اشاعت کا اکتیس واں سال ، پہلا شمارہ

نگراں : یوسف دہلوی

مدیرہ : زینت کوثر دہلوی

ادارۂ تحریر : شمیم آرا دہلوی

سعدیہ دہلوی

● مالکان : شمع میگزین

● طابع و ناشر : یونس دہلوی

● مطبوعہ : ایس۔ پی۔ پریس

● [illegible] آفسیٹ پریس

عام شمارے کی قیمت :

ایک روپیہ پچاس پیسے

سالانہ قیمت :

اٹھارہ روپے (جس میں سالنامہ مفت ملتا ہے)

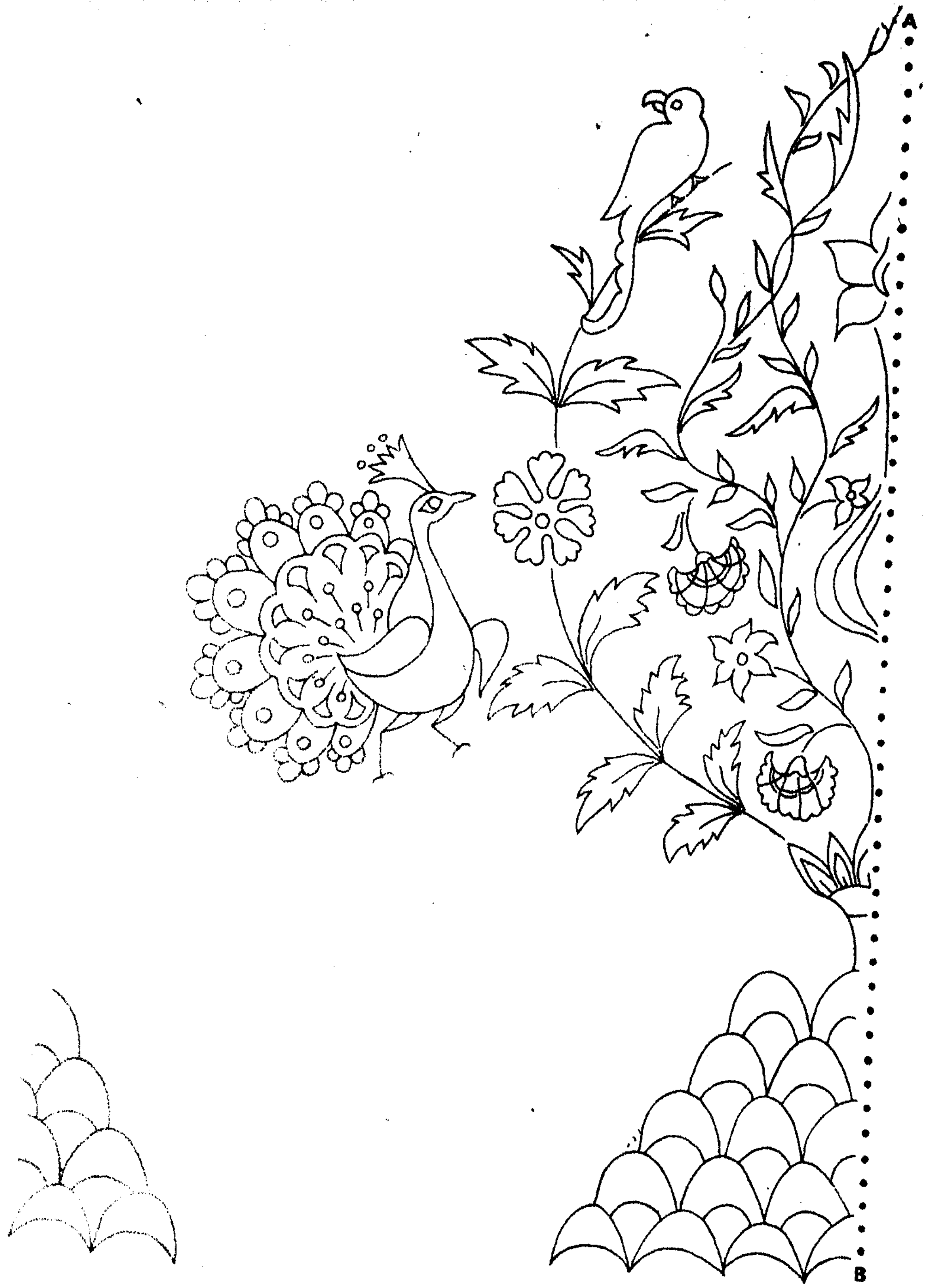
مقام اشاعت و صدر دفاتر :

آصف علی روڈ ، نئی دہلی

تار کا پتہ : "شمع" نئی دہلی

ٹیلی فون : ٢٧٢٠٦٦ ، ٢٧٢٠٦٧ ، ٢٧٣٠٦٨ ، ٢٧[illegible]

دیگر دفاتر : بمبئی ، کلکتہ اور مدراس


A
B

جب انسان کو زندگی میں کبھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ اپنی کمزوریوں پر نظر ڈالنے کے بجائے قسمت کو دوش دیتا ہے۔ کیونکہ قسمت ایک مبہم اور غیر واضح شے ہے، جس کی تشریح نہیں کی جاسکتی، اس لئے یہ غلطیوں پر پردہ ڈالنے کے کام آتی ہے۔ دراصل انسان اپنی تقدیر کو دوش دے کر خود اپنا پیچھا آسانی سے چھڑا لیتا ہے۔

ممکن ہے کسی عورت کا شوہر اس کی بدسلیقگی، زبان درازی یا اس کی کسی اور خراب عادت کی وجہ سے ناراض رہتا ہو۔ لیکن وہ اپنے ان عیوب پر نظر ڈالنے کے بجائے اپنی قسمت کو قصوروار ٹھیرا کر خود کو ہر بات سے بری الذمہ کرلیتی ہے۔ یہ ایک غیر صحت مندانہ رویہ ہے۔ جو انسان اپنی غلطیوں پر نظر ڈالنے کی بجائے ہر وقت قسمت کو کوستا رہے، وہ اپنی برائیاں کبھی بھی دور نہیں کرسکتا۔ اس کے برخلاف اگر کوئی انسان اپنا گہرا مطالعہ کرے اور جرأت سے کام لے کر اپنی ناکامی کی وجہ خود میں تلاش کرکے اس کو دور کرڈالے تو یقیناً وہ ایک باہمت اور ترقی پسند انسان ہے جو اپنی ناکامیوں کو کامیابیوں میں بدل دینے کا حوصلہ رکھتا ہے

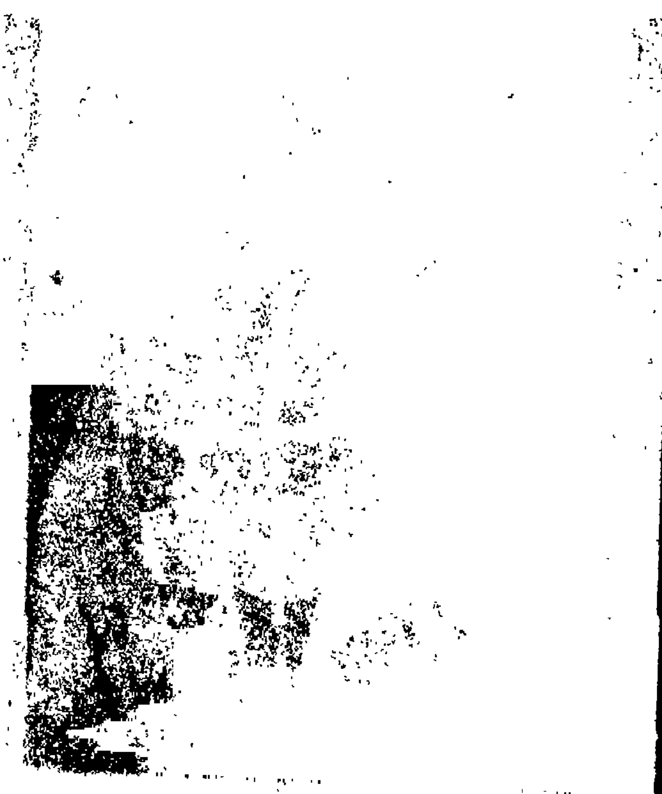
نیپالی عورتیں

ہندوستان کی سرحد پر پہاڑ سے
لگا ہوا، ہمالیہ کی گود میں لمبائی میں پھیلا ہوا نیپال
ایک چھوٹا سا ملک ہے جس کا تعلق ہندوستان
سے بہت پرانا ہے۔ یہاں بدھ بھکشو بھی تبلیغ
کرنے پہنچے تھے مگر آج جو تہذیب نیپالیوں پر
چھائی ہوئی ہے وہ ہندو تہذیب ہے۔ ہندوستان
میں ہندوستانیوں کی آپسی لڑائیوں سے تنگ
آکر کئی راجپوت راجہ بھی نیپال چلے گئے تھے
اور انہوں نے وہاں اپنی سلطنت کر کے وہیں
کی سکونت اختیار کر لی تھی۔ اُن کی نسلیں
راج وشی (گورکھا) کہلاتی ہیں۔ ان کے
علاوہ بہت سے قبائل بھی پہاڑوں پر پھیلے
ہوئے گھنے جنگلوں کے درمیان آباد ہیں۔
مجموعی طور سے نیپالی لوگ منگول نسل سے
تعلق رکھتے ہیں، جس کا ثبوت ان کی چھوٹی
چھوٹی آنکھیں اور گالوں کی اُبھری ہوئی
ہڈیاں ہیں۔

نیپال کی عورتیں بہت سی باتوں میں
ہندوستان کے پہاڑی علاقوں کی عورتوں
سے ملتی جلتی ہیں — ان کا لباس ہوتا ہے
... میں بنا ہوا ایک لمبا گھاگرا اور
... کی قمیص۔ سردی میں وہ
گرم کوٹ پہنتی ہیں اور سر پر ایک بڑا سا



▲ دیہی علاقے کی عورتوں کی محنت بھری زندگی میں دور دور سے پانی لانا بھی شامل ہے۔

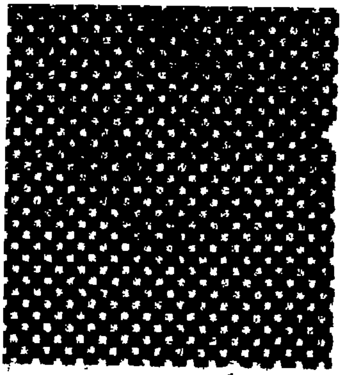


▲ مورنگیا نین اور مورنگیا مین، جن کے جادو سے بچنا مشکل ہے

[بند]ھ کر اٹھا کر کے باندھے رہتی ہیں۔ پہاڑی علاقے کے چشموں کا صاف پانی پینے، صاف ہوا میں سانس لینے اور پہاڑ کے دشوار گزار راستوں پر چلنے پھرنے کی وجہ سے نیپالی عورتیں اکثر صحت مند ہوتی ہیں۔ ان کے گالوں پر جھلکتی ہوئی سرخی ان کی صحت کی غماز ہوتی ہے

نیپال میں شادی اکثر ہندو رسوم کے مطابق ہوتی ہے، لیکن قبائل میں شادی کے مختلف اور دلچسپ طریقے بھی رائج ہیں۔ مشرقی نیپال کے "رئیس" اور "لمبو" قبیلوں [illegible] کے کھیتوں میں کام کرتے ہوئے نوجوان لڑکے لڑکیاں اپنے جیون ساتھی کا انتخاب خود کر لیتے ہیں۔ نوجوان لڑکے بانسری بجا بجا کر لڑکیوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں اور آنکھوں ہی آنکھوں میں محبت کا پیغام دیتے ہیں۔ کام کے خاتمے پر وہ جوڑے رک جاتے ہیں جو ایک دوسرے سے جذباتی وابستگی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ دونوں رومانی گیتوں کے ذریعہ محبت کے راز و نیاز اور عہد و پیمان کی باتیں کرتے ہیں۔ آس پاس کی پہاڑیاں محبت کے گیتوں سے گونجنے لگتی ہیں۔ اس ملاقات کے بعد جلد ہی دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ کبھی، کبھی اس طرح کی پہلی ملاقات بھرے ہوئے بازار میں بھی ہو جاتی ہے۔ بہت سے لوگ محبت میں سرشار جوانی کے گیت سنتے ہیں، مگر کسی قسم کی رکاوٹ نہیں بنتے۔

نیواری قبیلے میں لڑکی کی عمر پانچ سال ہونے پر اس کی شادی شنکر بھگوان کے پسندیدہ پھل بیل سے کر دی جاتی ہے لڑکی سے شادی کے بعد اس بیل کو کسی ندی میں دفن کر کے محفوظ بھی کر دیا جاتا ہے اس طرح ساری زندگی کے لئے اس لڑکی کو سہاگن مان لیا جاتا ہے، چاہے اس کا [illegible]



ایک بھوٹانی لڑکی کے سر کی آرائش

ایک تورکھا عورت

ہوتے والا شوہر مر جائے یا اس سے طلاق
لے کر دوسری شادی کر لے۔ لڑکی کے لئے
شوہر کی تلاش میں لڑکے والے کسی پسندیدہ
لڑکی کے گھر، گھر کے ہر فرد کے لئے دو دو بس
سپاریاں بھیجتے ہیں۔ رشتہ منظور ہونے پر
لڑکی کا باپ شادی اور تحائف لے کر لڑکے
والوں کے گھر جا کر شادی کی بات طے کرتا ہے۔
جہیز کی رسم نہیں ہے۔ لڑکے کا باپ اپنی طرف
سے ایک [illegible] دلہن کے لئے جاتا
ہے اور [illegible] کے ساتھ دلہن کو اپنے گھر
لے آتا ہے۔ باقی پھیرے وغیرہ لڑکے کے گھر پر
ہی ہوتے ہیں۔ طلاق لینا عورت کے لئے بہت
آسان ہے۔ طلاق چاہنے والی عورت اپنے
شوہر کے تکئے کے نیچے دو سپاریاں رکھ کر کہیں بھی
چلی جاتی ہے۔ بس یہی ان کے قطع تعلق کی نشانی
ہے پھر عورت کسی بھی دوسرے مرد سے آسانی سے
شادی کر سکتی ہے۔

گورکھا لوگوں میں شادی کا بندھن
زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ وہاں عورت کی بے
راہ روی کو بہت برا سمجھا جاتا ہے۔ عورت کو
بد چلنی پر بہت مارا پیٹا جاتا ہے۔ مرد کو بھی
بے وفائی کی سخت سزا دی جاتی ہے۔ عورت
کا شوہر عورت کے آشنا کو قتل کر دینے کا
بھی حق رکھتا ہے۔ اگر عورت کا آشنا عورت
کے شوہر کی ٹانگ کے نیچے سے تین بار نکل
جائے تو اسے معاف کر دیا جاتا ہے۔ مگر یہ
کسی بھی مرد کے لئے نہایت شرم کی بات ہے
اس کی بجائے آشنا اپنے گاؤں کو چھوڑ کر
بھاگنے کو ہی ترجیح دیتا ہے گورکھے اپنے

آپ کو راجپوتوں کی نسل سے سمجھتے ہیں اس لئے وہ راجپوت رسوم کے مطابق شادی کرتے ہیں۔ سوئمبر کے ذریعہ بھی لڑکی اپنا شوہر چن سکتی ہے پہلے گورکھا مرد کئی شادیاں کر لیتے تھے مگر اب یہ رواج ختم سا ہو گیا ہے۔ پہلے شادی کم سنی میں ہو جاتی تھی، مگر ۱۹۳۲ء میں، رانا شمشیر جنگ بہادر نے کم سنی کی شادی اور بوڑھوں کی شادی کی روک تھام کے لئے سخت قوانین بنا دیئے تھے۔

کاٹھمنڈو گھاٹی کے مغرب میں بسنے والے "مگر" اور "گورونگ" قبائل میں گاؤں کا مکھیا گاؤں کی لڑکیوں کے رشتے منظور و منسوخ کرتا ہے۔ ویسے لڑکیاں میلوں میں بھی اپنی پسند کا بر منتخب کر لیتی ہیں۔ گاؤں میں بنے ہوئے روڈی گھر میں لڑکے لڑکیاں آزادی کے ساتھ ملتے ہیں۔ شادی کے موقع پر گوشت، شراب، ناچ رنگ اور ڈھول باجوں کی رونق رہتی ہے۔ نیپال اور تبت کی سرحد پر آباد ایک پہاڑی قبیلے میں عورت کئی شوہر بیک وقت بھی رکھ سکتی ہے، مگر اب عملی طور سے یہ دستور ختم ہو چلا ہے۔

"دراٹ نگر" کا شہر مورنگیا قبائل کا مرکز ہے، جہاں شام کے وقت رنگین اور بھڑکیلے کپڑوں میں ملبوس خوب صورت مورنگیا عورتیں تتلیوں کی طرح گھومتی دکھائی دیتی ہیں۔ یہاں اتنی ہی خوب صورت اور بنی سنوری دکھائی دیتی ہیں جیسے نیپال میں بنی ہوئی کانچ کی گڑیاں سنیما گھروں پر بھیڑ ہوتی ہے اور ہندوستانی فلم چاہے کیسی بھی ہو، خوب رش لیتی ہے۔ بمبئی کے فیشن فلموں کے ذریعہ اگلے ہفتہ ہی دراٹ نگر کے بازاروں میں دکھائی دینے لگتے ہیں۔ عورتیں بھی چرٹ پیتی نظر آتی ہیں اور گانجہ بھی، جو نیپال میں بغیر کسی پابندی کے فروخت ہوتا ہے، عورتوں کے شوق میں شامل ہوتا ہے۔ پان بھی کھایا جاتا ہے، جس کے بارے میں یہاں یہ کہاوت ہے کہ مورنگیا پان جنت میں راجہ اندر کو بھی نہیں ملتے۔ غرض مورنگ کی راجدھانی دراٹ نگر بہت دلچسپ شہر ہے۔

اس کے بعد نگینوں کی طرح جڑے ہوئے پہاڑی دیہات کا سلسلہ ہے۔ مورنگ کی تمام عورتیں بے خوف ہو کر کھیتوں میں کام کرتی ہیں اور بنوں سے لکڑی چنتی ہیں۔ گاؤں کے لوگوں پر "دھامائین" کا گہرا اثر پایا جاتا ہے۔ دھامائین کو ایک طرح کی جادوگرنی سمجھئے جو کالی مائی کی پوجا کرتی ہے اور عجیب و غریب پتھروں، لکڑیوں اور جڑی بوٹیوں کے سہارے قسمت کا حال بھی بتاتی ہے اور بیماریوں کا علاج بھی کرتی ہے۔ مورنگ کی عورتوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ جنگلوں سے گزرتے ان مردوں کو جو ان کے حسن کے جال میں پھنس جائیں، بھیڑ بنا لیتی ہیں۔ پہلے ایسی ہی بات ہمارے ملک میں بھی مشہور تھی کہ بنگال کی عورتیں مردوں کو مکھی بنا کر قید کر لیتی ہیں، شاید یہ باتیں اسی حقیقت کا بگڑا ہوا روپ ہوں کہ بنگال کی سیاہ زلفیں، غزالی آنکھیں اور ملیح جلد رکھنے والی عورتیں مردوں کا دل جیت لیتی ہیں اور مرد کو اپنا غلام بنا لیتی ہیں۔ یہی بات مورنگ کی بھرے بھرے جسم، سرخ سفید رنگت، گول چہرے، گھنے بال اور نشیلی آنکھوں والی عورتوں کے بارے میں صحیح لگتی ہے کہ وہ مرد کو بھیڑ کی طرح سیدھا سادہ بنا کر اپنے عشق کے دام میں پھنسا لیتی ہیں

یوں عام زندگی میں نیپالی عورت شوہر کی اس طرح مرید ہوتی ہے جیسے تمام مشرق میں عورت کا دستور ہے۔ وفا اور اطاعت کا تصور نیپالی عورت میں بالکل مشرقی ہے یہ دوسری بات ہے کہ وہ کبھی کبھی اپنے شوہر سے لڑتی ہے اور مار بھی کھا لیتی ہے —— لیکن یہ تو ہندوستان میں بھی ہوتا ہے۔ عموماً نیپالی عورت کی زندگی دیہات کی پُرمشقت اور سیدھی سادی زندگی ہے، جس میں فیشن کی گنجائش ہے نہ دنیا کی ہوا وہاں تک پہنچتی ہے لیکن ترقی کی لہر تو دور افتادہ قطبین تک بھی پہنچ گئی ہے، اور نیپال تو ایسا ملک ہے جہاں کچھ سال پہلے راجہ نے ایک امریکن لڑکی سے شادی کی تھی پھر نیپال میں ہپیوں کے داخلہ پر کوئی پابندی نہیں۔ چنانچہ یورپ اور امریکہ کے ہپی نشے کی اس جنت میں ہزاروں کی تعداد میں دکھائی دیتے ہیں۔ سرکار تعلیم و ترقی کی طرف بھی دھیان دے رہی ہے۔ ہمارے ملک کی سرکار نیپال کی ترقی میں بڑی مدد کر رہی ہے۔ ایسے حالات میں نیپال کے شہروں میں بھی تعلیم، ترقی اور فیشن سے لیس عورتوں کا پایا جانا فطری ہے مگر ابھی تک نیپال شہروں کی تعداد بھی کم ہے اور ایسی عورتوں کی بھی۔ زیادہ تر عورتوں کی زندگی تو یہی ہے کہ وہ مردوں کے مقابلہ کھیتوں اور گھروں میں محنت کریں، ہاتھ سے بنے موٹے کپڑے کے گھاگھرے قمیص پہنے کندھوں پر ایک اونچی سی مضبوط بید کی بنی ہوئی ٹوکری میں بھاری سامان یا بچوں کو لادے دشوار گزار راستوں سے گزرتی رہیں اور جنگل کے ہر خطرے کا مقابلہ بڑی ہمت سے کریں۔

●●

ان سے ملئے

صحافت کا میدان ہندوستان میں مردوں کے لئے مخصوص رہا ہے۔ ہمارے ملک میں ایسی عورتوں کی تعداد بہت کم ہے جو اخباروں اور رسالوں کی ایڈیٹر ہیں۔ کچھ عورتوں کے رسالے ضرور عورتوں کی زیرِ ادارت شائع ہوتے ہیں۔ لیکن عام اخبار اور رسالے مرد ہی نکالتے ہیں۔ انیس جنگ ایک انگریزی رسالے کی ایڈیٹر ہیں۔ اس رسالے کا نام "یوتھ ٹائمز" ہے۔ یہ نوجوانوں کا رسالہ ہے۔ اس میں حالاتِ حاضرہ پر مضامین چھپتے ہیں۔ خبروں پر ریویو ہوتا ہے، فلمی اور ادبی مضمون ہوتے ہیں۔ انیس تین سال سے اس رسالے کی ایڈیٹر ہیں۔ انیس کے زیرِ ادارت آنے سے پہلے، ابزار چھپتا تھا۔ اب ان کی محنت اور قابلیت کی بدولت اس رسالے کی اشاعت دگنی ہو گئی ہے۔

انیس ہر کام کو لگن اور انہماک سے انجام دینے کی قائل ہیں۔ اخبار کی اشاعت دوچند کرنے کے علاوہ بھی انہوں نے جو کام اپنے ذمہ لیا اسے نہایت عمدگی اور سلیقے سے انجام دیا۔ آج کل وہ خالی وقت میں موسیقی سیکھ رہی ہیں۔ انہیں موسیقی سکھانے والا اُستاد بھی ان کے شوق اور مستعدی کا معترف ہے۔ وہ اپنا کام یکسوئی سے انجام دینے کی عادی ہیں۔ دفتر میں ان کے انہماک کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ کام کرتے وقت ساری دنیا سے غافل ہو جاتی ہیں۔ اسی لئے وہ اکثر تین گھنٹے میں آٹھ گھنٹے کا کام ختم کر دیتی ہیں۔ انہیں کام کے وقت بے کار باتیں کرنا، یا حیدرآبادی زبان میں منطق مارنا پسند نہیں۔ کوئی آدمی دفتر میں ان سے ملنے آئے تو وہ اس سے بس کام کی بات کرتی ہیں، چائے پلانے کے بجائے وقت کو ضائع کرنا انہیں پسند نہیں۔

انیس ہوش یار جنگ کی بیٹی ہیں —— ہوش یار جنگ بلگرامی خاندان کے فرد تھے۔ حیدرآباد کے انتظامیہ میں بلگرامی خاندان کا کافی اثر رہا ہے۔ ہوش یار جنگ نظام کی حکومت میں وزیر تھے۔ اس سے پہلے وہ رام پور اور بھوپال کی ریاستوں میں کام کر چکے تھے۔ انیس نے ابتدائی تعلیم حیدرآباد میں حاصل کی۔ سینئر کیمرج کے بعد وہ امریکہ چلی گئیں۔ امریکہ میں انہوں نے انگریزی ادب میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد انہوں نے کچھ دنوں اقوام متحدہ میں اور ہندوستانی سفارت خانے میں بھی کام کیا۔ امریکہ میں وہ ۹ سال رہیں۔ پھر وطن کی محبت انہیں ہندوستان واپس لے آئی۔ وہ کچھ دن بمبئی میں رہیں —— اس وقت ان کا خاندان بمبئی میں آباد تھا۔ یہاں انہوں نے کچھ عرصے اخبارات کے لئے مضامین لکھے۔ اس کے بعد وہ پھر امریکہ چلی گئیں، لیکن یہ قیام بھی عارضی ثابت ہوا، اور وہ ہندوستان واپس آکر مستقلاً بمبئی میں رہنے لگیں۔ تین سال پہلے انہوں نے "یوتھ ٹائمز" کی ادارت کا بار سنبھالا۔ اس طرح وہ دلی میں بس گئیں۔

انیس کا شمار ہندوستان کی ان گنی چنی عورتوں میں ہوتا ہے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، اپنی روزی خود کماتی ہیں، اور مردوں کی دستِ نگر نہیں ہیں۔ لیکن اس معاملے میں انیس کے خیالات عام ڈگر سے مختلف ہیں۔ انہیں اس بات پہ فخر نہیں ہے کہ وہ مردوں کے دوش بدوش کام کر رہی ہیں، یا مردوں سے کسی طرح کا مقابلہ کر رہی ہیں۔ انہیں تو عورتوں اور مردوں کی برابری کا نعرہ ہی پسند نہیں۔ ان کے خیال میں جو عورتیں مردوں کی برابری کرنا چاہتی ہیں وہ احساسِ کمتری کا شکار ہیں اور ان میں تحفظ کے احساس کی کمی ہے۔ ان کی نظر میں ہر عورت کی اپنی علیحدہ شخصیت ہوتی ہے، اس کا اپنا الگ مزاج ہوتا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اسے سماج کو کیا دینا ہے۔ اگر ایک عورت یہ سمجھتی ہے کہ وہ ایک اچھی بیوی اور اچھی ماں ہے تو یہ کافی ہے، بلکہ دفتر میں گھِس گھِس کرنے سے بدرجہا بہتر ہے۔ عورتوں نے آزادی کا بس یہ مطلب سمجھ لیا ہے کہ وہ دفتروں میں کام کریں، اپنی روزی خود کمائیں، مردوں کی دستِ نگر نہ رہیں تو یہی ان کے لئے اصلی آزادی ہے۔ مگر یہ نظریہ غلط ہے۔ ایک اچھی ماں ثابت ہونا بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا ایک اہم

عہدے پر فائز ہونا۔ انیس خود دفتر میں کام کرتی ہیں لیکن وہ کسی مشنی جذبے کے تحت کام نہیں کرتیں، بلکہ اس کام میں انہیں اپنی زندگی زیادہ ہم آہنگ نظر آتی ہے۔ یہاں ان کی اہلیت بروئے کار آتی ہے، جس سے انہیں تسکین کا احساس ہوتا ہے۔ اس کام کے پیچھے مردوں سے مقابلے کا جذبہ نہیں، بلکہ اپنی شخصیت کی تکمیل کی آرزو کارفرما ہے اگر کبھی یہ کام ان کی شخصیت کی تکمیل کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوا تو وہ بلاتکلف اس کام کو چھوڑ دیں گی۔

انیس ترقی پسند ہیں، وہ کٹر ہندوستانی ہیں۔ رواداری ان کی گھٹی میں ہے۔ فرقہ پرستی ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ مسجدوں میں بھی جاتی ہیں اور مندروں میں بھی۔ انہیں گرجا گھر بہت پسند ہیں۔ ہندوستان کا کوئی مشہور مندر ایسا نہیں جو انہوں نے نہ دیکھا ہو۔ وہ جگن ناتھ پوری کے مندر میں بھی گئیں جہاں غیر ہندو کا داخلہ ممنوع ہے۔ وہ مذہب کو ذاتی شے مانتی ہیں۔ ان کی رائے میں ہر شخص کو آزادی ہونی چاہئے کہ وہ جس طرح چاہے خدا کی عبادت کرے کوئی مذہب آپس میں بیر رکھنا نہیں سکھاتا۔ مذہب کے نام پر سیاسی جماعتیں بنانا اور ایک انسان سے دوسرے انسان سے لڑانا غلط ہے۔ یہ مذہب کی رُوح کے خلاف ہے۔ انیس کی رگ رگ میں ہندوستانیت رچی ہوئی ہے۔ انہیں اپنے وطن سے پیار ہے۔ ان کے خیال میں ہندوستان ایک کامیاب جمہوریت ہے، جہاں ہر انسان سے برابر کا سلوک ہوتا ہے۔ کم از کم ان کی ترقی کے راستے میں ان کا مذہب کبھی رکاوٹ ثابت نہیں ہوا۔

مسلم پرسنل لا کے متعلق انیس کا خیال ہے کہ اس میں ترمیم ہونا چاہئے۔ لوگ اس قانون کا

اجازت ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ گذشتہ زمانے کے حالات دوسرے تھے۔ اس زمانے میں لوگ قانون کا احترام کرتے تھے۔ خود انیس کے والد نے دو شادیاں کی تھیں۔ لیکن ان کا سلوک دونوں بیویوں کے ساتھ مساویانہ تھا۔ آج لوگ اس اجازت کی آڑ میں عورتوں پر ظلم کرتے ہیں

ہمارے سماج میں لڑکوں اور لڑکیوں کی تربیت مختلف انداز سے ہوتی ہے۔ لڑکوں کو زیادہ آزادی حاصل ہوتی ہے۔ ان کی بے راہ روی کو بھی آسانی سے برداشت کر لیا جاتا ہے، لیکن لڑکیوں پر ہر طرح کی پابندی عائد کی جاتی ہے۔ ان پر اعتبار نہیں کیا جاتا۔ یہ دوہرا معیار ہمارے سماج کی پستی کی نشانی ہے۔ انیس کے خیال میں عورت کا کیریکٹر مرد سے کہیں زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ اس دعوے کو ثابت کرنے کے لئے انہوں نے ایک بہت اچھی مثال دی۔ وہ کئی سال مغربی ممالک میں رہیں، وہاں انہیں ہندوستانی لڑکے لڑکیوں کے کردار کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ہندوستانی لڑکے جنسی بھوک سے بلبلاتے ہوئے مغربی ممالک میں پہنچتے ہیں۔ وہ سفید فام عورتوں کو دیکھ کر اپنے حواس کھو بیٹھتے ہیں۔ وہاں عورتیں آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہیں۔ وہ سفید فام عورتوں کے ساتھ خوب رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ ان کے ارد گرد وہ بھونروں کی طرح منڈلاتے ہیں۔ عورت ان کے اعصاب پر سوار ہوتی ہے۔ ان کی بے راہ روی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے برعکس انیس کو اپنے قیام کے دوران ایک بھی ہندوستانی عورت ایسی نہیں ملی جو سفید فام مرد سے دوستی کی شائق ہو۔ یہ بات نہیں کہ اسے ایسے مواقع نہیں ملتے۔ یہ صرف اس کے کیریکٹر کی عظمت کی نشانی ہے

کہ وہ آزادی کے باوجود بے راہ روی کی زندگی پسند نہیں کرتی۔ ممکن ہے کہ اس کے پیچھے عورت کا ممتا کا جذبہ کارفرما ہو۔ عورت مرد کو جنم دیتی ہے وہ اسے بگاڑنا نہیں چاہتی، وجہ کچھ بھی ہو، یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ عورت کا کیریکٹر مرد کے مقابلے میں زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ انیس کے خیال میں دنیا کی ہر عورت میں یہ جذبہ پایا جاتا ہے۔

انیس عورتوں کی آزادی کی حامی ہیں لیکن اس بات سے ان کا یہ مطلب نہیں کہ لڑکیاں ماں باپ کی نافرمانی کریں۔ دراصل والدین اور بچوں کے درمیان اعتماد ہونا ضروری ہے۔ والدین کا اعتماد اور بھروسہ ایک بنیادی شے ہے۔ ہمارے سماج میں لڑکیوں سے بہت سی باتیں چھپائی جاتی ہیں۔ ان کو پردے میں رکھا جاتا ہے — یہ پردہ جسمانی بھی ہوتا ہے اور ذہنی بھی۔ ذہنی پردہ زیادہ خطرناک ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کو جس کام کے کرنے سے روکا جائے، وہ اسے ضرور کرنا چاہتا ہے، جو چیز اس سے راز میں رکھی جائے اُسے ضرور معلوم کرنا چاہتا ہے۔ لڑکیوں کو ذہنی پردے میں رکھنا اُن کے تجسّس کو ہوا دینا ہے یہ غلط رجحان ہے۔ انسان کی فطرت کا تقاضہ ہے کہ وہ کھلی ہوئی چیز کو حاصل کرنا نہیں چاہتا وہ بند چیزوں کو ہی کھول کر دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر والدین اپنے بچوں کا اعتبار کریں اور ہر بات ان کے سامنے کھول کر رکھ دیں تو بچے بھی اس آزادی کا ناجائز فائدہ نہیں اُٹھائیں گے۔ خود انیس کو والدین کا بھرپور اعتماد حاصل رہا۔ وہ اکیلی نو برس امریکہ میں رہیں۔ آج کل بھی وہ تنہا دلی میں رہتی ہیں۔ ان کی والدہ پڑھی لکھی نہیں لیکن ان میں رواداری ہے۔ جب وہ پہلی بار دلی آئیں تو انیس

کے گھر میں رہیں۔ انیس کے گھر کی دیواروں پر تصویریں آویزاں ہیں، بزرگوں کے خیال میں جس جگہ تصویریں ہوں، وہاں نماز جائز نہیں۔ انیس کی ماں کو کوئی کمرہ تصویروں سے خالی نظر نہیں آیا تو انہوں نے انیس سے پوچھا "بتاؤ میں نماز کہاں پڑھوں؟ تمہارے ہر کمرے میں تصویریں ٹنگی ہوئی ہیں۔" یہ سنتے ہی انیس نے انہیں ایسی جگہ مہیا کردی، جہاں تصویریں نہیں تھیں، اور انہوں نے نماز ادا کرلی۔ انہوں نے ایک دفعہ بھی انیس سے یہ نہیں کہا کہ تم نے دیواروں پہ تصویریں کیوں لگائی ہیں۔ انہیں یہاں سے ہٹا دو۔ انیس کو ماں کا مکمل اعتماد حاصل ہے۔ وہ کہیں بھی چلی جائیں، ان کی ماں کو یقین ہے کہ ان کی بیٹی غلط راستے پر نہیں چل سکتی۔ انیس کے گھر میں ان کے ملاقاتی اور دوست آتے تھے۔ ان ملاقاتیوں میں مرد بھی ہوتے تھے اور عورتیں بھی۔ لیکن ان کی ماں نے کبھی ان کی زندگی میں دخل نہیں دیا۔

عورتوں کی آزادی کے لئے مردوں نے بہت کام کیا ہے۔ یہ قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ عورت خود اس قانون کی مخالفت کرتی ہے جو اسے آزادی مہیا کرتا ہے۔ انیس کے خیال میں مرد عورتوں سے زیادہ ترقی پسند ہیں۔ ہندوستان کی عورت خاص طور پر لکیر کی فقیر ہے، اس ہندوستان میں کاملہ طیب جی کے سوا ایک بھی ایسی عورت نہیں ملی جو صحیح معنوں میں ترقی پسند ہو۔ کاملہ طیب جی نے ۲۸ سال ہندوستان سے باہر گزارے ہیں۔ وہ ایک مشہور وکیل ہیں اور بمبئی میں پریکٹس کرتی ہیں۔

ہندوستان میں لوگ عام طور پہ مغربی تہذیب کو برا سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں یورپ اور امریکہ محض عریانی اور فحاشی کا مرکز ہیں۔ یہ غلط خیال ہے۔ انیس کو اپنے امریکہ کے قیام کے دوران ایسے بہت سے لوگ ملے جن کی نیکی اور اخلاق کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔ وہاں جنسی بھوک نہیں ہے۔ وہاں مرد بھوکے بھیڑیوں کی طرح عورتوں کی تلاش میں نہیں پھرتے۔ ان کی تہذیب میں مرد اور عورت کی دوستی کو بری نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ یہ دوستی صرف دوستی ہی رہتی ہے اس سے آگے نہیں بڑھتی۔ اس کے برعکس ہندوستانی مرد اور عورت کی دوستی ایک عجوبہ ہے۔ یہاں بیوی کبھی دوست نہیں بنتی۔ وہ صرف بیوی ہی رہتی ہے۔ انیس امریکہ میں ۹ سال رہیں، اور اس لمبے عرصے میں انہیں کسی مرد نے بری نظر سے نہیں دیکھا۔ اس کے برخلاف ہندوستان میں انہیں ایسے کئی تجربات سے دوچار ہونا پڑا۔ ہم لوگ مغرب کی عریانی اور فحاشی پر لعن طعن کرتے ہیں لیکن وہاں کی اچھی باتوں کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ انیس نے اس بارے میں گاندھی جی کا ایک مقولہ سنایا، کہ اپنے گھر کی کھڑکیاں کھلی رکھو، تاکہ باہر کی ہوا اندر آتی رہے۔ اس سے تمہارے گھر کی آب و ہوا صحت بخش رہے گی۔

انیس کو زیورات کا شوق نہیں، وہ بھڑکیلے لباس پسند نہیں کرتیں۔ ان کے خیال میں زیورات اور بھڑکیلے لباس احساس کم تری کی دلیل ہیں۔ جب انسان زیور اور کپڑوں کے ذریعہ دوسروں کو مرعوب کرنا چاہتا ہے تو وہ دراصل اپنی کمزوری کو چھپاتا ہے۔ یہ بیماری متوسط طبقے میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ نئے نئے دولت مند بھی اس روگ کا شکار ہیں۔ خاندانی رئیس کو ان اوچھے ہتھیاروں کے استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

انیس کو مرغن اور نفیس کھانوں کا شوق ہے۔ یہ شوق ان کو اپنے باپ سے ورثے میں ملا ہے۔ ہوش یار جنگ بھی اچھے کھانے کے شوقین تھے۔ وہ یوپی کے رہنے والے تھے۔ انیس کی ماں حیدرآباد کی رہنے والی ہیں۔ اس طرح ان کے گھر میں شمال اور جنوب کے کھانے میز پہ سجے ہوتے تھے۔ ہوش بلگرامی رام پور سے ایک باورچی کو اپنے ساتھ حیدرآباد لائے تھے۔ سنتروں کے چھلکے کا میٹھا انہیں بہت پسند تھا۔ انیس بھی باپ کی طرح بہت کم کھاتی ہیں۔ انہیں مغربی کھانے بالکل پسند نہیں۔ ہندوستانی کھانوں کے بعد انہیں چینی کھانے پسند ہیں۔

انیس کو سیاحت کا بہت شوق ہے۔ انہیں جب فرصت ملتی ہے وہ سیاحت کے لئے نکل جاتی ہیں۔ سیاحت کے بعد انہیں موسیقی کا شوق ہے۔ مغربی کلاسیکل موسیقی بہت پسند ہے۔ ہندوستانی موسیقی میں انہیں غزل پسند ہے۔ ان کے والد شاعر تھے، ان کے بھائی مہوش بلگرامی کے نام سے مشہور ہیں۔ انیس کو اُردو برائے نام آتی ہے۔ اسکول میں انہوں نے ہندی پڑھی تھی، لیکن ان کے گھر کی زبان اُردو تھی، اس لئے انہوں نے خود ہی اُردو سے شدبد حاصل کرلی۔

انیس مطالعہ کی رسیا ہیں۔ ناول، تاریخ اور سوانح عمری ان کے پسندیدہ مضامین ہیں — انیس کی پانچ بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ دو بہنیں اور ایک بھائی امریکہ میں رہتے ہیں۔ انیس نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ ماں باپ کی پسند کی شادی کا زمانہ نکل گیا، ویسے بھی دوسروں کا پسند کیا ہوا رشتہ ان کی طبیعت کو قبول نہیں۔ انیس تنہا رہتی ہیں۔ وہ اپنی زندگی سے مطمئن ہیں لیکن انہوں نے شادی کا دروازہ بند نہیں کیا ہے۔

●●

اسلام اور فیملی پلاننگ

وقت کی سب سے اہم کتاب جو ہر مسلمان کو پڑھنی چاہیئے!

دُنیا بھر کے مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ آنحضرت رسول اللہؐ خاتم النبیین تھے اور اسلام ہر دور، ہر زمانے اور ہر ملک کے لئے مکمل مذہب ہے۔ دین و دنیا کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس کے بارے میں حق تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی کے ذریعے مومنوں کے لئے ہدایت نہ فرمائی ہو۔ فیملی پلاننگ یا خاندانی منصوبہ بندی کا مسئلہ آج بہت سے حضرات کو نئے زمانے کی دین معلوم ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ "فیملی پلاننگ" کا نام نیا ہے، کچھ ذرائع نئی سائنس کی دریافت ہیں ـــــ لیکن صحابہ کرام کے زمانے سے ہی بلا خواہش ہونے والی اولاد کے بوجھ سے بچنے کے لئے حمل روکنے اور حمل کے ابتدائی دنوں میں حمل کو گرانے یا ساقط کرنے کے مختلف طریقوں سے لوگ واقف تھے۔

اسلام میں ہر موقع کے لئے ہدایت موجود ہے

صحیح مسلم، صحیح بخاری اور دوسری مستند احادیث میں اولاد کی تعداد کم رکھنے کے طریقوں کا ذکر موجود ہے اور ان کے بارے میں صحابہ کرام کے پوچھنے پر رسول کریمؐ کے ارشادات بھی تحریر ہیں۔ چاروں امام بھی اس مسئلہ پر اپنی رائے کا اظہار کر چکے ہیں۔ آنحضرتؐ کے زمانے میں، جب عرب اپنی جہالت میں اپنی نوزائیدہ بچیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے، اس وقت یہودی برتھ کنٹرول کے ایک رائج طریقے کو "چھوٹا زندہ درگور کرنا" کہا کرتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ زمانہ قدیم سے اس مسئلہ کی اہمیت تسلیم کی گئی اور یہ کیسے ممکن تھا کہ اتنے اہم معاملے پر جس سے اُمتِ نبوی کے ہر فرد کو دلچسپی ہو سکتی ہے، پیغمبر اسلام اور خلفائے راشدین نیز ائمہ کی رائے قدیم کتب میں محفوظ نہ ہوں۔

دورِ حاضر کی اہم ضرورت

دورِ حاضر کی اہم ضرورت تھی کہ اولاد کی پیدائش کو روکنے کے عارضی اور مستقل طریقوں کو جو آج رائج ہیں اسلام کے احکامات کی روشنی میں پرکھا جائے اور مسلمانوں کو صحیح راہ دکھائی جائے تاکہ مزید اختلاف کی حتی الامکان کی گنجائش نہ رہ جائے۔

ملک کے مقتدر عالم دین، حضرت شاہ زید ابوالحسن فاروقی نے بڑی تحقیق و جستجو کے بعد کتاب "اسلام اور فیملی پلاننگ" (مسئلہ ضبطِ ولادت) تحریر فرمائی ہے۔ اس کی تصنیف میں قرآن مجید اور صحیح احادیث کے علاوہ، خلفائے راشدین کے اقوال اور چاروں اماموں کی رائے سے اس مسئلہ پر اسلام کی صحیح تعلیمات کی نشان دہی کی گئی ہے۔ امام ابو جعفر طحاوی (جن کا وصال ۳۲۱ھ میں ہوا) امام ابوبکر جصاص رازی (جن کا انتقال ۳۷۰ھ میں ہوا) اور حجۃ الاسلام امام غزالی (جنہوں نے ۵۰۵ھ میں وفات پائی) اور دوسرے بہت سے علماء کی قدیم اور نایاب کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی لکھوائی ہوئی کتاب "فتاویٰ عالمگیری" سے (جو مصر سے طبع ہوئی) اور امام مبارک بن اسیر جزری (سنہ وفات: ۶۰۶ ہجری) سے بھی اقتباسات لئے گئے ہیں۔ ضبطِ تولید کے متعلق امام غزالی کے ایک مضمون کا ترجمہ بھی کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔

دوسرے مشاہرین کی رائے

"اسلام اور فیملی پلاننگ" میں اس کتاب کے متعلق مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب، مولانا قاضی سجاد حسین صاحب (صدر مدرس، مدرسہ عالیہ، فتح پوری دہلی) سعید احمد صاحب اکبر آبادی (صدر شعبۂ دینیات، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) مولانا اخلاق حسین صاحب دہلوی (لال محل، بستی نظام الدین اولیاء دہلی) جیسے ۱۴ اکابرین کی رائے بھی شامل ہے۔ ان سب علماء نے اصل مسئلہ پر بھی اپنے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔

آج ہی مطالعہ کے لئے منگوائیے!

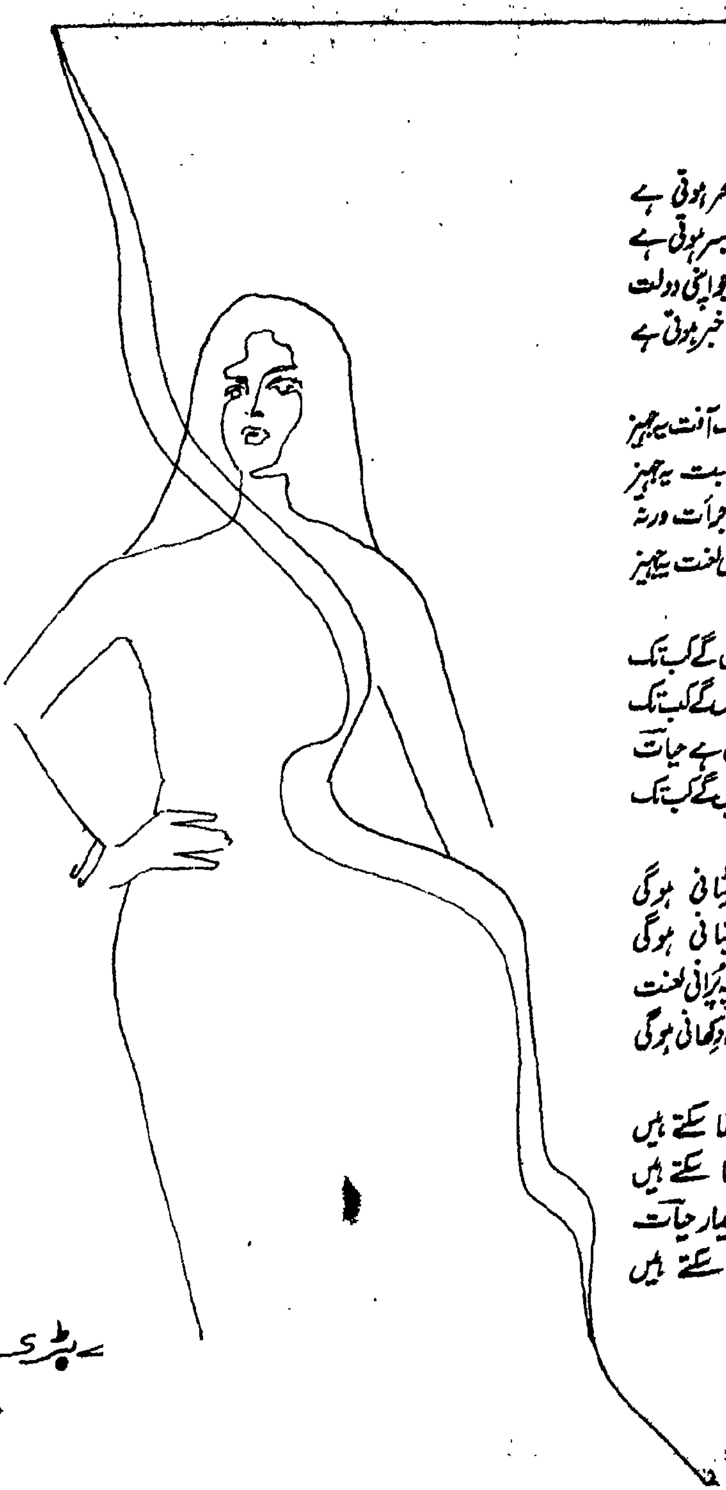
مختصر یہ ہے کہ "اسلام اور فیملی پلاننگ" میں ضبطِ ولادت کے سبھی رائج الوقت طریقوں پر (جن میں مردانہ اور زنانہ نس بندی بھی شامل ہے) قرآن اور حدیث کی روشنی میں نیز علماء احناف و شوافع کے اقوال پر مبنی بصیرت افروز اور سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے اور مسلمانوں کو صحیح فیصلہ پر پہنچنے میں مدد دی گئی ہے۔

شمع کے ادارے، مکتبہ دینیات، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ نے اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن اپنی روایتی خوبصورتی اور سلیقہ سے شائع کیا ہے۔ اپنے مطالعہ کے لئے، اپنی لائبریری کے لئے اور اپنے احباب کے لئے آج ہی منگوائیے، تاکہ ختم ہو جانے پر اگلے ایڈیشن کا انتظار نہ کرنا پڑ جائے۔

سات روپے قیمت کی یہ کتاب وی پی ہرگز نہ بھیجی جائے گی۔ جتنی کاپیاں درکار ہوں، فی کاپی سات روپے منی آرڈر سے مکتبہ دینیات، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ کے نام بھیج دیجئے اور منی آرڈر کی ڈاک سے ملنے والی رسید اپنی فرمائش کے ساتھ ہمیں بھیج دیجئے۔ ڈاک خرچ معاف۔ بیک وقت ایک سو سے زائد کاپیاں منگوانا ہوں تو خصوصی رعایت کے لئے لکھئے۔ یاد رکھئے، وقت کے سب سے اہم مسئلے پر یہ انتہائی بصیرت افروز کتاب ہے جسے پیش کرنے کا فخر حضرت علامہ شاہ زید ابوالحسن فاروقی کی عنایت سے شمع کے ادارے کو حاصل ہوا ہے۔

چند اہم سوال جن کے جواب آپ کو "اسلام اور فیملی پلاننگ" کے مطالعہ سے حاصل ہوں گے:

- ★ کیا "نرودھ" کا استعمال جائز ہے؟
- ★ کیا نس بندی کرانا [illegible]
- ★ ایک دوسرے کی رضامندی کے بغیر [illegible] پر کیا حکم ہے؟
- ★ اُمت کو [illegible]
- ★ کیا فیملی پلاننگ [illegible]



بر پیسے کی ہمیں شام و سحر ہوتی ہے
ندگی کتنی مصیبت سے بسر ہوتی ہے
رف ہم کرتے ہیں شادی پہ جو اپنی دولت
کتنے دُکھ جھیلتے ہیں کس کو خبر ہوتی ہے

کتنے ماں باپ کے سَر پہ ہے اِک آفت یہ جہیز
کتنے احباب کو دیتا ہے مصیبت یہ جہیز
لب کشائی کی نہیں ہے ہمیں جرأت ورنہ
ہے ہمارے لئے سب سے بڑی لعنت یہ جہیز

اپنے ہونٹوں کو سیئیں گے تو سیئیں گے کب تک
صرف مرنے کے لئے اور جئیں گے کب تک
یہ بُری رسم تو اِک زہر ہلاہل ہے حیات
جام اِس زہر سے بھر بھر کے پئیں گے کب تک

رسم بد ہم کو گلستاں سے ہٹانی ہوگی
اِس چمن کی نئی تصویر بنانی ہوگی
ہٹ تو جائے گی چمن سے یہ پُرانی لعنت
ہاں مگر کچھ ہمیں ہمت بھی دکھانی ہوگی

ہم اگر چاہیں تو یہ رسم اُٹھا سکتے ہیں
یہ جہیز اور یہ تقلید ہٹا سکتے ہیں
ہم کو مل جائے اگر دیدۂ بیدار حیات
اِک نئی راہ زمانے کو دکھا سکتے ہیں

عورہ

ے بڑی لعنت

نیر سلطانہ

ایک عورت نے ۱۷ مہینے امریکہ پر حکومت کی

لوگ ایڈیتھ بولنگ کو امریکہ کی پہلی خاتون صدر کہتے تھے تاہم اسے کوئی سرکاری عہدہ حاصل نہ تھا۔ وہ امریکہ کے صدر ولسن کی بیوی تھی صدر ولسن امریکہ کے طول و عرض کا دورہ کر رہے تھے کہ اچانک ان پر دل کا دورہ پڑا اور وہ اگلے سترہ مہینے تک بستر علالت پر پڑے رہے۔ ان کی بیوی نے ان کی دیکھ بھال کی۔ یہ دیکھ بھال ذرا سخت تھی سوا اُن کے اور ڈاکٹر کے کوئی دوسرا شخص صدر کے بیڈ روم میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ ایڈیتھ نے صدر کے چاروں طرف ایک آہنی دیوار کھڑی کر دی تھی۔ حکومت کا وزیر ہو یا افسر کوئی بھی اُن کے کمرے میں بغیر ایڈیتھ کی اجازت کے داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ سرکاری کاغذات خود وصول کرتی۔ صدر کے بیڈ روم میں جاتی، ان کی ہدایات سنتی اور اپنے قلم سے کاغذات پر جواب لکھ دیتی — گویا وہ امریکہ کے صدر کی مختار عام تھی۔

ایڈیتھ صدر ولسن کی دوسری بیوی تھی۔ اُن کی پہلی بیوی کا انتقال ان کے زمانۂ صدارت میں ہی ہو گیا تھا۔ امریکہ میں صدر کا عہدہ چار سال کے لئے ہوتا ہے۔ اکثر صدر دوبارہ چُن لئے جاتے ہیں اس طرح یہ عہدہ آٹھ سال کے لئے ہو جاتا ہے۔ آئین کی رُو سے آٹھ سال سے زیادہ کسی کو صدر کے عہدے پر رہنے کی اجازت نہیں صرف صدر روزویلٹ نے اس قانون کو توڑا تھا لیکن صدر روزویلٹ انتہائی ہر دل عزیز انسان تھے۔ ولسن بھی دو مرتبہ امریکہ کے صدر چُنے گئے۔ ان کا پہلا دور ۱۹۱۲ سے ۱۹۱۶ تک اور دوسرا ۱۹۱۶ سے ۱۹۲۰ تک رہا۔ ان کی پہلی بیوی ۱۹۱۴ میں چل بسیں تو صدر کو انتہائی صدمہ ہوا۔ وہ جنگِ عظیم کا زمانہ تھا صدر ولسن نے اپنی بیوی کی موت پر کہا "خدا نے مجھے ایسا غم بخشا ہے جس کو برداشت نہیں کیا جا سکتا" تاہم اسے انسانی فطرت کی ستم ظریفی کہئے یا صدر کی خوش نصیبی کہ بیوی کی موت کے ناقابلِ برداشت سانحہ کے ایک ہی سال بعد وہ پھر کسی کے دامِ محبت میں گرفتار ہو گئے۔

دراصل یہ جال اُن کے ڈاکٹر نے پھیلایا تھا ان کے ڈاکٹر کو ان سے ہمدردی تھی۔ امریکہ کے صدر کا عہدہ بڑا کٹھن ہے۔ دنیا بھر میں وہ واحد شخص ہے جس کے اختیارات بہت وسیع ہیں۔ اسے بہت اہم فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ نہ صرف اپنے ملک کے مسائل بلکہ بین الاقوامی مسائل بھی اس کے فیصلہ کے محتاج ہوتے ہیں۔ ایسے وقت میں اس کے لئے ایک ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے جو دن بھر کی محنت و مشقت کے بعد اس کو ذہنی اور جسمانی سکون دے سکے — یہ ساتھی ایک بیوی کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔ اس لئے امریکہ کے لوگ ہمیشہ ایسے آدمی کو منتخب کرتے ہیں جو بیوی بچوں والا ہو اور جس کی شادی کامیاب ہو۔ صدر ولسن اتنے بڑے صدارتی محل میں اکیلے زندگی گذار رہے تھے۔ ان کے ڈاکٹر کو اس بات سے تشویش تھی اس لئے اس نے واشنگٹن میں ان کے لئے ایک بیوی کی تلاش شروع کر دی۔

ایڈیتھ بولنگ ڈاکٹر کی منگیتر کی سہیلی تھی، اس کی عمر ۴۲ سال تھی اور وہ بیوہ تھی۔ ڈاکٹر نے ایڈیتھ کا تعارف صدر کی بہن سے کرایا۔ صدر کی بہن ایڈیتھ کی سہیلی بن گئیں۔ جب صدر کی بہن نے ایڈیتھ کو ڈنر پر بلایا تو اس سے صدر کی ملاقات بھی ہو گئی۔ صدر ولسن اس کو دیکھتے ہی اس پر فریفتہ ہو گئے۔ دوسری ہی ملاقات میں صدر نے شادی کی تجویز پیش کر دی۔ ایڈیتھ نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے: میں صدر کی درخواست سُن کر حیران رہ گئی۔ میں نے ان سے کہا کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہو سکتی۔ ہماری ملاقات کو صرف ایک ہفتہ ہوا ہے۔ اس ایک ہفتہ میں تمہیں مجھ سے پوری واقفیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ تمہاری پہلی بیوی کو گذرے ہوئے ایک سال بھی تو نہیں ہوا" صدر نے جواب دیا "محبت کے لئے وقت کی قید نہیں محبت کو ہفتوں اور مہینوں کے پیمانے سے نہیں ناپا جاتا وہ دل کی گہرائیوں میں ہوتی ہے اور وقت کی قید سے بے نیاز ہوتی ہے۔" صدر نے مزید کہا "میرا ان کا عہدہ پبلک عہدہ ہے۔ میری ہر حرکت لوگوں کی نگاہ میں ہوتی ہے۔ اگر تم بار بار میرے گھر پہ آئیں تو لوگ باتیں بنائیں گے۔ اگر میں تمہارے گھر پہ جاؤں گا تو اس سے افواہوں کو اور تقویت ملے گی۔ میں نے ایمان داری سے اپنے دل کی بات اپنی بہن اور لڑکیوں کو بتا دی ہے۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں تنہائی اور افسردگی سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

ان کی بات چیت ایک گھنٹہ تک جاری رہی، لیکن ایڈیتھ کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکی۔ اس نے صدر سے کہا "اگر آپ اسی وقت میرا جواب ہاں یا نہیں میں چاہتے ہیں تو میرا جواب نہیں میں ہے میں دو ٹوک فیصلہ نہیں کر سکتی۔ مجھے سوچنے کے لئے وقت چاہئے۔" اس طرح یہ ملاقات ختم ہو گئی۔ صدر ولسن انتہائی افسردہ تھے۔ دوسرے روز صدر کی بہن نے ایڈیتھ سے کہا "تم نے میرے بھائی کو نا قابلِ

برداشت صدمہ پہنچا ہے۔ تم ان کی زندگی کی خوشیاں عطا کر سکتی تھیں، لیکن تم نے ان کا دل توڑ دیا۔ یہ سُن کر بھی ایڈیتھ کا دل نہ پسیجا، اس نے کہا "میں ولسن سے اس لئے شادی کرنا نہیں چاہتی کہ وہ دنیا کے سب سے بڑے عہدے پر سرفراز ہیں، اگر وہ معمولی آدمی ہوتے تو میں ان سے شادی کرنے میں نہیں جھجکتی۔ میں امریکہ کے صدر سے نہیں بلکہ ولسن سے شادی کرنا چاہتی ہوں مجھے ان کے عہدے کا کوئی لالچ نہیں، اگر وہ اگلے انتخابات میں ہار گئے تو میں ان سے شادی کرلوں گی شادی عہدے سے نہیں، آدمی سے کی جاتی ہے۔"

ایڈیتھ دُھن کی پکی تھی، وہ واشنگٹن سے باہر چلی گئی تاکہ صدر کی محبت کا امتحان لے سکے۔ وہ دو مہینے واشنگٹن سے باہر رہی۔ جب وہ واشنگٹن واپس پہنچی تو صدر نے اسے ڈنر کے لئے بلایا۔ اس ملاقات کا حال اسی کی زبانی سنیئے:

"میں جب وائٹ ہاؤس کے بلیو رُوم میں پہنچی تو صدر کو اپنا منتظر پایا۔ وہ ڈنر لباس میں بہت شان دار لگ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دئے میں نے اپنے ہاتھ ان کے ہاتھوں میں دے دئے۔ صدر نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا کہ میرا دل پگھل گیا مجھے محسوس ہوا جیسے میرے اندر کچھ ٹوٹ گیا ہے میں ان نظروں کی تاب نہ لا سکی، میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں اس شخص کے ساتھ دنیا کے دوسرے سرے تک جانے کے تیار ہوں۔"

ڈنر کے بعد دونوں موٹر میں سیر کے لئے روانہ ہوگئے۔ امریکہ کا صدر امریکہ کے لوگوں کی امانت ہوتا ہے۔ اس کی اپنی کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ وہ بازار میں تنہا نہیں جا سکتا۔ خفیہ پولیس کا آدمی ہر وقت سائے کی طرح اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس دفعہ بھی یہی ہوا۔ آگے کی سیٹ پر ڈرائیور اور خفیہ پولیس کا آدمی بیٹھا تھا پچھلی سیٹ پر صدر، ایڈیتھ اور اس کی سہیلی بیٹھی تھی۔ اتنے لوگوں کی موجودگی میں محبت کی باتیں کرنا مشکل کام تھا۔ لیکن صدر کو اس کی پروا نہ تھی۔ یورپ میں جنگِ عظیم اپنے عروج پر تھی۔ انگلستان اور فرانس، امریکہ پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کردے۔ امریکہ کے لوگ جنگ میں شمولیت کے خلاف تھے۔ صدر مخمصے میں گرفتار تھے۔ ان کے ذہن پر بوجھ تھا۔ اُنہوں نے ایڈیتھ سے کہا "میرے ذہن پر کام کا اتنا بوجھ ہے کہ میری کمر ٹوٹ رہی ہے۔ میں ذمے داری اکیلا نہیں سنبھال سکتا تم مجھ پر رحم کھاؤ اور میرا ہاتھ بٹانے کے لئے مجھ سے شادی کرلو" ایڈیتھ کی قوتِ مدافعت ختم ہوچکی تھی اس نے کار میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بانہیں صدر کی گردن میں ڈال دیں اور بولی، "تم نے اچھا کیا کہ مجھ سے شادی کا سوال کردیا ورنہ میں تم سے خود شادی کی تجویز پیش کرتی۔"

ان کی منگنی کا اعلان ۴ ستمبر ۱۹۱۵ کو ہوگیا لیکن اب ایک اور مصیبت کھڑی ہوگئی۔ واشنگٹن میں افواہوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ لوگوں نے کہنا شروع کردیا کہ صدر محبت کی پینگیں بڑھا رہے ہیں اور حکومت کے کام سے غفلت برت رہے ہیں مزید پریشانی اس وقت پیدا ہوئی جب ایک عورت مسز میری پیک نے اعلان کیا کہ "صدر ولسن کو مجھ سے محبت تھی۔ انہوں نے مجھے دو سو محبت نامے لکھے، اور سات ہزار پانچ سو ڈالر دئے۔" اس نے کہا کہ اگر صدر نے ایڈیتھ سے شادی کرلی تو وہ ان تمام محبت ناموں کو شائع کرادے گی۔ صدر نے جب یہ سنا تو ان کے ہوش اُڑ گئے۔ انہوں نے میری کو دو سو خط ضرور لکھے ہیں، لیکن ان خطوں میں کوئی ایسی ویسی بات نہیں۔ ان کی پہلی بیوی کو اس خط و کتابت کا علم تھا۔ اب رہی سات ہزار پانچ سو ڈالر کی بات تو وہ میری کو قرض کی شکل میں دئے گئے تھے۔ صدر کی سب سے زیادہ پریشانی اس بات کی تھی کہ ایڈیتھ ان افواہوں کو سُن کر کیا سوچے گی وہ اس کی بدنامی سے ڈرتے تھے۔ انہوں نے اپنے ڈاکٹر کے ذریعے اس کو کہلا بھیجا کہ وہ چاہے تو شادی کے وعدے سے سبک دوش ہوسکتی ہے۔ وہ ان حالات میں شادی پر مجبور نہیں کرسکتے۔ جب ڈاکٹر یہ پیغام لے کر اس کے پاس پہنچا تو ایڈیتھ نے اسے کوئی جواب نہیں دیا، صرف اتنا کہا کہ وہ خود صدر کو خط لکھے گی۔ ڈاکٹر واپس چلا گیا تو ایڈیتھ سوچ میں پڑ گئی۔ وہ گھنٹوں سوچتی رہی۔ یکایک اس کا ذہن صاف ہوگیا۔ اس نے فیصلہ کرلیا اور صدر کو خط لکھنے بیٹھ گئی، اس نے لکھا: "رات کی تاریکی ختم ہوگئی، صبح کا اُجالا پھیل گیا۔ مجھے افواہوں پر یقین نہیں مجھے اپنی محبت پر یقین ہے میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ میں ہر پریشانی اور مصیبت میں تمہارا ساتھ دوں گی۔"

ایڈیتھ کو اس خط کا کوئی جواب نہیں ملا جب دوسرے روز بھی کوئی جواب نہیں آیا تو وہ فکرمند ہوگئی۔ تیسرے روز صدر کا ڈاکٹر اس کے پاس آیا اور بولا "صدر کی طبیعت بہت خراب ہے۔ آپ براہِ مہربانی میرے ساتھ وائٹ ہاؤس چلئے۔" ایڈیتھ فوراً تیار ہوگئی۔ جب وہ وائٹ ہاؤس پہنچی تو صدر اپنے بستر پر لیٹے ہوئے تھے ان کا چہرہ زرد تھا۔ ان کی آنکھوں میں ایک ناقابلِ بیان افسردگی تھی۔ اُنہوں نے اپنا ہاتھ بڑھایا ایڈیتھ نے ان کا ہاتھ تھام لیا اور بولی "کیا آپ کو میرا خط مل گیا تھا؟" صدر نے صرف اتنا کہا "ہاں" اور خاموش ہوگئے۔

تین مہینے بعد ان دونوں کی شادی ہوگئی۔ شادی کے دوسرے روز وہ ہنی مون منانے کے لئے اپنے صدارتی کاٹیج میں گئے۔ یہ کاٹیج ورجینیا میں ہے۔ شام کو جب آتش دان میں آگ جل رہی تھی اور دونوں محبت کے متوالے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔ یکایک صدر بول اُٹھے: "ایڈیتھ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں، مجھ سے کچھ غلطی ہوگئی تھی، اس کا احساس میرے ذہن پر سوار رہتا ہے۔ آج میں اس غلطی کا اعتراف کرکے اپنا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔" یہ یہ کہہ کر انہوں نے جیب سے ایک لفافہ نکالا' لفافہ بند تھا۔ اس کی مہر سالم تھی۔ یہ وہی خط تھا جو ایڈیتھ نے تین مہینے پہلے انہیں بھیجا تھا۔ صدر نے کہا" میں بزدل نہیں ہوں لیکن جب مجھے یہ خط ملا تو مجھ پر گزشتہ شب بے خوابی سے تھکن طاری تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اتنی افواہیں سننے کے بعد تمہارا جواب نفی میں ہوگا۔ اسی لئے میں اس خط کو کھولنے کی جرأت نہ کر سکا۔ اب تم خود یہ خط کھولو۔ ایڈیتھ نے خط کھولا۔ دونوں نے اس کو مل کر پڑھا۔ صدر کو ایک ناقابلِ بیان سکون حاصل ہوا۔ انہوں نے ایڈیتھ سے درخواست کی کہ اس خط کو ضائع نہ کیا جائے۔

جنگِ عظیم جاری تھی۔ ۱۹۱۶ میں صدر ولسن دوبارہ منتخب ہوگئے تھے۔ ان کا انتخابی نعرہ تھا: 'ولسن نے امریکہ کو جنگ سے علیحدہ رکھا' یہ قدرت کی ستم ظریفی تھی کہ انہوں نے جس انتخابی نعرے کی مدد سے الیکشن جیتا تھا اُسے بعد میں خود ہی رد کرنا پڑا۔ اس طرح امریکہ ۱۹۱۷ میں جنگ میں شامل ہوگیا۔ جنگ جیتنے کے بعد ولسن نے لیگ آف نیشنز کی بنیاد ڈالی۔ وہ پیرس گئے اور اپنا پروگرام پیش کیا یورپ کے ممالک راضی ہوگئے لیکن یہ ولسن کی بدقسمتی تھی کہ خود ان کا ملک لیگ آف نیشنز میں شامل نہ ہوسکا۔ امریکہ کے لوگ علیحدگی پسند تھے۔ وہ یورپ کی خانہ جنگیوں سے دور رہنا چاہتے تھے یہ ولسن کی عزت کا سوال تھا۔ انہوں نے یہ پروگرام بنایا کہ وہ دس ہزار میل کا ریل کا سفر کریں گے اسے وِسل اسٹاپ سفر کہتے ہیں۔ ان کو ایک اسپیشل ٹرین میں جانا تھا۔ وہ جہاں چاہے اس ٹرین کو روک سکتے تھے اور ٹرین سے ہی عام لوگوں کو خطاب کر سکتے تھے۔ اس طرح وہ رائے عامہ ہموار کرنا چاہتے تھے۔ یہ سفر بہت صبر آزما تھا۔ ڈاکٹروں نے اُن کو بہت سمجھایا لیکن وہ نہ مانے۔ اس سفر میں ان کی بیوی ایک ڈاکٹر، دو درجن اخباری نمائندے اور آٹھ خفیہ پولیس کے سپاہی ان کے ساتھ تھے۔ اس ٹرین میں سات ڈبے تھے۔ ابھی انہوں نے سفر شروع ہی کیا تھا کہ وسط امریکہ میں پہنچ کر ان پر دل کا دورہ پڑ گیا چنانچہ سفر منسوخ کر دیا گیا اور ٹرین واشنگٹن پہنچ گئی۔

اب ولسن بیمار تھے۔ ان کے کمرے میں ڈاکٹروں اور نرسوں کی بھیڑ جمع رہتی۔ تمام امریکہ کی نگاہیں وائٹ ہاؤس پر تھیں۔ امریکہ کے لوگ اپنے صدر کے بغیر ایک گھنٹہ بھی نہیں رہ سکتے (صدر کینیڈی کے قتل کے ایک گھنٹہ کے اندر ہی صدر جانسن نے صدارت کا حلف اُٹھا لیا تھا، یہ تقریب ہوائی جہاز میں ہوئی تھی) یہ دَور امریکہ کے لئے بہت صبر آزما تھا۔ ان کی صحت کے بارے میں روزانہ بلیٹن شائع ہوتے ایڈیتھ ایک منٹ کے لئے بھی ان کے پاس سے نہ اُٹھتی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ایڈیتھ کو امریکہ کے صدر کا غیر سرکاری خطاب دیا گیا۔ وہ کسی کو صدر سے نہ ملنے دیتی۔ امریکہ کی حکومت ٹھپ ہوگئی۔ انگلستان کا نیا سفیر چار مہینے تک اپنے اسناد پیش کرنے کے لئے واشنگٹن میں ٹھیرا آخر نا اُمید ہو کر واپس چلا گیا۔ اس وقت امریکہ کی حکومت ایک معمولی عورت ایڈیتھ ولسن کے ہاتھ میں تھی۔ قانون اس بارے میں مجبور تھا صدر ولسن نے استعفیٰ نہیں دیا۔ نائب صدر ان کی موت یا استعفیٰ کے بعد ہی صدر بن سکتا تھا بعض لوگ کہتے کہ صدر کا دماغ خراب ہوگیا ہے ان کی کیبنیٹ کے وزرا پریشان تھے۔ وہ بار بار ان کے ڈاکٹر کو بلاتے اور اس سے صدر کی حالت کے متعلق پوچھ گچھ کرتے۔ ڈاکٹر بھی کوئی تسلی بخش جواب نہ دیتا۔ وزیروں کے استعفیٰ یا نئے سرکاری افسروں کا تقرر صدر کے دستخطوں سے عمل میں آتا ہے۔ یہ سب کام رک گئے۔ ایڈیتھ ہر سوال کا ایک ہی جواب دیتی" مجھے امریکہ کے صدر سے کوئی دلچسپی نہیں، مجھے صرف شوہر کی صحت کے بارے میں تشویش ہے" جب کوئی کاغذ صدر کو بھیجا جاتا ایڈیتھ اس کاغذ کو لے کر صدر کے بیڈ روم میں جاتی اور تھوڑی دیر بعد وہ کاغذ واپس لے آتی۔ اس کاغذ پر صدر کا حکم درج ہوتا یہ حکم عموماً پنسل سے لکھا ہوتا۔ ایڈیتھ کچھ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی۔ اسکول میں اس نے صرف دو سال پڑھا تھا۔ اس کا خط بچکانہ تھا۔ وہ بچوں کی طرح بڑے بڑے حروف میں لکھتی تھی۔

یہ دستور العمل سترہ مہینے تک جاری رہا سترہ مہینے کے بعد الیکشن ہوئے۔ صدر ولسن کو صدارت کے لئے نامزد نہیں کیا گیا۔ چنانچہ ۱۹۲۰ میں صدر ہارڈنگ منتخب ہوگئے۔ ولسن کا آدھا جسم مفلوج ہوچکا تھا۔ ان کا ایک ہاتھ کام نہیں کرتا تھا۔ ۱۹۲۴ میں ان کا انتقال ہوا ایڈیتھ ان دنوں ان کی خدمت اور بھی تندہی اور گرم جوشی سے کرتی رہی۔ جب وہ صدر تھے، کیوں کہ اسے امریکی صدر سے نہیں اپنے شوہر ولسن سے محبت تھی۔ ●●

نندنی ست پتھی



(اڑیا کہانی) جھکا ہوا آسمان

نرم نرم گھاس پر آہستہ آہستہ چہل قدمی کرنا واقعی بڑا پُر لطف مشغلہ ہے۔ صبح کو شبنم سے بھیگی ہوئی ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس ــــ اس کتنی جاں بخش ہوتی ہے۔ اس کا ٹھنڈا لمس کیسا سکون بخش ہے۔ گھاس کے سبز نازک بدن پر آدمی کے سخت پاؤں مسلسل ٹھوکر لگاتے رہے ہیں اس کے نتیجے میں جگہ جگہ گھاس نے اپنا دلکش سبز رنگ کھو دیا ہے۔ صرف رنگ ہی نہیں، کئی جگہوں پر تو گھاس نے اپنا وجود بھی گنوا دیا ہے۔ وہاں خشک بھوری مٹی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

لان کے درمیان ایک دو بڑے درخت بھی ہیں۔ چیت کی ہوا سے پتے گر رہے ہیں اور نئی نئی کونپلیں اُگ رہی ہیں۔ جو پُرانا ہے وہ کسی دن نیا تھا، موجود تھا، ہرا بھرا۔ لیکن آج وہ جا رہا ہے۔ آدمی کے پاؤں کی ٹھوکر سے جائے یا ہوا کی مار سے۔ ایک جھُر جھُر کی آواز کے ساتھ وہ اپنی دردناک داستان سُنا رہا ہے۔

گارڈن چیئر پر بیٹھ کر شانتو رائے گرتے ہوئے پتوں کی اس انوکھی رخصتی تقریب کو دیکھ رہا تھا۔ قریب کے کمرے میں شاید اس کی بیٹی انورادھا نے ریڈیو لگا دیا تھا۔ کوئی بنگالی گانے والی گا رہی تھی!

تو مار پرتم بیکا ہینیتے ریچے پڑے
تُومی نایکن۔ تومی نایکن
مُکت آمار نایکن

شانتو رائے نے ایک لمبی سانس لی۔

زندگی میں پہلی کامیابی اس کو مل چکی تھی ــــ سامنے والا لان، باغیچہ اور قطاروں میں لگے ہوئے رنگ برنگ کے گلاب کے پھول لمحہ بھر کے لئے جیسے غیر واضح ہو گئے ــــ اسے شہر کے مشہور بیوپاری شانتو بابو نے روکیوں رکھے ہیں؟

اپنے آپ سے یہی سوال پوچھ کر وہ احتیاط کے ساتھ چاروں طرف نظر دوڑانے لگا کسی نے دیکھ تو نہیں لیا؟ آج کل ایک انوکھا خوف اس کے دل میں بار بار آتا ہے۔ اس کے جذبات کو

کسی نے مجروح نہیں کیا؟ واقعی اس کے دل میں یہ بلا وجہ کا خوف کئی دن سے پیدا ہو رہا ہے۔ اسے بھول جانے کے لئے اس نے بہت کوششیں کی ہیں۔ پورٹیکو میں گاڑی کے ٹھہرنے کی آواز

آئی ۔ شاید سُکھدا گھر لوٹی ہے ۔ ہنسی خوشی اور چہکتی گفتگو سے لمحہ بھر میں ہی خاموش کوٹھی جاگ اُٹھی ۔ شانتو شاید اپنے دل کے ساتھ اس گھر کا مقابلہ کر رہا تھا ۔ کوئی اور دن ہوتا تو شانتو خود بھی کرسی چھوڑ کر اُٹھ جاتا ۔ اپنی بیوی اور دوستوں کا استقبال کرتا ۔ شاید گفتگو اور شور و غل میں بھی شریک ہو جاتا ۔ لیکن آج نہیں ۔ آج اس لان کی تنہائی میں بیٹھنا ہی اسے اچھا معلوم ہو رہا تھا کسی نے اُسے تلاش بھی نہیں کیا ۔ کمرے میں چائے اور کھانا پینا چلنے لگا ۔ سب کے کھانے پینے اور ہنسنے کی آواز آ رہی تھی ۔ ان جانے میں وہ شاید سکھدا کی طرف سے بُلائے جانے کا انتظار کر رہا تھا ۔ خاموش لیکن چوکسی کے ساتھ وہ اپنی کرسی پر بیٹھا تھا کسی پتے کے گرنے کی آواز آتی تو وہ چونک کر اُدھر دیکھنے لگتا ، ہاں ان جانے میں وہ سُکھدا کی طرف سے بُلائے جانے کا انتظار کر رہا تھا ۔

لیکن سُکھدا نہیں آئی ۔ شاید شانتو کی غیر موجودگی اُس نے محسوس ہی نہیں کی ہوگی یا سوچا ہوگا کہ شانتو کہیں باہر ہے ۔ ٹھیک ہے ایسا ہونا ممکن بھی تھا ۔ لیکن سکھدا کو تو اس بات کا پتہ تھا کہ اس وقت شانتو کبھی باہر نہیں نکلتا ۔

شانتو اس وقت لان میں بیٹھا بیٹھا سُکھدا کے بارے میں کیوں سوچ رہا ہے ؟ سکھدا کی باتیں گویا اس کے چاروں طرف گونج رہی ہوں حقیقی زندگی میں سب جگہ جیسے سُکھدا نے ہی گھیر لی ہو ۔ آگے پیچھے ، گھر باہر ، سب طرف سُکھدا سکھدا ہے ۔ اور اب شانتو کے تصور میں بھی وہ آ بیٹھی ہے ۔

سُکھدا کے خیال سے چھٹکارا پانے کے لیے شانتو نے بھرپور کوشش کی سُکھدا کی فکر سے شانتو کو اگر کوئی چھٹکارا دلا سکتی تھی تو وہ تھی کوئی اور ۔ لیکن اس نے اُسے نظر اُٹھا کر دیکھا بھی نہیں ۔ وہ تو دُور رہ گئی تھی —— بہت دُور ۔

"پتاجی !" شانتو چونک اٹھا ۔ ہاتھ میں چائے کے ٹرے لیے اس کی بیٹی انورادھا کھڑی تھی ۔ ارے ! کیا خوب انورادھا کا چہرہ ملکہ کے چہرے سے کس قدر ملتا جلتا ہے ۔ اچانک دونوں میں اس قدر گہری مشابہت دریافت کر کے شانتو حیران ہو رہا تھا ۔ پہلی مرتبہ جب اس نے ملکہ کو دیکھا تھا تو اس کی عمر اتنی ہی ہوگی جتنی اب انورادھا کی ہے ۔ اٹھارہ ، انیس سال کی لڑکی ، جس کے کپڑوں میں بھی سادگی تھی اور چہرے میں بھی لیکن اس کی خوب صورتی میں ایک انوکھی رعنائی تھی اسی لئے تو اسے چھونے کو بار بار جی چاہتا تھا ، لیکن چھونے کا حوصلہ کبھی نہیں ہوتا تھا ۔

انورادھا نے تپائی پر چائے کی ٹرے زور سے رکھ دی ۔ شانتو نے پھر سر اُٹھایا —— بے بسی آمیز غرور سے انورادھا کی آنکھوں میں آنسوؤں کی بوندیں ٹال مٹول کر رہی تھیں " ملی " بھی جب روٹھتی تھی تو ایسا ہی کرتی تھی ۔ وہ برابر مونہہ پھُلائے دیکھتی رہتی تھی مگر زبردستی اپنے آپ کو مسلط کرنے کی کوشش کبھی نہیں کرتی تھی ۔ آخر تک وہ اپنے کو مسلط نہیں کر سکی ۔ اب انورادھا لوٹ رہی تھی ۔ اسی طرح " ملی " بھی اُس روز لوٹ گئی تھی ۔ اسی طرح بے بسی آمیز غرور کے ساتھ اس کی سفید ساڑھی کے ہلکے ہلکے آنچل کے چھپنے تک شانتو اُسی کی طرف دیکھتا رہا ۔ بہت دُور تک دیکھتا رہا کہ شاید وہ واپس آ جائے ۔ شاید وہ شانتو کو ڈھونڈے ، اور جب اسے نہ پائے تو اور بھی بے بسی آمیز غرور کرنے لگے

شام کی تاریکی مزید گہری ہو گئی ۔ ستارے آسمان میں تاروں کی روشنی پھیل گئی ۔ چاروں طرف سے کوٹھی بھی روشن ہو اُٹھی ۔ شانتو کی کار کے دروازے کھلے رہے لیکن ملکہ نہ لوٹی ۔

شانتو زیر لب ہنس پڑا ۔ یہ ٹھیک ہے ، کہ ملکہ نہیں آئی ، لیکن مالتی ، لیلی ، چمپا چنبیلی وغیرہ تو آ گئی تھیں ، کتنے اُمیدواروں کو اس نے خالی ہاتھ لوٹا دیا تھا ۔ لیکن آج ایک سچے عاشق کی طرح وہ اس قدر خلوص کے ساتھ ملکہ کو کیوں یاد کر رہا ہے ؟ کیا اس کا دل اب بھی بھرا نہیں تھا ؟ سُکھدا جیسی خوب صورت ، سلیقہ شعار سگھڑ بیوی اسے ملی ہے ۔ روپیہ پیسہ ، مکان ، سونا وغیرہ جو کچھ انسان کے سُکھ کے لئے لازمی ہے سب اس کے پاس ہے ۔ یہ سب کچھ اس نے اپنی عقل اور ہمت سے حاصل کیا ہے مگر اس دوست کے ساتھ تو دل کا سکون اور بھی اُڑ گیا ہے ۔

شاید اس روز ملکہ نے بھی کچھ ایسی ہی بات کہی تھی ۔ ڈاک بنگلے کے عقب والے لان میں اچانک اس نے ملکہ کو دیکھا تھا بہت دن بعد مڈبھیڑ ہوئی تھی ملکہ نے ایک بید کی کرسی پر بیٹھ کر اپنی ٹانگیں دوسری کرسی پر رکھ دی تھیں اور آرام سے ایک اخبار پڑھ رہی ۔ شام کے ڈھلتے ہوئے سورج کی نازک روشنی میں عینک لگا کر بھی اخبار کے حروف پڑھنے میں اُسے کافی محنت کرنا پڑ رہی تھی ، اسی لئے شانتو کی [illegible] نہ کر سکی ۔

لیکن شانتو نے بغیر عینک کے بھی ، " کو پہچان لیا تھا ۔ اس نے محسوس کیا [illegible] سے پہلے کا شانتو اس کے جسم [illegible] وہ آگے بڑھا اور اس کے [illegible] بلا کر کہا " ملکہ ! تم ! "

ملکہ چونک اٹھی لیکن صرف لمحہ بھر کے لئے اس کے بعد سنجیدگی اور ضبط کے ساتھ وہ کرسی چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ اتنے دن کے بعد بھی اس کی خاموشی کی زبان سمجھنے میں شانتو کو کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ بیٹھ گیا۔ اب اس کا جوش ٹھنڈا ہو گیا تھا۔

اپنی کرسی کو ذرا سرکا کر ملکہ بھی بیٹھ گئی دھیمی آواز میں کہنے لگی "کب آئے شانتو؟ جیسے کچھ ہی دیر پہلے اس نے شانتو کو دیکھا ہو اور اور جیسے شانتو کے یہاں آنے میں حیرت کی کوئی بات ہی نہ ہو۔ شانتو ملکہ کو دیکھ کر اتنا حیران نہیں ہوا تھا جتنا اس کی یہ بات سن کر۔

انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر دونوں ہاتھوں کو اپنی گود میں رکھے۔ ملکہ بیٹھی تھی۔ یہ اس کے بیٹھنے کا ایک خاص انداز تھا۔ اس حالت میں بیٹھی ہوئی ملکہ کے ہاتھ اس نے کئی مرتبہ کھینچ لئے تھے۔ آج بھی ان جانے میں اس نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا لیکن ملکہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی شاید وہ فوراً ہٹ جانا چاہتی تھی۔

شانتو کا جی چاہا کہ وہ اسے روکے ہاتھ یا آنچل پکڑ کر اسے بٹھائے۔ لیکن اس نے جب سر اٹھا کر ملکہ کے چہرے پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے دو قطرے چمک رہے ہیں۔ کیا ملکہ نے اب تک اس کو یاد رکھا ہے۔ کیا وہ گزری ہوئی باتوں کے لئے آج بھی افسوس کرتی ہے؟ کیا اس کو بیتی باتیں یاد دلانے سے اسے چوٹ پہنچی؟ یہ ساری بات شانتو نے کبھی نہیں سوچی تھی۔ سوچنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ اس کی زندگی میں ملکہ جیسی [illegible] نہیں تھی لیکن ملکہ کی زندگی میں وہ اکیلا تھا بالکل اکیلا۔ وہ اچھی طرح یہ جانتا تھا اور

اس پر فخر بھی کرتا تھا اس لئے جس روز اس نے ملکہ کو واپس لوٹا دیا تھا، دل ہی دل میں ایک انوکھا سرور اور لطف محسوس کیا تھا۔

شام کی ہلکی تاریکی میں سفید ساڑھی پہنے۔ ملکہ سنگِ مرمر کی مورتی معلوم ہوتی تھی کاش وہ سچ مچ ایک مورتی بن جاتی پھر شانتو ضرور اسے اٹھا کر اپنے بیڈ روم کے کونے میں رکھ دیتا اور ہر روز جی بھر کے اسے دیکھ لیتا لیکن ملکہ نے گھونگھٹ کیوں نکال لیا ہے؟ کیا اس نے شادی کر لی ہے؟ کب شادی کی؟ کس سے؟

اب سنگِ مرمر کی مورتی نے حرکت کی۔ "شانتو، میں اس علاقے کے اسکولوں کا معائنہ کرنے آئی ہوں۔ میرا کام ختم ہو گیا ہے۔ میں کل ہی لوٹ جاؤں گی۔ لیکن اس دیہاتی علاقے میں تم کیسے آئے؟ کیا ادھر بھی تمہارا کچھ کاروبار ہے؟ ایک ہی سانس میں ملکہ نے اتنی ساری باتیں کہہ ڈالیں۔

شانتو مبہوت سا سُن رہا تھا، جیسے باتوں کے پھول جھڑ رہے ہوں۔ کچھ بھی نہیں بدلا ہے۔ سب کچھ ٹھیک ویسا ہے جیسے پہلے تھا تیس سال کا فاصلہ گویا سکڑ کر تیس منٹ بن گیا تھا وہ کس قدر بھولے اور قدرتی انداز سے بول رہی تھی!

اس روز ملکہ کے ساتھ اور کیا کیا باتیں ہوئیں۔ آج کچھ یاد نہیں آ رہا ہے۔ لیکن اس روز ملکہ کے لہجہ میں اس نے ایک عجیب مضبوطی محسوس کی تھی، جیسے وہ کہہ رہی ہو "میں اس قدر [illegible]

کس کے پاس فرصت ہے؟

اس کے بعد ملکہ وہاں نہیں ٹھیری۔ باہر کسی جگہ ڈنر تھا۔ اس نے سنا کہ ڈنر کے بعد ڈاک بنگلہ میں آکر ملکہ نے اپنا پروگرام بدل دیا تھا اور رات کی ٹرین سے ہی شہر چھوڑ چکی تھی۔ سب کا یہی خیال تھا کہ وہ کسی ضروری کام سے چلی گئی ہے۔ لیکن شانتو رائے نے جذباتی ملکہ کو اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ اس نے بہت دیر تک محسوس کیا کہ اس کی کوئی انوکھی چیز کھو گئی ہے۔

ڈرائنگ روم میں اب شور و غل سنائی نہیں دے رہا تھا۔ شاید شکھدا کے دوست گھر واپس چلے گئے ہوں گے۔ اور ادھر کے [illegible] میں بھی ریڈیو پر گانے نہیں گونج رہے تھے۔ شانتو اب اٹھنا چاہتا تھا، لیکن ایک انوکھی سی [illegible] محسوس کر رہا تھا۔ جیسے اس کا جسم بے حس و حرکت ہو گیا ہو۔ ملکہ اپنے کام کاج میں، اپنی دنیا میں مصروف ہے۔ شکھدا کا بھی یہی حال ہے لیکن اس کے بارے میں ذرا سا سوچنے سے [illegible] ہیں۔ انہوں نے اپنے اپنے معاملہ میں [illegible] کو ڈھال لیا ہے۔ انہوں نے زندگی کی [illegible] کر لی ہے۔ وہ زندگی کا پورا لطف لے رہے [illegible] لیکن شانتو؟ اس کے لئے زندگی کے [illegible] کیوں اتنی جلدی ختم ہو گئے؟

شکھدا کمرے میں آ [illegible] سے پوچھ رہی تھی [illegible]

عطیہ ناز

نظر کمزور ہونے سے بچائیے

آنکھیں جسم کا سب سے نازک اور اہم حصّہ ہوتی ہیں۔ ان ہی کے سہارے ہم قدرتی مناظر اور دنیا کی ساری رنگینیوں کا لُطف اٹھاتے ہیں، لیکن ایک تازہ ترین سروے سے پتہ چلا کہ دنیا کے پچیس فی صد لوگ آنکھوں کے کسی نہ کسی مرض سے دوچار ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان میں ۱۹۷۵ میں اٹھارہ لاکھ لوگ اندھے تھے، اور ایسے لوگوں کی تو تعداد کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے جو آنکھوں کے مختلف چھوٹے بڑے امراض میں مبتلا ہیں۔ امریکہ کی ایک سائنسی تحقیق کے مطابق مناسب اور متوازن غذا نہ ملنے کی وجہ سے بچوں میں اندھے پن کا مرض تیزی سے پھیل رہا ہے۔

نظر کم زور ہونے کی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ان میں سے ایک اہم وجہ متوازن اور مناسب غذا نہ ملنا ہے۔ دوسری وجہوں میں زیادہ چٹپٹے اور زیادہ مسالے دار کھانے، ثقیل غذا، نشیلی چیزوں کا استعمال، زیادہ سنیما یا ٹیلی ویژن کا دیکھنا شامل ہے۔ ذہنی طور پر پریشان رہنا، زیادہ لکھنا پڑھنا، بہت تیز یا بہت ہلکی روشنی میں لیٹ کر پڑھنا، دھوئیں یا گرد غبار کے ماحول میں رہنا، کم سونا اور ہر وقت دھوپ کا چشمہ استعمال کرنا بھی آنکھوں کے لئے نقصان دہ ہے۔

نظر کم زور ہونے کا مطلب ہے وٹامن "اے" کی کمی۔ اس لئے غذا اور خوراک کا انتخاب اس طرح کرنا چاہئے کہ وٹامن اے جسم کو مناسب مقدار میں ملتا رہے۔ یہ وٹامن عموماً دودھ، گھی، انڈے، تازہ سبزی، اور پھلوں میں زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ



دلچسپ حقیقتیں

گاجر، خربوزہ، ٹماٹر اور سنترے میں بھی یہ وٹامن موجود ہوتا ہے۔ وٹامن اے کے ساتھ وٹامن بی اور سی کا بھی ہونا بہت ضروری ہے۔

قبض کی بیماری آنکھوں کے لئے بے حد مضر ہے۔ قبض رہنے سے آنکھوں کی قدرتی چمک معدوم ہونے لگتی ہے اور آنکھیں پیلی پڑ جاتی ہیں۔ اس لئے کوشش کرنا چاہئے کہ آپ کو قبض کی شکایت نہ رہے۔

آنکھوں کو محفوظ رکھنے اور نظر کو کم زور ہونے سے بچانے کے لئے بہت تیز اور بہت دھیمی روشنی میں پڑھنے کی عادت ترک کیجئے۔ لیٹ کر یا چلتی بس یا گاڑی میں بھی نہیں پڑھنا چاہئے۔ بھرپور اور مکمل نیند لیجئے روزانہ صبح کو آنکھوں پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ماریئے، غسل کرتے وقت آنکھوں کو کھولنا اور بند کرنا بھی بے حد مفید ورزش ہے۔ شہد بھی کبھی کبھی آنکھوں میں لگا لینا مفید ہے۔

صبح سویرے شبنم سے بھیگی ہوئی گھاس پر ٹہلنے کی عادت ڈالئے۔ اس سے دماغ اور آنکھوں کو تراوٹ اور فرحت حاصل ہوتی ہے۔ سرسبز مقامات پر گھومنا آنکھوں کے لئے بہت عمدہ ورزش ہے۔

رات کو دودھ کے ساتھ دو تولہ پسا ہوا دھنیا اور شکر برابر کی مقدار میں ملا کر استعمال کیجئے، اس سے دماغ تقویت پاتا ہے اور آنکھوں کی روشنی بھی بڑھتی ہے۔

جہاں تک ہو سکے، دھوپ کے چشمے کا استعمال متواتر نہ کیجئے۔ اس عادت کا بھی آنکھوں کی قدرتی روشنی اور چمک پر بُرا اثر پڑتا ہے۔

آنکھیں قدرت کا بیش بہا عطیہ ہیں۔ اور اُن کی طرف سے بے پروائی برتنا یا ان کے بارے میں غافل رہنا آپ کو اس بیش بہا عطیہ سے محروم کر سکتا ہے۔

یہ سچ ہے

فرانس کے ایک زنانہ ہسپتال میں مچلے نام کی ایک عورت داخل ہوئی۔ اُس کے آٹھ پونڈ کی ایک لڑکی پیدا ہوئی —— یہ اُس کی تیئسویں اولاد تھی۔ اُس کے تیرہ لڑکے اور دس لڑکیاں پوری طرح صحت مند ہیں۔

فرانس کے عوام نے مچلے نام کی اس عورت کا شاندار استقبال کیا، کیوں کہ اپنی ازدواجی زندگی میں صحت مند رہتے ہوئے اُس نے ۲۳ بچوں کو جنم دیا ہے۔ ان بچوں کو فرانس کے سابق وزیر اعظم ایم رینی کوٹ کے وسیلے سے ہر ماہ بہت سے تحائف دیئے جاتے ہیں۔

اسی طرح روس میں ایک عورت نے ۵۷ بچوں کو جنم دیا تھا۔ یہ بچے تین تین اور چار چار کی گنتی میں ایک ساتھ پیدا ہوئے تھے۔ تمام بچے صحت مند رہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وہ عورت اپنے شوہر کی دوسری بیوی تھی۔ پہلی بیوی سے بھی شوہر کے ۱۵ بچے موجود تھے۔ اس طرح اُن کے یہاں کُل ۷۲ بچے موجود تھے!

ماسکو کی ہی ایک اور عورت مسز فیڈر کے ۸۸ بچے پیدا ہوئے تھے۔ ان میں سے ۶۲ بچے بڑے ہو کر سرکاری عہدوں پر ملازم ہوئے —— مسز فیڈر کا خاندان ماسکو میں سب سے بڑا خاندان مانا جاتا ہے۔

۱۹۲۱ میں میکسکو میں ایک عورت کے ایک ساتھ آٹھ بچے پیدا ہوئے تھے۔

اس سے بھی حیرت انگیز واقعہ ایک چینی عورت کا ہے۔ اس کے یہاں ایک ساتھ سات لڑکے اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔

امریکہ میں ایک عورت کے ۲۲ پونڈ کا بچہ ہوا۔ اتنے تندرست بچے کی پیدائش کا ریکارڈ آج تک کوئی عورت نہیں توڑ سکی۔

۱۹۵۳ میں سڈنی کی ایک عورت کے یہاں ایک لڑکی کی پیدائش کے ٹھیک ۶۳ دن بعد دوسرا بچہ پیدا ہوا۔ دنیا میں اب تک اتنے کم عرصہ میں دوسرے بچے کا پیدا ہونے کا یہ ایک انوکھا واقعہ ہے۔

●●

ٹاٹ کا پیوند

ڈاکٹر شبیر صدیقی



حویلی کو دیکھتے ہی مجھے امی جان کے کہے ہوئے الفاظ یاد آنے لگے: "میرا اِن حویلی والوں سے کبھی کوئی واسطہ نہیں رہا۔ پھر بھی میں خون کو خون سے جدا نہیں کر سکتی۔ تم اپنی مرضی سے اپنے چچا ابا اور چچی اماں کی خیریت معلوم کرتے رہا کرو۔"

نواب حشمت بیگ کی حویلی اب صرف نام کی حویلی رہ گئی تھی۔ اس کا رنگ روپ اور شان و شوکت وقت کے ساتھ سب کھنڈر میں بدل گیا تھا۔ اس شان دار حویلی کی اینٹیں بھی اب دھیرے دھیرے چچا ابا کے ہاتھوں بکنے لگی تھی۔ حویلی کے بجھتے ہوئے چراغ میں صرف میرے چچا ابا نواب نصرت بیگ بچے تھے۔ انہیں ورثے میں صرف دس پیڑوں کا ایک آم کا باغ اور تین مکان ملے تھے۔ یا پھر یہ حویلی تھی۔ مکانوں میں کرائے دار بھی اتنے پرانے تھے کہ ان سے وصول ہونے والے کرائے سے بس واجبی گزارا کیا جا رہا تھا۔

تانگہ حویلی کے سامنے آ کر رُک گیا۔ حویلی کے بلند دروازے کے بعد ایک ڈیوڑھی تھی۔ ڈیوڑھی کے بعد دو بوسیدہ سے کمرے نظر آ رہے تھے۔ چچا ابا ڈیوڑھی میں بیٹھے شطرنج کھیل رہے تھے۔ شطرنج چچا ابا کا محبوب مشغلہ تھا۔ وہ سارے سارے دن اپنے دوستوں کے ساتھ شطرنج کھیلتے رہتے۔ وضع قطع اور بات چیت سے کبھی کوئی دوست چچا ابا کی پریشانی کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ چاہے گھر میں فاقہ ہو یا چچی اماں کی طبیعت ناساز ہو، مگر چچا ابا اپنی خاندانی روایت کو قائم رکھتے ہوئے ہمیشہ سب سے مسکرا کر خندہ پیشانی سے پیش آتے ـــــ اور سارا دن باہر ڈیوڑھی میں بیٹھ کر گزار دیتے۔

اچانک حویلی کے سامنے تانگے کو رکتے اور

مجھے آتے دیکھ کر چچا ابا جان چلتے چلتے رُک گئے۔ اور اُٹھ کر حیران حیران سے تلنگے کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ "چچا ابا" کہتے ہوئے میں اُن سے لپٹ گیا۔

چچا ابا مجھے اپنے سینے سے لگا کر بازوؤں میں بھینچتے ہوئے بولے "ارے بیٹا جاوید! اتنی مدت کے بعد تمہیں آج کیسے اپنے چچا ابا کا خیال آ گیا!" کہتے ہوئے چچا ابا کی آواز بھرا گئی۔

میں چچا ابا کے ساتھ ڈیوڑھی سے ہوتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ چچا ابا چچی اماں کو آواز دیتے ہوئے بولے "اجی بیگم صاحبہ، دیکھئے کون آیا ہے؟"

چچی اماں اپنے کمزور جسم پر زور دیتے ہوئے ایک دم اُٹھ بیٹھیں اور میری طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے بولیں "ارے تم؟ تم کیسے بغیر اطلاع دئے ایک دم آ گئے؟"

میں چچی اماں کے پاس ہی بیٹھ گیا اور ان کے ہاتھ کو بوسہ دیتے ہوئے بولا "اماں آپ کا مزاج کیسا ہے؟"

چچی اماں ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بڑے درد بھرے لہجے میں بولیں "بیٹے، جو حال ہے بس تیرے سامنے ہے۔ زندگی کے دن گن رہی ہوں۔ خدا جانے وہ کب اپنی بارگاہ میں بلائے گا۔ اب تو ایک ایک پل جینا مشکل ہو گیا ہے"

میں نے چچی اماں کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا "کیسی باتیں کرتی ہیں آپ؟ خدا سے خیر کی دعا کیجئے سب ٹھیک ہو جائے گا"

پھر میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک طرف چھوٹی سی نماز پڑھنے کی چوکی جس پر پرانے زمانے کی ایرانی جانماز اور تسبیح رکھی تھی۔ پاس ہی وضو کرنے کے لئے مٹی کا لوٹا پانی سے بھرا رکھا تھا۔ ایک طاق میں دواؤں اور ٹانک کی شیشیاں رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے طاق کے قریب جا کر گولیوں کی ایک شیشی اٹھا کر پوچھا۔ "چچی اماں علاج سے تو کافی فرق پڑ گیا ہوگا؟"

چچی اماں پیروں کی سوجن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں "بیٹا بڑھاپے کی گٹھیا ہے۔ اب کیا آرام ہوگا؟ ہاں دوا کھاتی ہوں تو چین پڑ جاتا ہے"۔

اتنے میں چچا ابا خود ہی اپنے ہاتھوں سے پان لگانے میں مشغول ہو گئے تھے۔ انہوں نے پان مونہہ میں رکھا اور انگلی سے قوام چاٹتے ہوئے کہا "بیگم، میں جا رہا ہوں۔ لوگ باہر بیٹھے ہیں۔ آپ جاوید میاں کے لئے کھانے کا انتظام کرا دیجئے گا"

چچی اماں کچھ چڑ کر بولیں "میں کہتی ہوں اس موئی شطرنج نے کبھی پیچھا چھوٹے گا کہ نہیں؟ رات ہو یا دن، ہر وقت بیٹھی پھیلائے رہتے ہو" پھر اپنے آپ کو کوستے ہوئے بولیں "جانے اس حویلی والوں پر ابھی اور کتنی لعنتیں برسیں گی۔ رات ہونے کو آ گئی ہے، مگر ڈیوڑھی پر بیٹھی پھیلا رکھی ہے۔ اسی لئے تو ساری برکتیں اُڑ گئی ہیں۔ فرشتے بھی تو ایسے گھر میں نہیں داخل ہوتے"

چچی اماں بڑبڑاتی رہیں، مگر چچا ابا مسکرا کر خاموشی سے باہر نکل گئے۔ جیسے یہ سب کچھ سننا اُن کے معمول میں شامل ہو۔

پھر چچی اماں نے اسی طرح تنے ہوئے چہرے کے ساتھ میرے والدین کی خیریت معلوم کی "تمہاری امی کیسی ہیں؟ ابو کی طبیعت ٹھیک رہتی ہے نا؟" پھر خود ہی شکوہ کرتے ہوئے بولیں "تم تو خیر ایک زمانے کے بعد دیکھنے کے لئے آ بھی گئے، تمہارے والدین کو کہاں اتنی فرصت ہے جو کبھی خیریت کا خط ہی ڈال دیتے" پھر ایک لمبی سانس لے کر بڑبڑائیں "اب تو زمانہ ہی بدل گیا ہے۔ سب کے خون سفید ہو گئے ہیں۔ بھائی کو بھائی سے لگاؤ نہیں رہا"

میرا بہت جی چاہا کہ صاف صاف جواب دوں، "رشتہ تو آپ نے ہی ختم کیا ہے چچی اماں ابو کو اپنی مرضی سے شادی کرنے کی اتنی بڑی سزا آپ ہی لوگوں نے دی ہے۔ آپ نے انہیں دودھ کی مکھی کی طرح الگ کر دیا، اب آخر وقت میں کسی کی بیماری اور موت میں تھوڑا بہت آنا جانا ہو بھی گیا تو کیا وہ زخم بھی بھر گئے جو آپ لوگوں نے دئے ہیں" مگر میں نے پرانی باتوں کو کریدنا مناسب نہ سمجھا اور ابو کی طرف سے وکالت کرتے ہوئے کہا "چچی اماں، آپ تو خواہ مخواہ دل میں میل رکھتی ہیں۔ ابو نے ہی تو مجھے آپ کی خیریت معلوم کرنے کے لئے بھیجا ہے"

چچی اماں ناگواری سے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے بولیں "لو اب تو تم بھی بولنے لگے! ماشا اللہ!"

میں نے محسوس کیا کہ مسلسل بیماری سے چچی اماں کا مزاج کچھ زیادہ ہی چڑچڑا ہو گیا ہے۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھا اور خاموشی سے حویلی کا جائزہ لینے کے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ یہاں چچی اماں کی جوان بیوہ بیٹی ریحانہ لالٹین کی ہلکی ہلکی روشنی میں کرتے کاڑھ رہی تھی۔ اس کے کھلے ہوئے سنہرے چمکیلے بال شانوں پر لٹک رہے تھے۔ جوانی کی ہلکی ہلکی سُرخی لالٹین کی روشنی میں سونے کی طرح دمک رہی تھی۔

میں ریحانہ کے قریب پہنچ کر چند لمحہ بالکل ساکت کھڑا رہا، پھر ہلکی سی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا "آداب عرض کرتا ہوں"

ریحانہ نے چونک کر میری طرف دیکھا اور گھبرا کر کُرتے کو اپنے پیچھے چھپاتے ہوئے پاس پڑے ہوئے دوپٹہ کو اپنے سینے پر ڈال لیا۔ پھر خود بھی مسکراتے ہوئے بولی "آپ کب آ گئے؟" پھر اس

نے اپنے آپ کو پلنگ کے ایک طرف سمیٹتے ہوئے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

میں وہیں بیٹھ گیا اور اسی طرح مسکراہٹ کے ساتھ میں نے خیریت معلوم کی "آپ تو خیریت سے ہیں؟"

"شکر ہے خدا کا ——— آپ کب آئے؟ چچا جان، چچی جان خیریت سے ہیں؟" ریحانہ نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

"جی ہاں سب خیریت سے ہیں۔ چچی اماں کی بیماری سے فکر مند ہو کر ابو نے خیریت معلوم کرنے کے لئے مجھے بھیجا ہے۔" اتنا کہنے کے بعد میں کچھ دیر ریحانہ کی طرف بغور دیکھتا رہا۔ ریحانہ کے خوب صورت چہرے پر اُداس مسکراہٹ، سینے پر پڑا ہوا سفید دوپٹہ، بغیر چوڑیوں کے سُونی سُونی نازک کلائیاں ——— مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے چمن کو بے دردی سے نوچ دیا گیا ہو۔ میں درد بھرے لہجے میں بولا "ایک وہ وقت تھا جب میں نے آپ کو سولہ سنگار کئے ہوئے دلہن بنا دیکھا تھا۔ آج یہ وقت ہے کہ آپ کو درد کی تصویر بنا دیکھ رہا ہوں۔"

ریحانہ میری بات کا جواب نہ دے سکی۔ بس اس کی بوجھل بوجھل پلکوں سے آنسو ٹپکتے رہے۔ اور وہ انہیں خاموشی سے دوپٹہ کے آنچل سے پونچھتی رہی۔ اور میں انہیں آنسوؤں کی مالا گوندھتے ہوئے اکیلا چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

میں رات گئے تک چچا ابا اور چچی اماں سے باتیں کرتا رہا۔ چچا ابا اپنی عادت کے مطابق ایک ٹھیرے ہوئے تالاب کی طرح ساکت بیٹھے رہے مگر چچی اماں بار بار اپنی دُکھ بھری کہانی سُناتی رہیں۔ چچی اماں اپنی بربادی کی کہانی سُناتے وقت دوسروں کو ہی مجرم ٹھیراتیں..... "جب تک زر، زیور، جائیداد تھی، سب کے سب جونک کی طرح لپٹے خون چوستے رہے۔ اب جب کہ حویلی کے بہار کے دن ختم ہو گئے ہیں، سب سُوکھے پتوں کی طرح جھڑ جھڑ کر آنکھوں سے اوجھل ہو گئے....."

ریحانہ خاموش بیٹھی ایک طرف کُرتے میں کام بنا رہی تھی۔ چچی اماں کو یاس بھری گفتگو کرتے دیکھ کر ایک دم چچی اماں سے کہنے لگی "امی! آپ نے اس وقت کی دوا کھالی؟"

چچی اماں اپنی کمزور یادداشت پر جھنجھلاتے ہوئے بولیں۔ "اُف! اب تو ایک پل کی بھی بات یاد نہیں رہتی۔ نماز کے بعد خیال آیا تھا کہ دوا کھاؤں گی، لیکن پھر بھول گئی۔"

ریحانہ نے اُٹھ کر دوا کی گولیاں اور تازہ پانی چچی اماں کو دیا۔ چچی اماں نے پانی کے ساتھ گولیاں حلق میں اُتار لیں۔ اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔ "اس بے چاری کے دَم کا ہی سہارا ہے۔ ہر وقت خیال رکھتی ہے میرا۔ اس کی خدمت کی وجہ سے کچھ دن شاید اور جی لوں، ورنہ اِس مُوذی مرض نے تو آپا بیج ہی کر کے ڈال دیا ہے۔"

میں چچی اماں کی بات کاٹتے ہوئے بیچ میں بول اُٹھا "آپ کیوں ہر وقت ایسی باتیں کرتی ہیں۔ بیماری ہے۔ آئی ہے تو چلی بھی جائے گی۔"

ریحانہ بھی اپنی امی کی شکایت کرنے کے انداز میں بولی "امی کو تو بس بدشگونی کے ہی الفاظ نکالنے کی فرصت رہ گئی ہے۔" مگر چچی اماں اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولتی رہیں "ہم لوگوں کی بدنصیبی کا سایہ تو تجھے بھی لے ڈوبا۔ ہائے! خدا دشمن کو بھی یہ دن نہ دکھلائے۔" پھر دوپٹہ کے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگیں "بیٹا! اب تو بس یہی آخری آرزو ہے جو دل کو ستا رہی ہے کہ میرے جیتے جی کہیں عزت سے بے چاری کا رشتہ ہو جاتا۔"

میں نے حیرت سے پوچھا "آپ ریحانہ کا کہیں رشتہ کرنا چاہتی ہیں، چچی اماں؟"

"ہاں بیٹا، سوچتی تو ہوں کہ کہیں خاندانی لڑکا مل جائے تو رشتہ کر دوں۔ بھری جوانی کا بوجھ کب تک اٹھاتے رہے گی اس طرح۔"

میں نے ریحانہ کی طرف دیکھا تو وہ خاموشی سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر چچی اماں اور چچا ابا کو خدا حافظ کہہ کر آرام کرنے کے لئے اس کمرے میں چلا گیا جہاں میرے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔

دو دن بعد میں نے واپس جانے کی تیاری شروع کی تو اشاروں اشاروں میں ریحانہ نے کچھ دن اور ٹھیرنے کے لئے اصرار کیا۔ مگر گھر کی مالی حالت اور مہنگائی میں پیش آنے والی تکلیفوں کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے مزید رُکنا مناسب نہیں سمجھا۔ اور ضروری کام کی مجبوری ظاہر کر کے روانگی کی تیاری کر لی۔

ساری تیاری کرنے کے بعد میں چچی اماں کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ چند لمحوں بعد میں نے دل میں اُتر جانے والی ہمدردی کا لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "چچی اماں، اس حویلی پر جو گردشیں آئی ہیں اس کا مجھے بہت صدمہ ہے۔ اس کے ساتھ مجھے آپ کی پریشانیوں کا بھی احساس ہے....."

چچی اماں خاموش بیٹھی رہیں۔ بس ایک مرتبہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں "ہاں بیٹا، اب تو خدا ہی مشکل دُور کرنے والا ہے۔"

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ گفتگو کا

سلسلہ جاری رکھتے ہوئے پھر کہنا شروع کیا " میں۔ میں ـــ چاہتا تھا ... " کہتے کہتے میری آواز اندر ہی ڈوب کر رہ گئی ۔ چچی آماں کے چہرے پر ہلکی سی بے چینی نمودار ہو گئی ۔ پھر وہ ہمت بندھاتی ہوئی بولیں ۔ " کہو کہو ، کیا کہنا چاہتے ہو ؟ "

میں نے اپنے حواس کو یکجا کرتے ہوئے بہت سنبھلے ہوئے انداز میں کہا " میں چاہتا ہوں کہ امی اور آپ لوگوں میں ایک مدت سے جو رنجش چلی آرہی ہے اُسے اب ختم ہو جانا چاہئے۔ اس کے لئے میں ... "

چچی آماں میری بات کاٹ کر اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولیں " تم اب کوئی ننھے بچے تو رہے نہیں ہو۔ نہ تم سے کچھ چھپا رہا ہوگا۔ چھوٹے نواب (میرے والد) نے خاندان کی روایت کے خلاف شادی کر لی تھی ۔ یہ اس زمانے میں بڑی معیوب بات تھی ۔ اب تو خیر زمانہ ہی بدل گیا ہے۔ اسی وقت غصے میں ریحانہ کے دادا میاں نے تمہارے والد کو حویلی سے نکل جانے کو کہہ دیا تھا ، اور جب ہی سے چھوٹے نواب کا ہم لوگوں سے ملنا جلنا ختم ہو گیا تھا ۔"

میں بیچ میں بول اٹھا ۔ " اسی لئے تو میں چاہتا ہوں چچی اماں کہ اس نفرت کو اب ختم ہو جانا چاہئے ۔ اب نہ وہ پرانے لوگ رہے نہ وہ پرانی باتیں۔ اور نہ وہ شان و شوکت ۔"

چچی اماں آج پہلی بار اپنے چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بولیں " تو کیا تم کوئی فارمولہ لے کر آئے ہو ؟ "

میں نے ہمت کر کے کہہ دیا ۔ " جی ۔"

چچی اماں نے ایک دم سوال کیا " کیا ؟ "

" میں چاہتا ہوں کہ اپنائیت کا رشتہ ایک بار پھر مضبوط ہو جائے ۔ اس لئے میں ریحانہ کے لئے اپنا پیام دینا چاہتا ہوں ۔" میں نے ایک ہی سانس میں سب ہی کچھ کہہ دیا۔

" کیا ـــ ؟ " چچی اماں کا چہرہ اچانک سُرخ ہو گیا اور ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی ۔ اس کی جگہ ہونٹ غصے سے تھر تھرانے لگے ۔ " تمہاری یہ جرأت کیسے ہوئی جاوید ۔ شاید تم لوگ وقت سے فائدہ اٹھا کر مجھ سے انتقام لینا چاہتے ہو ۔ مگر جا کر کہہ دینا چھوٹے نواب سے اور اپنی ماں سے کہ ہم بربادی اور بدحالی کا شکار ضرور ہو گئے ہیں ، مگر ہماری رگوں میں ابھی نواب خاندان کا خون دوڑ رہا ہے ، جو ابھی مُردہ نہیں ہوا ہے ۔ ہم اپنے آپ کو فنا تو کر سکتے ہیں ، مگر اپنے ضمیر کو نہیں بیچ سکتے ۔ "

چچی اماں اسی طرح غصے میں پھنکارتے ہوئے بولیں " جاؤ ، ابھی اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ۔ میں مخمل میں ٹاٹ کا پیوند ہرگز نہیں لگا سکتی ۔ "

یہ کہتے ہوئے چچی اماں کی سانس پھولنے لگی اور انہوں نے نفرت سے مونہہ پھیر لیا۔

میں چند لمحے بیٹھا چچی اماں کو حیرت سے دیکھتا رہا کہ یہ جھوٹی شان کے پجاری ، انسان کو انسان سے اتنی نفرت سے دیکھنے والے لوگ ابھی اور کتنی بربادی کی منزلیں طے کریں گے ۔

میں جیسے ہی چلنے کے لئے اُٹھا ، میں نے محسوس کیا کہ سامنے ریحانہ کھڑی جانے کب سے بڑی اُداس نظروں سے مجھے گھور رہی تھی ۔ میں نے نظر بھر کر جیوں ہی اُسے دیکھا تو اس کی آنکھوں سے آنسو اُبل پڑے ۔ مجھے ریحانہ کی درد بھری زندگی سے بہ [illegible] ۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میرا دل بھی بھر آیا ۔ میں نے ریحانہ کے پاس پہنچ کر ہمدردی بھرے لہجے میں کہا " میں جا رہا ہوں ریحانہ ـــ مجھ سے اَن جانے میں جو غلطی ہو گئی ہے ، اس کی معافی چاہتا ہوں ۔"

ریحانہ نے اچانک میرے کندھے پر سر رکھ دیا اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ۔ سسکیوں سے بھری آواز میں اُس نے نہ جانے کیسے ہمت کر کے صرف اتنا کہا ۔ " مجھے اس جہنم سے نکال لو جاوید ۔"

میں نے جذبات بھرے لہجے میں سوال کیا " مگر کیسے ؟ "

" ایک بار ابو سے بات کر کے دیکھو وہ اتنے سنگ دل نہیں ہیں اور نہ وہ اپنے اندر اس حد تک خاندانی بُغض رکھتے ہیں ۔"

میرے قدم دھیرے دھیرے چچا ابا کی طرف بڑھتے گئے ۔ وہ ڈیوڑھی میں بیٹھے ہوئے دوستوں کے ساتھ شطرنج کھیل رہے تھے ۔ میں کچھ دیر خاموش اُن کے پاس کھڑا رہا ۔ وہ اتنی دیر میں کئی بار مات کھا چکے تھے ۔ اچانک انہوں نے ایک سرسری سی نظر مجھ پر ڈالی تو میں نے ڈرتے ڈرتے اُن سے کہا " چچا ابا ، میں جا رہا ہوں ۔"

میرا خیال تھا کہ وہ مجھے رخصت کرنے کے لئے اُٹھیں گے یا رُکنے کے لئے اصرار کرتے ہوئے اندر لے جائیں گے تو میں ریحانہ سے رشتے کی بات کروں گا ، مگر ایسا نہیں ہوا ۔ چچا ابا اپنے آپ کو مات بچانے کے لئے مہروں میں اُلجھے رہے اور بڑی بے پروائی سے بغیر میری طرف دیکھے ہوئے بولے " سب کو دُعا کہنا ۔ وقت ملے تو کبھی کبھی آجایا کرو ۔" کہہ کر وہ پھر شطرنج کے مہروں میں کھو گئے ۔

چچا ابا کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ میرے اندر نفرت کی اینٹ بن کر دیوار چنتا گیا ـــ اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ چالیں چچا ابا چل رہے ہیں ، مگر زندگی سے مات میں کھا رہا ہوں۔

ترکِ تعلقات کے بعد

میں نے ترکِ تعلقات کئے
جاں کی بازی نہیں لگاؤں گا
اب نہ سوچوں گا تیرے بارے میں
تیرے اِک خوش نما اشارے میں

اب نہ دیکھوں گا تیری جانب میں
اب نہ چھیڑوں گا دل کے تاروں کو
تاکہ تجھ سے مجھے محبت ہو
تاکہ آواز کی ضرورت ہو

تجھ سے وابستہ جتنی یادیں ہیں
گھونٹ دوں گا گلا میں ارماں کا
دِل سے اپنے انہیں بُھلا دوں گا
نقشِ اُلفت کو بھی مٹا دوں گا

تُو نے وہ خط مجھے جو بھیجے تھے
آج اُن کو بھی میں جلا دوں گا
اب بھی محفوظ ہیں کتابوں میں
آ سکے تُو نہ میرے خوابوں میں

مجھ کو اِس تلخ زندگی کی قسم
مُسکرا کر جیوں گا اب میں بھی
اب نہ میری یہ آنکھ نم ہوگی
شام کوئی نہ وقفِ غم ہوگی

شکل تیری جو مجھ کو دِکھلائیں
یاد تیری جو لائے گی گردِش
آئینے ایسے توڑ دوں گا میں
اس کے رُخ کو بھی موڑ دوں گا میں

اب زباں سے نہ کہہ سکوں گا تجھے
اُف میں پھر بھی غلط ہی کہتا ہوں
اے مرے دلربا، مرے ہمدم
ہاں فقط دِلربا حسین صنم

بیٹھے بیٹھے یہ کیا ہُوا مجھ کو
بھر گیا موتیوں سے کیوں دامن
درد سا دل میں میرے اٹھا کیوں
ایک طوفاں سا آج اُمنڈا کیوں

آہ کے ساتھ پھر لبوں پہ مرے
ڈھ گئی شورشِ الم حد سے
بے محابا یہ کِس کا نام آیا
کِس کو گھبرا کے میں پکار اُٹھا

کون ہے اب یہاں جو آئے گا
اُف، یہ اندر بھی آگیا اب تو
کِس نے کھولے کواڑ کمرے کے
کون چلمن سے جھانکتا ہے مجھے

زندگی کا مہیب تر لمحہ
ایسا لگتا ہے کوئی سایہ سا
اِس قدر مجھ کو کیوں ڈراتا ہے
جیسے میرے قریب آتا ہے

کہہ رہا ہے نظر جھکائے ہوئے
معاف کر دو گے تم یقیں ہے مجھے
ہوں جفاؤں پہ اپنی شرمندہ
اِس سہارے پہ ہوں ابھی زندہ

میں نے مانا کہ اِس تغافل سے
اَب مری زندگی تمہاری ہے
مجھ سے بیزار ہو گئے ہو تم
اِس کے حق دار ہو گئے ہو تم

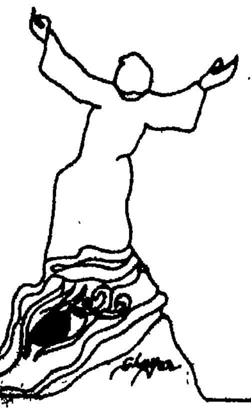
گھونٹ دو اب مرا گلا چاہے
اور منظور ہے اگر تم کو
مجھ سے رنگین شام بھی لے لو
ظلم کا انتقام بھی لے لو

ایسی باتیں نہ اب کرو ہمدم
آؤ سینے سے اب لگا لوں تمہیں
کر دیا معاف سب جفاؤں کو
میں نہیں چاہتا کہ دُور رہو

اور اِس بے وفا زمانے کو
حدِ فاصِل رکھے گا راہوں میں
مجھ سے ملنے نہ دے گا دیکھو تمہیں
کیوں نہ ہم ہی اُسی کو چھوڑ چلیں

آؤ دُنیا کو الوداع کہہ دوں
میں نے پہلے کہے تھے جو الفاظ
پیچھے مُڑ کر کبھی نہ دیکھوں گا
آج دُنیا سے کہتا جاؤں گا

میں نے ترکِ تعلقات کئے
جاں کی بازی نہیں لگاؤں گا
اب نہ سوچوں گا تیرے بارے میں
تیرے اِک خوش نما اشارے میں

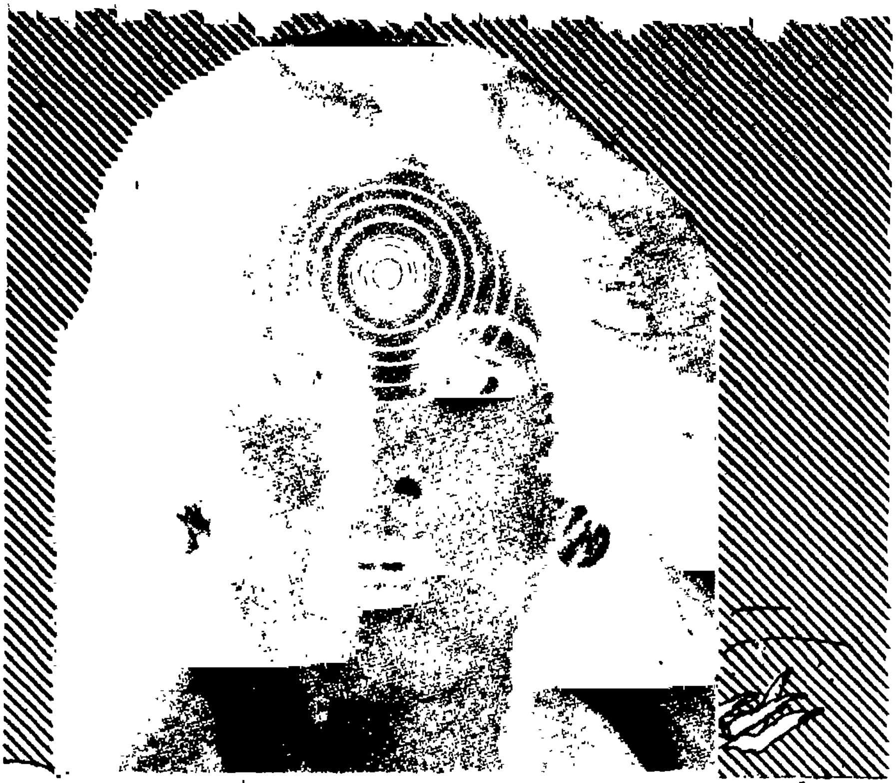


محمد طاہر رزاقی طاہر سنبھلی



کیا آپ نے بیمہ ایجنٹ سے
رابطہ پیدا کیا ہے۔ ایل آئی سی کی نئی پروٹیکشن
'تین وفادار' پالیسیوں کے سلسلہ میں
'پروگریسیو
پروٹیکشن پالیسی'
ایک مقررہ مدت پر پالیسی کی رقم میں اضافہ ہوگا اور اس کے لئے نئے پروپوزل یا ڈاکٹری معائنہ کی ضرورت نہیں
'ویکیشن اینڈ
کوور پالیسی'
ہر پانچ سال پر ادائیگیوں کی گارنٹی دی جاتی ہے۔ اور کل رقم بیمہ پر بونس بھی ملے گا۔ ساتھ ہی زندگی بھر سلامتی بھی ملے گی۔
'منی بیک
پالیسی'
دوسرے پلانوں کے مقابلہ میں زیادہ سے زیادہ اور جلد از جلد رقم کچھ کچھ وقفہ سے ملتی رہتی ہے۔ اور وہ بھی پالیسی کی مدت ختم ہونے سے پہلے اور مدت ختم ہونے تک ساری رقم بیمہ کے لئے جوکھم برقرار رہتا ہے۔
وقت بدل رہا ہے۔ ضرورتیں بدل رہی ہیں
لائف انشورنس کارپوریشن آف انڈیا

آپ کی ذہنی اُلجھن اور اُس کا حل



ڈاکٹر بھاٹیہ ایک مشہور ماہر نفسیات ہیں۔ وہ بانو پڑھنے والوں کے سوالات کا جواب دیں گے اور اُن کے نفسیاتی مسئلوں کا تجزیہ اور حل پیش کریں گے۔

پتہ: W 113، گریٹر کیلاش، نئی دلی۔

س: میرے خاوند مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں، لیکن کبھی کبھی مجھ سے درشتی اور تلخ کلامی سے بھی پیش آتے ہیں۔ جس سے میرا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی ماں اور بہنوں کو مجھ سے زیادہ چاہتے ہیں اور اُن کی بات کو زیادہ فوقیت دیتے ہیں۔ روز روز کے جھگڑوں سے میرا مزاج چڑچڑا رہنے لگا ہے۔ ہمارے حالات ایسے نہیں کہ ہم الگ گھر میں رہ سکیں۔ مجھے کیا کرنا چاہئے؟

آپ کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایک مشترکہ خاندان میں رہتی ہیں۔ مشترکہ خاندان میں یہ مسئلہ عام طور پر شوہر اور بیوی کے درمیان غلط فہمی پیدا کرتا ہے۔ اگر آپ کے خسر حیات نہیں تو آپ کے خاوند کی حیثیت خاندان کے سربراہ کی ہے۔ فیملی کے سربراہ ہونے کے ناطے وہ باپ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کے بھائی بہن حتیٰ کہ ان کی ماں بھی اُن سے وہی توقع رکھتی ہیں جو ایک باپ سے رکھی جاتی ہے۔ کچھ ایسی ہی توقعات آپ کی بھی ہیں۔ ان حالات میں حسد کا جذبہ ہونا فطری ہے۔ اگر آپ کی نندیں یہ دیکھتی ہیں کہ اُن کا بھائی آپ کو زیادہ پیار کرتا ہے تو ان کے دل میں حسد پیدا ہوتا ہے۔

اگر آپ کے خیال میں خاوند بہن سے زیادہ پیار کرتا ہے تو یہی جذبہ آپ کے دل میں بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اس بات پر آپ کو غصہ بھی آتا ہے۔ اس غصہ کا مرکز شوہر ہے، کیوں کہ وہی محبت کا سرچشمہ ہے۔ اگر آپ کوشش کریں کہ اپنے غصے کو محبت سے بدل دیں تو یہ خاصا دشوار کام ہے۔ غصہ اور حسد پُرسکون زندگی میں اضطراب اور بے چینی پیدا کرتے ہیں۔ اگر وقتاً فوقتاً غصے کا اظہار ہوتا ہے تو اس سے بے چینی شدت اختیار نہیں کرتی بلکہ غصے کا اظہار بعض حالات میں دشوار ہوتا ہے۔ غبارے میں ہوا بھر دی جائے تو اصلی حالت میں واپس لینے کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ یہ ہوا غبارے سے نکال دی جائے، ورنہ مزید ہوا سے غبارے کے پھٹنے کا اندیشہ

رہتا ہے۔ اگر آپ اپنے غصے کا اظہار نہیں کر سکتیں، تو اس سے بہت سی خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ آپ کا ظاہری مزاج اور خوش اخلاقی اس غصے کو اندرونی طور پر اور تیز بنا دیتے ہیں۔ یہ غصہ مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے اور کئی بھیس بدلتا ہے۔ غصے کی یہ شکلیں اتنی دُور از کار ہوتی ہیں کہ عام انسان دھوکا کھا جاتا ہے۔ وہ اصل مرض کا پتہ لگانے کی بجائے اس کی ظاہری شکل کا علاج کرتا ہے۔ اپنی ناراضگی پر قابو پانے کی کوشش آپ کے اندر ذہنی کھنچاؤ پیدا کرتی ہے۔ اس کی کھنچاؤ سے آپ کی ازدواجی زندگی میں بھی خرابی پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ خرابی آپ کی طرف سے بے رغبتی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔

جب انسان کے دل پر چوٹ لگتی ہے تو قدرتی طور پر اس میں بدلہ لینے کی خواہش جاگ اُٹھتی ہے۔ مرد کے وسائل وسیع ہیں۔ وہ اپنی طاقت اور روپے کے بل پر انتقام لے سکتا ہے۔ عورت کے وسائل محدود ہیں۔ وہ اپنی بے رغبتی کے ذریعے انتقام لیتی ہے۔ یہ بدلہ ازدواجی تعلقات میں سرد مہری پیدا کرتا ہے۔ اس سرد مہری سے عورت کو نقصان پہنچتا ہے۔ عورت اس نقصان کو سمجھتی ہے، لیکن وہ اپنی لاشعوری خواہش کے سامنے بے بس ہوتی ہے۔ اس لائحہ عمل کو بدلنا اس کے بس میں نہیں۔

اس صورت میں آپ کو دو باتوں پر غور کرنا چاہئے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ اپنے ظاہری برتاؤ کے سبب کو تلاش کریں۔ اُوپر لکھی ہوئی باتوں کی روشنی میں آپ کو یہ سبب ڈھونڈنے میں آسانی ہوگی۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کا اصل سبب آپ کا غصہ ہے۔ آپ اس بات کو ایمان داری سے تسلیم کر لیں۔ اپنے منفی جذبے کو تسلیم کرنا خاصا مشکل کام ہے، لیکن ایک دفعہ رُکاوٹ دور ہو جائے تو باقی راستہ آسان ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد آپ آسانی سے حالات کے ساتھ سمجھوتہ کر سکتی ہیں۔ آپ کو سب کے ساتھ رہنا ہے۔ اگر آپ کو شوہر کی ساری توجہ اور پیار نہیں مل سکتا تو اُسے مِل بانٹ کر حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہونا چاہئے۔ اس محبت کو ضرور تقسیم ہونا ہے۔ جھگڑے سے تقسیم ہو یا سمجھوتے سے۔ پھر کیوں نہ اُسے سکون سے تقسیم کر لیا جائے۔

دوسری بات آپ کے چڑچڑے پن سے متعلق ہے۔ اس چڑچڑے پن کی وجہ سے نہ آپ اپنے شوہر کو پیار دے سکتی ہیں اور نہ اس سے پیار حاصل کر سکتی ہیں۔ آپ اپنے چڑچڑے پن کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ظاہری طور پر روزمرّہ کے معمولی اختلافات اس کی بنا ہو سکتے ہیں۔ لیکن اصل وجہ یہ نہیں۔ اصل وجہ شوہر کی طرف سے محبت کے اظہار کی کمی ہے۔ محبت دو طرفہ ٹریفک ہے۔ آپ اپنے شوہر سے بے رغبتی کا اظہار کریں گی تو ان سے محبت کی حق دار نہیں بن سکتیں۔ اگر آپ انہیں پیار دے سکتی ہیں تو اُن سے پیار حاصل بھی کر سکتی ہیں۔

عورت کی زندگی ردِّ عمل کے طور پر گھومتی ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ مرد کو ہر بات میں پہل کرنا چاہئے۔ لیکن یہاں پہل آپ کی طرف سے ہونا چاہئے۔ آپ ان کی مشکلات کو سمجھنے کی کوشش کریں اور ان سے ہمدردی اور پیار کا برتاؤ کریں تو یقیناً ان کی طرف سے بھی آپ کو زیادہ توجہ اور محبت ملے گی۔ آپ کی اصل ضرورت محبت ہے۔ اگر یہ آپ کو مل گئی تو آپ کا غصہ اور چڑچڑا پن دُور ہو جائے گا اور آپ کی زندگی میں سکون اور شانتی پیدا ہوگی۔

س: میرے شوہر بہت کنجوس ہیں۔ آٹا اور گھی تک تالہ لگا کر رکھتے ہیں۔ کبھی شہر سے باہر جاتے ہیں تو سب چیزوں پر نشانات لگا کر جاتے ہیں اور آنے کے بعد جھگڑا کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں فضول خرچ ہوں، پھوہڑ ہوں۔ ان کی غیر موجودگی میں کبھی مہمان گھر پر آجائیں تو مجھے بڑی شرمندگی ہوتی ہے۔ پڑوس سے چیزیں مانگ کر کام چلانا پڑتا ہے۔ ہماری مالی حالت اچھی ہے، اس لئے یہ کنجوسی میری سمجھ میں نہیں آتی۔ کیا ان کی کنجوسی سے چھٹکارا مل سکتا ہے؟

ج: کنجوسی کا دولت مندی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک ذہنی کیفیت ہے۔ دنیا کے بے شمار دولت مند اس کا شکار رہ چکے ہیں۔ دراصل یہ تحفظ کے احساس کی کمی کا اظہار ہے۔ ممکن ہے آپ کے شوہر بچپن میں غریبی کا شکار رہے ہوں، بچپن میں انہیں عدم تحفظ کا احساس رہا ہو، اور انہوں نے اسی تحفظ کو حاصل کرنے کے لئے دولت جمع کی ہو۔ آج وہ دولت ان کو حاصل ہے، لیکن عدم تحفظ کا احساس جوں کا توں برقرار ہے۔ انہیں یہ خدشہ رہتا ہے کہ ان کی دولت ان سے چھن جائے گی اور وہ پھر غریبی کے گڑھے میں گر جائیں گے۔ اس لئے وہ اپنی دولت سے چمٹے رہتے ہیں۔ محنت سے کمائی ہوئی دولت کی قدر و قیمت ورثہ میں ملی ہوئی دولت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔

اگر آپ اپنے شوہر سے اس بارے میں گفتگو کریں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ آپ انہیں گھر کا حساب کتاب سمجھائیں۔ ان کو بتائیں کہ اُن کے

اس بتا دینے سے آپ کا اعتماد ٹوٹ جاتا ہے۔ اگر ان کا بھروسہ آپ پر سے اُٹھ جائے تو یہ اچھی بات نہیں۔ اگر وہ اسی طرح خرچ کی روک تھام کرتے رہے تو زندگی کا سارا لطف ختم ہو جائے گا۔

جب کوئی انسان اپنے کھانے پینے کے اخراجات پر ضرورت سے زیادہ کنٹرول کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ زندگی کا لطف اُٹھانے سے ڈرتا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ کے شوہر کے والدین ایسی طبیعت کے مالک ہوں۔ بچپن کی عادتیں مشکل ہی سے چھوڑی جا سکتی ہیں۔ اگر ان کے والد کنجوس تھے تو ممکن ہے یہ عادت انہیں ورثے میں ملی ہو۔ بعض دفعہ کنجوس ماں باپ کے بچے فضول خرچ بھی ہوتے ہیں، لیکن یہ بچپن کے کنٹرول کا ردِ عمل ہوتا ہے۔ انسان پر بچپن کے حالات کا ردِ عمل دو قسم کا ہوتا ہے۔ یا تو وہ بغیر سوچے سمجھے اُن ہی حالات کو دُہراتا ہے جن سے اس کا سابقہ بچپن میں پڑا تھا۔ یا وہ بغیر سوچے سمجھے ان حالات کے بالکل برعکس زندگی بسر کرتا ہے۔ دونوں صورتیں مناسب نہیں۔ جو انسان ماضی کی قید سے آزاد ہو کر زندگی گزارے وہی عقلمند کہلانے کا مستحق ہے۔ ہر شخص کو اپنے موجودہ حالات کی روشنی میں زندگی گزارنا چاہئے۔

جو انسان کھانے پینے کی چیزوں کو تالے میں بند رکھے، وہ ان چیزوں کے علاوہ اور بہت سی چیزوں پر تالا لگا دیتا ہے۔ یہ کنٹرول اس کی ساری زندگی پر حاوی ہو جاتا ہے۔ دراصل ایسا انسان زندگی کو مزے سے گزارنا ہی نہیں چاہتا۔ کھانے پینے کی چیزوں پر کنٹرول اس مرض کی ایک علامت ہے۔ ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو ایسا شخص زندگی کی خوشیوں پر کنٹرول کرنا چاہتا ہے۔ اس کی زندگی کی ضرورتیں تو پوری ہو جاتی ہیں، لیکن اُسے ان کا کوئی لطف حاصل نہیں ہوتا۔ یہ وہی مثل ہے کہ دودھ بھی دیا تو مینگنوں بھرا۔ آپ کا تعلق باورچی خانے یا کپڑے لتے سے ہے، اس لئے آپ کو اپنے شوہر کی خامی کا زیادہ احساس ہوتا ہے۔ ویسے ان کی باہر کی زندگی میں بھی یہی کم زوری کارفرما ہونا چاہئے۔

کنجوسی کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں۔ یہ بچپن کے پہلے سال تک پہنچتی ہیں۔ جب ماں بچے کو اپنی نرم گرم آغوش میں لیتی ہے تو بچہ خوش ہوتا ہے۔ وہ اُسے وقت پر دودھ دیتی ہے۔ اگر بچہ پیشاب کر دے تو ماں جلدی سے اس کے گیلے کپڑے بدل دیتی ہے۔ بچہ اپنی ماں سے خوش رہتا ہے۔ اگر ماں کسی وجہ سے اُسے وقت پر دودھ نہ دے، وہ بھوک سے رو رہا ہو اور ماں اس کا خیال نہ کرے، اُس کے کپڑے گیلے ہوں، اُسے سردی لگ رہی ہو اور ماں اس کے کپڑے بدلوانے میں دیر لگائے تو بچے میں ناراضگی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ زندگی کا لین دین انسان کی پیدائش کے پہلے ہی سال سے شروع ہو جاتا ہے۔ بچہ خوش ہو کر ماں کو کوئی انعام دینا چاہتا ہے۔ وہ یہ انعام اپنی اجابت کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ بچہ اس اجابت کو پیدا کرتا ہے۔ یہ اس کے لئے ایک کارنامہ ہے۔ اُسے اس میں کوئی بدبو یا کراہیت نہیں آتی۔ آپ نے مشاہدہ کیا ہوگا کہ بچہ اپنی اجابت کو ہاتھ لگانے میں شرم محسوس نہیں کرتا۔ جب بچہ ناراض ہو جاتا ہے تو وہ اس انعام کو پیش نہیں کرتا۔ وہ اپنی اجابت کو روک لیتا ہے۔ یہ طرزِ عمل اس کی باقی زندگی میں بھی جاری رہتا ہے۔ جب اُسے زندگی میں توجہ نہ ملے تو وہ اپنے اخراجات کو روک لیتا ہے۔ ہر مرحلہ پر یہ روک تھام اس کی زندگی پر حاوی رہتی ہے، اسی لئے کنجوس آدمی عموماً قبض کے مریض بھی ہوتے ہیں۔

اگر آپ اپنے شوہر کی طرف معمول سے زیادہ توجہ دیں تو اُن کی کنجوسی میں کمی واقع ہو سکتی ہے۔ کنجوسی کا تعلق سوسائٹی سے بھی ہے۔ اگر وہ ایسے لوگوں سے میل جول رکھیں جو زندگی کو بہتر طریقے سے گزارتے ہیں تو آہستہ آہستہ ان کی زندگی میں بھی نمایاں تبدیلی ہو سکتی ہے۔

س: میرے شوہر مجھ پر شک کرتے ہیں۔ ہماری شادی کو ۱۰ سال ہو چکے ہیں۔ میرے دو بچے ہیں۔ میں نے انہیں سینکڑوں بار اپنی معصومیت کا یقین دلایا ہے۔ وہ میری بات مان بھی جاتے ہیں، لیکن عارضی طور پر۔ کچھ دن کے بعد ان کی شک کرنے کی عادت پھر زندہ ہو جاتی ہے۔ میری زندگی ایک مستقل عذاب بن گئی ہے۔ کیا اُن کی اس بیماری کا علاج ممکن ہے؟

ج آپ نے یہ نہیں لکھا کہ آپ کی زندگی میں ایسا کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہے جس کی وجہ سے آپ کے شوہر کو پہلی بار آپ پر شک ہوا ہو؟ اگر ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا اور آپ نے سچ کہا ہے کہ ان کا شک قطعی بے بنیاد ہے تو ہم آپ کو شک کی وجہیں بتاتے ہیں۔

اگر آپ اپنی ازدواجی زندگی سے غیر مطمئن ہیں تو یہ بات بھی شوہر کے دل میں شک پیدا کر سکتی ہے۔ آپ کی بے رغبتی ان کے دل میں اس شک کو اُبھارتی ہے کہ جو خوشی آپ کو ان سے نہ حاصل ہو سکی وہ آپ کسی دوسرے سے حاصل کریں گی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ یہ رائے قائم کرنے میں کہاں تک حق بجانب ہیں۔ لیکن آپ کی دلچسپی کی کمی ان کے دل میں یہ خیال پیدا کر سکتی ہے۔ اگر آپ

کہ شوہر بھی اپنی ازدواجی زندگی سے مطمئن نہیں تو ان کا شک اور بھی قوی ہو جاتا ہے۔

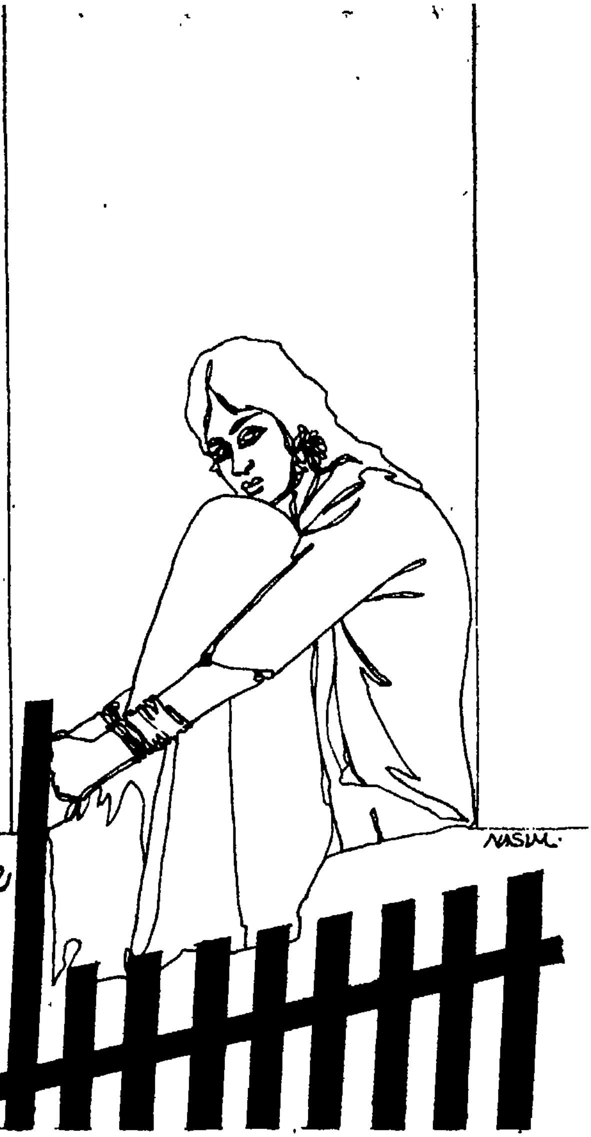
شوہر کو اپنی نااہلیت کا احساس ہو تو یہ بات بھی اس کے دل میں شک کو جگہ دیتی ہے۔ وہ جس معاملے میں اپنے آپ کو نااہل پاتا ہے۔ اس میں دوسروں کو اہل سمجھتا ہے۔ اپنے آپ کو نااہل سمجھنا ایک نفسیاتی بیماری ہے۔ بچپن کے حوصلہ شکن واقعات اس کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ جب وہ دوسرے کو اپنے سے بہتر سمجھتا ہے تو نفسیاتی طور پر ان کا وجود بھی تسلیم کر لیتا ہے۔ دوسرے کی ظاہری غیر موجودگی اس کو مطمئن نہیں کر سکتی۔ دوسرے کی موجودگی اس کے دماغ میں ہے۔ نفسیاتی بیماریوں میں خیال اور حقیقت میں بہت زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا۔ دونوں اس طرح گڈمڈ ہو جاتے ہیں کہ خیال کو اصلیت سے جدا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ شوہر اپنے آپ کو بدصورت یا معمولی شکل و صورت کا انسان سمجھتا ہو۔ اس کا خیال تھا کہ اس سے زیادہ خوبصورت لوگ اس کی بیوی کی توجہ کے مستحق ہیں۔ یہ فرضی لوگ خیالات کی بستیوں سے حقیقت کے میدان میں اُتر آتے ہیں۔ اگر بیوی غیر معمولی طور پر حسین ہو تو یہ شک اور بھی بڑھ جاتا ہے۔

مرد کے خیالات میں بے راہ روی عورتوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ جب اُسے اپنی ازدواجی زندگی میں سکون اور اطمینان حاصل نہیں ہوتا تو اس کا ذہن بھٹکنے لگتا ہے۔ اس کے خیالات دوسری عورتوں کی طرف جاتے ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ جو لطف اور خوشی اُسے اپنی بیوی سے حاصل نہ ہو سکی وہ دوسری عورت سے حاصل کرے۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی سوچتا ہے کہ جس طرح اس کے خیالات بھٹک رہے ہیں۔ اس کی بیوی کا دل بھی کسی دوسرے مرد کے خیالات میں گم ہوگا۔ وہ ایسا نہ میں حق بجانب نہیں ہے۔ لیکن اس کی انصاف پسند طبیعت اُسے شک کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شک کی بیماری کا کیا علاج ہے۔ آپ کی شادی کو دس سال گزر چکے ہیں۔ ۱۰ سال کے بعد ازدواجی زندگی میں ٹھہراؤ آ جاتا ہے۔ بچوں کی پیدائش کے بعد بیوی کی محبت بھی تقسیم ہو جاتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ اپنے شوہر سے وہی برتاؤ کریں جو شادی کے ابتدائی دنوں میں اُن کا حق تھا۔ انہیں یہ احساس ہرگز نہ ہونے دیں کہ وہ نااہل ہیں، کم زور ہیں یا معمولی شکل و صورت کے ہیں۔ آپ کے طرزِ عمل کی یہ تبدیلی ان کے شک کی دیوار کو گرا دے گی۔

■■

عورتوں کی پوزیشن بدل گئی مگر عورتیں خود نہیں بدلیں



رضوانہ مطلوب احمد

اگرچہ اب حالات تبدیل ہو چکے ہیں اور عورتوں کو تقریباً دنیا بھر میں مردوں کے برابر حقوق مل گئے ہیں، لیکن یہ بات اپنی جگہ مسلّم ہے کہ مردوں نے سماج کے اس نصف حصّے کو شروع سے ہی ایک کم تر اور کم زور مخلوق کا درجہ دے رکھا ہے۔ زیادہ قدیم دور کو ٹٹولنے کی بجائے اگر صرف گیارہویں صدی کے زمانے پر ہی نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت بہت واضح انداز میں نظر آتی ہے کہ اس دور میں بھی کیتھولک چرچ سے وابستہ حضرات اپنی تقریروں اور وعظوں میں کہا کرتے تھے کہ عورت ایک ایسا جسم ہے جس میں روح نہیں ہوتی۔ پھر جرمنی کے مشہور فلسفی شوپنہاور نے بھی کہا تھا کہ عورتوں میں عدل و انصاف کا احساس نہیں ہوتا، اس لئے کسی جج کے سامنے اس کی شہادت قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ شوپنہاور کے اس قول کو اس دور کے تمام مؤرخین نے نمایاں طور پر جگہ دی اور بظاہر پوری دنیا نے یہ حقیقت تسلیم کر لی کہ عورتیں عدالتوں وغیرہ میں گواہی نہیں دے سکتیں۔ مذہبِ اسلام نے عورتوں کی شہادت کو تسلیم تو کیا ہے لیکن ایک مرد کی جگہ پر دو عورتوں کی گواہی لازمی قرار دی ہے۔ خود ہمارے سماج میں بھی عورتوں کو ایک ایسی پسلی سے تعبیر کیا جاتا تھا جسے اگر سیدھا کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ ٹوٹ جائے گی۔

یورپ میں انیسویں صدی میں یہ صورتِ حال بدلنا شروع ہو گئی۔ اس کا سہرا برطانیہ کی ایک باہمت خاتون ایملین پینکھرسٹ کے سر جاتا ہے، جس نے دنیا میں پہلی بار مردوں کی غلامی سے عورتوں کو آزادی دلانے کی جدّوجہد شروع کی۔ ایک بار کچھ برطانوی لوگوں نے پینکھرسٹ سے کہا کہ آپ عورتوں کی جدّوجہدِ آزادی کی آڑ میں مردوں کی تقلید کرنے کی کوشش کر رہی ہیں تو اس نے برجستہ جواب دیا تھا: "مرد بننے سے میری عزت نہیں بڑھ جائے گی، کیوں کہ میں مرد سے کہیں زیادہ عظیم ہوں۔ اس زندگی میں میرا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ میں ایک ماں بنوں، کیوں کہ ماتا میں اتنا بڑا اعزاز اور شرف پوشیدہ ہے کہ ہر عظیم انسان اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔"

پینکھرسٹ نے آج سے سو سال قبل جو الفاظ کہے تھے وہ آج بھی سو فی صد صحیح ہیں۔

آج کی عورت اگرچہ کُلّی طور سے بدل چکی ہے لیکن اس نے اپنا بنیادی فریضہ نہیں چھوڑا ہے۔ دنیا بھر میں تحریکِ نسواں کی ہر لیڈر اپنی تقریروں میں ہمیشہ اس بات پر زور دیتی رہی ہے کہ ہر عورت کا پہلا اور بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہ ایک کام یاب بیوی، ماں اور گرہستن عورت بنے۔ اس کا گھر ہی اس کی چھوٹی سی حکومت ہوتی ہے، جس میں وہ اپنے شوہر کے ساتھ مِل کر اپنے بچّوں کی پرورش

اور نگہداشت کرتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی جس نظریہ کی ماڈرن باشعور عورت سب سے بڑی مخالف ہے وہ یہ ہے کہ عورت کا اصل مقام صرف اس کا گھر ہی ہے اور اس گھر کے لئے اسے اپنا سب کچھ تیاگ دینا چاہئے۔ ایک عورت خواہ کتنی ہی پڑھی لکھی کیوں نہ ہو، اس کے مشغلے اور شوق خواہ کچھ بھی ہوں، لیکن شادی کے بعد اسے اپنے شوہر اور بچوں کی خاطر ان تمام چیزوں کو قربان کرنا پڑتا ہے اس قسم کی باتیں نہ صرف یہ کہ اس کی انا کو ٹھیس پہنچاتی ہیں بلکہ اس کے مستقل وجود اور اس کی انفرادیت کے بھی منافی ہیں، حالاں کہ اگر یہی باتیں کسی مرد سے کہی جائیں تو اس کے لئے کبھی بھی قابل قبول نہ ہوں گی۔ کوئی بھی مرد اپنی بیوی بچوں کے لئے نہ تو اپنے مشغلے ہی چھوڑتا ہے اور نہ اپنے تعلیمی مفادات سے دست بردار ہوتا ہے۔ اس کے برعکس عورت نے ہمیشہ بیوی اور ماں بننے کو اپنا بنیادی فریضہ قرار دیا ہے اور کبھی اپنے اس بنیادی حق کو تیاگنے کی بات نہیں کہی ہے۔ لیکن وہ اتنا ضرور چاہتی ہے کہ اس کی تمام کائنات اور اس کے پورے وجود کو گھر کی چہار دیواری میں ہمیشہ کے لئے محصور کر کے نہ رکھ دیا جائے۔

پچھلے سو برس کے بعد عورتوں نے اپنے اندر چھپے ہوئے اعلیٰ جوہروں کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ اس نے خود اپنے لئے، اپنے گھر گرہستی کے لئے اور اپنے بچوں کے لئے علمی اور عملی میدان میں قدم رکھا ہے، کیوں کہ ایک پڑھی لکھی عورت اور گھر سے باہر کام کرنے والی بیوی اپنے بچوں کی صحیح تربیت اور زندگی کی حقیقتوں سے پوری طرح واقفیت اور ان سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت کسی گھر کی چہار دیواری میں محصور، لاچار اور مجبور عورت کے مقابلے میں کہیں زیادہ رکھتی ہے۔

ان سب حقائق کے باوجود مرد ابھی تک خود کو گھر کا حاکم اور عورت کو اپنا تابع اور فرماں بردار سمجھتا ہے۔ اپنے مقابلے میں وہ ہمیشہ عورت کو بزدل، کم زور، یہاں تک کہ کم عقل سمجھنے پر مصر ہے۔ مردوں کے خیال میں اس کی وجہ عورت کے فطری میلانات ہیں، جن کی وجہ سے وہ ہمیشہ مردوں کی حمایت کی دست نگر رہتی ہے۔ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ بہت کم ہی کوئی عورت بغیر مرد کے زندگی گزار سکتی ہے، جب کہ مرد بغیر عورت کے آسانی سے رہ سکتا ہے۔ وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ شادی کے بعد عورت اپنا وجود تک مرد کے وجود میں ضم کر دیتی ہے اور اپنا نام بھی مرد کے ساتھ وابستہ کر لیتی ہے۔ یہ قدیم دور کی ایک فرسودہ روایت ہے جس کے مطابق مرد عورت کو اپنی جائداد سمجھتا تھا۔ بدقسمتی سے یہ گھسی پٹی روایت ابھی تک چل رہی ہے لیکن اب اس روایت میں بھی دھیرے دھیرے انقلاب برپا ہو رہا ہے اور اب تو بہت سی عورتیں خاص طور سے اعلیٰ تعلیم یافتہ عورتیں اپنا اور اپنے خاندان کا نام شادی کے بعد بھی اسی طرح برقرار رکھتی ہیں۔

حال ہی میں یورپ کے مشہور ماہر سماجیات مارک پیٹرسن نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "خوش گوار شادی کی طرف تمہارا قدم" میں لکھا ہے: "عورت کی زندگی، اس کی شخصیت، یہاں تک کہ اس کا نظریۂ حیات مکمل طور سے بدل چکا ہے۔ لیکن اس کے باوجود عورت کے تئیں مرد کا رویہ ابھی تک نہیں بدل سکا ہے۔ آج وہ اپنے سامنے اپنے باپ دادا کے دور سے بالکل مختلف عورت کو دیکھتا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ اس تبدیلی کا احساس تک نہیں کرتا۔ آج بھی مرد یہی سمجھتا ہے کہ عورت صرف اس کے لئے پیدا کی گئی ہے، وہ ابھی تک اس خود فریبی میں مبتلا ہے کہ عورت کا وجود صرف ا لئے ہے کہ وہ اس کے بچوں کو جنم دے، اس کا بہلائے، اسے ہر وقت خوش رکھنے کا جتن کر اور اپنی ساری عمر اس کے بچوں کی تعلیم و تربیت پرورش میں ختم کر دے۔"

یہ اٹھارویں صدی کی بات ہے جب فرانس کے مشہور فلسفی ژاں ژاک روسو نے سب سے پہلے عورتوں کی تعلیم و تربیت اور آزادی کے لئے آواز اٹھائی تھی۔ اس نے صاف صاف لکھا سماج کی ترقی اور خوش حالی کے لئے عورتوں کا تعلیم ہونا ضروری ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ ایک تعلیم یافتہ بیوی ماں کے فرائض غیر تعلیم یافتہ بیوی کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتر طور سے انجام دے سکتی ہے۔ بعد میں اسی عظیم مفکر کے خیالات اور اس کی تحریروں نے فرانس میں انقلاب کو جنم دیا، جس کے بعد یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی انقلاب کا سلسلہ شروع ہو گیا اور دنیا کے تقریباً سب ہی ملکوں میں عورتوں نے اسکولوں، کالجوں اور یونی ورسٹیوں کا رخ کرنا شروع کر دیا۔

تعلیم کے زیور سے آراستہ ہونے کے بعد عورتوں نے سماج میں اپنی افادیت اور اہمیت منوانا شروع کر دی۔ سب سے پہلے انہوں نے چھوٹے بچوں کو پڑھانے کے میدان میں اپنی برتری کا سکہ جمایا، پھر سکریٹری، ٹیلی فون آپریٹر اور ریڈیو اناؤنسر کی حیثیت سے مردوں سے بازی لے گئیں، اور اب تو کارخانوں اور فیکٹریوں کے علاوہ فوج تک میں وہ مردوں کے دوش بدوش سخت محنت و مشقت کے کام انجام دے رہی ہیں۔ آج کل عورتوں میں بہترین ڈاکٹر، بہترین انجینئر، قابل ترین وکیل اور ماہر سیاست داں موجود ہیں۔ چنانچہ یہ دنیا صرف مرد

کی دنیا نہیں رہ گئی ہے۔ اور اب تو بہت سے خاندان گزر بسر کے لئے صرف مردوں کی کمائی پر انحصار نہیں کرتے بلکہ گھر کی بہو بیٹیاں بھی دفتروں وغیرہ میں کام کرکے اچھی خاصی تنخواہ حاصل کرتی ہیں۔ اس طرح سماج میں عورت کی حیثیت بالکل ہی بدل گئی ہے لیکن سوال یہ ہے کیا عورت بھی بدلی ہے یا نہیں ؟

مارک پیٹرسن کہتے ہیں کہ عورت کی حیثیت اور پوزیشن ضرور بدل گئی ہے لیکن جہاں تک عورت کی ذات کا تعلق ہے، اس میں اب تک کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی ہے، کیوں کہ عورت کے تحت الشعور میں شروع سے ہی یہ بات پنہاں ہوتی ہے کہ وہ ایک عورت ہے اور اسے زندگی کے ہر موڑ پر کسی مرد کی حمایت اور تحفظ کی ضرورت ہے۔ جب تک عورت اپنی اس ذہنی پس ماندگی سے گلو خلاصی حاصل نہیں کرے گی وہ مردوں کی محتاج اور دست نگر ہی رہے گی۔ لیکن اس رجحان سے چھٹکارا پانا آسان نہیں ہے، کیوں کہ اس ذہنی پس ماندگی کی جڑیں اس کے بچپن تک پیوست ہوتی ہیں۔ آج کے سماج میں خواہ وہ یورپ کا ترقی یافتہ سماج ہو یا تیسری دنیا کا پچھڑا ہوا سماج، ہر جگہ لڑکوں اور لڑکیوں کی پرورش مختلف ڈھنگ سے ہوتی ہے۔ بچپن میں بچیوں کے لئے گڑیا خریدی جاتی ہے تو لڑکا اپنی سائیکل اور موٹر وغیرہ سے کھیلتا ہے۔ جب یہ تھوڑے سے سمجھدار ہوتے ہیں تو لڑکیوں کو چولہے چکی کے کاموں میں لگا دیا جاتا ہے اور لڑکوں کو گھر سے باہر کھیلنے کے لئے بھیج دیا جاتا ہے۔ پھر اسکول اور کالج میں بھی لڑکی قصے کہانیوں کی کتابوں پر زور دیتی ہے جب کہ لڑکے سائنس اور نئی نئی ایجادات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہی چیزیں بعد میں چل کر پوری زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ بچپن سے ہی ان کی الگ الگ تربیت کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ لڑکی ایک طرح کے موہوم خوف کا شکار ہو جاتی ہے۔ وہ تن تنہا کہیں نہیں جا سکتی۔ وہ سماج کے طے کئے ہوئے خطوط یا حد بندیوں کو نہیں پھلانگ سکتی۔ یہی اس کی کمزوری اور لاچاری کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

اب اس معاملے میں بھی انقلاب کی رو دوڑ چلی ہے۔ لڑکیاں بھی اب سائنس اور طرح طرح کی ایجادات کے میدان میں تیزی کے ساتھ قدم رکھ رہی ہیں، اور ان کی تعداد جس تیزی سے اس میدان میں بڑھ رہی ہے، اس کے پیش نظر یہ بات یقینی ہے کہ صدیوں پرانی یہ زنجیر بھی جلد ہی کٹ جائے گی اور اسی وقت عورت کو صحیح معنوں میں آزادی اور مساوات حاصل ہو سکے گی۔

●●

شمع کشیدہ کاری



جس میں ہر قسم کی بیلیں، بوٹیاں، کروشیا کا کام، مونوگرام، کراس اسٹچ، ساڑھیوں اور دوپٹوں کے ڈیزائن۔ غرض یہ کہ شمع کشیدہ کاری بہنیں اپنے پاس رکھ کر فخر محسوس کریں گی ——

اردو اور ہندی میں —— قیمت: آٹھ روپے

شمع بک ڈپو ۔ آصف علی روڈ ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

گوردیو سنگھ روپانا

ایک چہرہ



گاؤں بھر میں بیبے کی بیوی کا چرچا تھا۔ اس کا سبب شاید یہ تھا کہ جیسا جتنا بدصورت تھا، اس کی بیوی اتنی ہی خوب صورت تھی۔ جیبا بیس سال کا تھا۔ سیاہ رنگ، ٹھوٹا ٹھگنا تھل تھل کرتا جسم۔ باہر کی طرف نکلے ہوتے اوپر کے بڑے بڑے دانت۔ جنہوں نے نچلے ہونٹ کو دبا رکھا تھا۔ وہ بالکل اپنی ماں پہ گیا تھا۔ وہ اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا اور اس کا باپ مر چکا تھا۔

عورتیں بیبے کی ماں کو مبارک باد دیتیں کہ اس کے بیٹے کو اتنی خوب صورت دُلہن ملی ہے۔ بیبے کی ماں بظاہر ہُوں، ہاں، کرتی لیکن دل میں سوچتی "خوب صورت تو بہت سے سانپ بھی ہوتے ہیں" اور اس خیال کے ساتھ وہ مبارک باد وصول کرنے سے بچنے کی خاطر چُھپتی پھرتی۔ جب وہ بہو کو دیکھتی تو نفرت سے اپنے اوپر والے بڑے بڑے دانت پر چھپکلی کی طرح زبان پھیرتی۔

گونے کے تیسرے دن بیبے کی ماں نے بھنگن سے کہا "کل سے ہمارے ہاں گوبر کوڑا صاف کرنے نہ آنا۔ ہم اب دو ہو گئی ہیں، خود ہی سنبھال لیا کریں گی۔ اپنے کام کرنے سے کوئی ہاتھ تو میلے ہوں گے نہیں۔" اس نے بہو کو سُنایا اور پھر دل میں ہی کہا "تیری ساری خوب صورتی میں ٹھیک کر دوں گی، تو لڑکے کے قابو میں نہیں آئے گی، تجھے میں قابو میں کروں گی۔" اور اس نے پھر اپنے بڑے بڑے دانتوں پر زبان پھیری۔

اگلی صبح کو اس نے گوبر کے دو ٹوکرے بھرے۔ ایک اپنے سر پر رکھا اور دوسرا بہو کے سر پر۔ جہاں سے وہ گزرتیں، لوگ کھڑے

کے کھڑے رہ جاتے۔ وہ حیرت سے دانتوں میں اُنگلیاں دبا لیتے۔ جب وہ اس کام سے فارغ ہوئیں تو دھوپ کافی نکل آئی تھی۔ وہ نلکے پر ہاتھ دھونے بیٹھ گئیں۔ پہلے بہو نے نلکا چلایا اور پھر جب بہو ہاتھ دھونے لگی تو اس کے گوبر سے صاف ہوتے ہوئے مہندی لگے گورے گورے ہاتھ بیبے کی ماں کو سفید کبوتروں کے جوڑے جیسے لگے۔ اس نے اپنے دانتوں پر زبان پھیری اور مونہہ دوسری طرف پھیر لیا۔

کھانے پینے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے بہو سے کہا "آ، ہم تھوڑا سا دانہ پیس

لیں۔" یہ کہہ کر چنوں کا ٹوکرا بھرا، پہلے وہ خود چکی پر جا بیٹھی۔ اپنے ہاتھ کے ساتھ بہو کا ہاتھ ملا کر دیکھا تو اسے ایسا لگا جیسے ہتھیلی کے کچھ حصے پر دھوپ ہے، کچھ پر چھاؤں۔ اس نے چکی روک دی۔ بہو کے چہرے پہ پسینے کے ننھے ننھے قطرے ابھر آتے تھے۔ چہرہ دہک رہا تھا۔ سرخ گلاب کی مانند۔ جس روز اس نے پہلی مرتبہ اس کا گھونگھٹ اٹھا کر اس کا مونہہ جھوٹا کیا تھا، آج وہ اس دن سے بھی زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ دانتوں پہ زبان پھیر کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور بہو کو اکیلے میں چنے پیسنے کے لئے

کہہ گئی۔
شام کو جیبا غصہ میں بھرا ہوا گھر آیا۔ ماں کو ایک طرف لے جا کر کہنے لگا:
"ماں لوگ تھو تھو کر رہے ہیں۔ ابھی تو اس کے ہاتھوں سے مہندی بھی نہیں اتری۔ اور تو نے کنگن کو بھی ہٹا دیا!" اس نے لوگوں سے جیسا سنا، ویسا ہی کہہ دیا۔
"دو دن میں ہی جورو کا غلام ہو گیا؟ بہت درد ہوتا ہے اس کا!" ماں نے طنز سے کہا "تو چپ رہ، میں جو کرتی ہوں، تیرے ہی بھلے کے لئے کرتی ہوں۔"
"لوگ کیا کہیں گے؟ اور اس میں ہمارا بھلا بھی کیا ہے؟"
"فاختہ کو بھگوان کی باتوں کا کیا پتہ۔ اگر اسے اس طرح خوار نہ کروں تو اس قدر خوب صورت لڑکی کیسے بسے گی تیرے جیسے بچو کے گھر میں!" ماں نے چاروں طرف سفید سفید آنکھیں گھما کر کہا "خوبصورت خوب صورت کہہ کر اسے سر پر چڑھا ما ہے؟ اس بات کی طرف اس کا دھیان ہونے ہی نہ دو کہ وہ اس قدر خوب صورت ہے، ورنہ وہ ہمیں کیا خاک خاطر میں لائے گی، کہیں اور نہ دیسے لڑا بیٹھے گی؟"
اس دن جیبے نے بڑے غور سے آئینہ دیکھا۔ پھر اپنی شکل کو دھیان میں رکھ کر اس نے بیوی کو دیکھا۔ اسے ماں کی بات میں کچھ سچائی نظر آئی۔ رات کو بیوی اس کے پاس آئی، تو وہ مونہہ پھیرے پڑا رہا — بیوی نے خود اسے ایک دو بار بلایا، لیکن وہ نہ بولا، نہ کوئی حرکت کی۔
"میرے ہاتھوں کے پھپولے (آبلے) تو دیکھ! دن بھر چنے پیستی رہی ہوں!" بیوی نے اس کا مونہہ اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔
"میرے ہاتھوں کے پھپولے بھی دیکھ لے جو پھاوڑا چلاتے ہوتے پڑے ہیں۔"
"میں تو نئی نئی سسرال آئی ہوں۔"
"میں بھی تو نیا نیا گونا (مکلاوا) لایا ہوں۔"
پھر وہ چپ چاپ روتی رہی اور اپنے ماں باپ کو کوستی رہی، اس لئے نہیں کہ اس کے لئے انہوں نے اس قدر بد صورت بر تلاش کیا تھا، بلکہ اس لئے کہ کس قدر سنگ دل مرد اس کے پلّے باندھ دیا تھا۔
صبح کو پھر گوبر کے ٹوکرے تیار تھے۔ ساس نے بہو پر نظر ڈالی۔ وہ زیورات سے

لدی ہوئی تھی۔ اس نے سُرخ سُوٹ پہن رکھا تھا۔ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کہاں سے شروع ہوتی تھی اور سُوٹ کہاں سے۔ سرو کا سا قد جھومتے کھاتا نظر آرہا تھا۔

"زیور اُتار دے اور کوئی ہلکے رنگ کا سُوٹ پہن لے۔" ساس نے اپنے بڑے بڑے دانتوں پر زبان پھیر کر کہا۔

بہو جب باہر آئی تو اس نے زیور اُتار دیئے تھے۔ اور ہلکے بادامی رنگ کا سُوٹ پہن لیا تھا۔ جس پر بہت چھوٹی چھوٹی، سبز رنگ کی بُوٹیاں تھیں۔ اب بھی سُوٹ کا رنگ اس کے جسم سے غضب کی مناسبت رکھتا تھا۔ زیورات کے بغیر وہ کنواری بیل جیسی لگتی تھی۔ ساس کو اب وہ پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت معلوم ہوئی اور ساس نے پھر اپنے دانتوں پر زبان پھیری۔

گھر، گوڑے سے فارغ ہوئیں تو آج ساس نے اس کے ہاتھ نہ دُھلائے۔ اس نے خود ہی نلکا چلا کر ہاتھ دھوئے۔ آج ساس اس کے ساتھ پیڑھی پر چنے پیسنے بھی نہ بیٹھی۔

"او ہو، کل تو اسے جانا ہے۔" ساس کو ایک دم خیال آیا۔

چلچلاتی دوپہر میں وہ کُندن سُنار کی دکان پر گئی اور وہاں سے ایک شیشی میں تیزاب لے آئی۔ اس رات کھیت میں پانی دینے کی باری ان کی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی، یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ لڑکا کھیت پر چلا گیا۔

رات کو اس نے بہو کی چارپائی اپنے پاس صحن میں بچھائی۔ پورن ماشی کی رات تھی۔ آسمان پر اکا دُکا بادل تھے۔ بہو سامنے کی چارپائی پر سمٹی ہوئی پڑی تھی۔ اس کے اس طرح سمٹ کر پڑے رہنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ ابھی وہ سوئی نہیں تھی۔

"پہلے میں اس کی آنکھوں میں ڈالوں گی۔ اس کی آنکھیں بڑی خراب ہیں۔" ساس نے سوچا "پھر مونہہ پر بھی ——— بعد میں شور مچا دوں گی "بھاگ گیا! بھاگ گیا! دروازہ پہلے ہی کھول دوں گی۔" کتنی ہی دیر تک ——— وہ منصوبے بناتی رہی۔

اس نے دیکھا کہ بہو دھیرے دھیرے بے سُدھ ہوتی جا رہی ہے، ٹانگیں، بانہیں بالکل بے حس و حرکت تھیں۔ چہرہ بھی سیدھا اوپر کی طرف تھا۔ ساس ہولے ہولے اندر گئی اور تیزاب کی شیشی اٹھا لائی۔ ڈھکن اس نے گلی میں پھینک دیا۔ پھر اس نے آسمان پر نظر ڈالی۔ بادل کا کوئی ٹکڑا چاند کے پاس نہیں تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ کوئی بڑا سا ابر پارہ چاند کے اوپر آ جائے تاکہ اس کا کام آسانی سے ہو سکے۔

اپنی چارپائی پر لیٹ کر وہ بادل کے ٹکڑے کا انتظار کرنے لگی۔ کچھ منٹ میں سیاہ بادل کا ایک ٹکڑا چاند کے قریب سرک آیا۔ اس نے شیشی اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لی۔ پھر اسے دروازہ کھولنے کا خیال آیا۔ شیشی رکھ کر وہ دروازہ کھولنے گئی۔ دروازہ نے چُرر ——— چُرر کی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ بہو ابھی تک بے حس و حرکت پڑی تھی۔ وہ جلدی سے لوٹ آئی۔ جُھک کر اس نے بہو کے چہرے کو دیکھا تو اس کا دل بیٹھ گیا۔

بہو کا مونہہ دوپٹے سے ڈھکا ہوا تھا۔ اور دوپٹہ اس کے بازو کے نیچے دبا ہوا تھا۔ ساس نے ایک ہاتھ سے دوپٹہ سرکانا شروع کیا ——— آہستہ ——— آہستہ ——— آخر اس نے دوپٹہ سرکا ہی لیا۔ بہو کا چہرہ کھُل گیا۔ ساس لرز کر رہ گئی۔ بہو کی پیشانی چاند کی طرح چمک رہی تھی۔ اس کے ہاتھ سے شیشی گر گئی۔

"کیا بات ہے ماں جی؟" بہو جاگ اٹھی۔

"کچھ نہیں، کچھ نہیں۔ میں دیکھ رہی تھی کہیں تو گہنے پہن کر تو نہیں سو گئی۔ آج ہم گھر میں اکیلی ہیں، اور آج میں دروازہ بند کرنا بھی بھول گئی تھی۔" کہتے ہوئے وہ دروازہ بند کرنے چلی گئی۔

اگلے روز بہو کا باپ بہو کو لینے کے لئے آیا۔ اور شام کو وہ اس کے ساتھ چلی گئی۔

کچھ دن بعد خبر ملی کہ بہو کے چیچک نکلی ہے۔ سندیسہ لانے والے نائی کو ساس نے پوریاں بنا کر کھلائیں۔ زمین پر اس کے پاؤں لگ ہی نہیں رہے تھے۔ "جو کام مجھ سے نہیں ہو پایا، وہ بھگوان نے خود ہی کر دیا۔ داغ دار ہو کر آئے گی، اب کون اس کی طرف دیکھے گا؟ میرے بیٹے کے برابر ہی ہو جائے گی۔" اس کے دل میں گدگدی سی اٹھ رہی تھی۔

دو مہینے بعد جیبا اسے لے آیا۔ ساس کے چرنوں کو چھو کر جب بہو نے گھونگھٹ اٹھایا تو اس کے چہرے پر بس چار پانچ داغ تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے چار پانچ تارے چمک رہے ہوں۔ اب تو وہ اور بھی زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ آشیرواد دینے کی بجائے ساس نے اپنے دانتوں پر زبان پھیری اور اپنا مونہہ دوسری طرف پھیر لیا۔

●●

ذہنی تناؤ سے پریشان لوگ زندگی کے بارے میں مایوس کن نظریہ اپنا لیتے ہیں ــــ معمولی خوشیاں اُن کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ ان کی خود اعتمادی کم ہو جاتی ہے، اور احساسِ کمتری بڑھ جاتا ہے۔ دھیرے دھیرے اس کا اعتماد دوسروں پر سے بھی اُٹھنے لگتا ہے اور وہ ان کو شک کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں جدوجہد اور محنت سے دُور بھاگنے کی عادت پیدا ہو جاتی ہے۔ تھوڑا سا کام کرنے سے ہی سُستی، بے چینی اور تھکان محسوس ہونے لگتی نیند نہ آنے، سر درد اور بھوک کی کمی کی شکایتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ نفسیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ ذہنی تناؤ کا شکار مردوں کے مقابلے میں خواتین زیادہ ہوتی ہیں۔

عام طور سے ملازمت پیشہ خواتین صبح سے شام تک مشین کی طرح کام کرتی رہتی ہیں وہ تھوڑی دیر آرام کرنے کے لئے بھی وقت نہیں نکالتیں کبھی کبھی اتنا زیادہ کام کرنے کے بعد بھی گھر کے افراد ان پر غلط نکتہ چینی کرنے سے باز نہیں آتے اس وقت اُن کے دل کو چوٹ لگتی ہے، اور وہ سخت ذہنی تناؤ یا انتشار کا شکار ہو جاتی ہیں مشترکہ خاندان میں تو خاص طور سے ایسی حالت اکثر پیدا ہوتی رہتی ہے۔ گھر اور بچوں کی دیکھ بھال شوہر کی خدمت اور آرام کے خیال اور بہت سی گھریلو ذمہ داریاں خواتین کو ذہنی طور پر مستقلاً پریشان کئے رہتی ہیں۔ لیکن اس طرح پریشان ہونے یا فکر کرنے سے مسائل حل تو نہیں ہو جاتے۔ ان کا سامنا تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ بے کار دل ہی دل میں کڑھنے یا بڑبڑانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا، بلکہ ذہن پر بوجھ بڑھتا ہی رہتا ہے اور یہی ذہنی تناؤ کا باعث بن جاتا ہے۔

آپ دن بھر محنت کرتی ہیں۔ کس لئے؟ صرف زندگی کو سکھی بنانے کے لئے۔ پھر کیوں نہ ہر ممکن کوشش سے مایوسیوں اور تفکرات کو بھول کر خوش رہنے کی کوشش کی جائے ــ؟ ملازمت پیشہ خواتین کے لئے ہی نہیں۔ گھریلو کام سنبھالنے والی عورتوں کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ بیچ بیچ میں اپنے آپ کو مکمل آرام دینے کی عادت بھی ڈالیں۔ اس مختصر آرام سے بھی جسم کے رگ پٹھوں کو کافی سکون مل سکتا ہے۔ اور ضائع ہونے والی ذہنی اور جسمانی طاقت برقرار ہو جاتی ہے کسی بھی فکر یا پریشانی کو دبائے رکھنے سے ذہنی تناؤ اور بڑھتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ دل کی بات یا کوئی بھی مسئلہ اپنے کسی بھروسے کے ساتھی کو بتا دیا جائے۔ اس طرح دل و دماغ پر رکھا ہوا بوجھ بھی کم ہوگا اور ہو سکتا ہے اُلجھن یا مسئلہ کا کوئی حل بھی نکل آئے۔

ملازمت پیشہ خواتین اکثر ایک ہی ڈھنگ سے اپنا کام کرتی ہیں۔ کام میں دلچسپی قائم رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ کام کرنے کے طور طریقے میں تھوڑی سی تبدیلی ہوتی رہے۔ یہ تبدیلی اپنی صلاحیت کے مطابق آپ خود بخوبی کر سکتی ہیں۔ اس طرح آپ کی بوریت اور یکسانیت سے پیدا ہوئی ذہنی بے زاری دُور ہو جائے گی۔

ذہنی تناؤ کا غصّے سے چولی دامن کا تعلق ہے۔ تناؤ سے غصّہ آتا ہے اور غصّہ سے تناؤ بڑھتا ہے۔ غصّہ آنے پر اپنے اوپر قابو پانے کی کوشش کیجئے۔ جس کی وجہ سے غصّہ آ رہا ہو اس سے دُور ہٹ جائیے..... اچھا یہ رہتا ہے کہ اس جگہ سے ہی چلی جائیں۔ کہیں بھی چلی جائیے۔ مثلاً کسی پڑوسن کی سہیلی کے پاس یا کسی کام میں مصروف ہو جائیے۔

بہت سی خواتین اپنے پڑوس یا جان پہچان والی عورتوں سے بلاوجہ حسد کرنے لگتی ہیں اور یہ چیز اُن کے ذہنی سکون کو برباد کر دیتی ہے اگر آپ خود پُرسکون اور خوش رہنا چاہتی ہیں تو دوسروں پر توجّہ کم رکھئے، اپنے اوپر زیادہ۔ کوئی بھی ناگوار بات ہو جائے تو اسے برداشت کر لیجئے تھوڑی دیر بعد ماحول بدل جائے گا اور وہ بات بھی آپ کے ذہن سے نکل جائے گی۔ اس کے علاوہ آپ کو اپنے کھانے پینے پر بھی خاص دھیان رکھنا چاہیئے۔ اگر آپ نے کھانے پینے پر دھیان نہیں دیا تو تندرستی ٹھیک نہیں رہے گی۔ ذہنی توازن برقرار رکھنے کے لئے پروٹین سب سے ضروری چیز ہے۔ اس لئے پروٹین والی غذاؤں کو پابندی سے استعمال کیجئے۔ ویسے ڈاکٹر کے مشورے سے وٹامن کی گولیاں بھی استعمال کی جا سکتی ہیں ذہنی تناؤ دُور کرنے کے لئے کیلشیم بھی ضروری چیز ہے۔ پان کھانے سے یہ کمی دُور کی جا سکتی ہے ــ طبّی نقطۂ نظر سے کیلشیم کی گولیاں بھی فائدہ کرتی ہیں۔

دورانِ خون تیز رہے اور دماغی قوّت برقرار رہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ تھوڑی دیر کھلی ہوا میں چہل قدمی بھی کریں، اس کے لئے تیل کی مالش بھی مفید ثابت ہو سکتی ہے،

ذہنی تناؤ اور پریشانیوں سے چھٹکارا پانے کے لئے سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ ہم زندگی کے ہر پہلو سے بھرپور دلچسپی لیں در گذر اور برداشت کا مادہ پیدا کریں اور کام کے وقت کام اور آرام کے وقت آرام کا پورا خیال رکھیں۔

●●



بچّوں کو کھُلی ہوا میں کھیلنے دیجیے

طبّی ماہرین کا کہنا ہے کہ جو شخص جتنی زیادہ دیر کھُلی ہوا میں رہتا ہے اس کے بیمار پڑنے کا اندیشہ اتنا ہی کم رہتا ہے، اس لئے بچّوں کو جتنی دیر زیادہ کھُلی ہوا میں کھیلنے کا موقع ملے اتنا ہی اچھا ہے۔ اس طرح ان کا جسم مضبوط بنتا ہے، اعصاب کو تقویت حاصل ہوتی ہے، بدن میں چستی آتی ہے، یہی ہے کہ بچّے جب باہر نکلتے ہیں تو ان کے ماں باپ کو ان پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔ اس سے تھوڑی سی پریشانی بھی ہوتی ہے۔ کیوں کہ والدین اپنا کام ٹھیک نہیں کر سکتے۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ آپ اپنے بچّوں کو گھر سے باہر کسی میدان، کھُلے ہوئے آنگن یا گھر کے بالکل نزدیک کسی پارک وغیرہ میں کھیلنے کے لئے بھیج دیں، جہاں ان کے لئے سڑک کے ٹریفک وغیرہ کا بھی ڈر نہ ہو، اور ان کو دھوپ اور ہوا بھی بھرپور انداز میں مہیّا ہوتی رہے۔ اس طرح ان پر نظر رکھنے کی پریشانی سے بھی آپ کو نجات مل جائے گی۔

کھُلی ہوا میں رہنے والے بچّوں کو سردی زکام کی شکایت نہیں کے برابر ہوتی ہے لیکن ایک بات کا دھیان رکھنا ضروری ہے، اگر آپ نے اپنے بچّوں کو شروع سے ہی کھُلی ہوا میں رہنے کی عادت نہیں ڈالی ہے تو ایک دم ان کو کھُلی ہوا میں چھوڑ کر جوکھم نہ اُٹھائیے۔ یہ عادت آہستہ آہستہ دھیرے دھیرے ڈالئے۔

اب موسم کی شدّت کا سوال آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جاڑے میں صبح و شام بچّوں کو کھُلی ہوا میں رکھنے سے نمونیہ ہو سکتا ہے اور گرمی کے دنوں دوپہر کے وقت لُو چلنے سے بچّوں کو لُو لگنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ موسم کی شدّت سے بچّوں کو بچانے کا طریقہ یہ ہے کہ جاڑے کے موسم میں بچّوں کو صبح تڑکے ہی نہ اُٹھائیے، ویسے بھی جاڑوں میں بچّے سات آٹھ بجے سے پہلے نہیں اُٹھتے منہ دھوتے، اور ناشتہ کرتے کرتے نو بج جاتے ہیں، اتنی دیر میں کھُلے میدان یا آنگن میں خاصی دھوپ پھیل جاتی ہے۔ اس دھوپ میں اگر بچّے کھُلی ہوا میں کھیلیں تو ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ وہاں شام کے چار بجے تک بچّے کھیل سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بچّوں کو سردی کے موسم میں جوتے موزے اور مناسب گرم کپڑے پہنائے رکھئے۔ اس طرح ان کو سردی سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں رہے گا۔ جاڑوں میں کبھی کبھی تیز ہوائیں چلتی ہیں۔ بارش ہونے لگتی ہے اور موسم ایک دم ٹھنڈا ہو جاتا ہے اس وقت بچّوں کو ٹھنڈ لگنے کا خطرہ ضرور رہتا۔ اس لئے اس وقت بچّوں کو گھر کے اندر ہی رکھا جا سکتا ہے، لیکن پوری طرح لحاف اور بستر کے اندر نہیں — ان کو مناسب گرم کپڑے پہنا کر کمرے یا آنگن میں کھیلنے دیجئے۔ ایسی سردی میں بچّوں کو موزے، جوتے اور کانوں تک کو ڈھکنے والے گرم کپڑے پہنائے رکھئے کیوں کہ بچّوں کو سردی عام طور سے گلے اور پیروں ہی سے لگتی ہے۔

گرمیوں میں جب لُو چلتی ہے تو بچّوں کا باہر کھیلنا نقصان دہ ہو سکتا ہے گرمیوں میں لوگ عام طور سے باہر سوتے ہیں اور صبح کو جلدی جاگتے ہیں۔ بچّے بھی جلد ہی اُٹھ جاتے ہیں۔ اس لئے ان دنوں بچّوں کو صبح سے دوپہر کے دس بجے تک باہر کھیلنے دیجئے شام کو چھ بجے کے بعد بھی بچّے باہر کھیل سکتے ہیں

بچّوں کو کھُلی ہوا میں رہنے اور کھیلنے سے ان کے پھیپھڑے مضبوط ہوتے ہیں، خون کا دوران تیز ہوتا ہے۔ بھوک اچھی طرح لگتی ہے اور جسمانی نشو و نما میں بہت مدد ملتی ہے اگر آپ نے اپنے بچّوں کو کھُلی ہوا میں کھیلنے کی عادت ڈال دی تو کچھ ہی دن میں آپ ان کی صحت میں نمایاں تبدیلی محسوس کریں گی۔

●●

آپ کو مجرم کی تلاش ہے





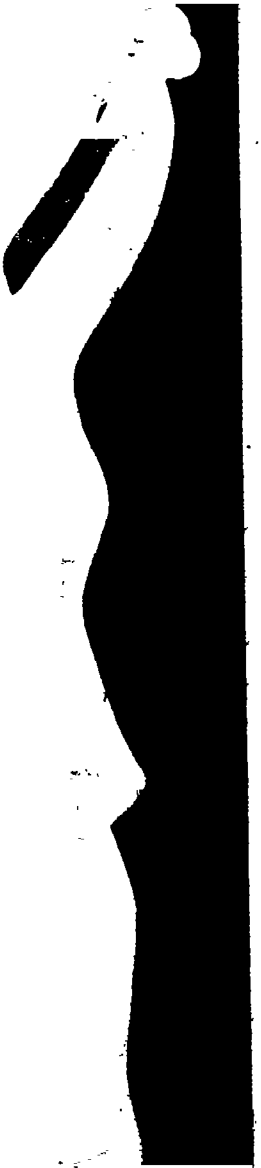
اور کیوں نہ ہو؟ "مجرم" "شمع" کے ادارے سے شائع ہونے والا نیا اور خوب صورت جاسوسی ماہ نامہ ہے، جو اُردو کے جاسوسی ادب میں ایک نئی راہ کھول رہا ہے۔ "مجرم" محض ایک جاسوسی ناول نہیں ہے، جرم و سزا، قانون، پولیس اور تحقیقات کا ایک مکمل رسالہ ہے۔ اس میں ہر ماہ ایک مکمل ناول شائع کیا جاتا ہے۔ "مجرم" ہندوستان کا پہلا جاسوسی رسالہ ہے جو فوٹو آفسیٹ سے شائع کیا جاتا ہے۔ اگر آپ نے ابھی تک "مجرم" نہیں پڑھا تو آج ہی اپنے اخبار فروش سے مانگئے، اور اگر وہ آپ کی مانگ پوری نہ کر سکے تو چوبیس روپے نیچے کے پتے پر بھیج کر سالانہ خریدار بن جائیے۔

جاسوسی ماہ نامہ "مجرم"، دفاتر شمع، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱

مجھ کو خط لکھنا

کسی سے چھپ کے کسی رات مجھ کو خط لکھنا
یہ خط ہے نصف ملاقات، مجھ کو خط لکھنا
مرا یہ حال کہ بس، ڈاکیے کی راہ تکوں
تمہارے کیسے ہیں حالات؟ مجھ کو خط لکھنا
یہاں تو آٹھوں پہر آنکھوں سے لگی ہے جھڑی
وہاں بھی ہوتی ہے برسات؟ مجھ کو خط لکھنا
گذارے تھے کبھی "تکیہ" میں، یاد آتے ہیں
وہ صبح و شام، وہ دن رات! مجھ کو خط لکھنا
سنا ہے، تیری "بہن" گاؤں آنے والی ہے
تو آ رہی ہے اگر ساتھ، مجھ کو خط لکھنا
سنا ہے، پھولے گی سرسوں جب اپنے آنگن میں
تو ہوں گے پیلے ترے ہات، مجھ کو خط لکھنا
جمعہ کو عید ہے، مہندی کہ خونِ دل کی شفق
میں بھیجوں کون سی سوغات؟ مجھ کو خط لکھنا
خموش کیوں ہے؟ زمانے سے مونس ساگر
نہ کھا گئی ہو کہیں مات! مجھ کو خط لکھنا

ساگر چاپدانوی



ایک خط

مری اچھی، مری پیاری سہیلی
عجب کل رات میں نے خواب دیکھا

وہی سپنوں کا میرے شاہزادہ
خیالوں میں جسے میں پوجتی ہوں
نہایت دھوم سے بارات لے کر
مرے دروازے پر آ کے کھڑا ہے
مجھے آواز ہنس کر دے رہا ہے

کہیں بجتے ہیں دلکش شادیانے
کہیں شہنائیاں بھی گونجتی ہیں
کہیں سکھیوں کے میٹھے گیت کے سنگ
ابھرتی ڈوبتی ڈھولک کی تھاپیں
مرے کانوں میں امرت گھولتی ہیں
ہزاروں رازِ پنہاں کھولتی ہیں

مری ہم جولیوں کی ایک ٹولی
دیے پاؤں مرے کمرے میں آ کر
مجھے نام "اس کا" لے کر چھیڑتی ہیں
اور میں شرم و حیا سے زیر ہو کر
چھپا لیتی ہوں آنچل میں سراپا

...

مری اچھی، مری پیاری سہیلی
یہ رنگین خواب جو دیکھا ہے میں نے
دعا کرنا کہ بن جائے حقیقت

فیاض انور

میک اپ — کیوں اور کیسے؟

میک اپ کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ یہ مہنگا شوق ہے۔ اس کے علاوہ اس پر وقت بھی بہت خرچ ہوتا ہے۔ مگر یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ جو عورتیں اپنے چہرے کے بناؤ سنگھار کی طرف سے غفلت برتتی ہیں وہ خوب صورتی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتی ہیں۔ آج کل کی دنیا مقابلے کی دنیا ہے۔ بناؤ سنگھار کا معاملہ بھی اس مقابلے کے رجحان سے خالی نہیں۔ کچھ عورتیں عدیم الفرصتی کا بہانہ کرتی ہیں تو کچھ خرچ کی تنگی کی آڑ لیتی ہیں۔ یہ نامناسب بات ہے۔ آخر ایک عورت کو صبح اٹھ کر بالوں میں برش کرنے اور ساڑی پہننے میں کتنا وقت لگتا ہے؟ خوب صورتی اور جامہ زیبی کے لئے یہ ضروری نہیں کہ آپ ۳۰۰ روپے کی ساڑھی پہنیں یا قیمتی شلوار سوٹ سلوائیں۔ اگر آپ کا ذوق نفیس ہے تو آپ سستے، مگر مناسب ڈیزائن کے کپڑے پہن سکتی ہیں۔ خوش لباس عورت قیمتی کپڑوں سے نہیں بلکہ اپنے اسٹائل سے پہچانی جاتی ہے۔

سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ عورتوں کو میک اپ کے متعلق واقفیت نہیں ہوتی۔ مثلاً کچھ عورتیں رات کو سونے سے پہلے مونہہ پر کریم لگاتی ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ اس طرح کریم جلد میں اچھی طرح جذب ہو جائے گی۔ یہ عادت نہ صرف غلط ہے بلکہ جلد کے لئے خطرناک بھی ہے۔ رات کو کریم لگانے سے پہلے یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ جلد کے لئے سانس لینا اتنا ہی ضروری ہے جتنا پھیپھڑوں کے لئے۔ کریم رات بھر چہرے پر



شہناز حسین
۹۲-M گریٹر کیلاش، نئی دہلی۔ فون نمبر: ۶۱۱۶۴۴

بیوٹی کالج

لگی رہے تو مسامات بند ہو جاتے ہیں ان پر چکنائی کی دبیز تہہ جم جاتی ہے۔ اس طرح جلد سانس نہیں لے سکتی۔ اس کے علاوہ بہت سی عورتوں کو زیادہ مقدار میں کریم لگانے کی عادت ہوتی ہے۔ کریم لگانے میں فیاضی سے کام لینا مفید نہیں۔ چہرے کی جلد کریم کی تھوڑی سی مقدار کو ہی قبول کرتی ہے اور یہ مقدار اس کی نشو ونما کے لئے کافی ہے۔ کریم اس مقدار سے زیادہ ہو تو اس کا استعمال بےکار ثابت ہوتا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھ لیجئے کہ انسان کے جسم میں فولاد کا عنصر بہت تھوڑا ہے۔ جسم کی یہ ضرورت روزانہ ایک سیب کھانے سے پوری ہو جاتی ہے انگریزی کی ایک مثل ہے کہ روزانہ ایک سیب کا استعمال ڈاکٹر کو گھر سے دور رکھتا ہے۔ انسان کے جسم کو صرف اتنے لوہے کی ضرورت ہے کہ اس سے ایک چھوٹی سی کیل بن جائے۔ ایک سیب یہ ضرورت پوری کر دیتا ہے۔ اگر آپ سیب کو فائدہ مند سمجھ کر زیادہ مقدار میں کھائیں گی تو ایک سیب کو چھوڑ کر باقی سیب اکارت جائیں گے۔ وہ سوا فضلہ بنانے کے اور کسی کام نہیں آئیں گے یہ خیال غلط ہے کہ اگر کوئی چیز تھوڑی مقدار میں فائدہ مند ہے تو زیادہ مقدار میں زیادہ فائدہ مند ثابت ہوگی کریم کے استعمال کے معاملے میں بھی یہی اصول یاد رکھنا چاہئے۔ اس کے علاوہ وقت کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ کریم چہرے پر صرف ۲۰ منٹ تک رہنی چاہئے اس کے بعد اس کو صاف کر دینا چاہئے، کیونکہ چہرے کی جلد ۲۰ منٹ میں کریم کو اچھی طرح جذب کر لیتی ہے۔ دوسری بات میک اپ کو اتارنے کے بارے میں ہے۔ آپ کسی پارٹی یا تقریب میں شرکت کر کے گھر لوٹی ہیں۔ آپ تھکی ہوئی ہیں۔ اور میک اپ اتارے بغیر سو جانا چاہتی ہیں۔ یہ بات نقصان دہ ہے۔ میک اپ میں چاہے آدھا گھنٹہ خرچ ہوا ہو اس کے اتارنے میں غفلت نہ برتیں۔ اگر فاؤنڈیشن پر میک اپ کیا ہے تو یہ میک اپ اتارنا اور بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ کسی کلینزنگ کریم کی مدد سے میک اپ اتاریں۔ اگر لیموں اس کریم کا ایک جزو ہو تو اور بھی اچھا ہے۔ بازار میں لیموں کی بنیاد پر بنی ہوئی کلینزنگ کریم عام ملتی ہے۔

میک اپ اتارتے وقت اس بات کا دھیان رکھیں کہ روئی کا ٹکڑا خشک نہ ہو۔ روئی کو پانی میں تر کر کے کلینزنگ کریم لگائیں۔ بھیگی ہوئی روئی سے میک اپ اتارنے سے ایک فائدہ یہ ہے کہ چہرہ تر و تازہ رہتا ہے اور اس کی جلد

کی نمی برقرار رہتی ہے۔ اگر آپ خشک روئی استعمال کریں گی تو یہ روئی چہرے کی نمی کو بھی جذب کر لے گی روئی سے میک اپ صاف کرتے وقت اس بات کا بھی خیال رکھیں کہ انگلیوں کی حرکت رخساروں سے کنپٹیوں کی طرف ہو۔ کنپٹی کے پاس ایک مقام ہے جہاں خالص خون جلد کی بالائی سطح کے قریب آجاتا ہے۔ یہ مقام پہنچے پر بھی ہوتا ہے حکیم لوگ اسی جگہ انگلی رکھ کر نبض دیکھتے ہیں۔ اگر آپ کان کے کے درمیانی حصے کے پاس اور کنپٹی کے نیچے انگلی رکھ کر دیکھیں گی تو آپ کو یہاں بھی 'نبض' چلتی معلوم ہوگی۔ چہرے سے میک اپ اتارتے وقت آپ کی انگلیوں کی حرکت اسی نبض والی رگ کی جانب ہونا چاہئے۔ جب آپ موہنہ دھونے کے بعد تولیہ استعمال کریں تو اس وقت بھی آپ ہاتھوں کو رخسار سے کنپٹی کی طرف حرکت دیں۔ اگر آپ نے تولیہ کو مخالف سمت میں حرکت دی تو اس سے آپ کے چہرے کی جلد ڈھیلی ہو جائے گی۔ اوپر سے نیچے کی طرف حرکت دینے سے ٹھوڑی کا گوشت لٹک جاتا ہے دراصل تولیہ سے چہرے کو رگڑ کر صاف کرنا ہی غلط ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ موہنہ دھونے کے بعد چہرے کو تولئے سے تھپتھپائیں۔ آپ تولئے سے چہرہ کو اس طرح صاف نہ کریں جس طرح چمڑے کا ٹکڑا صاف کیا جاتا ہے۔ آپ کی جلد ایک مردہ چمڑے کا ٹکڑا نہیں بلکہ ایک جیتی جاگتی چیز ہے۔ آپ تولیہ چہرے کی جلد پر اس احساس کے ساتھ لگائیں کہ آپ ایک زندہ اور جان دار چیز کو صاف کر رہی ہیں۔

روغنی جلد عموماً مہاسوں اور دانوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ چہرے پر ہر وقت تیل چمکتا رہتا ہے۔ بہت سی عورتیں اس لئے بار بار اپنے چہرے کو صابن سے دھویا کرتی ہیں۔ ان کے خیال میں اس ترکیب سے جلد صاف اور خشک رہتی ہے یہ خیال غلط ہے۔ روغنی جلد کو صابن اور پانی سے بار بار دھونے سے جلد کے قدرتی روغنیات بھی برباد ہو جاتے ہیں۔ جلد کے نیچے کے حصے میں کچھ غدود ہوتے ہیں۔ بار بار صابن لگانے سے اُن کی حرکت میں خلل پڑ جاتا ہے۔ صابن سے جلد کو دھونے سے آپ کو چند گھنٹے آرام مل سکتا ہے، لیکن روغنی جلد اپنا عمل دہراتی رہتی ہے اس طرح چند گھنٹوں کے بعد پھر خارش شروع ہو جاتی ہے۔

اگر آپ کی جلد خشک ہے تو آپ ایسی کریم استعمال کریں جس میں لینولین ملا ہو۔ یہ ایک قسم کی چربی ہے جو خشک اور کھردری جلد کو ملائم بنانے میں مدد کرتی ہے۔ چہرے پر کریم لگاتے وقت آنکھوں کے زیریں حصے کو نہ بھولیں۔ انسان کے چہرے پر صرف یہی جگہ ہے جو چکنائی بنانے والے غدودوں سے خالی ہے۔ اس جگہ سب سے پہلے جھرّیاں پڑتی ہیں۔ یہ کریم چہرے پر اور آنکھوں کے زیریں حصے پر ۱۰ منٹ لگائے رکھیں۔ اگر یہ کریم آنکھوں کے نیچے ۱۰ منٹ سے زیادہ لگی رہی تو آپ کی آنکھیں سوج جائیں گی۔ آپ سمجھیں گی کہ کریم خراب ہے۔ دراصل وجہ یہ ہوتی ہے زیادہ دیر چکنائی لگی رہنے سے جلد کو سانس لینے کا موقع نہیں ملتا۔ ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ کلینسنگ کریم کو ۳۰ منٹ سے زیادہ استعمال نہیں کرنا چاہئے لینولین ملی کریم کے لئے ۱۰ منٹ کی قید اس لئے ہے کہ اس کریم میں چربی کی مقدار زیادہ دیر تک لگی رہے تو جلد کو آکسیجن نہیں ملتی، کاربن ڈائی آکسائیڈ جلد میں رہ جاتی ہے۔ اور جلد سوج جاتی ہے۔

کچھ عورتوں کے لئے مہاسے، دانے اور کیلیں مصیبت کا باعث بنے رہتے ہیں۔ مہاسوں کی وجہ جلد کے زیریں غدود ہوتے ہیں یہ غدود جلد کو چکنائی مہیا کرتے ہیں۔ روغنی جلد اس چکنائی کو جلد سے باہر نہیں آنے دیتی۔ اس طرح یہ جلد کے نیچے بند ہو جاتی ہے اور مہاسے بن جاتی ہے سن بلوغت کو پہنچنے پر جہاں عورتوں کے دیگر اعضا کی تیزی سے نشوونما ہوتی ہے، وہاں یہ غدود بھی 'اوور ٹائم' کام کرتے ہیں۔ اس طرح مہاسوں کی تعداد میں بے تحاشا اضافہ ہو جاتا ہے ۲۰ برس کی عمر تک ان مہاسوں اور دانوں کا نکلنا قدرتی ہے۔ اس لئے نوجوان لڑکیوں کو ان دانوں سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ۲۰ برس کی عمر کے بعد یہ دانے خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔ بعض لڑکیوں کے چہرے پر مہاسے بالکل نہیں نکلتے۔ یہ ان کی خوش نصیبی ہے۔ اگر مہاسے ۲۰ برس کے بعد بھی نمودار ہوں تو یہ مسئلہ غور طلب ہو جاتا ہے۔

لڑکپن اور نوجوانی کے علاوہ مہاسوں کی اور وجہیں بھی ہیں۔ ہاضمے کی خرابی، فکر اور پریشانی غم اور صدمہ بھی جلد کے زیریں غدودوں کو حرکت میں لا سکتا ہے۔ تفکرات سے تمام جسمانی نظام میں فرق پڑتا ہے۔ ہاضمہ خراب ہو جاتا ہے، بدن سوکھ جاتا ہے، بال سفید ہو جاتے ہیں تو مہاسے کیوں نہیں پیدا ہو سکتے؟ اگر آپ کی عمر ۲۰ سال سے زیادہ ہے اور آپ کو ابھی تک مہاسوں سے نجات نہیں ملی تو پھر آپ کو ذہنی سکون کی ضرورت ہے آپ کسی نفسیاتی الجھن کا شکار ہیں۔ شادی سے پہلے بھی مہاسوں کا نکلنا قدرتی امر ہے۔ امتحان کے خوف سے بھی مہاسے پیدا ہو سکتے ہیں۔

کچھ عورتیں کیلوں کو انگلیوں سے دبا کر نکالتی ہیں یہ بہت خطرناک عادت ہے۔ کیل نکالنا

ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ اگر آپ اسی طرح نکالتی رہیں تو انفیکشن ہونے کا خطرہ ہے۔ آپ کے ہاتھ میلے ہو سکتے ہیں۔ آپ کے ناخن گندے ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ اس طرح بے احتیاطی سے کیلیں نکالیں گی تو زہرباد ہونے کا خطرہ ہے کچی کیل نکالنا اور بھی غلط بات ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ استرے سے مخمل کو چیر ڈالیں یہ ایک مجرمانہ فعل ہے۔ جلد اسے کبھی معاف نہیں کرتی آپ کے مہاسے تو ختم ہو جائیں گے لیکن جاتے جاتے اپنی نشانیاں چھوڑ جائیں گے اور آپ کا چہرہ عمر بھر کے لئے داغ دار ہو جائے گا۔ بہتر یہ ہے کہ آپ کسی بیوٹی سیلون میں جا کر اپنے مہاسوں کو نکلوائیں۔ اگر آپ کے شہر میں کوئی بیوٹی سیلون نہیں ہے تو پھر بڑی احتیاط سے انھیں گھر پر نکالیں۔ ایک روئی کے ٹکڑے کو گرم پانی میں بھگو کر مہاسے پر رکھیں۔ یہ روئی کا ٹکڑا لحاف یا توشک سے کھینچ کر نہ نکالیں۔ بازار میں دوا کی روئی ملتی ہے۔ اسے استعمال کریں۔ اگر مہاسہ پکا ہے تو اُسے آہستہ آہستہ دبائیں مہاسے کو انگلی سے نہ چھوئیں۔ جب کیل مہاسے سے نکل کر روئی میں آجائے تو تھوڑے سے ٹھنڈے پانی میں یوڈی کلون ملا کر لگائیں۔ اس سے مہاسے کا مونہہ ہو جائے گا اور زہرباد بھی نہ ہوگا۔ اگر یوڈی کلون نہ مل سکے تو ایک دو قطرے ڈیٹول پانی میں ملا کر لگائیں۔ ڈیٹول جراثیم کش دوا ہے

جو عورتیں مہاسوں کی شکار رہیں، انھیں اپنی غذا میں بھی احتیاط برتنا چاہئے۔ تلی ہوئی چیزیں، مٹھائیاں، سوڈا لیمن، کوکا کولا وغیرہ کم استعمال کریں۔ اگر وہ ان ہدایات پر عمل کریں تو ان کو مہاسوں سے نجات مل سکتی ہے۔

روغنی جلد والی عورتوں کو گھی اور مکھن کے استعمال میں احتیاط لازم ہے۔ ان کی جلد کے

غدود پہلے ہی چکنائی پیدا کر رہے ہیں۔ اس پر جسم کو مزید چکنائی پہنچانا غلط ہے۔ ان کے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اس قدرتی روغن کو کیسے کم کریں جو ان کے چہرے پر چکنائی کی تہہ چڑھاتا ہے۔ اگر یہ عورتیں کبھی کبھی چہرے پر یوڈی کلون لگائیں تو اس سے چکنائی کا اثر کم ہو جاتا ہے۔ روغنی جلد بھدا معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس پر جھریاں بھی دیر میں پڑتی ہیں۔ یہ چہرے کو سدا بہار رکھتی ہے۔

خشک جلد والی عورتوں کو یوڈی کلون نہیں لگانا چاہئے۔ اس سے جلد کے غدود اور زیادہ خشک ہو جائیں گے خشک جلد جوانی میں ضرور جاذبِ نظر معلوم ہوتی ہے، لیکن اس پر جھریاں بھی جلد پڑتی ہیں۔ شاید اسی کو قدرت کا انصاف کہتے ہیں۔

سوال و جواب

فرح نار، دہلی

س۔ جاڑوں میں دھوپ میں متواتر بیٹھنے سے چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے۔ کیا دھوپ چہرے کے لئے نقصان دہ ہے!

ج ذرا دیر دھوپ میں رہنے سے چہرہ پر فرق نہیں پڑتا لیکن اگر گھنٹوں متواتر دھوپ میں بیٹھا جائے۔ تو یقیناً چہرے اور بالوں کے لے نقصان دہ ہوگا۔ اور چہرہ زیادہ خشک اور سیاہ ہو جائے گا اسی طرح بال بھی خشک ہو جائیں گے کیونکہ دھوپ نمی چوس لیتی ہے۔ جاڑوں کی زیادہ ٹھنڈی ہوا بھی چہرے اور بالوں کو نقصان پہنچاتی ہے۔

رخشندہ خانم، دہلی

س۔ میرے بال بہت نرم ہیں اگر تیل نہ بھی لگاؤ تب بھی چپکے چپکے سے رہتے ہیں۔ ہر چیز میں کرنا نہیں چاہتی کیونکہ اس کا زیادہ استعمال بالوں کو خراب کر دیتا ہے کوئی طریقہ بتائیے جو میرے بال پھولے پھولے معلوم ہوں

ج آپ بالوں میں دہی کا پانی لگائیں اور خشک ہونے پر کنگھا کریں۔ بال ایک دم پھولے پھولے ہو جائیں گے۔ ویسے بھی دہی کا پانی بالوں کے لئے مفید ہے۔

سروری خاتون، بریلی

س۔ کیا لیٹ کر پڑھنا نقصان دہ ہے!

ج جی ہاں لیٹ کر پڑھنے سے آنکھیں کمزور ہو جاتی ہیں۔

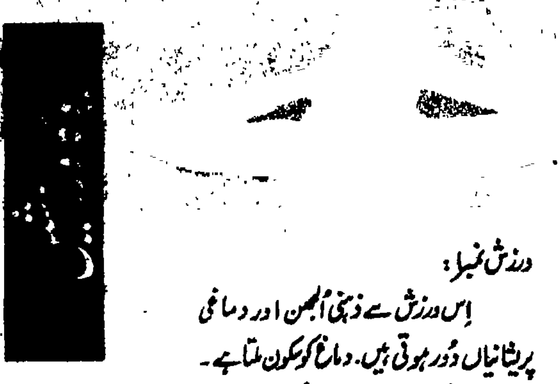
شاہ جہاں بیگم، میرٹھ

س۔ میرے جسم کی کھال بہت خشک ہے۔ حالانکہ میں نہانے سے پہلے تیل کی مالش کرتی ہوں۔

ج آپ تیل کی مالش نہانے کے بعد کیا کریں پہلے گرم پانی سے غسل کریں تاکہ تمام مسامات کھل جائیں اور ان میں تیل آسانی سے پہنچ جائے۔ اس کے دو ایک گھنٹہ بعد دوبارہ نیم گرم پانی سے غسل کریں۔ غسل سے پہلے مسامات بند ہوتے ہیں اس لئے تیل مسامات کے اندر نہیں پہنچ پاتا

س۔ میرے پیروں کی ایڑیاں جاڑوں کی سرد ہوا کی وجہ سے سخت ہو گئی ہیں۔

ج آپ لیموں کاٹ کر اس پر گلیسرین لگا کر ایڑیاں رگڑیں۔ تیز گرم پانی سے پیروں کو دھونے کے بجائے ہلکے نیم گرم پانی سے دھوئیں اور پیروں کو خشک کر کے موزے پہن لیں۔ اور پیروں کو سرد ہوا سے بچانے کی کوشش کریں۔ زیادہ ٹھنڈی ہوا لگنے سے پیر پھٹنے لگتے ہیں۔



ورزش نمبر ۱:

اِس ورزش سے ذہنی اُلجھن اور دماغی پریشانیاں دُور ہوتی ہیں۔ دماغ کو سکون ملتا ہے۔

فرش پر آرام سے بیٹھ جائیں۔ دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں سے کانوں کے سوراخ بند کر دیں۔ آنکھیں بند کر کے شہادت کی انگلیاں ان پر رکھ لیں۔ دوسری انگلیاں نتھنوں پر رکھ لیں۔ تیسری انگلیاں بالائی ہونٹ پر اور سب سے چھوٹی انگلیاں زیریں ہونٹ پر رکھ لیں۔

دوسری انگلیاں نتھنوں سے اٹھا کر گہرا سانس لیں۔ چار تک گنیں اور سانس کو باہر نکال دیں۔ یہ عمل پانچ بار دُہرائیں۔

ورزش نمبر ۲:

سر کا درد اگر اعصابی تناؤ سے ہو تو اس ورزش سے رفع ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ گردن کے نچلے حصّے میں درد ہو تو وہ بھی کم ہو جاتا ہے۔



فرش پر دوزانو بیٹھ جائیں۔ کولہے دونوں پیروں پر ٹکا لیں۔ دونوں پنجوں کا رُخ ایک دوسرے کی جانب ہونا چاہیے۔ دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر رانوں پر رکھ لیں۔ کہنیوں کو خم دے کر کندھے جتنے زیادہ اُچکا سکتی ہیں اُچکائیں۔ آہستہ آہستہ گردن کو کندھوں سے ملا کر آگے اور پیچھے کی طرف لے جائیں۔ شانوں کی رگڑ سے گردن کی مالش کریں۔ دو منٹ تک جاری رکھیں۔ یہ عمل ایک یا دو بار دُہرائیں۔

مطبوعات شمع بک ڈپو، کھلونا بک ڈپو، بانو بک ڈپو، شبستاں بک ڈپو

تبلیغی باتیں	مفتی حفیظ الدین	۲ روپے
تاج بہشتی زیور مکمل مجلد	مولانا اشرف علی تھانوی	۱۵ روپے
قرآن مجید مترجم رف مجلد	مترجم مولانا اشرف علی تھانوی	۸ روپے
ستاروں کے قیدی	ظفر پیامی	۲ روپے ۵۰ پیسے
کالی دنیا	سراج انور	۶ روپے ۵۰ پیسے
نیلی دنیا	سراج انور	۷ روپے
ڈرپوک چوہا	(رنگین)	۴۵ پیسے
گورنر کی بیٹی	طغرل پاشا	۳۵ پیسے
ہلال کی کہانیاں	عشرت رحمانی	۴۰ پیسے
جاپانی بچے	طغرل پاشا	۳۵ پیسے
مانو کے کارنامے	عشرت رحمانی	۷۵ پیسے
شاہی نجومی	راجہ مہدی علی خاں	۴۵ پیسے
سرکس کے کھیل	پرکاش پنڈت	۵۰ پیسے
شمع کشیدہ کاری		۸ روپے
رشیدہ کی کشیدہ کاری		۷ روپے ۵۰ پیسے
حسین کشیدہ کاری		۵ روپے
دلہن کشیدہ کاری		۵ روپے
زینت کشیدہ کاری		۱۰ روپے

شمع بک ڈپو آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

فردوس یاسمین، بھاگلپور

س۔ مذاق کب گراں گزرتا ہے؟

ج جب وہ عملی صورت اختیار کرلے۔

عبدالرزاق حسینی، حیدرآباد

س۔ انسان کا ضمیر کب جاگتا ہے؟

ج جب اپنے گناہ کا احساس ہو جائے۔

س۔ خوب صورت پھول کانٹوں میں کیوں ہوتا ہے؟

ج تاکہ لوگ اس کا حاصل کرنا آسان نہ سمجھیں۔

نواب اصغر علی نورجہاں بیگم، دھتہاد بازار

س۔ محلے کے لوگ کب اچھے لگتے ہیں؟

ج جب آپ ان کو اچھے لگتے ہوں۔

س۔ اپنا گھر ویران کب نظر آتا ہے؟

ج جب بیوی میکہ میں ہو۔

ناہید شمسی، بجنور

س۔ زندگی مایوسیوں کا جلتا ہوا چراغ ہے تو موت کیا ہے؟

ج چراغ سے چراغ جلتے آئے ہیں۔ اگر زندگی جلتا ہوا چراغ ہے تو موت دوسرا چراغ ہے جو زندگی کی لو بجھنے نہیں دیتا۔

س۔ جب دوست دوستی کے فرائض نہیں جانتے تو دوستی کا ہاتھ کیوں بڑھاتے ہیں؟

ج دوستی کے فرائض کسی کتاب اور قانون میں درج نہیں ہیں۔ تالی دونوں ہاتھ سے بجتی ہے۔ آپ جو کچھ اپنے دوست کو دیتے ہیں اس سے زیادہ پانے کی امید نہ رکھنی چاہئے۔

یاسمین سلطانہ، پیاری سلطانہ، کنٹور

س۔ مردوں کا کہنا ہے کہ عورتیں شکی مزاج اور کچے کان کی ہوتی ہیں یہ الزام بیچاری عورتوں پر مردوں نے لگائے ہیں آپ کا کیا خیال ہے؟

بزم بانو

اس عنوان کے تحت دلچسپ معلوماتی اور مذہبی سوالوں کے جواب دئے جاتے ہیں۔ ایک کاغذ پر یا پوسٹ کارڈ پر زیادہ سے زیادہ تین سوال لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کے لئے جگہ چھوڑیئے اور اپنا پورا نام پتہ لکھئے جس کاغذ یا کارڈ پر سوالات ہوں اس پر دفتر سے متعلق اور کوئی بات نہ لکھئے۔ اپنے سوالات اس پتہ پر بھیجئے: بزم بانو

ماہنامہ بانو آصف علی روڈ، نئی دہلی نمبر ۲

—— مدیرہ

ج ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان دونوں عادتوں میں عورتیں مردوں سے دو قدم آگے ہیں۔ گو اس میں ان کی فطرت سے زیادہ ان کے ماحول کا دخل ہے۔

ج کسی کا دل دکھانا سب سے بڑا گناہ ہے

پھر بھی آج کل کے مردوں نے عورتوں کے دل کو کھلونا کیوں سمجھ رکھا ہے بتائیے؟

ج کوئی انسان دوسرے کے دل کو اس کی خواہش کے خلاف کھلونا نہیں بنا سکتا۔

مسز پروین دلشاد، بادشاہ پور (حیدرآباد)

س۔ خواب کبھی سچا نہیں ہوتا پھر بھی لوگ خوب صورت خواب دیکھتے ایسا کیوں؟

ج جو امیدیں بیداری میں پوری نہیں ہوتی ہیں وہ اکثر خواب میں پوری ہو جاتی ہیں۔ خواب کے دوران ہر واقعہ سچا ہوتا ہے۔ آنکھ کھلنے کے بعد ہی وہ واقعہ خواب معلوم ہوتا ہے۔

س۔ درد جب بڑھتا ہے تو دوا ہو جاتا ہے پیار جب حد سے زیادہ بڑھ جائے تو؟

ج دیوانگی کی حدوں کو چھو لیتا ہے۔

فاروق علی ذاکر، کریم نگر

س۔ جدوجہد کے بعد ناکامی ہی ہاتھ آئے تو؟

ج اصل چیز جدوجہد ہے۔ کامیابی اور ناکامی دراصل آنے والی کامیابی کا پیش خیمہ ہے۔ انسان اپنی ناکامی سے جو کچھ سیکھتا ہے وہ اس کی آئندہ کامیابی کے لئے مشعل راہ بن جاتا ہے۔

ڈاکٹر محمد فضل الرحمٰن، کنٹور، آندھرا

س۔ شہرت حاصل کرنے کے لئے انسان کو کیا کرنا چاہئے؟

ج شہرت حاصل کرنے کا بہترین طریقہ دوسروں کے کام آنا ہے اگر یہ خدمت بے غرض ہو تو سبحان اللہ ۔۔۔

س۔ جھوٹ کا سہارا دولت مند لوگ لیتے ہیں یا غریب؟

ج جھوٹ بولنے کے لئے امیر اور غریب کی کوئی قید نہیں۔ یہ ایک مجبوری عادت ہے جیسے امیر لوگوں کو اپنی دولت بڑھانے اور اسے ٹیکس سے بچانے کے لئے اکثر جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔

خورشید بیگم، حیدرآباد

س۔ ماں کے آنسو، بہن کے آنسو اور بیوی کے آنسو، ان سب سے زیادہ انمول آنسو کس کے ہوتے ہیں؟

ج ماں اور بہن کے آنسو زیادہ انمول ہوتے ہیں۔ بیوی کے آنسو مصلحت آمیز ہوتے ہیں۔

رعنا خاتون، نگینہ

س۔ بھائی! شادی کے بعد لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کے ماضی کو کریدنے کی کوشش کیوں کرتے ہیں؟

ج ایک دوسرے کو سمجھنے کے لئے ماضی کا جاننا ضروری ہے ویسے ہم ہندوستانی لوگ زیادہ تر گڑے مردے اکھاڑنا پسند کرتے ہیں۔

س۔ اگر کسی کی سیدھی سادی زندگی پر راز کی تہہ چڑھا دی جائے؟

ج یہ اس کی خوش قسمتی ہے۔ لوگ پُراسرار زندگی کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

بیگم رضیہ زبیر شمسی، محمد آباد گوہنہ

س۔ انسان خود کو کب بھول جاتا ہے؟

ج جب اس کے دل پر کسی اور کا قبضہ ہو جائے

س۔ بعض لوگ اپنے مقابلے میں دوسروں کو حقیر اور کمتر کیوں سمجھتے ہیں؟

ج وہی لوگ ایسا کرتے ہیں جنہیں گزشتہ زمانے میں لوگوں نے حقیر سمجھا تھا۔ اپنا وقت آنے پر یہ لوگ اسی برتاؤ کو دہراتے ہیں

س۔ کسی کی بُری عادت کو کیسے بدلا جا سکتا ہے؟

ج اسے اپنی بری عادت کو بدلنے کا مشورہ نہ دیا جائے۔ اسے صرف اتنا بتانا چاہیے کہ اس کی بُری عادت کس طرح پیدا ہوئی۔

محمد صابر ردی والے، دہلی

س۔ لڑکیاں اپنے حسن پر کیوں ناز کرتی ہیں؟

ج حسن خدا کا عطیہ ہے۔ اس پر ناز کرنا بجا ہے۔

س۔ آج کل کی لڑکیاں لڑکوں کو دیکھ کر کیوں مسکراتی ہیں؟

ج ان کے زنانہ پن کی وجہ سے۔

وقار احمد خاں، گریڈیہہ

س۔ کیا بیوی ماں کی ممتا اور بہن کا پیار دے سکتی ہے؟

ج بیوی صرف بیوی کا پیار دے سکتی ہے اس سے ماں اور بہن کا پیار مانگنا نابالغ ہونے کی نشانی ہے۔

س۔ شہرت حاصل کرنے کے لئے کیا کرنا چاہیے؟

ج اپنے وقت کا کچھ حصہ دوسروں کے لئے وقف کر دیجئے۔

محمد تمیز احمد، نظام آباد

س۔ جھوٹ کا سہارا کون لوگ لیتے ہیں؟

ج آرٹسٹ۔ ادیب اور شاعر۔ جھوٹ بولنا ایک آرٹ ہے جسے ایک آرٹسٹ ہی خوب صورتی سے استعمال کر سکتا ہے۔

س۔ جھوٹ انسان کو کدھر لے جاتا ہے؟

ج اُمید کے فرضی باغات میں۔

نفیسہ یاسمین، نئی دہلی

س۔ شادی کا اصل مقصد کیا ہے؟

ج مردوں کے جذبات کی تسکین عورتوں کے لئے تحفظ اور اپنے گھر کی تلاش جسے وہ اپنا کہہ سکے۔

س۔ کسی کے دل میں جگہ نہ ملے تو؟

ج دل کے دروازے پر دستک دیتی رہیے ایک نہ ایک دن یہ دروازہ ضرور کھلے گا۔

متین صدیقی، حیدرآباد

س۔ لوگ محبت کر کے دھوکا کیوں دیتے ہیں؟

ج دھوکا کھانے والے کی خواہش سے مجبور ہو کر۔

س۔ صبر کا پھل کڑوا کب ہوتا ہے؟

ج جب اس کے حاصل کرنے میں بہت دیر لگ جائے۔

س۔ زندگی دھوپ ہے یا سایہ؟

ج محنت کے وقت دھوپ اور آرام کے وقت سایہ۔

محمد یوسف ماسٹر، ناندگاؤں قاضی

س۔ جو شادی نہیں کرتا وہ بھی پچھتاتا ہے اور جو شادی کرتا ہے وہ بھی پچھتاتا ہے ایسا کیوں؟

ج جو لوگ پچھتانے کے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں وہ ہر بات پر پچھتاتے ہیں۔

س۔ حقیقت کی کیا پہچان ہے؟

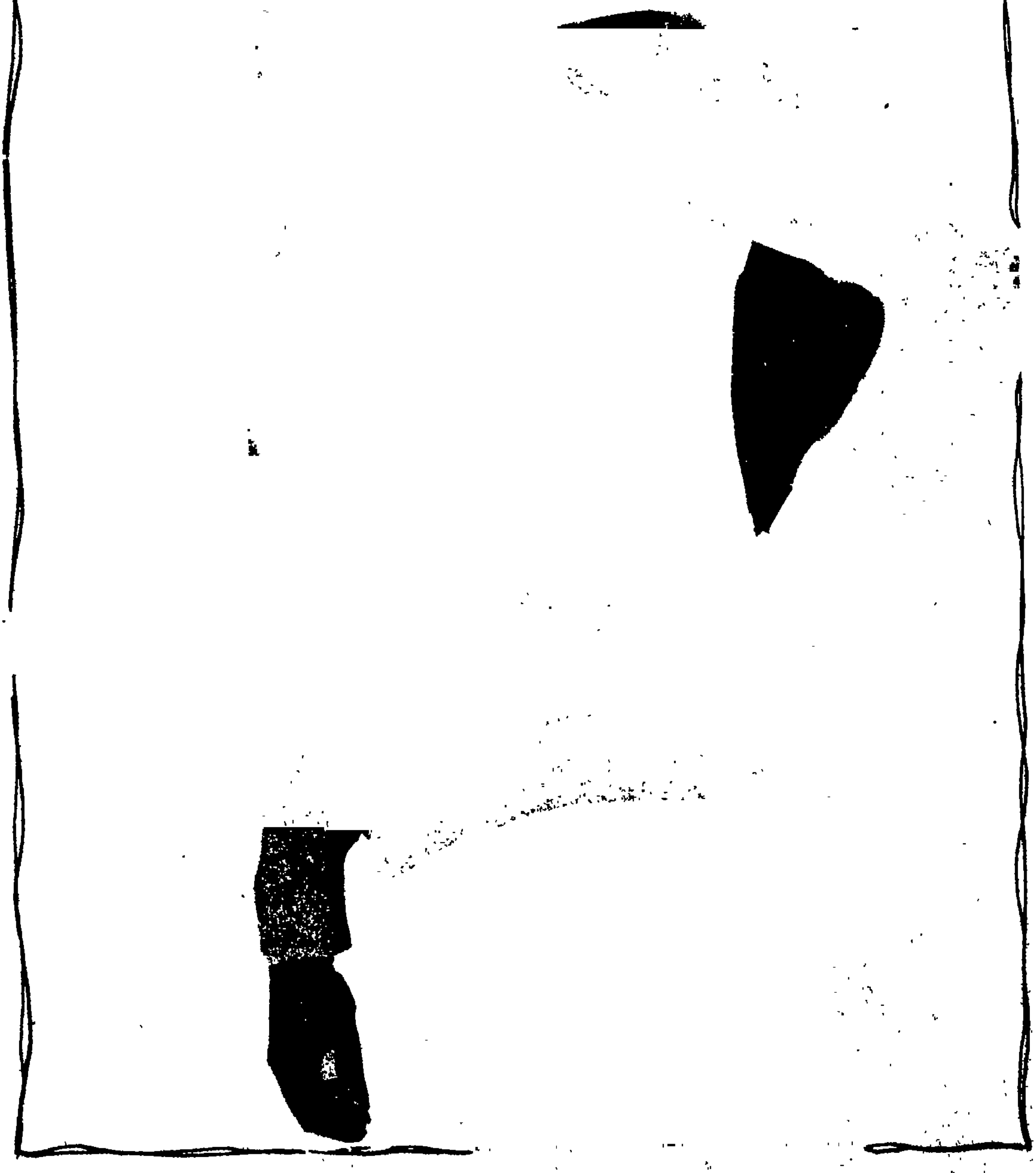
ج جب اسے دل تسلیم نہ کرے لیکن دماغ تسلیم کرے۔

ناز لطیفی، حیدرآباد

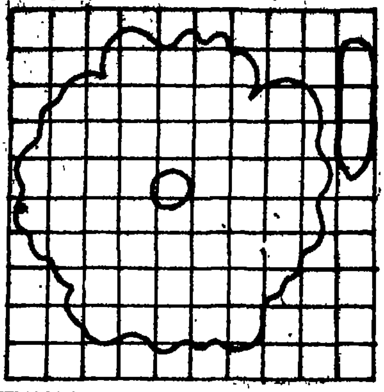
س۔ لیٹ کر پڑھنے کے فوائد اور نقصانات کیا ہیں؟

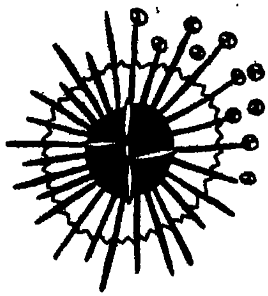
ج لیٹ کر پڑھنے سے نیند آجاتی ہے نیند آنا فائدے کی علامت ہے۔ اور نیند کی وجہ سے مطالعہ ادھورا رہ جانا نقصان کی۔

مردانہ سویٹر کا
خوب صورت نمونہ



پھول کا
اصلی
سائز

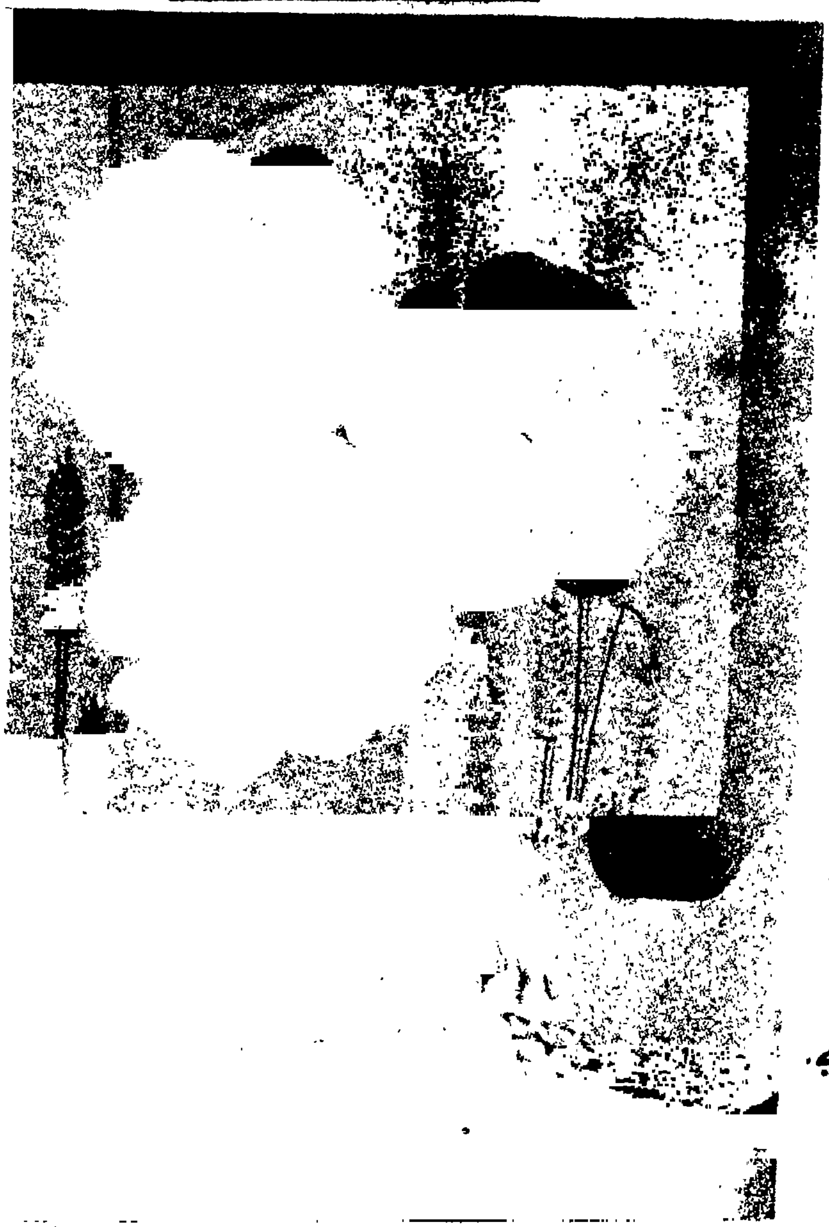




درمیانی حصے کو لمبے چھوٹے
ٹانکے سے گہرے رنگ
میں کاڑھیے۔



پتیاں لیزی ڈیزی
ٹانکے سے
بنیں گی

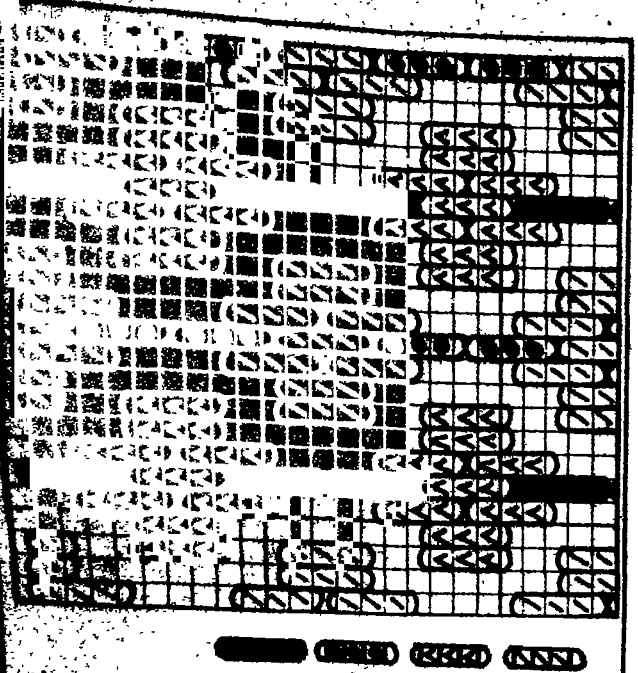


فوم کے چوڑے ٹکڑے پر
گرم کپڑے کی
کترنوں سے پھول بنائیے۔

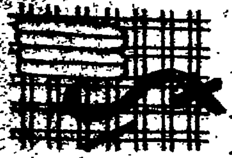


▲ خوب صورت ٹی کوزی

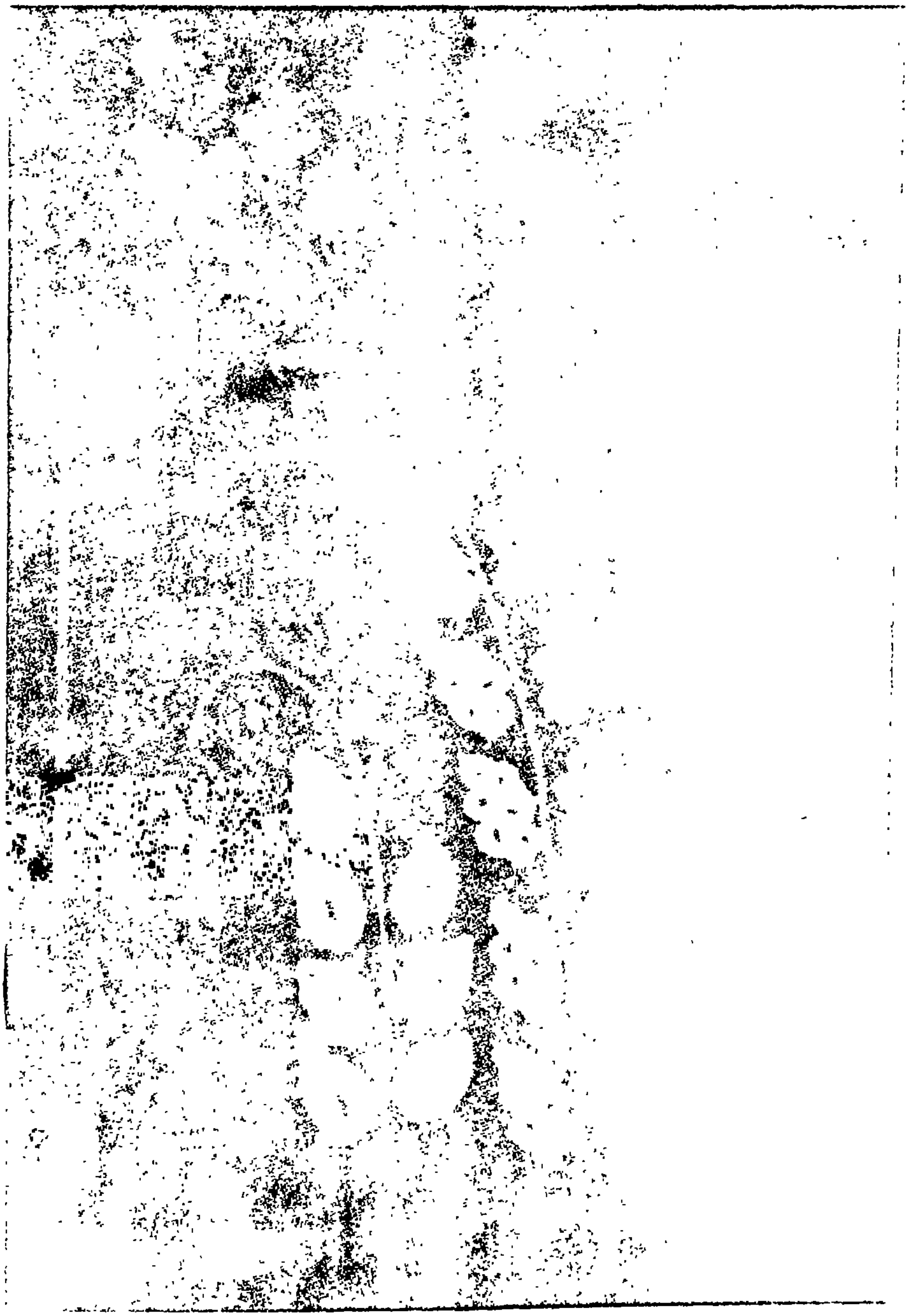
▲ دوسوتی میں ڈبل پلائی اون سے ساٹن اسٹچ سے ٹی کوزی کاڑھیے



	Cushion	Stool	Tea Cosy
	Beehive 2583 Anchor (0306)	Beehive 2671 Anchor (0167)	Beehive 2644 Anchor (0688)
	Beehive 2601 Anchor (0348)	Beehive 2544 Anchor (0168)	Beehive 2500 Anchor (09)
	Beehive 2623 Anchor (0842)	Beehive 2548 Anchor (0187)	Beehive 2503 Anchor (019)
	Beehive 2665 Anchor (0867)	Beehive 2630 Anchor (0861)	Beehive 2579 Anchor (0286)



▲ ٹی کوزی کا خاکہ



کروشیا سے بنے گہرے رنگوں میں پھول بنا کر کپڑے پر علیحدہ سے لگا ہے



آدمی نے کُتّے کو کاٹ لیا

مشرقی پنجاب کے شہر موگہ میں ایک پاگل آدمی نے کُتّے کو کاٹ کھایا۔ یہ آدمی بازار سے گزر رہا تھا کہ ایک کُتّے نے اس کی ٹانگ پکڑ لی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ آدمی پہلے ہی سے اِس حملے کے لئے تیار تھا۔ اُس نے فوراً کُتّے کے دونوں کان پکڑ کر اُسے اُوپر اُٹھا لیا اور اُس کی دُم اپنے دانتوں سے پکڑ لی۔ کُتّے نے اپنی دُم چھڑانے کے لئے بہت زور لگایا، لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ کُتّے اور آدمی کی یہ لڑائی چند منٹ جاری رہی۔ آدمی کو معمولی سے زخم آئے، لیکن اُس نے کُتّے کی دُم کاٹ کر ہی دَم لیا۔

دیمک کے پُجاری

جموں کے ایک گاؤں میں این۔ایس۔ایس کے افسران اور طالب علم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ لوگ وہاں دیمک کی پوجا کرتے ہیں۔ دیمک کا گھونسلہ ٹیلہ نما ہوتا ہے۔ اس گاؤں کے رہنے والے اس ٹیلے کی پوجا کرتے ہیں۔ اس کے آگے پھول رکھتے ہیں۔ پھل اور مٹھائی رکھتے ہیں۔ جب افسروں نے دیمک کو ہلاک کرنے کے لئے دوائیاں نکالیں تو سارا گاؤں ان کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا۔ افسروں کا کہنا تھا کہ دیمک کھانے کی چیزوں اور کتابوں کو چاٹ جاتی ہے۔ گاؤں والوں کا اصرار تھا کہ دیمک ان کی دیوی ہے۔ اس تنازعہ میں سرکاری افسروں کی جیت ہوئی اور انہوں نے گاؤں والوں کی مخالفت کے باوجود دیمک کو ہلاک کر دیا۔

بنک سے روپیہ کس طرح نکالیں؟

کرناٹک کے ایک شہر میں بنک آف میسور میں روپیہ جمع کرانے والے حیران ہیں کہ وہ اِس بنک سے اپنا روپیہ کس طرح نکالیں۔ دراصل شہد کی مکھیوں نے اس بنک کے دروازے پر اپنا چھتا بنایا ہے۔ یہ مکھیاں کسی کو بنک میں داخل نہیں ہونے دیتیں۔ کچھ لوگوں نے منہ پر کپڑا باندھ کر بنک میں گھسنے کی کوشش کی، لیکن یہ مکھیاں ان کے جسم میں گھس گئیں اور ان کو بُری طرح کاٹا اور اب تک پانچ آدمی ان مکھیوں کے کاٹنے کی وجہ سے اسپتال جا چکے ہیں۔ دو بوڑھی عورتیں ان کے زہریلے ڈنک کے اثر سے بستر پر پڑی ہیں۔ بنک عارضی طور پر بند کر دیا گیا ہے۔ بنک کے منیجر نے صورت حال پر قابو پانے کے لئے مکھیوں کے چھتے کو جلانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

اسپین میں نیا سال منانے کی عجیب رسم

اسپین میں نئے سال کی آمد پر لوگ میڈرڈ کے چوک میں جمع ہو جاتے ہیں۔ جُوں ہی گھنٹہ گھر نصف شب کا اعلان کرتا ہے، ہزاروں لوگ بڑے بڑے انگوروں کو نگلنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہر آدمی کو لازم ہے کہ وہ کم از کم ایک درجن بڑے انگور نگلے۔ اسپین میں ایک قدیمی روایت ہے کہ نیا سال شروع ہوتے ہی انگور نگلنے سے انسان اگلے بارہ ماہ تمام آفتوں سے محفوظ رہتا ہے۔ بڑے سائز کے انگور نگلنا دشوار کام ہے۔ لیکن اسپین کے لوگ بڑی مہارت سے انگور نگل جاتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق اسپین کے لوگ نئے سال کی رات کو ایک ہزار ٹن وزن کے انگور نگل جاتے ہیں۔ یہ لوگ اس رسم کے اس قدر پابند ہیں کہ تھیٹر اور کھیل تماشے کو روک کر اکثر انگور کھاتے ہیں۔

روپے کا نیلام

حیدرآباد میں ایک سب انسپکٹر پولیس کو سڑک پر ۱۰۰ روپے کا نوٹ ملا۔ یہ نوٹ کئی روز تک تھانے میں بند پڑا رہا۔ سب انسپکٹر پولیس نے بہت انتظار کیا، لیکن اس نوٹ کا کوئی دعوے دار نہیں آیا۔ قانون کی رُو سے کھوئی ہوئی چیز کے دعوے دار کا چھ مہینے تک انتظار کیا جاتا ہے۔ اس نوٹ کو چھ مہینے تک انتظار کرنے کے بعد نیلام کر دیا جائے گا۔ سب سے اونچی بولی دینے والے کو یہ نوٹ مل جائے گا اور نیلام سے جمع کی ہوئی رقم سرکاری خزانے میں جمع کر دی جائے گی۔

فاضل زمین کس کے نام کی جائے؟

مدھیہ پردیش کے ٹونک ضلع میں ایک زمیندار کے فاضل زمین تھی۔ زمین کی ملکیت کی حد مقرر ہے۔ اس زمیندار کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ فاضل زمین کو سرکار کے چنگل سے کس طرح بچائے۔ آخر اُس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ اُس نے فاضل زمین اپنے دو پالتو کتّوں کے نام کر دی۔

اردن کی تاریخ میں پہلا واقعہ

اردن کی ایک عدالت نے ایک عورت کو پھانسی کی سزا دی ہے۔ اس عورت کے خلاف یہ الزام تھا کہ اُس نے اپنی ساس کو قتل کیا ہے۔ اردن

کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ ایک عورت کو سزائے موت دی گئی۔

کیا اُسے اپنی موت کا علم تھا؟

ضلع میرٹھ میں ایک بچی بار بار اپنے ماں باپ سے کہتی کہ وہ اُوپر جانے والی ہے۔ بچی کی عمر دس بارہ سال تھی۔ ماں باپ اس بات کو مذاق سمجھ کر ٹال دیتے۔ بچی سنجیدگی سے یہ بات کہتی تو وہ بھی سوچ میں پڑ جاتے۔ ایک دن صبح کو اسکول جانے سے پہلے اس بچی نے اپنے ماں باپ سے کہا کہ آج میں اُوپر چلی جاؤں گی۔ ماں باپ نے کہا اُوپر بعد میں جانا پہلے اسکول جاؤ۔ وہاں سے آنے کے بعد وہ ماں باپ کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھ گئی۔ اُن کا گھر سڑک کے کنارے تھا۔ ایک بھاری ٹرک سڑک پر گزر رہا تھا۔ جب وہ اس گھر کے قریب پہنچا تو اس کا دُھرا ٹوٹ گیا۔ دُھرا ٹوٹ جانے سے پہیہ ٹرک سے الگ ہو گیا۔ ٹرک پُوری رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ پہیہ تیز رفتاری سے دوڑتا ہوا سڑک کے ایک جانب مُڑ گیا۔ یہ پہیہ تیزی سے دوڑتا ہوا اس گھر میں گھس گیا اور ٹھیک بچی کے سینے پر لگا۔ ایک تو ٹرک کا بھاری پہیہ۔ دوسرے اس کی تیز رفتاری۔ بچی نے وہیں دم توڑ دیا۔ ماں باپ سامنے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ ان کا بال بھی بانکا نہ ہوا۔

چُوہوں پر کوئی پابندی نہیں!

ہندوستان سے جنگلی جانوروں کی ایکسپورٹ ممنوع ہے۔ شیر اور چیتوں کی کھالیں بڑی تعداد میں ہندوستان سے باہر بھیجی جاتی ہیں۔ اب تمام جنگلی جانوروں کی کھالیں ایکسپورٹ کرنے پر پابندی ہے۔ چوہے اس پابندی سے مستثنیٰ ہیں۔ ہر قسم کے چوہے زندہ یا مُردہ کسی لائسنس کے باہر کے ملکوں کو بھیجے جا سکتے ہیں۔

بیوی اور اُس کے آشنا کے ہاتھوں خاوند کا قتل

اندور پولیس نے ایک کنوئیں سے گج راج نامی ایک شخص کی لاش برآمد کی ہے۔ یہ شخص کئی روز سے لاپتہ تھا۔ پولیس کو تحقیقات کے دوران اس کی بیوی پر شبہ ہوا۔ بیوی نے جُرم کا اقرار کیا۔ گج راج کی بیوی اور اُس کے آشنا نے اس کو ٹھکانے لگانے کا منصوبہ بنایا۔ پہلے اُنہوں نے اس کو بہانے سے ایک خواب آور دوا پلا دی۔ جب وہ بے ہوش ہو گیا تو اس کا سر کاٹ کر باقی دھڑ کنوئیں میں ڈال دیا۔

پولیس نے گج راج کی بیوی اور اس کے آشنا کو قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا ہے۔

دمے کا ڈاکٹر ٹیکس افسران کے دام میں!

جالندھر کے ایک گاؤں میں ایک نقلی ڈاکٹر پریکٹس کرتا تھا۔ یہ ڈاکٹر اپنے آپ کو دمے کا اسپیشلسٹ بتاتا تھا۔ دمے کے علاوہ بھی وہ کئی بیماریوں کا علاج کرتا تھا۔ وہ آس پاس کے علاقے میں کافی مشہور تھا۔ ہزاروں لوگ اس کے پاس علاج کے لئے آتے۔ اس ڈاکٹر نے صحیح انکم ٹیکس نہیں دیا اور نہ ہی حکومت کو اپنی دولت کی صحیح تفصیل مہیا کی جو قانوناً ضروری ہے۔

ٹیکس افسران کو اس ڈاکٹر پر مدت سے شبہ تھا۔ آخر ایک دن انہوں نے اس کے دواخانے پر چھاپہ مارا۔ باہر سے اس کا گھر اور مطب دو الگ الگ عمارتیں معلوم ہوتی تھیں، لیکن اصل میں یہ ایک ہی عمارت تھی۔

افسروں نے پہلے ایک فرضی گاہک اس ڈاکٹر کے پاس بھیجا۔ اس نقلی مریض نے اس ڈاکٹر کی پریکٹس کا اندازہ لگایا۔ مختلف مریضوں سے پُوچھ تاچھ کی۔ اس کے اندازے کے مطابق ڈاکٹر کی سالانہ آمدنی تین لاکھ روپیہ تھی۔ ڈاکٹر نے اپنی آمدنی ۵۰۰ روپے بتائی تھی۔

تحقیقات کے دوران یہ بھی پتہ چلا کہ اس کے پاس کوئی میڈیکل ڈگری نہیں۔ پہلے یہ ڈاکٹر افریقہ میں پریکٹس کرتا تھا۔ پھر وہاں سے ہندوستان واپس آ گیا اور جالندھر میں آباد ہو گیا۔ اس کو ایک ہزار روپیہ پنشن ملتی تھی۔ اُس نے اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے کے لئے ایک گاؤں میں پریکٹس شروع کر دی۔ وہ دمے کا ماہر بن گیا۔ دراصل وہ گاؤں کے سادہ لوح لوگوں کو بے وقوف بناتا تھا۔ وہ ایک مشہور فرم سے تھوک میں کھانسی اور دمے کی دوا خریدتا۔ اس دوا میں پانی ملاتا۔ ملاوٹ کا تناسب ۲ شیشی دوا اور ایک شیشی پانی ہوتا۔ یہ دوا وہ دوسری بوتلوں میں بھرتا اور اپنے لیبل لگا کر فروخت کرتا۔

انکم ٹیکس کے افسروں نے جب اس کے گھر پر چھاپہ مارا تو انہیں اس کے گھر میں سونے کے زیورات، نقد روپیہ اور بنک کے ڈپازٹ کی رسیدیں ملیں۔ تحقیقات کے دوران یہ معلوم ہوا کہ اس نے اپنے دوست کے گھر ایک مقفل صندوق امانت رکھا ہے۔ یہ صندوق برآمد ہوا تو اس میں چھ لاکھ روپے کے کرنسی نوٹ تھے۔ چھپی ہوئی دولت کا اندازہ تقریباً ۲۸ لاکھ روپے تھا۔

اس ڈاکٹر پر اپنی دولت کو ٹیکس سے بچانے کے جُرم میں مقدمہ چلایا جائے گا۔ اس کے علاوہ اس پر دھوکہ دہی اور دواؤں میں ملاوٹ کرنے اور انہیں اپنے نام سے فروخت کرنے کے الزام میں بھی مقدمہ چلے گا۔ ●●

باورچی خانہ

مزے دار اور آزمودہ پکوان

سبزیوں کے سوپ

گاجر ۲ عدد (درمیانہ سائز)
مٹر ۲۵۰ گرام
پھول گوبھی ۲۵۰ گرام
آلو ۲ عدد (درمیانہ سائز)
پیاز ۲ عدد (درمیانہ سائز)
دودھ ایک پیالی
کالی مرچ ایک چائے کا چمچہ
نمک حسب ذائقہ
گھی ایک ٹیبل اسپون

گاجروں کو چھیل کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرلیں۔ مٹر کی پھلیوں کو چھیل کر دانے نکال لیں، آلوؤں کو چھیل کر آٹھ آٹھ ٹکڑے کرلیں گوبھی کا پھول کاٹ لیں، ڈنٹھل پھینک دیں۔ پیاز کے لچھے کاٹ لیں۔ اب ایک دیگچی میں گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ گھی گرم ہوجائے تو اس میں پیاز اور سب سبزیاں ڈال دیں۔ دو چار منٹ بھون کر پانچ پیالی پانی، نمک اور کالی مرچیں ڈال دیں۔ پھر دیگچی کو ڈھانپ دیں اور آنچ دھیمی کردیں جب سب سبزیاں گل جائیں تو دودھ بھی اس میں ملادیں پانچ سات منٹ پکا کر آنچ سے اُتارلیں اور چمچے سے اچھی طرح گھونٹ دیں۔ اگر سوپ گاڑھا معلوم ہو تو اس میں تھوڑا سا پانی اُبال کر ملالیں۔

ٹماٹر کی سبزی

ٹماٹر ۵۰۰ گرام
پیاز ۲ عدد (بڑی)
ادرک ۲ انچ کا ٹکڑا
لہسن ۶ جوے
لال مرچ ۵ عدد
ہلدی آدھا چائے کا چمچہ
ہری مرچ ۳ عدد
خشخاش ایک چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا (کٹا ہوا) ۲ چائے کے چمچے
ناریل (سوکھا) ۲ انچ کا ٹکڑا
سفید زیرہ ۲ چائے کے چمچے
نمک حسب ذائقہ
گھی آدھی پیالی
املی ۱۰ گرام

ٹماٹروں کو دھو کر اُن کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرلیں۔ پیاز کے لچھے کاٹ لیں۔ املی کو آدھی پیالی پانی میں بھگو دیں۔ جب پھول جائے تو ہاتھ سے مل کر گودا نکال لیں اور پھوک پھینک دیں۔ ناریل کو باریک باریک کاٹ لیں۔ زیرے کو بغیر گھی کے بھون کر موٹا موٹا کوٹ لیں۔ لال مرچ، ادرک، ہلدی، لہسن اور خشخاش کو سل پر تھوڑا پانی ڈال کر باریک پیس لیں۔ ہری مرچوں کا کچومر کاٹ لیں۔ اب ایک دیگچی میں گھی اور آدھے پیاز کے لچھے ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ پیاز بادامی ہوجائے تو اس میں پسے ہوئے مسالے اور آدھ پیالی پانی ڈال دیں۔ جب مسالہ بھن جائے تو اس میں کٹے ہوئے ٹماٹر اور ناریل ڈال دیں۔ آنچ دھیمی کردیں جب ٹماٹر گھل جائیں تو اس میں زیرہ، پیاز کے لچھے، نمک اور املی کا گودا ملادیں پانچ سات منٹ کے بعد ہری مرچ کا کچومر اور ہرا دھنیا بھی ڈال دیں اور ایک منٹ کے بعد آنچ سے اُتارلیں۔

سبزی کباب

آلو ۲۵۰ گرام
مٹر ۲۵۰ گرام
گوبھی ۲۵۰ گرام
لہسن ۴ جوے
ادرک ایک انچ کا ٹکڑا
ہری مرچ کا کچومر پاؤ پیالی
ہرے دھنیے کا کچومر آدھی پیالی
لیمو ایک عدد
نمک حسب ذائقہ
گھی حسب ضرورت
انڈا ایک عدد
کرم (سوکھی ڈبل روٹی کا چورا) آدھی پیالی

آلو کو چھیل لیں۔ مٹر کی پھلیوں سے دانے نکال لیں۔ گوبھی کو کاٹ لیں (ڈنٹھل پھینک دیں) اب تینوں چیزوں کو الگ الگ اُبال لیں، پھر تینوں چیزوں کو ملا کر آٹے کی طرح گوندھ لیں۔ لہسن، ادرک کو چھیل لیں۔ پھر ادرک، لہسن، ہرے دھنیے، اور ہری مرچ کو سل پر پیس لیں اور سبزیوں میں ملادیں۔ نمک اور لیموں کا رس بھی ملادیں۔ ایک کڑھائی میں گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ اب ایک پاؤ انچ موٹی گول سیخ یا لکڑی لیں۔ اس پر مسلی اور گندھی ہوئی سبزی چاروں طرف لگادیں۔ سبزی کباب کی موٹائی آدھا انچ اور لمبائی تین انچ ہونا چاہیے پھر انڈے میں ہاتھ ڈبو کر اس پر مل دیں۔ دوسرے

ہاتھ سے کرم ہر طرف لگا دیں۔ پھر احتیاط سے کفگیر سے اتار کر گرم گھی میں ڈال دیں۔ اسی طرح تمام کباب تل لیں اور کسی بھی چٹنی کے ساتھ گرم گرم کھائیں۔

مٹر کا اچار

مٹر کے دانے ۵۰۰ گرام

رائی ۲۵ گرام

لال مرچ ۳ چائے کے چمچے

گرم مسالہ ایک چائے کا چمچہ

ہلدی ایک چائے کا چمچہ

کالی مرچ (ثابت) ایک چائے کا چمچہ

نمک حسبِ ذائقہ

تیل آدھا لیٹر

ایک دیگچی میں پانچ پیالی پانی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ پانی ابلنے لگے تو اس میں مٹر کے دانے ڈال دیں۔ ایک منٹ بعد آنچ سے اتار لیں اور چھلنی میں چھان کر صاف اور موٹے کپڑے پر دانوں کو خشک کرنے کے لئے پھیلا دیں۔ اب ایک صاف اور خشک مرتبان میں مٹر کے دانے اور سب مسالے ڈال کر خوب اچھی طرح ملا دیں اور مرتبان کو ایک دن کے لئے دھوپ میں رکھ دیں۔ دوسرے دن تیل بھی اس میں شامل کر دیں۔ چار پانچ روز اسے دھوپ میں رکھنے کے بعد استعمال کریں۔

پنیر کے کوفتے

پنیر ۵۰۰ گرام

کرم (سوکھی ڈبل روٹی کا چورا) ۳ پیالی

انڈے ۴ عدد

لال مرچ ایک چائے کا چمچہ

بیکنگ پاؤڈر پاؤ چائے کا چمچہ

نمک حسبِ ذائقہ

گھی حسبِ ضرورت

پنیر کو کدوکش میں کس لیں، پھر اس میں تین انڈے، لال مرچ، نمک اور دو پیالی کرم خوب اچھی طرح ملا لیں۔ ایک انڈے میں تھوڑا سا پانی ملا کر اچھی طرح پھینٹ لیں۔ اب ایک کڑھائی میں گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ کرم ملے ہوئے پنیر کے چھوٹے گول کوفتے بنا لیں پھر کوفتے کو پہلے پھینٹے ہوئے انڈے میں ڈبوئیں پھر اس پر ہر طرف کرم لگا لیں اور اس کے بعد گرم گھی میں ڈال دیں۔ ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ پانچ، چھ کوفتے گھی میں ڈالیں جب کوفتے بادامی رنگ کے ہو جائیں تو انہیں آنچ سے اتار لیں۔

کوفتوں کا مسالہ

پیاز ایک عدد (درمیانہ سائز)

لال مرچ ایک چائے کا چمچہ

ثابت دھنیا ایک چائے کا چمچہ

سفید زیرہ آدھا چائے کا چمچہ

تل آدھا چائے کا چمچہ

خشخاش آدھا چائے کا چمچہ

نمک حسبِ ذائقہ

دہی ½ پیالی

ادرک دو انچ کا ٹکڑا

گھی پاؤ پیالی

ہلدی پاؤ چائے کا چمچہ

ادرک اور پیاز باریک کاٹ لیں۔ دھنیا، زیرہ تل اور خشخاش کو بغیر گھی کے کڑھائی میں ڈال کر ہلکا سا بھون لیں، پھر سل پر باریک پیس لیں اب دیگچی میں گھی، کٹی ہوئی پیاز اور ادرک ڈال کر آنچ پر رکھ دیں، جب دونوں بادامی ہو جائیں تو انہیں گھی سے نکال کر سل پر پیس لیں۔ اس کے بعد انہیں پھر گھی میں ڈال دیں۔ ساتھ ہی باقی سب مسالے اور پاؤ پیالی پانی بھی ڈال دیں اور مسالے کو بھون لیں، پھر دہی کو اچھی طرح پھینٹ کر اس میں شامل کر دیں۔ جب دہی کا پانی بھن جائے تو مزید پاؤ پیالی پانی ڈال دیں جب پکنے لگے تو اس میں تلے ہوئے کوفتے ڈال دیں اور ایک منٹ بعد آنچ سے اتار لیں۔

انڈوں کی فیرنی

انڈے ۴ عدد

چاول پاؤ پیالی

دودھ آدھا لیٹر

چینی آدھی پیالی

پستے ۱۰ عدد

بادام ۵ عدد

ورق حسبِ ضرورت

چاولوں کو دو گھنٹے کے لئے بھگو دیں پھر سل پر باریک پیس لیں۔ پستے اور باداموں کو گرم پانی میں بھگو کر چھلکے اتار دیں۔ پھر ہوائیاں کاٹ لیں۔ انڈوں کو توڑ کر زردی، سفیدی الگ الگ کر لیں سفیدی کسی اور کام میں لے آئیں۔ کھیر میں صرف زردی ڈالیں زردی کو خوب پھینٹ لیں۔ اب دودھ کو آنچ پر رکھ دیں۔ پھر اس میں پسے ہوئے چاول بھی ڈال دیں چمچہ برابر چلاتی رہیں۔ جب دودھ کھیر کی طرح گاڑھا ہو جائے تو اس میں انڈے بھی ملا دیں۔ دو چار منٹ پکا کر اس میں چینی بھی شامل کریں جب چینی گھل جائے تو فیرنی آنچ سے اتار لیں۔ ڈش میں یا پیالوں میں نکالنے کے بعد اوپر سے پستے بادام کی ہوائیاں چھڑک دیں اور ورق لگا دیں۔

کہی سنی

مرد بچہ

بھابی صاحبہ :

شادی سے پہلے جب میں اس طرح کی کوئی بات سنا کرتی تھی کہ "وہ مرد بچہ ہے" بھلا کسی سے ڈرے کیوں؟" تو 'مرد بچہ' کو میں صرف محاورہ سمجھتی تھی اور اس سے 'دلیر مرد' مراد لیتی تھی لیکن شادی کے بعد مجھ پر یہ بھید کھلا کہ یہ محاورہ اپنے لفظی مفہوم میں زیادہ درست ہے۔ یعنی مرد سچ مچ 'بچہ' ہوتا ہے اور بچہ ہی رہتا ہے۔ وہ شادی کے بعد بیوی کی طرف سے اسی 'دلار' پیار (اور کبھی کبھی پھٹکار) کا آرزومند رہتا ہے جو اسے بچپن میں ماں کی طرف سے ملا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ 'بالک ہٹ' میں مبتلا رہتا ہے اور جب سے یہ راز مجھ پر کھلا ہے، میری گھریلو زندگی زیادہ سکھی ہو گئی ہے، کیوں کہ میں اب اپنے شوہر کا بھی اسی طرح خیال رکھتی ہوں، جس طرح اپنے بچوں کا اور نتیجے میں شوہر صاحب بھی مجھ سے اتنے ہی خوش رہتے ہیں جتنے بچے۔

شگفتہ سمن، کلکتہ ۱۷

بانو: دسمبر ۱۹۷۶

محترمہ :

منجو چودھری کے انٹرویو (بانو: دسمبر، ۱۹۷۶) میں کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں۔ یہ انٹرویو میں نے لیا تھا۔ براہ کرم اگلے شمارے میں ان غلطیوں کی تصحیح شائع کر دیں۔

انٹرنیشنل آرٹ ایگزیبیشن میں مجسمہ سازی کے جج شری شیام سندر بھگت تھے۔ انٹرویو میں 'شری بھارت' چھپ گیا ہے۔

ورکنگ گرلز ہاسٹل میں کمرے کا کرایہ ۵۰ روپے نہیں ۶۰ روپے ماہ وار ہے۔

ایک اور جگہ لکھا ہے نومبر ۱۹۷۴ میں پہلا امداد کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ صدر مملکت کی بیگم عابدہ احمد اس کمیٹی کی صدر مقرر ہوئیں حقیقت یہ ہے کہ بیگم صاحبہ نہ صرف اس کمیٹی کی صدر ہیں، بلکہ اس کمیٹی کی داغ بیل ہی انہوں نے ڈالی تھی۔

محمد عبداللہ ہاشمی دہلی ۱۲

سوئیٹ بھابی :

اس بار آپ کا "افتتاحیہ" میرے لئے "سکونِ زندگی" بن گیا۔ بات یہ ہے کہ میں ایک ادارے کی سکریٹری ہوں۔ سوشل ورک میری زندگی کا اہم جز ہے۔ لیکن مجھے آئے دن ایک نئی افواہ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جس سے میرا ذہن کافی پریشان رہتا ہے۔ میرے بارے میں افواہ پھیلانے والے بھی کوئی اور کوئی نہیں "میرے اپنے" ہی ہیں۔ تقریباً تین ماہ میں سے بے حد ذہنی کشمکش میں مبتلا تھی کہ مجھے زندگی کی کون سی راہ اختیار کرنا چاہئے؟ اپنے لئے جینا چاہئے یا دوسروں کے لئے؟ اب آپ کے افتتاحیہ نے فیصلہ کر دیا۔ اس نے مجھ میں ایک نیا عزم اور حوصلہ پیدا کر دیا ہے۔ اب میں نے عہد کر لیا ہے کہ کسی بھی افواہ پر دھیان نہ دوں گی اور میری وہی راہ ہوگی جو صحیح اور سچی ہے اور دوسروں کی بھلائی کے لئے ہے۔

شریفہ شمعون علی، اندور

ڈیر بھابی :

بانو: دسمبر میں امینہ کا مضمون "کرشمہ انسان کے ہاتھ میں ہے" میرے لئے ولولوں کا سرچشمہ ثابت ہوا۔ "چوزی کے غلام" اور "خوابوں کا شہزادہ" بے حد پُر لطف ہے۔

بیوٹی کالج تو افادیت کا خزانہ ہے۔ ہر ماہ یہ خوب صورتی میں اضافہ کرنے کے نئے نئے طریقے بتاتا ہے۔

بلقیس پروین، راقنہ کیلا!

پیاری بھابی :

قاضی مشتاق احمد کا مضمون "خوابوں کا شہزادہ" (بانو: دسمبر ۱۹۷۶) پڑھ کر ان لوگوں کی آنکھیں یقیناً کھلی ہوں گی جو پڑھی لکھی لڑکیوں کی 'آزادی' پر خواہ مخواہ ناک بھوں چڑھاتے رہتے ہیں۔ اس سروے نے واضح طور پر ثابت کر دیا ہے کہ تعلیم یافتہ لڑکیوں کی اکثریت ابھی تک مشرقی قدروں کو ہی سینے سے لگائے ہوئے ہے۔

عارفہ انجم، حیدرآباد

ڈیر بھابی :

قاضی مشتاق احمد کا مضمون "خوابوں کا شہزادہ" جو ایک سروے پر مبنی ہے، ہندوستانی لڑکی کی ذہنی پسماندگی کی بڑی یاس آمیز تصویر پیش کرتا ہے۔ یہ جان کر مجھے واقعی دکھ ہوا کہ تعلیم بھی اس میں خود اعتمادی پیدا نہیں کر سکی ہے — ورنہ ستر فی صد لڑکیاں اپنے والدین کے ذریعے شادی کرنے کے حق میں کیوں ہوتیں۔ ۸۶ فی صد لڑکیاں اپنے ہی مذہب کے لڑکے سے شادی کرنے کا ارادہ کیوں ظاہر کرتیں اور آدھی سے زیادہ لڑکیاں اپنے شوہر کا نام لینے کو برا کیوں سمجھتیں؟

رضیہ توقیر، بمبئی ۸

اب

نیا ایڈیشن

آگیا ہے



زینت کشیدہ کاری

بیگم زینت کوثر کی ترتیب دی ہوئی اور فوٹو آفسیٹ کے طریقے پر چھاپی گئی کشیدہ کاری سے متعلق ایک ایسی لاجواب کتاب —— جس میں مشرق و مغرب کی خوش ذوق خواتین کے دل پسند نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ کئی طریقوں سے کاڑھنے کے علاوہ رنگوں کے انتخاب کے اصول اور مختلف ٹانکوں کا استعمال بڑی وضاحت سے سمجھایا گیا ہے۔ ہر اچھے گھرانے میں زینت کشیدہ کاری کا ہونا انتہائی ضروری ہے۔ اردو ہندی میں اب اس کا پندرھواں ایڈیشن نہایت اہتمام سے شائع ہوگیا ہے، آج ہی منگائیے کہیں پھر آپ کو مایوسی ہو اور نئے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے —— قیمت ۱۰ روپلے

شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۲

بارہ ہزار روپے کے نقد انعامات کی شاندار تقسیم!

■	■	د	س	س	س
■	■	ل	بھ	و	ی
گ	ل	■	ی	ز	ا
پ	ل	ٹ	■	ی	س
ش	ہ	ت	ے	■	ی
ج	ت	ا	ن	ے	■

صحیح حل شمع بینی معمہ نمبر ۱۵

شمع بینی معمہ نمبر ۱۵ بے حد آسان ثابت ہوا اور ۲۴ پروانے بالکل درست حل تک پہنچ گئے۔ ان ۲۴ درست حلوں پر پہلا انعام مبلغ آٹھ ہزار روپے تقسیم کیا گیا۔
شمع بینی معموں کی تیز رفتاری بے مثال ہے۔ درست حل ظاہر کئے جانے کے چند ہی گھنٹوں میں چیکنگ ختم کر کے تقسیم انعامات کی تفصیلات کا اعلان کر دیا گیا۔ جن پروانوں نے صحیح حل منگانے کے لئے لفافے بھیجے تھے انہیں تقسیم انعامات کی تفصیلات بھی لکھ دی گئیں۔ دوبارہ جانچ کے لئے کسی کلیم کا انتظار کئے بغیر ہی پہلا اور دوسرے انعام کے منی آرڈرز بھیج دیے گئے۔

بالکل درست حل ۲۴ موصول ہوئے جن پر پہلا انعام مبلغ آٹھ ہزار روپے بحساب ۳۳۳ روپے ۳۳ پیسے فی حل تقسیم کیا گیا۔

۱ - [illegible] خاں صاحب، محلہ تالاب سکھلے والا، رام پور
۲ - نسیم اختر صاحبہ۔ دختر شیخ محمد اقبال، مقام ڈاکخانہ، راجپورہ، ضلع چمبہ
۳ - ایس۔ کے۔ ایچ زیدی صاحب، معرفت ماسٹر حامد علی، مکان نمبر ۱، گلی نظیر باغ، کھٹی میدان، بھوپال
۴ - رام جی داس صاحب، کلرک حوض قاضی پوسٹ آفس، دہلی ۱۱۰۰۰۶
۵ - محمد سعید صاحب، سی/۳۹ کنال ایسٹ روڈ، کلکتہ ۷۰۰۰۱۱
۶ - محمد نیاب الدین صاحب، ۱۳۸ اگر گھاری محلہ، بمبئی ۴۰۰۰۰۳
۷ - محمد بدر الدین قمر صاحب، محلہ پرانا قلعہ، سیوان
۸ - مولراج کمار صاحب، ۳۰۶ حسین پورہ، امرتسر ۱۴۳۰۰۱
۹ - اے۔ ایم آہنگر صاحب، ملک آنگن۔ سری نگر
۱۰ - ایم۔ رحمت اللہ صاحب مکان نمبر ۴۵/۴۶ ڈسپنسری نگر، کرنول ۴
۱۱ - مستری محمد ایوب صاحب، محلہ قلعہ، دیوبند، ضلع سہارنپور
۱۲ - جگدیش کمار سرین صاحب، پوسٹ ماسٹر، سیکٹر نمبر ۱، مارکیٹ، فرید آباد ۶
۱۳ - عبدالحفیظ نعیمی صاحب، ۲۵۴، فیلخانہ، پیلی بھیت
۱۴ - ایس۔ ایم علی صاحب، آر۔ بی ۱/۷، ایس۔ VI، آر۔ کے پورم، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۲
۱۵ - نیاز احمد صاحب، محلہ، پرانا قلعہ، سیوان
۱۶ - مسز غوث الدین صاحبہ، سپروائزر پوسٹ، جنگم پیٹھ، تعلقہ بودھن، نظام آباد
۱۷ - امیر احمد صاحب، معرفت عبدالعزیز پان والے۔ امبر تالاب ریلوے روڈ، روڑکی
۱۸ - [illegible] سنگھ صاحب ولد [illegible] سنگھ، لوہاسان، نئی آبادی، قصبہ لکھپورہ۔ ضلع غازی آباد
۱۹ - یونس احمد صاحب، معرفت بھارت انجینئرنگ ورکس، اوریکلی [illegible] روڈ، جھریا، دھنباد
۲۰ - محمد احمد صاحب، سی بی ایس ایک، پنت نگر، ضلع نینی تال
۲۱ - سلطان احمد خاں صاحب، معرفت ذکی اللہ خاں، ڈاکخانہ، رچھا، ضلع بریلی
۲۲ - صدیق حسن صاحب، معرفت عبدالغنی اینڈ سنس، حاجی ٹولی، غازی پور
۲۳ - آفتاب احمد صاحب ابن نیاز احمد صاحب۔ محلہ پرانا قلعہ سیوان
۲۴ - رام سنگھ راجپوت صاحب، کالج روڈ، پوسٹ کوچھیا، ضلع سنبھل پور

ایک غلطی والے ۲۰۲ حل موصول ہوئے جن پر دوسرا انعام مبلغ چار ہزار روپے بحساب [illegible] روپے [illegible] پیسے فی حل تقسیم کیا گیا۔

[illegible]

[illegible]

حوالے: [illegible]

[illegible]

بدری نواس، جموں ۱۶۰- منصور عالم، جھمری تلیا ۱۶۱- حبیب احمد، حیدرآباد ۱۶۲- افتخار الحق، امروہہ ۱۶۳- محمد نسیم، کلکتہ ۱۶۴- شکنتلا گپتا، کانپور ۱۶۵- ایم ایم بیگ سری نگر ۱۶۶- رابعہ بی بی، باندیہ ۱۶۷- پیارے لال، لمڈنگ ۱۶۸- ایس، حسنی، دھنباد ۱۶۹- ایم محمود، آسنسول ۱۷۰- شمیم اختر، کلکتہ ۱۷۱- غلام عارف، کلکتہ ۱۷۲- رما کانت، شاہ جہاں پور ۱۷۳- نرگس نرزانہ، امروہہ ۱۷۴- عبدالغفور، گرگنٹہ ۱۷۵- رادھے شیام، دہلی ۱۷۶- عبدالمجیب، لکھیم پور کھیری ۱۷۷- شہزاد بیگ، چکرمرلی ۱۷۸- گلاب، مدراس ۱۷۹- صفدر علی، بڑودہ ۱۸۰- ایل، آر، صونت، فریدآباد ۱۸۱- ایل، آر، صونت، فریدآباد ۱۸۲- سید نذیر، میسور ۱۸۳- غلام نبی عالم، پٹنہ ۱۸۴- اے، ڈی، ساہنی، دارجلنگ ۱۸۵- بالو بھائی، احمدآباد ۱۸۶- داؤد بلال، املنیر ۱۸۷- امان اللہ، مدراس ۱۸۸- عبدالخالق، آمبور ۱۸۹- اے، رشید، لوہردگا ۱۹۰- ایس کے قادری، گلبرگہ ۱۹۱- این، پال، جالندھر ۱۹۲- قمر تسلیم، الموڑہ ۱۹۳- محمد حاتم طائی، بانس بڑیا ۱۹۴- محمد اقبال، جے پور ۱۹۵- شیر خاں، ورنگل ۱۹۶- سوہن سنگھ، مدے بہال ۱۹۷- محمد رضوان، بھوپال ۱۹۸- جی، نارائن، منجر پال ۱۹۹- سعیدہ پروین، جموڑیا ہاٹ ۲۰۰- ایم، شاہد، مرادآباد ۲۰۱- اقبال احمد، کلکتہ ۲۰۲- مسز ایس، کے ساہنی، دارجلنگ ۲۰۳- فدا بھیر ودی، ولید پور ۲۰۴- محمد فاروق، نجیب آباد ۲۰۵- محمد فاروق، نجیب آباد ۲۰۶- نجمہ خاتون، سیتا مڑھی ۲۰۷- نجمہ خاتون، سیتا مڑھی ۲۰۸- واحد علی، حیدرآباد ۲۰۹- محمد مولانا، گلبرگہ ۲۱۰ صابر خاں، وڈودرا ۲۱۱- قمرالدین، گرو گوبند ناتھ ۲۱۲- محمد جمیل، اجمیر ۲۱۳- اے رائے قال، لال پور ۲۱۴- عبدالحق، کھاتگا ۲۱۵- عبدالحق، کھاتگا ۲۱۶- عبدالحق کھاتگا ۲۱۷- عبدالرحیم، ناک ۲۱۸- شوکت مرزا، منجر پال ۲۱۹- شبیر حسن، جلائی ۲۲۰

عبدالمجید، لسواں ۲۲۱- مجیب مرتضیٰ، جانسن ۲۲۲- رتن سنگھ، موگا ۲۲۳ ——

افضل خان، حیدرآباد ۲۲۴- یوسف، مدنا والہ، اڈیا کتر ول ۲۲۵- کملا رانی، فیروزگڑھ ۲۲۶- حبیب احمد، پیلی بھیت ۲۲۷- حبیب احمد، پیلی بھیت ۲۲۸- محمد اسماعیل، کرنول ۲۲۹- رو دبی، وارانسی ۲۳۰- محمد صاحب، ویاج پیٹ ۲۳۱- بی، انیس، مشیر ا، نئی دہلی ۲۳۲- مولماج کمار، امرتسر ۲۳۳- جمال الدین، ظہیرآباد ۲۳۴ ——

حبیب ریار یڈی، کمال الدین پور ۲۳۵- یوسف، مدنا والہ، اڈیا کتر ول ۲۳۶- سلام کوچنیلا ۲۳۷- رام سنگھ، کوچنیلا ۲۳۸- ایم، آر، زنگی، مہندا ول ۲۳۹- آمنہ خاتون ولیاس ۲۴۰- ایس، ایم علی، نئی دہلی ۲۴۱- ایس ایم، علی، نئی دہلی ۲۴۲- ایم، اے سعدی، نئی دہلی ۲۴۳- عبدالحفیظ، پیلی بھیت ۲۴۴- سفیر احمد، شمس پور ۲۴۵ ——

خورشید اللہ، شاہ جہاں پور ۲۴۶- عبدالحفیظ، پیلی بھیت ۲۴۷- احمد حسین، گرڈیہہ ۲۴۸- شکیل رحمانی، جمعہ پور ۲۴۹- ہنسراج، پونہ ۲۵۰- رگھوناتھ، امرتسر ۲۵۱- ریاض احمد، الموڑہ ۲۵۲- عبدالغفور، گرگنٹہ ۲۵۳- نذیر احمد، اگچوڈہ، ۲۵۴- ایکا ایم، ابراہیم، سیوہارہ ۲۵۵- ایس، ایم، نسیم، الہ آباد ۲۵۶- محفوظ جان پیلی بھیت ۲۵۷- آفتاب احمد، سیوان ۲۵۸- نیاز احمد، سیوان ۲۵۹- بدرالدین سیوان ۲۶۰- بدرالدین، سیوان ۲۶۱- خلیق احمد، لکھیم پور کھیری ۲۶۲- رضوان اللہ تھانہ بھون ۲۶۳- جگندر سنگھ، غازی آباد ۲۶۴- شیام پیارکی، کالا سنگھیاں ۲۶۵- فرحت حسین، سنبھل ۲۶۶- غلام غوثیہ، نلگنڈہ ۲۶۷- غلام حسین، سنگاریڈی ۲۶۸ ایم، نقی، احمدآباد ۲۶۹- رام پرتاپ، سنگرور ۲۷۰- پیارے سنگھ، نئی دہلی ۲۷۱- محمد مشتاق، نئی دہلی ۲۷۲- سہیل احمد، جمشید پور

Rs 8,000/-

آٹھ ہزار روپے کے نقد انعام

پہلا انعام بالکل درست حل پر پانچ ہزار روپے۔ دوسرا انعام ایک غلطی والے حل پر : تین ہزار روپے

فیس داخلۂ حل : ایک روپیہ۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ فیس داخلہ پوسٹل آرڈر، منی آرڈر یا شمع ادبی معموں کے نقدناموں کے ذریعے ادا کی جاسکتی ہے۔ نقدنامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانہ سے ملنے والی رسید اپنے حلوں کے ساتھ بھیجئے۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ ان کی فیس ایک ساتھ بھیج سکتے ہیں اور ہر حل پر علیحدہ انعام کے حق دار ہو سکتے ہیں۔ کوئی ٹوکن بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ٹوکن بھیجنے کی شرط کے علاوہ شمع ادبی معموں کی دوسری تمام شرائط شمع منی معموں پر بھی عاید ہیں۔ ان کی پابندی ضروری ہے۔

دفاتر شمع (نئی دہلی) میں ڈاک سے اور دستی حل وصول ہونے کی آخری تاریخ : ۲۶ فروری ۱۹۷۷ء، ۸ بجے رات تک

شمع منی مُعمّہ نمبر ۱۷

ن	و	ر	و	۱ ح	■
ی	س	و	۲ خ	■	۵ ز
ت	ا	۳ ب	■	۶ ع	ک
س	۴ ج	■	۷ د	و	ل
■	■	۸ ہ	ٹ	م	ت
■	■	و	ع	ت	ا

اشارے

دائیں سے بائیں

۱۔ جگنو کی طرح اندھیروں میں چھپنا ایک بہادر انسان کو زیب نہیں دیتا

۲۔ ہر نتیجہ اسی کی طرف سے ہے لیکن انسان کو اپنی کوشش میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیئے

۳۔ کس کس بات کو یاد کروں۔ کس کس زخم پر مرہم رکھوں۔ اب تو

۴۔ بے دادِ عشق سے نہیں ڈرتا، مگر اسد جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا

اوپر سے نیچے

۵۔ مفسد مادہ خون میں گردش کرتا رہتا ہے اور کہیں نہ کہیں سے پھوٹ نکلتا ہے

۶۔ اس عادت کو جو برسوں سے دل میں بس چکی ہو بھلانا تقریباً ناممکن ہوتا ہے

۷۔ میرے سینے میں لوگ اپنے ایسے ایسے راز دفن کر جاتے ہیں کہ اگر اپنے سینے میں رکھتے تو آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑتا

۸۔ جو طالب علم سارا سال بری صحبتوں اور کھیل کود میں وقت ضائع کرتا ہے۔ وہ امتحان میں کیسے کامیاب ہو سکتا ہے

شمع ادبی معمے (شمع منی معمہ نمبر ۱۷) ماہ نامہ شمع، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

شمع منی معمہ نمبر ۱۷ کا صحیح حل یکم مارچ ۱۹۷۷ کو صبح ساڑھے نو بجے ظاہر کر دیا جائے گا۔ صحیح حل اور انعام پانے والوں کے نام مارچ ۱۹۷۷ کے "بانو" میں شائع کئے جائیں گے۔ انعام پانے والوں کی تفصیلات شمع اپریل ۱۹۷۷ میں شائع کی جاسکتی ہیں۔

شمع منی مُعمّہ نمبر ۱۷

- اب آپ ایک شمع ادبی معمہ اور دوسرے شمع ادبی معمے کے حل بھیجنے کے درمیان اپنے ادبی ذوق کی تسکین کر سکتے ہیں۔۔۔ منی معمہ کے ذریعے!
- کوئی ٹوکن بھیجنے کی قید نہیں!
- جتنے حل جی چاہے بھیجئے۔ اپنے تمام حلوں کی فیس ایک یا ایک سے زیادہ منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا نقدناموں سے بھیج سکتے ہیں
- آپ ہر حل پر انعام کے حق دار بن سکتے ہیں فیس داخلۂ حل صرف ایک روپیہ
- صرف آٹھ اشارے انعام پانا کس قدر آسان!
- فیس داخلہ بھیجنے کے لئے شمع ادبی معموں کے نقدنامے استعمال کئے جاسکتے ہیں۔۔۔ یا پوسٹل آرڈر، منی آرڈر بھیجئے۔ اپنے حلوں کے ساتھ نقدنامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید ضرور بھیجئے۔

صحیح حل : جوابی لفافہ بھیج کر منگا لیجئے یا پھر اگلے ماہ نامہ "بانو" یا ماہ نامہ "شمع" میں دیکھئے۔

- منی معمہ نمبر ۱۷ کا نتیجہ مارچ ۱۹۷۷ کے "بانو" میں اور اپریل ۱۹۷۷ کے شمع میں شائع کیا جائے گا

فروری
۱۹۷۷

اشاعت کا اکتیس واں سال
دوسرا شمارہ

نگراں : یوسف دہلوی
مدیرہ : زینت کوثر دہلوی
ادارۂ تحریر : شمیم آرا دہلوی
سعدیہ دہلوی

● مالکان : شمع میگزین
● طابع وناشر : یونس دہلوی
● مطبوعہ : ایس۔ پی۔ پروسیس
● ملا شل بمبئی آفسٹ پریس

عام شمارے کی قیمت :
ایک روپیہ پچاس پیسے
سالانہ قیمت :
اٹھارہ روپے (جس میں سالنامہ مفت ملتا ہے)

مقام اشاعت وصدر دفاتر :
آصف علی روڈ، نئی دہلی
تار کا پتہ : "شمع" نئی دہلی
ٹیلی فون : ۲۷۲۰۶۶ ، ۲۷۲۰۶۷ ، ۲۷۳۰۶۸
دیگر دفاتر : بمبئی، کلکتہ اور مدراس

انشائیہ

اگر انسان پھل آور درخت لگا کر، اسی وقت میوہ کھانا چاہے تو یہ ذری ممکن نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے برسوں کی محنت درکار ہوتی ہے، تب کہیں جاکر پودا درخت بنتا ہے۔ انسان کی دوستی بھی پودے کی طرح ہی پنپتی ہے۔ لیکن یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ ذرا سی غلط فہمی کی بنا پر دوستی کی مضبوط جڑ کو غصہ کی کلہاڑی کے ایک وار سے تباہ کردیا جاتا ہے، اور وہی دوست جو ایک جان دو قالب تھے ایک دوسرے کے جانی دشمن ہوجاتے ہیں ـــــ اکثر دیکھا یہ گیا ہے کہ تیسرا فریق غلط فہمی کو دور کرانے کی بجائے اس کو ہوا دیتا ہے اور مدتوں کی بے مثال دوستی کے مضبوط درخت کو اکھاڑ کر ہی دم لیتا ہے ـــــ تیسرے فریق کا یہ رویہ ذلالت کی بدترین مثال ہے۔

آپس کی غلط فہمی دور کرانا انسانیت کی بے لوث خدمت ہے۔ اگر کوئی شخص یہ فریضہ انجام نہیں دے سکتا تو جھگڑے کو ہوا بھی نہ دے، یہی غنیمت ہوگا ـــــ اگر ہم دودھ میں شکر نہیں ملا سکتے تو نمک گھولنے سے بھی گریز کریں۔

بنت کوثر مسعود

یئو عورتیں
ردوں کے
شانہ بشانہ کام
کرتی ہیں

چارہ کاٹنے والی مشین پر میاں بیوی مل کر کام کر رہے ہیں۔



پانی کا بھرا ہوا مٹکا بھاری ہے لیکن محنت میں کوئی عار نہیں



امینہ

دلی کے پاس ہندوستان کا ایک نیا صوبہ واقع ہے۔ یہ ہریانہ کہلاتا ہے پہلے یہ علاقہ مشرقی پنجاب کا ایک حصہ تھا۔ پھر مشرقی پنجاب کے تین ٹکڑے کر دیتے گئے۔ پہلا حصہ صوبہ ہریانہ کہلایا۔ دلی سے انبالہ تک پھیلا ہوا۔ انبالہ سے امرتسر تک پنجابی صوبہ ہے۔ کلو، شملہ اور پہاڑی علاقے ہماچل پردیش کہلاتے ہیں۔

ہریانہ میں زیادہ تر جاٹ آباد ہیں۔ مسلمانوں کی آبادی کم ہے، لیکن قابل لحاظ ہے۔ یہ لوگ میو کہلاتے ہیں۔ تقسیم ملک

کے موقع پر مینو قوم کی اکثریت پاکستان ہجرت کر گئی تھی ۔ لعد میں مہاتما گاندھی کی کوششوں سے اکثر مینو پھر ہندوستان واپس آگئے۔

مینو ایک خوب صورت قوم ہے۔ ان لوگوں کے رنگ سفید یا گندمی ہوتے ہیں۔ اکثر بھوری یا نیلی آنکھیں بھی پائی جاتی ہیں۔ مینو عورتوں میں پردے کا رواج برائے نام ہے۔ یہ عورتیں مردوں کے ساتھ مل کر کھیتوں میں کام کرتی ہیں۔

مینو ایک مشترکہ تہذیب کا نشان ہیں انہوں نے قبول اسلام کے بعد بھی اپنی پرانی رسموں کو خیر باد نہیں کیا۔ ان میں شادی بیاہ کے لئے آج بھی اپنے "گوتر" میں رشتہ نہیں کیا جاتا۔ چچا، تایا اور پھوپھی کی لڑکی سے بیاہ نہیں کیا جا سکتا۔ جس گاؤں میں لڑکے کی شادی ہوتی ہے وہ پورا گاؤں اس کی سسرال بن جاتا ہے۔ اس گاؤں میں رہنے والی لڑکیاں اس کی سالیاں شمار ہوتی ہیں۔



▶ ماں باپ کھیتوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ بچّوں کے لئے گھر کا آنگن کافی ہے۔



▶ نکاح کے بعد دولہا دولہن کی سلامتی کے لئے دعا مانگی جا رہی ہے۔

وہ سب اسے بہنوئی سمجھ کر اس سے مذاق کرتی ہیں۔

گزشتہ زمانے میں نکاح کے بعد یہاں میو لڑکا لڑکی پھیرے بھی لیتے تھے۔ میو قوم میں مذہبی منافرت کا نام نہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ آج کل ہریانہ کا علاقہ ترقی کی راہ پر قدم بڑھا رہا ہے۔ ہریانہ کے ہر گاؤں میں بجلی موجود ہے۔ دلی سے متصل ہونے کی وجہ سے اس علاقے کی ترقی زیادہ تیزی سے ہوتی ہے۔ دلی کے متصل فرید آباد ہریانہ کا ایک صنعتی علاقہ ہے۔

میو عورتیں بہت محنتی اور جفاکش ہوتی ہیں۔ یہاں ساڑی کا رواج نہیں۔ عام طور پر قمیض اور تنگ موری کی شلوار ہی پہنی جاتی ہے۔ اگر آپ کسی میو گاؤں میں جائیں تو وہاں آپ کو عورتیں بھوسے کے بڑے بڑے گٹھڑ سروں پر اٹھائے ملیں گی۔ فصل کی کٹائی کے موقع پر وہ گیہوں کے انبار جمع کرتی نظر آئیں گی۔ کنوؤں پر پانی بھرتی



▲ محنت کے لئے عمر کی قید نہیں۔ یہ بوڑھی عورت چارے کے گٹھر بنا رہی ہے۔



▲ میو عورتوں میں پردے کا رواج نہیں۔ عورتیں گاؤں کے کنوئیں سے پانی بھرنے جا رہی ہیں۔



میتوکسان لڑکیاں کھیتوں میں کام کرنے کے بعد خوشی خوشی گھر لوٹ رہی ہیں۔

اس ہینڈ پمپ سے ہندو اور مسلمان دونوں پانی بھرتے ہیں۔

دکھائی دیں گی۔ ہریانہ میں ذات پات کی سختی نہیں۔ میتو اور جاٹ ایک ہی کنویں پر پانی بھرتے نظر آتے ہیں۔

میتو زیادہ تر گوڑ گاؤں سہنہ نوح اور فیروزپور جھرکہ میں آباد ہیں۔ یہ سب دلی کے نواحی علاقے ہیں۔ میتو شہری زندگی کو زیادہ پسند نہیں کرتے۔ انہیں اپنے دیہات سے پیار ہے۔

ان لوگوں میں لڑکی والے لڑکے والوں کے یہاں شادی کا پیغام لے کر جاتے ہیں۔ شادی کے موقع پر خوب گانا بجانا ہوتا ہے۔ میتو عورتیں گانے کی بہت شوقین ہوتی ہیں۔ یہ عورتیں ڈھولک پر گیت گاتی ہیں۔ شادی کے موقع پر دولہا دلہن کا زیور، کپڑے اور سہاگ پوڑا لے کر اس کے گھر جاتا ہے دلہن کا زیادہ زیور لڑکے والوں کے یہاں آتا ہے، خصوصاً سہاگ کی چوڑیاں اور کڑے ان لوگوں میں جہیز دینے کا بھی رواج ہے۔

میتو عورت مرد کی مرضی کے مطابق کام کرتی ہے۔ اگر وہ اپنے ماں باپ کے گھر میں کام نہیں کرتی تھی تو غالب امکان یہ رہتا ہے کہ وہ اپنے شوہر کے گھر میں بھی کام نہیں کرے گی۔ میتو عورتیں بازار یا کھیتوں میں گھونگھٹ نکال کر چلتی ہیں۔ برقعے کا رواج نہیں۔ اگر کوئی مرد آس پاس نہ ہو تو عورت سر پہ پگڑی باندھ کر کام کرتی ہے۔ اگر کوئی اجنبی آجائے تو یہی پگڑی دوپٹہ بن جاتی ہے۔

●●

شادی جہیز اور

ذوالنورین صدیقی مسرور



شادی ہوئی جب، ملا مجھ کو اِس قدر
ٹی وی، پلنگ، ریڈیو، صوفہ ملا مجھے
سیکو گھڑی اور ایک حسیں سائیکل ملی
رُپیہ بھی دس ہزار سلامی میں لے لیا
تھا خود کو مجھ پہ ناز بڑا تیر مار کر
امّی بلائیں لیتی تھیں، ابّا تھے پُر بہار
میں جب شبِ زفاف میں پہنچا یہ سوچ کر
تو واں سماں کچھ اور ہی آیا مجھے نظر
ہلکا سا رُخ پہ شرم و حیا کا نہ نور تھا
پہنچا جو اُس کی سیج پر کہنے لگی "اجی!
کانٹے پڑے ہیں حلق میں پیاسی ہوں دیر سے
سنتے ہی آبِ سرد اُسے لا کے جب دیا
"اُف میٹھے میٹھے دیکھئے اکڑی ہے یہ کمر
بچھوائیے پلنگ وہ میرے جہیز کا
میں نے کہا کہ کل ہی بچھا دوں گا وہ پلنگ
کہنے لگی یہ جنگ کی باتیں نہیں حضور!
سر، ہاتھ، پیر میرا دبا دیں ذرا ابھی
سنتے ہی یہ چھری سی مرے دل پہ چل گئی
تِل بھر جگہ بچی نہ کہیں بھر گیا تھا گھر
تھی مانگ جتنی اپنی، سسر نے دیا مجھے
قسمت مری خدا نے خود ہاتھوں سے لکھی تھی
گویا وقارِ زیست کو نیلام کر دیا
گھر کو سجا لیا تھا یوں دامن پسار کر
گھر کے تمام لوگ دُلہن پر تھے بس نثار
دُہراؤں گا مکالمے ناول کے پڑھ اکثر
گھونگھٹ اُٹھائے بیٹھی تھی وہ میری ہم سفر
چہرے سے صاف اُس کے جھلکتا غرور تھا
مسٹر گرگو بر جگ! اے پسٹل واٹر فارمی
تشنہ بہ لب ہوں میٹھی، ذرا پانی لائیے
پہلے بجھائی پیاس پھر اِٹھلا کے یوں کہا
آئے گی کیسے نیند مجھے چارپائی پر
لیٹوں گی اُس پہ نیند تب آئے گی بے خطا
اِس وقت تو خدا کے لئے یوں کرو نہ جنگ
سچ کہہ رہی ہوں درد سے سارا بدن ہے چُور
منظور کیجئے یہ غلامی خوشی خوشی
پاؤں تلے زمین جو تھی، وہ نِکل گئی

آنسو بہاتے اپنے مقدر پہ رات بھر
پاؤں دبا کے میں نے تو سوئی وہ بے خبر

افسوس جب یہ روز کا معمول ہو گیا
تنگ آ کے ایک روز یہ اظہار کر دیا
ناگن کی طرح پھر تو وہ پھنکارنے لگی
کہنے لگی کہ آپ کی قسمت سنور گئی
مجھ پہ یا میرے باپ پہ احسان کیا کیا؟
شادی میں کیا جہیز کی یہ رسم فرض ہے
شادی تو کی ہے آپ نے میرے جہیز سے
مانگا تھا جب جہیز میں سامان بے شمار
اُس وقت شرم آپ کو آئی نہ کیوں جناب
اب بارِ ناز میرا اُٹھانے سے عار کیوں
القصہ آبرو کا چمن یوں اُجڑ گیا
اپنا وجود مفت میں مجہول ہو گیا
یعنی غلامی کرنے سے انکار کر دیا
جھٹکا کے ہاتھ ٹھوکریں پھر مارنے لگی
میرے ہی دم سے گھر کی بھی حالت نکھر گئی
سائل کی طرح مانگ کے خود گھر کو بھر لیا
کیا اہلِ دختراں پہ ضروری یہ قرض ہے
ٹی وی، پلنگ، ریڈیو، کرسی و میز سے
روپئے لئے تھے جب میرے والد سے دس ہزار
غیرت سے آپ کیوں نہ مرے تھے یوں آب آب
آیا میری غلامی سے اب یہ بخار کیوں؟
باتوں کے تیر سے مرا حلیہ بگڑ گیا

لعنت ہے اُس جہیز پہ جس سے گھٹے وقار
نعمت وہی ہے، گر ملے، بیوی وفا شعار

اسلام اور فیملی پلاننگ

وقت کی سب سے اہم کتاب جو ہر مسلمان کو پڑھنی چاہیئے!

دُنیا بھر کے مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ آنحضرت رسول اللہؐ خاتم النبیین تھے اور اسلام ہر قدر، ہر زمانے اور ہر مملکت کے لئے مکمل مذہب ہے۔ دین و دنیا کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس کے بارے میں حق تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی کے ذریعے مومنوں کے لئے ہدایت نہ فرمائی ہو۔ فیملی پلاننگ یا خاندانی منصوبہ بندی کا مسئلہ آج بہت سے حضرات کو نئے زمانے کی دین معلوم ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ "فیملی پلاننگ" کا نام نیا ہے۔ کچھ ذرائع نئی سائنس کی دریافت ہیں —— لیکن صحابہ کرام کے زمانے سے ہی بلاخواہش ہونے والی اولاد کے بوجھ سے بچنے کے لئے، حمل روکنے اور حمل کے ابتدائی دنوں میں حمل کو گرانے یا ساقط کرنے کے مختلف طریقوں سے لوگ واقف تھے۔

اسلام میں ہر موقع کے لئے ہدایت موجود ہے

صحیح مسلم، صحیح بخاری اور دوسری مستند احادیث میں اولاد کی تعداد کم رکھنے کے طریقوں کا ذکر موجود ہے اور ان کے بارے میں صحابہ کرام کے پوچھنے پر رسول کریمؐ کے ارشادات بھی تحریر ہیں۔ چاروں امام بھی اس مسئلہ پر اپنی رائے کا اظہار کر چکے ہیں۔ آنحضرتؐ کے زمانے میں، جب عرب اپنی جہالت میں اپنی نوزائیدہ بچیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے، اس وقت یہودی برتھ کنٹرول کے ایک رائج طریقے کو "چھوٹا زندہ درگور کرنا" کہا کرتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ زمانۂ قدیم سے اس مسئلہ کی اہمیت تسلیم کی گئی اور یہ کیسے ممکن تھا کہ اتنے اہم معاملے پر جس سے اُمت نبوی کے ہر فرد کو دلچسپی ہو سکتی ہے، پیغمبر اسلام اور خلفائے راشدہ نیز ائمہ کی رائے قدیم کتب میں محفوظ نہ ہو۔

دورِ حاضر کی اہم ضرورت

دورِ حاضر کی اہم ضرورت تھی کہ اولاد کی پیدائش کو روکنے کے عارضی اور مستقل طریقوں کو جو آج رائج ہیں اسلام کے احکامات کی روشنی میں پرکھا جائے اور مسلمانوں کو صحیح راہ دکھائی جائے تاکہ مزید اختلاف کی حتی الامکان کی گنجائش نہ رہ جائے۔

ملک کے مقتدر عالم دین، حضرت شاہ زید ابوالحسن فاروقی نے بڑی تحقیق و جستجو کے بعد کتاب "اسلام اور فیملی پلاننگ" (مسئلہ ضبط ولادت) تحریر فرمائی ہے۔ اس کی تصنیف میں قرآن مجید اور صحیح احادیث کے علاوہ، خلفائے راشدین کے اقوال اور چاروں اماموں کی رائے سے اس مسئلہ پر اسلام کی صحیح تعلیمات کی نشان دہی کی گئی ہے۔ امام ابوجعفر طحاوی (جن کا وصال ۳۲۱ھ میں ہوا) امام ابوبکر جصاص رازی (جن کا انتقال ۳۷۰ھ میں ہوا) اور حجۃ الاسلام امام غزالی (جنہوں نے ۵۰۵ھ میں وفات پائی) اور دوسرے بہت سے علماء کی قدیم اور نایاب کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی لکھوائی ہوئی کتاب "فتاویٰ عالمگیری" سے (جو مصر سے طبع ہوئی) اور امام مبارک بن اثیر جزری (سنہ وفات: ۶۰۶ ہجری) سے بھی اقتباسات لئے گئے ہیں۔ ضبط تولید کے متعلق امام غزالی کے ایک مضمون کا ترجمہ بھی کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔

دوسرے مشاہیر کی رائے

"اسلام اور فیملی پلاننگ" میں اس کتاب کے متعلق مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب، مولانا قاضی سجاد حسین صاحب (صدر مدرس، مدرسہ عالیہ، فتح پوری دہلی) سعید احمد صاحب اکبر آبادی (صدر شعبۂ دینیات، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) مولانا اخلاق حسین صاحب دہلوی (لال محل، بستی نظام الدین اولیاء دہلی) جیسے ۱۴ اکابرین کی رائے بھی شامل ہے۔ ان سب علماء نے اصل مسئلہ پر بھی اپنے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔

آج ہی مطالعہ کے لئے منگوایئے!

مختصر یہ ہے کہ "اسلام اور فیملی پلاننگ" میں ضبط ولادت کے سبھی رائج الوقت طریقوں پر (جن میں مردانہ اور زنانہ نس بندی بھی شامل ہے) قرآن اور حدیث کی روشنی میں، علماء احناف و شوافع کے اقوال پر مبنی بصیرت افروز اور سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے اور مسلمانوں کو صحیح فیصلہ پر پہنچنے میں مدد دی گئی ہے۔

شمع کے ادارے سے، مکتبہ دینیات، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن اپنی روایتی خوب صورتی اور سلیقہ سے شائع کیا ہے۔ اپنے مطالعہ کے لئے، اپنی لائبریری کے لئے اور اپنے احباب کے لئے آج ہی منگوایئے، تاکہ ختم ہو جانے پر اگلے ایڈیشن کا انتظار نہ کرنا پڑ جائے۔

سات روپے قیمت کی یہ کتاب وی پی ہرگز نہ بھیجی جائے گی۔ جتنی کاپیاں درکار ہوں، فی کاپی سات روپے منی آرڈر سے "مکتبہ دینیات، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲" کے نام بھیج دیجئے اور منی آرڈر کی ڈاک سے ملنے والی رسید اپنی فرمائش کے ساتھ ہمیں بھیج دیجئے۔ ڈاک خرچ مفت۔ بیک وقت ایک سو سے زائد کاپیاں منگوانا ہوں تو خصوصی رعایت کے لئے لکھئے۔ یاد رکھئے، وقت کے سب سے اہم مسئلے پر یہ انتہائی بصیرت افروز کتاب ہے جسے پیش کرنے کا فخر حضرت علامہ شاہ زید ابوالحسن فاروقی کی عنایت سے شمع کے ادارے کو حاصل ہوا ہے۔

چند اہم سوال جن کے جواب آپ کو "اسلام اور فیملی پلاننگ" کے مطالعہ سے حاصل ہوں گے:

★ کیا "نرودھ" کا استعمال جائز ہے؟
★ کیا نس بندی کرانے والا اللہ کے پیدا کئے ہوئے جسم کو بدلنے کا گنہگار ہے؟
★ ایک دوسرے کی رضامندی کے بغیر میاں بیوی کے ضبط تولید کرنے پر کیا حکم ہے؟
★ نطفہ کو گرا دینے کے بارے میں صحیح احکامات کیا ہیں؟
★ کیا فیملی پلاننگ سے کوئی انسان کرتا ہے جس کو (نعوذ باللہ) خداوند تعالیٰ کی رزاقی میں شک ہے؟



عطیہ پروین

دائیں بازو میں جیسے پوری سُوئی اتر گئی!
بانو نے بلبلا کر بازو کو جھٹکا، پھر ہاتھ سیدھا کر کے دیکھا۔ ایک ننھی سی چیونٹی بُری طرح کھال سے چمٹی ہوئی تھی۔ بانو نے دوسرے ہاتھ کی چٹکی سے چیونٹی کو نوچا اور اسے زمین پر ڈال کر پاؤں سے مسل دیا۔

"اُف!" اس کے مونہہ سے نکلا۔

"اتنی ذرا سی جان اور اتنی ظالم!" اچانک ایک اور سُوئی سنسناتی ہوئی آئی اور اس کی سماعت میں پیوست ہو گئی۔

"اب بیٹھی بیٹھی ہاتھ پاؤں میں مالش ہی کئے جاؤگی یا برتن بھی صاف کر دگی۔ شام ہونے کو آئی۔ بچے اسکول سے آتے ہی ہوں گے... توبہ ہے! کس قدر کاہل عورت ہے! اتنی عمر میں تو میں جانے کتنا کام منٹوں میں کر کے پھینک دیتی تھی...؟

یہ بانو کی ساس تھیں۔

نرم نرم دھوپ میں گدگدے بستر پر لیٹی ہوئی وہ حسب معمول پان چبا رہی تھیں اور ایک ناول کا مطالعہ کر رہی تھیں۔ مطالعہ کم کیا جاتا معائنہ زیادہ ہوتا۔ معائنہ کس کا؟ وہی کمبخت بانو کا۔

بانو، جو تین سال پہلے اس گھر کی بہو بن کر آئی تھی، لیکن آج بہو کم اور لونڈی زیادہ معلوم ہوتی تھی۔

بانو نے جلدی جلدی برتن دھونے شروع کر دئے۔ جاڑوں کے ننھے ننھے دن اور پہاڑ جیسا کام۔ اس سردی میں سالن اور انڈوں کی چکنائی بھی اس طرح جم جاتی ہے کہ چھوٹنے کا نام نہیں لیتی۔ گرم پانی کر کے ذرا آسانی ہوتی تھی مگر ساس صاحبہ کو یہ 'فضول خرچی' قطعی پسند نہیں آئی۔ جتنی دیر میں برتنوں کے لئے پانی گرم ہوتا اتنی دیر میں بُرادے کی انگیٹھی آدھی جل جاتی اور ایک لکڑی ختم ہو جاتی۔ "توبہ! اتنی مہنگی لکڑی اور بُرادہ! ارے تازہ پانی بھی تو کنکنا ہی ہوتا ہے۔"

بانو نے اپنے چکنے ہوئے سیاہ ہاتھوں کو دیکھا، پھر حسرت سے نل کے اوپر لگے بریکٹ پر رکھے وِم کے ڈبے کو دیکھا۔ اگر تھوڑا سا وِم بھی مل جائے تو یہ چکنائی چھوٹ جائے۔

"امی جی، تھوڑا سا وِم لے لوں؟ یہ چکنائی چھوٹ نہیں رہی ہے۔" اس نے بڑی مسکینی سے کہا اور ساس کو کنکھیوں سے دیکھا۔ ایک سُوئی پھر ساس کی زبان سے نکلی اور سیدھی آکر بانو کے کلیجے میں پیوست ہو گئی۔

"بس بی بی، اب تو حد ہو گئی! گرم گرم راکھ سے تو جانے کتنے برتن صاف کر کے پھینک دیتی تھی میں۔ نہ چکنائی کا نام ہوتا نہ راکھ کا، چم چم کرنے لگتے سارے برتن... اور اب تم چلی ہو وِم اور سرف سے برتن صاف کرنے! ارے، فضول خرچی کی کوئی حد ہوتی ہے! یہ چیزیں وقت بے وقت

کے لئے ہوتی ہیں کہ روز کے خرچ کے لئے؟ اور پھر وہ بھی تمہاری جیسی پھوہڑ کے ہاتھوں۔ ایک پتیلی میں آدھا دم اُلٹ دو، پھر بھی صاف نہ ہو۔"

چیونٹی کو تو نوچ کر پھینکا جا سکتا ہے، مسلا جا سکتا ہے، لیکن آواز کی ان سُوئیوں سے کس طرح بچا جائے؟ اللہ! دل لہولہان ہو گیا! اور جسم ـــــ؟ جسم بھی تو...

"بانو کے حلق میں آنسوؤں اور درد کا ایک گولا سا آپھنسا۔ اپنے ہی گھر میں وہ کس قدر بے بس تھی۔ اس کا شوہر اقبال گھر کا سارا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے تھا۔ دو بہنوں کا اور ایک بھائی کا بوجھ، ایک ماں کا بوجھ اور ایک بیوی کا بوجھ بھی۔ خدا رکھے اچھی آمدنی تھی۔ مزے سے گزر بسر ہوتی تھی، مگر دلی سکون نام کی چیز اس گھر میں عنقا تھی۔

بانو کی گھٹی گھٹی آہیں اور آنسو، ماں کی برچھی جیسی باتیں، بہنوں کے اونچے دماغ، بھائی کی بے راہ روی اور خودسری۔ چھوٹی سی عمر میں ہی اقبال کے سر کے بال آدھے اُڑ چکے تھے اور باقی سفید ہو چلے تھے۔ آنکھوں پر چشمہ چڑھ گیا۔ کمر پر ہر پتلون ڈھیلی ہو گئی تھی۔

ماں کہتی "ارے، جب سے اس سبز قدم نے گھر دیکھا، تب سے ہی نحوست چھا گئی ہے۔ میرا بچہ اندر ہی اندر بتاشے کی طرح گھلا جا رہا ہے..." اور بانو بڑے دکھ سے اپنے شوہر کو دیکھتی۔ ہاں سچ مچ وہ کتنا دبلا، کتنا کمزور اور کتنا خاموش ہو گیا تھا مگر کیا اس کی وجہ سے؟ وہ، جو کیا شوہر کیا ساس کیا نند اور کیا دیور، ہر ایک کے لئے ایک پاؤں سے کھڑی رہتی ہے۔ گھر کا اتنا بڑا کاروبار اور ایک نوکر نہیں۔ جب وہ بیاہ کر آئی تھی تو کھانا پکانے والی بھی تھی اور اوپر کا کام کرنے والا ایک لڑکا بھی۔ مائیکے میں بیس سال جھاڑ و برتن کرتے اور تعلیم حاصل کرنے اور کھانا پکانے میں گزارے تھے۔ وہ تھک گئی تھی، اوب گئی تھی۔ یہاں سسرال میں دیکھا، بڑا آرام ہے، بڑا امن ہے۔ نندیں اسکول جاتی ہیں آتی ہیں، ٹھاٹ سے گھومتی پھرتی ہیں۔ روز کوئی نہ کوئی پروگرام بنتا ہے۔ سہیلیاں آتی ہیں، بازار سے چائے ناشتہ آجاتا ہے، ہا ہا ہو ہو میں ساس صاحبہ بھی شریک رہتی ہیں۔ بانو اپنے آپ کو دنیا کی خوش قسمت ترین بہو سمجھنے لگی۔ مگر ایک سال کے اندر ہی اس کے سارے خواب وہ چکنا چور ہو گئے۔ ساس کی میٹھی زبان دھیرے دھیرے کڑوی ہوتی تھی وہ پھر زہر اگلنے لگی۔ اس کی جن باتوں کی تعریف ہوتی تھی اب وہی ہدف ملامت بن گئیں۔ ماما کے ہاتھوں کا کھانا اچانک بدمزہ ہو گیا۔ چنانچہ اس کو چلتا کر دیا گیا۔ اوپری کام والا لڑکا اچانک چور اور نکما نظر آنے لگا، چنانچہ اسے بھی بھگا دیا گیا۔ نندوں کو اپنے پڑھنے اور بناؤ سنگھار سے رتی برابر فرصت نہ ملتی۔ ساس کی پنڈلیوں میں مستقل درد رہنے لگا۔ وہ کام تو رہا الگ، اپنا بستر بھی خود نہ بچھاتیں۔ سر میں نگوڑا تیل لگا کر چٹیا بھی نہ باندھ پاتیں۔ بہو آخر کس مرض کی دوا تھی؟ اب تو بس گدگدا سا بستر تھا جس پر کھانا، ناشتہ، چائے وقت پر پہنچ جاتا، پاندان تھا جس کا ڈھکنا مسلسل بند ہوتا اور کھلتا رہتا، اور ناول تھے جن پر خرچ کیا گیا پیسہ ان کو فضول خرچی نہیں بلکہ بہت ہی نیک کام میں لگا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

اب رہی بانو ـــــ وہ اس گھر کی بہو بھی تھی لونڈی بھی اور جو کہو بیٹی تو، توبہ کرلو سو بار ـــ! ساس ناک بھوں، مونہہ ایک ساتھ سکوڑ کر زہر اگلتیں۔

"اے ہے بہو بیٹی برابر ہوتی ہے میں خود ذرا فرق نہیں سمجھتی مگر ان کو خود ہی گوشت سے ناخن الگ کرنا اچھا لگتا ہے۔ بس نہیں چلتا میرے اقبال کو اُلّو کا گوشت کھلا دیں۔ اب بھی جیسی کرنی ویسی بھرنی..."

محلے ٹولے میں یا عزیزوں میں کس کا دم خم تھا جو کہہ دیتا۔ ایمان نہ لگلو بی بی۔ بہو کے ساتھ جیسا سلوک تم کرتی ہو ظاہر ہے۔ اور یہ بے زبان گائے جو کچھ کرتی ہے وہ بھی کھلا ہے کون حق پر ہے، کون ناحق، یہ بھی ظاہر ہے ـــ مگر سب ڈرتے اقبال کی امی جی کی تتیا مرچ جیسی زبان سے۔

دن بھر کی تھکی ماندی بانو، رات کو گرتی پڑتی اپنے بستر پر جانے لگتی تو اقبال کی امی کراہ کراہ کر کہتیں "ہائے ہائے! درد اور اینٹھن کے مارے پنڈلیاں مردار پھٹی جاتی ہیں۔ دلہن دو ہاتھ لگا دو تو نیند آجائے..."

جماہیاں روکتی، نیند ایسی آنکھیں پھاڑتی بانو ساس کے قدموں میں آبیٹھتی اور مالش شروع کر دیتی۔ یہ دو ہاتھ اس قدر طوالت کھینچتے کہ اندر اپنے کمرے میں بیوی سے دو باتیں کر کے دفتر کی بوریت اور تھکن اتارنے والا اقبال، سعادت مند برخوردار بیٹا، کروٹیں بدلتا ہوا سو جاتا۔ اور جب بانو کمرے میں آتی تو اس کو ذرا بھی پتہ نہ چلتا۔ صبح تو بانو غائب۔ بہنیں اردگرد، ماں حاضر، مگر بانو اس سے گویا کوسوں دور، کچن میں بیٹھی ناشتہ تیار کرنے میں، اٹھا اٹھا کر سب کو چائے کی پیالیاں پہنچانے میں، بیچ بیچ میں کوئی برتن دھونے میں، دوڑ کر دودھ والے سے دودھ لینے میں، غرض ایک سانس میں ہزار کام کرنے میں مصروف ہوتی۔

اقبال بانو سے کوئی چیز مانگتا تو ماں کے اشارے پر کوئی نہ کوئی بہن دوڑ آتی۔ مثلاً اس نے کہا "بانو پتلون میں بٹن نہیں ہے۔"

"ابھی آئی۔" بانو میاں کو مخاطب پا کر پھولی نہ سماتی۔ مگر امی جی فوراً اس کی خوشی کافور کر دیتیں۔

"نہیں، تم اپنا کام کرو۔ شبو بٹن ٹانک دے گی۔ اسے ہے خالی وقت میں بٹن وٹن دیکھ لیا کرو۔ یہ کون سا پھوہڑ پن ہے کہ جو کپڑا دیکھو اُدھڑا ہوا، بٹن غائب . . . ."

بانو گھٹ کر رہ جاتی۔ یہ بھی تو نہ کہہ پاتی "امی جی! فرصت نام کی کوئی چیز آپ کے راج میں مل سکتی ہے مجھے؟ اور اگر کوئی کپڑا لے کر بیٹھوں بھی تو آپ یوں چھین لیتی ہیں جیسے میں نے کوئی غلط چیز اٹھالی ہے۔ پھر یہ بھی نہیں کہ اس کو ٹھیک کر کے ہی رکھیں، یوں ہی اٹھا کر ڈال دیتی ہیں۔ اس لئے کہ جو کام ان کے سامنے نہ ہونا چاہئے وہ سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔"

کبھی اقبال کے دل میں ہڑک اٹھتی تو کہتا "امی جی بانو دن بھر کام کاج کیا کرتی ہے۔ گھر سے باہر نہیں نکل پاتی۔ شام کو پکچر دکھا لاؤں۔ ذرا دماغ تازہ ہو جائے گا۔"

امی جی تڑپ کر کہتیں "بس بس چپ رہو۔ ایک تمھاری بیوی دنیا سے نرالی نہیں ہے۔ سب بہو بیٹیاں گھر کا کام کرتی ہیں۔ وہ بیوی ہی کیا جو گھر بار نہ سنبھالے۔ آخر میں نے بھی برسوں یہ سب کیا ہے۔ کون سا روز تفریح کرتی تھی اور کون سی صحت خراب ہو گئی تھی؟"

اقبال سر جھکا کر دل کی اس ہڑک کو گھونٹ لیتا اور بانو دھواں لگنے کے بہانے آنسو بہانے لگتی۔

بیٹیاں کام نہیں کرتیں تو اس کے لئے امی جی کا کہنا یہ تھا "پرایا دھن ہیں۔ کل کو چلی جائیں گی، اپنے گھر بار میں الجھ جائیں گی، پھر کہاں یہ تفریح اور آزادی ہو گی۔ جی بھر کر گھوم پھر لیں۔ بھاوج کو خود یہ سوچنا چاہئے۔"

بانو بے چارگی سے ان کو دیکھتی اور رہ جاتی میکے میں جی توڑ کام کرنے کے باوجود اور رُوکھی سُوکھی کھانے کے بعد بھی بانو کی تن درستی، بانو کی شگفتگی دیکھنے والی تھی۔ سُرخ و سفید رنگ دیکھ کر تازہ تازہ سیبوں کی تشبیہ بالکل صحیح اترتی۔

لیکن اب؟

گھٹ گھٹ کر، جل جل کر، جذبات و احساسات کو مار مار کر ساس کی نکتہ چینیوں کا بوجھ دل پر اٹھا اٹھا کر، وہ سیب جیسی رنگت راکھ ہو چکی تھی! اگاڑی بھر ڈیل ہواؤں پر اُڑنے لگا تھا۔ ایک اُداسی کی تہ ہر وقت چہرے پر جمی ہی رہتی تھی۔ اقبال بیوی کی حالت سے بے خبر نہیں تھا، لیکن، مجبور تھا، بے بس تھا۔ بچپن ہی سے ماں نے اسے دبا دبا کر رکھا۔ جوان ہوا تو باپ کی موت نے ذمہ داریوں کے بوجھ سے دبا دیا۔ ماں نے جو جو تکلیفیں برداشت کی تھیں، ان کا بھی اس کو احساس تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ ماں کے دل کو اس کی ذات سے ذرہ برابر بھی دُکھ پہنچے۔ مگر وہ ان کی زیادتیاں اور زبردستیاں دیکھتا، بہنوں کی بے پرواہی دیکھتا اور بانو کو گوشت و پوست کی مشین بنا دیکھتا تو کڑھتا تھا جلتا بھی تھا۔ اسے اتنا موقع بھی نہ ملتا کہ اسے ہمدردی کے دو بول ہی سنا دے، اس کے زرد، پژمردہ رخساروں کو پیار سے تھپتھپا کر ایک ذرا سی مسکراہٹ ہی دیکھ لے۔ گرمیوں میں سب کے بستر آنگن میں لگتے۔ امی جی کے ایک طرف شبو اور ربو کا پلنگ ہوتا، دوسری طرف بانو کا اور اقبال افضال ان چاروں سے کافی دور پلنگ سے پلنگ ملا کر لیٹتے۔

رات کو کسی وقت بانو کی اچانک آنکھ کھل جاتی تو وہ سر اٹھا کر میاں کے پلنگ کی طرف دیکھتی ۔۔ اس حسرت سے اس ہک سے جس طرح کوئی بچہ چاند کو دیکھتا ہے۔ اور کبھی کبھی ٹھیک اسی وقت اقبال کا سر بھی اٹھتا۔ بانو کھانستی۔ "یا اللہ!" کی ہلکی سی آواز کے ساتھ گویا بتاتی ۔ "نیند نہ آئے ساری رات رے . . . . .!"

اقبال دھیرے سے اٹھتا، مگر پلنگ زور سے چرچراتا امی جی نے شاید یہ پلنگ بھی سوچ سمجھ کر اقبال کو دیا تھا۔

پھر تیسرا سر اٹھتا ــــــ اور بانو کی سانس رُک جاتی۔

"اقبال، کیا بیٹے گرمی بہت ہے؟ پنکھا چلا لو . . ." امی جی کہتیں۔ پھر وہ اٹھ کر بیٹھ جاتیں پاندان کھولتیں، پان کھاتیں، اپنی بے وقت کی لمبی لمبی ڈکاروں کو کوستیں۔ گرمی کا شکوہ کرتیں، شبو کو ٹھیک طرح لیٹنے کی تنبیہ کرتیں، ربو کو تکیے پر سر سیدھا کر لینے کے لئے پکارتیں، افضال کے اونچے خراٹوں کو برا بھلا کہتیں . . . . !

اقبال دم سادھ کر لیٹ جاتا، بانو مردہ بن جاتی۔!

یہ تھے بانو کے شب و روز۔

بانو کے لئے اس ہر لحظہ کی قیامت میں کبھی کوئی تبدیلی آتی تھی تو میکے جانے پر۔ مگر یہ آزادی بھی چند روز کی ہوتی۔ نندیں واویلا مچاتیں۔ امی جی اچانک بیمار پڑ جاتیں۔ پنجرے سے نکل کر پر دراز کر کے ابھی چڑیا نے انگڑائی لی ہی ہوتی کہ پنجرے کا دروازہ پھر کھل جاتا، چڑیا پھر مٹھی میں کس لی

جاتی۔

امّی جی ہمیشہ افضال کو ہی بانو کے میکے بھیجتیں۔ اقبال نے چوتھی کے بعد سسرال کی دہلیز نہیں دیکھی تھی۔

کبھی کبھی کوئی پوچھ بیٹھتا "بہو کی گود ابھی نہیں بھری۔ اللہ رکھے شادی کو تین سال ہو رہے ہیں۔؟" تو امّی جی ٹھنڈی سانس بھر کر کہتیں۔ "اپنا اپنا نصیب ہے بہن۔ کوئی بہو آنچل میں بچّہ باندھ کر آتی ہے، کوئی نہیں۔ تین برس لاکھی ایسی گھوما کرتی ہے۔ ارے مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اقبال کے بچّے کی حسرت لئے ہی اس دنیا سے اٹھ جاؤں گی۔"

بانو کے دل میں کرچیں چبھنے لگتیں، لبوں پر ایک گھٹی گھٹی آہ ابھرتی اور وہ اپنے بے پناہ آنسوؤں کے اُبال کو روکتی ہوئی اپنے سنگھاسن یعنی کچن میں جا بیٹھتی۔

اور آج ——

آج تو اس کو واقعی بڑی سستی معلوم ہو رہی تھی۔ ہاتھ شل ہوئے جا رہے تھے۔ آنکھیں بار بار بند ہو جاتیں اور سر کا درد معاذ اللہ! جیسے کوئی ہتھوڑے برسا رہا تھا۔

ابھی کتنے سارے برتن باقی تھے۔ پلیٹیں، تھالیاں، پیالیاں، کاسے، وہ سب صاف کر چکی تھی لیکن دیگچیاں ابھی سب باقی تھیں اور یہ فرائی پین، یہ کڑاہی اور وہ توا —— اُف!

یہ چکنائی! اس نے تھک کر، بے بس ہو کر اپنے چکنے سیاہ ہاتھوں کو دیکھا۔ پھر وہ اٹھی کہ برادے سے رگڑ رگڑ کر یہ کالک چھڑا لے، ورنہ صاف برتن رکھتے وقت پھر گندے ہو جائیں گے۔ اقبال شروع میں اس کے لئے پیئرس سوپ اور صندل سوپ لاتا تھا۔ انھیں شبّو ربّو زیادہ گھستیں۔ وہ تو بس کبھی کبھار ہی استعمال کرتی۔ امّی جی کو اس کے چہرے کی چمک کھٹکی تو انھوں نے اتنے مہنگے صابنوں پر پابندی لگا دی۔ "ضرورت ہی کیا ہے صابن کی۔ ذرا سا آٹا گیلا کرو اور مونہہ پر چپڑ کر دھو ڈالو۔ رہی شبّو ربّو کی بات۔ صبح شام پیئرس سوپ گھستی ہیں تو کیا ہوا؟ کالج جاتی ہیں۔ چار آدمیوں سے ملتی ہیں۔ پھر یہ کل کو پرائی ہو جائیں گی۔ کاہے کو بھائی کی کمائی کھانے اُڑانے آئیں گی ——"

بانو اٹھی ہی تھی کہ اسے زور کا چکر آیا۔ جلدی سے پائپ تھام نہ لیتی تو چٹاخ سے پکّے فرش پر گرتی۔

"توبہ ہے بی بی! حد کر دی تم نے نزاکت کی!" امّی جی چیخ کر بولیں۔ "وہ جھوا بھر برتن بٹورے بیٹھی ہو۔ صبح سے شام کر دی۔ لڑکیاں ابھی آتی ہوں گی۔ چائے مانگیں گی اور یہاں چولھا ہی نہیں جلا۔ . . ارے کچھ ہو نہیں پاتا تو اماں کو لکھو کہ کوئی لونڈی بھیج دیں . . . لوگ کہیں گے لونڈی پر لونڈی اتری نوج! مزاج عرشِ معلّیٰ پر ہیں۔ اپنے میکے میں دن رات جھاڑو برتن کرتی تھیں تو گوارا تھا۔ یہاں..."

بانو نے اپنے چکراتے، چیختے، پھٹتے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر زمین پر بیٹھتے ہوئے بڑی اجنبی سی آواز میں کہا "امّی جی بس بہت ہو چکا!"

امّی جی کے سر پر گویا بم پھٹ پڑا۔

ایں! یہ کون بولا؟ یہ کس کی آواز تھی؟ یہ کس کا باغی لہجہ تھا؟ کیا یہ چیونٹی؟ یہ —— یہ بانو؟ کیا اس نے کاٹا تھا؟ وہ بلبلا کر، تلملا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ یوں بڑھیں جیسے بانو کو، اس چیونٹی کو، حقیر سی چیونٹی کو پاؤں سے مسل ڈالیں گی! "کیا کہا؟ دماغ ٹھیک ہے نا تمھارا؟" وہ گرج کر بولیں۔

لیکن بانو دبی نہیں، سہمی نہیں، سر جھکا کر باورچی خانے کی طرف بھی نہیں بھاگی۔ اس نے سر اٹھا کر امّی جی کی طرف دیکھا۔

اس کا چہرہ — زرد انگارے کی طرح تپ رہا تھا۔ آنکھیں سرخ تھیں اور ہونٹ پھڑکے جا رہے تھے۔

"جب چیونٹی دباؤ برداشت نہیں کر پاتی تو کاٹ بھی لیتی ہے۔ بہن!" امّی جی کے کانوں میں اچانک محلے کی جگّو خالہ کی آواز گونج اٹھی وہ کل ہی تو آئی تھیں۔ دنیا بھر کے قصّے سنائے تھے انھوں نے۔ "میں تو خدا لگتی کہوں گی بہن تمھاری بہو بے زبان گائے ہے، گائے۔ ایسی اچھی لڑکی تمھیں چراغ لے کر ڈھونڈھتے سے نہ ملتی۔ ارے بیوی آجکل کی بہوئیں ہوتی ہیں کہ پٹاخہ۔ دغیں تو ساری سسرال ہلا ڈالی۔ کیا ساس کیا سسر، کیا نند اور جیٹھ دیور، سب کو مارا جوتی کی نوک پر، اور میاں کو لے دوسرا گھر بسا بیٹھیں۔ اب ان پڑوس والی وکیلن کو لو۔ کیسا دبدبہ تھا! کیا دھاک تھی ان کی! مگر بہو آئی اور ان کا راج ختم! بیٹا ہے سو بیوی کے اشاروں پر ناچتا ہے۔ آٹھ آٹھ آنسو روتی ہیں . . . اور بہن میری اس کے برعکس تمھاری بہو ہے —— ہائے مجھے تو اس پر ترس آتا ہے . . ."

بانو ان کو یک ٹک دیکھ رہی تھی — آخر یہ آنکھیں کیوں نہیں جھکاتی؟ یہ کیسا انقلاب تھا؟

"نہ کر ساس بُرائی، تیرے آگے بھی جائی۔" جگّو خالہ برابر ان کے کانوں میں کہے جا رہی تھیں۔ "کل کو تمھاری لڑکیاں بھی ساس کے زیرِ سایہ ہوں گی ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر . . . بہن،

میں تو خدا لگتی بات کہوں گی . . . "

یہ بانو کا چہرہ اتنا لال کیوں ہے؟
کیا غصہ سے، دل کی آگ سے؟ جذبات کی بھڑک سے؟ اور یہ آنکھیں، جو ان کے سامنے سدا جھکی رہتی تھیں، اس باغیانہ انداز میں ان کو تکے کیوں جا رہی ہیں؟
جگو خالہ نے گھی کا خالی ٹین بجا بجا کر گانا بھی توگایا تھا۔

مار لایا رے سمندر سے مچھلی مار لایا رے۔
ساس نہ پکاوے نند نہ پکاوے۔
پکائے میٹھی ری پرائی جائی بٹیا پکائے میٹھی ری
جگو خالہ خدا تمھارا بیڑا غرق کرے ــ!
تمھاری باتوں نے ہی یہ انقلاب اٹھایا ہے . . .
خدا لگتی بات؟
ہاں یہی تو ہے نا کہ بانو واقعی بڑی دبلی بڑی کمزور ہو گئی ہے۔ کس قدر خاموش اور افسردہ رہتی ہے۔ کپڑے۔ ہاں کپڑے بھی بڑے میلے ہیں۔ بال بھی نہیں سنوارے گئے ہیں۔
وقت؟ ہاں وقت ہی کب ملتا ہے؟ اتنی دور سے پیاز لہسن اور دھوئیں کی بھبک چلی آ رہی ہے . . . اقبال تو بڑا ہی نفاست پسند ہے! کپڑوں پر ہر وقت سینٹ چھڑک کے رہتا ہے . . . مگر . . . وہ دونوں اس قدر قریب ہی کب ہوتے ہیں کہ بو اور خوشبو کی شکایت ہو۔
کل کو تمھاری لڑکیاں بھی . . . !
نا کر ساس برائی . . . . !
دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔
تجھے بخار ہے امی جی . . . میں اس وقت معافی چاہوں گی۔!"
بانو نے ایک لمبی سانس کھینچ کر پہلے برتنوں کے انبار کو دیکھا پھر امی جی کو اور ڈگمگاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی۔
ابھی دو قدم ہی چلی ہو گی کہ دوبارہ چکر آیا۔ اس بار وہ اپنے کو سنبھال نہیں سکی۔
لیکن وہ زمین پر نہیں گری۔ امی جی کی پھیلی ہوئی بانہوں میں گری۔ اس کے چکنائی لگے سیاہ ہاتھوں، لہسن اور پیاز کی بو میں بسے کپڑوں اور راکھ اور مٹی کے ذرات سے بھرے بالوں سمیت امی جی نے اس کو اپنی گود میں سمیٹ لیا ــــ!
"ارے تمہیں تو سچ مچ بخار ہے بیٹی ــ
افضال! او افضال! لپک کر اقبال کو بلا لا ــ
دلہن کو ابھی ابھی ڈاکٹر کے یہاں لے جائے۔
توبہ! اتنا بھی کام کیسا کہ آدمی بیوی بچوں کو بھول جائے۔"


21 سال کی
عمر سے پہلے
شادی نہ کیجئے
قانون اِس کی مُمانعت کرتا ہے۔
davp 76/678

ایم ناصر

اپنے ذہن کو آزاد کیجیے

آج کل ساری دنیا میں آزادی کی لہر دوڑ رہی ہے۔ انسان سیاسی آزادی چاہتا ہے، معاشی اور سماجی آزادی چاہتا ہے، لیکن وہ ذہنی طور پر آج بھی غلام ہے۔

پچھلے زمانے میں انسان جسمانی طور پر غلام تھا۔ عورتیں بھیڑ بکریوں کی طرح خریدی اور بیچی جاتی تھیں۔ نیلام کے وقت زنجیریں پہنائی جاتی تھیں۔ سب سے زیادہ بولی دینے والا عورت کو خرید لیتا اور عورت زندگی بھر کے لئے اُس کی غلام بن جاتی۔ آج جسمانی غلامی غیر قانونی ہے۔ لیکن ذہنی غلامی بدستور باقی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس کی زنجیریں دکھائی نہیں دیتیں۔

ذہنی غلامی کے کئی رُوپ ہیں۔ سب سے پہلے ماضی کی غلامی آتی ہے۔ یہ غلامی سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ اگر ایک عورت کی زندگی بچپن میں یا شادی کے بعد ناخوش گوار ماحول میں گزری ہے تو یہ ناخوش گواری زندگی بھر اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اس ضمن میں ہم آپ کو ایک واقعہ سناتے ہیں :

سلمیٰ ایک رئیس باپ کی بیٹی تھی۔ اُس کی شادی ایک ایسے آدمی کے ساتھ ہوئی جو سست رفتار اور صلح پسند واقع ہوا تھا۔ سلمیٰ کے شوہر میں کوئی عیب نہیں تھا، لیکن وہ زندگی کی جد و جہد میں جرأت سے کام نہ لیتا تھا۔ اُس کا چھوٹا سا کاروبار تھا۔ اس کاروبار میں اس کا ایک دوست بھی شریک تھا۔ یہ دوست چالاک اور ذہین تھا، وہ سلمیٰ کے شوہر کو ہر بات میں [illegible] سلمیٰ کا شوہر اس دوست کی زیادتیوں کو ہنس کر ٹال جاتا۔ کاروبار بہت سست رفتاری سے بڑھ رہا تھا۔ سلمیٰ نے اچھے دن دیکھے تھے۔ اُس کا دل شوہر میں جرأت اور حوصلے کی کمی دیکھ کر کُڑھتا تھا۔ کاروبار کی سست رفتاری کی وجہ سے گھر میں بھی تنگی رہتی۔ اس دوران سلمیٰ کے سات بچے پیدا ہوئے۔ پانچ لڑکے اور دو لڑکیاں۔ ان کی تعلیم اور کپڑوں کا خرچ بھی مشکل سے پورا ہوتا تھا۔ سلمیٰ باپ سے مدد لینا نہیں چاہتی تھی۔ ممکن ہے کہ اگر باپ اس کی مدد کرتے تو وہ ان کی مدد کو قبول کر لیتی، مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ زندگی اسی طرح گزر رہی تھی کہ یکایک مالکِ مکان نے ان کے لیے دخلی کا نوٹس دے دیا۔ سلمیٰ کا شوہر اس نوٹس سے اتنا گھبرا گیا کہ اُس نے مکان خالی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سلمیٰ نے اس کو لاکھ سمجھایا کہ وہ مالکِ مکان سے مقدمہ بازی کرے۔ اگر مقدمہ بازی نہ کر سکے تو اس مکان کی سلامی ہی وصول کر لے۔ لیکن سلمیٰ کے خاوند نے زندگی سے لڑنا نہیں سیکھا تھا۔ اُس نے چُپ چاپ مکان خالی کر دیا اور یہ خاندان ایک چھوٹے سے مکان میں منتقل ہو گیا۔

سلمیٰ کی زندگی دوبھر ہو گئی۔ خرچ کی تنگی کے باوجود اُس نے اپنی ساکھ بنائے رکھی۔ رفتہ رفتہ اُس کے بچے جوان ہو گئے۔ اُنہوں نے دکان کی باگ ڈور سنبھال لی۔ سب سے پہلے انہوں نے اپنے شریک کو دکان سے الگ کیا اور کاروبار کو ترقی دینے میں جُٹ گئے۔ تھوڑے ہی عرصے میں کاروبار چمک گیا۔ اب اس شہر میں سلمیٰ کے لڑکوں کی چار دُکانیں ہیں۔ وہ ایک عالی شان کوٹھی میں رہتے ہیں۔ اُن کے پاس کار ہے، نوکر چاکر ہیں۔ زندگی کے سارے لوازم موجود ہیں۔ مگر سلمیٰ — سلمیٰ اس تبدیلی میں خوش نہیں ہے۔ اس کی عمر ۵۰ سال ہے۔ زندگی کی صبح کا اندھیرا اس کی شام پر چھایا ہوا ہے۔ وہ ٹھنڈی آہ بھر کر کہتی ہے۔ "میں نے جوانی کا زمانہ غریبی اور تنگی میں کاٹ دیا اب میں ادھیڑ ہو گئی ہوں۔ یہ دولت میرے بچوں اور ان کی بیویوں کو مبارک ہو۔ مجھے اس دولت سے کوئی خوشی نہیں ہے۔"

آپ نے دیکھا کس طرح کے سیاہ بادل حال پر چھائے رہتے ہیں۔ ساری زندگی کی حسرتیں اس ایک فقرے میں چھپی ہوئی ہیں۔ کاش ایسا پہلے ہو جاتا۔ قلم نے شاید ہی اس سے زیادہ اُداس فقرہ لکھا ہو۔

ذہنی غلامی کے بارے میں سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ باہر سے نہیں تھوپی جاتی۔ انسان خود ہی منصف بن کر اپنے لئے اس سزا کا اعلان کرتا ہے اور خود ہی اس سزا کو قبول کرتا ہے۔ اس کی ذہنی غلامی اس کو یہ 'عمر قید' بھگتنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس کو آزادی کے راستے معلوم نہیں۔ وہ اپنی زندگی اسی جیل کی چار دیواری میں کاٹ دیتا ہے۔ چونکہ یہ اس کا اپنا انتخاب ہے، اس لئے وہ اس قید کی زندگی کو بھگتنے پر مجبور ہے۔

انسان کا کیریکٹر آزادی میں پختہ ہو جاتا ہے، جہاں ماں باپ بچے کے لئے سخت گیر ہوں تو بچہ ان کے خوف اور رعب سے ان کا حکم مانتا ہے۔ لیکن اس کی تابع داری دکھاوا ہوتی ہے۔ وہ

اپنے تحفظ کے لئے اس بہروپ پر مجبور رہتا ہے۔ ماں باپ خوش ہوتے ہیں کہ اُن کا بچہ بڑا فرماں بردار ہے۔ وہ کبھی من مانی نہیں کرتا۔ ان کو خبر نہیں کہ ان کے دل میں کیا ہے۔ وہی فرماں بردار لڑکا بزرگوں کا سایہ سر سے اُٹھنے پر خوب کھُل کھیلتا ہے۔ اُس وقت وہ اپنی غلامی کا خوب بدلہ لیتا ہے۔ لوگ اس کی حالت پر کفِ افسوس ملتے ہیں۔ وہ اس اچانک تبدیلی پر حیران ہو جاتے ہیں، حالاں کہ اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں۔ غلامی کے دَور کی فرماں برداری حقیقت سے دُور تھی۔ اگر ماں باپ سخت گیر نہ ہوتے تو ممکن ہے کہ بچہ ان کے اصولوں کو خود بخود اختیار کر لیتا۔ اور زندگی بھر اپنائے رہتا۔

انسان اپنے ماحول کا قیدی ہے۔ یہی اس کی سب سے بڑی کم زوری ہے۔ وہ اپنا گھر، اپنا محلہ، اپنا شہر چھوڑنے سے گھبراتا ہے۔ کچھ ایسی مثالیں بھی مشہور ہیں کہ اپنے گھر کی رُوکھی سُوکھی غریب الوطنی کے حلوے سے بہتر ہے۔ یا آدھی چھوڑ ساری کو جاوے آدھی رہے نہ ساری پاوے۔ یہ مثالیں گمراہ کُن ہیں۔

ایک خاندان پس ماندہ اور معمولی بستی میں رہتا تھا۔ ان کے محلّے کی گلیاں تنگ اور تاریک تھیں، جہاں دن بھر آوارہ بچے گلی ڈنڈا کھیلتے اور پڑوس کی عورتیں ایک دوسرے سے لڑتیں۔ رفتہ رفتہ اس خاندان کی مالی حالت سُدھرنے لگی۔ یہ لوگ اس قابل ہو گئے کہ اس محلّے کو چھوڑ کر شہر کے باہر کھُلی ہوا میں رہ سکیں۔ جہاں انہیں اور ان کے بچّوں کو بہتر ماحول مل سکے، لیکن وہ ایسا نہیں کر سکے۔ آپ پُوچھیں گی کہ انہیں کون روکتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کی ذہنی غلامی ان کے راستے کا پتھر بنی ہوئی ہے۔ یہ لوگ اس حقیقت کا اعتراف نہیں کر سکتے۔ ان کے دلائل اس قسم کے ہیں: "ہم نے اپنے مکان پر بہت رُوپیہ لگایا ہے۔ اگر ہم یہ روپیہ نہ لگاتے تو مکان کو چھوڑ دیتے۔ ہم نے روپیہ خرچ کیا ہے تو ہمیں اس سے فائدہ بھی اُٹھانا چاہیئے۔ اس کے علاوہ یہ جگہ دُکانوں سے نزدیک ہے۔ ہمیں سواری رکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے گھر سے بازار قریب ہے۔ بچّوں کا اسکول قریب ہے۔ یہاں سب لوگوں سے برسوں کی جان پہچان ہے۔ دُکھ بیماری میں سارے پڑوسی اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ شہر سے باہر نیا ماحول ہے۔ وہ جگہ سنسان ہے۔ پھر وہاں منتقل ہونے سے اخراجات بڑھ جاتے ہیں۔ چوکیدار رکھنا پڑتا ہے۔ سواری رکھنا پڑتی ہے۔"

غرض دلائل کا ایک انبار ہے جو حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ اُنھوں نے اس سڑے گلے اور گندے ماحول میں زندگی بسر کرنے کی سزا خود تجویز کی ہے۔

عورت کے لئے تحفظ کی تلاش ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ وہ زندگی کی ڈگر کو بدلنے سے گھبراتی ہے۔ اس کی دنیا محدود ہے، اس لئے اس کی ذہنی غلامی مردوں سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔

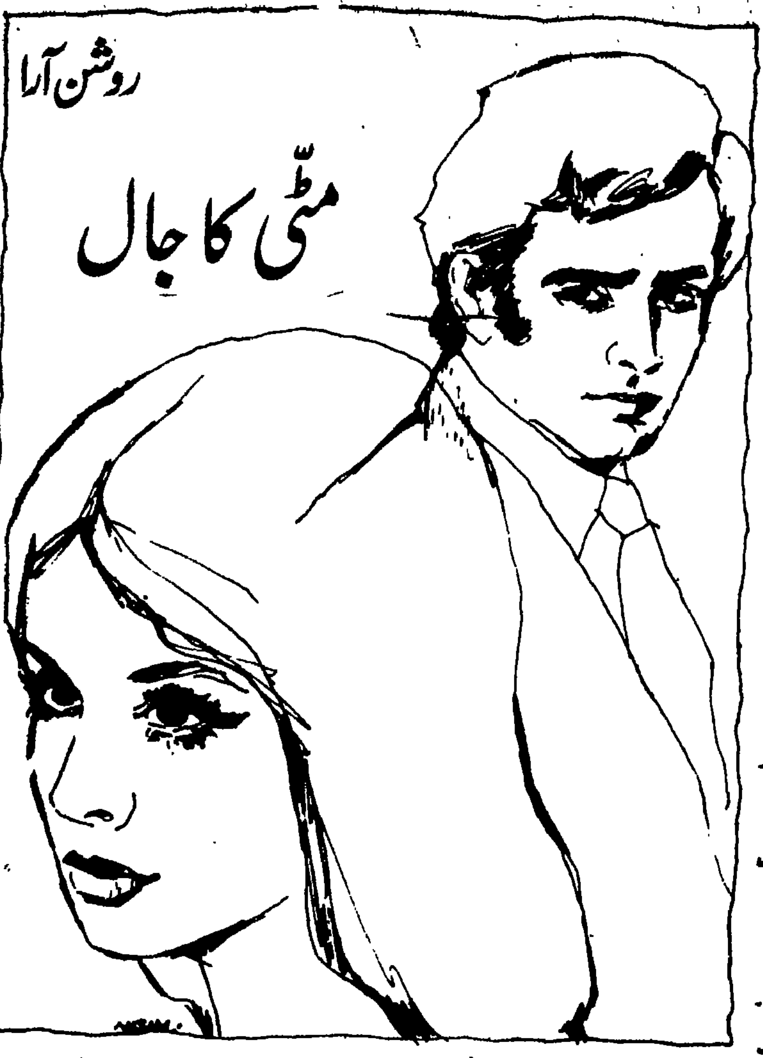
مثلاً نئے فیشن کا کپڑا بازار میں آیا ہے اور اس کی سہیلیوں نے وہ کپڑا خرید لیا ہے تو اب اس عورت کے لئے بھی لازم ہے کہ وہ بھیڑوں کے گلّے میں مل جائے۔ اس کی اپنی کوئی پسند نہیں۔ اس کی پسند کی باگ ڈور دوسروں کے ہاتھ میں ہے۔ عورت خطرہ مول لینے سے گھبراتی ہے۔ اگر اس کا شوہر اپنی ملازمت چھوڑ کر کاروبار کرنا چاہتا ہے تو وہ گھبرا جاتی ہے۔ اس کا تحفظ خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ کہیں کاروبار میں نقصان نہ ہو جائے۔ وہ اپنے شوہر کی حوصلہ شکنی کرتی ہے۔ یہاں بھی اس کی ذہنی غلامی اُسے گمراہ کرتی ہے۔

انسان کی سوسائٹی بھی اس کی ذہنی غلامی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ انسان سوسائٹی میں اپنے ہم خیال ڈھونڈ نکالتا ہے۔ وہ ایسے آدمیوں سے ملنا پسند کرتا ہے جو اس کی طرح ذہنی غلامی کا شکار ہوں۔ وہ سوسائٹی کی اہمیت سے واقف ہے۔ اس لئے ان سب لوگوں سے بچ کر رہتا ہے جو اس کے خیالات کو بدل سکتے ہیں۔ عورتیں اس معاملے میں مردوں سے دو ہاتھ آگے ہیں۔

اگر کوئی عورت اپنی زندگی سے مطمئن نہیں ہے تو وہ ایسی عورت سے ملنا پسند کرے گی جو اسی کی طرح زندگی سے بیزار ہو۔ جب دونوں ملتی ہیں تو زندگی کی شکایتوں کا تبادلہ ہوتا ہے۔ ایک مہنگائی کا رونا روتی ہے تو دوسری موسم کا۔ ایک نوکر کی خیانت کا ذکر کرتی ہے تو دوسری بچے کی شرارت کا۔ اگر یہ عورت اپنی غلامی کا حصار توڑ کر کامیاب اور مطمئن لوگوں سے میل جول رکھے تو اس کی زندگی میں انقلاب آ سکتا ہے۔ انسان کی تربیت اس کے نقل کرنے کی عادت پر منحصر ہے۔ اسکول میں ایک بچّہ دوسرے کو ہکلاتے دیکھ کر خود ہکلانے لگتا ہے۔ دراصل وہ دوسرے بچّے کی نقل کرتا ہے۔ انسان کی چال ڈھال اور گفتگو کا انداز اور اُٹھنے بیٹھنے کے طریقے اُس کے اپنے دوستوں، اُستادوں یا والدین کی نقل ہوتے ہیں۔ انسان کی تربیت میں اس کے سُننے، دیکھنے اور نقل کرنے کی صلاحیت کا بہت دخل ہے۔ یہ نقالی صرف جسمانی نہیں ہوتی۔ بلکہ ذہنی بھی ہوتی ہے۔ زندگی کے متعلق ہمارا نظریہ بڑی حد تک وہی ہوتا ہے جو ہمارے والدین، اُستاد یا دوستوں کا ہوتا ہے۔ انسان جو کچھ دیکھتا ہے اور سُنتا ہے، لاشعوری طور پر اُسے زندگی میں دُہراتا ہے، اس لئے ایسے لوگوں سے میل جول رکھنا بہتر ہے، جو زندگی کو حوصلے اور جرأت سے گزارتے ہیں۔

روشن آرا

مٹّی کا جال



جمِ خانہ کلب میں آج بہت چہل پہل ہے۔ لڑکیاں کچھ زیادہ ہی بناؤ سنگھار کر کے آئی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے 'مس انڈیا' کا چناؤ ہونے والا ہے۔ لیکن دراصل آج کی رونق کی وجہ یہ ہے کہ آج وسنت کھنہ کے کلب میں آنے کی خبر ہے۔ وسنت کل ہی امریکہ سے واپس پہنچا ہے۔ وہ وہاں سے بزنس مینجمنٹ کی ٹریننگ لے کر آیا ہے۔ اس کے باپ بدری داس کھنہ شہر کے مشہور کروڑ پتی ہیں۔ بدری داس ۱۹۴۷ میں لاہور سے دلّی آئے تھے۔ اُس وقت ان کے پاس دو لاکھ روپیہ تھا۔ انہوں نے یہ روپیہ لوہے کے کاروبار میں لگایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کا کاروبار چمک اٹھا۔ اب ہریانہ اور بہار میں ان کے کئی کارخانے ہیں۔ وہ شہر کے نئے دولت مندوں میں سے ہیں۔ وسنت ان کا اکلوتا بیٹا ہے۔ بی اے کرنے کے بعد امریکہ چلا گیا تھا اور اب وہاں سے بزنس مینجمنٹ کی ٹریننگ لے کر واپس آیا ہے۔

بدری داس جمِ خانہ کلب کا ممبر تھا۔ آج اس کا بیٹا بھی اس کے ساتھ کلب میں آنے والا تھا۔ بدری داس نے اس کے آنے کی خوشی میں ایک پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ وسنت کے آنے کی خبر نے دلّی کی کنواری لڑکیوں کے دلوں میں ہل چل مچا دی تھی۔ وہ امریکہ جانے سے پہلے بھی کلب آیا کرتا تھا۔ کئی لڑکیوں سے اس کی جان پہچان تھی۔ لیکن یہ جان پہچان سرسری دوستی سے آگے کبھی نہیں بڑھی۔ وسنت ایک آئیڈیلسٹ تھا۔ وہ کروڑ پتی باپ کا بیٹا تھا۔ وہ چاہتا تو کسی بھی حسین لڑکی سے شادی کر سکتا تھا لیکن وہ دولت سے دل خریدنے کا قائل نہیں تھا۔ امریکہ میں رہنے کے بعد اس کے نظریہ میں زیادہ شدت آ گئی تھی۔ امریکہ میں ہر چیز ڈالر سے ناپی جاتی ہے۔ امریکہ والے ڈالر سے مکان خریدتے ہیں، عزت خریدتے ہیں۔ بیوی خریدتے ہیں۔ وسنت کو روپے کی طاقت معلوم تھی، لیکن وہ اس طاقت سے دلوں کا سودا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

وسنت جب کلب پہنچا تو اس کے کئی پرانے دوست اس سے گلے ملے۔ بدری داس نے مہمانوں سے اس کا تعارف کرایا۔ وہ ایک لمبا تڑنگا خوب رُو نوجوان تھا۔ اس سے ملتے وقت لڑکیوں کے دل دھک دھک کر رہے تھے۔ ان کی مائیں شکار کو جال میں پھانسنے کی تدبیریں سوچ رہی تھیں۔ بدری داس مہمانوں سے وسنت کا تعارف کرانے کے بعد اپنے دوستوں کے حلقے میں جا بیٹھے۔ وسنت کو لڑکوں اور لڑکیوں نے گھیر لیا۔ ٹھنڈے اور گرم مشروبات کا دَور چلنے لگا۔ وسنت ایک صوفے پر بیٹھ گیا تو شیلا کی ماں نے اپنی بیٹی کو آنکھ ماری۔ شیلا ایک ادائے مستانہ سے چلتی ہوئی وسنت کے پاس پہنچی مسکرا کر اس کے پاس بیٹھ گئی اور بولی "میں شیلا کپور ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا تین سال پہلے میں آپ کی الوداعی پارٹی میں شریک تھی۔ میں سوچتی تھی کہ امریکہ میں رہ کر آپ بالکل بدل گئے ہوں گے۔"

وسنت نے تیوری چڑھائی "کیوں؟ امریکہ میں رہنے سے کیا انسان بدل جاتا ہے؟"

شیلا یہ جواب سُن کر سٹ پٹائی! اس نے تو بات شروع کرنے کے لئے یہ فقرہ بولا تھا اس کو کوئی جواب نہیں سُوجھا تو اس نے فوراً موضوع بدل دیا اور بولی "کہیے آپ وہاں سے کوئی کار بھی لائے؟"

وسنت نے کہا "میں امریکہ تعلیم حاصل کرنے گیا تھا، موٹریں خریدنے کے لئے نہیں۔"

شیلا گھبرا گئی۔ یہ لڑکا تو اُلٹی کھوپڑی کا معلوم ہوتا ہے۔ کسی بات کا صحیح جواب ہی نہیں دیتا۔ اس نے گھبرا کر ماں کی طرف دیکھا۔ ماں مسکرائی۔ اس کی آنکھیں بیٹی کی طرف ہی لگی ہوئی تھیں۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا، گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کی پیٹھ تھپک رہی ہو۔

منجو مہرہ اور اس کی ماں بھی یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ منجو کی ماں کو فکر تھی کہ شیلا کہیں مچھلی کو اپنے جال میں نہ پھنسا لے۔ وسنت نیا نیا ہندوستان آیا ہے۔ اگر وہ شیلا کی باتوں میں آ گیا تو کیا ہوگا۔ اس نے منجو کے کان میں کچھ کہا اور پھر آہستگی سے اٹھ کر وسنت کے صوفے کے قریب پہنچ گئی اور شیلا سے مخاطب ہو کر بولی "شیلا، انیل تمہیں یاد کر رہا ہے۔ وہ مجھے سوئمنگ پول کے قریب ملا تھا اور تمہیں پوچھ رہا تھا۔"

شیلا نے قہر بھری نظروں سے منجو کی ماں کو دیکھا اور 'ایکس کیوز می' کہہ کر اٹھ گئی۔ اس کے اٹھتے ہی منجو صوفے کے قریب پہنچ گئی۔ منجو کی ماں بولی "ارے، تم کہاں بیٹھی ہو؟ یہاں وسنت کے پاس بیٹھو، وہ اتنے دن کے بعد امریکہ سے آیا ہے۔ وسنت ڈیئر تمہارے چلے جانے کے بعد تو یہ کلب سُونا ہو گیا تھا۔ منجو تمہیں اکثر یاد کرتی تھی۔ تمہیں یاد ہے کہ جب منجو نے بی اے کیا تھا اور ہم نے یہاں ایک پارٹی دی تھی تو تم بھی اُس پارٹی میں شریک تھے۔"

وسنت تعظیماً اٹھ کھڑا ہوا۔ منجو کی ماں چلی گئی تو منجو صوفے پر بیٹھ گئی اور آہ بھر کر بولی "آپ کو امریکہ کیسا لگا؟ مجھے تو ہندوستان بالکل پسند نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ اپنا ہنی مون امریکہ میں مناؤں۔"

وسنت بولا "کیوں؟ امریکہ میں ایسی کیا بات ہے کہ آپ کو بغیر دیکھے پسند آ گیا۔"

منجو کو اس سوال کی اُمید نہیں تھی۔ مگر اس نے فوراً گفتگو کا رُخ بدل دیا اور بولی "کل میری بہن کی سالگرہ ہے، آپ ضرور ہمارے گھر آئیں۔ آئیں گے نا؟ پلیز!"

وسنت نے حامی بھر لی۔

منجو کے بعد کملا کی باری آئی۔ اور اس کے بعد میرا کی۔ سب باری باری وسنت کے پاس بیٹھیں اور اپنی اپنی درخواست ڈال کر چلی گئیں۔ وہ سب سہیلیاں تھیں، لیکن اس وقت ایک انار اور سو بیمار والا مضمون تھا۔ ہر ایک کو فکر تھی کہ اس کی سہیلی شکار کو نہ جھپٹ لے۔ صرف ایک لڑکی وسنت کے صوفے کے پاس نہ پھٹکی۔ یہ لڑکی مینا تھی۔ وہ دُور سے یہ تماشا دیکھتی رہی۔ اُس نے ایک آدھ بار وسنت پر اُچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور اپنی دوستوں سے گفتگو میں مشغول ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد ڈانس شروع ہو گیا۔ وسنت نے باری باری سب لڑکیوں کے ساتھ ڈانس کیا۔ ناچتے وقت بھی لڑکیوں کی زبان پر وسنت کی دولت کا چرچا تھا۔ کوئی اس سے اس نئی مِل کے متعلق پوچھتی جو بدری داس اپنے بیٹے کے لئے کھولنا چاہتا تھا۔ کوئی اس کی مرسیڈیز کار کا ماڈل پوچھتی۔ وسنت ان باتوں کو سُن سُن کر اوب گیا تھا۔ اس نے ہال کے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اسے ہال کے کونے میں ایک لڑکی دکھائی دی۔ وہ لڑکی ایک شانِ بے نیازی سے اپنی ایک سہیلی سے بات کر رہی تھی۔ یہ مینا تھی۔ اس نے ایک دفعہ بھی وسنت کی طرف مُڑ کر نہ دیکھا تھا۔ وسنت کو تعجب ہوا۔ اس نے رقص کرتے ہوئے کملا سے پوچھا "وہ لڑکی کون ہے؟ وہ جو سامنے نیلی ساڑی پہنے بیٹھی ہے۔"

کملا کا دل دہل گیا۔ "کون سی لڑکی؟" یہ پہلا موقع تھا کہ وسنت نے خود کسی لڑکی کے متعلق پوچھا تھا۔ لیکن جب کملا نے نیلی ساڑی والی لڑکی کو دیکھا تو اس کے دل سے خوف نکل گیا "ارے یہ تو مینا ہے۔ ایک آوارہ سی لڑکی۔ نہ معلوم کتنے لڑکوں سے محبت کر چکی ہے۔ اس کے اسکینڈلز تو سارے کلب میں مشہور ہیں۔"

وسنت نے کہا "میڈم، امریکہ میں کسی لڑکی کے چال چلن کے متعلق شبہ کرنا عیب سمجھا جاتا ہے۔ میں نے آپ سے اس کا نام پوچھا تھا اس کا کیریکٹر نہیں۔"

کملا نے اس بات کا بُرا نہیں مانا۔ مینا اس میدان میں نہیں تھی۔ جہاں اس کی دوسری سہیلیاں خم ٹھونک کر مقابلہ کر رہی تھیں۔ مینا سے حسد کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مینا نہ شکل و صورت میں اس سے مقابلہ کر سکتی تھی اور نہ مال و دولت میں۔ اس کی محبتوں کے چرچے ہی وسنت کو اس سے دُور رکھنے کے لئے کافی تھے۔

اس پارٹی کے بعد کئی روز اسی طرح گزر گئے کہ آج منجو کے یہاں پارٹی ہے تو آج شیلا کے یہاں ڈنر۔ وسنت ان لڑکیوں کو پسند کرتا تھا یہ سب سیدھی سادھی، چرب زبان لڑکیاں تھیں لیکن وہ اپنے آئیڈیل کو نہیں بھلا سکتا تھا۔ اُسے ایک ایسی لڑکی کی تلاش تھی جو اس کی دولت سے نہیں [illegible] اس سے پیار کرے۔ وہ شادی کرنا [illegible] تھا لیکن اس

، دولت اس کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ
ہے۔ اسے یقین تھا کہ اگر وہ دولت مند نہ ہوتا تو
ان میں سے ایک لڑکی بھی اس کو گھاس نہ ڈالتی۔
یہی خیال اس کو مارے ڈالتا تھا۔ وہ اکثر اپنے
دوستوں سے کہتا "یہ لڑکیاں مجھ سے نہیں میری
مرسیڈیز کار سے شادی کرنا چاہتی ہیں۔ میری کوٹھی
سے شادی کرنا چاہتی ہیں۔ مجھے تو ایسی لڑکی کی
تلاش ہے جو میری دولت کی ذرا بھی پروا نہ کرے۔"
وہ عجیب مخمصے میں تھا۔ اس کی دولت
ان لڑکیوں کو اس طرح کھینچتی تھی جیسے مٹھائی
مکھیوں کو۔ وہ اپنی دولت کی وجہ سے ان لڑکیوں
کو پسند تھا، اور اسی وجہ سے وہ اسے ناپسند
تھیں۔ جو چیز شادی میں سب سے زیادہ مددگار
ثابت ہو سکتی تھی۔ وہی سب سے بڑی رکاوٹ
ثابت ہو رہی تھی۔ وہ عجیب الجھن میں پڑ گیا۔ وہ ان
لڑکیوں سے ملتا، لیکن شادی کی بات زبان پر
نہ لاتا۔

اسی طرح چند ہفتے گزر گئے۔ لڑکیاں سب
جتن کر کے ہار چکی تھیں۔ وسنت کے دل کا حال
کسی کو معلوم نہ تھا۔ اب مقابلہ میں ٹھہراؤ آگیا تھا۔
وہ سمجھ گئی تھیں کہ وسنت تر نوالہ نہیں جسے کوئی بھی
نگل لے۔ وہ سارے ہتھیار آزما چکی تھیں۔ انہیں
حیرت تھی کہ آخر وسنت کس مٹی کا بنا ہے کہ ٹس سے
مس نہیں ہوتا۔ وہ دیکھنا چاہتی تھیں کہ اس
ڈرامے کا کیا انجام ہوتا ہے۔ کس خوش نصیب کے
نام یہ لاٹری نکلتی ہے۔

ایک دن وسنت اپنے آفس میں بیٹھا
تھا کہ اس کا چپراسی اندر آیا اور کہنے لگا "صاحب
کوئی میم صاحب آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔" وسنت
نے [illegible]
سمندر میں [illegible] داخل
ہوئی۔ یہ مینا تھی۔ وہ ایک سفید سوتی ساڑی پہنے
ہوئے تھی۔ اس نے کوئی میک اپ نہیں کیا تھا۔
وہ ایک شان بے نیازی کے ساتھ چلتی ہوئی وسنت
کی میز کے قریب پہنچ گئی اور بولی "میرا نام مینا ہے۔
آپ کی سیکریٹری میرے پڑوس میں رہتی ہے۔ آج
صبح اسے ایک ٹیلی گرام ملا جس میں اس کے بھائی
کے ایکسیڈنٹ کی خبر تھی۔ وہ فوراً ہی بمبئی چلی گئی۔
جلدی میں وہ آپ کو اطلاع بھی نہ کر سکی۔ اس نے
مجھے یہ درخواست لکھ کر دی ہے کہ میں آپ تک
پہنچا دوں۔"

وسنت نے درخواست لے کر پڑھی۔ اس
کی سیکریٹری نے ایک ہفتے کی رخصت مانگی تھی۔
وسنت نے درخواست پڑھنے کے بعد اسے پیپرویٹ
کے نیچے رکھ دیا اور بولا "میں نے آپ کو جم خانہ میں
دیکھا تھا۔ آپ نے نیلی ساڑی پہن رکھی تھی۔"
مینا بولی "آپ کی یادداشت اچھی ہے۔
اچھا میں چلتی ہوں۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔"
وسنت نے کہا "ذرا ٹھہریئے۔ ایسی بھی کیا
جلدی ہے۔ بتایئے آپ کیا پئیں گی؟ چائے یا کافی؟"
مینا نے کہا "جی نہیں۔ میں چائے پی کر
آئی ہوں۔"
وسنت نے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟
آپ میرے کام کی وجہ سے میرے دفتر آئی
ہیں۔ میں آپ کو بغیر چائے پئے نہ جانے دوں گا۔"
اس نے گھنٹی بجائی اور چپراسی کو چائے بھجوانے
کے لئے کہا۔

چائے آگئی۔ مینا خاموش ہو گئی۔ وسنت
بولے جا رہا تھا۔ چائے ختم کرنے کے بعد مینا
اٹھی اور بولی "اب اجازت دیجئے۔ مجھے دیر
ہو رہی ہے۔"
وسنت نے کہا "آپ کو کہاں جانا ہے۔
میرا ڈرائیور آپ کو چھوڑ آئے گا۔"
"جی نہیں آپ تکلیف نہ کیجئے۔" مینا نے
جواب دیا اور جلدی جلدی دفتر سے نکل گئی۔
وسنت کے دماغ میں گھنٹی سی بجی ۔۔۔ اس
لڑکی نے میری دولت کے متعلق کوئی ذکر نہیں کیا۔
ذکر تو درکنار، اس نے میری باتوں میں کوئی دلچسپی
تک نہ لی۔ یہ کیسی لڑکی ہے؟

شام کو وسنت کلب پہنچا تو حسب معمول
لڑکیوں نے اسے گھیر لیا۔ کچھ دیر خوش گپیاں کرنے
کے بعد وسنت باغ میں چلا گیا۔ وہاں اسے مینا
نظر آئی۔ وہ اکیلی لان میں بیٹھی لیمنیڈ پی رہی تھی۔۔۔
وسنت نے اسے دیکھا تو فوراً اس کے پاس جا
پہنچا اور بولا "مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ سے اتنے
جلد ملاقات ہو جائے گی۔ کیا میں آپ کے ساتھ
بیٹھ سکتا ہوں؟"
مینا بولی "بیٹھئے۔ ویسے میں یہاں اپنی
دوست کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے مجھے سات
بجے کا ٹائم دیا تھا، مگر اب تک نہیں آئی۔"
وسنت بولا "یہ میری خوش نصیبی ہے کہ
آپ کی دوست وقت پر نہ پہنچی، ورنہ آپ سے
تنہائی میں باتیں کرنے کا موقع کس طرح ملتا۔"
مینا نے اس بات کا جواب نہیں دیا۔ وسنت
نے کہا "آپ صبح اتنی جلدی چلی آئیں کہ آپ سے
بات کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔"
مینا بولی "دفتر کام کرنے کی جگہ ہے۔ میں
نے آپ کا وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔"
وسنت نے کہا "خیر کوئی بات نہیں [illegible]
کی تلافی شام کو ہو سکتی ہے۔" پھر وسنت [illegible]
[illegible]

مینا بظاہر دل چسپی سے اس کی باتیں سُن رہی تھی، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا دِل کہیں اور ہے۔ یکایک وہ بول اٹھی۔ آج کا موسم کتنا سہانا ہے۔ بارش کی وجہ سے سبزے میں زندگی آ گئی ہے۔ وسنت بولتے بولتے رُک گیا۔ یہ کیا؟ میں اسے اپنی دولت کے قصے سنا رہا ہوں اور یہ گھاس کی تعریف کر رہی ہے۔ کہیں یہ لڑکی وہی تو نہیں جس کی مجھے عرصے سے تلاش ہے۔ اس کے دماغ میں پھر گھنٹیاں بجنے لگیں۔ اس نے مینا کو دوسرے دن ایک ریستوراں میں چائے پینے کی دعوت دی۔

دوسرے دن شام کو دونوں گے لارڈ میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ مینا نے گلابی ساڑی پہن رکھی تھی۔ چہرے پر ہلکا سا میک اپ تھا۔ چائے کے دوران مینا نے اسے اپنے بچپن کا حال سُنایا، کالج کے قصے سنائے۔ وسنت نے پھر اپنے کاروبار کی باتیں شروع کر دیں۔ مینا نے اسے ٹوک دیا اور بولی "آپ کو آسام کی چائے پسند ہے یا دارجلنگ کی؟ بہت سے لوگ دارجلنگ کی چائے پسند کرتے ہیں، کیوں کہ اس میں خوش بو ہوتی ہے۔ لیکن میں آسام کی چائے پسند کرتی ہوں، کیوں کہ اس میں رنگ ہوتا ہے۔ جس چائے میں رنگ نہ ہو وہ چائے نہیں پانی ہے۔"

وسنت تلملا گیا۔ یہ کس قسم کی لڑکی ہے؟ کل بارش کا ذکر تھا تو آج آسام کی چائے کی تعریف۔ کیا واقعی اسے میری دولت سے دل چسپی نہیں؟

اب مینا اور وسنت ہر روز شام کو گے لارڈ میں چائے پیتے۔ کبھی وہ سنیما دیکھنے چلے جاتے اور کبھی کسی ہوٹل میں رات کو رقص کرتے۔ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے۔ ان کے رومانس کی کسی کو خبر نہ تھی۔ وسنت گیلی مٹی میں د - ں رہا تھا۔ اس کی سوندھی خوش بو اس کے دماغ کو معطر کر رہی تھی۔ وہ بہت خوش تھا۔ آخر ایک دن اس نے مینا کے سامنے شادی کی تجویز پیش کر دی۔ مینا خاموش رہی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے زبان کھولی "مجھے سوچنے کا موقع دیجئے۔"

وسنت نے اس کا ہاتھ دبایا اور رخصت ہو گیا۔

اس واقعہ کے تیسرے دن وسنت کو ایک خط ملا۔ یہ خط مینا نے بھیجا تھا۔ وسنت نے بے تابی سے خط کھولا اور پڑھنے لگا۔

مائی ڈیر وسنت:

کاش میں آپ سے شادی
کر سکتی۔ میں آپ سے محبت کرتی
ہوں، لیکن شادی نہیں کر سکتی۔
مجھے غلط نہ سمجھئے۔ اس میں آپ کا
کوئی قصور نہیں۔ قصور آپ کی
دولت کا ہے۔ آپ دولت مند
نہ ہوتے تو میں آپ کو سر آنکھوں
پر بٹھاتی۔ لیکن آپ کی دولت
ہمارے راستے کا پتھر بن گئی ہے۔
میں مجبور ہوں — مجھے معاف
کر دیجئے۔

آپ کی مینا

وسنت نے خط پڑھا تو خوشی کے مارے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اس کا جی چاہا کہ چیخ چیخ کر کہے "مِل گئی! مِل گئی! میری مُراد مِل گئی!" اسے اپنی خوش نصیبی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے فوراً موٹر نکالی اور مینا کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

دوسرے دن شام کو کلب میں بدری داس کھنہ کی طرف سے ایک شان دار پارٹی کا انتظام کیا گیا۔ کلب کی عمارت دُلہن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ بدری داس ایک ضروری اعلان کرنے والے تھے۔ جب سب مہمان جمع ہو گئے تو اُنہوں نے وسنت اور مینا کو اپنے پاس بُلایا اور دونوں کی منگنی کا اعلان کر دیا۔ شیلا کولڈ ڈرنک پی رہی تھی۔ اُسے زور کا اُچھو لگ گیا۔ کملا کے ہاتھ سے گلاس گر پڑا۔ میرا نے چلتے چلتے ٹھوکر کھائی اور اوندھے مونہہ گرتے گرتے بچی۔ سب کی مائیں دَھک سے رہ گئیں۔ سب کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں یہ کیسے ہو گیا۔ ہائے بھگوان! یہ لُولی لنگڑی گھوڑی کیسے ریس جیت گئی! چیونٹی نے ہاتھی کو نگل لیا! یہ آوارہ لڑکی ایک شریف اور دولت مند لڑکے کو کس طرح ہضم کر گئی؟ یہ کیا ہو گیا؟ کیسے ہو گیا؟ سب کے مونہہ لٹک گئے۔

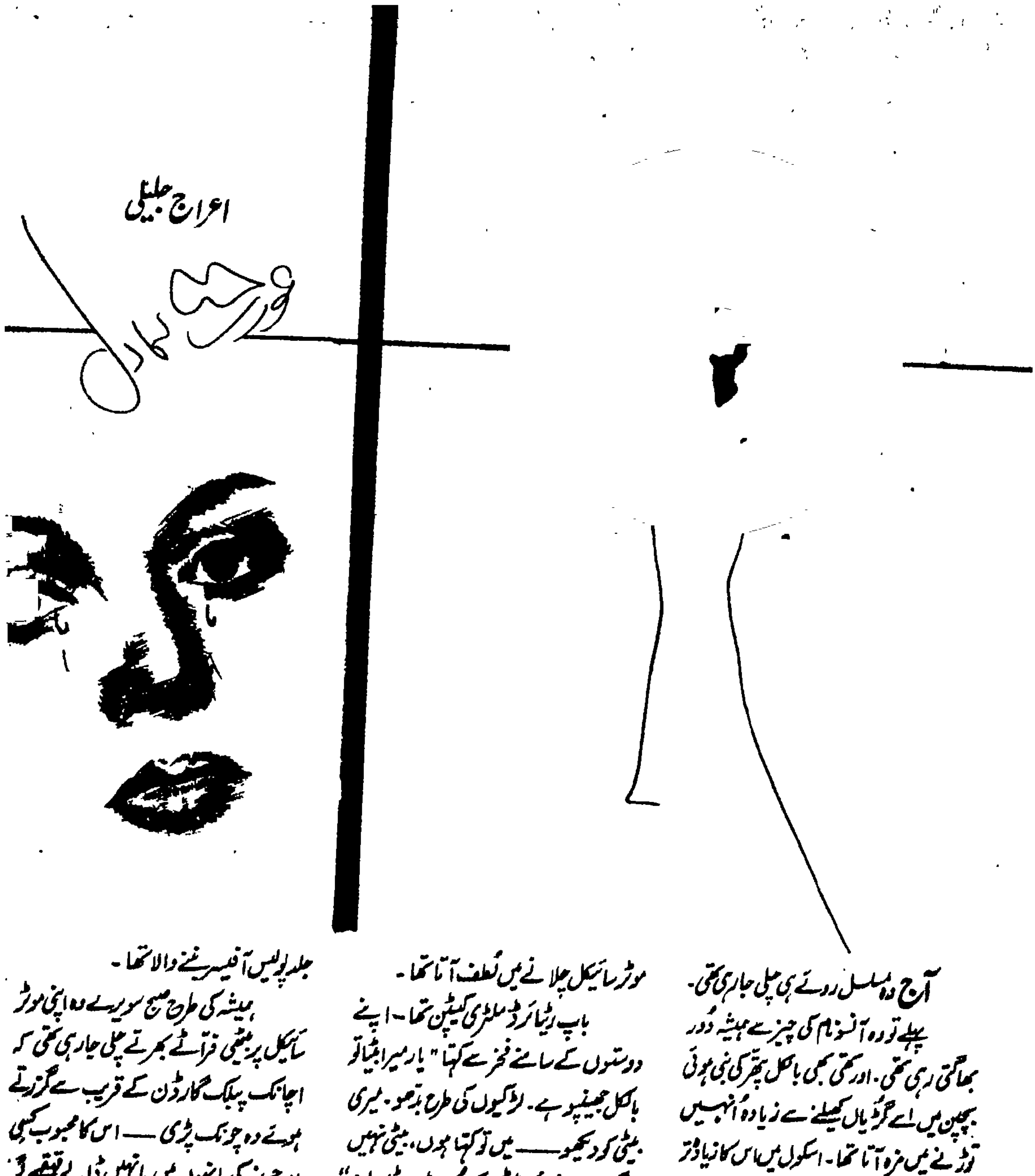
ایک ہفتے کے بعد انجلا بمبئی کے ایک فلیٹ میں مینا کا خط پڑھ رہی تھی —— انجلا جو مینا کی بچپن کی سہیلی تھی۔ مینا نے لکھا تھا:

ڈیر انجلا:

تم نے میری منگنی کی خبر
سُنی ہو گی۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھے
دِل سے مبارک باد دو گی۔ یہاں
تو سب مجھے رسمی مبارک باد دے
رہے ہیں۔ مجھے اپنی دوستوں
کی زبانی معلوم ہو گیا تھا کہ وسنت
ایک ایسی لڑکی کی تلاش میں ہے
جو اس کی دولت کی پروا نہ کرے
میں نے اسی آگاہی کے تحت
اپنا پروگرام بنایا۔ شکر ہے کہ میں
اپنے منصوبے میں کام یاب ہو گئی۔
کیا مجھے داد نہیں دو گی؟

تمہاری مینا

جلد خود اس
تھا لیکن اس



اعراج جلیلی

آج وہ مسلسل روتے ہی چلی جارہی تھی۔

پہلے تو وہ آنسو نام کی چیز سے ہمیشہ دور بھاگتی رہی تھی۔ اور تھی بھی بالکل پتھر کی بنی ہوئی بچپن میں اسے گڑیاں کھیلنے سے زیادہ انہیں توڑنے میں مزہ آتا تھا۔ اسکول میں اس کا زیادہ تر وقت لڑکوں کے ساتھ شرارتیں کرنے میں گزرتا۔ کالج میں آئی تو ہاکی، فٹ بال اور کرکٹ سب ہی کھیل ڈالے۔ اسے اونچی اونچی پہاڑیاں چڑھنے ...ہ میں غوطے لگانے اور برق رفتاری سے موٹر سائیکل چلانے میں لطف آتا تھا۔

باپ ریٹائرڈ ملٹری کیپٹن تھا۔ اپنے دوستوں کے سامنے فخر سے کہتا "یار میرا بیٹا تو بالکل جھینپو ہے۔ لڑکیوں کی طرح بزدل۔ میری بیٹی کو دیکھو — میں تو کہتا ہوں، بیٹی نہیں بھگوان نے مجھے بیٹی کے روپ میں بیٹا دیا ہے۔"

اس کا محبوب بھی اسی کی طرح تھا۔ بہادر، جری اور حوصلہ مند۔ اس نے آئی۔پی۔ ایس کا امتحان پاس کر لیا تھا اور اب بہت جلد پولیس آفیسر بننے والا تھا۔

ہمیشہ کی طرح صبح سویرے وہ اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھی فراٹے بھرتے چلی جارہی تھی کہ اچانک پبلک گارڈن کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ چونک پڑی — اس کا محبوب کسی اور حسینہ کی بانہوں میں باہیں ڈالے قہقہے لگا رہا تھا۔

اور اس وقت سے وہ مسلسل روتے چلی جارہی تھی۔

■■

یورپ میں گھریلو زندگی ناخوش گوار کیوں ہے؟

مطلوب احمد





یہ مادی ترقی کا دور ہے، اور یہ ترقی بلاشبہ ہمارے لئے باعثِ رحمت بھی ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ یہ ترقی سماجی، اخلاقی اور مذہبی اقدار کو بھی اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہو۔ لیکن اگر یہ ترقی اخلاقی اور مذہبی قدروں کو روندنے لگے تو اس سے خاندانی اور سماجی زندگی کا شیرازہ بکھرنے لگتا ہے اور پھر آگے چل کر یہی ترقی ننگِ انسانیت اور پورے سماج کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ بن جاتی ہے۔

آج کل یورپ کے انتہائی ترقی یافتہ ممالک اسی دور سے گزر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی ترقی پسندی کے زعم میں اپنی تمام پرانی روایات اور اخلاقی قدروں کا جنازہ نکال دیا ہے۔ جس کا نتیجہ برآمد ہوا ہے کہ ان ملکوں کی سماجی زندگی کے تار و پود بکھر کر رہ گئے ہیں۔ یہ دیکھا گیا کہ اکثر شادیاں ناکام ہو جاتی ہیں۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں اب باقاعدہ شادی بیاہ کے بندھنوں میں جکڑنے کے بجائے "آزاد شادی" کو پسند کرتے ہیں، جس میں دونوں میاں بیوی کی طرح رہنے کے باوجود قانونی طور سے میاں بیوی نہیں ہوتے۔ ایسی صورت میں بچوں کے وجود اور منصوبہ بند زندگی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس صورت حال نے ان ملکوں کے ماہرینِ سماجیات بہت پریشان ہیں۔ کیوں کہ آگے چل کر یہ بات پورے سماج اور پھر پورے ملک کے لئے خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔ لیکن حالات کے تحت بہاؤ کے سامنے وہ ابھی تک کوئی بند باندھنے میں کامیاب نہیں ہوسکے ہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اخلاقی بے راہ روی کا سیلاب برابر بڑھتا ہی جا رہا ہے جس کی وجہ سے سماجی ماہرین اور حقیقت پسند لوگوں کی راتوں کی نیند اور دن کا سکون برباد ہو کر رہ گیا ہے۔

حال ہی میں جرمنی کے ایک میگزین اور فرانس کے دو عورتوں کے جریدوں نے اپنے اپنے ملکوں میں ہمہ گیر اخلاقی بے راہ روی اور نوجوان لڑکے لڑکیوں کی آزادی پسندی کی بڑی گمبھیر تصویر پیش کی ہے۔ جرمن میگزین نے سترہ سال سے ستر سال کی شادی شدہ عورتوں کی اپنے شوہروں اور بچوں وغیرہ کے بارے میں ۱۹۶۳ اور پھر ۱۹۷۶ میں عام رائے پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ۱۹۶۳ میں ۹۴ فی صد عورتیں سماجی حدود میں رہنا اپنے لئے ضروری سمجھتی تھیں، لیکن اب صرف ۴۳ فی صد عورتیں سماجی قدروں کو مانتی ہیں۔ اسی طرح پہلے ۱۹ فی صد لڑکیاں شادی کو ضروری سمجھتی تھیں۔ لیکن ۱۳ سال کے اندر ایسی عورتوں کی تعداد گھٹ کر ۱۰ فی صد رہ گئی ہے۔ پہلے صرف ایک فی صد عورتیں اپنے شوہروں سے بے وفائی کرنے کو صحیح سمجھتی تھیں، لیکن اب اس خیانت کا صریحی اقرار کرنے والی عورتوں کی تعداد ۷ فی صد کی حد تک بڑھ گئی ہے۔ پہلے ہر ۳۳ شادی شدہ عورتوں میں سے صرف ایک عورت اپنے شوہر کے ساتھ ازدواجی خیانت کا اقرار کرتی تھی۔ لیکن اب یہ تعداد بڑھ کے ہر گیارہ میں سے ایک عورت تک پہنچ گئی ہے۔ اس طرح پہلے اس مدت میں کل پانچ لاکھ عورتیں شادی کرتی تھیں۔ لیکن اب شادی کے بندھنوں میں بندھنے والی لڑکیوں کی تعداد گھٹ کر تین لاکھ ستر ہزار رہ گئی ہے۔ اس کے برعکس طلاق کے واقعات پچاس ہزار سے بڑھ کر ایک لاکھ ہوگئے ہیں۔ ۱۹۶۳ میں کل دس لاکھ بچے پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۷۵ میں صرف چھ لاکھ ہوئے۔ ۱۹۶۳ میں گرجا گھر سے ناطہ توڑنے والوں کی تعداد صرف ۲۰ ہزار تھی، لیکن ۱۹۷۵ میں یہ تعداد بڑھ کر تین لاکھ تک پہنچ گئی۔ ان اعداد و شمار کو پیش کرنے کے بعد اس

جرمن میگزین نے اس قیامت خیز صورتِ حال کا ذمہ دار ۱۹۶۴ میں وسیع پیمانے پر مانع حمل گولیوں کی فروخت ۱۹۶۷ کے دوران منی اسکرٹ اور نیم عریاں کپڑوں کے استعمال، ۱۹۶۶ میں ہپیوں کے سیلاب اور ۱۹۶۷ میں عریاں فلموں کی زیادہ نمائش کو قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ باقی بچی کمی کو ۱۹۷۱ میں اسقاطِ حمل کو غیر مشروط طور پر قانونی بنانے نے پورا کر دیا۔ اس طرح اخلاقی اور مذہبی قدروں سے تہی دامن لڑکیوں کو اب حمل کا کوئی بھی خطرہ نہیں رہا تھا۔ اس پر مزید ستم یہ ہوا کہ ۱۹۷۳ میں امریکہ کی عریاں فلمیں کثرت سے درآمد کی گئیں جنہیں نوجوان لڑکے اور لڑکیوں نے خوب دیکھا اور وہ بھی اسی بے راہ روی کو اختیار کرنے لگے۔ اس کے بعد ۱۹۷۴ میں امریکہ کے عریاں پرچے میدان میں آئے اور اپنی فروخت کے تمام ریکارڈ توڑ ڈالے۔ ایک سروے سے پتہ چلتا ہے کہ جرمن لڑکوں کے علاوہ جرمن لڑکیاں بھی ہر ماہ ۲۸ لاکھ ایسے پرچے خریدتی ہیں۔

اس طویل مقالے کے بعد جرمنی میں عورتوں کے اس میگزین "اشٹیرن" نے اپنی ۲۹۔ اپریل کی اشاعت میں لکھا ہے کہ کیا یہ صورتِ حال دھماکہ خیز نہیں ہے۔ اگر نوجوانوں میں بڑھتی ہوئی بے راہ روی پر جلد ہی کوئی روک نہیں لگائی گئی تو یورپی ملکوں کا پورا سماجی نظام تباہ ہو کر رہ جائے گا۔

یہ تو تھی جرمنی کی بات۔ اب آیئے فرانس کی طرف، جہاں اپریل ۱۹۷۶ میں عورتوں کے دو پرچوں "لاوی کرسٹان" اور "میری کلیر" نے نوجوان لڑکے لڑکیوں میں شادی نہ کرنے کے بڑھتے ہوئے رجحان اور میاں بیوی کی ازدواجی خیانت کے بارے میں لرزہ خیز حقائق پیش کرتے ہوئے مذہبی اور اخلاقی بنیاد پر سماج کو از سرِ نو استوار کرنے پر زور دیا ہے۔ عورتوں کے ان دونوں رسالوں نے متفقہ طور سے لکھا ہے کہ اگر جلد ہی اس مسئلے کا کوئی حل تلاش نہ کیا گیا تو یورپ کا پورا معاشرہ کسی گھن کھائی ہوئی لکڑی کی طرح بیکار ہو کر رہ جائے گا۔

"لاوی کرسٹیان" نے نوجوانوں میں آزاد شادی کی روز افزوں مقبولیت پر تشویش ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آج سے صرف پچاس سال قبل سائمن کمیشن نے فرانس کی معاشرتی اور سماجی حالت پر اطمینان ظاہر کرتے ہوئے یہ انکشاف کیا تھا کہ فرانس کی ۷۹ فی صد عورتیں شادی کے بعد روایتی بیویوں کی طرح رہنا پسند کرتی ہیں۔ اور فرانس میں شادی کے قابل لڑکے اور لڑکیاں عام طور سے شادی شدہ زندگی گزارنا پسند کرتی ہیں۔ چنانچہ یہاں شادی کا تناسب ۶۹ فی ہزار سالانہ تھا جو بہت حد تک اطمینان بخش تھا لیکن پچھلے پچاس برس میں یہاں کے لڑکے اور لڑکیوں کے خیالات میں جس تیزی کے ساتھ انقلاب برپا ہوتا رہا ہے، اس نے ان تمام قدروں کی جڑیں ہلا کے رکھ دی ہیں۔ آج کل نوجوان لڑکا اور لڑکی ایک کمرے میں میاں بیوی کی طرح تو ضرور رہتے ہیں، لیکن میاں بیوی کہلانے کی بجائے صرف دوست کہلانا پسند کرتے ہیں۔

اس کے بعد "لاوی کرسٹیان" کی مدیرہ لکھتی ہیں کہ خود ان کی بلڈنگ میں ۲۵ سالہ جین پیر اور ۲۳ سالہ کیتھرین کافی دنوں سے ایک ساتھ رہتے ہیں اور جب انہوں نے اس کے بارے میں دریافت کیا تو ان دونوں نے بیک زبان کہا کہ جتنے دن تک ممکن ہو سکا وہ دونوں میاں بیوی کی طرح رہیں گے، ورنہ پھر اُن کی راہیں الگ الگ ہو جائیں گی۔ جب انہوں نے شادی نہ کرنے کی اصل وجہ دریافت کی تو انہوں نے کہا کہ "ہمارا یہ سمجھوتہ شادی سے زیادہ قابلِ قبول ہے۔ اور پھر سفید کپڑے پہن کر کسی کلیسا میں چلے جانے اور پادری کی دعائیں لینے سے بھی شادی ہی ہوتی ہے، وہی شادی اس طرح بھی ہو جاتی ہے۔ پھر ان سب خرافات کو بھگتنے سے فائدہ ہی کیا ہے۔ ہاں اگر چند برس کے بعد ہم نے اولاد کی ضرورت محسوس کی تو ہم کسی چرچ میں جا کر باقاعدہ شادی کر لیں گے۔"

اس کے بعد "لاوی کرسٹیان" کی مدیرہ لکھتی ہیں کہ اب یہ وبا اس قدر تیزی کے ساتھ پھیل رہی ہے کہ بہت سے نوجوان چرچ میں پادری کے سامنے نکاح کرنے کا برسرِ عام مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صدیوں پرانی اس روایت کی کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہی ہے۔ کیوں کہ پادری کے سامنے نکاح کرنے سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ اس طرح باہمی سمجھوتہ کے نتیجے میں بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ لہٰذا اس دقیانوسی تہذیب کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہے۔ لیکن شاید وہ اس طرح کی سمجھوتے کی شادیوں کے سب سے ناخوش گوار پہلو پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے اور وہ ہے بچوں کا عدم وجود کیوں کہ اس طرح کی شادیوں میں بچوں کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ جس کے نتیجے میں شرحِ پیدائش خطرناک حد تک کم ہو کر رہ گئی ہے جو فرانسیسی معاشرہ اور خود فرانس کے لئے آئندہ چل کر باعثِ تباہی بن سکتا ہے۔

عورتوں کے دوسرے رسالے "میری کلیر" نے فرانسیسی معاشرے کی ایک دوسری دکھتی ہوئی رگ پر انگلی رکھتے ہوئے لکھا ہے کہ آج کل شادی شدہ جوڑوں میں ازدواجی خیانت ایک وبا کی طرح پھیلتی جا رہی ہے۔ شوہر بغیر کسی احساسِ گناہ کے دوسری عورتوں کے پیچھے بھاگتا ہے۔ اور اپنی بیوی کو وہ آج بھی کوئی ذاتی جائداد یا جاگیر سمجھتا ہے، لیکن تعجب اس بات پر ہے کہ اب بیوی اس میدان

میں بھی مکمل مساوات کا ثبوت دیتی ہے اور وہ بھی ازدواجی خیانت کا اسی طرح استعمال کرتی ہے۔ جیسے اپنا جائز حق استعمال کر رہی ہو۔

اس رسالے نے ۴۸۴ شادی شدہ جوڑوں کے جوابات کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اگر کوئی شوہر چھ ماہ یا اس سے زیادہ مدت تک بے وفائی کا مرتکب ہو تو اس کا یہ جرم اس کی بیوی کے لئے ناقابلِ معافی بن جاتا ہے۔ لیکن اگر جرم کی مدت اس سے کم ہو تو وہ معاف کر دیتی ہے۔ اسی طرح بیوی کی خیانت کو ۶۵ فی صد شوہر معاف کر دیتے ہیں۔ اگر اس کا بار بار اعادہ ہو تو معاف کرنے والے شوہروں کی تعداد گھٹ کر صرف پانچ فی صد رہ جاتی ہے۔ اس میگزین کے جمع کردہ اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ آج کل جنسی خیانت کے مرتکب شوہروں کی تعداد ۶۰ فی صد اور بیویوں کی تعداد ۴۰ فی صد ہے۔ جب کہ پچاس سال قبل سائمن کمیشن کی رپورٹ کے مطابق بے وفا شوہروں کی تعداد ۳۰ فی صد اور بیویوں کا تناسب صرف ۱۰ فی صد تھا۔

اس کے بعد "میری کلیر" نے لکھا ہے کہ دراصل یہی جنسی خیانت شادی شدہ جوڑوں کی ازدواجی زندگی میں بے اطمینانی اور ناکامی کی بہت حد تک ذمہ دار ہے، لیکن اس مسئلے پر کسی قانون کی مدد سے قابو نہیں پایا جا سکتا بلکہ مذہبی اور اخلاقی قدروں کو از سرِ نو زندہ کر کے ہی اس کی روک تھام کی جا سکتی ہے۔

ہندوستان ایک مشرقی ملک ہونے کے ناطے بہت حد تک مذہب پسند رہا ہے۔ ہمارے یہاں کے سماج کی اکثریت ابھی تک اپنی قدیم روایات کو سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے سماج میں ابھی تک شادی بیاہ کو ایک مقدس رشتہ سمجھا جاتا ہے، جس میں بندھنے کے بعد میاں بیوی دونوں ایک دوسرے کے فرائض اور حقوق کی اسی طرح حفاظت کرتے ہیں، جس طرح وہ اپنے دھرم اور مذہب کی حفاظت کرتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے ہمارا معاشرہ یورپ کی ان تمام برائیوں اور آلائشوں سے ابھی تک محفوظ رہا ہے، لیکن یورپی تہذیب جس قدر تیزی کے ساتھ یہاں اپنے قدم جما رہی ہے، اس کے پیشِ نظر مستقبل کے بارے میں کوئی پیشن گوئی کرنا قبل از وقت ہی ہوگا۔ تاہم چونکہ ہمارے یہاں مذہبی اقدار اور اخلاقی روایتوں کی جڑیں بہت گہری ہیں، اس لئے یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ حال کی طرح ہمارا مستقبل بھی یورپ کی ان برائیوں سے محفوظ رہے گا۔ ●●

شہناز



دُنیا کی سب سے کام یاب تاجر خاتون

عمر کے لحاظ سے بوڑھی ہوتے ہوئے بھی بجلی کی سی تیزی اور پھرتی دکھانے والی خاتون مارجری ہرسٹ کو انگلینڈ کی سب سے زیادہ کام یاب عورت کہا جاتا ہے۔ ابھی تھوڑے دن پہلے وہ انگلینڈ کے کروڑپتی لوگوں کی فہرست میں شامل ہوگئی ہے۔

یہ خاتون ایک ایجنسی کو کام یاب طریقہ سے چلا رہی ہے۔ یہ ایجنسی انگلینڈ، امریکہ اور آسٹریلیا میں دفاتر وغیرہ کے لئے ہوشیار اور تجربہ کار سکریٹری اور ٹائپسٹ لڑکیاں مہیا کرتی ہے۔ ان تین ملکوں میں پھیلی ہوئی اس ایجنسی کو مسز ہرسٹ پوری کام یابی سے چلا رہی ہے کسی زمانے میں وہ خود بھی ایک کمپنی میں ٹائپسٹ تھی، مگر آج وہ ایک بڑی کمپنی کی منتظم اور مالکہ ہے۔ اس مقام تک پہنچنے کے لئے اس کو انیس سال تک سخت محنت اور جدوجہد کرنا پڑی۔ شروع شروع میں جب اس نے یہ ایجنسی شروع کی تو اس کا کل اثاثہ صرف ایک ایک ٹائپ رائٹر اور سات سو روپے تھے، اسٹاف میں تنہا وہ خود تھی۔ جب بھی کوئی دفتر ان سے کسی ٹائپسٹ لڑکی کو بھیجنے کے لئے کہتا تو وہ خود فرضی نام سے وہاں ٹائپ کرنے پہنچ جاتی۔ وہ بہت اچھی اسٹینو اور ٹائپسٹ تھی۔ دن بھر وہ ڈٹ کر کام کرتی تھی۔ آج بھی وہ اسی رفتار سے کام دیکھتی ہے لیکن اب اس کا اسٹاف پانچ ہزار خواتین پر مشتمل ہے۔ اس کا ایک کمرہ کا دفتر اب ایک عالی شان کئی منزلہ عمارت میں بدل چکا ہے۔ انگلینڈ امریکہ، اور آسٹریلیا میں اس ایجنسی کی تقریباً پچاس شاخیں موجود ہیں۔

دنیا میں اپنے ڈھنگ کی یہ سب سے بڑی اور انوکھی ایجنسی ہے۔ یہ ہر سال تین لاکھ پچیس ہزار لڑکیوں کو ملازمتیں دلاتی ہے اور اس کی سالانہ آمدنی لاکھوں ڈالر ہے۔ یہ ایجنسی ایسے موقعوں پر جب دفاتر اور کمپنیوں کی مستقل ملازم لڑکیاں اچانک کسی وجہ سے چھٹیوں پر چلی جاتی ہیں، عارضی ملازم لڑکیاں بھی مہیا کرنے کا کام کرتی ہے۔

مسز ہرسٹ ملازم لڑکیوں اور مالکوں کے جھگڑوں کو بھی سلجھاتی ہے۔ ایک بار امریکہ میں تنخواہ کے معاملہ پر ہنگامہ ہوا، مسز ہرسٹ فوراً وہاں پہنچی اور معاملہ طے کرا دیا۔

مسز ہرسٹ کے کام کا ڈھنگ بہت سادہ ہے۔ "جو جس کام کے لئے مناسب ہوتا ہے ہم اسے وہی کام دلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں کام کو خوش اسلوبی سے پورا کرنا پسند کرتی ہوں"

مسز ہرسٹ کے کہنے کے مطابق ایک اچھی سکریٹری میں یہ خوبیاں ہونی چاہئیں۔ چست دماغ، ایک سو بیس الفاظ فی منٹ کی رفتار سے ملانے کی صلاحیت اور لوگوں کے ساتھ خوش گوار اور بشاشت آمیز برتاؤ۔"

اور کوئی ہوتا تو اتنی کام یابی کے بعد آرام کرتا۔ لیکن مسز ہرسٹ کے لئے آرام حرام ہے۔ اس کے دم خم تو یہ ہیں کہ اس کی آرزو ہے وہ دنیا میں اس ایجنسی کی کم از کم سو شاخیں قائم کرے ـــ اور شاید ایک دن اس کا یہ خواب بھی پورا ہو ہی جائے۔

●●


کیا آپ نے بیمہ ایجنٹ سے
رابطہ پیدا کیا ہے۔ ایل آئی سی کی نئی پرکشش
"تین وفادار" پالیسیوں کے سلسلہ میں
"پروگریسیو
پروٹیکشن پالیسی"
ایک مقررہ مدت پر پالیسی کی
رقم میں اضافہ ہوگا اور اس کے لیے نئے
پروپوزل یا ڈاکٹری معائنہ کی
ضرورت نہیں
"کیش اینڈ
کوور پالیسی"
ہر پانچ سال پر ادائیگیوں کی گارنٹی
دی جاتی ہے۔ اور کل رقم
بیمہ پر بونس بھی ملے گا۔ ساتھ ہی
زندگی بھر سلامتی
بھی ملے گی۔
"منی بیک
پالیسی"
دوسرے پلانوں کے مقابلہ میں زیادہ سے
زیادہ اور جلد از جلد رقم، کچھ کچھ
وقفہ سے ملتی رہتی ہے۔ اور وہ بھی پالیسی
کی مدت ختم ہونے سے پہلے۔
اور مدت ختم ہونے تک ساری رقم بیمہ
کے لئے، جو کم برقرار رہتا ہے۔
وقت بدل رہا ہے۔ ضرورتیں بدل رہی ہیں
لائف انشورنس کارپوریشن آف انڈیا

خیالؔ انصاری



نجات

مکان کے دروازے پر قدم رکھتے ہی وہ تاڑ گیا کہ آج بھی گھر کی فضا مخدوش ہے۔ کچن سے اس کی پتنی کی تیز آواز گونج رہی تھی:

"میرے تو نصیب پھوٹ گئے۔ یہ گھر ہے یا جیل خانہ۔ گھڑی بھر کے لئے بھی سکون نہیں۔ میں تو نرک میں جل رہی ہوں۔ نہ جانے بھگوان نے کس جنم کا بدلہ لیا ہے۔ مجھ سے بہتر تو گلی کے کتے ہیں۔ میں تو بس لونڈی ہوں، لونڈی اس گھر کی۔ بھگوان اٹھا بھی تو نہیں لیتا۔"

"نصیب تو میرے پھوٹ گئے کل موہی۔ جس دن سے میرے بیٹے کے پلّے بندھ کر آئی ہے، میرا بیٹا مجھ سے چھن گیا ہے۔ میرے گھر سے خوشیاں روٹھ گئیں۔ تیرے منحوس قدم پڑتے ہی بسا بسایا گھر اُجاڑ ہو گیا ہے۔ میرے گھر پر حکومت کرنے کی نہ سوچ۔ میں تو اپنے کپوت بیٹے سے ہاری ہوں، نہیں تو تجھ چڑیل کو کب کا چلتا کر دیتی۔ آتے ہی تُو نے میرے بیٹے کو نہ جانے کیا کھلایا کہ لڑکا میرے بس میں نہ رہا۔"

وہ خاموشی سے دروازے پر کھڑا ماں اور پتنی کی جھڑپ سن رہا تھا۔ اس کی آنکھیں غصّے سے سرخ ہو رہی تھیں، چہرے پر بے چارگی اور تھکے ہوئے مسافر کی کیفیت طاری تھی۔ آج ایک ہفتے سے اس کے گھر کا امن و سکون برباد ہو چکا تھا۔ روز ہی اس کی کوشش ہوتی کہ ساس بہو میں کسی طرح صلح کرا دے، لیکن جب تک وہ گھر میں ہوتا، آگ دبی رہتی، اس کے باہر قدم نکالتے ہی گویا نفرتوں کی یہ آگ بھڑک اٹھتی۔ اور جب وہ پھر دروازے پر قدم رکھتا تو ان لوگوں کو لڑتے جھگڑتے ہی پاتا۔

اس نے اندر قدم رکھا اور چیخ کر کہا "بھگوان کے لئے اب تو خاموش ہو جاؤ۔ کیوں میری زندگی لینے پر تُلی ہوئی ہو تم دونوں! کچھ تو سمجھ داری سے کام لو۔" اور وہ غصّے میں بھرا ہوا پلنگ پر گر گیا۔

اب گھر کی فضا میں مکمل خاموشی تھی۔

اور وہ سوچ رہا تھا کہ یہ وہی میری ماں ہے جس کی زبان بہو کی تعریف کرتے ہوئے نہیں تھکتی تھی۔ بہو کی محبت میں وہ اپنے بیٹے تک کو کبھی کبھی بھلا دیتی تھی۔ میرا جب پہلا لڑکا ہوا تھا تو یہی ماں اپنی بہو کو سونے میں تولنے پہ تُلی ہوئی تھی۔ کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، سونے تک کے وقت اس کے ساتھ ہوتی۔ بڑھ بڑھ کر اس کے سب کام کرتی۔ بہو کی اس کے بچے کی بلائیں لیتی۔ کسی بات پر میں اگر رادھا کو ڈانٹتا تو الٹا مجھ پر برس پڑتی:

"اے لڑکے مانا تو اسے بیاہ کر لایا ہے اور یہ تیری پتنی ہے۔ لیکن یاد رکھ تجھ سے زیادہ میرا حق ہے اس پر۔ خبردار، میری بہو کو کچھ الٹا سیدھا کہا تو۔ اے پگلے ابھی اس کی کوئی عمر ہے گھر گرہستی کے جھمیلوں میں پڑنے کی۔ نادان بچی تو ہے میری بہو۔ تجھے جو کام کرانا ہے، مجھ سے کہہ۔ میں ابھی زندہ ہوں۔ میرے بازوؤں میں ابھی دم ہے۔ تم دونوں ابھی جوان ہو۔ زندگی کا مزہ لو۔ کام کاج، گھر گرہستی تو سدا کی زندگی ہے۔ جوانی کے دن گرہستی اور بلاوجہ کی فکر میں نہ گنواؤ۔ میں زندہ ہوں، ابھی منوہر۔ تیرا باپ مر گیا لیکن تیری ماں ابھی زندہ ہے۔ بہو پر زیادہ رعب نہ گانٹھا کر۔ یہ تیری پتنی بعد میں ہے، میری بہو پہلے۔"

اور یہ وہی رادھا تھی جو لوٹ لوٹ کر ساس کی خدمت میں لگی رہتی۔

"ماں جی، ہٹو۔ میں برتن دھوئے دیتی ہوں۔ ماں جی، لاؤ تمہارے پاؤں داب دوں۔ لاؤ، سر میں تیل ڈال دوں۔ ماں جی، کیوں آپ مجھے ناکارہ بنانے پر تلی ہوئی ہیں۔ سب لوگ دیکھتے ہیں پھر، وہ، بھی دل میں کیا سوچتے ہوں گے کہ بوڑھی ماں سے کام لیتی ہے۔ گلی محلے اڑوس پڑوس کی پھٹکار پڑے گی مجھ پر ماں جی۔ اب آپ آرام کیجئے۔ کم از کم میرے کام تو نہ کیا کیجئے۔" اور پھر وہ اپنے آنسوؤں کو ساڑی کے پلو سے پونچھ کر کہتی۔ "ماں جی، میری ماں تو بچپن ہی میں مر گئی تھی میں اپنی ماں کی کوئی بھی خدمت نہ کر سکی۔ اپنی خدمت کرنے کا مجھے موقع دیں ماں جی، تاکہ میری روح کو سکون ملے۔"

کبھی کبھی وہ پتی سے بھی اُلجھ پڑتی "آپ کیسے بیٹے ہیں۔ ماں جی بڑھ بڑھ کر چھین چھین کر مجھ سے میرا سب کام کرتی ہیں اور آپ، انہیں کچھ کہتے نہیں۔ میری تو کوئی سنوائی ہی نہیں۔ کچھ تم ہم آپ تو کہیے۔ آپ کی بات نہ ٹالیں گی ماں جی۔"

اور وہ اسی الجھن میں پھنسا رہتا کہ کیسے سمجھائے اور کس طرح سمجھائے۔ اس کے ساتھ وہ یہ سوچ کر خوش بھی ہوتا کہ میرا گھر سنہرا سنسار ہے، جہاں کوئی رنجش، کوئی ان بن، کوئی جھگڑا نہیں۔ بس شانتی ہی شانتی ہے۔ اور وہ بھگوان سے دعا کرتا ـــ "بھگوان! میرے گھر کو اسی طرح پریم اور شانتی کا نگر بنائے رکھنا۔"

لیکن اب اسے ایسا محسوس ہوتا کہ پریم اور شانتی کا بس ایک جھونکا تھا۔ جو وقتی طور سے اس گھر میں آکر اپنی خوشبو پھیلا کر گذر گیا تھا۔ اس کے بعد اب جلی کٹی باتوں، رنجش اور ایک دوسرے پر طعنہ زنی کے سوا اس کے گھر میں کوئی اور بات نہیں رہی تھی۔ روز روز کی اس دانتا کلکل نے اس کا ذہنی سکون برباد کر دیا تھا۔ اسے خوش و خرم گھرانے میں نفرت کا رخنہ اس وقت پڑا جب رادھا کی معمولی سی بے پروائی کی بنا پر اس کے لڑکے کو چیچک کھا گئی۔ لڑکے کی زندگی کم تھی، اس بد قسمت سے وہ چیچک کی لپیٹ میں آکر پورے ہنستے بولتے خوش و خرم گھر میں اُداسی اور خاموشی کی لہر میں بہتا چھوڑ کر جُدا ہو گیا۔ لیکن اس کی ماں بس یہی کہتی رہی کہ بہو کی بے پروائی نے پوتے کی جان لی ہے۔ اور پھر دن بہ دن اختلافات اور رنجشوں کی دیواریں مضبوط ہوتی گئیں اور ساس بہو ایک دوسرے سے دُور اور دُور ہوتی گئیں۔ وہ زرا زرا سی باتوں پر جھگڑنے لگیں، طعنے کسے جانے لگے۔ پھر تین سال کا عرصہ بیت گیا اور بہو نے کوئی دوسرا بچہ پیدا نہیں کر کے دیا تو ساس کی نفرت کی آگ سرد ہونے کا یہ امکان

بھی ختم ہوا۔

اب وہ برسوں سے ماں اور تپنی کی نفرتوں کے بیچ زندگی بسر کر رہا تھا۔ لیکن ادھر ایک ہفتے سے وہ ذہنی اور دلی طور سے جتنا پریشان اور فکرمند تھا پہلے کبھی نہ رہا تھا۔ یہ کسی طوفان کے آنے کے آثار تھے۔

آج پھر وہ شام کو دفتر سے گھر آیا تو اس کے گھر میں مہابھارت چھڑی ہوئی تھی۔

اس کو دیکھتے ہی ماں اور تپنی کو جیسے نئی طاقت مل گئی۔ دونوں اس کی طرف لپکے۔ ماں سامنے تن کر آکھڑی ہوئی۔ "دیکھ ارون، سن لے کان کھول کر۔ اب یہ چڑیل رہے گی اس گھر میں یا پھر میں۔ اب مجھ سے اور برداشت نہیں ہوتا۔ آج فیصلہ ہو جائے تو میں سکھ کا سانس لوں۔ تجھے ابھی فیصلہ کرنا ہوگا ـــ تجھے ماں چاہیے یا تپنی۔ میں ان طعنوں کو برداشت نہیں کر سکتی کہ میں تیرے ٹکڑوں پر پل رہی ہوں۔ اور اگر تو اس چڑیل کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا تو تو بھی چاہے تو اس کے ساتھ جا سکتا ہے، ورنہ مجھ سے صاف صاف کہہ دے۔ اب میرا دانا پانی اٹھ گیا ہے تو میں ہی اس جہنم سے نکل جاتی ہوں۔ رہو تم دونوں سکھ سے۔ لیکن اب میں نہیں رہ سکتی۔"

اُس کی ماں نے ایک ہی سانس میں اپنا مدعا کہہ سنایا۔

"دیکھ رہے ہیں آپ؟ کیا کچھ نہیں کہا انہوں نے۔ میں بھی انسان ہوں۔ کب تک برداشت کروں میں بھی۔ میں خود چاہتی ہوں کہ اب میرا فیصلہ ہو جائے۔" اس کی تپنی نے روتے ہوئے کہا۔

"سن رہا ہے کلموہی کی زبان درازی؟ ارے میں کہوں کہ اس کے پیٹ کا بوجھ بن گئی ہوں کیا میں؟ اور تو اب کچھ نہ کہے جا رہا ہے۔ جاؤ چھوڑ دو مجھے اکیلا، پروا نہیں۔ اب میں خود تمہارے ٹکڑوں پر پلنا نہیں چاہتی۔ میں خود تم پر بوجھ بن کر نہیں رہنا چاہتی۔ صبح کو ہی اگر تم لوگ یہاں سے نہیں گئے تو میں خود چلی جاؤں گی۔ کان کھول کر سن لو تم لوگ!" اس کی ماں نے الٹی میٹم دے دیا۔

"ماں، اگر تم ہم لوگوں سے اتنی ہی بیزار ہو تو میں چلا جاتا ہوں۔"

ارون نے کہنے کو تو کہہ دیا، لیکن خود وہ حیران تھا کہ اس کے منہ سے آج ایسے جملے کیسے نکل گئے۔ ماں کو وہ کسی بھی طرح چھوڑ نہیں سکتا تھا۔

"نکل جا ابھی ـــ جا اس چڑیل کی پوجا کر کہیں لے جا کر ـــ دونوں نکل جاؤ ابھی نکل جاؤ۔ مجھے ضرورت نہیں تمہاری۔"

یہ سنتے ہی ارون کے برداشت اور صبر کی حدیں ٹوٹ گئیں۔ اس نے رادھا کا ہاتھ پکڑا اور کچھ کہے بغیر گھر سے نکل پڑا۔

ارون اور رادھا کو گھر سے گئے ہوئے ابھی پندرہ منٹ ہی گذرے تھے کہ اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ پورا گھر اس کو کاٹ کھانے کو دوڑنے لگا۔ در و دیوار پر ایک عجیب سی اداسی چھا گئی۔ اور پھر وہ سسک سسک کر رونے لگی۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

"ارون! میرے لال! تو چھوڑ گیا مجھے! ارے نادان برا مان گیا۔ میں نے دل سے کب نکل جانے کو کہا تھا تجھے۔ ماں کا غصہ دیکھا تجھے، ماں کا دل چیر کر دیکھا ہوتا۔ ماں کو چھوڑ گیا بیوی کے لئے۔ اس ماں کو جس نے تجھے پالا پوسا، اتنا بڑا کیا۔ تپنی کے ساتھ بھاگتے میں شرم نہیں آئی۔ تپنی کی مسکراہٹ اور محبت کے آگے ماں کی ممتا اور پیار کو ٹھکرا گیا۔ تیرا خون اتنا بے رنگ ہو گیا!"

اس کے ذہن میں الٹے سیدھے خیالات پرورش پا رہے تھے۔ نہ جانے کب اسے نیند آئی تھی۔ وہ پلنگ پر پڑی ایک ٹک دروازے کو دیکھتی رہی۔ اس کا دل جیسے کہہ رہا تھا، اس کا بیٹا اب آیا تب آیا۔ اس کی بے چین نظریں اور اس کے کان دروازے پر ارون کے قدموں کی چاپ سننے کے لیے بے چین تھے۔ لیکن وہ سو گئی اور ارون نہیں آیا۔

صبح کا اجالا پھیل چکا تھا۔

راستے پر قدموں کی چاپ سے دھول اُڑنے لگی تھی۔ جانوروں کی بولیاں صبح کی آمد کی نشاندہی کر رہی تھیں۔ سرد ہوا کا ایک جھونکا کھڑکی کے پٹ کھولتا ہوا کمرے میں آگھسا اور ماں کی نیند ٹوٹ گئی۔ اس نے لیٹے لیٹے دروازے کی جانب ایک نظر دوڑائی۔ دروازے پر کوئی نہیں تھا۔

اچانک اسے اپنے پیروں پر ایک بوجھ محسوس ہوا اور وہ گھبرا کر پیروں کی جانب دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ایک قطار بہہ نکلی۔

ارون زمین پر بیٹھا اپنا سر ماں کے قدموں پر رکھ کر سو رہا تھا۔

وہ اٹھی اور "میرا لال" کہہ کر اسے چپٹا لیا۔

پھر کہا "ارون، میری بہو کہاں ہے؟ بہو کو کیوں نہیں لایا؟ جا ابھی جا، مجھے میری بہو چاہیئے، ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

ارون آنکھوں ملتا ہوا اٹھا اور کچھ کہے بغیر دروازے سے نکل گیا۔

وہ ۴۶ برس تک ایک مرد فوجی ڈاکٹر کے بھیس میں رہی

ایم عبداللہ

آج کل فوجی اسپتالوں میں نرسوں کی کمی نہیں لیکن لیڈی ڈاکٹران اسپتالوں میں کبھی عجوبہ سمجھی جاتی ہے۔ جنگ چھڑنے پر فوجی اسپتال محاذ کے عقب میں قائم کئے جاتے ہیں۔ وہاں گولوں کے دھماکوں کے ساتھ ایمرجنسی آپریشن بھی کئے جاتے ہیں زخمیوں کی مرہم پٹی بھی کی جاتی ہے۔ زیادہ مجروح سپاہی دور کے اسپتالوں میں منتقل کر دئے جاتے ہیں۔ ان اسپتالوں میں کام کرنا مذاق نہیں۔ یہ بڑے دل گردے کا کام ہے۔ ہندوستان میں لیڈی ڈاکٹروں کی تعداد اچھی خاصی ہے لیکن یہ سب عورتیں شہروں ہی میں پریکٹس کرتی ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں لیڈی ڈاکٹر ایک نایاب چیز ہے۔ وہاں عورتیں ڈاکٹر بننا پسند نہیں کرتیں۔ نزلہ کھانسی کے علاج سے لے کر زچگی کرانے کا کام تک مرد ڈاکٹر ہی کرتے ہیں۔

آج سے ۲۰۰ سال پہلے انگلستان میں ایک بھی لیڈی ڈاکٹر نہیں تھی۔ سرکاری ریکارڈ کے مطابق یہ بات درست ہے، لیکن اصل میں یہ بات غلط ہے انگلستان میں نہ صرف ایک لیڈی ڈاکٹر موجود تھی بلکہ وہ فوجی اسپتال میں سرجن کا کام بھی کرتی تھی۔ اس کا نام ڈاکٹر جیمس بیری تھا۔ یہ عورت تمام عمر مردانہ بھیس میں رہی۔ یہ راز اس کی زندگی میں کسی کو نہ معلوم ہو سکا کہ وہ مرد نہیں عورت ہے۔ اس عورت نے ۴۶ سال تک انگریزی فوج میں سرجن کی ملازمت کی۔

جیمس بیری کا اصل نام کسی کو معلوم نہیں اس کی پرورش لڑکوں کی طرح ہوئی تھی۔ اس کے ماں باپ کے متعلق بھی کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ شاہزادہ انگلستان کی ناجائز بیٹی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ کوئی معزز آدمی اس کی پشت پناہ تھا، لیکن اس آدمی کا نام آج تک صیغۂ راز میں ہے۔

ڈاکٹر بیری ۱۴ سال کی عمر میں ایڈنبرا یونیورسٹی کے میڈیکل کالج میں داخل ہوئی۔ اس کا قد صرف ۵ فٹ تھا۔ وہ دبلے پتلے جسم اور سرخ بالوں والی لڑکی تھی۔ ۱۷ سال کی عمر میں اس نے ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا۔ اس زمانے میں کلوروفارم ایجاد نہیں ہوا تھا۔ پینی سلین اور جراثیم کش دوائیں ابھی منظر عام پر نہیں آئی تھیں آپریشن کا کمرہ کسی مقتل سے کم نہ ہوتا تھا۔ کچھ لوگ مریض کو زور سے پکڑ لیتے اور ڈاکٹر آری سے اس کے بیمار عضو کو کاٹتا تھا۔ مریض کی چیخوں سے لوگوں کے دل دہل جاتے تھے۔ بڑے بڑے بہادر آدمی اس منظر کو دیکھ کر لرز جاتے تھے مگر یہ ایک حیرت انگیز بات ہے کہ ڈاکٹر بیری ان تمام آزمائشوں میں کامیاب ہوگئی۔

جنوری ۱۸۱۲ میں بیری نے سرجری کا امتحان پاس کیا۔ اسے ایک اسپتال میں اسسٹنٹ سرجن کے عہدہ پر تعینات کیا گیا۔ جب وہ اپنے عہدے کا چارج لینے کے لئے اسپتال پہنچی تو چیف سرجن نے اسے بچہ سمجھ کر اسپتال میں رکھنے سے انکار کر دیا۔ کچھ ہی دن بعد چیف سرجن کو وزارتِ صحت کی طرف سے 'مشورہ' دیا گیا کہ وہ اس معاملہ میں خاموشی اختیار کرے۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر بیری کی پشت پناہی کوئی بڑا آدمی کر رہا تھا

ڈاکٹر بیری نے دو سال اس اسپتال میں کام کیا۔ اس کے بعد اسے فوج کے ڈاکٹر کا عہدہ مل گیا۔ اس کا تبادلہ جنوبی افریقہ کے شہر کیپ ٹاؤن میں ہو گیا۔ ڈاکٹر بیری کی عمر اس وقت ۲۱ سال تھی۔ وہ اپنی قامت کا راز چھپانے کے لئے ۳ انچ کی ایڑی والا جوتا پہنتی تھی، بہترین وردی زیبِ تن کرتی تھی، ایک لمبی تلوار اس کی پیٹی سے لٹکتی رہتی۔ اس تلوار کا سنبھالنا اس کے لئے مشکل ہوتا۔ وہ مردانہ لباس میں سج دھج کر پارٹیوں اور رقص کی محفلوں میں جاتی، وہ ہر عورت سے پیار محبت کا کھیل کھیلتی وہ اپنے کوٹ میں روئی کے پیڈ لگا کر جاتی، تاکہ اس کا سینہ چوڑا معلوم ہو۔ ۱۸۲۳ میں اس نے ایک بچہ کو ماں کا پیٹ کاٹ کر نکالا۔ یہ انگلستان کا سب سے پہلا "سی زیرین آپریشن" تھا۔

ڈاکٹر بیری بڑی درشت مزاج عورت تھی۔ اس کی بدمزاجی سارے کیپ ٹاؤن میں مشہور تھی، ایک دفعہ وہ گورنر سے ملنے گئی۔ گورنر کے سیکریٹری نے اس سے باہر کے کمرے میں انتظار کرنے کی درخواست کی۔ گورنر اپنے کمرے میں ہالینڈ کی ایک عورت کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھا جب گورنر کو باہر آنے میں دیر ہو گئی تو بیری کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ اس نے اپنی لمبی ناک سکیڑ کر کہا "یہ اچھی ہالینڈ کی گھوڑی ہے جو گورنر کو پسند آگئی ہے"۔ سیکریٹری یہ سن کر آگ بگولہ ہو گیا۔ اس نے فوراً بیری کی ناک پکڑ لی اور کہا "بدمعاش! اپنے الفاظ واپس لے!" بیری نے الفاظ واپس لینا سیکھا ہی نہیں تھا۔ اس نے فوراً سیکریٹری کو 'ڈوئیل' لڑنے کے لئے للکارا۔ پرانے زمانے میں 'ڈوئیل' دو شریف آدمیوں کے درمیان لڑی جاتی تھی۔ اگر ایک رئیس دوسرے کی توہین کرتا تو دوسرا اس سے معافی مانگنے کے لئے کہتا۔ اگر وہ معافی مانگنے سے انکار کرتا تو اسے دوسرے دن لڑنا پڑتا۔ یہ لڑائی نہایت خاموشی سے شہر سے دور جنگل میں لڑی جاتی۔ دونوں لڑنے والوں کے نائب



جگہ اور ہتھیاروں کا انتخاب کرتے۔ ایک ڈاکٹر بھی موقع پر موجود رہتا تھا۔ یہ سب کام نہایت رازداری سے ہوتا تھا کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ لڑنے والے کے بیوی بچے بھی اس سے بے خبر رہتے تھے۔ پہلے یہ جنگ تلواروں سے لڑی جاتی تھی بعد میں پستول سے لڑی جانے لگی۔ دونوں لڑنے والے ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہوجاتے۔ پھر ایک دوسرے کی طرف پشت کرکے ۲۰ قدم چلتے اور فوراً مڑکر ایک دوسرے پر فائر کرتے۔ انھیں نشانہ لینے کا وقت نہیں ملتا تھا۔ زخمی ہونے والے کی مرہم پٹی کرکے اسے خاموشی سے گھر پہنچا دیا جاتا تھا۔ اگر دونوں کا نشانہ خطا ہوجاتا تو دونوں گھر واپس چلے جاتے اور معاملہ وہیں ختم ہوجاتا۔ یہ لڑائی اب غیر قانونی ہے۔

جب بیری نے سیکریٹری کو ڈوئیل کے لئے للکارا۔ تو سیکریٹری نے یہ چیلنج قبول کرلیا۔ دوسرے دن تڑکے ہی یہ ڈوئیل لڑی گئی۔ دونوں کے ہاتھ میں ایک ایک پستول تھا۔ پستول میں ایک ایک گولی تھی۔ ۲۰ قدم چلنے کے بعد دونوں نے ایک ساتھ فائر کئے۔ بیری زمین پر گر پڑی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سیکریٹری کا نشانہ خطا نہیں گیا۔ ڈاکٹر موقع پر موجود تھا۔ اس نے لپک کر بیری کو سنبھالا اور کہا "کیا آپ کے چوٹ آگئی ہے؟" بیری نے فوراً جواب دیا "نہیں مجھے کوئی چوٹ نہیں آئی" یہ کہہ کر وہ آہستہ آہستہ اپنی گاڑی کی طرف چل پڑی۔ لیکن اس کے چلنے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے گولی لگی ہے۔ بیری گاڑی میں بیٹھ کر گھر روانہ ہوگئی۔ وہ کئی دن تک گھر میں رہی۔ اس نے اپنا علاج خود کیا۔ اگر ڈاکٹر اس کا علاج کرتا تو اس کے عورت ہونے

کا راز کھل جاتا۔ بعد میں بیرل اور سیکریٹری بہت اچھے دوست بن گئے۔

بیری جب تک کیپ ٹاؤن میں رہی کسی کو اس کے سامنے دم مارنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس کی سخت مزاجی سے اسپتال کا سارا اسٹاف کانپتا تھا بیسویں صدی کے اوائل تک کیپ ٹاؤن کی نرسیں بچوں کو ڈاکٹر بیری کے بھوت کا نام لے کر ڈرایا کرتی تھیں کیپ ٹاؤن کے قیام کے دوران ایک بار اس کی شخصیت کا راز کھلتے کھلتے رہ گیا۔ ایک دن ایک نرس اس کے کمرے میں بغیر دستک دیئے گھس گئی۔ اس نے وہاں جو کچھ دیکھا وہ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی تھا کہ ڈاکٹر بیری مرد نہیں عورت ہے۔ نرس نے اپنی کچھ ہمجولیوں کو یہ بات بتائی ـــــ لیکن سب نے اسے مجذوب کی بڑ سمجھ کر ٹال دیا۔

ڈاکٹر بیری قاعدے قانون کی زیادہ پروا نہیں کرتی تھی۔ ایک دفعہ وہ رخصت کی درخواست دیئے بغیر انگلستان روانہ ہوگئی۔ جب وہ انگلستان پہنچی تو فوج کے ڈائرکٹر جنرل نے اسے بلایا اور چھٹی کی درخواست منظور ہوئے بغیر انگلستان آنے کی وجہ پوچھی۔ ڈاکٹر بیری نے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور بڑے اطمینان سے جواب دیا "جناب، میں یہاں اپنے بال کٹوانے آیا ہوں" یہ سنتے ہی غصے کے مارے ڈاکٹر کا برا حال ہوگیا۔ لیکن وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا کوئی بہت بڑا آدمی بیری کی پشت پناہی کر رہا تھا

کچھ عرصے بعد ڈاکٹر بیری کو جمیکا بھیج دیا گیا۔ یہ وسط امریکہ میں ایک جزیرہ ہے۔ جمیکا میں اس کے قیام کے دوران وہاں کے رہنے والے سیاہ فام باشندے انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت پر اتر آئے۔ انگریزی فوج نے اس بغاوت کو آسانی سے کچل دیا۔ جنگ میں انگریزوں کا زیادہ جانی نقصان نہیں ہوا۔ لیکن انگریزی کیمپ میں وبا پھیل گئی۔ ملیریا، پیچش اور زرد بخار نے تباہی مچادی۔ ڈاکٹر بیری نے رات دن محنت کی۔ آخر اس نے ان بیماریوں پر قابو پالیا۔ وہ شراب اور گوشت سے پرہیز کرتی تھی۔ وہ نہایت سادہ زندگی گذارتی تھی۔ شاید اسی وجہ سے وہ ان بیماریوں سے محفوظ رہی۔

جمیکا سے اسے سینٹ ہلینا بھیج دیا گیا یہ جزیرہ افریقہ کے ساحل کے قریب واقع ہے۔ یہاں نپولین کو قید کیا گیا تھا۔ اسی جزیرے میں اس کی موت ہوئی تھی۔ ڈاکٹر بیری نے یہاں بھی گورنر سے جھگڑا مول لے لیا۔ اس نے گورنر کے خلاف بالا ہی بالا وزارت جنگ کو خط لکھا۔ گورنر کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے فوج کے جنرل سے شکایت کی۔ ڈاکٹر بیری کا کورٹ مارشل کیا گیا اس فوجی عدالت سے بھی ڈاکٹر بیری باعزت بری ہوگئی۔

سینٹ ہلینا سے بیری کو پھر جمیکا بھیج دیا گیا۔ یہاں اس کی شخصیت کا راز ایک بار پھر کھلتے کھلتے رہ گیا۔ ڈاکٹر بیری پر بخار کا شدید حملہ ہوا۔ اس کے جینے کی کوئی امید نہ رہی۔ اس نے وصیت کی کہ اس کو مرنے کے فوراً بعد ملٹری کی وردی میں دفنایا جائے جمیکا میں گرمی بہت تھی۔ وہ ہلکے سوتی کپڑے پہنے بستر پر دراز تھی۔ ایک ڈاکٹر جو اس کا ماتحت تھا اس کو دیکھنے چلا آیا۔ اس کے ساتھ ایک سپاہی بھی تھا۔ ڈاکٹر بیری نیم بے ہوشی کی حالت میں کراہ رہی تھی۔ ڈاکٹر خاموشی سے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے بستر پر ایک عورت کو دراز دیکھا۔ اس نے فوراً سپاہی کو اندر بلایا اور کہا۔ "دیکھو، بیری ایک عورت ہے"۔ بیری نے اس کی آواز سن لی۔ وہ سمجھ گئی کہ اس کا راز فاش ہوچکا ہے لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ اس نے ان دونوں کو قریب بلایا اور ان کو قسم دی کہ وہ یہ راز کسی کو نہ بتائیں گے۔ اُس زمانے میں شرفا کی قسم بہت اہمیت رکھتی تھی۔ شرفا اپنی عزت کی قسم کھاتے تھے اور اُسے نبھاتے تھے۔ ڈاکٹر بیری کے معاملے میں بھی یہی ہوا۔ دونوں نے اپنی زبان بند رکھی۔

ڈاکٹر بیری نے ۴۶ سال فوج میں ملازمت کی ۱۸۵۹ میں وہ فوج سے ریٹائر ہوگئی۔ اُسے جنرل کا عہدہ دیا گیا اور نصف تنخواہ پر ریٹائر کر دیا گیا ۱۸۶۵ میں ڈاکٹر بیری دستوں کی بیماری سے مرگئی۔ اُس کے کفن دفن کا انتظام کرنے کے لئے ایک عورت بلائی گئی۔ یہ عورت لاش کو تابوت میں رکھنے کے لئے کمرے میں گئی، لیکن فوراً ہی چلاتی ہوئی باہر آگئی اور ڈاکٹر سے بولی: "آپ نے مجھے ایک جنرل کی تکفین کے لئے حکم دیا تھا۔ وہ ایک عورت ہے اور عورت بھی وہ جو بچہ پیدا کرچکی ہے"۔ اس عورت کا اعتبار نہیں کیا گیا۔ جب یہ معاملہ فوج کے وکیل کے سامنے آیا تو اس عورت نے گواہی دی کہ وہ حاملہ عورت کے پیٹ کے نشان پہچانتی ہے۔ وہ خود نو بچوں کی ماں ہے اور اس بات کی قسم کھا سکتی ہے کہ بیری نہ صرف ایک عورت ہے، بلکہ ایک بچہ کی ماں بھی بن چکی ہے۔

ڈاکٹر بیری کی موت کے دوسرے دن ایک رئیس کا ملازم اس کے گھر پر آیا۔ اس نے بیری کے سیاہ فام نوکر کو اس کی بقایا تنخواہ اور اس کے واپس جمیکا جانے کا کرایہ دیا۔ اسے بیری کے گھر سے ایک سیاہ رنگ کا سوٹ کیس ملا۔ وہ اسے لے کر چلتا بنا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اس سوٹ کیس میں بیری کی پُراسرار پیدائش کی کہانی چھپی ہوئی تھی۔

دوسرے دن بیری کو لندن کے ایک قبرستان میں دفن کردیا گیا۔

شریکِ حیات سے ایک سوال

اِک زمانہ تھا مِری آنکھوں میں جلتے تھے چراغ
میرے ہونٹوں سے چھلک پڑتے تھے مستی کے ایاغ
تھی مہک میرے پسینہ میں
مِرے ہاتھ حِنائی سے تھے !
آپ کہتے تھے کہ مرمر کا بدن ہے میرا !
آج اکیس برس بعد، مِرے گلشن میں
وہ مہک ہے نہ چمک !
میری زلفوں سے وہ ساون کی گھٹا روٹھ گئی
زرد ہیں عارضِ تابندہ کے رنگین گلاب !
کتنی بوسیدہ سی لگتی ہے یہ چہرے کی کتاب ؟
ہاں ـــ مگر جھانک کے دیکھو ذرا ان آنکھوں میں
میری اِک بات سنو : ـــ
میں نے تخلیق کئے آپ کے جو چار گلاب
حُسن میرا انہیں پھولوں میں سمٹ آیا ہے
آپ کی جاہ بھری شخصیت
یہ آپ کا گھر ـــ
میری ہستی، مری ہستی کا ہی تو سایہ ہے !

آپ کیوں ڈھونڈتے ہیں غیر کی آنکھوں میں چراغ
وہ پسینہ کی مہک
اور وہ ہونٹوں کے ایاغ ؟

شیریں فرحت قمر



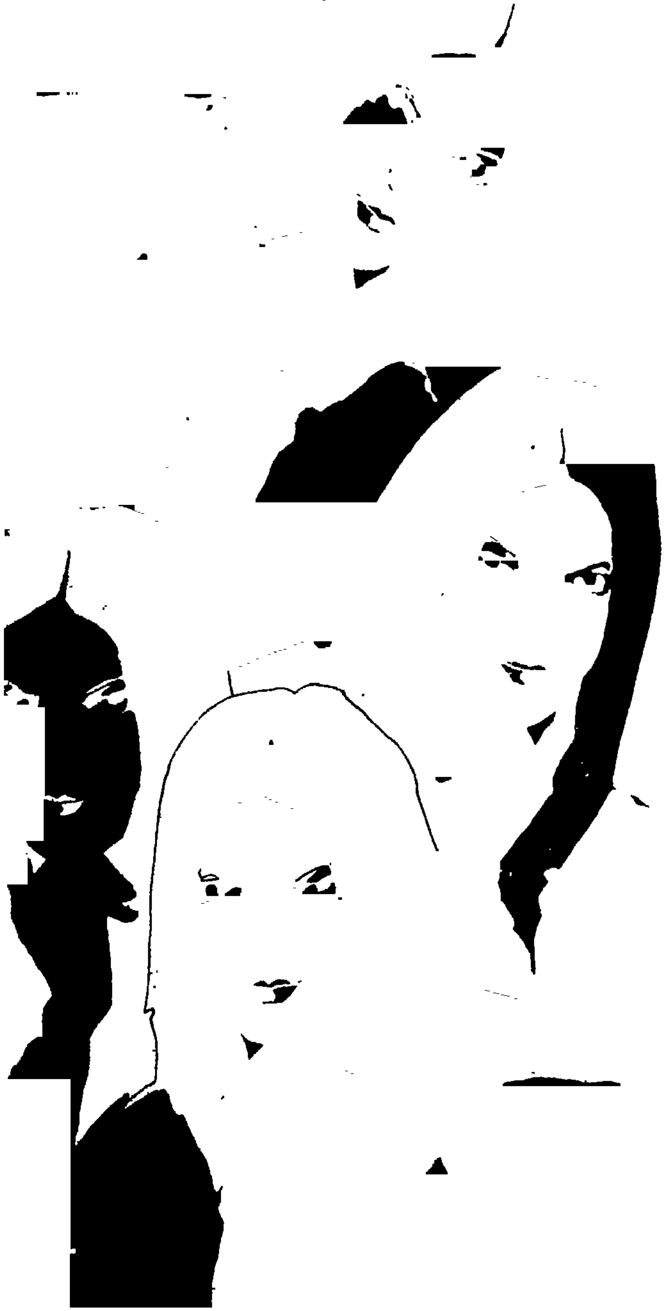
نیا فرہاد

موسمِ بہار کی حسین چاندرات میں
چاند کو گواہ کر کے اُس نے باتوں بات میں
عجیب ڈھنگ سے کہا
تمہیں تو آنکھوں کا ہو نور
میرے دل کا ہو سرور
نگاہ و دل کا ہو سکوں
حاصلِ بہار ہو
قرار ہی قرار ہو
تمہارا ہجر ۔ قابلِ یقیں نہیں
مِرا کرو یقیں
کہو تو پتھروں کا سینہ چیر کر
میں جوئے شیر لاؤں جانِ من
داستانِ کوہ کن کو تازگی عطا کروں
کہو تو آسمان کے حسین تارے توڑ کر
تمہاری مانگ کو سجا دوں میں
کائنات لا دوں میں
کہو تو میں . . . .
میں نے بات اُس کی کاٹ کر
ہاتھ اُس کا لے کے ہاتھ میں
کہا ۔
پہلے یہ بتاؤ تو ۔
شام کل پھر آؤ گے ۔ ؟
مِرا خیال ہے کہ اور اِئے کاشی نیشل ٹھیک ہے
سُن کے بات میری اُس نے یوں جمائی لی ۔
اور سے سمجھا کے پھر کہا ۔
ضرور آؤں گا
شرط یہ ہے
بارش اگر نہ آئی تو . . . .

زرینہ زریں

ن ، سلطانہ

خیال کی طاقت سے فائدہ اٹھائیے



ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک بوڑھا آدمی درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔ اچانک پلیگ کا بھوت اس کے سامنے سے گزرا۔ اس نے بھوت سے پوچھا "تم کہاں جارہے ہو؟" بھوت نے جواب دیا "میں بنارس جارہا ہوں۔ وہاں ۱۰۰ آدمی میرا شکار ہوں گے"۔ یہ کہہ کر بھوت چلا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد بوڑھے آدمی نے سنا کہ بنارس میں دس ہزار انسان پلیگ کا شکار ہوگئے۔ ایک دن پلیگ کا بھوت پھر اس بوڑھے آدمی کے سامنے سے گزرا تو اس نے بھوت سے کہا "تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ تم نے تو کہا تھا کہ تم صرف ۱۰۰ آدمی شکار کروگے"۔ بھوت نے جواب دیا "میں نے صرف ۱۰۰ آدمی مارے تھے۔ باقی لوگ پلیگ کے خوف سے مرگئے تھے"۔

خیال کا انسان کی زندگی پر زبردست اثر پڑتا ہے۔ انسان کی حرکات اس کے خیال کے تابع ہیں۔ اگر ہمارا ہاتھ انگارے کو چھولے تو ہم فوراً ہی ہاتھ کو ہٹالیتے ہیں۔ ہاتھ سے انگارہ لگا اور دماغ نے ہاتھ کو انگارے سے الگ ہوجانے کا حکم دیا۔ یہ سب ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ہوجاتا ہے۔ اگر ہمارا پاؤں رسّی پر پڑجائے اور ہم اسے سانپ سمجھ لیں تو فوراً اچھل پڑتے ہیں۔ یہ حکم بھی دماغ سے ہی آتا ہے۔ لیکن یہاں دماغ دھوکا کھا گیا۔ یہ دھوکا ہمارے ڈر کی وجہ سے ہوا۔ جب ہمیں یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ ہم رسّی کو سانپ سمجھ

بیٹھے ہیں تو یہ انکشاف دماغ سے دوسری قسم کا حکم صادر کراتا ہے۔ پھر ہم بغیر خوف کے رسی کے اوپر سے گزر جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم دماغ کو جو خیال دیں گے اسی خیال کو ایک حکم کی شکل میں تبدیل کرلیں گے۔

اتنی بات سمجھ میں آجائے تو انسان کی روزمرہ کی زندگی کو سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ دماغ کی دنیا ایک پیچیدہ دنیا ہے۔ خیالات کا گورکھ دھندا وہاں اس طرح الجھ جاتا ہے کہ اسے سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مختلف قسم کے خیالات ایک دوسرے سے گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ خوف اور حرص آپس میں مل جاتے ہیں۔ خوشی اور حسد ایک دوسرے سے اُلجھ جاتے ہیں۔ خیالات کا تانا بانا اتنا وسیع اور پیچیدہ ہو جاتا ہے کہ کسی طرح سلجھنے میں نہیں آتا۔ ہر خیال اپنا ایک حکم لے کر آتا ہے۔ دوسرا خیال دوسرا حکم لے کر آتا ہے۔ نتیجے میں انسان کی حرکتیں عجیب ہو جاتی ہیں۔ وہ مجموعۂ اضداد بن جاتا ہے۔ بعض دفعہ اعصاب اس بوجھ کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ایسی صورت میں جسم تھک جاتا ہے اور طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔

خیالات دو طرح کے ہوتے ہیں: صحت مند اور امید افزا خیالات اور شکست خوردہ اور حوصلہ شکن خیالات۔ خیالات واقعات کے تابع ہوتے ہیں۔ ہر خوف کے پیچھے ایک واقعہ چھُپا ہوتا ہے۔ اگر آپ اندھیرے سے ڈرتی ہیں تو ضرور بچپن میں آپ اندھیرے میں تنہا رہی ہوں گی۔ یہ واقعہ آپ کو زندگی بھر اندھیرے سے ڈراتا رہے گا اور آپ بڑی ہو کر بھی اندھیرے سے خوف کھاتی رہیں گی۔ بڑے ہو کر اندھیرے سے ڈرنا بے بنیاد بات ہے۔ آپ چاہتی ہیں کہ آپ اس خوف سے چھٹکارا حاصل کرلیں۔ لیکن آپ کی ہر کوشش ناکام ہو جاتی ہے۔ آپ اس خوف کو لاعلاج سمجھ کر اس سے سمجھوتا کرلیتی ہیں۔ نفسیات میں اس کا صرف ایک ہی علاج ہے کہ آپ اس واقعہ کو یاد کریں جو اصلاً اس خوف کا سبب بن گیا تھا۔ زندگی کے وہ لمحات آپ اپنے دماغ میں دہرائیں۔ پھر آپ کو اپنے بچپن کا خوف قطعی بے بنیاد معلوم ہوگا اور آپ اس خوف سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا پالیں گی۔

آپ اپنی روزمرہ کی زندگی کا بغور جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ ناخوش گوار ماحول سے بچنے کے لئے طرح طرح کے بہانے تلاش کرتی ہیں۔ مثلاً آپ کی سہیلی نے آپ کو دعوت میں بلایا۔ وہاں کچھ ایسے لوگ بھی آنے والے ہیں جو آپ کو پسند نہیں یا جو آپ پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ آپ دعوت میں جانا بھی چاہتی ہیں اور ان لوگوں سے بچنا بھی چاہتی ہیں۔ دونوں قسم کے خیالات آپ کے دماغ میں چکر کاٹ رہے ہیں۔ آخر آپ نہ جانے کا فیصلہ کرلیتی ہیں۔ طبیعت کی ناسازی یا عدیم الفرصتی کا بہانہ بنا کر ٹال جاتی ہیں۔ یہ صورتِ حال بھی غنیمت ہے۔ کم از کم آپ کو احساس تو ہے کہ آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔ آپ نے ایک جھوٹ بول کر اپنے آپ کو ناخوش گوار ماحول سے بچالیا لیکن آپ روزمرہ کی زندگی میں ساری ناخوش گوار باتوں سے چھٹکارا حاصل نہیں کرسکتیں۔ جھوٹ بولنے کا احساسِ جرم آپ کو ستاتا رہتا ہے۔ آپ کا ضمیر آپ کو ملامت کرتا ہے۔ اس لئے دوسری مرتبہ جب یہ صورتِ حال پیش آتی ہے تو واقعی آپ کے سر میں درد شروع ہو جاتا ہے۔ آپ کا عذر ایک حقیقت بن جاتا ہے اور آپ جھوٹ بولنے کے احساسِ جرم سے بچ جاتی ہیں۔ مگر اس کے بعد ایک اور مصیبت شروع ہوتی ہے۔ جب یہ عادت پرانی ہو جائے تو واقعہ کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ سر کا درد ہمیشہ آپ کی مدد کے لئے موجود رہتا ہے۔ آپ کی زندگی کا نیا خاکہ تیار ہو جاتا ہے۔ جہاں کوئی ناخوش گوار بات پیش آئی آپ کے سر میں درد شروع ہو گیا۔ آپ اس بات کو کھوجنے کی بجائے سر کے درد کا علاج کرتی ہیں، سر پر رومال باندھ کر لیٹ جاتی ہیں، سر کے درد کو بے خوابی، ہاضمہ کی خرابی یا شوروغل کی کثرت کا نتیجہ بتاتی ہیں۔ یہ سب چیزیں سمجھ میں آنے والی ہیں۔ اس طرح آپ خود کو بھی سمجھاتی ہیں اور دوسروں کو بھی، یعنی خود کو بھی دھوکا دیتی ہیں اور دوسروں کو بھی۔ آپ بھول جاتی ہیں کہ سر کا درد باہر سے نہیں آیا بلکہ خود آپ کا پیدا کیا ہوا ہے۔

یہی حال بہت سی دوسری جسمانی بیماریوں کا ہے۔ ماہرینِ نفسیات کے نزدیک دنیا میں کوئی بیماری نہیں۔ بیماری خیالات سے پیدا ہوتی ہے۔ صحت انسان کا حق ہے۔ صحت قدرتی چیز ہے بیماری غیر فطری۔ خانہ بدوش قبائل یا جنگلات میں رہنے والے نیم وحشی لوگ حیرت انگیز طور پر صحت مند ہوتے ہیں۔ جنگل میں نہ ان کے لئے اسپتال ہوتے ہیں اور نہ ڈاکٹر۔ ان کے ہاضمے کا نظام درست رہتا ہے۔ ان کو زندگی کی آسائشیں میسر نہیں۔ گرمی میں پنکھے نہیں، برف نہیں۔ بارش میں چھتری نہیں۔ سردی میں ہیٹر نہیں۔ بعض اوقات ان کے سر پر چھت بھی نہیں ہوتی۔ لیکن ان آسائشوں کی کمی سے بھی ان کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مہذب لوگوں کو اپنی صحت برقرار رکھنے کے لئے ہزاروں آسائشیں میسر ہیں۔ طرح طرح کی غذائیں ہیں، طاقت بخش خوراک ہے، ڈاکٹر اور حکیم ہیں۔ اس کے باوجود وہ بیمار رہتے ہیں۔ یہ سب تہذیب کی برکتیں ہیں۔ جنگل میں رہنے والے لوگ ناخوش گوار ماحول سے بچے رہتے ہیں۔ ان میں حسد، جلن اور غصہ تہذیب یافتہ لوگوں سے کم ہوتا ہے۔ شہر کے لوگ پڑوسی کے ریڈیو، کار یا فریج کو دیکھ کر حسد کرتے ہیں۔ جنگل میں یہ چیزیں ناپید ہیں، اس لئے حسد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دماغ اور جسم کا چولی دامن کا ساتھ ہے

جسم پر دماغ کی حکمرانی مسلّم ہے۔ جس طرح صحت اور خوشی خیالات سے پیدا ہوتی ہے، اسی طرح بیماری اور رنج بھی خیالات کے تابع ہیں۔ آج کل بہت سی بیماریوں کے متعلق انکشافات ہو رہے ہیں۔ بہت سی جسمانی بیماریاں دماغی بیماریوں کی فہرست میں شامل ہو رہی ہیں۔ یہ فہرست ابھی تک مکمل نہیں ہوئی اس میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ ہاضمے کی خرابی، اختلاج، بلڈ پریشر اور ہسٹریا بہت زمانے سے اعصابی بیماریاں سمجھی جاتی تھیں۔ آج کل دمہ، گٹھیا، ذیابیطس، تپ دق، دانتوں میں کیڑا لگنا، فالج اور ایگزیما بھی ان ہی بیماریوں میں شمار کئے جاتے ہیں کینسر کا سبب آج تک دریافت نہیں ہو سکا۔ سائنس دانوں نے سر توڑ کوشش کی، لیکن ناکام رہے۔ آخر لاچار ہو کر انہوں نے اپنی تحقیقات کا رُخ دماغ کی طرف موڑ دیا یہی حال رہا تو آنے والے زمانے میں تمام اسپتال بند ہو جائیں گے۔ کسی نے ایک مشہور سرجن سے سوال کیا کہ اکیسویں صدی میں سرجری میں کتنی ترقی ہوگی۔ اس نے جواب دیا کہ اکیسویں صدی میں سرجن کا پیشہ ہی ختم ہو جائے گا۔

یہ ضروری نہیں کہ ہر واقعے کا ردِ عمل ایک سا ہو۔ ہر انسان اپنے ردِ عمل میں آزاد ہے۔ مثلاً ایک بلڈنگ میں تین فلیٹ ہیں۔ درمیان والے فلیٹ میں رہنے والا ریڈیو کا شوقین ہے۔ وہ کانوں سے ذرا اونچا سنتا ہے۔ اس کی وجہ سے وہ ریڈیو بہت اونچی آواز سے بجاتا ہے۔ پاس والے فلیٹ میں رہنے والا ریڈیو کی آواز سے پریشان ہو جاتا ہے۔ وہ تیسرے فلیٹ میں رہنے والے سے کہتا ہے: "میرا تو اس آواز سے ناک میں دم آگیا ہے۔ ہر وقت ریڈیو بھیں بھیں کرتا رہتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ایک دن اس کے گھر میں گھس کر اس کے ریڈیو کو کھڑکی سے باہر پھینک دوں۔ یہ ہر وقت کا شور مجھے پاگل بنا دے گا۔" تیسرا پڑوسی یہ سن کر کہتا ہے: "مجھے تو ریڈیو پر گانے سننے کا بہت شوق ہے۔ میں اپنا ریڈیو نہیں کھولتا میں اپنے پڑوسی کا شکر گزار ہوں کہ وہ اونچی آواز میں ریڈیو بجاتا ہے۔" آپ نے دیکھا، ریڈیو ایک ہی ہے۔ اس کی آواز دونوں کے لئے اونچی ہے لیکن دونوں کا ردِ عمل جدا ہے۔ اگر ریڈیو میں بذاتِ خود کوئی پریشان کرنے والی بات ہوتی تو دونوں پڑوسی یکساں طور پر پریشان ہوتے۔ پہلے پڑوسی کا دماغ پریشان رہتا ہے۔ وہ اپنی سادگی میں ریڈیو کو اس کا سبب سمجھتا ہے اور اس پر اپنا غصہ نکالنا چاہتا ہے۔

اس مثال سے ثابت ہو گیا کہ واقعات کا رُخ موڑنے کی بجائے خیالات کا رُخ موڑنے کی ضرورت ہے۔ واقعہ خواہ کتنا ہی سنگین کیوں نہ ہو، آپ کو پریشان نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے دماغ کو تربیت دینا پڑتی ہے۔ نفسیات کے ماہرین نے خیالات کو دو زمروں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک عام خیال اور دوسرا سرِ خیال۔ سرِ خیال عام خیالات کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ تمام خیالات اس کے تابع ہوتے ہیں۔ اس کی مثال درخت کے بیج کی ہے۔ بیج چھوٹا ہوتا ہے، اکیلا ہوتا ہے لیکن ہزاروں پتے اور ٹہنیاں اس کے تابع ہوتی ہیں۔ آپ ٹہنیوں اور پتوں کو لاکھ بدلنا چاہیں تو اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ ضرورت ہے کہ آپ اپنی منشا کے مطابق نیا بیج ڈالیں۔ قدرتی طور پر درخت آپ کی منشا کے مطابق ہی پھل دے گا۔

سرِ خیال کو بدلنے کے لئے یہ نکتہ سمجھنا ضروری ہے کہ آپ اپنے موجودہ خیالات سے لڑنا بند کر دیں۔ جس طرح آپ بیج کو بدلے بغیر درخت کی شکل کو نہیں بدل سکتیں، اسی طرح آپ سرِ خیال کو بدلے بغیر موجودہ خیالات سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتیں۔ آپ اپنے غصّے، حسد اور خوف پر قابو پانے کی کوشش چھوڑ دیں، اپنی سستی اور کاہلی سے نہ لڑیں، ا[...] بیماریوں کے علاج سے دست بردار ہو جائیں۔ آ[...] صرف اپنے سرِ خیال کو بدلنے کی کوشش کریں۔ ا[...] کے لئے آپ کو ایک تحریری مضمون بنانا پڑے گا۔ اسے دماغ میں یقین اور اعتماد کے ساتھ دہرانا ہ[...] اس طرح آپ ایک نئے سرِ خیال کی داغ بیل ڈا[...] گی۔ نیا درخت آپ کی توجہ سے نشو و نما پائے گا او[ر] درخت آپ کی بے توجہی سے سوکھ جائے گا۔ نیا بیج [بونے] کے بعد آپ مایوسی کو دل میں جگہ نہ دیں اور یہ ی[اد] رکھیں کہ آپ کا ڈالا ہوا بیج ایک دن تناور درخ[ت] بن جائے گا۔ یاد رکھئے کہ درخت کی نشو و نما آپ [کے] نقطۂ نظر کی محتاج نہیں۔ وہ قدرت کے قانون [کے] مطابق ہے۔ بیج کو آپ کی مایوسی اور ناامیدی [سے کوئی غرض] نہیں۔ اس کا کام پھلنا پھولنا ہے۔ آپ کا کام م[حض] اتنا ہے کہ آپ زمین میں سوراخ کر دیں اور بیج ڈ[ال] دیں۔ باقی قدرت کے قانون پر چھوڑ دیں۔

اگر آپ کے سر میں درد رہتا ہے اور آ[پ] دوائیں استعمال کر کے عاجز آگئی ہیں تو اپنے سرِ خ[یال] کو حرکت دیجئے۔ آپ اس قسم کی دعا کو زبان پر لا[ئیے:] میرے غلط سرِ خیال سے میرے سر میں درد ہوت[ا ہے] میں اس غلط سرِ خیال کو ختم کرنا چاہتی ہوں میں [نئے] سرِ خیال کو دل میں جگہ دینا چاہتی ہوں۔ یہ سرِ خ[یال] صحت طاقت اور توانائی کا ہے۔ میں اس سرِ خیا[ل کو] خدا کے حوالے کرتی ہوں۔ وہ اس سرِ خیال کو میر[ے] دل میں بٹھانے میں مدد کرے گا اور غلط سرِ خیال [کو دل] سے نکال دے گا۔

آپ نہایت اعتماد سے یہ دعا دہرائیں[۔ ایک] دفعہ صحت مند سرِ خیال نے جڑ پکڑ لی تو باقی کا[م آسان] ہو جائے گا۔ بعض اوقات اس خیال کے آتے ہی درد رفع ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات اس میں دیر لگ[تی ہے۔] نتیجہ آپ کے اعتماد اور یقین پر منحصر ہے۔ ☐

مطبوعات شمع بک ڈپو، کھلونا بک ڈپو، بانو بک ڈپو اور مکتبہ دینیات

تبلیغی باتیں	مفتی حفیظ الدین	۲ روپے
تاج بہشتی زیور مکمل مجلد	مولانا اشرف علی تھانوی	۱۵ روپے
قرآن مجید مترجم رف مجلد	مترجم مولانا اشرف علی تھانوی	۸ روپے
ستاروں کے قیدی	ظفر پیامی	۲ روپے ۵۰ پیسے
کالی دنیا	سراج انور	۶ روپے ۵۰ پیسے
نیلی دنیا	سراج انور	۷ روپے
ڈرپوک چوہا	(رنگین)	۴۵ پیسے
گورنر کی بیٹی	طغرل پاشا	۳۵ پیسے
ہلال کی کہانیاں	عشرت رحمانی	۴۰ پیسے
جاپانی بچے	طغرل پاشا	۳۵ پیسے
مالو کے کارنامے	عشرت رحمانی	۷۵ پیسے
شاہی نجومی	راجہ مہدی علی خاں	۴۵ پیسے
سرکس کے کھیل	پرکاش پنڈت	۵۰ پیسے
شمع کشیدہ کاری		۸ روپے
رشیدہ کی کشیدہ کاری		۷ روپے ۵۰ پیسے
حسین کشیدہ کاری		۵ روپے
دلہن کشیدہ کاری		۵ روپے
زینت کشیدہ کاری		۱۰ روپے

شمع بک ڈپو آصف علی روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ناک سے دیکھنے والی لڑکی!



عشرت امیر

ٹوکیو (جاپان) کے سائنسی تحقیقاتی ادارے میں ایک لڑکی کی آنکھوں کا معائنہ ہو رہا تھا۔ لڑکی کے سامنے بورڈ پر موٹے اور باریک الفاظ میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ لڑکی کی آنکھوں پر کئی تہیں کیا ہوا موٹا کپڑا بندھا ہوا تھا۔ مگر لڑکی اٹکے بغیر بورڈ پر لکھے ہوئے سارے الفاظ پڑھ گئی۔ پھر اُسے ایک کتاب پڑھنے کو دی گئی۔ اس نے وہ کتاب بھی اس طرح پڑھ ڈالی جیسے اس کی آنکھوں پر پٹی نہ بندھی ہو۔ ڈاکٹر حیرت میں تھے کہ آنکھوں پر موٹے کپڑے کی تہوں کی پٹی بندھے ہونے کے باوجود لڑکی کیسے پڑھ لیتی ہے۔ پھر ایک ڈاکٹر نے اپنی ہتھیلی اس کی ناک پر رکھ دی۔ اب لڑکی چلا پڑی "ڈاکٹر مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا ہے۔"

ڈاکٹروں پر اس طرح یہ بات ثابت ہوئی کہ قدرت نے اس لڑکی کو ایک عجیب اور حیرت انگیز صلاحیت سے نوازا ہے۔ اس لڑکی کو ناک سے دکھائی دیتا ہے۔

اس گیارہ سالہ لڑکی کا نام سیوری تناکا ہے۔ اس نے آج کی سائنس کو ایک گہری اور حیرت انگیز تحقیق میں مصروف کر دیا ہے — اُسے ناک سے کیوں دکھائی دیتا ہے۔ مشہور ڈاکٹر بھی تک اس بارے میں کچھ نہیں جان سکے ہیں۔

اس لڑکی نے آنکھوں پر پٹی باندھ کر ایک سیدھی لائن کھینچ کر اس پر سائیکل چلائی ہے۔ وہ بھیڑ میں سڑک پر سائیکل پر گھومی ہے اس نے اپنی ناک کے ذریعے ٹیلی وژن پر دکھائی دینے والے پروگراموں کو دیکھا ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر کے کیمرے سے بالکل صاف اور صحیح فوٹو گراف اتارے ہیں۔ آنکھوں پر پٹی باندھ کر ہی اس نے بہت سی کتابیں پڑھ دی ہیں — آنکھوں پر پٹی باندھے باندھے اس نے والی بال کھیلی اور گیند کیچ کی ہے۔ اسی طرح اس نے بہت سے کام کیے ہیں جو آنکھوں کے بغیر نہیں کیے جاسکتے۔

سیوری تناکانے بتایا کہ ناک سے دیکھتے وقت اُسے ایسا لگتا ہے جیسے جو چیز وہ دیکھ رہی ہے اس پر دھوئیں کی ایک ہلکی سی چادر ہے اور وہ اس چادر کے پار ہر چیز دیکھ لیتی ہے۔ آنکھوں سے اُسے بالکل دکھائی نہیں دیتا ہے۔

سیوری تناکانے بتایا کہ تقریباً ڈیڑھ برس پہلے وہ آنکھوں سے بھی دیکھ لیتی تھی مگر ایک دن جب وہ سو کر اُٹھی تو اس نے محسوس کیا کہ آنکھیں بند ہونے پر بھی وہ دیکھ سکتی ہے۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر بھی اسے ہر چیز دکھائی دے رہی تھی۔ یہ ایک حیرت انگیز بات تھی۔ وہ اپنے ماں باپ کے پاس پہنچی۔ اس کے ماں باپ نے بچی کی بات کو مذاق سمجھا۔ لیکن بعد میں ان کو بھی سچائی کا یقین کرنا پڑا۔ سارے جاپان میں اس لڑکی کو دیکھنے کے لئے لوگ دُور دُور سے آتے ہیں۔ اس بچی کی پوری طرح جانچ کی گئی ہے۔ اور یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ اب اس کو آنکھوں کی بجائے ناک سے دکھائی دینے لگا ہے۔

قدرت کے اس کرشمے نے بڑے بڑے ڈاکٹروں اور سائنس والوں کے سامنے ناقابلِ یقین سوالات کھڑے کر دئے ہیں۔ کیا انسانی جسم میں کچھ ایسی خصوصیات بھی ہیں کہ وہ ناک سے دیکھ سکتا ہے؟ کیا یہ سائنس کے لئے ایک نیا چیلنج نہیں ہے؟

بہت سے لوگوں کا کہنا ہے کہ ناک سے دکھائی دینے والی بات کوری گپ ہے۔ ان کے خیال میں یہ لڑکی کسی چالاکی سے کام لیتی ہے۔ مگر جانچ کرنے پر یہ بات غلط ثابت ہو چکی ہے۔

ویسے آنکھوں کے علاوہ جسم کے دیگر اعضار سے دکھائی دینے کا یہ واحد کیس نہیں ہے۔ پوری دنیا میں اب تک دس آدمی ایسے ہوئے ہیں جن کو آنکھوں سے نہیں جسم کے اور حصّوں سے دکھائی دیتا ہے۔ وہ لوگ جاپان کے علاوہ امریکہ اور روس میں پیدا ہوئے ہیں اور ان کی "آنکھیں" ان کی انگلیوں کے پوروں پر ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس طرح آنکھوں کے علاوہ جسم کے دیگر اعضار سے دیکھنے والی سب عورتیں ہی ہیں۔ سیوری تناکا کے علاوہ ایک اور عورت بھی ہے جسے ناک سے دکھائی دیتا ہے۔

(ترجمہ)

●●



عبدالقدیر صدیقی

دِل، احساس اور تنہائی

'سمورا' کی ایک میز پر پہنچ کر فیروز نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ دوپہر کے تین بجنے کو تھے آج سنیچر تھا ـــــ دفتر کی آدھے دن کی چھٹی تھی۔ صبیحہ نے ٹھیک تین بجے آنے کا وعدہ کیا تھا اور فیروز سوچ رہا تھا کہ وہ صبیحہ کے حسین چہرے پر پریشانی برداشت کر سکے گا یا نہیں۔

دو ماہ دیکھتے ہی دیکھتے بیت گئے تھے۔

آج ملنی کی چھٹی کا آخری دن تھا۔

فیروز کو یقین تھا کہ ملنی شام تک لوٹ آئے گی اور وہ شاید چھوٹتے ہی صبیحہ سے نئے فلیٹ کے متعلق دریافت کرے گی۔

نئے فلیٹ کے لئے دو ماہ پہلے اس نے اور صبیحہ نے جو خواب سجائے تھے، وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہوئے ـــــ صبیحہ کے بینک نے رقم کی ادائی مزید ایک مہینے بعد کرنے کو کہا تھا۔ اور اب فیروز کو اپنی

حماقت کا احساس ہو رہا تھا۔ صبیحہ کے پیار کی دیوانگی میں اس نے حالات پر غور کرنا بھی گوارہ نہیں کیا تھا۔ اسے تو بس اتنا احساس تھا کہ صبیحہ کا وجود ایک ایسی دنیا ہے جو اب تک اسی کے لئے ایک خواب ہی رہی تھی۔ صبیحہ خود بھی تو اس کے لئے بے حد بے چین تھی۔ اور ان کے پیار کی بے چینی کو صرف نلنی نے سمجھا تھا ـــــ مگر اب ؟ اتنے بڑے شہر میں کوئی بھی تو ایسا نہ تھا جس سے وہ اپنی پریشانی کا ذکر کرتا ـــــ اس کی نظریں سمورا کی دار پر لگی ہوئی ایک تصویر پر جم گئیں جس میں بمبئی کی فلک بوس عمارتوں کو اس طرح دکھایا گیا تھا جیسے وہ تھک گئی ہوں ـــــ اونچی اونچی عمارتیں جن میں چیونٹیوں کی طرح انسان بستے ہیں، جہاں ہر چہرہ انجان ہے، جہاں ہر دیوار میں ایک تہذیبی اجنبیت رچی ہوئی ہے، جہاں زندگی کے ہر شعبے کو ایک معیار دے دیا گیا ہے اور اس معیار کا زینہ روپیہ ہے۔

اُسی وقت سمورا کے داخلی دروازے میں اسے صبیحہ نظر آئی۔ اسے دیکھ کر وہ اسی میز پر چلی آئی اور بیٹھتے ہوئے بولی "میں نے ایروز کے دو ٹکٹ منگوا لئے ہیں۔ ابھی پندرہ منٹ بعد شو کا ٹائم ہے۔"

فیروز نے اسے حیرت بھری نظروں سے دیکھا۔ صبیحہ کے چہرے پر اسے پریشانی کا ہلکا سا بھی تاثر نظر نہیں آیا۔ اس کے حسین چہرے پر تو بڑی دلکش شادابی رقصاں تھی۔

"اُفوہ!" وہ یکایک مچل کر بولی "اب جلدی چلو نا! بڑی اچھی فلم ہے! دفتر میں سب نے دیکھ لی ہے۔"

سمورا سے باہر نکل کر صبیحہ نے ایک ٹیکسی رکوائی اور اسے بٹھا کر خود بھی بیٹھ گئی اور ڈرائیور کو چرچ گیٹ چلنے کے لئے کہا۔ ٹیکسی ٹریفک کے ساتھ دوڑنے لگی اور کھڑکی سے وہ باہر دیکھنے لگا ـــــ سڑک کے کنارے پیدل چلنے والوں کی کتنی بھیڑ تھی ـــــ یہاں دفتر بند ہوتے ہی سڑکوں پر بھیڑ بڑھنے لگتی ہے۔ جسے دیکھو بھاگتا نظر آتا ہے۔ دفتر سے نکلتے ہی گھر لوٹ جانا یہاں کے ملازمت پیشہ طبقے کا معمول ہے۔ گھر؟ فیروز کا ذہن پھر اُلجھنے لگا ـــــ کاش اس کا اپنا بھی کوئی گھر ہوتا۔ وہ کھڑکی سے باہر فلک بوس عمارتوں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھنے لگا ـــــ اگر اس کا اپنا فلیٹ ہوتا تو شاید اس کے اور صبیحہ کے ذہن پر اس پریشانی کی پرچھائیں بھی نہ ہوتی۔ اس نے صبیحہ کی جانب دیکھا۔ اور اسے اپنی طرف دیکھتے پاکر صبیحہ کے ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ پھیل گئی ـــــ اور وہ صبیحہ کے متعلق سوچنے لگا۔

سائن کے چھوٹے سے اسٹیشن پر اس نے پہلی مرتبہ صبیحہ کو دیکھا تھا۔

اُس دن اسٹیشن پر کافی بھیڑ تھی۔ ٹرین آتے دیکھ کر فیروز تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے پہنچا اور اسی لمحہ اچانک صبیحہ اس کے سامنے آگئی' سرخ جمپر اور سرخ ہی شلوار میں ملبوس ایک دہکتے شعلے کی مانند۔ اس نے نظریں اٹھا کر فیروز کو دیکھا اور پھر تیزی سے لیڈیز کمپارٹمنٹ کی جانب چلی گئی۔ لیکن فیروز ان نظروں کو اپنے دل کی گہرائیوں میں اُترتے محسوس کر رہا تھا۔ راستے بھر اس کا حسین چہرہ فیروز کی نگاہوں میں چکرا تا رہا۔ ٹرین وکٹوریہ ٹرمنس سے آگئی تو فیروز بھیڑ کو چیرتا ہوا لیڈیز کمپارٹمنٹ کی طرف بڑھا اور صبیحہ اسے عورتوں کے حسین جھرمٹ میں نظر آگئی۔ فیروز کے دل میں یہ سوچ کر خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی کہ اس کی منزل بھی وکٹوریہ ٹرمنس ہے ـــــ صبیحہ نے شانے سے ایک خوب صورت بیگ لٹکا رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں اُردو کا ایک رسالہ تھا۔ اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکل کر وہ الیکٹرک ہاؤس جانے والی بس میں سوار ہوئی۔ فیروز بھی اس کے پیچھے ہی سوار ہوا اور جب صبیحہ نے کنڈیکٹر سے کالا گھوڑا کا ٹکٹ مانگا تو فیروز کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ اس کا اپنا دفتر جہانگیر آرٹ گیلری کے سامنے تھا ـــــ بس سے اُتر کر وہ بینک کی عمارت کی جانب بڑھ گئی تھی اور فیروز اسے بینک میں داخل ہونے تک دیکھتا رہا۔

اور پھر صبیحہ کے لئے ہر روز سائن اسٹیشن پر نظر دوڑانا اس کا معمول بن گیا۔

آٹھ بج کر ۵۵ منٹ کو جانے والی لوکل ٹرین کے لئے وہ سائن پہنچ جاتا اور پلیٹ فارم پر لیڈیز کمپارٹمنٹ والی جگہ کے قریب ہی ٹھیر کر ٹرین کا انتظار کرتے ہوئے وہ کنکھیوں سے صبیحہ کو دیکھتا رہتا۔ اب اکثر وہ اپنے ہاتھ میں اُردو کا اخبار یا رسالہ ضرور رکھتا تھا اور صبیحہ کو اپنی جانب دیکھتے پاکر وہ اسے اپنے چہرے کے سامنے پھیلا لیتا تھا۔ اکثر صبیحہ وی ٹی سے باہر نکل کر پیدل ہی فورٹ تک چلتی تھی اور وہ بھی کچھ فاصلے سے اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا۔ صبیحہ کو اس کی دلچسپی کا احساس اچھی طرح ہو چکا تھا۔ اب وہ بھی اسے مُڑ کر دیکھ لیتی تھی ـــــ فیروز کے لئے صبیحہ کے خیال سے بے نیاز ہونا ممکن نہیں رہا تھا ـــــ لیکن اسے تو اس کا نام بھی معلوم نہ تھا۔ ایک دن حوصلہ کرکے وہ اسی بینک میں داخل ہو گیا جہاں صبیحہ ملازم تھی، وہ صرف اپنے حسین خیالوں کے پیکر کا نام جاننا چاہتا تھا، لیکن یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کی یہی کوشش اُسے صبیحہ سے ایک دم قریب کردے گی ـــــ صبیحہ اُسے ایک کاؤنٹر کے پیچھے نظر آئی۔ فیروز نے بینک کے ایک چپراسی کو اشارے سے قریب بلایا اور اسے پانچ

روپے کا ایک نوٹ تھما کر صبیحہ کی طرف اشارہ کر کے اس کا نام پوچھا —— اور اس رات اس کے ہونٹوں پر صبیحہ کا نام مچلتا رہا۔

دوسری صبح وہ حسبِ معمول نوروجی روڈ پر صبیحہ کے پیچھے چل رہا تھا۔

کراسنگ کے قریب وہ رکی اور پھر اچانک مڑ کر اس سے مخاطب ہوئی " مسٹر، اگر میرا نام ہی جاننا چاہئے تھا تو مجھ سے پوچھ لیا ہوتا۔"

"جی ؟" فیروز بری طرح بوکھلا گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ صبیحہ اس طرح اس سے مخاطب ہوگی۔

"میرے دفتر کے چپراسی سے میرا نام پوچھ کر آپ نے یہ بھی نہیں سوچا کہ میں وہاں ملازمت کرتی ہوں۔ چپراسی میرے متعلق کیا رائے قائم کرے گا۔"

فیروز کی زبان گنگ ہو گئی تھی —— اس کی بوکھلاہٹ دیکھ کر وہ یکایک دِل آویز انداز میں مسکرا اٹھی۔

صبیحہ کی کہانی سن کر فیروز کو محسوس ہوا کہ تنہائی اور محرومی کا وہ تنہا شکار نہیں ہے۔

صبیحہ کو اپنے ڈیڈی کے متعلق صرف اس قدر معلوم تھا کہ کافی مدت ہوئے ان کی موت ہوائی فوج کی ایک مشقی مہم میں ہوئی تھی۔ ممی نے حوصلے کے ساتھ اس کی تربیت کی تھی لیکن پھر ایک دن اچانک وہ ایک ڈبل ڈیکر بس کی زد میں آگئیں۔ ممی کی اچانک موت نے صبیحہ کے احساسات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا —— وہ یک بیک تنہا رہ گئی تھی —— اور پھر ایک دن وہ اپنے ماضی کو ایک یاد بنا کر اپنی کالج کلاس فیلو نلنی کے ساتھ رہنے لگی۔

فیروز کی تنہائی کسی حادثے کی دین نہیں تھی —— وہ بس ایک دن اپنے ماحول سے گھبرا کر بھاگ نکلا تھا۔ ان دنوں اس کی عمر اٹھارہ برس ہو گی اسے اپنے باپ سے بہت نفرت تھی جو آئے دن اس کی ماں کو پیٹتا رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ ان دونوں کو لڑتے جھگڑتے دیکھتا تھا۔ اس کی ماں کا تعلق کسی مال دار گھرانے سے تھا۔ وہ اکثر اس کے باپ کی کمائی کے طعنے دیتی رہتی تھی اور شاید ان میں اسی بنیاد پر جھگڑا ہوتا تھا —— اور اس رات جانے اس کی ماں نے کیا کہہ دیا تھا کہ دونوں میں خوب جھگڑا ہوا تھا اور اس کی ماں نے اپنے جسم پر کیروسین چھڑک کر آگ لگائی تھی۔ اور فیروز اسی رات اپنے سرٹیفکیٹ لے کر ہمیشہ کے لئے اپنے شہر کو چھوڑ کر بمبئی کے اپنے ایک قلمی دوست کے پاس بھاگ آیا تھا —— پچھلی زندگی وہیں ختم ہو گئی تھی —— پھر اسے اپنے باپ کی کوئی خبر نہیں ملی۔ لیکن جو باتیں ان دنوں اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں اب وہ ان پر اکثر غور کرتا رہتا تھا —— اس کا باپ جاہل یا بددماغ نہیں تھا۔ افلاس نے اس کے ذہن میں جو جھنجھلاہٹ پیدا کر دی تھی۔ لیکن اس کی ماں نے کبھی اس جھلاہٹ کو ختم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے خود ہی راہِ فرار اختیار کرلی۔

سنیما ہال سے نکل کر وہ پیدل ہی چل پڑے۔ فلم بڑی اچھی تھی —— صبیحہ شاید فلم کے حسین تاثر میں کھوئی ہوئی تھی۔ لیکن فیروز کا ذہن پھر اسی گتھی سے الجھنے لگا تھا۔

صبیحہ کو پاکر فیروز کو اپنی زندگی کا وہ خلا پُر ہوتا محسوس ہوا تھا جسے اس نے تنہائی نام دے رکھا تھا۔ ان دونوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن شادی کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ رہائش کا تھا۔ فیروز ایک گندی چال کے گھٹے گھٹے کمرے میں رہتا تھا اور صبیحہ اپنی کلاس فیلو نلنی کے ساتھ رہتی تھی جو کسی انڈسٹریل فرم میں ٹیلی فون آپریٹر تھی۔ نلنی کا اپنا سنگل بیڈ روم فلیٹ تھا —— شادی کے بعد صبیحہ کے لئے علیٰحدہ رہائش ضروری تھی۔ اسی لئے ان دونوں نے کرائے پر علیٰحدہ فلیٹ حاصل کرنے کے لئے منصوبہ بنایا —— فیروز ہر ماہ ایک بڑی رقم بچاتا رہا تھا، اور صبیحہ کو اس کے بینک سے رہائش کے لئے قرض مل سکتا تھا۔ لیکن قرض کے لئے انہیں تقریباً دو ماہ کے طویل عرصے کا انتظار برداشت کرنا تھا —— مگر انہیں دو ماہ کی صبر آزما مدت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ نلنی کو کمپنی کی طرف سے دو ماہ چھٹی ملی تھی اور وہ دو مہینے کے لئے وطن کیرالا میں جا رہی تھی —— نلنی نے ہی انہیں شادی کے بندھن میں بندھ جانے کے لئے مجبور کر دیا تھا اس نے کہا تھا کہ دو مہینے تک وہ شوق سے اس کے فلیٹ میں رہیں۔ اتنی مدت کوئی اور ٹھکانا اطمینان سے ڈھونڈنے کے لئے کافی ہوگا۔

مگر شادی شدہ زندگی کے دو ماہ دیکھتے ہی دیکھتے گزر گئے —— صبیحہ کو بینک سے جو قرض ملنے والا تھا اس کی ادائیگی میں کسی وجہ سے ایک ماہ کی مزید تاخیر ہو رہی تھی —— اور آج نلنی لوٹنے والی تھی۔ فیروز کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ نلنی کا سامنا کس طرح کرے گا۔ ایک ماہ کی طویل مدت وہ کہاں بسر کریں گے ؟ اگر وہ تنہا ہوتا تو کوئی بات نہ تھی۔ مگر اب تو اس کے ساتھ اس کی شریکِ حیات صبیحہ کا بھی وجود وابستہ تھا۔ وہ اس مسئلے پر جس قدر سوچتا چلا گیا، اتنا ہی الجھتا رہا۔ اسے یہ احساس بھی اچھی طرح تھا کہ نلنی نے دو ماہ کی رخصت اسی غرض سے لی تھی کہ ان کی شادی میں تاخیر نہ ہو۔ مگر اب ؟ نلنی شاید فلیٹ پر ان کی منتظر ہوگی۔ فیروز نے ایک مرتبہ پھر صبیحہ کے چہرے پر نظر ڈالی، مگر اسے وہاں وہی شادابی ملی اور وہ

فیروز کو دیکھ کر دل کش انداز میں مسکرانے لگی۔ فیروز کو یقین تھا کہ اس وقت کی صبیحہ کی ذہنی حالت کیا ہوگی؟

نلنی کے فلیٹ پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ نلنی نہیں آئی ہے۔ شاید کسی وجہ سے وہ اس شام کو لوٹ نہیں سکی تھی۔ لیکن دوسری صبح اس کی آمد یقینی تھی کیوں کہ دوسرے دن اسے دفتر جوائن کرنا تھا۔

اور اس رات صبیحہ نے اس کے بالوں میں دھیرے دھیرے انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا" فیروز ہم ایک ماہ کے لئے پھر وہی دو انجان راہی بن جائیں گے جو شادی سے پہلے تھے ـــــ جب تک ہمارا اپنا فلیٹ نہیں مل جاتا۔"

فیروز نے نگاہیں اٹھاکر اسے دیکھا۔ صبیحہ کے حسین چہرے سے عزم و حوصلہ جھلک رہا تھا۔ اور یکایک اس کے ذہن میں اپنے باپ کی تشبیہہ ـــ اُبھر آئی ـــــ وہ جاہل یا بد دماغ نہیں تھا، صرف جھلا گیا تھا۔ صبیحہ اسی طرح اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں انگلیاں پھرا رہی تھی ـــــ فیروز نے دونوں آنکھیں مُوند لیں۔ اسے یک بیک سکون کا احساس ہونے لگا تھا۔

دوسری صبح دفتر میں اس کے نام کہیں سے فون آیا ـــــ اور فیروز دوسری جانب سے نلنی کی آواز سُن کر ایک گہری سانس لے کر رہ گیا ـــــ ظاہر تھا کہ نلنی لوٹ آئی ہے۔

" میں صبیحہ کے دفتر سے بول رہی ہوں۔"

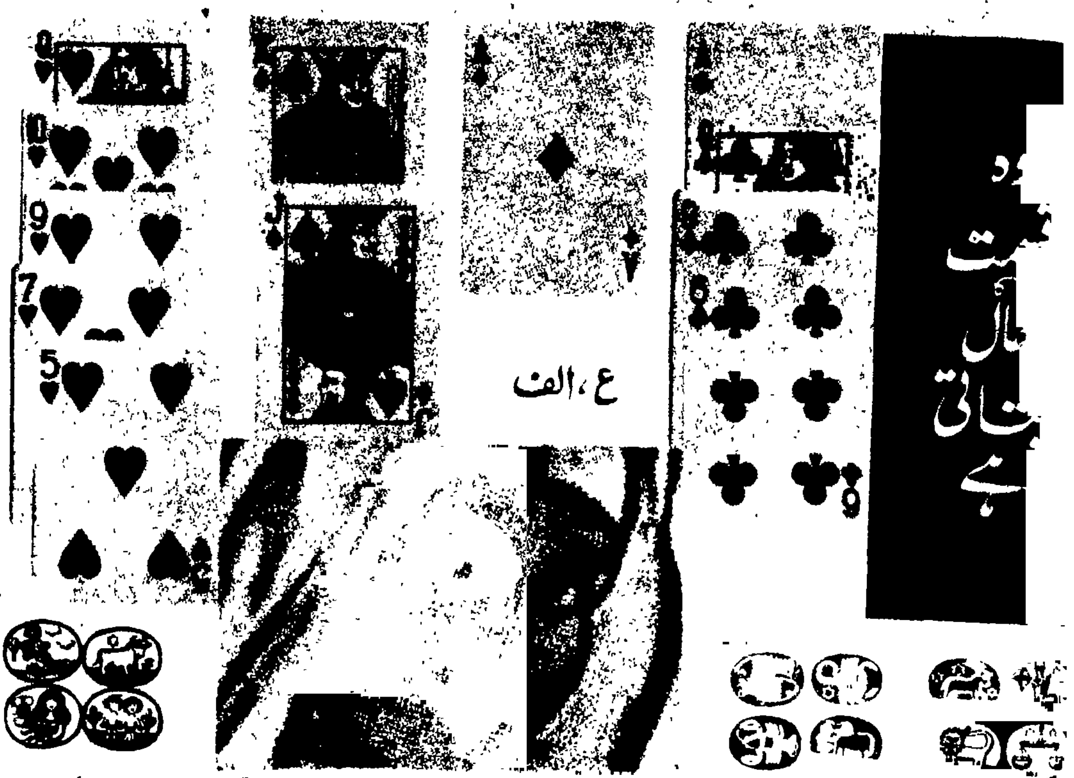
نلنی نے کہا" صبیحہ کو ایک خوش خبری دینے چلی آئی تھی۔ سوچا آپ کو بھی مطلع کر دوں۔"

"کیسی خوش خبری؟ فیروز کا دل دھڑکنے لگا ـــــ نلنی کی سگائی ہو چکی تھی اور وہ عن قریب ہی شادی کرنے والی تھی۔

" چھٹی پر جانے سے پہلے میں نے نائٹ شفٹ کے لیے درخواست دی تھی، جو منظور کر لی گئی ہے ـــــ نائٹ شفٹ میں تین گھنٹے اوور ٹائم کے شمار کیے جاتے ہیں۔ اس طرح کچھ پیسے زیادہ بن جائیں گے۔ آپ تو جانتے ہیں دو ماہ بعد میں اِن ...." وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر دھیرے سے ہنس دی۔ پھر دوبارہ بولی" آپ دفتر سے سیدھے گھر آیئے، کیوں کہ شام کو مجھے ڈیوٹی جوائن کرنا ہوگی۔"

ریسیور کریڈل پر رکھ کر وہ سوچنے لگا ـــــ نلنی نے پھر اسے اپنے خلوص کی بندش میں جکڑ لیا ہے ـــــ اونچی اونچی فلک بوس عمارتوں سے بظاہر بیگانگی ضرور ٹپکتی ہے، لیکن یہاں نلنی بھی ہے۔

■■



اکیس سالہ گیبی ہافمین ہتھیلی، تاش کے پتے یا پھر ستارے دیکھ کر قسمت کا حال بتلانے والی عجیب وغریب عورت ہے۔ اس کا یہ کاروبار اپنے ملک میں بڑے وسیع پیمانے پر پھیلا ہوا ہے۔

بلی سے بے حد محبت کرنے والی اس عورت کو اتنی شہرت حاصل ہے کہ دُور دُور سے لوگ اپنی تقدیر کا حال معلوم کرنے کے لئے اس کے پاس آئے ہیں۔ اس کی شہرت اتنی زیادہ ہے کہ لوگوں کو اس سے ملنے کے لئے تین تین مہینے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ گیبی ہافمین تقریباً دو برس سے یہ پیشہ اپنائے ہوئے ہے۔ برلن کی اس سُرخ بالوں والی اس لڑکی کو پیش گوئی کرنے کے لئے کسی خاص طرح کی قابلیت یا محنت کی ضرورت نہیں پڑتی پیش گوئیاں کرنے کے لئے وہ کارڈوں کو دیکھتی ہے جس میں آنے والے واقعات کی تصویریں اُبھر آتی ہیں۔ ہتھیلی دیکھ کر مستقبل کا حال بتلاتے وقت ہتھیلی پر مستقبل کی تصویریں فلم کی طرح اُبھر کر اس کی آنکھوں کے سامنے گذرنے لگتی ہیں۔

بہت سی سچی پیش گوئیوں کے ساتھ اس کی ایک پیش گوئی بہت ہی زیادہ مشہور ہوئی اس نے سی۔ ڈی۔ یو کے ڈپٹی پیٹر لورنز کے اغوا کی پہلے ہی پیش گوئی کر دی تھی اور جلد ہی یہ "حادثہ" ہو گیا۔

گیبی کا کہنا ہے کہ یہ صلاحیت اس کو اپنے بزرگوں سے ملی ہے، اس کی پردادی دادی یہاں تک کہ اس کے شوہر کے گھر والے بھی اس علم سے واقف ہیں۔ مسز ہافمین کا کہنا ہے کہ اس علم کو وہ بچپن سے ہی سیکھ گئی تھی۔ جب وہ اسکول میں پڑھتی تھی تو اپنی کلاس فیلو لڑکیوں کو بتا دیا کرتی تھی کہ ان کو امتحان میں کتنے نمبر ملنے والے ہیں یا ان کے گھر میں کب بہن یا بھائی پیدا ہوں گے۔

مسز ہافمین نے اپنی عملی زندگی کا آغاز نرس کی ملازمت سے کیا تھا۔ لیکن اس کام سے وہ مطمئن نہیں ہو سکی، کیوں کہ اسے پہلے سے یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ کس کی موت واقع ہونے والی ہے۔ اس سے اس کے دماغ پر بُرا اثر پڑتا تھا اس لئے اس نے اس پیشے کو ترک کر دیا۔

اب گیبی کے شوہر مچل نے اپنی بیوی کی اس صلاحیت اور خداداد علم کو دیکھ کر اپنے ہوٹل کے کاروبار کو بند کر دیا ہے اور بیوی کے ساتھ اسی پیشے میں مصروف ہو گیا ہے۔ اس پیشے سے ان کو لاکھوں روپے کی آمدنی ہے۔ ●●

نیا ایڈیشن شائع ہوگیا ہے

رشیدہ کی کشیدہ کاری

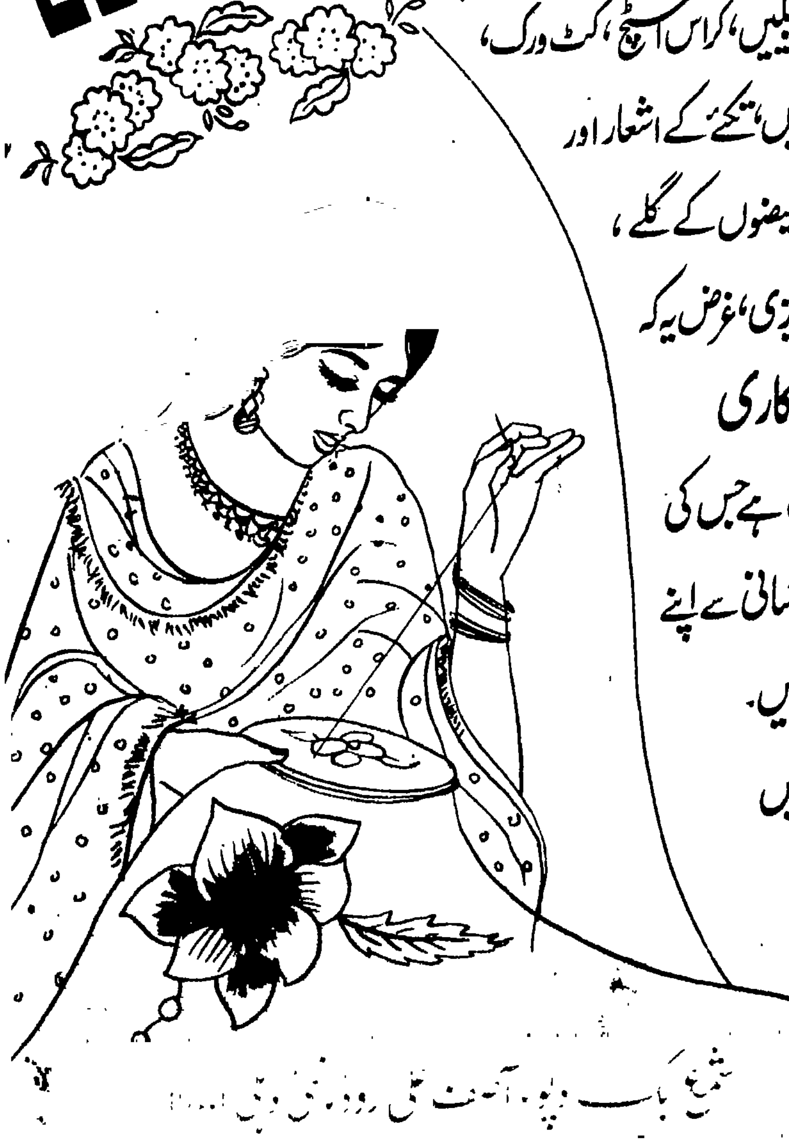
کشیدہ کاری کے نئے نئے
ڈیزائن، عمدہ بوٹیاں، لاجواب بیلیں، کراس اسٹچ، کٹ ورک،
موتیوں کا کام، مونوگرام، سینریاں، تکیے کے اشعار اور
ڈیزائن، پیٹی کوٹ کے بارڈر، قمیصوں کے گلے،
کٹ ورک، اسموکنگ، لیزی ڈیزی، غرض یہ کہ

رشیدہ کی کشیدہ کاری

ایک ایسی مکمل اور جامع کتاب ہے جس کی
مدد سے نوآموز بہنیں بھی بڑی آسانی سے اپنے
حسبِ پسند ڈیزائن بنا سکتی ہیں۔

اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں

قیمت:
۷ روپے ۵۰ پیسے



شمع بک ڈپو۔ آصف علی روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

سہاگ رات

آنکھیں میں دیکھ رہی ہوں بہت قریب سے آج
دھڑک رہا ہے مرا دل، مچل رہی ہے سانس
نہ جانے آج یہ طوفان کیسے اُٹھتے ہیں
نہ جانے دل میں یہ چبھتی ہے آج کونسی پھانس

ابھی ابھی وہ مرے پاس آکے بیٹھے ہیں
لبوں پہ رقص کناں شوخ مسکراہٹ سی
نہ جانے آج میں کیوں چونک چونک جاتی ہوں
ذرا بھی پاس جو پاتی ہوں اپنے آہٹ سی

ابھی وہ شوخ نگاہوں سے دیکھتے ہیں مجھے
ابھی اُنہوں نے مری زُلف کو سنوارا ہے
یہ دل میں کیسے گُلِ آرزو مہکتے ہیں
اُنہوں نے پیار سے شاید مجھے پکارا ہے

ابھی اُنہوں نے کہا مجھ سے "میں تمہارا ہوں"
حجاب و شرم سے گردن جھکا رہی ہوں میں
عجیب پیار کا احساس دل کو ہوتا ہے
دل و نظر کو بھی مسرور پا رہی ہوں میں

نہ جانے کیوں مری پلکوں پہ جگمگاتے ہیں
یہ دو حسین سے شبنم کے کانپتے قطرے
نہ جانے کیوں مرے لب تھرتھرائے جاتے ہیں
نہ جانے کس لئے ہنستے ہیں گھر کے آئینے

ذرا سا میں نے جو شرما کے اُن کو دیکھ لیا
تو پلکیں فرطِ مسرت سے تھرتھرانے لگیں
یہ دل کہ اُن کی محبت کا ایک تاج محل
ہزار شمعیں یہاں خود ہی جھلملانے لگیں

میں سوچتی ہوں تو بس سوچتی ہی رہتی ہوں
کہ زندگی میں مری کیسی واردات ہوئی
تو گر کے پھول پہ شبنم یہ کہتی ہے مجھ سے
تجھے خبر بھی ہے پگلی! سہاگ رات ہوئی

رفیعہ شبنم عابدی

میرے چمن میں

ہر ذرہ ہے صد رشکِ جناں میرے چمن میں
اِک عشق کا دریا ہے رواں میرے چمن میں

ہوتا ہے ستاروں کا گماں میرے چمن میں
وہ کیف کا عالم ہے رواں میرے چمن میں

احساسِ مسرت ہے عیاں میرے چمن میں
ہوتا ہے گذر غم کا کہاں میرے چمن میں

فطرت بھی یہاں نغمہ سرا، ساز ہے گویا
ہیں لالہ و گُل جادو بیاں میرے چمن میں

دل جس کی تمنا میں تڑپتا ہے ازل سے
ملتا ہے وہ پُرکیف سماں میرے چمن میں

باقی ہے ابھی رسمِ وفا دہر میں کشور
قائم ہے محبت کا جہاں میرے چمن میں

کشور کیلاش پوری



بیوٹی کالج

شہناز حسین
۹۲-۸۸ گریٹر کیلاش، نئی دہلی۔ فون نمبر: ۶۱۱۶۴۴



جلد کے سیاہ دھبے کیسے دُور کئے جائیں؟

کبھی کبھی چہرے کی جِلد پر سیاہ دھبے پڑجاتے ہیں۔ چہرے پر ہی نہیں، کلائیوں اور ٹانگوں پر بھی سیاہ دھبے نمودار ہو جاتے ہیں کلائیوں اور ٹانگوں کے سیاہ دھبے چھپائے جاسکتے ہیں، لیکن چہرے کے دھبے تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ ان سیاہ دھبوں کی کیا وجہ ہے؟ جِلد میں ایک مادّہ ہوتا ہے، جس کا نام مے لانین ہے۔ یہی مے لانین جِلد کا رنگ بناتا ہے۔ یہی مادہ فیصلہ کرتا ہے کہ جِلد کا رنگ کیسا ہو۔ اگر جِلد خشک ہے تو سورج کی شعاعیں اس مادّے کو جِلد کی نیچے کی تہوں میں پہنچا دیتی ہیں سورج کی الٹرا وائلٹ شعاعیں یہ کام بہت تیزی سے کرتی ہیں۔ جب یہ مادّہ جِلد کے نیچے کی تہوں میں پہنچ جاتا ہے تو جِلد پر سیاہ دھبے پڑجاتے ہیں۔ ایک دفعہ یہ دھبے جِلد پر نمودار ہوجائیں تو ان کو دور نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم ان کی سیاہی کو میک اپ کے ذریعے کم ضرور کیا جاسکتا ہے۔ اگر یہ دھبے ہلکے ہیں اور صرف جِلد کے اوپری حصّے میں ہیں تو انہیں دُور بھی کیا جاسکتا ہے۔ دراصل یہ دھبے خشک جِلد والی عورتوں کے چہروں پر ہی نمودار ہوتے ہیں۔ خشک جِلد والی عورتوں میں تقریباً ۶۰ فی صد عورتیں ان سیاہ دھبوں کا شکار ہوجاتی ہیں۔ ان کا علاج یہ ہے کہ آپ اپنی جِلد کو تر رکھیں۔ موائسچرائزر کریم اور لوشن استعمال کریں یہ آپ کی جِلد میں نمی کے تناسب کو برقرار رکھیں گے۔ سورج کی شعاعوں سے اپنی جِلد کو محفوظ رکھیں۔ یاد رکھئے، سورج چائے کا دشمن ہے۔ اگر دھوپ میں نکلنا ہی پڑے تو چھتری استعمال کریں۔ اگر آپ گرمیوں میں پہاڑ پر جاتی ہیں تو وہاں خاص طور پر چہرے کو دھوپ کی تمازت سے بچائیں۔ پہاڑوں پر ہوا لطیف ہوتی ہے، اس لئے سورج کی کرنوں میں تیزی ہوتی ہے۔

جب کسی عورت کے چہرے پر یہ سیاہ دھبے نمودار ہوتے ہیں تو وہ گھبرا جاتی ہے۔ اسے نہ ان دھبوں کی وجہ معلوم ہوتی ہے اور نہ علاج۔ ایک دفعہ ان کی وجہ آپ کی سمجھ میں آجائے تو آپ ان دھبوں سے اپنے چہرے کو محفوظ رکھ سکتی ہیں اور دھبے نمایاں ہوں تو ان کا علاج کرسکتی ہیں۔ اس بارے میں ایک غلط فہمی عورتوں میں پائی جاتی ہے۔ وہ آنکھوں کی نچلی سطح کے سیاہ حلقوں کو بھی سیاہ دھبوں میں شمار کرتی ہیں۔ یہ غلط ہے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے دوسری چیز ہیں۔ ان کا جِلد کے سیاہ دھبوں سے کوئی تعلق نہیں۔ آنکھوں کے سیاہ حلقے قدرتی ہوتے ہیں۔ ان حلقوں کی وجہ رطوبت کی کمی ہے۔ یہ آنکھوں کے نچلے حصّے کی جِلد رطوبت پیدا کرنے والے غدودوں سے محروم ہے، اس لئے اس جگہ کبھی مہاسے نہیں پیدا ہوتے، لیکن رطوبت کی کمی سے جِلد خشک اور سیاہ ہو جاتی ہے۔ اس قدرتی کمی کو پورا کرنے کے لئے آپ کو آنکھوں کے نیچے کی جِلد کو مصنوعی طور پر تر رکھنا پڑتا ہے۔ رات کو سوتے وقت اس جگہ کوئی کریم لگائیں اور ایک گھنٹہ کے بعد روئی کے ٹکڑے سے صاف کردیں۔ اس طرح جِلد کا یہ حصّہ تر رہے گا اور سیاہ حلقے نمودار نہ ہوں گے۔ ان حلقوں کی ابتدا ۲۰ برس کی عمر میں ہوتی ہے ۲۰ اور ۳۵ برس کے درمیان ان کی رفتار تیز ہوجاتی ہے۔ ۵۰ اور ۶۵ میں یہ حلقے بجلی کی سی تیزی سے بڑھتے ہیں۔ اگر آپ اس جگہ کو تر رکھیں گی تو یہ سیاہ حلقے کبھی نمایاں نہیں ہوں گے۔

کبھی کبھی ٹھوڑی کے نچلے حصّے میں سفید دھبے پڑجاتے ہیں۔ یہ سفید نشان آنکھوں کے نیچے بھی نمودار ہوتے ہیں۔ یہ صفرا کی زیادتی کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ تیز مزاج والوں کے جسم میں صفرا زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ سفید نشان پیدا ہوجائیں تو آپ صفرا کی زیادتی کا علاج کریں۔ صفرا کم ہوجائے گا تو یہ سفید نشان بھی غائب ہوجائیں گے۔

سفید چھائیاں وٹامن اے کی کمی کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ وٹامن اے کی کمی "ملٹی وٹامن" سے دُور کی جا سکتی ہے۔ روزانہ ایک گولی کھانے سے وٹامن اے کی سپلائی نارمل ہو جاتی ہے۔ ۱۵، ۲۰ روز کے علاج سے یہ سفید نشان غائب ہو جاتے ہیں۔

چہرے کی جھریاں اور نشان عورتوں کے لئے پریشان کُن ثابت ہوتے ہیں۔ چیچک کے گہرے داغ بھی چہرے کی خوب صورتی کو زائل کر دیتے ہیں۔ چیچک کے داغوں کا علاج بھی آج کل دست یاب ہے، لیکن یہ بڑے بڑے شہروں تک محدود ہے۔ یہ علاج کافی مہنگا اور تکلیف دہ ہے۔ ڈاکٹر ایک تار کے برش سے چہرے کو رگڑتا ہے۔ اس کے بعد چہرے کو ایک ماسک میں رکھا جاتا ہے۔ یہ نقاب اس وقت تک چہرے پر لگا رہتا ہے۔ جب تک کہ نئی کھال چہرے پر نہ آ جائے۔ نئی کھال ان نشانوں سے خالی ہوتی ہے۔ اس علاج میں کافی دن لگ جاتے ہیں۔ ویسے یہ علاج بے ضرر ہے۔

اگر چہرے پر جلنے کا نشان ہو یا بچپن کے کسی گھاؤ کا نشان ہو تو یہ نشان بھی آسانی سے دُور کئے جا سکتے ہیں۔ ان نشانوں کو دُور کرنے کے لئے پلاسٹک سرجری کا عمل درکار ہوتا ہے۔ پلاسٹک سرجن جلی ہوئی کھال کو اُتار لیتا ہے۔ اور جسم کے دوسرے حصّے کی کھال کو اس جگہ چسپاں کر دیتا ہے۔ یہ بہت نازک آپریشن ہوتا ہے۔ اس آپریشن میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی اس آپریشن کے دوران مریض کو بے ہوش کر دیا جاتا ہے۔ انسان کا جسم اپنے کسی حصّے کی کھال کو فوراً قبول کر لیتا ہے۔

چند روز کے بعد دوران خون صحیح ہو جاتا ہے اس آپریشن سے جلد پر کوئی نشان نہیں پڑتا۔ اس بات سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ پلاسٹک سرجری میں جسم کے کسی حصّے کی پوری کھال اتار لی جاتی ہے۔ انسان کی جلد کی کئی تہیں ہوتی ہیں۔ آپ نے مشاہدہ کیا ہوگا کہ زخم پر ٹنکچر آیوڈین لگانے سے جلد کی رنگت سیاہ پڑ جاتی ہے۔ ٹنکچر جلد کی اوپر کی تہہ کو جلا دیتا ہے۔ مگر کچھ روز کے بعد جلد کی اوپر کی تہہ آسانی سے اتر آتی ہے اور اس طرح ٹنکچر سے جلد کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ نئی کھال کا رنگ سفیدی مائل ہوتا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد یہ کھال اپنی اصلی حالت پر آ جاتی ہے۔ اسی طرح پلاسٹک سرجن کمال ہوشیاری سے بیمار جلد کی اوپر کی تہہ اتارتا ہے۔ اسی طرح وہ صحت مند جلد کی اوپر کی تہہ اتارتا ہے۔ یہ صحت مند جلد وہ بیمار جلد پر چسپاں کر دیتا ہے۔ آپریشن کے دوران جلد کی باقی تہیں محفوظ رہتی ہیں۔

کچھ عورتوں کی باچھوں پر لکیریں پڑ جاتی ہیں۔ جن عورتوں کی باچھیں عموماً کھلی رہتی ہیں، وہ اکثر اس عیب کا شکار ہو جاتی ہیں۔ ہر وقت ہنسنے سے ہونٹ پھیلے رہتے ہیں، ہونٹوں اور گالوں کے درمیان لکیریں پڑ جاتی ہیں۔ ادھیڑ عمری میں کھال کے تنگ جانے سے لکیریں پڑ جاتی ہیں۔ ان کا علاج بھی پلاسٹک سرجری سے ہوتا ہے۔ پلاسٹک سرجن گالوں کی تہہ کے نیچے ایک سلائی ڈالتا ہے۔ اور اوپر کی تہہ کو باقی جلد سے الگ کر دیتا ہے۔ وہ اس جلد کو کنپٹی کی طرف کھینچتا ہے۔ اس آپریشن میں جلد کو اتارا نہیں جاتا۔ نہ جسم کے دوسرے حصّے کی جلد چسپاں کی جاتی ہے۔ اس آپریشن میں صرف جلد کو کھینچا جاتا ہے، تاکہ اس کی جھریاں غائب ہو جائیں۔ اس آپریشن میں جلد پر کوئی نشان باقی نہیں رہتا۔ آپریشن کا نشان کنپٹی کے بالوں کی لَو کے نیچے چھپا دیا جاتا ہے۔ اس طرح لکیریں اور جھریاں غائب ہو جاتی ہیں۔ اور چہرہ جوانوں کی مانند ہو جاتا ہے۔

آپ آپریشن کی طوالت سے بچنا چاہتی ہیں تو لیگا ورزش کیجئے۔ مونہہ بند کر کے سانس کو باہر نکالنے کی کوشش کیجئے۔ اس طرح مونہہ غبارے کی مانند پھول جائے گا۔ آدھے منٹ انتظار کرنے کے بعد سانس باہر نکال لیجئے۔ اس عمل کو دن میں کئی بار دہرانے سے یہ لکیریں غائب ہو جاتی ہیں۔

اس کے علاوہ ماتھے اور گلے کی جھریاں بھی پلاسٹک سرجری سے دُور کی جاتی ہیں۔ پیشانی کی جلد کو کھینچ کر سر کے بالوں میں چھپا دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات پیشانی کی شکنیں کم عمری میں نمودار ہو جاتی ہیں۔ اس کی وجہ تیوری چڑھانا ہے جو عورتیں غصہ زیادہ کرتی ہیں اور بات بات پر تیوری چڑھاتی ہیں ان کی پیشانی جلد ہی ان لکیروں کا شکار ہو جاتی ہے۔ فکر اور پریشانی کی وجہ سے بھی پیشانی کی جلد متاثر ہوتی ہے۔ نوجوان لڑکیوں کو تیوری چڑھانے کی عادت سے پرہیز لازم ہے۔ مغربی ممالک میں بعض عورتیں پیشانی پر ٹیپ چسپاں کر لیتی ہیں۔ اس طرح کوشش کرنے کے باوجود پیشانی پر شکن نہیں پڑتی۔

سکے؟ جھریوں کا تعلق عمر سے ہے
آپ کے چہرے کی جلد خواہ کتنی ہی تروتازہ

کیوا ، نہ ہو، آپ کے سٹے کی چھری یا عمر کی چیقلی کھاتی ہیں پلاسٹک سرجری سے گلے کی جلد کی اوپر کی تہہ کھینچ کر ٹھوڑی تک لائی جاتی ہے۔ اس آپریشن میں بھی جلد کی اوپر کی تہہ اتاری جاتی ہے۔ بلکہ کھینچی جاتی ہے۔ آپریشن کا نشان ٹھوڑی کے نیچے رہتا ہے۔ اور نمایاں نہیں ہوتا۔

جلد کی حفاظت کے معاملے میں بے پروائی نہ برتیں۔ جلد کی بیماریاں چھوت سے لگ جاتی ہیں۔ مثلاً خارش یا ایگزیما چھوت کی بیماریاں ہیں۔ خارش کی ایک قسم "اسکے بیس" کہلاتی ہے۔ اس بیماری میں پھنسیاں نہیں پیدا ہوتیں، دانے نہیں نکلتے، صرف خارش ہوتی ہے۔ انسان جسم کو کھجاتے کھجاتے پریشان ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کے گھر میں کسی کو یہ بیماری ہے تو اس سے اپنے آپ کو بچا کر رکھنا ضروری ہے۔ اگر یہ بیماری ماں کو ہے تو اسے لازم ہے کہ وہ اپنے بچوں کو گود میں نہ اٹھائے، نہ انہیں پیار کرے۔ اگر یہ تدابیر اختیار نہ کی گئیں تو ممکن ہے کہ سارا گھر اس بیماری میں مبتلا ہو جائے۔ کھجلی کے مریضوں کے کپڑے الگ رکھنے چاہئیں۔ انہیں گرم پانی میں دھونا چاہئے۔ گرم پانی میں چند قطرے ڈیٹول ڈال کر کپڑے دھونا بہتر ہے۔ کھجلی کے مریضوں کے برتن وغیرہ بھی الگ رکھنے چاہئیں۔ اس میں بُرا ماننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پرہیز علاج سے بہتر ہے۔

سوال و جواب

شگفتہ پروین، لکھنؤ

س : میرا مزاج بلغمی اور صفراوی ہے۔ مجھے کس چیز کا استعمال زیادہ رکھنا چاہئے؟

ج : آپ دس گلاس پانی میں ایک لیموں نچوڑ کر ملا لیں اور ہر ایک گھنٹہ بعد ایک گلاس پانی پیا کریں۔ لیموں کا پانی جسم میں تیزابیت کو ختم کر دے گا۔

فرح یاسمین، دہلی

س : میں پانی بہت کم پیتی ہوں مجھے پیاس نہیں لگتی۔ کیا پانی نہ پینا نقصان دہ ہو سکتا ہے؟

ج : جی ہاں پانی نہ پینا بہت سی بیماریوں کو دعوت دیتا ہے۔ دن بھر میں کم سے کم آٹھ گلاس پانی پینا بہت ضروری ہے چاہے آپ کو پیاس محسوس ہو یا نہ ہو۔ پانی نہ پینے سے جسم میں خشکی پیدا ہو جاتی ہے اور قبض بھی ہو جاتا ہے۔ اگر قبض کی شکایت ہو تو ایک گلاس نیم گرم پانی میں ذرا سا نمک شامل کر کے روزانہ صبح نہار منہ پیا کریں۔ قبض کی شکایت جاتی رہے گی۔

ترنم ناہید، دیوبند

س : میری آنکھوں میں پڑھتے پڑھتے یا کام کرتے کرتے تھکاوٹ ہو جاتی ہے۔ کوئی ورزش ایسی بتائیے جو فوری طور پر آنکھوں کی تھکن دُور کر دے؟

ج : دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو دونوں آنکھوں پر اچھی طرح ڈھانپ لیں۔ کہیں سے جھری نہ رہے کس کر بند کریں تاکہ آپ کی ہتھیلیاں آپ کی آنکھوں کو چھوتی رہیں دس منٹ تک دبائے رکھیں پھر ایک دم ہاتھ ہٹا لیں آنکھوں میں تازگی پیدا ہو جائے گی۔

نیلوفر، حسن پور

س : میرے دانتوں میں چُونا سا جم گیا ہے مگر میری والدہ کا کہنا ہے کہ دانتوں کے ڈاکٹر سے چُونا صاف کرانے سے دانت کمزور پڑ جائیں گے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

ج : یاد رکھئے چونا نہ صاف کرانے سے دانت کمزور پڑ جائیں گے۔ کیوں کہ چونا دانتوں کی جڑوں کو کھا کھا کر کمزور کر دیتا ہے۔ آپ دانتوں کے ڈاکٹر کے پاس ضرور جائیں۔ ●●

شمع / شمع کی قیمت میں اضافہ

کناڈا، امریکہ اور فن لینڈ میں، جہاں سے شمع / شمع کے لئے عمدہ کاغذ منگوایا جاتا ہے، اخباری کاغذ کی قیمتیں مسلسل بڑھ رہی ہیں۔ طباعت اور دوسرے اخراجات میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ شمع کے صفحات یا اس کی دوسری دلچسپیاں کم کرنا ہمیں گوارا نہیں —— اس لئے ہم اپریل کے شمارے سے شمع اور شمع کے ادارے کے دوسرے رسائل کی قیمتیں بڑھانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ نئی قیمتیں یہ ہوں گی :
شمع / شمع اور شبستاں : تین روپے فی کاپی۔
مجرم : دو روپے پچاس پیسے فی کاپی۔

بزم بانو

اس عنوان کے تحت دلچسپ معلوماتی اور مذہبی سوالوں کے جواب دئے جاتے ہیں۔ ایک کاغذ پر یا پوسٹ کارڈ پر زیادہ سے زیادہ تین سوال لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کے لئے جگہ چھوڑیئے اور اپنا پورا نام پتہ لکھئے جس کاغذ یا کارڈ پر سوالات ہوں اس پر دفتر سے متعلق اور کوئی بات نہ لکھئے۔ اپنے سوالات اس پتہ پر بھیجئے: بزم بانو

ماہنامہ بانو ۳ آصف علی روڈ، نئی دہلی نمبر ۱

—— مدیرہ

محمد واصل آرزو شہناز، واسع پور، دھنباد

س۔ بزدل انسان کب بہادر بن جاتا ہے؟

ج جب بھاگنے کی سب راہیں بند ہو جاتی ہیں۔

س۔ آج کے دور میں علم حاصل کرنا چاہیئے یا ہنر؟

ج علم کے اہل کو علم حاصل کرنا چاہئے اُس میں دماغ نہ چلتا ہو تو ہنر۔

س۔ عورت اور مرد کے دل میں کیا فرق ہے؟

ج مرد کے دل میں عورت ہے عورت کے دل میں گھر۔

پرویز بھارتی۔ بتیا

س۔ مرد کی عقل پر پردہ کب پڑ جاتا ہے؟

ج جب وہ عورت کو پردے کی قید میں بند کر دیتا ہے۔

نسیم اختر۔ ویلور

س۔ اتفاقات کے بھروسے پر کون لوگ رہتے ہیں؟

ج تن آسان لوگ جو محنت کے جذبے اور حوصلہ سے محروم ہوتے ہیں۔

س۔ موجودہ دور میں احسان کا بدلہ برائی سے کیوں ملتا ہے؟

ج احسان کا بدلہ مانگنا خود ایک برائی ہے۔

خالد یوسف۔ سہارنپور

س۔ بیماری انسان کو کب اچھی لگتی ہے؟

ج جب وہ کام کی مصروفیت سے تنگ جائے۔

اے۔ ایچ۔ عبدالشکور، ویلور

س۔ یاس پرستی کی انتہا کیا ہوتی ہے؟

ج یاس پرستی کی انتہا اس کی ابتدا ہے

س۔ بحث کے لئے سب سے اچھی جگہ کونسی ہے؟

ج بستر پر۔ تاکہ نیند آنے پر بحث خود بخود ختم ہو جائے

س۔ انسان اپنی قدر کب کھو دیتا ہے؟

ج جب انسان کے بزرگ اس کی حوصلہ شکنی میں استقلال کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

روشن پروین شاہد، رانچی، بہار

س۔ عورتیں زیادہ عقلمند ہوتی ہیں یا مرد

ج عقل مند وہی ہیں جو بے وقوف بن کر عقل مندوں سے کچھ حاصل کرتے ہیں۔

س۔ میرے دوستوں کا کہنا ہے کہ عورت ایک خوب صورت ناگن ہے

ج شکر ہے کہ آپ کے دوست ناگن کے ساتھ خوب صورت کا لفظ بھی جوڑ دیتے ہیں

س۔ انسان کو دنیا رنگین کب نظر آتی ہے جوانی میں یا بڑھاپے میں

ج جوانی میں دنیا کے سات رنگ ہوتے ہیں اور بڑھاپے میں صرف ایک رنگ

فاروق ذاکر مشتاق تمنا، کریم نگر

س۔ دل سے آہ کب نکلتی ہے؟

ج بے خبری میں۔

شوکت علی، کلکتہ

س۔ زندگی میں عورت کب اور کیوں پریشان ہوتی ہے۔

ج جب اس کے چاہنے والے کی نظر کسی اور پر پڑنے لگے۔

س۔ عورتیں اپنے حسن پر ناز کیوں کرتی ہیں

ج حسن قدرت کا عطیہ ہے اس پر ناز کرنا بجا ہے۔

محمد الیاس قریشی، جمشید پور

س۔ کیا خوب صورت لڑکیاں اچھی بیوی بن سکتی ہیں؟

ج اگر انہیں اپنی خوب صورتی کا احساس ہے تو یہ کام ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔

ایس، ایم خواجہ بیڑ والا، مہاراشٹرا

س۔ جوانی دیوانی ہے تو بڑھاپا کیا ہے؟

ج جوانی کی حسرتوں کا مقبرہ۔

کلام احمد آرزو، ہزاری باغ

س مرد کا دل کب ڈوبنے لگتا ہے؟

ج دکانداروں کے بل دیکھ کر۔

نصرت بی، بدایوں

س۔ جب انسان کو یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ گناہ کرنا گناہ ہے تو پھر بھی وہ گناہ کیوں کرتا ہے۔

ج گناہ انسان کی صفت ہے۔ اگر وہ گناہ نہ کرے تو توبہ بھی نہیں کرے گا۔

کیا کہا ذوقِ معاصی سے کنارہ کروں
شانِ رحمت تیری توہین گوارہ کروں

س۔ آج کل کا انسان اپنی نظر میں دوسرے انسان کو گرا ہوا کیوں سمجھتا ہے۔

ج یہ بیماری آج کی نہیں بہت پرانی ہے جمہوریت کے زمانے میں یہ بیماری کچھ کم ہو جاتی ہے۔

مس محمودہ صدیقی، جھارسگڈا اڑیسہ

س۔ آج کل کے زمانے اور فیشن کو بُرا لوگ اِس قدر بُرا کیوں کہتے ہیں۔

ج آج سے ۵۰ سال پہلے کے لوگ بھی زمانے کے فیشن کو بے حیائی سے تعبیر کرتے تھے۔

س۔ نیکی کا بدلہ برائی سے ملتا ہے ایسا کیوں

ج نیکی کا بدلہ چاہنا خود ایک بُرائی ہے۔

محمد تمیز احمد، نظام آباد

س۔ کسی پر کب تک بھروسہ کرنا چاہئے۔

ج جب تک وہ بھروسہ کے قابل رہے۔

س۔ کیا زندگی ایک کھلونا ہے؟

ج جی ہاں۔ لیکن صرف عقل مند آدمی کے لئے۔

محمد ابرار الحق، سیتا پور

س۔ دولت کیا شئے ہے۔

ج دولت قوتِ خرید کا نام ہے۔

س۔ کیا دوست بھی غداری کر سکتا ہے۔

ج غدّاری کے لئے دوست اور دشمن سب برابر ہیں۔

نعیم حسن، کاماریڈی

س۔ انسان کی عظمت کا راز ـــــ؟

ج اس کی خاکساری میں پوشیدہ ہے۔

س۔ عورت کے آنسو؟

ج مرد کا دل پتھر دل پگھلا دیتے ہیں۔

س۔ یادیں پیچھا کب چھوڑتی ہیں؟

ج وقت کی تلوار یادوں کو کاٹ دیتی ہے

محمد جمیل "اُجالا"، دھنباد

س۔ گھر میں دیر سے آنے پر بیوی سے، کیا بہانہ کرنا چاہئے؟

ج یہی کہ تمہارے لئے ایک اچھی سی ساڑھی دیکھ رہا تھا۔

س۔ دل کو خوش رکھنے کے لئے کیا کرنا چاہیئے

ج اپنے آپ کو مصروف رکھنا چاہئے۔ اتنی فرصت بھی نہ ملے کہ یہ سوال کیا جائے۔

قدسیہ انجم شمسی، علی گڑھ

س۔ سچ اور جھوٹ ساتھ نہ دیں تو کیا کرنا چاہیئے

ج خاموش رہنا چاہئے۔

س۔ کیا پڑھنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے؟

ج جی ہاں جب حروف آنکھوں کے آگے ناچنے لگیں اور آنکھیں بند ہو جائیں۔

محمد الیاس قریشی، جمشید پور

س۔ شوہر بیوی کا غلام کب بن جاتا ہے؟

ج جب بیوی اپنی خدمت گزاری سے اُسے پتا کر دے۔

س۔ زہر اب اثر نہیں کرتا؟

ج جب اس میں ملاوٹ ہو۔

سلطان احمد اشک، کریم نگر

س۔ غرور انسان کو کدھر لے جاتا ہے؟

ج ابتدا میں اوپر کی طرف اور بعد میں تنزل کی طرف۔

س۔ اگر زندگی غموں سے گھر جائے تو کیا کرنا چاہئے؟

ج خوشی میں گزارے ہوئے لمحات کی یاد۔ اور خوشی کے پلٹ آنے کی آرزو۔

نواب اصغر علی بیگم اصغر علی، دھنباد

س۔ زندگی اُلجھن کب بن جاتی ہے؟

ج جب انسان اسے سلجھانا نہ چاہے۔

بیگم شفیق پریمی، ٹاٹانگر ۵

س۔ جھگڑا کب ہوتا ہے؟

ج جب انسان جھگڑا کرنے پر تل جائے

س۔ انسان کب تڑپ اُٹھتا ہے؟

ج اہلِ دل دوسرے کی تکلیف دیکھ کر۔ خود غرض آدمی اپنا نقصان دیکھ کر۔

رابعہ صدیقی

س۔ وقت کے ساتھ ساتھ زندگی گھٹتی ہے یا بڑھتی ہے؟

ج زندگی گھٹتی ہے۔ اور تجربہ بڑھتا ہے۔

س۔ حسن اور وصف؟

ج شاذ و نادر ہی دونوں ایک ساتھ دکھائی دیتے ہیں

زینت فائق، آسنسول

س۔ وہ کون سا کام ہے جس کا آغاز برا ہو تو انجام اچھا ہوتا ہے؟

ج کھاد بنانے کا عمل

س۔ شہرت کا بھوکا آپ کی نظر میں؟

ج شہرت کی بھوک ایک فطری امر ہے

ہم طالبِ شہرت ہیں ہمیں ننگ سے کیا کام
بدنام بھی گر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

لوگ شہرت حاصل کرنے کے لئے بدنامی سے بھی گریز نہیں کرتے۔

دیس بدیس کی خبریں



راجستھان میں عورتوں کا پہلا بینک

راجستھان کے وزیر خزانہ جناب چندن مل بید نے ۲۳ دسمبر ۱۹۷۶ کو جے پور میں صرف خواتین کے لئے مخصوص سنڈیکیٹ بینک کی ایک شاخ کا افتتاح کیا۔ اس سے پہلے بھی سنڈیکیٹ بینک کی طرف سے تیرہ شاخیں صرف خواتین کے لئے کھولی جا چکی ہیں۔ اس جے پور شاخ کی مینجر مسز جانکی پانڈے نے بتایا کہ اس شاخ کی طرف سے خواتین کو ہر قسم کی سہولتیں دی جائیں گی تاکہ وہ اپنی زندگی آرام سے گزار سکیں۔ اب تک ان "خاتون شاخوں کے کھلنے سے تین لاکھ خواتین کسی نہ کسی حیثیت سے بینک سے وابستہ ہو چکی ہیں۔ بینک کی طرف سے دیہی علاقوں میں بھی عورتوں کو قرض دئے گئے ہیں اور اس طرح زراعتی میدان میں ترقی کی ایک نئی راہ کھلی ہے۔

پانچ لاکھویں خوش نصیب سیّاح خاتون

ہندوستان میں سیاحوں کی آمد کو بڑھاوا دینے کے سلسلہ میں پانچ لاکھویں سیاح خاتون مسز جوڈتھ لیور کو "خوش نصیب سیاح" کی حیثیت سے بہت سے انعامات سے نوازا گیا۔ یہ سیاحی تقریب نئی دہلی کے اشوکا ہوٹل میں شان سے منائی گئی۔ مسز لیور کو وزیر سیاحت شری راج بہادر نے تین خصوصی انعامات عطا کئے جو مختلف ہوٹلوں اور ٹورسٹ کمپنیوں کی طرف سے دئے گئے تھے۔ مسز لیور امریکی ہیں اور وہاں صحت اور تعلیم کے محکمے میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ مسز لیور کے شوہر ڈاکٹر مارٹن ان سے ایک دن بعد بمبئی پہنچے ورنہ انھیں پانچ لاکھواں خوش نصیب سیاح قرار دیا جاتا۔ مارٹن بھی اشوکا کی تقریب میں شریک تھے اور ان کو بھی کچھ تحفے پیش کئے گئے۔ ہندوستان میں اس سال سیاحوں کی ریکارڈ توڑ آمد ہوئی ہے دسمبر کے آغاز تک ہی تقریباً پونے پانچ لاکھ سیاح آ چکے تھے۔ اس بار سیاح عورتیں بھی کافی تعداد میں آ رہی ہیں۔

ہندوستان کی پہلی خاتون جنرل

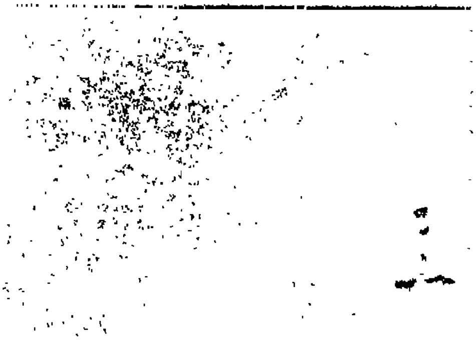
حال ہی میں جب فرانس کی افواج میں پہلی بار ایک خاتون مالیری آندریہ کو جنرل تعینات کیا گیا تو دنیا بھر کے اخبارات میں اس خبر کو نمایاں طور سے شائع کیا گیا تھا ــــ لیکن ہندوستان کی فوج میں پہلے ہی ایک خاتون میجر جنرل مس جی۔ اے۔ رام جنرل کے عہدے پر فائز ہیں۔ اب ان کو مزید ترقی دے کر آرمی ہیڈ کوارٹر میں ملٹری نرسنگ سروسز کا پہلا ڈائرکٹر مقرر کیا گیا ہے۔ جنرل جی۔ اے۔ رام نے افواج میں نمایاں کارنامے انجام دئے ہیں۔ ہندوستانی فوجوں میں خواتین کی پذیرائی پہلے سے زیادہ ہو رہی ہے۔ کچھ ہی دن پہلے کی بات ہے کہ ہندوستانی بحریہ میں ڈاکٹر بربرا گھوش کو خاتون کمانڈر مقرر کیا گیا ہے۔

شہزادی این تیز رفتاری کی راہ پر

انگلستان کی ملکہ الزبتھ کی صاحب زادی شہزادی این انتہائی تیز رفتار سے کار ڈرائیو کرتی ہیں۔ وہ تیز رفتاری کا انعام بھی حاصل کر چکی ہیں، اور کئی مرتبہ اس خطا پر جرمانہ ادا کر چکی ہیں۔ حال ہی میں ایک سو چوالیس کلو میٹر کی رفتار سے گاڑی چلانے کے جرم میں ان کو جرمانے کی شکل میں سزا بھگتنا پڑی جس شاہ راہ پر زیادہ سے زیادہ ایک سو بارہ کلو میٹر فی گھنٹے کی رفتار کی پابندی ہے، وہاں این نے ایک سو چوالیس کلو میٹر فی گھنٹے کی رفتار سے گاڑی چلائی۔ جب ان کو وارننگ دے کر روکا گیا اور ان کا چالان کیا گیا تو اس وقت ان کے ساتھ ان کے شوہر کیپٹن مارک فلپس بھی موجود تھے شہزادی لمبی شاہ راہوں پر انتہائی تیز رفتار سے کار چلانے میں ماہر ہیں۔

پندرہ سال کی دلہن ۱۶۸ سال کا شوہر

ایران کے ایک کاشت کار نے، جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کی عمر ۱۶۸ سال ہے، حال ہی میں ایک کم سن دوشیزہ سے شادی کی ہے دلہن کی عمر صرف پندرہ سال ہے۔ تہران کے ایک اخبار "اتفاق" نے لکھا ہے کہ دولہا علی اشرف حسین آذربائیجان کے علاقے کا



جس میں مسز چنتل سنگھ نے اپنے جہاز کو کئی بار غوطے دئے اور پھر جہاز سے ہوائی چھتری کے ساتھ کود پڑیں اور سلامتی کے ساتھ زمین پر اتر آئیں۔ چنتل کے شوہر کیپٹن شمشیر سنگھ نے بھی اس مظاہرے میں حصہ لیا اور دونوں نے اپنی مہارت اور بہادری کا ثبوت پیش کیا۔ اس موقع پر خصوصی مہمان ایر چیف اسٹاف ایر مارشل مول گار کرنے چنتل کو مبارک باد پیش کی۔ چنتل اس سے پہلے بھی اس طرح کے کئی مظاہروں میں کارنامے دکھا چکی ہیں۔

امریکی اداکارہ کی ساتویں شادی

ہالی روڈ (امریکہ) میں مشہور اداکار اور اداکارائیں شادی اور طلاق کو ایک محبوب مشغلہ سمجھتے ہیں۔ اس کا ثبوت حال ہی میں الزبتھ ٹیلر کی ساتویں شادی ہے۔ یہ شادی اس نے امریکہ کے

باشندہ ہے۔ یہ خطہ اپنے باشندوں کی درازیٔ عمر کے معاملے میں کافی مشہور ہے۔ علی اشرف حسین کی یہ تیسری شادی ہے۔ دلہن کا نام اکرم عنوانی ہے۔ اشرف حسین کی پانچ پشتیں موجود ہیں۔ اس کی نئی پندرہ سالہ دلہن خوب صورت اور تعلیم یافتہ ہے۔

ہندوستانی چھاتا بردار خاتون کا شاندار مظاہرہ

کانپور میں گلائڈنگ اور سورنگ مرکز" کے زیر اہتمام ہوا میں غوطہ لگانے کا مظاہرہ کیا گیا

نیوی سکریٹری جان وارنر سے کی ہے اس سے پہلے الزبتھ ٹیلر مشہور اداکار رچرڈ برٹن کی بھی بیوی رہ چکی ہے۔ الزبتھ کے لئے شادی اور طلاق گڈے اور گڑیوں کا سا کھیل ہے۔ وہ جب چاہتی ہے طلاق دے کر دوسری شادی رچا لیتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وارنر کے ساتھ وہ کب تک نبھاتی ہے۔

باورچی خانہ

مزے دار اور
آزمودہ پکوان

آلو والا روغن جوش

گوشت	بغیر ہڈی کا	۲۵۰ گرام
آلو		۲۵۰ گرام
ٹماٹر		۱۵۰ گرام
لال مرچ		۲ چائے کے چمچے
دھنیا		۲ چائے کے چمچے
ہلدی		آدھا چائے کا چمچہ
ادرک		ایک چائے کا چمچہ
لہسن		ایک چائے کا چمچہ
پیاز	درمیانہ سائز	۲ ڈلی
زیرہ (پسا ہوا)		آدھا چائے کا چمچہ
جائفل (پسی ہوئی)		ایک چٹکی
جاوتری (پسی ہوئی)		ایک چٹکی
زعفران		ایک چٹکی
دودھ		آدھی پیالی
گھی		ایک پیالی
نمک		حسبِ ذائقہ

گوشت کے ایک ایک انچ کے چوکور ٹکڑے کرلیں آلو چھیل کر ان کے بھی دو دو انچ کے چوکور ٹکڑے کرلیں زعفران کو تھوڑے سے پانی میں بھگو کر کھرل میں پیس لیں پیاز کے لچھے کاٹ لیں ایک دیگچی میں گھی اور پیاز کے لچھے ڈال آنچ پر رکھ دیں پیاز بادامی ہو جائے تو اس میں سب مسالے ادرک لہسن اور پاؤ پیالی پانی ڈال کر ڈال کر بھون لیں اب اس میں گوشت آدھی زعفران اور گلنے کے انداز کا پانی ڈال کر دیگچی کو ڈھانپ دیں جب گوشت تین چوتھائی گل جائے تو اس میں آلو ڈال دیں اب ایک دوسری دیگچی میں چار پیالی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں پانی اُبل جائے تو اس میں ٹماٹر ڈال کر دیگچی کو ڈھانپ دیں اور آنچ سے اتار لیں۔ دس منٹ بعد پانی اُبل جائے تو اس میں ٹماٹر ڈال کر دیگچی کو ڈھانپ دیں اور آنچ سے اتار لیں دس منٹ بعد پانی پھینک دیں اور ٹماٹروں کے چھلکے اتار کر کانٹے سے کچل لیں جب آلو اور گوشت گل جائیں تو اس میں ٹماٹر ڈال دیں ٹماٹروں کا پانی کم ہو جائے تو باقی کی زعفران اور دودھ ڈال کر دیگچی کو آنچ سے اُتار لیں۔

رحمن بیگم، کلکتہ

شکر قندی کی بھاجی

شکر قندی		۳۵۰ گرام
پیاز	درمیانہ سائز	۴ عدد
لال مرچ		ایک چائے کا چمچہ
ہلدی		پاؤ چائے
زیرہ		آدھا چائے کا چمچہ
رائی		پاؤ چائے کا چمچہ
لہسن		پاؤ چائے کا چمچہ
دودھ		آدھی پیالی
گھی		آدھی پیالی
نمک		حسبِ ذائقہ

شکر قندی کو چھیل کر آدھا آدھا انچ موٹے ٹکڑے کرلیں پیاز چھیل کر لچھے کاٹ لیں ایک دیگچی میں گھی اور پیاز کے لچھے ڈال کر آنچ پر رکھ دیں پیاز بادامی ہو جائے تو اس میں رائی اور زیرہ ڈال دیں پھر فوراً ہی شکر قندی کے ٹکڑے لال مرچ ہلدی نمک اور لہسن ڈال دیں اور ایک منٹ بھون کر گلنے کے انداز کا پانی ڈال کر دیگچی کو ڈھانپ دیں جب شکر قندی گل جائے تو اس میں دودھ ڈال دیں اور ایک دو منٹ پکا کر آنچ سے اتار لیں۔

شلغم کا حلوہ

شلغم	۵۰۰ گرام
دودھ	ایک لیٹر
چینی	ایک پیالی
عرق کیوڑہ	۴ چائے کے چمچے
زعفران	ایک چٹکی
پستہ	۱۰ عدد
بادام	۵ عدد
گھی	آدھی پیالی

شلغم کو چھیل کر چار چار ٹکڑے کرلیں پھر پانی میں اُبال لیں اور چھلنے میں ڈال کر پانی پھینک دیں شلغم دس پندرہ منٹ چھلنے میں ہی رہنے دیں زعفران کو چند قطرے دودھ میں بھگو کر کھرل میں پیس لیں پستہ بادام کو گرم پانی میں بھگو کر چھلکے آتار دیں اور ان کی ہوائیاں کاٹ لیں ایک دیگچی میں شلغم اور دودھ ڈال کر

آنچ پر رکھ دیں جب دودھ پکتے پکتے خشک ہو جائے تو دیگچی کو آنچ سے اتار لیں اور شلغم کو دال گھوٹنی سے خوب اچھی طرح گھوٹ لیں اب چینی میں آدھی پیالی پانی ڈال کر قوام پکالیں۔ فرائی پان میں گھی اور الائچی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ الائچی بادامی ہو جائیں تو گھی شلغم والی دیگچی میں انڈیل دیں اور دیگچی کو دوبارہ آنچ پر رکھ دیں مزید دو چار منٹ بھون کر کیوڑہ اور زعفران ڈال دیں پھر فوراً ہی دیگچی آنچ سے اتار لیں ڈش میں نکالنے کے بعد پستہ بادام کی ہوائیاں چھڑک دیں۔

گاجر کا رائتہ

گاجر	۱۰۰ گرام
دہی	۲۵۰ گرام
کالی مرچ	ایک چائے کا چمچ
لہسن	پاؤ چائے کا چمچ
زیرہ	پاؤ چائے کا چمچ+لیموں کا عرق دو چائے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ

گاجروں کو چھیل کر کدوکش میں موٹا موٹا کس لیں دہی کو خوب اچھی طرح پھینٹ لیں زیرے کو بغیر گھی کے بھون کر موٹا موٹا کوٹ لیں پھر دہی زیرہ نمک کالی مرچ اور لہسن ملالیں اب ایک دیگچی میں تین پیالی پانی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں جب پانی ابلنے لگے تو اس میں گاجریں اور لیموں کا عرق ڈال دیں دو چار منٹ بعد آنچ سے اتار کر چھلنی میں چھان کر پانی پھینک دیں اور گاجریں دہی میں ملالیں۔

گوبھی کا اچار

گوبھی	ایک کلو
پیاز (درمیانہ سائز)	۴ ڈلی
لہسن (درمیانہ سائز)	۲ پوتھی
ادرک	۳ انچ کا ٹکڑہ
کلونجی	۲ چائے کے چمچے
کالی مرچ	۲ چائے کے چمچے
عرق نعناع	۵۰۰ ملی لیٹر

گوبھی کو دھو کر چھوٹے چھوٹے پھول کاٹ لیں ڈنڈیاں پھینک دیں پیاز لہسن اور ادرک کو چھیل کر پیس لیں پھر اس میں کالی مرچ اور کلونجی بھی ملالیں اور یہ سب چیزیں گوبھی پر مل کر دھوپ میں رکھ دیں دو تین گھنٹے کے بعد ایک اسٹیل کی دیگچی میں عرق نعناع اور گوبھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں جب عرق پکنے لگے تو آنچ سے اتار لیں ٹھنڈا ہو جانے کے بعد کسی صاف اور خشک مرتبان میں بھر کر رکھ لیں۔

آلو چھولے

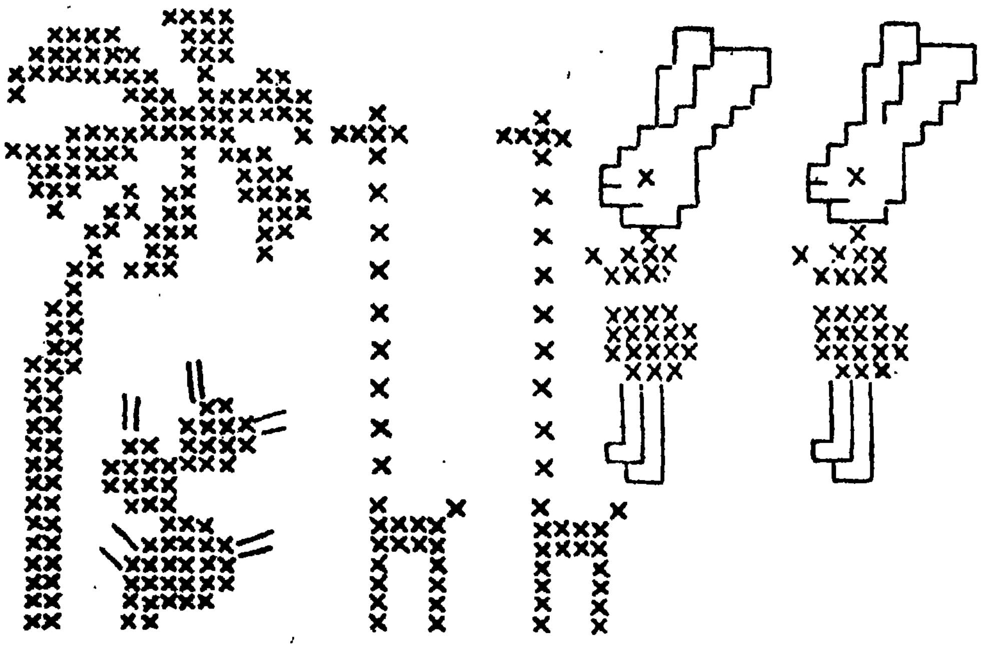
کالے چنے	۱۲۵ گرام
آلو	۱۰۰ گرام
ناریل کا برادہ	۱۰۰ گرام
املی کا گودہ	۲۰ گرام
لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
سوڈا (کھانے کا)	آدھا چائے کا چمچہ
ہری مرچ	۳ عدد+چینی دو چائے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ

چنوں کو صاف کر کے دھو لیں پھر اس میں سوڈا ملا کر چار گھنٹے کے لئے بھگو دیں املی کو بھی دھو کر تین پیالی پانی میں دو گھنٹے کے لئے بھگو دیں آلو دھو کر اُبال لیں اور ان کے پاؤ پاؤ انچ موٹے گول ٹکڑے کاٹ لیں چنوں کو بھی اُبال لیں املی کو ہاتھ سے مل کر چھلنی میں چھان کر گودا نکال لیں۔ ہری مرچوں کو کاٹ لیں اب ایک اسٹیل کی دیگچی میں املی کا پانی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں پھر اس میں لال مرچ نمک اور چینی ڈال دیں جب پانی پکنے لگے تو اس میں آدھا ناریل کا برادہ بھی ملا دیں ایک دو منٹ بعد آنچ سے اتار لیں اب ایک ڈش میں چنے آلو اور ہری مرچ کا کچومر ڈال دیں اور اس کے اوپر پکی ہوئی املی ڈال کر خوب اچھی طرح ملا دیں اوپر سے باقی ناریل کا برادہ چھڑک دیں۔

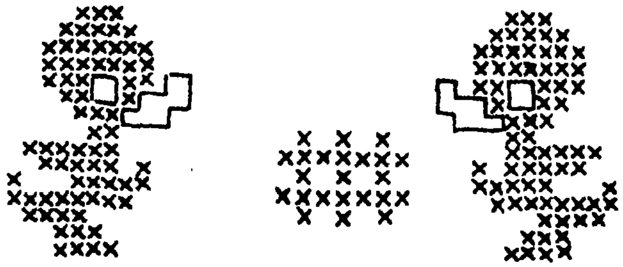
کاجو والی کھچڑی

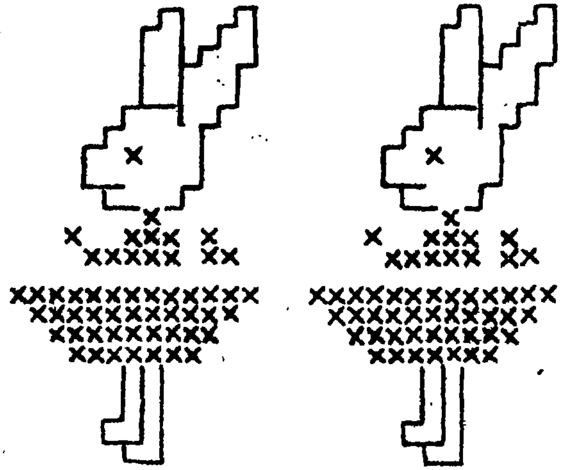
چاول	۵۰۰ گرام
مونگ کی دال	بغیر چھلکوں کی ۲۵۰ گرام
کاجو	۵۰ گرام
لال مرچ	ایک انچ کا ٹکڑہ
گھی	ایک پیالی
نمک	حسب ذائقہ

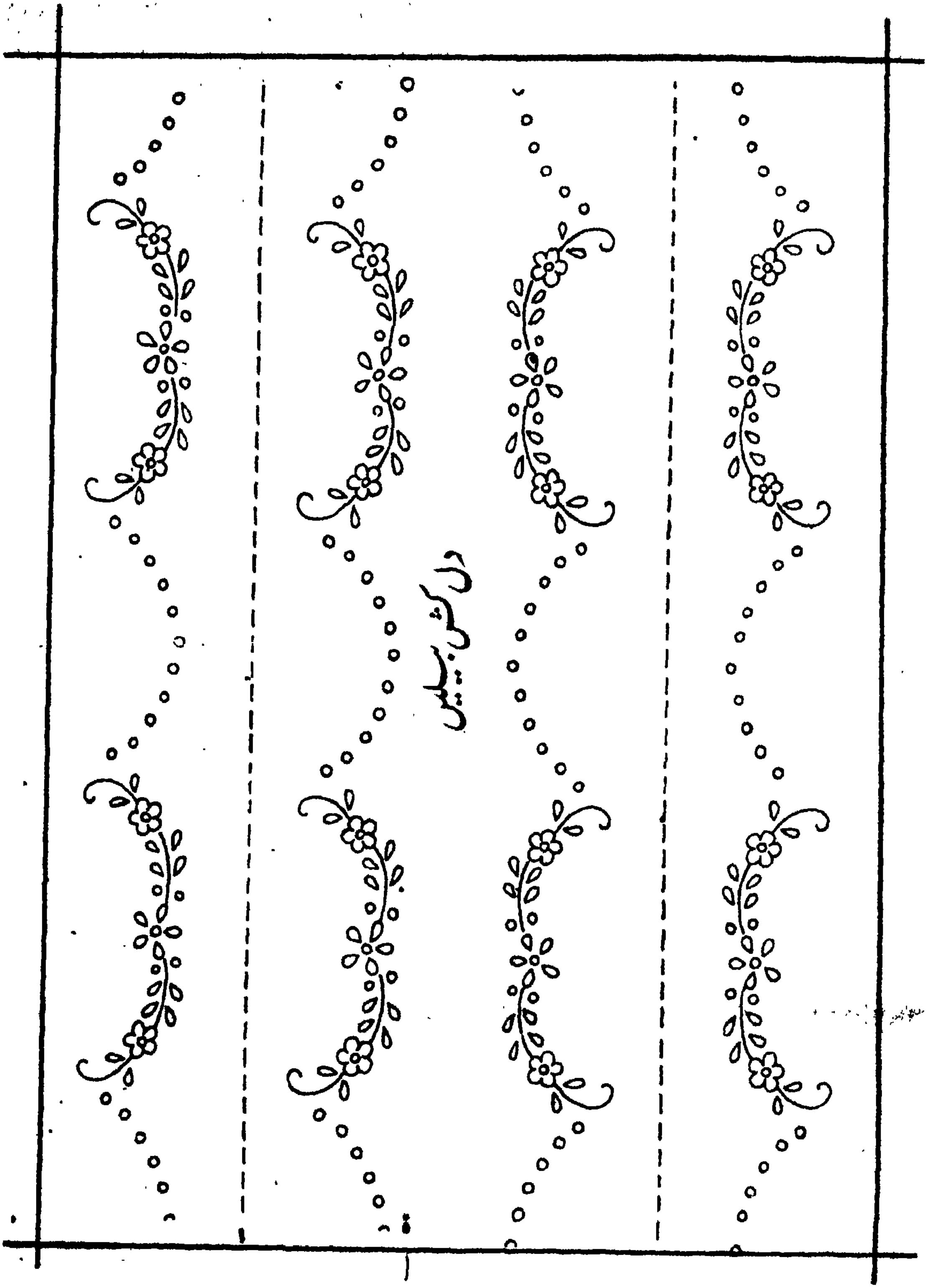
چاولوں کو دھو کر ایک گھنٹے کے لئے بھگو دیں ادرک کو چھیل کر لچھے کاٹ لیں دال کو دھو لیں۔ اب ایک دیگچی میں گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں گھی گرم ہو جائے تو اس میں کاجو ڈال دیں کاجو بادامی ہو جائیں تو گھی سے نکال لیں پھر اس میں لال مرچیں ڈنڈیوں سمیت ڈال دیں جب مرچیں پھول جائیں تو اس میں دال ادرک اور نمک ڈال دیں ایک دو منٹ بھون کر اس میں چاول بھی شامل کر دیں پھر پھر گلنے کے اندازکا پانی ڈال کر دیگچی کو ڈھانپ دیں دال چاول گل جائیں اور پانی خشک ہو جائے تو آنچ سے اتار لیں ڈش میں نکالنے کے بعد کاجو چھڑک دیں۔ ●●

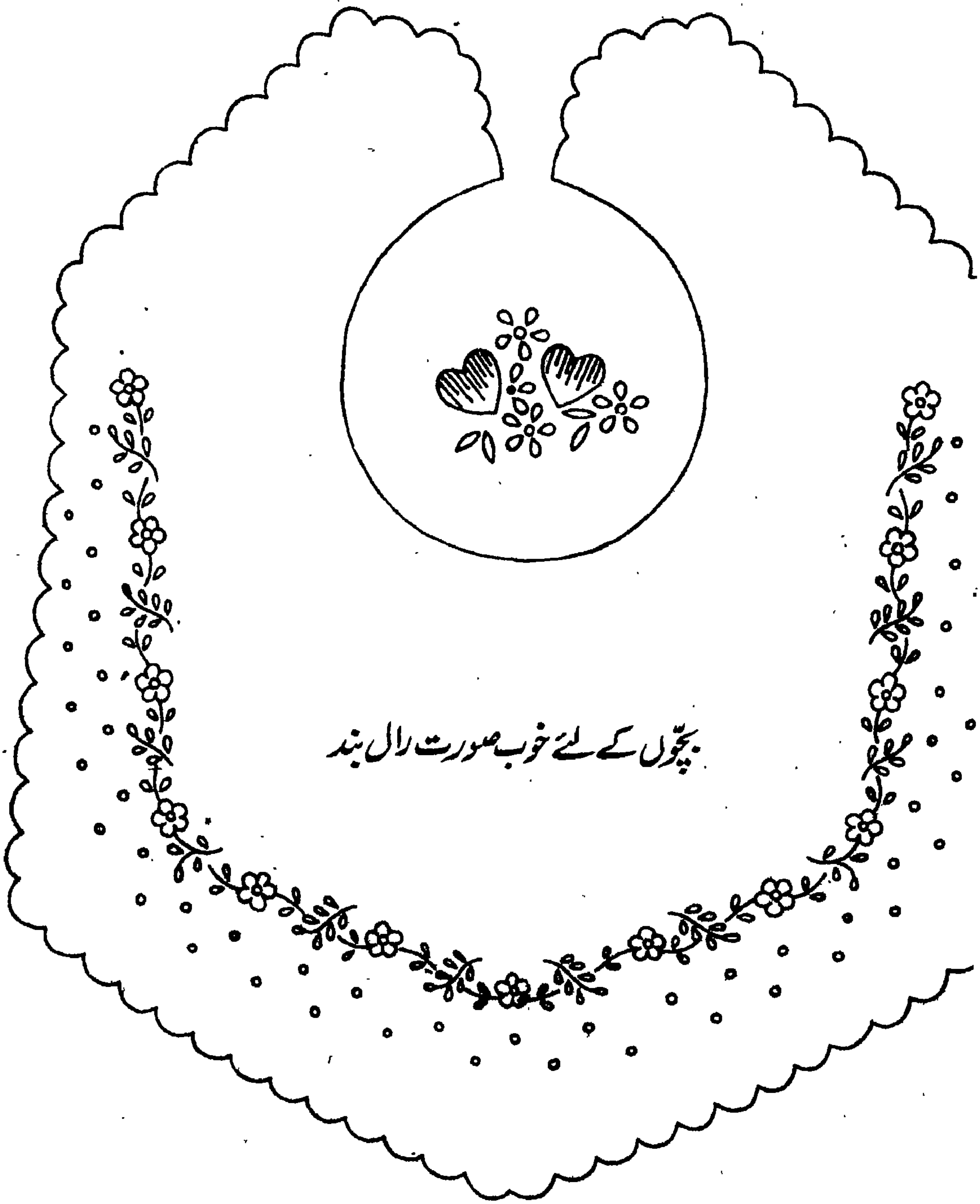


دل کش کشیدہ کاری






دلکش بیلیں


بچوں کے لئے خوب صورت رال بند

کہی اَن سُنی

خطا کس کی ہے؟

سوئیٹ بھابی:

کچھ دن ہوئے مجھے شاپنگ کرنے کا اتفاق ہوا۔ میں جس دُکان سے خریداری کر رہی تھی، اُسی دکان پر دو تین لڑکیاں بھی خریداری کر رہی تھیں۔ لڑکیاں کیا تھیں، اگر ان کو ماڈرن تتلیاں کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ ناف سے نیچے ساڑی، بلاؤز کیا تھا، سے اگر چولی کہا جائے تو بہتر ہوگا۔ ساڑی جتنی نیچے بندھی ہوئی تھی، بلاؤز اتنا ہی اونچا تھا۔ کپڑے تن ڈھانکنے کو نہیں، بلکہ جسم کے ہر عضو کو اور نمایاں کرنے کے لئے پہنے گئے تھے ــــ اور میک اپ؟ اُف توبہ! ایسا معلوم ہوا جیسے کسی میک اپ کا سامان بنانے والی کمپنی کا اشتہار ہیں۔ انہیں دیکھ کر ہم جنس بھی انہیں دیکھنے پر مجبور ہو جائے، مخالف جنس کا تو کہنا ہی کیا۔ دو تین من چلے انہیں دیکھ کر اسی دکان پر کھڑے ہو گئے اور بے مقصد چیزوں کے دام پوچھنے لگے۔ اصل مقصد تو ان تتلیوں کا جی بھر کے درشن کرنا تھا۔ ایک لڑکا اپنے ساتھی سے کہنے لگا "واہ۔ کیا مال ہے! جی چاہتا ہے گھر لے جایا جائے۔" اور میں سوچنے لگی کہ لڑکیاں قیامت بن کر تو خود باہر نکلتی ہیں، پھر کیسے کوئی نہ دیکھے اور چھیڑے قصور ان نوجوانوں کا نہیں جو بدنگاہی اور بدکلامی کرتے ہیں، قصور تو لڑکیوں کا ہی ہے جو ان کو ایسا موقع دیتی ہیں۔

شریفہ شمعون علی، اندور

ڈیئر بھابی:

اس مرتبہ افتتاحیہ پڑھ کر خوشی بھی ہوئی، اور تھوڑی سی مایوسی بھی، کیوں کہ وہ صفحہ خاص طور سے عورتوں کے لئے ہی نکلا۔ ویسے جملوں کو کچھ تبدیل کیا جائے تو ہم لڑکوں کے لئے بھی اتنا ہی کارآمد ہو سکتا ہے۔ کاش خواتین دوسروں کی بے توجہی کی اصل جڑ کی طرف نگاہ اٹھائیں۔ پھر ازدواجی زندگی کے دن اتنے کڑوے تو نہ ہوتے اور لطیفوں میں ان کا استعمال تو نہ ہوتا۔

الجھنوں اور نفسیاتی مسائل کا صفحہ دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ اردو ماہ ناموں میں یہ ایک انوکھا، کارآمد اور قابلِ ستائش کام ہوا ہے۔ اس کے لئے دلی مبارک باد قبول فرمائیں۔ رئیس احمد، مظفر پور

پیاری بھابی:

اس بار آپ نے ایک اور معرکہ آرا اضافہ کیا ہے، جس سے بانو بہنوں کو آسودگی اور مسرت کی راہ تلاش کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔ میری مُراد اس کالم سے ہے جس کا عنوان ہے: "آپ کی ذہنی الجھن اور اس کا حل" آپ ہم بہنوں کی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے کیسے کیسے جتن کرتی ہیں۔ مبارک باد قبول فرمائیں۔ آمنہ نعیم، بنگلور

★ "ان سے ملئے" کے تحت انیس ہوش یار جنگ سے ملاقات لائقِ تعریف ہے۔ ایک جگہ انیس کے بارے میں لکھا گیا ہے: "انیس نے ابتدائی تعلیم حیدرآباد میں حاصل کی۔ سینئر کیمبرج کے بعد وہ امریکہ چلی گئیں۔ انیس چار سال امریکہ میں رہیں۔" پڑھنے والوں کی آگاہی کے لئے میں اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ انیس نے ۱۹۶۰ میں عثمانیہ یونی ورسٹی سے ایم۔ اے (سوشیالوجی) کی ڈگری لی تھی۔ میں اس وقت ایم۔ اے ابتدائی کا طالب علم تھا۔ مس کانگا اور سوشیالوجی ان کی گورنس اور نگران تھیں۔

محمد عبدالوحید خاں، حیدرآباد

بھابی صاحبہ:

فرحت قمر کا مضمون "نیپالی عورتیں" (بانو: جنوری) بہت معلومات افروز ہے۔ تصویروں سے ایسے فیچروں میں اور بھی جان پڑ جاتی ہے۔ بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم سچ مچ ان اجنبی بہنوں کے درمیان گھوم پھر رہے ہوں۔ ان کے رہن سہن اور رسموں کا مشاہدہ کر رہے ہوں، ان سے باتیں کر رہے ہوں۔ یہ سلسلہ جاری رکھئے۔ عائشہ نسیم، ورنگل

بھابی جان:

اِس مرتبہ انیس جنگ سے لیا ہوا انٹرویو بہت پسند آیا۔ اُن کے کارنامے بھی خوب ہیں اور خیالات بھی۔ اُنہوں نے ثابت کر دکھایا ہے کہ کامیابی کی راہوں پر آگے بڑھنے کے لیے عورت کا مشرقی قدروں کو خیرباد کہنا ضروری نہیں۔ بلکہ یہ طریقہ شاید نقصان رساں ہی ہے۔ مبارک باد ــــ آپ کو بھی اور اُنہیں بھی۔ ثریا رفعت، بھوپال

محترمہ:

بانو: جنوری میں 'دیس بدیس کی خبریں' کے تحت آپ نے ایک خبر شائع کی ہے جس کا عنوان "روپے کا نیلام" ہے۔

حیدرآباد میں سب انسپکٹر پولیس کو جو سو روپیہ کا نوٹ ملا تھا، اس کا کوئی دعویٰ دار نہیں آیا، اِس لئے چھ ماہ بعد وہ نوٹ سرکاری خزانے میں تحصیل دار (تعلقہ مجسٹریٹ) کے ذریعے جمع کرانا ہوگا، کیوں کہ کرنسی نوٹوں جیسی چیزیں جن کی قیمت سرکار نے مقرر کر دی ہے۔ نیلام نہیں کی جاتیں۔ ایسی چیزیں براہِ راست سرکاری خزانے میں جمع کرا دی جاتی ہیں۔ مہاراشٹر میں یہ کارروائی بمبئی پولیس ایکٹ کی دفعہ ۸۲ کے

ت کی جاتی ہے۔ فاروق قادری، ستارہ، ناسک

جمالی صاحبہ:

اِس مرتبہ بانو مجھے پہلے سے بھی زیادہ ولولہ خیز اور زندگی کی جوت جگانے والا محسوس ہوا۔ "افتتاحیہ" "اِن سے ملئے" "آپ کی ذہنی اُلجھن اور اُس کا حل" "ذہنی تناؤ سے محفوظ رہیے" "بیوٹی کالج" — سب کے سب زندگی میں اُمنگ، جوشِ عمل اور حُسن پیدا کرنے کے کارگر نسخے ہیں۔ بہنوں کی اِس پُر خلوص خدمت پر آفریں! سلمہ انصاری، ناگپور

محترمہ زینت صاحبہ:

ستمبر کے بانو میں شہناز عشرت امیر کا مضمون "نئی دُلہن اور سسرال" پڑھ کر قلم اٹھانے کے لئے مجبور ہو گیا ہوں۔ ایک جگہ مصنفہ نے اِس بات پر بہت زور دیا ہے کہ بعض سسرال والے بہو کے جہیز کے سامان کو انتہائی بے پروائی اور بغیر اس کی اجازت کے استعمال کرتے ہیں جب کہ اُنہیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے — یہ حقیقت ہے کہ سسرال والے بہو کے سامان پر اپنا پورا حق سمجھنے لگتے ہیں۔ لیکن یہاں میں ایک اور بات کی طرف بھی توجہ دلانا چاہوں گا۔ میرے مشاہدے میں ایک بات یہ بھی آئی ہے کہ شادی سے پہلے (محض پبلسٹی کے طور پر) کہہ دیا جاتا ہے کہ فلاں چیز ہم نے بہو کے لئے رکھی ہے، لیکن شادی ہوتے ہی وہ تمام چیزیں جو بہو کے لئے رکھی جاتی ہیں، سسرال والوں کی ہو جاتی ہیں۔

سسرال والوں کا کہنا ہے کہ ہم اپنی بہو کو بیٹیوں کی طرح چاہتے اور رکھتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کیا اِسی کو کہتے ہیں بہو کو آرام اور سُکھ پہنچانا کہ بہو کی چیزوں پہ بیٹیاں قبضہ جمائیں اور گھر کی بہو تکلیفیں جھیلیں؛ شادی کے بعد جب لڑکی اپنے ماں باپ سے رخصت ہو کر سسرال آتی ہے تو اس کے دل میں بھی کچھ اُمیدیں، کچھ ارمان اور کچھ تصورات ہوتے ہیں۔ جن میں سے ایک یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کا شوہر اس کا اپنا ہوگا۔ اُس کا اپنا ایک گھر ہوگا جسے وہ اپنی مرضی سے سجائے گی، سنوارے گی، صاف ستھرا رکھے گی، وغیرہ۔

میرے خیال میں تو ہر لڑکی والے کو یہ بات شادی سے پہلے طے کر لینا چاہیئے کہ جو لوگ اُن کی بیٹی کو اپنی بیٹی بنا کر رکھنے کا دعویٰ کر رہے ہیں وہ حقیقت میں اپنے اِس فعل پر قائم رہیں گے یا اپنے بہو بیٹے کی چیزوں کو اپنی فیملی کے دیگر افراد کے حوالے کر دیں گے۔ اشفاق احمد، بودھن

آٹھ ہزار روپے کے نقد انعامات کی شاندار تقسیم!

شمع مِنی معمّہ نمبر ۱۶ میں تین صحیح آئے

صحیح حل شمع مِنی معمّہ نمبر ۱۶

■	ے	ت	ک	ب	¹بھ
⁵چ	■	ل	م	ہ	²م
ف	⁶ا	■	ت	س	³س
ر	گ	⁷ذ	■	ا	⁴ب
و	ل	ا	⁸ت	■	■
ن	ے	ت	ر	■	■

شمع مِنی معمّہ نمبر ۱۶ آسان ثابت ہوا اور تین پروانے بالکل درست حل تک پہنچ گئے۔ ان درست حلوں پر پہلا انعام مبلغ **پانچ ہزار روپے** تقسیم کیا گیا۔

شمع مِنی معموں کی تیز رفتاری بے مثال ہے۔ درست حل ظاہر کئے جانے کے چند ہی گھنٹوں میں چیکنگ ختم کر کے تقسیم انعامات کی تفصیلات کا اعلان کر دیا گیا۔ جن پروانوں نے صحیح حل منگانے کے لئے لفافے بھیجے تھے۔ انہیں تقسیم انعامات کی تفصیلات بھی لکھ دی گئیں۔ دوبارہ جانچ کے لئے کسی کلیم کا انتظار کئے بغیر ہی دوسرے انعام کے منی آرڈر بھیج دیے گئے۔

بالکل درست حل ۳ موصول ہوئے جن پر پہلا انعام مبلغ پانچ ہزار روپے بحساب ۱۶۶۶ روپے ۶۶ پیسے فی حل تقسیم کیا گیا:

۱۔ رحمت علی صاحب عُرف بھولا۔ سائیکل مستری، چھاؤنی بازار۔ بہرائچ

۲۔ غلام نبی بٹ صاحب۔ ٹیلر آف ٹیسٹ۔ مہاراجہ بازار۔ امیرا کدل، سری نگر

۳۔ بالو میاں صاحب۔ کٹ کوئیاں۔ رام پور

ایک غلطی والے ۷۰۸ حل موصول ہوئے جن پر دوسرا انعام مبلغ تین ہزار روپے بحساب ۴ روپے ۲۴ پیسے فی حل تقسیم کیا گیا

۱۔ رینو گوئل۔ شاہدرہ ۲۔ ایچ۔ سی۔ ودھوا، نئی دہلی ۳۔ بالومیاں، رام پور ۴۔ بالومیاں، رام پور ۵۔ بالومیاں، رام پور ۶۔ قمر علی، بریلی ۷۔ تہمینہ سلمان، دہلی ۸۔ مقبول الٰہی، دہلی ۹۔ سونیتا مالی، دہلی ۱۰۔ جگدیش کور، دہلی ۱۱۔ شمشاد علی، ڈونڈہ والا ۱۲۔ سونیتا مالی، دہلی ۱۳۔ عبدالحفیظ، پیلی بھیت ۱۴۔ شاہدہ پروین۔ رام پور ۱۵۔ یعقوب علی، شاہجہانپور ۱۶۔ ونیش راج، نئی دہلی ۱۷۔ ونی ایس، دہلی ۱۸۔ ونی ایس، نئی دہلی ۱۹۔ ایوب حسن، شاہجہانپور ۲۰۔ شاکر علی، امروہہ ۲۱۔ رحمان خاں، حیدرآباد ۲۲۔ وزیرہ بیگم، حیدرآباد ۲۳۔ نفیس الدین، دہلی ۲۴۔ ایس۔ ایم۔ ذاکر، دہلی ۲۵۔ محمد اکرم، مرادآباد ۲۶۔ محمد اکرم، مرادآباد ۲۷۔ محمد اکرم، مرادآباد ۲۸۔ محمد رفیع، دہلی ۲۹۔ شاکر علی، امروہہ ۳۰۔ محمد یوسف، رام پور ۳۱۔ انیل ککڑ، دہلی ۳۲۔ جے۔ اے۔ قریشی، شاہجہانپور ۳۳۔ امرنا تھ، نئی دہلی ۳۴۔ اوکنور، چنڈی گڑھ ۳۵۔ امیر احمد، بریلی ۳۶۔ جمال الدین، سکندرآباد ۳۷۔ شہزادی، چکردھرپور ۳۸۔ جمال الدین، سکندرآباد ۳۹۔ غلام دستگیر، کرنول، ۴۰۔ راشد علی، روڑکی ۴۱۔ جمیل احمد، سیوان ۴۲۔ سلیم خاں، سہارنپور ۴۳۔ صالحہ خاتون، جمشید پور ۴۴۔ رحیم اظہر، رام پور ۴۵۔ نواب اختر، سہارنپور ۴۶۔ عدیل احمد، پیلی بھیت ۴۷۔ محمد شفیع، سری نگر ۴۸۔ محمد یوسف، سری نگر ۴۹۔ محمد یوسف، سری نگر ۵۰۔ نگینہ بیگم، سلطان پور ۵۱۔ عبدالاحد، سری نگر ۵۲۔ عبدالصمد، علی گڑھ ۵۳۔ رحمت علی، بہرائچ ۵۴۔ رحمت علی، بہرائچ ۵۵۔ رحمت علی، بہرائچ ۵۶۔ ولی محمد، رنرمل ۵۷۔ عبدالرؤف، رانچی ۵۸۔ ایم۔ کے۔ انصاری، ہری پور

۵۔ ایم اسلم، سہارنپور ۶۰۔ علیم الدین، گمبھلی ۶۱۔ روشن تا بشی، نیموره ۶۲
ء اسماعیل، احمد آباد ۶۳۔ منوہر لال، فیروز پور ۶۴۔ عقیل احمد، الہ آباد ۶۵۔
رحمن ہوا انسنی ۶۶۔ شکنتلا چودھری، بلند شہر ۶۷۔ ایم سلیم، دھنسار ۶۸۔
صبیح الدین، گلبرگہ ۶۹۔ جسونت سنگھ، چنڈی گڑھ ۷۰۔ جسونت سنگھ، چنڈی گڑھ
۷۔ سعادت خاں، امراؤتی ۷۲۔ سردار محمد، اندور ۷۳۔ اتی احمد، بہرائچ ۷۴۔
سوریا رینڈی، کمال الدین پور ۷۵۔ محمد یعقوب، دہلی ۷۶۔ کشوری لال، پٹنہ
۷۷۔ غلام مصطفیٰ، سیوان ڈیہہ ۷۸۔ عبدالرزاق، باندہ ۷۹۔ مایا شنکر، راجپورہ
۸۰۔ مایا شنکر، راجپورہ ۸۱۔ احمد حسین، بمبئی ۸۲۔ سعید احمد، بمبئی ۸۳۔ عبدالحفیظ
بستی ۸۴۔ ایس، ایم، لوشہ، کٹھورہ ۸۵۔ شورشنت کمار، کرچنڈا ۸۶۔ آئی اے
پورنج، نئی دہلی ۸۷۔ ایس، ایم، علی، نئی دہلی۔

●●

☐ تمام حلوں کی جانچ نہایت احتیاط سے کی گئی ہے پھر بھی اگر آپ کو شبہ ہے کہ آپ کو کوئی انعام ملنا چاہئے تھا اور آپ کو ابھی تک منی آرڈر نہیں ملا تو دوبارہ جانچ کی فیس ایک روپیہ، منی آرڈر سے "شمع منی معمہ، ماہ نامہ شمع، آصف علی روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲" کو بھیج کر اس کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید یا ایک روپے کے ہمارے جاری کئے گئے نقد نامے کے ساتھ "کلیم سیکشن، شمع منی معمہ نمبر ۱۶۱۸ ماہ نامہ شمع، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲" کو اپنی شکایت لکھیں۔ ساتھ ہی یہ بھی تحریر کریں کہ آپ نے شمع منی معمہ نمبر ۱۶۱۸ کے کتنے حل بھیجے تھے، کس تاریخ کو بھیجے تھے۔ سادہ ڈاک سے، ریکارڈڈ ڈلیوری، رجسٹری سے بھیجے تھے یا دستی طور پر دفاتر شمع، نئی دہلی میں ڈالے تھے اور متعلقہ حل کی فیس کس نمبر کے منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا نقد نامے سے کس تاریخ کو بھیجی تھی اور تقسیم انعامات سے متعلق آپ کی شکایت کیا ہے۔ اگر آپ کی شکایت درست ہوئی تو آپ کو انعام میں حصہ دیا جائے گا اور دوبارہ جانچ کی فیس کا ایک روپیہ بھی واپس کر دیا جائے گا۔ اگر شکایت غلط ثابت ہوئی تو دوبارہ جانچ کی فیس واپس نہیں کی جائے گی۔ ہر حل کے بارے میں شکایت الگ آنی چاہئے اور اس کی فیس بھی الگ ادا کرنی ضروری ہے۔ اپنی شکایت میں یہ ضرور بتایئے کہ یہ اس حل کے بارے میں ہے۔ جس کی فیس . . . نمبر کے منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا نقد نامے کے ذریعے ادا کی گئی ہے۔ ایسی تمام شکایات ہمیں یکم مارچ ۱۹۷۷ تک مل جانی چاہئیں

☐

حوالے: منی معمہ نمبر ۱۶۱۸ کے اشارے جن کتب سے لئے گئے تھے ان کے نام یا ان کے قلم کاروں کے مختصر نام یہ ہیں: دائیں سے بائیں: ۱۔ عثمان ۲۔ سعید ۳۔ ناصر ۴۔ اقبال۔ اوپر سے نیچے: ۵۔ حسین ۶۔ مختار ۷۔ منوہر ۸۔ اسد

[redacted]



[redacted]

Rs. 8,000.00

آٹھ ہزار روپے کے نقد انعام

پہلا انعام بالکل درست حل پر: پانچ ہزار روپے۔ دوسرا انعام ایک غلطی والے حل پر: تین ہزار روپے

فیس داخلہ فی حل: ایک روپیہ۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ فیس داخلہ پوسٹل آرڈر، منی آرڈر یا شمع ادبی معموں کے نقدناموں کے ذریعے ادا کی جا سکتی ہے۔ نقدنامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانہ سے ملنے والی رسید اپنے حلوں کے ساتھ بھیجئے۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ ان کی فیس ایک ساتھ بھیج سکتے ہیں اور ہر حل پر علیحدہ انعام کے حق دار ہو سکتے ہیں۔ کوئی ٹوکن بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ٹوکن بھیجنے کی شرط کے علاوہ شمع ادبی معموں کی دوسری تمام شرائط شمع منی معموں پر بھی عاید ہیں۔ ان کی پابندی ضروری ہے۔

دفاتر شمع (نئی دہلی) میں ڈاک سے یا دستی حل وصول ہونے کی آخری تاریخ: ۲۶ مارچ ۱۹۷۷ء، ۸ بجے رات تک

شمع منی معمہ نمبر ۱۸

■	■	۴	۳	۲	۱ د
■	■	و	ا		
ا	۵	■		ت	ا
ک		۶	■	ی	و
س	ت		۷	■	ن
ن	ے	ا	ن	۸	■

اشارے

اوپر سے نیچے

۱۔ ___، مُرادول اور دوان خیرا توں کے بعد پٹپانے ایک کی بجائے دو بیٹوں کو جنم دیا لیکن ان میں سے ایک بچہ پیدائشی اندھا تھا

۲۔ عشق کی آگ ہمارے دلوں میں ___ ہے اور آہستہ آہستہ ہمارے وجود کو جلاتی جاتی ہے

۳۔ ___ میں آجانے کے بعد دشمن کو چھوڑ دینا اوّل درجے کی نادانی ہے

۴۔ روپیہ ___ ہر فساد کی جڑ ہے۔ لیکن اس کے نہ ہونے سے بھی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں

دائیں سے بائیں

۵۔ منزل کو ___ لینے والے وہی ہوتے ہیں جو راستے کی دشواریوں کو خاطر میں نہیں لاتے

۶۔ میں جانتی ہوں بغاوت کا شعلہ تمہارے دل میں ___ رہا ہے۔ جو ایک نہ ایک دن اس راج محل کو کھنڈر بنا دیگا

۷۔ پیدائش کے وقت کوئی کسی سے ___ نہیں ہوتا۔ خدا نے سب کو ایک جیسا بنایا ہے۔ انسان اپنے اعمال سے خود

۸۔ ہم کسی کے بارے میں کیوں باتیں ___۔ ہمیں اپنے کام بہت ہیں

شمع ادبی معمے (شمع منی معمہ نمبر ۱۸) ماہنامہ شمع، آصف علی روڈ، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

۲۹۔ مارچ کو رام نومی کی تعطیل ہوگی اس لئے شمع منی معمہ نمبر ۱۸ کا نتیجہ ۳۰۔ مارچ ۷۷ء کو صبح ساڑھے نو بجے ظاہر کیا جائے گا۔ صحیح حل اور انعام پانے والوں کے نام اپریل ۱۹۷۷ء کے "بانو" میں شائع کئے جائیں گے۔ انعام پانے والوں کی تفصیلات شمع: مئی ۱۹۷۷ء میں بھی شائع کی جا سکتی ہیں۔

شمع منی معمہ نمبر ۱۸

★ اب آپ ایک شمع ادبی معمہ اور دوسرے شمع ادبی معمے کے حل بھیجنے کے درمیان اپنے ادبی ذوق کی تسکین کر سکتے ہیں۔۔۔ منی معمہ کے ذریعے!

★ کوئی ٹوکن بھیجنے کی قید نہیں!

★ جتنے حل جی چاہے بھیجئے۔ اپنے تمام حلوں کی فیس ایک یا ایک سے زیادہ منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا نقدناموں سے بھیج سکتے ہیں

★ آپ ہر حل پر انعام کے حق دار بن سکتے ہیں

فیس داخلہ، فی حل صرف ایک روپیہ

★ صرف آٹھ اشارے

انعام پانا کس قدر آسان!

★ فیس داخلہ بھیجنے کے لئے شمع ادبی معموں کے نقدنامے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ یا پوسٹل آرڈر، منی آرڈر بھیجئے۔ اپنے حلوں کے ساتھ نقدنامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید ضرور بھیجئے۔

صحیح حل: جوابی لفافہ بھیج کر منگوا لیجئے یا پھر اگلے ماہنامہ "بانو" یا ماہنامہ "شمع" میں دیکھئے۔

★ منی معمہ نمبر ۱۸ کا نتیجہ اپریل ۱۹۷۷ء کے "بانو" میں اور مئی ۱۹۷۷ء کے شمع میں شائع کیا جائے گا

مارچ
۱۹۷۷

اشاعت ۲ اکتیس واں سال
[illegible]

نگراں : یوسف دہلوی
مدیر : زینت کوثر دہلوی
معاون مدیر : نعیم آزاد دہلوی
سعید دہلوی

[illegible]

انشائیہ

جب انسان بے تحاشا ترقی اور شہرت کی منزل
طے کرتا چلا جاتا ہے تو بعض اوقات وہ خدا کی دی ہوئی
شہرت، قیمت اور عزت کو اپنی جاگیر سمجھنے لگتا ہے۔ یہ
احساس اس کے اندر انا اور گھمنڈ پیدا کر دیتا ہے اور پھر وہ
مزید شہرت، دولت اور عزت حاصل کرنے کے لئے
جائز اور غیر جائز ہر قسم کے ہتھکنڈوں کے
استعمال سے بھی نہیں چوکتا۔ مگر یہ حقیقت [illegible]
اس طرح کے حربے استعمال کرنے سے کام یابی مل
بھی جائے تو یہ کام یابی عارضی ثابت ہو سکتی ہے
جس کا [illegible] ذلت اور ناکامی کی
صورت میں ہوتا ہے۔ اور جس وقت [illegible] بار مخالفت کی
ہوا چلتی ہے تو انسان کی زندگی بھر کی کمائی ہوئی
عزت اور شہرت منٹوں میں خاک میں مل جاتی ہے
اگر انسان شہرت کے نشے میں ڈوبنے کے بجائے
زندگی کے ہر شعبے میں [illegible]
اور انصاف کو اپنا نصب العین بنا لے تو
یقیناً اس کے قدم کام یابی کی بلندیوں کو چھوتے چلے
جائیں گے۔ پھر اس کی عزت و شہرت کی عمارت
مسمار کرنا کسی کے بس کی بات نہیں [illegible] رہے گی۔

عراق کی عورتیں

[illegible]

پانچ مستانی تھی۔ اس کو خوش کرنے کے لئے ہی [illegible]

[illegible] لگائے گئے تھے اور [illegible]

[illegible]

ہوتی ہے [illegible] ہے۔ [illegible]

میں ہندوستان کی کوئی بھی چیز [illegible] تھی

ہیں۔ صندل، ساج، کافور وغیرہ [illegible] انگریزی

ناموں کو [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

لاکھوں [illegible] ملک کی حکومت [illegible] ہے

حکومت [illegible] تعلیم [illegible] ہے اور [illegible]

[illegible]

[illegible]

ممالک اپنے یہاں کی عورتوں کی ترقی کر رہے ہیں

عراق میں [illegible] خاص طور سے عراقی عورتوں اور لڑکیوں کی طرح کا کام سونپا گیا ہے کہ [illegible] طالبات کو خصوصی تعلیم دے کر دیہاتی علاقوں میں بھیجا گیا ہے اس کے علاوہ کے ساتھ عراق کی [illegible] اور [illegible] آبادی میں [illegible] عورتوں کی [illegible] عراق کی نئی انقلابی حکومت نے اس بات کا اندازہ کر لیا تھا کہ [illegible] کسی ملک میں [illegible] انقلاب لانے کے لئے اس ملک کی خواتین کو تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر عراق میں [illegible] سال [illegible] تعلیم کے لئے خصوصی [illegible] جاتی ہے۔ تعلیم پر سرکاری [illegible] ملک [illegible]

[illegible]

[illegible]

عراقی [illegible]

[illegible]

اپنے [illegible] حاصل کرنے کے لئے [illegible] ہے

آج عراق کی [illegible] تعلیم کی [illegible]

[illegible]

[illegible]

آخری خط

خط جو آخری تمہاری طرف سے ملا ہے
تم نے لکھا ہے کہ اب [illegible]
جس سے بھی [illegible]
نام الفت میں [illegible]
کہتا اب ایسی محبت کے [illegible]
یہ محبت [illegible]
[illegible]
آئی تھی کل [illegible] تمہاری شادی کا پیغام
[illegible]
[illegible]
بات ایسی وہ کہیں [illegible]
[illegible]
بات [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
میرے والد [illegible]
[illegible] دل [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
اب [illegible]
اب [illegible]

[illegible]



[illegible] رفاقت

[illegible]
[illegible] ہے
[illegible] چاہت سے
[illegible] ہے
[illegible] ہے
[illegible]
[illegible] ہے
[illegible]
[illegible] ہے
[illegible] ہے
[illegible] جاتی ہے
[illegible] ہے
[illegible] ہے
[illegible] ہے

[illegible] رفاقت کی
[illegible] حاصل ہے
[illegible] ہے
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] کی
[illegible] کی
[illegible]
[illegible] سے
[illegible]
[illegible] ہے
[illegible] ہے

[illegible]





[illegible]
ہیں ... کام کرنے والوں کا ... ہے
... ہے۔ اگر ہوٹل ...
... سے واقف ہوتے ہیں ...
[illegible]
کی تعریف ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اگر ...
... ایک ... ہی خط ... نہیں
لکھتے۔ ایسے تمام خطوط ایک کاغذ پر اتار لیے
جاتے ہیں۔ ان کی سائیکلوسٹائل کاپیاں تیار
کی جاتی ہیں اور ہوٹل کے تمام اشاعات میں بانٹ
دی جاتی ہیں۔ اس طرح محنت سے کام کرنے
والے آدمی کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ تمام
اسٹاف اس کو رشک کی نظر سے دیکھتا ہے۔
اگر ملازم صحیح کام نہ کرے اور اس کی رپورٹ
... ہو تو ابتدائی تین ہفتے میں اس کو
جواب دے دیا جاتا ہے۔

... کا خیال ہے کہ اگر کوئی انسان
کام نہ سیکھنا چاہے تو دوسرا اس کو سکھا ہی نہیں
سکتا۔ دراصل ہر انسان خود ہی سیکھتا ہے۔ ہوٹل
میں ... پڑھتے گئے۔ ...
کام کرنے والے کی ترقی کے نشان ہوتے ہیں۔
اسسٹنٹ اسٹیورڈ کے بعد ...
... گیا۔ اس کے بعد وہ کیپٹن بن گئی۔ یہ
سب ہوٹل کی ملازمت کے درجے ہیں۔ کیپٹن
کے بعد ... اور پھر منیجر کا عہدہ ملتا ہے۔
کیپٹن کا کام ہوٹل میں کام کرنے والوں کی دیکھ
بھال کرنا ہے۔ ریستوران میں کھانے پینے کی
چیزوں کی ... ہوتی ہے۔ کام کرنے والے بھی
[illegible]
... ہے۔ ریستوران
... چیزوں کی چوری کا کوئی خطرہ
[illegible]
... ہے کہ اگر کوئی ملازم ...

[illegible]
کھانا ... جب ...
[illegible]
... آرام سے ...
کرنے والے کو ... کی ضرورت نہیں پڑے
گی۔ بعض ہوشیار لوگ ایک ایک درجن ۱۲
انڈوں کا آملیٹ کھا جاتے ہیں۔ اس چوری
کا کوئی حساب نہیں ہوتا۔ اگر کوئی مہمان ریستوران
میں کسی چیز کو ناپسند کر دے تو اس کو ... پھینک
دیا یا ضائع کر دی جاتی ہے ...
دی جاتی ہے یا ملازم خود ہضم کر جاتے ہیں۔
ریستورانوں میں پھلوں ...
دن استعمال نہیں کئے جاتے۔ بچا ہوا ...
میں بہا دیا جاتا ہے۔ دوسرے دن تازہ ...
کئے جاتے ہیں۔ ان سب باتوں کا ذکر ...
ضروری ہوتا ہے۔

... نے چند ہفتے روم سروس کے شعبے
میں بھی کام کیا۔ اس ہوٹل میں ۲۰۰ کمرے ہیں
ہوٹل میں رہنے والوں کی عادتیں مختلف ہوتی ہیں
کوئی صبح کو ۶ بجے چائے پینا چاہتا ہے، کوئی ۸
بجے۔ کوئی ... چائے مانگتا ہے کوئی تیز۔ کوئی
... مانگتا ہے تو کوئی ...
ہوتے ناشتے کی ... نہیں ہوتی ہیں۔ کوئی
... منٹ تک ... مانگتا ہے تو
کوئی مختلف منٹ تک ...
[illegible]

[illegible]
حالات کی ...
پھر بھی ... جاتی ہے۔ ملازم ...
میں جاتے اور ... آتے ہیں ...
گئے ہیں۔ اگر ...
اس سے جواب طلب ہو سکتا ہے۔ ...
[illegible]
اشتہار ...
جائے۔ اگر کوئی ...
ہے تو روم سروس والوں کی شامت آ جاتی ہے
ان کو ... آدمیوں ...
ہیں یہ لوگ ...
رہتے ہیں۔ یہ ... بہت ... ہوتے ہیں۔
ہوٹل والے قدرتی طور پر ... امیر ... کی
زیادہ ناز برداری کرتے ہیں۔

ریستوران میں ہر کام مشین سے ہوتا ہے
چھری کانٹے اور ... مشین سے صاف کئے
جاتے ہیں۔ اس کے باوجود ... کو صاف
کپڑے سے دوبارہ صاف کیا جاتا ہے ...
ایک وقت میں ...
[illegible]

[illegible]

[illegible] واسطہ [illegible] ہے [illegible] شاہانہ

کے [illegible] پاکستان [illegible]

[illegible] انہوں نے [illegible]

[illegible] انہوں نے کام میں مشغول

رکھیں۔ [illegible] کا ماحول بھی [illegible] تھے

[illegible] دیتا ہے۔ شاہانہ کی رائے میں یہ خواتین

ان کے کام کا ایک حصہ ہیں۔ [illegible]

کرنے والی گھران خواتین کے لئے تیار رہنا

چاہئے۔ بعض وقت ایسی پرکیوں کی کوششیں بھی

بے احتیاطی کی وجہ سے نقصان پہنچا سکتی ہے

اس لئے شروع سے ان کا جواب [illegible] کر

جا سکتا ہے۔

[illegible] ماں [illegible]

[illegible] جانے کی چھٹیاں اور [illegible]

[illegible] زندگی [illegible] جاتی ہے [illegible]

[illegible] کی کوشش سے صاف کئے جاتے ہیں۔ ان

[illegible] کی پالش ہوتی ہے اس کے

علاوہ [illegible] بیٹھے ہیں اور [illegible]

[illegible] ہوتی ہے [illegible]

[illegible]

ہو گا کہ وہ [illegible] شاہانہ کی [illegible]

سے پوچھتے ہیں۔ انہوں نے [illegible]

بھاگنے کے سلسلے [illegible] ہے کہا ہے

”دہ صاحب یہ ایک تاریخی اشارہ بن گیا ہے بتانا کی

کی کہانی نہیں“ یہاں ان کی عزت لفظ سے شہرت

ہو جاتی ہے۔ شاہانہ کے تجربے میں ایک بھی

غیر ملکی مہمان نے چھٹی بجا کر دوپٹہ کو نہیں ہلایا۔

وہ [illegible] اندر رہتے وقت اس بات کا خیال

رکھتے ہیں کہ وہ [illegible] کا احساس نہ ہو۔

شاہانہ امام پور کی رہنے والی ہیں۔ ان

کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم یوپی اور دہلی میں

ہوئی۔ لیکن ان کی زندگی کا بیشتر حصہ کشمیر میں

گزرا۔ انہوں نے پرائمری کی تعلیم سرینگر کے

سینٹ میری میں حاصل کی اور کچھ عرصے [illegible]

[illegible] میں بھی رہیں۔ کشمیری جاعت [illegible]

تک وہ کشمیر میں رہیں۔ وہاں سے انہوں نے

پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کیا — کالج میں وہ

اسٹوڈنٹس یونین کی صدر رہیں۔ کالج کی اسٹوڈنٹس

یونین کی صدر ہونا تو [illegible] سمجھی جاتی تھی۔

شاہانہ کو سکنڈ ائیر میں ہی یہ اعزاز حاصل ہو گیا۔

وہ [illegible] جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ

[illegible] ہے انہیں [illegible] زبان پر

[illegible] قدرت حاصل ہے [illegible]

[illegible] تعلیم کے دوران انہوں

[illegible]

[illegible] کی خاتون نے [illegible]

کی مدد سے ثابت کر دیا کہ ان کے آبائی سید دادا

میر لیسے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے

اس سے پتا چلا انہیں کشمیر کی شہریت مل گئی [illegible]

فوج میں ملازم تھے۔ ان کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔

جس سے بچوں کی تعلیم میں رکاوٹ پڑتی تھی۔

ان کے والد نے فیصلہ کیا کہ ان کے بیوی بچے [illegible]

جموں میں رہیں گے۔ انہوں نے وہاں اپنا ایک

مکان بھی بنا لیا۔

شاہانہ نے مغربی ممالک کی سیاحت بھی

کی ہے۔ وہ سات [illegible] یورپ گئی ہیں۔ یورپ

میں ان کا زیادہ وقت انگلینڈ میں گزرا۔ ان کے

ایک بھائی انگلینڈ میں رہتے ہیں۔ انگلینڈ کے علاوہ

انہوں نے بلجیم، جرمنی اور امریکہ کی بھی سیاحت

کی ہے۔ [illegible] ٹورزم کی ملازمت کے سلسلے

انہوں نے جاپان کی سیاحت بھی کی۔

شاہانہ نے ایم اے پاس کرنے کے بعد

آئی اے ایس کا امتحان دیا۔ کشمیر گورنمنٹ نے

انہیں اس امتحان کی تیاری کے لئے دو سو

روپے وظیفہ دیا۔ مگر شاہانہ اس امتحان میں

ناکام رہیں۔

شاہانہ کو [illegible] لباس پہننے کا شوق ہیں

[illegible] کا شوق نہیں۔ [illegible]

انہیں [illegible] کی [illegible] ہیں۔ [illegible]

[illegible]

شمع کشیدہ کاری



[illegible]

[illegible]

[illegible]



[illegible]

[illegible]

اندر گھس گیا۔

[illegible]

[illegible]

میری نگاہ [illegible] سامنے کی سیٹ پر بیٹھی

[illegible]

رہ گئی۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
ان دنوں سلیمن پھوپا بڑی دکھی تھیں۔ ان کے
نصیب شوہر نے ان کو طلاق دے دی تھی
اور بچے کو بھی ان سے چھین لیا تھا۔ سلیمن پھوپا
نے اپنی ساری ممتا میرے اوپر نچھاور کر دی
اور میں بھی اپنی ماں کی توجہ اس لئے کم پانے
لگی تھی کہ مجھ سے چھوٹے دو اور بچے ہو گئے
تھے۔ ان کی ممتا کو پا کر نہال ہو گئی ۔۔۔
اماں بے چاری کیا کرتیں۔ مجھے سنبھالتیں
یا میرے نئے بہن بھائیوں کو دیکھتیں۔ سلیمن
پھوپا کی میں ایسی عاشق ہوئی کہ رات کو
بھی ان کے پاس رہتی۔ اماں جان سوتے میں
مجھے اپنے بستر پر اٹھا لے جاتیں، لیکن رات
کو میں جب بھی میری آنکھ کھلتی، میں پھر
بھاگ کر سلیمن پھوپا کے پاس پہنچ جاتی۔ وہ
ہنس کر بڑے پیار سے مجھے چپٹا لیتیں
"آ گئیں میری بٹیا رانی" ... اور پھر
ان کی باریک آواز وہ منصور لوری گانے
لگتیں، جس کو سن کر میں پٹ سے سو جاتی۔
مجھے نہلانا، میرے کپڑے بدلنا، کنگھی
کر کے چٹیاں گوندھنا، یہ بٹا ٹبا کاجل لگانا،
کھلانا پلانا، سلانا، کہانیاں سنانا، باہر ٹہلانے
لے جانا، یہ سب ان ہی کے ذمے تھا۔
اماں میری طرف سے مطمئن اور بے فکر
ہو کر دوسرے بچوں میں لگ گئی تھیں۔
بڑے بھائی دوسرا ہا کے چھیڑتے:
"دیکھنا، یہ رہین کی [illegible]
[illegible] ہے"
"اندھیرے میں [illegible]"
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
سب [illegible] اور میرا
[illegible] کرتے تھے۔ میں کتنی بڑی ہو گئی
تھی، پھر بھی ان کی گود میں [illegible] رہتی۔ محرم
میں ماتم یا تعزیے کا جلوس دیکھنے کے
لئے میں ان ہی کے [illegible]
کے محلوں میں ان کی گود میں ہی چڑھ کر جایا
کرتی۔ وہ ہانپ جاتیں، تھک کے چور ہو جاتیں
مگر نہ میں ان کی گود سے اترتی، نہ وہ
مجھے اتارنے پر راضی ہوتیں۔ کوئی ٹوکتا
بھی "اے سلیمن بوا، پوری بیل کو لادے
گھوم رہی ہو۔ کلیجہ پھٹ جائے گا" تو
بہت برا مانتیں۔ "پھٹے منہ میرا کلیجہ، تم
کاہے کو فکر کرتی ہو۔ چلی آئیں موئی بٹیا کو
نظر لگانے والی"
گھر آ کر وہ میری نظر اتارتیں تو میں
[illegible]
[illegible] رہ جاتے۔ [illegible]
سلیمن پھوپا کو کتنا پیار تھا۔
بچپن چھوٹا [illegible] لگا پھر
بھی سلیمن پھوپا مجھ سے اتنی ہی قریب رہیں
میں پھر بھی ان کے ساتھ سوتی۔ فرق یہ
تھا کہ اب وہ میری [illegible] تھیں
اب بھی مجھے رات [illegible] آتی تو
وہ مجھے لوری سنانے لگتیں:
"چندن کا [illegible]
[illegible]
[illegible]
"واللہ [illegible]

[illegible]
[illegible]
سلیمن پھوپا نے [illegible]
دو شوہروں سے کر لیا [illegible]
دونوں نے [illegible] دے دی [illegible]
دی گئی کہ یہ بانجھ ہیں۔ مگر [illegible]
ہوئی تو [illegible] بچے [illegible]
بھر گئی۔ یہ شادی پانچ سال چلی۔ [illegible]
[illegible]
کا ایک اور عورت سے دل لگ گیا۔ [illegible]
برداشت نہ کر سکیں۔ جھگڑا [illegible]
طلاق دے دی، گھر سے نکال دیا۔ [illegible]
لیا۔ غم رسیدہ، ہاری، دھتکاری سلیمن [illegible]
گھر کا کام کاج کر کے پیٹ کا دوزخ [illegible]
رہی تھیں کہ [illegible]
[illegible] رکھ لیا۔ کھانا، کپڑا، تنخواہ [illegible]
[illegible]
کیا چاہیے تھا۔ [illegible]
[illegible]

[illegible]

پر چھا گیا [illegible]
[illegible] سفید قمیض [illegible]
ایک [illegible] ہوتے۔ [illegible]
کی خوب صورت گھڑی۔ سب ٹھٹک کر
رہ گئے۔

"کیا ہوا ۔ کلیم [illegible] آیا
ہوں؟" اس نے پوچھا۔

[illegible] برس کے اس فرق
میں اپنے پانچ سال کے [illegible] بیٹا تو پہچان لیا
تھا، پہچان لیا تھا۔ ایک بچہ [illegible]

"کلیم!"

"اماں!"

اور دونوں ماں بیٹے ایک دوسرے
میں سما گئے۔

اف! بے مروت، بے وفا سلیم بوا
ایک دم سب کچھ بھول گئیں۔ اپنے یہ
سولہ برس [illegible] کر یوں پھینکے جیسے اتنے
ڈھیرے دن ان کی زندگی سے ایک ہی
[illegible] گئے ہوں۔ انہوں نے تو اس
[illegible] کو بھی نہ اٹھایا [illegible] کے
ارد گرد [illegible]
[illegible]

[illegible]

پھر [illegible]
کیونکہ اس کی [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] یہاں آ پہنچا اور دو گھنٹے
کے بعد ہی [illegible] کر چلا جاتا۔

ان دو گھنٹوں میں بھی صرف ایک
دفعہ میرے پاس آئی تھیں۔ وہ بھی
جاتے وقت۔

"جا رہی ہوں بی بی! اللہ تم کو
خوش رکھے۔ . . ."

میں نے سوچا تھا شاید اب یہ کہیں گی
مجھے کسی منی بی بی کی طرح اپنی گود میں بٹھا لیں
گی، کیسے لاڈ سے کہیں گی "[illegible]
کیوں جاؤں اپنی بچی کو چھوڑ کر. . ."
مگر نہیں۔ بوا کی تو آنکھیں بھی جا رہی تھیں
کالا کلوٹا چہرہ [illegible] نظر آتا تھا،
[illegible] کی زیادتی اور خون کی [illegible]
سے [illegible] ہو گیا تھا۔

"جا رہی ہو بوا؟" [illegible] آواز
[illegible]

"ہاں بچی، اللہ [illegible]
[illegible] بہت بڑا آدمی ہو گیا ہے [illegible]
[illegible]

[illegible]
کلیم کی [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] بھی ہو گیا ہے۔

اور آج ——

برسوں کے بعد میں سلیم بوا کو پھر
دیکھ رہی تھی۔

نظر گھما کر ان کے [illegible]
نہیں [illegible] رہی تھی۔ [illegible]
[illegible] ہو چکا تھا [illegible]
سسکیاں بھر رہا تھا۔

اللہ! یہ بے مروت [illegible] بوا کبھی
کس چاؤ سے کہا کرتی تھیں: "بی بی! عمر یہاں
گزری، اب جو [illegible] ہے [illegible]
ان کی اللہ رکھے سسرال میں گزر جائے گی
[illegible] ان کے بچے [illegible] ہوں گے
آنکھوں کے تارے بنا کر رکھوں گی. . ."

اور اس وقت میں بھی سامنے تھی، میرے
دو لڑکے بچے بھی سامنے تھے، میرا بچہ پاس
[illegible] تھا اور سلیم بوا نے
ابھی ابھی [illegible] بہت ہی
خوب صورت [illegible] لیا تھا،
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

بھونک کی صدا آئی۔

"نرس مجھے کچھ پانی پلا دو۔"

ایک عورت کھینچ کر پانی کی بوتل تک پہنچی اور میرے پاس پہنچی، میری جان میں جان آگئی۔

"بہن بہت بہت شکریہ ..."

میں بھرائے گلے سے اتنا ہی کہہ سکی۔

"شکریہ کیسا بہن جی۔ مجھے جانا ہی تھا۔ میں نے نرس کے پاس سے پانی منگوایا۔ کوئی ساتھ میں نہیں ہے کیا؟"

"نہیں۔ میرے ہسبنڈ مجھے اسٹیشن پر مل جائیں گے۔ میں اپنے میکے سے آرہی ہوں!"

یہ بات میں نے ذرا اونچی آواز میں کہی — صرف سلیمی بیا کو سنانے کے لئے مگر وہ اسی طرح بے تعلق بنی کھڑکی سے باہر دیکھتی رہیں۔

بچے نے پھر کسمسا کر پیار سے دیکھا تھوڑی دیر پھر چپ ہوگیا۔

"اچھا آتی ہوں۔" وہ بھلی عورت مسکرا کر اپنی سیٹ پر جا بیٹھی۔

اسٹیشن آیا تو وہ اپنی سیٹ پر آ بیٹھی اور ان سے بات کرنے لگی۔ خوش ہو کر مجھ سے پوچھا۔

"تمہیں اب کیسا لگ رہا ہے؟"

[illegible]

[illegible]

نہا سکیں اب

مگر ان کا چہرہ سپاٹ تھا۔ چکنا سیاہ پتھر، جس پر کوئی جذبہ کبھی ٹھہرا ہی نہیں تھا۔ پتا نہیں۔ یہ جو کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھیں، وہ ان سے باتیں کر رہی تھیں۔

وہی آواز وہی لہجہ، ہر لفظ کا وہی مخصوص کھنچاؤ۔

میرا خشک ہونٹ پھڑکنے لگا تھا۔ میں نے اس کو زبان سے پھر تر کیا اور اس کے نرم نرم بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے غیر ارادی طور پر گنگنانے لگی۔

"چندا ماما سے پیارا، ریشم کی ڈوری جیسے میرا ننھا بیٹا ... "

اور یکایک ایک عجیب، بہت عجیب بات ہوئی۔

سلیمی بیا کے بے تعلق چہرے پر ایک چمک سی آئی — وہ کچھ لمحوں میرے چہرے سے ہوتی ہوئی پھر گم ہو گئی۔

میرا دل زور زور سے دھڑک اٹھا۔ لب کانپ رہے تھے۔ میں نے سوچا اب انہیں سلیمی بیا سے اب انہوں نے مجھ کو پہچان لیا ہے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

رہا بیچ کی [illegible]

تھی۔ [illegible]

سب کچھ [illegible]

تھی بیا تھا۔ [illegible]

سر کو جھٹکا اور ان کے [illegible]

تھی۔ جیسے [illegible]

سب کچھ بھول گئی۔ [illegible]

کا بہت [illegible]

بار بار [illegible]

میں آ کر [illegible]

[illegible]

[illegible]



[illegible]
[illegible] کوئی بھی ساتھی دوسرے [illegible]
تبدیلی کرنے کا منصب نہیں کر سکتا بنیادی
تبدیلی اندر سے ہی ہو سکتی ہے۔ اس طرح کوئی
بھی ساتھی کسی دوسرے کے سلوک کے
لئے پوری طرح ذمہ دار نہیں بن سکتا جس طرح
وہ اپنے سلوک کے لئے ہوتا ہے۔

(۴) سیکس (جنس) کو متوازن بنائیے

اس کا یہ مطلب نہیں کہ جسمانی تعلقات
اہمیت اور سنجیدگی کے ساتھ استوار رکھنے کے قابل نہیں۔
مگر اس کی اصل اہمیت اس بات میں ہے کہ یہ آپ
دونوں کی یکساں توجہ کے طلب گار ہیں۔ شادی
کے اس میدان میں جذبے کی بہت اہمیت ہے
اتنی ہی اہمیت خیال کی بھی ہے۔ سیکس کو ذہنی
اور جسمانی لطف اور آسودگی کا ذریعہ ہونا چاہئے
اس لئے دونوں فریقوں کے لئے لازم ہے کہ
سیکس کو قدرتی اور پُرمسرت بنائیں۔

(۵) پابندی کے بغیر رہئے

خود کو آزاد محسوس کیجئے اور اپنے جیون
ساتھی کو بھی یہ احساس دلائیے بہترین ازدواجی
زندگی پابندی یا بیڑی کبھی نہیں ہوتی۔ یہ کوئی
[illegible] فرض نہیں ہوتا۔ یہ جیل نہیں ہے، غلامی
نہیں ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ کوئی بھی
فریق دوسرے کو جکڑے نہیں۔

(۶) محبت بدلنے والی شے ہے

یہ بات معلوم [illegible] ہے لیکن [illegible]
[illegible] بات کو تسلیم [illegible]
[illegible] اصول کے مطابق محبت
[illegible]
بات ہی کیا سال [illegible]
میں نہیں رہ سکتی۔ اس امر کو قبول کیجئے زندگی
کامیاب رہے گی۔

(۷) بول سُن لیجئے

ایک دوسرے کی بات سنئیے۔ ایک
دوسرے سے باتیں کیا کیجئے۔ اگر کسی وجہ سے
آپ بہت غصے میں ہیں تو بھی اپنے شوہر یا بیوی
کے نام رقعہ لکھ دیجئے۔ (آپ کو حیرت ہوگی کہ
لکھ دینے کے بعد رقعہ دینے شوہر (یا بیوی) کو
دینے کی آپ کو خواہش ہی نہیں ہوگی) اگر آپ
دونوں میں کوئی بھی بات کرنے کو تیار نہیں تو
آپ اندر ہی اندر گھٹتے رہیں گے۔ یہ بھی تو
ممکن ہے کہ دوسرے کی بات ہی صحیح ہو کہنا
سننا فوراً اور پوری طرح بے تکلفی سے ہو جائے
تو کتنی ہی گتھیاں سلجھ جائیں۔

(۸) سکون حاصل کیجئے اور دیجئے

ایک اعتبار سے شادی ایک اسراری
کیفیت ہے۔ باہر کی دنیا کی تگ و دو سے فرار۔ لوگ توقع کرتے ہیں کہ ازدواجی زندگی
میں انہیں سکون ملے گا۔ ان کو باہر کے بوجھ
اور دباؤ سے راحت ملے گی لیکن سکون ا[illegible]
صحیح [illegible] مل سکتا ہے جب شریک حیات
اس سکون کا سرچشمہ بننے کو تیار ہو۔ [illegible]
کو اپنی بساط کے مطابق یہ سکون اور راحت
دینے کو اپنا فرض سمجھے [illegible]
[illegible] کے [illegible]
جانے سے پہلے۔

(۹) [illegible]

[illegible]
[illegible] کو اس [illegible]
[illegible] ساتھ [illegible]
ہوں، یعنی اس طرح رہیں جیسے ساتھ [illegible]
ہر مرد اور عورت کو اکثر ایک دوسرے کو
معاف کر دینا پڑتا ہے۔ ضبط کرنا پڑتا ہے جذبات
کو ضبط کرنا پڑتا ہے، آنسوؤں کو روکنا پڑتا
پڑتا ہے، زبان کو بند کرنا پڑتا ہے، ورنہ
ان کا ساتھ نہیں بنتا۔ اس کے بغیر چارہ نہیں۔
ازدواجی زندگی کو ایسا ہی نظریہ کامیاب بناتا
ہے۔ ہر مرد اور ہر عورت کو بعض لمحوں میں ایسے
ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے جس کے دل میں
اس کے لئے دلچسپی، تعلق خاطر اور ہمدردی ہو۔
محبت میں جو [illegible] اس [illegible] کو خوب سمجھتے
ہیں، جب کہ شادی شدہ جوڑے اکثر اس بات کو
بھول جاتے ہیں۔

(۱۰) دوسرے کی خلوت کا بھی احترام کیجئے

شوہر اور بیوی کو ایک دوسرے کی خلوت
کے لمحوں میں مسلسل خلل انداز ہونے سے گریز کرنا
چاہئے۔ ہم سب کو خلوت کی [illegible]
ہوتی ہے [illegible] صرف جسمانی خلوت [illegible]
ذہنی اور روحانی خلوت (تنہائی) کی بھی۔ جو
شوہر (یا بیوی) اس بات کو نظر انداز کرتے
ہیں [illegible] ازدواجی زندگی کو [illegible]
کا نقصان [illegible] اہمیت کو سمجھئے اور
اس معاملے میں دوسرے کی [illegible]
کرنے کو تیار ہو [illegible]
بانٹا جیت [illegible] ہے۔

ممتا



شبینہ امام

یہ سب ان کے ساتھ ساتھ چلتا رہا [illegible]

[illegible]

سوچا تھا کہ خاندان سے اور خاص طور پر ماں سے اس قدر الگ ہو جائے گی۔

مہینے کا آخری ہفتہ چل رہا ہے۔ امی کی اور ارشد کی تنخواہ ختم ہونے کو ہے۔ ارشد پچھلے کئی مہینے سے اس شہر میں نہیں ہے۔ اس کا ٹرانسفر ہو گیا ہے۔ لیکن وہ خود اسکول کی وجہ سے ارشد کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی ——

پچھلے چند مہینوں میں اس نے بڑی دقت سے کچھ پیسے جمع بھی کئے تھے۔ مگر وہ سب بے بی کی بیماری کا میں اب تک خرچ ہو چکے ہیں۔ پھر ماں کے پاس آنے جانے میں، اور وہاں رہنے میں کچھ خرچ تو ہوتا ہی ہے۔ ویسے خرچ کرنا ضروری نہیں ہے۔ پھر بھی اتنے لوگوں کی نگاہوں کو برداشت کرنا بھی تو قیامت سے کم نہیں۔

جمیلہ کی آنکھوں کے سامنے دھند کی ایک تہہ جم جاتی ہے۔ اس دھند کی چادر کے اس پار اسے ایک چھوٹی سی لڑکی نظر آنے لگتی ہے —— چنچل، الھڑ اور شوخ سی۔ پڑھنے میں بھی تیز۔

ایوب چچا اکثر اس کے گھر آیا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ ان کا بیٹا بھی آتا تھا۔ جمیلہ اور وہ دونوں خوب گھل مل گئے۔ عمر کے بڑھنے کے ساتھ پتہ نہیں کب یہ دوستی پیار میں بدل گئی۔ ابا نے جمیلہ کو آگے پڑھانا چاہا، مگر یہ پیار تھا جو اس جیسی ہونہار لڑکی کی ذہانت کو گھن کی طرح چاٹ گیا تھا۔

ارشد کے ساتھ اس کی کھلی آزادی ماں نے کبھی پسند نہیں کی اور پھر شاید ابا کو بھی اسی کا اندیشہ تھا۔ ارشد سے شادی کے تصور تک ابا بھی نہیں پہنچے تھے۔ لیکن حالات کچھ اس طرح سے بگڑتے چلے گئے کہ ابا کو مجبور ہو جانا پڑا تھا۔

جب سے ہی کشمکش کی زندگی شروع ہو گئی تھی۔ کیسی پٹی نوکری کرتا ہوا ارشد پریشان ہوا تھا تو جمیلہ نے بھی ایک اسکول میں نوکری کر لی ——

یوں تو تنخواہ دونوں کو ملتی ہے۔ مگر بڑھتی ہوئی مہنگائی اور تین بچوں کا ساتھ...

جب اس نے پہلے بچے کو جنم دیا تھا تو ماں خود کو نہیں روک سکی تھی۔ ڈھیر سارا سامان بھیج دیا تھا۔ دوسرے بچے کی پیدائش پر بھائی دیکھنے آیا تھا۔ اور تیسرے کے وقت اس کی لوٹتی ہوئی صحت کی خبر سن کر ماں خود آ گئی تھی —— اور پھر ماں کے ساتھ اسے بھی اپنے مائیکے جانا پڑا تھا۔ اور وہاں ڈھیر سارے سوالات اور تجسس آمیز نگاہوں کا اس نے سامنا کیا تھا۔ ابا اسے دیکھ کر کتنے اداس ہو گئے تھے۔ چھوٹی بہنوں کی شادیاں اچھے گھروں میں ہوئی ہیں۔ وہ کافی خوش حال ہیں۔ مگر جمیلہ اپنی حالت ماں سے کسی بھی طرح نہیں چھپا سکی تھی۔ ماں کی آنکھوں میں تیرتے تجربے کا سامنا کرنا مشکل ہوتا ہے!

دوسری بار بھتیجے کے عقیقہ پر بھائی خود لینے آئے تھے۔ مہینوں کے جمع کئے ہوئے پیسوں سے وہ اپنی سمجھ کے مطابق اچھے کپڑے خرید کر لے گئی تھی۔ لیکن چھوٹی بہنوں نے جب بیڈ شیٹ اسے دکھا دیا تو اسے اپنے لائے ہوئے کپڑے بے حد گھٹیا لگے۔ وہ اپنے بکس سے کپڑے نکال کر لوگوں کی نگاہیں بچاتے ہوئے ماں کے حوالے کر آئی۔ ماں کی آنکھوں میں خوشی کی جگہ ایک تحیر دوڑتی نظر آئی۔ "کیوں لائی یہ سب تو؟ کیا ضرورت تھی؟"

چلتے وقت جب اس نے چھوٹی بہن کو اپنی بچیوں کے ایک دو پرانے کپڑے اس کی بے بی کے لئے اس کے بکس میں ڈال رہی تھی تو وہ کٹ کر رہ گئی۔

تیسری بار وہ چھوٹے بھائی کی شادی پر گئی تو سب کچھ خوشی خوشی ختم ہو گیا اور وہ جلد ہی وہاں سے روانہ ہو گئی۔ ماں نے سب کو دکھا کر اسے جو کچھ بھی دیا، وہ دیا ہی، لوگوں کی نظریں بچا کر الگ سے ایک بنڈل بھی اس کے حوالے کر دیا تھا۔ اور وہ عجیب طرح کے احساس سے گڑ کر رہ گئی تھی۔ اور لوٹ کر اس نے سوچا تھا کہ ماں کا دیا ہوا بنڈل وہ کبھی نہیں کھولے گی اور آئندہ اس طرح کی چیزیں وہ نہیں لے گی۔

لیکن بے بی کی طویل بیماری نے اس کے ارادے کو ڈانواں ڈول کر دیا ہے۔

ٹہلتے ٹہلتے رک کر اس نے بے بی کے جسم پر ہاتھ پھیرا تھا تو اسے ایسا لگتا ہے جیسے اس نے انگارے کو چھو لیا ہو۔ وہ کئی لمحے تک بے بی کو دیکھتی رہتی ہے، پھر اٹھ کر الماری کے پاس جاتی ہے۔ الماری میں سے ماں کا دیا ہوا بنڈل نکالتی ہے اور اسے کھول کر دیکھتی ہے۔ سب سے اوپر ایک لفافے میں اسے کئی ہرے نوٹ جھانکتے نظر آتے ہیں۔

ایک نوٹ کھینچ کر وہ جھٹکے سے بے بی کو گود میں اٹھا لیتی ہے اور سیڑھیاں اترنے لگتی ہے —— ڈاکٹر کے پاس جانے کے لئے۔

وہ یہ بھی فیصلہ کر لیتی ہے کہ اب وہ ماں کو جواب دے سکے گی کہ اس سے ملنے کے لئے وہ بھی آنے کی ضد کرے گی۔ ●●

"آج آئیں گے سجن"



آج آئیں گے مرے گھر میرے سپنوں کے سجن
آؤ سکھیو مجھے جلدی سے بنا دو دلہن
آج آئیں گے سجن

چاند سے کہہ دو مجھے چاندنی اپنی دے دے
کہہ دو سورج سے کہ رخشندگی اپنی دے دے
صبح رنگیں سے کہو دلکشی اپنی دے دے
مانگ کر لاؤ چمن سے گل و لالہ کی پھبن
آؤ سکھیو مجھے جلدی سے بنا دو دلہن
آج آئیں گے سجن

میرے عارض کے لیے چاند کے جلوے لاؤ
میری زلفوں میں سجانے کو ستارے لاؤ
کاجل آنکھوں کے لیے ایسا کہیں سے لاؤ
مجھ پہ سو جان سے ہو جائیں فدا میرے سجن
آؤ سکھیو مجھے جلدی سے بنا دو دلہن
آج آئیں گے سجن

سرخی لالہ کی ہاتھوں میں رچا دو مہندی
شفق شام کی ہونٹوں پہ لگا دو لالی
کہکشاں سے کرو تزئیں مرے رخساروں کی
[illegible] کی قسم [illegible] کرن
آؤ سکھیو مجھے جلدی سے بنا دو دلہن
آج آئیں گے سجن

[illegible] میری پیشانی کر دو
مانگ میں [illegible] افشاں بھر دو
[illegible] سے جادو بھر دو
[illegible] سے کر دو آراستہ ملبوس بدن
آؤ سکھیو مجھے جلدی سے بنا دو دلہن
آج آئیں گے سجن

جاؤ شبنم کی خنک تاب طراوت لاؤ
تازگی پھولوں کی غنچوں کی لطافت لاؤ
سبزہ و سنبل و ریحاں کی نزاکت لاؤ
ہو سکے تم سے تو لے آؤ یہیں سارا چمن
آؤ سکھیو مجھے جلدی سے بنا دو دلہن
آج آئیں گے سجن

جب وہ آئیں گے تو کچھ دیر ستاؤں گی انہیں
حسن کے ناز و ادا خوب دکھاؤں گی انہیں
گر خفا ہوں گے تو جلدی سے مناؤں گی انہیں
اُن کی بانہوں میں سمٹ جاؤں گی پھر ہو کے مگن
آؤ سکھیو مجھے جلدی سے بنا دو دلہن
آج آئیں گے سجن

فیاض حسن تاندوی

میں اتحاد ہو جائے تاکہ جنگ کا خطرہ ہمیشہ کے لئے ٹل جائے۔ اس لئے اس نے اپنی جوانی اور حسن کی بازی لگا دی۔

قیصر روم جولیس سیزر جب مصر کے دورے پر آیا تو قلوپطرہ نے اسے اپنے حسن کے جال میں پھنسانے کا تہیہ کر لیا۔ قیصر اپنے کیمپ میں تھا کسی کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں تھی، قلوپطرہ کو ایک انوکھی ترکیب سوجھی۔ اس نے اپنے ایک غلام کو حکم دیا کہ وہ اسے ایک قالین میں لپیٹ لے اور قیصر کے سامنے وہ قالین پیش کر دے۔ یہ انوکھی ترکیب کارگر ہوئی۔ غلام یہ قالین بادشاہ کی نذر کرنے کے لئے قیصر کے دربار میں پہنچا۔ نہایت ڈرامائی انداز میں اس نے قالین کھولنا شروع کیا۔ قالین کی تہیں کھلتی گئیں۔ آخری تہہ میں سے ایک خوب صورت جوان اور نیم عریاں عورت نکلی۔ یہ قلوپطرہ تھی۔ قیصر اور اس کے صلاح کار حیران رہ گئے۔ دربار میں پیش ہونے کا یہ انداز قیصر کو پسند آیا۔ قیصر بوڑھا ہو چکا تھا۔ اسے مرگی کے دورے پڑتے تھے۔ قلوپطرہ نے اسے اپنی محبت کا یقین دلایا۔ اس کی بہت خاطر مدارات کی۔ قیصر اس کی باتوں میں آگیا۔

قلوپطرہ اس طرح روم پہنچ گئی۔ اس نے قیصر سے شادی کر لی۔ شادی کے سال بھر بعد اس کے یہاں ایک بچہ پیدا ہوا۔ قلوپطرہ کا دنیا کی حکومت حاصل کرنے کا خواب اب پورا ہونے کے قریب تھا۔ وہ روم کی ملکہ تھی۔ اس کا بیٹا روم کے تخت کا آئندہ وارث بننے والا تھا لیکن اس کا یہ خواب پورا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ روم میں انقلاب آگیا۔ روم کے لوگ جمہوریت پسند تھے۔ قیصر نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا۔ روم کے لوگوں کو یہ بات پسند نہیں تھی۔ ایک روز قیصر

کے دوستوں نے ہی اس کو محل کی سیڑھیوں پر قتل کر دیا۔ قلوپطرہ کو جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ وہ اپنے بیٹے کو لے کر مصر واپس پہنچ گئی۔

قلوپطرہ کا خواب چکنا چور ہو چکا تھا لیکن وہ آسانی سے ہار ماننے والی عورت نہیں تھی۔ روم میں بادشاہت کے دو امیدوار تھے۔ ایک آکٹے ویان، جو سابق قیصر کا عزیز تھا اور دوسرا مارک انطونی جو قیصر کا دوست تھا۔ ان دونوں دعوے داروں میں اقتدار کے لئے کھینچا تانی ہو رہی تھی۔ قلوپطرہ کے لئے ان میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ اس نے انطونی کو چنا۔ انطونی خوب صورت تھا، بہادر تھا۔ وہ ایک قابل جرنیل تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ اس اقتدار کی جنگ میں کامیاب ہو جائے۔ اس طرح قلوپطرہ کھوئی ہوئی بازی جیت سکتی تھی۔

انطونی جب تارسس کے جزیرے میں پہنچا تو اس نے قلوپطرہ کے دربار میں اپنا سفیر بھیجا اور اُسے ملاقات کی دعوت دی۔ قلوپطرہ کو جس موقع کا انتظار تھا وہ آگیا۔ اس نے دودھ اور عطر میں غسل کیا۔ بدن پر طرح طرح کی خوشبوئیں لگائیں۔ نیم عریاں لباس پہنا زیورات سے جسم کو آراستہ کیا۔ پھر اپنی خادماؤں کے جھرمٹ میں ایک جہاز میں بیٹھ کر انطونی سے ملنے گئی۔ انطونی نے اس طلسم ہوش ربا کو دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ قلوپطرہ نے اس کو اپنے جہاز پر آنے کی دعوت دی۔ انطونی بے خودی کے عالم میں اس کے جہاز پر چڑھا۔ وہ ایک ہی نگاہ میں قلوپطرہ کے حسن کا شکار ہو گیا۔

قلوپطرہ اور انطونی [illegible] دیکھتے ہے۔ انطونی اس [illegible] تھا۔ قلوپطرہ کے سامنے ایک نہایت [illegible]

[illegible] قیصر روم کو شکست دے کر اس کے بیٹے کو روم کے تخت پر بٹھانے کا انطونی اس بات کے لئے نیم راضی ہو گیا۔ اس نے مفصل بات چیت کے لئے دوبارہ ملنے کا وعدہ کیا، اور روم واپس چلا گیا۔

جب انطونی دوبارہ مصر پہنچا تو قلوپطرہ نے اسکندریہ میں اس کا استقبال کیا۔ یہ استقبال اتنا شاندار تھا کہ انطونی کے گزشتہ دور کی دھوم دھام اس کے سامنے ماند پڑ گئی۔ قلوپطرہ نے انطونی کی خاطر میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ انطونی بھی سب کچھ بھول کر اس کی زلفوں میں کھو گیا۔ وہ اسکندریہ میں کافی عرصہ رہا۔ اس دوران قلوپطرہ کے یہاں جڑواں بچے پیدا ہوئے۔ اس نے لڑکے کا نام سورج رکھا اور لڑکی کا چاند۔ وہ چاہتی تھی کہ انطونی روم کا تخت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے اور اسے اپنی ملکہ بنا لے۔ اس طرح وہ ایک شاہی خاندان کی داغ بیل ڈالنا چاہتی تھی۔ ادھر انطونی مصر میں قلوپطرہ کے ساتھ رنگ رلیوں میں مصروف تھا۔ اُدھر آکٹے ویان روم میں اپنی حکومت مضبوط بنا رہا تھا۔ روم انطونی کی بیوی فولویا سارے حالات سے باخبر تھی۔ اس نے ایک جنگی بیڑا جمع کیا، اور آکٹے ویان سے جنگ لڑنے کے لئے تیار ہو گئی مگر لڑائی میں وہ آکٹے ویان سے ہار گئی اور [illegible] یونان میں [illegible]

انطونی کو جب اس شکست کی خبر ملی تو وہ [illegible]

ہے اس کی کل دولت چار سال تک جنگ
قلوپطرہ نے یہ چار سال تنہائی
کے عالم میں گزارے۔ اس نے سنا کہ انطونی
کی بیوی فلویا یونان میں چل بسی پھر خبر آئی
کہ انطونی اور آکٹیوین میں صلح ہو گئی یہی نہیں
بلکہ انطونی نے آکٹیوین کی سوتیلی بہن آکٹیویا
سے شادی بھی کر لی۔ قلوپطرہ کی نظر میں یہ سراسر
بے وفائی تھی۔ وہ یہ خبر سن کر ہوش کھو بیٹھی،
ڈاکٹروں نے بڑی مشکل سے اس کی جان
بچائی۔ جب وہ اپنی بیماری سے صحت یاب ہو گئی
تو سب کچھ بھول کر مصر کو مضبوط بنانے کی
کوشش میں جُٹ گئی۔

کچھ عرصے کے بعد انطونی اور آکٹیوین
میں پھر ناچاقی ہو گئی۔ انطونی نے روم کو خیرباد
کہہ دیا۔ اور یونان چلا گیا، یونان اس کو راس
آ گیا۔ وہاں لوگوں نے اس کا شاندار استقبال کیا
انطونی کو خیال آیا کہ کیوں نہ ایران پر حملہ کیا
جائے۔ اس کا خیال تھا کہ ایران کی فتح سے
اس کی ہر دل عزیزی میں اضافہ ہو گا۔ اس
نے اپنی بیوی کو روم بھیج دیا اور جنگی تیاریوں
میں مشغول ہو گیا۔ جنگ کے لئے روپیہ درکار
تھا۔ روپے کا خیال آتے ہی اسے قلوپطرہ
کا دھیان آیا۔ اگر وہ اس کی مدد کے لئے راضی
ہو جائے تو مصر کی دولت اس کے قدموں میں
ہو گی۔ انطونی اپنی فوج لے کر شام پہنچ گیا اور
وہاں اس نے جنگی چھاؤنی ڈال دی۔ پھر اس نے
قلوپطرہ کو پیغام بھیجا کہ وہ انطاکیہ میں اس سے
ملے۔ قلوپطرہ اب وہ قلوپطرہ نہیں تھی
وہ ۳۳ سال کی تھی۔ اس کے مزاج میں سنجیدگی
آ گئی تھی۔ اس نے جلد بازی نہیں دکھائی

اس نے انطونی سے ملنے کے کچھ شرائط رکھیں
پہلی شرط یہ تھی کہ انطونی اس سے شادی کرے
دوسری یہ کہ وہ قلوپطرہ کے پہلے بچے کو جو
قیصر روم کا بیٹا تھا، مصر کا بادشاہ تسلیم
کرے۔ اس کے علاوہ شام، لبنان، اور
فلسطین کا علاقہ مصر کے تحت سمجھا جائے اگر
انطونی ان شرائط کو مان لے تو وہ مصر کی دولت
جنگ کے اخراجات کے لئے پیش کر سکتی ہے
انطونی کو ان شرائط کے ماننے کے سوا
کوئی چارہ نہ تھا۔ قلوپطرہ بڑی شان و شوکت
سے انطاکیہ پہنچی۔ وہاں دونوں نے معاہدے
پر دستخط کئے۔ معاہدے کے تین روز بعد
دونوں کی شادی ہو گئی۔ اس طرح انطونی
سے قلوپطرہ کے دونوں بچے جائز قرار دئے
گئے۔ قلوپطرہ نے اس شادی کی یادگار میں
سکے ڈھلوائے، جن پر دونوں کی تصویریں
نقش تھیں۔

شادی سے فارغ ہوتے ہی انطونی جنگی
تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ اب اس کی سپاہ
کی تعداد ایک لاکھ تھی جس میں ساٹھ ہزار رومن فوج
تھی۔ وہ بڑی شان و شوکت سے فوج لے کر ایران
کی طرف روانہ ہوا۔ قلوپطرہ دریائے فرات تک اسے
چھوڑنے آئی اور فلسطین کے راستے سے مصر
واپس روانہ ہو گئی۔ اسکندریہ پہنچ کر اسے معلوم
ہوا کہ اس کے یہاں بچہ پیدا ہونے والا ہے،
وہ انطونی کے بچے اور اس کی فتح کی خوشخبری
کا بے چینی سے انتظار کرنے لگی۔ کچھ مدت بعد
اسے انطونی کی خبر ملی، مگر وہ فتح کی نہیں شکست
کی تھی۔ انطونی کو ایران میں خوفناک شکست
کا سامنا پڑا۔ اس کی ساری فوج تباہ ہو گئی
چوبیس ہزار آدمی ہلاک ہو گئے۔ انطونی بے سروسامانی

کی حالت میں انطاکیہ پہنچا اور قلوپطرہ کو بلانے
کے قاصد روانہ کر دئے۔ اس کی حالت دیوانوں
کی سی تھی۔ وہ بے تحاشا شراب پیتا تھا، اور
افق کی طرف نظریں دوڑاتا تھا کہ کب اسے قلوپطرہ
کا ارغوانی بادبانوں والا جہاز سمندر میں آتا دکھائی
دے۔ آخر قلوپطرہ آ پہنچی۔ اس نے انطونی کو
ڈھارس دی۔ اسے مشورہ دیا کہ وہ ایران کا
خیال چھوڑ دے اور روم کی حکومت پر قبضہ
کرنے کا منصوبہ بنائے۔ اس اثنا میں انطونی
کو یہ خبر ملی کہ اس کی بیوی آکٹیویا روم سے جنگی
جہاز اور ساز و سامان لے کر یونان پہنچ گئی ہے
آکٹیویا نے انطونی کو پیغام بھیجا کہ وہ ایران پر
دوبارہ چڑھائی کرے اور اپنی پچھلی شکست کا
داغ مٹا دے۔ وہ سپاہیوں اور ساز و سامان
سے اس کی مدد کرے گی۔ اس طرح انطونی کی
دونوں بیویاں اس کو مخالف سمت میں پیش قدمی کے
لئے اکسا رہی تھیں۔ اس رسہ کشی میں قلوپطرہ کو
کامیابی ہوئی، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ انطونی کے
ساتھ تھی اور رات دن اسے روم پر حملہ کرنے کے
لئے ورغلاتی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے یہ کہہ کر
انطونی کے کان بھی بھرے کہ اس کی پہلی بیوی آکٹیویا
آخر آکٹیوین کی بہن ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اپنی
بہن کے ذریعے انطونی کو ایران کی طرف جبراً
پیش قدمی اور تباہی کے راستے پر لے جا رہا ہو
الغرض میدان قلوپطرہ کے ہاتھ رہا۔ انطونی نے
آکٹیویا کو کہلا بھیجا کہ وہ روم واپس چلی جائے اور
خود جنگی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔

ادھر آکٹیوین نے روم میں اپنا اقتدار
جما لیا تھا۔ اس کی عمر ۳۷ سال تھی۔ اس کے
سامنے صرف ایک رکاوٹ تھی اور وہ انطونی کی
شخصیت تھی۔ وہ اس کانٹے کو راستے سے ہٹانا

چاہتا تھا۔ اس نے روم میں انطونی کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ رومی غیر ملکیوں سے تعصب رکھتے تھے۔ اس نے روم کے شہریوں کے دل میں یہ بات بٹھا دی کہ انطونی ایک غیر ملکی ملکہ کو روم پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی رومن بیوی کو چھوڑ کر ایک فاحشہ کے ساتھ زندگی گزار رہا ہے۔ انطونی نے یہ کہہ کر جوابی حملہ کیا کہ آکٹےوین اوباشوں کی زندگی گزار رہا ہے۔ یہ زبانی جنگ کچھ دنوں تک چلتی رہی۔ انطونی مصر میں داد عیش دے رہا تھا۔ وہ شراب کے جام پر جام لنڈھاتا اور ناچ رنگ سے لطف اندوز ہوتا۔ وہ جنگ سے جی چراتا تھا۔ قلوپطرہ کو اس کے جاسوسوں نے خبر دی کہ انطونی خفیہ طور پر آکٹےوین سے صلح کی بات چیت کر رہا ہے۔ انطونی کی عمر ۵۰ سال تھی وہ بوڑھا ہو چلا تھا۔ وہ اکثر اپنی پہلی بیوی کو خط لکھتا اور اُسے آکٹےوین سے صلح کی بات چیت کرنے پر مجبور کرتا۔ قلوپطرہ کے لئے یہ دوغلی پالیسی روح فرسا تھی۔ آکٹےوین نے روم کے شہریوں کو یقین دلایا کہ انطونی ہوش و حواس کھو بیٹھا ہے، اور قلوپطرہ کے عشق میں دیوانہ ہو چکا ہے اسی طرح الزاموں اور جوابی الزاموں کا دور جاری رہا۔ آخر تنگ آکر آکٹےوین نے اعلان جنگ کر دیا قلوپطرہ کو جس فیصلہ کن گھڑی کا انتظار رہتا وہ آگئی۔

یہ فیصلہ کن جنگ یونان کے سمندر میں ہوئی۔ یہ لڑائی در اصل مشرق اور مغرب کی لڑائی تھی۔ اگر قلوپطرہ کو اس جنگ میں فتح نصیب ہوتی تو دنیا کی تاریخ مختلف ہوتی، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ اس جنگ میں ہار گئی۔ اس کا جنگی بیڑا تباہ ہو کر اسکندریہ پہنچا۔ انطونی نے جب قلوپطرہ کو پسپا ہوتے دیکھا تو وہ بھی ایک کشتی میں بیٹھ کر اس کے جہاز تک پہنچ گیا۔ قلوپطرہ نے اس کو اپنے جہاز میں جگہ دی۔ دونوں خاموش تھے۔ اُن کے خواب مسمار ہو چکے تھے۔ روم کا غضب ان پر نازل ہونے والا تھا۔ انطونی اپنا سر پکڑے بیٹھا تھا۔ دونوں مل کر دنیا کی بادشاہت کا خواب دیکھتے تھے، اب بادشاہت کے بدلے انہیں ذلت اور رسوائی کا سامنا کرنا تھا۔

اب اس ڈرامے کے آخری سین کی تیاری ہو رہی تھی۔ آکٹےوین نے قلوپطرہ کو ایک خفیہ پیغام بھیجا کہ وہ اب بھی مصر پر حکومت کر سکتی ہے مگر اس کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ انطونی کو قتل کر دے۔ قلوپطرہ نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ در اصل وہ سمجھتی تھی کہ اس طرح آکٹےوین انطونی کو راستے سے ہٹانا چاہتا ہے واقعہ بھی یہی تھا۔ آکٹےوین قلوپطرہ کو دھوکے سے گرفتار کرنا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ قلوپطرہ کو روم کے بازاروں میں جلوس کی شکل میں لے جائے اور سارا روم اس کی ہنسی اڑائے۔ وہ ایک قیدی کی طرح اس کی تشہیر کرنا چاہتا تھا اس کے بعد وہ اُسے قتل کرا دیتا قلوپطرہ اتنی بے وقوف نہیں تھی کہ اس کے دام میں آجاتی۔ قلوپطرہ کے انکار پر آکٹےوین نے اسکندریہ پر حملہ کر دیا، اور مصر پر قبضہ کر لیا اب قلوپطرہ کے لئے کوئی جائے پناہ نہیں تھی؛ انطونی اس سے دور ایک خفیہ پناہ گاہ میں چھپا بیٹھا تھا۔ وہاں ایک مخبر نے خبر دی، کہ قلوپطرہ کو قتل کر دیا گیا ہے۔ یہ سنتے ہی انطونی کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ اس نے اپنا خنجر اپنے پیٹ میں بھونک لیا، بعد میں معلوم ہوا کہ یہ اطلاع غلط تھی اور قلوپطرہ [illegible] کو حکم دیا کہ وہ اسے فوراً قلوپطرہ کے پاس لے جائیں جب وہ اس کے پاس پہنچا تو قلوپطرہ نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ انطونی نے مرتے مرتے اس کو سمجھایا کہ وہ اب بھی آکٹےوین سے صلح کر لے تھوڑی دیر میں انطونی اپنے زخم کی تاب نہ لاکر چل بسا دونوں نے دنیا کی حکومت کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ آج مردہ انطونی اس کی گود میں لیٹا ہوا تھا اور خود اس کی جان خطرے میں تھی۔

آکٹےوین نے جب انطونی کی موت کی خبر سنی تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے قلوپطرہ کو اتنی مہلت دی کہ وہ انطونی کی تدفین سے فارغ ہو جائے۔ قلوپطرہ انطونی کے دفن سے فارغ ہو کر اپنے مقبرہ میں چلی گئی۔ یہ مقبرہ اس نے اپنے لئے بنوایا تھا۔ آکٹےوین نے اسے پیغام بھیجا کہ وہ اس سے ملنا چاہتا ہے۔ قلوپطرہ ٹال مٹول کرنے لگی۔ اسے معلوم تھا کہ آکٹےوین اسے قیدی بنا کر روم لے جانا چاہتا ہے۔ جب آکٹےوین نے ملنے کے لئے اصرار کیا تو قلوپطرہ مجبوراً راضی ہو گئی۔ اس نے اپنی خادماؤں کو حکم دیا کہ وہ اسے بنا سنوار کر دلہن بنائیں۔ اس کے بعد اس نے اپنے ایک وفادار خادم کو اشارہ کیا۔ وہ ایک باسکٹ لے کر آپہنچا۔ قلوپطرہ نے باسکٹ کا ڈھکنا اٹھایا اس میں ایک چھوٹا سا سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ یہ افعی تھا جس کا کاٹا پانی بھی نہیں مانگتا، قلوپطرہ نے اپنا ہاتھ سانپ کی طرف بڑھا دیا۔ سانپ نے اسے ڈس لیا اور وہ چند سیکنڈ میں ہی ڈھیر ہو گئی۔ آکٹےوین جب وہاں پہنچا تو اسے قلوپطرہ کی کاسنی رنگ کی لاش ملی۔ موت کے وقت اس کی عمر ۳۹ برس تھی۔

ممتا کی خوشبو

قمر جہاں



گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے پکارا
"ممی [illegible] سے چلاتی ہوئی آئی [illegible]"

بے بی کی آواز سن کر بوا جو باورچی خانے میں کام کر رہی تھی، بڑبڑاتی ہوئی باہر آئی اور لگی بے بی کو سمجھانے "دیکھو بیٹا کتنی بار منع کیا کہ اچھے بچے اس طرح نہیں چیخا کرتے ہیں۔ تم تو جانتی ہو کہ ممی اس وقت گھر میں نہیں ہوتیں، پھر تم نے اس طرح ممی ممی کی رٹ کیوں لگا رکھی ہے؟"

یہ کہہ کر بوا باورچی خانے میں پلٹی اور نعمت خانہ سے کھانے کی پلیٹ نکال کر بے بی کے سامنے رکھتے ہوئے بولی: "ممی نے کہا تھا کہ کھانا کھا کر کہیں جانا۔"

بے بی اسکول سے بے حد خوش خوش گھر آئی تھی، لیکن گھر میں ممی کو نہ پا کر اس کا مونہہ لٹک گیا۔ اس کی بھوک بھی ختم ہو گئی۔ سامنے کھانے کی پلیٹ دیکھ کر بھی اس کا دل کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے خاموشی سے پلیٹ اٹھائی اور دوبارہ نعمت خانے میں رکھ دی۔ بوا پھر اپنے کام میں لگ چکی تھی۔ اس نے دھیان بھی نہیں دیا اور بے بی چپ چاپ اپنے کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گئی۔

آج اسکول میں وہ بے حد خوش تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ جلد چھٹی ہو اور وہ گھر جا کر ممی سے لپٹ جائے اور اسے یہ خوش خبری سنائے کہ وہ اپنے کلاس میں فرسٹ آئی ہے۔ لیکن گھر پہنچ کر تو اسے ایسا لگا جیسے دوڑتے دوڑتے وہ اچانک کسی شے سے ٹکرائی ہے اور ٹکرا کے مونہہ کے بل زمین پر گر پڑی ہے، اچھال کوئی اسے اٹھانے والا بھی نہیں ہے، کوئی یہ پوچھنے والا بھی نہیں ہے کہ بے بی تم [illegible] اس [illegible] تمہاری تیز آواز اچانک کہاں کھو گئی؟ تم تو تتلی کی طرح چہک رہی تھیں۔ یہ اچانک تم اس قدر سنجیدہ اتنی گمبھیر کیوں ہو گئیں؟ بس ایک بوا ہے جو اب اتنی بوڑھی ہو چکی ہے کہ جو کچھ وہ کر لیتی ہے وہی غنیمت ہے۔ اسے اتنی فرصت اور اتنی سمجھ کہاں ہے کہ وہ اس کے جذبات کے اتار چڑھاؤ کو سمجھ سکے۔ اور پھر وہ تو بوا! جب ممی ہی ان باتوں کو نہیں سمجھ سکیں تو بوا سے تو شکایت ہی فضول ہے... بے بی جو اب بے بی نہیں گیارہ سال کی ہوش مند بچی تھی طرح طرح کے خیالات میں الجھی رہی۔

بستر پر بھی اسے سکون نہیں ملا تو وہ پھر باہر نکل آئی۔ گھر میں ہر طرف سناٹا تھا۔ صرف کچن سے بوا کے برتن دھونے کی آواز بار بار آ رہی تھی اور ساتھ ہی نل سے پانی گرنے کی ٹپ ٹپ آواز۔ اور یہی آوازیں گھر کے اس پُر سکوت ماحول میں زندگی کی علامتیں پیش کر رہی تھیں، ورنہ اس گھر میں اس وقت زندگی کا احساس

ننھے دل کا ہم کی کوئی چیز نہ تھی۔

بے بی کی طبیعت اس پُرسکوت ماحول سے گھبرانے لگی تو وہ دل بہلانے کی خاطر اپنی سہیلی رُکمنی کے گھر چلی گئی۔ رُکمنی کھانا کھا کر ابھی ہاتھ دھو ہی رہی تھی۔ اس کی ماں آنگن میں جاتی ہوئی ڈھلتی دھوپ میں بیٹھی رُکمنی کی چھوٹی بہن کے سر میں کنگھا کر رہی تھی۔ رُکمنی کو کھانے سے فارغ ہوتے دیکھ کر بولی: "آ بیٹی تیرے سر میں بھی تیل ڈال دوں۔ کیسے خراب ہو رہے ہیں تیرے بال۔"

بے بی یہ سوچ کر گئی تھی کہ تھوڑی دیر رُکمنی کے ساتھ کیرم کھیلا جائے گا لیکن رُکمنی کو ماں کے پاس جاتے دیکھ کر اس نے اپنے دل کی بات دل ہی میں رکھ لی اور اُداسی سے رُکمنی اور اس کی ماں کی طرف دیکھنے لگی ——— اچانک اسے خیال آیا کہ اس کے بال بھی تو خشک ہو رہے ہیں لیکن کون ہے جو اس کے سر میں اتنے پیار سے تیل لگائے۔ اس کی ماں کو فرصت ہی کہاں ہوتی ہے۔ وہ بے چاری تو بے ناشتہ اور ٹفن ہی مشکل سے دے پاتی ہیں۔ ایک لمحے کے لیے اسے اپنی ماں پر ترس بھی آیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے سوچا کہ وہ بے کار ہی پیدا ہوئی ایسے گھر میں ——— اور یہ سوچ کر وہ اور بھی مضمحل ہو گئی۔

رُکمنی کی ماں نے اسے اُداس دیکھ کر پوچھا: "کیوں بے بی، اب تک ماں نہیں آئی ہیں؟"

"نہیں چاچی۔" اس نے مختصر سا جواب دیا اور بوجھل دل کے ساتھ وہاں سے لوٹ آئی۔

اپنے گھر میں پہنچ کر پھر وہی خاموشی اور دم گھٹا دینے والی فضا اسے اپنے چاروں طرف محسوس ہوئی ——— رُکمنی کے گھر جا کر اس کے دل کا بوجھ کم ہونے کی بجائے اور بڑھ گیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں جا کر دوبارہ بستر پر لیٹ گئی اور اپنے دل کا اضطراب کو کم کرنے کے لیے میز پر سے کوئی رسالہ اٹھا کر الٹ پلٹ کرنے لگی لیکن دل پڑھنے میں بھی نہیں لگ رہا تھا۔

اس نے گھڑی کی طرف دیکھا ——— "ابھی تو پونے چار ہی ہوئے ہیں۔ ابھی تو ممی کے آنے میں سوا گھنٹہ باقی ہے ——— اور پاپا بھی تو چھ سے پہلے نہیں آتے ہیں۔" اس نے اُداس ہوتے ہوئے سوچا اور گھبرا کر بُوا کو آواز دی: "بُوا میرے سر میں درد ہو رہا ہے، ذرا میرا سر داب دو۔"

لیکن بُوا کو کام ختم کرنے کی جلدی تھی، بولی "اچھا بٹیا آتی ہوں۔" اور جلدی جلدی اپنا کام پورا کرنے لگی۔

بے بی پھر خیالوں کی دنیا میں بھٹکنے لگی۔ اسے بچپن کی باتیں یاد آ رہی تھیں ——— ممی کہتی ہیں کہ میں نے انہیں بچپن میں بہت پریشان کیا ہے۔ جب میں چھوٹی تھی تو انہیں چھوڑنا بالکل ہی پسند نہ کرتی تھی۔ ان کا کالج جانا بھی مشکل تھا۔ کالج جانے سے پہلے وہ کتنی ہی دیر تک مجھ سے الگ ہونے کے لیے پینترے آزماتی رہتیں۔ کبھی رکشا آنے سے پہلے ہی مجھے بُوا کے ساتھ کسی دکان پر ٹافی خریدنے بھیج دیتیں، کبھی پاپا مجھے گود میں لے کر ڈرائنگ روم میں چلے جاتے اور کبھی اگر وقت کم ہوتا اور ممی جلدی میں ہوتیں تو پھر میں روتا اور چلاتا رہتا چھوڑ کر ہی ان کو چلا جانا پڑتا۔ اور میں دیر تک زمین پر پیر پٹک پٹک کر رویا کرتی اور اپنے شور سے پورے گھر کو سر پر اٹھا لیتی۔ کبھی پاپا ڈانٹتے اور کبھی بُوا بہلاتی۔ اور جب ممی گھر آتیں تو میں خوب تالیاں بجا بجا کر ان کا استقبال کرتی اور اپنی توتلی زبان میں "مم ——— ممی آ ——— گئیں" کا گیت گایا کرتی۔

بھولی بسری باتیں یاد کرتے کرتے نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ اچانک باہر ممی کے گرجنے کی آواز آنے لگی۔

"بُوا! آخر آپ کیا کرتی رہیں۔ بے بی نے کھانا بھی نہیں کھایا اور آپ نے کوئی دھیان نہیں دیا۔ میں آپ کو ماں کی طرح سمجھتی ہوں اور آپ ہیں کہ میری بچی کا خیال تک نہیں رکھتیں۔ مجھے اپنے لیے کچھ نہیں چاہئے، لیکن آپ کم از کم میری بچی کا تو خیال رکھئے۔" ممی غصے سے تلملا رہی تھیں۔

بے بی کی نیند ٹوٹ چکی تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ ابھی جا کر ممی کے گلے میں باہیں ڈال دے اور کہے:

"میری پیاری ممی، قصور بُوا کا نہیں ہے، بلکہ آپ کی بیٹی کا ہے، جس کا دل اس گھر میں بُوا کو نہیں، آپ کو ڈھونڈتا ہے۔"

■■

فارم نمبر ۴
رجسٹریشن آف نیوز پیپرز رولز ۱۹۵۶ء

۱۔ مقام اشاعت: دفتر شمع آصف علی روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
۲۔ وقفۂ اشاعت: ماہانہ
۳۔ طابع و ناشر: ایم یونس دہلوی
قومیت: ہندوستانی
۵۔ مدیرہ: زینت کوثر دہلوی
قومیت: ہندوستانی
۶۔ ملکیت: شمع میگزین

[illegible]



کیا آپ نے بیمہ ایجنٹ سے
رابطہ پیدا کیا ہے۔ ایل آئی سی کی نئی پیشکش
تین وفادار پالیسیوں کے سلسلہ میں
منی بیک پالیسی
کیش اینڈ کوور پالیسی
ہر پانچ سال پر ادائیگیوں کی گارنٹی دی جاتی ہے اور کل رقم بیمہ پر بونس بھی ملے گا۔ ساتھ ہی زندگی بھر سلامتی بھی ملے گی۔
پروگریسیو پروٹیکشن پالیسی
ایک مقررہ مدت پر پالیسی کی رقم میں اضافہ ہوگا اور اس کے لیے نئے پروپوزل یا ڈاکٹری معائنہ کی ضرورت نہیں
وقت بدل رہا ہے۔ ضرورتیں بدل رہی ہیں
لائف انشورنس کارپوریشن آف انڈیا



جلیس سہسوانی

اورنگ زیب کی نورِ نظر
زیب النساء مخفی

کتابی چہرہ، دل کش صورت، موزوں
قامت، حسین خدوخال، مسکراتی آنکھیں،
ارغوانی ہونٹ، رخساروں پر وہ سیاہ تل، جو خوب
صورتی میں مزید اضافہ کرتے تھے۔ نام زیب النساء
بیگم بنت اورنگ زیب۔ تخلص مخفی۔

یہ نیک سیرت، بلند اخلاق اور بلند کردار
خاتون ماہ شوال ۱۰۴۸ھ میں دلرس بانو دختر شاہ
نواز خان کے بطن سے پیدا ہوئی۔ [illegible]
میانی کے سپرد کی گئی [illegible]
[illegible]
میاں [illegible]
ہونے کے [illegible]
[illegible]

النساء کو اپنے پاس بٹھاتی تھی۔ زیب النساء بہت ہی
ذوق شوق سے اس کی تلاوت سنتی۔ اس تلاوت
کے سحر نے اس پر ایسا اثر کیا کہ اسے چھوٹی عمر میں ہی
قرآن پاک پڑھنے کا شوق ہو گیا اور اس نے چھ سات
سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کر لیا۔ اس حیرت انگیز
کارنامے میں زیب النساء کی ذہانت اور معلمہ حافظہ
مریم زیب النساء کی کاوش اور لگن دونوں کو دخل
تھا۔ اس موقع پر اورنگ زیب کی مسرت کی انتہا نہ تھی

اس نے اس مسرت سے سرشار ہو کر ساری افواج
اور غرباء کو پر تکلف کھانا کھلایا اور انھیں بیش بہا
انعامات سے نوازا۔ تیس ہزار اشرفیاں حافظہ مریم کو
نذرانے کے طور پر شاہی خزانہ سے عطا فرمائیں۔

اب زیب النساء کی ذہانت نے اورنگ
زیب کو اس کے لیے مزید معلم رکھنے پر مجبور کر دیا۔ اکیس
سال کی عمر میں اس نے فارسی اور عربی کتب کے علاوہ
حدیث، ہیئت اور دوسرے کئی علوم میں کمال
حاصل کر لیا تھا۔ ہیئت کی طرف اس کا رجحان طبعی
نسبتاً زیادہ تھا۔ اسی لیے وہ مباحثے کے اوقات
میں اجرام فلکی کی ماہیئت و تشریح پر مدلل بحث
کر کے ہم جلیس عورتوں کو خاموش اور اپنا ہم خیال
[illegible] کر دیا کرتی تھی۔ اس کی تعلیم و تربیت میں [illegible]

ایران کا رہنے والا ہی حقند تھا۔ اس کے اساتذہ میں ملا اشرف شاعر بھی تھے۔ شہزادی کو خود بھی شاعری سے فطرتاً گہرا شغف اور دلچسپی تھی۔ اس نے عربی ادب کی تکمیل کے بعد اُس کا ذہن عربی شاعری کی طرف مائل ہو گیا۔ اُس نے پہلی نظم عربی میں حمد کہی تھی جب اُس نے یہ نظم کہی تھی تو اتفاق سے اُس وقت دہلی میں مدینہ منورہ کا ایک عربی ادیب موجود تھا۔ وہ نظم اُس ادیب کو دکھائی گئی۔ اُس نے کہا: بلاشبہ یہ نظم لاجواب ہے لیکن اس کا تخلیق کار ہندی نژاد ہے۔ اس لیے محاورات اور نشستِ الفاظ میں کہیں کہیں لغزش ہو گئی ہے۔ پھر بھی یہ نظم اپنے تخلیق کار کی علمی و ادبی ذہانت کا ثبوت ہے۔ اُس ادیب کی رائے حوصلہ افزا تھی۔ پھر بھی زیب النساء نے یہ احساس کر کے کہ کامیابی اپنی ہی زبان میں ہے، عربی شاعری کو خیرباد کہہ دیا اور اپنی ساری شاعرانہ صلاحیتیں مادری زبان فارسی پر مرکوز کر دیں۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوتی لیکن اُس کی شاعری کو پھلنے پھولنے کا زیادہ موقع نہ ملا کیوں کہ اورنگ زیب کو شاعری سے رغبت نہ تھی۔ نہ وہ شعر کہنا پسند کرتا تھا، نہ اشعار سننا۔ اس لیے اُس کے دربار میں کوئی بھی شاعر نہ تھا اور اگر کوئی پہلا شاعر دربار سے وابستہ تھا بھی تو وہ کس مپرسی سے گھبرا کر روپوش ہو گیا، جو باقی رہ گئے مصلحتاً خاموش رہے۔ اسی لیے زیب النساء بھی اپنے باپ کے خوف سے دل میں شاعری کے جذبات دبائے خاموش رہی۔ ویسے وہ تیرہ چودہ سال کی عمر میں ہی شعر کہنے لگی تھی۔ جو کچھ زبان پر آتا وہ اپنی بیاض میں لکھ لیتی تاکہ اورنگ زیب کی نظر نہ پڑ جائے۔

ایک دن ملا اشرف نے اس کی بیاض دیکھ کر سبحان اللہ کی صدائیں بلند کیں اور اس کے شعروں پر نظرثانی شروع کر دی۔ اس حوصلہ افزائی سے زیب النساء کے دل و دماغ پر گہرا اثر ہوا اور وہ اپنا کلام بغرض اصلاح ملا اشرف کو دکھانے لگی۔ اب اُس کی شاعری کے چرچے رفتہ رفتہ محلوں میں ہونے لگے۔ جو شاعر خاموش تھے وہ جانتے تھے کہ اگر کسی طرح اُن کے کلام کی رسائی شہزادی زیب النساء تک ہو جائے اور انہیں شرفِ قبولیت کا درجہ حاصل ہو جائے۔ شعرا کو کوئی درخواست بھی کرنا ہوتی تو وہ نظم میں پیش کرتے۔ ملا اشرف کو بھی وطن کی یاد نے ستایا تو یہ اشعار لکھ کر شہزادی کی خدمت میں پیش کر دیے:

یک بار ز وطن نتواں برگرفت دل
در غربتم اگرچہ فزوں است اعتبار
پیش تو قرب و بُعد تفاوت نمی کند
گر خدمتِ حضور نباشد مرا شعار
نسبت بجز باطنی است چہ دہلی چہ اصفہان
دل پیش تست من چہ بکابل چہ قندہار

اسی طرح نعمت علی خان عالی جو عہدِ زیب النساء میں ایک بلند مرتبہ شاعر تھا، ایک رُباعی لکھ کر شہزادی زیب النساء کی خدمت میں پیش کر کے اپنی مفلسی دور کرنے میں کامیاب ہوا۔ خواصوں نے شاعروں سے اشعار لکھوا کر اپنے قصور معاف کرائے۔ زیب النساء کے دل میں شاعروں کی اور ان کی شاعری کی عظمت کا جذبہ بھرپور پنہاں تھا۔ اسی لیے بڑے بڑے قصور محض قصائد لکھنے پر معاف کر دیا کرتی تھی۔ اگرچہ اورنگ زیب نے محل میں آزادی کو داخل نہ ہونے دیا تھا، کسی کو عام کتابیں پڑھنے کی اجازت نہ تھی، لیکن زیب النساء کو مطالعہ کی اجازت تھی۔ اسی اجازت کی آڑ میں وہ دیوانِ حافظ بھی دیکھ لیتی تھی اور کبھی کبھی علمی مباحثے میں اورنگ زیب سے گفتگو کرتی تو وہ اس کے مدلل جوابات سن کر ششدر رہ جاتا۔ اس کی عقل مندی کی وجہ سے اورنگ زیب اسے بہت زیادہ مانتا تھا۔ اُس نے [illegible] کو ختم کر دیا تھا۔ حالانکہ [illegible] شوق تھا اور اورنگ زیب بھی سُنی تھا لیکن اورنگ زیب کا جھکاؤ [illegible] شیعہ تھا۔

پھر ایک دور وہ آیا جب زیب النساء کی ذی فہم اور دانشمند شخصیت کو کسی سیاست کے فریب نے جکڑ لیا اور وہ قلعہ سلیم گڑھ میں قلعہ کی پشت پر قید کر دی گئی۔ ۱۰۹۱ھ میں راجپوتوں سے مغلوں کی لڑائی ہوئی تو اورنگ زیب نے شہزادہ اکبر کو ان کی پیش قدمی روکنے اور راجپوتوں کو سزا دینے کے لئے بھیجا لیکن پیش قدمی روکنے کی بجائے شہزادہ راجپوتوں کی باتوں میں آ کر اُن سے مل گیا اور باپ سے منحرف ہو گیا اور اتنا منحرف ہوا کہ لشکرِ شاہی کے مقابلے پر آ گیا۔ اس عالم سرکشی میں اورنگ زیب کو طیش آنا یقینی تھا۔ باپ بیٹے کے اس تعلق کے باوجود زیب النساء اور اکبر کی خط و کتابت جاری رہی۔ حالانکہ خط و کتابت [illegible] کی بہت کم ہی ہوئی تھی لیکن شہزادی کو محض اس جرم کے ارتکاب پر ایک سال تک قید کے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد شہزادی زیب النساء کو اس کی ایک عزیزہ کی موت کی تعزیت کے لئے محل میں بلایا گیا اور [illegible] کی شادی تک وہ وہیں رہی۔ اس وقت اُس نے یہ شعر کہے تھے:

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] از جیب رسد دست [illegible]
[illegible] دست بدامن شد
[illegible]

زیب النساء انتہائی خوش خلق اور مخلص تھی۔ غصّہ اس کی پیشانی پر شکن نہیں ڈال سکتا تھا۔ دہلی کے ایک مشاعرہ کے مصرع طرح پر اس نے یوں مصرع لگایا تھا:

مصرع طرح:
دُرِ ابلق کسے کم دیدہ موجود
مصرع ثانی
مگر اشکِ بتانِ سرمہ آلود

ایک دن صبح کے وقت زیب النساء مصروفِ سیرِ چمن تھی اور موسمِ بہار سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چہل قدمی کرتی ہوئی جب چشمے کے کنارے پہنچی تو دلکش منظر کی کیفیت نے اُسے بے خود کر دیا اور اُس کی زبان سے یہ شعر نکل گیا:

چہار چیز ز غم دل برد کدام چہار
شراب و سبزہ و آبِ رواں و روئے نگار

اچانک اورنگ زیب بھی اُدھر آ گیا۔ پوچھا۔
"بیٹی کیا شعر پڑھ رہی ہو؟"
عرض کیا: قبلہ و کعبہ یہ پڑھ رہی تھی:

چہار چیز ز غم دل برد کدام چہار
نماز و روزہ و تسبیح و توبہ استغفار

یہ سُن کر اورنگ زیب بہت مسرور و شادماں ہوا۔

زیب النساء سادگی پسند تھی۔ سفید سادہ لباس اور سادہ زندگی اُسے بہت عزیز تھی۔ اُسے تصنیف و تالیف کا بہت شوق تھا۔ اس نے بہت سے [illegible] کو تصنیف و تالیف [illegible] "تفسیر کبیر" کا [illegible] فارسی ترجمہ [illegible] زیب النساء کی تصنیفات [illegible] کے نام سے ایک کتاب لکھی گئی تھی۔ اسی زمانے میں ایک کتب خانہ بھی قائم کیا گیا تھا جس میں گراں قدر کتابوں کا ذخیرہ موجود تھا۔ شہزادی زیب النساء کی تصنیفات میں دیوانِ مخفی بھی ہے۔ بعض مورخ لوگ کسی اور کا دیوان کہتے ہیں۔ انگریز مورخین نے تو عاقل خاں اور زیب النساء کے معاشقے کی داستانیں بھی لکھی ہیں اور کہا ہے کہ زیب النساء نے عاقل خاں کی محبت میں سرشار ہو کر شادی نہیں کی تھی۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ایک دن باغ میں جب عاقل خاں زیب النساء سے ملنے آیا تو اورنگ زیب نے اُسے آگ پر چڑھی دیگ میں جلا کر مار ڈالا تھا۔

کیا یہ حقیقت ہو سکتی ہے؟ [illegible] حیرت ہے لیکن اس حیرت کو تنقید نگاروں کی [illegible] جانب دارانہ تنقید نے دور کر دیا ہے، کیوں کہ اورنگ زیب کے عدل و انصاف سے ساری دنیا واقف ہے۔ اس حیا سوز واقعہ کو دیکھ کر اُس نے عاقل خاں کو تو سزا دے دی لیکن اپنی بیٹی سے باز پُرس نہ کی۔ یہ بات قیاس سے بعید ہے۔ ایک سخت گیر عادل ایسی ناانصافی بھی کر سکتا ہے؟ درحقیقت یہ ہے کہ اُس بلند کردار شہزادی کے سفید دامن پر مغربی مورخین نے سیاہ داغ ثبت کرنے کی کوشش کی ہے ——

بہرحال شہزادی کی ذہانت، بلاغت اور فصاحت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ جو کچھ اپنی زبان سے ادا کرتی تھی سوچ سمجھ کر ادا کرتی تھی۔ اسی لئے اُس کا کلام نفاست و لطافت سے لبریز ہوتا تھا۔ اُس کے کلام میں نفاست اور شوخی و لطافت اس قدر ہوتی تھی کہ وہ عورت تھی جو کوئی اُس کا کلام دیکھتا متحیر رہ جاتا۔ کبھی کبھی وہ اپنے کلام پر خود بھی حیران و ششدر رہ جاتی جو اُس کے اِس مصرع سے عیاں ہے:

[illegible]

مخفی کے دیوان کے بہت سے نسخے مل چکے ہیں۔ مخفی کے اشعار سے اُس کے کلام کی نفاست و لطافت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

خیالِ چشمِ جادو کردم امشب
گلِ مقصود را بو کردم امشب
نہ بزمِ بلبلاں نے شاخ تا صبح
بباغ یاد او یاہو کردم امشب

[illegible] و دیدار تو افتاد بہ محشر
[illegible] افتاد بفردائے قیامت
ہر روز قیامت گذرد بر دلِ مخفی!
تا چند توان وعدہ بفردائے قیامت

۱۱۱۳ھ میں جب اورنگ زیب فتوحاتِ دکن میں مصروف تھا، شہزادی زیب النساء شدید علالت میں مبتلا ہو گئی۔ اُس کا دل دنیا کی سرد مہریوں اور حوادث کی تلخیوں سے گھبرا گیا تھا۔ اس لئے وہ [illegible] اجل ہو گیا۔ آخر زیب النساء نے پینسٹھ سال کی عمر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

زیب النساء مخفی نے اپنے کلام کے سوا کوئی یادگار نہ چھوڑی۔ اورنگ زیب کو جب اُن کے انتقالِ پُر ملال کی خبر ملی تو بے اختیار اُس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ معاصر شعراء میں سے کسی نے یہ قطعہ نظم کیا:

آہ زیب النساء بحکمِ خدا
ناگہاں از نگاہ مخفی شد
مخزنِ علم و فضل و حسن و جمال
ہمچو بوئے [illegible] مخفی شد
سالِ تاریخ از خرد جستم
گفت ہاتف کہ ماہ مخفی شد

اس قطعہ میں مادۂ تاریخ کے اعداد جمع کئے جائیں تو سنہ [illegible] ظاہر ہوتا ہے۔ بعض تواریخ میں سنِ وفات ۱۱۱۳ھ لکھا ہے۔



مرزا محمود بیگ جیسے عظیم انسان صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہ کسی ایک فرد کا نام نہیں، ایک تہذیب کا نام ہے، ایک زندہ اور تابندہ روایت کا نام ہے۔ وہ مغل نسل تھے۔ اُن کے دادا، دادی نے ۱۸۵۷ کا غدر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ۱۸۵۷ کی دلّی کا ہر حادثہ، ہر واقعہ اُن کے ذہن پر پوری طرح نقش تھا۔ اُن کی دادی ہر رات جن، بھوتوں، شہزادے شہزادیوں کی کہانیوں کی بجائے وہ اپنے پوتے کو غدر کی کہانیاں سُنایا کرتی تھیں۔

مرزا محمود بیگ میں مغلوں کی آن بان تھی —— آواز مہذب —— لب و لہجہ شگفتہ، زبان شہد میں ڈھلی۔ پچھلے سال وہ چلے گئے۔ جیسے گلاب کے پھول سے شبنم، جیسے دریا سے حباب۔ بیگ صاحب نے غدر کی سو سالہ تقریبات کے سلسلہ میں ۱۸۵۷ کی دلّی سے متعلق بہت سے مضامین لکھے تھے جو آل انڈیا ریڈیو سے نشر کئے گئے اور جو نہ صرف اُس دَور کی دلّی کی عکاسی کرتے ہیں بلکہ دلّی کی پیاری زبان کا شاہکار ہیں۔ ان کے یہ مضامین اُردو ادب کا سرمایہ۔ اُردو کی آبرو، شان بن گئے ہیں۔

بیگ صاحب کے ان ہی مضامین کے مجموعے کا نام ہے 'دلّی ۱۸۵۷ کی' جسے آپ پڑھ کر زبان کی چاشنی سے محظوظ ہو سکیں گے اور غدر کے دنوں کی دلّی اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں گے۔ قیمت دس روپے

ملنے کا پتہ: شمع بک ڈپو آصف علی روڈ، نئی دہلی

مغربی ممالک میں عورتوں کی آزادی

شمیم اختر



مغربی ممالک میں عورتوں کی آزادی کی تحریکیں وقتاً فوقتاً صرف عوام بلکہ حکومت کو بھی متاثر کرتی رہی ہیں، لیکن مغرب کے شوہر اکثر اپنی بیویوں کی "انجمن خواتین" اور ان کے اتحاد و تنظیم کا مذاق ہی اڑاتے رہتے ہیں۔ عورتوں کی آزادی کی تحریک کی طرف سے مغربی ممالک کے بڑے بڑے شہروں میں آئے دن مظاہرے ہوتے رہتے ہیں اور شہری، صوبائی یا مرکزی انتظامیہ کو ان کے مطالبات سننے پڑتے ہیں اور ان کو کسی حد تک تسلیم بھی کر لیا جاتا ہے۔ بعض اوقات تو عورتوں کی آزادی کی تحریک نے اس قدر زور پکڑا ہے کہ متعلقہ انتظامیہ کو مسلح جوابی کارروائی بھی کرنا پڑی ہے۔ لندن اور مانچسٹر میں خواتین کی آزادی کی جماعتیں آج بھی انتہائی زور و شور سے اپنا کام انجام دے رہی ہیں۔ اسی طرح پیرس، واشنگٹن، نیویارک، شکاگو، میڈرڈ اور برلن جیسے بین الاقوامی شہرت یافتہ شہروں میں "آزاد خواتین" "حقوقِ خواتین" "خواتین کی آواز" "عورتوں کی فریاد" جیسی بہت سی انجمنیں اور مجلسیں قائم ہیں جو عورتوں کی آزادی کے لئے سرگرم عمل ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے جب عورتوں کی آزادی کی تحریک اپنے عروج پر پہنچ گئی تو مرد پریشان ہو گئے اور انہوں نے ان انجمنوں کو ناکام بنانے کے لئے ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کئے، لیکن انجام کار شوہروں کی ملی بھگت اور جوابی کارروائی بے اثر ہی ثابت ہوئی۔ رفتہ رفتہ عورتیں مردوں کے برابر ہی حقوق حاصل کرتی گئیں۔ بعض جگہوں پر تو خواتین کو مردوں سے بھی زیادہ حقوق مل گئے۔ جب خواتین اس طرح کامیاب ہو گئیں تو شوہروں کو مزید گھبراہٹ ہوئی اور انہوں نے اس کا کوئی علاج تلاش کرنا چاہا، لیکن بے چاروں کی کوئی

دعا یا دعا اثر نہ دکھا سکی۔

بے بسی کی اسی فضا میں ایک دن واشنگٹن کے ایک "غیرت مند اور ستم رسیدہ" شوہر ہیری برٹن نے خواتین کی آزادی کی تحریک کے خلاف کھلم کھلا آواز اٹھائی۔ اب ہیری احتجاج کے طور پر "خانہ بدر" ہو گیا ہے اور واشنگٹن کی پُر شکوہ شاہ راہوں پر بڑے بڑے بورڈ ہاتھوں میں لئے پھرتا ہے۔ چھیالیس سالہ ہیری گھر سے دور کورسپی مشن میں دس روپے یومیہ اُجرت پر کام کر رہا ہے۔ اُسے اُمید ہے کہ وہ ایک دن اپنے مطالبات منوانے کے بعد اپنے بیوی بچوں سے پھر جا ملے گا۔ لیکن پچھلے تیرہ مہینوں سے اس کی اُمید بر نہیں آئی ہے۔ ہیری نے ایک دن مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے بتایا: "میں نے اپنی بیوی سے بار ہا کہا کہ وہ صرف تین سال تک سروس کرے اور پھر ملازمت سے سبک دوش ہو جائے، لیکن اُس نے ایک نہ مانی اور ایک دن وہ آیا کہ اُس نے میرا بوریا بستر باندھ کر باہر رکھ دیا اور غصہ میں بولی کہ باہر نکل کر پتنگ اُڑاؤ۔"

مجمع پتنگ والی بات سُن کر قہقہے لگائے بغیر نہ رہ سکا۔ ہیری نے اپنا بیان جاری رکھا: "میں نے گھر کو خیر باد کہا اور طے کر لیا کہ اُس وقت تک گھر واپس نہیں جاؤں گا جب تک میری بیوی نوکری چھوڑ دے اور شوہر کی اطاعت قبول نہ کرے۔ آپ بھی میری تقلید کیجئے اور اپنی بیویوں کو اپنا محکوم بنائیے نہ کہ حاکم، ورنہ ہم شوہروں کا جینا حرام ہو جائے گا۔ ہمیں گھر کا کھانا خود بنانا پڑے گا، برتن خود مانجھنے پڑیں گے اور یہاں تک کہ بچوں کی پرورش بھی خود کرنا پڑے گی۔"

ہیری اب تک ہزاروں حامی اشخاص کے دستخط اپنے حق میں حاصل کر چکا ہے۔ یہ دستخط اُس نے اس محضر پر کرائے ہیں جن میں عورتوں کی ترقی ہوئی حکم عدولی اور آزادی پر احتجاج کیا گیا ہے اور اُن سے واضح الفاظ میں اپیل کی گئی ہے کہ وہ گھر کے کام کاج میں ہی اچھی لگتی ہیں، اس لئے وہ دفتروں میں کام کرنے کی بجائے گھر کی ذمہ داریاں سنبھالیں، ورنہ بے چارے شوہروں کی زندگی گھر اور باہر ہر طرف عذابِ جان بن جائے گی۔

ایک اور دن ہیری نے لوگوں کو بتایا: "میری بیوی سکریٹری کے طور پر ملازم ہے، وہ تمام دن ٹائپ کر کے تھکی ہاری گھر واپس آتی ہے تو اس کے اوندھے سیدھے ناز نخرے، میں تو کیا بے چارے معصوم بچے بھی برداشت کرتے ہیں۔ کھانا پکانا تو دُور کی بات ہے، وہ تو بس ٹی وی کھول کر آرام سے بیٹھ جاتی ہے، جیسے وہ شوہر ہو اور میں اس کی بیوی۔ کیا اُلٹا زمانہ ہے۔"

ہیری ہفتے میں دو بار صبح کو چھ بجے کورسپی مشن پہنچ جاتا ہے۔ اس کے پاس اس وقت تمام فائلیں، کاغذات اور سائیکلو اسٹائل کئے ہوئے پمفلٹ ہوتے ہیں، جن کا عنوان "شوہروں کی آزادی کے خبرنامے" اور "مرد کی آزادی خطرے میں ہے"۔ وہ ان کتابچوں کو فی کاپی دو روپے کے حساب سے فروخت کرتا ہے۔ پچیس تیس کاپیاں فروخت کرنے کے بعد وہ وائٹ ہاؤس کے پاس اس وسیع گوشے میں جا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ جہاں وائٹ ہاؤس سے ملاقاتی اور سیاح باہر نکلتے رہتے ہیں۔ وہ اُن سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتا رہتا ہے

ہیری طوفان یا بارش کے دوران احتیاطاً اپنا مظاہرہ جاری نہیں رکھتا، کیوں کہ اُسے اس بات کا اندیشہ رہتا کہ اُس کی کاغذیں جو دستخطوں کی شکل میں اُس کے پاس نادر نمونوں کے طور پر موجود ہیں، خراب ہو جائیں گی اور اُس کے سارے کئے دھرے پر پانی پھر جائے گا۔

ہیری ایک کامیاب صنعتی انجنیئر رہ چکا ہے، لیکن اب وہ صرف کتابچے فروخت کر کے گزر اوقات کر رہا ہے۔ سیاح اور آنے جانے والے ہمدرد اس کو کتابچوں کی قیمت کے علاوہ کچھ نہ کچھ عطیہ بھی دے جاتے ہیں جو اس کی گزر بسر کے لئے کافی ہوتا ہے۔

پہلے لوگ یہ سمجھتے رہے کہ ہیری محض ڈھونگ رچا رہا ہے، لیکن جب ہر معاملے اور ہر موقع پر اُس کو سنجیدہ اور ڈٹا ہوا پایا گیا تو سب کو کامل یقین ہو گیا کہ حقیقتاً ہیری شوہروں کی دُرگت اور حالتِ زار کو سمجھ چکا ہے۔ اور اسی وجہ سے عملی طور پر قدم اٹھا کر ہزاروں، لاکھوں شوہروں کی مکمل حمایت حاصل کر چکا ہے۔ ہیری کو پختہ یقین ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن سرخ رُو ہو کر گھر واپس جائے گا اور اپنی بیس سال کی ازدواجی زندگی پھر اپنی شریکِ حیات کے ساتھ گزار سکے گا۔ اُسے اپنی بیوی لیلین کبھی کبھی بہت زیادہ یاد آتی ہے۔ جب اُسے اپنے بچوں بیس سالہ رابرٹ، اٹھارہ سالہ فلپس اور سولہ سالہ بیٹی ایلین کا خیال آتا ہے تو وہ دیر تک بیٹھا سوچتا رہتا ہے۔ اُسے یہ خیال بھی ستاتا رہتا ہے کہ ان معصوموں نے کیا گناہ کیا ہے، جو جیتے جی ان کے لئے وہ مرا برابر ہو گیا۔

ایک دن ہیری نے "واشنگٹن پوسٹ" کے نمائندے کے ایک تیکھے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا:

"ہم دونوں میاں بیوی طلاق جیسے ناپاک اقدام پر یقین نہیں رکھتے۔ نظریاتی اختلافات کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اپنی بیس سالہ شادی شدہ

زندگی کو ختم کر کے علیحدگی اختیار کر لیں۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ ٹیلیفون ملازمت کو خیر باد کر کے آرام سے گھر رہیے' اور اُس وقت وہ مجھے بلائے گی تو میں کسی عذر کے بغیر گھر واپس چلا جاؤں گا۔ خدا کا شکر ہے اب ہم تین کمانے والے ہیں۔ میرے دونوں لڑکے تعلیم کے ساتھ ساتھ ٹیلی وژن ٹریننگ حاصل کر رہے ہیں۔ ٹی وی کمپنی سے اب بھی اُن کو اتنی تنخواہ مل جاتی ہے کہ ان کے تعلیمی اور تفریحی اخراجات بخوبی پورے ہو جاتے ہیں۔ شوہروں کو انتہائی کوشش کرنا چاہئے کہ وہ اپنی بیویوں کو راہِ راست پر لائیں اور گھریلو ذمہ داریاں اُن کے سپرد کریں تاکہ وہ "سبھا کی پری" بن کر بدنامی کا باعث نہ بنیں۔ عورتوں کا ٹھکانا ان کا گھر ہے، دفاتر نہیں۔ ان کا فرض ہے کہ گھر کو سنبھالیں، بچوں کی پرورش صحیح ڈھنگ سے کریں۔ میں یہ تو نہیں چاہتا کہ عورت گھر کی چار دیواری میں ہر وقت قید رہے، لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ اس کی ساری سرگرمیوں کا مرکز گھر ہو، دولت یا سماجی رُتبے کا حصول نہیں۔"

ہیری کے مظاہرے اتنے کامیاب ہوئے ہیں کہ بہت سے ممتاز شہریوں کی طرف سے اُس کو مکمل حمایت کا یقین دلایا جانے لگا ہے۔ ہیری کہتا ہے کہ "میری بیوی کام کیوں کرتی ہے؟ اس لئے تاکہ زیادہ سے زیادہ ڈالر آئیں، جن کے بوتے پر زیادہ فیشن ہو، زیادہ اچھے کپڑے زیب تن کئے جائیں، بہت سی آرائش و آسائش ہو۔ میں جانتا ہوں کہ اگر یہی اس کی آرزو ہے تو یہ زیادہ بے جا بھی نہیں، لیکن وہ مجھ سے کہہ کر تو دیکھے۔ سخت محنت کر کے میں سب مہیا کر دوں گا۔ میری اپنی بھی دیرینہ خواہش ہے کہ گھر میں دنیا بھر کا عیش کا سامان ہو، موٹر کاریں ہوں، نوکر چاکر ہوں اور بینکوں میں ڈالر بھرے ہوئے ہوں۔"

ہیری کے قریب سے گزرنے والے لوگ اس کے پاس ضرور کچھ دیر کے لئے ٹھہر جاتے ہیں اور اس کی بات سنے بغیر کوئی آگے نہیں بڑھتا۔ کچھ لوگ اس کے محضر پر دستخط کر جاتے ہیں۔ ہیری کا دعویٰ ہے کہ اُس نے بہت سے دانشوروں کے دستخط حاصل کر لئے ہیں۔ اب تک مجموعی طور پر تقریباً ایک ہزار دو سو دستخط اپنے حق میں کرا چکا ہے۔ دستخطوں کی اس فائل کا عنوان اُس نے "شوہروں کی آزادی" رکھا ہے۔ ان دستخطوں میں خاص بات یہ ہے کہ ان میں تین سو دستخط معزز شادی شدہ خواتین کے بھی شامل ہیں۔ باقی دستخط شہر کے اعلیٰ حکام، وکلا، میونسپل کاؤنسلرز اور اساتذہ وغیرہ کے ہیں۔

وائٹ ہاؤس کا رُخ کرنے سے پہلے ہیری کچھ دیر کے لئے اُس بلڈنگ کے بیرونی پھاٹک پر بھی رُکتا ہے، جس کا نام "محکمۂ انصاف" ہے۔ وہاں امریکہ کے مانے ہوئے وکلا، اور جج آتے رہتے ہیں۔ ہیری کو خاص طور سے اُس دن کا انتظار ہے جب اٹارنی جنرل جان مائیکل اس کو چرچل کی طرح انگلیوں سے انگریزی حرف وی (V) دکھا کر فتح کا نشان عطا کر دیں گے، یعنی جب وہ ہیری کی جد و جہد کا اثر قبول کر کے شوہروں کی آزادی کو تسلیم کر لیں گے اور بیویوں کی آزادی کو قانوناً محدود کر دیں گے، لیکن ہیری کا یہ بھی خیال ہے کہ اس حد تک کامیابی حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

اپنی تحریک کے دوران ہیری کو بہت سے تلخ تر تجربات سے بھی دوچار ہونا پڑا ہے۔ بہت سی خواتین نے اس کو دھتکارا، ڈرایا اور دھمکایا ہے۔ کچھ بیویوں نے اس کا منہ چڑایا اور کچھ نے انگوٹھا دکھایا۔ کچھ نے قدرے اس کو توہین کا ہار دکھایا۔ کچھ اس پر قہقہے لگاتی رہیں اور کچھ ہیری کو نیم پاگل قرار دے گئیں۔ ایک دن ایک خاتون نے چپکے سے اُس کے کان میں کہا: "ہیری ایک بات پوچھوں؟"

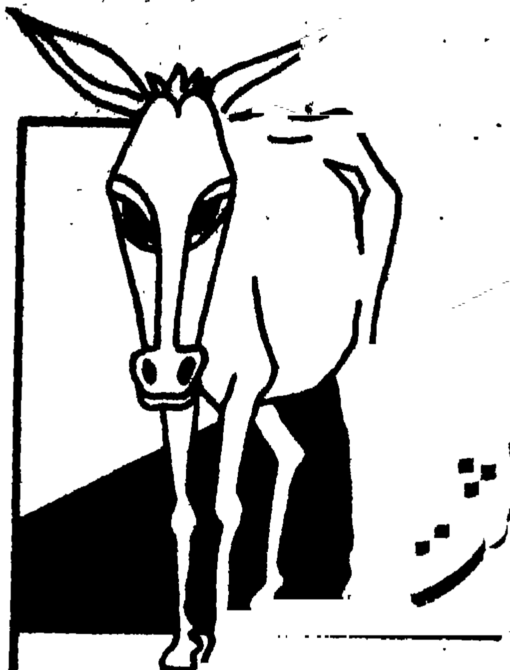
"جی ہاں، شوق سے معلوم کیجئے۔"

"کیا تم نے اپنے دماغ کی دُھلائی کرائی ہے؟"

یہ سوال سُن کر ہیری غصّے میں لال پیلا ہو گیا۔ لیکن انتہائی صبر و ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُس نے اس عورت کو کوئی ناگوار جواب نہیں دیا اور چپ چاپ دوسری طرف منہ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کو پورا اعتماد ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن اپنی دھن میں ضرور کامیاب ہو جائے گا۔ ہیری کے خیال کے مطابق اگر بیویاں اس کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ گھر سے باہر کی دنیا آباد کر کے وہ نہ صرف اپنی زندگی برباد کر رہی ہیں بلکہ آنے والی نسلوں یعنی بچوں کی معصوم زندگیوں کو بھی نقصان پہنچا رہی ہیں تو یقیناً وہ اسی وقت اپنی فضول اور نام نہاد "آزادی" اور تفریحات کو بالائے طاق رکھ کر، گھریلو ذمہ داریاں کو سنبھال کر نئی، فرحت بخش، خوش حال اور مسرت آگیں زندگی بسر کر سکیں گی۔ ہیری کا کہنا ہے یہ مردوں کی آزادی کی جنگ نہیں ہے، یہ تو صرف شوہروں کی بالادستی اور آزادی کی لڑائی ہے۔ ابھی غیر شادی شدہ نوجوان اس زمرے میں شامل نہیں ہیں۔"

دیکھنا یہ ہے کہ ہیری اپنے مشن میں کس حد تک کامیاب ہوتا ہے۔

○○



آپ کی ذہنی الجھن اور اس کا حل

ڈاکٹر بجاشیہ ایک مشہور ماہر نفسیات ہیں۔ وہ بانو پڑھنے والوں کے سوالات کا جواب دیں گے اور ان کے نفسیاتی مسئلوں کا تجزیہ اور حل پیش کریں گے۔ پتہ: معرفت ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰

س: میری عمر ۴۴ سال ہے۔ برسوں سے مجھے بے خوابی کی شکایت ہے۔ تین چوتھائی رات کروٹیں بدلتے گزر جاتی ہے۔ مجھے نیند کی گولیاں کھانے کی عادت ہے۔ ان کے بغیر مجھے نیند نہیں آتی۔ کیا مجھے اس عادت سے چھٹکارا مل سکتا ہے؟ میں بے خوابی کی وجہ سے بہت پریشان رہتی ہوں۔

ج: بے خوابی کے اثرات کے متعلق عام طور پر لوگوں میں غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ بے خوابی سے صحت پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا۔ اس کے متعلق سوچنے اور پریشان ہونے سے ضرور بُرا اثر پڑتا ہے۔ جو لوگ دیر سے سوتے ہیں وہ قدرتی طور پر دیر سے جاگتے ہیں اس طرح وہ اپنی نیند پوری کر لیتے ہیں۔ اگر دیر سے سونے والے جلد جاگ جائیں تو دوپہر کو قیلولے کی شکل میں اپنی نیند پوری کر لیتے ہیں۔ دراصل نیند جسم کا قرض ہے۔ یہ قرض کسی نہ کسی طرح ادا ہو جاتا ہے۔ آپ کی پریشانی کا اصل سبب نیند سے محرومی کا خوف ہے۔ نیند ہر انسان کا حق ہے۔ آپ اس حق سے محروم ہیں۔ یہی محرومی آپ کو پریشان کرتی ہے۔

نیند کے بارے میں کوئی کلیہ نہیں ہے۔ بچوں کو عموماً ۱۰، ۱۲ گھنٹے کی نیند کی ضرورت ہوتی ہے۔ عمر کے ساتھ نیند کا وقت کم ہوتا جاتا ہے۔ بعض لوگ ۳، ۴ گھنٹے میں اپنی نیند پوری کر لیتے ہیں۔ اگر نیند گہری ہو اور اس کا وقفہ کم ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ اس خوف کو دل سے نکال دیں کہ نیند کی کمی آپ کی صحت پر بُرا اثر ڈال رہی ہے۔ آپ اس خیال کو بھی دل سے جھٹک دیں کہ نیند کی گولیاں استعمال کئے بغیر نیند آنا مشکل ہے۔ اگر آپ کی گولیاں کھانے کی عادت پختہ ہو چکی ہے تو آپ یک لخت اس عادت سے چھٹکارا نہیں پا سکتیں۔ بہتر یہ ہے کہ آپ ان کی مقدار کم کر دیں۔ اگر ایک گولی کھاتی ہیں تو آٹھ دن آدھی گولی کھائیں اور پھر چوتھائی۔ اس طرح آپ کی عادت چھوٹ جائے گی۔ نیند کو بلانے کی کوشش نہ کریں۔ نیند نہ آنے سے پریشان نہ ہوں۔ اگر نیند سے محرومی کا خوف آپ کے دل سے نکل گیا تو نیند خود بخود آنے لگے گی۔

س: میرے بچے کی عمر ۵ سال ہے۔ اسے انگوٹھا چوسنے کی عادت ہے۔ پہلے سال تو میں نے اس بات کی پروا نہیں کی، لیکن اب مجھے اس کی عادت سے ندامت ہوتی ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ وہ اس عادت کو چھوڑ دے لیکن اس کی عادت زیادہ پختہ ہو گئی۔ کیا میرے بچے کی یہ عادت چھڑائی جا سکتی ہے؟

ج: آپ نے یہ نہیں لکھا کہ آپ نے بچے کی انگوٹھا چوسنے کی عادت چھڑانے کے لئے اب تک کیا حربے استعمال کئے ہیں۔ بہت سی عورتیں بچے کا انگوٹھا بار بار اس کے مونہہ سے نکال لیتی ہیں، یا

ڈانٹ ڈپٹ کر اسے انگوٹھا مونہہ میں رکھنے سے منع کرتی ہیں۔ کچھ عورتیں انگوٹھے پر کوئی کڑوی کسیلی دوا لگا دیتی ہیں۔ یہ سب باتیں بیکار ہیں۔ انگوٹھا چوسنے کی عادت نفسیاتی ہے۔ اس سے بچے کی پریشانی کم ہو جاتی ہے، اگرچہ ماں کی پریشانی بڑھ جاتی ہے۔ آپ کو بچے کی اس عادت سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ عادت بے ضرر ہے۔ پیدائش کے پہلے سال کے دوران عموماً ہر بچہ انگوٹھا چوستا ہے۔ اکثر ایک سال کے بعد یہ عادت خود بخود چھوٹ جاتی ہے چھ سال تک اس عادت سے کوئی خطرہ نہیں۔ اگر بچہ چھ سال کے بعد بھی انگوٹھا چوسنا نہ چھوڑے تو اس عادت سے صرف ایک نقصان ہوتا ہے۔ اس کے دانت باہر کی طرف مڑ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس عادت سے اور کوئی خطرہ نہیں ہے۔

انگوٹھا چوسنے کی خواہش بچے کی جذباتی ناآسودگی کو دور کرتی ہے۔ اس عادت کی کئی وجہیں ہیں۔ پیدائش کے پہلے سال کے دوران بچے کو دودھ پلانے کا وقفہ طویل ہو جائے تو اس عادت کی داغ بیل پڑ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر آپ بچے کو ہر تین گھنٹے کے بعد دودھ پلاتی ہیں۔ اگر کسی وجہ سے یہ وقفہ تین گھنٹے سے زیادہ طویل ہو جائے تو بچہ دودھ کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ دودھ نہ ملنے کی صورت میں اس کے پاس ایک ہی حربہ باقی رہ جاتا ہے۔ وہ اپنا انگوٹھا چوسنے لگتا ہے۔ آپ کو عدیم الفرصتی یا کاہلی کی وجہ سے بچے کے دودھ پلانے کا وقت یاد نہیں رہتا ہے، لیکن بچے کو تو اپنی خوراک وقت پر ملنا چاہئے۔ اس کا تحت الشعور اپنے ٹائم ٹیبل کو یاد رکھتا ہے۔ وقت ہو جانے پر اس کے ذہن میں گھنٹی بجنے لگتی ہے اور وہ اپنی خوراک وقت پر نہ ملنے پر انگوٹھے کو مونہہ میں رکھ لیتا ہے۔ دوسری وجہ بچہ کو دودھ پلانے میں جلدی کرنا ہے۔ بچہ صرف خوراک کا بھوکا نہیں ہوتا۔ وہ ماں کی نرم گرم آغوش کا بھی خواہش مند ہوتا ہے۔ بچہ جانور نہیں ہے کہ اس کے آگے چارہ ڈال دیا اور اس نے کھانا شروع کر دیا دودھ خواہ اپنا پلایا جائے یا بوتل کا، دودھ پلانے کا وقفہ طویل ہونا چاہئے۔ دراصل بچہ پہلے ۵ منٹ میں اپنی ساری غذا حاصل کر لیتا ہے۔ پھر اس کے دودھ پینے کی رفتار سست ہو جاتی ہے۔ پھر وہ دودھ بھی پیتا ہے اور ساتھ ساتھ اونگھتا بھی ہے۔ یہ وقفہ آدھے گھنٹے سے پون گھنٹے تک ہوتا ہے یہ طویل وقفہ بچے کی جسمانی خوراک اور ذہنی خوراک پوری کرنے کے لئے ضروری ہے۔ بہت سی مائیں بچے کی اس عادت سے اکتا جاتی ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ بچہ دودھ پی چکا، اب وہ اٹھکیلیاں کر رہا ہے، وہ کب تک اس کے نخرے برداشت کریں؟ یہ خیال آتے ہی وہ بچے کے مونہہ سے یک لخت دودھ چھڑا دیتی ہیں۔ مائیں ایسا سوچنے میں حق بجانب ہیں۔ بچے کی حرکتیں انہیں ایسا سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ لیکن یہ بچے کی نفسیات سے ناواقفیت کی بنا پر ہوتا ہے۔ ماں کی نیت پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی ماں اپنے بچے کا برا نہیں چاہتی۔ لیکن وہ اپنی نادانی میں ایسی حرکت کر بیٹھتی ہے جس سے آگے چل کر نقصان ہو سکتا ہے۔ بوتل سے دودھ پینے والا بچہ عموماً ۱۰ منٹ میں اپنی خوراک پوری کر لیتا ہے لیکن بوتل کے مونہہ سے چھٹتے ہی اس کا ماں کے قرب کا احساس تشنہ رہ جاتا ہے۔ انگوٹھا چوسنے کی عادت پہلے ۴ مہینے میں زیادہ ہوتی ہے۔ ۶ مہینے کے بعد خود بخود کم ہو جاتی ہے۔ اگر آپ دیکھیں کہ بچے کی عادت پختہ ہو رہی ہے، تو اسے نپل کی عادت ڈالیں۔ نپل انگوٹھے کا نعم البدل ثابت ہوتا ہے۔

اس عادت کو چھوٹنے یا جاری رکھنے میں پہلا سال بہت اہم ہوتا ہے۔ اگر یہ عادت پہلے سال میں نہ چھوٹے تو کئی سال تک جاری رہتی ہے۔ یہ ضروری امر ہے کہ بچے کو خالی نہ بیٹھنے دیں۔ اس سے باتیں کریں، اسے کوئی کھلونا دیں، اسے توجہ اور محبت دیں۔ اگر آپ اسے بچہ گاڑی یا نہلانے میں لٹا کر بھول گئیں تو بچہ تنہائی سے بور ہو کر انگوٹھا چوسنا شروع کر دے گا۔

ماں باپ کے درمیان جھگڑا یا کھنچاؤ ہو تو اس کا بھی بچہ پر برا اثر پڑتا ہے۔ شیرخوار بچے اس معاملے میں بڑوں سے کہیں زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ وہ بول نہیں سکتے، لیکن فضا میں کشیدگی ہو تو فوراً سمجھ جاتے ہیں۔ ماں باپ کی ایک بے ضرر اور معمولی بحث یا تکرار ان کے ذہنی سکون کو پامال کر دیتی ہے بچے کے سامنے لڑنے سے پرہیز کرنا لازم ہے۔ بچہ ماں باپ کی کشیدگی سے متاثر ہو کر بھی انگوٹھا چوسنا شروع کر دیتا ہے۔ اسے اس عادت سے یک گونہ سکون ملتا ہے۔

بچے کو اس عادت پر بار بار جھڑکنا اور روکنا غلط ہے۔ اس کے انگوٹھے پر کڑوی دوا لگانا بھی غلط ہے۔ یہ اس عادت کا علاج نہیں اس طرح بچہ اور بھی تیزی سے انگوٹھا چوسنا شروع کر دے گا۔

محفل میں کوئی بچے کا مذاق اڑائے تو آپ شرمندگی محسوس نہ کریں۔ یہ عادت نقصان رساں نہیں ہے، اور وقت کے ساتھ خود ہی چھوٹ جاتی ہے۔

س : میری لڑکی کی عمر ۱۷ برس ہے۔ قد ۵ فٹ ۴ انچ ہے، اور وزن ۲۰۰ پونڈ۔ وہ بے تحاشا کھاتی ہے زیادہ کھانے سے وہ بہت موٹی ہو گئی ہے۔ میری عمر ۴۵ سال ہے۔ دو برس ہوئے میرے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ میں اپنی لڑکی کو زیادہ کھانے سے روکتی ہوں، لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ کیا اس کی بسیار خوری کم ہو سکتی ہے؟

ج : آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ کی لڑکی کو زیادہ

کھانے کی عادت کب سے پڑی۔ ممکن ہے کہ آپ کے خاوند کی موت کے بعد اس نے زیادہ کھانا شروع کر دیا ہو۔ آپ کی بچّی کی عمر اور وزن کو دیکھتے ہوئے یہ مسئلہ تشویش ناک بن جاتا ہے۔ آپ کا اندیشہ بجا ہے، لیکن اس بیماری کا علاج وہ نہیں جو آپ کر رہی ہیں زیادہ کھانے سے روکنا یا اس کے خطرات سے آگاہ کرنا اس کا علاج نہیں۔ آپ کی بچّی محبت سے محرومی کا شکار ہے۔ اس کو اپنے باپ سے محبت تھی۔ ان کے مر جانے سے اس کا تحفّظ کا احساس تہہ و بالا ہو گیا۔ آپ کی عمر بھی کچھ زیادہ نہیں۔ ممکن ہے کہ آپ کا دوسری شادی کرنے کا ارادہ ہو۔ اس طرح اس کے تحفّظ کا احساس زیادہ مجروح ہو جاتا ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ ایک ہم درد اور ساتھی تو چلا گیا، کہیں دوسرا بھی نہ چلا جائے۔

زیادہ کھانے کی عادت کا تعلق نفسیات سے ہے۔ کچھ لوگوں کی بھوک غصّے اور پریشانی کے عالم میں بند ہو جاتی ہے، کچھ لوگوں کی بڑھ جاتی ہے محرومی کا احساس مونہہ چلانے سے کم ہو جاتا ہے۔ آپ کی بچّی جب کھانا کھاتی ہے تو اسے تسکین ملتی ہے۔ محرومی کا احساس جتنا بڑھتا جائے گا، اس کی بھوک اتنی ہی بڑھ جائے گی۔ مونہہ سے تسکین حاصل کرنا جذباتی شیر خوارگی کی علامت ہے۔ سگریٹ پینے والے، پان چبانے والے، چٹورے اور بسیار خور اسی کم زوری کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ لوگ کوشش کرتے ہیں کہ اپنی عادتیں چھوڑ دیں، لیکن ان عادتوں کا چھوڑنا آسان نہیں۔ یہ عادتیں ان کی نفسیاتی کم زوریوں کی تلافی کرتی ہیں، ان کے جذباتی خلا کو پُر کرتی ہیں۔ آپ کوشش کیجیے کہ آپ کی بچّی تحفّظ کے احساس سے محروم نہ ہو۔ اسے ہم دردی اور اطمینان چاہیے۔ اسے آپ کی محبت کا یقین ہو جائے تو اسے سکون حاصل ہوگا اور وہ خود بخود زیادہ کھانے کی عادت ترک کر دے گی۔ اسے اس بات پر ڈانٹنا پھٹکارنا بالکل لاحاصل ہوگا۔ اس کا اثر اُلٹا پڑے گا۔ اس کا سکون ختم ہو جائے گا۔ وہ اور بھی زیادہ کھانا شروع کر دے گی۔ اس سے شفقت کا برتاؤ کریں۔ اس کی بسیار خوری پر نکتہ چینی نہ کریں۔ اس کے علاوہ بہت تیزی سے وزن گھٹانا یوں بھی صحت کے لئے نقصان دہ ہے۔

س : میری عمر ۱۸ سال ہے۔ میرے چہرے پر مہاسے ہیں۔ میں نے بہت علاج کئے، لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ کیا مہاسے نکلنے کی کوئی نفسیاتی وجہ ہو سکتی ہے؟

ج : مہاسے نکلنا جِلد کی بیماری ہے اور جِلد کی اکثر بیماریاں نفسیاتی الجھنوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ جو لوگ اپنی جِلد کا بہت خیال کرتے ہیں۔ اور ہر وقت آئینے میں اپنی شکل دیکھتے رہتے ہیں، وہی اکثر جلد کی خرابیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ اپنی جِلد سے اتنا پیار کرنا صحت مند رجحان نہیں ہے۔ مہاسے اکثر روغنی جِلد پر نکلتے ہیں۔ جِلد کے نیچے کچھ غدود چکنائی پیدا کرتے ہیں۔ ان غدودوں کا کام غصّے کی حالت میں بڑھ جاتا ہے۔ غصّے اور جوش کی حالت میں یہ معمول سے زیادہ چکنائی پیدا کرتے ہیں۔ غصّے کی حالت میں پسینہ بھی زیادہ آتا ہے۔ اس کے برعکس پریشانی اور خوف کی حالت میں چکنائی کی پیداوار بہت کم ہو جاتی ہے، کیوں کہ ایسی صورت میں چکنائی پیدا کرنے والے غدود سست رفتاری سے کام کرتے ہیں۔ ہم اکثر سنتے ہیں کہ خوف سے خون منجمد ہو گیا، یا ڈر کے مارے خون خشک ہو گیا۔ ان محاوروں میں نفسیاتی حقیقت پوشیدہ ہے۔ جب چکنائی کم ہو جاتی ہے تو اسے غدود سے کھال تک پہنچانے والی رگیں بھی بند ہو جاتی ہیں نوجوانی کے زمانے میں موڈ بہت جلدی بدل جاتا ہے نوجوان لڑکیوں میں پختگی اور ٹھیراؤ نہیں ہوتا۔ انہیں جلد غصّہ آ جاتا ہے۔ غصّے کی حالت میں غدود پھر پوری قوت سے کام کرنے لگتے ہیں۔ چکنائی کی پیداوار بڑھ جاتی ہے۔ یہ چکنائی رگیں بند ہونے کی وجہ سے کھال تک نہیں پہنچتی۔ جب اس چکنائی کو راستہ نہیں ملتا تو غدود پر اس کا دباؤ بڑھ جاتا ہے اور یہ سُوج جاتا ہے۔ یہی سُوجی ہوئی جگہ مہاسہ کہلاتی ہے۔ جسم میں جب کوئی جگہ سُوج جاتی ہے تو اس جگہ خون کی گردش بے قاعدہ ہو جاتی ہے۔ جب کسی عضو میں دورانِ خون خراب ہو جائے تو یہ جگہ جراثیم کا شکار بن جاتی ہے۔ اس میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہی حال مہاسے کا ہوتا ہے۔

آپ کو چاہیئے کہ مہاسوں کا اوپری علاج کرنے کے بجائے اپنی ذہنی اور جذباتی حالت کا جائزہ لیں۔ نوجوان لڑکیاں عام طور پر اپنے غصّے کا اظہار نہیں کر سکتیں۔ بزرگوں کے ڈر سے وہ اپنا غصّہ دبائے رکھتی ہیں۔ یہ دبا دبا اندرونی غصّہ پریشانی اور فکر پیدا کرتا ہے۔ غصّہ کا اظہار اس کو دبانے سے بہتر ہے۔ ہم آپ کو یہ مشورہ نہیں دے سکتے کہ جب آپ کا جی چاہے دوسروں پر برس پڑیں۔ اگر آپ کو غصّہ آئے تو مناسب طریقے سے اس کا اظہار کریں۔ آپ کو جِلد کی دیکھ بھال سے زیادہ اپنے مزاج کی دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے کہ آپ کے گھر میں بھائی بہنیں ہوں، آپ کے والدین آپ کی نظر میں ان سے زیادہ پیار کرتے ہوں، آپ کو اس ترجیحی سلوک پر غصّہ آتا ہو۔ آپ غصّہ ظاہر نہیں کر سکتیں۔ ماں باپ کا ادب آپ کے آڑے آ جاتا ہے یا ممکن ہے گھر میں کوئی آپ کو اہمیت نہیں دیتا ہو۔ آپ کی بات نہ مانتا ہو۔ یہ باتیں بھی غصّہ پیدا کرتی ہیں۔ ڈاکٹروں کی اس بات میں بھی کچھ سچائی ہے کہ مہاسوں کا علاج شادی ہے۔ شادی کے بعد خاوند کا پیار ملتا ہے۔ لڑکی کو اپنی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ اس کا غصّہ کافور ہو جاتا ہے۔ پھر قدرتی طور پر

ہاسے پیدا ہوتے بند ہو جاتے ہیں۔

اگر آپ اپنے اندرونی غصّے کو سمجھ جائیں تو آپ کو فکر اور پریشانی سے نجات مل جائے گی۔ غصّے کا فطری نتیجہ احساسِ گناہ ہوتا ہے۔ جب ہم اپنے بزرگوں کے خلاف کوئی بات سوچتے ہیں تو اس کے نتیجے سے بچ نہیں سکتے۔ یہ نتیجہ احساسِ گناہ کی شکل میں ہمارے ذہن پر سوار رہتا ہے۔ یہ احساسِ گناہ سزا کا خوف پیدا کرتا ہے اور خوف جلد کی چکنائی کو خشک کر دیتا ہے۔ اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے اور نئے ہاسے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ آپ اپنے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اسے تسلیم کرلیں۔ آپ کا غصّہ اور خوف دُور ہو جائے گا، اور ہاسے نکلنے بند ہو جائیں گے۔

س : میری عمر ۴۸ سال ہے۔ کچھ دنوں سے میں بہت پریشان رہتی ہوں۔ کسی کام میں دل نہیں لگتا۔ صحت بھی جواب دے رہی ہے۔ ایک اَن جانا خوف ہر وقت دل پر سوار رہتا ہے۔ گھر میں خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ پھر میری پریشانی کی کیا وجہ ہے؟

ج : آپ کی عمر ۴۸ سال ہے۔ اس عمر میں عورت جوانی سے گزر کر بڑھاپے کی سرحد میں داخل ہوتی ہے۔ بڑھاپا ایک تلخ حقیقت ہے۔ عورت جب بڑھاپے کی سرحد میں داخل ہوتی ہے تو اسے ایک مبہم خوف دامن گیر ہوتا ہے۔ اگر وہ جوانی میں خوب صورت رہی ہو تو یہ خوف زیادہ ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس عمر میں کچھ جسمانی تبدیلیاں بھی واقع ہوتی ہیں۔ ایام بند ہو جاتے ہیں۔ مزاج چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ یہ زندگی کی بہت اہم تبدیلی ہوتی ہے جس سے ہر عورت دوچار ہوتی ہے۔ اس زمانے میں عورت کو اکثر بلڈ پریشر کی شکایت رہتی ہے۔ اسے بات بات پر غصّہ آتا ہے۔ بظاہر ان باتوں کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اس پر جھنجلاہٹ اور بڑھ جاتی ہے۔

سب سے پہلے آپ کو یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہئے کہ آپ کی علامات قدرتی ہیں۔ یہ بات آپ کی سمجھ میں آجائے تو آپ ان حالات کا مقابلہ بہتر طریقے سے کرسکتی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ اس تبدیلی کو تسلیم کریں۔ خوب صورتی کے لئے عمر کی کوئی قید نہیں۔ عورت عمر کے ہر حصّے میں خوب صورت لگ سکتی ہے۔ ہر عمر کی اپنی الگ خوب صورتی ہوتی ہے۔ آپ اس تبدیلی کے متعلق سوچنا چھوڑ دیں۔ اگر آپ پریشان رہیں گی تو بڑھاپا زیادہ جلد آئے گا۔ آپ کو خوف ہے کہ آپ اپنی جوانی اور خوب صورتی سے محروم ہو جائیں گی۔ آپ کی جوانی کی تصویر دُھندلی ہو رہی ہے۔ آپ اس بات کی پروانہ کریں۔ اس تبدیلی سے فرار ناممکن ہے۔ پھر کیوں نہ اسے تسلیم کرلیا جائے؟ ◣◣

نیا سورج

اندھیرا اپنی ہی سازش کا خود شکار ہوا
اُفق پہ وہ نیا خورشید آشکار ہوا

شفق نے جیسے اُفق پر گُلال چھڑکا ہے
عروسِ نور نے رُخ سے نقاب اُلٹا ہے
عجب ادا سے صبا نے گلوں کو چھیڑا ہے
روش روش پہ تبسم کا مینہ برستا ہے
شبِ فراق گئی انتظار ختم ہوا
اُفق پہ وہ نیا خورشید آشکار ہوا

ہوائیں ناز دکھاتی ہوئی سنکتی ہیں
نیا غرور لئے ڈالیاں لچکتی ہیں
کسان جاگ اُٹھے کھیتیاں لہکتی ہیں
مثالِ آئینہ پیشانیاں دمکتی ہیں
نہ جانے کتنے برس میں یہ پہلی بار ہوا
اُفق پہ وہ نیا خورشید آشکار ہوا

وہ بوڑھے گاؤں کے پنگھٹ پہ گاگروں کی کھنک
وہ قہقہوں کی پھواریں وہ آنچلوں کی دھنک
وہ چھیڑ چھاڑ کا ماحول چوڑیوں کی چھنک
خرامِ ناز کی سرگرم پائلوں کی جھنک
ہر ایک خواب حقیقت سے ہم کنار ہوا
اُفق پہ وہ نیا خورشید آشکار ہوا

بہار آئی کھِلے ہیں گُلاب گالوں میں
سُہاگنوں نے سجائے ہیں پھول بالوں میں
پڑے ہیں جھولے گھنی املیوں کی ڈالوں میں
کنواریوں کی رچیں شادیاں خیالوں میں
نصیب ماں کی مُرادوں کو اعتبار ہوا
اُفق پہ وہ نیا خورشید آشکار ہوا

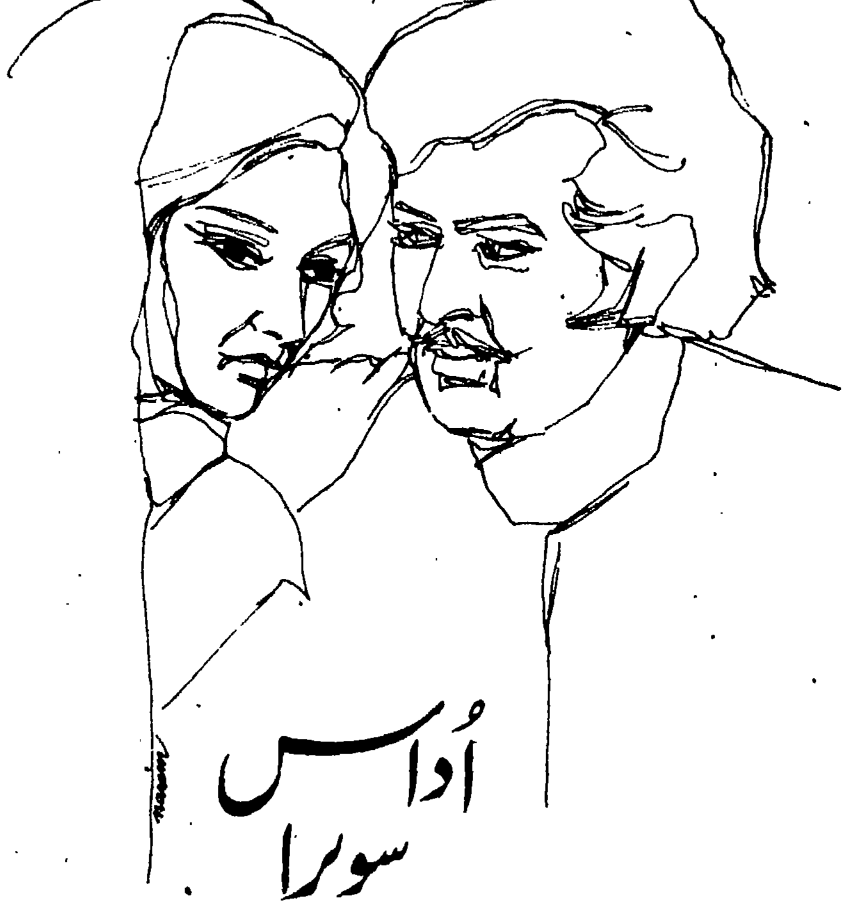
کراہ، درد، فغاں، آہ، شدّتِ افلاس
تھکا تھکا سا ذہن تھا بجھا بجھا احساس
نہ آج کا تھا بھروسہ نہ کل پہ تھا وشواس
یہ دَور دَور تھا یا جیسے رام کا بن باس
کئے پہ اپنے ستم خود ہی شرم سار ہوا
اُفق پہ وہ نیا خورشید آشکار ہوا

احسان رسول پوری




ذرا ٹھہریے
کیا آپ گلے کی تکلیفوں میں اکثر مبتلا رہتے ہیں اور اس کی وجہ سے سخت پریشان ہیں، لیکن یہ نہ سمجھئے کہ ایسی پریشان کن بیماری سے گلا کاٹ دینے سے ہی چھٹکارہ مل سکتا ہے۔ ذرا ٹھہریئے! خالص دیسی ادویات سے تیار کیا ہوا "ٹونسیلیکس" ایک بار، صرف ایک بار استعمال کر کے تو دیکھئے، پھر آپ کو گلے کے غدود بڑھ جانے، گلے کی سرسراہٹ، خراش، گلے کے ورم، زخم اور دوسرے تمام امراض کی شکایت نہیں رہے گی۔ اگر آپ کے علم میں کوئی ایسا مریض ہو جس کے گلے کے غدود (ٹانسلز) کا آپریشن ہونا ہے تو اُسے اِس دوا کے بارے میں ضرور بتایئے گا کیوں کہ پھر اُسے آپریشن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ چھوٹے بچے جو کھٹی میٹھی چیزیں کھا کر گلا خراب کر لیتے ہیں ان کے لئے بھی یہ بہت کام کی دوا ہے، ہر گھر میں اس کا رہنا بہت ہی ضروری ہے۔
قیمت فی شیشی: ۵ روپے
شمع (یونانی اینڈ آیورویدک) لیباریٹریز، لال کنواں، دہلی ۶

ظہیر کیفی امروہوی



اداس سویرا

ارجمند بیگم کی زندگی میں بھونچال سا آگیا تھا۔

پورے اٹھائیس سال بعد ان کے شوہر پاکستان سے وطن لوٹ کر آئے تھے۔ شادی کے تیسرے ہی دن وہ ان سے کچھ وعدے کرکے، کچھ محبت جتا کر چلے گئے تھے۔

ارجمند بیگم کے خواب وخیال میں بھی نہ تھا کہ ان کی شادی شدہ زندگی صرف تین دن اور دو راتوں کی ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ سچ تھا ــــ بہت صبر آزما سچ، ایسا سچ جس کو انہوں نے اپنی تمام امنگوں اور آرزوؤں کو سلاتے ہوئے برداشت کیا تھا اور وہ پورے اٹھائیس سال تک اپنے بدن کے جہنم میں سلگتی رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ یہی وہ لڑکی تھی جو بات بات پر قہقہے اور شوخیاں لٹاتی تھی۔

میکے کی سہیلیاں ڈھیر سے بچوں کی مائیں بن چکی تھیں۔ ان کی اولادوں کی بھی شادیاں اور منگنیاں ہو چکی تھیں ــــ لیکن ارجمند بیگم؟ وہ بھی سہاگن تھیں۔ ان کے بدن سے جو کونپل پھوٹی تھی۔ وہ اب بھرپور درخت بننے لگا تھا۔ لیکن دنیا نے کیا کیا چہ میگوئیاں اور سرگوشیاں نہ کی تھیں، دبے اور کھلے الفاظ میں ان کی عصمت و عفت کو داغ دار بنانے کی کوشش کی تھی مگر وہ چپ رہی تھیں، کیوں کہ وہ بے سہارا تھیں۔ ہمدردیوں سے محروم اپنوں اور

بیگانوں کی نگاہوں کی ماری ہوئی ایک بدنام عورت۔

پورے اٹھائیس سال گزر جانے کے بعد بھی یہ سیتا، "اگنی پریکشا" میں جل رہی تھی۔

شوہر نے ان کی کوکھ سے جنم لینے والے لڑکے کو اپنا چراغ، اپنا خون، اپنا بیٹا اور اپنے خاندان کی نشانی ماننے سے صاف انکار کر دیا تھا — تو کیا یہ جوان جہان لڑکا واقعی ارجمند بیگم کے کالے کرتوتوں کا پھل تھا، ان کی بھٹکی ہوئی جوانی کا نشان، ان کی پیاسی رُوح کی بے کلی کے ہاتھوں کسی اندھیری رات کا تحفہ، ان کی ہوس کی بانی کرن تھا۔

اس تیسری دہائی تک پہنچتے پہنچتے ارجمند بیگم کتنی بار دلدل میں پھنسی تھیں، اس کا حساب کسے یاد ہوگا۔ کتنی بھوک اور بیماری محنت، تڑپ، اُداسی، نامُرادی، بے چارگی کو جھیل کر وہ اپنی جوانی کو کھنڈر میں تبدیل کرنے پر مجبور کر دی گئی تھیں۔ اس کا خیال کسے تھا، وہ کنوارپن کے رنگین، بے فکرے دن کہاں اُڑ گئے تھے، جن کو یاد کر کے وہ اپنا جی بہلاتی تھیں اور اپنی سہیلیوں کو تصور کی آنکھ سے دیکھا کرتی تھیں۔

ایک ایک سہیلی کی زندگی اُن کے سامنے تھی۔

یہ عذرا ہے — سولہ سال کی سنجیدہ لڑکی، جس کی آواز میں نغمگی اور تھرتھراہٹ کتنے ہی سوتے ہوئے جذبوں کو جگاتی رہی تھی۔ اس کی من موہنی صورت پر تو کتنی ہی اس کی ہم عمر سہیلیاں واری جاتی تھیں کتنے ہی لڑکے گلی کے چکر کاٹتے نظر آتے تھے۔ لیکن عذرا ان سب سے بے نیاز اپنے ذہن کی مٹھی کو بند کئے رہی تھی۔ اور جب اس نے یہ مٹھی اپنی سہیلیوں کو دکھائی تھی تو اس پر رنگِ حنا جیسے جیتے جاگتے خون کی طرح چھلک اور چمک اٹھا تھا — کتنے ہی لڑکوں کی چاہت کو زخمی کر کے عذرا نے ایک ایسے مرد کو اپنا صندلی جسم سونپ دیا تھا جو بدصورت ضرور تھا لیکن ایک ہزار روپے مہینہ کماتا تھا، اور ارجمند بیگم کو تعجب تھا کہ عذرا جیسی نفاست پسند لڑکی اس کوڑھ کو کیسے برداشت کرتی رہی ہے۔ شاید اپنی رُوح کے اس کوڑھ کو چھپانے کے لئے ہی وہ رنگین ساڑیاں پہنتی ہے۔ نت نئے میک اپ چہرے کے غلاف پر چڑھاتی ہے۔ جڑاؤ زیورات کو زیبِ تن کر کے ناز کا جھوٹا چولا پہنتی ہے لیکن ایک دن عذرا کی ساری پیاس بکھر کر رہ گئی تھی۔ وہ ایک ایسے مرد کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن گئی تھی جو اس کے شوہر کا دوست تھا اور اس کا محبوب۔ عذرا کے نام پر گلی، محلے عورتوں کی تقریبوں اور محفلوں میں کیا کیا تھڑی تھڑی نہ ہوئی تھی۔ چھ بچوں کی ماں بن کر بھی عذرا کی ذات سے یہ کلنک دُور نہیں ہو سکا ہے۔

اور یہ ایں بی بی رفیقہ۔ ان کو پرانی فلموں کے گیت گانے کا شوق تھا۔ کوٹھے پر لڑکیوں کو گدگدانا ہنسانا اس اٹھارہ سال کی لڑکی کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

رفیقہ، کامنی، زبیدہ، رابعہ، شاہدہ، نایاب، توصیفہ، کتنی ہی لڑکیاں کنیا پاٹھ شالے میں پڑھتی تھیں۔ رفیقہ بھی زندگی کی رنگینیاں نہ جھیل سکی تھی اور اس کی شادی کا سرحد پار کر دی گئی تھی۔ اب تک بھی اس کی باتیں عورتوں کے لئے جذبات کی تسکین کا سبب بنی ہوئی ہیں۔ جاتے وقت ارجمند بیگم سے مل کر وہ کتنا روئی تھی اور اپنے آنسوؤں کو آنچل سے پونچھ کر بولی تھی "ارجمند، کیا تم مجھے یاد رکھوگی؟ اپنی بے حیا، بے شرم رفیقہ کو — جس نے مردوں کی ہوس کو کبھی پرکھا بھی نہ تھا، اس لئے مردوں کی ضرورت کو وقت سے پہلے ہی سمجھ جایا کرتی تھی۔ اس صلے میں کیا کچھ بدنامی میرے ماتھے پر نہ جگمگاتی تھی۔ ارجمند، مجھے معاف کرنا کہ میں نے کیا کیا کھیل کھیلے۔ زندگی کو میں نے ایک کھیل ہی سمجھا تھا، مگر اب میں تم سے ہزاروں میل دُور رہ کر دکھ سکھ کی لمبی قید بھگتوں گی" پھر اپنے شوہر کے ساتھ رفیقہ بھی چلی گئی تھی۔ اس کی رنگین باتیں اور دل گداز یادیں ہی تو رہ گئی تھیں۔ اس کی شرارتیں اور شوخیاں ذہن کی چھت سے تنہائیوں میں ٹپکتی رہتی تھیں۔ رفیقہ بھی بچوں کی فوج میں گھر کر رہ گئی تھی۔ ایک شوخ و شریر زندہ دل لڑکی، ایک خشک، بے رُوح مرد کی غلامی بھگت رہی تھی۔

ارجمند بیگم نے اپنے کھنڈر مکان کے سناٹے میں بیسیوں بار اپنے دل اور ذہن کی ہمراز سہیلیوں کے بارے میں سوچا تھا یہ شاندار کھنڈر نما مکان۔ جس میں وہ بیاہ کر لائی گئی تھیں، جس میں دیوان خانہ تھا، باورچی خانہ تھا، غسل خانہ تھا، اندھیری کوٹھریاں لمبے چوڑے دالان، پچھلے پچھلے صحن، وسیع

...بڑھیاں، نوکر خادمائیں، مرغ، بشیر تمیز
...ر اور جانے کیا کیا الا بلا تھا۔ بہت کچھ
...قت کا عزت نکل گیا اور کچھ باقی بچا
ہے وہ کھنڈر نما یہ مکان ہے جس کی کڑیاں
...یدہ ہو چکی ہیں، چھت ڈھے گئی ہے، دیواریں
...یڑھی ہو چکی ہیں دروازوں کے کواڑ ٹوٹ
پھوٹ کر اپنی بیتی ہوئی کہانی کو ہر راہ گیر
سے بے محابا کہہ اٹھتے ہیں۔ یہ سہ دری ہے۔
بچپن کڑیوں کی لمبی سی محل سراؤں کے حق
...ہر کی یادگار ـــ یہ بھی تو اب اس کی نہیں
رہی ہے۔ اگر وہ اس کو کرائے پر نہ چڑھاتیں
...کس طرح گزر بسر کی راہ نکل سکتی تھی، کس
...رح وہ اپنے خوابوں کو پروان چڑھا سکتی تھیں
کیسے اپنی روح کے پرتو باقی رکھ سکتی تھیں؟

اس قلعہ نما بوسیدہ مکان کی تنہائیوں
...یں انہوں نے دکھ کی لمبی رسی کو بٹا ہے، حالات
کے الجھے دھاگوں کو سلجھانے کی کوشش
...کی ہے، درد کے کنویں میں جھانکتی رہی ہیں
...رتی، ابھرتی رہی ہیں۔ اسی مکان میں انہوں
نے آرزوؤں کے بن باس کو جھیلا ہے، ضرورتوں
کی خندق کو اپنے ہی ہاتھوں سے پاٹنے کی
...کوشش کی ہے، آبرو کی دلدل میں سہم سہم کر
...پھونک پھونک کے قدم رکھے ہیں، تب جا کر وہ
...ن غنچے کو مرجھانے سے بچا سکی ہیں۔ جو اب
...تناور درخت بن کر اس کی نگاہوں کے
سامنے لہلہا رہا ہے اور اس کی روح کو فرحت
...بخش رہا ہے۔ اس کا نام انہوں نے جگنو
رکھا ہے۔ کتنی راتوں کو ڈر ڈر، سہم سہم کر
انہوں نے گزارا ہے۔ اس کا حساب کہاں
...ہوا نظر آ سکتا ہے؟

لیکن اٹھائیس برس ... اس کا

شوہر کلب علی ان سے یہی سوال پوچھ رہا
ہے، بتاؤ۔ یہ لڑکا کون ہے؟"

ارجمند بیگم سسک اٹھی ہیں۔

انہوں نے سوچ رکھا تھا کہ وہ اسے دیکھ کر
نہال ہو جائیں گے، خوشی سے پھولے نہ
سمائیں گے، اپنی روح میں ہلچل، امنگ
اور محبت کے غبارے پھوٹتے ہمکتے پا کر
اس سے لپٹ جائیں گے، اور وہ سارے
گلے شکوے، دکھ درد محرومیاں، بے عزتیاں
بھول کر سرخ رو ہو کر فخر و انبساط کے جذبات
میں ڈوبتے ابھرتے ہوئے کہہ سکیں گی۔
"کیا آپ اپنی روح کی آسودگی، اور عکس
کو بھی نہیں پہچان سکتے؟"

لیکن کلب علی کے ٹیڑھے، نکیلے اور
مشتبہ ذہن سے اگلے ہوئے سوال کا جواب
ارجمند بیگم کی سسکیوں کے سوا اور کچھ نہ
تھا۔ کلب علی اپنی گھنی اور سفید مونچھوں
کی اٹھان کو مروڑتے ہوئے کرخت لہجے
میں پھر بولا، "عورت، مرد کے بغیر نہیں رہ
سکتی۔ یہ تو میں جانتا ہوں لیکن پاپ کے
پھل اگانا کیا اس کی ممتا ہے؟ نہیں، خالص
ہوس پرستی ہے۔"

"اللہ ـــ ذرا سوچ سمجھ کر میرے
زخم کو کریدیے۔ اس کی ٹیسوں سے میں ہلکان
ہو چکی ہوں۔ مرہم نہیں لگا سکتے تو۔ ۔ ۔"

"بکومت۔" کلب علی نے حساب فہمی
کی۔ "اٹھائیس برس تک تم اپنی من مانی کرتی
رہیں۔ کیا تم میری وفادار بیوی تھیں؟ کیا
تم میرے پاس خود چل کر نہیں آ سکتی تھیں
میں تمہیں محروم نہ کرتا، مالا مال کر دیتا۔ ساری
پیاس اور بھوک دور کرنے کی کوشش کرتا۔"

ارجمند بیگم سہمی سہمی سی شوہر کی طرف
رحم طلب نظروں سے تکنے لگیں۔ لیکن کلب
علی نے سفاکانہ لہجہ میں پھر کہا "میرا تمہارا
واسطہ تو اسی وقت ختم ہو گیا تھا جب تم نے
اس سپولیے کو اپنی کوکھ میں بٹھا لیا تھا،
مجھے اگر اپنے خاندان کے بزرگوں کی قبروں
کی زیارت کرنے کی آرزو نہ ہوتی تو تمہاری
منحوس شکل دیکھنے میں اب بھی واپس نہ آتا،
تم میرے خاندانی بزرگوں کی ہڈیوں تک
کو نیلام کر کے بھی مجھ سے یہ امید کیوں کرتی
رہیں کہ میں تم سے کوئی تعلق جوڑ لوں گا۔
ہرگز نہیں۔ یہ عالی شان مکان، کسبیوں
کے لئے نہیں بنا تھا، بیگموں کے لئے ان
کی اطاعت شعار زوجیت اور اس کے
تحفظ کے لئے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے مکان
کی ایک ایک اینٹ ان آبرو پر مٹنے والی
عورتوں کی یادگار ہے جو شوہر کی وفادار
بیویاں بنی رہیں، جنہوں نے مرتے دم تک
غیر مرد کی جانب دیکھا بھی نہیں۔ کہاں منہیاں
نبار ... تک ان کا پور بھی نہیں دیکھ
سکے۔ لیکن تم جیسی آبرو باختہ عورت اس
مکان کے ذرے ذرے کو ننگا کرتی رہیں اور
شرمندہ نہ ہوئیں۔ بس اب میں اور نہیں
سہہ سکتا۔ اب اس کا فیصلہ ہو ہی جائے
کہ تم ۔ ۔ ۔"

"اللہ! ذرا ٹھہریئے۔" ارجمند بیگم،
تڑپ کر اٹھیں، اور اپنی کوٹھڑی میں جا گھسیں
۔ کلب علی دندناتے ہوئے پیچھے پیچھے دوڑے
ارجمند بیگم ... ہاتھوں
میں کاغذات کا پلندہ تھا۔ وہ پہلی بار بڑی
جرأت سے بولیں۔ آپ کو مذہب نے میرا

سرتاج، میرا مالک، میرا رکھوالا، میرے کپڑے لتے، روٹی اور پرورش کا آقا بنایا ہے۔ لیکن کیا آپ نے یہ سب کچھ مجھے دیا ہے؟ یاد کیجئے اس پہلی رات کو۔ جب آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہیں دھوکا نہیں دوں گا، دکھ نہیں پہنچاؤں گا، بھولوں گا نہیں۔ آپ نے کتنی بڑی قسم کھائی تھی کہ تمہاری کوکھ سے پیدا ہونے والے کو بے سہارا نہیں ہونے دوں گا اگر اپنے قول سے پھروں گا تو امام کی قسم اپنی ولدیت کے ساتھ دغا کروں گا۔ جانے دیجئے اس طرح کے قول اور قسمیں تو مردوں کے وہ ہتھکنڈے ہیں جن کے ذریعہ وہ عورت کو عمر قید میں مبتلا رکھتا ہے، خود بے وفائی کرکے اس سے پاکیزگی اور وفاداری کا تقاضہ کرتا ہے۔ نکاح کے الہامی وعدے اور الفاظ، کیا صرف عورت کے ہی یاد رکھنے کے لئے مذہب اور مرد نے بنا رکھے ہیں؟

کلب علی خاں چیخا۔ بکومت۔ ان ساری باتوں کے دہرانے کا اب کیا محل باقی رکھا ہے تم نے؟ تم نے شرافت کو ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ عزت کو نیلام کر دیا۔ بزرگوں کی روحوں کو تڑپا دیا۔ مذہب کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اگر تم کو کچھ یاد رہا تو بس یہی کہ تم ایک پیاسی عورت ہو آزاد عورت ہو، خود جیسا چاہو کر سکتی ہو۔ اپنے شوہر کی آنکھوں میں دھول جھونک کر بھی اس سے منکوح رہ سکتی ہو۔ ہرگز نہیں۔ کبھی نہیں میں ایسا مرد نہیں ہوں کہ ایک عورت کی ریاکار عیاش فطرت کو برداشت کر سکوں۔ میں ابھی امام صاحب کے سامنے تم کو . . .“

”میں کلام پاک کو حاضر ناظر جان کر کہتی ہوں“ ارجمند بیگم نے اس خلیم کتب پر ہاتھ رکھ کر کہنا شروع کیا۔ ”جگن تمہارا بیٹا ہے تمہاری رُوح کا پرتو، میری آرزوؤں کا چراغ، اس خاندان کا اجالا اور رکھوالا جس میں گھٹ گھٹ کر میں اٹھائیس برس تک جیتی مرتی رہی ہوں۔ دکھ جھیلتی رہی ہوں محنت مزدوری کرکے میں نے اس کو پالا پوسا پڑھایا اور لکھایا ہے، آپ کی عزت کو بچا کے رکھنے کے لئے میں نے دنیا کے کیا کیا طعنے نہ سہے ہیں، کیا کیا ذلتیں نہ اٹھائی ہیں۔ میرا کوئی بھی تو مددگار نہیں تھا۔ کتنے مردوں کی ہوسناکی کو دو ٹوک جواب نہیں دیا ہے کتنے ہی ایسے چہرے رہزن کر میرے سامنے آئے جو میری عزت لُوٹنے کے درپے تھے۔

وہ لوگ میرے اُجلے گناہوں میں لگے رہے مجھے ورغلانے، بہکانے کے لئے، کتنی عورتیں میرے پیچھے لگائیں۔ مجھے ہر طرح ہراساں اور پریشان کیا۔ انہوں نے میرے لئے بھوک کا مسئلہ کھڑا کیا، میرے بچے کو ناجائز کہلوایا مجھے رنڈی تک کہنے سے دریغ نہیں کیا۔ انہوں نے مکان کو ہتھیانے کی کوشش بھی کی۔ یہ کون لوگ تھے؟ کیا باہر کے تھے؟ غیر تھے؟ دوسرے مذہب کے تھے؟ جی نہیں —— یہ آپ کے اور میرے رشتے دار بہن، بھائی، چچا تایا، ماموں، ممانی خالہ خالو ہی تو تھے۔ گلی محلے کے باعزت لوگ تھے جن کی بیویاں اور بیٹیاں کیا کیا نہ گل کھلاتی رہی ہیں۔ ان کی لڑکیاں بہت معمولی تنخواہ پر اسکول کی ملازمت کر کے قیمتی ساڑیاں پہنتی ہیں، دوسرے شہروں میں جا کر تفریح کرتی ہیں، غیر کفو میں شادی رچاتی ہیں۔ مذہب کو فراموش کر کے بھی محرم مناتی ہیں، روزے رکھتی ہیں۔ مجلسیں منعقد کرتی ہیں، مرثیے، نوحے، منقبتیں سلام پڑھتی ہیں اور اتنا کچھ کر کے بھی رتی برابر بھی اپنے آپ کو نہیں سدھارتیں اور شرمندہ نہیں ہوتیں ان کے ماں باپ، بڑے سے غیر مردوں کی صحبت میں ان کو پہنچا کر بھی اپنے آپ کو عزت دار اور خاندانی شرافت کا ٹھیکے دار سمجھتے ہیں۔ اور یہی لوگ ایک بے سہارا بچے کو، ایک مظلوم و بے آسرا عورت کو طرح طرح بدنام کرتے ہیں، میں جو کچھ ہوں، میری روح اور ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے کسی سے کوئی دغا، فریب نہیں کیا، اپنے ماں باپ کے نام کو بٹہ نہیں لگایا۔ اپنی ہیلیوں کو میں نے سیدھے راستے پر چلنے کی ہمیشہ نصیحت کی ہے، کیونکہ میں خود کبھی نہیں بھٹکی۔ خدا کی قسم کبھی نہیں۔ مجھے ہر آن یہی خیال رہا کہ میں ایک شادی شدہ عورت ہوں، چاہے اپنے شوہر سے میری قربت مختصر ہی کیوں نہ رہی ہو۔ اس لئے ایک پل کو بھی آپ کے تصور، آپ کی یادوں، باتوں اور وعدوں سے غافل نہیں رہی ہوں۔ اگر آپ یقین کریں تو میں بتاتی ہوں کہ میں نے بیڑیاں بنا کر اپنے بچے کو دودھ پلایا ہے، کپڑے سی سی کر روٹی حاصل کی ہے، کاڑھنے بُننے کے کام کی مزدوری سے میں نے اپنے جگر کے ٹکڑے کو کتابیں خرید کر دی ہیں —— اللہ پاک کا شکر ہے کہ میں اس امتحان میں کامیاب اور کھری اتری ہوں اور بلند رہی ہوں . . . "

" ارجمند بیگم شدتِ جذبات سے روہانسی ہو گئیں۔ کلب علی، نرمی سے بولا۔ " جگن کہاں ہے؟"

" نوکری پر گیا ہے " ارجمند بیگم نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے شوہر کی طرف دیکھا اور مجھے گمان بھی نہ تھا کہ آپ برسوں بعد اچانک واپس آجائیں گے۔ جگن بے چارہ کیا جانے کہ آپ اس کے لئے زندہ ہیں اور آ گئے ہیں۔ میں نے اسے سب کچھ بتایا ہے لیکن وہ نہیں جانتا، یقین ہی نہیں کرتا کہ اس کا باپ زندہ ہے "

کلب علی جذباتی ہو کر بولا " خدا کی قسم میں نے تمہارے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے لیکن میں مجبور تھا۔ میں نے وہاں شادی کر لی تھی۔ قمر بڑی ظالم عورت ہے۔ مجھے یہاں آنے ہی نہیں دیتی تھی۔ ایسی ہی بچے بھی ہیں کہ وہ میری ذرا نہیں سنتے۔ ساتھ آنے کے لئے نہ وہ آمادہ ہوتی نہ بچے۔ جگن کیسا لڑکا ہے؟"

ارجمند بیگم تڑپ کر رہ گئیں اپنے مجروح جذبات کو چھپا کر آنسو پونچھنے لگیں۔

" تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا کیا اب بھی ناراض ہو؟" کلب علی نے ارجمند بیگم کو لپٹانے کی کوشش کی تو وہ اس سے الگ ہو کر بولیں " مجھے چند دن کی یہ خوشی ہی کافی ہے۔ کچھ دن آپ جگن کے اور میرے ساتھ ہنسی خوشی رہیں گے۔ بس اور مجھے کچھ نہیں چاہئے سوتے ہوئے جذبوں کو جگانے سے میں ثابت قدم نہیں رہ سکتی۔ للہ مجھے معاف کر دیجئے۔"

" میں اپنے ساتھ تم کو لے چلوں گا " کلب علی نے اپنا ہاتھ ان کی پشت پر پھیرتے ہوئے کہا۔

" نہیں " وہ تڑپ کر بولیں۔ میں اپنے بزرگوں کی قبروں سے دور نہیں جا سکتی۔ جگن کو ہر لمحہ نگاہوں کے قریب دیکھ کر مجھے کسی اور شے کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔"

کلب علی بڑی ندامت سے ارجمند بیگم کی طرف دیکھا اور بات پلٹتے ہوئے بولے۔ " ارے ہمارے مکان کے پاس جو صبا، رفیقہ، توصیفہ اور نہ جانے کون کون لڑکیاں رہتی تھیں اب کہاں ہیں؟"

" اپنے بچوں اور شوہروں کے ساتھ زندگی کی خوشیاں سمیٹ رہی ہیں، ارجمند بیگم بولیں " اب سب ہی تو میری طرح برہن نہیں ہوتیں۔"

کلب علی نے بے اختیار ارجمند بیگم کے رخسار پر سے اس اداسی کو چوم لیا جو اٹھائیس برس سے بسیرا کئے ہوئے تھی۔ ●●

بیگم وقار احمد خاں، گریڈیہہ، بہار

س۔ کیا پیار کرنا جرم ہے؟

ج پیار کا لفظ بہت بدنام ہے۔ بعض پیار عبادت میں داخل ہیں اور بعض پیار جرم ہیں۔ فیصلہ آپ کا ضمیر کر سکتا ہے۔ اگر پیار آپ کے دل میں کانٹے کی طرح چبھ جائے اور آپ کا ضمیر آپ کو ملامت کرے تو پیار جرم ہے۔

س۔ دوسروں کی برائی بیان کرنے سے انسان کو کیا محسوس ہوتا ہے؟

ج اپنی برائیوں کے بوجھ میں کچھ کمی محسوس ہوتی ہے۔

فاطمہ سلطانہ، واسع پور، دھنباد

س۔ انسان کی زندگی کانٹوں بھری کیوں ہوتی ہے؟

ج دراصل کانٹے انسان کا دامن کھینچ لیتے ہیں۔

محمد سعید منصوری، جمشید پور۔

س۔ بے وقوف عقلمند کب سمجھے جاتے ہیں؟

ج دولت حاصل کرنے کے بعد۔

س۔ نفرت ہمدردی میں کب بدل جاتی ہے؟

ج جب نفرت کی وجہ سمجھ میں آ جائے جس انسان سے ہم نفرت کرتے ہیں اگر اس کے برتاؤ کے پیچھے اس کی مجبوریاں دیکھیں تو یقیناً ہمیں اس سے نفرت کی جگہ ہمدردی پیدا ہو جائے گی۔

س۔ قسمت کب ساتھ چھوڑ دیتی ہے؟

ج جب قسمت پر سے اعتبار اٹھ جائے۔

محمد واصل آرزو، واسع پور، دھنباد

س۔ زندگی انسان کے لئے بوجھ کب بن جاتی ہے؟

ج جب زندگی میں دلچسپی باقی نہ رہے۔ یکسانیت بھی زندگی کو بوجھ بنا دیتی ہے

بزم بانو

اس عنوان کے تحت دلچسپ معلوماتی اور مذہبی سوالوں کے جواب دئے جاتے ہیں۔ ایک کاغذ یا پوسٹ کارڈ پر زیادہ سے زیادہ تین سوال لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کے لئے جگہ چھوڑیئے اور اپنا پورا نام پتہ لکھئے جس کاغذ یا کارڈ پر سوالات ہوں اس پر دفتر سے متعلق اور کوئی بات نہ لکھئے۔ اپنے سوالات اس پتہ پر بھیجئے: بزم بانو

ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی نمبر ۲

—— مدیرہ

س۔ حقیقت کو انسان نظرانداز کب کر دیتا ہے؟

ج جب حقیقت کڑوی ہو۔

تبسم شمسی، نگینہ، بجنور

س۔ کیا اپنی برادری سے باہر شادی گناہ ہے؟

ج خدا کی مخلوق میں صرف ایک ہی برادری ہے اور وہ ہے انسانوں کی برادری۔

انجم رحمان، مدراس ۱

س۔ انسان غلطی کر کے پشیمان ہونے پر بھی غلطی کیوں کرتا ہے؟

ج غلطی کرنا انسان کی فطرت ہے۔

س۔ کیا عقلمند انسان پر بھی بری صحبت کا اثر پڑ جاتا ہے؟

ج ہم صحبت کے اثر کو نہیں مانتے کنول کیچڑ میں رہ کر بھی صاف ستھرا رہتا ہے۔

س۔ انسان سب کچھ پانے کے بعد پھر بھی کمی محسوس کرتا ہے ایسا کیوں؟

ج خواہشیں خودکار مشین کی طرح ہوتی ہیں ایک پوری ہو جاتی تو دوسری خودبخود پیدا ہو جاتی ہے۔

بیگم رضیہ زبیر شمسی، محمد آباد گوہنہ

س۔ آدمی وقت کی اہمیت کو کب سمجھتا ہے؟

ج جب اس کے ذمے کوئی بڑا کام آ جائے

س۔ عورت کی محبت نفرت میں کب بدل جاتی ہے؟

ج جب اس کو مستقل بے وفائی کا سامنا کرنا پڑے۔

ایم۔ شبیر علی، سنبھل پور

س۔ موجودہ دور کی لڑکیاں شادی سے قبل لڑکوں کی کس چیز کو ترجیح دیتی ہیں۔ صورت، دولت یا عزت؟

ج ہر دور کی لڑکی مرد کی صورت کو اس کی دولت اور عزت پر ترجیح دیتی ہے۔ عام طور پر مرد کسی بھی عورت کے ساتھ زندگی گزار سکتا ہے لیکن عورت کے لئے مرد کو پسند کرنا بہت ضروری ہے۔

س۔ ذہنی پریشانیوں سے بچنے کی ترکیب بتائیں؟

ج ذہنی پریشانیوں کی جگہ دماغ ہے۔ دماغ میں ایک وقت میں ایک ہی خیال رہ سکتا ہے جب پریشانی حملہ کرے تو فوراً کوئی خوش آئند بات سوچنا شروع کر دیجئے۔

انوار وقار، گریڈیہہ، بہار

س۔ کسی کی مدد کرتے وقت کس بات کا خیال رکھنا چاہیئے؟

ج اسے اس بات کا خیال نہ ہو کہ آپ اُس کی مدد کر رہے ہیں۔ کسی پر احسان کا بوجھ ڈالنا اس سے دشمنی مول لینے کے برابر ہے۔

س۔ انسان کو اپنے آپ سے کب نفرت ہونے لگتی ہے۔

ج ماں باپ بہن بھائی عزیز و اقارب کی سازشوں کی وجہ سے۔

س۔ خوشی کا کارواں کب لٹ جاتا ہے؟

ج جب آپ رہزنوں کو دعوت دیں کہ وہ آپ کا کارواں لوٹ لیں۔

پروین سلطانہ، پیاری سلطانہ، آندھرا

س۔ انسان آنکھ رکھتے ہوئے اندھا کیوں بن جاتا ہے؟

ج بعض آنکھ ہوتے ہوئے اندھا بن جانا کارآمد ہوتا ہے۔ انگریزی کی ایک مثل ہے کہ جس کام میں لاعلمی بہتر ہو اس میں عقلمندی دکھانا بے وقوفی ہے۔

س۔ ہماری اُلجھنیں کس طرح دُور ہو سکتی ہیں۔

ج ہم نے ذہنی اُلجھنوں کو دُور کرنے کے لئے ایک ماہر نفسیات کی خدمات حاصل کرلی ہیں۔ آپ بانو کو اپنی ذہنی اُلجھن بھیج دیجئے۔

س۔ نہ ہم کو کوئی خوشی ملی اور نہ راحت اور نہ پیار ملا۔ جھوٹی محبت جھوٹا پیار دھوکے باز مرد کب تک چین کی بنسی بجا بجا کر خوش رہیں گے اور ہم کب تک دھوکا کھاتے رہیں گے بتائیے آپ ہماری کچھ مدد کریں؟

ج دھوکہ کھانا اور خوش رہنا چوکنا رہنے اور کڑھنے سے بہتر ہے۔

متین صدیقی، بہادر پورہ، حیدرآباد

س۔ اپنے پرائے اور پرائے اپنے کب بن جاتے ہیں؟

ج پہلی صورت اُدھار مانگتے وقت پیدا ہوتی ہے دوسری دولت مند ہونے کے بعد۔

س۔ نیکی کر کے ساتھ دریا میں ڈال کا لفظ کیوں منسلک ہے؟

ج اس لئے کہ نیکی کرنے کے بعد اسے بھول جانا افضل ہے۔

س۔ حاسدوں سے دوستی؟

ج حسد کو کم کر دیتی ہے۔

مس ثریا عراقی، شکر نگر (حیدرآباد)

س۔ اپنی تعریف کرتے رہنے والے انسان کو آپ کیا کہیں گے؟

ج ارسطو کا قول ہے کہ ایک مقام ایسا ہے جہاں سچ بولنا عیب ہے اور وہ ہے انسان کی اپنی تعریف کرنا۔ خواہ سچ ہی کیوں نہ ہو۔

س۔ وقت کی رفتار کب سست لگتی ہے؟

ج انتظار کی شدت میں۔

س۔ دل سے دوستی رکھنے والی سہیلی کی کیا پہچان ہے؟

ج وہ اپنے دل کی کوئی بات آپ سے نہ چھپائے گی۔

صبیحہ ممتاز، وارث علی گنج، نوادہ

س۔ امیر کی زندگی میں اور فقیر کی زندگی میں کیا فرق ہے؟

ج دونوں آرزوؤں کے غلام ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ امیر کی خواہشوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں اور فقیر کی خواہش صرف ایک وقت کی روٹی ہے۔

س۔ زندگی کامیاب کیسے بن سکتی ہے؟

ج ناکامی کے خیال کو کبھی دل میں جگہ نہ دیں۔

امتیاز احمد گیاوی، گیا، بہار

س۔ انسان خود کو دھوکہ کب دیتا ہے؟

ج جب حقیقت کا سامنا کرنا مشکل معلوم ہو۔ خود فریبی اگر تھوڑی مقدار میں بطور دوا کے استعمال کی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

س۔ کیا بانو صرف عورتوں ہی کا پرچہ ہے؟

ج بانو عورتوں کا پرچہ ضرور ہے لیکن جانبدار نہیں۔ اس لئے مرد بھی اسے شوق سے پڑھتے ہیں۔

ایس کے معین الدین، گلبرگہ

س۔ زندگی دولت سے خریدی جاتی ہے اور موت؟

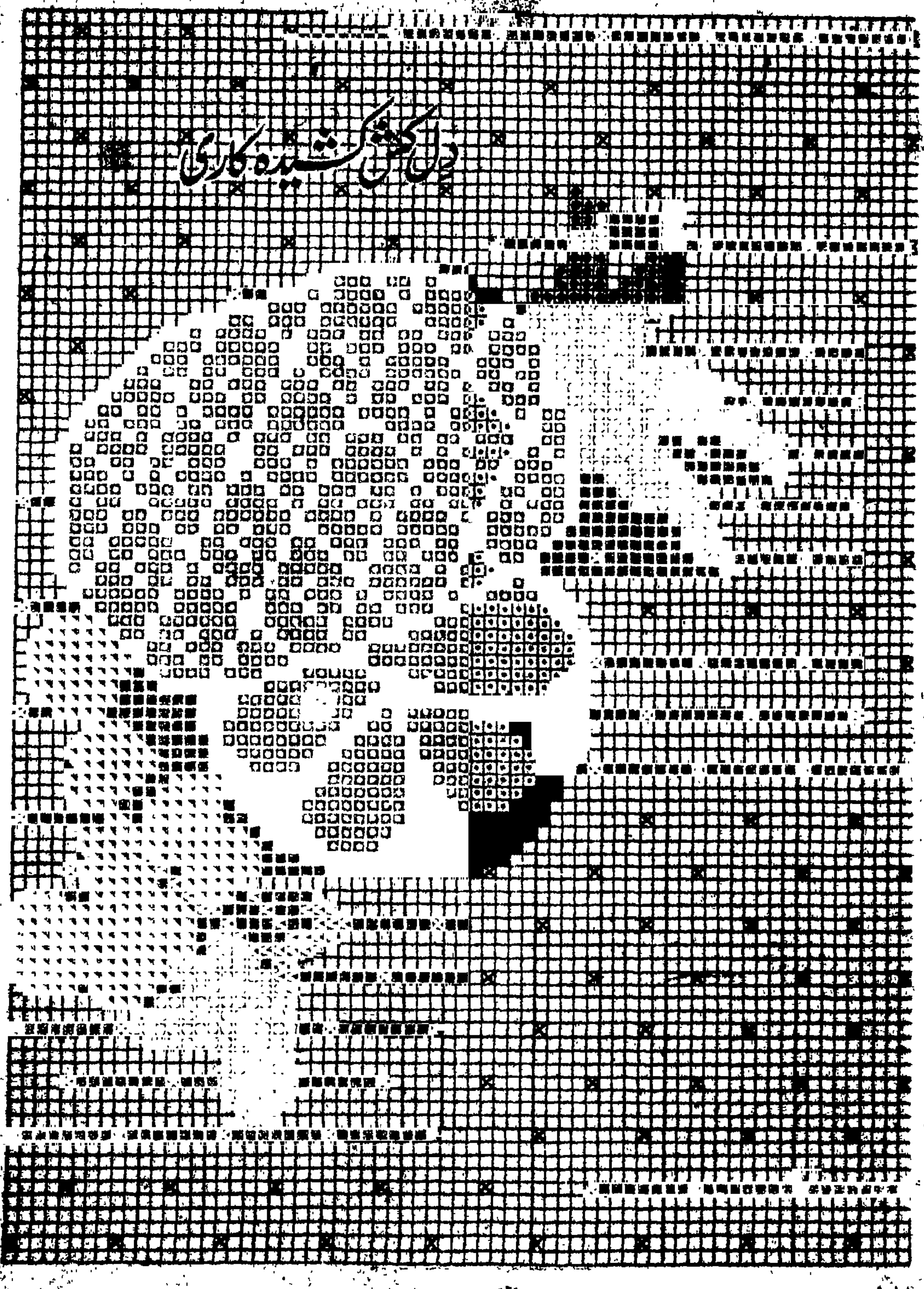
ج زندگی اور موت دونوں دولت کے قابو سے باہر ہیں۔

اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

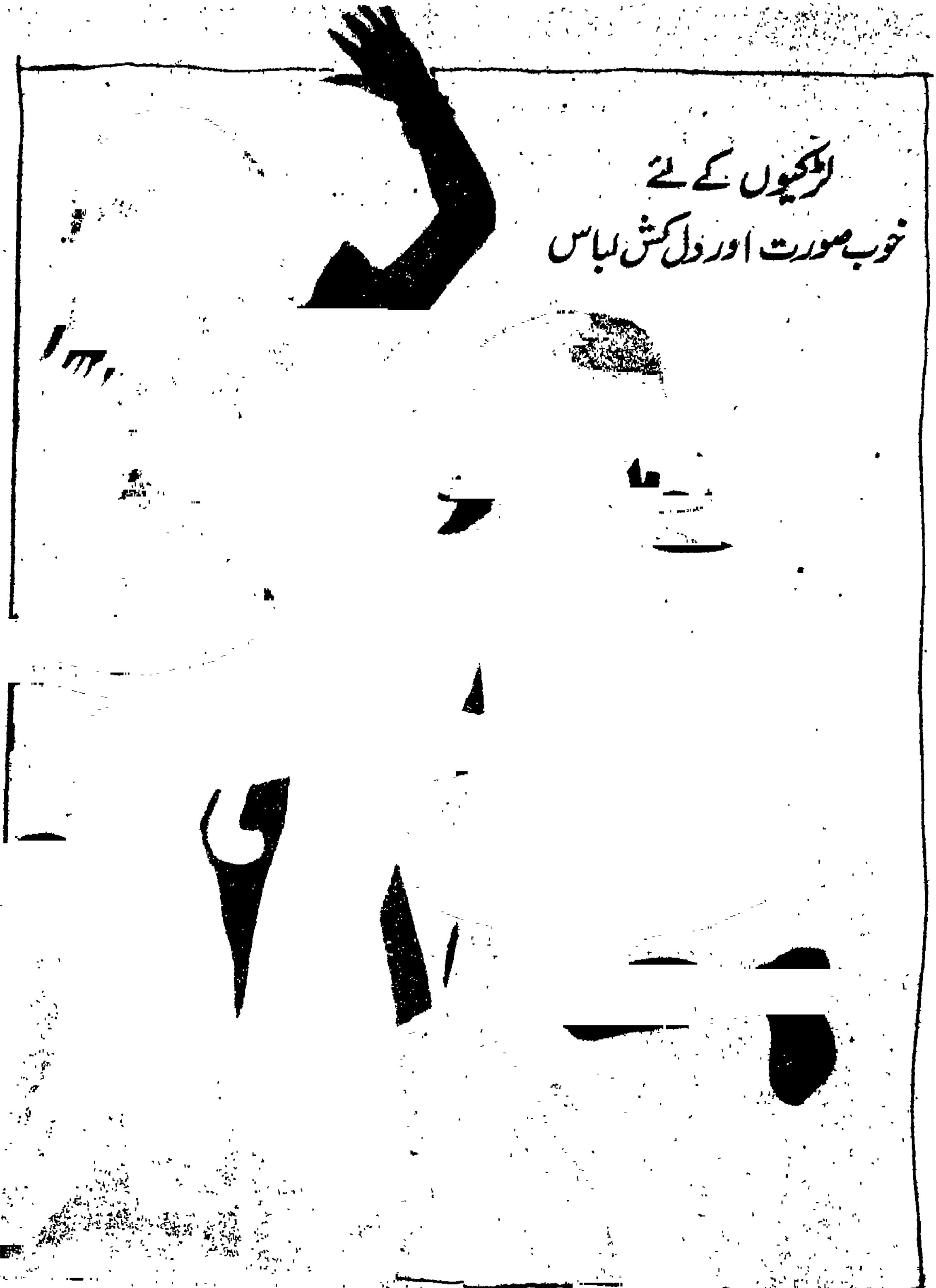
امین احمد انصاری، چکردھرپور

س۔ انسان دوسرے کی نظر میں کب گر جاتا ہے؟

ج جب وہ خود اپنی نظر میں گر جائے ●


دلکش کشیدہ کاری

لڑکیوں کے لئے
خوب صورت اور دل کش لباس



لڑکیوں کے لئے خوب صورت اور دِلکش لباس



روزمرّہ کی زندگی میں جِلد کی حفاظت کیسے کی جائے؟

بیوٹی کالج

اگر آپ اپنی جِلد کی تازگی کو برقرار رکھنے کے لئے بیوٹی سیلون میں جاتی ہیں تو آپ کے لئے گھریلو نسخوں کی ضرورت نہیں ہے، لیکن بیوٹی سیلون صرف بڑے شہروں میں ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ مہنگے ہوتے ہیں۔ ہم آپ کو ایسی ترکیبیں بتاتے ہیں جن سے آپ گھر میں رہ کر بھی اپنی جِلد کی حفاظت کر سکتی ہیں۔

سب سے پہلی بات کھانے کی احتیاط ہے۔ بہت سی عورتیں وزن کم کرنے کے لئے کم کھاتی ہیں۔ یہ طریقہ غلط ہے۔ وزن گھٹانے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ آپ کم کھائیں، سوال یہ نہیں کہ آپ کتنا کھاتی ہیں، سوال یہ ہے کہ آپ کیا کھاتی ہیں۔ اگر آپ آلو، پراٹھے، مٹھائیاں اور تلی ہوئی چیزیں کھاتی ہیں تو یہ کم مقدار میں بھی آپ کو نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ اگر آپ پھل، سبزیاں، دودھ اور خشک میوے کھاتی ہیں تو یہ زیادہ مقدار میں بھی آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔

ایک خاتون کے شوہر کا وزن اوسط سے زیادہ بڑھ رہا تھا۔ وہ خاتون کچھ عقل مند تھیں۔ انہوں نے شوہر کو کھانے سے نہیں روکا، بلکہ اُن کی خوراک کا رُخ موڑ دیا۔ شوہر جب دسترخوان پر بیٹھتے تو کھانا میز پر نہیں ہوتا تھا، بلکہ مختلف قسم کی سلاد رکھی ہوتی تھی۔ بیوی کہتیں کہ کھانے میں پانچ منٹ کی دیر ہے۔ خاوند کھانے کی میز سے نہ اُٹھتے بلکہ شغل گزارنے کے لئے سلاد سے شغل کرتے رہتے۔ سلاد میں ٹماٹر، پیاز، مولی، گاجر، اُبلے ہوئے پتے اور سلاد کے پتے ہوتے۔ دہی کا رائتہ ہوتا۔ شوہر کھانے کے لئے پکارتے رہتے اور اس کے ساتھ سلاد بھی کھاتے رہتے۔



شہناز حسین

۹۲-۱۱ گریٹر کیلاش، نئی دہلی۔ فون نمبر: ۶۱۱۶۴۴۳

جب سلاد کی پلیٹ صاف ہو جاتی تو بیوی کھانا لگاتیں اور ساتھ میں تاخیر کے لئے معذرت بھی چاہتیں۔ خاوند کا پیٹ تو سلاد سے بھر چکا ہوتا، وہ اب زیادہ کھانا کیسے کھاتے۔ تین چار لقمے کھا کر اُٹھ کھڑے ہوتے۔ انہیں بیوی کے پھوہڑپن پر غصّہ تو آتا لیکن کچھ ہی دنوں میں اُن کا وزن گھٹنا شروع ہو گیا۔ رفتہ رفتہ وہ ایسے کھانے کے عادی ہو گئے۔ بیوی کی عقل مندی سے سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹی۔

اگر آپ کھانا ایک دم کم کر دیں گی تو آپ کا معدہ بھوکا رہے گا۔ جسم کو خوراک نہیں پہنچے گی تو آپ کمزوری محسوس کریں گی۔ آپ یک سر چکنائی کھانا چھوڑ دیں گی تو یہ بھی بُرا ہے۔ جسم کو چکنائی کی بھی ضرورت ہے۔ خاص طور پر خشک جسم کے لئے ضروری ہے۔ جسم میں چکنائی نہیں ہو گی تو آپ کی جِلد پر بُرا اثر پڑے گا، اس کی شگفتگی ختم ہو جائے گی۔

کھانے کی احتیاط سے زیادہ ورزش کرنا ضروری ہے۔ آپ کم از کم دو کیلو میٹر روز چلیں۔ اس سے بہتر کوئی ورزش نہیں۔ یہ سب سے آسان اور سستا نسخہ ہے۔ چہل قدمی سے جسم کی فالتو چربی کم ہو جاتی ہے، خون کا دوران تیز ہو جاتا ہے، معدے میں نئی زندگی آ جاتی ہے۔ اگر کسی وجہ سے آپ یہ نسخہ نہیں آزما سکتیں تو پھر کام کاج میں ہی مشغول رہیے۔ اگر آپ کے گھر میں نوکر ہے تو اس سے کام لینے میں بخل کیجئے اور اس کا کچھ کام اپنے ذمّے لے لیجئے۔ گھر کی جھاڑ دینا، بستر ٹھیک کرنا، کپڑے دھونا بھی ورزش ہے۔

جب آپ بستر ٹھیک کریں تو پیٹ کو اندر کی طرف سکیڑ لیں۔ آپ گھر میں اِدھر اُدھر چل پھر رہی ہوں تو بھی کچھ لمحوں کے لئے پیٹ کو اندر کی طرف سکیڑ لیں۔ کھڑی ہو کر استری کریں یا کپڑے دھوئیں تو بھی ایسا کرنا مفید ہے۔ اس طرح پیٹ کے عضلات کی ورزش ہوتی ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر پیٹ کو اندر کی طرف سکیڑنے کی عادت ڈال لیں۔ اس طرح آپ کا پیٹ ڈھیلا نہ ہو گا۔

پیٹ کے بعد ہاتھوں کا نمبر آتا ہے۔ ہاتھ جسم میں سب سے زیادہ کام کرتے ہیں۔ یہ ہر وقت کھلے رہتے ہیں۔ دھوپ، پانی اور صابن ان کی غذا بن جاتا ہے۔ اگر آپ کی کھال خشک ہے تو زیادہ صابن کا استعمال ہاتھوں کو خشک اور کھُردرا بنا دے گا۔ خاص طور پر کپڑے دھونے کا صابن تو ہاتھوں کے لئے بہت مضر ہے۔ کپڑے دھونے کے صابن میں کاسٹک سوڈا ہوتا

ہے ۔ یہ سوڈا کھال کے لئے مضر ہے ۔ اگر آپ کو متواتر کپڑے دھونے پڑتے ہیں تو ربڑ کے دستانے پہن کر کپڑے دھوئیں ۔ یہ باریک ربڑ کے دستانے جنرل مرچنٹ اور انگریزی دوا فروشوں کے یہاں عام ملتے ہیں ۔ اس ترکیب سے آپ کے ہاتھ صابن کے مضر اثرات سے پاک رہیں گے۔

ہاتھوں کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ہاتھوں کی ورزش بھی ضروری ہے ۔ پانچوں انگلیاں خوب پھیلائیں ۔ اور ہاتھوں میں تناؤ پیدا کریں ۔ ۴، ۵ سیکنڈ انتظار کرنے کے بعد ڈھیلا چھوڑ دیں ۔ یہ عمل دس بار دہرائیں ۔ اس کے علاوہ انگلیوں سے انگریزی کا ہندسہ '8' لکھنے کی کوشش کریں ۔ ہوا میں انگلیوں کو اس طرح نچائیں جیسے آپ '8' لکھنے کی مشق کر رہی ہیں ۔ اس مشق سے انگلیاں خوب صورت ہو جاتی ہیں ۔

ہاتھوں کے بعد سر کی باری آتی ہے ۔ سر کو پہلے آگے کی طرف جھکائیں اور پھر پیچھے کی طرف جتنا جھکا سکتی ہیں جھکائیں ۔ سر کو پیچھے کی طرف جھکاتے وقت بھنوؤں کو اوپر کی طرف کھینچیں ۔ ۱۰ بار یہ عمل دہرائیں ۔ اس ورزش سے سر کے اعصاب چست ہو جاتے ہیں ۔ بال تیزی سے بڑھتے ہیں اور بالوں کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں ۔

آنکھوں کو آرام پہنچانا بھی ضروری ہے ۔ اگر آپ کتاب پڑھتے پڑھتے تھک گئی ہیں تو ہتھیلی کا کپ بنا کر آنکھوں پر رکھیں ۔ چند سیکنڈ اسی طرح آنکھوں کو بند رکھیں ۔ ہتھیلیاں آنکھوں سے مس نہ ہوں ۔ انہیں آنکھوں پر ڈھکنے کی طرح رکھیں ۔ چند سیکنڈ میں ہی آپ آنکھوں میں آرام اور سکون محسوس کریں گی ۔

اگر آپ کے ہونٹ گلابی اور تر و تازہ نہیں تو آپ یہ ورزش کریں ۔ نیچے کے ہونٹ کو کنارے کی طرف سے پیچھے کی طرف کھینچیں ۔ یہ کام ہاتھوں سے نہیں چہرے کے پٹھوں کی مدد سے انجام دیں ۔ پہلے دائیں طرف اور پھر بائیں طرف انہیں پھیلائیں ۔ اس دوران گلے کی کھال کو اوپر کی طرف کھینچیں ۔ یہ عمل دس بار دہرائیں ۔

آنکھوں کی ورزش کے لئے آنکھوں کی پتلیوں کو حرکت دیں ۔ پہلے پتلیاں دائیں کونے کی طرف لے جائیں اور پھر بائیں کونے کی طرف دس بار اسی طرح کریں ۔ پھر آنکھوں کی پتلیوں کو دائرے کی شکل میں گھمائیں ۔ پہلے دائیں طرف ۵ بار گھمائیں اور پھر بائیں طرف ۵ بار گھمائیں ۔ اگر آپ کسی تانگے یا موٹر میں بیٹھی سفر کر رہی ہوں تو پہلے بہت دور کسی چیز پر نظر جمائیں اور پھر فوراً اپنی سواری میں کسی قریب ترین چیز کو دیکھیں

اگر آپ گھر کی چھت پر کھڑی ہوں یا اوپر کی منزل پر رہتی ہوں جہاں سے دور دور دکھائی دیتا ہو تو اسی ورزش کو عمل میں لائیں ۔ پہلے دور کی چیز دیکھیں اور پھر قریب کی ۔

چہرے کے اعضا کے ساتھ جسم کی بناوٹ کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے ۔ قدرت نے انسان کی ریڑھ کی ہڈی کو سیدھا بنایا ہے لیکن انسان اپنی کم زوری اور بے توجہی سے اس میں خم پیدا کر دیتا ہے ۔ یہ خم عموماً بچے کی پیدائش سے چھ مہینے کے اندر ہی پیدا ہو جاتا ہے ۔

ہمارے ملک میں بچے سے بہت زیادہ پیار کیا جاتا ہے ، لیکن اس پیار کا طریقہ غلط ہے ۔ ہمارے یہاں بچے کو گود میں لئے پھرنے کا نام ہی محبت ہے ۔ جو رشتہ دار آتا ہے بچے کو گود میں اٹھا لیتا ہے ۔ ماں باپ بہن بھائی بے تحاشا بچے کو گود میں لئے پھرتے ہیں ۔ بچہ روتا ہے تو اسے کندھے سے لگا کر ٹہلاتے رہتے ہیں ۔

اس طرح بچے کی ریڑھ کی ہڈی میں خم آجاتا ہے کچی عمر میں بچے کو گود میں اٹھانے میں ریڑھ کی ہڈی متاثر ہو جاتی ہے ۔ مغربی ممالک کے والدین کو اس بات کی خاص تعلیم دی جاتی ہے کہ وہ بچے کو پہلے سال گود میں نہ اٹھائیں ۔ وہاں بچہ تمام دن اور تمام رات لیٹا رہتا ہے ۔ اسے صرف دودھ پلاتے وقت اور نہلاتے یا کپڑے پہناتے وقت ہی اٹھایا جاتا ہے ۔ باہر لے جاتے وقت بھی ماں باپ بچے کو گود میں نہیں لیتے بلکہ ایک جھولے میں لٹا دیتے ہیں ۔ جھولے کا ایک سرا شوہر کے ہاتھ میں رہتا ہے دوسرا بیوی کے ہاتھ میں ۔ اس طرح بازار میں پھرتے وقت بھی بچے کی کمر سیدھی رہتی ہوگی ۔ آپ نے مغربی ممالک کی عورتوں کو دیکھا ہوگا کہ بڑھاپے میں بھی ان کی کمر سیدھی رہتی ہے ۔ اس کا راز ان کی صحیح تربیت میں ہے ۔ آپ جب بھی گھر میں بیٹھ کر باتیں کریں ، کتاب پڑھیں یا سلائی کریں تو سیدھی بیٹھنے کی کوشش کریں ۔ ابتدا میں آپ کو کچھ کوفت محسوس ہوگی ، لیکن آہستہ آہستہ آپ کو سیدھا بیٹھنے کی عادت پڑ جائے گی ۔

اگر آپ کرسی پر بیٹھتی ہیں تو اس طرح بیٹھیں کہ رانیں ایک دوسرے سے ملی ہوں ۔ پیٹ اندر کی طرف ہو اور کمر سیدھی ہو ۔ کمر میں خم ہرگز نہ آنے دیں ۔ ابتدا میں کچھ تکان محسوس ہو تو کرسی کی پشت پر ٹیک لگا کر سیدھی کریں ۔ اگر آپ فرش پر بیٹھتی ہیں تو ابتدا میں دیوار کے سہارے کمر کو سیدھا کر کے بیٹھیں ۔ رفتہ رفتہ دیوار کا سہارا چھوڑ دیں اور سہارے کے بغیر سیدھی بیٹھنے کی کوشش کریں ۔

چہرے پر میک اپ کرنے کی عادت نہ ڈالیں ۔ زیادہ میک اپ جلد کے لئے زہر ہے ۔ خاص طور پر فاؤنڈیشن کا استعمال ۔ متواتر استعمال کرنے سے جلد کے مسامات بند ہو جاتے ہیں ۔

جلد کو ہوا کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی پھیپھڑوں کو۔ مسامات بند ہو جائیں تو آکسیجن جلد میں داخل نہیں ہوتی اور کاربن ڈائی آکسائڈ باہر نہیں آتی۔ نتیجے میں کھال مردہ ہو جاتی ہے۔ ایسی کھال گھوڑے کے چمڑے کے مشابہ ہوتی ہے۔ اگر آپ کی جلد پر دھبے یا سیاہ دھبے ہیں تو ان کو چھپانے کے لئے میک اپ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن گھر پہنچتے ہی سب سے پہلا کام یہ کریں کہ میک اپ اتار دیں۔ اگر آپ کسی پھول کو پلاسٹک کے تھیلے میں بند کر کے اس کا مونہہ بند کر دیں تو کیا ہوگا؟ پھول دیکھتے ہی دیکھتے مرجھا جائے گا۔ اگر آپ کو ہر وقت میک اپ میں رہنے کی عادت ہے تو اس بری عادت سے جلد چھٹکارہ پانا ضروری ہے۔ میک اپ ایک قسم کی بیساکھی ہے جس کے سہارے خوبصورتی کو زندہ رکھا جاتا ہے۔ آپ یہ بیساکھیاں نکال کر پھینک دیجئے۔ اکثر عورتیں کہتی ہیں کہ ان کے چہرے کی جلد زرد ہے یا بہت سفید ہے، اس لئے اس میں سرخی لانے کے لئے یا صحت کی جھلک پیدا کرنے کے لئے میک اپ کرنا ضروری ہے۔ چلئے ہم ان کی بات مان لیتے ہیں لیکن انہیں بھی میک اپ کرتے وقت سیال فاؤنڈیشن سے پرہیز کرنا لازم ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ بلش آن استعمال کر سکتی ہیں۔ اس ترکیب سے ان کے چہرے پر سرخی جھلکنے لگے گی اور جلد بھی فاؤنڈیشن کے مضر اثرات سے محفوظ رہے گی۔ کچھ عورتوں کا بیان ہے کہ وہ قدرتی عناصر مثلاً دھوپ اور ٹھنڈی یا گرم ہوا سے جلد کو بچانے کے لئے میک اپ کرتی ہیں۔ یہ بات غلط ہے۔ اگر قدرت کو جلد کو عناصر سے بچانا منظور ہوتا تو وہ انسان کی جلد پر ایک تہہ اور چڑھا سکتی تھی۔ یہ فالتو تہہ جلد کی بخوبی حفاظت کر سکتی تھی، لیکن ایسا نہیں ہے۔ جلد پر نمی کا اثر لانے کے لئے موائسچرائزر ضروری ہے۔ جلد پہ نمی برقرار رہے اور اس کے لئے آکسیجن بند نہ ہو۔ جلد کی حفاظت کے لئے یہ دونوں ہی باتیں ضروری ہیں۔

گرمیوں کا موسم شروع ہونے والا ہے۔ اس موسم میں جلد کو دھوپ سے بچانا ضروری ہے۔ اس کے لئے ایک اچھی کریم کا استعمال کریں۔ یہ کریم دھوپ کی الٹرا وائلٹ شعاعوں سے جلد کو محفوظ رکھتی ہے۔ جلد کو صاف کرنا اور اسے غذا فراہم کرنا اس کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ ہم سمجھتے ہیں۔ جلد بھی انسان کی طرح بوڑھی ہو جاتی ہے۔ انسان اپنی جوانی برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اپنی جلد کی طرف سے عموماً بے توجہی برتتا ہے۔

انسان کی جلد میں کروڑوں خلئے ہوتے ہیں۔ ان خلیوں کی عمر دو برس ہوتی ہے۔ دو برس کے بعد ان میں دوبارہ زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ خلئے سیلس کہلاتے ہیں۔ اس طرح پچاس برس کی عمر میں ۱۰۰ بار ان خلیوں کو دوبارہ زندگی ملتی ہے۔ جب یہ خلئے کم تعداد میں پیدا ہوتے ہیں تو بڑھاپا آجاتا ہے۔ خلیوں کی موت اور زندگی کے تناسب کا نام ہی بڑھاپا ہے۔ جوانی میں جتنے خلئے مرتے ہیں، اتنے ہی دوبارہ پیدا ہو جاتے ہیں، لیکن بڑھاپے میں جتنے خلئے مرتے ہیں اس سے کم پیدا ہوتے ہیں۔ نتیجے میں کھال میں جھریاں پڑ جاتی ہیں۔ گوشت سوکھ کر لٹک جاتا ہے اور بڑھاپا اپنے قدم جما لیتا ہے۔ خلیوں کی موت کا سلسلہ دراصل انسان کی پیدائش سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن ۲۵ برس کی عمر کے بعد اس میں تیزی آجاتی ہے۔ جوانی میں جلد تر و تازہ رہتی ہے، چہرے پر رونق رہتی ہے۔ اکثر عورتیں جوانی میں جلد کی طرف سے بے توجہی برتتی ہیں۔ وہ اپنی تر و تازہ جلد کو دیکھ کر مطمئن ہوتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ ابھی سے پرہیز کی کیا ضرورت ہے۔ بڑھاپے میں دیکھا جائے گا۔ یاد رکھئے پرہیز علاج سے بہتر ہے۔ بیماری سے پہلے پرہیز کر لیا جائے تو بیماری کی نوبت ہی نہیں آتی۔ اگر آپ نوجوانی میں جلد کی حفاظت کریں گی تو آپ کو بڑھاپے میں پریشانی نہیں ہوگی، ورنہ بڑھاپے میں علاج کرنا مردہ میں جان ڈالنے کے مترادف ہوگا۔

ہمارے ملک میں جلد سے متعلق بے خبری عام ہے۔ عورتوں کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ جلد کے لئے کریم کلینسنگ اور موائسچرائزنگ بہت ضروری ہے۔ روزانہ جلد کی بھرپور صفائی اور اسے مناسب مقدار میں نمی پہنچانا ضروری ہے۔ کسی ادھیڑ عمر کی عورت کو اگر یہ سب کچھ بتایا جائے تو وہ یہی کہے گی کہ مجھے چالیس سال سے کچھ نہیں ہوا، اب ایسی کیا آفت آگئی؟ یہ نقطۂ نظر جہالت پر مبنی ہے۔ جب جلد پر شباب آتا ہے تو غضب کی بہار دیتا ہے۔ تر و تازہ چہرہ اور شگفتہ و شاداب جلد جوانی کا حسن دوبالا کر دیتے ہیں۔ مگر افسوس یہ رونق عارضی ثابت ہوتی ہے۔ جوانی میں جن عورتوں کے چہرے پھول کی طرح شاداب رہتے تھے وہ ادھیڑ عمری میں بے رونق ہو جاتے ہیں۔ لوگ ان کو دیکھ کر افسوس کا اظہار کرتے ہیں، لیکن اب پچھتانے سے کچھ حاصل نہیں۔ جلد کی رونق ایک دفعہ چلی جائے تو پھر واپس نہیں آتی، اس لئے ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ جلد کی حفاظت کیجئے۔ خدا کے اس عطیہ کی قدر کیجئے، اس کی طرف سے بے توجہی مت برتئے۔

اگر آپ کی جلد خشک ہے تو صابن کا استعمال بند کر دیں۔ صابن جلد کا سارا قدرتی روغن صاف کر دیتا ہے۔ صبح کو ایک ایسی کلینزنگ کریم استعمال کریں جس میں لیموں ہو۔ ... کریم لگانے کے بعد گیلی روئی کے ٹکڑے سے ...

ڈالیں۔ گیلی روئی سے کریم کو صاف کرنا بہت ضروری ہے۔ اگر روئی خشک ہوگی تو وہ جلد کی ساری نمی جذب کرلے گی اور جلد پھر خشک رہ جائے گی۔ کلینزنگ کریم کے بعد موائسچرائزر لگائیں۔ یہ سارے چہرے پر لگانا چاہئے — خاص طور پر آنکھوں کے نیچے والے حصے میں۔ ہم کئی دفعہ بتا چکے ہیں کہ آنکھوں کے نیچے والے حصے میں چکنائی کے غدود نہیں ہوتے۔ یہ حصہ ہمیشہ خشک رہتا ہے۔ قدرت کا یہ راز سمجھ سے بالاتر ہے۔ نمی سے محروم رہنے کی وجہ سے یہاں سب سے پہلے سیاہ حلقے اور جھریاں پڑتی ہیں۔ کبھی کبھی اس جگہ ویسلین یا پھر بادام یا زیتون کا تیل لگائیں۔ کچھ دیر کے بعد گیلی روئی سے صاف کردیں۔

دھوپ سے بچنا بھی ضروری ہے۔ دھوپ جلد کی دشمن ہے۔ اگر آپ دھوپ سے پرہیز نہیں کرتیں تو آپ کی جلد بہت جلد خراب ہوجائے گی۔ اگر آپ ابھی جوان ہیں اور آپ کے بڑھاپا آنے میں کافی وقت ہے تو دھوپ اس عمل کو تیز تر کرسکتی ہے۔ دھوپ سے قبل از وقت ہی آپ کی کھال چمڑے کی طرح سخت اور سانولی ہوجائے گی۔ یہ نظریہ کہ "مجھے پروا نہیں" بہت خطرناک ہے۔ گرمیوں میں جسم سے پسینہ کافی مقدار میں خارج ہوتا ہے۔ اس کی تلافی کے لئے دن میں کم از کم ۸ گلاس پانی پئیں، اس طرح جسم کی نمی جو دن میں ضائع ہوجاتی ہے، برقرار رہے گی۔

اگر آپ آنکھوں پر آئی لائنر یا آئی شیڈو لگاتی ہیں تو پہلے پوڈر پر فاؤنڈیشن لگائیں تاکہ آئی لائنر یا آئی شیڈو کا رنگ جلد پر برا اثر نہ ڈالے۔ گھر پہنچ کر آئی شیڈو یا آئی لائنر فوراً اُتار دیں۔ میک اپ اُتارنے کے لئے کسی اچھی کلینزنگ کریم کا استعمال کریں۔ سوتے وقت میک اپ نہ اُتارنا جلد کے لئے موت کا حکم رکھتا ہے۔ اس لئے میک اپ اُتارے بغیر ہرگز نہ سوئیں۔ گیلی روئی سے آنکھوں کے نیچے کا حصہ ضرور صاف کریں۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو صبح کو آپ کی آنکھ سوج جائے گی۔ یہ سوجن آکسیجن کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ کریم دس منٹ سے زیادہ چہرے پر نہ لگائیں۔ جلد کو کریم کی جتنی ضرورت ہوتی ہے، ۱۰ منٹ میں وہ اُسے جذب کرلیتی ہے۔ اگر آپ کریم کا ایک جار بھی استعمال کریں گی تو جلد اپنی ضرورت کا حصہ لے کر باقی چھوڑ دے گی۔

اگر آپ کی جلد روغنی ہے تو آپ مارگو سوپ (نیم کا صابن) استعمال کریں۔ مارگو سوپ سے چہرے کو دھونے کے بعد یوڈی کلون لگائیں۔ تاکہ چہرے کی چکنائی جلد پر نمودار نہ ہو۔ سوتے وقت چہرے کو ہمیشہ دھو کر سوئیں۔ اکثر عورتیں جو گھر سے باہر نہیں نکلتیں، اس بات سے غفلت برتتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ جب ہم باہر نہیں گئے اور چہرے پر دھول اور مٹی نہیں ہے تو ہمیں بار بار چہرے کو دھونے کی کیا ضرورت ہے۔ روغنی جلد کو خشک جلد سے زیادہ دھونا ضروری ہے۔

اگر چہرے پر مہاسے ہوں تو مہاسوں کے لئے کوئی کریم یا لوشن استعمال کریں۔ مہاسوں کو دبا کر ختم نہ کریں، یہ جلد کے لئے خودکشی کا حکم رکھتا ہے۔

سوال و جواب

فرزانہ نسرین، آگرہ

س : میرا پیٹ بہت پھول جاتا ہے۔ ایک وقت میں تین چار گلاس پانی پینا کیا نقصان دہ ہے؟

ج جی ہاں — آپ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک ایک گلاس پانی پیا کریں۔ اکٹھا پانی پینے والوں کا پیٹ بڑھ جاتا ہے۔

یاسمین کوثر، امروہہ

س : سوتے وقت اگر گرم گرم دودھ پیا جائے تو آپ کے خیال میں صحت کے لئے اچھا ہے؟

ج جی ہاں — سوتے وقت گرم دودھ پینے سے نیند اچھی آتی ہے۔ اس کے علاوہ دودھ پینے سے چہرے میں دلکشی پیدا ہوتی ہے۔

ثریا پروین، حیدرآباد

س : کیا دہی صحت کے لئے ضروری ہے؟

ج دہی ایک بہترین نعمت ہے۔ چاہے آپ یوں ہی کھائیں یا دہی کی لسی بنا کر پئیں۔ گرمیوں میں دہی جسم کی خشکی دور کرتی ہے اور جلد تروتازہ کرتی ہے۔

نسیم بیگم، میرٹھ

س : میرے بال گرمیوں میں بہت خشک ہوجاتے ہیں۔

ج آپ زلفی شیمپو سے سر دھویا کریں۔ آپ کے بال ریشم کی طرح ملائم ہوجائیں گے۔

رشیدہ عباس، بدایوں

س : مجھے بارہ مہینے نزلہ زکام کی شکایت رہتی ہے۔ علاج بتلایئے؟

ج صبح نہار منہ آدھے گلاس نیم گرم پانی میں ایک لیموں کا رس نچوڑ کر روزانہ پیا کریں۔ ۱۵، ۲۰ دن کے استعمال سے ضرور فائدہ ہوگا۔

○○

دیس بدیس کی خبریں

عورتیں دل کی بیماری میں کم مبتلا ہوتی ہیں

امریکہ میں ایک ادارے کی طرف سے اعداد و شمار جمع کرنے کے بعد یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ عورتیں مردوں کے مقابلے میں دل کی بیماریوں میں بہت کم مبتلا ہوتی ہیں، چنانچہ امریکہ بھر میں پچاس سال سے کم عمر والے دل کے ہر تین سو مریضوں میں عورت مریض کا تناسب صرف ایک ہوتا ہے، اس رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مردوں میں دل کی بیماری زیادہ ہونے کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہ عورتوں سے کہیں زیادہ ذہنی کشیدگی اور اعصابی تناؤ کا شکار رہتے ہیں۔ ان کا یہی اعصابی تناؤ بڑھ کر دل کی بیماری کا سبب بن جاتا ہے۔

وہ سیب سے مورتیاں بناتی ہیں

لوگ سیب کو کھاتے ہیں لیکن برطانیہ کی ۶۵ سالہ خاتون مسز ویرا دارام سیبوں سے خوب صورت مجسمے اور مورتیاں بناتی ہیں۔ انھوں نے یہ ہنر شمالی امریکہ کے ریڈ انڈین قبائلیوں سے سیکھا تھا۔ پھر جب وہ اپنے شوہر کے ہمراہ لندن واپس آ گئیں تو برابر اس کی مشق بھی کرتی رہیں اور اسی مشق کے نتیجے میں اب وہ ریڈ انڈین کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوب صورت مورتیاں بنا لیتی ہیں۔ انھوں نے سیبوں سے ملکہ برطانیہ، برطانیہ کے عظیم لیڈر چرچل اور سابق وزیر اعظم ایڈورڈ ہیتھ کے مجسمے بنا کر لوگوں سے زبردست خراج تحسین وصول کیا ہے۔ ویرا دارام کا کہنا ہے کہ سیب سے مورتیاں بنانے میں ان کے کھانے سے کہیں زیادہ مزہ آتا ہے۔ صرف اپنے اپنے شوق کی بات ہے۔

روسی عورتوں میں مٹاپے کا مرض بڑھ رہا ہے

روس سے شائع ہونے والے ایک میگزین "سدوروتی" نے یہ حیرت انگیز انکشاف کیا ہے کہ روس میں چالیس سال سے تجاوز کر جانے والی عورتوں کی آدھی سے بھی زیادہ تعداد مٹاپے کا شکار ہے اور یہ حال اس وقت ہے جب اکثر عورتوں کو یہ بات معلوم ہے کہ اس عمر میں وزن بڑھنے کی بجائے گھٹنا چاہئے۔ محض بے پروائی کی وجہ سے زیادہ تر عورتیں اپنا وزن غیر ضروری طور پر بڑھا لیتی ہیں۔ اس میگزین نے لکھا ہے کہ اس مرض کے شکار بہت سے وہ مرد بھی ہو جاتے ہیں جو اپنی صحت کا زیادہ خیال نہیں رکھتے، کیوں کہ وزن کی زیادتی کسی مرض کی وجہ سے نہیں ہوتی، بلکہ زیادہ کھانے، ورزش نہ کرنے اور سونے سے پہلے روغنی غذاؤں کے استعمال کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس میگزین نے یہ بھی لکھا ہے کہ مٹاپا اور وزن کی زیادتی تندرستی کی علامت نہیں بلکہ کمزوری و سستی کی نشانی ہے اور ایسے لوگوں کو بیماریاں بڑی آسانی کے ساتھ دبوچ لیتی ہیں۔

عورتوں نے تعلیمی میدان میں ریکارڈ توڑ ترقی کی ہے

ایک امریکی خاتون پیٹریشیا میکنگ نے دنیا بھر میں عورتوں کی تعلیمی ترقی کا جائزہ لیتے ہوئے یہ دلچسپ انکشاف کیا ہے کہ گذشتہ پچاس برس کے دوران تعلیمی اور دیگر میدانوں میں عورتوں نے نمایاں ترقی کی ہے۔ مثال کے طور پر مصر میں آج سے پچاس سال پہلے صرف ۴۳ عورتیں پڑھی لکھی تھیں لیکن اب پڑھی لکھی عورتوں کی تعداد پانچ لاکھ سے بھی زیادہ ہے۔ اسی طرح جاپان میں ۱۹۵۰ کے مقابلے میں اب یونیورسٹی میں پڑھنے والی لڑکیوں کی تعداد دوگنی ہو چکی ہے اور افریقہ کے ایک ملک نائجیریا میں اُن کی تعداد تین گنا بڑھ گئی ہے جب کہ پاکستان میں چار گنا اور تھائی لینڈ میں پانچ گنا ہو گئی ہے۔ اسی طرح ہندوستان میں بھی یونیورسٹی تک تعلیم حاصل کرنے والی لڑکیوں کی تعداد میں تقریباً پانچ گنا کا اضافہ ہوا ہے۔ اس تعلیمی ترقی کا واضح مطلب یہ ہے کہ عورتوں میں بیداری کی لہر کافی تیز ہے اور انہوں نے تعلیمی اور سماجی میدانوں میں ریکارڈ توڑ ترقی کی ہے۔ چنانچہ آج دنیا بھر میں ڈاکٹروں کی ۳۰ فی صد تعداد لیڈی ڈاکٹروں پر مشتمل ہے۔ کچھ یہی حال زندگی کے دوسرے شعبوں کا بھی ہے۔

عالمی صحت کے لئے انعام پانے والی پہلی خاتون

پچھلے مہینے تاریخ میں پہلی بار عالمی صحت کی تنظیم نے اپنا سب سے بڑا انعام، "بیرہ..." جو دس ہزار ڈالر پر مشتمل ہے، بین الاقوامی

شہرت کی مالک ایک خاتون ڈاکٹر روزالین یالو کو دیا ہے۔ ڈاکٹر روزالین یالو ایٹمی فزکس کی ماہر ہیں۔ بیماریوں اور موت کے بڑے بڑے اسباب کا تناسب گھٹانے کے سلسلے میں انہوں نے قابل قدر تحقیقات کی ہیں ان کا سب سے بڑا کارنامہ چیچک جیسی بھیانک بیماری کے اسباب کا پتہ لگا کر اس کی مکمل بیخ کنی کرنا ہے اور ان کی کوششوں کی بدولت آج دنیا کے بیشتر ممالک سے اس موذی بیماری کا تقریباً خاتمہ کیا جا چکا ہے۔

ماسکو میں عورتیں زیادہ، مرد کم

روس کی سرکاری خبر رساں ایجنسی تاس نے ابھی حال ہی میں یہ خبر دی ہے کہ روس کی اس راجدھانی میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہو گئی ہے، ماسکو کی کل آبادی ۷۷ لاکھ ۳۴ ہزار ہے۔ ان میں ۳۴ لاکھ ۸۰ ہزار مرد ہیں اور ۴۲ لاکھ ۵۴ ہزار عورتیں۔ تاس نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ ماسکو کی سب سے پہلی مردم شماری ۱۸۷۱ میں ہوئی تھی اور اب ۱۹۷۰ میں ہونے والی مردم شماری سے یہ واضح ہوا کہ یہاں کی آبادی گذشتہ سو سال کے اندر بارہ گنا بڑھ گئی ہے اور اسی حساب سے اس شہر کا رقبہ بھی بڑھا ہے۔

جرمن لڑکیاں شہروں میں شادی کرنا زیادہ پسند کرتی ہیں

مغربی جرمنی میں آج کل نوجوان کسانوں کو شادی کے لئے مناسب لڑکیاں تلاش کرنے میں سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ زیادہ تر لڑکیاں دیہات کی بجائے شہروں میں رہنا زیادہ پسند کرتی ہیں۔ مغربی جرمنی کے ایک اخبار نے اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پچاس سال پہلے تک دیہات کو شہروں پر ترجیح دی جاتی تھی، کیوں شہروں کے مقابلے میں دیہات کے لوگ زیادہ ملنسار، ہمدرد اور دکھ درد کے ساتھی ہوتے ہیں اور اسی وجہ سے لڑکیاں بھی دیہات میں ہی رہنا پسند کرتی تھیں لیکن اب صورت حال تبدیل ہو چکی ہے اور دیہات میں پروان چڑھنے والی لڑکیاں بھی شہروں میں شادی کرنے کو ترجیح دیتی ہیں، کیوں کہ وہاں تفریح کے زیادہ مواقع حاصل ہوتے ہیں۔

اردن کی ملکہ عالیہ ہوائی حادثہ میں ہلاک

اردن کی ملکہ عالیہ ایک ہوائی حادثہ میں ہلاک ہو گئیں یہ افسوس ناک خبر خود شاہ حسین نے ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر بتائی۔ شاہ نے ملک کے



سوگ میں پورے ملک میں ایک ہفتے کے ماتم کا اعلان کیا ہے اٹھائیس سالہ عالیہ عمان سے سو میل دور ایک ہسپتال کا معائنہ کرکے ہیلی کاپٹر کے ذریعہ واپس آرہی تھیں کہ ہیلی کاپٹر گر پڑا اور عالیہ موت کی گود میں پہنچ گئیں ملکہ عالیہ ہمیشہ اردنی عوام کی بھلائی کے کاموں میں مصروف رہتی تھیں۔ وہ دسمبر ۱۹۷۲ میں شاہ کی شریک حیات بنی تھیں اور اردن کے عوام میں بے حد مقبول تھیں۔ ہیلی کاپٹر میں وزیر صحت محمد البشیر اور دو فوجی افسر بھی تھے۔ وہ بھی حادثے میں ہلاک ہو گئے۔

ریشمی دھاگے کے زیورات

آج سے چند سال پہلے تک عورتیں اپنے سروں، کلائیوں اور گردن وغیرہ میں سونے چاندی کے زیورات پہنا کرتی تھیں، مگر اب یورپ میں ایک بالکل ہی نیا فیشن شروع ہوا ہے اور وہاں کی عورتیں چمکدار ریشمی دھاگوں کے بنے ہوئے زیورات استعمال کر رہی ہیں۔ اگرچہ دھاگے کے یہ زیورات ابھی حال ہی میں بازاروں میں آئے ہیں، لیکن نوجوان اور فیشن پرست لڑکیوں میں ان کی زبردست مقبولیت کی وجہ سے خیال کیا جاتا ہے کہ یہ فیشن جلد ہی یورپ بھر میں اور پھر پوری دنیا میں پھیل جائے گا۔

خواتین کی آنکھیں اور خون دینے کی پیشکش

رائے پور (ضلع بستر) کی دو سو خواتین نے ایک انتہائی جرأت مندانہ قدم اٹھایا ہے ان خواتین نے [illegible] اپنی آنکھیں اور خون کے عطیہ کے طور پر دینے کی پیشکش کی ہے۔ اس فیصلے کا اعلان مشہور ہندی ادیب مسز [illegible] نے [illegible] میں کیا ہے۔

کہی سنی

نا اِنصافی؟

پیاری بھابی:
دُنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے الیکشن ہو چکے ہیں۔ نتائج کا انتظار ہے۔
اب کی بار الیکشن کچھ زیادہ ہی زوردار رہے ہیں مگر کم از کم ایک اعتبار سے انہیں پچھلے انتخابات کے مقابلے میں مات کھایا ہوا ہی کہا جائے گا۔ اِس مرتبہ دونوں بڑی حریف پارٹیوں نے پارلیمانی سیٹوں کے لئے خاتون اُمیدواروں کو کم تعداد میں کھڑا کیا ہے جس کے نتیجے میں اِس مرتبہ پارلیمنٹ میں عورتیں پہلے سے بہت کم تعداد میں آسکیں گی۔ کیا سیاست کا میدان پھر مردوں کے لئے مخصوص سمجھا جانے لگا ہے۔

رضیہ تبسم، بمبئی ۲۶

بھابی صاحبہ:
۱۹۷۱ کے مقابلے ۱۹۷۷ کے انتخابات میں پارلیمنٹ کے لئے کم عورتیں کھڑی ہوئیں اور کم ہی کامیاب ہوئیں۔ کاش ہم گھریلو عورتوں کا دکھ درد محسوس کرنے والی زیادہ عورتیں پارلیمنٹ میں پہنچتیں۔ ہمیں خارجہ پالیسی سے اتنی دلچسپی نہیں جتنی روپے کی قیمت سے ہے اور میرا خیال ہے کہ مہنگائی کی روک تھام کے لئے زیادہ جتن خاتون ایم پی ہی کر سکتی ہیں اس لئے کہ وہ صحیح معنوں میں جانتی اور محسوس کر سکتی ہیں کہ بڑھتی ہوئی قیمتوں سے گھریلو عورتوں کے دلوں پر کیا قیامت گزرتی ہے

آصفہ کبیر، سری نگر

بانو: فروری ۱۹۷۷

ڈیر بھابی،
ایک بیش قیمت خزانہ 'بانو' فروری کے رُوپ میں منظر نواز ہوا۔ سارے ہی کالم آنکھوں کے راستے دِل میں اُتر گئے۔ ن۔ سلطانہ کا مضمون "خیال کی طاقت سے فائدہ اٹھایئے" اور ایم۔ ناصر کا مضمون "اپنے ذہن کو آزاد کیجئے" خاص طور سے پسند آئے۔ اِن مضامین نے دماغ کی طاقت اور صلاحیت کو جگمگا کر رکھ دیا ہے۔ "ناک سے دیکھنے والی لڑکی" نے تھوڑی دیر کے لئے حیرت میں ڈال دیا۔ بیوٹی کالج، دیس بدیس کی خبریں، باورچی خانہ بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ سب ہی افسانے اونچے معیار کے ہیں۔

شگفتہ زرین، کلکتہ

پیاری بھابی:
کئی ماہ سے "بانو" کافی انتظار کے بعد ملتا ہے، مگر دیکھ کر طبیعت کھل اٹھتی ہے۔ سب سے پہلے میں "افتتاحیہ" پڑھتی ہوں، جو ایک مسلّم کی حیثیت رکھتا ہے۔ "بیوٹی کالج"، "ان سے ملئے" "باورچی خانہ"، اچھے اچھے افسانے، نظمیں جو کچھ ہم چاہتے ہیں سب ہی کچھ "بانو" میں موجود ہوتا ہے پچھلے مہینے آپ نے ایک نیا کالم شروع کیا تھا جس کا عنوان ہے: "آپ کی ذہنی اُلجھن اور اُس کا حل" یہ بہت ہی انوکھا اور کارآمد کالم ہے۔ اس کو جاری رکھئے۔

زینت فاروقی، منگلور

بھابی صاحبہ:
کسی شاعر سے میں نے پوچھا "حضرت یہ آزاد نظم کیا ہوتی ہے؟" فرمایا "آزاد تخیل کی حسین پرواز" لیکن زرینہ زرّین کی نظم "نیا فرہاد" (بانو، فروری) پڑھ کر میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کیا لطیفوں کو نظم کی شکل دے دینا ہی "پرواز تخیل" کہلاتا ہے کیا ہی اچھا ہوتا اگر موصوفہ نظم کے نیچے تحریر فرما دیتیں کہ اُنہوں نے "شمع" میں شائع شدہ ایک لطیفہ سے مُتاثر ہو کر یہ نظم لکھی ہے۔

مبارک علی مبارکی، کلکتہ

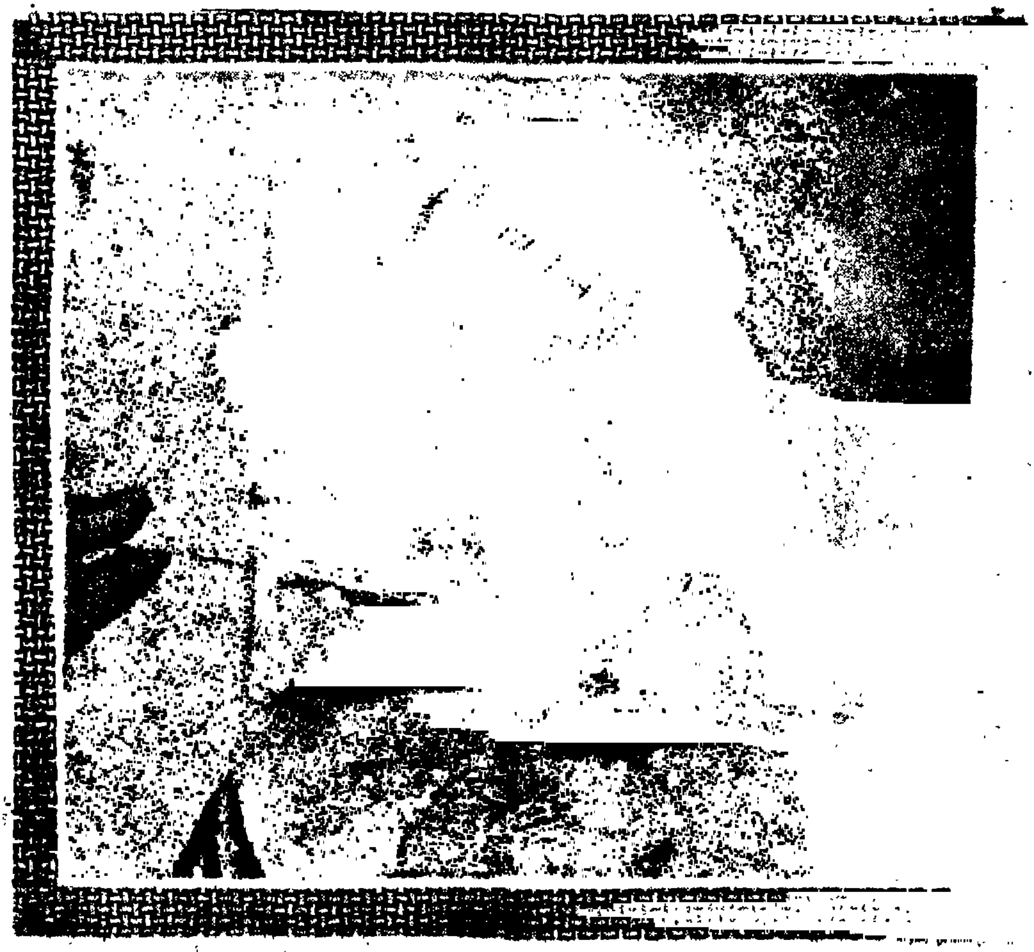
پیاری بیٹی کوثر:
فروری کے شمارے میں ع۔ الف۔ کا مضمون "وہ قسمت کا حال بتاتی ہے" بہت ہی دلچسپ لگا۔ آج کے دور میں صحیح پیش گوئی کرنے والے شاذ و نادر ہیں، اِس لئے مسز گیبی ہاف مین کی صلاحیت نے ہمیں بے حد مُتاثر کیا۔ اگر آپ اِس باکمال خاتون کا پتہ بھی چھاپ دیتیں تو "بانو" بہنوں کو ڈاک کے ذریعہ اپنی قسمت کا [illegible] دریافت کرنے میں آسانی ہو جاتی۔

امینہ بائی عبدالقادر اسمٰعیل، بمبئی ۹

بھابی صاحبہ:
اِس مرتبہ افتتاحیہ (بانو، فروری ۱۹۷۷) پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ یہ خاص طور سے میرے اور میرے کچھ دوستوں کے لئے بڑا سُود مند ثابت ہوا ن۔ سُلطانہ کا مضمون "خیال کی طاقت سے فائدہ اٹھایئے" بھی بہت پسند آیا۔ ایم ناصر کے مضمون کو پڑھ کر بہت افسوس ہوا کہ جسمانی طور پر آزاد ہوتے ہوئے بھی ذہنی طور پر عورتیں آج تک آزاد نہیں ہو سکی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ عورتیں اپنی اِس کمزوری کو دُور کرنے کی کوشش کریں گی۔

محمد سہیل اختر، جمشید پور

ہر روز کھانے کے وقت بچّوں کی خوشامد کرنا پڑتی ہے مگر وہ پھر بھی پیٹ بھر کھانا نہیں کھاتے۔ اب آپ کا بچّہ کھانے سے انکار کرے تو آپ ناراض ہونے کی بجائے اُسے صبح 'ممتا' کا ایک چمچہ پلا دیجئے۔ پھر دیکھئے اُس کی بھوک کتنی بڑھتی ہے۔ ممتا بے بی ٹانک جسم میں کیلشیم کی ضرورت کو پورا کر کے ہڈیوں کو مضبوط کرتا ہے۔ قبض بدہضمی، زکام اور دانت نکلنے کے دنوں میں بھی مدد دیتا ہے۔ آپ کے پیار کی طرح آپ کے لاڈلے کو ہر روز ایک چمچہ 'ممتا' کی ضرورت ہے جو مزے دار ہے۔



قیمت چھوٹی شیشی : تین روپے بڑی شیشی : پانچ روپے

شمع (یونانی اینڈ آیورویدک)، لال کنواں، دہلی۔٦

باورچی خانہ

مزے دار اور
آزمودہ پکوان

آزمائش اور ترتیب: رشیدہ خاتون

پنجابی مچھلی

مچھلی (سنگھاڑا)	۵۰۰ گرام
لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
کھٹائی	۳ چائے کے چمچے
نارنجی رنگ (کھانے کا)	پونا چائے کا چمچہ
لہسن	۶ جوے
بیسن	حسبِ ضرورت
تیل	حسبِ ضرورت
نمک	حسبِ ذائقہ
پیاز	دو ڈلی
لال رنگ (کھانے کا)	پاؤ چائے کا چمچہ

مچھلی کے ڈیڑھ ڈیڑھ انچ موٹے گول قتلے کاٹ کر خوب اچھی طرح دھولیں۔

لال مرچ، کھٹائی، نارنجی رنگ اور نمک میں ایک ٹیبل اسپون پانی ملالیں اور پھر یہ مسالہ مچھلی کے قتلوں کے دونوں طرف اچھی طرح مَل دیں اور آدھے گھنٹے کے لئے رکھ دیں۔ پیاز کو چھیل کر لچھے کاٹ لیں۔ لال رنگ میں ایک ٹیبل اسپون پانی ملاکر پیاز کے لچھوں پر ڈال دیں اور ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لئے رکھ دیں۔ اب ایک کڑھائی میں تیل ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ تیل گرم ہو جائے تو اس میں لہسن کے جوے بغیر چھیلے ڈال دیں۔ لہسن کے جوے جل جائیں تو تیل سے نکال کر پھینک دیں اور تیل کو تھوڑا ٹھنڈا ہونے دیں۔ مچھلی کے قتلوں کو سوکھے بیسن میں لپیٹ کر دو چار منٹ رکھ دیں۔ پھر تیل میں ڈال دیں اور ہلکا سا تل کر نکال لیں دس منٹ بعد مچھلی کے قتلوں کو دوبارہ گرم تیل میں ڈال دیں۔ بادامی ہو جائیں تو تیل سے نکال لیں۔ پیاز کے لچھوں اور چٹنی کے ساتھ گرم گرم کھائیں۔

چٹنی کی ترکیب

اِملی کا گودا	پاؤ پیالی
لال مرچ	۲ عدد
ہری مرچ	۴ عدد
پودینے کی پتیاں	ایک ٹیبل اسپون
چینی	۲ چائے کے چمچے
نمک	حسبِ ذائقہ

اِملی کو ایک پیالی پانی میں دو گھنٹے کے لئے بھگو دیں، پھر ہاتھ سے مل کر چھلنی سے چھان لیں۔ پھوک پھینک دیں۔ باقی کی تمام چیزوں کو سِل پر باریک پیس کر املی کے گودے میں ملا لیں۔ چٹنی تیار ہے۔ مچھلی کے ساتھ کھائیں۔

نرجس دہلوی

آلو والی بنگالی کھنڈویاں

چنے کی دال	۲۰۰ گرام
آلو (چھوٹے)	۱۰۰ گرام
ٹماٹر	۱۰۰ گرام
لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
گرم مسالہ	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
سفید زیرہ (ثابت)	ایک چائے کا چمچہ
لونگ	۵ عدد
دار چینی	آدھا انچ کا ٹکڑا
پیاز (درمیانہ سائز)	۲ عدد
ادرک	۱.۲ انچ کا ٹکڑا
ہری مرچ	۴ عدد
ہرے دھنیے کی پتیاں	ایک ٹیبل اسپون
گھی	حسبِ ضرورت
نمک	حسبِ ذائقہ
چینی	ایک چائے کا چمچہ

دال کو صاف کر کے ایک گھنٹے کے لئے بھگو دیں پھر سِل پر خوب باریک پیس لیں۔ پیاز اور ادرک کو چھیل کر لچھے کاٹ لیں۔ آلوؤں کو چھیل کر لمبائی کے رُخ سے آٹھ آٹھ ٹکڑے کرلیں۔ ٹماٹر دھل کو دھو کر ان کا کچومر کاٹ لیں۔ ایک دیگچی میں پاؤ پیالی گھی اور آدھی پیاز اور ادرک کے لچھے ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ پیاز اور ادرک بادامی ہو جائے تو اس میں پسی ہوئی دال ڈال دیں۔ ہلدی لال مرچ اور دھنیا آدھا آدھا ڈال دیں۔ زیرہ اور نمک بھی ڈال دیں۔ ہری مرچوں کا کچھ حصہ کاٹ کر اس میں شامل کر دیں۔ چمچہ چلاتی رہیں جب دال خوب گاڑھی اور جمنے کے قابل ہو جائے تو آنچ

سے اتار لیں اور کسی تھالی میں آدھا انچ موٹی تہہ پھیلا دیں۔ ٹھنڈی ہو جائے تو دو انچ لمبے اور ایک انچ چوڑے ٹکڑے کاٹ لیں۔ اب ایک کڑھائی میں گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ گھی گرم ہو جائے تو اس میں ٹکڑوں کو ہلکا سا تل کر نکال لیں۔ اب ایک دوسری دیگچی میں آدھی پیالی گھی، پیاز اور ادرک کے باقی لچھے (گرم مسالے اور ہرے دھنئے کی پتیوں کے علاوہ) تمام مسالے، چینی اور پاؤ پیالی پانی ڈال کر مسالہ بھون لیں پھر اس میں آلو اور ایک پیالی پانی ڈال دیں۔ آلو گل جائیں تو ٹماٹروں کا کچومر بھی اس میں ملا دیں۔ ٹماٹر گل جائیں تو مزید ڈیڑھ پیالی پانی ڈال دیں۔ پانی پکنے لگے تو دال کے تلے ہوئے ٹکڑے ڈال دیں۔ ایک دو منٹ بعد آنچ سے اتار لیں۔ ڈش میں نکالنے کے بعد گرم مسالہ اور ہرے دھنئے کی پتیاں چھڑک دیں۔

تنویر، کلکتہ

آلو ٹماٹر کے کٹلٹس

آلو	۵۰۰ گرام
ٹماٹر	۲۵۰ گرام
پیاز (درمیانہ سائز)	۲ عدد
ہری مرچ	۸ عدد
ہرے دھنئے کی پتیاں	۲ ٹیبل اسپون
انڈا	ایک عدد
کرم (سوکھی ڈبل روٹی کا چورا)	سوا پیالی
نمک	حسب ذائقہ
گھی	حسب ضرورت

آلوؤں کو دھو کر ابال لیں پھر چھیل کر [illegible]

[illegible]

باریک چھلنی میں چھان لیں۔ بیج اور چھلکے پھینک دیں اور گودے کو آلوؤں میں ملا دیں۔ پیاز چھیل کر باریک کچومر کاٹ لیں۔ ہری مرچوں کا بھی کچومر کاٹ لیں۔ اب پیاز، ہری مرچوں کا کچومر اور پون پیالی کرم اور نمک بھی آلوؤں میں شامل کر لیں۔ پھر آلوؤں کو ہاتھ سے آٹے کی طرح گوندھ لیں۔ انڈے کو توڑ کر خوب اچھی طرح پھینٹ لیں۔ باقی کے کرم کو کسی سیدھی پلیٹ میں پھیلا دیں۔ اب آلوؤں کے تین انچ لمبے اور ڈیڑھ انچ چوڑے کٹلٹس بنا لیں۔ فرائنگ پان میں تھوڑا سا گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں کٹلٹ کو پہلے انڈے میں ڈبوئیں اور فوراً ہی کرم میں لپیٹ کر فرائنگ پان میں ڈال دیں۔ ایک طرف سے بادامی ہو جائیں تو پلٹ دیں۔ دوسری طرف سے بادامی ہو جائیں تو کاغذ پر اتار لیں، تاکہ فالتو گھی کاغذ میں جذب ہو جائے، پھر پلیٹ میں رکھ کر گرم گرم کھائیں۔

بیگم جان، رانچی

نورتن پلاؤ

چاول (سیلا)	۲۵۰ گرام
مٹر	۱۵۰ گرام
پنیر	۱۰۰ گرام
ٹماٹر	۱۵۰ گرام
کاجو	۱۵ عدد
پستے	۲۰ عدد
بادام	۱۵ عدد
کشمش	ایک ٹیبل اسپون
پیاز (درمیانہ سائز)	[illegible]
ادرک	[illegible]
لونگ	[illegible]
کالی مرچ	۱۰ عدد
بڑی الائچی	۴ عدد
دار چینی	ایک انچ کا ٹکڑا
سفید زیرہ (ثابت)	ایک چائے کا چمچہ
ہری مرچ	۴ عدد
بہار رنگ (کھانے کا)	ایک چائے کا چمچہ
گھی	ایک پیالی
نمک	حسب ذائقہ

چاولوں کو صاف کر کے دو گھنٹے کے لئے بھگو دیں۔ ادرک اور پیاز چھیل کر لچھے کاٹ لیں۔ مٹر کے دانے نکال کر ابال لیں۔ پنیر کے چھوٹے چھوٹے چوکور ٹکڑے کر لیں۔ اب ایک دیگچی میں گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ گھی گرم ہو جائے تو اس میں کشمش، بادام، پستے اور کاجو ڈال دیں اور ہلکا سا تل کر نکال لیں۔ پھر اسی گھی میں پنیر کے ٹکڑے ڈال دیں۔ ہلکے بادامی ہو جائیں تو ان کو بھی گھی سے نکال کر رکھ لیں اور اسی گھی میں پیاز اور ادرک کے لچھے ڈال دیں۔ لچھے بادامی ہو جائیں تو آدھے لچھے گھی سے نکال لیں۔ باقی کے لچھوں میں لونگ، کالی مرچ، بڑی الائچی، سفید زیرہ، دار چینی اور نمک ڈال دیں۔ ایک منٹ بعد اس میں ٹماٹر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے ڈال دیں۔ ٹماٹر گل جائیں تو مٹر اور گلنے کے اندازکا پانی ڈال کر دیگچی کو ڈھانپ دیں۔ جب چاولوں میں ایک کنی رہ جائے تو پنیر کے ٹکڑے ڈال دیں اور پانچ سات منٹ بعد دیگچی کو دم پر رکھ دیں۔ ڈش میں نکالتے وقت [illegible]

[illegible]

[illegible] دہلی

آٹھ ہزار روپے کے نقد انعامات کی شان دار تقسیم!

شمع مِنی معمّہ نمبر ۱ جو اسان ثابت ہوا اور ... پروانے بالکل درست حل تک پہنچ گئے۔ ان درست ... لوں پر پہلا انعام مبلغ پانچ ہزار روپے تقسیم کیا گیا۔

شمع مِنی معمّوں کی تیز رفتاری بے مثال ہے۔ درست ... ل ظاہر کئے جانے کے چند ہی گھنٹوں میں چیکنگ ختم کرکے ... تقسیم انعامات کی تفصیلات کا اعلان کر دیا گیا۔

جن پروانوں نے صحیح حل لگانے کے لئے نشانے ... بھیجے تھے۔ انہیں تقسیم انعامات کی تفصیلات بھی لکھ دی ... ہیں۔ دوبارہ جانچ کے لئے کسی کلیم کا انتظار کئے بغیر ہی ... بلے اور دوسرے انعامات بھیج دئے گئے۔

صحیح حل شمع مِنی معمّہ نمبر ۱

ن	و	ہ	و	ج	■
ی	ق	و	خ	■	ن
ت	ا	م	■	ع	ک
س	ج	■	د	و	ل
■	■	ہ	ب	ر	ت
■	■	و	ا	ت	ا

بالکل درست حل ۱۰ وصول ہوئے جن پر پہلا انعام مبلغ پانچ ہزار روپے بحساب ۵۰۰ روپے فی حل تقسیم کیا گیا:

۱۔ محبوب احمد شیخ صاحب، پوسٹ بکس نمبر ۲۸۱۸، دارالسلام، تنزانیہ (افریقہ)
۲۔ بی ایس شرما صاحب، اسٹیٹ بینک آف انڈیا، نجف گڑھ، دہلی
۳۔ ماسٹر ایس سی مہر صاحب، نزد اولڈ موٹر اسٹینڈ، برہان پور ۴۵۰۳۳۱
۴۔ سید رحیم الدین صاحب، مکان نمبر ۱۲/۲-۳-۱۲-۲، محلہ اندرون قلعہ، رائچور ۵۸۴۱۰۱
۵۔ جسونت سنگھ صاحب، مکان نمبر ۲۲۲۸، سیکٹر ۲۷۔سی، چنڈی گڑھ
۶۔ محمد سلیمان خان صاحب، ۲۷۳، حبیب ہال، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱
۷۔ این اختر صاحب، معرفت نسیم منظور، مقام و ڈاکخانہ سیوان ڈیہہ، بی ایس سٹی نمبر II، ضلع دھنباد
۸۔ ایچ سی باوریا صاحب، ای ایل ۲۳۴، محلہ ... جالندھر
۹۔ درگا پرشاد صاحب ستار، پہاڑی ... ۲۷۲۰۰۲
۱۰۔ محمد نصیر الدین صاحب، ... بھاگل پور

ایک غلطی والے ... حل موصول ہوئے جن پر دوسرا انعام مبلغ تین ہزار روپے بحساب ... پیسے فی حل تقسیم کیا گیا

Rs. 8,000.00

آٹھ ہزار روپے کے نقد انعام

پہلا انعام بالکل درست حل پر پانچ ہزار روپے۔ دوسرا انعام ایک غلطی والے حل پر: تین ہزار روپے

فیس داخلہ فی حل ایک روپیہ۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ فیس داخلہ پوسٹل آرڈر، منی آرڈر یا شمع ادبی معموں کے نقد ناموں کے ذریعے ادا کی جا سکتی ہے۔ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانہ سے ملنے والی رسید اپنے حلوں کے ساتھ بھیجئے۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ ان کی فیس ایک ساتھ بھیج سکتے ہیں اور ہر حل پر علیحدہ انعام کے حق دار ہو سکتے ہیں۔ کوئی ٹوکن بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ٹوکن بھیجنے کی شرط کے علاوہ شمع ادبی معموں کی دوسری تمام شرائط شمع مینی معموں پر بھی عاید ہیں۔ ان کی پابندی ضروری ہے۔

دفاتر شمع (نئی دہلی) میں ڈاک سے اور دستی حل وصول ہونے کی آخری تاریخ: ۳۰ اپریل ۱۹۷۷ء ۹ بجے رات تک۔

اشارے

دائیں سے بائیں

۱۔ بچوں کا کیا ہے بچے تو جیسا —— ہیں ویسا ہی کرتے ہیں

۲۔ روپے کی ضرورت کس کو نہیں ——! اس کا یہ تو مطلب نہیں کہ ہر شخص چوری کرتا پھرے

۳۔ بڑے بڑے دانشوروں اور فلسفیوں کے نظریات آج محض کتابوں میں —— ہیں اور لائبریریاں کتابوں سے بھری پڑی ہیں

۴۔ رازِ ہستی راز ہے جب تک کوئی محرم نہ ہو کھل گیا جس —— تو محرم کے سوا کچھ بھی نہیں

اوپر سے نیچے

۵۔ میں نے تو آنکھ کھول کر تم ہی کو دیکھا اور تم ہی کو میں اپنی ماں کی طرح —— ہوں

۶۔ —— ایجادوں نے زندگی کو آسان بنانے کی بجائے اور الجھا دیا ہے

۷۔ آؤ۔ آؤ۔ میرے پاس آؤ۔ میں تمہارے دلوں کو —— سے بھر دوں گا

۸۔ آج —— زندگی اتنی تیز رفتار ہے کہ فرصت کے چند لمحات بھی مشکل سے ملتے ہیں

شمع مینی معمہ نمبر ۱۹

■	ے	ت	کھ	ی	
	■	ی	ت		
ا	ن	■			د
			■		د
ت	ن	و	ک	■	■
ا	ی			■	■

●●

شمع ادبی معمہ (شمع مینی معمہ نمبر ۱۹) ماہنامہ شمع، آصف علی روڈ، نئی دہلی

۲ مئی کو بعد دوپہر تعطیل ہوگی۔ ماہنامہ شمع مینی معمہ نمبر ۱۹ کا صحیح حل ۲ مئی ۱۹۷۷ کو شمع کے دفتر میں ظاہر کیا جائے گا۔ صحیح حل اور انعام پانے والوں کے نام مئی ۱۹۷۷ کے "بانو" میں شائع کئے جائیں گے۔ انعام پانے والوں کی تفصیلات شمع: جولائی ۱۹۷۷ میں بھی شائع کی جا سکتی ہیں۔

شمع مینی معمہ نمبر ۱۹

★ اب آپ ایک شمع ادبی معمہ اور دوسرے شمع ادبی معمہ کے حل بھیجنے کے درمیان اپنے ادبی ذوق کی تسکین کر سکتے ہیں۔۔۔ مینی معمہ کے ذریعے!

★ کوئی ٹوکن بھیجنے کی قید نہیں!

★ جتنے حل بھی چاہے بھیجئے اپنے تمام حلوں کی فیس ایک یا ایک سے زیادہ منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا نقد ناموں سے بھیج سکتے ہیں

★ آپ ہر حل پر انعام کے حق دار بن سکتے ہیں فیس داخلہ فی حل صرف ایک روپیہ

★ صرف آٹھ اشارے انعام پانا کس قدر آسان!

★ فیس داخلہ بھیجنے کے لئے شمع ادبی معموں کے نقد نامے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ یا پوسٹل آرڈر، منی آرڈر بھیجئے۔ اپنے حلوں کے ساتھ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید ضرور بھیجئے۔

صحیح حل: جوابی لفافہ بھیج کر منگوایئے یا پھر اگلے ماہنامہ "بانو" یا ماہنامہ "شمع" میں دیکھئے۔

★ شمع مینی معمہ نمبر ۱۹ کا نتیجہ مئی ۱۹۷۷ کے "بانو" میں اور جولائی ۱۹۷۷ کے شمع میں شائع کیا جائے گا۔

اشاعت کا اکتیسواں سال چوتھا شمارہ

نگراں:

یوسف دہلوی

مدیرہ:

زینت کوثر دہلوی

ادارۂ تحریر:

شمیم آرا دہلوی
سعدیہ دہلوی

مالکان: شمع میگزین ● طابع و ناشر: یونس دہلوی ● مطبوعہ: ایس، پی پروسیس ● ٹائٹل: بمبئی آفسیٹ پریس

عام شمارے کی قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے، سالانہ قیمت: اٹھارہ روپے (جس میں سالنامہ مفت ملتا ہے)

مقام اشاعت و صدر دفاتر: آصف علی روڈ، نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰ تار کا پتہ: "شمع" نئی دہلی ٹیلی فون: ۲۷۴۹۹۶۲، ۲۷۲۰۹۶، ۲۷۴۹۸۰ دیگر دفاتر: بمبئی، کلکتہ، مدراس

افتتاحیہ

انسان کے لئے سب سے مشکل کام خود اپنے آپ سے اس کی ملاقات ہے۔ بہت سے آدمیوں کو تنہائی سے پریشان ہوتے دیکھا ہے۔ ایسے لوگ خود سے ملاقات پسند نہیں کرتے۔ کیوں کہ وہ اپنے وجود سے نفرت کرتے ہیں، اور کسی بھی قیمت پر اس کا سامنا کرنے سے کتراتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو خود فریبی میں مبتلا رکھتے ہیں اور یہ خود فریبی ان کی شخصیت کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔

تنہائی اپنے سدھار کی بہترین ساتھی ہے جو خود اپنی شخصیت سے ملاقات کراتی ہے۔ اگر ہمت اور قوتِ ارادی سے تنہائی میں اپنا بھرپور جائزہ لیا جائے تو اپنے عیبوں اور کمزوریوں پر قابو پانا آسان ہو سکتا ہے۔ اور یقیناً یہ بہادری کا بہت بڑا کارنامہ ہے جو بزدلوں کے بس کا نہیں۔

جب انسان اپنی نظروں میں خود کو گرا دیتا ہے تو دنیا اسے بہت جلد اپنی نظروں سے گرا دیتی ہے۔ اس کے برخلاف اگر کوئی شخص اپنی نظروں میں خود کو قابلِ احترام سمجھتا ہے تو دنیا بھی اس کی عزت کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے اور شاید ہی اس حقیقت سے کسی کو انکار ہو۔

ابن کوثر مسعود



امریکہ میں بالی کے قالین، داہومی کے کپڑوں اور اپر وولٹا کے زیوروں کے طرز پر بنی ہوئی ایشیائی نمائش

عورتوں کے لباس میں ایک نیا انقلاب

رضوانہ مطلوب احمد

کیا عورتوں کا لباس ایک بار پھر انقلاب سے دوچار ہو رہا ہے؟ لباس کے معاملے میں یورپ کی نوجوان نسل کی پسند کے پیشِ نظر اب یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ گزشتہ پچاس سالوں کے مسلسل تجربات کے بعد وہاں کی فیشن پرستی نے اب ایک نیا موڑ لیا ہے جس کا رُخ مستقبل کی بجائے ماضی کی طرف ہے۔ چنانچہ آج کل تقریباً سارے یورپی ملکوں میں پرانے طرز کے ڈھیلے ڈھالے لباس تیزی کے ساتھ مقبولیت حاصل کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ نوجوان لڑکیوں میں ہندوستانی ساڑیاں، راجستھان وغیرہ میں پہنے جانے والے گھاگھرے، اور عرب بدو عورتوں کا مقبولِ عام پوشاک جلباب مقبول ہو رہے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ افریقہ کے نیم مہذب علاقوں میں پہنے جانے والی بہت سی پوشاکیں بھی یورپی منڈیوں میں کافی بک رہی ہیں۔

یورپی لڑکیوں میں فیشن پرستی کے اس نئے رُخ نے لباس کا ڈیزائن تیار کرنے والی کمپنیوں کے لئے ایک نئی جولان گاہ فراہم کر دی ہے۔ جنت نے ڈیزائن تیار کرنے کی بجائے وہ چھوٹی موٹی تبدیلیوں کے ساتھ زمانۂ قدیم میں رائج لباسوں کو ایک بار پھر مارکیٹ میں لا رہی ہیں اور توقع سے کہیں زیادہ انہیں فروخت کر کے دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہی ہیں۔ چنانچہ آج کل آپ یورپ کی کسی بھی مارکیٹ سے گزریں یا کسی بھی ریستوراں میں بیٹھ جائیں ہندوستانی، عربی، افریقی یا قدیم یورپی پوشاک میں آپ کو بے شمار لڑکیاں نظر آئیں گی۔

لیکن فیشن پرستی کے اس نئے رجحان

...سے کی ہاتھوں میں چلی گئی ہے لیکن قریب جاکر مسٹر جارج ریش بالکل مبہوت رہ گئے کیوں کہ یہ خاتون اپنے لاکٹ میں پیوست ننھے سے ٹرانسمیٹر کے ذریعہ نمائش میں موجود کپڑوں کی پوری تفصیل کسی اور فرم کو بھیج رہی تھیں

ایک بار برطانیہ کی مشہور زمانہ ڈیزائن ساز خاتون مسز کرسٹینا بوڈوسکا کے پاس ایک نامعلوم شخص آیا اور اس نے کہا کہ نمائش میں پیش کرنے سے قبل ہی اگر وہ اپنے تیار کردہ ڈیزائن کا نمونہ فراہم کر دیں تو انہیں بہت بڑی رقم دی جائے گی۔ لیکن اس کی اس پیش کش کو مسز کرسٹینا نے ٹھکرا دیا۔ اس کے چند ہی روز کے بعد انہیں اچانک اغوا کر لیا گیا اور اپنی رہائی کے معاوضے میں انہیں کچھ جدید ترین ڈیزائن بنا کر مفت دینے پڑے۔



پورے مغرب میں کپڑوں کے ڈیزائن بنانے کے چار اہم مرکز ہیں جن میں دنیا کی سب سے بڑی بڑی کمپنیاں واقع ہیں۔ یہ ملک امریکہ، برطانیہ، فرانس اور اٹلی ہیں۔ ان ہی چاروں ملکوں میں نئے نئے ڈیزائن بنائے جاتے ہیں پھر سارے یورپ اور ایشیا وغیرہ میں فروخت کئے جاتے ہیں۔ کپڑوں کے بڑے بڑے تاجران ہی ملکوں میں واقع کمپنیوں سے معاملات طے کرتے ہیں اور بڑے بڑے آرڈر دیتے ہیں لیکن جب ان تاجروں کو چند ہزار یا لاکھ روپے میں کوئی نیا ڈیزائن گھر بیٹھے بٹھائے مل جاتی ہے تو وہ فوراً ہی ان کے نمونے تیار کر کے فروخت کرنا شروع کر دیتے ہیں اور لاکھوں کے وارے نیارے کر لیتے ہیں۔

کچھ دن پہلے فرانسیسی پولیس نے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر اور بلی پر ایک ایسے ہی چور کو رنگے ہاتھوں گرفتار کیا تھا۔ ایک کسٹم افسر کی نگاہ اچانک ایک تصویر پر پڑی اور پھر اس نے جب مزید سامان کو کھنگالا تو اسی قسم کے بہت سے ڈیزائن برآمد ہوئے جو سب کے سب بڑی بڑی ڈیزائن ساز کمپنیوں سے چرائے گئے تھے۔ تفتیش کے دوران یہ انکشاف ہوا کہ یہ چور اسی مقصد کے لئے باقاعدہ ہانگ کانگ سے آیا تھا اور اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا تو اسے مقامی تاجروں سے لاکھوں پونڈ ملتے۔

اس قسم کی چوریوں سے امریکہ، برطانیہ، اٹلی اور فرانس کی کمپنیاں بہت تنگ آ چکی ہیں اور اس سلسلے میں کسی بین الاقوامی قانون کا مطالبہ بھی کر رہی ہیں تاکہ لاکھوں ڈالر سے تیار کئے ہوئے ڈیزائنوں کی چوری کا کوئی خطرہ باقی نہ رہے۔ ہر ڈیزائن ساز کمپنی مہینوں اور برسوں کی محنت کے بعد ایک پرکشش ڈیزائن تیار کرتی ہے جو اگر مقبول ہو گیا تو کروڑوں کے وارے نیارے ہو گئے، ورنہ لاکھوں روپے پانی میں ڈوب جاتے ہیں۔ لیکن ایسی چوریوں کا باب بند کرنے والے کسی قانون کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ خود یہ کمپنیاں بھی چوری پر انحصار کرتی ہیں۔ چنانچہ وہ قدیم لباس یا ہندوستان، عرب یا افریقی طرز کے لباس بنا کر مارکیٹ میں پیش کرتی ہیں، جو خوش قسمتی سے آج کل یورپ میں کافی مقبول ہو رہے ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی قانون بنا اور ہر طرح کے ڈیزائنوں کی نقل ممنوع قرار دے دی گئی تو خود ان کمپنیوں کو بھی ناقابل برداشت خسارے سے دوچار ہونا پڑے گا۔ □□

اِن سے ملئے

پاکیزہ سلطان

علم حاصل کرنے کے لئے کتابیں اتنی ہی ضروری ہیں جتنی زندگی کے لئے ہوا۔ کتابیں پڑھنے والے زندگی سے کبھی بور نہیں ہوتے۔ کتابیں ایک قسم کی کھڑکیاں ہیں جن سے دنیا کی سیر کی جاتی ہے۔ پہلے زمانے میں کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں۔ وہ بہت مہنگی ہوتی تھیں کتابیں خریدنا اور اپنی ذاتی لائبریری بنانا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں تھا۔ لیکن آج کل زمانہ بدل گیا ہے۔ کتابیں مقابلتاً سستی ہیں پھر بھی انہیں خرید کر پڑھنا خاصا مشکل کام ہے لائبریریوں نے یہ مشکل آسان کر دی ہے۔

کتابوں کے متعلق یہ مقولہ مشہور ہے کہ ایک بے وقوف ہی اپنی کتاب دوسرے کو پڑھنے کے لئے دیتا ہے، لیکن جو شخص کتاب پڑھ کر واپس کر دے وہ اس سے بھی بڑی احمقانہ حرکت کرتا ہے۔ لائبریری ایسا ہی ایک بے وقوف ادارہ ہے۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں بے وقوف کتابیں پڑھ کر اسے واپس کر دیتے ہیں۔ ایک اور مقولہ ہے کہ کتابیں کبھی خرید کر نہیں پڑھنی چاہئیں، کتابیں مانگ کر یا چُرا کر پڑھنی چاہئیں، اگر یہ دونوں صورتیں ممکن نہ ہوں تو ادھار مانگ کے پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لائبریری اس تیسری صورت میں پڑھنے والوں کی مدد کرتی ہے۔ لائبریری میں علم و ادب کے خزانے سجے رہتے ہیں۔ ان خزانوں کی رکھوالی لائبریرین کرتا ہے۔ پاکیزہ سلطان ایسے ہی ایک خزانے کی محافظ ہیں۔

پاکیزہ دلی کے آزاد بھون میں کام کرتی ہیں۔ آزاد بھون انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کے تحت ہے۔ یہاں تقریباً ۴ ہزار کتابیں ہیں آزاد بھون میں ایک سیکشن افریقہ سے متعلق ہے۔ اس سیکشن میں ۳ ہزار کتابیں ہیں۔ پاکیزہ اس سیکشن کی انچارج ہیں۔

لائبریری کے کام کے بارے میں عام لوگوں کو زیادہ واقفیت حاصل نہیں ان کا خیال ہے کہ لائبریری کا کام بہت آسان ہے۔ الماریوں میں بہت سی کتابیں سجی ہوتی ہیں اور کتاب پڑھنے والا اپنے مطلب کی کتاب چُن لیتا ہے۔ بس اتنی سی بات ہے لیکن دراصل معاملہ اتنا سہل نہیں۔ لائبریری کو چلانا ایک مستقل فن ہے۔ اس کے لئے باقاعدہ ڈگری لینا پڑتی ہے۔ یہ مضمون لائبریری سائنس کہلاتا ہے۔ اس میں بی اے اور ایم اے تک تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ ہم اتنا دستیاب ہے کہ اس میں پی ایچ ڈی بھی کیا جاتا ہے۔ لائبریری سائنس میں یہ سکھایا جاتا ہے کہ کتابوں کو کس طرح سجایا جائے۔ ایک مضمون پر ہزاروں کتابیں ہوتی ہیں۔ ان کے مصنف مختلف ہوتے ہیں۔ لائبریری والے اس مضمون کو نمبر میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ یہ نمبر پڑھنے والے کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس نمبر کے تحت ساری کتابیں ایک جگہ جمع ہو جاتی ہیں۔ جب ہم لائبریری میں کتاب لینے کے لئے جاتے ہیں تو ہمارا سابقہ ان ہی نمبروں سے پڑتا ہے فہرست بنانے کا یہ طریقہ کتاب اور پڑھنے والے کے درمیان ایک رشتہ قائم کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی مضمون پر ریسرچ کرتا ہے تو اسے ایک نمبر کے تحت اس کے مضمون کی ساری کتابیں مل جاتی ہیں۔ اگر پڑھنے والے کو کتاب کا نام یاد نہیں، صرف مصنف کا نام یاد ہے تو بھی لائبریرین کتاب کی تلاش میں

اس کی مدد کر سکتا ہے۔ بعض اوقات پڑھنے والے کو نہ مصنف کا نام یاد ہوتا ہے اور نہ عنوان، اسے صرف سیریز یاد رہتی ہیں اس صورت میں بھی اسے مطلوبہ کتاب مل سکتی ہے۔ لائبریرین ایک ایسا ماہی گیر ہے جو اپنے سمندر کا تجربی علم رکھتا ہے۔ وہ ایک غوطہ لگا کر آپ کی پسندیدہ مچھلی حاضر کر دیتا ہے۔

آزاد بھون کے افریقہ سیکشن میں کتابوں کے علاوہ اخبار اور رسالے بھی آتے ہیں۔ افریقہ کے ملکوں سے آتے ہوئے یہ اخبار اور رسالے فائلوں میں رکھے جاتے ہیں۔ ان کی جلد بندی کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں چھپنے والے اخبارات میں جتنا مواد افریقہ کے متعلق ہوتا ہے، اس کے تراشے بھی محفوظ کئے جاتے ہیں۔ پاکیزہ کو اس سلسلے میں دس اخبار روز پڑھنے پڑتے ہیں۔

پاکیزہ مغلیہ خاندان سے تعلق رکھتی ہیں شہزادہ فتح الملک بہادر عرف مرزا فخرو ان کی والدہ قمر سلطان بیگم کے دادا تھے۔ مرزا فخرو دلی کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے بیٹے تھے۔ غدر کے خاتمے پر شاہی خاندان نے ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لی تھی، جو دلی سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ دلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ انگریز میجر ہڈسن سپاہیوں کی ایک رجمنٹ لے کر بادشاہ کو گرفتار کرنے کے لئے ہمایوں کے مقبرے پہنچ گیا۔ بادشاہ نے جان کی امان مانگی۔ ہڈسن نے ان کی درخواست منظور کر لی۔ بوڑھے بادشاہ ملکہ بیگم کے ہمراہ لال قلعہ کو روانہ ہو گئے۔ بادشاہ کے بعد شہزادوں کی باری آئی۔ ہڈسن نے انہیں گرفتار کر لیا اور لال قلعہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ ابھی یہ قافلہ دلی دروازے کے قریب پہنچا تھا کہ سنگ دل ہڈسن نے شہزادوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ ان شہزادوں میں مرزا فخرو بھی شامل تھے۔ قمر سلطان بیگم انہی مرزا فخرو کی پوتی ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا دلی کے لال قلعہ میں بہادر شاہ ظفر کی صد سالہ برسی منائی گئی تو قمر سلطان اس میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئی تھیں۔

پاکیزہ کے والد حکیم مرزا محمد نعیم بیگ تھے۔ ان کے دادا پنجاب کے علاقہ پالی کے حاکم تھے۔ ۱۹۴۸ میں مرزا نعیم بیگ کا انتقال ہو گیا۔ پاکیزہ کی ایک بہن ہیں، جن کا نام طاہرہ ہے۔ ان کے بھائی محمد طیب بیگ کا کم سنی ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ پاکیزہ دلی میں اپنے آبائی مکان میں رہتی ہیں، جو کوچہ چیلان میں ہے۔

پاکیزہ کو اردو ادب سے دل چسپی ہے۔ انہوں نے علی گڑھ سے بی اے پاس کیا، وہیں سے ایم اے کیا اور لائبریری سائنس کی ڈگری لی۔ لائبریری میں کام کرنے والے اکثر کتابوں سے اکتا جاتے ہیں۔ لائبریری میں کتابیں دیکھتے دیکھتے ان کا دل بھر جاتا ہے۔ پاکیزہ کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ انہیں مطالعہ کا بہت شوق ہے۔ ان کا دل کتابوں سے کبھی نہیں بھرتا۔

پاکیزہ کو شعر و شاعری کا بھی شوق ہے کالج کے زمانے میں وہ خود شعر کہتی تھیں۔ ان کو غزل بہت پسند ہے۔ ان کے خیال میں غزل ایک مترنم خیال ہے۔ جگر مراد آبادی ان کے محبوب شاعر ہیں۔ جدید شاعروں میں انہیں فیض پسند ہیں۔ ویسے وہ جدید شاعری سے زیادہ دل چسپی نہیں رکھتیں۔ انہوں نے افسانے بھی لکھے ہیں۔ لیکن ان کی دل چسپی نثر سے زیادہ نظم میں ہے۔

پاکیزہ کو زیورات کا شوق ہے، لیکن یہ شوق عام ہندوستانی عورتوں کی طرح جنون کی حد تک نہیں پہنچا۔ ان کا خیال ہے کہ ہر عورت کی ایک شخصیت ہوتی ہے۔ یہ شخصیت زیورات کی محتاج نہیں۔ یہ سادہ کپڑوں میں بھی جھلکتی ہے۔ پاکیزہ کو قدیم ہندوستانی لباس پسند ہیں۔ لیکن موجودہ زمانے میں دفتر میں کام کرنے والی عورتیں یہ لباس نہیں پہن سکتیں۔ پاکیزہ عام طور پر ساڑی پہنتی ہیں، لیکن شادی اور دوسری تقریبوں میں غرارہ اور فرشی پاجامہ زیب تن کرتی ہیں۔

مسلم پرسنل لا کے متعلق پاکیزہ کا خیال ہے کہ اس میں مرد کو یک طرفہ طلاق کا حق عورتوں پر زیادتی ہے۔ یہ اس صورت میں جائز ہو سکتا ہے۔ جب مہر کی رقم اتنی ہو کہ عورت بے سہارا نہ ہو سکے اور اپنی باقی زندگی آرام سے گزار سکے۔ ان کے اپنے خاندان میں مہر کی رقم بہت زیادہ ہوتی ہے — لیکن وہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں — عام مسلمانوں میں مہر کی رقم کم رکھی جاتی ہے۔ یہ اتنی نہیں ہوتی کہ عورت اس سے اپنی باقی زندگی آسانی سے گزار سکے۔ اس طرح عورت کو تحفظ نہیں ملتا۔ ہندوستانی عورت تعلیم یافتہ نہیں۔ وہ ملازمت نہیں کر سکتی۔ اسے زندگی کی منجدھار میں بے سہارا چھوڑ دینا ظلم ہے۔ ایک سے زیادہ شادیاں کرنا اس سے بھی بڑا ظلم ہے۔ پاکیزہ کے خیال میں

عورت کے لئے سوتن سب سے بڑی سزا ہے لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے۔ ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کا رواج ختم ہو گیا ہے۔

اس کی ایک وجہ معاشی حالات ہیں لیکن سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ عورت میں خود اعتمادی آگئی ہے۔ وہ مرد کی عادت اور مزاج کو سمجھتی ہے طلاق اور دوسری شادی کی سب سے بڑی وجہ میاں بیوی میں ایک دوسرے کو سمجھنے کی اہلیت کا نہ ہونا ہے کیوں کہ اس طرح غلط فہمیوں کی دیوار کھڑی ہو جاتی ہے۔ ذہنی ہم آہنگی نہ ہو تو مرد اسے دوسری عورت میں تلاش کرتا ہے۔ اب صورتِ حال بدل گئی ہے عورت تعلیم حاصل کر رہی ہے مرد اور عورت کا ذہنی فرق مٹ رہا ہے۔ وہ اس کے دکھ درد کو سمجھ سکتی ہے، زندگی میں اس کا ہاتھ بٹا سکتی ہے۔ وہ صحیح معنوں میں اس کی شریک حیات بن سکتی ہے۔ اس لئے مرد کو دوسری جگہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ عورت اب صرف کھانا پکانے والی باورچن نہیں ہے، وہ صرف بچوں کی آیا نہیں ہے، بلکہ وہ ایک دوست اور رفیق بھی ہے۔ ہندوستان کے قانون کے مطابق سرکاری افسر ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی نہیں کر سکتا، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان غیر سرکاری لوگ اس قانون کی زد میں نہیں آتے۔ سرکاری افسروں کو دوسری شادی کے لئے حکومت سے اجازت طلب کرنا پڑتی ہے۔ اگر بیوی دائمی تپ دق کی مریض ہے یا بانجھ ہے تو اس صورت میں دوسری شادی کی اجازت مل جاتی ہے۔ بعض اوقات بیوی کی طویل بیماری بھی اس اجازت کا سبب بن سکتی ہے لیکن پاکیزہ کے خیال میں یہ اجازت نامناسب ہے۔ کیا مرد بیمار نہیں ہو سکتا؟

پاکیزہ عورتوں کی بے انتہا آزادی کے حق میں نہیں۔ ان کے خیال میں عورت کو اپنی نسوانیت پر فخر کرنا چاہئے۔ مردوں کی مشابہت کا جنون نادانی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ مرد اور عورت زندگی کی گاڑی کے دو پہئے ہیں۔ بعض لوگوں کے خیال میں یہ پہئے برابر نہیں۔ مرد ٹرک کا پہیہ ہے اور عورت اسکوٹر کا۔ مرد کماتا ہے۔ اس کی زندگی گھر میں محدود نہیں تمام بڑے بڑے فیصلے اس کے اختیار میں ہے۔ پاکیزہ کے خیال میں یہ غلط ہے۔ ان کا خیال ہے کہ دونوں پہیوں میں عورت بڑا پہیہ ہے۔ وہ اس دعوے کے ثبوت میں جدید تعلیم یافتہ عورت کی مثال پیش کرتی ہیں۔ آج عورت مرد کے ساتھ ہی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ کالج اور یونیورسٹی میں عورتوں کی تعداد مردوں سے کم نہیں۔ تعلیم کے بعد عورت ملازمت بھی کرتی ہے۔ شادی کے بعد وہ گھر کی ذمہ داری کا بوجھ بھی اٹھاتی ہے۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کا بار بھی اسی کے سر ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اس کے بچے اچھے اسکولوں میں پڑھیں — اگر میاں کی تنخواہ گزارے لائق ہے تو اس عورت کی مالی مدد کے لئے کام بھی کرتی ہے اس طرح ایک تعلیم یافتہ عورت کی ذمہ داری مرد سے زیادہ ہے۔

مغربی ممالک میں خصوصاً امریکہ میں عورتوں کی آزادی کی جو تحریک چل رہی ہے پاکیزہ اس کے حق میں ہیں۔ ان کے خیال میں عورت کو ابھی تک برابر کے حقوق نہیں ملے کچھ حلقوں میں ابھی تک عورت کو ووٹ دینے کا حق بھی نہیں ملا۔ اس میں شک نہیں کہ مرد نے عورت کو دبا کر رکھا ہے، اسے اپنے مطلب کے لئے جائز اور ناجائز استعمال کیا ہے۔ اشتہارات میں عورت کو پبلسٹی کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ صابن اور کریم سے لے کر ریڈیو اور ٹی وی تک کے لئے عورت کو اشتہار بازی میں استعمال کیا جاتا ہے، حتیٰ کہ مردوں کی قمیص فروخت کرنے کے لئے بھی عورت کے دامن کا سہارا لیا جاتا ہے۔ یہ نامناسب ہے۔ اس کے باوجود یہ تحریک ہمارے ملک کے لئے مناسب نہیں اس لئے کہ ہمارے ملک کا ڈھانچہ مختلف ہے یہاں عورتوں کو آزادی سے زیادہ روشن خیالی کی ضرورت ہے۔

پاکیزہ ماں باپ کی پسند کی شادی کے حق میں نہیں۔ قدیم زمانے میں عورت تعلیم یافتہ نہیں تھی۔ اس کی شادی کم سنی میں کر دی جاتی تھی۔ اس کا شعور پختہ نہیں ہوتا تھا کہ اسے کیسا ساتھی چاہئے۔ شادی کے بعد وہ اپنے آپ کو سسرال کے ماحول میں ڈھال لیتی تھی اس طرح مل جل کر گزارہ ہوتا تھا اب صورتِ حال بدل گئی ہے۔ تعلیم کے ساتھ شعور بھی پختہ ہو جاتا ہے۔ اب عورت جانتی ہے کہ اسے کیسے مرد کی ضرورت ہے۔ اس پر زبردستی کسی کو مسلط نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں ماں باپ کی رائے لینے میں کوئی حرج نہیں۔ ان کے تجربے سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہئے۔

●●





محبّت نامے

حمیدہ سلطان

رُوفی بھائی مجھ سے ایک دو نہیں، پورے دس سال بڑے ہیں۔ لیکن اپنی مسخری طبیعت اور چونچالی کے باعث ان کا برتاؤ میرے ساتھ ایسا ہے جیسے اوپر تلے کے بہن بھائیوں میں ہوتا ہے۔ سچ پوچھئے تو رشتہ ان سے بس نام بھر کا ہے۔ خدا جانے کتنے اوٹ پٹانگ

سلسلے ملاکر نانی اماں نے بتایا تھا۔ رُدنی بھائی کی دادی اماں ان کی بھاوج ہوتی تھیں۔ یہ بھی اس طرح معلوم ہوا کہ رُدنی بھائی اماں باوا کے اکلوتے لاڈلے بیٹے، وسیع جائیداد کے تنہا مالک، بے فکرے انسان۔ خالی بیٹھے بیٹھے ان کو ایڈیٹر بننے کا شوق چرایا۔ رسالہ نکالنے کے ساتھ لکھنے والوں اور لکھنے والیوں کا خیال آیا۔ مجھ سے سرسری طور پر وہ دو تین ادبی جلسوں میں مل چکے تھے۔ اسی حوالے سے آدھمکے۔ دو چار پھیرے انہوں نے کئے تو نانی اماں نے ان کے اماں باوا نانا نانی، دادا دادی کی بابت پوری تفتیش کی اور یہ ثابت ہوتے ہی کہ وہ بھی کسی نہ کسی طرح بھائی ہو سکتے ہیں، انھوں نے اپنا حق پوری طرح ثابت کرنے کے لئے بزرگی کا رعب مجھ پہ جمایا اور ہر مہینے ڈانٹ ڈپٹ کر اپنے رسالے کے لئے مضمون مجھ سے لینے لگے۔

ادیب ایڈیٹر بن جانے سے قبل رُدنی بھائی تھے نہ اب ہیں۔ لیکن خیالات اور عمروں کے تفاوت کے باوجود ہم دونوں بے حد بے تکلف ہیں۔ میری ہر شرارت کو وہ نظر انداز کرتے ہیں اور میں ان کے سخت سے سخت مذاق کو برداشت کر لیتی ہوں۔ ان کے رسالے کا شمار ملک کے معیاری رسائل میں ہوتا ہے۔ اس لئے ہر مہینے نئی مطبوعات کا خاصا انبار ریویو کے لئے ان کی میز پر جمع ہو جاتا ہے۔ میں نئی کتابوں کے لالچ میں اکثر ان کے دفتر پہنچ جاتی ہوں۔

پچھلے ہفتے بھی میں صبح ہی صبح وہاں جا دھمکی۔ وہ پوری مدیرانہ شان سے کرسی پر رونق افروز تھے۔ سامنے میز پر رنگ برنگے کاغذ بکھرے ہوئے تھے اور وہ ان کاغذوں کے دیکھنے میں اتنے منہمک تھے کہ میں کھٹ پٹ کرتی قریب پہنچ گئی تو بھی ان کو خبر نہ ہوئی۔ ان کی توجہ اپنی جانب کرنے کے لئے میں جھوٹ موٹ کھانسی اور انہوں نے سر اٹھا کر میری جانب نظر کی۔ مجھے دیکھتے ہی ان کی سنجیدگی کافور ہو گئی اور شگفتہ لہجے میں بولے

"اچھا تو یہ آپ کی شان نزول ہے ایں سمجھا کوئی بلی دلی ہوگی۔"

"آپ کے ہاں سینڈل پہن کر بلیاں ہی آتی ہوں گی۔" میں نے مونہہ چڑا کر کہا۔

"ارے بھائی، ترقی کا زمانہ ہے۔ یہ خیال تھا کوئی ادیب قسم کی بلی ہوگی۔ تم جانو ادیب اور شاعر تو ہر قوم، ہر جنس میں ہوتے ہیں۔ یہ وبا تو سارے جہاں میں پھیلی ہوئی ہے" ہنسی کو روکتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"اچھا تو آپ کی نظر میں ادیبوں شاعروں کی اوقات بلیوں اور کتوں جیسی ہے۔ میں اب آپ کے رسالے کے لئے کچھ نہ دوں گی" میں نے ذرا روٹھ کر کہا۔

"لو بھئی، سچی بات پر تم کو غصہ آگیا۔ کتوں کے شاعر ہونے میں بھی تم کو شک ہے یہ بات میں نہیں اور ادیب بھی کہتے ہیں، پطرس کے مضامین تو تم نے پڑھے ہوں گے کتوں کے فی البدیہہ مشاعروں کے تو وہ بھی قائل ہیں" رُدنی بھائی قہقہہ لگا کر بولے۔

میں نے ان کی اس فضول بات کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور نئی کتابوں کو دیکھنے لگی۔

"تم تو اب بالکل خفا ہو گئیں۔ لو غصہ تھوک دو۔ میں تو یوں ہی مذاق کر رہا تھا۔ یہ تو بتاؤ میرے سامنے یہ کاغذ کیسے پڑے ہیں۔" رُدنی بھائی نے منانے کے انداز میں کہا۔

"ہوں گے مضمون۔ اور کیا ہو سکتا ہے رسالوں کے ایڈیٹروں کے پاس؟" میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"اوں ہوں۔ یہ تو محبت نامے ہیں، محبت نامے، جو مجھے ادیبہ، شاعرہ خواتین نے ازراہ عنایت بھیجے ہیں" وہ سگار کا دھواں چھوڑ کر بولے۔

"ہر لکھنے والی خاتون کو اپنے مضمون یا نظم کے ساتھ رسائل کے مدیروں کو خط بھی لکھنا پڑتا ہے۔ اس کی اہمیت ہی کیا ہے جو آپ یہ بہتان باندھ رہے ہیں؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں" رُدنی بھائی نے کہا "کہ سیدھے سادے خطوط کو محبت نامے سمجھ لوں۔ ایسے خطوط تو روزانہ آتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ ایسی بھی چند کرم فرما خواتین ہیں جو رسالے کے ساتھ ایڈیٹر کو بھی اپنی توجہ کا مرکز بنائے ہوئے ہیں۔ اور اس حقیقت سے انکار کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ پھر تعجب تو یہ ہے کہ غیر شادی شدہ تو خیر، لیکن شادی شدہ خواتین بھی اس قدر اشتیاق انگیز خط بھیجتی ہیں کہ اچھے خاصے مضبوط دل انسان کا بھی ایمان ڈگمگا جائے۔ تم کہتی ہو کہ بھولی بھالی عورتوں کو مرد بہکاتے ہیں، حالانکہ میرا تجربہ بتاتا ہے کہ ہم بھولے بھالے مردوں کو آج کل کی ترقی یافتہ خواتین نے بہکانے پر کمر باندھ رکھی ہے۔"

"واہ، یہ کیا فضول مذاق ہے۔ آپ سراسر تہمت لگا رہے ہیں۔ میں ان واہیات باتوں کو برداشت نہیں کر سکتی۔ بھلا عورتوں کو کیا غرض پڑی ہے کہ خواہ مخواہ کسی مرد کو بغیر جانے پوچھے

خط لکھنے شروع کر دیں؟" میں جھنک کر بولی۔

"یقین نہیں آتا تو خود دیکھ لو" رُوفی بھائی نے ایک ہلکے کاسنی رنگ کا معطر خط میرے ہاتھ میں دے کر کہا۔

میں نے جلدی سے لفافے سے خط نکالا تو سینٹ کی بھینی بھینی خوشبو دماغ میں بس گئی اور ایک تصویر میری گود میں گر پڑی۔ صاحبۂ تصویر کی پھٹی پھٹی آنکھیں۔ اُجڑی ہوئی صورت اور بے باکی کے انداز دیکھ کر میں نے تصویر کو لاحول پڑھ کر صوفے پر ڈال دیا۔ خط دیکھا تو چار صفحے کا طویل خط اور اس قدر رنگین کہ الٰہی توبہ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا رُوفی بھائی ان صاحبہ کے مدتوں ساتھ رہے ہیں، اچھی طرح ان سے واقف ہیں اور ان سے ہمیشہ سے محبت کرتے چلے آرہے ہیں۔ اس خط کو دیکھ کر مجھے اس قدر غصہ آیا کہ ختم کرنے سے پہلے ہی خط کو پھاڑ دیا۔

"ارے رے! یہ کیا ــــــ کیا؟ بڑی ظالم لڑکی ہے! خوب قدر کی مجھ سے محبت کرنے والی کی۔ آخر کو ہو نا بے وقوف۔ دیکھی میری اہمیت؟ کہتی ہو، میں ادیب نہیں ہوں اور میرا ادب سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ اگر میں اچھا . . . بھلا اس بی اے خاتون کو کتے نے کاٹا تھا جو اتنی تعریف میری کرتی؟ ابھی نہیں ایک درجن خواتین اور بھی میری ثناخوان ہیں" رُوفی بھائی آنکھیں نچا کر بولے۔

"بس بس، رہنے دیجئے اپنی لن ترانی۔ خدا کی قسم اس عورت کا خط دیکھ کر اتنا غصہ آرہا ہے کہ پیٹ دینے کو جی چاہتا ہے۔ میں اس کی آنکھوں کی کہ ذرا ہوش کی دوا کرو۔ رُوفی بھائی اکیلے نہیں جو تم ان پر ڈورے ڈالو گی۔ ایک بیوی بچاری جا رہے ہیں ... اور مجھ جیسی گرہوتے کیلئے مزاج کی بہن رکھتے ہیں۔ میری خوب صورت بھابی کے پاؤں دبانے کے لائق بھی تم نہیں ہو" میں نے جلدی سے کہا۔

"جی ہاں، ایک دنیا بھر میں بس تمہاری بھابی ہی تو خوب صورت ہیں۔ شلغم جیسا رنگ۔ اور ایک تم ہو، چشم بد دُور، ماشہ بھر کی ناک اور . . . ."

"واہ، میں نے اپنے کو خوب صورت کب کہا؟ آپ بھی کتنے وہ ہیں" میں بات کاٹ کر بولی۔

"ارے تم تو ایک خط دیکھ کر ہی بگڑ گئیں۔ اور خط تم کو نہیں دوں گا۔ خود سناؤں گا۔ افسوس ایک قیمتی خط ضائع ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے ڈارون کا نظریہ صحیح ہے اور کوئی ہو نہ ہو، تم پہلے ضرور بندریا ہو گی" رُوفی بھائی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یاد رکھئے گا، میں سارے خط پھاڑ دوں گی آپ کی چہیتیوں کے، اور بھابی سے لڑائی الگ کرا دوں گی۔ اگر زیادہ بکواس آپ نے کی تو . . . ." میں جل کر بولی۔

"تم سے نیکی کی اُمید ہی کب ہے۔ یہی تو کرو گی۔ خدا کی پناہ! لڑکی ہے کہ شعلۂ جوالہ۔ چلو، من جاؤ۔ اب ہم تم کو کچھ نہ کہیں گے خاموش بیٹھ کر خط سنو۔ جب تمہاری بھابی سے لڑائی ہوتی ہے تو یہ خط ہی میرے لئے سامانِ تسکین بن جاتے ہیں۔ وہ رُوٹھ کر کئی کئی ہفتہ نہیں بولتیں، چپ سادھ لیتی ہیں، اور میں اطمینان سے یہ خط بیٹھا دیکھا کرتا ہوں اور یہ جادو کا رگر ہوتا ہے وہ جلدی ہی من جاتی ہیں" رُوفی بھائی نے بات پوری کر کے فوراً ایک خط اٹھا لیا اور سنانے لگے

ادب نواز:

آپ کا محبت پاش خط باصرہ نواز ہوا۔

اپنی نظم کی تعریف آپ کے قلم سے دیکھ کر مجھے اپنی قسمت پر ناز ہو گیا میں کیا اور میرے اشعار کیا۔

ان میں کس کا حسین پر تو ہے۔

خیالات الفاظ کی صورت میں ڈھل گئے ہیں۔ ہاں، مجھے آپ سے ایک شکوہ ہے۔ میرے دو تین خطوں کے جواب میں آپ ہمیشہ ایک خط، اور وہ بھی بہت مختصر بھیجتے ہیں۔ مانا کہ آپ کے مدیرانہ فرائض آپ کو اور طرف متوجہ ہونے کی اجازت نہیں دیتے لیکن کیا میرے لئے بھی آپ تھوڑی سی فرصت نہیں نکال سکتے؟ کیا تم نہیں ہو میری تمنا جواب دو۔

اچھا اجازت۔ پھر ملیں گے۔

آپ کی . . . . . .

"اُف میرے معبود! اس عورت کا دماغ بالکل چل گیا ہے!" رُوفی بھائی کے خاموش ہوتے ہی میں نے بے اختیار کہا۔

"ایک کا ہی کیوں؟ ابھی تو تقریباً آدھ درجن اور بھی ہیں۔ سُنتی جاؤ۔ پھر لطف یہ ہے کہ ان میں سے ایک خاتون سے بھی ذاتی طور پر نیاز حاصل کرنے کا مجھے موقع نہیں ملا، نہ ان کے نجی حالات سے مجھے مطلق واقفیت ہے، نہ ان کو ... میرے متعلق کچھ علم ہے

لیکن یہ ہیں کہ خط بھیجے جارہی ہیں ـــــ ان صاحب سے کیا واقف ہو؟" ایک خاتون کا نام لے کر انھوں نے دریافت کیا۔

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔ میں ان سے مل چکی ہوں، لیکن دس سال پہلے" میں نے چونک کر جواب دیا۔

"کیا عمر ہوگی ان کی؟" رُوفی بھائی نے سوال کیا۔

"ان کی عمر اس وقت چالیس سال کے قریب تھی۔ ان کی لڑکی میرے برابر نہیں تو مجھ سے دو تین سال چھوٹی ہوگی۔ اب تو پچاس کے قریب ہوں گی۔ میں نے کہا۔

"اچھا تو یہ معمّر خاتون بھی ایسا رنگین خط لکھ سکتی ہیں! لو سنو" رُوفی بھائی خط نکالتے ہوئے بولے۔

من موہن:

اپنی پجارن کا سلام محبت
قبول کرو۔ دو خط بھیج چکی ہوں
لیکن جواب ندارد۔ آپ کی
تغافل کیشی کا جواب کاش
میں بھی دے سکتی لیکن پجارن
اپنے دیوتا کے حضور کیسے گستاخی
کر سکتی ہے؟
ایک چھوٹا سا افسانہ بھیج رہی
ہوں۔ اس کو اپنے رسالے کے
قیمتی صفحات پر جگہ دے کر
میری عزت بڑھائیں۔
سلامِ شوق۔
منتظرِ جواب

"خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را! بڑھاپے کا عشق ہے خدا خیر کرے"

میں نے جھوم کر کہا۔

اور رُوفی بھائی ایک زرد رنگ کا لفافہ اٹھا کر بولے "یہ ایک اور صاحبہ کا خط ہے۔ سماعت فرمائیے:

محتّبِ مکرم:

حسب الارشاد نظم سال گرہ نمبر
کے لئے ارسال ہے اور اپنی
تصویر بھی بھیج رہی ہوں۔ اگر
آپ چاہیں تو اس کو بھی شامل
کر دیں۔ رسالہ تو آپ کا تین
سال سے نکل رہا ہے، لیکن
آپ نے مجھے بہت دیر بعد
یاد کیا۔ اتنی دیر سے یاد کرنے
کا شکوہ کروں یا یاد کرنے کا
شکریہ۔ بقولِ غالب:

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ ایک نگاہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

اور ہاں، یہ تو بتائیے کہ آپ
اپنے رسالے میں اور لوگوں کی
تصویریں تو دے دیتے ہیں،
مگر اپنی تصویر کبھی نہیں دیتے،
گو آپ کی ارفع شانِ خود بینی
کی اجازت نہیں دیتی، مگر
ہماری خاطر آپ اپنی تصویر
ضرور دیں۔
آپ کی.....

"خدا غارت کرے ایسی نامرادوں کو جو نسوانی خودداری اور شانِ دوشیزگی کو اس طرح ملیامیٹ کریں" میں دانت پیس کر بولی، اور رُوفی بھائی نے خوش ہو کر کہا "ایک یہ زوردار خط اور سن لو۔ کیا یاد کرو گی

تم بھی"

حضورِ عالی جاہ:

اپنی دیوی کی جانب سے ہدیۂ
محبت لو سلامِ شوق قبول کرو۔
تم نے ہمارے شعروں کی تعریف
کی۔ ہم نے اس تعریف کو شرفِ
قبولیت بخشا اور تمہاری دلکش
تحریر سے متاثر ہو کر اپنی تصویر
بھیجتے ہیں۔ قومی اور ادبی کاموں
کی مصروفیت کی وجہ سے اگرچہ
وقت بالکل نہیں ملتا، لیکن
تمہارے رسالے کے لئے اپنی
اور نظمیں بھیجنے کا وعدہ کرتے
ہیں۔ اشتیاقِ ملاقات کو خدا
پورا کرے۔ تم کو دیکھنے، تم
سے ملنے، تم سے باتیں کرنے
کو دل چاہتا ہے۔ کوشش
کی جائے گی کہ جلد از جلد شرفِ
ملاقات تم کو بخشا جائے۔ اگر
تم اِدھر آ سکتے ہو تو پھر:
دیدہ و دل فراشِ راہ
تمہاری اپنی.....

یہ خط ایسی مشہور شاعرہ خاتون کا تھا جن کی شاعرانہ نازک خیالیوں اور سیاسی سرگرمیوں کا ڈنکا تمام ملک میں پٹ رہا ہے۔ یہ شہرت کا ڈنکا خود انھوں نے پیٹا ہے یا اوروں نے، اس کی بابت لکھنا ذرا مشکل ہے، بہر حال ہیں وہ شیطان کی طرح مشہور۔ ان کی تصویر بھی دیکھی۔ اس تصویر میں اپنی اصلیت کو چھپانے کے لئے انہوں نے بہت رُومانی انداز پیدا کئے تھے۔ بہترین لباس پہنا تھا اور بہت بناؤ سنگار بھی، لیکن باوجود اس زیب و

زینت کے بے چاری اپنے جسم کی ساخت کو پوشیدہ نہ رکھ سکی تھیں، نہ بھدّے خدوخال اور چہرے کی شکنوں کو دُور کر سکی تھیں۔ مگر بیٹھی اس انداز سے تھیں گویا اب اس تصویر کے ذریعہ سے اپنی دل ربائی کی بدولت تمام جہان کو قتل کر کے اُٹھیں گی۔

ان تمام خطوط کو سُن کر اور ان تصاویر کو دیکھ کر مجھے تعجب تھا ـــــ تعجب سے زیادہ غصہ اور غصے سے زیادہ افسوس۔ ابھی تک میں مردوں کا جذباتی ہونے کا مذاق اُڑاتی رہی تھی لیکن ان پڑھی لکھی، سمجھ بُوجھ والی عورتوں کی جذباتیت دیکھ کر تو میں انگشت بہ دنداں رہ گئی اور مجھے پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ عورتوں نے موجودہ دَور میں جہاں بہ لحاظِ علم و فضل ترقی کی ہے وہاں وہ اخلاقی لحاظ سے پست بھی ہوتی جا رہی ہیں۔ شہرت اور ہر دل عزیزی کے خیال سے یہ جذبات زدہ خواتین ہر رسالے کے ایڈیٹر کو ایسے اول جلول خط لکھتی ہوں گی اور ان بے وقوف عورتوں کا مضحکہ ہر رسالے کا ایڈیٹر خوب اُڑاتا ہوگا۔ میرا وہ تمام ناز، وہ تمام غرور جو عورتوں کے ادبی مضامین، افسانے، نظمیں، غزلیں رسائل میں دیکھ دیکھ کر سربلند ہوا تھا، سرنگوں ہوگیا۔ مجھ پر اس وقت گھڑوں پانی پڑ گیا۔ میری نظریں ندامت سے نیچی ہوگئیں۔ عورت اور اتنی پست! مشرق کی بیٹیاں اور اس درجہ جذبات پرست اور غیر ذمہ دار! ان چند بے شعور عورتوں نے گویا تمام ادیبہ اور شاعرہ خواتین کو مردوں کی نظروں میں بے وقوف بنا دیا ہے۔ اب وہ ہر لکھنے والی خاتون کو ایسا ہی سمجھیں گے۔ مجھے تو خود اپنی ذات سے بھی ان خطوط کو دیکھ کر نفرت ہونے لگی، کیوں کہ ادبی لحاظ سے میرا شمار بھی تو اسی طبقے میں ہوتا ہے۔ وہی مثل ہوئی: ایک مچھلی سارے جل کو گندا کرے۔ ایسے فضول خطوط بغیر جانے بُوجھے ہر کسی مرد کو لکھنے والیاں دامنِ ادب پر ایک بدنما داغ ہیں، ایک نہ مٹنے والا دھبّا۔ کاش تلاشِ محبت میں وہ ہر رسالے کے ایڈیٹر کو اپنا محبوب نہ سمجھا کریں اور خود کو جس طرح افسانوی ہیروئن شمار کر بیٹھی ہیں، یہ مغالطہ اپنے دل سے نکال دیں۔

یہ ادب نوازی نہیں، بے ادبی ہے۔ حقیقت تو سب کو ہی کڑوی لگتی ہے، لیکن تنقید جب اپنے اوپر خود ہی نہ کی جائے تو اور کون کرے گا؟ ●●

ضروری نہیں کہ ہر وہ چیز جس کے سب سے زیادہ ڈھول پیٹے جائیں وہی سب سے اعلیٰ اور عمدہ ہو۔ سونا لعل و جواہر کو اشتہارات کی ضرورت نہیں اسی لئے ہم نے گل برگ کی اشتہار بازی کی بجائے ساری توجہ کوالٹی پر دی ہے، اسے انتہائی مزے دار اور مفید بنانے پر دی ہے۔ گل برگ ہونٹوں سے لگتے ہی ٹھنڈک، تازگی اور فرحت پہنچاتا ہے۔ لو اور گرمی کے مضر اثرات سے محفوظ رکھتا ہے۔ گل برگ شربت نہیں، گرمی کی مزے دار دوا ہے یہ پھلوں پھولوں کے رس اور دل و دماغ کو تازگی اور فرحت پہنچانے والی مفید جڑی بوٹیوں سے تیار کیا جاتا ہے۔ اس میں عام بازاری شربتوں کی طرح بناوٹی یا نقلی خوشبو نہیں ڈالی جاتی۔ گل برگ وقتی طور پر ٹھنڈک پہنچانے والے مضر اجزا سے بھی پاک ہے۔

گُل برگ



شمع (یونانی اینڈ آیورویدک) لیباریٹریز لال کنواں دہلی ۶



برہم پال

زنان خانہ

[illegible]

ابھی موٹر سنبھالا ہی تھا کہ سامنے سے ایک جلوس نما ہجوم کو آتے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ عجب نظارہ تھا۔ ایک نوجوان لڑکی کو، جس کی عمر مشکل سے اکیس بائیس برس ہوگی، ہتھکڑی لگا کر دو سپاہیوں نے اپنے نرغے میں لے رکھا تھا۔ ایک چھوٹا تھانے دار اپنی طرہ دار پگڑی کو لہراتا اور اکڑتا ہوا ساتھ تھا۔ پیچھے بچے تالیاں پیٹ رہے تھے۔ چند نوجوان اشارہ کر کر کے مسکرا رہے تھے۔ کچھ بزرگ نما اصحاب کانا پھوسی کر رہے تھے۔ جب تھانے دار نے مجھے دیکھا تو اس نے سر کے اشارے سے ہی سلام کیا۔ میں منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا۔ یاد نہیں کہ میں نے اسے کوسا یا سلام کا جواب دیا۔ خیر کچھ بھی ہو، میں نے لڑکی کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ نہ صرف قابلِ قبول صورت تھی، بلکہ جسمانی طور پر بے حد جاذبِ نظر تھی۔ وہ اس طرح اکڑ اکڑ کر چل رہی تھی گویا یہ جلوس اس کی شان میں نکلا ہو۔ چہرے پر نہ ندامت تھی، نہ آنکھوں میں شرم۔ اس نے مجھے بھی اک لمحہ کو گھورا، اور پھر اسی شانِ بے نیازی سے آگے بڑھ گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ زبانِ حال سے مردوں کو ایک پیغام دے رہی ہو: تمہارا کام عورت کا جسم دیکھنا ہے، روح کو پرکھنا نہیں۔ آخر میں بھی تو ایک مرد ہی تھا۔

پرانے وقتوں میں عام طور پر گھر کے دو حصے ہوا کرتے تھے: مردانہ اور زنانہ۔ اب جب کہ عورتوں نے مردوں کے شانہ بشانہ زندگی کے ہر شعبے میں تیزی سے چلنا شروع کر دیا ہے، یہ امتیاز ختم ہو چکا ہے۔ مگر جیل میں یہ روایت ابھی باقی ہے۔ گو مرد اور عورت کا جرم یکساں ہو سکتا ہے، عورت بھی قاتل، افیون فروش، اسمگلر، ڈاکو یا آوارہ ہو سکتی ہے اور تعزیرات ہند کی رو سے یہ دفعات مرد اور عورت پر یکساں لاگو ہوتی ہیں، لیکن جب عورت گرفتار ہو جاتی ہے تو اسے جیل کی چار دیواری کے اندر ایک اور چار دیواری میں رکھا جاتا ہے۔ جیل کی اصطلاح میں اسے زنان خانہ کہتے ہیں۔ اس کی نگران بھی مرد نہیں، عورت سپاہی ہوتی ہیں۔ جیل کے اعلیٰ افسر کی حیثیت سے میرا کام ہر نووارد کو ملاحظہ کرنا ہوتا ہے، خواہ وہ قیدی ہو یا حوالاتی، عورت ہو یا مرد، عادی مجرم ہو یا اتفاقیہ۔ شام کے چار بجے کے قریب یہ تقریب تقریباً روزانہ منعقد ہوتی ہے۔ عدالت کے وارنٹ اور جیل کے رجسٹر پر دستخط ثبت کرنا ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی بات نئی نہیں۔ اس روز میں جب مرد قیدیوں اور حوالاتیوں کو ملاحظہ کر چکا تو میرے ماتحت نے کہا "صاحب، ایک عورت حوالاتی بھی ہے۔" اور میں ایک مشینی انداز میں "زنان خانہ" میں داخل ہو گیا۔

سامنے وہ تھی۔ وہی اندازِ بے نیازی۔ وہی حسین چہرے پر کرختگی اور نفرت۔ اس نے پھر مجھے اسی طرح چندھے گھورا اور اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے، گویا کہہ رہی ہو "میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم یہاں کہاں آ گئے؟"

عورت سپاہی نے، جسے ہم میٹرن کہتے ہیں، اسے سختی سے ڈانٹا: "صاحب آ گئے ہیں۔ سیدھی طرح بیٹھو۔ سر پر دوپٹہ لے لو۔"

اس نے بھی سنی ان سنی کر دی اور پھر مجھے گھورنے لگی۔ میں مسکرایا تو اس کے ماتھے کی سلوٹیں اور گہری ہو گئیں۔ ہونٹ نفرت سے اور سکڑ گئے۔ اس نے کہا: "اونہہ!" پھر اس نے میٹرن کی طرف

تو چپ [illegible] عورت [illegible] عورت پہچان لیتی ہے۔ اس نے بھانپ لیا کہ یہ معاملہ مرد اور عورت کا نہیں، حاکم اور ماتحت کا ہے۔ وہ چپکے سے مڑ گئی۔ پھر حسبِ معمول وہ عامیانہ سی کارروائی شروع ہوئی۔ ماتحت نے وارنٹ پڑھا، میں نے رجسٹر دیکھا۔ ماتحت نے پوچھا "نام؟" اگرچہ دونوں جگہ اس کا نام لکھا ہوا تھا لیکن اس کی تصدیق تو لازم ہوگئی تھی۔ جواب ملا "چندا۔" میں نے پہلی دفعہ اس کی آواز سنی تھی۔ اس میں نغمگی بھی تھی اور تلخی بھی جو بڑھاپے نے گھٹا تھا اور زمانے نے سکھایا تھا۔ ماتحت نے پھر پوچھا "اور تجھے چندا بھی کہتے ہیں؟" اب وہ بھڑک گئی۔ اس نے میرے ماتحت کی طرف گھورا اور کہنے لگی "مجھے تو لوگ بہت کچھ کہتے ہیں، "میری جان" بھی اور حرام زادی بھی!"

میٹرن نے میری طرف دیکھا اور کہنے لگی۔ "حضور، بڑی اکھڑ اور سرکش لڑکی ہے۔ کوئی بات مانتی ہی نہیں۔ بات بات پر کاٹنے کو دوڑتی ہے۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے ہونٹوں پہ سرکش سی مسکراہٹ تھی۔

دوسرا سوال تھا: باپ کا نام؟

وہ چپ رہی۔ میٹرن نے پھر ڈانٹا "بتاتی کیوں نہیں۔ کیا منہ میں پان دبا رکھا ہے؟"

وہ اکڑ کر کھڑی ہوگئی۔ اور پھر جیسے فوارہ چھوٹ پڑا ہو۔ اس نے روانی سے کہنا شروع کیا: "نہیں بتاتی، میری مرضی۔ میرا کوئی باپ نہیں۔ میری کوئی ماں نہیں۔ اگر کوئی ہوگا تو اس نے مجھے حلال زادی کے طور پر پیدا کیا ہوگا۔ اور اب اس حرام زادی کا کون باپ بنے؟ کوئی بھی ہو، میں اس کے نام کو بٹہ نہیں لگاؤں گی۔ میرا کوئی نہیں۔ کاغذوں میں لکھ لیجئے۔"

وارنٹ بھی اس معاملے میں خاموش تھا۔

میں بھی چپ سا ہو گیا۔ میٹرن نے بات [illegible] تو اس نے سمجھانے کے لہجے میں پوچھا "تو باپ کا نہ سہی، خاوند کا نام ہی لکھوا دے۔"

اب کی بار وہ زور سے ہنسی، جس سے میٹرن ٹھٹھک گئی اور ماتحت سراسیمہ ہو گیا۔ جیل میں ایک عام سا حوالاتی بڑے صاحب کے سامنے اتنی بے تمیزی کا مظاہرہ کرے! میٹرن کا ہاتھ اٹھتے اٹھتے رک گیا، کیوں کہ میں نے اسے روک دیا تھا۔ میرا ماتحت بھی ہونٹ چبا رہا تھا۔ اور چندا نے میری مداخلت دیکھ لی تھی۔ "اب آپ بضد ہیں تو اپنا ہی نام لکھ لیجئے۔" اس نے ماتحت سے کہا۔

میں سکتے میں آ گیا۔ بے اختیار میرے ماتحت نے کہا "حرامزادی!"

اب وہ کولہوں پہ ہاتھ رکھ کے کھڑی تھی۔ اس نے کہا: "تو خاوند کے خانے میں لکھو: حرام زادہ، کیوں کہ اس کی بیوی ہی حرام زادی ہوتی ہے۔"

میٹرن نے اسے کندھوں سے پکڑ کر بٹھانا چاہا، لیکن وہ اکڑی کھڑی رہی۔ ماتحت نے میٹرن کا ہاتھ ہٹانا چاہا، لیکن میں نے اسے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔

چند روز بعد میں دفتر میں بیٹھا تھا کہ مجھے حوالدار نے اطلاع دی "صاحب چلئے، زنان خانے میں فساد ہو گیا ہے۔"

"فساد؟" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "کیا مطلب؟"

اتنے میں وہ ماتحت بھی میرے کمرے میں آ گیا۔ اس کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے کہا "صاحب! اسی حرام زادی نے اس بڑھیا یالو کو پیٹ ڈالا۔"

یہ یالو یا دیال کور ایک ساٹھ سالہ بڑھیا تھی، جس پہ اپنی بہو پر تیل چھڑک کر جلا دینے کا الزام تھا۔ اب اس پر قتل کا مقدمہ چل رہا تھا۔ ویسے دیکھنے میں وہ بھولی بھالی [illegible] عورت تھی [illegible] مجھے [illegible] نام [illegible] وہ پوجا کرتی، بھگتی رس کے گیت گاتی۔ ہم لوگ اسے نانی کہتے تھے۔ جب یہ معلوم ہوا کہ اس داشتہ نے نانی کو پیٹا ہے تو مجھے بڑا تاؤ آیا۔ اس پر تو آوارہ گردی کا مقدمہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ ایک سال قید کی سزا ہوتی، اور وہ بھی اس صورت میں اگر وہ نیک چلنی کی ضمانت نہ دے سکے۔ اور اس بے چاری کا تو زندگی موت کا سوال تھا۔ ایسے مقدموں میں سزائے موت بھی ہو سکتی ہے۔ بھلا ایسی بوڑھی عورت پر ہاتھ اٹھانا کہاں تک روا ہے۔

میں جب "زنان خانے" میں پہنچا تو نانی "ہائے ہائے" کئے جا رہی تھی۔ اور چندا کمر پہ ہاتھ رکھے گالیاں بکے جا رہی تھی ـــــ ایسی فحش گالیاں جنہیں ہم مرد بھی نہ سن سکیں۔ جب اس نے مجھے دیکھا تو اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ وہ چپ تو ہو گئی، لیکن اس کے انداز اس بپھری ہوئی شیرنی جیسے تھے جس کا شکار سامنے ہو اور وہ اس پر جھپٹنے کو تیار ہو۔ میٹرن ایک طرف حواس باختہ کھڑی تھی۔ میں نے اندر گھس کر سخت آواز میں ڈانٹ کر اس سے کہا: "چندا، یہ کیا بدتمیزی ہے۔ اس بوڑھی عورت نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟"

اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور پھر بڑے نفرت بھرے لہجے میں کہا: "اس چھنال نے میرا کچھ نہیں بگاڑا، مگر میری بہن کی ہتیا ضرور کی ہے۔ کیوں کہ وہ ایک غریب سے باپ کی لڑکی تھی۔" اور پھر وہ گالیاں بکنے لگی۔

میں نے ذرا غصے سے کہا کہ کسی کے جرم کو پرکھنا اور اسے سزا دینا عدالت کا کام ہے، تمہارا نہیں۔ اگر اس نے ہتیا کی ہے تو اسے سزا ملے گی۔"

چندا اب میری طرف متوجہ ہو گئی۔ اس کے چہرے کے کھنچاؤ سے اس کے دل کی کیفیت عیاں تھی وہ تنک کر بولی: "آپ کو کیسے علم ہے کہ اس کو سزا ضرور ملے گی۔ آج ہی کہہ رہی تھی کہ اس کے خاوند اور بیٹے نے پیسے اور اثر و رسوخ سے سب گواہوں کو بٹھا دیا ہے اور یہ اگلی پیشی پر ہی بری ہو جائے گی۔ یہ بھگتنی نہیں چنڈالنی ہے۔ اس نے ایک کو مار ڈالا اور اب دوسری کو گھر لا کر یا تو اپنا گھر بھرے گی یا پھر اس کی بھی جان لے لے گی۔"

میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے تائی کے مونہہ پر تھوک دیا۔

"عجیب لڑکی ہے یہ بھی۔" میں نے غصہ دکھاتے ہوئے کہا: "اسے دس دن علیحدہ کوٹھڑی میں بند رکھو۔ اسے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کا حق نہیں۔"

چندا نے غصے سے میری طرف دیکھ کر کہا "صاحب، دس دن نہیں، آپ مجھے دس سال کال کوٹھڑی میں ڈال دیں، لیکن ان چڑیلوں کو میں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ ان ڈائنوں نے نہ معلوم کتنوں کی ہتیا کی ہے۔"

میں دفتر میں بیٹھ کر سوچنے لگا کہ کیا میرا اسے سزا دینا مناسب تھا؟ کیا اس کی بات میں سچائی نہ تھی؟ کیا تائی جیسی عورتیں قابلِ رحم ہیں؟ پھر میں نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ ڈسپلن آخر ڈسپلن ہے۔ اسے اس طرح توڑا بھی تو نہیں جا سکتا سزا دینا بہت ضروری تھی۔ مگر میں دل ہی دل میں شرمندہ ضرور تھا کیوں کہ چندا سچی تھی۔

پندرہ دن بعد ایک صاحب چندا سے ملنے آئے۔ ان کی عمر کوئی پچپن برس ہو گی۔ یہ صاحب کہیں جونیئر تحصیل دار تھے۔ شاید چوہدری کے علاقے سے تعلق رکھتے ہوں گے۔ وہ چندا کے لئے کم از کم پچاس روپے جمع کرا گئے اور مزید کچھ کھانے کا سامان دے گئے۔ جب تک وہ بیٹھے رہے، چندا ان سے لہک لہک کر باتیں کرتی رہی مگر جیسے ہی وہ اٹھ کر کمرے سے باہر گئے، چندا نے ایک بھرپور گالی انہیں دی۔ میں حیران سا رہ گیا۔ چندا نے جب میری حیرت دیکھی تو ہنس کر کہنے لگی: "صاحب، یہ بھی میرے اُن ان گنت خاوندوں میں سے ایک ہیں، جن کا ذکر میں نے پہلے روز ہی آپ سے کیا تھا۔" اور پھر قہقہہ لگا کر کہنے لگی: "لیکن جیل کے رجسٹر میں یہ اپنا نام لکھوانے کو تیار نہیں، کیوں کہ ان کی بیوی موجود ہے، نواسے ہیں، پوتے ہیں، گھر بار ہے۔"

"لیکن یہ تو تمہارے باپ کی عمر کے ہیں۔" میں نے حیرت سے کہا۔

"تو کیا ہوا؟" اس نے نفرت سے مونہہ سکوڑ کر کہا: "رشوت کے روپے بہت ہیں۔ بڑھاپے میں حرص اور بڑھ گئی۔ اس نے جوانی خرید لی۔ ان کو شرم کہاں کہ جس سے وہ کھیل رہے ہیں، وہ ان کی بیٹی یا نواسی کی عمر کی ہے۔"

اب مجھے شرم آ رہی تھی، کیوں کہ وہ حقیقت بیان کر رہی تھی۔ پھر وہ مجھ سے کہنے لگی "صاحب، اس روپے سے کچھ کھلونے، کچھ ایک دو سال کے بچے کے ناپ کے گرم کپڑے اور تھوڑے سے پھل منگوا دیجئے۔ آپ کی بہت مہربانی ہو گی۔"

چندا میرے لئے معمہ تھی۔ اس کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ میں نے تعجب سے پوچھا: "پھل تو میری سمجھ میں آ گئے لیکن یہ کھلونے اور بچوں کے کپڑے کس لئے؟ کیا آئندہ گھر بسا کر بچوں کے لئے جمع کرنا ہے؟"

وہ شرما گئی پھر اس نے آہستہ سے کہا "صاحب، وہ پارو ہے نا، تائی خانہ میں؟ اس کے ساتھ دو برس کا بچہ ہے ۔۔۔ اس کے لئے۔"

"ارے!" میں نے کہا۔ "تم پارو کو کیسے جانتی ہو؟ کیا رشتہ ہے؟"

اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور پھر کہا: "پارو کا عورت کے ساتھ رشتہ ہے۔"

میں نے کہا: "اس پر شاید انہوں کا کیس ہے اور اس سے کوئی ملنے نہیں آتا۔"

چندا نے جلدی سے کہا: "اس کا بھی تو کوئی خاوند رکشا چلاتا ہے۔ اس کی بیماری کی وجہ سے وہ گھر میں پڑا ہے۔ یہ جس سیٹھ کے ہاں برتن مانجھتی تھی اس نے کہا کہ خاوند کا علاج ہو جائے گا اگر یہ فلاں جگہ پہنچا دے۔ اس نے خاوند کو ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ خود دو تین دفعہ یہ دھندا کیا اور تیسری دفعہ پکڑی گئی۔" اور پھر مسکرا کر بولی: "یہ تحصیل دار کہتا تھا کہ میں اسے بری کرا دوں گا۔ جانا کتنا لگے گا اسی لئے تو میں اس سے ہنس ہنس کر بات کر رہی تھی۔"

پارو بری ہو گئی۔

اس روز چندا سے ملنے کے لئے دو آدمی آئے۔ ایک وہی تحصیل دار تھا جس نے کسی طرح پارو کو بری کروا لیا تھا۔ دوسرا ایک ادھیڑ عمر کا سوٹا سا آدمی تھا جس نے چندا کی [illegible] کی ضمانت دی تھی اور شاید اس کے لئے ایک نیا جوڑا کپڑوں کا اور سو روپے لے کر آیا تھا۔

چندا نے کپڑوں کا جوڑا اور روپیہ تو لے لیا لیکن ضمانت پر جانے سے بالکل انکار کر دیا۔ ہم نے اُسے بہت سمجھایا کہ اب تم آزاد ہو سکتی ہو۔ ایک شریف آدمی نے تمہاری ضمانت دی ہے لیکن چندا کے حلائل کا اب ہے یا [illegible] جواب نہ تھا۔ اس نے آنے والے [illegible] میں لا دیں اور تحصیل دار صاحب کو [illegible] کہا:

"ایک تو یہ صاحب جنہوں نے ضمانت دی ہے، شریف آدمی ہیں۔ دوسرے وہ نیک چلن ہیں۔ انہوں نے مجھے بدچلن بنانے کی ضمانت دی ہے، اور میں اس دھندے سے تھکی تو نہیں، اکتا ضرور چکی ہوں۔" وہ ہنس کر میری طرف دیکھ کر کہنے لگی "صاحب پیٹ بھرنے کو تو یہ دھندا کرنا ہی ہوگا۔ تھکنے سے تو کام نہیں بنے گا۔ آخر انسان ہوں۔" پھر اُن دونوں سے کہنے لگی "مشین کو بھی آرام کی ضرورت ہے۔ مجھے جیل میں روٹی کپڑا اور ٹھکانا ملا ہوا ہے۔ اور یہی آپ بھی مجھے دیتے تھے اور میرا بقایا جو آپ کے ذمے تھا، وہ میں نے لے لیا ہے۔"

چندا نے روپے اور کپڑے پارو کے حوالے کر دئیے، جو رہا ہو کر جیل سے باہر جا رہی تھی۔ وہ پارو کے گلے مل کر خوب روئی۔

کچھ دن بعد چندا کو ایک سال قید بامشقت کی سزا ہو گئی۔ اسے عورتوں کی جیل میں منتقل کرنا تھا۔ میں نے اسے دفتر میں بلایا اور اس سے کہا "بیٹی، آخر یہ جسم کب تک چلے گا۔ اس کا اش تو گھر بسا لے۔ تو عورت ہے۔"

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی، جیسے اس نے مجھے پہلی دفعہ دیکھا ہو۔

اُس نے آہستہ سے کہا "بیٹی! صاحب آپ نے مجھے بیٹی کہا! مجھے یہ لفظ سنے ہوئے مدت گزر گئی ہے اور وہ میری ٹانگوں سے لپٹ کر رونے لگی اور اس قدر زور زور سے روئی کہ شور سن کر میرے اردلی اندر آ گئے۔ میں اس کے سر پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتا رہا۔ جیسے وہ بیٹی ہی ہو، ایک قیدی عورت نہیں ——

پانچ سال ہو گئے۔ چندا تو گیا، بہت سے اہم واقعات ذہن سے نکل کر ماضی کے اندھیروں میں گم ہو گئے۔ میرا تبادلہ اس جگہ سے کسی اور جگہ کا ہو گیا۔ نئی جگہ تھی، نیا ماحول۔ ایک دن ایک اجنبی میرے دفتر میں آیا۔ عمر تیس برس کے قریب ہوگی۔ میرے پاس روز بیسیوں آدمی ملنے کو آتے ہیں۔ کسی کو کسی قیدی سے ملاقات کرنا ہوتی ہے۔ کوئی مشقت بدلوانے کے لئے کہتا ہے۔ کوئی کسی دوسری جیل میں تبادلہ کرانے کی التجا لے کر آتا ہے۔ میں اُن سے ایک آدھ بات پوچھ کر اسے متعلقہ کارکن کے پاس بھیج دیتا ہوں۔ لیکن اس اجنبی نے مجھ سے ایک عجیب سی درخواست کی۔

'صاحب، میرے لڑکے کی سال گرہ ہے۔ آپ ضرور تشریف لائیں۔'

میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا اس کا چہرہ قطعی طور پر شناسا نہ تھا۔

"معاف کیجئے، میں آپ کو نہیں پہچانتا" اور پھر بات بدلنے کو کہا۔

"ویسے بچے کی سال گرہ پر مبارک قبول فرمائیں۔" لیکن یہ الفاظ میرے دل سے نہیں، فقط مونہہ سے نکل رہے تھے اسی سانس میں میں نے کہا۔

"میں آج کل بے حد مصروف ہوں شاید میں حاضر نہ ہو سکوں۔"

لیکن وہ بضد تھا "صاحب آپ کو ضرور آنا ہوگا۔ میں خود آ کر لے جاؤں گا ——"

میں نے ٹالنے کے انداز میں کہا "آپ ہیں کون؟ کہاں سے آئے ہیں؟" اس نے ایک جگہ کا نام بتایا، جو دوسرے ضلع میں تھی۔ اس سالگرہ کی تقریب میں جانے کا مطلب ہوتا، دو دن چھٹی اور پچاس روپے کا خرچ۔ آخر یہ ہیں کون صاحب؟ میں سوچنے لگا۔ ہم جیل کے افسروں کو بہت محتاط رہنا پڑتا ہے کیونکہ کئی مجرموں سے واسطہ پڑتا ہے ایسا بھی ہوتا ہے کہ کبھی جیل میں ان سے سختی برتی ہو تو وہ کوئی بہانہ بنا کر بدلہ چکانے کی فکر میں رہتے ہیں اس لئے میں نے صاف انکار کر دیا۔ ویسے میں نے جیب سے دس روپے نکال کر اسے دے دئے "یہ میری طرف سے اپنے بچے کو دے دیں میں نہ آسکوں گا۔"

میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ اُتر سا گیا ہے، اس نے ہولے سے کہا "میں بڑی اُمید لے کر آیا تھا۔ یہ دس روپے کا معاملہ نہیں کسی کی زندگی کا سوال ہے اور روپے سے زندگی نہیں بنتی۔"

پتہ نہیں کیا بات تھی کہ میں نے 'ہاں' کہہ دی۔

وہ ایک دور اُفتادہ گاؤں کے مڈل اسکول میں ٹیچر تھا۔

مقررہ دن وہ مجھے لینے کے لئے آیا کوئی ستر میل کا راستہ بس سے طے کرنا تھا۔ اس سے آگے دو میل لے جانے کے لئے ایک ٹریکٹر میرا انتظار کر رہا تھا۔

آخر ٹریکٹر ایک نیم پختہ مکان کے سامنے رک گیا جس کے دروازے پر آم کے پتوں کی جھالر اور آٹے اور مہندی کے لیپے ہاتھوں کے نشانات شگن کی نشانی کو ظاہر کر رہے تھے جیسے ہی میں ٹریکٹر سے اُترا، کسی نے اندر جاکر

کہا "سلے بچھڑا تھے پتا جی آگئے"

میں سوچنے لگا کہ یہاں میں نے کون سی بیٹی کی شادی کی ہے۔ لیکن میری یہ حالت زیادہ دیر نہ رہی۔ ایک بیر بہوٹی سی لڑکی نے میرے پاؤں چھوئے۔ اور پھر میرے گلے لگ گئی۔ میں نے اس کی ٹھوڑی اٹھا کر دیکھا اور ایک دم کہا "چندا بیٹی!" اور پھر وہ پھپھک پھپھک کر رو پڑی۔ اتنے میں ایک بڑی عمر کی عورت نے ایک چھوٹا سا گل گوتھنا سا ایک سال کا بچہ میری گود میں دے دیا۔ اور میں نے جیب سے کچھ روپے نکال کر اس کے ہاتھوں میں کو دیئے

جب شام کو مہمان رخصت ہو گئے تو میں نے چندا سے پوچھا "بیٹی تم ہمیشہ میرے لئے معمہ ہی رہی ہو۔ آخر یہ سب کچھ کیا ہے؟"

اس نے مسکرا کر اور شرما کر کہا "آپ اپنا حکم یاد کیجئے اور وعدہ بھی ——— کہ میرے بسے ہوئے گھر میں ضرور آئیں گے!"

میں اپنے ذہن کو کریدنے لگا۔ اور پھر مجھے یاد آگیا۔ مگر میں سوچنے لگا کہ ایسی باتیں تو میں ہر ایک سے کہتا ہوں۔ لیکن کم ہی ہوں گے جو ان کو یاد بھی رکھتے ہوں۔ نبھانے کی بات تو بہت دور کی ہے۔ لیکن چندا عام عورتوں میں سے نہ تھی۔

"بیٹی مجھے تفصیل سے بتاؤ۔ ورنہ میں تو خوشی سے دیوانہ ہو جاؤں گا!"

چندا نے خالص دیہاتی آواز میں کہا "ان سے پوچھئے بابو۔ میں تو آپ کے لئے مکی کی روٹی سرسوں کا ساگ اور دودھ لینے چلی اندر زنان خانے میں۔ اور پھر جھینپ سے بولی "آپ تو میرے ایک دن کے مہمان ہیں۔ ہاں تو آپ کے پاس مہینوں رہی ——"

میں ہنس پڑا اور وہ مسکراتی ہوئی اندر چلی گئی۔

پھر ماسٹر کرتار سنگھ نے سارا قصہ خود سنایا:

"جیل سے رہا ہونے کے بعد چندا شہر کے مہیلا آشرم میں داخل ہو گئی۔ اگرچہ جیل کے دروازے پر اسے لینے کے لئے کئی پرانے گاہک آئے، لیکن آپ تو چندا کو جانتے ہی ہیں …. اس آشرم میں میری بہن ان لڑکیوں کو کڑھائی سکھاتی تھی۔ میرا بہنوئی اسی شہر میں کلرک تھا اور میں ایک اسکول میں ماسٹر۔ میری بہن اور چندا کی آپس میں دوستی ہو گئی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرا بھانجہ چندا سے بہت مانوس ہو گیا۔ آشرم میں وہ اکثر چندا کے پاس ہی رہتا۔

آشرم کے منیجر کے گھر بھی میری بہن کا آنا جانا بہت تھا۔ وہ منیجر کی بیوی کا ہاتھ بٹا دیتی تھی۔ کئی دفعہ شام کو کافی دیر سے بھی آتی تھی۔ ویسے کوئی فکر کی بات نہ تھی ایک دن شام کو منیجر صاحب نے میری بہن کو بلایا کہ اسے بی بی بلاتی ہیں۔ اس روز نہ معلوم کیوں چندا نے بچے کو اٹھا لیا اور کہا کہ وہ بھی ساتھ چلے گی۔ میری بہن نے لاکھ کہا مگر یہ نہ مانی۔ لیکن بھگوان جو کرتا ہے، بھلا ہی کرتا ہے۔ اس روز منیجر صاحب کی بیوی گھر پر نہ تھی۔ منیجر صاحب کی نیت خراب تھی۔ منیجر صاحب نے سمجھا کہ میری بہن اکیلی ہے۔ لیکن چندا نے منیجر صاحب کا دماغ درست کر دیا۔

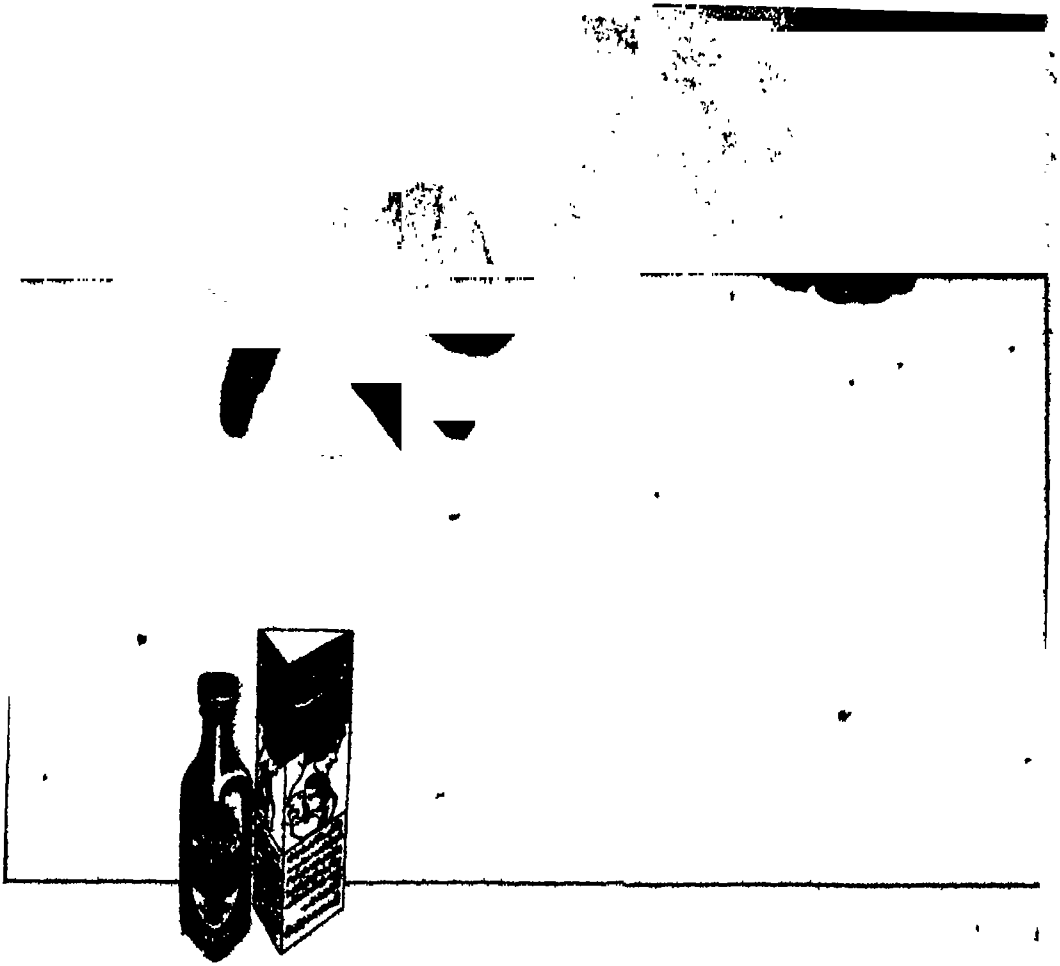
اس کے بعد میری بہن کی نوکری گئی اور چندا کو آشرم سے نکال دیا گیا۔ پھر تو یہ ہمارے گھر آ گئی۔

اس نے ہمیں ساری بات بتلائی اور میں نے ساری بات پر غور کیا تو اسی نتیجے پر پہنچا کہ چندا کی زندگی سنوارنے کے لئے اسے ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔ میں نے جب یہ تجویز اپنے بہنوئی اور بہن کے سامنے رکھی تو انہوں نے 'ہاں' کر دی۔ لیکن چندا نہ مانی۔ اس نے کہا کہ وہ کلنکنی ہے اور بہو بننے کے قابل نہیں۔ لیکن ہمارے زور دینے پر آخر وہ مان ہی گئی۔ ایک سال کے بعد اس کے ہاں یہ بچہ پیدا ہوا اور اس کے بعد میرا تبادلہ اس گاؤں میں ہو گیا۔

اب شہر میں تو کوئی کسی کو پوچھتا نہیں لیکن گاؤں میں ہر چھوٹی چھوٹی بات کی کرید ہوتی ہے۔ بہو سے پوچھا گیا کہ اس کے ماں باپ کہاں ہیں تو چندا نے آپ کا نام لے دیا۔ اسی لئے سارا گاؤں آپ کو دیکھنے کو بے چین تھا۔ پھر ہمیں پتہ چلا کہ آپ کا فلاں جگہ پر تبادلہ ہو گیا ہے۔ ہم نے سب سے کہہ رکھا تھا کہ چندا کے پتا اپنی بیٹی کے گھر نہیں آتے۔ البتہ نواسے کی سالگرہ پر ضرور آئیں گے۔ اسی لئے جب آپ نے 'نہ' کی تھی تو میں نے کہا تھا کہ یہ روپے کا نہیں زندگی کا سوال ہے۔"

اتنے میں چندا نے آکر کھانا رکھتے ہوئے کہا "کیوں بابو، ٹھیک ہے نا، روپے تو کمائے جا سکتے ہیں، لیکن زندگی کو سنوارنا بڑا مشکل ہے۔"

●●



ہر ماں اور باپ کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اُن کا لاڈلا دُنیا کی آنکھ کا تارا بنے۔ صرف اُن کا ہی نہیں، قوم کا ملک کا بھی نام روشن کرے، دُنیا کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھائے۔ یہ خواہش اپنی جگہ ٹھیک ہے مگر آپ نے اس سلسلے میں کیا کچھ کیا ہے۔ اس کی ابتدا پنگوڑے میں ہی کرنی چاہئے اپنے لاڈلے کو "ممتا" دیجئے یہ ننھے بچوں کا خاص ٹانک ہے جو ایک ماں کی طرح ان کی حفاظت کرتا ہے۔ جسم میں کیلشیم کی کمی کو دُور کر کے پنڈلیوں کے ٹیڑھے پن کو روکتا ہے۔ ننھے بے زبان بچوں کو قبض سے نجات دلاتا ہے۔ نزلہ اور زکام میں بھی مفید ہے۔ بچوں کو ہنستا اور خوش و خرم رکھنا ہی ممتا کا کام ہے۔ اپنے بچے سے پیار ہے تو اسے "ممتا" ہی دیجئے اور دیکھئے وہ کتنی جلدی جلدی پروان چڑھتا ہے۔

قیمت بڑی شیشی: پانچ روپے —— چھوٹی شیشی: تین روپے

شرع (یونانی) اینڈ آیورویدک لیبارٹیرز، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶

زود پشیماں شوہر کے نام....

میں نے کہی تھی کہ اک دن تمہیں آنا ہوگا
میرے قدموں میں تمہیں سر بھی جھکانا ہوگا
روٹھ جاؤں گی جو میں تم سے ہمیشہ کے لئے
ایک دن آ کے بہر حال منانا ہوگا
جاؤ، اب کس لئے آئے ہو پشیماں ہو کر!

اب تو اشکوں کے خزانے ہی مرے ساتھی ہیں
خون آلود فسانے ہی مرے ساتھی ہیں
اپنے ماضی کا کوئی گیت مجھے یاد نہیں
درد میں ڈوبے ترانے ہی مرے ساتھی ہیں
جاؤ، اب کس لئے آئے ہو، پشیماں ہو کر!

اب مرے پاس اندھیروں کے سوا کچھ بھی نہیں
نفرت کی راکھ کے ڈھیروں کے سوا کچھ بھی نہیں
میں نے مانا کہ درخشاں مری راتیں تھیں کبھی
اب تو تاریک سویروں کے سوا کچھ بھی نہیں
جاؤ، اب کس لئے آئے ہو پشیماں ہو کر؟

تم کو تو میری وفاؤں سے کوئی پیار نہیں
اور تمہارا دلِ بیمار بھی بیمار نہیں
نہ مرا حسن ہے دل کش، نہ نگاہیں قاتل
مجھ کو ٹھکرانا بھی ایسا کوئی دشوار نہیں
جاؤ، اب کس لئے آئے ہو پشیماں ہو کر؟

اب "آگہی" در پہ گرو جذبۂ اخلاص و وفا
ہاں کبھی میری نگاہوں کا بھی مرکز تھا
جاؤ تم، ہو گئے کیوں اتنے فسردہ خاطر!
کیا ملا تم کو محبت کا صلہ کچھ نہ ملا!
جاؤ، اب کس لئے آئے ہو پشیماں ہو کر؟

ناز تھا تم کو بہت "[illegible]" پہ
اور [illegible] مجھے [illegible] پہ
تم نے [illegible] مجھے [illegible] تھا
یہ [illegible] حسن کی پیشانی پہ
جاؤ، اب کس لئے آئے ہو پشیماں ہو کر؟

اپنے دامن پہ ریا کا داغ لگاتے کیوں ہو
جس کو ٹھکرایا اسے اپنا بناتے کیوں ہو
کیا مجھے چین سے جینے نہیں دو گے [illegible]
دل کے سوئے ہوئے زخموں کو جگاتے کیوں ہو؟
جاؤ، اب کس لئے آئے ہو پشیماں ہو کر!

عشق کے وعدوں سے پیمان سے نفرت ہے مجھے
آج ہر شوق سے، ارمان سے نفرت ہے مجھے
کچھ تمہیں پر نہیں موقوف یہ نفرت میری
اب تو دنیا کے ہر انسان سے نفرت ہے مجھے
جاؤ، اب کس لئے آئے ہو، پشیماں ہو کر!

رفیعہ شبنم عابدی



آپ کی ذہنی الجھنیں اور اُن کا حل



ڈاکٹر سجاتیہ ایک مشہور ماہرِ نفسیات ہیں۔ وہ بانو پڑھنے والوں کے سوالات کا جواب دیں گے اور ان کے نفسیاتی مسئلوں کا تجزیہ اور حل پیش کریں گے۔ پتہ: معرفت ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

س: میں ایک بڑی الجھن میں مبتلا ہوں۔ میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں، لیکن میرا گھرانہ پرانے خیالات کا حامی ہے۔ کچھ عرصے سے میں اپنے آپ سے نفرت کرنے لگی ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ جہاں بھی میری شادی کی بات چلتی ہے، لڑکے والے مجھے دیکھ کر انکار کر دیتے ہیں۔ ویسے میں شکل کی اتنی بری نہیں ہوں۔ میری حالت یہ ہو گئی ہے کہ کہیں آنے جانے سے بھی کتراتی ہوں۔ عرصہ ہوا آئینہ دیکھنا ترک کر چکی ہوں۔ ہر وقت سوچتی رہتی ہوں، ڈر ہے کہیں پاگل نہ ہو جاؤں یا خودکشی نہ کر لوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟

ج: آپ ایک تعلیم یافتہ عورت ہیں۔ آپ سماج کے ڈھانچے کو اچھی طرح سمجھتی ہیں۔ ہندوستان کے سماج میں لڑکے والے لڑکی دیکھنے آتے ہیں۔ اگر وہ لڑکی کو پسند نہیں کرتے تو اس میں برائی کی بات نہیں۔ ایسا عموماً ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ لڑکے والے لڑکی دیکھتے ہی پسند کر لیں۔ لڑکی کی پسند کی کوئی اہمیت نہیں۔ اگر لڑکے والے لڑکی کو پسند نہ کریں تو اس میں برا ماننے کی کوئی بات نہیں۔ یہ ہمارے یہاں کے رسم و رواج ہیں انہیں سمجھنے اور تسلیم کرنے میں ہی بہتری ہے۔ آپ کے والدین کی شادی کے موقع پر بھی ایسا ہوا تھا ممکن ہے کہ آپ کے بچوں کی شادی کے موقع پر بھی ایسا ہی ہو۔ سوال لڑکے والوں کی پسند کا نہیں بلکہ آپ کی اپنی پسند کا ہے۔ دراصل آپ خود کو ٹھکراتی ہیں۔ ٹھکرانے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص آپ کو پسند نہیں کرتا۔ وہ آپ پر نکتہ چینی کرتا رہتا ہے۔ یہ شخص کون ہے؟ یہ آپ خود ہیں۔ کوئی شخص آپ کے عیب نہیں دیکھتا، آپ خود ہی انہیں دیکھتی ہیں۔ جب ہم اپنے آپ سے نفرت کرتے ہیں تو لامحالہ دوسروں کو بھی اسی رنگ میں دیکھتے ہیں۔ آپ کو اپنے برے ہونے کا یقین ہے۔ آپ دوسرے لوگوں سے اس بات کا ثبوت چاہتی ہیں۔ وہ آپ کو یہ ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ آپ کی صورت بری نہیں، لیکن آپ آئینہ دیکھنا پسند نہیں کرتیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ خود کو دھتکارتی ہیں۔ دراصل آپ کو خود اپنی شکل پسند نہیں۔ یہ ناپسندیدگی دو وجہوں سے پیدا ہوتی ہے۔ پہلی وجہ بچپن کا احساسِ کمتری ہے۔ بچپن میں ماں باپ کی پوری توجہ نہ ملنے سے یا بڑے بھائی بہن کے دھتکارتے رہنے سے احساسِ کمتری پیدا ہوتا ہے۔ یہ احساس اندر ہی اندر پرورش پاتا ہے۔ جوانی میں یہ احساس پوری شخصیت پر چھا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو دوسروں سے کمتر سمجھتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو کسی قابل نہیں سمجھتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جب انسان کو زندگی میں حقیقت کی کمی

[illegible] کے لئے جنسی خیالات کو دل میں جگہ دیتا ہے اپنے دماغ کی تکلیف کو دور کرنے کے لئے وہ ان خیالات سے کھیلتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ ان خیالات سے شرمندہ ہو کر یا گھبرا کر انہیں کچل دیتا ہے۔ لیکن شرمندگی یا احساسِ گناہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے اور وہ خود کو مجرم سمجھنے لگتا ہے۔ نتیجے میں وہ اپنے آپ سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ آپ جوان ہیں۔ ذہن میں ایسے خیالات کا آنا قدرتی امر ہے۔ آپ کی عمر کے لحاظ سے یہ خیالات نارمل ہیں۔ ان خیالات سے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ایک دفعہ یہ بات آپ کی سمجھ میں آ جائے تو آپ احساسِ گناہ سے نکل جائیں گی۔ پھر آپ خود کو مجرم نہیں سمجھیں گی، اور نہ خود کو سزا دیں گی۔ آپ کو ڈر ہے کہ کہیں آپ پاگل نہ ہو جائیں۔ اس کا مطلب ہے کہ دنیا سے کہیں زیادہ آپ خود اپنے آپ کو دھتکارتی ہیں۔ آپ کو یقین ہے کہ دنیا والے بھی آپ کو دھتکارتے ہیں، دراصل ان خیالات کا تانا بانا آپ کے ذہن میں ہی بنتا ہے۔ حقیقت سے ان کا زیادہ تعلق نہیں۔ یہ بات آپ کی سمجھ میں آ جائے تو آپ کو سکون ملے گا۔ انسان خود ہی اپنا خیرخواہ ہے، اور خود ہی اپنا دشمن، دوسروں کی بات بعد میں آتی ہے۔

س: مجھے سوتے میں چلنے کی عادت ہے خواب جب تک خواب رہتا ہے حقیقت معلوم معلوم ہوتا ہے۔ جب آنکھ کھلتی ہے تو شرمندگی محسوس ہوتی ہے، اس بات پر گھر والے ہنسی اڑاتے ہیں۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں، لیکن ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں خواب میں کوئی خطرناک قدم نہ اٹھا لوں، ویسے سونے سے پہلے میں کوئی بات نہیں سوچتی جو خواب میں آئے۔

ج: سوتے میں چلنا کوئی خطرناک بیماری نہیں۔ آپ کے گھر والوں کو آپ کی ہنسی نہیں اڑانا چاہیے، ضرورت اس بات کی ہے کہ نہ آپ کو سوتے میں جگایا جائے اور نہ جاگ جانے پر مذاق اڑایا جائے۔ یہ آپ کی اپنی اختیار کی ہوئی عادت نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ کے گھر کے لوگ آپ کی حفاظت کا خیال رکھیں آپ کو اس بیماری سے ڈرنے کی ضرورت نہیں عموماً نیند میں چلنے والے ایسا کام نہیں کرتے جو خطرناک ہو۔ سوتے میں چلنے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انسان بیداری کی حالت میں اپنی خواہشوں کو دباتا ہے اور ان کے متعلق سوچنا بھی پسند نہیں کرتا۔ یہ خواہش بیداری میں دب جاتی ہے، لیکن نیند کی حالت میں ابھر آتی ہے۔ مثلاً بچے کو بستر پر پیشاب کرنے سے روکا جائے تو وہ خواب میں دیکھتا ہے کہ اس نے غسل خانے میں پیشاب کیا ہے جب کہ حقیقت میں وہ بستر پر ہی پیشاب کرتا ہے۔ اس بیماری کا علاج یہ ہے کہ آپ جو کچھ خواب میں دیکھتی ہیں اسے جاگنے پر بھی سوچیں آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ اپنی خواہشوں کو کتنا دباتی ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ بیداری میں کسی کام کو کرنے سے ڈرتی ہوں۔ آپ کو اپنی اہمیت کا یقین نہ ہو۔ خواب کی حالت میں یہ ڈر نکل جاتا ہے۔ انسان کا شعور ماحول پر منحصر ہے۔ ہماری ہزاروں خواہشیں ایسی ہوتی ہیں جن کو عمل میں لانا تو درکنار ان کا سوچنا بھی گناہ تصور کیا جاتا ہے۔ انسان بیداری میں وہی کرتا ہے جو اسے کرنا چاہئے ایک ہموار اور سہل زندگی گزارنے کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے۔ انسان کے تو ذہن پر سماج، مذہب اور رسم و رواج کی چھاپ لگی ہوتی ہے۔ یہ بندشیں اس کی فطری خواہشوں سے ٹکراتی ہیں اور انہیں کچل دیتی ہیں۔ بعض اوقات انسان اپنی خواہشوں کو جان بوجھ کر دباتا ہے۔ لیکن اکثر یہ عمل بچپنے میں ہوتا ہے۔ سماج میں زندگی گزارنے کے بعد اس کے شعور کو تمام بندشوں اور رکاوٹوں کا احساس ہوتا ہے۔ یہ احساس ایک خودکار مشین کی طرح عمل کرتا ہے۔ کچھ خواہشیں شعور میں داخل ہونے سے پہلے ہی کچل کر پھینک دی جاتی ہیں، انسان کو ان خواہشوں کے وجود کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ لیکن خواب کی حالت میں شعور آزاد ہو جاتا ہے۔ سماج کی بندشیں ٹوٹ جاتی ہیں اور دبی ہوئی خواہشیں خواب کی حالت میں ابھر آتی ہیں۔

اگر آپ خواب کی باتوں کو بیداری میں سوچیں تو آپ کو اس بات کا اندازہ ہو جائے گا۔ جاگنے کے بعد خواب کی باتوں پر شرمندہ یا حیران ہونے کی بجائے سنجیدگی سے سوچیں کہ کہیں یہ آپ کی کوئی دبی ہوئی خواہش تو نہیں۔ ایک دفعہ خواب کی بات انسان کے شعور میں آ جائے تو وہ اسے حل کر سکتا ہے۔ اسے سمجھ سکتا ہے۔ پھر اس عمل کو خواب میں دہرانے کی ضرورت نہیں رہتی۔

س: میرے گھر والوں کا رویہ میری بیوی کے ساتھ بے حد ناانصافی کا ہے۔ روز نئے بات بات پر ٹوکتے ہیں، اس کے میکے والوں کو برا کہتے ہیں، اس کے سامنے اس کے بچے کو مارتے [illegible] مجھ میں ہمت نہیں کہ اپنی بیوی کے ساتھ انصاف

کر سکوں۔ میری بیوی اس جھگڑے کے خلاف ہیں
تحریک میں سب سے بڑا ہاتھ میری ماں کا ہے
میں اپنی ماں کی عزت کرتا ہوں۔ لیکن اس کے
ساتھ مجھے اپنی بیوی سے بھی بے انتہا ہمدردی
ہے۔ میں الگ گھر میں رہنا چاہتا ہوں، مگر یہ بات
بھی والدین کی مرضی کے خلاف ہے میں کیا کروں؟

ج: آپ کی الجھن کا حل آپ کے ہاتھ میں ہے
آپ کی ماں نے آپ کو بچپن سے پالا ہے۔ آپ
ان کی عزت کرتے ہیں۔ آپ کی ماں نے آپ کی تربیت
ایسی کی ہے کہ اگر آپ نافرمانی کریں تو آپ کا دل
احساس گناہ سے بھر جائے۔ اگر آپ نے کوئی بات
نہ خود کہنے کی ہمت کی تو یہی جواب ملا کہ چھوٹوں کو
بڑوں کی باتوں میں بولنے کا کوئی حق نہیں۔ آپ
جب بھی اپنا حق مانگتے ہیں وہی نظارہ آپ کے
سامنے آجاتا ہے۔ آپ کے دل میں زبردست
گھبراہٹ پیدا ہوجاتی ہے۔ آپ اپنی فرماں برداری
کو محبت کا نام دے سکتے ہیں مگر جسے آپ محبت
کہتے ہیں وہ محبت نہیں۔ اس فرماں برداری سے
آپ کا سارا گھر تباہ ہوجائے گا۔ ماں باپ کی
غلطی کے خلاف بولنا بے ادبی نہیں ہے۔ اگر
آپ اپنے ماں باپ کی کمزوریوں پر پردہ ڈالتے
رہے تو آپ کو نقصان اٹھانا پڑے گا۔ آپ کے
جرأت کے ساتھ بولنے سے نہ صرف آپ کا بھلا
ہوگا بلکہ ان کو اپنی غلطیوں سے آگاہی ہوگی۔
ممکن ہے آپ کی خاموشی آپ کی رضا کا ثبوت
سمجھتا ہو، ممکن ہے کہ انہیں یہ معلوم ہی نہ ہو
کہ آپ ان کی باتوں سے کبیدہ خاطر رہتے ہیں
آپ کی ناراضگی معلوم ہونے پر وہ آئندہ کے
لئے محتاط ہوجائیں گے۔ میری رائے یہ ہے کہ
آپ اپنا سر اٹھائیں اور اپنے گھر کو بچائیں۔ اگر
آپ کو گھر سے علیحدہ ہونا پڑے تو اس میں کوئی
مضائقہ نہیں۔ آپ ان کی وقتی ناراضگی سے
دل برداشتہ نہ ہوں۔ جب آپ ان کے گھر میں
ہی نہیں رہیں گے تو وہ آپ کی بیوی کو سخت سست
نہ کہہ سکیں گے۔ اس طرح آپ اپنی ماں کو برائیوں
سے بچالیں گے اور ان کو ظلم کرنے کا موقع نہیں
دیں گے۔ اگر آپ نے یہ قدم اٹھا لیا تو آپ نہ صرف
اپنے والدین کو بری عادتوں سے بچالیں گے بلکہ
اپنے بچے کو بھی دماغی بیماریوں سے محفوظ رکھیں گے
ظاہر ہے کہ اس ماحول میں بچے کے ذہن پر برا اثر
پڑ رہا ہے وہ اپنی ماں اور دادی کی کشیدگی کے
درمیان پس رہا ہے۔ اس غریب کو ان دونوں
کے درمیان ذہنی تناؤ کے اسباب کا پتہ نہیں
لیکن وہ متاثر ضرور ہوتا ہے۔

آپ کی ذہنی الجھن کی جڑیں بہت گہری
ہیں۔ اگر آپ دھیان سے سوچیں تو آپ کو یاد آجائے
گا کہ آپ پر بچپن میں دباؤ ڈال دیا گیا تھا آپ کو بولنے
کا حق نہیں دیا گیا تھا۔ بچہ فطری طور پر ماں سے
جدا ہونا نہیں چاہتا۔ وہ اس کے جسم سے لگ کر
رہنا چاہتا ہے۔ یہ عادت شیر خواری اور بچپن
کی ہے۔ بعض اوقات یہ عادت نوجوانی، بلکہ
ادھیڑ عمری تک پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اگر ماں نے
بچپن میں بہت پیار کیا ہے تو یہ تعلق بہت گہرا
ہوجاتا ہے۔ پھر انسان زندگی کا سارا ظلم سہنے
پر تیار ہوجاتا ہے —— لیکن ماں کو چھوڑنے
پر راضی نہیں ہوتا۔ آپ اپنے آپ کو ذہنی طور
پر تیار کریں اور خود ماں سے علیحدگی پر راضی کریں
ماں باپ کی خفگی کا خیال نہ کریں۔ یہی بات آپ
کے لئے بہتر ہوگا۔

س: میرے شوہر تین سو روپے ماہوار کماتے ہیں
گھر میں ساس، سسر اور پانچ بہن بھائی بھی
رہتے ہیں۔ سسر کی آمدنی چھوٹے بہن بھائیوں کی
تعلیم اور کپڑے لتے پر خرچ ہوجاتی ہے۔ میرے
جیٹھ نے بھائی بھی ساتھ رہتے ہیں ایک بھائی
دو ہزار کماتے ہیں۔ دو بھائی ڈھائی ڈھائی سو
کماتے ہیں۔ تینوں بھائی گھر میں ایک پیسہ بھی نہیں
دیتے۔ جب کہ دو بھائی کنوارے ہیں۔ میرے شوہر
کی آدھی سے زیادہ تنخواہ گھر والوں پر صرف ہوجاتی
ہے۔ اس پر بھی میرے گھر والے میرے شوہر کا
خیال نہیں کرتے، میرا ذکر تو جانے دیجئے میں
اپنے شوہر کو بہت سمجھاتی ہوں مگر وہ نہیں مانتے
خواہ گھر کی ضرورت پوری نہ ہو، وہ ماں باپ کو
ضرور روپیہ دیتے ہیں۔ بتائیے انہیں کیسے
سمجھاؤں۔ ہمارے مستقبل کا کیا ہوگا؟ سب
بھائی پیسہ جوڑتے ہیں اور ہم اپنا پیٹ کاٹتے ہیں
میری صحت خراب ہوگئی ہے۔ ہماری شادی کو صرف
تین سال ہوئے ہیں۔

ج: آپ کا مسئلہ کافی مشکل ہے۔ آپ کے
شوہر کی تنخواہ تین سو روپے ہے اس مہنگائی کے
زمانے میں تین سو روپے میں آپ الگ بھی نہیں
رہ سکتیں، اس لئے علیحدگی میں بھی فائدہ نہیں ہے
آپ ان کو سمجھاتی ہیں اور وہ آپ کی بات نہیں مانتے
آئندہ آپ انہیں سمجھانے سے پرہیز کریں۔ جب
وہ آپ کی بات نہیں سنتے تو انہیں سمجھانے سے کیا
فائدہ ہے۔ ان کو سمجھانے کا ایک ہی طریقہ ہے
آپ آج سے ان کی عادتوں کو سراہنا شروع کردیں
ان کو سمجھانے کی بجائے آپ ان کی تعریف کریں
ان سے کہیں کہ وہ کتنے شریف بیٹے ہیں کتنے اچھے
ماں باپ کے وفادار ہیں، ان کا کتنا خیال کرتے ہیں
اس طرح مخالفت کی جو دیوار آپ کے اور آپ
کے شوہر کے درمیان ہے ٹوٹ جائے گی۔ اس
طرح انہیں خود بخود اپنی غلطی کا احساس ہوجائے
ان کو محسوس ہوگا کہ آپ ان کے ساتھ [illegible]

[illegible] احساس کمتری [illegible] ان کا ہے۔ [illegible] بھی ان کے ہیں، جیسے بھی والدین ہی کا ہے۔ ان پر کوئی دباؤ نہیں۔ وہ خود ہی فیصلہ کریں کہ ان کو کیا کرنا چاہئے۔ جب کسی قسم کا دباؤ نہ ہو تو انسان کو خود فیصلہ کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ مخالفت سے ضد پیدا ہو جاتی ہے۔ انسان ضد میں اپنا نقصان کر بیٹھتا ہے۔ وہ اپنی ضد کے آگے نقصان کی پروا نہیں کرتا۔ اگر آپ کسی ڈوبنے والے سے یہ کہیں کہ وہ پانی سے نکل آئے تو عین ممکن ہے کہ وہ ضد میں ڈوب جائے۔ بعض اوقات غلط حرکت سے روکنا اس حرکت کو ہوا دینے کے برابر ہوتا ہے۔ آپ میرا مطلب سمجھ گئی ہوں گی۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ ان پر نکتہ چینی کرنا بند کر دیں اور ان کی ضرورتوں کا پہلے سے زیادہ دھیان رکھیں۔ آپ اپنی ازدواجی زندگی کو بھی ہموار کرنے کی کوشش کریں۔ روز روز کی نکتہ چینی سے ازدواجی زندگی پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔ آپس کی کشیدگی ازدواجی زندگی کو رفتہ رفتہ سرد کر دیتی ہے۔ آپ کے شوہر کو آپ کی گرم جوشی اور محبت کا احساس ہو جائے تو ان کی عادت بدل سکتی ہے۔ انہیں اس بات کا احساس ہو جائے کہ انہیں آپ سے پیار ملتا ہے تو ان کے خیالات میں حیرت انگیز تبدیلی آ جائے گی۔

ہر انسان تعریف کا بھوکا ہوتا ہے۔ آپ کے شوہر میں یہ بھوک ضرورت سے زیادہ ہے وہ آپ کی بات سمجھتے ہیں، لیکن مانتے نہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ وہ اپنی تعریف سننے کے لئے [illegible] قربانی دینے کو تیار ہیں۔ ان کی [illegible] ماں باپ [illegible] تعریف کی [illegible] وہ تعریف [illegible] ہیں، آپ یہ تعریف انہیں [illegible] تو ان کی ضرورت پوری ہو جائے گی۔ جب انسان کو کوئی چیز بن مانگے ہی مل جائے تو اس کو چھیننے کی ضرورت نہیں رہتی۔ آپ بھی یہی نسخہ آزمائیں اگر آپ کو اس مشورے سے فائدہ ہو تو ہم کو ضرور لکھئے۔

س: میں اس وقت بی اے کے آخری سال میں تعلیم پا رہا ہوں میں تقریباً ہر مسئلہ کے مختلف پہلوؤں سے پوری آگاہی رکھتا ہوں لیکن اس آگاہی سے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتا جب میرے حلقۂ احباب میں کسی مسئلہ پر بحث چھڑ جاتی ہے تو سب دوست اس بحث میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ مگر میں بس ان کی صورت تکتا رہتا ہوں — کافی معلومات رکھتے ہوئے بھی میری قوتِ گویائی سلب ہو جاتی ہے۔ براہ کرم اس مسئلہ کا کوئی حل بتائیے؟

ج: بحث کے دوران آپ کی خاموشی کا تعلق علم سے نہیں۔ آپ نے لکھا ہے کہ آپ ہر مسئلہ سے پوری آگاہی رکھتے ہیں اور پھر بھی اس کے دوران آپ بول نہیں سکتے۔ دراصل بحث کے دوران آپ کی شخصیت دوسروں سے ٹکراتی ہے۔ اس ٹکراؤ سے آپ کے اندر احساسِ برتری پیدا ہوتا ہے۔ یہ احساس آپ کے بولنے کی قوت سلب کر دیتا ہے۔ آپ کے دوست بحث میں مشغول ہوتے ہیں۔ ان کے بولنے کے انداز سے آپ کے اندر حسد پیدا ہوتا ہے۔ دراصل بحث کا مضمون اہم نہیں ہوتا آپ کی کوشش ہوتی ہے کہ میں ان سب کو ہرا دوں ان کے دلائل کے پرخچے اڑا دوں۔ انہیں کچل دوں یہ سب آپ کے دوست ہیں۔ انہیں نیچا دکھانا آپ کے اندر احساسِ گناہ پیدا کرتا ہے۔ جب ہم کسی کی برائی چاہتے ہیں تو اس جرم سے بچ نہیں سکتے۔ اگر وہ دشمن ہے تو اس کی برائی چاہنے سے دماغ پر اثر نہیں پڑتا۔ لیکن اگر وہ دوست ہے تو اس کی برائی چاہنے سے شرمندگی ہوتی ہے۔ آپ اس احساسِ گناہ سے بچنا چاہتے ہیں، اگرچہ آپ نے خود اسے پیدا کیا ہے۔ آپ کو ڈر لگتا ہے کہ کہیں آپ کے دوستوں کو آپ کے مخالف جذبات کا پتہ نہ لگ جائے، آپ کے تباہ کن ارادوں کی خبر نہ ہو جائے۔ آپ اس صورت حال سے بچنے کے لئے خاموشی کا حربہ استعمال کرتے ہیں۔ بظاہر آپ نے ان کی عزت کی، ان کی باتوں کو مان لیا ہے۔ ان کے دلائل کو خاموشی سے سنا ہے۔ لیکن انہیں آپ کی اندرونی کشمکش کا علم نہیں ہوتا۔ انسان خود اپنے دماغ کے داؤ پیچ نہیں سمجھتا۔ مخالفت کے جذبات جتنے گہرے ہوں گے۔ احساسِ گناہ اتنا ہی گہرا ہو گا اور زبان اتنی ہی خاموش رہے گی۔

انسان کی اس طرح کی کمزوریاں یکایک پیدا نہیں ہوتیں۔ ان کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں۔ عموماً ان کی داغ بیل بچپن میں پڑ جاتی ہے ممکن ہے کہ آپ کے بچپن میں ایسے واقعات پیش آتے ہوں جب ماں باپ یا بڑے بھائی بہن نے بحث میں آپ کو ہرا دیا ہو۔ یہ ہار دلائل کی وجہ سے نہ ہوئی بلکہ بڑوں نے اپنی بڑائی کے زور پر آپ کو ہرایا ہو۔ ان کی عزت کے خیال سے آپ خاموش رہے تھے۔ لیکن اندر ہی اندر کھولتے رہے تھے۔ [illegible] کی محفل میں دہرایا گیا۔ آپ اس بات کو سمجھیں تو اس عادت پر قابو پانا آسان ہو جائے گا۔

بہلاوا



سید علی عابدی

ارجن بابو جب سڑک پار کر کے گلی کے نکڑ تک پہنچے تو وہاں اچانک چکر آ کر گر گئے۔ دو چار آدمیوں نے بوڑھا آدمی سمجھ کر انھیں سہارا دیا اور پاس کی ایک دکان سے گلاس میں پانی منگوا کر ان کے مونھ پر چھینٹے مارے۔ انھیں جلد ہی ہوش آ گیا۔ ایک ادھیڑ عمر کے شخص نے پوچھا۔ "بابو آپ کہاں جائیں گے کہئے تو میں گھر تک پہنچا دوں۔"

لیکن اس وقت انھیں ہوش آ چکا تھا۔ انھوں نے کہا۔

"نہیں نہیں، میں ٹھیک ہوں۔ آہستہ آہستہ گھر چلا جاؤں گا۔ بس یوں ہی ذرا سا چکر آ گیا تھا۔"

پھر وہ بوجھل قدموں سے اپنے گھر آ گئے اور چارپائی پر لیٹ گئے۔ اُن کی آنکھوں کے سامنے گزرے ہوئے واقعات ایک ایک کر کے آتے چلے گئے۔

وہ بازار گئے تھے۔ وہاں انھوں نے ارچنا کو دیکھا تھا۔ اُسے وہ کتنا چاہتے تھے۔ کبھی وہ ان کے گھر کی بہو تھی، خاندان کی عزت! کتنے ارمانوں سے وہ اُسے بیاہ کر لائے تھے۔

سروج ان کا اکلوتا بیٹا تھا، بڑھاپے کا سہارا، جسے انھوں نے ماں کا پیار دیا تھا کیوں کہ جب وہ چھ سال کا تھا تو اس کی ماں پرلوک سدھار گئی تھیں۔ انھوں نے اس کی خاطر دوسری شادی نہیں کی تھی کہ کہیں سوتیلی ماں اُسے ستانے لگے، اس پر ظلم نہ ڈھانے لگے۔ بس وہ دن رات سروج کی پرورش کرنے کو ہی اپنی زندگی کا حاصل سمجھ رہے تھے۔ انھوں نے اسے پال پوس کر جوان کیا۔ تعلیم بھی بہت تعلیم بھی دلوائی۔ ان کے پاس کوئی خاص روپیہ پیسہ نہیں تھا۔

وہ ایک مقامی فیکٹری میں معمولی کلرک تھے۔ ریٹائر ہو جانے کے بعد ان کے تو بس کچھ نہ رہ گئے تھے جو کچھ پس انداز کیا تھا اسی کے سہارے کسی طرح جیون کاٹتے جا رہے تھے۔ سروج جب جوان ہو گیا تو انھوں نے فیکٹری کے منیجر سے کہہ سن کر اس کو ایک جگہ دلوا دی تھی جس کے سبب اُن کی زندگی میں اب کسی قدر اطمینان پیدا ہو گیا تھا۔ اب ان کی صرف ایک خواہش تھی وہ یہ کہ سروج کا گھر بس جائے تو وہ آرام سے گوشہ نشینی اختیار کریں۔ چاند سی بہو ہوگی۔ پھر گھر میں کلیلیں کرتے ہوئے بچے ہو جائیں گے، تو ان کا گھر یقیناً سورگ بن جائے گا۔

سروج کے لئے رشتے تو کئی جگہ سے آئے تھے لیکن بات امرناتھ بابو کی بیٹی ارچنا پر ٹھہری تھی۔ امرناتھ بابو شہر سے کچھ دور ایک گاؤں کے رہنے والے تھے اور کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ارچنا کتنی پیاری لڑکی تھی۔ سندر، سوشیل، شرمیلی۔ وہ ارجن بابو کے گھر کی بہو بن کر آ گئی۔ اس نے اپنی خدمت سے، رکھ رکھاؤ اور سوبھاؤ سے اُن کے اور سروج کے دل کو جیت لیا تھا۔ ان کی خدمت کرنا اس کا دھرم تھا۔ ناشتے کا خیال رکھنا، کھانے میں ان کے پسند کی چیزیں تیار کرنا، ان کو پہننے کے لئے کپڑے دینا، بستر کو صاف رکھنا، غرض ارچنا ان کی دن رات خدمت کیا کرتی تھی اور ان کی دعائیں اور آشیرواد دن میں کئی کئی بار لیا کرتی تھی۔ سروج تو ارچنا کو دل و جان سے چاہتا تھا۔ وہ دونوں ہی اور بھی ان کی خدمت کرنے کو جیسے اپنا حاصلِ زندگی سمجھ رہے تھے۔

ایک دن سروج اور ارچنا اپنے کمرے میں ہنسی مذاق اور چہلیں کر رہے تھے۔ ارچنا نے ہاتھ میں پانی کا گلاس لے رکھا تھا۔ وہ سروج پر پانی پھینکنے والی تھی کہ سروج ایک طرف کو کھسک گیا تھا ٹھیک اسی وقت ارجن بابو اس طرف سے گزر رہے تھے۔ پورے گلاس کا پانی ان کے مونھ پر پڑ گیا تھا۔ ارچنا چاہتی تھی کہ پانی پانی ہو گئی تھی کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ سروج بھی اس انہونی بات پر سخت شرمندہ ہوا تھا۔ لیکن ارجن بابو تو مسکرا کر رہ گئے تھے

[illegible] ہو گئے ہیں۔ کتنا خوش گوار ماحول تھا ان کے گھر کا!

لیکن دوسری طرف قسمت ان پر مسکرا رہی تھی۔ اس سے ان کے گھر کا یہ خوش گوار ماحول دیکھا نہیں گیا۔ ایک روز سورج فیکٹری میں ایک حادثے کا شکار ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ان کے ارمانوں کا محل مسمار ہو گیا۔ موت نے اُن کے بڑھاپے کا سہارا چھین لیا تھا۔ ارچنا نے رو رو کر اپنا برا حال کر لیا تھا۔ اس کی مانگ کا سیندور مٹ گیا تھا، ہاتھ چوڑیوں سے محروم ہو گئے تھے۔ اروِن بابو نے اپنے بوڑھے ہاتھوں سے اپنے جوان بیٹے کا انتم سنسکار کیا تھا۔ سورج کی موت سے اُن کے گھر پر وحشت ناک سناٹا چھا گیا تھا۔ اس کی جوان موت پر دوست، دشمن سبھی رو دیے تھے۔ سبھی کو اروِن بابو کے بڑھاپے پر افسوس ہوتا تھا۔

کچھ دن کے بعد امرناتھ بابو نے ارچنا کو ساتھ لے جانے کے لئے اروِن بابو سے کہا۔ مگر اروِن بابو ارچنا کو اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتے تھے۔ انہوں نے رو رو کر امرناتھ بابو سے کہا کہ وہ ابھی چند دن تک اُسے ان کے پاس رہنے دیں۔ ابھی اُن کا غم تازہ ہے۔ اسے گھر میں نہ دیکھ کر انہیں سورج کا غم اور بھی ستانے لگا۔ خود ارچنا بھی اس گھر سے جانے کے لئے تیار نہ تھی لیکن امرناتھ بابو نے ارچنا کو لے جانے کی اتنی زیادہ ضد کی کہ اروِن بابو کو اسے اپنے گھر سے رخصت ہی کرنا پڑا تھا۔ انہوں نے رو رو کر ارچنا کو رخصت کر دیا تھا۔ ارچنا [illegible] کے پیر چھوتے ہوئے روتی ہوئی گھر سے چلی گئی۔ انہوں نے [illegible] وہ آنسو جلد ہی بلا لیں گے۔

ایک ماہ کے بعد ارچنا کو بلانے کے لئے اروِن بابو نے امرناتھ بابو کو خط لکھا تھا لیکن انہوں نے اُسے نہیں بھیجا۔ دو ماہ کے بعد بھی انکار کیا۔ اس طرح دن گزرتے چلے گئے اور اروِن بابو ارچنا کو بلاتے بلاتے تھک گئے تھے۔

سورج کو مرے ہوئے تین سال ہو چکے تھے۔ ارچنا کو بھی گئے ہوئے لگ بھگ اتنا ہی عرصہ ہو چکا تھا۔ اب تو اروِن بابو کی کرادرکی بھول گئی تھی۔ اُن کی زندگی میں کوئی رس نہ رہا تھا۔ کھوکھلا جسم لئے ہوئے وہ کبھی کبھار بازار کسی کام سے چلے جاتے، ورنہ زیادہ تر اُن کا وقت گھر ہی پر گزرتا تھا۔ اِدھر انہیں متواتر کئی روز سے ہلکا ہلکا بخار بھی رہنے لگا تھا۔

اس روز اروِن بابو آہستہ آہستہ چلتے ہوئے قریب کے دواخانے میں دوا لینے چلے گئے تھے۔ جس وقت وہ دوا لے کر دکان سے باہر آ رہے تھے، انہوں نے دیکھا کہ ارچنا ایک نوجوان کے ساتھ ہے۔ اور اس کے ہاتھ میں ہاتھ دئے ہوئے چلی جا رہی ہے۔ اس کی مانگ میں سیندور بھرا ہوا ہے، ہاتھ میں شادی کی چوڑیاں ہیں اور وہ شادی کا لباس پہنے ہوئے ہے۔ تو کیا ارچنا نے دوسری شادی کر لی؟ وہ جو اُن کے گھر کی عزت تھی، کیا اب وہ دوسرے گھر کی بہو بن گئی ہے۔ وہ تو ابھی تک اس کی واپسی کی راہ دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اُسے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ وہ ارچنا ہی تھی۔ انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے انہیں بہت بڑی گالی دے دی ہو۔ جیسے ان کے جسم پر کسی نے بجلی کا ہر ہزار تار لگا دیا ہو۔ ارچنا ایسا کرے گی، ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

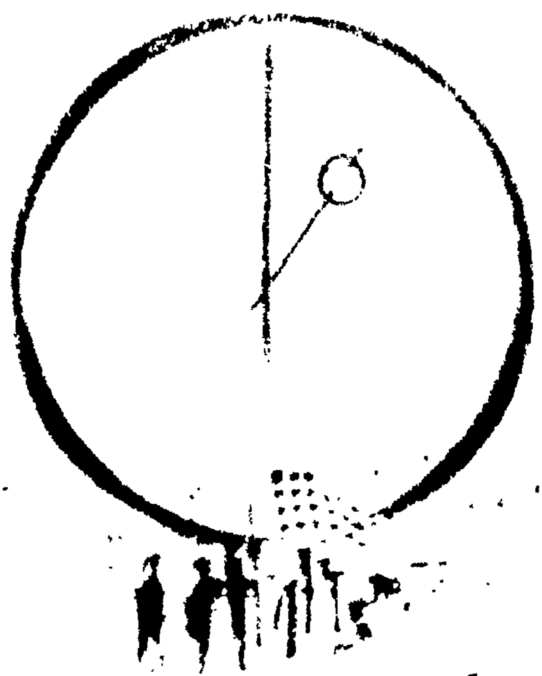
[illegible] ان کے قدم [illegible] سے وہ دکان سے [illegible] سڑک پار کر کے گلی کے نکڑ تک گئے لیکن وہاں تک پہنچتے پہنچتے وہ چکرا کر گر گئے۔

ماضی کی کتاب کے ورق ہی اوراق کو وہ اپنے ذہن میں پڑھتے جا رہے تھے۔ یہ یادیں تو ان کا گلا گھونٹ دیں گی۔ اُن کے منہ سے بے اختیار نکلا "واہ رے قسمت کے بنانے والے!"

اچانک کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا، ارچنا اسی اجنبی مرد کے ساتھ ان کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ سوچنے لگے کہیں وہ سپنا تو نہیں دیکھ رہے ہیں۔ کہیں ارچنا انہیں جلانے اور ان کے دکھ میں اضافہ کرنے تو نہیں آئی تھی۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ اس نے اُن کے پیر چھو لئے۔ "بابو جی، ہمیں آشیرواد دیجئے۔ دیکھئے نا، میں ہوں ارچنا، وہی ارچنا جسے آپ روز ہی آشیرواد دیا کرتے تھے۔"

ارچنا کہے جا رہی تھی اور اروِن بابو عجیب سی الجھن میں گرفتار ہو گئے تھے۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ ارچنا نے پھر کہنا شروع کیا "[illegible] ہم لوگ اس شہر میں آئے ہیں۔ ہم لوگوں کو نئے جیون کے [illegible] کا آشیرواد دیجئے نا بابو جی۔ ہم لوگ آپ ہی کے پاس رہیں گے۔ آپ کی سیوا کریں گے۔ آپ کو سورج کی کمی کا احساس [illegible] مکان کسی کو نہیں مل رہا ہے [illegible]"

اروِن بابو کچھ دیر [illegible] وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور ارچنا [illegible] سر پر ہاتھ پھیر کر آشیرواد [illegible] انہوں نے ارچنا کا [illegible] [illegible]



کہانی ایک خاتون صدر کی

۲۴ مارچ ۱۹۷۶ء ——— مقام ارجنٹینا
کا دارالحکومت بیونس آئرس ——— رات کا ایک
بجا تھا۔ بیونس آئرس کا میونسپل ہوائی اڈے کی عمارت
کی کھڑکیوں میں بجلی کی روشنیوں سے جگمگا رہا
تھا۔ اچانک ہوائی اڈے کے کنٹرول ٹاور میں
ایک ہیلی کاپٹر کے اترنے کی اطلاع
موصول ہوئی۔ [illegible] کچھ دیر بعد ایک
[illegible] تھا کہ اسے وہاں پر
[illegible]
[illegible]
[illegible]

اپنے کپڑوں میں چھپایا ہوا پستول نکال کر سپاہی
کی طرف تان لیا۔ سپاہی ایک دم مبہوت اس عورت
کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ اچانک عورت کے
پیچھے کھڑے ہوئے ایک سپاہی نے بڑی پھرتی
سے عورت کا پستول چھین لیا۔ اس کے فوراً
بعد اس عورت کو اس کے سوٹ کیس کے ساتھ
ایک جیٹ طیارے میں بٹھا دیا گیا۔ پھر طیارہ
بیونس آئرس سے چودہ سو کلو میٹر دور ایک [illegible]
شہر میں واقع شان دار [illegible] کی طرف
روانہ ہو گیا۔
ہوائی اڈے پر گرفتار کی جانے والی یہ

خاتون تھیں ارجنٹینا کی صدر [illegible] دنیا کے
کسی بھی ملک کی پہلی اور واحد صدر خاتون
مسز ماریا ایستیلا مارٹینیز ڈی پیرون ———
کسی زمانے میں اپنی دل فریب اداؤں سے
دوسروں کو خوش کرنے والی نائٹ کلب کی
سابق کیبرے ڈانسر فوجی افسروں کے سامنے
جھک گئی ——— پیرون کو ایک ہفتہ پہلے ہی
پتہ چل گیا تھا کہ ملک میں فوجی انقلاب آسکتا
ہے۔ اس لئے اس نے فرار ہونے کی تمام
تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ منصوبہ یہ تھا کہ وہ صدارتی
محل سے ہوائی جہاز کے ذریعہ [illegible]

اسے پائلٹ کرنے والا ہوائی اڈے کی طرف لے جانے کا حکم دیا۔ اتفاق سے اترتے ہی فوجی سپاہیوں نے اسے گرفتار کرلیا۔

بالکل اسی طرح ۱۹۵۵ میں رات کے اندھیرے میں ایک چھوٹا سا بریف کیس اور سوٹ کیس ہاتھ میں اپنے کتے کی پاس بک کے ساتھ ارجنٹینا کی موجودہ خاتون صدر کے والد جوان ڈومینگو فوجی بغاوت کی وجہ سے ایک چھوٹی سی کشتی کے ذریعہ فرار ہوگئے تھے۔

پیرون کی زندگی کا سب سے اہم اور غیر معمولی دن تھا، ۱۷ اکتوبر ۱۹۴۵۔ اس دن بیونس کی سڑکوں پر پانچ لاکھ مزدور نعرے لگا رہے تھے، اور ان مزدوروں کی رہنمائی کر رہی تھی ایک نوعمر دوشیزہ جو ریڈیو آرٹسٹ بھی تھی۔ اس کا نام تھا ایوا ڈیوارٹ ——— ہجوم مطالبہ کر رہا تھا کہ وزیر محنت جوان ڈومینگو پیرون کو رہا کیا جائے۔ اس وقت پیرون کی مزدوروں سے متعلق پالیسیاں اتنی اچھی تھیں کہ پیرون کی رہائی کے فوراً بعد عوام نے اسے صدر منتخب کرلیا۔ کچھ دن کے بعد ایوا ڈیوارٹ پیرون کی دوسری بیوی بن گئی۔

۱۹۵۱ میں ایوا ڈیوارٹ نے نائب صدر بننے کی کوشش کی تھی، مگر فوجی دباؤ کے تحت ناکام رہی ——— ۲۶ جولائی کو صرف تیس برس کی عمر میں کینسر کے مرض میں مبتلا ہوکر ایوا چل بسی ——— ایوا کے مرنے سے پہلے ہی پیرون اتنا مقبول ہوگیا تھا کہ شہر میں دونوں کے مجسمے نصب کئے گئے تھے۔

۱۹۵۵ میں اپنی کچھ غلط اقتصادی پالیسیوں کی وجہ سے اور فوجی بغاوت کی وجہ سے پیرون کو ملک چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ ۱۹۵۵ میں فوجی بغاوت سے پہلے پناما کے ایک شان دار ہوٹل میں کیبرے ڈانسر ایزابیلا سے پیرون کی ملاقات ہوئی ——— ایزابیلا صدر کے ساتھ ہی ارجنٹینا آگئی۔ لیکن تین ماہ بعد ہی صدر کو ملک چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ اس وقت ۲۵ سالہ ایزابیلا بھی صدر کے ساتھ بھاگ کر وینزویلا چلی گئی۔ بعد میں اسپین کی راجدھانی میڈرڈ میں پہنچ کر دونوں نے شادی کرلی۔
اپنے ملک سے دور رہ کر جلاوطنی کی زندگی گزارتے ہوئے پیرون ۱۷ سال تک ارجنٹینا کے برسر اقتدار لوگوں کے لئے دردِ سر اور دہشت بنا رہا ——— سترہ سال تک بار بار پلٹے کھاتی ہوئی کمزور حکومت اور بے رحم تاناشاہوں کی وجہ سے وہاں کی حالت بالکل خستہ ہوگئی تھی۔ آخر میں فوجی تاناشاہوں نے صدر کو دوبارہ ملک واپس آنے اور اقتدار سونپنے کی پیش کش کی۔

۱۹۷۲ کو صدر پیرون اپنے ملک میں آگیا۔ وہاں اس کا خاطر خواہ استقبال ہوا ——— ۱۹۷۲ سے جون ۱۹۷۴ تک پیرون نے پھر حکومت کی۔ اسی دوران اس کی بیوی ایزابیلا بھی نائب صدر چن لی گئی۔

۷۸ سالہ پیرون کا انتقال جولائی ۱۹۷۴ میں ہوا، اور فوراً ہی وہاں کے قانون کے مطابق نائب صدر ایزابیلا صدر بن گئی۔ ایزابیلا لاطینی امریکہ کی پہلی خاتون صدر بنی۔ صدارتی محل میں حلف برداری کی پُرشکوہ تقریب میں ایزابیلا نے عوام کے نام اپنے پیغام میں کہا کہ وہ اپنے ملک کے عوام کے لئے ملکہ وکٹوریہ ثابت ہوں گی ——— لیکن کچھ عرصے کے بعد وہاں ملک میں پھر انتشار افراتفری کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ آہستہ آہستہ ایزابیلا پر فوجی دباؤ بڑھنے لگا۔ انتہا پسند سمجھے جانے والی فوج نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں چھاپہ ماروں نے اپنی کارروائیاں شروع کردیں ہر ماہ سینکڑوں لوگ چھاپہ ماروں کے ذریعے موت کے گھاٹ اتارے جانے لگے۔

دسمبر ۱۹۷۵ میں وہاں کی بری فوج نے بغاوت کردی، جو چار دن بعد ناکام ہوگئی۔ ایزابیلا پر سے عوام کا اعتماد اٹھتا جا رہا تھا ——— اور یہ اعتماد ایک چیک کے معاملے کی وجہ سے بالکل ہی ختم ہوگیا ——— ایک مذہبی تنظیم کو حکومت کی طرف سے پچاس لاکھ ڈالر کا چیک دینے پر وہاں کافی ہنگامہ ہوا۔ اس معاملے کو واٹر گیٹ کی طرح شہرت حاصل ہوئی جیسے تیسے یہ معاملہ دبا دیا گیا۔ حالات کے پیشِ نظر ایزابیلا نے ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۶ کو ملک میں عام انتخابات کرانے کا اعلان کیا ——— لیکن وہاں کے اندرونی حالات اتنے بگڑ چکے تھے کہ فروری ۱۹۷۶ سے ہی فوجی بغاوت کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ اور پھر ۲۴ مارچ ۱۹۷۶ کو پیرون کو اس بغاوت کی اطلاع مل گئی اور ایزابیلا پیرون کو ملک سے فرار ہونے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ لیکن بدقسمتی سے وہ بھاگنے سے پہلے ہی ہوائی اڈے پر گرفتار کرلی گئی۔

ابھی تک کچھ پتہ نہیں کہ ایزابیلا کے لئے مستقبل اپنے دامن میں کیا سوغات لائے گا۔ ارجنٹینا کے حالات اس قدر غیر یقینی اور متزلزل رہتے ہیں کہ پتا نہیں ان کے حق میں بھی فیصلہ ہوسکتا ہے اور خلاف بھی۔



پینتیس سال تک پدما وتی اپنے ماں باپ کے پاس ہی رہی۔ اس دوران اس کے لئے کئی رشتے آئے، مگر بیل منڈھے نہ چڑھی۔ کبھی لڑکے والوں کو جہیز کم لگتا تو کبھی نقد مطالبہ زیادہ ہو جاتا۔ کبھی لڑکی میں کچھ نقص نظر آتا تو کبھی لڑکی کے ماں باپ میں کچھ خرابی دکھائی دینے لگتی۔

جیسے ہی پدما کو پتہ چلتا کہ اس بار بھی بات چیت ٹوٹ گئی ہے تو وہ اپنے کمرے میں چلی جاتی اور خوب روتی۔ اپنی بدقسمتی کا گلہ بھگوان سے دل کھول کر کرتی۔ جب وہ رونے سے تھک جاتی تو چہرے سے کواڑ کھول کر باہر آجاتی اور منہ ہاتھ دھو کر اپنے کام کاج میں لگ جاتی۔

کام کاج میں لگنے کے لئے جیسے ہی وہ رسوئی گھر کے اندر جاتی تو ان چیزوں پر جو اس کی نظر پڑتی جو جہاں تو رسکے

لئے تیار کئے گئے اور جن کی تیاری میں اس کو اپنے ماں باپ کا دیوالہ نکلتا نظر آرہا تھا۔ پھر وہ ایک آہِ سرد بھر کر اس بربادی کو دیر تک تکا کرتی۔

ماں تو ایسے حادثے کے بعد کئی کئی گھنٹے رسوئی میں پاؤں نہیں دھرتی تھیں اور نہ گھر کے باہر نکلا کرتی تھیں۔ مگر ان پڑوسنوں کا کیا کیا جائے جو اس بے چاری کو اظہارِ ہمدردی کے بہانے مفت میں پریشان کرتی تھیں۔ کوئی ان کی اس بربادی پر دل ہی دل میں خوش ہوتی تھی تو کوئی ہنسنے والے کا نعرہ بلند کرتی چلی آتی تھی۔ دونوں ہی باتیں ستیاوتی کو ناگوار گزرتی تھیں۔ وہ تو بس مبہوت سی پتھر کی مورتی بنی بیٹھی رہتیں۔ نگاہیں نیچی کئے وہ چپ سادھے ایک آدھ آنسو ٹپکا دیتیں۔ بس۔ پتا بیچارے ان بیٹی کو تکا کرتے اور ان سے کہتے "پاگل ہو گئی ہو

تم دونوں۔ بھگوان بڑے دیالو ہیں۔ دھیرج رکھنا سیکھو۔ میری پدما کے لئے تو وہ خود ہی سوچ رہے ہیں کہ کون سا بر اچھا رہے گا۔ اس لئے وہ لوٹا دیتے ہیں۔ وہ ضرور میری پدما کو اچھا ساتھی دیں گے۔" ہمیشہ ہی وہ یہی کہتے۔ کیا مجال کہ ایک بھی سلوٹ ان کے ماتھے پہ آئی ہو۔

جب اس کے پتا اس طرح کی بات کہتے تو پدما سوچتی: پاگل تو پتا جی ہی ہو رہے ہیں جو ایسا سوچتے ہیں۔ کیا اچھا سا بر بھگوان پہلی بار ہی نہیں بھیج سکتے تھے؟ اب وہ ایسا کیوں کریں گے؟ ہونہہ!

پلیٹوں پر لگے ہوئے فالتو گھی کو گرم پانی اور صابن سے دھوتے ہوئے پدما سوچتی کہ کہیں نہ وہ خودکشی کر لے۔ اس چکنائی کی طرح وہ بھی کیوں نہ بہہ جائے۔ اس کی زندگی بھی اس فالتو چکنائی کی طرح بے کار ہو کر رہ گئی

[illegible] بہت ہی نفیس صاف جو [illegible]
وہ مر جائے گی تو اس کے ماتا پتا کو قرار آ جائے گا
مگر ایسا ہو سکتا۔ وہ ایسی انتہا پسندی
کیسے دکھائے۔ وہ مر جائے گی تو اس کے
ماں باپ بھی اس کے غم میں نڈھال ہو کر
مر جائیں گے۔ ہے بھگوان! وہ کبھی خودکشی
نہیں کرے گی۔ وہ ان کے لئے جئے گی اور
ان ہی کے لئے مرے گی۔ شادی نہ ہو تو کوئی
بات نہیں۔ اس جیسی لاکھوں ابھاگنیں ہیں۔
اس طرح وہ اپنا جی کڑا کر لیتی۔

سال پر سال گذرتے چلے گئے۔

ایک دن ایک عورت ستیاوتی کے
پاس آ کر بیٹھ گئی۔ کچھ ادھر ادھر کی باتیں کرنے
کے بعد وہ ایک لڑکے کا ذکر کرنے لگی۔ ستیاوتی
نے ایک سرد آہ بھر کر کہا "بہن اور تو سب
کچھ ٹھیک ہے، مگر جو عمر آپ لڑکے کی بتا رہی
ہیں وہ پدما کی عمر سے کم لگتی ہے۔ پھر بھی آپ
انہیں بلا کر لے آئیں۔"

اس عورت نے ایک نظر پدما پر ڈالی
اور کہنے لگی "آپ فکر نہ کریں۔ میں سب ٹھیک
کر لوں گی۔"

پدما دروازے کی اوٹ میں کھڑی سب
کچھ سن رہی تھی۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی
ہو کر جائزہ لینے لگی۔ وہ اپنے آپ سے کہہ رہی
تھی "ماں جھوٹ نہیں بول رہی تھیں۔ بڑھتی
ہوئی عمر صاف جھلک رہی ہے۔" واقعی پدما
اب عمر رسیدہ لگتی تھی۔ چہرے پر پختگی
[illegible] پیشانی پہ
[illegible]
[illegible]

پیلاہٹ چہرے پہ پھیل رہی تھی۔

اپنے پریتم کے انتظار میں وہ مدت میں
گذار چکی تھی۔ انتظار کرتے کرتے اس کی آنکھیں
بے نور سی ہو چلی تھیں۔ اس خیال کے آتے ہی
پدما کی آنکھیں بھر آئیں "قیامت کا انتظار
کر چکی ہوں میں! مدتیں گذاریں میں نے ان
کے انتظار میں۔ مگر وہ اب تک نہیں آئے۔"
غم سے نڈھال پدما جانے کب تک روتی
سسکتی رہی۔

چند دن بعد ایک خوب رو نوجوان
اور اس کی ماں پدما کو دیکھنے کے لئے آئے۔
رشتہ نہ ہونے کی امید تو کسی کو بھی نہیں تھی، پھر بھی
پدما کے پتا نے بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال
کیا۔ پدما کو بنا سجا کے سامنے لایا گیا۔ پدما کی ہونے
والی ساس نے تو اسی وقت منہ پھیر لیا جب
پدما دور سے آ رہی تھی۔ جب اس سے کسی نے
کوئی سوال نہیں پوچھا تو پدما نے خود ہی نگاہیں
دھیرے سے اوپر اٹھائیں اور لڑکے اور اس کی
ماں کو دیکھا۔ لڑکے کی خوب صورتی سے پدما
بے حد متاثر ہو گئی اور اس کی آنکھیں بھر آئیں۔
کئی سوال ایک ساتھ اس کے دماغ میں ابھرے
کیا وہ اس شخص کے قابل ہے۔ اس عمر میں
کیا وہ اس لڑکے کی دلہن کے روپ میں سجے
گی؟ اوہ نہیں! کوئی مقابلہ ہی نہیں ——
اپنی ساری ناامیدیوں کو سمیٹتے ہوئے وہ
اٹھ کھڑی ہوئی اور جھکے سے جانے لگی یکایک
ایک نرم اور میٹھی آواز کمرے میں گونجی "ٹھہریے،
ابھی تو ہم نے آپ سے ایک بات بھی نہیں کی
اور آپ جانے بھی لگیں۔"

پدما کے قدم جیسے رک سے گئے [illegible]
صوفے پر بیٹھ گئی۔ [illegible]

[illegible]

پسینہ آنے لگا تھا۔ قریب تھا کہ [illegible]
[illegible] بے ہوش ہو جاتی کہ دوسری مرتبہ وہ
دھیمی سی آواز کمرے میں گونجی "ماں ان کو
ہار پہنا دو۔ یہ مجھے پسند ہیں۔"

اپنے گلے سے ہار نکال کر چپ چاپ
کچھ کہے بغیر گنیش کی ماں نے پدما کو ہار پہنا دیا۔
پدما نے بے اختیار اپنی ساس کے پاؤں چھوئے
اور ان کے قدموں کی مٹی اپنے ماتھے پر لگا لی۔
اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے پتی کے قدموں
پر اپنا سر رکھ دے۔ مگر نہ جانے کیوں وہ ایسا
نہ کر سکی۔ پھر وہ اٹھ کر دھیرے دھیرے اندر
چلی گئی۔

اس کے حواس ٹھکانے نہیں تھے۔ اس
کے کانوں کی لوئیں جل رہی تھیں۔ بار بار ایک
ہی سوال اس کے ذہن میں ابھر رہا تھا ——
آخر اس کے پتی نے اس میں کون سی ایسی خوبی
دیکھی کہ یک دم اپنی ماتا کو ہار پہنانے کے لئے
کہہ دیا۔ وہ تو دیوتا ہیں۔ پتا جی ٹھیک ہی تو
کہہ رہے تھے کہ بھگوان اس کے لئے اچھا سا بر
دیں گے۔ کتنی سچائی تھی ان کی باتوں میں۔
کتنا بھروسہ تھا انہیں اپنے بھگوان [illegible]
اوہ پتا جی! پوجیا پتا جی!

اس کے ماتا پتا تو خوشی سے پھولے نہیں
سما رہے تھے۔ مہمانوں کے جانے کے بعد وہ
دونوں کیسے چہک چہک کر ان دونوں کے
بارے میں بات چیت کر رہے تھے اور
انہیں دعائیں دے رہے تھے۔ پتا جی جب
جوش و خروش کے ساتھ [illegible]
نہیں کہہ سکتا تھا [illegible]
[illegible]
[illegible]

چند مہینے کے بعد پدماوتی کی شادی ہو گئی اور پدما خوشی خوشی اپنے ماں باپ سے وداع ہو گئی۔ آنسو تو سب کی آنکھوں میں چمک رہے تھے، مگر اب تک سب نے مایوسیوں کے آنسو بہائے تھے، اب خوشی کے آنسو بہا رہے تھے۔

چند دن بعد پدما نے اپنے پتی سے کہا "ایک بات پوچھوں آپ سے؟"

گنیش نے کہا "ضرور، اس میں اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے؟ شوق سے پوچھو" گنیش نے بے تابی سے کہا۔

"آپ نے مجھ میں ایسی کون سی خوبی دیکھی تھی جو ایک ہی نظر میں آپ نے مجھے پسند کر لیا؟"

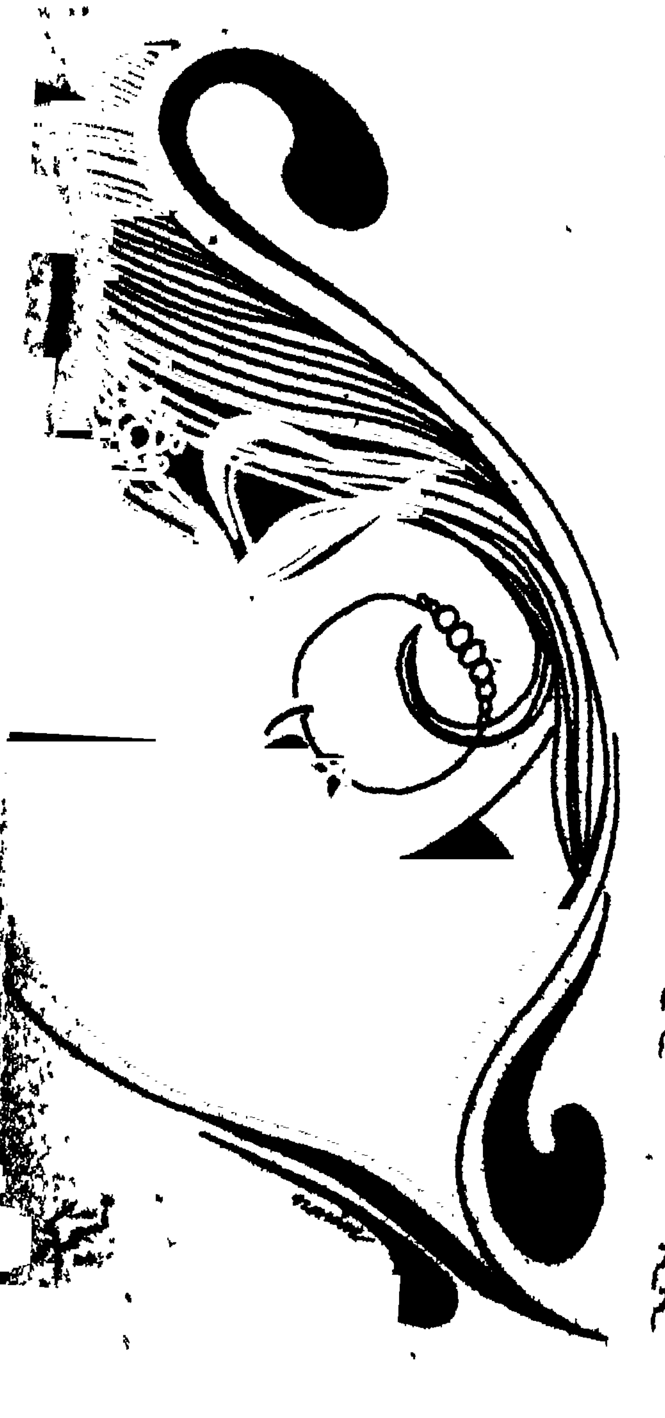
جواب میں گنیش نے تھوڑی دیر پدما کو دیکھا پھر اس کے جھریوں بھرے ہاتھ کو اپنی آنکھوں سے لگا کر چوم لیا اور کہا "پدما خوبصورتی کا معیار صرف نظر ہوتی ہے۔ تم خود کو میری نظر سے دیکھو۔"

پدما کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ کافی لمبے سفر کے بعد اسے منزل دکھائی دینے لگی تھی اور وہ تھکن سی محسوس کر رہی تھی۔ دھیرے سے وہ اپنے شوہر سے کہنے لگی "کیا سچ مچ میری ڈولی اٹھی تھی؟ کیا سچ مچ آپ میرے ساتھ ہیں؟"

"ہاں پدما!" اس کے شوہر نے اس کا سر سہلاتے ہوئے کہا۔ چاند مسکرا رہا تھا۔ فضائیں ترنم بکھیر رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں: کبھی کبھی بدبختی کی رات کے بعد خوش قسمتی کی صبح بھی آتی ہے۔ گنیش عام مردوں سے مختلف تھا۔ اس کا دل درد مندی کا سرچشمہ تھا۔ وہ پدما سے محض اس لئے پیار کرنے لگا تھا کہ وہ بہت دنوں سے بن بیاہی بیٹھی تھی۔ بیچاری کئی برس سے دکھی تھی اور وہ اس کو خوش کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ پدما کے چہرے پر اطمینان و سکون کا رنگ دیکھتا تو اس کی رگ رگ میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔

کچھ دن بعد پدما کے ہاں کیرتن ہوا۔ آملے کی شاخیں بھگوان کی مورتی کے دونوں طرف رکھی ہوئی تھیں اور پدما پوجا کرتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ آملہ پہلے تو کڑوا لگتا ہے مگر بعد میں میٹھا ہو جاتا ہے ——— بالکل اس کی اپنی زندگی کی طرح، جو پہلے کڑوا ہٹ لیے رہی تھی اور اب مٹھاس۔ ■■

دھوپ چھاؤں



بات سکھی ری سن لینا تم
پیار کے موتی چن لینا تم

ساس سسر ماں باپ تمہارے
دیور بھابی سب کے پیارے
نند بہنوں سے کیا کہنے
ایک لڑی کے ہیں سب گہنے
بات سکھی ری سن لینا تم
پیار کے موتی چن لینا تم

لڑتے ہی رہنا ٹھیک نہیں ہے
حد سے گزرنا ٹھیک نہیں ہے
میل ملاپ سے گھر بنتا ہے
پیار سے جیون سکھ ملتا ہے
بات سکھی ری سن لینا تم
پیار کے موتی چن لینا تم

جیون کیا ہے ایک سواری
اس کے مسافر ہیں نر ناری
ہوگی آساں زیست کی منزل
راہ چلو جیون کی سنگ مل
بات سکھی ری سن لینا تم
پیار کے موتی چن لینا تم

میکے سے جب سسرال ہو جانا
جینا مرنا سب ہو وہیں کا
اک ہو ڈولی، ایک جنازہ
غیرت مندوں کا ہے تقاضا
بات سکھی ری سن لینا تم
پیار کے موتی چن لینا تم

ماتا غم کی رات ہے کالی
بات ڈھلے گی، صبح بھی ہوگی
دھوکا ہے جیون سارا اپنا
بیتے گا سب سہاگوں کا سپنا
بات سکھی ری سن لینا تم
پیار کے موتی چن لینا تم

امریکہ میں شادیاں کیوں ناکام ہوتی ہیں؟

ن سلطانہ

مغربی ممالک میں شادی مرد اور عورت کا ذاتی معاملہ ہے۔ ماں باپ اور خاندان والوں کا اس سے زیادہ تعلق نہیں ہوتا۔ مغرب میں شادیاں محبت کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ یہ محبت کی شادیاں جتنی جلدی ظہور میں آتی ہیں۔ اتنی ہی جلدی ختم بھی ہو جاتی ہیں۔ شادی اور طلاق کا یہ سلسلہ اتنا عام ہے کہ پچھلے سال امریکہ میں دس لاکھ طلاقیں حاصل کی گئیں۔ اس تعداد نے طلاقوں کے گذشتہ تمام ریکارڈ توڑ دئیے۔ بہت سے لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ اگر شادی کا نتیجہ طلاق ہے تو شادی ہی کیوں کی جائے؟

یہ سب صحیح ہے لیکن صورت حال اتنی مایوس کن بھی نہیں۔ دنیا سے شادی کا رواج ختم ہونے والا نہیں ہے۔ امریکہ شادی اور طلاق میں دنیا کے سب ملکوں سے آگے ہے۔ یہ ملک طلاق کی کثرت کی وجہ سے بہت بدنام ہے لیکن اس کے باوجود امریکہ میں لاکھوں جوڑے ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ آج بھی محبت کی شادی کو اہمیت دیتے ہیں۔ ایک اخبار نے اپنے پڑھنے والیوں سے کچھ اعداد و شمار جمع کئے ہیں۔ ۔۔ ہزار عورتوں نے ان سوالات کا جواب دیا ان سوالات کا موضوع یہ تھا کہ کامیاب شادی کے لئے کن چیزوں کی ضرورت ہے۔ امریکن عورتوں کے جوابات بہت دلچسپ ہیں۔

شادی کے متعلق یہ نظریہ عام ہے کہ یہ ایک قسم کی قید ہے۔ اس کی شرطیں کڑی ہیں۔ ان میں خاص پر عورتوں کو آگے بڑھنے کا موقع نہیں ملتا۔ وہ گھر کی چار دیواری میں بند ہو کر رہ جاتی ہیں۔ امریکن عورتوں کی رائے کے مطابق یہ نظریہ غلط ہے۔ وہ اپنے آپ کو آزاد سمجھتی ہیں شادی کی اہمیت بدل رہی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے چند نکات کی طرف توجہ دلائی ہے

امریکن عورتوں کی نظر میں شادی محبت کا عہد و پیمان ہے جس میں ایک دوسرے کو سمجھنا ضروری ہے۔ یہ فرائض اور احکامات کی تعمیل کا نام نہیں۔ عورتیں اس لئے شادی نہیں کرتیں کہ انہیں بالآخر شادی کرنا ہی ہے محبت اور صرف محبت ہی ان کی شادی کی وجہ ہوتی ہے۔

دوسری بات یہ کہ عورت کی ترقی اور کامیابی کے لئے شادی ہونا لازمی ضروری نہیں وہ شادی کے بغیر بھی ہنسی خوشی زندگی گزار سکتی ہیں۔

طلاق کے متعلق امریکن عورتوں کا نظریہ ہے کہ یہ اتنی تباہ کن نہیں جتنی سمجھی جاتی ہے۔ یہ نظریہ کہ طلاق کی وجہ سے بچے بگڑ اور برباد ہو جاتے ہیں، صحیح نہیں۔ ماں باپ کی علیحدگی سے بچوں پر برا اثر نہیں پڑتا۔ ماں باپ کی شادی کی ناکامی کے باوجود ان کی اپنی شادیاں کامیاب ہو سکتی ہیں۔ یہ بات فرسودہ ہو چکی ہے کہ میاں بیوی کے شعبے الگ الگ ہیں بیوی بچے اور باورچی خانہ سنبھالتی ہے میاں دفتر، دکان یا کھیتی باڑی کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ نئے زمانے میں دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔

آیئے اب ذرا تفصیل سے ان اعداد و شمار کا مطالعہ کریں۔

شادی کے متعلق یہ نظریہ عام ہے کہ لڑکی کو شادی کرنا چاہیئے۔ مرد عورت کو ایک دوسرے کے پتی ہونے چاہئیں۔ عورتوں کو مرد کی حفاظت اور مدد کی ضرورت ہے۔ شادی مذہب، تہذیب اور خاندان کی بقا کے لئے ضروری ہے۔ محبت ایک فروعی چیز ہے۔ مل جائے تو سبحان اللہ نہ ملے تو صبر لازم ہے۔ عورتوں کو ان مردوں سے شادی کرنا چاہیئے جو ان کی کفالت کر سکیں مرد ایسی عورتوں کی تلاش کرتے ہیں جو ان کے گھر کا بوجھ بار اٹھا سکیں اور ان کے بچوں کی پرورش کر سکیں۔ یہ نظریہ ساری دنیا میں مقبول ہے۔ ایشیا اور افریقہ میں آج بھی شادیاں اسی نظریہ کے تحت کی جاتی ہیں۔

امریکہ میں یہ نظریہ اب فرسودہ ہو چکا ہے۔ وہاں شادی کی بنیاد محبت ہے اس کے علاوہ مرد اور عورت کی پسند اور خیالات ایک ہونے چاہئیں۔ ناکام شادیوں کی ایک وجہ خیالات اور پسند کا نہ ملنا بھی ہے۔

ایک اہم بات جو ان اعداد و شمار سے ظاہر ہوئی وہ یہ ہے کہ حکمرانی کا جذبہ شادی کی کامیابی کی راہ میں روڑے اٹکاتا ہے۔ عام نظریہ یہ ہے کہ مرد حکمرانی کرتا ہے اور عورت اس کا حکم مانتی ہے۔ شاذ و نادر ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ عورت حکمرانی کرتی ہے اور مرد اس کی بات مانتا ہے۔ ایسے مرد کو جورو کا غلام یا زن مرید کہتے ہیں۔ مرد کی حکمرانی اور عورت کی تابعداری فطری امر سمجھی جاتی ہے۔ یہ نظریہ غلط ہے۔ کامیاب شادیوں کی اکثریت میں حکمرانی کا جذبہ مرد اور عورت دونوں میں مفقود تھا۔ دوسرے درجہ پر وہ شادیاں تھیں جن میں مرد اور عورت دونوں میں حکمرانی کا جذبہ برابر پایا جاتا تھا۔ سب سے آخر میں وہ شادیاں تھیں جن میں ایک

[illegible]
درجہ کی تھیں۔

کچھ اور دلچسپ نتائج جو ان اعداد و شمار سے سامنے آئے حسب ذیل ہیں:

عورتوں کا خیال ہے کہ مرد اور عورت دونوں میں محبت کا جذبہ برابر کا ہونا لازم ہے مگر ایک فریق دوسرے سے زیادہ محبت کرتا ہے تو شادی کی کشتی ڈگمگانے لگتی ہے، خاص طور پر جب عورت زیادہ محبت کرتی ہے تو اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مرد اور عورت دونوں کو گھر کا کام کرنا لازم ہے۔ مرد کے لئے ضروری ہے کہ وہ گھر کے کام کاج میں عورت کا ہاتھ بٹائے۔ وہ دن گئے جب مرد پلیٹیں صاف کرنا یا کپڑے ٹانگنا کسر شان سمجھتا تھا۔ بچوں کی دیکھ بھال مردوں کے لئے اتنی ہی ضروری ہے جتنی عورتوں کے لئے مردوں اور عورتوں کے کام کی روایتی تقسیم غلط ہے۔

گھر کے متعلق کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے مرد پر لازم ہے کہ وہ عورت کو بھی مشورے میں شریک کرے۔ اگر کوئی مکان خریدنا ہے۔ فرنیچر بدلنا ہے۔ یا گھر میں رنگ روغن کرانا ہے تو یہ فیصلہ مشترکہ ہونا چاہئے۔

ان عورتوں کی تعداد جو بچوں کو شادی کی کامیابی کے لئے ضروری سمجھتی ہیں ان عورتوں کے برابر تھی جو بچوں کو غیر ضروری سمجھتی ہیں۔ گزشتہ زمانے میں بچے کامیاب شادی کی بنیاد سمجھے جاتے تھے۔ ایشیا اور افریقہ میں یہ نظریہ آج تک رائج ہے۔ امریکی عورتیں بچے پیدا کرنا چاہتی ہیں لیکن انہیں کامیاب شادی کی ضمانت نہیں سمجھتیں بلکہ عورتوں کا خیال ہے کہ بچوں نے ان کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ ڈالی ہے۔

اس ضمن میں ایک اور بات قابلِ ذکر ہے۔ جن عورتوں کے بچے ابھی چھوٹے ہیں۔ وہ ان کی دیکھ بھال سے پریشان ہو جاتی ہیں وہ عورتیں زیادہ خوش رہتی ہیں جن کے بچے نہیں یا جن کے بچے جوان ہو گئے اور وہ ان کی پرورش کی مشکلات سے آزاد ہو گئیں۔ جوان عورتیں جن کی عمر ۲۰ برس یا اس کے لگ بھگ تھی، بچوں سے کچھ زیادہ پریشان نظر آتی تھیں۔ انہیں بچوں کے باوجود تنہائی محسوس ہوتی تھی۔ چھوٹے بچوں سے وہ دل کی بات نہیں کر سکتی تھیں، ان سے گپ شپ نہیں کر سکتی تھیں۔ اس کے علاوہ بچے ان کی سماجی زندگی میں بھی رکاوٹ ڈالتے تھے، بچوں سے ان کی ازدواجی زندگی پر بھی برا اثر پڑتا تھا۔ بچوں کے شور و غل سے ان کے سر میں درد رہتا تھا۔ راتوں کو جاگنے اور پریشان ہونے سے ان کا مزاج خراب رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ تھکی سی رہتی تھیں۔ اس کے برخلاف بے اولاد عورتیں آزادی محسوس کرتی تھیں، ان کو تنہائی نہیں ستاتی تھی۔

بچہ پیدا ہونے کے بعد ماں کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ اسے بچے کی دیکھ بھال کرنا ہوتا ہے۔ گھر کا کام کرنا پڑتا ہے۔ امریکہ میں نوکر نہیں ملتے۔ سب کام خود کرنا پڑتا ہے۔ وہاں بہت سی مشینیں ہیں۔ جن سے گھر کا کام نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔ بجلی کی جھاڑو سے منٹوں میں گھر صاف ہو جاتا ہے۔ کپڑے مشین میں دھلتے ہیں۔ پلیٹیں مشین سے صاف ہوتی ہیں۔ کھانا بجلی سے پکتا ہے۔ اس کے باوجود عورت کو محنت کرنا پڑتی ہے۔ کپڑے مشین میں ضرور دھلتے ہیں لیکن عورت کو کپڑے ٹانگنے اور استری کرنا پڑتی ہے۔ کھانا مشین سے پکتا ہے لیکن بازار سے گوشت اور سبزی عورت کو خریدنا پڑتی ہے۔ پلیٹیں مشین سے صاف ہوتی ہیں لیکن میز پر پلیٹیں لگانا، انہیں اٹھانا اور دھو کر انہیں رومال سے صاف کرنا عورت کی ذمہ داری ہے۔ جب مرد دفتر سے آئے تو اسے بھی وقت دینا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ اپنے میک اپ لباس اور دوستوں پر بھی وقت خرچ ہوتا ہے۔ غرض عورت پر بچہ پیدا ہونے کے بعد ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔

یہ بات مشہور ہے کہ بچوں سے گھر کی رونق بڑھ جاتی ہے اور گھر میں خوشی کا [illegible] رہتا ہے لیکن دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں

پر پلنے والی عورت معاشرے میں مسرت افزا ہے کہ بچوں
سے گھر کی رونق دوبالا ہو جاتی ہے۔ حقیقت اس
کے برعکس ہے۔ امریکہ میں جن عورتوں کے بچے پسند
نہیں وہ زیادہ تر بے اولاد ہیں یا حاملہ ہیں۔ جو
عورتیں اتفاقیہ ماں بن جاتی ہیں وہ بچوں سے امید لگانے
لگتی ہیں کہ وہ ان کے گھر کو خوشیوں سے بھر دیں گے۔

اگر عورت نوکری کرتی ہے تو بچوں کا
بوجھ اسے زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ
بچے نوکری کرنے والی عورتوں کی ازدواجی زندگی
پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ ماں بننے سے عورت کی
تکمیل ضرور ہوتی ہے لیکن اس سے شادی کی
کامیابی اور ناکامی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اگر میاں
بیوی میں اختلاف ہے تو بچے اسے دور نہیں
کر سکتے۔ اگر ماں باپ ایک دوسرے سے بہت
قریب ہیں تو بچے انہیں دور کرنے میں مدد کرتے
ہیں۔ عورت کی توجہ مرد سے ہٹ کر بچے پر مرکوز
ہو جاتی ہے اور یوں ان میں دوری پیدا
ہو جاتی ہے۔

ان اعداد و شمار سے ایک اور بات یہ واضح
ہوتی ہے کہ دوسری شادی پہلی شادی سے کم کامیاب
ہوتی ہے۔ ڈاکٹر جانسن کا خیال ہے کہ دوسری
شادی تجربہ اور یقین کی فتح ہے۔ کچھ لوگوں کے
نزدیک دوسری شادی تنزل کر رہی ہے۔ اس لئے
پہلی شادی سے زیادہ خطرہ ہے لیکن اعداد
و شمار اس نظریے کے برعکس نتائج پیش کرتے ہیں
دوسری شادی میں طلاق کا امکان پہلی شادی
سے زیادہ ہوتا ہے۔

اگر شادی شدہ جوڑے کی عمر ۳۰ سال سے
کم ہو تو شادی کی ناکامی کے امکانات بڑھ جاتے
[illegible]
[illegible]

کسی [illegible] جا سکتی ہے۔ زیادہ تر
شادیاں عموماً طلاق پر ختم ہوتی ہیں۔ طلاق کے
بعد لڑکیاں دوسری شادی کرنے کے لئے بیتاب
ہو جاتی ہیں۔ وہ خاوند سے مایوس ہوتی ہیں شادی
سے نہیں۔ امریکہ میں شادی سے پہلے خاوند کے
ساتھ رہنے کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ شادی کے بعد
علیحدگی خاصا مشکل اور صبر طلب کام ہے۔ اس
کے لئے قانون کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ طلاق عدالت
سے ملتی ہے۔ اس کے بعد چھ مہینے انتظار کرنا پڑتا
ہے۔ ۶۰ مہینے کے بعد طلاق مکمل ہو جاتی ہے اور
فریقین کو دوسری شادی کی آزادی مل جاتی ہے۔
شادی سے پہلے ہونے والے خاوند کے ساتھ رہنے
سے ان مشکلات کا سامنا کرنا نہیں پڑتا۔ اگر مزاج
نہ ملیں تو یہ رشتہ آسانی سے توڑا جا سکتا ہے۔ جس
مرد کے ساتھ زندگی گزارنا ہے اس کے ساتھ چند
ہفتے یا چند مہینے بغیر شادی کے گزارنے میں کیا
قباحت ہے۔ اس طرح آنے والے دور کی ایک
دھندلی سی تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ ایک دوسرے
کی عادتوں کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے، یہ بات چند
گھنٹوں کی ملاقاتوں میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس کے
علاوہ جب مرد و عورت چند گھنٹوں کے لئے ایک
دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں تو اپنا بہترین پہلو
پیش کرتے ہیں۔ میلا کچیلا رہنے والا مرد عورت کو
مرعوب کرنے کے لئے صاف ستھرے کپڑے پہنتا
ہے۔ بد زبان آدمی اپنی زبان کو قابو میں رکھتا
ہے۔ اس بہروپ میں عورت اس سے دو قدم
آگے رہتی ہے۔ وہ ایثار اور قربانی کا مجسمہ معلوم
ہوتی ہے۔ وہ ہر آن مرد کی ہاں میں ہاں ملاتی
ہے۔ شادی کے بعد بہروپ کی حقیقت کھل
جاتی ہے۔ دراصل وہ حقیقت میں ایک دوسرے
کو نہیں بلکہ خود کو دھوکا دے رہے ہوتے [illegible]

[illegible]

امریکہ میں شادی کی ناکامی کا ایک سبب تنہائی
کا احساس ہے۔ خاص طور پر بچوں کے گھر چھوڑنے پر یہ
احساس بڑھ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مالی تحفظ
بھی شادی کا سبب بن جاتا ہے لیکن شادی
کے یہ سبب فہرست میں سب سے نیچے آتے ہیں
شکل سے ۱۰ فی صد عورتیں مالی تحفظ یا تنہائی
سے بچنے کے لئے شادی کرتی ہیں۔

شادیوں کی ناکامی کی ذمہ داری شوہر اور
بیوی پر ہے۔ شادی کے اصول میں کوئی خرابی
نہیں۔ ابھی تہذیب نے اتنی ترقی نہیں کی کہ
شادیوں کا سلسلہ سرے سے ہی ختم ہو جائے۔
عیسائی مذہب میں شادی ایک مجبوری یا ضابطہ
نہیں، بلکہ ایک تلاش اور پوتر بندھن ہے۔
شادی کی رسموں میں قسم کھائی جاتی ہے کہ جب
تک کہ موت ہم کو ایک دوسرے سے جدا نہ کر دے
ہم ایک دوسرے سے پیار کریں گے۔ ہم امیری
میں، مفلسی میں، صحت میں، بیماری میں، ایک
دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ مگر ان قسموں
کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ یہ قسمیں عدالت کے
کٹہرے میں ہی ٹوٹ جاتی ہیں۔ اصلاحی تحریکوں کے
بعد اس عقیدے کی شدت میں کمی آ گئی ہے۔
اب امریکن عورت شادی نبھانے کی قسم کھانے
کی بجائے شادی نبھانے کا وعدہ کرنا چاہتی ہے
شادی کی قدریں بدل رہی ہیں۔ یہ
نظریہ ختم ہوتا جا رہا ہے کہ ایک فریق کو دوسرے
کے لئے قربانی دینا چاہئے اور اپنی شخصیت
کو ختم کر کے دوسرے فریق میں ضم کر دینا چاہئے۔
امریکن عورتوں کا خیال ہے کہ انفرادیت شادی
کی کامیابی کے لئے ضروری ہے۔ [illegible]
[illegible]
مستقبل [illegible]



چمکیلے

ایم اعظم عرفان

[illegible] کی [illegible] میں [illegible] شام نے سہم کر سرگوشی کے انداز میں [illegible] کو گہرا کیا — اور رات اپنے [illegible] اندھیرے کو سمیٹ کر کسی مقبرے میں اٹھنے والے کثیف دھوئیں کی طرح بلند سے ابھرتی گئی۔

"کیا کر رہے ہو؟"

"او ہو! تم آگئیں تم!"

"ہاں — چھ بج چکے ہیں — اور تمہیں احساس ہی نہیں کہ میرے آفس سے آنے کا وقت ہو چلا ہے —"

میں نے کنکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا "سچ مجھے احساس ہی نہیں رہا کہ مجھے تمہارا انتظار کرنا چاہیے۔"

"اُف! جلی کٹی باتیں کیوں کرتے ہو۔ اچھا، یہ بتاؤ کیا ناول لکھ رہے ہو؟"

"تمہیں کیا دکھائی دے رہا ہے گھاس چھیل رہا ہوں؟"

"ایسی باتیں کیوں کرتے ہو؟"

"پھر کیسی باتیں کروں؟ تمہاری نوکری کی، تمہاری شاعری کی، تمہارے حسن کی باتیں۔ یا تمہارے وحشی ماحول کی باتیں جنہیں مزید سننے کی مجھ میں تاب نہیں؟"

وہ بدحواسی ہو کر بولی "ایسا کیوں سوچتے ہو؟ تمہیں معلوم نہیں کہ تم ہی میرا آئیڈیل ہو۔ میں نے تمہارے افسانے پڑھے تھے۔ تمہاری شخصیت کی گہرائی کھوجتی رہتی تھی۔ پھر [illegible] ہو کر اپنے ماں باپ کی مرضی کے خلاف تم سے شادی کی تھی اور پھر نوکری کر رہی ہوں [illegible] اپنے [illegible] کی [illegible] میں نہیں [illegible] تم سے شادی [illegible]

ضدی اور جذباتی رہی ہوں۔ لیکن تم نے میری شخصیت کو ہی بدل ڈالا۔ اور مجھے اس بدلی ہوئی شخصیت پر فخر ہے۔ صرف تمہاری بدولت"

باتیں خوب کرنے لگی ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ واقعی آج کی عورت آزاد ہو گئی ہے۔"

"یہ آزادی بھی تمہاری ہی دین ہے۔"

"کیوں، میری دین کیوں؟"

"تم نے ہی میری شخصیت کو سنوارا۔ تم نے ہی میری آواز کو "پہچان" بنایا۔ تم نے ہی ثابت کر دیا کہ ایک ادیب کی بیوی شاعرہ بھی ہو سکتی ہے۔ خود ہی بناتے ہو اور خود ہی بگاڑتے ہو۔"

"ہاں ہاں، میں نے کہا تھا کہ خوب گھومو، پھرو۔ ریڈیو اسٹیشن جاؤ، غزلیں ریکارڈ کراؤ۔ لوگوں کی سنو، اپنی سناؤ، اور پلٹ کر بھی نہ دیکھو کہ پیچھے کون کھڑا ہے۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے

نہیں، اب اور کچھ نہ کہو۔ میں پریشان ہو گئی ہوں۔ اب آگے کچھ نہ کہو — میں برداشت نہ کر سکوں گی۔"

"میں پریشان ہو گیا تھا [illegible]

میں؟ اتنی کم زور نا سمجھ عورت!

وہ سسک اُٹھی "تم تو صرف منطقی دلائل سے مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ میں نے معاشیات میں ایم اے کیا ہے اور نوکری بھی کر رہی ہوں اور تم نے کیا کیا؟ اپنی بیوی کے لئے، اپنے گھر کے لئے، اپنے مستقبل کے لئے تم نے کیا کیا — بس چند افسانے، ایک ناول اور دل کش باتیں — جن کو میں نے ایک قیمتی اثاثہ سمجھ کر ذہن نشین کر لیا۔ [illegible] ان پڑھ عورت ان سب پر تھوکنا بھی گوارا نہ کرتی۔

زلزلے دار [illegible] کی آواز سن کر [illegible] شام نے تاریکی سے سرگوشی کی اور رات نے آہستہ سے اپنے وجود کو "دن" کی گود سے [illegible] لیا —

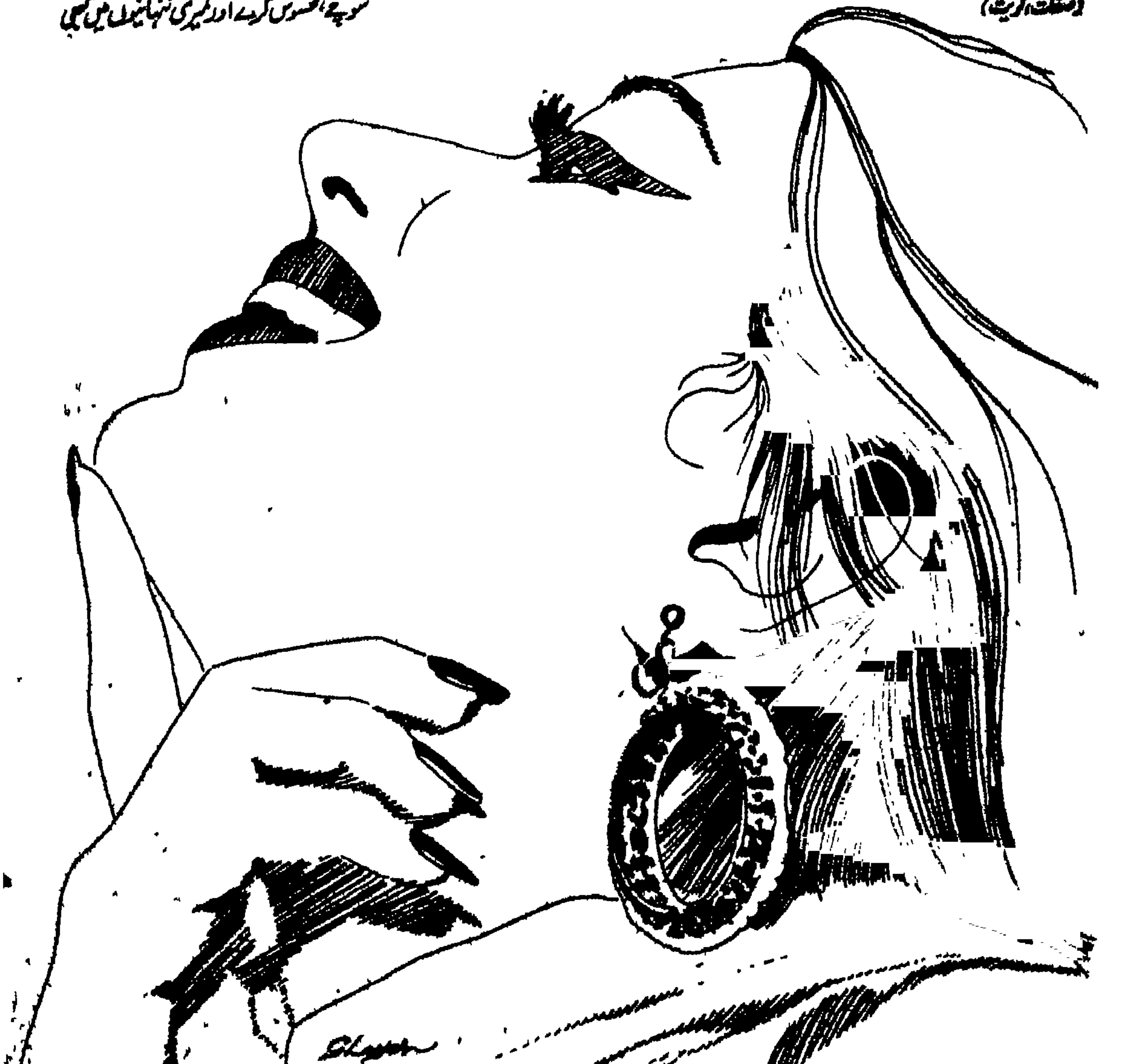
سورج اپنے ہی جذبات کی شدت سے سرخ اپنی کم زوری پر نادم ہو کر پاتال کی [illegible] میں ڈوبتا چلا گیا اور رات اپنی [illegible] اور غم آلود [illegible] سے [illegible] آہستہ آہستہ [illegible]

ہم اداس نہیں ہیں

سعیدہ احمد

(صفات، کویت)

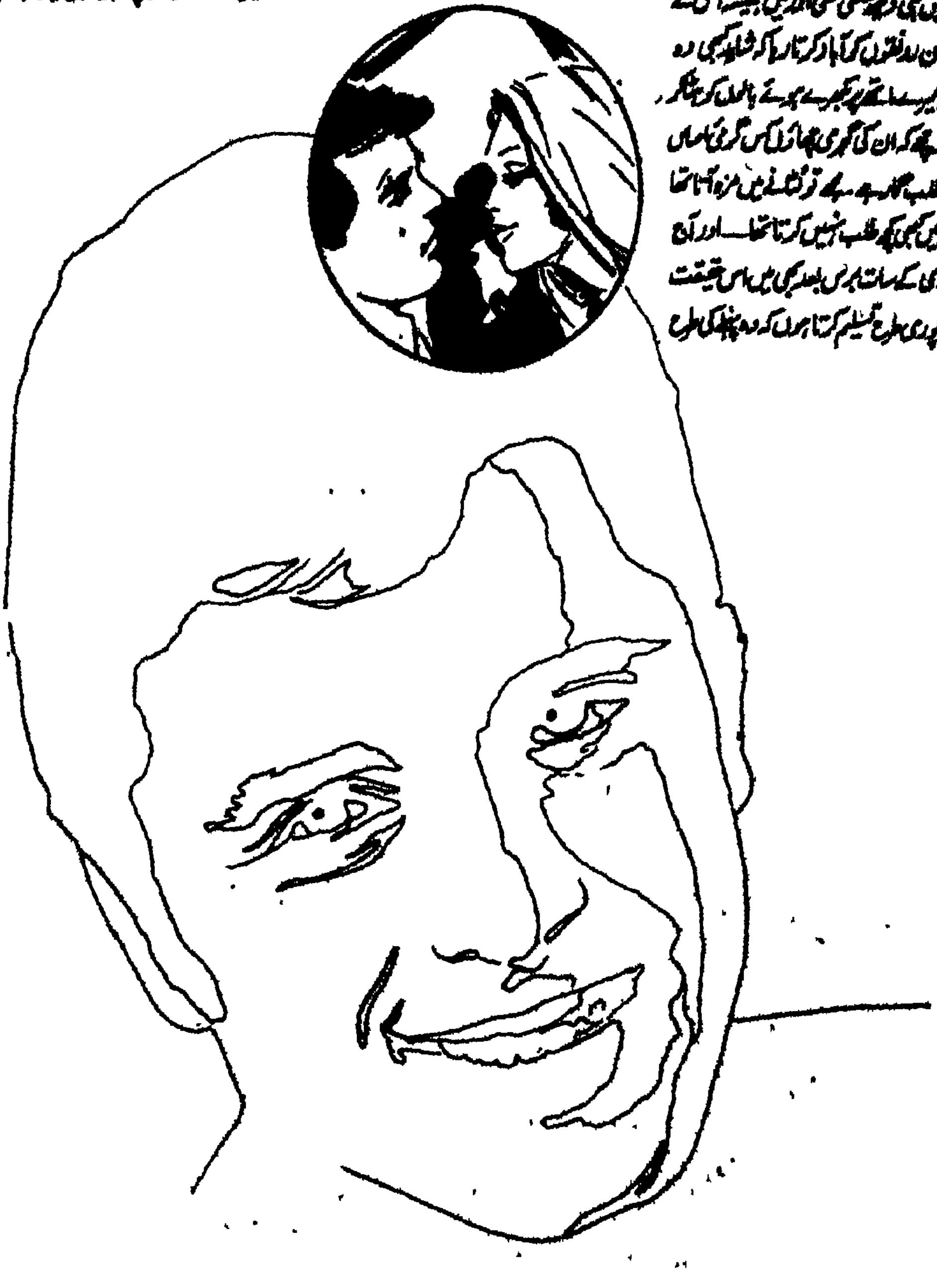
قناعت کی دولت کو جذبات کی زد
میں آ کر میں اُس کے ساتھ ایک معاہدہ کر بیٹھا
اور آج سات برس گزرنے کو ہیں میرے اندر
وہ جو ایک پھول کی طرح کھلا ہوا انسان تھا
ٹوٹ پھوٹ کر بکھرتا رہا ہے۔ وہ خوش اور
مطمئن رہی کہ میں نے اپنا وعدہ نبھایا ہے،
لیکن اس کی جو قیمت مجھے ادا کرنا پڑی اُس
کا اندازہ بھی نہ کر سکی۔ وہ اپنی ہر خواہش کی
تکمیل [illegible]
زندگی گزارتی رہی اور جو تمنائیں بھی پوری کرتی
رہی، ایک لمحے کے لئے بھی اُس انسان کے
بارے میں نہیں سوچا۔ کسی برتن کے ٹوٹنے کا
افسوس اسے ہوتا رہا اور وہ گہرے گھاؤ جو میری
روح میں سلگتے رہے اُن کا کبھی اُس کو احساس بھی
نہ ہوا۔ وقت نے شاید میری اس خواہش کو بھی
مار ڈالا تھا کہ اُس کو احساس ہو، وہ بھی میری طرح
سوچے، محسوس کرے اور میری تنہائیوں میں کبھی



[illegible] چاہتا تھا کہ [illegible] کوشش کرے کہ میں
پہنچ سکوں [illegible] کی گہرائیوں
کو بھی [illegible] میں وہ کون سی الجھن
ہے جو اس کے [illegible] رہتی ہے
اور وہ [illegible] کر رہ جاتی ہے [illegible] صرف
رونقیں ہی دیکھ سکتی تھی اور میں ہمیشہ اس کے
لئے ان رونقوں کو آباد کرتا رہا کہ شاید کبھی وہ
بھی میرے ساتھ [illegible] ہوئے [illegible] کر
یہ [illegible] کہ ان کی گہری [illegible] کس گہرے احساس
کی طلب گار ہے [illegible] میں مزہ آتا تھا
خود میں کبھی کچھ طلب نہیں کرتا تھا ۔۔۔ اور آج
شادی کے سات برس بعد بھی میں اس حقیقت
کو پوری طرح تسلیم کرتا ہوں کہ وہ [illegible] کی طرح

ہوتا ہے [illegible] کہ [illegible]
ایک [illegible] رفتار [illegible] ہے ۔ [illegible] پہنچ کر پہلا
کرنے کے بعد [illegible] حسن [illegible] اس پر
آیا تھا اس کو دیکھ کر ہی میں [illegible] ہو جاتا تھا
وقت میرے لئے کتنا آسان ہو گیا تھا کہ اس کی

ہر خواہش کے آگے [illegible] خواہش
اس کے ذہن میں پوری طرح [illegible]
میں اسے پورا کر دیا کرتا ۔ [illegible] خوشی [illegible]
کے سارے [illegible] کا خون اس کے [illegible] میں
اکٹھا ہو جاتا جنہیں [illegible] کر میں کائنات کی
ساری [illegible] کر اپنے [illegible] میں جذب



کرتا تھا۔

ایک صرف اُس سے تعلق پیدا ہونے سے میرے سارے تعلقات ٹوٹ گئے تھے، مجھے اس بات کی بھی کوئی پرواہ نہیں تھی کہ جو کچھ میں نے پایا تھا وہ سب کچھ کھو دینے سے بھی کہیں زیادہ تھا۔ جسم کی حقیقت سب حقیقتوں پر غالب تھی۔ پہلے تو صرف اس کے تصور کی کہانیاں ہی لکھا کرتے تھے۔ لمبی سرد راتیں اُس کی قربت کی چاہت میں گذار دیتے تھے۔ اور دن کو دفتر میں بیٹھ کر جسم کی ہمدردیوں، اور مہربانیوں اور رفاقتوں پر جو کہانیاں لکھا کرتے تھے انہیں پڑھ کر کنوارے جسموں کو ضرور اپنے آپ پر رشک آتا ہوگا اور وہ مسرت سے جھوم کر ناچنے لگتے ہوں گے کہ اُن کے پاس کتنی بڑی حقیقت ہے۔ جس کی نقاب کشائی کے لئے مرد سب سے بھی کر سکتے ہیں۔ کیسا خوش کن تصور تھا اور اب یوں محسوس ہوتا ہے جیسے محض تصور ہی خوش کن تھا۔ ایک سوال ذہن میں اُبھرتا ہے کہ کیا واقعی قربت کشش میں کمی پیدا کر دیتی ہے قربت کے بعد تو چاہت اور بڑھنی چاہئے۔ تو پھر یہ کیا ہے کہ وہ تو ہر طرح سے خوش ہے جبکہ میں اپنے آپ کو لُٹا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ اُس کو اب شاید یاد بھی نہ ہو کہ شادی کی پہلی رات کو اُس نے کون سی چیز مجھ سے چھین لی تھی جسے معمولی سی بات سمجھ کر میں نے اُس پر نچھاور کر دیا تھا۔ میں تو اُسے پا کر دنیا کی ہر دوسری چیز سے اپنا رشتہ توڑنے کے لئے تیار تھا۔ وہ تھی ہی اس قابل۔ اور آج تک میں نے کبھی ایک لمحے کے لئے بھی اُس کو یہ شک نہیں ہونے دیا کہ اُس لمحے لُٹانے کے بعد مجھ میں کیا رہ گیا ہے ـــــ صرف چند مسکراہٹیں

جو وقتی اس سنگ کے تجھیز تار رہتا ہوں اور وہ انہیں سمیٹ کر پہلے کی طرح مکمل تخلیق ہے اور میں پھر کچھ دیر کے لئے زندہ ہو جاتا ہوں اصل میں اندر سے میں بالکل مر چکا ہوں۔

"میری ایک بات مانو گے؟ ـــ وعدہ کرو۔ اُس نے کہا تھا۔

"صرف ایک بات؟" میں نے اُس کے ہونٹوں کو چوم لیا تھا، اور وہ رونے لگی تھی۔

"تمہیں پتہ ہے ہم نے بہت بُرے حال میں زندگی گذاری ہے۔ میری ماں ٹی بی سے مر گئی تھی۔ اس سے زیادہ خوبصورت عورت میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ مگر آخری دنوں میں اُس کا جو حال تھا...... وہ اپنے آنسو پونچھنے لگی ـــــ میرا باپ اس کا علاج نہیں کرا سکا، صرف اس لئے کہ تیس برس سے وہ قلم سے صفحے کالے کر کے روزی کماتا تھا، جن سے پیسے صرف اتنے ملتے تھے کہ وہ ہم کو اچھی طرح تعلیم بھی نہ دلا سکا۔ اور ـــــ اور یہ بڑی لمبی کہانی ہے جسے میں بھول جانا چاہتی ہوں۔ مجھے قلم اور کاغذ سے نفرت ہے میں تم سے صرف یہ وعدہ لینا چاہتی ہوں کہ تم لکھنا چھوڑ دو۔ کسی اور کمپنی میں ملازمت کر لو۔ ہمارے بچوں کا وہ حال نہیں ہونا چاہئے۔"

لکھنا چھوڑ دوں؟ بس! میں تمہارے لئے دنیا چھوڑ سکتا ہوں۔" اور میں نے اس کو اپنی باہوں میں اتنی زور سے بھینچ لیا تھا کہ مجھے اس بات کا ہوش بھی نہ رہا کہ میں دنیا چھوڑ چکا ہوں۔ دنیا واقعی میں چھوڑ چکا تھا۔ مجھے ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی میں ملازمت مل گئی اور ہم نے دوسری دنیا آباد کر لی اور وہ وقت گذارنے

جن کے کشادہ صرف کہانیوں [illegible] لکھنے والوں کی زندگیوں میں اس کی کوئی جھلک بھی نہیں ہوتی۔ غریب، مگر یہاں ٹھیک چلتا رہا۔ شاپنگ بھی ہوتی رہی، نئی نئی ساڑیاں بھی آتی رہیں۔ میرے نئے سوٹ بھی بنتے رہے۔ پہلا بچہ اور پھر دوسرا ـــــ بچہ ترقی ملی تو وہ خوشی سے پاگل ہو کر میرے لئے ایک اور سوٹ خرید لائی۔ میں خوشی سے پاگل نہ ہو سکا، پھر بھی اس کے لئے ایک ساڑی خرید کر لے آیا۔ ساڑی دیکھتے ہی اُس نے جسم پر لپیٹ لی اور میرے دوسرے ہاتھ میں ایک پیکٹ کی طرف دیکھتے ہوئے اُس نے کہا تھا "یہ کیا ہے؟ دیکھوں"۔

"یہ ایک بہت اچھا ناول ہے۔" اُنّاس نسلیں"۔

اُس نے پیکٹ میرے ہاتھ سے لے کر فرش پر پھینک دیا۔ ہم اُنّاس نہیں ہیں، میرے گلے لگ جاؤ۔ ساری خرافات ہیں ناچتی ہیں"۔ اُس نے مجھے اپنے گلے لگا لیا اور کوئی چیز اندر سے میرے اندر ٹوٹ کر رہ گئی کہ میں جس کو اپنے آپ کو گوارا کر سکا۔ میں نے وہ کتاب فرش سے نہیں اٹھائی اور اُس کے بعد مجھے علم نہیں کہ وہ کہاں گئی۔

"کیا لکھ رہے ہیں آپ؟"

"ایک دوست کو خط لکھ رہا ہوں۔" وہ دیکھنے کے لئے آگے بڑھی [illegible] سامنے اپنی نامکمل کہانی کو پھاڑ کر پھینک دیا [illegible] کتنی ہی نامکمل آدھی ادھوری کہانیاں میں نے کبھی دفتر میں کبھی پاس کی [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] اُس نے نکلیں ہیں [illegible] تک
[illegible] ہیں اور میں تڑپ کر بھی صرف اُس کے لئے
[illegible] سکتا ہوں۔ میں اُس کے لئے بازار کوئی چیز
لینے چلا جاتا ہوں، اُس کے بچوں کو سینے
سے لگا کر پیار کرتا ہوں اور ان حرکتوں کو وہ
میری آسودگی کی علامت سمجھتی ہے۔ ایک دن
اپنے پاس بٹھا کر میں نے بڑے پیار سے اُس
سے پوچھا تھا "اگر کسی ماں کی کوکھ میں بچہ جنم
لینے سے پہلے ہی مر جائے تو....

"ہائے اللہ!" اُس نے میرے ہونٹوں کو بند کر دیا۔

"......اسی طرح اگر کوئی نا مکمل چھوڑ دی جائے ......" مگر وہ میری بات سنے بغیر میری پسند کا کھانا پکانے باورچی خانے میں چلی گئی۔ ہم نے اکٹھے کھانا کھایا اور وہ خوش تھی کہ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی مجھے بہت مزہ آیا تھا۔ شام کو اس کے کہنے پر ہم فلم دیکھنے گئے تھے۔ آدھی فلم دیکھ کر وہ اٹھ کر چلی آئی۔

"مجھے رونے پیٹنے والی فلمیں اچھی نہیں لگتیں شاعر اسی طرح بھوک سے مرتے ہیں؟" میں نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ فلم کتنی محنت اور بڑی اذیت برداشت کر کے انھوں نے تخلیق کی ہے۔

"کی ہوگی۔ مگر کیا یہ ضروری ہے کہ ہم بھی اُس کو دیکھیں؟"

"ہاں یہ ضروری ہے بہت ضروری ہے [illegible]

[illegible] ہوا تھا۔ اُس نے [illegible] کو بند کر دیا اور زیادہ وقت تنہائی میں [illegible] گزارتی رہی۔ اور جب اُس نے بہت بے دلی کے ساتھ بچے کو مار کر زمین پر گرا دیا تھا ڈاکٹروں نے خود ہی اُس کو یقین دلایا تھا کہ میرے لئے صرف اُس کے ساتھ رہنا ہی ضروری ہے اور کسی غریب شاعر کی زندگی پر فلم دیکھنا قطعی ضروری نہیں۔ اُس کے باوجود کئی دن تک اُس کا موڈ ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ اس صورتِ حال میں میرے لئے کئی متبادل راستے بھی تھے جن پر میں آسانی سے عمل کر سکتا تھا اور یہ میرا حق بھی تھا، لیکن میں نے اپنا حق استعمال نہیں کیا کیونکہ وعدہ میں نے کیا تھا اور کوئی وعدہ اُس نے نہیں تھا۔ اور ایک موہوم سی اُمید یہ بھی تو تھی کہ شاید کسی دن وہ بھی سمجھ سکے۔ میری رجائیت پسندی نے مجھے ہمیشہ آنے والے دنوں کے انتظار میں خاموش رکھا۔

ایک دن کھڑکی کے پاس بیٹھا میں باہر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جو جگہ پہلے خالی پڑی تھی اب وہاں ایک کارخانہ بن رہا تھا۔ میں سوچنے لگا اب آس پاس کے سب کاشتکار [illegible] لے گا۔ کارخانے اور بنگلے جائیں۔ میرے ذہن میں کہانیاں جنم لے لے کر دم توڑتی رہیں۔ پچھلے دنوں میرا ایک عزیز دوست مر گیا تھا، اُس کی زندگی پر لکھنے کو میرا جی چاہتا تھا۔ جس کی ساری زندگی انقلابی جد و جہد کرتے گزری تھی، سوچ کے بھنور میں پھنسا ہوا جب میں اپنے آپ کو نکالتا تو مجھے محسوس ہوتا کہ وہ جو مر گیا ہے۔ اصل میں زندہ [illegible] ایک مرے ہوئے آدمی کو [illegible] کا بھی کوئی حق نہیں۔ میں نے کھڑکی بند کر دی اور میں واپس چلا آیا۔ جہاں کمرے میں [illegible] لیٹی ہوئی تھی۔ اُس کی بانہوں میں [illegible] جسم کو [illegible] آ گئی۔ مگر نہیں جاگ کر [illegible] کسی نے دروازے پر دستک دی۔ مجھ میں اُٹھنے کی سکت نہیں تھی۔ "جو بھی ہو گا چلا جائے گا۔ دوسری دنیا کے آدمی کو ہماری دنیا میں آنے کا کوئی حق نہیں۔" میں نے کہا اور وہ اُٹھ کر دروازہ کھولنے کے لئے چلی گئی۔

"ڈاکیہ ہے۔ یہ رجسٹری لایا ہے۔" اُس نے کہا اور رجسٹری کو میری طرف پھینک دیا۔ رجسٹری کسی غیر ملک سے آئی تھی۔ اوپر لگے ہوئے ٹکٹوں پر تھوڑا اور نقش بنا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے لفافہ کھولا۔ ایک خط تھا اور اُس کے ساتھ ایک چیک دس ہزار کا۔ جسم کی ہمدردیاں اور جو باتیں اور فاقوں کی جو کہانیاں میں لکھا کرتا تھا اُن میں سے یہ رد عمل پر مشتمل ایک [illegible] کہانی تھی جس کا انگریزی زبان سے براہِ راست مشرقی علوم اور زبان کے شعبہ کی ایک طالبہ نے اپنی علاقائی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ چیک کہانی شائع ہونے پر اعزازیہ کے طور پر بھیجا گیا تھا۔ خط اور چیک میرے ہاتھ سے گر پڑے۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ میرے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ گریبان کو اتنی زور سے پکڑ کر میں نے کھینچا کہ سارے بٹن ٹوٹ گئے اور میں دھڑام سے فرش پر گر پڑا۔ بہت دیر کے بعد جب مجھے ہوش آیا تو میری بیوی مجھے جانے پلا رہی تھی۔ چیک اُس کے ہاتھ میں تھا۔ اُس نے میرے ماتھے سے بالوں کو ہٹاتے ہوئے کہا۔ "ایسی ہی ایک اور کہانی لکھئے نا۔"

●●



مرزا محمود بیگ جیسے عظیم انسان صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہ کسی ایک فرد کا نام نہیں، ایک تہذیب کا نام ہے، ایک زندہ اور تابندہ روایت کا نام ہے۔ وہ مغل نسل تھے۔ اُن کے دادا، دادی نے ۱۸۵۷ء کا غدر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی دلی کا ہر حادثہ، ہر واقعہ اُن کے ذہن پر پوری طرح نقش تھا۔ اُن کی دادی بجائے جن، بھوتوں، شہزادوں، شہزادیوں کی کہانیوں کی بجائے وہ اپنے پوتے کو غدر کی کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔

مرزا محمود بیگ میں مغلوں کی آن بان تھی ——— آواز مہذب ——— لب و لہجہ شگفتہ، زبان شہد میں دُھلی۔ پچھلے سال وہ چلے گئے۔ جیسے گلاب کے پھول سے شبنم، جیسے دریا سے حباب۔ بیگ صاحب نے غدر کی سو سالہ تقریبات کے سلسلہ میں ۱۸۵۷ء کی دلی سے متعلق بہت سے مضامین لکھے تھے جو آل انڈیا ریڈیو سے نشر کئے گئے اور جو نہ صرف اس غدر کی دلی کی عکاسی کرتے ہیں بلکہ دلی کی پیاری زبان کا شاہکار ہیں۔ ان کے یہ مضامین اُردو ادب کا سرمایہ۔ اُردو کی آبرو و شان بن گئے ہیں۔

بیگ صاحب کے ان ہی مضامین کے مجموعے کا نام ہے "دلی ۱۸۵۷ء" جسے آپ پڑھ کر زبان کی چاشنی سے محظوظ ہو سکیں گے اور غدر کے دنوں کی دلی اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں گے۔ قیمت: دس روپے

ملنے کا پتہ: شمع بک ڈپو آصف علی روڈ نئی دہلی

[illegible]

نو سالہ گونگی اور بہری انگلینڈ کی مشہور رقاصہ

انگلینڈ کی نو سالہ ہیلن ڈائزن جو پیدائشی گونگی اور بہری ہے، رقص کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ کلب، ہوٹل اور مختلف مقابلوں میں ہیلن اپنے فن کا وہ مظاہرہ کرتی ہے کہ تماشائی عش عش کر اٹھتے ہیں۔ وہ راک این رال، چاچاچا، ٹوئسٹ، کیبرے اور بیلے رقص کی اتنی سی عمر میں ماہر مانی جاتی ہے۔ انگلینڈ کی کافی رقص گاہوں کے سالانہ مقابلوں میں ہیلن متعدد مرتبہ انعامات جیت چکی ہے۔ ہیلن کو بچپن سے ہی رقص کا شوق تھا۔ اس کے شوق کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے والدین نے اس کو فن میں مہارت حاصل کرنے کی پوری اجازت دے دی۔

نابینا لڑکی اولمپک میں حصہ لے گی!

مغربی جرمنی کی ایک نابینا لڑکی مس شیلبرگ آئندہ اولمپک میں "ہائی جمپ" میں شریک ہونے کے لئے تیاری کر رہی ہے۔ وہ اب تک چھ اور ساڑھے چھ میٹر ہائی جمپ کا شاندار مظاہرہ کر چکی ہے۔ شیلبرگ کو دوڑ کا بھی شوق ہے۔ ملک کے کئی چھوٹے مقابلوں میں کئی ریکارڈ قائم کر چکی ہے۔ اولمپک میں شامل ہونے پر یہ پہلا اتفاق ہوگا کہ ایک اندھے کھلاڑی کو مقابلے میں شامل کیا جائے گا۔ شیلبرگ کی طرح دوسرے نابینا کھلاڑیوں کو بھی تربیت دی جا رہی ہے اور دوسرے مقابلوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کریں گے۔

دل باہر تھا، اندر کر دیا گیا!

تاریخ میں دوسری بار فلاڈلفیا (امریکہ) میں ایک بچے کا نہایت عجیب و غریب آپریشن کیا گیا۔ ایک نوزائیدہ بچے کا دل پیدائش کے وقت اس کے سینے کے باہر چپکا ہوا تھا۔ اس کو فوراً بچوں کے اسپتال میں داخل کیا گیا۔ اسپتال تک کے سفر کے دوران اس کے دل کو گیلے کپڑے سے ڈھک دیا گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے پھیپھڑوں کو الگ کر دیا، آنتوں کو بھی باہر نکال کر رکھ دیا اور دل کو جسم کے اندر رکھنے کے لئے جگہ بنائی۔ پسلیوں کے خم کو روکنے کے لئے لوہے کی سلاخیں لگائی گئیں۔ ڈھائی گھنٹے کے آپریشن کے بعد پیٹ کے چاک کو بند کر دیا گیا۔ بچے کو انجکشن دے کر ایک ہفتے کے لئے سن کر دیا گیا۔ تاکہ وہ حرکت نہ کر سکے اور زخم بھر جائیں۔ بچے کو غذا نلکیوں کے ذریعے دی جا رہی ہے۔ سانس کے لئے بھی مصنوعی پھیپھڑے داخل کئے گئے ہیں۔ ڈاکٹروں کی ٹیم میں ایک خاتون ڈاکٹر بھی شامل ہے، جس نے بچے کے پھیپھڑوں کو آنتوں سے الگ کیا تھا۔

عالمی ٹیبل ٹینس جیتنے والی کمسن لڑکی

برسٹل میں (انگلینڈ) میں چودھویں [illegible]

[illegible]

[illegible] نے اپنے [illegible] حاصل [illegible] ہو کر [illegible] مقابلوں میں [illegible]

چینی کھلاڑی مقابلوں میں کامیاب ہو کر آخر تک فاصل میں پہنچ گئیں۔ کمال کی بات یہ ہے کہ چینگ نے چین کی عالمی شہرت یافتہ [illegible] کھلاڑی چنگ کو بڑی زبردست شکست دے کر [illegible] کی امتیازی ٹرافی حاصل کر لی۔ چین ہمیشہ عورتوں اور مردوں کے [illegible] عالمی مقابلوں میں فتح حاصل کرتا رہا ہے۔ اس بار مردوں کا مقابلہ جاپان کے [illegible] نے جیتا ہے۔

کے لئے مخصوص ہے۔ اس تقریب کی صدارت وزیر تعلیم ڈاکٹر [illegible] چندر نے کی۔ انہوں

کو اس میں جگہ دی گئی ہے۔

بھٹناگر ایوارڈ

ایک خاتون سائنس داں نے بھی حاصل کیا

1975 کے بھٹناگر ایوارڈ جن مشہور سائنس دانوں کو دئے گئے ہیں، ان میں ایک خوش نصیب خاتون بھی شامل ہیں۔ [illegible] میں [illegible] سائنس کی [illegible] کو بھٹناگر ایوارڈ ان کی سائنسی خدمات کے لئے دیا گیا ہے۔ [illegible] میں [illegible] [illegible] [illegible] ہندوستان کی [illegible] [illegible] [illegible]

خواتین کی ڈائرکٹری کا اجرا

خواتین کی کون کیا ہے؟

راشٹرپتی بھون کی ایک تقریب میں [illegible] صدر جناب [illegible] نے اس ڈائرکٹری کا اجرا کیا۔ یہ صرف خواتین کے تعارف [illegible]

کے لئے انڈین وومن [illegible] "ڈائرکٹری" صدر جمہوریہ ہند کو [illegible] کی۔ اس کتاب میں [illegible] زیادہ عورتوں کا ذکر ہے جنہوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں [illegible] حاصل کیا ہے۔ [illegible] ڈاکٹر، سائنس داں، [illegible] سماجی کارکن [illegible] خواتین تک

[illegible]

گھونگھریلے بال کیسے بنائے جائیں؟

بیوٹی کالج

گھونگھریلے بال گھر میں بھی بنائے جا سکتے ہیں۔ ان بالوں کے متعلق سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ بال ہر چہرے پر اچھے نہیں لگتے۔ سب سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ یہ بال دھونے کے بعد کیسے لگتے ہیں۔ اصل چیز بالوں کی سیٹنگ ہے، اگر بال صحیح طور پر سیٹ ہو جائیں تو گھونگھر اچھے لگتے ہیں۔ اگر آپ نے سیلون میں بال بنوائے اور آپ کے چہرے پر یہ بال اچھے نہیں لگے تو آپ کو افسوس ہوگا اس لئے بہتر یہ ہے کہ پہلے گھر پر آزمائش کریں اگر گھر پر بال بنانے میں قباحت ہو، یا بال بننے کے بعد اچھے نہ لگتے ہوں تو یہ ممکن ہے کہ پرم میں کوئی خرابی نہ ہو (پرم انگریزی میں گھونگھر کو کہتے ہیں یہ ان آلات کا نام ہے جو بالوں میں گھونگھر ڈالتے ہیں) بلکہ خرابی اسٹائیل اور سیٹنگ میں ہو۔ اگر اسٹائیل اور سیٹنگ موزوں نہیں تو گھونگھر خوش نما نہیں لگتے۔ اگر پرم بناتے وقت بال گیلے رہ جائیں یا بالوں کی حفاظت نہ کی جائے تو پھر وہ ضرورت سے زیادہ خم دار ہو جاتے ہیں یعنی ان کی لہریں تنگ ہو جاتی ہیں اور گھونگھر چھوٹے ہو جاتے ہیں۔ پرم کرنے کے لئے برسات اور سپت جھڑ کا زمانہ اچھا نہیں اگر آپ سیلون میں پرم کرانے کا ارادہ رکھتی ہیں تو بہتر یہ ہے کہ پرم کرانے سے پہلے اپنے بالوں کے متعلق سیلون والوں کو سب کچھ بتا دیں، مثلاً کن چیزوں سے آپ کے بالوں میں نقصان پہنچتا ہے اور پرم کرانے سے پہلے آپ نے بالوں کے لئے کیا کیا چیزیں استعمال کر چکی ہیں اس سے سیلون والوں کا کام آسان ہو جاتا ہے۔



شہناز حسین
۹۲-۱۱ گریٹر کیلاش، نئی دہلی۔۔ فون نمبر ۶۱۱۶۴۴۳

بہتر یہ ہے کہ آپ اپنے سارے بالوں کو پرم کرانے سے پہلے تھوڑے سے بالوں کو پرم کیجئے۔ اس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ گھونگھر آپ پر اچھے لگتے ہیں یا نہیں۔ بال ایک دفعہ پرم ہو جائیں تو مہینوں چلتے ہیں پھر ان کو سیدھا کرنا مشکل ہے۔ اس لئے بالوں کو گھونگھریالے بنانے میں جلدی نہ کیجئے۔

جب آپ گھر میں گھونگھر بنانے کا فیصلہ کریں تو بہت تنگ پرم استعمال نہ کریں اور نہ بالوں کو سختی سے پرم کریں۔ اس طرح آپ کے لئے کوئی کفایت نہیں ہوتی بلکہ الٹے بال خراب ہو جاتے ہیں۔ ہلکا پرم لہریں پیدا کرتا ہے۔ ان بالوں میں آسانی سے کنگھا کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ کے بال سفید ہیں اور آپ ہیئر ڈائی استعمال کرتی ہیں تو ہیئر ڈائی لگانے کے فوراً بعد بالوں کو کرل نہ کرائیں۔ سامنے کے بالوں کو کرلنگ بنانے کے لئے آپ آئینہ کا استعمال کر سکتی ہیں۔ لیکن پیچھے کے بالوں کے لئے کسی کی مدد لینا ضروری ہے۔

اب ہم آپ کو گھر پر بالوں کو گھونگھریالے بنانے کی ترکیب بتلاتے ہیں۔ پہلے بالوں کو شامپو سے دھوئیں۔ شامپو خواہ خشک ہو یا روغنی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ شامپو کرنے کے بعد بالوں کو خوب خشک کر لیں۔ اب ان خشک بالوں میں ویونگ لوشن لگائیں۔ یہ ویونگ لوشن بالوں کی جڑوں تک پہنچنا چاہئے۔ لمبے بالوں کی اوپری سطح پر لگانا کافی نہیں۔ بالوں کو کوپن میں لپیٹ کر جڑوں تک لے جائیں بالوں کی موٹائی چوتھائی انچ ہونی چاہئے۔ بالوں کو لپیٹ کر ہیئر گرپ سے گردن کے نچلے حصے پر روک لیں۔ کوشش کریں کہ سارے بال کوپن میں آجائیں۔

جب سارے بال کرل میں لگ جائیں تو ہر کرل کو ویونگ لوشن سے بھگو لیں۔ اب ۴۵ منٹ سے ایک گھنٹہ تک انتظار کریں۔ اس کے بعد نیوٹرالائزر سے بالوں کو دھوئیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے نیوٹرالائزر پاؤڈر ایک پیالے میں ڈال لیں۔ بازار میں ویونگ لوشن اور نیوٹرالائزر عام ملتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں ایک ہی پیکٹ میں ہوتی ہیں۔ ویلوسٹی سوپر نام کا ویونگ لوشن مقابلتاً اچھا ہے ویونگ لوشن ایک شیشی میں تیار ملتا ہے۔ یہ سیدھا شیشی سے لگایا جا سکتا ہے۔ نیوٹرالائزر پاؤڈر کی شکل میں

ہوتا ہے۔ ویوئنگ لوشن لگا کر ایک گھنٹہ انتظار کریں اور پھر نیوٹرالائی زر کا استعمال کریں۔ اس کو استعمال کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدھا پاؤڈر گرم پانی کے پیالے میں ڈال دیں۔ اس میں ایک روئی کا ٹکڑا بھگو کر اس ٹکڑے سے بالوں کو تھپتھپائیں۔ پانچ منٹ انتظار کریں۔ نیوٹرالائی زر استعمال کرتے وقت اس بات کا دھیان رکھیں کہ یہ آنکھوں میں نہ جائے، ورنہ آنکھوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ پانچ منٹ انتظار کرنے کے بعد باقی پاؤڈر بھی تازہ گرم پانی میں بھگو لیں اور اس محلول کو بالوں سے گذاریں۔ جب بال خشک ہو جائیں تو آہستگی سے کرل کھول ڈالیں اور برش سے گھونگھر سیٹ کر لیں۔ اس وقت بالوں کی سیٹنگ آپ کے ہاتھ میں ہے، جس طرح چاہیں سیٹ کر لیں اس کے لئے دو تین کنگھے پاس رکھیں۔ ایک کنگھے سے بالوں کو روک کر دوسرے کنگھے سے بال سیٹ کر سکتی ہیں — بالوں میں گھونگھر ڈالنے کے لئے نیوٹرالائی زر سب سے ضروری چیز ہے۔ اس سے گھونگھر مستقل ہو جاتا ہے۔ بغیر نیوٹرالائی زر کے گھونگھر نہیں بن سکتے۔

بالوں کو کرل کرتے وقت اس بات کا دھیان رکھیں کہ سامنے کے بالوں میں بڑے کرل ڈالیں۔ یہ بال جلد کرل ہو جاتے ہیں۔ پیچھے کے بالوں کو ذرا تنگ کرل کریں — ویوئنگ لوشن سے ماتھے کو بچانے کے لئے تھوڑی سی روئی کرلر کے نیچے رکھ لیں۔ نیوٹرالائی زر کے استعمال کے وقت بھی روئی کرلر کے نیچے رکھیں، مگر یہ دھیان رہے کہ یہ روئی بالوں کو نہ لگے۔ اگر بالوں کے سرے خراب ہیں تو انہیں ذرا سا کاٹ لیں۔ نیوٹرالائی زر لگانے کے بعد شیمپو کرنا ضروری ہے۔ اگر شیمپو میں انڈا شامل ہو تو بہتر ہے۔ انڈے کا شیمپو بازار میں عام ملتا ہے۔

بالوں کو کرل کرتے وقت آپ کو یہ اندازہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کے بال صحیح کرل ہو رہے ہیں اس لئے پھر پندرہ منٹ کے بعد صرف ایک کرل کھول کر دیکھیں اور فوراً بند کر دیں۔ اس کے بعد دوسرا کرل کھول کر دیکھیں۔ اس طرح آپ کو آئندہ کے لئے تجربہ حاصل ہو جائے گا کہ اب کرل کو کتنا تنگ رکھ سکتی ہیں

اگر بدقسمتی سے کرل خراب ہو گیا ہے اور آپ کی حسب منشا گھونگھر نہیں بنے تو دوبارہ ہرگز بالوں کو پرم نہ کریں، ورنہ بال مرجھا جائیں گے اور روکھے ہو جائیں گے۔ دوبارہ کرلنگ کے لئے نئے بال نکلنے کا انتظار کریں۔ صرف وہی بال کرل کرنے چاہئیں جو پہلے سے کرل کئے ہوئے نہ ہوں اس کے علاوہ اگر آپ کے بال پہلے ہی کرل کئے ہوئے ہیں تو ان کو کرل نہ کریں صرف سیدھے بال کرل کرنے چاہئیں اگر آپ نے نئے بالوں کے نکلنے کا انتظار نہ کیا تو نئے بال سیدھے نکلیں گے اور پرانے بال گھونگھر یالے ہوں گے — اس طرح بال ناموزوں معلوم ہوں گے۔ کرلر کو بالوں کے سروں سے اچھی طرح لگا کر رکھیں کہ نئے بال بھی خم لے کر پیدا ہوں۔

اگر آپ بالوں میں گھونگھر ڈالنے کے جھنجھٹ سے بچنا چاہتی ہیں اور صرف اپنے بالوں کو سیٹ کرنا چاہتی ہیں تو اس کے لئے یہ ترکیب ہے، بالوں کو خوب اچھی طرح دھو لیں۔ خشک ہو جانے پر ان میں کنگھی کریں اور ویوئنگ لوشن لگائیں۔ یہ لوشن بالوں میں لہریں پیدا کر دے گا۔ اس کے لئے آپ کی انگلیاں ہی کافی ہیں۔ ایک انگلی کو بالوں کے نیچے لے جا کر ذرا اوپر اٹھائیں اور بالوں پر ویوئنگ لوشن لگائیں یا انگلی کو بالوں کے نیچے رکھ کر بالوں میں کنگھی کریں۔ اگر آپ بیک کومبنگ کرنا چاہتی ہیں یعنی الٹی کنگھی پھیرنا چاہتی ہیں تو الٹی کنگھی پھیر کر ویوئنگ لوشن لگائیں۔ اس طرح بال سیٹ ہو جائیں گے اور ان میں حسب منشا لہریں پیدا ہو جائیں گی۔

بالوں کو کرلنگ بنانے کے لئے اس بات کا دھیان رکھیں کہ لمبے بالوں کے لئے بڑے رولر استعمال کئے جاتے ہیں اور چھوٹے بالوں کے لئے چھوٹے رولر۔

سوال وجواب

نورجہاں بیگم، مظفرپور

س : رنگ گورا کرنے کی کوئی ترکیب بتایئے۔

ج : مونگ کو رات بھر کے لئے دودھ میں بھگو دیں۔ صبح کو مونگ پھیلا کر خشک کر لیں پھر اسے پیس کر اس کا آٹا بنا کر رکھ لیں اور اس میں دودھ ملا کر لیپ بنا لیا کریں اور صابن کے بجائے چہرے کو مونگ کے لیپ سے دھوئیں۔ فوراً پانی بہانے کی بجائے اگر چند منٹ لیپ لگا رہنے دیں تو بہت مفید ہوگا۔

شہلا ذکی، نہٹور

س : میری ٹھوڑی کا گوشت لٹک گیا ہے

جس سے چہرہ بھدا لگتا ہے۔ کوئی علاج بتائیے۔

ج : تھوڑی تھوڑی دیر بعد ٹھوڑی پر ہاتھ سے چٹکیاں بھرتی رہیں۔ یہ بہترین ورزش ہے۔ اس سے لٹکی ہوئی ٹھوڑی اپنی جگہ واپس چلی جائے گی۔

بیگم شبیر علی، دھنباد

س : میرے چہرے پر چھائیاں ہو گئی ہیں انہیں کیسے دور کیا جائے۔؟

ج : آپ لیموں کا زیادہ سے زیادہ استعمال کریں۔

شہاب عالم، گریڈیہہ

س : بال جلدی کیوں سفید ہو جاتے ہیں؟

ج : اس کی کئی وجہیں ہیں۔ رات کو دیر تک جاگنا، ہر وقت ذہنی تناؤ میں مبتلا رہنا یا ہر وقت نزلہ کا رہنا۔ ان میں سے کوئی وجہ ہو سکتی ہے۔

س : بالوں کو تندرست رکھنے کے لئے کھانے پینے میں کس چیز کا استعمال زیادہ کرنا چاہیئے؟

ج : دودھ، دہی اور سبزیوں کا استعمال زیادہ کرنا چاہیئے، ان چیزوں سے بال صحت مند رہتے ہیں۔

رشیما، بنگلور

س : میں بہت موٹی ہوں جب کہ میری عمر صرف ۲۵ سال ہے۔

ج : لیموں کا رس ملا کر پئیں۔ کھانے میں ابلی ہوئی سبزیاں اور سلاد کھائیں شام کو ایک گلاس پانی میں لیموں کا رس ملا کر پئیں۔ رات کے کھانے میں سبزیاں لیں۔ اگر ابلی ہوئی سبزی ناپسند ہوں تو پودینے کی چٹنی میں املی ملا کر سبزیوں کے ساتھ کھائیں۔ صبح اور شام کو چہل قدمی کریں۔

رعنا ابراہیم، کلکتہ

س : میں اپنی پلکوں کو بڑھانے کے لئے کبھی کبھار تراشتی رہتی ہوں، مگر میری پلکیں نہیں بڑھتیں۔

ج : آپ اپنی پلکوں کو ہرگز نہ تراشیں، کیوں کہ کسی کسی کی ہی پلکیں بڑھتی ہوں گی ورنہ بال تراشنے کے بعد پلکیں نہیں بڑھتیں۔ آپ پلکوں پر کیسٹر آئل لگایا کریں۔

ایم اے پروین، سہرسا

س : میری بھنویں بہت گھنی ہیں موچنے سے نوچنے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔

ج : آپ بال نوچنے سے پہلے ایک روئی کا ٹکڑا تیز گرم پانی میں بھگو کر ہلکا سا نچوڑ کر بھنوؤں پر رکھ لیں۔ پانچ منٹ بعد ہٹا کر پھر بال موچنے سے اکھیڑیں اس طرح تکلیف بھی نہیں ہوگی، اور بال جلدی اکھڑ جائیں گے۔

زہرہ خاتون، دہلی

س : مجھے قبض کی شکایت رہتی ہے جس کی وجہ سے میرے چہرے پر دلکشی نہیں رہتی۔

ج : آپ ایک بڑا چمچہ گلقند سوتے ہوئے کھائیں اور اس کے فوراً ہی بعد ایک گلاس گرم دودھ پئیں۔ جب تک قبض کی شکایت دور نہ ہو جائے یہ عمل برابر کرتی رہیں۔

رئیسہ بیگم، کانپور

س : میری پلکیں براؤن ہیں، میں ان کو کالی کرنا چاہتی ہوں۔

ج : آپ پلکوں کو کالا کرنے کے لئے ویسلین کا استعمال کریں۔ پلکوں پر ویسلین لگانے سے پلکیں کالی ہو جاتی ہیں۔

رعنا، ہاتھرس

س : ڈھیلے پیٹ کو کسنے کے لئے کوئی ورزش بتائیے لیکن ورزش آسان ہو۔

ج : پیٹ کو اتنا اندر کریں کہ ایسا معلوم ہو کہ آپ کمر سے لگانا چاہتی ہیں پیٹ اندر کرتے وقت سانس اندر کی طرف کھینچئے، چند سیکنڈ پیٹ کو اور سانس کو روکے رکھیں، پھر چھوڑ دیں۔ اس طرح کم سے کم پانچ بار صبح شام ضرور کریں پھر آہستہ آہستہ بڑھاتی رہیں۔

محمد سلیم راہی، غازی آباد

س : مجھے مستقل نزلہ رہتا ہے کوئی گھریلو علاج بتائیں۔ میں نے بہت علاج کئے مگر فائدہ نہیں ہوا۔

ج : نزلہ عام طور سے رونے کی علامت ہے، ڈاکٹر اسے نفسیاتی بیماری کہتے ہیں۔ پھر بھی ایک ترکیب لکھ رہی ہوں۔ دو چمچے آٹے کی بھوسی پانی میں ڈال کر نتھار لیں تاکہ آٹا نیچے بیٹھ جائے اب ڈیڑھ پیالی پانی میں ذرا سی نمک کی چٹکی ڈال کر ہلکی آنچ پر پکائیں جب ایک پیالی پانی رہ جائے تو پی لیں۔ روزانہ صبح شام اسی طرح بھوسی پکا کر پئیں۔

●●



باورچی خانہ

مزے دار اور آزمودہ پکوان

آزمائش اور ترتیب: رشیدہ خاتون

لذیذ مرغی

مرغی (چھوٹا سائز)	ایک عدد
لال مرچ	آدھا چائے کا چمچ
ادرک	ایک چائے کا چمچ
لہسن	ایک چائے کا چمچ
پیاز	۲ ڈلی
نارنجی رنگ (کھانے کا)	آدھا چائے کا چمچ
گھی	ایک ٹیبل اسپون
نمک	حسبِ ذائقہ

پیاز چھیل کر لچھے کاٹ لیں۔ مرغی کو اچھی طرح دھو کر درمیانے سائز کے ٹکڑے کر لیں۔ ایک پیالی پانی میں لال مرچ، ادرک، لہسن، رنگ اور نمک ملا لیں۔ اب ایک دیگچی میں یہ سب چیزیں، مرغی کے ٹکڑے اور گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ مرغی گل جائے اور پانی خشک ہو جائے تو خوب اچھی طرح بھون کر آنچ سے اتار لیں۔ ڈش میں رکھ کر ان پر پہلے مسالہ چھڑک دیں پھر اس پر پیاز کے لچھے ڈال دیں۔ مسالے کی ترکیب حسب ذیل ہے:

مسالہ

لال مرچ	ایک چائے کا چمچ
کشنائی	۲ چائے کے چمچے
کالی مرچ	ایک چائے کا چمچ
سفید زیرہ	۲ چائے کے چمچے
نمک	۲ چائے کے چمچے

سب کو ملا کر باریک پیس لیں۔ فرح، دہلی

لوکی کی کھیر

لوکی	۲۵۰ گرام
کھویا	۱۵۰ گرام
دودھ	۲ پیالی
چینی	ایک پیالی
پستہ	۱۰ عدد
بادام	۶ عدد
زعفران	پاؤ چائے کا چمچ

لوکی کو چھیل لیں۔ پستے اور باداموں کو کچھ دیر کے لئے گرم پانی میں بھگو دیں، پھر چھلکے اتار کر موٹا موٹا کاٹ لیں۔ زعفران کو کچھ دیر کے لئے ایک ٹیبل اسپون دودھ میں بھگو دیں، پھر کھرل میں پیس لیں۔ کھوئے کو توڑ کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر لیں۔

اب ایک دیگچی میں لوکی اور ایک پیالی پانی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ لوکی گل جائے تو چھلنی میں ڈال کر پانی نکال دیں۔ پھر لوکی کو دوبارہ دیگچی میں ڈال دیں۔ دودھ اور کھویا بھی ڈال دیں۔ چمچہ برابر چلاتی رہیں۔ دودھ خشک ہو جائے تو اسے دال گھوٹنی سے گھوٹ لیں۔ پھر اس میں چینی بھی شامل کر دیں۔ مزید پانچ دس منٹ پکا کر آنچ سے اتار لیں۔ ڈش میں نکالنے کے بعد پستے اور بادام کی ہوائیاں چھڑک دیں۔ شمیم بیگم، مظفر نگر

آلو کی چٹپٹی بھاجی

آلو (ایک سائز کے چھوٹے)	۵۰۰ گرام
لال مرچ	آٹھ عدد
دھنیا (ثابت)	ڈیڑھ ٹیبل اسپون
سفید زیرہ (ثابت)	ڈیڑھ چائے کا چمچ
لہسن	ایک چائے کا چمچ
ادرک	۲ چائے کے چمچے
املی (بغیر بیجوں کی)	پاؤ پیالی
ہرے دھنئے کی پتیاں	پاؤ پیالی
گھی	۳/۴ پیالی
نمک	حسب ذائقہ

آلوؤں کو دھو کر ابال لیں اور چھیل کر رکھ لیں۔ املی کو دھو کر ایک پیالی پانی میں بھگو دیں اور ایک گھنٹے کے لئے رکھ دیں پھر ہاتھ سے مل کر چھلنی میں چھان لیں۔ گودا رکھ لیں، پھوک پھینک دیں۔

دھنئے، زیرے اور لال مرچ کو سوکھی سل پر موٹا موٹا پیس لیں۔ پودینے کی پتیوں کو باریک باریک کاٹ لیں۔

اب ایک دیگچی میں گھی اور تمام سوکھے مسالے نمک اور پاؤ پیالی پانی ڈال کر مسالہ بھون لیں۔ پھر آلو ڈال دیں۔ دو چار منٹ بھون کر املی کا گودا ڈال دیں۔ املی کا پانی پاؤ پیالی رہ جائے تو ہرے دھنئے اور پودینے کی پتیاں ڈال دیں اور مزید دو چار منٹ پکا کر آنچ سے اتار لیں۔ آمنہ خاتون، بنگلور

کچے آم کی کڑھی

آم (کچے)	ایک کلو
چینی	۲۵۰ گرام
لال مرچ	ایک چائے کا چمچ

گرم مسالہ — آدھا چائے کا چمچ
ہینگ — پاؤ چائے کا چمچ
کالا نمک — ایک چھوٹی چٹکی
زیرہ — ایک چائے کا چمچ
ہرے دھنیے کی پتیاں — ایک ٹیبل اسپون
گھی یا تیل — حسب ضرورت
نمک — حسب ذائقہ

آموں کو گرم بھوبل میں دبا دیں۔ آم گل جائیں تو اُن کو بھوبل سے نکال کر دھولیں پھر ہاتھ سے گھلا کر اُن کا رس نکال لیں۔

بیسن میں آدھی لال مرچیں، آدھا کالا نمک، پاؤ چائے کا چمچ زیرہ نمک اور ایک پیالی آم کا رس ڈال کر خوب اچھی طرح پھینٹ لیں۔ بیسن اگر پھلکیوں کے بیسن سے گاڑھا معلوم ہو تو تھوڑا سا پانی ملا لیں۔ اب ایک کڑھائی میں گھی یا تیل ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ گھی یا تیل گرم ہو جائے تو اس میں بیسن کی چھوٹی چھوٹی پھلکیاں تل لیں۔

کڑھائی میں پاؤ پیالی گھی یا تیل چھوڑ دیں، باقی نکال لیں۔ پھر اس میں زیرہ ڈال دیں۔ زیرہ بادامی ہو جائے تو آم کا رس اور تمام مسالے، نمک اور آدھی پیالی پانی ڈال دیں۔ اگر آم زیادہ ترش ہوں تو اس میں ایک چائے کا چمچ چینی ملا لیں پانچ سات منٹ پکا کر آنچ سے اتار لیں۔ ڈش میں نکالتے وقت پہلے پھلکیاں رکھیں، پھر ان پر آموں کا پکا ہوا رس ڈال دیں۔ کماری لتا پاٹھک، امرتسر

تکے

گوشت — ۵۰۰ گرام
کچا پپیتہ — ۲ انچ کا ٹکڑا
ادرک — ڈیڑھ انچ کا ٹکڑا
لال مرچ — ایک چائے کا چمچ
پیاز — ۳ ڈلی
کالی مرچ — ایک چائے کا چمچ
سفید زیرہ — ایک چائے کا چمچ
دارچینی — ایک انچ کا ٹکڑا
دہی — پاؤ پیالی
گھی — پاؤ پیالی
نمک — حسب ذائقہ

ران کے گوشت کے ایک انچ موٹے، ایک انچ چوڑے ٹکڑے کرالیں۔ پھر انھیں دھو کر کپڑے میں خشک کر لیں۔ پپیتے اور ادرک کو چھیل کر سل پر نمک ملا کر باریک پیس لیں پھر اس کو ٹکڑوں پر خوب اچھی طرح مل کر ڈیڑھ دو گھنٹے کے لئے رکھ دیں۔ پیاز کو چھیل کر سل پر پیس لیں۔ زیرہ، کالی مرچ، لال مرچ اور دارچینی کو بھی تھوڑا سا پانی ملا کر سل پر پیس لیں اور پسی ہوئی پیاز میں ملا کر گوشت کے ٹکڑوں پر اچھی طرح مل دیں۔ دہی پھینٹ کر اس میں گھی کو پگھلا کر ملا دیں اور اسے بھی ٹکڑوں پر خوب اچھی طرح مل دیں پھر ٹکڑوں کو سیخوں میں پرو کر دھیمی آنچ پر تھوڑی تھوڑی دیر سب طرف سے سینک لیں۔ جب اچھی طرح سنک جائیں تو انھیں پیاز کے لچھے ڈال کر چٹنی کے ساتھ کھائیں۔ جہاں آرا، کلکتہ

ملی جلی سبزیوں کا سرکہ والا اچار

گاجر — ۵۰۰ گرام
شلجم — ۵۰۰ گرام
مولی (درمیانہ سائز) — ۲ عدد
کھیرا (درمیانہ سائز) — ۲ عدد
لال مرچ — ۲ ٹیبل اسپون
ہلدی — ایک چائے کا چمچ
گرم مسالہ — ۲ چائے کے چمچے
سفید سرکہ — ۲ لیٹر
نمک — حسب ذائقہ

سب ترکاریوں کو خوب اچھی طرح دھو کر چھیل لیں۔ کھیروں کی کڑواہٹ نکال لیں گاجر اور شلجم کے گول گول قتلے کاٹ لیں۔ کھیرے اور مولی کے لمبائی کے رخ سے چار چار ٹکڑے کریں پھر ان چاروں ٹکڑوں کے چار چار ٹکڑے کر لیں۔ اب کسی صاف اور خشک مرتبان میں سرکہ تمام مسالے، نمک اور تمام سبزیاں ڈال دیں آٹھ دس دن دھوپ دکھانے کے بعد کھائیں۔ مس تنویر خاں، بمبئی

ہری مرچ تلی ہوئی

ہری مرچ — ۱۲۵ گرام
دھنیا (ثابت) — ایک ٹیبل اسپون
سونف (ثابت) — ایک ٹیبل اسپون
سفید زیرہ (ثابت) — ۲ چائے کے چمچے
کھٹائی — ایک چائے کا چمچ
لیمو — ایک عدد
گھی — پاؤ پیالی
نمک — حسب ذائقہ

ہری مرچوں کو دھو کر کسی صاف کپڑے سے خشک کر لیں پھر ڈنڈیاں کاٹ کر پھینک دیں۔ اور لمبائی کے رخ شگاف ڈال دیں۔

دھنیا، سونف اور زیرہ کو بغیر گھی کے کڑھائی میں ہلکا سا بھون کر سل پر پیس لیں اب کڑھائی میں گھی اور ہری مرچیں ڈال کر آنچ پر رکھ دیں مرچیں بادامی ہو جائیں تو تمام مسالے ڈال دیں اور ایک دو منٹ بھون کر آنچ سے اتار لیں پھر ان پر لیموں کا عرق نچوڑ دیں۔

بزم بانو

اس عنوان کے تحت دلچسپ معلوماتی اور مذہبی سوالوں کے جواب دئے جاتے ہیں۔ ایک کاغذ پر یا پوسٹ کارڈ پر زیادہ سے زیادہ تین سوال لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کے لئے جگہ چھوڑیئے اور اپنا پورا نام پتہ لکھئے جس کاغذ یا کارڈ پر سوالات ہوں اس پر دفتر سے متعلق اور کوئی بات نہ لکھئے۔ اپنے سوالات اس پتہ پر بھیجئے: بزم بانو

ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی نمبر ۲

—— مدیرہ

شبیر احمد گدی۔ چکرد ھرپور

س : شادی اپنی پسند سے کرنی چاہئے یا والدین کی پسند سے؟

ج : ۲۵ برس سے پہلے والدین کی مرضی سے اور اس کے بعد اپنی مرضی سے۔

سید عمر، قلعہ گولکنڈہ، حیدرآباد

س : عورت جب تک بہو ہی رہتی ہے کہتی ہے اُسے ساس اچھی نہیں ملی اور جب خود ساس بنتی ہے تو کہتی ہے اسے بہو اچھی نہیں ملی۔ آخر یہ تضاد کیوں؟

ج : عورت میں بدلہ کی خواہش مرد سے کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ وہ بہو پر ظلم کو اس لئے روا سمجھتی ہے کہ خود اس پر ظلم کو روا سمجھا گیا۔ وہ بیٹے کی توجہ بٹ جانے سے بھی خائف ہوتی ہے اور بہو کو اس کا ذمہ دار سمجھتی ہے۔

نورجہاں بیگم، دھنباد

س : آدمی سہارا کب ڈھونڈتا ہے؟

ج : جب اسے اپنے آپ پر اعتماد نہ ہو۔

کریم پروین، پلی سرائے، مظفرپور

س : کیا محبت کرنا گناہ ہے؟ اور جرم بھی؟

ج : محبت ہوس میں بدل جائے تو گناہ بھی ہے اور جرم بھی۔

محمد سلیم خاموش، ہزاری باغ

س : کسی سے وفا کی اُمید کب کی جا سکتی ہے؟

ج : جب ہم خود کو وفا کے قابل سمجھیں۔

مس عشرت بیگم، غازی آباد

س : خیرات کرنے میں عورت زیادہ رحم دل ہوتی ہے یا مرد؟

ج : عورت۔ لیکن ذرائع کی کمی کی وجہ سے اس کی رحم دلی بروئے کار نہیں آتی مرد کے ذرائع اس کی رحم دلی کو شہرت عطا کرتے ہیں۔

عظیمہ، دھنباد

س : [illegible] ہوتے دل اور ٹوٹے ہوئے ستاروں میں کیا فرق ہوتا ہے؟

ج : ٹوٹے ہوئے دل جڑ سکتے ہیں۔ ستارے نہیں۔

رفیق الرحمٰن، گلبرگہ

س : دولت مند لڑکی بدصورت ہو کر خوب صورتی کا ناٹک کیوں کرتی ہے؟

ج : خوب صورتی ذوق کا معاملہ ہے ممکن ہو جسے آپ بدصورت سمجھتے ہوں اسے دوسرے لوگ خوب صورت کہتے ہوں۔ اپنے آپ کو خوب صورت سمجھنا ہر عورت کا پیدائشی حق ہے۔ اس میں غریب اور دولت مند کی قید نہیں۔

یاسمین سلطانہ، پروین سلطانہ، گنتور

س : سب سے قیمتی چیز، سب سے میٹھی چیز کون سی ہوتی ہے؟

ج : سب سے قیمتی چیز دوستی اور سب سے میٹھی زبان کی شیرینی۔

میر ممتاز علی شاکر، کریم نگر

س : چھت سے گرنے پر ہڈی ٹوٹ جاتی ہے تو نظروں سے گرنے پر کیا ہوتا ہے؟

ج : دل ٹوٹ جاتا ہے۔ لیکن دونوں چیزیں دوبارہ جُڑ سکتی ہیں۔

احسان المظفر، اروَل، گیا

س : احسان کا بدلہ کیسے چکایا جا سکتا ہے؟

ج : احسان کر کے۔ لیکن احسان کرنے والے کے لئے بدلہ کی خواہش کرنا غلط ہے۔ نیکی کر کے کنویں میں ڈال دینا بہتر ہے۔

اقبال حسین، چھپرہ، بہار

س : کیسے لوگ نظر سے گر جاتے ہیں؟

ج : جو خود اپنی نظر سے گر گئے ہوں۔

شہلا ذکی، شہلا صمد، نہٹور

س : خوش گوار زندگی کا راز کیا ہے؟

ج : آنے والے زمانے کے متعلق خوش آئند خواب دیکھنا۔ حال سے ناخوش نہ ہونا۔

فیاض قریشی، ناظمہ سلطانہ، واسع پور

س : زیادہ تر لوگ اپنی بدنصیبی کو روتے ہیں؟

ج : جو لوگ اپنی بدنصیبی کو روتے ہیں انہیں رونا پسند ہوتا ہے۔ اس لئے بدنصیبی ان کی مدد کرتی ہے۔ بلکہ وہ بدنصیبی کو دعوت دیتے ہیں۔

ایس، ایم، گائیڈ، اناؤ

س : انسان اپنا وعدہ کب بھول جاتا ہے؟

ج : جب وہ بے سوچے سمجھے وعدہ کرے۔

کلام احمد آرزو، ہزاری باغ

س : عورت، ناگن اور تلوار میں سب سے خطرناک کون سی شے ہے؟

ج : یہ تینوں چیزیں بے ضرر ہیں جب تک کہ ان کو چھیڑا نہ جائے۔

سہیل توحید، سہسرام،

س : دوست، دوست سے کب کترانے لگتا ہے؟

ج : جب وہ اس سے قرض طلب کرے۔

شگفتہ شیریں، آصفہ ہمایوں، رمضا پور

س : کیا یہ درست ہے کہ دل میں جو سپنے دیکھے جاتے ہیں وہ سچے ہوتے ہیں؟

ج : سپنے دل میں نہیں دماغ میں دیکھے جاتے ہیں جو بات حقیقت بنتے بنتے رہ گئی وہی سپنا بن جاتی ہے۔

دلشاد، میرٹھ

س : دل کے ویرانے میں اگر پیار کے پھول نہ کھل سکیں تو؟

ج : اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔

مس سلطانہ نسرین نعمانی، چھپرہ

س : انسان کی سب سے بڑی کمزوری؟

ج : لالچ جس کی کوئی انتہا نہیں۔

اسرار احمد اشک، گریڈیہہ

س : دوسروں کے دکھوں پر خوش ہونے والا انسان آپ کی نظر میں؟

ج : جب ہم کسی سے نفرت کرتے ہیں تو اس کی تکلیف کر دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ ایسا انسان اپنے آپ سے بھی نفرت کرتا ہے۔

محمد مصطفےٰ، روڑکی

س : کیا شرم وحیا عورت کی زینت ہے؟

ج : شرم اور حیا کے لئے عورت کی تخصیص کیوں ہے۔ کیا اس سے یہ سمجھ لیا جائے کہ مرد ان سے بے نیاز ہیں۔

تبسم جہاں، گنگوہ

س : غرور کیا دیتا ہے؟

ج : دوستوں کا قحط۔

راشدہ کاظمی، دہلی

س : اپنی تعریف کون کرتا ہے؟

ج : جس کی کوئی تعریف نہ کرے۔

نواب اصغر علی، دھنباد بازار

س : آدمی اپنا ایمان کب فروخت کرتا ہے؟

ج : شریف آدمی مجبوری کے وقت۔ غیر شریف لالچ کے اثر سے۔

مسرت جہاں، مرادآباد

س : بیوی شوہر سے کب ڈرتی ہے؟

ج : جب وہ مسکرانا چھوڑ دے۔

شکیلہ امیر، پریم نگر، مہاراشٹر

س : بے کسی حد سے تجاوز کر جائے تو؟

ج : بے کسی کی انتہا کام یابی کی ابتدا ہے۔

یاسمین سلطانہ، دیوبند

س : وقت کی قیمت کب اور کس کو محسوس ہوتی ہے؟

ج : وقت کی قیمت وقت نکل جانے کے بعد محسوس ہوتی ہے۔ کوئی بڑا کام شروع کرنے پر بھی وقت کی اہمیت محسوس ہوتی ہے۔

انجم الٰہی، کلکتہ

س : زندگی میں اندھیرے ہی اندھیرے ہوں تو کیا کرنا چاہئے؟

ج : امیدوں کے چراغ جلانے چاہئیں خواہ ان کے پورا ہونے کی کوئی امید نہ ہو۔

محمد اصغر علی، شوکت علی، دھرم پور

س : انسان محبت میں دھوکا کب کھاتا ہے؟

ج : جب وہ اپنی محبت کے سہارے ایسے محل بنائے جن کی کوئی بنیاد نہیں حقیقت کی ایک ہی چوٹ سے یہ محل دھڑام سے گر جاتے ہیں۔ انسان اپنی کوتاہ فہمی کو دھوکا سمجھتا ہے۔

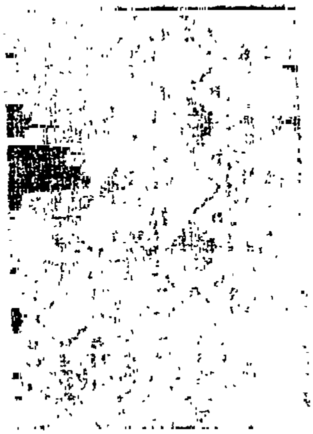
محمد اسلم، ہزاری باغ

س : شکست میں خوشی کب محسوس ہوتی ہے؟

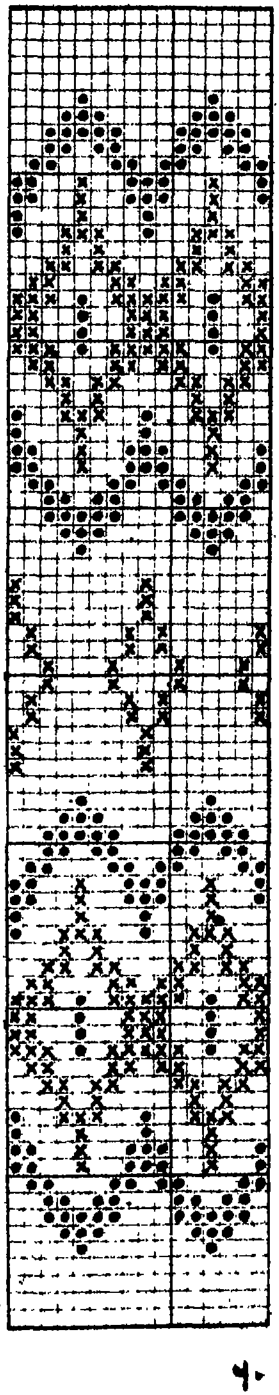
ج : جب انسان اذیت پسند ہو۔ ●

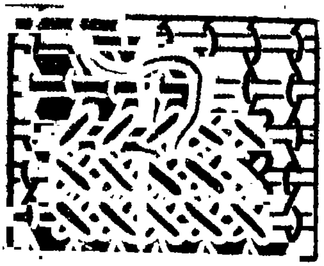


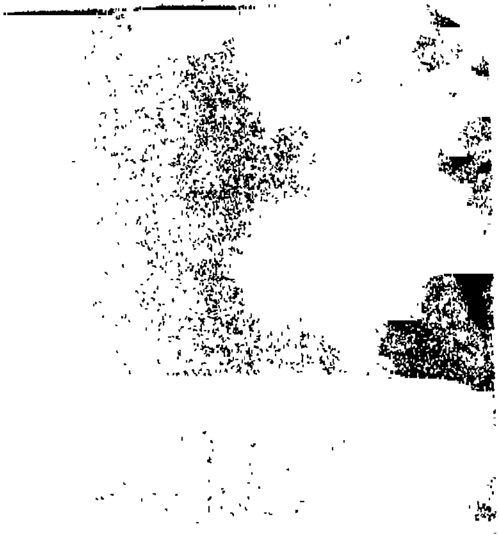
کھانے کی میز کو کراس اسٹچ سے خوب صورت بنائیے

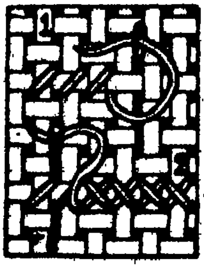


دل کش کشیدہ کاری











موسم گرما کے لئے بچوں کے خوبصورت لباس



دل کش لباس



کہتی سُنتی

زینت بیٹی:

میں عرصے سے بانو کا مطالعہ کر رہی ہوں۔ ابتدا میں مجھے بانو پڑھ کر کچھ کوفت ہوئی تھی۔ ساس بہو کے جھگڑوں اور مردوں کی مخالفت کے سوا اس میں کچھ نہیں ہوتا تھا۔ میں خود ایک ساس ہوں میری بہوویں مجھ سے خوش رہتی ہیں۔ یہ کہنا کہ دنیا کی ساری ساسیں ظالم ہوتی ہیں۔ غلط ہے۔ عورت اور مرد کی کش مکش بھی ایک منفی چیز ہے۔ اچھے اور بُرے دونوں میں ملتے ہیں۔ شکر ہے کہ اب بانو میں اس قسم کے بحث مباحثے بند ہوگئے۔ ان چیزوں کے علاوہ بھی بہت سے مسائل ہیں جن سے بانو کے پڑھنے والو کو رہنمائی مل سکتی ہے۔ بیگم آر۔ کے۔ خان، کلکتہ

سویٹ بھابی:

میں بانو بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ آپ کا افتتاحیہ رسالے کی جان ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کشیدہ کاری اور بیوٹی کالج بھی بہت مفید ہوتے ہیں۔ لیکن میں بانو میں ایک کمی عرصے سے محسوس کر رہی ہوں۔ اس میں ایک کالم دست کاری کے متعلق بھی ہونا چاہئے۔ میں بہت زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہوں۔ ملازمت نہیں کر سکتی۔ اور نہ ہی میرے گھر کا ماحول اس کی اجازت دیتا ہے کہ میں دفتروں میں نوکری کروں۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ اپنا خالی وقت کسی کام میں گزاروں۔ مجھے خالی بیٹھنا بالکل پسند نہیں۔ مطالعہ کرتے کرتے بھی طبیعت اکتا جاتی ہے — سوشل ورک کے لئے بھی گھر سے نکلنا ضروری ہے۔ پردہ نشین عورتوں کے لئے کوئی راہ نکالنی چاہئے۔ کیا آپ ایسا کالم شروع کر سکتی ہیں جس سے مجھ جیسی ہزاروں لڑکیاں گھر میں رہ کر کوئی کام کر سکیں۔ ہمیں اس بارے میں کوئی جانکاری نہیں۔ اگر آپ کی طرف سے رہنمائی مل جائے تو ہم گھر بیٹھے روزگار سے لگ سکتے ہیں۔ اُمید ہے کہ آپ میری اس درخواست پر توجہ دیں گی۔ سلمیٰ بیگم، کانپور

محترمہ:

میں ایک عرصے سے بانو پڑھ رہا ہوں۔ بانو میری بیوی کے نام آتا ہے پہلے تو میں اسے عورتوں کا پرچہ سمجھ کر نظر انداز کرتا رہا بھلا مردوں کو کشیدہ کاری اور باورچی خانے سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ لیکن ایک دن میں نے وقت نکال کر بانو شروع سے آخر تک پڑھ ڈالا مجھے اپنی غلط فہمی پر افسوس ہوا۔ بانو کے مضامین اور افسانے عورتوں کے لئے ہوتے ہیں لیکن مرد بھی ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ خصوصاً آپ کی ذہنی الجھن اور اس کا حل بہت اچھی کوشش ہے۔ جسمانی بیماریوں کے لئے تو ڈاکٹر اور حکیم مل جاتے ہیں لیکن ذہنی بیماریوں کے لئے معالج کہاں ملتے ہیں۔ بہت کم گھر ایسے ملیں گے جہاں ذہنی تناؤ نہیں ہوتا۔ خیالات کا اختلاف ایک فطری چیز ہے۔ لیکن ہر فریق یہ سمجھتا ہے کہ وہ حق پہ ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ دوسرا فریق اگر کوئی غلط قدم اٹھا رہا ہے تو اس کی وجوہ کیا ہیں۔ ایسی کون سی مجبوری ہے جو اسے غلط رویّہ اپنانے پر مجبور کر رہی ہے۔ اس کالم سے کیوں اور کیسے کا جواب مل جاتا ہے اس کالم کو جاری رکھئے۔ باقر علی، لکھنؤ

مائی ڈیر بھابی:

یوں تو بانو میں سب ہی مضامین اور افسانے معیاری ہوتے ہیں لیکن اس بار بانو کا افتتاحیہ سب پر بازی لے گیا۔ آپ نے خوب لکھا ہے کہ جب عوام اپنی قسمت کی باگ ڈور حکمرانوں کے حوالے کر دیتے ہیں تو ان سے بجا طور پر اُمید کرتے ہیں کہ وہ ان کی خوش حالی اور فلاح و بہبود کے لئے کام کریں گے۔ اس کے برعکس جب حکمران جبر اور ظلم پر اتر آئیں تو عوام کو حق حاصل ہے کہ وہ انہیں گدی سے اتار دیں۔ ہندوستان میں پچھلے ۲ سال سے یہی ظلم ہو رہا تھا۔ حکمران طبقہ اپنی گدی کو محفوظ سمجھتا تھا۔ انہوں نے لوگوں کی آواز کو سختی سے کچل دیا تھا۔ جب آواز ہی نہیں اٹھے گی تو لیڈروں کے کان تک کیسے پہنچے گی۔ اس طرح گویا صیاد خود اپنے دام میں آ گیا۔ لیڈروں کو مخالفت کا پتہ ہی نہیں چلا۔ وہ یہ سمجھتے رہے کہ چاروں طرف امن و امان ہے۔ وہ اپنی من مانی کرتے رہے۔ عوام کی خاموشی کو انہوں نے رضامندی سے تعبیر کیا۔ جب عوام کو موقعہ ملا تو انہوں نے اپنے اختیارات کا استعمال کیا ظلم اور تشدد کا خاتمہ ہو گیا احمقوں کی جنت میں رہنے والوں کا یہی حال ہوتا ہے۔ شگفتہ پروین، بمبئی

ڈیر بھابی:

بانو ایک ادبی اور سماجی رسالہ ہے۔ اس کے افسانے اور نظمیں معیاری ہوتے ہیں لیکن بانو میں غزلیں کیوں نہیں چھپتیں۔ آخر غزل سے یہ بیر کیوں ہے غزل بھی ادب کی ایک صنف ہے۔ اردو ادب سے غزل کو نکال لیجئے تو ادب ادھورا رہ جائے گا۔ میں شاعر نہیں لیکن غزلیں شوق سے پڑھتی ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ میری اس درخواست پر توجہ دیں گی۔ ثمینہ یاسمین، گیا

ڈیر بھابی:

آپ سے ایک شکایت ہے۔ بانو وقت پر نہیں نکلتا۔ پہلی تاریخ سے جو انتظار شروع ہوتا ہے تو مہینے کا آخر ہو جاتا ہے۔ بانو کے پڑھنے والوں پر یہ زیادتی کیوں ہے۔ شاید آپ ہمارے صبر کا امتحان لیتی ہیں۔ نکہت عباس، بنارس

ڈیر بھابی:

بانو میں یوں تو سب مضامین اور افسانے پڑھنے کے لائق ہوتے ہیں لیکن مجھے ان سے ملئے سب سے زیادہ پسند آتا ہے۔ آپ نے بہت سے شعبوں میں کام کرنے والی عورتوں کا انٹرویو بانو میں شائع کیا ہے لیکن کسی سپاہی عورت کا انٹرویو شائع نہیں کیا ہے۔ اگر کسی سپاہی عورت کا انٹرویو شائع کریں تو دلچسپی کا باعث ہوگا۔

نسرین ناز، پونا

آٹھ ہزار روپے کے نقد انعامات کی شاندار تقسیم!

شمع منی معمّہ نمبر ۱۸ میں پانچ صحیح حل آئے

صحیح حل شمع منی معمّہ نمبر ۱۸

■	■	۴ گ	۳ د	۲ ج	۱ د
■	■	و	ا	ل	ع
ا	۵ پ	■	م	ت	ا
ک	ڑ	۶ بھ	■	ی	و
ر	ت	م	۷ ک	■	ن
ن	ے	ا	ن	۸ ب	■

شمع منی معمّہ نمبر ۱۸ آسان ثابت ہوا اور پانچ پروانے بالکل درست حل تک پہنچ گئے ان پانچ درست حلوں پر پہلا انعام مبلغ پانچ ہزار روپے تقسیم کیا گیا۔

شمع منی معموں کی تیز رفتاری بے مثال ہے۔ درست حل ظاہر کئے جانے کے چند ہی گھنٹوں میں چیکنگ ختم کر کے تقسیم انعامات کی تفصیلات کا اعلان کر دیا گیا جن پروانوں نے صحیح حل منگانے کے لئے لفافے بھیجے تھے انہیں تقسیم انعامات کی تفصیلات بھی لکھ دی گئیں ـــــ دوبارہ جانچ کے لئے کسی کلیم کا انتظار کئے بغیر ہی پہلے اور دوسرے انعامات بھیج دیتے گئے۔

بالکل درست حل ۵ موصول ہوئے جن پر پہلا انعام مبلغ پانچ ہزار روپے بحساب ۱۰۰۰ روپے فی حل تقسیم کیا گیا:

۱ ۔ محمد مقبول خاں صاحب، معرفت دی جموں اینڈ کشمیر بنک لمیٹڈ، ریزیڈنسی روڈ، سرینگر

۲ ۔ ایچ. سی پریمی صاحب، ۸۸، اہیر منڈی، ہاتھی برکلا، دہرہ دون

۳ ۔ پریتم سنگھ مٹو صاحب، ایس اینڈ ایم برانچ، آرڈیننس ڈپو، شکور بستی، دہلی، ۱۱۰۰۵۶

۴ ۔ جے. اے. قریشی صاحب. قریشی کتاب گھر، بہادر گنج، شاہ جہانپور

۵ ۔ احمد خاں صاحب، معرفت: اگروال میڈیکل اسٹور، کوسی کلاں، ضلع متھرا

ایک غلطی والے ۸۶ حل موصول ہوتے جن پر دوسرا انعام مبلغ تین ہزار روپے بحساب ۳۴ روپے ۸۹ پیسے فی حل تقسیم کیا گیا:

۱۔ محبوب النساء، حیدرآباد ۲۔ حمید مرزا، دہلی ۶ ۔ این، یو، صدیقی، بنگلور ۴ ۔ چنڈی گڑھ ۸۔ احمد میاں، بریلی ۹۔ سری رام، نئی دہلی ۱۰۔ محمود الحسن، چکا دھری
اختیار جیہ کا، نئی دہلی ۵ ۔ عبدالحفیظ، پلی بھیت ۶۔ قیصر علی، بدایوں ۷۔ ستیش کمار ۱۱۔ سنبل گلانی، دہلی ۱۲ ۔ ایس، ایس، شرما، نئی دہلی ۱۳۔ فرح، بریلی ۱۴۔ گوبند پرشاد

دہلی ۱۸۔ مقبول احمد، روڑکی ۱۷۔ سجاد احمد، سری نگر ۱۸۔ پربین، بھاگل ۱۸۔ ڈی، آر، چاولہ، نئی دہلی ۱۹۔ عشرت حسین، رتھیڑی ۲۰۔ سے، لے، قریشی۔ شاہ جہاں پور ۲۱۔ غلام رسول، سری نگر ۲۲۔ انیسہ بیگم، دہلی ۲۳۔ انیسہ بیگم، دہلی ۲۴۔ نگار سلطانہ، بمبئی ۲۵۔ محمد رمضان، جبل گوڑہ ۲۶۔ ارشدی باقر، جمشید پور ۲۷۔ ذکی اللہ، بریلی ۲۸۔ منظر رشید، سری نگر ۲۹۔ صدیق حسن، غازی پور ۳۰۔ بی، ایس شرما، نئی دہلی ۳۱۔ بی، ایس، شرما، نئی دہلی ۳۲۔ ریاست علی، دہلی ۳۳۔ محمد عقیل دہلی ۳۴۔ یاسین، دہلی ۳۵۔ وزیرالحق، شاہ جہاں پور ۳۶۔ ترلوک سیٹھی، نئی دہلی ۳۷۔ اختر علی، دہلی ۳۸۔ عبدالرشید، جیون توی ۳۹۔ مسعود حسن، علی گڑھ ۴۰۔ رحمٰن خاں، حیدرآباد ۴۱۔ زنگل خاں، حیدرآباد ۴۲۔ محمد اسماعیل، ناگپور ۴۳۔ مختار حق، ناگپور ۴۴۔ یلین علی، حیدرآباد ۴۵۔ غلام احمد، اننت ناگ ۴۶۔ عبدالقدیر، قیصری بازار ۴۷۔ مشتاق احمد، خیرآباد ۴۸۔ مظہر حسین، ورنگل ۴۹۔ ناصر داد، علی گڑھ ۵۰۔ نسیم احمد، اعظم گڑھ ۵۱۔ مسز ودنی چند، پالم پور ۵۲۔ مسز ودنی چند، پالم پور ۵۳۔ صفدر علی، پٹنہ ۵۴۔ بشیر احمد، اورنگ آباد ۵۵۔ مولراج کمار، امرتسر ۵۶۔ مولراج کمار، امرتسر ۵۷۔ صابر خاں، ۵۸۔ محمود ۵۹۔ فصیح الدین، گلبرگہ ۵۹۔ فصیح الدین، گلبرگہ ۶۰۔ کرشن دلیپ، لدھیانہ ۶۱۔ پرکاش چند سباٹھو ۶۲۔ گوبند رام، احمد آباد ۶۳۔ چندر شیکھر، چندی گڑھ ۶۴۔ مسرت علی علی گڑھ ۶۵۔ پریم چند، لدھیانہ ۶۶۔ نصراللہ، بنگلور ۶۷۔ خلیل احمد، جلال پور ۶۸۔ خلیل محمود، بھگلپور ۶۹۔ صابرہ اقبال، ناگپور ۷۰۔ شبیر ستار، ناگپور ۷۱۔ شبیر ستار، ناگپور ۷۲۔ نثار احمد، امفال ۷۳۔ شمیم احمد، گیا ۷۴۔ شمس الدین، موسیٰ بنی ۷۵۔ اختر، کلکتہ ۷۶۔ نسرین جہانگیر، کلکتہ ۷۷۔ اعظم عرفان، ناگپور ۷۸۔ قمرالدین، گولڈ گرکرن ناتھ ۷۹۔ سردار آصف، شاہ جہاں پور ۸۰۔ شبانہ وکیل، دہلی ۸۱۔ اے، لے قریشی، شاہ جہاں پور ۸۲۔ جعفر محی الدین، ناگپور ۸۳۔ ایم، گلاب، بمبئی ۸۴۔ ایم، لے خاں، جودھپور ۸۵۔ نسیم حلیم، علی گڑھ ۸۶۔ مدینہ بیگم، علی گڑھ

☐ تمام حلوں کی جانچ نہایت احتیاط سے کی گئی ہے پھر بھی اگر آپ کو شبہ ہے کہ آپ کو کوئی انعام ملنا چاہیے تھا اور آپ کو ابھی تک منی آرڈر نہیں ملا تو دوبارہ جانچ کی فیس ایک روپیہ، منی آرڈر سے "شمع منی معمہ، ماہ نامہ شمع، آصف علی روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲" کو بھیج کر اس کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید یا ایک روپے کے ہمارے جاری کیے گئے نقد نامے کے ساتھ "کلیم سیکشن، شمع منی معمہ نمبر ۱۸، ماہ نامہ شمع، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲" کو اپنی شکایت لکھیں۔ ساتھ ہی یہ بھی تحریر کریں کہ آپ نے شمع منی معمہ نمبر ۱۸ کے کتنے حل بھیجے تھے، کس تاریخ کو بھیجے تھے۔ سادہ ڈاک سے، ریکارڈڈ ڈلیوری، رجسٹری سے بھیجے تھے یا دستی طور پر دفاتر شمع، نئی دہلی میں ڈالے تھے اور متعلقہ حل کی فیس کس نمبر کے منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا نقد نامے سے کس تاریخ کو بھیجی تھی اور تقسیم انعامات سے متعلق آپ کی شکایت کیا ہے۔ اگر آپ کی شکایت درست ہوئی تو آپ کو انعام میں حصہ دیا جائے گا اور دوبارہ جانچ کی فیس کا ایک روپیہ بھی واپس کر دیا جائے گا۔ اگر شکایت غلط ثابت ہوئی تو دوبارہ جانچ کی فیس واپس نہیں کی جائے گی۔ ہر حل کے بارے میں شکایت الگ آنی چاہیے اور اس کی فیس بھی الگ ادا کرنی ضروری ہے۔ اپنی شکایت میں یہ ضرور بتائیے کہ یہ اس حل کے بارے میں ہے۔ جس کی فیس . . . نمبر کے منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا نقد نامے کے ذریعے ادا کی گئی ہے۔ ایسی تمام شکایات ہمیں ۲۵ اپریل ۱۹۷۷ تک مل جانی چاہئیں پہلے دوسرے انعامات ادا کیے جا چکے ہیں۔ ☐

حوالے: شمع منی معمہ نمبر ۱۸ کے اشارے جن کتب سے اخذ کیے گئے تھے، اُن کے نام یا اُن کے قلم کاروں کے مختصر نام یہ تھے: اوپر سے نیچے: ۱۔ بیراگ ۲۔ جمال ۳۔ فیروز ۴۔ صدیقی۔ دائیں سے بائیں: ۵۔ پرکاش ۶۔ راجندر ۷۔ ابراہیم ۸۔ ریاض

شمع منی معمہ نمبر ۲۰

Rs. 8,000.00

آٹھ ہزار روپے کے نقد انعام

پہلا انعام بالکل درست حل پر: پانچ ہزار روپے۔ دوسرا انعام ایک غلطی والے حل پر: تین ہزار روپے

فیس داخلہ فی حل: ایک روپیہ۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں فیس داخلہ پوسٹل آرڈر، منی آرڈر یا شمع ادبی معموں کے نقد ناموں کے ذریعے ادا کی جا سکتی ہے۔ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانہ سے ملنے والی رسید اپنے حلوں کے ساتھ بھیجیے۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ ان کی فیس ایک ساتھ بھیج سکتے ہیں اور ہر حل پر علیحدہ انعام کے حق دار ہو سکتے ہیں۔ کوئی ٹوکن بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ٹوکن بھیجنے کی شرط کے علاوہ شمع ادبی معموں کی دوسری تمام شرائط شمع منی معموں پر بھی عاید ہیں۔ ان کی پابندی ضروری ہے۔

دفاتر شمع (نئی دہلی) میں ڈاک سے اور دستی حل وصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۸، مئی ۷۷ء، ۸ بجے رات تک۔

شمع منی معمہ نمبر ۲۰

۴	۳	۲	۱	■	■
م	و	و	م	■	■
ک		گ	■	ٹ	۵
ت	ے	■	ض		۶
ا	■	ت	ے	ہ	۷
■	ی	ت	ا	ٹ	۸

اشارے

اوپر سے نیچے

۱۔ کعبہ کس منہ سے جاؤ گے؟ غالب شرم —— کو مگر نہیں آتی

۲۔ بھوک اور بیماری۔ یہ —— تو زندگی بھر ساتھ لگے ہوتے ہیں

۳۔ ہندوستان کے ہر —— میں آزادی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی ہے۔ لوگ خوش ہیں

۴۔ ایک پر وقار شخصیت —— ہوا چہرہ۔ رعب دار آنکھیں۔ پر کشش آواز۔ یہ سب مل کر دیکھنے والے پر بے حد اثر انداز ہوتے ہیں

دائیں سے بائیں

۵۔ اب برائیاں —— رہی ہیں اور ہمارا سماج ہر روز پہلے سے بہتر بن رہا ہے

۶۔ —— اصل میں گھن کی طرح انسان کو آہستہ آہستہ کھوکھلا کر دیتا ہے

۷۔ حق کے سپاہی اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں —— ۔ ہر مشکل کا سینہ سپر کر کے مقابلہ کرتے ہیں

۸۔ شہر کی بے شمار دلچسپیاں اپنی جگہ تو خوب ہیں لیکن عبادت اور ریاضت دونوں سے توجہ —— ہیں

شمع ادبی معمے (شمع منی معمہ نمبر ۲۰) ماہ نامہ شمع، آصف علی روڈ، نئی دہلی۔

شمع منی معمہ نمبر ۲۰ کا صحیح حل ۳۱ مئی ۷۷ء کو صبح ساڑھے نو بجے ظاہر کر دیا جائے گا۔ صحیح حل اور انعام پانے والوں کے نام جون ۷۷ء کے "بانو" میں شائع کئے جائیں گے۔ انعام پانے والوں کی تفصیلات شمع: جولائی ۷۷ء میں بھی شائع کی جا سکتی ہیں۔

★ اب آپ ایک شمع ادبی معمہ اور دوسرے شمع ادبی معمہ کے حل بھیجنے کے درمیان اپنے ادبی ذوق کی تسکین کر سکتے ہیں۔۔۔ منی معمہ کے ذریعے!

★ کوئی ٹوکن بھیجنے کی قید نہیں!

★ جتنے حل جی چاہے بھیجیے اپنے تمام حلوں کی فیس ایک یا ایک سے زیادہ منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا نقد ناموں سے بھیج سکتے ہیں

★ آپ ہر حل پر انعام کے حق دار بن سکتے ہیں فیس داخلہ، فی حل صرف ایک روپیہ

★ صرف آٹھ اشارے انعام پانا کس قدر آسان!

★ فیس داخلہ بھیجنے کے لئے شمع ادبی معموں کے نقد نامے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ یا پوسٹل آرڈر، منی آرڈر بھیجیے۔ اپنے حلوں کے ساتھ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید ضرور بھیجیے۔

صحیح حل: جوابی لفافہ بھیج کر منگوا لیجئے یا پھر اگلے ماہ نامہ "بانو" یا ماہ نامہ "شمع" میں دیکھیے۔

★ شمع منی معمہ نمبر ۲۰ کا نتیجہ جون ۷۷ء کے "بانو" میں اور جولائی ۷۷ء کے شمع میں شائع کیا جائے گا۔

نگراں:
یوسف دہلوی

مدیرہ:
زینت کوثر دہلوی

ادارۂ تحریر:
شمیم آرا دہلوی
سعدیہ دہلوی

مئی ۱۹۷۷ء — اشاعت کا اکتیسواں سال پانچواں شمارہ

مالکان: شمع میگزین ● طابع و ناشر: یونس دہلوی ● مطبوعہ: ایس پی پریس ● ٹائٹل: بمبئی آفسیٹ پریس

عام شمارے کی قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے، سالانہ قیمت: اٹھارہ روپے (جس میں سالنامہ مفت ملتا ہے)

مقام اشاعت و دفتر: آصف علی روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ تار کا پتہ: "شمع" نئی دہلی ٹیلی فون: ۲۷۲۰۶۶، ۲۷۲۰۹۴، ۲۷۲۰۸۸ دیگر دفاتر: بمبئی، کلکتہ، اسلام آباد

ہر قسم کے جھگڑوں کی وجہ اختلافِ رائے ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تو بحث و مباحثہ کی گرما گرمی خطرناک صورت اختیار کر لیتی ہے۔ مخالف کو اپنا ہم خیال بنانا ایک فن ہے۔ اور جو لوگ اِس فن سے ناواقف ہیں وہ اکثر اوقات خواہ مخواہ ہی دوسروں سے دشمنی یا مخالفت مول لے لیتے ہیں۔

آپس میں اظہارِ خیال یا بحث کرتے وقت ہمیں خاص طور پر اِس بات کا دھیان رکھنا چاہیئے کہ گفتگو کا موضوع چاہے کچھ بھی ہو لیکن اندازِ بیان مناسب اور شیریں ہونا چاہیئے۔ اگر کہیں جھگڑا ہو رہا ہو تو آپ دیکھیں گے کہ جھگڑے کو ہوا دینے کا اصل سبب بات کا موضوع نہیں بلکہ ناشائستہ لب و لہجہ ہے۔ کڑوی سے کڑوی بات اگر اچھے انداز میں کہی جائے تو گوارا ہوتی ہے، جب کہ ایک اچھی بات کو بھی سخت لہجہ میں ادا کیا جائے تو دوسروں کو مشتعل کر دیتی ہے۔

اگر ہم اپنے لب و لہجہ پر خود ہی توجہ دے کر دھیان رکھنے کا فیصلہ کر لیں تو یقیناً ہم سوسائٹی میں اپنے لئے پہلے سے بہتر مقام بنا سکتے ہیں اور اپنے مخالفین کی تعداد میں بھی کمی کر سکتے ہیں۔

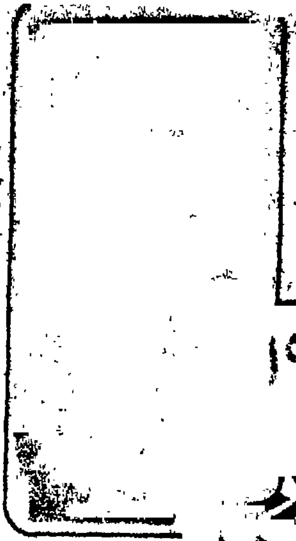
شاید کہ تِرے دل میں اُتر جائے مِری بات

بشریٰ مسعود

مطلوب احمد

۱۹۶





◄ کروڑپتی پیٹریشیا ہیرسٹ

◄ جرمن دہشت پسند الریکے مینہوف

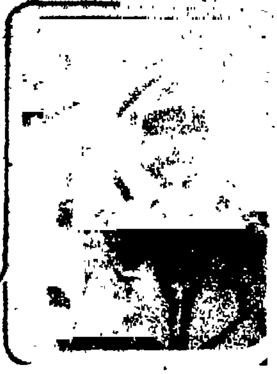
▼ ملکہ سلویا اور شاہ گوسٹاف







◄ ارجنٹائن کی سابق صدر ایزابیلا



اقوام متحدہ کی طرف سے دنیا بھر میں ۱۹۷۵ کو عورتوں کے سال پر منایا گیا تھا، مگر حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۷۶ کو ہی صحیح معنوں میں عورتوں کا سال قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ اس پورے سال کے دوران دنیا بھر میں ایسے واقعات رونما ہوتے جن کی بنا پر خواتین اخبارات کی شہ سرخیوں کی زینت زیادہ بنی رہیں۔

چین کے مرد آہن ماؤزے تنگ کی بیوی چیانگ چنگ نے اسی برس اپنی شوہر کی موت کے فوراً بعد ہی انقلاب کے ذریعہ اقتدار پر قابض ہونا چاہا، لیکن وہ اپنی اس کوشش میں ناکام ہوئیں اور گرفتار کر لی گئیں۔ دنیا کو آج کل اُن کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں ہے کہ وہ ابھی تک جیل ہی میں ہیں یا خاموشی کے ساتھ انہیں موت کی نیند سلا دیا گیا ہے

اس سے قبل جرمنی کی ایک خوب صورت مگر معمولی گھرانے کی لڑکی سلویا نے سویڈن کے بادشاہ سے شادی کر کے پوری دنیا میں ایک ہلچل مچا دی تھی۔ اس کے علاوہ اسی سال کے آخر میں یہ سنسنی خیز خبر بھی موصول ہوئی کہ برطانوی ملکہ کی بہن شہزادی مارگریٹ نے شاہی روایات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنی پندرہ سالہ ازدواجی زندگی کو ختم کر کے اپنی عمر سے پورے بیس سال کم کے ایک نوجوان سے عشق کرنا شروع کر دیا ہے۔ اسی سال ایک خون ریز انقلاب کے بعد ارجنٹائن کی صدر مسز ایزابیلا کو قید کر دیا ہے۔ اسی سال کے آغاز میں امریکہ کے ایک

کر رہی تھی اور ایک بڑے اخبار کے مالک کی پوتی پیٹریشیا ہیرسٹ قتل و غارت گری کے کئی معاملات میں ملوث ہونے کے بعد ایک بینک لوٹتے ہوئے گرفتار ہوئی۔ اسی برس جرمنی کی ایک دہشت پسند تنظیم کی لیڈر ایک مینہوف نے گرفتاری کے بعد جیل میں خودکشی کرکے پوری دنیا میں سنسنی پیدا کر دی۔

ان روح فرسا واقعات کے بعد دو دل خوش کن خبریں بھی موصول ہوئیں۔ فرانس کی سب سے قدیم یونیورسٹی سوربون میں پہلی بار ایک خاتون کو وائس چانسلر جیسے منصب پر فائز کیا گیا اور امریکہ کی باربرا والٹرز نے امریکی ٹیلی ویژن کمپنی سے خبریں پیش کرنے کے لئے پچاس لاکھ ڈالر سالانہ کا معاہدہ کرکے ساری دنیا کا ریکارڈ توڑ دیا۔ اب وہ ٹیلی ویژن کی ملکہ کہی جاتی ہیں۔

غور سے دیکھا جائے تو ماؤزے تنگ کی بیوی مسز چیانگ چنگ کے زوال سے زیادہ ان کا عروج سنسنی خیز اور دلچسپ نظر آئے گا۔ وہ ایک بہت غریب گھرانے کی فرد تھیں اور ان کے والدین نے غربت سے مجبور ہو کر انہیں شنگھائی کے ایک ناچ گانے والے شخص کو فروخت کر دیا۔ جس کے ساتھ وہ کافی عرصے تک ڈانس کرتی پھریں۔ پھر جب چین میں خانہ جنگی برپا ہوئی تو وہ بھاگ کر ماؤ کی فوج میں شامل ہو گئیں۔ اس وقت تک چیئرمین ماؤ کی شادی ہو چکی تھی۔ اور چین میں طلاق کو بہت ہی معیوب سمجھا جاتا تھا، لیکن چیئرمین ماؤ نے ان کے لئے اپنی بیوی اور دونوں بچوں کو بھی چھوڑ دیا۔ شادی کے بعد ان سے دو بیٹیاں پیدا ہوئیں اور ان کی ازدواجی زندگی چالیس سال کے بعد چیئرمین ماؤ کی موت واقع ہونے پر ختم ہوئی۔ چین کی خانہ جنگی کے دوران ماؤ نے اپنے دونوں بچوں کو ایک کسان کے یہاں رکھ چھوڑا تھا، جن کا بعد میں پتہ ہی نہ چل سکا کہ وہ کہاں چلے گئے۔ یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ دونوں بھی خانہ جنگی کا شکار ہو گئے تھے یا ابھی تک اسی کسان کے ساتھ گمنامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ سارے چین کو کھنگالنے کے باوجود ان کا کوئی سراغ نہیں مل سکا۔

شادی کے وقت پارٹی نے میڈم چیانگ چنگ کے سامنے یہ شرط رکھی تھی کہ وہ سیاسی امور میں کبھی کوئی مداخلت نہیں کریں گی۔ اور انہوں نے شروع میں اس شرط پر عمل بھی کیا لیکن جب چیئرمین ماؤ بیمار پڑے تو میڈم چیانگ چنگ کا نام اخبارات وغیرہ میں آنے لگا۔ چیئرمین ماؤ کی بیماری کے دنوں میں وہ چین کے ثقافتی امور کی نگراں بن گئیں، لیکن ان کی انتہا پسندی کی وجہ سے چین کے دانشور ان سے نفرت کرتے تھے۔ پھر چین کے مشہور زمانہ ثقافتی انقلاب کے دور میں انہوں نے بڑی بے رحمی کے ساتھ پرانے لیڈروں کا چن چن کے صفایا، تاکہ بعد میں ان کے اقتدار کے لئے راہ ہموار ہو جائے، لیکن ان کی بدقسمتی سے پانسہ پلٹ گیا۔ اور وہ خود ہی اعتدال پسندوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئیں۔ آج کل کسی کو بھی پتہ نہیں کہ وہ حکومت کے خلاف سازش کے الزام میں آج بھی نظربند ہیں یا خاموشی کے ساتھ قتل کر دی گئیں۔

۱۹۷۶ میں عورتوں کی تاریخ کا دوسرا سب سے بڑا حادثہ ارجنٹائن کی صدر مسز ازابیلا کے خلاف انقلاب برپا ہونا اور پھر ان کا گرفتار ہو جانا ہے۔ شادی سے پہلے ان کا نام میری اسٹیلا مارٹینیز تھا اور مادام چیانگ چنگ کی طرح وہ بھی ایک کیبرے ڈانسر تھیں۔ صدر پیرون جب اپنی جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے تو اچانک انہوں نے ان کا تھرکتا ہوا ڈانس دیکھا اور عمر میں تیس سال کا فرق ہونے کے باوجود ان سے شادی کر لی۔ جب تک صدر پیرون زندہ رہے، ارجنٹائن کے عوام ان کی عزت اور احترام کرتے رہے، لیکن ان کے انتقال کے بعد جب مسز ازابیلا ۱۹۷۴ میں صدر بنیں تو ملک میں بے اطمینانی پیدا ہونے لگی۔ مہنگائی کی شرح ۴۰۰ فی صد سے زیادہ بڑھ گئی اور اسی حساب سے ملک میں بے کاری کی رفتار بھی بڑھنے لگی۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ ان کے ساتھی وزراء نے بڑے پیمانے پر مالی لوٹ کھسوٹ مچائی۔ اور انہوں نے ان کے خلاف سخت تادیبی کارروائی بھی نہیں کی۔ ان ہی سب باتوں کی وجہ سے گزشتہ ۲۴ مارچ کو سب سے پہلے ہوائی فوج نے ان کے خلاف بغاوت کی اور پھر پوری فوج متحد ہو کر مقابلے پر آ گئی۔ اسی وقت سے مسز ازابیلا میڈور کے قلعہ میں نظربند ہیں۔

ٹھیک اسی وقت جب ارجنٹائن کی صدر مسز ازابیلا کی قسمت کا ستارہ غروب ہو رہا تھا، مغربی جرمنی کی ایک عام مگر بہت خوبصورت لڑکی کے اقتدار کا ستارہ بام عروج پر پہنچ رہا تھا۔ سلویا کے سویڈن کے بادشاہ سے معاشقے کی ابتدا ۱۹۷۲ کے میونخ اولمپک سے ہوئی۔ جب کل [illegible] میں سلویا

کی درخواست قبول کرکے اُسے غیر ملکی مہمانوں کا استقبال کرنے والی ٹیم کا سربراہ مقرر کیا گیا۔

چنانچہ جب سویڈن کے ولی عہد کا طیارہ میونخ کے ہوائی اڈے پر پہنچا تو سلویا حسب معمول ایک گل دستہ لئے ان کے استقبال کو کھڑی تھی۔

پہلی ہی نظر میں ولی عہد کے دل پر کیوپڈ کا تیر چل گیا اور انہوں نے اسی روز سلویا کو شام کے کھانے کی دعوت دے دی جسے سلویا نے بخوشی قبول کرلیا۔ جب تک ولی عہد میونخ میں رہے وہ اکثر سلویا کے ساتھ ہی کھانا تناول کرتے رہے۔ اور جب سویڈن واپس گئے تو روزانہ صبح کو پابندی کے ساتھ سلویا سے فون پر گفتگو کرتے رہے۔

اسی اثنا میں اُن کے والد کا انتقال ہو گیا اور نوجوان گوستاف کو بادشاہ چن لیا گیا۔ اس طرح ۳۰ سالہ شاہ گوستاف اور ۳۲ سالہ سلویا نے بغیر کسی رکاوٹ کے منگنی کرلی اور پھر شادی کے بعد جب پہلی بار اپنی نئی نویلی ملکہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر محل کی بالکنی میں عوام کے سامنے آئے تو سویڈن کے عوام نے تالیاں بجا بجا کے خوشی کے نعرے لگائے۔

۱۹۷۶ کا سال جہاں سلویا اور سویڈن کے شاہ کے لئے بہت مبارک سال ثابت ہوا، وہاں برطانیہ کی ملکہ کی بہن شہزادی مارگریٹ کی ازدواجی زندگی کے لئے بہت منحوس بھی ثابت ہوا۔ کافی دن کی ہیجان خیز کش مکش کے بعد انہوں نے اس سال کے اواخر میں اپنی سولہ سالہ ازدواجی زندگی کے تار پود بکھیرتے ہوئے مسٹر انتھونی آرم اسٹرانگ جونس سے طلاق لے لی۔ شہزادی سے شادی کرنے کے بعد شاہی محل کی طرف سے لارڈ اسنوڈون کا خطاب ملا تھا۔

چھیالیس سالہ شہزادی مارگریٹ نے اپنی جوانی کے آغاز سے ہی قصر بکنگھم میں کافی ہلچل پیدا کردی تھی۔ انہوں نے ۱۹۵۵ء میں ہوائی فوج کے ایک بہادر پائیلیٹ کیپٹن پیٹر ٹاؤن سینڈ سے کھلے عام محبت کی، مگر شاہی محل کے زبردست دباؤ کے سامنے انہیں اپنی محبت کا گلا گھونٹنا پڑا۔ اُس وقت شاہی محل، برطانوی اخبارات اور خود حکومت نے انہیں اس قدر مجبور کردیا تھا کہ ان کو آنسوؤں کی باڑھ کے درمیان برطانوی وزیر اعظم کے تیار کردہ ایک اعلان پر دستخط کرنا پڑا تھا جس میں انہوں نے کھلم کھلا پیٹر ٹاؤن سینڈ سے شادی نہ کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا تھا۔

اُس وقت تو زمانے کے ہاتھوں انہوں نے اپنی محبت کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ لیکن اُن کے دماغ میں یہ بات ہمیشہ ایک اُبلتے ہوئے لاوے کی طرح موجود رہی اور اب وہ اپنی اسی محرومی کا انتقام لینے پر اُتر آئی ہیں۔ چنانچہ اب وہ اپنی بہن ملکہ الزبتھ سے انتقام لے رہی ہیں جو اُن کی خوب صورتی پر تو رشک کرتی تھیں، مگر شادی کے سلسلے میں ایک آہنی دیوار بن کر کھڑی ہو گئیں۔ انہوں نے اپنے شوہر آرم اسٹرانگ سے بھی انتقام لیا ہے جنہوں نے شادی کے لئے خود کو جھٹ پیش کر دیا تھا۔ پھر ان کے انتقام کا نشانہ پورا برطانیہ بنا ہے۔ جو روایات کی ایک فرسودہ زنجیر میں انہیں جکڑنا چاہتا تھا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اب خود اپنی ذات سے بھی انتقام لے رہی ہیں کیوں کہ محض ایک دباؤ کے تحت انہوں نے اپنی محبت کی شمع خود ہی گل کردی تھی۔

شاید اسی انتقام کے جذبے کے تحت وہ آج کل اپنی عمر سے پورے بیس سال چھوٹے دبلے پتلے اور لا اُبالی نوجوان روڈی کی کمر میں ہاتھ ڈالے گھومتی نظر آتی ہیں اور انہیں اس بات کا غم نہیں ہے کہ اُن کے اس عمل سے پورا قصر شاہی سخت پریشان ہے۔ کیوں کہ وہ بہر طور برطانیہ کی فرسودہ روایات سے انتقام لینا چاہتی ہیں۔

چین، ارجنٹائن، سویڈن اور جرمنی کے علاوہ ۱۹۷۶ء کے دوران امریکہ میں بھی ایک لڑکی نے کافی تہلکہ مچایا تھا۔ وہ لڑکی تھی مشہور زمانہ ہیرسٹ نشریاتی ادارے کے کروڑپتی مالک کی پوتی پیٹریشیا، جسے ایک بینک لوٹنے اور گیارہ دوسرے جرائم میں ملوث ہونے کے الزام میں سات سال قید کی سزا ہوئی ہے۔ اس کروڑپتی لڑکی نے دہشت پسندوں کی ایک جماعت کے ساتھ بینک پر ڈاکہ ڈالا تھا اور پولیس سے مقابلہ ہونے پر گروہ کے صرف تین افراد زندہ بچے تھے۔ یہ تو گرفتار ہو گئی اور باقی دو دہشت پسند ولیم ہارس اور اس کی بیوی ایملی ابھی تک مفرور ہیں۔

پیٹریشیا کے منگیتر نے "نیوز ویک" کے نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا کہ اس کروڑپتی خاندان کی عائد کردہ بے جا پابندیوں نے اس جوان سال لڑکی کو باغی بنایا تھا۔ وہ نشہ آور گولیاں کھاتی تھی اور اس کا دماغ بغاوت کے منصوبے باندھتا رہتا تھا تاکہ وہ آزادانہ کھلے ہوئے ماحول میں سانس لے سکے۔

پیٹریشیا کے وکیل نے اس کی صفائی

میں کہا تھا کہ اُسے ۴ فروری ۱۹۷۴ء کو کچھ انتہا پسندوں نے اغوا کر لیا تھا اور کچھ دن تک اس کو دو میٹر لمبے اور ایک میٹر چوڑے بکس میں آنکھوں پر پٹی باندھ کر رکھا گیا۔ اسی دوران اُس کے دماغ کو مختل کرنے کے لئے اُسے ہلوسہ کی نشہ آور گولیاں کھلائی گئیں تاکہ وہ آزاد ہونے پر بھی اُن کے چنگل سے نکل نہ سکے۔ چونکہ پیٹریشیا کے گھر والوں نے انتہا پسندوں کا مطالبہ منظور نہیں کیا تھا۔ اس وجہ سے وہ مہینوں اُن کی قید میں رہی، جس کے دوران اس کو "ذہنی غسل" دیا گیا اور وہ غیر ارادی طور پر ان کی انتہا پسندانہ کارروائیوں میں شریک ہونے لگی۔ لیکن عدالت نے پیٹریشیا کے وکیل کی ساری دلیلیں مسترد کرتے ہوئے اُسے سات سال قید کا حکم سنایا اور اب دنیا کی یہ امیر ترین لڑکی سان فرانسسکو جیل میں اپنی سزا "بھگت" رہی ہے۔

امریکہ ہی کی ایک اور خاتون باربرا نے مشہور ٹیلی ویژن براڈ کاسٹنگ کمپنی کے ساتھ دس لاکھ ڈالر سالانہ کے حساب سے پانچ سال کا معاہدہ کرکے دنیا کی سب سے مہنگی اور کامیاب اناؤنسر ہونے کا شرف حاصل کیا ہے۔ باربرا کی عمر اس وقت ۴۴ سال ہے۔ اور وہ ایک بچی کی ماں بھی ہے، لیکن بعد میں شوہر سے اختلاف ہونے کی بنا پر اُس نے طلاق لے لی تھی۔ اس کمپنی کے علاوہ کمپنی نے باربرا کو ایک کا دفتر ڈرائیور کے، ایک سکریٹری اور ایک ہیئر ڈریسر بھی دیا ہے۔ دس لاکھ ڈالر سالانہ کے علاوہ باربرا اپنے دو گھنٹے کے اوقات کار میں کچھ تجارتی کمپنیوں کے اشتہارات بھی پیش کرے گی اور اس کے لئے اسے چار لاکھ ڈالر سالانہ مزید دیا جائے گا۔ آج کل باربرا سات بجے سے نو بجے تک روزانہ ٹیلی ویژن پر پروگرام پیش کرتی ہیں اور ان کا یہ دلچسپ پروگرام دیکھنے کے لئے ہزاروں امریکی خلافِ عادت صبح سویرے بیدار ہونے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

باربرا گزشتہ ۱۵ برس سے ٹیلی ویژن پر آ رہی ہیں اور انہوں نے امریکہ کی تقریباً تمام ہی بڑی بڑی ہستیوں سے انٹرویو لئے ہیں۔ اُن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ پروگرام پیش کرتے وقت وہ جدت پسندی سے کام لیتی ہیں اور چبھتے ہوئے سوالات کرکے بہت دلچسپ انٹرویو لیتی ہیں۔

فرانس میں ۱۹۷۶ء میں ایک بالکل نئی بات رونما ہوئی ہے اور وہ یہ کہ یہاں کی سب سے قدیم سوربون یونیورسٹی میں جس کی بنیاد تیرھویں صدی میں ڈالی گئی تھی، پہلی بار ایک خاتون ہیلین اروبلار کو وائس چانسلر جیسے ذمہ دار منصب پر فائز کیا گیا ہے۔ مسز ہیلین ایک یونانی خاندان کی چشم و چراغ ہیں جس نے صدیوں قبل فرانس میں سکونت اختیار کر لی تھی وہ شادی شدہ ہیں اور ایک بارہ سالہ بچی کی ماں ہیں۔ اُن کی پیدائش ایتھنز میں ۲۹ اگست ۱۹۱۶ء کو ہوئی تھی۔ شروع میں انہوں نے مشرقِ وسطیٰ کے آثارِ قدیمہ کو اپنی جولانگاہ بنایا، لیکن بعد میں انہوں نے اپنا رخ بازنطینی دور کی طرف پھیر دیا اور آج کل وہ اس پر ماہرِ تعلیم مانی جاتی ہیں۔ مسز اروبلار کو آج کل تیس ہزار طلباء، سات سو اساتذہ اور دو سو پرائیویٹ لیکچر دینے والوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ یونیورسٹی کے انتظامات وہ بہت خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیتی ہیں۔ اس کے لئے وہ روزانہ ساڑھے آٹھ بجے دفتر پہنچ جاتی ہیں اور شام کو چھ بجے تک دفتر میں ہی موجود رہتی ہیں۔

جرمنی میں بھی ۱۹۷۶ء کے دوران ایک ۴۱ سالہ خاتون نے کافی شہرت حاصل کی تھی یعنی الریکے مینہوف، جو اپنے تین دہشت پسند ساتھیوں کے ہمراہ گرفتار ہوئیں اور جنہوں نے ۸ مئی کو رات کے دس بجے اسٹامہیم پرسٹو تجاوزیٹ کی جیل میں خاموشی کے ساتھ خودکشی کر لی۔ اس خاتون نے اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ بون کی ایک شاہراہ پر دستی بموں اور مشین گنوں سے چار امریکی فوجیوں پر حملہ کرکے انہیں قتل کر دیا۔ اور جب پولیس سامنے آئی تو اس سے بھی دو دو ہاتھ ہو گئے۔ جس کے نتیجے میں ایک پولیس افسر ہلاک اور درجنوں مجروح ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی اُن کے تینوں ساتھی بھی ہلاک ہو گئے اور یہ خود گرفتار ہو گئیں۔ مینہوف کا تعلق سرخ فوج سے تھا جو مسلح انقلاب برپا کرنا چاہتی تھی اور اکثر قتل و غارت گری بھی کرتی رہتی تھی۔ آخر کئی سال کی مسلسل کوشش کے بعد اس پوری تنظیم کے سارے اراکین ایک ایک کرکے گرفتار ہو گئے اور شاید اسی وجہ سے انتہا پسند مینہوف نے بھی خودکشی کرنے کا منصوبہ بنا لیا، لیکن ان کی خودکشی کا اعلان ہوتے ہی جرمنی بھر میں کسی بھی غیر متوقع حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے پولیس کو مسلح تیار رہنے کا حکم دے دیا گیا تھا۔ اس کے باوجود تشدد کی کئی واردات ہو گئیں اور سینکڑوں لوگوں کو اپنی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔

رفیقِ غم سے

عجیب بات ہے کہ زندگی کی چاندنی
اُداسیوں کے جان لیوا سایوں کے تلے

دبی رہی
گھٹی رہی
بتاؤ میرے ساتھ تم بھی چلتے چلتے تھک گئے ہو کس لئے ؟
وہ راستے
جہاں ہمارے پیار نے، حسین پھول بھی کھلائے تھے
وہ آسماں
کہ جس پہ عشق کے ستارے جگمگائے تھے
وہ دھرتی
جس کی گود میں
ہمارا جذبۂ وفا
جواں ہوا
وہ راستے
وہ آسماں
وہ دھرتی
سب اُداس ہیں
تھکے تھکے تمہارے یہ قدم
بجھے بجھے دِل ودماغ
کہ جن پہ گردِ حادثات جم گئی تو کیا ہوا
میرے رفیقِ غم
میں ہوں شریکِ زندگی
تو پھر اُداسیوں میں گھر کے اس طرح
نہ تھک کے بیٹھو، ہار کے
اِدھر تو آؤ۔ غم کا بوجھ اُتار کے
تھکے تھکے سے قدموں کو میں زندگی میں ڈھال دوں
بجھے بجھے سے دِل، دماغ کو میں تازگی عطا کردوں
میرے رفیقِ غم
مجھے اُداسیوں کے جان لیوا سایوں کے تلے سے اب نکال دو
میں اپنی زندگی کے خول میں سمٹ گئی ہوں آج پھر
حیاتِ نو کی روشنی سے پھر مجھے سنوار دو۔



زرینہ زریں

اُس کے کچھ چرچے بھی ہوئے۔ مگر حقیقت صرف اتنی تھی کہ بد اچھا بدنام بُرا۔ لوگ ایسی ویسی من گھڑت باتیں اڑا دیا کرتے تو اس میں اس کا کیا قصور ــــ؟ بس بات یوں تھی۔ کہ وہ ذرا منہ زور تھی۔ اور اس کی پلکوں نے جھکے رہنا نہیں سیکھا تھا ــ اس پر بھی اگر دمکتا ہوا حسن اور بولتا ہوا شباب نہ ہوتا تو کون کس کے بھلے بُرے کو کریدتا پھرتا ہے۔

اس کے والدین کو شادی کی فکر تو شروع سے ہی تھی۔ جب وہ اچھی طرح جوان بھی نہ ہوئی تھی ــــ مگر رشتہ ملنا ہی نہ تھا۔ نئے زمانے میں غریب لوگ بھی دولت مندوں اور خوش حالوں کی بُرائیوں کی نقل کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ سلّو کے رشتے کے لئے جہاں کہیں بھی بات چلائی گئی، سائیکل، گھڑی اور پانچ سو روپے کی مانگ نے روڑا اٹکا دیا۔ حالانکہ جو لوگ یہ مانگ کرتے تھے، وہ خود بھی اتنے غریب اور مجبور تھے کہ بس روزانہ مزدوری ہی پر گزارہ تھا۔ مگر اس طرح کی مانگ کے ساتھ لڑکے کی شادی کرنے میں وہ فخر اور بڑائی سمجھتے تھے۔ لڑکے کا معاملہ ہوتا تو اپنی اوقات بھول جاتے مگر جب خود اپنی لڑکی کا معاملہ ہوتا تو اوقات سمجھ میں آجاتی۔

دن گزرتے گئے ــــ یہاں تک کہ سلّو کی جوانی سر چڑھ کر بولنے لگی۔ اور والدین کو اس پر پہرا لگانا پڑا۔ شریف صاحب بھی اپنی تلاش میں تھک گئے۔ والدین کی خواہش اور کوشش ہمیشہ یہی رہی کہ لڑکا غریب سہی، مگر جیسا تاج تھا، ویسا سر تو ہو۔ مگر لڑکی کے معیار کا لڑکا مفت ہاتھ آنے والا نہیں تھا۔

آخر مایوسی جب زیادہ بڑھی اور بوجھ ناقابلِ برداشت ہو گیا تو دل پر جبر کر کے سلّو کو ایک جیسے تیسے لڑکے سے بیاہ دیا گیا۔ بوجھ اُتر گیا مگر خوشی کسی کو نہ ہوئی۔

سلّو نے اپنے آپ کو مار کر بھی شوہر سے تال میل پیدا کرنے کی بہت کوشش کی۔ یوں تو شادی کی پہلی ہی رات میں اس کا جی نکل بھاگنے کو چاہا ــــ مگر اس کو وہ سماں یاد تھا جب ماں اور باپ دونوں نے آنکھوں میں آنسو بھر کر ہاتھ جوڑتے ہوئے اس سے کہا تھا ــــ "بیٹی ہماری عزت رکھنا ــــ" اس لئے اس کو اپنی خوشی سے زیادہ والدین کی عزت عزیز تھی۔ پھر بھی وہ چھ مہینے سے زیادہ والدین کی عزت کا پاس نہ کر سکی۔ اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ سلّو شوہر کو چھوڑ کر میکے بھاگ آئی۔ آتے ہی اس نے ماں سے کہہ دیا ــــ "میں زندہ گئی تھی، مُردہ آئی ہوں۔ اب وہاں تم میری لاش کو ہی بھیج سکتی ہو ــــ"

اور پھر چند ہی روز بعد اس کے شوہر نے بھی تاؤ کھا کر اور کچھ شک و شبہ میں پڑ کر اختلافاً اس کو طلاق دے دی۔ حقیقت میں تھا شک و شبہ غلط تھا۔ والدین نے اُترے ہوئے بوجھ کو واپس اپنی چھاتی پر قبول کر لیا۔ کرتے بھی کیا، زندہ قبر میں تھوڑے ہی ڈال دیتے۔ مگر ہوا یہ کہ پہلے تو سلّو کے صرف چرچے ہی ہوا کرتے تھے۔ اب اس کا شور بھی بچ گیا۔ ایک دو شوقین ایسے تھے، جو پہلی بیوی کو سیکنڈ ہینڈ سمجھ کر دوسری شادی کے آرزومند تھے۔ اب سلّو ان کو سہل الحصول معلوم ہوئی۔ اور ان کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے۔ کہ مراد پوری ہونے کا امکان روشن ہو گیا۔ آخر سلّو کے والدین کو ناموس کے دشمن کو دور دفع کرنا ہی تھا۔

شریف صاحب کو بھی سلّو کے والدین پر بڑا ترس آیا۔ ان غریبوں کے لئے یہ سانحہ بڑا جان لیوا تھا۔ دل ہی دل میں وہ کئی روز تک ــــ سلّو کے بارے میں سوچتے رہے۔ رفتہ رفتہ بات پرانی ہونے لگی۔ سلّو پھر اس طرح رہنے لگی، جیسے اس کی شادی کبھی ہوئی ہی نہ ہو۔ مگر صبح کے کھلے ہوئے گلاب پر شبنم کی جو نمی ہوتی ہے اس کو دھوپ چاٹ گئی تھی۔ ہاں گلاب ویسے ہی مسکرا رہا تھا ــــ ایک سال، ــــ دو سال ــــ تین سال گزر گئے۔

چڑھے ہوئے دریا نے انچ انچ کر کے اُترنا شروع کر دیا۔ حالانکہ شریف صاحب کبھی کبھی سلّو کو دُور سے دیکھ پاتے تو وہ ویسی ہی سرسبز و شاداب نظر آتی۔ مگر کلونا اب میں وہ پہلی سی قاتلانہ بات نہیں رہ گئی تھی۔ شریف صاحب نے بڑی ہمدردی سے محسوس کیا کہ سلّو کو اب شادی کی ضرورت ہمیشہ سے زیادہ تھی ورنہ کچھ اور دن گزرے تو جھوٹا نوالہ بن کر رہ جائے گی۔ ماں باپ پر تو اتنی بھاری تھی کہ اگر وہ کہیں بھاگ بھی جاتی تو کوئی ڈھونڈنے والا نہ ہوتا۔ مگر وہ ایسی نہیں تھی۔ البتہ ڈھلتی جوانی کا احساس اس کو کبھی کبھی ستانے لگا تھا۔

ان تین برسوں میں سلّو پر کیا کیا بیتی گزری تھیں۔ ایک بار پچھلے سال ایک آدمی نے

ایک بیوی کے ہوتے ہوئے اس کو دوسری بیوی بنانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ اس کے والدین تو راضی ہو گئے۔ مگر وہ خود اپنے آپ کو تیار نہ کر سکی۔ کچھ دن کے بعد ایک دور دراز کے گاؤں میں اس کی شادی بالکل پکی ہو گئی۔ مگر تقریب کو صرف چند دن باقی رہ گئے تو ستّو کے پہلے شوہر نے کچھ الٹا سیدھا بتا کر لڑکے والوں کو بھڑکا دیا۔ اور ابھی ایک سال پہلے بھی اسی طرح کی ایک بات ہو گئی۔ اس بار اس شادی شدہ آدمی نے بنی بنائی بات بگاڑ دی۔ جس کی دوسری بیوی بننے سے ستّو نے صاف انکار کر دیا تھا۔ تیسری چوٹ کھانے کے بعد ستّو اور اس کے والدین نے شادی کی طرف سے گویا صبر ہی کر لیا تھا۔ ہاں کوئی اللہ کا بندہ خود ہی شادی کا پیغام لے کر پہنچ جاتا تو اور بات ہوتی۔

لیکن ستّو کا یوں رہ جانا شریف صاحب کے دل کو بہت کھٹکنے لگا۔ اس میں اُن کی شکست تھی۔ وہ زندگی بھر لوگوں کے کام آئے۔ کتنوں کی مشکل آسان کی۔ کتنوں کو سہارا دیا۔ اللہ کے فضل سے ہمیشہ سرخروئی ہوئی۔ ایک ستّو ہی کے معاملے میں وہ کچھ نہیں کر پا رہے تھے۔ اِدھر چند دنوں سے وہ ستّو کو بہت غور سے دیکھنے لگے تھے۔ اور اس کی خاک میں ملتی جوانی پر افسوس کیا کرتے۔ احساس تو ان کو ستّو کے والدین کی عزّت اور پریشانی کا بھی تھا۔ مگر خود ستّو کی بربادی سے وہ کچھ زیادہ متاثر تھے۔

اُنھوں نے طے کر لیا کہ ستّو کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔ چاہے جس قیمت پر ہو۔

پھر ایک دن ستّو کے باپ کو بلوا کر اُنھوں نے خوش خبری سنائی ــــــ

"میں نے پڑوس کے گاؤں میں ستّو کی شادی کے لئے ایک اچھا سا نوجوان دیکھ لیا ہے۔ عمر میں ستّو سے دو چار سال بڑا ہو گا۔ شادی شدہ تھا مگر ایک بچّہ چھوڑ کر بیوی مر گئی۔ بڑی مشکل سے تیار ہوا ہے۔ کچھ فرمائش ہے۔ مگر تم فکر نہ کرو۔ خرچ میں کروں گا۔ کسی طرح بھتّر کی یہ سِل تو تمھاری چھاتی سے ہٹے۔ تم لوگ صرف پسند کر لو۔ بہت اچھی جوڑی رہے گی۔"

ستّو کے باپ کی آنکھوں میں احسان مندی کے آنسو آ گئے۔ شریف صاحب اس کے لئے گویا فرشتۂ رحمت تھے۔ ماں نے سنا تو دل ہلکا سا ہو گیا۔ خود ستّو بھی جھوم اُٹھی۔ سب کو یقین تھا کہ اس بار دھوکا نہیں ہو گا۔ کیوں کہ اس کا بیڑا شریف صاحب نے اٹھایا تھا۔

پڑوس کے گاؤں کی تو بات تھی۔ دیکھا سُنی کا مرحلہ دو تین دن میں ختم ہو گیا۔ رشتہ دونوں طرف سے پسند کر لیا گیا۔ اور تیاریاں شروع ہو گئیں۔ غریبوں کی شادی کے لئے تیاریاں ہی کیا۔ شریف صاحب کی مدد سے ایک ہفتے کے اندر اندر جو کچھ بنا تھا سب ہو گیا۔ نکاح اور رخصتی کی جھٹ پٹ والی تاریخ بھی مقرّر ہو گئی۔ شریف صاحب نے اتنی دل چسپی کسی کی شادی میں نہیں لی تھی۔ ستّو کے چہرے سے ملال کا غبار دُھل گیا۔ اور اس پر نیا نکھار آ گیا۔ اس کارِ خیر کو انجام دیتے ہوئے خود شریف صاحب کے صحت مند چہرے پر بھی ایسی تمتماہٹ اور شادابی رہنے لگی جیسے ان کی اپنی ہی شادی ہو رہی ہو۔

بات یہ ٹھیری تھی کہ دس آدمی نوشہ کے ساتھ آئیں گے۔ رات کو نکاح ہوگا اور صبح کو رخصتی ہو جائے گی۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق مختصر سی بارات کے طعام و قیام کا انتظام ہوا۔ محلّے کے بھی کچھ لوگوں کو مدعو کر لیا گیا۔ شام ہوتے ہی گھر میں چہل پہل شروع ہو گئی۔ محلّے کے کچھ لوگ بھی اِدھر اُدھر لپک جھپک کرنے لگے۔ شریف صاحب ابھی اخلاقاً ایک دو بار آئے گئے۔ مگر آج نہ جانے کیوں پل پل ان کے چہرے کی کیفیت ادل بدل رہی تھی ـــــ ابھی دیکھو تو ہشاش بشاش نظر آ رہے ہیں، پھر دیکھو تو کچھ پریشان اور کھوئے کھوئے سے معلوم ہوتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ یہ ان کے وقار اور ایک کئی بار کے چوٹ کھائے ہوئے غریب گھرانے کی عزّت اور آن کا سوال تھا۔ اگر خدانخواستہ کوئی گڑبڑ ہوئی تو اس بار ان کی بھی تھُو تھُو ہو جائے گی۔

شام سے رات ہوئی۔ مگر بارات نہیں آئی۔ سب کو تشویش ہونے لگی۔ کچھ اور دیر گزری تو سب کو پریشانی ہونے لگی۔ اور جب اتنا وقت گزر گیا کہ دال میں کالا نظر آنے لگا تو ایک شخص کو یہ پتہ لگانے کو دوڑایا گیا کہ آخر ماجرا کیا ہے ـــــ بارات کیوں نہیں پہنچی۔

ایک گھنٹے کے اندر ہی وہ آدمی واپس آگیا۔ اس نے بھیڑ بھاڑ میں سے شریف صاحب کو الگ لے جا کر کچھ کھسر پھسر کی۔ بات بڑی شرم ناک تھی۔ شریف صاحب نے سلّو کے باپ کو بھی پاس بلا لیا۔ اور بڑی شرمندگی کے ساتھ اس کو بتایا کہ بارات نہیں آئے گی۔ شادی نہیں ہوگی۔ خبر لانے والے آدمی نے جھجک جھجک کر اپنی بات دُہرائی، ——"میں جوں ہی لڑکے والوں کے دروازے پر پہنچا اور ماجرا پوچھا تو لوگ بڑی حقارت سے مجھ پر لعنت ملامت کرنے لگے۔ وہ لوگ کہنے لگے کہ اچھا ہوا جو عین وقت پر بھانڈا پھوٹ گیا، ورنہ ناک کٹ جاتی۔ ان کم بختوں کا کہنا ہے کہ لڑکی داغ دار ہے۔"

ماحول پر اوس پڑ گئی۔ سب کے منہ لٹک گئے۔ مگر شریف صاحب نے سلّو کے باپ کی ڈھارس بندھائی ——

"گھبراؤ نہیں، آج تمھاری بیٹی کے سہاگ کے لئے میں بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا ہوں۔"

اس کے بعد شریف صاحب نے سب کے سامنے بات کھول کر رکھ دی۔ ان کی بے چینی کا عالم قابلِ دید تھا۔ محلّے میں کھلبلی مچ گئی۔ ہوتے ہوتے بات سلّو کے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔ اس کی ماں پر ایسا سکوت طاری ہوا جیسے دم نکل گیا ہو۔ شریف صاحب نے پھر ایک بات سلّو کے باپ کو الگ لے جا کر کہی۔ اس بے چارے کے چہرے پر ایک رنگ آنے ایک جانے لگا۔ بڑی عجلت میں کچھ باتیں ہوئیں۔ اور دونوں تیزی کے ساتھ سلّو کے پاس پہنچ گئے۔ سب کو ہٹا کر اس کے باپ نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر کچھ کہا۔ اور پھر جب وہ دونوں عجلت کے ساتھ باہر نکلے تو سلّو کی ایک گھُٹی گھُٹی سی ہچکی نے ان کا تعاقب کیا۔

پھر ذرا دیر بعد قاضی سلّو کا نکاح شریف صاحب سے پڑھا رہا تھا۔ پورے ماحول پر مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ بھیڑ میں صرف ایک بُڑھیا مسکرائے جا رہی تھی، کیوں کہ صرف وہ بُڑھیا ہی جانتی تھی کہ اس بار سازش خود شریف صاحب نے کی تھی ——

○

مطبوعات بانو بک ڈپو

[illegible]

ان سے ملئے

عصمت جہاں

امریکہ کی راج دھانی واشنگٹن میں غالباً دُنیا کی سب سے بڑی لائبریری موجود ہے۔ اس کا نام لائبریری آف کانگریس ہے (کانگریس امریکہ کی پارلیمنٹ کو کہتے ہیں) اس لائبریری میں لاکھوں کتابیں ہیں یہ کئی عمارتوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اس میں دُنیا کے ہر مضمون پر کتابیں موجود ہیں۔ کتابوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے اس لائبریری نے کتابیں جمع کرنے کے لئے ساری دنیا میں مرکز کھول رکھے ہیں۔ ایسا ہی ایک مرکز دلی میں بھی ہے۔ عصمت جہاں اسی مرکز میں کام کرتی ہیں۔

اس مرکز میں ہندوستان کی ہر زبان کی کتابیں جمع کی جاتی ہیں۔ جو کتاب چُن لی جاتی ہے اس کی تین کاپیاں امریکہ بھیج دی جاتی ہیں۔ امریکہ کی کئی یونیورسٹیاں لائبریری آف کانگریس سے منسلک ہیں۔ کتاب کی ایک جلد واشنگٹن میں رکھی جاتی ہے اور باقی جلدیں ممبر یونیورسٹیوں کی لائبریریوں کو بھیج دی جاتی ہیں۔ عصمت اس مرکز میں اردو، فارسی اور عربی کتابیں چنتی ہیں۔ کام زیادہ ہونے پر وہ انگریزی اور ہندی کی کتابیں بھی منتخب کرتی ہیں۔ اردو کی کتابوں میں ادب، فلسفہ، سیاست مذہب، غرض ہر موضوع کی کتابیں شامل ہوتی ہیں۔ کتابوں کے علاوہ روزانہ اخبار اور رسالے بھی امریکہ بھیجے جاتے ہیں۔ اخبارات کو مائیکروفلم پر تبدیل کر کے بھیجا جاتا ہے ایک اخبار کا فوٹو ایک انچ لمبی اور ایک انچ چوڑی فلم پر اُتار لیا جاتا ہے، اس فلم کو پڑھنے کے لئے سلائیڈ مشین میں رکھیں تو اسکرین پر سارا اخبار سینما کی تصویر کی طرح دکھائی دیتا ہے۔

امریکہ ایک مالدار ملک ہے۔ امریکن اپنی مقصد براری کے لئے دھڑلے سے روپیہ خرچ کرتے ہیں ایک امریکن واشنگٹن میں بیٹھ کر آرام سے مشرقی موضوعات پر ریسرچ کر سکتا ہے۔ اگر وہ اُردو ادب کا مطالعہ کرنا چاہے تو جتنی کتابیں اسے واشنگٹن میں مل سکتی ہیں، شاید ہندوستان کی کسی لائبریری میں بھی نہیں ملیں گی۔ نئی دلی میں لائبریری آف کانگریس کے مرکز کا شاندار دفتر ہے۔ یہاں ایرکنڈیشنڈ کمرے ہیں، بہترین فرنیچر ہے کام کرنے والوں کے لئے جتنی ہے کوئی ادارہ ان کے برابر تنخواہ نہیں دے سکتا۔ لیکن امریکن بے دریغ روپیہ خرچ کرتے ہیں تو کام لینا بھی جانتے ہیں ان کے یہاں وقت کی پابندی لازمی ہے۔ ایک منٹ کی دیر بھی برداشت نہیں کی جاتی۔ دن بھر میں صرف آدھا گھنٹہ دوپہر کے کھانے کے لئے ملتا ہے۔ ۱۵-۱۵ منٹ کے لئے چائے کا وقفہ بھی ہوتا ہے اس کے علاوہ ایک منٹ

بھی آرام کے لئے نہیں ملتا۔ اس دفتر میں ہر کام کرنے والے کو ہفتہ واری رپورٹ پیش کرنا پڑتی ہے، اپنے کام کے اعداد و شمار فراہم کرنے پڑتے ہیں۔ ایک ہفتہ میں اس نے کتنا کام کیا، کتنا باقی ہے اور کیوں باقی ہے ۔ ساری تفصیل دینا ہوتی ہے۔

کتابوں کی فراہمی کے لئے اس دفتر نے کئی کتب فروشوں کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں ۔۔ وہ کتابیں جمع کرکے انتخاب کے لئے بھیج دیتے ہیں عصمت ان کتابوں کا انتخاب کرتی ہیں۔ جو کتابیں منتخب ہو جائیں وہ رکھ لی جاتی ہیں، باقی کتب فروشوں کو واپس کر دی جاتی ہیں۔ عصمت کو ہر کتاب سرسری طور پر پڑھنا پڑتی ہے۔ منتخب شدہ کتاب لسٹ میں درج ہو جاتی ہے اس کا ایک کارڈ بنایا جاتا ہے۔ عصمت نے اب تک آٹھ ہزار کتابوں کے کارڈ بنائے ہیں۔

عصمت بریلی میں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کے والد جناب معین المظفر خیدوری کے زمیں دار تھے عصمت روہیلے پٹھانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے جد امجد نواب نجیب الدولہ تھے جنہوں نے نجیب آباد بسایا تھا۔ غدر کے زمانے میں جب نجیب آباد میں شورش بپا ہوئی تو عصمت کی پردادی اپنے دونوں بیٹوں کو لے کر رام پور آ گئیں۔ ان کے ایک بیٹے کا نام حمید المظفر تھا اور دوسرے کا نام عظیم الدین حمید المظفر عصمت کے دادا تھے۔ عظیم الدین بعد میں جنرل عظیم الدین بن گئے جنرل عظیم الدین کچھ عرصہ رام پور کے وزیر اعظم بھی رہے۔ روہیلوں کی دو شاخیں تھیں۔ ایک شاخ نجیب آباد میں تھی اور دوسری پیلی بھیت میں۔ پیلی بھیت کی شاخ کے سربراہ حافظ رحمت خاں تھے۔ حافظ رحمت خاں عصمت کی والدہ کے جد امجد تھے۔ اس طرح عصمت ایک "دو آتشہ" پٹھان ہیں۔

عصمت کی ابتدائی تعلیم بریلی میں ہوئی۔ انہوں نے آگرہ یونیورسٹی سے بی اے اور پھر ایم اے کیا ایم اے میں ان کا مضمون اردو ادب تھا۔ ایم اے میں وہ یونیورسٹی میں اوّل آئیں۔ ۱۹۵۷ میں عصمت کی شادی مظفر شاہ سے ہو گئی مظفر وزارت رسل و رسائل میں ملازمت کرتے تھے ۱۹۶۳ میں وہ جرنلزم میں ایم اے کرنے کے لئے امریکہ گئے تو عصمت بھی ان کے ساتھ گئیں۔ امریکہ میں یہ دونوں کیلی فورنیا کی برکلے یونیورسٹی میں رہے۔ عصمت برکلے میں امریکنوں کو اردو اور ہندی پڑھاتی تھیں۔ دو سال امریکہ میں رہنے کے بعد دونوں ہندوستان واپس آ گئے۔ ۱۹۶۸ میں مظفر شاہ کا انتقال ہو گیا۔

عصمت جب برکلے یونیورسٹی میں اردو پڑھاتی تھیں تو انہیں لائبریری آف کانگریس کے ہندوستانی مرکز کا پتہ چلا۔ یہ مرکز دلی میں ۱۹۶۲ میں قائم ہوا تھا۔ عصمت ۱۹۶۵ میں ہندوستان آئیں تو انہوں نے اس مرکز میں کام کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ ۱۹۶۶ میں انہیں ملازمت مل گئی۔ اب انہیں اس مرکز میں کام کرتے ہوئے گیارہ سال ہو گئے ہیں

مسلم پرسنل لا کے متعلق عصمت کا خیال ہے کہ اسے یوں ہی رہنے دیا جائے تو بہتر ہے ۔ تعدّدِ ازدواج اور یک طرفہ طلاق معمولی چیزیں ہیں۔ آج کل کے زمانے میں کوئی ان کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھاتا۔ اس قانون سے مسلمانوں کو کوئی تکلیف نہیں پہنچتی۔ ہاں اس میں ترمیم کرنے کے ارادے سے ان کو ضرور تکلیف پہنچتی ہے۔ اس ترمیم سے مسلمانوں میں شورش برپا ہو گی۔

والدین کی پسند کا رشتہ اور محبت کی شادی کے متعلق عصمت کا نظریہ بین بین ہے۔ جس لڑکی کی شادی ہو رہی ہے اسے رشتے کو نامنظور کرنے کا حق ملنا چاہئے۔ آخر اس کو لڑکے کے ساتھ زندگی گذارنا ہے۔ اس کے برعکس عصمت ایسی محبت کی شادی کے خلاف ہیں جس میں والدین کو یکسر نظر انداز کر دیا جائے ان کے خیال میں والدین کو راہ نمائی کرنے کا حق ہے، بلکہ یہ ان کا فرض ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آج کل والدین بھی رشتہ ڈھونڈنے کی ذمہ داری سے کتراتے ہیں اس لئے وہ لڑکی کو چھوٹ دے دیتے ہیں کہ وہ جسے چاہے پسند کر لے۔

عصمت کے خیال میں مخلوط تعلیم میں کوئی حرج نہیں۔ زمانہ بدل گیا ہے۔ لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے سے مل جل سکتے ہیں یہ دوستی دوستی تک ہی ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ بلکہ یہ دوستی صحت مند ہے۔ اس طرح لڑکیوں کی بے جا شرم اور جھجک دور ہو جاتی ہے۔ عصمت فیملی پلاننگ کے حق میں ہیں ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر یہ بہت ضروری ہے آبادی کے اندھا دھند اضافے نے ہم کو بھکاری بنا دیا ہے۔ ایک فصل بھی خراب ہو جائے تو قحط کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں اور ہمیں دوسرے ملکوں کے آگے دامن پھیلانا پڑتا ہے۔ اس معاملے میں ہمیں جذبات سے زیادہ حقیقت پسندی سے کام لینا چاہئے۔

آج کل ساری دنیا کی عورتوں میں بیداری کی لہر اٹھی ہے۔ خصوصاً امریکہ میں عورتوں نے تو مردوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا ہے۔ عصمت امریکہ میں رہ چکی ہیں۔ ان کے خیال میں امریکہ کی عورت مردوں کے لئے ایک تفریح کا ذریعہ ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ وہاں مرد نے عورت کو ایک گڑیا بنا دیا ہے۔ مرد اسے نت نئے زیورات پہناتے ہیں اس کے لئے طرح طرح کے لباس تراشتے ہیں وہاں کی عورت عریاں سے بے وقوف بنائی جاتی ہے، اشتہار بازی میں اس کی نمائش کی جاتی ہے۔ وہ مردوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ گئی ہے۔ قدرتی طور پر وہاں اس کا ردِ عمل ظاہر ہو رہا ہے عورتوں نے بغاوت

کے جوش میں نسوانیت کو ہی طاق پر رکھ دیا ہے لیکن یہاں حالات اس کے برعکس ہیں۔ یہاں کبھی عورت پر ظلم ہوا ہے۔ وہ چرنوں کی داسی رہی ہے لیکن مرد نے عورت کو کبھی کھلونا نہیں بنایا۔ آج بھی ہندوستانی مرد غیر عورت کو بہن اور ماں کہہ کر پکارتا ہے۔ امریکہ میں کوئی مرد عورت کو ماں اور بہن کا رتبہ نہیں دیتا۔ یہاں مرد نے عورت کو دیوی کا مرتبہ دیا ہے، اس کی عزت کی ہے ہندوؤں میں گذشتہ زمانے میں عورت کا کوئی حق نہیں تھا وہ اپنے خاوند سے طلاق نہیں لے سکتی تھی اپنے باپ اور خاوند کی جائیداد میں اسے کوئی حصہ نہ ملتا تھا لیکن آج یہ سب کچھ بدل گیا ہے۔ امریکہ میں عورت پر ظلم نہیں ہوا اس کے باوجود وہ بغاوت پر آمادہ ہے غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں عورت کو کسی بڑے عہدے کے لائق نہیں سمجھا جاتا۔ وہ کلرک اور ٹائپسٹ ہو سکتی ہے، لیکن صدر یا گورنر نہیں بن سکتی۔ ہندوستان میں عورتوں نے بڑے بڑے عہدے حاصل کئے ہیں۔

عصمت ایک زمیندار خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ یوپی کے زمیندار عیش و عشرت کی زندگی گذارتے تھے۔ عصمت کا بچپن بھی اسی ماحول میں گذرا۔ انہوں نے اسی جاگیرداری نظام میں آنکھ کھولی۔ گھر میں نوکروں کی فوج تھی۔ ان میں آیائیں، خادمائیں اور مُغلانیاں تھیں، میراثنیں تھیں، غرض ہر طرف نوکروں کی ریل پیل تھی۔ اس کے علاوہ سواری کے لئے موٹریں، بگھیاں اور تانگے تھے ایک موٹر اور ایک ڈرائیور بچوں کے لئے مخصوص تھا۔ خانساماں نے کھانا پکایا، بیروں نے میز پر لگایا، خادموں نے ہاتھ دُھلوائے، غرض عصمت نے کبھی اٹھ کر پانی بھی نہیں پیا۔ عصمت کو وہ زمانہ اچھی طرح یاد ہے جب عورتیں شادی بیاہ کی تقریب میں فرشی پائجامے پہنتی تھیں، یہ فرشی پائجامہ ایک عظیم الشان غرارہ ہوتا تھا۔ اس میں ۲۲ گز کپڑا لگتا تھا۔ اطلس اور کمخواب کے یہ غرارے باندیاں اٹھا کر پیچھے پیچھے چلتی تھیں۔ ان فرشی پائجاموں کو ہاتھ میں لے کر چلنا اور ان کی تہیں ہاتھ میں رکھ کر بیٹھنا بھی ایک فن تھا۔ ان پائجاموں کا سینا ہر درزی کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کے لئے خاص مُغلانیاں ہوتی تھیں جو انہیں ہاتھ سے سیتی تھیں، عصمت کے والد ہر سال پورے تام جھام کے ساتھ نینی تال جاتے اور وہاں گرمیوں کا موسم گذارتے اس سفر میں ان کے کتے بھی ان کے ساتھ رہتے تھے

باورچی خانہ ان کے گھر سے دور تھا عصمت نے مہینوں باورچی خانے کی شکل نہیں دیکھی — باورچی خانے سے ملحق نوکروں کے گھر تھے۔ یہ شاگرد پیشہ کہلاتے تھے۔ نوکروں کے لئے الگ کھانا بنتا تھا یہ محلے کا سالن کہلاتا تھا۔ اس میں شوربا بہت ہوتا تھا۔ عصمت کو یہ سالن گھر کے کھانے سے زیادہ مرغوب تھا۔ وہ ضد کر کے یہی محلے کا سالن کھاتی تھیں۔ نوکر اپنے پورے خاندان کو لے آتے۔ ان کے بچے یہیں پل کر جوان ہوتے اور انہیں کسی نہ کسی کام پر لگا دیا جاتا نوکروں کے اہل و عیال کو بار نہیں سمجھا جاتا تھا۔

اب عصمت کو یہ سب کچھ خواب سا معلوم ہوتا ہے۔ زمینداری کے خاتمے کے بعد یہ عیش و عشرت کی زندگی بھی ختم ہو گئی۔ یوپی کے زمیندار جو کام کو عیب سمجھتے تھے، جو آرام طلب تھے، جو سست اور کاہل تھے، زمینداری نظام کے ختم ہونے کے بعد پریشان ہو گئے۔ صدیوں کی عادتیں یک لخت نہیں بدل سکتیں آنے والی نسل نئے نظام میں آنکھ کھولے گی۔ ان کو کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ مصیبت تو ان کی ہے جنہوں نے عیش کا زمانہ دیکھا ہے۔ وہ کیسے موجودہ حالات سے سمجھوتہ کر لیں، یہ سمجھوتہ مشکل ہے۔ لیکن عصمت نے اس مشکل کو آسان کر دکھایا ہے۔ انہوں نے بڑی آسانی سے اپنے آپ کو نئے ماحول میں ڈھال لیا ہے اس میں ان کی فطرت کا بڑا ہاتھ ہے۔ انہیں بچپن سے ہی سستی اور کاہلی ناپسند تھی۔ وہ اپنے گھر میں اکیلی لڑکی ہیں۔ ان کے چار بھائی ہیں۔ بہن کے نہ ہونے سے انہیں بھائیوں کے ساتھ کھیلنا پڑتا۔ انہیں مردانہ کھیل پسند تھے۔ انہوں نے فٹ بال، والی بال، باسکٹ بال اور ٹینس کھیلے۔ بیڈمنٹن میں انہوں نے انعام بھی حاصل کیا۔ سائیکل سواری اور گھوڑ سواری بھی انہیں پسند تھی، یہاں تک کہ انہوں نے کبڈی کو بھی نہیں چھوڑا۔ وہ خالی بیٹھنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ شاید ان کی شخصیت کا یہ پہلو ہی ان کی بعد کی زندگی میں کام آیا۔ ان کے خاندان میں لڑکیوں کی ملازمت کو برا سمجھا جاتا تھا لیکن عصمت نے اس بات کی پرواہ نہیں کی۔

عصمت کو زیورات خریدنے کا شوق ہے۔ کس عورت کو یہ شوق نہیں ہوتا؟ لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ زیورات پہننا انہیں پسند نہیں۔ ان کے خیال میں زیورات پہننے کا مقصد نمائش کے سوا کچھ نہیں انہیں قیمتی لباس سے رغبت نہیں۔ ان کے خیال میں لباس سادہ اور نفیس ہونا چاہئے۔ انہیں موسیقی سے لگاؤ ہے۔ وہ ہارمونیم اور طبلے کی شوقین ہیں۔ وہ اچھا کھانا پکا سکتی ہیں لیکن انہیں اچھا کھانے کا شوق نہیں ہے۔ عصمت نے اپنی والدہ کی طرح سوشل ورک میں بھی حصہ لیا ہے ان کی والدہ نے دوسری جنگ عظیم کے دوران بریلی میں سوشل ورک کیا تھا۔ انہیں "قیصر ہند" کا تمغہ اور ٹائیٹل ملا تھا۔ عصمت کو ملازمت سے پہلے سوشل ورک کرنے کا موقع ملا تھا اب اس کام کے لئے انہیں ملازمت سے فرصت نہیں ملتی۔

عصمت کے تین بچے ہیں۔ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ بڑی لڑکی کالج میں تعلیم پا رہی ہے۔ دونوں چھوٹے بچے ابھی اسکول میں زیر تعلیم ہیں۔ ○

نیا ایڈیشن شائع ہوگیا

رشیدہ کی کشیدہ کاری

کشیدہ کاری کے نئے نئے

ڈیزائن، عمدہ بوٹیاں، لاجواب بیلیں، کراس اسٹچ، کٹ ورک،

موتیوں کا کام، مونوگرام، سینریاں، تکیے کے اشعار اور

ڈیزائن، پیٹی کوٹ کے بارڈر، قمیصوں کے گلے،

کٹ ورک، اسموکنگ، لیزی ڈیزی، غرض یہ کہ

رشیدہ کی کشیدہ کاری

ایک ایسی مکمل اور جامع کتاب ہے جس کی

مدد سے نوآموز بہنیں بھی بڑی آسانی سے اپنے

حسبِ پسند ڈیزائن بنا سکتی ہیں۔

اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں



قیمت:

۷ روپے ۵۰ پیسے

پہلا جھوٹ

روشن آرا



بانو نئی دہلی مئی ۱۹۷۷

کلب میں نئے سال کے استقبال کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ کلب کی عمارت دُلہن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ لان میں رنگین بتیوں کی قطاریں روشن تھی۔ دس بجے تک کلب مہمانوں سے بھر گیا تھا مرد قیمتی اور بیش قیمت سوٹوں میں ملبوس تھے۔ عورتیں رنگین اور زرق برق ساڑیوں میں تتلیوں کی طرح منڈلا رہی تھیں۔ سارے ماحول پر پرستان کا گمان ہوتا تھا۔

شوبھا بھی اپنے ماں باپ کے ساتھ نئے سال کے جشن میں شریک ہونے کے لئے آئی تھی۔ اس کے باپ سوہن لال کپور شہر کے سرکردہ ٹھیکے دار تھے۔ شوبھا بی اے میں تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ وہ بہت خوبصورت تو نہیں تھی لیکن اس کی آنکھوں میں ایک خاص مقناطیسی کشش تھی۔ اس کی صحت قابلِ رشک تھی، جوانی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ وہ آج پہلی دفعہ نئے سال کا جشن منانے کلب میں آئی تھی۔

سوہن لال اپنی بیوی امبھا اور بیٹی شوبھا کے ساتھ ایک ٹیبل پر بیٹھے تھے۔ ہال میں بینڈ کی دُھن پر کچھ جوڑے رقص کر رہے تھے۔ یکایک دو نوجوان ان کی ٹیبل کے پاس آئے۔ ان میں سے ایک نوجوان نے سوہن لال کو نمستے کہا اور بولا "انکل آپ مجھے پہچانتے ہیں؟ میں جیون لال کھنہ کا بیٹا ہوں میرا نام رمیش ہے۔"

سوہن لال بولے "اچھا تم جیون کے بیٹے ہو۔ میں نے تمہیں کئی سال پہلے دیکھا تھا۔ سنا تھا کہ تم انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے کہاں چلے گئے ہوئے تھے۔ آؤ بیٹھو۔ تمہارے باپ کہاں ہیں۔ اور یہ تمہارے ساتھ کون ہیں۔؟"

رمیش نے جواب دیا "ڈیڈی تو کسی کام سے باہر گئے ہیں۔ یہ میرا دوست موتی ہے۔"

سوہن لال نے کہا "کوئی بات نہیں۔ آج کی شام تم ہمارے مہمان ہو۔ یہ میری بیوی امبھا ہے اور یہ میری بیٹی شوبھا۔"

دونوں نوجوان ان کو نمستے کہنے کے بعد اسی ٹیبل پر بیٹھ گئے کچھ دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ رمیش نے پھر موتی کا تعارف شوبھا سے کرایا۔ اس نے کہا "موتی بڑا عجیب آدمی ہے۔ بہت حقیقت پسند۔ بناوٹ اور تکلف اس میں نام کو نہیں۔ یہ خواب نہیں دیکھتا۔ میرے خیال میں اگر انسان خواب نہ دیکھے تو اس کی زندگی اجیرن ہو جائے۔"

شوبھا نے مسکرا کر موتی کی طرف دیکھا۔ موتی ایک پستہ قد نوجوان تھا۔ یہ بدصورت تو نہ تھا لیکن اس کے چہرے پر کافی گہرے چیچک کے داغ تھے۔ شوبھا نے سوچا کہ شاید موتی کی بدصورتی نے ہی اس کی زندگی کو تلخ بنا رکھا ہے۔ اس نے موتی سے پوچھا "کیا رمیش سچ کہتے ہیں کہ انسان کی زندگی خوابوں کے سہارے ہی چلتی ہے؟"

موتی نے جواب دیا "لیکن خواب بہت جلد ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور خواب کے ٹوٹنے سے جو تکلیف ہوتی ہے وہ ٹانگ ٹوٹنے سے زیادہ ہوتی ہے۔"

شوبھا ہنس پڑی۔ سوہن لال ان کی گفتگو سے بور ہو رہے تھے۔ وہ اپنی بیوی کو لے کر کچھ دیر کے لئے دوسری ٹیبل پر جا بیٹھے جہاں ان کے کچھ ہم عمر دوست بیٹھے تھے۔

رمیش ایک خوب رو جوان تھا۔ اس کے گھنے بال کندھوں کو چھو رہے تھے۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی مگر تیز تھیں۔ وہ شوبھا کے قریب بیٹھ گیا۔ اسے شوبھا پسند آئی تھی۔ وہ اپنی پسند کا جواب حاصل کرنا چاہتا تھا۔ کبھی کبھی دونوں کے گھٹنے ایک دوسرے سے چھو جاتے لیکن شوبھا اپنے گھٹنے کو دُور کرنے کی کوشش نہ کرتی ایک دفعہ باتوں ہی باتوں میں رمیش نے شوبھا کا بازو تھام لیا تو شوبھا نے اپنا بازو نہیں چھڑایا۔ محبت جتانے کے لئے زبان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جسم کے اعضاء بھی محبت کی زبان بولتے ہیں۔ رمیش کو اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ موتی یہ کھیل دیکھ کر مسکرایا۔ اور بولا "رمیش تمہیں والٹز پسند ہے۔ اس وقت والٹز کی دُھن بج رہی ہے۔ تم شوبھا

سکے ساتھ ڈانس کیوں نہیں کرتے ؟"

رمیش نے تشکر بھری نظروں سے موتی کو دیکھا اور بولا۔ "ہاں یار مجھے تو ڈانس کا خیال ہی نہیں آیا۔ کیا آپ میرے ساتھ ڈانس کرنا پسند کریں گی مس شوبھا؟"

شوبھا کھڑی ہو گئی اور دونوں ڈانس فلور پر چلے گئے۔ ڈانس کرتے وقت رمیش کو اپنے سارے سوالوں کا جواب مل گیا۔ وہ سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے۔ رمیش نے شوبھا سے دوبارہ ملنے کا وعدہ لے لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد دونوں اپنی اپنی ٹیبل پر آ کر بیٹھ گئے۔

رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ رمیش اور شوبھا ناچ میں مصروف تھے۔ یکایک مائیک پر سالِ نو کی آمد کا اعلان ہوا۔ اور ہال کی ساری بتیاں بجھ گئیں۔ رمیش نے کہا "نیا سال مبارک ہو" اور شوبھا کو کس کر اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لیا۔ شوبھا نے بھی اس کے کندھے سے ہاتھ کو سرکا کر اس کے گلے میں ڈال دیا اور کہا "نیا سال مبارک ہو"۔ بتیاں جلنے کے بعد بھی وہ اسی حالت میں ناچتے رہے۔

ایک بج چکا تھا۔ سوہن لال اپنی ٹیبل پر واپس آ گئے۔ شوبھا بھی تھک گئی تھی۔ سوہن لال نے کہا "ایک بج چکا ہے۔ اب گھر چلتے ہیں۔ نیا سال مبارک ہو"۔

رمیش بولا "آپ کو بھی نیا سال مبارک ہو" اور سوہن لال سے ہاتھ ملا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ شوبھا اسے عجیب نظروں سے تک رہی تھی۔ رمیش کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اسی ٹیبل پر بیٹھا رہے۔ شوبھا اس کے سامنے ہو۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ ایک دوسرے کو اپنے دل کا حال سناتے رہیں۔ اس نے با دلِ ناخواستہ سوہن لال سے رخصت لی اور موتی کو ساتھ لے کر کلب سے باہر نکل آیا۔

تیسرے دن اتوار تھا۔ رمیش موتی کو لے کر سوہن لال کے گھر چلا گیا۔ رمیش نے گھنٹی بجائی۔ شوبھا نے دروازہ کھولا۔ وہ رمیش کو دیکھ کر کھل اٹھی اور بولی "آیئے آیئے۔ ڈیڈی ممی کو لے کر کسی دوست سے ملنے گئے ہیں۔"

دونوں دوست ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ شوبھا نے نوکر سے چائے بنانے کے لیے کہا۔ جب چائے آ گئی تو شوبھا نے ایک کپ بنا کر رمیش کو دیا۔ چائے کا کپ دیتے وقت اس کی انگلیاں رمیش کی انگلیوں سے چھو گئیں۔ تو اس کے چہرے پر سرخی چھا گئی۔ وہ تینوں چائے پی رہے تھے کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ نوکر نے دروازہ کھولا۔ شوبھا اپنی سہیلی کو دیکھ کر تقریباً چیخ اٹھی "رما! آؤ آؤ میں تمہارا کتنے دنوں سے انتظار کر رہی ہوں۔" اس نے رمیش اور موتی سے رما کا تعارف کرایا۔ "یہ میری کالج کی سہیلی ہے، رما۔ اگلے مہینے اس کی شادی ہونے والی ہے۔ اس کا ہونے والا شوہر لندن میں رہتا ہے۔ شادی ہوتے ہی یہ لندن چلی جائے گی۔ ہائے کتنی خوش نصیب ہے رما۔"

رما شرما گئی اور بولی "میں تو اپنا ملک چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی، مگر کیا کروں مجبوری ہے۔"

موتی فوراً بولا "مگر یہ کتنی حسین مجبوری ہے۔ شادی کے ساتھ ساتھ لندن کی سیر کا موقع بھی مل جائے گا۔"

رمیش نے موتی کی بات کاٹی "آپ اس کی باتوں کا خیال نہ کیجئے۔ اس کا دماغ چلا ہوا ہے۔ یہ ہمیشہ ایسی ہی باتیں کرتا ہے۔ یہ دراصل شادی کے ہی خلاف ہے۔"

موتی بولا "رمیش ٹھیک کہتا ہے۔ میں واقعی شادی کے خلاف ہوں۔ میرے خیال میں شادی کی بنیاد دھوکے پر قائم ہے۔ شادی کا دوسرا نام جھوٹ ہے۔ شادی کے بعد انسان جھوٹ بولنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ شادی کی قسمیں اور عہد سب جھوٹ ہیں۔ اور جھوٹ بولنے سے روح مر جاتی ہے۔ کیا آپ شادی کے لیے جھوٹ بولنا بہت ضروری ہے۔ شادی کے پہلے جھوٹ کی طرف پہلا قدم ہے۔"

موتی بولے جا رہا تھا۔ رما کے چہرے پر ناراضگی کی پرچھائیں آ گئی اور وہ کہہ اٹھی "شادی ایک پرانا ادارہ ہے۔ یہ صدیوں سے دنیا میں رائج ہے۔ اگر آپ سچ کہتے ہیں تو کیا صدیوں سے انسان جھوٹ بول رہا ہے؟"

موتی نے کہا "انسان جھوٹ بولنے پر مجبور ہے۔ شادی کا ادارہ مردوں نے رائج کیا ہے، اور اس کا سب سے زیادہ فائدہ عورتوں کو پہنچتا ہے۔ دراصل شادی عورت کو کرنی چاہیئے مرد کو ہرگز نہیں۔"

رما بولی "یہ کیا بات ہوئی؟ عورت مرد سے شادی نہیں کرے گی تو کیا مٹی کے بت سے کرے گی؟"

موتی نے کہا "آپ یہ بات سمجھ نہیں سکیں۔ شادی کی بنیاد ملکیت کا تصور ہے۔ پہلے انسان عورت کو اس طرح خریدتا تھا جس طرح مویشی کو، بلکہ پرانے زمانے میں تو ایک گھوڑے کی قیمت دس عورتوں کے برابر تھی۔ بگی اور بھاپ کی ایجادات سے گھوڑے کی قیمت کم ہو گئی ہے۔ لیکن عورت کی قیمت نہیں بڑھی۔ مرد جس طرح مکان خریدتا ہے، فرنیچر خریدتا ہے، اسی طرح عورت کو خریدتا ہے۔ اس خریداری کو شادی کا نام دینا جھوٹ ہے۔"

شوبھا موتی کی باتیں صبر سے سن رہی تھی۔ آخر اس سے نہ رہا گیا۔ وہ بولی۔ "اگر شادی کی بنیاد ملکیت کا تصور ہے تو یہ مرد کی اجارہ داری نہیں۔ عورت بھی مرد کو اپنی ملکیت سمجھتی ہے۔ اس میں کیا حرج ہے؟"

موتی نے کہا: "آپ نے میرے مونہہ کی بات چھین لی۔ موجودہ زمانے میں خرید و فروخت دونوں طرف سے ہوتی ہے۔ عورتیں جہیز دے کر مرد کو خریدتی ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں شادی سے عورتوں کو فائدہ ہی فائدہ ہے۔ وہ مرد کی زندگی کو محدود کر دیتی ہیں۔ وہ اس کی ذات کا مرکز بن جاتی ہیں۔ اس قید کا سلسلہ شادی سے پہلے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ جب کوئی مرد محبت میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ اپنے کام کاج کی طرف سے غافل ہو جاتا ہے۔ وہ بس اپنی محبوبہ کے متعلق ہی سوچتا رہتا ہے۔ وہ گردن جھکائے دل کے آئینے میں تصویر یار دیکھتا رہتا ہے۔ شادی کے بعد اس کی حالت اور دگرگوں ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو بھول جاتا ہے۔ اب اس کی ساری آمدنی بیوی کی فرمائشیں پوری کرنے میں صرف ہو جاتی ہے۔ بیوی کی سیاہ زلفوں میں اسیر ہو کر وہ پرانے رشتے ناطے بھول جاتا ہے۔ بچے ہونے کے بعد تو اس کا خاتمہ بالخیر ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے دوستوں سے قطع تعلق کر دیتا ہے۔ بچوں کی دیکھ بھال اور ان کی دکھ بیماری اسے دوستوں کی محفل سے باہر نکال دیتی ہے۔"

رمیش کو موتی کی باتیں ناگوار گذریں وہ بولا "بس کرو موتی۔ آج کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ کچھ کل کے لئے بھی اٹھا رکھو۔ تم کچھ بھی کہو، شادیاں ہوتی رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔" یہ کہہ کر رمیش کھڑا ہو گیا۔ موتی بھی اس کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں نے شوبھا سے اجازت چاہی اور گھر سے باہر نکل آئے۔

رمیش موتی کو پسند کرتا تھا، لیکن اس کی اول جلول باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ اس نے شوبھا کے گھر دوبارہ موتی کو ساتھ لے جانا مناسب نہ سمجھا۔ اب وہ اکیلا ہی شوبھا کے گھر جاتا۔ شوبھا کے ماں باپ نئے خیال کے تھے۔ انہیں بھی رمیش پسند تھا۔ ان کی محبت پروان چڑھتی گئی اور ایک دن رمیش نے شوبھا سے شادی کی بات چھیڑ دی۔ شوبھا نے شرما کر سر جھکا لیا۔ "آپ ڈیڈی سے بات کیجئے۔" رمیش نے اپنی ماں سے شوبھا کا تذکرہ کیا۔ اس کے ماں باپ شوبھا کو دیکھنے آئے۔ شوبھا انہیں پسند تھی۔ چنانچہ شادی طے ہو گئی۔

رمیش نے موتی کو جب اپنی منگنی کی خبر سنائی تو وہ بولا۔ "مجھے معلوم تھا کہ تمہاری محبت کا یہی انجام ہونا تھا۔ کیا تم شوبھا کو اچھی طرح جانتے ہو؟ کیا وہ تمہیں سمجھتی ہے؟ تم دونوں نے اپنے بہترین پہلو ایک دوسرے کو دکھائے ہیں۔ پہلے تم ایک دوسرے کو اپنی کمزوریوں سے بھی آگاہ کرو۔ شادی کے بعد کمزوریاں سامنے آئیں گے تو پریشان ہو جاؤ گے۔"

رمیش نے کہا "تم سچ کہتے ہو۔ مجھے اپنی کمزوریاں معلوم ہیں، مگر شوبھا کی کمزوریوں کا پتہ نہیں لیکن مجھے اس کی پروا نہیں۔ محبت اندھی ہوتی ہے۔ اور ....."

موتی نے اس کی بات کاٹی۔ "شادی سے بینائی واپس آ جاتی ہے۔"

رمیش کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ "تم شکی ہو۔ شادی کے بعد ہم ایک دوسرے کی کمزوریوں سے واقف ہو جائیں گے ....."

"اور اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لئے جھوٹ کا سہارا لیں گے۔" موتی نے پھر اس کی بات کاٹی۔

رمیش نے کہا۔ "مجھے اُمید ہے کہ ہم ایک دوسرے کی کمزوریوں کو تسلیم کر لیں گے۔ ہماری محبت کمزوریوں پر غالب آ جائے گی۔" موتی بولا "یہ تمہارا خیال ہے لیکن مجھے معلوم ہے کہ تم میری بات نہیں مانو گے۔"

رمیش کی شادی ہو گئی۔ شوبھا جیسی لڑکی پا کر وہ بہت خوش تھا۔ وہ دونوں ہنی مون منانے کے لئے کشمیر گئے۔ ہر صبح اُن کے لئے خوشیوں کا پیام لاتی، ہر رات رنگین ہوتی۔ دونوں بہت مگن تھے۔ کشمیر سے واپس آ کر رمیش نے اپنے ماں باپ کے ساتھ رہنا شروع کر دیا۔

کشمیر سے واپسی کے بعد کچھ روز تو سکون سے کٹ گئے، لیکن رمیش کے ساتھ رہنے کے بعد شوبھا کو معلوم ہوا کہ رمیش کو گھر میں رہنا پسند ہے۔ وہ چھٹی کے روز بھی گھر میں رہتا تھا۔ ایک اتوار کو اس نے رمیش سے باہر چلنے کا مطالبہ کیا۔ وہ دن بڑا خوشگوار تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ شوبھا گھر میں رہتے رہتے اُوب گئی تھی۔ اُس نے رمیش سے کہا "چلو آج پکنک پر چلتے ہیں، بڑا اچھا موسم ہے۔"

رمیش بولا "نہ بھئی، یہ میرے بس کی بات نہیں۔ جو موسم گھر میں ہے وہی باہر بھی ہے اس کے لئے باہر جانے کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے باہر جانا اچھا نہیں لگتا۔"

شوبھا سُن ہو گئی۔ اس کو بہت ملال ہوا۔ لیکن اس نے اپنی ناراضگی کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ وہ بولی "اچھا چلو، پکچر دیکھنے چلتے ہیں۔ آج کل ریگل پر بڑی اچھی پکچر چل رہی ہے۔"

رمیش نے بے رُخی سے جواب دیا: "پکچر

دیکھنے سے مجھے خدا واسطے کا بیر ہے۔ یہ تین گھنٹے کی قید ہے اور پانچ روپے جرمانہ الگ ادا کرنا پڑتا ہے۔ مار دھاڑ اور جھوٹے سچے قصوں کے سوا پکچر میں کیا ہوتا ہے؟"

شوبھا تلملا گئی، لیکن اس نے اپنے غصہ پر قابو پا لیا۔ وہ سوچنے لگی، پہلے تو رمیش ایسا نہیں تھا۔ وہ ہر دوسرے تیسرے روز اسے گھمانے لے جاتا تھا۔ اس نے مجھے کبھی یہ نہیں بتایا کہ اُسے پکچر پسند نہیں۔ شادی کے بعد رمیش کو کیا ہو گیا؟ اُسے اپنی سہیلی کملا کی یاد آئی۔ کملا اور اس کا پتی موہن شادی کے بعد کتنا گھومتے تھے۔ گھر میں بیٹھنا تو وہ جانتے ہی نہیں تھے۔ آج ایک دوست کے یہاں پارٹی ہے، تو کل دوسرے کے یہاں۔ فلم اور اسٹیج کے دونوں رسیا تھے۔

شوبھا کو سوچ میں دیکھ کر رمیش بولا "کیا سوچ رہی ہو؟"

"کچھ نہیں" شوبھا نے سوچ کر جواب دیا۔

"کچھ تو ضرور سوچ رہی تھیں۔ بتاؤ کیا سوچ رہی تھیں؟" رمیش نے اصرار کیا۔

"میں سوچ رہی تھی کہ آج دوپہر کے کھانے کے لئے کیا بناؤں۔"

رمیش چپ ہو گیا۔ شادی کے بعد شوبھا نے پہلی دفعہ جھوٹ بولا تھا۔ جھوٹ بولنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔

آہستہ آہستہ شوبھا کو رمیش کی عادتوں سے واقفیت ہوتی گئی۔ وہ کبھی سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں نہ ڈالتا۔ شوبھا اُسے سمجھاتے سمجھاتے تھک گئی لیکن اُس کے کان پر جوں نہ رینگی، وہ نہایت ضدی اور خود سر تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا لڑکا تھا۔ اُسے ٹوکنے کی عادت نہیں تھی۔ شوبھا دم بخود رہ گئی۔ شادی سے پہلے کے چند مہینے اب اسے خواب کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ کیا کیا سپنے دیکھے تھے اس نے۔ سب ٹوٹ گئے۔ لوگ ٹھیک کہتے ہیں کہ ساتھ رہنے کے بعد ہی آدمی کے اصلی رنگ کا پتہ چلتا ہے۔

ایک دن شوبھا کے پاس ایک لفافہ آیا۔ اس کی کالج کی سہیلی کانتا کی برتھ ڈے پارٹی تھی۔ اس نے شوبھا اور رمیش کو بھی بلایا تھا۔ شوبھا نے رمیش کو پارٹی میں جانے کے لئے راضی کر لیا۔ وہ دونوں مقررہ وقت پر پارٹی میں پہنچ گئے۔ کانتا نے اپنی سہیلی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ سب مہمانوں سے رمیش اور شوبھا کا تعارف کرایا۔ رمیش اور شوبھا ایک ساتھ بیٹھ گئے۔ کانتا ان کے پاس آئی اور بولی "آپ دونوں یہاں بھی ایک دوسرے کو نہیں چھوڑتے۔ چلو شوبھا، تم میرے بھائی کے ساتھ بیٹھو۔ اور بھیا آپ میری بھابھی کے ساتھ بیٹھئے۔"

شوبھا یہ سن کر شرما گئی۔ کانتا نے اس کا بازو پکڑا۔ اور اسے اٹھا کر کمرے کے دوسری طرف لے گئی۔ جہاں اس کا بھائی رنجیت بیٹھا تھا۔ اپنی بھابھی کو اس نے رمیش کے پاس بٹھا دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد برتھ ڈے کیک کاٹا گیا۔ اور سب لوگ پلیٹیں بھر کر اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ رنجیت نے شوبھا سے باتیں شروع کر دیں۔ وہ حال ہی میں امریکہ سے واپس آیا تھا اسے سیر سپاٹے کا بہت شوق تھا۔ وہ ایک فری لانس جرنلسٹ تھا۔ وہ تقریباً آدھی دنیا گھوم چکا تھا۔ بڑے بڑے آدمیوں تک اس کی رسائی تھی۔ وہ پارٹیوں کا شوقین تھا۔ وہ شوبھا کو اپنی زندگی کے واقعات سناتا رہا۔ شوبھا [illegible] جاتا سے شوبھا ہی [illegible] لگے تھا کتنا جوان تھا [illegible] زندہ دل ہنس مکھ بات بات پر قہقہے لگاتا تھا۔ اسی کا نام زندہ دلی کا نام تھا۔ شوبھا احساس سی گئی۔

ہے۔

ادھر رمیش کانتا کی بھابھی کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھا۔ [illegible] کی لڑکی تھی وہ ایک سادہ سی سیدھی سجائی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ میک اپ سے رمیش سے باتیں کرتے وقت شرما رہی تھی۔ گھرانہ پرانے خیال کا تھا۔ [illegible] جاتے تھے۔ چندرا کو پارٹیاں پسند نہیں آتی ہیں ہجوم میں اس کا جی گھبراتا تھا گھر کی چار دیواری میں گذارنا اچھا لگتا اس سے کرید کرید کر اس کی زندگی کے بارے میں پوچھتا رہا۔ چندرا کے پاس بتانے اس کا پتی ہی اس کی زندگی ہے۔ جسے اپنے کرنا۔ اس کے کپڑے اور کتابیں اپنی اس کے آرام اور کھانے پینے میں اس کی زندگی تھا۔ وہ اپنے گھر ہی میں خوش تھا کہ خوشی گھر کے باہر نہیں ہے۔ پکچر سب فضول چیزیں ہیں۔ ہے، جو شوہر کے قدموں میں زیادہ رمیش کو چندرا کی سپاٹ ہے۔

شام کے سات بجے پریشان اور شوبھا میزبان سے رخصت کی وجہ ہو گئے۔ رات کو جب دونوں معمول شوبھا نے رمیش کو اپنے خیالات میں کھوئی "!

اچھا لڑکا ہے۔ کتنا خوش

لیکن وہ چپ ہوگیا۔

"تم کیا سوچ رہے تھے؟" اب شوبھا کی باری تھی۔ رمیش اپنی چوری پکڑے جانے پر جھنجھلایا لیکن اس نے بے تعلقی سے جواب دیا۔

"مجھے کل انکم ٹیکس کے دفتر جانا ہے۔ اس کے متعلق سوچ رہا تھا۔"

شوبھا کو معلوم تھا کہ رمیش جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے کہا۔ "تمہیں چندرا کیسی لگی؟"

رمیش کی تیوری پر بل آگیا۔ اس نے سوچا کہ یہ اس کا پرائیویٹ معاملہ ہے۔ شوبھا کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ مگر شوبھا کے سوال کا جواب دینا بھی ضروری تھا۔ وہ بولا "چندرا؟ کون چندرا؟"

شوبھا اس بے تعلقی سے متاثر نہیں ہوئی اس نے بڑے صبر سے چندرا کی شکل وصورت، قدوقامت اور لباس کی تفصیل بتائی، رمیش بولا۔ "اچھا' وہ چندرا! ہاں بس ٹھیک ہی تھی مگر وہ میرا ٹائپ نہیں۔ ہاں تم نے آج رنجیت سے بہت دیر تک باتیں کیں۔"

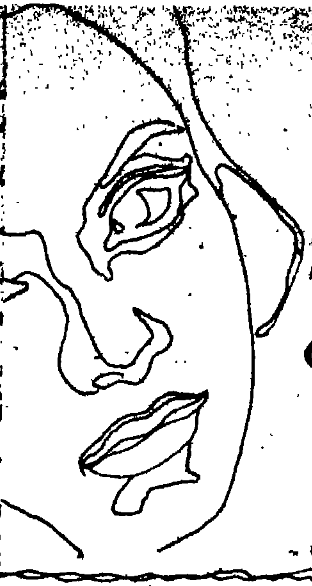
کیا باتیں ہوئیں؟ اب شوبھا کی چوری پکڑی گئی۔ مگر وہ گھبرائی نہیں۔ اس نے فوراً جواب دیا۔ "وہ تو ایک عام سا آدمی ہے۔ اپنی کامیابی کی داستانیں سناتا رہا۔ سارے وقت اپنے ہی متعلق باتیں کرتا رہا۔ مجھے ایسے آدمی پسند نہیں جو ہر وقت اپنے ہی گن گاتے رہیں۔" یہ کہہ کر شوبھا نے ایک جماہی لی اور بولی۔ "مجھے نیند آرہی ہے۔"

پھر اس نے کروٹ لی اور آنکھیں بند کرلیں اور سوچنے لگی کہ لوگ کہتے ہیں، جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ یہ شادی کیسا جھوٹ ہے جو عمر بھر چلتا رہتا ہے!



ی باتیں دلچسپ
شوبھا خوب رہا اور لمبا
آخر اس سے نہ رہ... شروع تھا۔ وہ
بنیاد ملکیت کا ت... کے نزدیک زندگی
نہیں۔ عورت ... کی باتوں میں کھو
اس میں کیا حسن
موتی سے بھابی چندرا کے
بات چھین لی۔ چندرا سیدھی سادھی
دونوں طرف سے ... ساڑی پہنے ہوئے
کر مرد کو خریدتی ہے ... سے بے نیاز تھا۔ وہ
شادی سے عورت ... گھبرا رہی تھی۔ اس کا
مرد کی زندگی کو محض کے باپ زمین ... ار
کا مرکز بن جاتی ہیں تھیں۔ لوگوں کے
سے پہلے ہی شروع ... تھا۔ وہ اپنا سارا وقت
محبت میں مبتلا ... بھا سمجھتی تھی۔ رمیش
طرف سے غافل ... کے متعلق پوچھتا
کے متعلق ہی سوچ ... کے لئے کچھ تھا ہی نہیں۔
دل کے آئینے میں ... مرکز تھا۔ اس کی بیوی
کے بعد اس کی حالت ... کی دیکھ بھال کرتا'
وہ اپنے ماں باپ کا خیال رکھنا بھی اس
ہے۔ اب اس کی ... تھی۔ اس کا خیال
پوری کرنے میں صرف ... پارٹیاں پلنگ
زلفوں میں اسیر ... اصل چیز گھر کا سکھ
جاتا ہے۔ نیچے ... رہ کر ہی ملتا ہے۔
ہو جاتا ہے۔ وہ ... باتوں میں مزہ آرہا تھا۔
دیتا ہے۔ بچوں کے ... پارٹی ختم ہوگئی۔ رمیش
بیماری اسے دو ... صحت لے کر گھر روانہ
دیتی ہے۔"
... بستر پر لیٹے تو خلاف
رمیش کو ... سے کوئی بات نہ کی۔ وہ
بولا "بس کرو موتی ... ہوئی تھی۔ رنجیت کتنا
کچھ کل کے لئے بھی ... مزاج ہے وہ۔ پارٹی
ہوتی رہی ہیں اور ...

آپ کی ذہنی الجھن اور اس کا حل



ڈاکٹر بھاٹیہ ایک مشہور ماہر نفسیات ہیں۔ وہ بانو پڑھنے والوں
نفسیاتی مسئلوں کا تجزیہ اور حل پیش کریں گے۔ پتہ: معرفت

س: میں ایک اسکول ٹیچر ہوں میری عمر ۲۵ سال
ہے۔ میری شادی طے ہو چکی ہے۔ شادی کے بعد
مجھے دوسرے شہر جانا پڑے گا۔ یہ ایک عجیب اتفاق
ہے کہ میری نسبت ہو جانے کے بعد میری ماں کی طبیعت
خراب ہو گئی ہے۔ کبھی کبھی ان پر دل کے دورے
کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ میں عجیب مشکل
میں گرفتار ہوں۔ میں شادی کرنا چاہتی ہوں
لیکن ماں کو اس حالت میں چھوڑنا بھی نہیں چاہتی
کوئی حل بتائیے۔ ناہید سلیم، بمبئی

ج: آپ نے یہ نہیں لکھا کہ گھر میں آپ کے علاوہ
اور کتنے لوگ ہیں۔ اگر آپ کے والد حیات نہیں اور
آپ کے چھوٹے بھائی بہن بھی ہیں تو آپ کی ماں
کی طبیعت کا خراب ہونا قدرتی ہے۔ ممکن ہے کہ
آپ گھر میں اکیلی کمانے والی ہوں۔ اس صورت میں
ان کا فکر مند ہونا فطری ہے۔ وہ چاہتی ہیں کہ
آپ اپنا گھر بسا لیں۔ ہر ماں کی یہی خواہش ہوتی
ہے۔ لیکن آپ کے جانے کے بعد گھر کا بوجھ کون
اٹھائے گا، آپ کی ماں اسی کش مکش میں مبتلا ہیں
اگر آپ اپنی ماں کا واحد سہارا ہیں تو
ان کو ساتھ رکھ سکتی ہیں۔ اس طرح آپ گناہ کے
احساس سے بچ جائیں گی۔ لیکن اگر آپ کے جانے سے
آپ کی والدہ پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا، اور وہ
آپ کے بغیر آرام سے زندگی گزار سکتی ہیں تو ان کی
بیماری کے نفسیاتی پہلو پر غور کرنا چاہئے۔
ماں کا رشتہ ایک اہم رشتہ ہے۔ بچے
ماں کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ وہ اس کی محبت
کے محتاج ہیں۔ ماں بلا کسی لالچ یا دباؤ کے
انہیں محبت دیتی ہے۔ اگر ماں کی طبیعت میں نرمی
ہے تو بچوں پر اچھا اثر پڑتا ہے یہ ان کو
جذباتی طور پر بالغ ہونے میں مدد دیتی ہے۔ ماں
کی محبت بے لوث ہوتی ہے۔ ماں کے مطابق ہوتی

ہے۔ وہ اپنے بچوں سے صلہ نہیں مانگتی۔ اس
ماحول میں پلے ہوئے بچے آزادی محسوس کرتے ہیں۔ وہ
اپنے ماں باپ سے کھل کر گفتگو کر سکتے ہیں۔ وہ ان
کی مخالفت بھی کر سکتے ہیں۔ اس مخالفت میں بھی
ادب کا عنصر شامل رہتا ہے۔ اس کے برعکس اگر
ماں کی طبیعت میں حکمرانی ہو تو حالات پیچیدہ ہو جاتے
ہیں۔ ماں ایک ہی صورت میں اپنی حکمرانی کو جاری
رکھ سکتی ہے۔ وہ صورت یہ ہے کہ اس کے بچے
بچے ہی رہیں اور بالغ نہ ہونے پائیں۔ مگر یہ فطرت
کے خلاف ہے۔ بچے ضرور بڑے ہوں گے اور اپنی
من مانی کریں گے۔ ماں کے لاشعور میں یہی خوف
جاگزیں رہتا ہے کہ بچوں کے بڑے ہوتے ہی اس
کا دباؤ اور اثر ختم ہو جائے گا۔ وہ اس کا تدارک
اس طرح کرتی ہے کہ بچوں کو بالغ نہیں ہونے
دیتی۔ بلوغت دو طرح کی ہوتی ہے۔ جسمانی اور
جذباتی۔ جسمانی طور پر بچے چاہے بڑے ہو جائیں
لیکن جذباتی طور پر وہ بچے ہی رہتے ہیں۔ ہم

...میں ایک رشتہ قائم ہو جاتا
...ل بچپن میں ہی بن جاتا ہے
...ا ہے تو یہی دستور التعلق ہو
...۔ وہ جب تنہائی محسوس کرتا
...ہوتا ہے تو محبت کے احساس
...کھانا شروع کر دیتا ہے۔
...رند آپ کے پاس نہیں۔ آپ
...تی ہیں۔ ممکن ہے کہ ان کے
...نے پر آپ فکر مند ہو جاتی ہوں
...احساس کو آپ کھانے سے
...بت اور خوراک کا پرانا رشتہ
...کھانا محبت کا بدل بن جاتا ہے
...نے پر بھی بے تحاشہ کھاتی ہیں
...ش کرنے سے یہ عادت کم نہ
اکثر لاشعوری ضرورت بن گیا
ہے۔ اس نکتے کو سمجھ جائیں تو آپ
اثر پا سکتی ہیں۔
ہو، پریشاں ہوتا ہے تو اسے اپنے
محسوس ہوتا ہے۔ یہ خالی پن
لیجر پر دور ہو جاتا ہے لیکن اس
ہی حل نہیں ہوتا۔ پریشانی کم
یہ اک بڑھ جاتی ہے۔ معدے
وہ کھانے کی عادت پڑ جائے
کو بتاتا ہے۔ اس طرح زیادہ
انواع بیل پڑ جاتی ہے۔
کھانے کی عادت سے پریشان
اسباب پر غور کریں جن کی وجہ
کھوئی ہے۔ آپ کے دل سے
جائے گی تو آپ دستر خوان
گی۔

●●



میرا لال



اے میرے لال ، اے مرے معصوم شیرخوار!
اے ننھے پھول ، گلشنِ اُمید کی بہار!
آئیں خزاں کے جھونکے نہ باغِ حیات میں
سرسبز تو ہمیشہ رہے کائنات میں
غم کا گذر نہ ہو کبھی تیری حیات میں
ہر دم تو شاد کام رہے کائنات میں
تو میرا پہلا بچّہ ہے پہلی بہار ہے
تجھ پر ہزار جاں سے تری ماں نثار ہے
دن رات مانگتی ہوں خدا سے یہی دُعا
پروردگار جلدی سے کر دے تجھے بڑا
وہ دن بھی نیک جلدی سے آئے مرے خدا
اسکول جائے ننھا مرا ، ہنستا کھیلتا
علم و ادب کی کاوش فضا تجھ کو آئے راس
اچھے نمبروں سے کرے امتحان پاس
للہ تجھ کو علم کی دَولت عطا کرے
لو پڑھ کے تو جہاں میں بڑا آدمی بنے
علم دین و دنیا سے تجھ کو سنوار کر
پھر ہو نہار بیٹا کہوں گی پکار کر
جب تک فلک پہ چاند ستارے ہیں جلوہ گر
ری طرف اُٹھے نہ اجل کی کبھی نظر
وردگار بخشے تجھے عمر خضر کی
کو خدا دے چاند ستاروں کی زندگی

حسینہ افروز

پلاؤ کھاتے ہیں احباب...

شبینہ پروین

موت ـــــــ اور پھر

جوان کی موت! جو سنتا، اس کا کلیجہ دہل جاتا ـــ میں نے سنا تو یقین ہی نہ آیا۔

اختر! کون اختر؟ وہی نا! اونچے قد کا، چھریرے جسم کا، گھنگھریالے بالوں اور مسکراتے ہوئے چہرے والا نوجوان! جب وہ گھنیری پلکیں اٹھا کر اپنی روشن آنکھوں سے میری طرف دیکھتا تو میں سوچتی، اگر میں شاعر ہوتی تو ان آنکھوں کی تعریف میں ایک دیوان ضرور تیار کر دیتی یا اگر میں مصوّر ہوتی تو ان آنکھوں کو ہر زاویے سے اپنے کینواس پر منتقل کرتی۔

وہ میرا خالہ زاد دیور تھا ـــــ بے انتہا ہنس مکھ، بے انتہا خوش مزاج

وہ جونیر انجینئر ہو گیا تھا۔ گھر کو ایسا سنبھالا کہ لوگ تعریف کرتے نہ تھکتے۔ بھائی اور بہنوں پر جان چھڑکنے والا۔ بوڑھی ماں کی خدمت کرنے والا ـــ اپنوں، پرایوں کے کام آنے والا اختر

نہیں، میں کیسے یقین کروں! ابھی کوئی دو ماہ قبل اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں اپنی خوش دامن کے انتقال کے سلسلے میں سید پور گئی تھی ـــ تیجے میں وہ بھی آیا تھا۔ گرم سلیٹی پتلون اور اس پر پوری آستین کا زرد اور سیاہ سویٹر، وہی روشن آنکھیں، وہی روشن چہرہ ـــ میں نے کہا ـــ "اختر، بڑے خوب صورت نظر آ رہے ہو!"

اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ بولا ـــ "آپ کی آنکھوں کا قصور ہے بھابھی ـــ"

جب میں چائے بنانے کے لئے کچن میں آئی تو وہ بھی میرے ساتھ آ گیا۔

"لائیے، اپنے ہاتھ کی چائے ـــ پلا دیجیے بھابھی ـــ"

اور ہم دونوں بڑی دیر تک وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔

صبح کو وہ چلا گیا۔ پھر میں اس کو دیکھ نہ سکی ـــــ اور افسوس! اب کبھی نہ دیکھ سکوں گی۔

اللہ! ایسے ایسے بھرپور جوان بھی یوں بے بسی سے قبر کی تاریکی میں چھپ جاتے ہیں ـــ!

ہم لوگ دوسرے ہی روز لکھنؤ پہنچے ـــ!

کتنی ـــ ہی دیر تک میں ڈیوڑھی میں کھڑی خود کو تیار کرتی رہی کہ کس طرح خالہ جان کے سامنے جاؤں ـــ اندر پہنچی تو بڑے سے برآمدے میں سفید چاندنی کا فرش لگا تھا۔ بہت ساری عورتوں کے درمیان خالہ جان بیٹھی تھیں ـــ جھکی کمر، دھندلی آنکھیں، پریشان سفید بال،

"دلہن! ارے دلہن! مورا کڑیل جوان کہاں جا چھپا، تم ہی ہمکا پتہ بتائے۔

دیو اس کا......"

"بھابھی، میرا بیٹا! میرا اختر مجھ سے روٹھ گیا ـــ!"

ماں اور بہن پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ دل خون رو رہا تھا۔ در و دیوار لرز رہے تھے ـــ!

کتنی بڑی ٹریجڈی تھی یہ! اس گھر میں جہاں اختر کو دولہا بن کے آنا تھا لوگ اُسے جنازے کی صورت میں لائے تھے ـــ اختر کے بڑے بھائی کی خوب صورت سلیقہ مند سالی سے اختر کا رشتہ طے پایا تھا۔ اور دو ماہ بعد شادی کی تاریخ طے ہو گئی تھی ـــ شادی کے انتظامات ہو رہے تھے۔ اختر نے اپنی پسند سے دلہن کے ملبوسات تیار کرائے تھے۔ زیورات بنوائے تھے۔ پرجاؤں کے کپڑے بن گئے تھے۔ غلّہ اکٹھا کر لیا گیا تھا ـــ اب وہ غلّہ چالیسویں کے فاتحے کے لئے استعمال کیا جانے والا تھا۔

میں نے اختر کی منگیتر کو دیکھا تو دل میں تیر سا پیوست ہو گیا۔ بوٹے سے قد کی، بھرے بھرے جسم کی گوری چٹّی لڑکی، جس کی آنکھیں سُرخ اور پپوٹے سُوجے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں وہ بیٹھی چُپ چاپ کچھ سوچے جا رہی تھی ـــ

اگلے روز سوم تھا ـــ

صبح سے ہی لوگوں کا تانتا لگ گیا تھا۔ عورت یا مرد، غیر یا عزیز، جو بھی آتا، خالہ امّاں کے گلے لگ کر روتا۔



رہ پھر چائے، بنتی، بسکٹ اور نمکین سے بھری ٹرے سامنے رکھی جاتی ــــ چائے حلق سے اترتے ہی گویا تھکے ماندے جسم میں گرمی آجاتی۔ اب جو گفتگو ہوتی تو وہ مرحوم اختر کے متعلق نہیں، اپنے کاروبار، اپنی سروس، اپنے گھر یا اور کسی موضوع پر ہی ہوتی۔ ایک سمت لڑکیاں تھیں ــــ ایک سے ایک نئے فیشن کا لباس پہنے، بال سنوارے ہنستی، کھلکھلاتی، ایک دوسری پر گرتی، ہوئی مذاق کرتی ہوئی، نئی فلموں اور رشی کپور، ششی کپور پر تبصرے کرتی ہوئی ایک طرف نظر آرہی تھیں۔

خواتین کا ایک حلقہ، جو پان زدہ تھا۔ بڑے سارے پاندان کے گرد جمع تھا ــــ گلوں میں پان ٹھنسے تھے۔ ہونٹ لال تھے۔ قوام اور پیپرمنٹ کی مہک چکراتی پھر رہی تھی۔ ایک طرف کچھ اور عورتیں بھی تھیں۔ جو برسوں کے جھگڑے نپٹا رہی تھیں اور گلے شکوے ہو رہے تھے۔

میں گھبرا کر اس طرف نکل گئی جہاں کھانا پک رہا تھا ــــ

اختر کے بڑے بھائی نے پوچھا،

ــــ "بھابی ــــ کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں......" کہتے کہتے میری آواز بھرّا گئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے ــــ

"میرا قوتِ بازو مجھ سے چھوٹ گیا۔ بھابی...... اس کے فاتحہ کا کھانا پکوا رہا ہوں۔ دل کے ٹکڑے ہوئے جا رہے ہیں........"

جی بھر کر رو چکی تو پھر اندر چلی آئی۔ یہاں گریہ و زاری کا ایک طوفان اٹھا ہوا تھا ــــ معلوم ہوا رشتہ کی ایک بہن آئی ہیں ــــ وہ بہن جو اختر کو بے حد عزیز رکھتی تھیں ــــ

ان کی بے قراری دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ ماں اور سگی بہنوں کی آہ و فغاں ان کے سامنے کوئی وزن نہیں رکھتی ہے۔

بڑی مشکل سے انھیں چپ کرایا گیا۔ غم زدہ ماں گھبرا کر اُن ہی کو تسلی دینے لگیں ــــ

ــــ "واقعی محبت ہو تو ایسی ــــ!"

ــــ "اسے جان دیتی تھیں یہ اختر پر" "دل کی کمزور بھی ہیں!"

"ذرا دیکھو تو ہچکیاں، رو کے نہیں رُک رہی ہیں ——"

خواتین ان کو خراجِ تحسین پیش کر رہی تھیں —— میں چپ چاپ دیکھتی اور سنتی رہی ——

قرآن خوانی اور فاتحہ کے بعد دسترخوان لگایا گیا —— مہکتی ہوئی سُرخ شیرمال، خمیری روٹی، قورمہ، کلیجہ، بھاپ اُڑاتا ہوا پلاؤ اور شہابی رنگت کا زردہ، —— وہ بی بیاں جو اختر کے غم سے نڈھال تھیں، لپک لپک کر شیرمال اٹھا رہی تھیں۔ خمیری روٹی گرم سے گرم دیکھ کر نکالی جا رہی تھی۔ پلاؤ کی طشت گردش میں تھی —— قورمے کا ڈونگا چکراتا پھر رہا تھا —— قلیے کا ڈونگا پانسے کے مانند پھسل رہا تھا۔

ایک خاتون فرما رہی تھیں ——

"پلاؤ کے ساتھ جب تک دہی نہ ہو، مزہ ادھورا رہتا ہے ——"

دوسری پھسپھسائیں ——

"زردہ بڑا لذیذ ہے"

تیسری نے سرگوشی کی —— "اے ہے، ابھی بچے نہیں آپائے، روز، روز کہاں ایسا کھانا ملتا ہے ——"

چوتھی نے مڑ کر پکارا —— "پچّا! ادھر اد پچّا جلدی سے آ —— بھوکا رو رہا تھا، اب کدھر مرگیا —— !"

اور وہ بہن —— جو غم سے چُور تھیں، جن کی ہچکیاں رو کے نہ رُک رہی تھیں —— جن کے لبوں پہ اختر صرف اختر کا نام تھا —— اپنے سامنے پلیٹ میں پلاؤ کا جائزہ لیتے ہوئے ایک موٹی سی بوٹی کو دانتوں سے نوچتی ہوئی پاس بیٹھی خاتون سے چپکے چپکے کہہ رہی تھیں ——

"ذرا کوئی اچھی سی بوٹی نکال کے دینا —— اور ایک ہڈی بھی گودے والی ...."

تب پتہ نہیں کیوں، اختر کا مسکراتا ہوا چہرہ میرے سامنے آگیا۔ اور اس کی نرم نرم آواز کانوں میں گونج اٹھی ——

"تجا بھی ......" پلاؤ کھائیں گے احباب .... بس یہی ہوگا ——"

□□



جلتی روحیں

دیار میں
ایک بے
میل جوڑے
کو دیکھ کر

مختار بانو کھوکھر
(کویت، عربین گلف)

پہلی سہیلی : دیکھ، سکھی ری۔ نظریں اٹھا کر
کیسی حماقت۔ کیسی قیامت
پھول سا دولہا،
تنہا سی دُلہن!
قسمت نے کیسا کھیل رچایا
جوڑا کیا بے میل دِکھایا!
بول، سکھی ری!
کیسا ہے دستور نرالا
کوئی نہیں ہے دیکھنے والا؟

دوسری سہیلی : تجھ کو کچھ معلوم نہیں ہے
وہ جو کھڑی ہے سامنے تن کر
سیٹھ کی ہے وہ لاڈلی بیٹی
پھول سا دولہا،
لیکن بے بس!
سونے میں اس کو تولا گیا ہے
لاکھوں اس کو نقد ملا ہے!

سامنے جب بھی آ جاتے ہیں
سوچ پہ میری چھا جاتے ہیں
اکثر میں سوچا کرتی ہوں
روپیہ، دولت، دھن سے
انسان خریدا جاتا ہے
ایمان خریدا جاتا ہے

پہلی سہیلی : سُن ری، سکھی ری!
کل بھی تو دیکھا تھا اِک جوڑا،
بگیا میں جو گھوم رہا تھا۔
کیسا تھا وہ رُوپ انوکھا!
دُلہن کیسی چندر مُکھی تھی!
جس کا دولہا ___ دادا کی طرح تھا!
بول، سکھی ری!
دُلہن کیسے جیتی ہوگی؟
غم کے آنسو پیتی ہوگی۔

پہلی سہیلی : رسمِ دنیا ___ کیسے بدلے؟
کیسے ہم آزادی جیتیں؟
کب تک ہم یوں بِکا کریں گے
لُٹا کریں گے،
گھُٹا کریں گے؟
گویا ___ ہم ایسی رُوحیں ہیں
جو جل تو رہی ہیں
لیکن ___
بالکل دھواں نہیں ہے!

دوسری سہیلی : سچ ہے، سکھی ری!
سامنے یہ بے میل سے جوڑے

کم تری کا احساس کیوں پیدا ہوتا ہے؟

ارسطو کا قول ہے کہ انسان ایک سماجی جانور ہے۔ سماج میں رہنے کی اہلیت ہی اُسے دوسرے جانوروں سے ممتاز کرتی ہے۔ ہماری زندگی کی ضرورتیں سماج ہی پیدا کرتا ہے۔ ہمارے نظریات کو بنانے میں سماج کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ انسان کے لئے سماج میں رہنا اور اس کے قاعدے قانون کی پابندی کرنا بہت ضروری ہے۔ یہ قاعدے اور قانون جہاں ہمیں سہولتیں دیتے ہیں وہاں ہمارے لئے مشکلات بھی پیدا کرتے ہیں۔ کم تری کا احساس بھی ان ہی مشکلات میں شامل ہے۔

ایک ماہرِ نفسیات کا کہنا ہے کہ کم تری کا احساس ہر انسان میں پیدا ہوتا ہے۔ بعض انسان اس پر قابو پا لیتے ہیں اور بعض زندگی بھر اس کا شکار رہتے ہیں۔ وہ اس احساس کی ایک دل چسپ توجیہہ بیان کرتا ہے۔ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو اس کی بنیادی خواہش کھانا اور سونا ہوتی ہے۔ یہ خواہش بغیر کسی کوشش کے پوری ہو جاتی ہے۔ کوئی ہاتھ وقت پر اس کے مونہہ میں دودھ کی شیشی دے دیتا ہے اور وہ دودھ پی کر مزے سے سو جاتا ہے اُسے نہ بدہضمی ہوتی ہے اور نہ بے خوابی کی شکایت۔ جب وہ ذرا بڑا ہوتا ہے تو اس کی خواہشوں میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ وہ کھلونے مانگتا ہے۔ چاکلیٹ اور مٹھائی مانگتا ہے، چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لئے ضد کرتا ہے۔ یہاں بھی وہی جادو کے ہاتھ اس کی خواہشوں کو پورا کرتے ہیں۔ جیسے ہی اس نے خواہش ظاہر کی وہ پوری ہو گئی۔ وہ اپنے ماں باپ کو سمجھتا ہے۔ ماں باپ اس کی نظر میں جادوگر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر وہ جادوگر نہ ہوتے تو اس کی سب خواہشیں کیسے پوری کرتے۔ وہ ان سے بے حد مرعوب ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جسمانی طور پر وہ ان سے بہت چھوٹا ہے۔ وہ جب ان کو کھڑا دیکھتا ہے تو اُسے گردن اونچی کرنا پڑتی ہے۔ اس کے لئے والدین نہ صرف جادوگر ہیں، بلکہ دیوقامت بھی۔ ان کے پاس طاقت ہے، اختیار ہے اور الٰہ دین کا چراغ بھی، جو دنیا بھر کی چیزیں اس کے لئے مہیا کرتا ہے۔ بچہ اپنی حالت کا مقابلہ والدین سے کرتا ہے۔ اپنے آپ کو محتاج، کم زور اور کم طاقت پاتا ہے۔ یہ بات اس کو احساسِ کم تری میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اس کو اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ بھی ایک دن اتنا ہی بڑا ہو جائے گا۔ بچے کے لئے ماضی اور مستقبل کوئی معنی نہیں رکھتے۔ وہ صرف حال میں رہتا ہے۔ اس کے والدین اس سے کئی گنا بڑے ہوتے ہیں۔ وہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ وہ ان کا محتاج ہے۔ ان کے بغیر وہ ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ احساسِ کم تری کا یہ جذبہ ہر انسان کا بنیادی مسئلہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر انسان ان حالات سے دوچار ہوتا ہے۔ بڑے سے بڑا لیڈر اور فوجی جرنیل بھی اس احساس سے گزرتا ہے۔

آپ کو یہ سُن کر ایک گونہ اطمینان ہوگا کہ آپ اکیلے ہی اس جذبے کا شکار نہیں، دنیا کا ہر انسان اس راستے سے گزر چکا ہے۔ انسان کا سب سے بڑا امتحان یہ ہے کہ وہ کس طرح اپنی آئندہ زندگی میں اس جذبے پر قابو پاتا ہے۔ بچپن کی باتیں بچپن کے ساتھ ختم ہو جاتی ہیں۔ اگر انسان کے گھر کا ماحول خوش گوار رہا اور اس کا بچپن نارمل ہو تو اسے اس احساس پر قابو پانے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوتا، لیکن اگر اس کے گھر کا ماحول خراب ہو یا [illegible] کی تربیت ٹھیک طرح نہ ہو تو یہ احساس بچپن کے ساتھ ختم نہیں ہوتا۔ بلکہ جوانی تک قائم رہتا ہے۔ بعض اوقات یہ کم زوری تمام عمر پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اگر بچپن میں ماں باپ یا بہن بھائی عقل سے کام نہ لیں تو یہ احساس اور شدید ہو جاتا ہے۔ اگر ماں باپ مسلسل بچے کو یاد دلاتے رہیں کہ وہ کم زور ہے، نارمل ہے، بدتمیز ہے تو پھر وہ اس احساس کو جھٹک نہیں سکتا۔ ایسی صورت میں ایک کم زوری جسے وقت کے ساتھ قدرتی طور پر ختم ہو جانا چاہئے، تمام عمر ختم نہیں ہوتی۔

لڑکپن اور جوانی میں یہ مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ ہر انسان چاہتا ہے کہ وہ دوستوں میں مقبول ہو، گھر میں ہر دل عزیز ہو، لوگ اس کی بات کو مانیں۔ اسے ہوشیار اور عقل مند سمجھیں۔ جب اس کا تجربہ اس کے برعکس ہو تو اس میں ناراضگی اور غصے کا عنصر پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اس غصے اور ناراضگی کو ظاہر نہیں کر سکتا۔ اگر وہ بڑوں کی محفل میں بول اُٹھتا ہے تو اُسے یہ کہہ کر چُپ کرا دیا جاتا ہے کہ بچے بڑوں کی بات میں نہیں بولتے۔ وہ اپنے بزرگوں کی اس دلیل کی بنیاد کو نہیں سمجھتا۔ ان کی دلیل کی بنیاد یہ ہے کہ بچے بڑوں کا احترام کریں۔ وہ احترام کا مطلب نہیں سمجھتا۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس میں عقل نہیں ہے۔ وہ اپنے آپ کو کم عقل اور جاہل سمجھتا [illegible] مستقل طور پر جیتا رہے تو اس [illegible] کم تری شدید ہو جاتا ہے۔ وہ احترام اور کم عقلی کا فرق نہیں سمجھتا۔

اپنے ماں باپ اور عزیزوں کی محفل میں



ایم۔ عبداللہ

متواتر شکست کھانے سے بچے کے مزاج میں
تلخی پیدا ہو جاتی ہے۔ آخر یہ لوگ اس کی بات
کیوں نہیں سنتے؟ آہستہ آہستہ اسے یقین ہو جاتا
ہے کہ وہ واقعی کم عقل ہے۔ اس کے ساتھ اس
کے دل میں عدم تحفظ بھی پیدا ہوتا ہے۔ یہ ناکامی
کا عنصر یہ احساس کمتری کو جنم دیتا ہے۔ یہ کہانی
یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ جب وہ اپنے والدین
اور عزیزوں سے نالاں ہوتا ہے تو اس کے دل
میں احساس گناہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ وہ لوگ
اس کے خیرخواہ ہیں۔ انہوں نے اس کو پالا ہے،
تعلیم دلائی ہے [illegible] کے

بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا، اس لیے اسے ان
کا احسان مند ہونا چاہیے۔ وہ ان کا احسان مند
ہونے کے بجائے وہ ان سے ناراض ہے، ان
کا برا چاہتا ہے، انہیں کچھ کہنا چاہتا ہے۔ یہی
بات اس کے دل میں احساس گناہ پیدا کر دیتی ہے۔
یہ کہانی اس مقام پر بھی ختم نہیں ہوتی۔ جب
اس کے دل میں احساس گناہ پیدا ہوتا ہے تو وہ
گناہ کی سزا سے بھی نہیں بچ سکتا۔ قدرتی طور
پر مجرم کو سزا ملنی چاہیے۔ اس نے عملی طور پہ
کوئی جرم نہیں کیا۔ دنیا کی کوئی عدالت اسے سزا
نہیں دے سکتی۔ دنیا کے [illegible]

ارادہ کرنا جرم نہیں۔ جب تک مجرم عمل میں نہ آئے
مجرم نہیں ہوتا، لیکن یہ عدالتوں کی بات ہے۔
انسان کی ذہنی عدالت اس سے مختلف ہے۔
وہ اس مجرم کو تسلیم کرتی ہے۔ جرم تسلیم کر لیا
تو سزا سے بچنا مشکل ہے۔ دنیا کی عدالتیں مجرم
کو معاف کر سکتی ہیں لیکن انسان کے دل کی
عدالت اسے معاف نہیں کرتی، اسے سزا ملنی
چاہیے۔ سزا کے خیال کے ساتھ سزا کا خوف پیدا
ہوتا ہے۔ اور انسان [illegible]
[illegible]

ہو جاتا ہے۔ وہ محفلوں میں چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے۔ وہ کسی کے سامنے اپنی زبان نہیں کھول سکتا۔ عام محاورے میں وہ احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ واقعات کی کڑیاں انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہیں۔ یہ قصہ ناراضگی سے شروع ہو کر احساس کمتری پر ختم ہوتا ہے۔ آپ خواہ کتنی ہی تعلیم یافتہ ہوں، آپ بحث میں پیچھے رہ جائیں گی۔ آپ کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہوں، خوش پوش عورتوں کی محفل میں جھینپ جائیں گی۔ آپ نے اپنے ذہن میں اپنی تصویر بنائی ہے، اس کے خدوخال بگڑے ہوئے ہیں۔ آپ کا اپنے متعلق نظریہ غلط ہے۔ اگر کوئی آپ کو اس غلطی کی طرف دھیان دلائے تو آپ وقتی طور پر اس کی بات تسلیم کر لیں گی۔

لیکن کچھ وقت گزرنے پر وہی پرانا احساس عود کر آئے گا۔ آپ ڈرتی ہیں کہ محفل میں آپ کی پول نہ کھل جائے۔ لوگ محفل میں یا پیٹھ پیچھے آپ کا مذاق نہ اڑائیں۔ آپ اپنی نفرت اور دشمنی کے احساس کو دل میں دبائے چپ چاپ بیٹھی رہتی ہیں۔ بظاہر آپ سب کی بات سنتی ہیں، مگر جو کچھ آپ کے دل پر گزرتی ہے خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

آپ خواہ کتنی کوشش کریں اپنے احساس کمتری پر قابو نہیں پا سکتیں۔ جب تک آپ اس گہرائی تک نہیں پہنچیں گی آپ کا مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ اس کے لیے آپ کو اپنی ناراضگی اور اپنے غصے کو سمجھنا ہوگا۔ ایک دفعہ یہ بات آپ کی سمجھ میں آ جائے تو باقی راستہ آسان ہے۔ آپ یہ تسلیم کر لیں کہ آپ اپنے مخالفین کو کچل دینا چاہتی تھیں۔ علاوہ ازیں آپ کسی کو نقصان پہنچانے کی خواہش رکھتی تھیں۔ اگر آپ مناسب طریقے پر اپنی ناراضگی کا اظہار بھی کر سکیں تو مسئلہ زیادہ آسان ہو جائے گا۔ لیکن یہ اظہار خاصا مشکل کام ہے۔ خاص طور پر جب بزرگوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان حالات میں اپنی ناراضگی کو سمجھنا ہی کافی ہے۔ نفسیات میں ایک لاشعوری مسئلہ کو شعور میں لانا ضروری ہے۔ بیماری کی واقفیت ہی بیماری کا علاج ہے۔ یہ مسئلے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں اور ان کا علاج بھی ذہن میں ہوتا ہے۔

جب آپ اپنی ناراضگی پر قابو پا لیں گی تو احساس گناہ، گناہ کی سزا اور اس کے خوف سے بھی بچ جائیں گی۔ خوف دفع ہو گیا تو احساس کمتری خود بخود ختم ہو جائے گا۔

■■

عمر قید



آفندی

کل اسے رہا ہو جانا تھا۔ اُسے عمر قید کی سزا ملی تھی اور چودہ سال کی سزا کاٹنے کے بعد وہ جیل سے رہا ہونے والا تھا۔ اس نے اپنے جھریوں بھرے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ چودہ سال قبل وہ تیس سال کا ایک صحت مند اور وجیہہ شخص تھا۔ اب اپنے کمزور اور نحیف لاغر جسم پر حسرت بھری نظر ڈال کر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

اُسے آج بھی وہ دن اس طرح یاد تھا جیسے کل کی ہی بات ہو۔ وہ ساہوکار کے گھر گیا تھا۔ بات دو سو روپیہ کی تھی۔ بہن کی شادی پر لیے ہوئے قرض کی ادائی میں اُس کے اور ساہوکار کے حساب میں دو سو روپیہ کا فرق آ رہا تھا۔ رقم اس نے یقینی طور پر ادا کر دی تھی مگر ساہوکار اپنے کھاتے میں دیکھ کر کہہ رہا تھا کہ وصول نہیں ہوئی۔

بات طول پکڑ گئی۔ ساہوکار نے گالی [illegible] جلتا جاتا تھا اس سے گالیاں برداشت نہ ہو سکیں۔ ہاتھا پائی کی نوبت آ گئی۔ پھر یہ نہیں [illegible] کی حالت میں [illegible] گئی۔

[illegible]

تھا کیوں کر سیدھا سادہ کیس تھا۔ جائے واردات پر قاتل موجود، مقتول اور قتل کا ہتھیار دستیاب۔ جج نے اس کی جوانی پر ترس کھاتے ہوئے پھانسی کی بجائے عمر قید کی سزا سنائی۔

سزا سنتے ہی عدالت میں موجود اس کی ماں بے ہوش ہو گئی۔ چند گھنٹے بعد اسے جیل کی کوٹھری کی طرف لے جایا گیا اور اس کی ماں کو قبرستان کی طرف۔

پھر پتے جھڑے [illegible] [illegible]

چند مہینے بعد اُسے پتہ چلا کہ وہ ایک بچے کا باپ بن گیا ہے۔ اس کی بیوی محنت کر کے کسی طرح گزارہ کر رہی ہے۔ اس کے آنسو بھی اس دن خشک ہو گئے تھے جب ماں کی لاش عدالت سے باہر لے جائی جا رہی تھی۔ اسے خیال آیا کہ تقدیر نے اس کے ساتھ کیا کھیل کھیلا ہے۔ ایک پل کی لغزش کی اتنی سخت سزا۔ بچے یتیم، اس کی بیوی کو بیوہ کا سا [illegible] کرنا پڑا۔ اس کا بچہ یتیم سا ہو گیا۔

جیل کی تاریک کوٹھری میں اسے بار بار خیال آتا کیا ساہوکار اس کا [illegible]

کچھ دیتا ہوگا اور کبھی معصوم مسکراہٹ بکھیرتا ہوگا، وہ اس کے تصور میں بڑھتا گیا۔ جیل میں گزرنے والے ایک ایک دن کے ساتھ اس کا بچہ تصور میں پھلتا پھولتا رہا۔ وہ سوچتا کہ جب اس کے بچے کو تنگ کرتے ہوں گے تو وہ روتا ہوا ماں سے لپٹ جاتا ہوگا۔ اس خیال کے آتے ہی وہ بے اختیار جیل کی سلاخوں سے اپنا سر ٹکرا دیتا۔ اسے اپنی بیوی کی صورت یاد نہیں رہی تھی۔ گھنٹوں یاد کرنے کی کوشش کرتا مگر پھر بھی اسے تصور میں تراش لینے سے قاصر رہتا۔ بڑی تیزی سے وقت کی دیمک نے اس کے دل و دماغ پر گہرے تاریک پردے ڈال رکھے تھے۔ انسان جس شدت سے چاہتا ہے اگر اس کی شکل بھول جاتا ہے۔ خیالوں ہی خیالوں میں وہ بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتا، اپنی گود میں اٹھا کر محسوس کرتا۔ سوچتا معصوم توتلی زبان میں وہ کیا کہتا ہوگا، یہ سوچ کر وہ مسکرا اٹھتا اور پھر تھک جاتا۔

پہلے تو قید کے عمر بھر کو سال میں چند دنوں کی چھٹی دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنے گھر والوں سے مل سکے مگر اس کا کوئی ایسا واقف کار نہیں تھا جس کی ضمانت قبول کی جاتی۔ جیل میں اس کی مڈبھیڑ ہر قسم کے آدمیوں سے ہوئی، سازشی، خطرناک، لٹیرے، بدمعاش اور ڈاکوؤں سے۔ تاکہ وہ جو کچھ تھا وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھتے تھے کیا یہ کسی قاتل کے ہاتھ ہیں؟ وہ لوگ اس کے نزدیک آتے ہوئے کتراتے تھے۔ اس کے اور ساتھیوں کے درمیان ایک فاصلہ رہا جو کبھی سمٹ نہ سکا، مٹایا نہیں جا سکتا۔ بدنامی کا ایک ایسا داغ اس کی پیشانی پر لگا ہے جو کبھی نہیں مٹ سکتا تھا۔ نئے سرے سے زندگی شروع کرنا پڑے گی، ایک نیا سفر شروع ہوگا۔ نئی زندگی کی شروعات کرنا ہوگی۔ جہاں ماضی کا سایہ بھی نہ آئے۔ جب وہ اپنے کمزور لاغر جسم پر نظر ڈالتا تو اس کے ہونٹوں سے ایک آہ نکل جاتی۔ پتہ نہیں اس کی بیوی کیسی ہوگی؟ زینب! زینب!" وہ بڑبڑاتا اور بےچین ہو جاتا۔

جیل سے جاتے ہوئے اسے افسوس بھی ہو رہا تھا۔ اس چار دیواری سے عجیب سی انسیت ہو گئی تھی۔ چودہ برس کوئی چھوٹا عرصہ نہیں ہوتا۔ باہر کی آزاد دنیا پتہ نہیں کیسی ہوگی؟ زندہ بھی رہنے دے گی یا اس پر عرصہ حیات تنگ کر دے گی۔ وہ اپنے آپ سے ڈرنے لگتا۔ کتنی عجیب ہوگی جیل سے باہر کی دنیا!

آج کا سورج ایک نئی روشنی لیے اس کی کوٹھری میں داخل ہوا۔ جیل میں موجود سارے قیدی اسے گھیرے ہوئے تھے۔ قیدیوں کے کپڑے اتار کر جب اس نے اپنے کپڑے پہنے تو اسے کتنا عجیب لگ رہا تھا۔ بہت سے قیدی اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ دھیرے دھیرے وہ جیلر کے آفس میں آ گیا۔

"اپنے آپ کو کسی سے کمتر مت سمجھنا تم ایک ذمہ دار شہری ہو، ایک اچھے انسان۔" جیلر کے الفاظ اس پر ایک نئی کیفیت پیدا کر رہے تھے۔

چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اس نے پلٹ کر جیل کے دروازے کی طرف دیکھا اور داخلی دروازہ اسے بہت چھوٹا سا لگا۔ جیل سے کسی قدر فاصلے پر ایک درخت کے نیچے کوئی کھڑا تھا، وہ اس کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ وہیں رک گیا۔ اس نے اپنی گٹھڑی سنبھالی۔ اور نظریں سامنے نزدیک آتے گئے۔ وہ تیرہ سال کا ایک لڑکا تھا اور ساتھ ہی چلی ایک ادھیڑ عمر کی عورت۔

چند قدم کے فاصلے پر سہم کر رک گئے۔ اس کے ہونٹوں میں کپکپاہٹ سی ہوئی۔ "زینب" اس کے ہاتھوں سے گٹھڑی چھوٹ گئی۔ کانپتے قدموں سے وہ اپنی بیوی اور بچے کی طرف بڑھا۔ ایک ساتھ وہ تینوں لپٹ گئے۔ جذبات اتنی شدت سے جاگے تھے کہ زبانیں گنگ ہو گئیں۔ زینب کے آنسو بہے چلے جا رہے تھے۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے زمین کی گردش رک گئی ہے۔ اپنے کمزور بازوؤں میں اس نے دونوں کو بھینچ رکھا تھا۔ اس کے لڑکے کے لیے پدری شفقت ایک نیا تجربہ تھی۔

زینب کے سر سے آنچل ڈھلک گیا۔ اس کے آدھے سے زیادہ بالوں میں سفیدی آ گئی تھی۔ پیشانی پر بھی لکیریں ابھر آئی تھیں۔ چودہ سال سے دبا ہوا آتش فشاں پھٹ پڑا۔ بیوی اور بچے کے ہمراہ اس کے آنسو بھی بہہ نکلے اور بہتے چلے گئے۔

بہتے آنسوؤں کے درمیان اس نے ڈبڈبائی نظروں سے آسمان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی یاسیت تھی۔ درد، کرب، ماتم کی جھلک، شکایت اور نفرت شدید نفرت جیسے وہ کہہ رہا ہو! ... ہے کوئی طاقت کہ جو [illegible] [illegible] لوٹا سکے گی؟

———

ہندوستان میں شادیاں

ایشیا



ہندوستان میں مرد کا درجہ عورت سے بڑھا ہوا ہے یعنی صورت حال کے لئے یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ مرد عورت سے زیادہ طاقت ور ہے۔ اسے کمانے کے لئے محنت مشقت کرنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ عورت اپنی زندگی کے دوران بھی مرد کی مدد کی محتاج ہے۔ بچوں کی تربیت اور ان کے کھلانے پلانے کے لئے بھی مرد کا سہارا ضروری ہے۔

یہ دلیل زیادہ غلط نہیں، لیکن، مکمل بھی نہیں۔ ہندوستان کے خانہ بدوش قبیلوں میں مرد اور عورت کے کام بٹے ہوئے ہیں۔ عورت کھیتی باڑی کرتی ہے، زمین سے خوراک بٹورتی ہے، اور مرد شکار کرتا ہے۔ اس طرح عورت کا کام مرد سے زیادہ اہم ہے۔ لیکن پھر بھی شکاری کی عزت کسان سے زیادہ ہے۔

ہندوستان میں دو قسم کے سماج پائے جاتے ہیں۔ ایک پدری سماج اور دوسرا مادری سماج۔ مادری سماج زیادہ تر جنوبی ہند میں پایا جاتا ہے۔ اس سماج میں نسل ماں سے چلتی ہے۔ بیٹی کی پیدائش پر زیادہ خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے۔

ہمارے ملک میں مرد کی عزت عورت پر منحصر ہے۔ [illegible] مشہور ہے کہ عورت کی بدنامی سے اس کے ماں باپ کی ناک کٹ جاتی ہے اور اس کی عزت سے اس کے [illegible] کی عزت بڑھتی ہے۔ دونوں صورتوں میں مرد کی عزت عورت کی محتاج ہے۔ اس وجہ سے مرد عورت کی عزت کی نگہبان ہے۔ ہمارے یہاں شادی ایک سماجی مسئلہ ہے۔ لڑکے اور لڑکی کا ذاتی معاملہ نہیں۔ یہ سارے خاندان اور برادری کا معاملہ ہے۔ دو خاندان اپنی عزت بڑھانے کے لئے ایک دوسرے سے تعلق پیدا کرتے ہیں۔ لڑکے اور لڑکی کا اس انتخاب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ دراصل دنیا میں ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا ہے۔ محبت کی شادی کا تصور زیادہ نیا نہیں ہے۔ یورپ اور امریکہ میں بھی محبت کی شادی گذشتہ صدی سے ہی شروع ہوئی ہے۔

شادی کی بھی قسم بدل بدل

کی شادی ہے۔ ایک خاندان لڑکی دیتا ہے۔ تو داماد کی بہن سے اپنے لڑکے کی شادی کرتا ہے۔ یہ رواج صدیوں پرانا ہے۔ اونچی ذات کے ہندو اس رواج کو پسند نہیں کرتے۔ اسلام سے قبل عرب میں بھی یہ دستور رائج تھا اسے "شغار" کہتے ہیں۔ اسلام نے اس دستور کو پسند نہیں کیا۔ ہندوستان میں بھی اس قسم کی شادی کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ جنوبی ہند میں اس شادی کو "[illegible] سمبندھ" کہتے ہیں۔ پنجاب میں یہ "آٹے سٹے" کی شادی کہلاتی ہے۔ ہندوؤں کنیا دان کا تصور رائج ہے یعنی دلہن کو خیرات میں دیا جاتا ہے اس خیرات کے بدلے کچھ حاصل [illegible]

ادل بدل کی شادی ہندوؤں
کے نچلے طبقے میں آج تک رائج ہے۔ اس
میں کئی فائدے ہیں۔ لڑکی کو جہیز نہیں دینا
پڑتا۔ لڑکے کو لڑکی کے لیے کچھ خرچ
نہیں کرنا پڑتا۔ دونوں فریق خوش رہتے
ہیں۔ اس کے علاوہ داماد پر دباؤ رہتا
ہے کہ اگر اس نے اپنی بیوی کو تکلیف
پہنچائی تو اس کی بہن سے بدلہ لیا جا
سکتا ہے۔

اونچی ذات کے ہندوؤں میں
کنیا دان ایک متبرک رسم سمجھی جاتی ہے
ان کے یہاں بچی کا رتبہ دیوتا کا ہوتا ہے
اور اس کی پوجا کی جاتی ہے۔ طلاق اور
بیوہ کی شادی معیوب سمجھی جاتی ہے۔
یہ لوگ نچلی ذات والوں کا مذاق اڑاتے
ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ تم اپنی بیٹیوں
کو بیچتے ہو۔ نچلی ذات والے اس
بات کا یہ جواب دیتے ہیں کہ ہم اپنی
بیٹیوں کو خیرات میں نہیں دیتے۔

شادی کی دوسری قسم اعلیٰ —
خاندان میں رشتہ ڈھونڈنا ہے۔ اس
سلسلے میں جاٹوں اور راجپوتوں کی
مثال دی جاتی ہے۔ راجپوت تمام ہندوستان
میں پھیلے ہوئے ہیں مگر ان کا مرکز راجستھان
ہی ہے۔ یہاں بھی اونچے اور نیچے خاندان
کا سوال درپیش آتا ہے۔ بہت سے خاندان
اپنی لڑکی کو اونچے خاندان میں دینا چاہتے
ہیں۔ اونچے خاندان والوں کو اپنی قیمت
معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ قیمت بے دھڑک
طلب کرتے ہیں۔ لڑکی والے اونچے

[illegible]
سے اونچی بولی لگانے والے کو مل جاتا
ہے۔ شادی کے بعد بھی لڑکے والے لڑکی
کو سناتے رہتے ہیں کہ وہ کم جہیز لائی
ہے۔ یا ان سے نچلی ذات کی ہے۔ اس
بازی میں لڑکی کی حیثیت شطرنج کے
مہرے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اس قسم
کی شادی میں اونچی ذات والوں کو
روپیہ تو مل جاتا ہے لیکن انھیں بہت
سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔
وہ نچلی ذات والوں کے ہاتھ اپنے لڑکے
فروخت کرتے ہیں۔ اس طرح خود ان
کے طبقے میں لڑکوں کا کال پڑ جاتا ہے۔
اور ان کی لڑکیاں کنواری رہ جاتی ہیں۔
اسی لئے اعلیٰ ذات کے راجپوت اپنی لڑکیوں
کو مار دیتے تھے۔ اگر وہ اپنے والدین کے
ہاتھوں قتل ہونے سے بچ جاتی تھیں، تو
عمر بھر کنواری بیٹھی رہتی تھیں۔ نچلی ذات
کے لوگوں کو یہ دشواری پیش نہیں آتی۔
اگر انھیں اپنے برابر کا کوئی خاندان نہ
ملے تو وہ ذات برادری سے باہر بھی شادی
کر سکتے ہیں۔

اونچے خاندان والوں کے احساس
برتری سے لڑکی کی زندگی اجیرن ہو جاتی
ہے۔ وہ اسے ہمیشہ خاندان کا طعنہ دیتے
ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ان کے خاندان
میں جذب نہیں کر سکتی۔ اسے ہمیشہ اپنی
کمتری کا احساس رہتا ہے۔ اسے کبھی
سسرال میں اپنائیت محسوس نہیں ہوتی۔
اگر لڑکی نازک مزاج اور حساس ہے تو
وہ خودکشی پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ [illegible]

[illegible]
اکثر سسرال والوں کے طعنے سن سن کے
رہیں۔ اس طرح وہ زندگی کے عذاب سے
چھٹکارا پا جاتی ہیں۔

برہمنوں میں ذات پات کا
احساس دوسری ذاتوں سے زیادہ ہوتا
ہے۔ دوسری ذات کے لوگ ان سے
رشتہ جوڑنا چاہتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں
کہ یہ رشتہ عورت کے ذریعہ ہی جوڑا
جا سکتا ہے۔ اس طرح عورت اونچی
ذات میں داخل ہونے کا دروازہ بن
جاتی ہے۔ اگر اس کی شادی اونچی
ذات میں ہو جائے تو اس کی اولاد بھی
اونچی ذات میں شمار ہوگی۔ نسل باپ
سے چلتی ہے۔ اگر وہ اپنی ہی ذات میں
شادی کرے تو اس کی اولاد اس ذات
کی کہلائے گی۔ اگر کہیں وہ اپنے سے نچلی
ذات میں شادی کرے تو اس کی اولاد
بھی نچلی ذات میں شمار ہوگی۔ مرد اس
بات کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ اپنی ہی
ذات میں شادی کرتے ہیں۔ لیکن نچلی
ذات والی لڑکیوں سے ناجائز تعلق رکھتے
ہیں۔ لڑکیاں اس بات سے خوش ہوتی
ہیں کہ ان کی اولاد ایک بڑے گھر سے
ہے۔ خواہ وہ ناجائز ہی کیوں نہ ہو
مرد اس طرح اپنی ذات کو پاک رکھتا
ہے۔

جنوبی ہند کے [illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] اور [illegible] کی [illegible] یہاں کا بہترا الترت ہے جیا تر ادے کے بلا ارسے کے ڈر سے یہ لوگ زیادہ اولاد پیدا نہیں کرتے۔ ان کے یہاں خاندان میں صرف بڑے بھائی کو شادی کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ چھوٹے بھائی عمر بھر کنوارے رہتے ہیں لیکن انہیں نیچی ذات والی لڑکیوں سے تعلق رکھنے کی آزادی ہوتی ہے۔ یہ نائر لڑکیاں ہوتی ہیں۔ نائر ذات میں مادری سماج رائج ہے۔ نائر لڑکیاں اس تعلق سے خوش ہوتی ہیں۔ اس طرح ان کی اولاد ان سے ایک درجہ اونچی ہو جاتی ہے۔ نمبودری برہمن ان پر ایک طرح کا احسان کرتے ہیں۔ نائر عورتوں میں شادی کا بندھن سخت نہیں ہے۔ ان کے سماج میں لڑکی کبھی اپنا گھر چھوڑ کر خاوند کے گھر نہیں جاتی، بلکہ خاوند ہی اس کے گھر آتا ہے۔ وہ صرف رات بھر کا مہمان ہوتا ہے۔ اور صبح اٹھ کر اپنی راہ لیتا ہے۔ ان کے سماج میں طلاق بہت آسان ہے۔ اگر عورت مرد سے چھٹکارا پانا چاہتی ہے تو رات کو اس کے جوتے باہر رکھ کر دروازہ بند کر دیتی ہے۔ مرد بات سمجھ جاتا ہے اور طلاق ہو جاتی ہے۔

یہاں ایک اور دلچسپ بات قابل ذکر ہے۔ نمبودری برہمن نائر عورت سے [illegible] تعلق تو قائم کر لیتے ہیں، لیکن اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا نہیں کھاتے۔ نیچی ذات کی عورت کے ہاتھ سے پکا ہوا کھانا ان کا دھرم بھرشٹ کر دیتا ہے۔ ایسا کھانا کھانے سے ان کے جسم میں ناپاکی آ جاتی ہے۔ البتہ جنسی تعلقات سے صرف بیرونی ناپاکی کا احتمال ہوتا ہے، جو غسل کرنے سے رفع ہو جاتی ہے۔

اس جنسی آزادی سے مردوں کے لئے تعیش کا سامان مہیا ہو جاتا ہے۔ لیکن نمبودری عورتوں کو دوہری مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نمبودری عورتیں پردے کی پابند ہوتی ہیں۔ وہ جب گھر سے نکلتی ہیں تو کیلے کے پتوں کی چھتری سے اپنا منہ ڈھانپ لیتی ہیں۔ نمبودری عورتوں کے پردے کی سختی کا اندازہ اس بات لگایا جا سکتا ہے کہ یہ عورتیں اپنی شادی کی رسموں کے دوران بھی گھر سے باہر نہیں نکلتیں۔ اگر انھیں گھر سے باہر جانا پڑے تو ایک نائر لڑکی ان کے بدلے باہر جاتی ہے۔ اور ان کی طرف سے رسم ادا کرتی ہے۔

برہمنوں کا ایک ایسا ہی طبقہ بنگال میں بھی موجود ہے۔ یہ کولین برہمن کہلاتے ہیں۔ ان برہمنوں کی ذات سب سے اعلیٰ ہے۔ شادی کے لئے ان کی مانگ بہت زیادہ ہے۔ لوگ ان سے رشتہ جوڑنے کے لئے ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک انار اور سو بیمار والا معاملہ ہو جاتا ہے۔ ان کی قدر و قیمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک ایک کولین برہمن کئی کئی برہمن لڑکیوں سے شادی رچاتا ہے۔ یہ لڑکیاں برہمن ہوتی ہیں لیکن کولین ذات کی نہیں ہوتیں۔ کولین بھی [illegible] کی بیوی اور بچوں کے لئے کچھ نہیں کرنا پڑتا۔ اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی۔ کچھ کولین برہمن شادی کی رسومات کے بعد کبھی اپنی سسرال نہیں جاتے۔ لڑکی کو اپنے خاوند کی شکل بھی یاد نہیں رہتی۔ اسے دوبارہ اپنے خاوند کا منہ دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ لیکن [illegible] کی ساری ذمہ داری سنبھالتی ہے۔ اپنے خاوند کی موت کی خبر سن کر وہ بیوگی کا لباس پہن لیتی ہے۔ سر کے بالوں کا صفایا کرا دیتی ہے۔ اکثر لڑکی کی عمر [illegible] سے بہت کم ہوتی ہے۔ اس [illegible] ہے کہ وہ کم عمری میں ہی بیوہ ہو جاتی ہیں۔ بنگال میں بال ودھوا کی [illegible] کا مسئلہ ادیبوں اور ریفارمروں [illegible] کا مرکز بنا رہا ہے۔ ایک بچی جس کو [illegible] کا مطلب بھی معلوم نہیں، جو کبھی سسرال نہیں گئی، جو اپنے خاوند کو جانتی تک نہیں، شوہر کی موت کے بعد بیوگی کے پورے فرائض انجام دیتی ہے۔ اس ظلم کے خلاف بنگال کے ادیبوں نے آواز اٹھائی۔ حکومت نے بھی قانون بنائے۔ چنانچہ اب یہ رواج تقریباً ختم ہو گیا ہے۔

جنوبی ہند میں شادیوں کے مختلف طریقے رائج ہیں۔ تامل برہمنوں میں لڑکی کی شادی چھوٹے ماموں سے کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ماموں کی بیٹی اور پھوپھی کی بیٹی سے شادی جائز ہے لیکن خالہ اور چچا کی بیٹی سے شادی ناجائز ہے۔ ان سب [illegible] اصول کا ہزاروں برس سے [illegible]

پتا ہے۔ ماموں بھانجی کی شادی کا
تعداد اب کم ہے۔ لیکن ماموں زاد اور
پھوپھی زاد بھائی سے شادی کا رواج ابھی
باقی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح
لڑکی اپنے گھر اور گھر والوں سے دور نہیں جاتی۔
اس کی ننھیال ہی اس کی سسرال بن جاتی
ہے۔ اس طرح اسے اجنبی لوگوں سے واسطہ
نہیں پڑتا۔ اگر لڑکی بہت غریب ہے،
یا بد شکل ہے تو اس کی شادی کی ذمہ داری
اس کے ماموں پر ہے۔ ماموں اس
ذمہ داری کو اس طرح نبھاتا ہے کہ اپنے
لڑکے کی شادی اس سے کر دیتا ہے۔
آپس کی شادیوں میں لڑکی
سسرال کے ماحول کو جلد اپنا لیتی ہے
لیکن یہاں ایک قباحت بھی پیش آتی
ہے۔ لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو اچھی
طرح جانتے ہیں۔ وہ بچپن میں بہن بھائی
کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ کھیلے ہوتے
ہیں۔ یہ اپنائیت محبت کی شدت کو کم کر
دیتی ہے۔ وہ ولولہ جو ایک غیر عورت
کو دیکھ کر دل میں پیدا ہوتا ہے، رشتے
کی بہن کے لئے نہیں پیدا ہوتا۔ اس کے
علاوہ یہ خیال کہ رشتے کی بہن بیوی بن
سکتی ہے، لڑکے لڑکی کے بچپن میں غیریت
اور جھجک پیدا کرتا ہے۔

شمالی ہند

میں رشتے کی بہن
سے شادی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔
شادیاں دوسرے گاؤں میں ہوتی
ہیں۔ یہ گاؤں ۱۲، ۲۰ میل کے فاصلے پر
واقع ہوتے ہیں۔ نچلی ذات کے ہندوؤں
میں شادی کا دائرہ ۱۵، ۲۰ میل کے
اندر ہی ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں میں
لڑکی کو اپنے گھر سے بہت دور جانا پڑتا
ہے۔ بابل کا گھر چھوڑنا اس کے لئے بہت
تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ
شادی کے بعد بھی لڑکے والے لڑکی والوں
کے یہاں نہیں جاتے۔ لڑکی کے بزرگ
اس کے سسرال کے گاؤں کا پانی پینا بھی
پسند نہیں کرتے۔ لڑکی سسرال میں
تنہائی محسوس کرتی ہے۔ شادی کے ابتدائی
سال اس کے لئے بہت تکلیف دہ ہوتے
ہیں۔ اس کی ساس نندیں اس پر ظلم کرتی
ہیں۔ وہ میکے سے اپنا تعلق ختم کر چکی ہوتی
ہے۔ لے دے کے ایک شوہر کا سہارا ہوتا
ہے۔ لیکن اس بے چارے کے لئے بھی آگے
کنواں اور پیچھے کھائی والا معاملہ ہے۔ وہ
بیوی کی حمایت لے تو اس کی ماں بہنیں اسے
طعنے دیتی ہیں۔ کہ وہ ایک غیر کے لئے اپنے
خون سے لڑ رہا ہے۔ ماں بہنوں کی طرف
داری کرے تو اس کا ضمیر اس کو ملامت
کرتا ہے۔ شمالی ہند کے لوک گیت اس
صورتِ حال کی خوب عکاسی کرتے ہیں۔
اگر بہو لڑکا پیدا نہ کر سکے تو صورتِ
حال اور بھی بگڑ جاتی ہے۔ اگر لڑکا نہ ہوا
تو باپ کا کریا کرم اور شرادھ کون کرے
گا۔ اگر لڑکی بچہ پیدا نہ کر سکے تو خاوند اسے
گھر سے باہر نکال سکتا ہے۔ اور دوسری
شادی کر سکتا ہے۔ دوسری شادی کرنا
آسان کام ہے۔ اس میں زیادہ رسم و رواج
کا دخل نہیں رہتا۔ گجرات کے کئی ضلعوں میں
تو شادی کے لئے پھولوں کے ہار کا تبادلہ
ہی کافی ہوتا ہے۔

پنجاب اور ہریانہ کے ...

میں بیوہ کی شادی اس کے دیور سے کر دی
جاتی ہے۔ اس شادی کو چادر ڈالنا کہتے
ہیں۔ گذشتہ لڑائیوں میں سپاہیوں کی
بیواؤں کا مسئلہ سامنے آیا تھا۔ اس وقت
بیواؤں کو اُن کے سسرال والوں نے
اپنے گھر میں ہی رکھا، تاکہ وہ اپنے دیوروں
کے بڑے ہونے کا انتظار کریں۔ دیور جب
شادی کے قابل ہو گا تو ان پہ چادر ڈال
دے گا۔

ہماچل

کے کچھ حصوں میں ایک
سے زیادہ خاوند رکھنے کا رواج ہے۔
چکراتہ اور جان سر بابر کے علاقے میں ایک
عورت سب بھائیوں کی بیوی ہوتی ہے۔
اس کی شادی بڑے بھائی سے ہوتی ہے،
لیکن اس پر سب بھائیوں کا حق ہوتا ہے
زمانہ قدیم میں دروپدی کی مثال دی جا
سکتی ہے۔ جو پانڈو بھائیوں کی مشترکہ
بیوی تھی۔

ہندوؤں میں سہاگ کا رشتہ
خون کے رشتے سے بڑھ کر ہے۔ لڑکی ایک
دفعہ میکے سے سسرال چلی گئی، تو اُس
کے سارے پچھلے بندھن ٹوٹ گئے۔
اب سسرال اس کا گھر ہے۔ ہندی میں
بیوی کو "اردھانگنی" کہتے ہیں
یعنی وہ مرد کا آدھا جسم ہوتی ہے۔
شوہر اور بیوی ایک ہو جاتے ہیں۔ یہ جنم
جنانتر کا رشتہ کہلاتا ہے۔ اگر وہ سسرال
جائے تو اس کی ڈولی آتی ہے ...
اس کی حیثیت ایک ... کی سی
ہوتی ہے۔

جوزیفائن نے دنیا کے سب سے بڑے جرنیل کا دل جیت لیا

اے کمال

فرانس کے لوگ جوزیفائن کو فتوحات کا سرچشمہ کہتے تھے۔ وہ جب تک فرانس کی ملکہ رہی، نپولین مسلسل فتوحات حاصل کرتا گیا لیکن جب اس کا سایہ فرانس کے تخت سے ہٹ گیا تو نپولین کے برے دن آ گئے اور وہ فرانس سے دور ایک جزیرے میں قید و بند کی صعوبتیں جھیلتا ہوا مر گیا۔

جوزیفائن کی نپولین سے پہلی ملاقات ۱۷۹۵ء میں ہوئی اور وہ پہلی ہی ملاقات میں اس پر دل و جان سے فدا ہو گیا۔ اس سال انقلاب فرانس کا جوش ٹھنڈا پڑ رہا تھا۔ انتظام کے قریب تھا شاہ پسند لوگ پھر غالب آ گئے تھے۔ اس زمانے میں ایک شخص پال باراس حکومت پر حاوی بن گیا۔ اس نے نپولین کو اپنا نائب مقرر کیا۔ ان دونوں نے مل کر پیرس میں امن و امان قائم کر دیا۔ پیرس میں عوام کی حکومت تھی۔ قانون کی باگ ڈور ہجوم کے ہاتھ میں تھی۔ کسی کی جان و مال محفوظ نہیں تھی۔ کسی کے خلاف ذرا سا بھی شبہ ہوتا تو وہ قتل کر دیا جاتا۔ پال باراس اور نپولین نے چارج لیتے ہی عوام کا توپ کے گولوں سے استقبال کیا۔ ایک دن نپولین نے اتنی بے دردی سے قتل عام کیا کہ لوگوں پر اس کی دھاک بیٹھ گئی۔ اس واقعہ کے فوراً بعد نپولین ترقی کر کے لیفٹیننٹ جنرل بن گیا اور دس روز بعد باقاعدہ فوج کا جنرل بن گیا۔ اس وقت اس کی عمر صرف ۲۶ سال تھی۔

جوزیفائن کی عمر ان دنوں ۳۲ سال تھی۔ اس کا خاوند انقلاب فرانس کے ہنگاموں میں مارا گیا تھا۔ اس کے دو بچے تھے۔ اپنے خاوند کی موت کے بعد وہ پال باراس کی داشتہ بن گئی۔ اس کا خاوند فرانس کی فوج میں افسر رہ چکا تھا۔ جوزیفائن چاہتی تھی کہ وہ اپنے مرحوم شوہر کی تلوار اپنے پاس بطور یادگار رکھے اور جب اس کا بیٹا بڑا ہو جائے تو یہ تلوار اس کی ملکیت ہو جائے۔ نپولین کا حکم تھا کہ تمام باشندے اپنے ہتھیار حکومت کے حوالے کر دیں۔ جوزیفائن نے نپولین کو درخواست بھیجی کہ وہ اس کے مرحوم شوہر کی نشانی اس کے پاس رہنے دے۔ نپولین نے یہ درخواست منظور کر لی۔ جوزیفائن اس کا شکریہ ادا کرنے گئی۔ نپولین نے اس کو دیکھا اور ہزار جان سے اس پر فریفتہ ہو گیا۔

جوزیفائن میں وہ سب خوبیاں تھیں

جس سے نپولین محروم تھا۔ نپولین پستہ قد تھا
اکھڑ اور شرمیلا تھا۔ جوزیفائن مہذب اور شائستہ
تھی۔ نپولین فرانس کا رہنے والا نہیں تھا۔ وہ
جزیرہ کارسیکا کا باشندہ تھا۔ جوزیفائن
پیرس کی محفلوں کی جان تھی، اگرچہ اس کی
پیدائش وسط امریکہ کی تھی، لیکن وہ پیرس میں
مدتوں رہی تھی اور یہاں کے طور طریقوں سے
واقف تھی۔ وہ اپنے سے کم عمر نپولین کی محبت
دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہوتی تھی۔ اسے یقین
تھا کہ اس کا عاشق ایک دن بہت بڑا آدمی
بنے گا۔ ایک روز نپولین نے اس کے سامنے
شادی کی تجویز پیش کر دی۔ اس اثناء میں
نپولین کو فرانس کا کمانڈر ان چیف مقرر کر دیا
گیا۔ کچھ دن بعد ان کی شادی ہو گئی۔

نپولین اپنی شادی کی تقریب میں دو
گھنٹے تاخیر سے پہنچا۔ وہ اٹلی پر حملے کا منصوبہ
مکمل کر رہا تھا۔ جنگی تیاریوں کے دوران اس کو
وقت کا خیال ہی نہیں رہا۔ شادی کی تقریب
میں دولہا اور دلہن کے رشتہ دار شامل
نہیں ہوئے۔ نپولین نے اپنی ماں کو اس راز
سے آگاہ نہیں کیا کہ وہ شادی کر رہا ہے۔
اس کی ماں ایک سخت مزاج عورت تھی وہ چاہتی
تھی کہ نپولین کی شادی اس کے اپنے
خاندان میں ہو۔ نپولین کو معلوم تھا کہ اس کی ماں
اس شادی کی مخالفت کرے گی۔ ادھر جوزیفائن
نے بھی اپنے بیٹے اور بیٹی کو شادی کی محفل میں
نہیں بلایا۔ اُسے ڈر تھا کہ اس کے بچے اپنے
سوتیلے باپ کو دیکھ کر خوش نہ ہوں گے۔ ممکن ہے
کہ ان کے منہ سے ناراضگی کا کوئی کلمہ نکل جائے
نپولین کو اپنی کم عمری کا احساس تھا۔ جوزیفائن
اس سے چھ برس بڑی تھی۔ نپولین نے اس کا
اندراج کرتے ہوئے اپنی عمر ایک سال زیادہ لکھوائی
یعنی بجائے ۲۷ سال کے ۲۸ سال۔ جوزیفائن
نے بھی اپنی عمر ۲۸ سال لکھوائی، جب کہ وہ ۳۲
برس کی تھی۔

ان کے ہنی مون کی مدت صرف ۳۶
گھنٹے تھی۔ نپولین کو اٹلی فتح کرنے کی جلدی تھی۔
اسے اپنی کامیابی کا اتنا یقین تھا کہ اس نے جوزیفائن
کو اٹلی آنے کی دعوت دی۔ اس نے جوزیفائن
سے کہا:

"میں تم سے اٹلی کی فتح کے بعد میلان
میں ملوں گا۔" اس وقت فرانس کی فوجی حالت
بہت خستہ تھی۔ نپولین نے اس شکستہ فوج کو
آہنی دیوار میں بدل دیا۔ وہ ایک پیدائشی جنرل
تھا۔ جنگ اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ وہ اکثر کہتا
تھا "خدا نے مجھے ایک چٹان بنا کر دنیا میں بھیجا
ہے۔ مجھے کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتا۔" اٹلی کی
جنگ کے دوران اس کے دو محبوب مشغلے
تھے، دشمن پر کامیابی سے حملہ کرنا اور اپنی
محبوب جوزیفائن کو خط لکھنا۔ وہ اسے روزانہ
دو خط لکھتا تھا۔ ان سینکڑوں خطوط میں سے
۲۴۴ خطوط تاریخ کے صفحات میں آج بھی محفوظ ہیں
یہ خط "ہنی مون خط" کہلاتے ہیں کچھ لوگ ان کو
ہذیانی خطوط بھی کہتے ہیں۔ ان خطوط میں نپولین نے
اپنا دل نکال کر رکھ دیا تھا۔ جب بھی اسے جنگ
سے فرصت ملتی وہ جوزیفائن کو خط لکھنے بیٹھ جاتا
وہ کبھی جنگ کے نقشے پر لکھتا، کبھی ماچس کے
لیبل پر، لیمپ کی دھیمی روشنی میں وہ اپنے
سامنے [illegible] کاغذ پر بکھیر دیتا۔ وہ بڑا بدخط
تھا۔ بعد میں ماہرین کو اس کے خطوط پڑھنے میں خاصی
دشواریاں پیش آئیں۔ نہ معلوم جوزیفائن ان خطوط
کو کیسے پڑھتی تھی۔ ایک خط میں اس نے لکھا:

[illegible]
[illegible]
جاتی ہے۔ تم ہر وقت میرے دماغ پر چھائی رہتی
ہو۔ اکثر میرے تصور کی آنکھ تم کو اداس دیکھتی ہے
میرا غم ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔ اگر میں تم کو
خوش اور بے پرواہ دیکھتا ہوں تو مجھے اس بات
پر صدمہ ہوتا ہے کہ تم مجھے دو روز میں ہی
بھول گئیں۔ میری محبوب تم تھوڑا اداس
رہا کرو۔ اس کے باوجود میری دعا ہے کہ غم کا سایہ
کبھی تم پر نہ پڑے۔"

ایک اور خط میں نپولین نے لکھا: "تم نے
۱۳ تاریخ کو خط شروع کیا۔ اور ۱۶ کو ختم کیا
کیا تمہیں اپنے خاوند کو خط لکھنے میں چار دن
لگ گئے؟ تم نے مجھے آپ سے خطاب کیا۔ کیا
میں 'تم' کہلانے کے قابل نہیں ہوں۔ تمہارا
خط رسمی اور سرد تھا۔ میری روح بے چین ہے۔
میرا دل پریشان ہے۔ جس دن تمہاری محبت
میں کمی ہو گی، وہ میری محبت کا آخری دن ہو گا
اور میری زندگی کا بھی۔"

نپولین اٹلی کی فتح کے بعد پیرس آیا۔
وہاں وہ اپنی ماں سے ملا۔ نپولین نے جوزیفائن
سے شادی کر کے اپنی ماں کی نظر میں ناقابلِ
معافی گناہ کیا تھا۔ اسے دستور کے مطابق اپنے
بڑے بھائی سے اجازت لینا چاہیے تھی۔ اس
نے دو دن تک ماں کی خوشامد کی اور اسے
منا لیا۔ ماں اپنی بہو کے خط کا جواب دینے پر راضی
ہو گئی۔ یہ خط نپولین اپنے ساتھ لایا تھا۔ نپولین
دنیا کے بہترین جرنیلوں میں سے ایک تھا۔ اس
نے ۱۳ سال میں ۶۰ مقامات پر جنگ آزمائی کی
ہر جگہ اسے فتح نصیب ہوئی۔ [illegible]
[illegible] نپولین کو

[illegible] اسے
[illegible] بہت خوشی ہوئی۔ اس نے لکھا "میری دو
خواہشیں ہیں: تقدیر سے جنگ میں کامیابی کا
انعام اور جوزیفائن سے ایک بچہ کا تحفہ۔ اس
کے علاوہ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔" مگر جوزیفائن کے
بانجھ ہونے کی خبر غلط نکلی۔ نپولین کی فتوحات
سے متاثر ہو کر پیرس کی حکومت نے جوزیفائن
کو میدان جنگ میں اپنے خاوند سے ملنے کی
اجازت دے دی۔

نپولین سکندر کی طرح دنیا پر حکومت کرنے
کے خواب دیکھ رہا تھا۔ سارا یورپ اس کے
قدموں میں تھا۔ وہ جہاں کہیں جاتا، فتح و نصرت
اس کے قدم چومتی۔ یورپ کو فتح کرنے کے بعد
اس نے ایشیا پر قبضہ کرنے کی ٹھان لی۔ مگر
انگلستان ہمیشہ اس کی راہ میں چٹان بن کر آ جاتا۔
وہ انگریزوں سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے مصر
گیا۔ جوزیفائن نے اس کی بہت منت سماجت
کی کہ وہ اس مہم میں اسے اپنے ساتھ لے چلے،
لیکن نپولین نے انکار کر دیا۔ جوزیفائن شوہروں
کی فطرت سے واقف تھی۔ اسے اندیشہ تھا کہ
نپولین وہاں جا کر جلد یا بدیر کسی
دوسری عورت کے عشق میں گرفتار ہو جائے گا۔
اس کا یہ اندیشہ درست ثابت ہوا۔ [illegible]
[illegible]

[illegible] گویا تھا۔ انہوں نے اس کے پیچھے جاسوس
لگا دیے تھے۔ وہ اس کی ہر حرکت کی خبر رکھتے
اور نمک مرچ لگا کر نپولین کے کان بھرتے۔ اصل
نپولین کے خاندان کے لوگ جاہل اور گنوار تھے۔ وہ
تہذیب سے کوسوں دور تھے۔ انہوں نے
جب نپولین کی فتوحات کی خبر سنی تو سب پیرس
پہنچ گئے اور دونوں ہاتھوں سے مال و دولت
بٹورنے لگے۔ اس کا بھائی اس سے جرمنی کی
بادشاہت طلب کرنے لگا۔ اس کی بہنیں
بادشاہوں سے شادی کرنا چاہتی تھیں۔ نپولین
اپنے کم ظرف اور لالچی خاندان سے تنگ آ گیا،
لیکن وہ ان کی محبت کی وجہ سے مجبور تھا۔

نپولین کو مصر میں شکست نصیب ہوئی
انگریز امیر البحر لارڈ نیلسن نے اس کا بحری
بیڑا تباہ و برباد کر دیا۔ نپولین دل برداشتہ ہو کر
پیرس پہنچا۔ پیرس پہنچتے ہی اس کے گھر والوں نے
اس کو گھیر لیا۔ وہ سب مل کر جوزیفائن کی چغلی
کرنے لگے۔ بے چاری جوزیفائن کو اپنی صفائی
میں کچھ کہنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ اسے
نپولین کے کمرے میں گھسنے کی اجازت ہی نہیں ملی۔ وہ
اپنے دونوں بچوں کو لے کر کمرے کے باہر کھڑی رہی۔
اور روتی رہی۔ [illegible] وہ لوگ رخصت
ہوئے تو جوزیفائن نے اپنے دونوں بچوں کو ان
کے کمرے میں بھیج دیا۔ [illegible]
[illegible] اس کا دل پگھل گیا۔ اس نے اسے
گلے سے لگا لیا۔ نپولین نے اپنے خاندان کو گھر سے
نکال دیا۔ [illegible] جوزیفائن
کی [illegible]

جوزیفائن بے حد فضول خرچ تھی۔ وہ
نپولین کی غیر موجودگی میں ۲۰ کروڑ فرانک کی مقروض
ہو گئی تھی۔ نپولین کنجوس واقع ہوا تھا۔ اسے
فضول خرچی پسند نہیں تھی۔ جوزیفائن نے
ڈرتے ڈرتے اپنے قرض کا ذکر کیا لیکن نصف
رقم بتائی۔ نپولین کو بہت غصہ آیا لیکن اس
نے ۶ لاکھ ۰ ہزار فرانک ادا کر دیئے۔

نپولین کا وقار اب اتنا بڑھ گیا تھا کہ
اس نے فرانس کی بادشاہت حاصل کرنے
کا ارادہ کر لیا۔ حکومت نے اس کی درخواست
منظور کر لی۔ نپولین نے اپنی تاج پوشی کے لیے
پوپ کو دعوت دی۔ نپولین کا خاندان اس کی
تاج پوشی کے خیال سے خوش تھا، لیکن جوزیفائن
ان کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔
انہوں نے جوزیفائن کو راستے سے ہٹانے
کے لیے ایک چال چلی۔ انہوں نے ایک
خوب صورت عورت کا نپولین سے تعارف
کرایا۔ اس عورت نے نپولین کا دل جیت لیا۔
اس کے شب و روز اس عورت کے ساتھ
رنگ رلیوں میں گزرنے لگے۔ بے چاری جوزیفائن
دوسری بار بے وفائی کا شکار ہو گئی۔ ایک دن
نپولین اور اس کی نئی محبوبہ ایک کمرے میں خلوت
نشین ہو رہے تھے کہ اچانک جوزیفائن اندر
آ گئی۔ نپولین بجائے شرمندہ ہونے کے آپے سے
باہر ہو گیا۔ اس نے جوزیفائن کو خوب برا بھلا
کہا اور اسے کمرے سے باہر نکال دیا۔ اس نے
جوزیفائن کو حکم دیا کہ وہ محل خالی کر دے۔ نپولین
نے اسے طلاق کی دھمکی بھی دی۔

جب نپولین کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا تو وہ
اس مسئلہ پر سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ اسے
خیال آیا کہ اس کی شہرت پر طلاق کا برا اثر پڑے گا

یورپ میں طلاق کا دستور مختلف ہے۔ وہاں وہی انسان طلاق کی درخواست کر سکتا ہے جس سے بے وفائی کی جائے۔ بے وفا طلاق نہیں مانگ سکتا۔ نپولین نے جوزیفائن سے بے وفائی کی تھی وہ مجرم تھا اس لیے طلاق نہیں مانگ سکتا تھا۔ جوزیفائن اس کی بے وفائی کی بنا پر طلاق مانگ سکتی تھی نپولین نے اس سے درخواست کی وہ اس سے طلاق مانگ لے۔ لیکن جوزیفائن نے انکار کر دیا اسے اب بھی نپولین سے محبت تھی۔

اس اثنا میں نپولین کو معلوم ہو گیا کہ اس چال کے پیچھے اس کے خاندان کا ہاتھ ہے اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس بار انہیں ایسا مزا چکھائے گا کہ یاد رکھیں گے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ جوزیفائن نہ صرف اس کی تاج پوشی کے دربار میں شرکت کرے گی بلکہ وہ اپنے ہاتھ سے اس کے سر پر تاج رکھے گا اور اسے اپنی ملکہ بنائے گا۔ اس کے گھر والے یہ منظر دیکھ کر انگاروں پر لوٹیں گے۔

ایسا ہی ہوا۔ ۲ دسمبر ۱۸۰۴ کا دن فرانس کی تاریخ میں ایک یادگار دن تھا۔ اس دن پیرس کے مشہور چرچ نوتر دیم میں نپولین اور جوزیفائن کی رسم تاج پوشی عمل میں آئی۔ نپولین نے اپنے ہاتھ سے اپنی ملکہ کے سر پر تاج رکھا۔ اس رسم کے بعد بڑی شان سے ان کی سواری نکلی لاکھوں آدمیوں کے ہجوم نے انہیں مبارک باد دی۔

تاج پوشی سے ایک دن پہلے دونوں کی خفیہ شادی ہوئی۔ مذہبی رہنماؤں کے نزدیک ان کی پہلی شادی قابل قبول نہیں تھی ان کی [illegible] تھی پھر بھی اس شادی کو باقاعدہ شادی نہیں مانتا تھا۔

نپولین کا خاندان اب بھی چین سے نہ بیٹھا۔ وہ چاہتے تھے کہ نپولین کے بچہ پیدا ہو جو اس کا جانشین ہو۔ انہوں نے پھر نپولین کے کان بھرنے شروع کیے۔ نپولین روس کی فوج کا پیچھا کرتے کرتے پولینڈ پہنچ گیا تھا۔ وہاں وہ [illegible] والیوسکا کے دام محبت میں گرفتار ہو گیا۔ [illegible] ایک جوان اور خوب صورت عورت تھی۔ اس کا خاوند بوڑھا تھا۔ جوزیفائن کے کانوں تک بھی اس معاشقے کی بھنک پہنچ گئی۔ اس نے نپولین کو شکایتی خط لکھے۔ نپولین جب واپس پیرس پہنچا تو جوزیفائن کو دیکھتے ہی سب کچھ بھول گیا۔ اس کے بھائی بہنوں نے پھر ان کی طلاق کے لیے کوشش شروع کر دی۔ نپولین پھر ان کی باتوں میں آ گیا۔ اس نے ایک آدمی کو جوزیفائن کے پاس بھیجا تاکہ وہ اسے نپولین سے طلاق لینے پر مجبور کرے۔ جب جوزیفائن کا نپولین سے ملنا ہوا تو اس نے رو رو کر اس سے التجا کی کہ وہ ایسا نہ کرے۔ اس نے کہا "تم نے اپنے ہاتھ سے میرے سر پر تاج رکھا ہے میں تمہاری بیوی ہوں۔ تم چاہو تو مجھے ٹھکرا سکتے ہو۔ لیکن میں یہ قدم نہیں اٹھا سکتی" نپولین اس کے آنسوؤں کی تاب نہ لا سکا۔ یہ منظر دونوں کے بغل گیر ہونے پر ختم ہوا۔

نپولین بار بار طلاق کے متعلق سوچتا اور ہر بار جوزیفائن کے آنسو دیکھ کر پگھل جاتا لیکن طلاق کا خیال اس کے دل میں جڑ پکڑ چکا تھا۔ اسے ایک جانشین کی خواہش تھی اس کی شادی کو ۱۵ سال ہو چکے تھے جوزیفائن کی عمر [illegible] سال تھی اس عمر میں بچہ پیدا کرنے کا امکان نہیں [illegible] تھا۔ نپولین نے فیصلہ [illegible] کی۔ اس نے ایک بیان تیار کرایا جو جوزیفائن کو دربار میں یہ بیان پڑھنا تھا۔ اس بیان میں لکھا تھا میں اپنی مرضی سے نپولین کو چھوڑ رہی ہوں۔ یہ قربانی بادشاہ اور ملک کی خاطر دے رہی ہوں۔ جوزیفائن مجبوراً اس بیان کو پڑھنے پر راضی ہو گئی لیکن جب وہ دربار میں پہنچی تو اس پر غشی طاری ہو گئی۔ ایک شخص نے اس کی طرف سے یہ بیان پڑھ کر سنا دیا اور اس طرح جوزیفائن کو طلاق ہو گئی۔

جوزیفائن سے طلاق لینے کے بعد نپولین نے آسٹریا کی شہزادی سے شادی رچائی۔ لیکن یہ شادی اسے راس نہ آئی۔ اس کو پے در پے شکستوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جوزیفائن اس کی خوش نصیبی کا ستارہ تھی۔ فرانس کے لوگ اس کو فتح و نصرت کی دیوی کہتے تھے۔ نپولین کا ستارہ گردش میں آ گیا۔ اس کو تخت و تاج چھوڑنا پڑا اور اسے جزیرہ ایلبا میں جلا وطن کر دیا گیا۔ اس کی نئی ملکہ نے جب یہ حالت دیکھی تو وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ نپولین بھیس بدل کر جزیرہ ایلبا سے فرانس واپس آ گیا اور اس نے حکومت پر دوبارہ قبضہ کر لیا لیکن اس کی قسمت اس سے منہ موڑ چکی تھی۔ سو دن حکومت کرنے کے بعد واٹرلو کے مقام پر اسے عبرت ناک شکست ہوئی۔

جوزیفائن طلاق لینے کے بعد پیرس سے باہر چلی گئی تھی۔ اس کی زندگی کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ نپولین کی بے وفائی نے اس کا دل توڑ دیا تھا۔ وہ گھل گھل کر بیمار ہو گئی [illegible] اس کی عمر [illegible] سال تھی۔

بیوٹی کالج

موسم میں میک اپ کیسے کیا جائے؟

میک اپ خوبصورتی کا ایک ایسا راز ہے جس پر عمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ مصور کینوس پر تصویر بناتا ہے تو اسے یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ رنگوں کو کس طرح ملایا جائے، برش کو کس طرح استعمال کیا جائے۔ یہی حال چہرے کا ہے۔ میک اپ کرنے سے پہلے جلد کی ساخت کو سمجھنا پڑتا ہے، موسم کا دھیان رکھنا پڑتا ہے، میک اپ کے اجزاء کی مقدار کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔

میک اپ کرنے سے پہلے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ آپ کی جلد صاف ستھری ہو۔ اگر یوں ہی منہ دھو کر میک اپ کریں گی تو اس کا اثر اچھا ظاہر نہیں ہوگا۔ جلد کے مسامات گرد و غبار سے پاک ہونے ضروری ہیں۔ صابن سے اچھی طرح جلد کو دھونے کے بعد بیوٹی لوشن سے جلد کو صاف کریں۔ اگر بیوٹی لوشن نہ مل سکے تو ٹھنڈے پانی کے چھینٹے منہ پر ماریں۔ اس کے بعد کوئی سا اچھا کلینزنگ کلینسر لگائیں۔ اگر آپ کی کھال خشک ہے تو کولڈ کریم لگائیں۔ کولڈ کریم خشک کھال کے لئے بہت اچھی چیز ہے۔ کولڈ کریم ایک ایملشن ہے جس سے نہ صرف جلد صاف ہو جاتی ہے بلکہ جلد کے مسامات بھی کھلے اور چکنے ہو جاتے ہیں۔ اس سے چہرے کی جھریاں بھی معدوم ہو جاتی ہیں۔ تاہم وہ جھریاں جو عمر کے بڑھنے سے پیدا ہوتی ہیں کولڈ کریم سے صاف نہیں ہو سکتیں۔ جلد کو صاف کرنے کے بعد کریم اچھی طرح جذب ہو جائے [illegible] [illegible] [illegible] کا استعمال [illegible]

سکتی ہے۔ ۲۰ منٹ میں کر لیتی ہے۔ بہت سی عورتوں کو خیال ہے کہ کریم جتنی دیر جلد پر لگی رہے اتنا ہی فائدہ کرتی ہے۔ یہ خیال غلط ہے۔ بعض خواتین تو چہرے پر کریم لگی رہنے دیں، چہرے کو صاف کر کے سوتی ہیں۔ اگر آپ نے چہرے پر کریم لگائی اور رات بھر اسے یوں ہی لگا رہنے دیا تو جلد کو سانس لینا دشوار ہو جائے گا۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ جلد بھی سانس لیتی ہے۔ اسے بھی آکسیجن کی ضرورت ہے۔ کریم کی تہہ سے اس کا سانس گھٹ جاتا ہے۔ جلد کو تازہ ہوا اسی طرح کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی پانی کی ہے۔ اس لئے رات کے وقت کولڈ کریم کو ضرور صاف کر دیں۔ صاف

کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک روئی کے صاف ٹکڑے کو پانی میں بھگو کر نچوڑ لیں اور اس ٹکڑے سے چہرے کو صاف کریں۔ اس ترکیب سے کریم بھی صاف ہو جائے گی اور چہرے پر نمی بھی برقرار رہے گی۔ کلارزمی قسم کی کولڈ کریم استعمال نہ کریں۔ لیکوئیڈ کلینزنگ کلینسر کو استعمال کرنے سے پہلے اس کے لیبل کو پڑھ لیں۔ اس طرح آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ خشک جلد کے لئے ہے یا روغنی جلد کے لئے۔

کلینسر لگانے سے پہلے یہ بات بھی ذہن نشین کر لیں کہ چہرے پر ہاتھوں کی انگلیوں کی حرکت ناک سے کنپٹی کی طرف ہو۔ الٹے سیدھے ہاتھ چلانا چہرے کی مالش بھی ایک فن ہے۔ کان کے درمیانی حصے کے پاس نبض کی حرکت محسوس کی جا سکتی ہے۔ انگلیوں کی حرکت اس مقام کی جانب ہو تو مالش سے فائدہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ آنکھوں کے نیچے کے حصے کا دھیان رکھنا بھی ضروری ہے۔

ہم بانو کے پچھلے شماروں میں بتا چکے ہیں کہ چہرے کا یہ حصہ نمی کے غدود سے محروم ہے۔ اس لئے سب سے پہلے یہی حصہ جھریوں کا شکار ہوتا ہے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے یا کنپٹی کی طرف جھریاں انہی غدودوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے پڑتی ہیں۔ اس جگہ بادام کا تیل یا زیتون کا تیل لگائیں تاکہ یہ جگہ چکنی رہے اور اس پر جھریاں نہ پڑیں۔

صبح کو میک اپ کرنا ہو تو پہلے صابن سے منہ دھوئیں۔ میک اپ کرنے سے پہلے جلد کا صاف ہونا ضروری ہے۔ اگر آپ کی جلد روغنی ہے تو منہ دھونے کے بعد بیوٹی لوشن لگائیں۔ اگر جلد خشک ہے تو صرف ٹھنڈے پانی سے چہرے کو تھپتھپائیں۔ اب فیس ٹانک کریم یا

شہناز حسین
۹۲ - ۹۳ گریٹر کیلاش، نئی دہلی۔ فون نمبر ۶۱۲۶۴۳

فاؤنڈیشن کی باری آتی ہے۔ فاؤنڈیشن سے
رنگ ہوتا اچھا ہے۔ اگر آپ کی جلد خشک ہے
تو فاؤنڈیشن کریم استعمال کریں۔ اگر روغنی ہو تو
سیال فاؤنڈیشن استعمال کریں۔ فاؤنڈیشن سیال
ہو یا کریم کی شکل میں، اسے زیادہ نہ لگائیں۔ اگر
آپ نے اسے زیادہ مقدار میں استعمال کیا تو
یہ کچھ دیر کے بعد مسامات سے باہر نکل آئے گا۔
اور میک اپ کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔
اگر آپ کے چہرے پر زرد تل ہیں یا چوٹ کا نشان
ہے یا کوئی اور نقص ہے تو فاؤنڈیشن کے استعمال
سے یہ عیب چھپ جاتے ہیں۔ اگر آپ کا چہرہ
بے عیب ہے تو آپ کو سیال فاؤنڈیشن کی
ضرورت نہیں۔ اپنی جلد کو فاؤنڈیشن کی تہوں
سے سجا کر رکھیں۔ بھاری میک اپ جلد کے لئے
مفید نہیں۔ اگر آپ جوان ہیں، تندرست ہیں
تو جلد کو جوان اور تندرست رہنے دیجئے۔ ادھیڑ
عمر یا بڑھاپے میں بے شک میک اپ کی ضرورت
پڑتی ہے۔ ادھیڑ عمر کی صورت کو جو چیز پرکشش سے
حاصل ہوتی ہے، قدرت نے وہ کشش ہی آپ کو
عطا کی ہے۔ اس کی قدر کریں نقالی نہ کریں۔

جب فاؤنڈیشن لگائیں تو یہ ضروری ہے
کہ آپ کھڑکی کے پاس یا کمرے میں بیٹھیں۔ آپ کو
قدرتی روشنی میں آئینے کے سامنے بیٹھنا چاہئے۔ ٹیوب
لائٹ یا بلب کی روشنی میں رنگ کا صحیح اندازہ
نہیں ہوتا۔ اگر آپ کے پاس تین شیشوں والی
سنگھار میز ہے تو اس کا استعمال زیادہ مفید ثابت
ہوگا۔ اکثر خواتین فاؤنڈیشن لگاتے وقت ہاتھ
[illegible] کو بھول جاتی ہیں۔ بعض اوقات یہ دونوں
[illegible] میک اپ کے بعد معلوم ہوتے ہیں
[illegible] وقت ہاتھ [illegible]

آج کل عورتیں فاؤنڈیشن کے بجائے [illegible]
کریم استعمال کرتی ہیں۔ یہ طریقہ غلط ہے۔
اس رنگین کریم سے قدرتی اثر ختم ہو جاتا ہے۔
فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ یہ رنگ مصنوعی ہے۔ اگر
آپ رنگین فاؤنڈیشن ہی استعمال کرنا چاہتی ہیں
تو اس کے انتخاب کے وقت یہ خیال رکھیں کہ اس
کا رنگ آپ کی جلد سے ملتا جلتا ہو۔ فاؤنڈیشن
کا انتخاب کرتے وقت اسے ہاتھ پر لگا کر نہ دیکھیں۔
رنگ ٹیسٹ کرنے کا یہ طریقہ غلط ہے۔ ہاتھ اور چہرے
کی جلد کے رنگ میں فرق ہوتا ہے۔ آپ دن
بھر ہاتھوں سے کام لیتی ہیں، ان سے کپڑے
دھوتی ہیں، اس لئے ہاتھوں کی جلد میں دوران
خون باقی جسم سے زیادہ تیز ہوتا ہے۔ ہاتھ چہرے
سے زیادہ سرخ رہتے ہیں، اس لئے ہاتھوں پر
فاؤنڈیشن کے رنگ کی آزمائش نہ کریں۔
فاؤنڈیشن کے انتخاب کے وقت دن
کی روشنی کا ہونا ضروری ہے۔ چہرے کے ایک
حصے پر لگا کر اس کی آزمائش کریں۔ پاؤڈر کا
انتخاب کرتے وقت بھی یہی طریقہ اختیار کریں۔
اگر آپ کی کھال خشک ہے تو ڈرائی سکن کریم یا
فاؤنڈیشن استعمال نہ کریں۔ کیونکہ اس سے
آپ کی جلد کے لئے مسامات بند ہو جائیں
گے۔ اگر آپ کی جلد نہ روغنی ہے اور نہ خشک بلکہ
نارمل ہے تو بہت ہلکے رنگ کا فاؤنڈیشن استعمال
کریں۔ اگر آپ کی جلد پر زرد رنگ کے تل ہیں
تو فاؤنڈیشن کے لئے ایسے رنگ کا انتخاب کریں
جو آپ کی جلد کے رنگ اور تلوں کے رنگ کے
بین بین ہو۔ اگر فاؤنڈیشن کا رنگ جلد کے رنگ
سے میل کھاتا ہے تو بہتر ہے [illegible]
ہو تو بھی کوئی [illegible]
[illegible] مصنوعی معلوم ہوگا۔

اگر آپ کے چہرے [illegible]
[illegible] سے چہرے [illegible]
پھر فاؤنڈیشن لگائیں۔ اگر آپ کی جلد خشک
ہے تو فاؤنڈیشن لگانے سے پہلے کوئی [illegible]
لوشن لگائیں پھر فاؤنڈیشن لگائیں۔ اگر آنکھوں
کے گرد حلقے ہوں تو میک اپ اسٹک سے کم
کئے جا سکتے ہیں۔ جہاں جہاں پر فاؤنڈیشن اسٹک
لگائیں، اس کے بعد روئی کے ٹکڑے سے یکساں
ہموار کر لیں۔ یہ نہ معلوم ہو کہ کون سا رنگ کہاں شروع
ہوا اور کہاں ختم ہوا۔ آنکھوں کے نیچے ایک شیڈ
ہلکا رنگ استعمال کریں، لیکن رنگوں کا اختلاف
ظاہر نہیں ہونا چاہئے۔ رنگ ایک دوسرے
اس طرح خلط ملط ہو جائیں کہ ایک ہی رنگ کا
تاثر باقی رہے۔

فاؤنڈیشن لگاتے وقت ٹھوڑی کے
نیچے کے حصے کو نہ بھولیں۔ اگر آپ نے محفل میں
قہقہہ بلند کیا تو آپ کا سر قدرتی طور پر پیچھے کی
طرف چلا جائے گا۔ اس طرح ٹھوڑی کے نیچے کا
حصہ آپ کی بے احتیاطی کی چغلی کھائے گا۔ اس
کے علاوہ کانوں کے نیچے کے حصے پر اور کانوں کے
سوراخ میں بھی میک اپ کریں۔ گردن کے پچھلے
حصے کو بھی نہ بھولیں ورنہ دونوں حصوں کا فرق
نمایاں ہو جائے گا۔

اب [illegible] ہے۔ آج
سے ۱۰ سال پہلے [illegible]
لیکن اب [illegible]
[illegible]

آپ خشک اور سخت روژ استعمال کریں تو چہرے پر پاؤڈر لگانے کے بعد اسے استعمال کریں لیکن اگر سیال روژ پسند ہو تو پاؤڈر لگانے سے پہلے استعمال کریں، اس کے بعد روئی کے ٹکڑے سے رنگ کو اچھی طرح ملا لیں۔ کریم روژ بعض اوقات بہت گاڑھا ہوتا ہے اور اس کے لگانے میں مشکل پیش آتی ہے۔ اس مشکل کا حل یہ ہے کہ انگلیوں کے پوروں پر ذرا سی کلینزنگ کریم لگائیں۔ پھر اس میں کریم روژ ملا لیں۔ اس طرح یہ روژ ملائم ہو جائے گا۔ اور اس کا استعمال آسان ہو جائے گا۔

روژ کے استعمال کے لئے ہم آپ کو ایک نکتہ بتاتے ہیں۔ روژ چہرے پر سُرخی کا تاثر پیدا کرتا ہے۔ جہاں چہرے پر زیادہ سُرخی کے امکان ہوں روژ وہیں لگانا چاہیئے۔ اس طرح سُرخی کا اثر دوبالا ہو جاتا ہے۔ اس جگہ کو معلوم کرنے کے لئے آپ اپنے گالوں میں چٹکی بھریں۔ جس جگہ خون زیادہ دوڑے گا وہی جگہ زیادہ سُرخ معلوم ہو گی۔ بس اسی جگہ روژ لگائیں۔ روژ لگانے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اُسے مثلث کی شکل میں لگائیں۔ یعنی اس طرح :

⁘ (دو نقطے اوپر اور ایک نقطہ نیچے) پھر روئی سے ملائیں۔

خشک روژ ہمیشہ پاؤڈر کی تہہ کے اوپر لگائیں۔ پہلے چہرے پر اچھی طرح پاؤڈر لگا لیں۔ پھر پاؤڈر پف یا روئی کے ٹکڑے سے اسے اچھی طرح پھیلائیں۔ اس کے بعد روئی سے پونچھ کر چہرے کی طرف ... چہرے کے ... اور ... سے ... [illegible]
... اور ... روئی سے ... [illegible]
اگر ... پاؤڈر ... [illegible]

خشک روژ لگائیں۔ رخساروں کی ہڈیوں سے شروع کریں۔ روژ کے لئے صحیح جگہ کا انتخاب کرنے کے لئے یہ نکتہ قابلِ غور ہے۔ آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر مسکرائیں۔ مسکرانے یا ہنسنے سے چہرے کا گوشت اُبھر آتا ہے۔ صرف اس اُبھار پر روژ لگائیں۔ یہ اُبھار روژ کے لئے سرحد کا کام دیتا ہے۔ اس اُبھار کے باہر روژ نہ لگائیں۔ روژ لگانے کے بعد روئی کے ٹکڑے سے ہلکا سا پاؤڈر لگائیں۔

اگر آپ سیال روژ پسند کرتی ہیں تو روژ لگاتے وقت انگلیوں کی حرکت کا خیال رکھیں۔ جیسے ہم پہلے بتا چکے ہیں، انگلیوں کی حرکت گالوں سے کنپٹی کی طرف ہونا ضروری ہے۔ اگر آپ نے کریم روژ لگایا ہے اور آپ کو دن بھر گھر سے دور رہنا ہے تو وقتی طور پر سخت روژ کا استعمال کر سکتی ہیں۔ اس طرح سُرخی کا اثر قائم رہتا ہے۔ پاؤڈر اتنا نہ لگائیں کہ چہرے کی کھال چھپ جائے اور پاؤڈر ایک نقاب بن کر رہ جائے۔ پاؤڈر کے انتخاب میں احتیاط برتیں۔ پاؤڈر قیمتی اور باریک ہونا چاہیئے۔ اس معاملے میں کفایت شعاری نقصان دہ ہے۔ کچھ عورتیں پاؤڈر لگاتے وقت پاؤڈر پف کا استعمال کرتی ہیں۔ ہماری رائے میں روئی بار بار استعمال کئے ہوئے پاؤڈر پف سے بہتر ہے۔

پاؤڈر اور روژ لگانے کے بعد ذرا سا ٹھنڈی کا ٹکڑا بہت تھوڑا نم کرنے کے بعد چہرے پر رکھیں۔ اس سے میک اپ سیٹ ہو جائے گا۔

سوال و جواب

تجسیم بانو، میرٹھ

س : میرے چہرے پر پسینہ بہت آتا ہے اور کافی دنوں سے میرے چہرے کا رُوواں کالا ہوتا جا رہا ہے؟

ج : آپ چہرے کو رومال سے یقیناً رگڑ کر پونچھتی ہوں گی۔ یاد رکھئے کہ چہرے کو رگڑ رگڑ کر پونچھنے سے رُوواں بن جاتا ہے۔ اگر رومال سے پونچھنا ہو تو صرف تھپتھپا سکتی ہیں۔ اسی طرح تولئے سے بھی چہرے کو زور سے رگڑنا یا زور سے پونچھنا مناسب نہیں، جلد کے لئے بھی نقصان دہ ہے۔

فرزانہ حمید، حیدرآباد

س : گرمیوں میں چہرے کے لئے کوئی ٹونک تجویز کیجئے۔

ج : آپ بارلی پکا کر نتھار لیں اور بارلی کے دانوں کو چہرے پر مَل کر دس منٹ چھوڑ دیں پھر ٹھنڈے پانی سے دھو ڈالیں۔ اور بارلی کا پانی ٹھنڈا کر کے شربت گل برگ ڈال کر خود پی لیں۔ بہت مفید ہے۔

عقیلہ بی، رام پور

س : میرے بال بہت اُتر رہے ہیں۔ میں بہت پریشان ہوں؟

ج : آپ جتنا پریشان ہوں گی بال اُتنے زیادہ گریں گے۔ دماغی تناؤ اور پریشانی سے بال زیادہ اُترتے ہیں۔ آپ بالوں کو ریٹھے شیمپو پاؤڈر سے دھوئیں اور نیم گرم ہیئر آئل ڈالیں۔ بال گرنے بند ہو جائیں گے۔

رابعہ نسیم، سہارن پور

س : بال ہفتہ میں کتنی بار دھونے ضروری ہیں؟

ج: شیمپو تو ہفتہ میں ایک بار کافی ہے، لیکن سر میں نہاتے وقت روزانہ پانی ڈالنا بالوں کے لئے مفید ہے۔

انیس بیگم، دہلی

س: کیا کھیرا چہرے پر لگانا مفید ہے؟

ج: جی ہاں، کھیرے کا عرق ہی واحد ایک ایسی چیز ہے جو خشک اور چکنی دونوں طرح کی جلد کے لئے مفید ہے۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں کے لئے بھی کھیرے کا عرق مفید ہے۔ کھیرے کے باریک باریک سلائس کاٹ کر خوب ٹھنڈا بستہ کریں۔ پھر ان کو چہرے کے سب طرف لگا لیں۔ آنکھوں پر بھی رکھ لیں۔ آنکھیں بند رکھیں۔ دس منٹ بعد ہٹا دیں۔ تمام ترکاریوں میں کھیرا ایک ایسی چیز ہے جس کا عرق جلد کے اندر چلا جاتا ہے۔

عذرا تسنیم، شاہدرہ (دہلی)

س: میرے سر کے بال بہت ہی نرم ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ پھولے پھولے رہیں۔ میں بال سیٹ کرا نہیں سکتی کیوں کہ ہمارا گھرانہ بہت قدامت پرست ہے۔

ج: آپ بالوں میں بیئر کا پانی ڈال کر بالوں کو جس رُخ پر رکھنا چاہیں اُس کی مخالف سمت میں کنگھا کریں۔ خشک ہونے کے بعد بال پھولے پھولے ہو جائیں گے۔

ریحانہ بیگم، بدایوں

س: میرے سر کے بال بہت گھنگریالے ہیں۔ میں اپنے بالوں کو سیدھا کرنا چاہتی ہوں۔

ج: مغربی ممالک میں گھنگریالے بالوں کا فیشن پھر شروع ہو رہا ہے۔ آپ اپنے بال دھونے کے بعد [illegible] نہ کریں، جب تک بال سوکھ نہ جائیں، اس میں مستقل برش کرتی رہیں۔ بہت حد تک آپ کے بال سیدھے ہو جائیں گے۔ دوسری ترکیب سیدھے بال کرنے کی یہ ہے کہ شیمپو یا صابن سے بال دھونے کے بعد بالوں میں برش کر کے بالوں کو دو حصّوں میں بانٹ لیں۔ پھر کنگھے کی مدد سے دائیں طرف کے بال بائیں طرف لے جا کر سر کے چاروں طرف کس کر لپیٹ دیں اور ہیئر پن لگا دیں۔ اسی طرح بائیں طرف کے بال داہنی طرف لے جا کر لپیٹ لیں۔ ہر مرتبہ بال دھو کر ایسا ہی کریں بال کافی حد تک سیدھے ہو جائیں گے۔

بیگم رضیہ زبیر شمسی، دھنباد

س۔ آج کے انسان نے ہر برائی کو تہذیب کا نام کیوں دے رکھا ہے؟

ج: برائی کا معیار بدلتا رہتا ہے۔ گذشتہ زمانے میں ایک مہذب انسان اپنی بیویوں اور غلاموں کی تعداد سے پہچانا جاتا تھا۔ آج یہ دونوں چیزیں برائیوں میں شمار ہوتی ہیں۔

س۔ عورت خود کو فاتح اعظم کب سمجھتی ہے؟

ج: جب وہ کوشش کر کے اپنا ایک الگ گھر بنا لے۔

س۔ بعض لڑکے بھی لڑکیوں کی طرح زیادہ باتیں کیوں کرتے ہیں؟

ج: یہ آپ کا وہم ہے آپ نے شاید کبھی سیاسی لیڈروں کو لمبے لمبے بھاشن دیتے ہوئے نہیں سنا۔

حسینہ پروین انصاری، کامٹی، ناگپور

س۔ دولت حاصل کرنے کی خواہش مرد میں زیادہ ہوتی ہے یا عورت میں؟

ج: عورت میں دولت حاصل کرنے کی خواہش صرف گھر کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ لیکن بے تحاشا دولت حاصل کرنے کی خواہش صرف مردوں میں ہوتی ہے۔

س: میری عادت کم بولنے کی ہے جس کی وجہ سے لوگ مجھے گھمنڈی ہونے کا طعنہ دیتے ہیں ایسا کیوں؟

ج: ایسے لوگ حسد کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں۔ وہ کوشش کے باوجود اپنی زبان قابو میں نہیں رکھ سکتے۔ آپ میں یہ ہنر دیکھ کر وہ آپ سے حسد کرتے ہیں۔

ڈبلو۔ اے۔ زخمی، گریڈیہہ، بہار

س۔ کیا سوتیلی ماں اپنی ماں کا پیار دے سکتی ہے؟

ج: کیوں نہیں۔ سوتیلی ماں کا نام بدنام ہے۔ سماج اس سے بے رحمی کی توقع کرتا ہے۔ اگر وہ رحم دل ہو تو لوگ اس کا یقین نہیں کرتے دراصل عورت میں ممتا کا جذبہ ہونا ضروری ہے سگی اور سوتیلی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

س۔ کسی دوسرے کی بھلائی کر کے انسان کب خوش ہوتا ہے؟

ج: جب وہ اس بھلائی کے بدلے میں توقع نہ رکھے۔

محمد سہیل اختر، جمشید پور

س۔ کیا دنیا میں صرف غم ہی غم ہیں؟

ج: اگر آپ کی آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگا ہے تو آپ کو ہر چیز سیاہ نظر آئے گی۔

س۔ انسان زندگی سے بے زار کب ہو جاتا ہے؟

ج: جب وہ حالات کی بندشوں میں قید ہو کر رہ جائے۔

وقار احمد خاں، بیگم وقار، گریڈیہہ

س۔ انسان کو اپنی غلطی کا احساس کب ہوتا ہے؟

ج: وقت گذر جانے کے بعد

س۔ زندگی میں سکون کب ملتا ہے؟

ج: جب انسان یہ سمجھ لے کہ دنیا میں کوئی بھی شے اہم نہیں۔

س۔ انسان سب سے زیادہ کس سے ڈرتا ہے؟

ج: اپنے گناہ کے احساس سے۔

کلام احمد آرزو، ہزاری باغ

س۔ عورت کی تباہی؟

اس عنوان کے تحت دلچسپ معلوماتی اور ذہنی سوالوں کے جواب دئے جاتے ہیں۔ ایک کاغذ پر یا پوسٹ کارڈ پر زیادہ سے زیادہ تین سوال لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کے لئے جگہ چھوڑیئے اور اپنا پورا نام پتہ لکھئے جس کاغذ یا کارڈ پر سوالات ہوں اس پر دفتر سے متعلق اور کوئی بات نہ لکھئے۔ اپنے سوالات اس پتہ پر بھیجئے: بزم بانو

ماہنامہ بانو آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱

ج سارے گھر کی تباہی۔ مثل مشہور ہے
کہ عورت ایک سوئی سے گھر کو گرا سکتی
ہے اور مرد اگر پھاؤڑا لے کر بھی کھڑا
ہو جائے تو گھر کو تباہ نہیں کر سکتا۔

س۔ سکون کی تلاش؟
ج ہر انسان کا نصب العین ہے لیکن
افسوس کہ وہ ان چیزوں کی طرف
بھاگتا ہے جو بے سکونی پیدا کرتی ہیں۔

نواب اصغر علی نور جہاں بیگم، دھنباد بازار

س۔ وقت کا طوفان کب اٹھتا ہے؟
ج انسان طوفان اٹھاتا ہے۔ وقت
خواہ مخواہ بدنام ہوتا ہے۔

س۔ آدمی غم سے چھٹکارا کب پاتا ہے؟
ج جب غم کی انتہا ہو جائے۔
رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے غم
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

عبدالحفیظ شاکر، حیدرآباد

س۔ زندگی کا مقصد؟
ج جذبات اور خیالات میں ہم آہنگی۔

س۔ آج کل کی لڑکیاں مردانہ لباس کیوں
استعمال کرتی ہیں؟
ج کیونکہ اب عورتیں یہ طعنہ برداشت
نہیں کر سکتیں کہ اُن کے لباس
مردوں سے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔

س۔ انسان دوسروں کی تکلیف کو کب
محسوس کرتا ہے؟
ج جب وہ خود اس تکلیف سے گزر چکا ہو

محمد سعید عصوری، جمشید پور

س۔ کیا زندہ دل انسان بھی مایوس ہو سکتا
ہے۔
ج زندہ دل انسان وقتی طور پر مایوس
ہو سکتا ہے لیکن اس کی زندہ دلی
کبھی ختم نہیں ہوتی۔

س۔ انسان اپنی عزت کب کھو دیتا ہے؟
ج جب وہ خود کو اپنی نظروں سے گرا دے

محمد منہاج الحق گیشہار

س۔ موجودہ دور میں انسان کو اپنی عزت
پیاری ہے یا دولت؟
ج انسانوں کی اکثریت کو آج بھی اپنی
عزت دولت سے زیادہ عزیز ہے۔

س۔ کیا انسان کی زندگی شادی کے بغیر
نامکمل ہے؟
ج ارسطو کا قول ہے کہ انسان ایک
سماجی جانور ہے۔ وہ اکیلا نہیں
رہ سکتا۔ انسان رفاقت کے بغیر اپنے
آپ کو نامکمل سمجھتا ہے۔

سید تنویر احمد راجہ، واسع پور، دھنباد

س۔ گھریلو زندگی کے دامن پر بدگمانیوں
کا سایہ کب پڑتا ہے؟
ج جب شوہر اور بیوی کے درمیان گفتگو
کا سلسلہ بند ہو جائے۔ اکثر خاموشی
بدگمانی کو ہوا دیتی ہے۔

س۔ آج کل سب لوگوں کا کردار اس قدر
پست کیوں ہوتا جا رہا ہے؟
ج یہ آپ کا وہم ہے۔ لوگوں کے کردار
ہر زمانے میں بلند اور پست رہے ہیں
انسانیت ہمیشہ کے لئے کبھی ختم نہیں
ہو سکتی۔

س۔ زندگی کھلونا کب بن جاتی ہے؟
ج جب آدمی کو عقل آ جائے۔

ریشت کوثر، آسنسول

س۔ شریف آدمی بزدل کیوں کہلاتا ہے؟
ج بزدلی اور شرافت میں بال برابر کا
فرق ہے۔ کئی دفعہ بزدل انسان
اپنی کم زوری کو شرافت کے پیرہن
میں چھپا لیتا ہے۔ اس لئے پہچان
مشکل ہو جاتی ہے۔ شرافت اصل میں
بزدلی نہیں ہے۔

س۔ کیا وقت کے ساتھ چلنا ضروری ہے؟
ج عام آدمیوں لئے ضروری ہے، خاص
آدمی وقت کو اپنے ساتھ چلاتے ہیں۔

محمد شمیم خاں، فرخ آباد

س۔ آج کل کی بیویاں اپنے فرض کو بھول
رہی ہیں اور اپنے حقوق کو یاد رکھتی ہیں۔
آخر ایسا کیوں؟
ج وہ اپنے فرائض کو بھول رہی ہیں لیکن
ادا بھی کر رہی ہیں وہ حقوق کو یاد رکھتی
ہیں لیکن پا نہیں سکتیں۔

رعنا خاتون، نگینہ

س۔ بھائی! آنسو اور قسمت کی بے رحمی
کے خلاف آواز اٹھانے والے آپ
کی نظر میں؟
ج انسان دوست۔ اور بہادری کا سبق
سکھانے والے۔

س۔ اگر کسی کو زیادہ ہنسنے پر اعتراض اور
خاموش بیٹھنے پر شبہ ہو تو؟
ج وہ بہت سنجیدہ اور کام کی بات
کرنے والا ہے۔

محمد ابراہیم راہی، بانسواڑہ، نظام آباد

س۔ پیار کے لئے پیسہ چاہئے۔ پیسے کے
لئے محنت، تو نفرت کے لئے؟
ج جی نہیں۔ پیار کے لئے دل چاہئے۔ پیسے
کے لئے لگن اور نفرت کے لئے
خود غرضی

س۔ جانور کی محبت میں اور انسان کی
محبت میں کیا فرق ہے؟
ج جانور کو محبت میں ناکامی نہیں ہوتی
اگر ہو جائے تو وہ فراق میں آنسو نہیں
بہاتا۔

دیس بدیس کی خبریں

دُلہن بدل گئی

شادی کے لئے دُولہا دُلہن کے رشتہ داروں میں کئی روز سے بات چیت چل رہی تھی۔ دُولہا والے کھاتے پیتے گھرانے کے تھے۔ آخر شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ شادی کے دن برات آگرے کے لئے روانہ ہو گئی۔ دُلہن والے ان کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ جب شادی کی رسمیں ادا ہونے لگیں تو دُولہا یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دُلہن کی جگہ ایک بُڑھی اور بدشکل عورت اس کے پاس بیٹھی ہے۔ پہلے اسے بتایا گیا تھا کہ دُلہن جوان اور خوب صورت ہے۔ چنانچہ دُولہا نے شادی کرنے سے انکار کر دیا اور منڈپ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ دُلہن والے اس کے رویے سے بہت ناراض ہوئے۔ دُولہا کہتا تھا کہ اس کی سسرال والوں نے دُلہن کو بدل دیا ہے، جب کہ اس کی سسرال والوں کا اصرار تھا کہ انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ بہت دیر تک دونوں فریقوں میں تکرار ہوتی رہی۔ براتی مختصر تعداد میں تھے۔ دُلہن والوں نے ان کو گھیر لیا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ دُولہا اسی عورت سے شادی کرے۔ اس کے انکار پر اس کی سسرال والوں نے تمام براتیوں کو حراست میں لے لیا اور ان کو ایک کمرے میں بند کر دیا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ اگر دُولہا برات واپس لے جانا چاہتا ہے تو اسے ایک معقول رقم بطور تاوان لڑکی والوں کو ادا کرنی پڑے گی۔ یہ رقم ہزاروں تک پہنچی تھی۔ ناچار دُولہا نے یہ رقم ادا کر دی۔ اس طرح براتیوں کو خلاصی ملی اور یہ برات بمشکل رہا ہو کر واپس پہنچی۔

ملازمت حاصل کرنے کی انوکھی ترکیب

آندھرا پردیش کے ایک آدمی نے بے روزگاری کا حل اس طرح تلاش کیا کہ اس نے ہفتہ وار اخبار "سنڈے اسٹینڈرڈ" میں اشتہار دیا کہ وہ کسی بھی لڑکی سے شادی کرنے کو تیار ہے، بشرطیکہ لڑکی والے اسے کام مہیا کر دیں۔ اگر لڑکی اندھی یا لولی لنگڑی ہو تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اس آدمی کو ۲۵ سال کا تجربہ حاصل ہے، لیکن اسے کام نہیں ملتا تھا۔

ایک طمانچے کی قیمت ۱۰ روپے

دھارواڑ کے ایک پٹرول پمپ میں ناقص میٹر لگا ہوا تھا۔ یہ میٹر ۲ لیٹر پٹرول کو ۳ لیٹر دکھاتا تھا۔ اگر کوئی گاہک اس نقص کو بھانپ لیتا اور پٹرول پمپ کے مالک سے شکایت کرتا تو مالک فوراً دفتر سے باہر آ جاتا۔ اور پٹرول دینے والے لڑکے کے ایک چانٹا رسید کرتا۔ وہ لڑکے کو ڈانٹتا اور کہتا "میں نے تجھے اس ناقص میٹر کو استعمال کرنے کے لئے منع کیا تھا۔ میرے منع کرنے کے باوجود تو اس میٹر کو استعمال کرتا ہے!" گاہک یہی سمجھتا کہ یہ لڑکے کی بھول ہے۔ وہ مالک کو سمجھاتا کہ وہ لڑکے کو معاف کر دے اور پٹرول بھروا کر اپنی راہ لیتا۔ اس کے جاتے ہی مالک لڑکے کے ہاتھ میں دس روپے کا نوٹ تھما دیتا۔ یہ اس چانٹے کی قیمت ہوتی۔ جو اسے گاہک کو دھوکا دینے کے لئے کھانا پڑتا۔

شادی کا ایک انوکھا اشتہار

"امرت بازار پتریکا" میں شادی کا ایک اشتہار چھپا ہے: "ضرورت ہے ایک بیوی کی خواہ وہ بہری ہو گونگی، اندھی ہو یا اپاہج۔ بیوہ ہو طلاق یافتہ۔ کنواری ہو یا کئی بچوں کی ماں۔ اگر وہ کلکتہ کی رہنے والی ہو، ہندو ہو اور مال دار ہو تو شادی کے لئے درخواست کر سکتی ہے۔ شادی کے امیدوار کی عمر ۳۰ سال ہے۔ وہ ہائر سیکنڈری پاس ہے۔ معقول آمدنی کا مالک ہے۔ اس کا کوئی عزیز رشتہ دار نہیں۔"

لڑکی کی شادی میں دیر نہیں کرنی چاہیے

کچھ عرصہ ہوا گجرات میں ایک شادی کی محفل منعقد ہوئی۔ شادی کے وقت دلہن کی عمر ایک دن تھی اور دولہا کی عمر ایک سال۔ ابھی دلہن کا نام بھی نہیں رکھا گیا تھا۔ شادی کی رسمیں ادا ہونے کے بعد لڑکے والوں نے اپنے عزیزوں میں مٹھائی تقسیم کی۔

ساتھ جئیں گے، ساتھ مریں گے

کیرالہ کے ایک گاؤں میں سری کیشو نام کا ایک کسان اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ سری کیشو کی عمر ۸۵ سال تھی۔ ۲۲ جنوری کو صبح کو ۵ بجے اس کی موت واقع ہو گئی۔ اس کی موت اپنے بڑے بیٹے کے گھر پر ہوئی۔ اس وقت اس کی بیوی اپنے چھوٹے بیٹے کے گھر گئی ہوئی تھی۔ بڑے بیٹے نے ایک آدمی کو اپنے بھائی کے گھر بھیجا تاکہ وہ ماں بیٹے کو سری کیشو کی موت کی خبر پہنچا دے۔ جب یہ قاصد گھر سے روانہ ہوا تو اسے راستے میں ایک آدمی ملا۔ یہ آدمی اس کا شناسا تھا۔ اس نے پہلے قاصد کو بتایا کہ وہ سری کیشو کے بڑے بیٹے کے گھر جا رہا ہے تاکہ اسے اس کی بیوی کی موت کی خبر پہنچا دے۔ بیوی کی موت بھی اسی دن صبح ۵ بجے واقع ہوئی تھی۔

دو برس کا دولہا، تیس برس کی دلہن

گجرات کے ایک گاؤں کا منظر۔

ایک گھر کے آگے بڑا سا پنڈال سجا ہوا ہے۔ چاروں طرف خوب سجاوٹ ہو رہی ہے۔ یہاں ایک تیس سالہ بیوہ عورت کی دوسری شادی ہو رہی ہے۔ پوری شان و شوکت کے ساتھ بارات آئی۔ گھوڑی پر ایک شخص بیٹھا تھا، جس کی گود میں دو برس کا ایک بچہ اچھے اچھے کپڑے پہنے انگوٹھا چوس رہا تھا۔ بارات دلہن کے گھر کے دروازے پہنچی۔ رسم کے مطابق تیس سالہ دلہن نے دو سالہ دولہا کے گلے میں مالا ڈالی اور شادی ہو گئی۔ پھر یہ جوڑا سہاگ رات منانے کے لئے چلا گیا۔

یہ دو برس کا دولہا، کوئی غیر نہیں اسی عورت کا دیور تھا۔

یقین کیجئے، یہ بالکل سچا واقعہ ہے۔

گجرات کے اس گاؤں میں بھاورد نام کا ایک قبیلہ رہتا ہے۔ تقریباً چار لاکھ کی آبادی والے اس قبیلے کے رسم رواج اور رہن سہن کے انداز اب تک سیکڑوں برس پرانے ہی چلے آ رہے ہیں۔ اس قبیلے میں کسی بھی عورت کے شوہر کا انتقال ہو جانے پر اس کی شادی شوہر کے بھائی سے کر دی جاتی ہے، اب چاہے عورت کتنی بھی عمر کی ہو اور شوہر کا چھوٹا بھائی کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو۔

اگر عورت کا کوئی سگا دیور نہیں ہوتا تو رشتے کے کسی دیور سے اس کی شادی کر دی جاتی ہے۔ یہی نہیں، کسی بھی خاندان میں بچے کی پیدائش ہوتے ہی اس کی شادی کی تیاریاں شروع کر دی جاتی ہیں۔ جہاں بچہ نو دس ماہ کا ہوا، اس کی شادی کر دی جاتی ہے۔

شادی بہت دھوم دھام سے ہوتی ہے اور دولہا دلہن اپنی اپنی ماؤں کی گود میں انگوٹھا چوستے یا دودھ پیتے یا پھر آرام سے سوتے رہتے ہیں۔ شادی کرانے والے پجاری کو کافی رقم نذرانے کے طور پر ملتی ہے۔

اگر دولہا کی بچپن ہی میں موت واقع ہو جائے تو لڑکی کی دوسری شادی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے والدین لڑکے کے والدین سے اجازت نہ حاصل کر لیں۔ یہ اجازت عموماً لڑکی کا باپ ایک بڑی رقم دے کر حاصل کرتا ہے۔

اس قبیلے میں بہت سے پرانے عقیدے رائج ہیں، اور گاؤں کے پجاری بھولے بھالے لوگوں کو خوب لوٹتے رہتے ہیں۔ ابھی حال میں ایک اسی سال کے پجاری نے ایک خوبصورت عورت سے شادی کر لی۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر اس عورت کی شادی اس سے نہ ہوئی تو گاؤں بھر میں ناگہانی آفتیں ٹوٹ پڑیں گی۔

اس قبیلے میں ایک اور رواج ہے:

ہر لڑکی کو ہاتھی دانت کے کنگن پہننے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ ان کنگنوں کا ناپ لڑکی کی کلائی سے بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ پھر بھی ان کو لڑکی کی کلائی میں ٹھونک ٹھونک کر پہنایا جاتا ہے، جس کی وجہ سے لڑکیوں کی کلائیاں زخمی ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات کلائی کی ہڈی تک ٹوٹ جاتی ہے لیکن اس کے بعد بھی اسے یہ کنگن پہننے ضرور پڑتے ہیں۔ بہت سی لڑکیاں تو اس کنگن کے ظلم سے بچنے کے لئے بھاگ جاتی ہیں، اگر وہ پکڑ لی جاتی ہیں تو ان کو بری طرح زدوکوب کیا جاتا ہے، جس سے کبھی کبھی ان کی موت بھی واقع ہو جاتی ہے۔ ہاتھی دانت کے یہ کنگن اتنے مہنگے ہوتے ہیں کہ غریب لوگوں کو بھوکا رہ کر ان کو خریدنا پڑتا ہے۔

اب دھیرے دھیرے اس قبیلے میں حکومت کی طرف سے سدھار کا کام شروع کیا جا رہا ہے ان کو پرانے رسم رواج اور عقیدوں سے نجات دلائی جا رہی ہے۔ سب سے پہلے یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ شادی بیاہ کی رسموں کا بھاری خرچ اور عجیب و غریب رسمیں ختم کرا دی جائیں لیکن اس قبیلے کے لوگ ان تبدیلیوں کو آسانی سے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں اس لئے [illegible]

رشیدہ [illegible]

باورچی خانہ

مزے دار اور آزمودہ پکوان

مکئی کے گلگلے

مکئی کے دانے — ایک پیالی
چینی (پسی ہوئی) — ایک پیالی
بادام — ۵ عدد
زعفران — ایک چٹکی
گھی — حسبِ ضرورت
سوڈا (کھانے کا) — ½ چائے کا چمچہ

مکئی کے دانوں کو سل پر خوب باریک پیس لیں۔ اگر دانے سوکھے ہوں تو تھوڑا پانی ملا کر پیسیں۔

باداموں کو کچھ دیر کے لئے گرم پانی میں بھگو دیں، پھر انہیں چھیل کر سل پر پیس لیں۔ زعفران کو ایک چائے کا چمچہ بھر پانی میں بھگو دیں، پھر کھرل میں باریک پیس لیں۔

اب گھی کے علاوہ تمام چیزوں کو ملا کر ہاتھ سے خوب اچھی طرح پھینٹیں۔ اگر گھول زیادہ گاڑھا ہو تو تھوڑا پانی ملا لیں۔

کڑھائی میں گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ گھی گرم ہو جائے تو اس میں گلگلے تل لیں۔ گلگلے بادامی ہو جائیں تو انہیں کاغذ پر اتار دیں تاکہ فاضل گھی کاغذ میں جذب ہو جائے۔ سلطانہ شاہین، بمبئی

قیمہ بھرے آلو کے کوفتے

آلو — ۵۰۰ گرام
قیمہ (باریک پسا ہوا) — ۲۵۰ گرام
لال مرچ — ایک چائے کا چمچہ
دھنیا — آدھا چائے کا چمچہ
ہلدی — پاؤ چائے کا چمچہ
ادرک — ایک انچ کا ٹکڑا
پیاز (چھوٹا سائز) — ایک عدد
لہسن (پسا ہوا) — آدھا چائے کا چمچہ
ٹماٹر — ایک عدد
ہری مرچیں — ۳ عدد
ہرے دھنیے کی پتیاں — ۲ چائے کے چمچے
انڈے — ۲ عدد
کریم — آدھی پیالی
نمک — حسبِ ذائقہ
گھی — حسبِ ضرورت

پیاز کو چھیل کر لچھے کاٹ لیں۔ ادرک چھیل کر کچومر کاٹ لیں۔ ہری مرچوں کے گول چھلے کاٹ لیں۔ ٹماٹر کا کچومر کاٹ لیں۔

ایک دیگچی میں پیاز لچھے اور دو ٹیبل اسپون گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ پیاز بادامی ہو جائے تو اس میں آدھی لال مرچ، دھنیا، ہلدی، لہسن، نمک اور پاؤ پیالی پانی ڈال کر مسالہ بھون لیں پھر قیمہ دھو کر ڈال دیں۔ قیمے کا پانی بھن جائے تو ٹماٹر اور ادرک کا کچومر ڈال دیں۔ ٹماٹر کا پانی بھن جائے تو گلنے کے انداز کا پانی ڈال کر دیگچی کو ڈھانپ دیں۔ قیمہ گل جائے اور پانی خشک ہو جائے تو ہری مرچ اور ہرے دھنیے کی پتیاں ڈال دیں اور ایک دو منٹ بھون کر آگ سے اتار لیں۔

آلوؤں کو ابال کر چھیل لیں۔ پھر گرم گرم آلوؤں کو خوب اچھی طرح چمچے سے کچل لیں۔ تھوڑے ٹھنڈے ہو جائیں تو ان میں باقی لال مرچ، تھوڑا سا نمک اور ایک انڈا ڈال کر ہاتھ سے آٹے کی طرح گوندھ لیں۔

اب ہتھیلی پر تھوڑا سا آلو کا بھرتا رکھ کر دوسرے ہاتھ سے اس کو پھیلا لیں اور اس کے بیچ میں دو چائے کے چمچے بھر قیمہ رکھ کر گول کوفتہ بنا لیں۔ اسی طرح تمام کوفتے بنا لیں۔ ایک انڈے کو توڑ کر چرخی سے خوب اچھی طرح پھینٹ لیں۔ کڑھائی میں کافی گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ ایک کوفتے کو پہلے انڈے میں ڈبوئیں پھر اس پر کریم لپیٹ کر کڑھائی میں ڈال دیں۔ بادامی ہو جائے تو گھی سے نکال لیں۔ اسی طرح تمام کوفتے تل لیں۔

کوفتوں کا مسالہ

ٹماٹر — ۲۵۰ گرام
لال مرچ — ایک چائے کا چمچہ
سفید زیرہ (پسا ہوا) — ایک چائے کا چمچہ
ہلدی — پاؤ چائے کا چمچہ
پیاز (درمیانہ سائز) — ایک عدد
ہرے دھنیے کی پتیاں — ایک ٹیبل اسپون
نمک — حسبِ ذائقہ
گھی — پاؤ پیالی

ٹماٹروں کو دس منٹ کے لئے تیز گرم پانی میں ڈال کر رکھ دیں۔ پھر ان کے چھلکے اتار کر کچل لیں پھر چھلنی میں چھان کر گودا رکھ لیں، بیج پھینک دیں۔

پیاز کا کچومر کاٹ لیں۔ ایک دیگچی میں پیاز کا کچومر اور گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ پیا[illegible]

بادامی ہو جائے تو ٹماٹر اور ہرے دھنیے کو چھوڑ
باقی تمام چیزیں اور پاؤ پیالی پانی ڈال کر مسالہ
بھون لیں، پھر مزید ایک پیالی پانی ڈال کر
دیگچی ڈھانپ دیں اور آنچ دھیمی کر دیں۔ پیاز
گھل جائے اور پانی خشک ہو جائے تو ٹماٹروں
کا گودا ڈال دیں۔ ٹماٹروں کا پانی جذب ہو جائے
اور گھی چھوڑنے لگے تو پون پیالی پانی ڈال
دیں اور پانچ سات منٹ پکا کر آنچ سے اتار لیں
کھانے سے دو چار منٹ پہلے کوفتوں کو ڈش
میں رکھ کر ان پر مسالہ ڈال دیں۔ اوپر سے
ہرے دھنیے کی پتیاں چھڑک دیں۔

یاسمین، کلکتہ

انناس کی پڈنگ

انناس (درمیانہ سائز)	آدھا
انناس کا عرق	آدھی پیالی
کریم	ڈیڑھ پیالی
چینی	پاؤ پیالی
جیلاٹین	۲ ۱/۲ چائے کے چمچے
انناس کا ایسنس	پاؤ چائے کا چمچہ
پیلا رنگ (کھانے کا)	۲ بوندیں
چیری	۶ عدد
ٹشو پیپر	حسب ضرورت

انناس کو چھیل کر آدھے آدھے، دو گول ٹکڑے کاٹ لیں۔ باقی انناس کا موٹا موٹا چورا کر کاٹ لیں۔

جیلاٹین کو پاؤ پیالی پانی میں دس منٹ پہلے بھگو دیں۔ پھر ایک دیگچی میں چینی، انناس کا عرق اور جیلاٹین ڈال آنچ پر رکھ کر چمچہ چلاتی رہیں، چینی اور جیلاٹین مکمل گھل جائے تو اسے اتار کر دیگچی کو ٹھنڈے پانی میں رکھ دیں۔ گھول ٹھنڈا اور گاڑھا ہو جائے تو دیگچی کو پانی سے نکال لیں۔ پھر اس میں انناس کا چورا، کریم، ایسنس اور رنگ ڈال کر خوب اچھی طرح ملا لیں۔

اب ایک گول برتن میں ٹشو پیپر لگا کر تمام ملی ہوئی چیزیں اس میں انڈیل دیں اور چمچے سے برابر کر کے برتن کو ریفریجریٹر کے برف کے خانے میں رکھ دیں۔ پڈنگ جم جائے تو ریفریجریٹر سے اسے نکال کر کسی پلیٹ میں رکھ لیں۔ پھر اس کے بیچ میں چیری سے پھول بنا لیں۔ انناس کے ٹکڑوں کے دو دو ٹکڑے کر لیں اور چیری کے پھول کے چاروں طرف اس سے گول دائرہ بنا دیں، پھر پڈنگ کو دوبارہ ریفریجریٹر میں رکھ دیں۔ برف کے خانے میں نہ رکھیں۔ نیچے رکھ دیں۔ کھاتے وقت ہی پڈنگ کو ریفریجریٹر سے نکالیں۔

فرح، دہلی

گوشت کے پکوڑے

گوشت	۲۵۰ گرام
بیسن	آدھی پیالی
لال مرچ	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
گرم مسالہ	پاؤ چائے کا چمچہ
گھی	حسب ضرورت
نمک	حسب ذائقہ

گوشت کے آدھے انچ موٹے، دو انچ کے چوکور پارچے کر لیں۔ ان پارچوں کو دھو کر ایک دیگچی میں ڈال دیں۔ آدھی لال مرچ، گرم مسالہ، زیرہ اور نمک بھی ڈال دیں اور دیگچی کو آنچ پر رکھ دیں۔ گوشت کا پانی جذب ہو جائے تو گلنے کے انداز کا پانی ڈال کر دیگچی کو ڈھانپ دیں۔ گوشت گل جائے اور پانی بالکل جذب ہو جائے تو آنچ سے اتار لیں۔

بیسن کو چھان لیں پھر اس میں باقی لال مرچ نمک اور پانی ملا کر پکوڑوں کے بیسن کی طرح گھول لیں۔ کڑھائی میں کافی گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ گھی گرم ہو جائے تو گوشت کے ٹکڑوں کو بیسن میں ڈبو ڈبو کر گھی میں ڈال دیں۔ ایک طرف سے بادامی ہو جائیں تو پلٹ دیں۔ دوسری طرف سے بھی بادامی ہو جائیں تو کاغذ پر اتار لیں، تاکہ فاضل گھی کاغذ میں جذب ہو جائے۔ شام کی چائے پر ٹماٹر کی چٹنی کے ساتھ کھائیں۔

اگر گوشت کے پکوڑوں کا سالن بنانا چاہیں تو کوفتوں کے مسالے کی ترکیب کے مطابق مسالہ بنائیں اور کھانے سے دو چار منٹ پہلے ڈش میں پہلے گوشت کے پکوڑے رکھیں پھر ان پر مسالہ ڈال دیں۔

رخسانہ پروین، لکھنؤ

دودھ میں پکے ہوئے آلو

آلو (درمیانہ سائز کے گول)	۵۰۰ گرام
پیاز (درمیانہ سائز)	۱ عدد
دودھ	۲ پیالی
لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
چینی	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
دارچینی	ایک انچ کا ٹکڑا
ادرک	ایک انچ کا ٹکڑا
بڑی الائچی	۲ عدد
لہسن	۴ جوے
ہرے دھنیے کی پتیاں	ایک ٹیبل اسپون
لیموں کا عرق	ایک ٹیبل اسپون
نمک	حسب ذائقہ
گھی	آدھی پیالی

پیاز کو چھیل کر باریک کاٹ لیں، ہرا دھنیا

ہونا تو کہہ کھی سل پر پیس لیں۔ آلوؤں کو چھیل کر کانٹے سے ان کو گود لیں۔

دودھ میں گھی، لہسن، بڑی الائچی اور دار چینی کو چھوڑ کر تمام چیزیں اچھی طرح ملا دیں۔ پھر اس میں آلوؤں کو ڈبو کر چار پانچ گھنٹے کے لئے رکھ دیں۔

ایک دیگچی میں لہسن کے جوئے چھیل کر باریک کاٹ لیں اور گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ لہسن بادامی ہو جائے تو بڑی الائچی اور دار چینی ڈال دیں۔ پھر فوراً ہی دودھ میں بھیگے ہوئے آلو ڈال کر دیگچی کو ڈھانپ دیں اور آنچ دھیمی کر دیں۔ آلو گل جائیں اور تھوڑا شوربا باقی ہو تو آنچ سے اتار لیں۔ ڈش میں نکالنے کے بعد تھوڑی سی ہرے دھنئے کی پتیاں چھڑک دیں۔

کماری کملیش میہرہ

آلو اور بیسن کی پٹیاں

آلو	۲۵۰ گرام
بیسن	آدھی پیالی
لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
کالی مرچ	پاؤ چائے کا چمچہ
گھی	حسب ضرورت
نمک	حسب ذائقہ

آلوؤں کو ابال کر چھیل لیں اور گرم گرم آلوؤں کو چمچے سے کچل لیں۔ تھوڑے ٹھنڈے ہو جائیں تو ہاتھ سے آٹے کی طرح گوندھ لیں۔

بیسن کو چھان لیں پھر اس میں لال مرچ، کالی مرچ اور نمک ملا کر دوبارہ چھلنی میں ڈال دیں۔ تھوڑا بیسن چھان کر آلوؤں پر ڈال دیں اور آلوؤں کو آٹے کی طرح گوندھ لیں۔ اسی طرح تھوڑا تھوڑا بیسن ڈال کر آلوؤں کو گوندھیں۔ جب تمام بیسن آلوؤں میں مل جائے تو اس کے تین پیڑے بنا لیں۔

کڑھائی میں کافی گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ اب چکلے بیلن کی مدد سے پیڑے کی پاؤ انچ موٹی روٹی بیل لیں اور ایک تیز چھری سے ایک انچ چوڑی اور تین انچ لمبی پٹیاں کاٹ لیں۔ گھی گرم ہو جائے تو پٹیاں ڈال دیں اور جالی والے چمچے سے پٹیوں کو الٹ پلٹ کرتی رہیں۔ پٹیاں بادامی ہو جائیں تو انہیں کاغذ پر اتاریں تاکہ فاضل گھی کاغذ میں جذب ہو جائے۔

اسی طرح تمام پٹیاں بنا کر تل لیں اور گرم گرم ہی شام کی چائے کے ساتھ کھائیں۔

تنویر بیگم، سری نگر

کریلے اور آم کا اچار

کریلے	آدھا کلو
کچے آم	ایک کلو
لال مرچ	۲ ٹیبل اسپون
سونف	۳ ٹیبل اسپون
کلونجی	ایک ٹیبل اسپون
میتھرے	ڈیڑھ ٹیبل اسپون
لہسن	۱۰۰ گرام
نمک	حسب ذائقہ
سرسوں کا تیل	۲ کلو

کریلوں کو اچھی طرح دھو کر ان کی کڑواہٹ نکال لیں۔ پھر ان کے چار چار ٹکڑے کر لیں۔ آموں کو چھیل کر چار چار پھانکیں کر لیں۔ گٹھلیاں پھینک دیں۔ لہسن کو چھیل کر سل پر موٹا موٹا پیس لیں۔ سونف کو بھی شو کھی سل پر موٹا موٹا پیس لیں۔

اب ایک مرتبان میں کریلے، آم اور باقی تمام چیزیں ڈال کر خوب اچھی طرح ملا دیں اور مرتبان کو دھوپ میں رکھ دیں۔ آٹھ دس دن دھوپ لگانے کے بعد استعمال کریں۔

قمر جہاں، حیدرآباد

کہنی سُنی

بانو: مارچ ۱۹۷۷

خاموش انقلاب

پیاری بھابی:

بانو میں افتتاحیہ کے بعد "ان سے ملئے" کا کالم مجھے سب سے زیادہ پسند آتا ہے۔ اس کے ذریعہ آپ روایتوں کی زنجیروں میں بندھے ہوئے ذہنوں میں ایک خاموش انقلاب بپا کر رہی ہیں۔ اس کالم سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی عورتیں (اور ان میں بھی بالخصوص مسلمان عورتیں) کس طرح بوسیدہ روایتوں کی دھند سے نکل کر ترقی کی روشنی کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ بہت سے گھرانوں میں عورت کے ملازمت کرنے کو آج بھی بُرا سمجھا جاتا ہے بہت سے خاندان صرف کچھ خاص زمروں (مثلاً ٹیچر) کی حد تک چھوٹ دینے کے قائل ہیں۔ آپ اس کالم کے ذریعہ انھیں روشن خیالی کی تعلیم اور ترغیب دے رہی ہیں اور عورتوں کے لئے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے نئے نئے میدانوں کی نشان دہی کر رہی ہیں۔ اس کارنامے کے لئے مبارک باد قبول فرمائیں۔

نسرین انجم بھوپال

بھابی صاحبہ:

مارچ کے بانو میں یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے "آپ کی ذہنی اُلجھن اور اس کا حل" کا سلسلہ شروع کر دیا ہے اس طرح بہت سے پڑھنے والوں کی دلی خواہش آپ نے پوری کر دی ہے۔ اس شمارے میں شاہانہ نسیم سے ملاقات بھی پسند آئی۔ اگر اسی طرح عورتوں میں لگن ہو تو کوئی حیرت کی بات نہ ہوگی کہ ہندوستان میں بھی زندگی کے ہر شعبے میں عورتیں نمایاں نظر آئیں۔

محمد سہیل اختر، جمشید پور

ڈیر بھابی!

جب بانو ہمارے گھر میں آتا ہے۔ تو اس کے لئے چھینا جھپٹی شروع ہو جاتی ہے۔ میں گھر میں سب سے چھوٹی ہوں، اس لئے بانو سب کے آخر میں مجھے ملتا ہے۔ میں ایک ہی نشست میں اُسے ختم کر لیتی ہوں۔ مجھے بانو میں سب سے زیادہ جو چیز پسند آتی ہے وہ اس کے مستقل عنوان ہیں۔ خصوصاً ایک کالم "آپ کی ذہنی اُلجھن اور اس کا حل" جو آپ نے حال ہی میں شروع کیا ہے مجھے سب سے زیادہ پسند ہے کسی اور اُردو کے رسالے میں اس قسم کا کالم میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ "ان سے ملئے" کے تحت شاہانہ نسیم کا انٹرویو پڑھ کر بہت خوشی ہوئی تعلیم یافتہ عورتوں کے لئے ٹیچر اور کلرک بننا تو آسان ہے۔ لیکن ہوٹل کی ملازمت کے لئے بڑی ہمت درکار ہے۔ ہوٹل کے اوقات کی پابندی خصوصاً جاڑوں میں، کافی صبر آزما ہوتی ہے۔ میری طرف سے شاہانہ کو ان کی جراءت اور ہمت پر مبارک باد۔

کنیز سلطان، بنگلور

محترمہ:

تازہ بانو منظر نواز ہوا۔ تو حسبِ معمول میں نے اپنے پسندیدہ کالم "ان سے ملئے" کو سب سے پہلے پڑھا، جس میں اس بار شاہانہ نسیم کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ مضمون شاہانہ نسیم کا تعارف کم ہے اور اوبرائے انٹرکانٹی نینٹل کا تعارف زیادہ ہے بجائے اس کے کہ آپ شاہانہ نسیم کے گھریلو حالات، اُن کے خیالات، سماجی زندگی اور غیر معمولی صلاحیتوں کو موضوع بنائیں، آپ نے زیادہ یہی لکھا ہے کہ وہ جس ہوٹل میں کام کرتی ہیں اُس میں کتنے کمرے ہیں، کیا انتظامات ہوتے ہیں۔ کیا اخراجات ہوتے ہیں، برتنوں کی دُھلائی کا انتظام کیا ہوتا ہے، وغیرہ۔

مسز تنویر صدانی، دہلی

سویٹ بھابی صاحبہ:

ماہ مارچ کا بانو نظر نواز ہوا۔ افتتاحیہ پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ بیوٹی کا رنچ، ان سے ملئے، کہنی سنی، باورچی خانہ، اچھے اچھے افسانے نظمیں، سب بہت پسند آئے "آپ کی ذہنی اُلجھن اور اس کا حل" بہت انوکھا اور کارآمد کالم ہے۔ بانو میں شائع ہونے والی ساری چیزیں اپنی مثال آپ ہوتی ہیں۔ یہ نہ صرف عورتوں کے لئے بلکہ تمام پڑھنے والوں کے لئے سودمند ثابت ہوتے ہیں۔

شاہدہ قادر، ناگپور

بھابی صاحبہ:

گزشتہ شمارہ (مارچ ۷۷ء) کے افتتاحیہ میں آپ نے ہندوستان کے حالیہ انتخابات میں نامور، تجربہ کار اور دوررس سیاست دانوں کی زبردست اور ناقابلِ یقین شکستوں کا جس خوب صورتی سے جائزہ لیا ہے، اُس سے نہ صرف مسندِ اقتدار پر براجمان اصحاب بلکہ ایک عام آدمی بھی سبق حاصل کر سکتا ہے۔

بانو کے ہر شمارہ کا افتتاحیہ دعوتِ غور و فکر دیتا ہے۔ اس سے زندگیاں سنور سکتی ہیں یہ زندگی کا ایک لائحہ عمل بھی متعین کرتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ اب تک لکھے ہوئے تمام افتتاحیوں کو مرتب کر کے کتابی شکل میں شائع فرما دیں۔ ہارون رشید انصاری، بمبئی ۸

بانو: اپریل ۱۹۷۷

بھائی جان:

بانو: اپریل میں رضوانہ مطلوب احمد کا تصویری مضمون "عورتوں کے لباس میں ایک نیا انقلاب" بہت معلومات افزا ہے۔ اس سے ایک بار پھر یہ پرانی کہاوت سچی ثابت ہوتی ہے کہ فیشن کا سفر ایک دائرے کی شکل میں ہوتا ہے اور یہ "دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو" کا نعرہ بار بار لگاتا ہے کیا ہمارے یہاں کی مغرب زدہ عورتیں پہلے سے ہی مغرب میں رونما ہونے والے اس انقلاب سے کوئی سبق نہ سیکھیں گی؟

سلمہ فرحت، کلکتہ ۱۷

بھابی صاحبہ:

یوں تو ہر بار ہی افتتاحیہ زندگی کو سنوارنے کے لئے ایک نیا پیغام دیتا ہے، مگر اپریل کے شمارے کا افتتاحیہ تو حکمت کا خزانہ ہے۔ اس پر عمل کرنے سے آدمی اپنے آپ کو زوال کی دلدل سے نکال کر عظمت کی بلندی پر پہنچا سکتا ہے۔ اپنے آپ سے ملاقات [illegible] سے تو ترقی کی راہیں خود بخود کھلتی جاتی ہیں۔ اس بار خصوصیت کے ساتھ افتتاحیہ کا پیرا [illegible] بھی مجھے بہت پسند آیا۔ ہر فقرہ [illegible] اتر جاتا ہے ــــ شاید اس لئے کہ ہر فقرہ دل سے نکلا ہوا ہے۔ مبارک باد قبول فرمائیں۔ عارفہ نسیم، سری نگر

سوئیٹ بھابی:

حمیدہ سلطان کے "محبت نامے" پڑھ کر ہنسی بھی آئی، شعر و ادب کی خدمت کا دعویٰ کرنے والی عورتوں کے رویّہ پر افسوس بھی ہوا۔ حمیدہ سلطان نے بڑی چابکدستی سے ایک تلخ حقیقت کی عکاسی کی ہے۔ کیا اس سے وہ خواتین سبق نہ سیکھیں گی جو صرف چھپنے کے لالچ میں ایڈیٹروں کو "محبت نامے" لکھ کر عورت ذات کو بدنام کرتی ہیں؟

آنسہ شائستہ ابراہیم، حیدرآباد

بھابی صاحبہ

اپریل کا شمارہ جیسے ہی ملا میں نے اسے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔ یہ دلچسپ ہی اتنا ہے کہ پورا پڑھے بغیر میں اسے ہاتھ سے نہ رکھ سکی۔ حمیدہ سلطان کا "محبت نامے" اور رام پال کا "زنان خانہ" خاص طور سے پسند آئے۔ ایک میں اچھی بھلی عورتوں کو پستی کا رخ کرتے دکھایا گیا ہے تو دوسرے میں ایک گری ہوئی عورت پھر اپنا عظیم رتبہ حاصل کر لیتی ہے۔ دونوں قلم کاروں کو مبارک باد۔ شمیمہ توصیف، الہ آباد

زینت بھی:

اپریل کے بانو میں سب ہی مضامین افسانے اور منظومات پسند آئے۔ رام پال کا افسانہ "زنان خانہ" پڑھ کر دل بھر آیا۔ انھوں نے بہت پُر اثر کردار تراشے ہیں۔ "دیس بدیس کی خبریں" تصویروں کے اضافے سے اور بھی زیادہ دلچسپ اور جاندار ہو گئی ہیں۔ بانو کو دلکش بنانے کے لئے آپ کتنی محنت کرتی ہیں ــــ اس کی بروقت اشاعت کے لئے بھی تو کچھ جتن کیجئے۔ شعلہ، بمبئی ۸

عزیزہ زینت کوثر صاحبہ

یہ بڑے اطمینان کی بات ہے بانو کا معیار روز بروز بلند تر ہوتا جا رہا ہے۔ بانو جس وقت آتا ہے، میں اسے پورا پڑھ کر ہی کوئی دوسرا کام کرتا ہوں۔ ساغر نظامی، نئی دہلی ۲

بھائی صاحب:

مئی کا شمارہ ہر اعتبار سے خوب ہے۔ بس اس کی تاخیر سے آمد ذرا کھل گئی۔ بانو کی بروقت اشاعت کے لئے کوئی بندوبست کیجئے نا ــــ تاخیر کے عیب سے قطع نظر بانو آج بھی ہر لحاظ سے جاندار ہے اور روز بروز رو بہ ترقی ہے۔ اداریہ (جو آپ کی ذہنی کاوش کا نتیجہ ہوتا ہے) تو اپنی مثال آپ ہی ہے، "کہی سنی" (جو ہم پڑھنے والوں کی خامہ فرسائی کا نتیجہ ہے) بھی زیادہ پُر زور کالم ہوتا جا رہا ہے۔ دوسری تحریریں بھی پسند آئیں۔ ریحانہ اقبال، حیدرآباد

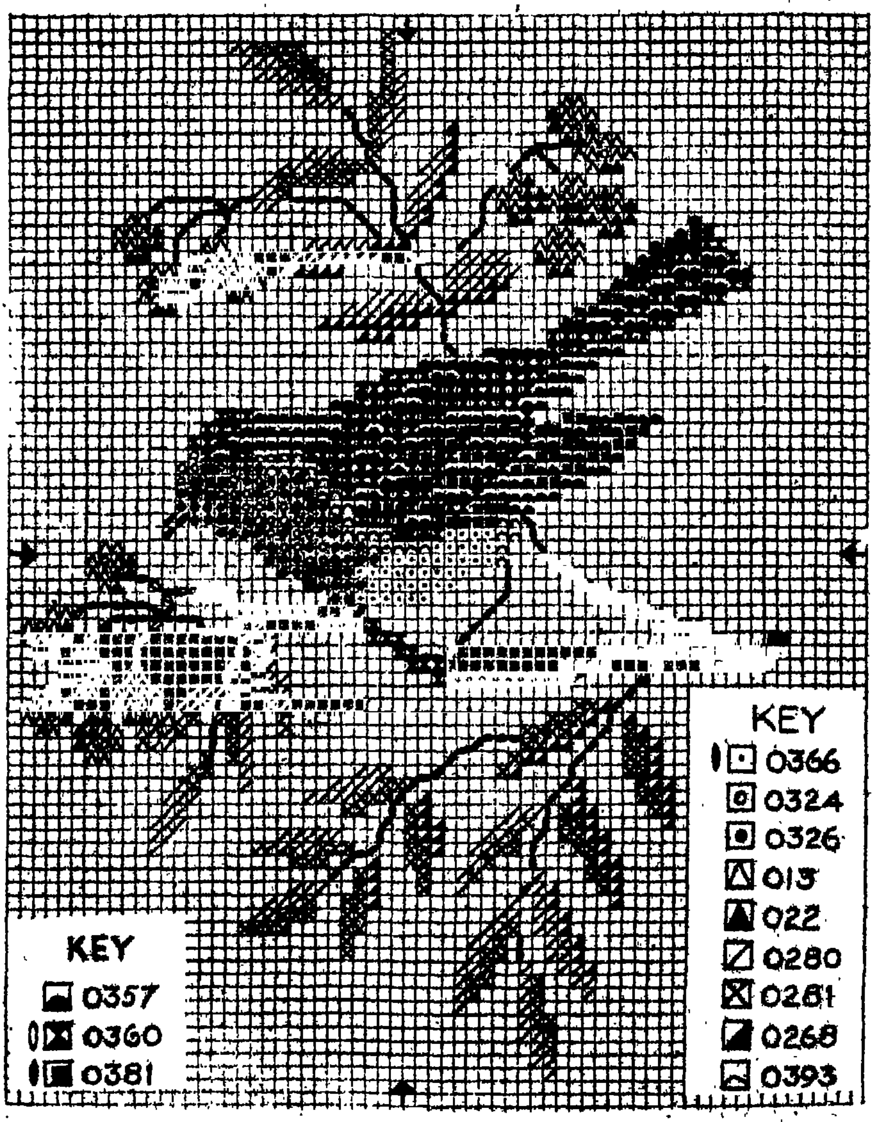
بھائی جان:

بانو کی قدر و قیمت کا احساس مردوں میں بھی عام ہو چلا ہے۔

میرے ہونے والے داماد سے جب پوچھا گیا کہ جہیز میں وہ کون کون سی چیزوں کو ترجیح دے گا تو اس کا جواب تھا: جہیز میں مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔ ہاں اپنی بیٹی کو پہلے ہی کی طرح بانو کا خریدار ضرور بنا رہنے دیجئے۔ اس طرح مجھے وہ سب کچھ مل جائے گا جو گھر بسانے کے لئے ضروری ہے۔ بیگم شائستہ افضال، بھوپال


لڑکیوں کے لئے
خوب صورت
لباس


لڑکیوں کے لئے
نئے فیشن کے
دل کش
لباس





دل کش کراس اسٹیچ ڈیزائن

دل کش بوٹے



آٹھ ہزار روپے کے نقد انعامات کی شان دار تقسیم!

شمع منی معمہ نمبر ۱۹

[illegible]

صحیح حل شمع منی معمہ نمبر ۱۹

■	ے	ت	کھ	ی	د
ج	■	ی	ت	ہ	ر
ا	ن	■	ج	ر	د
ہ	ٹ	ج	■	م	د
ت	ن	و	ک	■	■
ا	ی	ش	ی	■	■

شمع منی معمہ نمبر ۱۹ بے حد آسان ثابت ہوا اور سترہ پڑھنے والے بالکل درست حل بھیجنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان سترہ درست حلوں پر پہلا انعام مبلغ پانچ ہزار روپے تقسیم کیا گیا۔

شمع منی معموں کی تیز رفتاری بے مثال ہے۔ درست حل ظاہر کئے جانے کے چند ہی گھنٹوں میں پلک جھپکتے ہی تقسیم انعامات کی تفصیلات کا اعلان کر دیا گیا جن پڑھنے والوں نے صحیح حل منگانے کے لئے لفافے بھیجے تھے انہیں تقسیم انعامات کی تفصیلات بھی بھیج دی گئیں ۔۔۔ دوبارہ جانچ کے لئے کسی کلیم کا انتظار کئے بغیر ہی پہلے اور دوسرے انعامات کے منی آرڈر بھیج دئے گئے

بالکل درست حل ۱۷ موصول ہوئے جن پر پہلا انعام مبلغ پانچ ہزار روپے بحساب ۲۹۴ روپے ۱۱ پیسے فی حل تقسیم کیا گیا:

۱۔ منذکور احمد صاحب بنگال فلیش لائٹ، ۱۳۳ لور چت پور روڈ، کلکتہ ۷۰۰۰۷۳
۲۔ بی ایل کھورانہ صاحب، ۲۳۔ اے گڑ منڈی، دہلی ۱۱۰۰۰۷
۳۔ مدینہ بیگم صاحبہ معرفت محمد اسحاق خاں غوری صاحب، ۱۳۶۸ سر سید نگر، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱
۴۔ اصغری بیگم صاحبہ معرفت محمد عثمان ساکن و پوسٹ پرسونی وایا بینی پٹی، ضلع مدھوبنی
۵۔ سید حسیم الدین صاحب، مکان نمبر ۱۳/۱۔۲۔۳ محلہ اندرون قلعہ رائچور ۵۸۴۱۰۱
۶۔ عمر علی صاحب، ریٹائرڈ پوسٹ مین، محلہ قرولان، بریلی
۷۔ ایم اے انصاری صاحب، ۱۸/۹۴۔ بی، ریوڑی تالاب، وارانسی ۲۲۱۰۰۱
۸۔ ثریا، دختر بی ڈی سریواستو صاحب، ٹیلیفون ایکسچینج، پرتاپ گڑھ
۹۔ مجید مرزا صاحب، ۳۱۶ کوچہ میر عاشق، چاوڑی بازار، دہلی ۱۱۰۰۰۶
۱۰۔ محمد زاہد علی صاحب، شاہ آباد گیٹ، رام پور
۱۱۔ محمد سعید صاحب، معرفت نظام الدین صاحب، بکا بازار، آسنسول
۱۲۔ محمد اسمٰعیل صاحب، کلاتھ مرچنٹ، چوڑی پٹی زندو، پوسٹ کشن گنج بازار، ضلع پورنیہ
۱۳۔ محمد تسنیم صاحب، نیو شمع ہوٹل، مال روڈ، الموڑہ
۱۴۔ شاہین عابد صاحب، نیو ٹائمز ہاؤس، بس اسٹینڈ، بودھن، ضلع نظام آباد
۱۵۔ زاہد حسین صاحب، ۳۱/۱۳۹۔ اے، نئی پورہ، وارانسی ۲۲۱۰۰۱
۱۶۔ اعجاز بیگم صاحبہ، اقبال کمپاؤنڈ نزد منصور منزل، دودھ پور، علی گڑھ
۱۷۔ ایم معین الدین صاحب، محلہ عابد پور سیماں، مونگیر ۸۱۱۲۰۱

ایک غلطی والے ۳۲۴ حل موصول ہوئے جن پر دوسرا انعام مبلغ تین ہزار روپے بحساب ۹ روپے ۲۵ پیسے فی حل تقسیم کیا گیا:

[illegible]

[illegible]

تمام حلوں کی جانچ نہایت احتیاط سے کی گئی ہے۔ [illegible]

[illegible]

Rs. 8,000.00

آٹھ ہزار روپے کے نقد انعام

پہلا انعام بالکل درست حل پر پانچ ہزار روپے ۔ دوسرا انعام ایک غلطی والے حل پر تین ہزار روپے

فیس داخلہ فی حل : ایک روپیہ ۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں ۔ فیس داخلہ پوسٹل آرڈر، منی آرڈر یا شمع ادبی معموں کے نقد نامہ کے ذریعہ ادا کی جا سکتی ہے ۔ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانہ سے ملنے والی رسید اپنے حلوں کے ساتھ بھیجیے ۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں ۔ ان کی فیس ایک ساتھ بھیج سکتے ہیں اور ہر حل پر علیحدہ انعام کے حق دار ہو سکتے ہیں ۔ کوئی ٹوکن بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے ۔ ٹوکن بھیجنے کی شرط کے علاوہ شمع ادبی معموں کی دوسری تمام شرائط شمع منی معموں پر بھی عائد ہیں ۔ ان کی پابندی ضروری ہے ۔

دفاتر شمع (نئی دہلی) میں ڈاک سے اور دستی حل وصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۵ جون ۱۹ء، ۸ بجے رات تک

شمع منی معمہ نمبر ۲۱

ے	د	ن	س	۱	■
ن	ا	ہ	۷	■	۲
ٹ		۳	■		
	کس	■		ل	ک
■	■	۴	و		ن
■	■	م	ٹ	ل	ے

اشارے

دائیں سے بائیں

۱ ۔ جنگل میں ہر نسل کے ـــــ کہنے کو تو ایک ساتھ رہتے ہیں لیکن دراصل فنا و بقا کی مسلسل جدوجہد میں مصروف ہوتے ہیں

۲ ۔ ـــــ کی ہر شے سے بنانے والے کی قدرت کا کمال ظاہر ہوتا ہے

۳ ۔ تجارت میں جب تک روپیہ جلد سے جلد ـــــ کر نہ آئے کامیابی نہیں مل سکتی

۴ ۔ اولاد ـــــ صحیح تربیت کے لئے ماں کی پوری توجہ چاہیئے

اوپر سے نیچے

۵ ۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ہر طرف بغاوت کے شعلے ـــــ [illegible] ظلم کا [illegible] ہو گیا

۶ ۔ قانون [illegible] کے [illegible] سکتا ہے ۔ ـــــ کر رہنا نہیں سکھا سکتا

۷ ۔ سارے تعلقات سمجھئے ـــــ کر آج [illegible] سیاں [illegible]

۸ ۔ [illegible]

شمع ادبی معمے (شمع منی معمہ [illegible]) [illegible]

شمع منی معمہ نمبر ۱۸ کا صحیح حل [illegible] جولائی ۱۹ء کے "[illegible]" [illegible]

شمع منی معمہ نمبر ۲۱

★ اب آپ ایک شمع ادبی معمہ اور دوسرے شمع ادبی معمہ کے حل بھیجنے کے درمیان اپنے ادبی ذوق کی تسکین کر سکتے ہیں ۔ ۔ ۔ منی معمہ کے ذریعہ !

★ کوئی ٹوکن بھیجنے کی قید نہیں !

★ جتنے حل جی چاہے بھیجئے ۔ اپنے تمام حلوں کی فیس ایک یا ایک سے زیادہ منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا نقد ناموں سے بھیج سکتے ہیں

★ آپ ہر حل پر انعام کے حق دار بن سکتے ہیں ۔ فیس داخلہ فی حل صرف ایک روپیہ

★ صرف آٹھ اشارے ۔ انعام پانا کس قدر آسان !

★ فیس داخلہ بھیجنے کے لئے شمع ادبی معموں کے نقد نامے استعمال کئے جا سکتے ہیں ۔ یا پوسٹل آرڈر، منی آرڈر بھیجئے ۔ اپنے حلوں کے ساتھ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید ضرور بھیجئے ۔

شمع منی حل [illegible] لفافہ بھیج کر [illegible] لفافہ پر "[illegible]" یا ماہنامہ شمع [illegible]

★ شمع منی معمہ نمبر ۲۱ کا نتیجہ جولائی ۱۹ء کے [illegible] اگست ۱۹ء کے شمع میں شائع کیا جائے گا ۔

شمع

نئی دہلی

اشاعت کا اکتیسواں سال، چھٹا شمارہ

جون ۱۹۷۴

نگراں:
یوسف دہلوی

مدیرہ: **زینت کوثر دہلوی** ادارۂ تحریر: **شمیم آرا دہلوی** **سعدیہ دہلوی**

مالکان: شمع میگزین ● طابع وناشر: یونس دہلوی ● مطبوعہ: ایس. پی پریس ● ٹائٹل: بمبئی آفسیٹ پریس

عام شمارے کی قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے. سالانہ قیمت: اٹھارہ روپے (جس میں سالنامہ مفت ملتا ہے)

مقام اشاعت وصدر دفاتر: آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ تار کا پتہ: "شمع" نئی دہلی ٹیلی فون: ۲۷۲۰۶۶، ۲۷۲۰۶۷، ۲۷۲۰۶۸

دیگر دفاتر: بمبئی، کلکتہ اور مدراس

افتتاحیہ

یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ جب بھی کوئی بات اپنی مرضی کے خلاف سُنتا ہے تو بُرا مان جاتا ہے۔ بُرا ماننے کی یہ عادت عورتوں میں مَردوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ سوسائٹی میں بُرا ماننے کی عادت رکھنے والوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔

عام انسان کی رائے میں اس کے بُرا ماننے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مخالف اس کے متعلق جھوٹ بول رہا ہے۔ اس لئے جھنجلانا اور غصّہ آنا قدرتی بات ہے۔ لیکن یہ رائے سطحی ہے۔ یہ بات شاید کم ہی لوگوں کو معلوم ہوگی کہ مخالف کی بات میں سچائی ہو تو زیادہ غصّہ آتا ہے، کیوں کہ اصل وجہ بُرا ماننے والے کی وہ دُکھتی رگ ہوتی ہے جس کے چھیڑتے ہی وہ درد سے بے چین ہو اُٹھتا ہے اور اپنی کمزوری پر آئے ہوئے غصّے کو دوسروں پر نکالتا ہے۔ مخالف کی بات ایسے موقعوں پر کڑوی اور سچی ہوتی ہے اور سچ کو نگلنا عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔

بُرا ماننے کی اصل وجہ کم تری کا احساس ہے۔ ہم خود کو دوسروں سے کم تر سمجھتے ہیں۔ مخالف کوئی نئی بات نہیں کہتا، بلکہ ہمارے اس احساسِ کم تری کی تصدیق کرتا ہے، جو ہم برداشت نہیں کر سکتے۔

اگر ٹھنڈے دل سے مخالف کی کڑوی بات کا جائزہ لیا جائے اور وہ واقعی سچ نکلے تو بُرا ماننے کی بجائے خود کو سُدھارنے کی کوشش کرنا صحت مند رویّہ ہے۔ اگر ہم دیانت داری سے کام لیں تو ہمیں اپنے مخالفین کا شکر گزار ہونا چاہئے، جنہوں نے ہمارے عیبوں کی نشان دہی کر کے ہمیں اپنی اصلاح کا موقع بہم پہنچایا۔

زینب کوثر

امینہ

نکوبار کے انوکھے لوگ

جزائرِ نکوبار ہندوستان کے جنوب مشرق میں واقع ہیں۔ کلکتہ اور نکوبار کا درمیانی فاصلہ ۸۵۰ میل ہے۔ یہ جزائر انڈمان کے قریب ہیں۔ انڈمان وہ جزیرے ہیں جنہیں پہلے "کالاپانی" کہا جاتا تھا۔ قتل کے مجرم اور سیاسی قیدی کالے پانی بھیجے جاتے تھے۔ مگر یہ آزادی سے پہلے کی



▲ نکوباری عورتیں اپنے قومی لباس میں



◄ نکوبار میں دستکاری کا فروغ نکوباری عورت چٹائی بُن رہی ہے



► قبائلی عورتیں ٹوکریاں بنا رہی ہیں

باتیں ہیں۔ آج کالے پانی کا نام خوف اور دہشت سے یاد نہیں کیا جاتا۔

نکوبار کے جزیرے "کالے پانی" سے ۶۰ میل دُور ہیں۔ یہ جزیرے تعداد میں ۱۹ ہیں، لیکن ان میں صرف ۱۲ آباد ہیں۔ ان جزیروں میں انسانی آبادی بہت تھوڑی ہے۔ یہاں کے لوگوں کو فیملی پلاننگ کی ضرورت نہیں کیوں کہ یہاں کی آبادی حد سے زیادہ بڑھنے ہی نہیں پاتی

ہر انسان کے لئے مناسب غذا فراہم ہو جاتی ہے۔ نکوبار کے لوگ مشترکہ خاندان میں یقین رکھتے ہیں۔ اس سے وہ مشترکہ خاندان مُراد نہیں جو ہندوستان میں رائج ہے۔ ہندوستان میں مشترکہ خاندان ماں باپ بیٹے اور بہو پر مشتمل ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس میں کئی بھائیوں کے بچے شامل ہو جاتے ہیں۔ نکوبار میں مشترکہ خاندان بہت بڑا ہوتا ہے۔ اس میں دُور کے رشتہ دار بھی شامل ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ایک مشترکہ خاندان میں ۱۰۰ انسان شامل ہوتے ہیں۔ ہر خاندان کا ایک سربراہ ہوتا ہے، خاندان والے بلا چون وچرا اس کا حکم مانتے ہیں۔ ہر سربراہ مرنے سے پہلے اپنا جانشین مقرر کرتا ہے۔ عورتیں عموماً مشترکہ خاندان کی لیڈر نہیں بنتیں۔

مشترکہ خاندان کا باورچی خانہ بھی مشترک ہوتا ہے۔ اس باورچی خانے سے ہر انسان کی ضرورت پوری ہوتی ہے۔ اس خاندان کے ہر ممبر کو تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ اگر وہ بیمار ہو یا بُوڑھا ہو جائے تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جہاں مشترکہ خاندان کا رواج تحفظ کا احساس پیدا کرتا ہے وہاں سُستی اور کاہلی بھی پیدا کرتا ہے۔ یہاں کے لوگ سخت محنت نہیں کرتے۔ چوں کہ یہاں فرد کی حیثیت کچھ نہیں۔ اس لئے ذاتی جائیداد بنانے اور روپیہ کمانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کی چال بھی عجیب اور مستانہ سی ہوتی ہے۔ یہ لوگ سیدھے اور تیز نہیں چلتے۔ قدرت نے ان جزیروں کو ہریالی اور زرخیزی بخشی ہے۔ سال میں چھ مہینے بارش ہوتی ہے۔ ناریل کے درخت بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو پان چبانے کا بہت شوق ہے۔ یہ لوگ دن بھر مونہہ میں پان رکھتے ہیں۔ پان یہاں بکثرت سے پیدا ہوتا ہے۔ پان میں یہ لوگ صرف چونا استعمال کرتے ہیں۔ بچوں کو پان کھانے کی اجازت نہیں۔

یہاں شادی کی رسمیں بڑی عجیب ہیں۔ یہاں کے سماج میں مرد اور عورت کو برابر کا درجہ حاصل ہے۔ یہ لوگ ناچ اور گانے کے بہت شوقین ہیں۔ اکثر رات رات بھر ناچتے رہتے ہیں۔ ناچ کے موقع پر لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کو پسند کر لیتے ہیں۔ دونوں چھُپ چھپ کر ملتے رہتے ہیں۔ یہ ملاقاتیں گھنے جنگلوں میں یا سمندر کے کنارے ہوتی ہیں۔ لڑکا اور لڑکی شادی سے پہلے ہی ازدواجی تعلقات قائم کر لیتے ہیں۔ ان ملاقاتوں کے دوران لڑکا اور لڑکی محبت بھرے گیت گاتے ہیں۔ جب ان کی دوستی مضبوط ہو جاتی ہے تو لڑکا لڑکی کے گھر جانا شروع کرتا ہے۔ وہ ہر رات اس کے گھر گزارتا ہے۔ جب لڑکے کو لڑکی کے گھر راتیں گزارتے ہوئے ایک دو مہینے گزر جاتے ہیں تو لڑکی والے لڑکے کے والدین کو خبر کر دیتے ہیں اور لڑکی کو لڑکے کے گھر بھیج دیتے ہیں۔ یہ سب پروگرام باہمی رضامندی سے عمل میں آتا ہے۔ خاندان کے سربراہ کو خبر دی جاتی ہے ——— لڑکے والے راضی ہوں تو لڑکی کے لئے تحفے جمع کئے جاتے ہیں۔ شادی کے تحفوں میں ناریل کے درخت، مُرغیاں، سُوَر، کپڑے اور چاندی کے تار شامل ہوتے ہیں۔ پھر شادی کی تاریخ مقرر کی جاتی ہے۔

اُسی دن شام کو لڑکے والے برات لے کر لڑکی کے گھر پہنچ جاتے ہیں اور اسے دُلہن بنا کر گھر لے آتے ہیں۔ گھر پہنچ کر دُولہا اور دُلہن کا سر مُونڈا جاتا ہے۔ سر مُونڈنے سے مُراد یہ ہے کہ اب کنوارپن کی ہریالی ختم ہو گئی اور سنجیدہ زندگی شروع ہو گئی۔ دونوں کے سر مونڈنے کے بعد انہیں گھر کے ایک کونے میں بٹھا دیا جاتا ہے۔ ان کے سامنے ایک پردہ لٹکایا جاتا ہے تاکہ لوگوں کی بُری نظریں اُن پر نہ پڑیں۔ اس کے بعد دونوں کھانا کھاتے ہیں۔ کھانے میں سُوَر پکا کر کھایا جاتا ہے۔ اس کے بعد دُولہا دُلہن سمندر میں نہانے جاتے ہیں۔ جب دونوں سمندر سے واپس گھر پہنچتے ہیں تو ایک بڑی دعوت کا انتظام ہوتا ہے، دعوت کے بعد رشتہ دار دُولہا دُلہن کو تحائف پیش کرتے ہیں۔ رات گئے جب سب لوگ سو جاتے ہیں تو دُولہا کا باپ دُولہا دُلہن کے لئے ایک باسکٹ تیار کرتا ہے۔ اس میں پھل اور کھانا ہوتا ہے۔ اس باسکٹ کو لے کر شادی شدہ جوڑا چُپکے سے جنگل کی راہ لیتا ہے۔ یہاں وہ دونوں ہم سے، دن تک چھُپے رہتے ہیں۔ اس دوران لڑکا لڑکی سے تین عہد لیتا ہے۔

(۱) لڑکی شادی کے بعد کنواریوں کی طرح لااُبالی زندگی بسر نہیں کرے گی۔

(۲) وہ پان کا مستقل استعمال کرے گی۔ تاکہ اس کے دانت ہمیشہ سیاہ رہیں۔

(۳) وہ ناچ میں حصّہ نہیں لے گی۔

ایک ہفتہ جنگل میں گزارنے کے بعد دُولہا دُلہن گھر واپس آ جاتے ہیں۔ گھر پہنچنے کے بعد یہ ضروری نہیں کہ لڑکی اپنے خاوند کے خاندان میں ہی رہائش اختیار کرے۔ جس خاندان میں گنجائش ہو لڑکا اور لڑکی اسی خاندان میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اس میں بے عزّتی کا کوئی سوال نہیں۔ نکوبار میں لڑکے اور لڑکی کو شادی کے لئے بڑوں کی اجازت لینا ضروری ہے لیکن

اگر لڑکا اور لڑکی راضی ہوں تو عموماً بڑوں سے اجازت لینے میں دشواری پیش نہیں آتی۔

نکوبار کی معیشت میں سؤر کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ نکوبار کے ہر گھر میں سؤر پلتے ہیں۔ یہ جانور بڑی تیزی سے بڑھتے ہیں۔ اس جانور کی مادہ ایک سال میں تقریباً دس بچے دیتی ہے۔ اس میں تقریباً سات آٹھ بچے ایک دو مہینے زندہ رہ کر نکوباریوں کے پیٹ میں پہنچ جاتے ہیں، باقی دو تین جانور بڑی محبت سے پالے جاتے ہیں۔ نکوبار میں سؤروں کی تعداد انسانوں سے ڈیڑھ گنا ہے۔ بعض اوقات ان کی تعداد اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ ان کا پالنا دوبھر ہو جاتا ہے۔ ایسے موقع پر لوگ انہیں جنگل میں چھوڑ آتے ہیں۔ جنگل میں چھوڑنے سے پیشتر ان کے جسموں پر خاص نشان لگا دیئے جاتے ہیں، تاکہ انہیں ڈھونڈنے میں آسانی ہو۔ جنگل میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد ان میں پالتو جانوروں کی کوئی بات نہیں ملتی۔ اس لئے ان کو واپس لا کر خوراک کے کام میں لایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ تفریح کا سامان بھی بن جاتے ہیں۔ یہاں اکھاڑے میں انسان اور سؤر کی لڑائی ہوتی ہے، جسے لوگ بڑے شوق سے دیکھتے ہیں۔



▲ درخت پر چڑھ کر تماشہ اچھی طرح دیکھا جا سکتا ہے

ایک سؤر کی روزانہ خوراک میں چار سے چھ ناریل تک شامل ہوتے ہیں ـــ یہ ایک افسوس ناک بات ہے کہ جو ناریل سکھا کر ایکسپورٹ کئے جا سکتے ہیں ان جانوروں کی غذا بن جاتے ہیں۔ نکوباریوں کو سؤروں سے بہت محبت ہوتی ہے۔ ان کی محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر اس جانور کے بچے کو پوری خوراک نہ ملے یا اس کا جسم کمزور ہو تو نکوباری عورت اسے اپنی چھاتی سے دودھ پلاتی ہے۔

نکوباریوں کو ناریل کا تیل بہت پسند ہے۔ مرد اور عورت نہ صرف اسے سر میں لگاتے ہیں بلکہ اس سے پورے جسم پر مالش بھی کرتے ہیں۔ یہ لوگ سونے کے زیور نہیں پہنتے۔ یہاں چاندی کے زیور پہننے کا رواج ہے۔ مرد اور عورت دونوں ہی یکساں قسم کے زیور پہنتے ہیں۔ یہ زیور چاندی کے تار اور چاندی کے سکوں سے بنائے جاتے ہیں۔ چاندی کی چونیوں میں سوراخ کر کے ان کا ہار بنایا جاتا ہے۔ بعض لوگ اٹھنیوں اور روپوں کا ہار بھی بناتے ہیں۔ ٹخنے سے پنڈلی تک چاندی کے تار باندھے جاتے ہیں۔ یہی تار پہنچے سے کہنی تک بھی باندھے جاتے ہیں۔

نکوباری عورتوں کو بناؤ سنگھار کا بہت شوق ہوتا ہے۔ نکوباری مرد اپنی بیویوں سے بہت محبت کرتے ہیں۔ کنوارپن میں وہ پہلے ہی



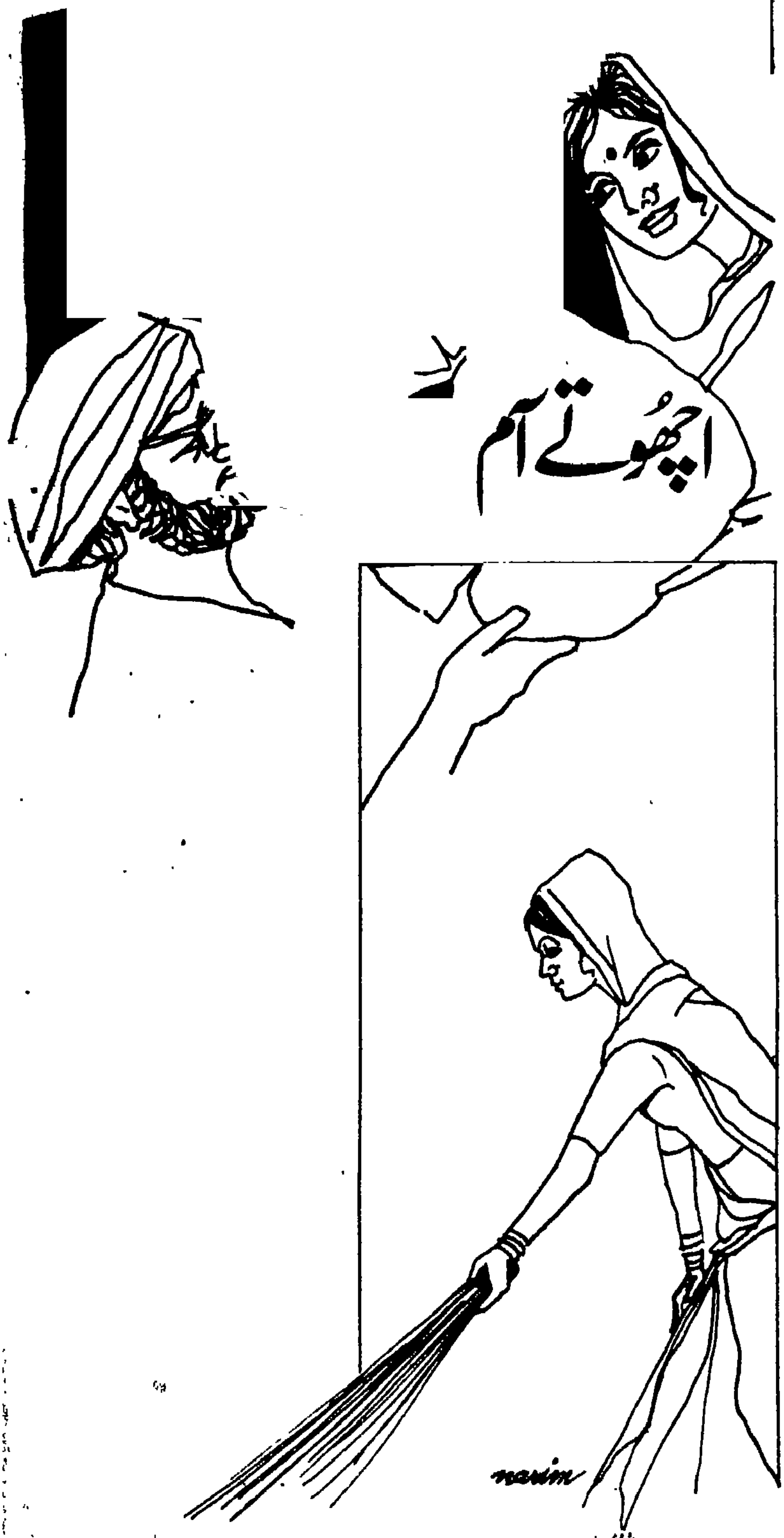
▲ اسکول میں لڑکیاں ورزش کر رہی ہیں۔



▲ مرغ لڑانا [illegible] کا مشغلہ اور [illegible] ہے

بے راہ روی کی زندگی گزاریں لیکن شادی کے بعد وہ اپنی بیویوں سے بے وفائی نہیں کرتے۔ میاں بیوی کے جھگڑے شاذ و نادر ہوتے ہیں۔ طلاق کا نام بھی یہ لوگ نہیں جانتے! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں محبت کی شادیاں کامیاب ہوتی ہیں۔ یہاں کی ۹۸ فی صد آبادی عیسائی ہے۔ مسلمان صرف ۲ فی صد ہیں۔ یہاں ہندوؤں کی آبادی نہیں۔ شہر میں شادیاں عیسائی اور اسلامی طریقے سے ہوتی ہیں۔ لیکن دیہات میں شادی کی پرانی رسمیں رائج ہیں۔

نکوباری لوگوں میں تکلف نام کو نہیں ہوتا۔ ایک دوسرے سے ملنے پر سلام اور خیریت پوچھنے کا کوئی رواج نہیں۔ گفتگو شروع کرنے سے پہلے کسی تمہید کی ضرورت نہیں۔ ان کی زبان میں شکریہ اور مبارک باد کے لفظ نہیں ہوتے۔ یہاں کوئی کسی کا کام کر کے اس پر احسان نہیں جتاتا، اس لئے شکریہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ لوگ قناعت پسند ہیں۔ موت اور زندگی کے فلسفے کو سمجھتے ہیں، اس لئے کوئی نکوباری اپنے قریب ترین عزیز کے مرنے پر بھی آنسو نہیں بہاتا۔ ●●



اچھوتے آم

(آں جہانی) نانک سنگھ
پنجابی سے ترجمہ: سرجیت

میرا ناول کافی عرصے سے نامکمل پڑا تھا۔ کئی مرتبہ اُسے شروع کیا اور انجام تک بھی پہنچایا، لیکن وہ میرے دل کو پسند نہ آسکا۔ ایک اور غلطی مجھ سے یہ ہوئی کہ ناول کو پورا کرنے سے پہلے ہی میں اس کا اشتہار دے بیٹھا — چنانچہ قارئین کے اشتیاق بھرے خطوط نے میرا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اسے جلد از جلد ختم کر دوں لیکن وہ ہنومان کی دُم کی طرح بڑھتا ہی جاتا تھا۔ اس کے ختم نہ ہونے کی وجہ کیا تھی، اِسے وہی سمجھ سکتے ہیں، جو ازدواجی زندگی کی دلدل میں گہرے پھنسے ہوئے ہوں۔

جب میں نے یہ دیکھ لیا کہ گھرُما چڑیا گھر میں کتاب کا مکمل ہونا ممکن نہیں، تو میں ایک درجن دن اور دو درجن روپے بچا کر دھرم شالہ کو روانہ ہو گیا —

دھرم شالہ میں مَیں ایک دوست کے ہاں ٹھیرا۔ اور فوراً ہی لکھنے کے کام میں مصروف ہو گیا۔ میرا دوست گھر میں اکیلا ہی تھا۔ پاس پڑوس میں کئی کنبوں کے گھر تھے۔ شور و غل یہاں بھی کم نہ تھا لیکن میرا دل اکتاتا نہیں تھا۔ ایک تو موسم بڑا خوش گوار تھا۔ دوسرے میری صحت اچھی تھی — آس پاس بچے ضرور شور و غل مچاتے تھے۔ لیکن مجھے کیا؟ مجھ سے تو کچھ نہیں مانگتے تھے۔

لیکن ایک وقت یہاں بھی تھی۔
بڑی بھاری وقت ــــ وہ تھی ایک نوجوان مہترانی، جو ہر دم، ہر ایک سے لڑتی رہتی تھی۔ اس کا مہابھارت تو میرے ناول سے بھی بڑا تھا ــــ کوئی نہ کوئی نیا باب چلتا ہی رہتا تھا۔ جتنے، وقت وہ گلی میں نہ ہوتی، میرا وقت آرام سے کٹ جاتا ــــ لیکن وہ جو کہتے ہیں نا کہ آرام کا وقت جلد گزر جاتا ہے۔ وہی ہوتا۔ میں دو چار صفحے ہی لکھ پاتا کہ پھر وہی شور و غل برپا ہو جاتا۔ میں جھنجھلا کر کہتا ــــ "اُف میرے خُدا! کہاں جاؤں ــــ؟ میرے ساتھ تو وہی ہوا ــــ "موسیٰ بھاگے موت سے، موت آگے کھڑی"

دھرم شالہ آئے ہوئے مجھے پانچ چھ دن ہو گئے تھے۔ اور اتنے ہی دن مزید مجھے یہاں قیام کرنا تھا۔ لیکن اس حالت میں میرے آنے کا مقصد پورا ہونے کی اُمّید کم تھی۔

چھٹے روز کا ذکر ہے، بارش صبح سے ہی ہو رہی تھی۔ میرا دوست کام پر جاتے وقت میرے لیے کچھ آم لے کر رکھ گیا تھا۔ دوپہر کو دروازے میں کرسی لگا کر میں آم چوسنے بیٹھا۔ ساتھ ہی میں بارش کا نظارہ بھی کرتا جا رہا تھا ــــ اچانک میرے سر پہ بجلی سی کڑکی ــــ آسمان سے نہیں، زمین سے، ــــ کانوں کے پردوں کو پھاڑنے والی آواز آئی ــــ "سردار، تمھیں دکھائی نہیں دیتا ــــ؟ میں ابھی جھاڑو لگا کر گئی ہوں، اور تم نے پھر ساری جگہ گندی کر دی ــــ جمعدار دیکھے گا تو جان لے لے گا ہماری"

مجھے اپنی حماقت کا خیال آیا۔ واقعی میں آم چوس کر بڑی بے پروائی سے، جیسے اپنی ہی حکومت ہو، چھلکے اور گٹھلیاں، باہر پھینک رہا تھا ــــ

میں پہلے ہی اس سے بہت ڈرتا تھا، فوراً اُٹھ کر دروازے کے سامنے سے چھلکے اور گٹھلیاں اٹھاتے ہوئے بولا ــــ "بہن، معاف کرنا ــــ مجھے معلوم نہیں تھا، ہم پردیسی آدمی ہیں۔ تم نے اچھا کیا، جو سمجھا دیا، پھر ایسی غلطی نہ ہو گی ــــ"

میرا خیال تھا کہ اپنی عادت کے مطابق وہ ابھی میری اچھی طرح خبر لے گی، لیکن نہ جانے میرے چند لفظوں کا اُس کے دل پر کیا اثر ہوا کہ اس نے ہونٹ بند ہی رکھے۔

لمحہ بھر بعد وہ بولی ــــ" سردار بابو، تم انھیں چھوڑ دو، ہاتھ مت خراب کرو، میں بٹور لیتی ہوں"

میں ہٹ گیا اور وہ جھاڑو سے جگہ صاف کرنے لگی۔ اُس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ اور چہرے پر شرمندگی کے تاثرات تھے۔

دوسرے روز جب وہ آئی تو سب سے پہلے میرے آنگن کی صفائی کرنے لگی۔ جبکہ اُس نے گذشتہ چھ دن سے کبھی نہیں کیا تھا۔ میں اُس کی اس خاص مہربانی کا سبب سوچ ہی رہا تھا کہ وہ دروازے کے پاس آ کر کہنے لگی ــــ

ــــ "سردار بابو، اور کوڑا ہو تو باہر پھینک دو، میں ڈال لوں ــــ"

"نہیں، اور تو نہیں ہے ــــ"

یہ کہہ کر میں لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ پیڈ کا صفحہ پھاڑ کر جیب میں رکھنے لگا، تو یوں ہی میری نظر دروازے کی طرف گئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ چلی گئی ہو گی، لیکن وہ ابھی تک دروازے کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ اور بیچ بیچ میں سر آگے کر کے میرے پیڈ پر لکھے ہوئے ٹیڑھے میڑھے الفاظ کو بھی دیکھ لیتی تھی۔

میں نے سوچا، شاید بخشش کے لئے کھڑی ہے۔ وہ بارش میں بھیگ رہی تھی۔ میں جیب میں ہاتھ ڈال کر سب سے چھوٹا سکّہ ٹٹولنے لگا۔ میرا ہاتھ باہر نکلنے سے پہلے ہی وہ اسی طرح میرے پیڈ پر نظر جمائے بولی ــــ "سردار، بابو یہ کیا لکھتے ہو ــــ؟"

"ایسے ہی کچھ لکھتا ہوں ــــ" یہ کہتے ہوئے میں نے ایک آنہ اس کی طرف بڑھایا اور کہا ــــ "لے"

"رہنے دو، بابو ــــ میں نہیں لوں گی ــــ"

میں نے پوچھا "کیوں ــــ؟"

اور ساتھ ہی مجھے اس کی لالچی طبیعت پر غصّہ آنے لگا ــــ سوچا، شاید کہنا چاہتی ہے کہ ایک آنہ بہت کم ہے ــــ لیکن وہ تھوڑا سا مسکرا کر بولی ــــ "کل تم نے مجھے 'بہن' کہا تھا

اس لئے ـــ" اُس کے چہرہ سے ایسا لگتا تھا جیسے میں نے اُسے بہت سی دولت سونپ دی ہو اور وہ میرے احسان کے بوجھ سے دبی جا رہی ہو۔

بارش مزید تیز ہو گئی۔ بوچھار کا رُخ بھی اِسی طرف تھا۔ محلّے کے تمام لوگوں نے دروازے بند کر لئے تھے، لیکن وہ ابھی تک بارش میں کھڑی تھی۔

میں نے سوچا ـــ میرا ایک معمولی لفظ 'بہن' اس کو اس قدر پیارا لگا ہے۔ میں تھوڑا بہت شاعر دل رکھتا تھا۔ لیکن میری جگہ اگر کوئی پتھر دل بھی ہوتا تو بھی جس انداز سے اس نے وہ کہا تھا، سُن کر موم ہو جاتا۔

یہ پیار کی کس قدر بھوکی ہے۔ کہ ایک چھوٹے سے لفظ کو اس نے اس طرح سنبھال کر رکھ لیا۔ میں نے سوچا ـــ واقعی یہ نفرت کی دنیا میں پیدا ہوئی اور نفرت کی ہوا میں پلی بڑھی ہو گی۔ بے چاری دن بھر لوگوں کے گھروں میں جھاڑو دیتی اور گندگی کوڑے سے لدی رہتی ہے اور بدلے میں پاتی ہے نفرت، حقارت، جھڑکیاں، گالی گلوچ، شاید اِسی لئے یہ سب سے نفرت کرتی ہے، سب سے لڑتی رہتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اِس کا دل کس قدر نیک، کس قدر سُندر، کس قدر نازک ہے ـــ او بدنصیب لڑکی، کاش، تُو واقعی میری بہن ہوتی ـــ اس کے کپڑوں میں سے پانی کے پرنالے بہہ رہے تھے۔ اور میرا دل۔ آنکھوں کے راستے سے بہہ رہا تھا۔

وہ بالکل شرابور ہو گئی تھی۔ یہ دیکھ کر میں نے قلم اور پیڈ ہاتھ سے رکھ دیا۔ اور آواز میں ذرا نرمی لا کر اُس سے کہا ـــ

"ارے، تم بھیگ رہی ہو، اندر آ جاؤ ـــ" اُس نے نظر بھر کر ایک بار میری طرف دیکھا ـــ لیکن وہ اندر نہیں آئی اور نہ کچھ بولی۔ میں چاہتا تھا کہ بارش ہلکی ہو جائے تو بے چاری چلی جائے۔ لیکن یہ کام میرے بس کا نہیں تھا۔ میں نے پھر اُس سے کہا ـــ

ـــ "اچھا تو میرا چھاتا لے جاؤ ـــ"

اس بار اس کی زبان کھُلی، کہنے لگی ـــ " سردار بابو ـــ ہم لوگ تو اِسی طرح پانی میں بھیگا کرتے ہیں۔ میں چلی جاؤں گی ـــ"

میں نے ضِد کے لہجے میں کہا ـــ "تھوڑی دیر کے لئے اندر آ کر بیٹھ جاؤ، جب بارش رُک جائے تو چلی جانا ـــ"

شاید اس کا جی اندر آنے کو چاہا، لیکن اندر اسٹوو، پیالیاں، پلیٹیں اور دو چار برتن بکھرے ہوئے دیکھ کر بولی ـــ "یہاں تو تم کھانا بناتے ہو ـــ"

میں نے جواب دیا ـــ "تو کیا حرج ہے، یہ برتن کسی اور کے تو نہیں، تمھارے بھائی کے ہیں۔"

جیسے میرا یہ جملہ سُن کر اس کا رُواں رُواں سرشار ہو اُٹھا۔ اس نے ایک بار اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ـــ پھر وہ جھاڑو کو پاس کی دیوار سے لگا کر اندر آنے لگی، لیکن دہلیز کے پاس ہی دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ صرف بارش سے بچاؤ کے لئے۔ وہ کانپ رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اور اندر آ جائے۔ چارپائی پر نہیں تو کم از کم زمین پر بچھی ہوئی دری پر ہی بیٹھ جائے۔ لیکن میں اُسے مجبور نہیں کر سکتا تھا ـــ

وہ اسی طرح اپنے بازو اپنے سینے پر رکھے کانپتی ہوئی بولی ـــ

" سردار بابو........"

میں نے اُسے بیچ میں ہی ٹوکا ـــ "بھائی کو، سردار نہیں کہتے، بہن ـــ"

وہ پہلے تو کچھ جھجکی، پھر بولی ـــ "بھائی ـــ تم کہاں رہتے ہو ـــ؟"

"امرتسر میں" ـــ میں نے جواب دیا اور پھر پوچھا ـــ "تمہارا نام کیا ہے؟"

بولی ـــ "کلّو" اور پھر کہنے لگی ـــ

"یہاں کتنے دن اور رہو گے؟"

"پانچ، چھ دن اور رہوں گا، لیکن اس مکان سے شاید کل ہی چلا جاؤں گا، اس جگہ بہت شور رہتا ہے۔"

وہ لمحہ بھر کو خاموش رہی۔ نہ جانے کیا سوچتی رہی، پھر کہنے لگی ـــ "یہ کیا لکھا کرتے ہو؟"

"کتابیں لکھتا ہوں ـــ"

"کتاب کے اچھر (الفاظ) تو دوسری طرح کے ہوتے ہیں۔"

"یہ بھی اسی طرح کے ہو جائیں گے ـــ مشین میں ڈالنے سے؟"

"ہاں —"
"امرتسر میں پانی نہیں پڑتا؟"
"بہت کم پڑتا ہے —"
"وہاں تمہارے کون کون ہیں؟"
"گھر والی ہے، بچے ہیں —"
بارش کو ہلکا دیکھ کر اس نے کہا — "اچھا بھائی، اب جاؤں گی — ابھی بہت کام کرنا ہے" اور دیوار سے لگی جھاڑو اٹھا کر چلی گئی۔

اس کے بعد میں جتنے دن وہاں رہا، بڑے آرام سے رہا۔ وہی کلو جو پہلے طوفان میل بنی رہتی تھی، اب چپ چاپ آتی، سب کے آنگن میں اچھی طرح جھاڑو لگاتی، کسی کا بچہ جگہ جگہ کوڑا بکھیر دیتا تو بھی وہ ایک لفظ نہ کہتی۔ اگر کسی لڑکے کو اونچی آواز میں بولتے ہوئے دیکھتی تو اسے سمجھاتی — "شور مت کرو، ادھر سردار بابو لکھ رہے ہیں۔"

سب سے پہلے وہ میرے آنگن میں صفائی کرتی اور جاتے وقت ذرا دیر کو میرے دروازے کے سامنے کھڑی ہو کر دو چار باتیں کرتی۔

جتنے دن مجھے قیام کرنا تھا، گذر گئے، ناول کا کام بھی ختم ہو گیا جس روز مجھے جانا تھا، اس سے ایک دن پہلے وہ حسب معمول میرے پاس آئی اور بولی، "کل چلے جاؤ گے، بھائی؟"

"ہاں، کل چلا جاؤں گا —" ذرا رک کر میں نے کہا —
"کلو، ذرا ادھر آنا" وہ بغیر ہچکچاہٹ کے کمرے کے اندر آ گئی۔ میں نے شفقت سے ہاتھ اس کے سر پر پھیرتے ہوئے اس کی ہتھیلی پر ایک روپیہ رکھ دیا۔ اس نے لوٹانا چاہا۔ لیکن میرے منہ سے یہ سن کر کہ "تمہیں نہیں، میں تو اپنی بہن کو دے رہا ہوں۔" بخوشی لے لیا۔

اگلے دن صبح کو ساڑھے آٹھ بجے میں نے سامان باندھ کر بس کی چھت پر رکھوا دیا اور خود اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔ اپنے میزبان دوست سے میں پہلے ہی سے رخصت ہو لیا تھا، اسے نو بجے کام پر بھی تو پہنچنا تھا —

ڈرائیور نے بس اسٹارٹ کر دی۔ — اچانک میری نظر دور سے دوڑی دوڑی آتی ہوئی کلو پر پڑی، اس نے سر پر کچھ اٹھا رکھا تھا۔ اس کی سانس بری طرح پھول رہی تھی۔

ڈرائیور کے بازو پر ہاتھ رکھ کر میں نے منت سے کہا — "بڑی مہربانی ہوگی، صرف ایک منٹ۔"

نیک دل ڈرائیور مان گیا اور میں فوراً نیچے اتر کر کلو کی طرف دوڑا۔ مجھے دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔ بس کے اسٹارٹ ہونے کی آواز شاید اس نے سن لی تھی۔ سر سے ٹوکری نیچے رکھ کر وہ جھجکتے جھجکتے بولی — "بھائی، اسے لے لو گے —؟"

— میں نے پوچھا "کیا ہے کلو؟"

وہ شرماتے ہوئے بولی — "بھابی کے لئے تھوڑے سے آم ہیں۔"

اور پھر لمحہ بھر رک کر بولی — "اپنی قسم میں نے اسے چھوا نہیں ہے۔ مزدور کو اٹھانے کے لئے کہا، لیکن وہ مانا نہیں۔ بولا: مہتر کی چیز ہم کس طرح چھوئیں۔!" اس لئے میں نے اٹھا لی — لیکن آم میں نے چھوئے ہوں، اس کی میں قسم کھاتی ہوں —" اور پھر میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگی کہ میں اس کی درخواست قبول کرتا ہوں یا نہیں —

مسرت بھرے لہجے میں میں نے کہا — "کلو، تو سوغات دے گی، تو کیوں نہیں لوں گا۔ بلکہ تو اپنی بھابی کے لئے کچھ نہ لاتی، تو میں تجھ پر بہت خفا ہوتا۔"

وہ سر سے پاؤں تک محبت میں ڈوب گئی — جو کچھ وہ بولنا چاہتی تھی، وہ...... خوشی کے مارے اس کے منہ سے نہ نکلا۔ ٹوکری دوبارہ سر پر رکھ کر وہ میرے ساتھ بس کی طرف چلنے لگی۔ لیکن میں نے اسے ٹوکری اٹھانے نہ دی، خود اٹھا لی — اسے آشیرواد دیتے ہوئے میں نے کہا — "بہن، ہم پھر ملیں گے۔"

پھر میں اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔ بس چل دی۔ جب تک بس پہاڑی کی موڑ کے دوسری طرف نہ ہو گئی، کلو مجھے دکھائی دیتی رہی — میں اسے دیکھتا رہا — کلو نہیں، اس کی مورتی مجھے سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی دکھائی دیتی رہی اور آخر کار وہ بادلوں کے دھندلکے میں غائب ہو گئی —

پریم وار برٹنی



بیکراں

مرے ہمدم
لہو میرے بدن کا
کام آسکتا تو پھر، لکھتی اُسی سے
داستانِ دِل
(تمہارے نام آدھی رات کو، تاروں کی چھاؤں میں)
مگر میں کیا کروں ؟
تنہا بہت ہے آسمانِ دِل
بہت تنہا ہے میری روح کا بے نام ویرانہ
ہوا میں سانس لیتا ہے
مری گہری اُداسی کا الم انگیز افسانہ
اگر اِس حال میں،
کوئی فراہم کر سکے مجھ کو
زمیں جتنا بڑا کاغذ
اگر دریائے نیل اپنے تمام آنسو مجھے دے دے
تو پھر ان آنسوؤں کی
بیکراں نیلاہٹیں لے کر
زمیں کے کورے کاغذ پر
میں اپنی روح کی تنہائیوں کا حال لکھ پاؤں
تمہارے نام،
پھر روداد ِ ماہ و سال لکھ پاؤں !!
مرے ہمدم !



مرزا محمود بیگ جیسے عظیم انسان صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہ کسی ایک فرد کا نام نہیں، ایک تہذیب کا نام ہے، ایک زندہ اور تابندہ روایت کا نام ہے۔ وہ مغل نسل تھے۔ اُن کے دادا، دادی نے ۱۸۵۷ کا غدر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ۱۸۵۷ کی دِلّی کا ہر حادثہ، ہر واقعہ اُن کے ذہن پر پوری طرح نقش تھا۔ اُن کی دادی ہر رات جن، بھوتوں، شہزادے شہزادیوں کی کہانیوں کی بجائے وہ اپنے پوتے کو غدر کی کہانیاں سُنایا کرتی تھیں۔

مرزا محمود بیگ میں مغلوں کی آن بان تھی ——— آواز مہذّب ——— لب و لہجہ شگفتہ، زبان شہد میں دُھلی۔ پچھلے سال وہ چلے گئے۔ جیسے گلاب کے پھُول سے شبنم، جیسے دریا سے حباب۔ بیگ صاحب نے غدر کی سو سالہ تقریبات کے سلسلہ میں، ۱۸۵۷ کی دِلّی سے متعلق بہت سے مضامین لکھے تھے جو آل انڈیا ریڈیو سے نشر کئے گئے اور جو نہ صرف اُس دَور کی دِلّی کی عکّاسی کرتے ہیں بلکہ دلّی کی پیاری زبان کا شاہ کار ہیں۔ ان کے یہ مضامین اُردو ادب کا سرمایہ۔ اُردو کی آبرو، شان بن گئے ہیں۔

بیگ صاحب کے ان ہی مضامین کے مجموعے کا نام ہے 'دِلّی ۱۸۵۷ کی' جسے آپ پڑھ کر زبان کی چاشنی سے محظوظ ہو سکیں گے اور غدر کے دنوں کی دِلّی اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں گے۔ قیمت: دس روپے

ملنے کا پتہ: **شمع بک ڈپو**، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲



ان سے ملیے

مزمّل صدّیقی

ہندوستان میں وکالت کا پیشہ پہلے مردوں کے لئے مخصوص تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں کوئی عورت وکیل نہیں تھی۔ ایک بنگالی عورت نے وکالت کا امتحان پاس کیا تو پٹنہ کے ایک جج نے اس کو عدالت میں جرح کرنے کی اجازت نہیں دی۔ وہ عورت اس تعصّب کے خلاف لڑی۔ یہ انگریزوں کا زمانہ تھا قانون میں ایسی دفعہ نہیں تھی جس کی رو سے کوئی عورت وکیل نہ بن سکے۔ آخر جج کو ہار ماننا پڑی۔

آج زمانہ بدل گیا ہے۔ عورتیں ڈسٹرکٹ کورٹ، ہائی کورٹ بلکہ سپریم کورٹ میں بھی پریکٹس کر رہی ہیں۔ مزمّل صدّیقی بھی ان ہی وکیلوں کے زمرے میں شامل ہیں۔ وہ دیوانی عدالتوں میں وکالت کرتی ہیں۔ دیوانی عدالتوں میں زیادہ تر زمین جائداد وغیرہ کے مقدمے پیش ہوتے ہیں فوجداری میں چوری ڈاکہ قتل وغیرہ کے مقدمے پیش ہوتے ہیں۔ مزمّل دیوانی عدالت کے علاوہ ایک اور عدالت میں بھی کام کرتی ہیں۔ اس عدالت کو لیبر ٹریبونل کہتے ہیں۔ اس عدالت میں تجارتی اداروں کے مالکوں اور کارکنوں کے جھگڑے پیش ہوتے ہیں۔ مزمّل ان جھگڑوں میں اکثر مالکوں کی طرف سے پیش ہوتی ہیں۔ مزدوروں کی اس عدالت کے فیصلہ کے بعد ہارنے والا فریق ہائی کورٹ میں اپیل دائر کرتا ہے۔ اس طرح مزمّل کے کام کا دائرہ ہائی کورٹ تک پہنچتا ہے۔

مزمل دلّی میں پیدا ہوئیں۔ یہاں اُن کے والد کا کپڑے کا کاروبار ہے۔ اُن کے والد نے دلّی کے اینگلو عربک کالج سے ایف اے پاس کیا تھا۔ وہ حافظ ہیں، قرأت کے ماہر ہیں اور پانچوں وقت نماز پڑھتے ہیں۔ وہ ایک باریش بزرگ مسلمان ہیں۔ لیکن ان باتوں سے یہ اندازہ لگانا غلط ہوگا کہ وہ قدامت پرست اور متعصّب ہیں۔ وہ مذہبی ہونے کے باوجود ترقّی پسند ہیں۔ انہوں نے تعلیم کی اور خاص طور پر تعلیمِ نسواں کی اہمیت کو سمجھا اُن کی تین لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے۔ انہوں نے اپنی تینوں لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ مزمّل کی والدہ کی تعلیم اردو اور قرآن خوانی تک محدود ہے۔ لیکن وہ بھی اپنی بیٹیوں کی تعلیم اور ترقّی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تعلیم کے ساتھ نقطۂ نظر بھی اہمیت رکھتا ہے۔ مزمّل دلّی کے ایک قدامت پسند علاقے میں رہتی ہیں، جہاں لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم ان کی بے پردگی اور ان کی ملازمت کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس حوصلہ شکن ماحول میں مزمّل کا تعلیم حاصل کرنا، پردے کو خیرباد کہنا اور سب سے بڑھ کر وکالت کرنا خاصا حیران کن ہے۔ اُن کے والد کو بھی اس سلسلے میں کافی پریشانیاں اُٹھانی پڑیں۔ مذہب کے ٹھیکے دار انہیں دوزخ سے ڈراتے اور سماج کے ٹھیکے دار لڑکیوں کی بے راہ روی سے۔ لیکن اس مردِ میدان نے ہمّت نہ ہاری۔ مزمّل کی کامیابی میں اُن کے والد کی جرأت، ہمّت اور استقلال کار فرما ہیں۔ وہ اپنے والد کی احسان مند ہیں۔

مزمّل قانون داں ہیں، لیکن وہ مسلم پرسنل لا میں ترمیم کے خلاف ہیں۔ وہ اس معاملے میں حکومت کی دخل اندازی پسند نہیں کرتیں۔ وہ مسلمانوں کی انفرادیت کو ختم کرنے کے خلاف ہیں۔ وہ یک طرفہ طلاق کے حق میں ہیں۔ اُن کی رائے میں مہر کی

رقم عورت کے تحفّظ کی ضمانت ہے۔ مہر کی رقم نہ اتنی کم ہو کہ مضحکہ خیز معلوم ہو اور نہ اتنی زیادہ کہ شوہر کی استعداد کے باہر ہو۔ مہر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک معجّل اور دوسرا موجّل۔ معجّل مہر کے معنی یہ ہیں کہ عورت جب چاہے اپنے مہر کی رقم طلب کر سکتی ہے۔ اسے عند الطلب بھی کہتے ہیں۔ یہ مہر ایک درشنی ہُنڈی کی طرح ہوتا ہے۔ عورت جب چاہے اس ہُنڈی کو بھنا سکتی ہے۔ موجّل مہر میں مرد کو اختیار ہے کہ وہ جب چاہے مہر کی رقم ادا کر دے۔ شوہر اکثر یہ مہر ادا نہیں وہ موجّل مہر سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ مہر اکثر بیوی کی موت پر یا اس کو طلاق دینے کے وقت ہی ادا ہوتا ہے۔ مزمّل کی رائے میں شوہر کو مہر کی رقم بیوی کے نام سے بینک میں جمع کرا دینی چاہئے تاکہ رقم محفوظ رہے۔ اور ساتھ میں بیوی کو تحفظ کا احساس بھی رہے۔ یورپ میں اور آج کل ہندوستان میں بھی ہندوؤں کو بھی ایک رقم طلاق کے بعد بیوی کو دینا پڑتی ہے۔ یہ رقم اس وقت تک دینا پڑتی ہے جب تک بیوی دوسری شادی نہ کر لے۔ مزمّل کی رائے میں یہ طریقۂ کار غلط ہے۔ جب بیوی کا شوہر سے کوئی تعلق ہی نہیں رہا تو اس کا شوہر سے خرچ طلب کرنے کا حق بھی ختم ہو گیا۔ بعض لوگ ۳۲ روپے ۳۲ ٹکے مہر باندھتے ہیں اور اس کے لئے شریعت کا حوالہ دیتے ہیں۔ یہ مناسب نہیں۔ صدیوں پہلے کی ضروریات آج کی ضروریات سے بدرجہا کم تھیں۔ اس کے علاوہ پیسے کی قوّتِ خرید میں بھی کمی ہو گئی ہے۔ اس بارے میں شریعت کی پناہ لینا مناسب نہیں۔

ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کے بارے میں مزمّل کا نظریہ معقول ہے۔ اگر عورت بانجھ ہے یا مستقل بیمار رہتی ہے تو دوسری شادی جائز ہے۔ دوسری صورت میں جائز نہیں۔ کم از کم وہ اپنے شوہر کو دوسری شادی نہیں کرنے دیں گی۔

قانونی علیحدگی کے بعد بچّہ ماں کے پاس پانچ برس تک رہ سکتا ہے۔ اس کے بعد شوہر بچّہ کو چھین سکتا ہے۔ مزمّل کے خیال میں یہ مناسب نہیں ہے اگر عورت دوسری شادی نہ کرے تو بچّہ ہی اُس کا واحد سہارا ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں بچّہ ماں کے پاس رہنا چاہئے اور اس کا خرچ باپ کو اُٹھانا چاہئے۔

مزمّل فیملی پلاننگ کے حق میں ہیں۔ اُن کی رائے میں زیادہ اولاد ہونے سے ماں باپ بچوّں کی مناسب دیکھ بھال نہیں کر سکتے اور نہ اُن کو اعلیٰ تعلیم دلا سکتے ہیں۔

مزمّل جب قانون کی تعلیم حاصل کر رہی تھیں تو اُنہیں لڑکیوں کو پڑھانے کا شوق چرایا حبیبہ قدوائی نے دلّی کے محلّہ ہٹیا محل میں ایک اسکول کھولا تھا۔ اس اسکول کا نام صدیقیہ ہائر سکنڈری اسکول ہے۔ مزمّل نے اس اسکول میں لڑکیوں کو دو سال سائنس کی تعلیم دی۔ مزمّل نے قانون پاس کرنے کے بعد بھی اسکول میں پڑھایا۔ اس دوران وہ اکثر عدالت بھی جاتیں، اپنے آنے والے دَور کی ایک دھندلی سی تصویر دیکھتیں اور واپس آ جاتیں۔ یہ سلسلہ چھ مہینے تک چلتا رہا۔ آخر اُنہوں نے ہمّت باندھ کر وکیل بننے کا ارادہ کر لیا۔ انہوں نے اسکول سے استعفیٰ دیا اور باقاعدہ طور پر عدالت جانے لگیں۔ ابتدا میں انہیں عدالت کے کمرے میں کھڑے ہونے پر جھجک محسوس ہوتی تھی۔ وہ اکیلی مسلمان لڑکی ہیں، یہ خیال اُن میں ہچکچاہٹ پیدا کرتا۔ لیکن انہوں نے جلد ہی اپنی جھجک پر قابو پا لیا۔ ججوں نے بھی اُن کی ہمّت افزائی کی۔

مزمّل جسونت سنگھ ایڈوکیٹ کے ساتھ کام کرتی ہیں۔ جسونت سنگھ راول پنڈی کے رہنے والے ہیں۔ وہ سوشلسٹ پارٹی کے کارکن تھے۔ مزمّل کے بھائی بھی سوشلسٹ پارٹی کے ممبر تھے۔ اس طرح اپنے بھائی کے ذریعہ مزمّل کی ملاقات جسونت سنگھ سے ہوئی۔ جسونت سنگھ بہت خلیق اور شریف انسان ہیں۔ انہیں وکالت کے ساتھ ساتھ صحافت کا بھی تجربہ ہے۔ انہوں نے کئی اردو رسالوں کی ادارت کی ہے۔ مزمّل ایک دن جج کی کرسی پر بیٹھنا چاہتی ہیں۔

مزمّل کو زیورات کا بالکل شوق نہیں لباس میں انہیں شلوار اور قمیص پسند ہیں عدالت میں وہ ہمیشہ ساڑی پہن کر جاتی ہیں، لیکن گھر پہنچ کر وہ اپنا مرغوب لباس شلوار اور قمیص پہن لیتی ہیں۔ مزمّل کو مرغّن کھانے کا شوق نہیں لیکن کھانا ذائقہ دار ہونا چاہئے۔ وہ خود بہت اچھا کھانا پکاتی ہیں۔ چھٹّی کے روز اُن کی ڈیوٹی کپڑے دھونے پر لگ جاتی ہے وہ اتوار کو گھر کے سارے کپڑے دھوتی ہیں انہیں سنیما کا شوق نہیں۔ گھر پر ٹی وی دیکھ لیتی ہیں۔

مزمّل نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے۔ محبّت کی شادی پر وہ والدین کی پسند کی شادی کو ترجیح دیتی ہیں۔

مزمّل انڈین فیڈریشن آف ویمنز لائیرز کی ایڈیشنل جوائنٹ سکریٹری ہیں۔ مسز شاملا پپو اس انجمن کی صدر ہیں۔ شاملا پپو سپریم کورٹ میں پریکٹس کرتی ہیں۔



اکیلی

منو بھنڈاری

سوماں بُوا بڑھیا ہیں۔

سوماں بُوا، تیاگی ہو گئی ہیں۔

سوماں بُوا اکیلی ہیں۔

سوماں بُوا کا جوان بیٹا کیا جاتا رہا، اُن کی اپنی جوانی چلی گئی۔ اُن کے خاوند کو بیٹے کے فراق کا اتنا صدمہ پہنچا کہ وہ اپنی بیوی، گھر بار، سب کو چھوڑ کر تیرتھ یاترا پر چلے گئے۔ کنبے میں کوئی اور شخص ایسا نہیں تھا جو اُن کے اکیلے پن کا مداوا بن سکے۔ ان کی پچھلی بیس برس کی زندگی کی یکسانیت میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی ویسے ہر برس اُن کے پتی ایک مہینے کے لئے اُن کے پاس آ کر رہتے تھے لیکن انہوں نے کبھی اپنے خاوند کا انتظار نہیں کیا تھا، نہ اُن کے راستے میں آنکھیں بچھائیں۔ جب تک اُن کے پتی گھر میں رہتے اُن کا من اور بھی مرجھایا ہوا رہتا، کیونکہ اُن کے پتی کا محبت سے عاری سلوک ان کی زندگی کی بہتی ہوئی ندی کو روک دیتا۔ اُن دنوں اُن کا گھومنا پھرنا، ملنا جلنا بھی بند ہو جاتا۔ اور سنیاسی جی مہاراج سے اتنا بھی ممکن نہ ہوتا کہ وہ محبت بھرے میٹھے بول بول کر اُس کو سہارا دیں، جن کی بدولت وہ زندگی کے ان گیارہ مہینوں کو گزار سکیں جب اُن کے پتی گھر پر قیام پذیر نہ ہوں۔ ان حالات میں بُوا کو اپنی زندگی اڑوس پڑوس کے بھروسے کاٹنا پڑتی تھی۔ کسی کے گھر مونڈن ہو، جنیو ہو، شادی ہو یا ماتم ہو، بُوا پہنچ جائیں اور خوب تن دہی سے کام کرتیں جیسے یہ کام اُن کا اپنا ہو، دوسروں کا نہیں۔

ان دنوں سوماں بُوا کے پتی آئے ہوئے ہیں اور ابھی ابھی اُن کے درمیان تُو تُو مَیں مَیں ہو چکی ہے۔ بُوا آنگن میں بیٹھی دھوپ سینک رہی ہیں، پاس رکھی کٹوری سے تیل لے کر ہاتھوں میں مل رہی ہیں اور بڑبڑا رہی ہیں۔ اس ایک مہینے میں جسم کے دوسرے حصوں کے ٹھنڈے ہونے کے کارن اُن کی زبان ذرا تیز اور شوخ ہو جاتی ہے۔ اُس وقت ہاتھ میں ایک پھٹی ساڑی اور پاپڑ لے کر اوپر سے رادھا بھابی اُتریں۔

"کیا ہوگیا بُوا۔ کیوں بڑبڑا رہی ہو؟ پھر سنیاسی جی مہاراج نے کچھ کہہ دیا ہے کیا؟"

"ارے، میں کہیں چلی جاؤں تو میرا جانا انہیں اچھا نہیں لگتا۔ کل چوک والے کشوری لال کے لڑکے کا مونڈن تھا۔ ساری برادری کا بلاوا تھا میں تو جانتی تھی کہ یہ پیسے کا گھمنڈ ہے کہ مونڈن پر بھی ساری برادری کو بلاوا بھیجا ہے۔ لیکن مجھے یہ بھی پتہ تھا کام اُن نئی نویلی بہوؤں سے ہوگا نہیں، اس لئے جلدی چلی گئی۔ ہوا بھی وہی" اور سرک کر بُوا نے رادھا کے ہاتھوں سے پاپڑ لے لئے اور انہیں خشک کرنے لگیں۔ "ایک کام بھی ڈھب سے نہیں ہو رہا تھا۔ اب گھر میں کوئی بڑا ہو تو سمجھائے۔ یا پھر کبھی کام کیا ہو تو علم ہو۔ گانے والی عورتیں مونڈن پر دُولہا دُلہن کے گیت الاپ رہی تھیں۔ میرا تو مارے ہنسی کے پیٹ پھول گیا۔" اور اُس کی یاد سے کچھ دیر پہلے کا دل میں اُٹھنے والا غصہ دُور ہو گیا۔ اپنے سادہ مزاج کے رنگ میں وہ کہنے لگیں۔ "دیکھو تو عجیب تماشا سموسے تو کچے اتار لئے اور اتنی مقدار میں بنا لئے کہ دو بار کھا لیں۔ اور گلاب جامن اتنے کم کہ ایک بار بھی پورے نہ ہوں۔ اسی وقت میدہ گوندھ کر نئے سرے سے گلاب جامن بنائے۔ اور بے چارے کشوری لال جی تو اتنے احسان مند تھے کہ کیا بتاؤں کہنے لگے۔ اماں تم نہ ہوتیں تو بڑی تھو تھو ہوتی۔ اماں، تم نے لاج رکھ لی۔" میں نے تو کہہ دیا 'ارے اپنے ہی کام نہیں آئیں گے تو کیا کوئی باہر سے آئے گا' یہ تو آج کل ان کی روٹی پانی کا کام رہتا ہے، نہیں تو صبح صبح ہی چلی جاتی۔"

"تو سنیاسی مہاراج کیوں بگڑ پڑے؟ شاید انہیں تمہارا آنا جانا اچھا نہیں لگتا بُوا۔"

"یوں میں کہیں بھی آؤں جاؤں، انہیں اچھا نہیں لگتا۔ اور پھر کل کشوری کے یہاں سے بلاوا نہیں آیا۔ انہیں اسی کا غصہ تھا۔ ارے میں کہوں کہ گھر والوں کا کیا بلاوا؟ وہ لوگ تو مجھے اپنی ماں سے کم نہیں سمجھتے، نہیں تو کون بھلا یوں سارا بھنڈار سونپتا ہے؟ لیکن انہیں اب یہ سب کچھ کون سمجھائے۔ کہنے لگے تو زبردستی دوسروں کے گھر میں ٹانگ اڑاتی پھرتی ہے۔" ارے ....." اور یکایک انہیں پتی کے غصے بھرے الفاظ یاد آ گئے جن کی بوچھار کچھ دیر پہلے ہی اُن پر ہو چکی تھی۔ یاد آتے ہی پھر اُن کے آنسو بہہ نکلے۔

"ارے، روتی کیوں ہو بُوا؟ کہنی سنی تو چلتی رہی ہے۔ سنیاسی جی مہاراج ایک مہینے کو تو آ کر رہتے ہیں۔ سن لیا کرو۔ اور کیا؟"

"سننے کو تو سنتی ہوں، مگر دل تو دُکھتا ہے کہ ایک مہینے کے لئے آتے ہیں تو بھی کبھی میٹھے بول نہیں بولتے۔ میرا کہیں آنا جانا انہیں اچھا نہیں لگتا۔ اس لئے تو ہی بتا رادھا میں کیا کروں۔ یہ تو ایک برس میں گیارہ مہینے ہردوار رہتے ہیں۔ انہیں تو رشتہ داروں سے کچھ نہیں لینا دینا۔ مگر مجھے تو سب سے نباہ کرنا ہے میں بھی سب سے رشتہ توڑ کر بیٹھ جاؤں تو کیسے کام چلے۔ میں تو اُن سے کہتی ہوں کہ جب دامن پکڑا ہے تو آخر دم تک ساتھ رکھو۔ وہ تو اُن سے ہوتا نہیں۔ سارا دھرم کرم یہی لوٹیں گے ساری نیکی یہ آپ لیں گے، اور میں اکیلی پڑی پڑی یہاں اُن کے نام کو رویا کروں۔ ان حالات میں کہیں آؤں جاؤں تو یہ اُن سے برداشت نہیں ہوتا" اور پھر بُوا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

رادھا نے دلاسا دیتے ہوئے کہا "روؤ نہیں بُوا۔ وہ تو اس لئے ناراض ہوئے تھے کہ بغیر بلائے تم وہاں کیوں چلی گئیں۔"

"بے چارے اتنے ہنگامے میں بلانا بھول گئے تو میں بھی جان کر بیٹھ جاتی؟ پھر گھر والوں کو کیسا بلاوا؟ میں تو اپنے پن کی بات جانتی ہوں کوئی پریم نہ رکھے تو اُس کے بلانے پر بھی نہ جاؤں اگر پریم رکھے تو بغیر بلائے بھی سر کے بل جاؤں۔ میرا اپنا ہرکھو ہوتا اور اُس کے گھر کا کام ہوتا تو کیا میں بلاوے کے بھروسے بیٹھی رہتی؟ میرے لئے جیسا ہرکھو ویسا کشوری لال۔ آج ہرکھو نہیں ہے اسی لئے دوسروں کو دیکھ دیکھ کر جیتی ہوں۔" اور وہ ہچکیاں لینے لگیں۔

سوکھے پاپڑوں کو بٹورتے بٹورتے اپنے لہجے اور آواز کو کومل بنا کر رادھا نے کہا "تم بھی بُوا بات کو کہاں سے کہاں لے گئیں؟ لو اب چپ ہو جاؤ۔ پاپڑ تل کر لاتی ہوں۔ کھا کر بتانا کیسے ہیں؟" اور وہ ساڑی کو سمیٹ کر اوپر چلی گئی۔

کوئی ایک ہفتے بعد بُوا بڑی خوشی خوشی آئیں اور سنیاسی جی سے بولیں۔ "سنتے ہو، دیور جی کے سسرال والوں کی کسی لڑکی کا رشتہ بھاگیرتھ جی کے یہاں ہوا ہے۔ وہ لوگ یہاں آ کر شادی کر رہے ہیں۔ دیور جی کے بعد تو اُن لوگوں سے کوئی تعلق ہی نہیں رہا پھر بھی ہیں تو ناطے دار۔ وہ تو تمہیں بھی بلائے بغیر نہیں مانیں گے۔ ناطے دار کو اب وہ کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟" اور بُوا خوش ہو کر ہنس پڑیں۔ سنیاسی جی کی خاموشی سے اُن کے دل کو ٹھیس تو پہنچی پھر بھی

وہ خوش تھیں۔ اِدھر اُدھر جا کر وہ اب شادی کے سلسلے کی تکمیل کی کڑیوں کو دیکھتی رہیں اور آخر وہ ایک دن یہ بھی سن آئیں کہ اُن کے ناطے دار بھی یہاں آ گئے ہیں زور شور سے تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ساری برادری کو دعوت دی جائے گی۔ خوب رونق ہونے والی ہے دونوں ہی پیسے والے ٹھیرے۔

"کیا جانے ہمارے گھر کے لئے بُلاوا آوے یا نہیں؟ دیور جی کو مرے پچیس برس ہو گئے۔ اس کے بعد سے تو کوئی تعلق ہی نہیں رکھا۔ رکھے بھی کون؟ یہ کام تو مردوں کا ہوتا ہے میں تو مرد والی ہو کے بھی بے مرد ہوں۔ اور ایک ٹھنڈی سانس اُن کے دل سے نکل گئی۔

"ارے واہ بُوا، تمہارا نام کیسے نہیں ہو سکتا؟ تم تو رشتہ دار ٹھیریں۔ رشتہ تھوڑے ہی ٹوٹ جاتا ہے۔ دال بینتے ہوئے گھر کی بڑی بہو بولی۔

ہے بُوا، تیرا نام ہے۔ میں تو ساری لسٹ دیکھ کر آئی ہوں، بیوہ نند بولیں۔

بیٹھے ہی بیٹھے ایک قدم آگے سرکا کر بُوا نے بڑے شوق سے پوچھا: "تو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئی ہے نام؟ نام تو ہونا ہی چاہئے۔ مگر میں نے سوچا کہ کیا جانے آج کل کے فیشن میں پرانے رشتہ داروں کو بلانا ٹھیک ہو، نہ ہو" اور بُوا لمحہ بھر رُکے بغیر وہاں سے چل پڑیں۔ اپنے گھر میں جا کر سیدھے رادھا بھابی کے کمرے میں پہنچیں۔

"کیوں ری رادھا، تو تو جانتی ہے کہ نئے فیشن میں [illegible] کی شادی میں کیا دیا جاتا ہے؟ سمدھیوں کا معاملہ ٹھیرا اور وہ بھی پیسے والے خالی ہاتھ جاؤں گی تو اچھا نہیں لگے گا۔ میں تو پُرانے زمانے کی ٹھیری۔ تو ہی بتا دے کیا دوں؟ اب کچھ بننے کا وقت تو رہا نہیں ہے۔ دو دن باقی ہیں، اس لئے کچھ بنا بنایا ہی خرید لانا ہے۔"

"کیا دینا چاہتی ہو اماں؟ زیور، کپڑا، سنگار دان یا کوئی چاندی کی چیز؟"

"میں تو کچھ بھی نہ سمجھوں ری۔ جو کچھ پاس ہے تجھے لا کے دے دیتی ہوں۔ جو تو ٹھیک سمجھے لے آنا۔ بس بھدا نہیں ہونی چاہئے۔ اچھا دیکھوں پہلے، روپے کتنے ہیں؟" اور بُوا ڈگمگاتے قدموں سے نیچے آئیں۔ دو تین کپڑوں کی گٹھریاں اُٹھا کر ہٹا کر ایک چھوٹا سا بکس نکالا اُس کا تالا کھولا۔ اس میں سات روپے اور کچھ ریزگاری پڑی تھی ایک انگوٹھی۔ بُوا کا قیاس تھا کہ روپے کچھ زیادہ ہوں گے۔ مگر جب سات ہی روپے نکلے تو وہ سوچ میں پڑ گئیں۔ رئیس سمدھیوں کے گھر میں اتنے سے روپوں سے تو بندی بھی نہیں لگے گی۔ ان کی نظر انگوٹھی پر گئی: یہ اُن کے مرحوم بیٹے کی ایک برائے نام اُن کے پاس نشانی رہ گئی تھی۔ بڑی بڑی مالی مشکلوں کے وقت وہ اُس انگوٹھی سے لگاؤ نہ توڑ سکی تھیں۔ آج بھی ایک بار اُسے اُٹھاتے وقت اُن کا دل دھڑک گیا۔ پھر بھی انہوں نے وہ انگوٹھی اور پانچ روپے اپنے آنچل میں باندھ لئے، بکس کو بند کیا اور پھر اُوپر کو چلیں۔ مگر اس بار اُن کے دل کا جوش کچھ ٹھنڈا پڑ گیا تھا اور قدموں کی چال رُک سی گئی تھی۔ رادھا کے پاس جا کر بولیں، روپے تو نہیں نکلے بہو۔ آئیں بھی کہاں سے۔ میرا کون کمانے والا بیٹھا ہے؟ اس کوٹھری کا کرایہ آتا ہے، اُسی سے دو وقت کی روٹی مشکل سے چل پاتی ہے۔" اور وہ رو پڑیں۔

رادھا نے کہا: "کیا کروں بُوا۔ آج کل میرا بھی ہاتھ تنگ ہے۔ نہیں تو میں ہی دے دیتی۔ ارے تم دینے کے چکر میں کیوں پڑتی ہو؟ آج کل تو دینے لینے کا رواج ہی اُٹھ گیا ہے۔"

"نہیں رادھا۔ سمدھیوں کا معاملہ ٹھیرا۔ پچیس برس ہو گئے تو بھی وہ نہیں بھولے۔ اور میں خالی ہاتھ جاؤں؟ نہیں نہیں۔ اس سے تو نہ جاؤں یہی اچھا ہے۔"

"تو جاؤ ہی نہیں۔ چلو چھٹی ہوئی۔ اتنے لوگوں میں کسے پتہ لگے گا کہ بُوا آئی یا نہیں آئی۔" رادھا نے سارے مسئلے کا سیدھا سا حل بتاتے ہوئے کہا۔

"بہت بُرا مانیں گے۔ سارے شہر کے لوگ جائیں گے۔ میں سمدھن ہو کر نہیں جاؤں گی تو وہ سمجھیں گے کہ دیور جی مرے تو تعلق توڑ لیا۔ نہیں نہیں، تو یہ انگوٹھی بیچ دے۔" اور انہوں نے آنچل کی گانٹھ کھول کر ایک پُرانے زمانے کی انگوٹھی رادھا کے ہاتھ پر رکھ دی۔ پھر بڑی منت کے لہجے میں بولیں "تو تو بازار جاتی رہتی ہے رادھا۔ اسے بیچ دے اور جو کچھ تو ٹھیک سمجھے خرید لینا۔ بس عزت رہ جائے، اتنا خیال رکھنا۔"

اسی وقت گلی میں بُوا نے چوڑی والے کی آواز سنی تو یکایک اُن کی نظر اپنے ہاتھ کی میلی، پُرانی چوڑی پر جا کر اٹک گئی۔ کل ناطے داروں کے ہاں جانا ہے، زیور نہیں تو کم از کم کانچ کی چوڑیاں تو اچھی پہن لیں لیکن ایک ناقابلِ بیان شرمندگی نے اُن کے پاؤں میں زنجیر ڈال دی کوئی دیکھے گا تو؟ لیکن دوسرے لمحے اپنی کمزوری پر فتح پاتے ہوئے وہ پچھلے دروازے

پر پہنچ گئیں۔ اور ایک روپیہ نکال کر لال ہری چوڑیوں کے بند پہن لئے۔ مگر سارے دن وہ چوڑیوں کو اپنے دوپٹے کے پلو سے ڈھانپے رہیں

شام کو رادھا بھابی نے بُوا کو چاندی کی ایک سیندوردانی، ایک ساڑھی اور ایک بلاؤز کا کپڑا لا کر دے دیا۔ سب کچھ پا کر بُوا بڑی خوش ہوئی اور یہ سوچ سوچ کر کہ جب وہ یہ تحفے دیں گی تو اُن کی سمدھن پُرانی باتوں کو دُہائی دے دے کر اُن کی ملنساری کی کتنی تعریف کریں گی، اُن کا دل بے حد مُسرّت سے بھر گیا۔ انگوٹھی بیچنے کا غم بھی جاتا رہا۔ پاس والے بنئے کی دُکان سے انہوں نے ایک آنے کا رنگ لے کر اپنی ساڑھی رنگی۔ شادی پر سفید ساڑھی پہن کر جانا کچھ اچھا لگے گا؟

رات کو بُوا سوئیں تو بھی اُن کا دل کل کی طرف دوڑا جا رہا تھا۔ دوسرے دن نو بجے تک انہوں نے کھانا پکانے کا کام ختم کر لیا۔ اپنی رنگی ہوئی ساڑھی دیکھی تو وہ جچی نہیں۔ پھر اوپر رادھا کے پاس پہنچیں۔ کیوں رادھا، تو رنگی ساڑیاں پہنتی ہے تو اُن میں بڑی آب ہے۔ اس میں تو چمک آئی نہیں۔"

"تم نے کلف جو نہیں لگایا اماں۔ تھوڑا سا مانڈ دے دیتیں تو اچھا رہتا۔ ابھی دے لو۔ ٹھیک ہو جائے گی ——— بُلاوا کب کا ہے؟"

"ارے نئے فیشن والوں کی کچھ نہ پوچھو عین موقع پر بُلاوا آتا ہے۔ پانچ بجے کا مہورت ہے دن میں کبھی آ جائے گا۔"

رادھا بھابی دل ہی دل میں مُسکرا اُٹھی۔

بُوا نے ساڑی میں مانڈ لگا کر خشک بھی کر لیا اور پھر ایک نئی تھالی نکال کر اپنی جوانی کے دنوں میں بنا ہوا کروشیا کا ایک چھوٹا سا میز پوش نکالا۔ تھالی میں ساڑی، سیندوردان، ایک ناریل اور تھوڑے سے بتاشے سجائے۔ پھر جا کر رادھا کو دکھایا۔ سنیاسی جی مہاراج صبح سے اس کاروائی کو دیکھ رہے تھے اور انہوں نے کل سے لے کر آج تک آٹھ بار چیتاونی دی تھی کہ اگر کوئی بلانے نہیں آیا تو ہرگز نہ جانا، نہیں تو ٹھیک نہیں ہوگا۔ اور ہر بار بُوا نے بڑے یقین کے ساتھ کہا تھا "مجھے کیا پاگل سمجھ رکھا ہے کہ بغیر بُلائے چلی جاؤں گی؟ ارے وہ پڑوس والی نندا اپنی آنکھوں سے بُلاوے کی لسٹ دیکھ کر آئی ہیں اور بلائیں گے کیوں نہیں۔ سارے شہر والوں کو بلائیں گے تو سمبندھیوں کو نہیں بلائیں گے کیا؟"

تین بجے کے قریب بُوا کو بے دل سے چھت پر ادھر اُدھر گھومتے دیکھ کر رادھا بھابی نے آواز لگائی "گئیں نہیں بُوا؟"

یکایک چونکتے ہوئے بُوا نے پُوچھا "کتنے بج گئے رادھا؟ کیا کہا تین؟ سردی میں دن کا پتہ ہی نہیں چلتا ہے۔ ابھی تین ہی بجے ہیں اور دھوپ ساری چھت پر سے ایسے سمٹ گئی ہے جیسے شام ہو گئی ہو۔ پھر یکایک جیسے خیال کہ یہ تو بھابی کے سوال کا جواب نہیں ہوا تو ذرا سرد لہجے میں بولیں "مہورت تو پانچ بجے کا ہے جاؤں گی تو چار بجے تک جاؤں گی۔ ابھی تو تین ہی بجے ہیں۔" بڑے زور سے انہوں نے اپنے لہجے میں بے نیازی کا رنگ بھرا۔

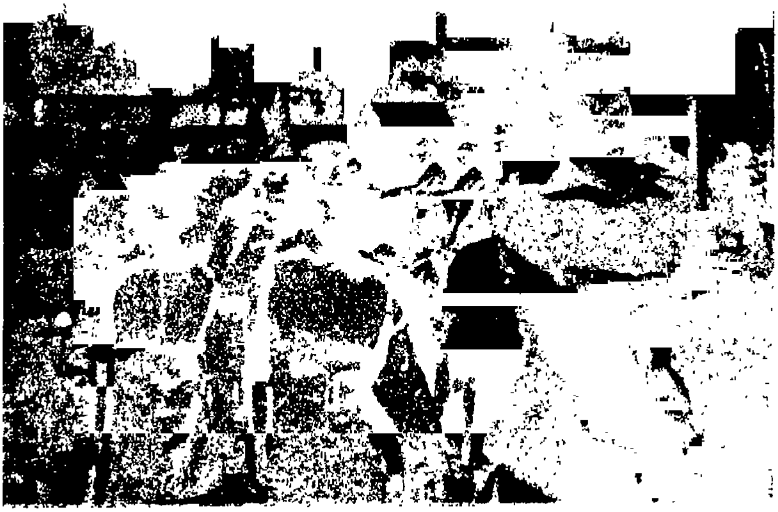
بُوا چھت سے گلی پر نظر لگائے کھڑی تھیں۔ ان کے پیچھے رسّی پر دھوتی پھیلی ہوئی جس میں کلف لگا تھا اور ابرق کی بھی چھڑکی ہوئی تھی۔ ابرق کے بکھرے ہوئے ذرّے رہ رہ کر دھوپ میں چمک اٹھتے تھے، ٹھیک اسی طرح جیسے کسی کو گلی میں گھستے دیکھ کر بُوا کا چہرہ چمک اٹھتا تھا۔

سات بجے کے دھندلکے میں نندا نے اوپر [illegible] دیکھا تو چھت کی دیوار سے لگی کھڑی، گلی کی طرف مونہہ کئے ایک سایہ اسے دکھائی دیا۔ اس کا دل بھر آیا۔ بغیر کچھ پوچھے اُس نے اتنا ہی کہا، بُوا سردی وہاں کھڑی کھڑی کیا کر رہی ہو؟ آج کھانا نہیں بنے گا کیا؟ سات تو بج گئے۔"

جیسے یکایک نیند سے جاگتے ہوئے بُوا نے کہا "کیا کہا؟ سات بج گئے؟" پھر جیسے اپنے آپ سے ہی بولتے ہوئے پوچھا "مگر سات کیسے بج سکتے ہیں؟ مہورت تو پانچ بجے کا تھا" پھر یکایک ساری حالت کو سمجھتے ہوئے اپنی آواز کو سنجیدہ بنا کر کہنے لگیں "ارے کا کیا [illegible] ابھی [illegible] گی۔ دو آدمیوں کا تو کھانا ہے بھی کیا کھانا اور کیا پکانا۔"

پھر انہوں [illegible] نے سُوکھی ساڑی کو اُتارا، نیچے جا کر اچھی طرح اُسے تہہ کیا، آہستہ آہستہ ہاتھوں سے چوڑیاں اُتاریں، تھالی [illegible] سے سارا سامان [illegible] بڑے جتن [illegible]

اس کے بعد وہ بجھے بجھے دل کے ساتھ انگیٹھی جلانے لگیں۔



عورت سپاہی کے بھیس میں

ایم ناصر

فوجی ملازمت مردوں کے لئے مخصوص ہے، عورتیں فوجی اسپتالوں میں نرسوں کا کام کر سکتی ہیں لیکن میدانِ جنگ میں آگ اور خون کی ہولی کھیلنا ان کے لئے ممنوع ہے۔ عورت صلح پسند ہوتی ہے۔ اسے آگ اور خون کا کھیل پسند نہیں۔ تاریخ میں بہت کم عورتوں نے میدانِ جنگ میں بہادری دکھائی ہے۔ گذشتہ زمانے میں فوج میں عورتوں کا داخلہ ہی ممنوع تھا۔ عورت صرف مرد کے بھیس میں لڑ سکتی تھی۔ یورپ کی تاریخ میں ایسی کئی عورتیں ملتی ہیں جنہوں نے مرد کا بھیس بدل کر میدانِ جنگ میں بہادری دکھائی۔ یہ عورتیں لڑنے کی شوقین نہیں تھیں۔ ان میں سے اکثر عورتیں مجبوری کی وجہ سے میدانِ جنگ میں گئیں کچھ عورتیں صرف اپنے خاوندوں کی تلاش میں نکلیں اور رن بھومی تک پہنچ گئیں۔ ان ہی عورتوں میں ایک ہانا سینل بھی تھی۔ یہ بہادر عورت اپنے شوہر کی تلاش میں نکلی۔ اس نے مردانہ لباس پہنا اور فوج میں شامل ہو گئی۔

ہانا انگلستان کی رہنے والی تھی۔ وہ اپنے ماں باپ کے مرنے کے بعد اپنی بڑی بہن کے ساتھ رہتی تھی۔ ۲۰ برس کی عمر میں اسے ایک نوجوان سے محبت ہو گئی۔ یہ نوجوان ہالینڈ کی بحری فوج میں ملازم تھا دونوں کی شادی ہو گئی۔ شادی کے سات مہینے کے بعد ہانا کا شوہر اپنی ملازمت پر واپس چلا گیا۔ دو برس تک اس کی کوئی خبر نہیں ملی۔ ہانا اپنے خاوند کو ڈھونڈنا چاہتی تھی اس کی بہن نے اسے بہت کچھ سمجھایا کہ وہ اب نہیں آئے گا۔ لیکن ہانا نے اس کی ایک نہ سنی۔ جب ہانا کا بچہ چھ مہینے کی عمر میں مر گیا تو اس نے اپنے خاوند کو ڈھونڈ نکالنے کا تہیہ کر لیا۔ اس نے اپنے بہنوئی کے کپڑے چرائے، اپنے سینے کو کس کر باندھا اور اپنی مہم پر روانہ ہو گئی۔

ہانا کے پاس نہ روپیہ تھا اور نہ کوئی ہنر۔ اسے دنیا کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ ایک ہمت تھی جس کے سہارے وہ دنیا کا مقابلہ کرنے نکل پڑی تھی۔ وہ اٹھارویں صدی کا زمانہ تھا۔ انگلستان میں اس زمانے میں جنگ کا بازار گرم تھا۔ ہانا نے فوج میں ملازمت کی کوشش کی اور اس کی کوشش کامیاب ہو گئی۔ اس نے فوج میں گھوڑ سواری اور ہتھیاروں کا استعمال بہت جلد سیکھ لیا۔ اس کے افسر اس کی لگن اور شوق دیکھ کر حیران رہ گئے۔ لیکن بدقسمتی سے اس کا سارجنٹ اس سے ناراض ہو گیا۔ یہ سارجنٹ بدمعاش تھا اور عورتوں کا رسیا تھا۔ بھولی بھالی عورتوں کو اپنے دام میں پھنسانا اس کا مشغلہ تھا۔ ایک دن اس سارجنٹ کی نظر گاؤں کی ایک حسینہ پر پڑی۔ اور اس نے اسے کسی بھی قیمت پر حاصل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے ہانا کو اپنا رازدار بنا لیا۔ لیکن ہانا کے سینے میں عورت کا دل تھا۔ وہ ظاہری طور پر تو سارجنٹ کی مدد کرنے پر آمادہ ہو گئی۔ لیکن اس نے خفیہ طریقے سے اس لڑکی کو سارجنٹ کے ارادے سے آگاہ کر دیا۔ سارجنٹ کا وار خالی گیا۔ اسے معلوم ہو گیا کہ اس کی ناکامی کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔ وہ غصّے میں تلملا کر گیا اس نے ہانا سے انتقام لینے کی ٹھان لی اور ایک دن اس پر جھوٹا الزام لگا کر ۶۰۰ کوڑے لگانے کی سزا دی۔ یہ سزا بہت کڑی تھی، لیکن اس زمانے میں خلافِ معمول نہ تھی۔ سپاہیوں نے ہانا کو فوجی بارک کے دروازے سے باندھ دیا اور اس کی ننگی پیٹھ پر کوڑے برسانے شروع کر دئے۔ دروازے سے بندھنا اس کے حق میں مفید ثابت ہوا۔ ورنہ اس کے عورت ہونے کا راز کھل جاتا۔ ہانا چاہتی تو اپنے عورت ہونے کا راز خود کھول سکتی تھی اور اس طرح اس سزا سے بچ سکتی تھی۔ لیکن اس نے ایسا نہ کیا اسے ڈر تھا کہ

اس بھید کے کھل جانے پر اسے فوجی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے گا اور پھر وہ اپنے خاوند کو تلاش نہیں کر سکے گی۔ اس نے ہمت اور صبر سے اپنی سزا کو برداشت کیا۔ جب ۵۰۰ کوڑے پورے ہو گئے تو اس کے افسر نے رحم کھا کر باقی کوڑے موقوف کر دیئے۔ ہانا کی پشت لہولہان ہو گئی تھی۔ وہ کئی روز بستر پر پڑی رہی جب اس کی پشت کے زخم مندمل ہونے لگے تو اس نے فوج کی ملازمت چھوڑ دی۔ اس کے گاؤں کا ایک نوجوان بھی اسی فوج میں بھرتی ہو گیا تھا۔ ہانا کو اندیشہ تھا کہ وہ اسے پہچان لے گا۔ اُس نے فوجی کپڑے اتار پھینکے اور شہری لباس پہن لیا۔

اب ہانا مردانہ بھیس میں پورٹس متھ کی طرف چل دی۔ راستے میں اس نے ایک سرائے میں قیام کیا۔ یہاں اس کے ساتھ ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ سرائے کے مالک کی بیوی اس پر ڈورے ڈالنے لگی۔ سرائے کے مالک کو جیسے ہی اس بات کا پتہ چلا، وہ مرنے مارنے پر تل ہانا نے سرائے کے مالک کی خوب مرمت کی اور پورٹس متھ روانہ ہو گئی۔

اس زمانے میں پورٹس متھ کی بندرگاہ سے ایک جنگی جہاز ہندوستان روانہ ہونے والا تھا ... ہندوستان جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ سیلاب کی گرمی سے بہت گھبراتے تھے۔ اس کے علاوہ ہیضہ اور ملیریا سے بھی ڈرتے تھے ہندوستان کا نام سن کر ہی سینکڑوں فوجی بھاگ جاتے تھے ہانا نے ان مصیبتوں کی کوئی پرواہ نہ کی۔ اور وہ بحری جہاز میں توپچی بن گئی۔

اس زمانے میں بحری جہازوں کی حالت بہت خراب ہوتی تھی۔ سڑا ہوا کھانا، جگہ کی تنگی اور لوریت بحری سفر کا لازمہ تھے۔ خدا خدا کر کے جہاز ماریشس پہنچا۔ جہاز کا کمانڈر ماریشس پر حملہ کرنا چاہتا تھا، مگر ماریشس میں فرانسیسیوں کا بحری بیڑا بہت طاقتور تھا۔ کمانڈر نے کچھ سپاہیوں کو ساحل کی طرف بھیجا تاکہ وہ دشمنوں کی نقل و حرکت کا مطالعہ کریں۔ ان سپاہیوں میں ہانا بھی شامل تھی۔ جیسے ہی ان کی کشتی ساحل کے قریب پہنچی، ان پر گولہ باری شروع ہو گئی۔ ہانا کی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا، وہ دو تولیوں کی زد پر تھی، لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور سب سپاہیوں کو زندہ سلامت لے کر واپس انگریزی جہاز پر پہنچ گئی۔

جہاز ماریشس سے چل کر پانڈی چری پہنچا۔ پانڈی چری کا شہر ہندوستان کے جنوب میں فرانس کی نوآبادی تھا۔ یہ شہر مدراس سے ۱۰۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ مدراس پر انگریزوں کی حکمرانی تھی۔ دونوں غیر ملکی فریقوں میں اکثر تناتنی رہتی۔ اس وقت بھی دونوں ملکوں کے درمیان جنگ جاری تھی۔ انگریزوں نے پانڈی چری پر حملہ کرنے سے پہلے ایک قلعہ پر حملہ کر دیا۔ یہ قلعہ دریا کے دہانے پر بنا ہوا تھا۔ انگریزی سپاہ کی تعداد ۲۵۰۰ تھی۔ ہانا بھی مردانہ بھیس میں ان سپاہیوں میں شامل تھی۔ فرانسیسیوں نے گولہ باری شروع کی، انگریزی سپاہ کے ۳۵ جوان ہلاک ہو گئے۔ انگریزوں نے جوابی حملے میں فرانسیسیوں کے دانت کھٹے کر دیئے۔ اتفاق سے ایک گولہ فرانس کے بارود کے ذخیرے میں گرا اور وہ تباہ ہو گیا۔ فرانسیسیوں نے ہمت ہاری۔ وہ پسپا ہو گئے۔

اب پانڈی چری پر حملہ کرنے کی باری تھی۔ پانڈی چری ایک مضبوط قلعہ تھا۔ اسے فتح کرنا آسان کام نہیں تھا۔ ایک دن انگریز سپاہی بحری جہاز سے توپیں اور بندوقیں اتار کر ساحل پر جمع کر رہے تھے کہ ایک فرانسیسی دستے کی نگاہ ان پر پڑ گئی اور انہوں نے انگریزوں پر حملہ کر دیا۔ اس حملے میں دو انگریز افسر ہلاک ہو گئے مگر ہانا نے اپنے اوسان برقرار رکھے اور ایک فرانسیسی افسر کو گولی کا نشانہ بنا دیا پھر وہ صحیح سلامت اپنے جہاز پر پہنچ گئی۔

جب پانڈی چری پر حملے کے انتظامات مکمل ہو گئے تو انگریزی سپاہ ساحل پر اُتر گئی۔ ہانا کو حملے کے دوران ایک دریا کو پار کرنا پڑا۔ پانی اس کے سینے تک پہنچ گیا۔ وہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ بندوق کو سر سے اوپر اٹھائے دریا کو پار کر گئی۔ انہوں نے ایک فرانسیسی چوکی پر قبضہ کر لیا۔ اس مقابلے میں دونوں ملکوں کے سپاہیوں کے درمیان دست بدست لڑائی ہوئی۔ ہانا نے اپنی بندوق سے ۳۷ گولیاں چلائیں اور ساری گولیاں ٹھیک نشانے پر لگیں اس لڑائی میں ہانا بُری طرح زخمی ہو گئی اس کی ایک ٹانگ میں چھ گولیاں لگیں، دوسری میں پانچ۔ اس کے علاوہ اس کی ران میں بھی ایک دو لگی۔ اسے فوراً اسپتال پہنچا دیا گیا۔

ہانا اسپتال پہنچ گئی لیکن وہ ایک عجیب کشمکش میں گرفتار تھی۔ اسے یہ اندیشہ مارے ڈالتا تھا کہ فوج کا سرجن اس کی ٹانگوں اور ران سے گولیاں نکالنے کے لئے اس کے کپڑے اتارے گا اور اس کا راز کھل جائے گا۔ ہانا کے لئے فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ ایک طرف موت اور دوسری طرف افشائے راز۔ اس نے فیصلہ کر لیا وہ مر جائے گی لیکن اپنا راز نہ کھلنے دے گی۔ وہ درد سے کراہ رہی تھی، لیکن اس نے

سرجن کو اپنی ٹانگوں کے متعلق کچھ نہ بتایا۔ شدید اذیت کے دوران بھی وہ مسکراتی رہی۔ اُس نے ڈاکٹر کو بتایا کہ اسے کچھ نہیں ہوا ہے۔ کبھی کبھی درد کی شدت اس قدر بڑھ جاتی کہ وہ افشائے راز پر آمادہ ہو جاتی، لیکن پھر اس کی قوتِ ارادی آڑے آ جاتی۔

ہانا کو معلوم تھا کہ جسم سے گولیاں نہ نکالی جائیں تو زہر باد ہو جاتا ہے۔ اس نے ایک مدراسی عورت کو اپنا رازدار بنا لیا وہ عورت اس کے لئے سرجن کی الماری سے کچھ دوائیں چرا لائی۔ ہانا نے خود اپنا آپریشن کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اُس نے اپنی اُنگلیوں سے گولیوں کو ٹٹولا۔ اور زخم میں انگلیاں گاڑ دیں۔ اپنے جسم سے خود گولیاں نکالنا بچوں کا کھیل نہیں۔ اس کے لئے بڑی قوتِ برداشت کی ضرورت ہے۔ ہانا نے درد کی پروا نہ کی۔ اور ساری گولیاں چُن چُن کر نکالیں۔ اس کے بعد سرجن کی الماری سے چرائی ہوئی دوائیں زخموں پر لگائیں۔

خدا کی قدرت کہ اس کا آپریشن کامیاب ہو گیا۔ اور آہستہ آہستہ اس کے زخم بھر گئے۔ تین مہینے بستر پر پڑے رہنے کے بعد وہ اس قابل ہو گئی کہ آسانی سے چل پھر سکے۔

جب ہانا پوری طرح صحت یاب ہو گئی تو اسے ایک بحری جہاز پر بھیج دیا گیا یہ جہاز مدراس سے بمبئی جا رہا تھا۔ ہانا کو اس جہاز میں کسی قدر عافیت ملی۔ وہ باقاعدہ سپاہی بن گئی۔ جہاز کی دُھلائی اور صفائی کا صبر آزما کام اس کے ذمہ نہیں تھا لیکن یہاں بھی وہ ایک مشکل میں پھنس گئی۔ جہاز کا کپتان ایک جابر افسر تھا۔ ایک دن اس نے ہانا کو حکم دیا کہ وہ اسے گانا سنائے۔ ہانا نے جواب دیا کہ افسروں کو گانا سنانا ایک سپاہی کے فرائض میں داخل نہیں۔ جہاز کے عرشے پر سپاہیوں کا ہجوم تھا۔ وہ سب اس افسر سے نفرت کرتے تھے۔ ہانا کا جواب سن کر افسر کو بہت غصہ آیا۔ اور وہ تلملا کر رہ گیا۔ سپاہیوں نے ہانا کی پیٹھ ٹھونکی۔ وہ اپنے افسروں کی خجالت پر بہت خوش تھے۔ افسر اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس وقت تو وہ خاموش ہو گیا لیکن اس نے ہانا سے انتقام لینے کی ٹھان لی۔ ایک دن اس نے اپنی قمیص کہیں چھپا دی اور پھر ہانا پر الزام لگایا کہ یہ قمیص ہانا نے چُرائی ہے۔ چوری کے جرم میں ہانا کو جہاز کے ایک کمرے میں قید کر دیا گیا۔ اس کو آہنی بیڑیوں میں جکڑ دیا گیا۔ ظالم افسر نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ حکم دیا کہ ہانا کی ننگی کمر پہ بارہ کوڑے لگائے جائیں ایک دفعہ پھر ہانا مصیبت میں گرفتار ہو گئی۔ اسے بارہ کوڑوں کی پروا نہیں تھی، اسے اپنے عورت ہونے کا راز کھل جانے کا اندیشہ تھا۔ اس راز کو چھپانے کے لئے اس کو ایک ترکیب سُوجھی۔ اس نے اپنی گردن کے گرد ایک بڑا رومال باندھ لیا اور رومال کے دونوں سرے اپنے سینے پہ پھیلا دئے۔ اس طرح وہ افشائے راز سے بچ گئی۔ کوڑے مارنے والا سپاہی افسر کے ظالمانہ رویّہ سے خود بھی لال تھا۔ اس نے ہانا کی پشت پر کوڑوں کی ضرب ہلکی لگائی۔ پانچ دن بعد ہانا کو اس قید سے رہائی مل گئی۔ جب یہ جہاز ایک بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا تو بحری بیڑے کے ایک افسر نے سارا ماجرا سُنا۔ وہ ایک رحم دل افسر تھا۔ اس نے ہانا کو قید سے چھٹکارا دلایا۔ کچھ دن بعد جہاز کے افسر کی قمیص بھی اس کی الماری میں مل گئی، سپاہیوں کو معلوم تھا کہ ہانا پہ چوری کا جھوٹا الزام لگایا گیا ہے۔ اس بات کا ثبوت مل جانے پر انہوں نے افسر سے بدلہ لینے کی ٹھان لی۔ جب یہ جہاز انگلستان کی ایک بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا تو سپاہیوں کی غلطی سے جہاز کا مستول افسر کے سر پر گر پڑا اور اس کی کھوپڑی پاش پاش ہو گئی۔

ہانا اس سفر میں اپنے خاوند کو برابر تلاش کرتی رہی۔ یہی اس کی زندگی کا مقصد تھا۔ وہ جہاں بھی جاتی، اپنے خاوند کے متعلق ضرور پوچھ گچھ کرتی۔ جب وہ پرتگال کی بندرگاہ لزبن پہنچی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے خاوند نے اٹلی کی ایک بندرگاہ کے شراب خانے میں کسی کو قتل کر دیا تھا۔ اس جرم کی پاداش میں اسے سزائے موت کا حکم سنایا گیا۔ اس کے خاوند کو ایک بوری میں بند کر دیا گیا۔ بوری میں وزنی پتھر بھر دئے گئے۔ اور پھر بوری کو سی کر سمندر میں غرق کر دیا گیا۔ ہانا کی تلاش ختم ہو گئی۔ سفر اور قید و بند کی صعوبتیں بے کار ثابت ہوئیں۔ ہانا دلِ شکستہ اپنے گھر پہنچی۔ اس نے فوجی لباس اتار پھینکا اب اسے اپنی جنس کو چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے زنانہ لباس پہنا۔ اور حسبِ سابق اپنی بہن کے ساتھ رہنے لگی۔

اس نے اپنی زندگی کی داستان کو شائع نہیں کیا، لیکن آہستہ آہستہ یہ خبر خود ہی سارے انگلستان میں پھیل گئی۔ کمانڈر ان چیف نے اس کو سپاہیوں کی وردی پہننے کی اجازت دی۔ دربار سے تیس اشرفیاں سالانہ اس کی پنشن مقرر ہو گئی

ہانا کا خاوند مر چکا تھا۔ اس نے مزید دو شادیاں کیں۔ عمر کے آخری حصہ میں اس پر دیوانگی کا حملہ ہوا۔ اور اسے پاگل خانے میں داخل کر دیا گیا۔ جہاں ۱۷۹۲ء میں اس کی موت نے اس کی ہنگامہ خیز زندگی کا خاتمہ کر دیا۔

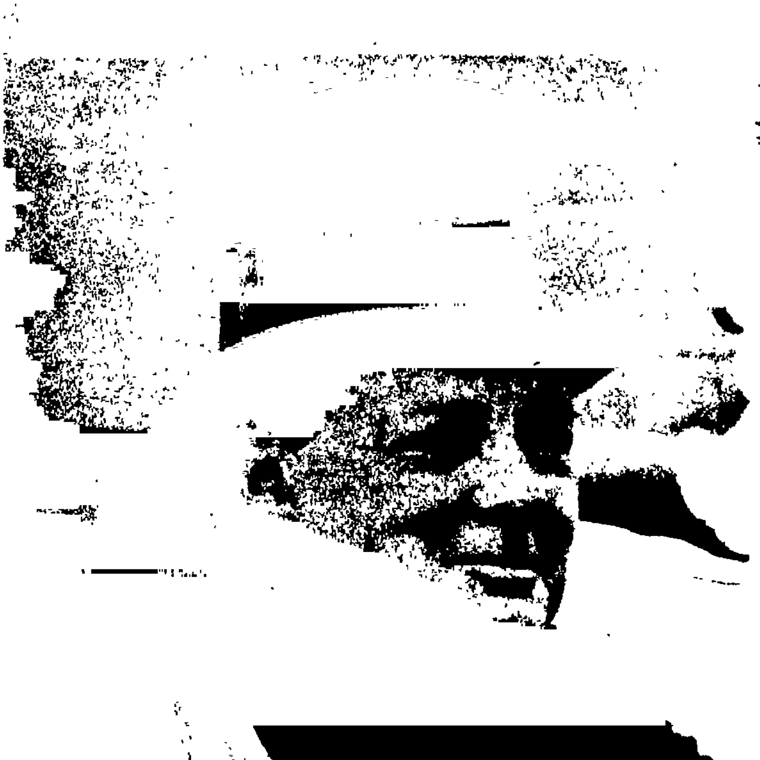


بیرگ اگر اس صدی کی واحد فلم ہے جس کا برسوں سے انتظار کیا جا رہا تھا تو ہماری یہ کتاب بھی اس صدی کی سب سے خوب صورت کتاب کہی جا سکتی ہے جس میں فلم کی مکمل کہانی ۔ گانے اور بے شمار فوٹو اس انداز سے پیش کئے گئے ہیں کہ موتیہ سے بولتے ہیں۔ فلم کے ہر منظر کی ایسی تفصیل اور ایسی ایسی تصاویر کہ پوری فلم آنکھوں کے سامنے آجائے۔ فلم کے تقریباً تمام ڈائیلاگ جنہیں آپ بار بار دہرائیں گے کتاب بیرگ حاصل کرنے کے لئے آج ہی چھ روپے (پانچ روپے کتاب کی قیمت اور ایک روپیہ جسٹری خرچ) کا منی آرڈر بھیج دیجئے اور منی آرڈر کرتے وقت ڈاک خانہ سے ملنے والی رسید اپنے خط کے ساتھ ہمیں بھیج دیجئے۔ ایجنٹ صاحبان بھی اپنے آرڈر جلد ارسال فرمائیں۔ شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

بیرگ
نیا ایڈیشن

چرچل کا سوتیلا باپ اس کا ہم عمر تھا

ن. سلطانہ



میں کسی سے شادی کرنا نہیں چاہتی
لیکن اگر کوئی پیارا سا آدمی مل گیا۔ جس کی آمدنی کم از کم چار لاکھ روپے سالانہ ہو، اور جو میری محبت میں دیوانہ ہو جائے تو میں اپنا ارادہ بدل سکتی ہوں۔" یہ الفاظ تھے جو چرچل کی ماں نے اس کے باپ کی موت کے کچھ عرصے کے بعد کہے چرچل کی ماں کا نام جینی تھا، وہ امریکن شہری تھی۔ چرچل کے باپ لارڈ رینڈولف چرچل کا انتقال ۴۵ برس کی عمر میں ہو گیا تھا۔ جینی ایک عجیب و غریب شخصیت کی مالک تھی۔ اس کے نزدیک روپے کی کوئی اہمیت نہیں تھی وہ روپیہ پانی کی طرح بہاتی تھی۔ اس کی پیدائش امریکہ میں ہوئی لیکن اس کا بچپن پیاریہ پیرس میں گذرا۔ اس کا باپ لیونارڈ ابتدا میں ایک کسان تھا لیکن اس نے اپنا سارا روپیہ سٹے میں لگا دیا قسمت اس پر مہربان تھی، جلد ہی وہ لاکھوں بلکہ کروڑوں کا مالک بن گیا ——

جینی خوب صورت تھی صحت مند تھی، زندہ دلی اس میں کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھی یہ پچھلی صدی کے آخر کا زمانہ تھا۔ ساری دنیا میں امن و امان تھا۔ راوی چین ہی چین لکھتا تھا جینی کے زیورات امریکہ سے بن کر آتے، لباس پیرس میں سلتے۔ اس رقص و سرور کی ایک محفل میں جینی کی ملاقات لارڈ چرچل سے ہو گئی، لارڈ چرچل پہلی ہی نظر میں جینی پر فدا ہو گیا۔ ان کی محبت تیزی سے منزلیں طے کرنے لگی۔ ان کی بے تابی کا یہ عالم تھا کہ تین روز کے بعد ہی لارڈ چرچل نے اپنے باپ ڈیوک آف مارلبرا سے کہا کہ وہ جینی سے شادی کرنا چاہتا ہے اس زمانے میں انگلستان وکٹوریہ کے دورِ حکومت سے گذر رہا تھا۔ سوسائٹی کے رسم و رواج بہت سخت تھے، خاندانی پابندیاں کڑی تھیں ایک رئیس زادہ ایک عام لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ ڈیوک نے اس شادی کی شدید مخالفت کی۔ وہ جینی کے ماں باپ کو نہیں جانتا تھا کہ وہ کون لوگ ہیں جو اس کے بیٹے کو پھانسنا چاہتے ہیں۔ جینی کے باپ نے جب یہ سنا تو اس کا امریکن خون کھولنے لگا۔ اس نے فوراً جینی کو لندن سے پیرس روانہ کر دیا وہ چاہتا تھا کہ جینی خوش رہے، لیکن وہ اپنے سمدھی کی لعن طعن برداشت نہیں کر سکتا تھا آخر ڈیوک نے بیٹے کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ لیکن اس نے شادی کے لئے ایک شرط رکھی۔ اس نے کہا کہ جب تک اس کا بیٹا پارلیمنٹ کا ممبر نہیں بنتا یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ خوش قسمتی سے انگلستان کی وزارت نے استعفےٰ دے دیا۔ نئے الیکشن کی تیاریاں ہونے لگیں۔ لارڈ چرچل نے بھی انتخاب میں حصّہ

لیا اور کامیاب ہوگیا۔ الیکشن کے اخراجات جینی کے باپ نے برداشت کئے، اب دونوں کے لئے شادی کا راستہ صاف ہوگیا لیکن ابھی کچھ رکاوٹیں باقی تھیں؛ اس زمانے کے دوسرے رئیسوں کی طرح لارڈ چرچل بھی بے کار تھا۔ وہ اپنے باپ کا دست نگر تھا۔ ادھر جینی کا باپ بھی مجبور تھا۔ امریکن قانون کے مطابق بیٹی اپنی شادی کے بعد باپ کی دولت سے محروم ہو جاتی تھی، لارڈ چرچل نے اعلان کیا کہ وہ اپنی روزی خود کمائے گا لیکن اس کے باپ کو معلوم تھا کہ یہ خالی خولی باتیں ہیں۔ کچھ عرصے دونوں خاندانوں میں خط و کتابت کا سلسلہ چلتا رہا۔ آخر تمام معاملات طے ہوگئے، جینی کے باپ نے جینی کو جہیز میں ایک معقول رقم دینے کا وعدہ کیا۔ ادھر لارڈ چرچل کے باپ نے بھی اپنے بیٹے کا ماہانہ الاؤنس مقرر کر دیا۔ ۱۵ اپریل ۱۸۷۴ء کو دونوں کی شادی ہوگئی،

یہ شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی دونوں ہنی مون منانے یورپ گئے۔ وہاں سے واپسی پر جینی نے اپنی سسرال میں رہنا شروع کیا کچھ مہینے کے بعد لارڈ چرچل لندن چلا گیا یہاں شادی کے ساڑھے نو مہینے کے بعد ونسٹن چرچل پیدا ہوا۔ کسے معلوم تھا کہ یہ بچّہ جو وقت سے ذرا پہلے پیدا ہوگیا تھا اور جس کے کپڑے بھی تیار نہیں ہوئے تھے، ایک دن انگلستان کا سب سے بڑا آدمی بن جائے گا۔

لارڈ چرچل خوشامد پسند نہیں تھا۔ وہ بے لاگ اور منہ پھٹ آدمی تھا۔ اس کی دلیری اور صاف گوئی اس کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں ولی عہد اور لارڈ چرچل میں ٹھن گئی، لارڈ چرچل نے ولی عہد کے بھائی کا ساتھ دیا تو ولی عہد اس سے ناراض ہوگیا ولی عہد کے ناراض ہوتے ہی انگلستان کے رئیسوں نے بھی ان کے یہاں جانا آنا کم کر دیا۔ ڈیوک آف مارلبرا اپنے بیٹے کی حرکتوں سے پریشان تھا لیکن وہ اس کی عادت نہیں بدل سکتا تھا۔ اس زمانے میں ڈسرائیلی انگلستان کا وزیر اعظم تھا۔ اس نے ڈیوک کو آئرلینڈ کا وائسرائے بنا کر بھیج دیا۔ یہ ایک قسم کی باعزّت جلاوطنی تھی۔ جینی اور لارڈ چرچل بھی آئرلینڈ چلے گئے۔ یہ لوگ تین سال آئرلینڈ میں رہے انگلستان آنے کے بعد ان کے یہاں دوسرا بچّہ پیدا ہوا۔ یہ جان چرچل تھا۔ کچھ عرصے کے بعد ڈیوک کا انتقال ہوگیا۔ ڈیوک کے انتقال کے بعد لارڈ چرچل اور ولی عہد کے درمیان مصالحت ہوگئی۔ لارڈ چرچل وزیر خزانہ بنا دیا گیا لیکن اب کی بار اس کا وزیر اعظم سے کسی بات پر جھگڑا ہوگیا، دراصل لارڈ چرچل نچلا بیٹھنا نہیں جانتا تھا۔ اسے مخالفت کی پروا نہیں تھی؛ وہ اپنے حریفوں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا؛ وہ اپنے اصولوں کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار رہتا تھا۔ وزیر اعظم سے اس کا جھگڑا طول پکڑ گیا۔ تو لارڈ چرچل کو اپنے عہدہ سے استعفےٰ دینا پڑا۔ جینی اپنے خاوند کی تلوّن مزاجی سے پریشان رہتی تھی لیکن وہ مجبور تھی، لارڈ چرچل نے بے کاری سے تنگ آ کر دنیا کا سفر کرنے کی ٹھانی، جینی بھی اس سفر میں شریک تھی؛ لارڈ چرچل کی صحت دن بدن گرتی جا رہی تھی؛ جب وہ مدراس پہنچے تو لارڈ چرچل تکان سے بے ہوش ہوگئے۔ جینی نے دنیا کا دورہ منسوخ کر دیا اور اپنے خاوند کو لے کر لندن پہنچ گئی۔

لارڈ چرچل کی صحت کے بارے میں اس کے قریبی لوگوں کو بہت تشویش تھی، وہ سوچتے تھے کہ پتہ نہیں کہ اس کی موت کے بعد جینی کا کیا ہوگا۔ اس کی سہیلیوں کا خیال تھا کہ جینی اپنے شوہر کی موت کے بعد کاؤنٹ کینسکی سے شادی کرلے گی۔ کینسکی آسٹریا کا شاہ زادہ تھا۔ جینی اس سے محبّت کرتی تھی۔ جینی نے لارڈ چرچل سے شادی ضرور کی تھی، لیکن اس کا دل کینسکی پر فدا تھا۔ کینسکی سے اس کی ملاقات آسٹریا میں ہوئی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں وہ اسے اپنا دل ہار بیٹھی تھی۔ اسکے بعد کینسکی اس سے آئرلینڈ میں ملا۔ ان کی محبّت پروان چڑھتی رہی، جینی کی محبّت کی راہ میں اس کا خاوند رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ اپنے مشرق کے سفر کے دوران جینی کو ایک تار ملا جس میں کینسکی کی منگنی کی خبر تھی۔ جینی پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اس کی زندگی کی پہلی اور آخری محبّت اس سے چھینی جا رہی تھی۔ وہ بہت افسردہ خاطر تھی۔ خاوند کی بیماری نے اس کو اور پریشان کر دیا اس کی صحت تباہ ہوگئی۔ اس کا مستقبل تاریک ہوگیا۔ لندن پہنچنے کے کچھ عرصے کے بعد لارڈ چرچل کی موت ہوگئی۔

اپنے باپ کی موت کے وقت چرچل کی عمر ۲۱ سال تھی۔ ماں دونوں بیٹوں کو لے کر اپنی سسرال چلی گئی۔ انگلستان کا ماتمی ماحول اس کی زندگی اور طبیعت پر گراں گذرنے لگا، تو اس نے اپنے بچّوں کو لے کر پیرس کا رُخ کیا اس کی صحت پر پیرس کی خوش باش زندگی کا بڑا اچھا اثر پڑا۔

کچھ عرصے پیرس میں رہنے کے بعد جینی دونوں بچّوں کو لے کر لندن واپس آگئی۔ لندن میں زندگی کا وہی دور پھر شروع ہوگیا جو اس کے خاوند کے مرنے سے پہلے تھا۔ ولی عہد نے ان کے گھر آنا شروع کر دیا۔ جینی کو اپنے بیٹے ونسٹن چرچل کی طرف سے بہت فکر رہتی تھی

ونسٹن بچپن میں بہت خود سر تھا۔ اسکول میں اس کے استاد اس سے پریشان رہتے تھے۔ وہ اپنا زیادہ وقت لڑکوں سے لڑنے جھگڑنے میں گزارتا تھا۔ امتحان میں وہ بہت کم نمبروں سے پاس ہوتا تھا۔ اس کے استاد اس کو کند ذہن، بے وقوف اور جھگڑالو سمجھتے تھے، دنیا کے اکثر بڑے آدمیوں کے بچپن اسی طرح گزرے ہیں کسے معلوم تھا کہ یہ ضدی اور سرکش لڑکا ایک دن انگلستان کا وزیر اعظم بن جائے گا اور دنیا کی دوسری جنگ عظیم میں برطانیہ کی رہنمائی کرے گا۔ اس کا باپ لارڈ چرچل بھی اس سے دل برداشتہ رہتا تھا۔ اس نے کبھی سیدھے منہ اپنے بیٹے سے بات نہیں کی، وہ اپنے نالائق بیٹے سے عاجز تھا اور اسے منہ لگانا نہیں چاہتا تھا۔ ونسٹن کا بیان ہے کہ اس کے باپ نے ۲۰ سال کے عرصے میں اس سے ۲۰ دفعہ سے زیادہ بات نہیں کی۔ اس طرح باپ بیٹے کی گفتگو کا اوسط ایک ملاقات سالانہ تھا۔ ونسٹن باپ کے ساتھ رہتے ہوئے بھی باپ کے سامنے آنے سے ہچکچاتا تھا۔ اس کا باپ خشک مزاج اور بارعب آدمی تھا۔ وہ داڑھی کی وجہ سے وہ اور زیادہ سنجیدہ دکھائی دیتا۔

باپ کے مرنے کے بعد ونسٹن کے لئے صورت حال بدل گئی۔ ونسٹن کو اپنی ماں سے بے پناہ محبت تھی۔ دونوں ماں بیٹے سے زیادہ بہن بھائی معلوم ہوتے تھے۔ جینی کی عمر چالیس سال تھی، وہ اب تک خوب صورت اور صحت مند تھی۔ چرچل فوج میں بھرتی ہو گیا۔ وہ ہندوستان گیا، پٹھانوں سے لڑنے کے بعد وہ جنوبی افریقہ چلا گیا۔ جینی لندن میں اکیلی رہتی تھی۔ اس کی سہیلیاں دوسری شادی کے متعلق اس سے کہتیں تو [illegible] ایک ہی جواب ہوتا "میں شادی کرنا نہیں چاہتی لیکن اگر کوئی پیارا سا آدمی مل جائے، جس کی آمدنی کم از کم چار لاکھ روپے سالانہ ہو اور جو میرا دیوانہ ہو جائے تو میں اپنا ارادہ بدل سکتی ہوں۔"

کچھ عرصے بعد ایک پیارا سا آدمی جینی کی زندگی میں آ گیا لیکن اس کی آمدنی چار لاکھ روپے سالانہ نہیں تھی۔ وہ پشتینی رئیس تھا لیکن دولت مند نہیں تھا۔ یہ جارج کارنواس ویسٹ تھا۔ جارج نوجوان تھا۔ اس کی ماں جینی سے چھوٹی تھی۔ جینی اسے دیکھتے ہی اس پر دل و جان سے فدا ہو گئی۔ جارج کا سر فخر سے اونچا ہو گیا۔ اتنی مشہور عورت اس پر مرمٹی تھی۔ جینی کا بیٹا چرچل جارج کا ہم عمر تھا۔ جینی جارج سے اپنے بیٹے کے مستقبل کے متعلق باتیں کرتی باتوں ہی باتوں میں جارج کے مستقبل کا ذکر بھی چھڑ جاتا۔ جارج بہت خوب رو نوجوان تھا۔ اس کی صحت قابل رشک تھی۔ انگلستان کے ولی عہد کے الفاظ میں "جارج انگلستان کا سب سے خوب رو نوجوان تھا۔"

جارج اور جینی کی شادی ہو گئی، لارڈ چرچل کی موت کو ۵ برس گزر چکے تھے، جینی ابھی تک لیڈی چرچل کے نام سے پکاری جاتی تھی وہ اپنے مرحوم شوہر کی تمام دولت ختم کر چکی تھی اس کے دوسرے خاوند کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ روپے کا تھا۔ وہ جینی کی فضول خرچیوں کے لئے روپیہ کہاں سے لاتا۔۔۔ جینی کو جب کوئی چیز پسند آ جاتی تو وہ اسے فوراً حاصل کرنا چاہتی تھی۔ وہ یہ سوچ ہی نہیں سکتی تھی کہ روپیہ کہاں سے آئے گا۔ اسے روپے کی قدر و قیمت کا کوئی احساس نہیں تھا۔ روپیہ کے لئے اس نے اپنے بیٹے چرچل کی بیمہ پالیسی تک گروی رکھ دی، ونسٹن چرچل کو اپنی ماں سے بے انتہا محبت تھی۔ وہ اس کی فضول خرچی سے پریشان رہتا تھا لیکن کبھی ماں کی دل شکنی نہ کرتا تھا۔ وہ اپنے ہم عمر باپ سے بھی التجا کرتا کہ اس کی ماں کا خیال رکھے۔

جارج نے اپنی فضول خرچ بیوی کی نت نئی فرمائشیں پوری کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جینی کی شخصیت اتنی پیاری تھی کہ اس کی خواہش کو ٹالنا گناہ معلوم ہوتا تھا۔ جارج نے اپنا مکان گروی رکھ دیا۔ اس نے مختلف کمپنیوں میں ملازمت بھی کی۔ شاہی خاندان سے اس کی کافی دوستی تھی۔ اس کا ملنا جلنا رئیسوں میں تھا۔ انگلستان کے کچھ صنعت کاروں نے اس کی مدد کی لیکن وہ اپنی آمدنی اور خرچ میں تناسب قائم نہ رکھ سکا۔ وہ ناتجربہ کار تھا نوجوان تھا، اس کی پہنچ بڑے بڑے آدمیوں تک تھی۔ کچھ جعل سازوں نے اسے اپنے منصوبوں میں شریک کر لیا۔ جلد سے جلد دولت مند بننے کے چکر میں اسے اور بھی نقصان ہوا۔

ان سب باتوں کے باوجود جینی اور جارج بہت خوش تھے۔ اس زمانے کا انگلستان خوش حالی کی انتہائی بلندی پر تھا۔ تمام دنیا کی دولت سمٹ کر لندن پہنچ رہی تھی، انگلستان کی حکومت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ دنیا کے پانچ براعظموں میں ان کا راج پھیلا ہوا تھا۔ رئیسوں کے ٹھاٹھ تھے۔ کلب، تاش کی بازیاں، گھوڑ دوڑ اور کشتیوں کی ریس روزمرّہ کا معمول تھا۔ جینی اور جارج ان تمام محفلوں میں شریک ہوتے، ریس کھیلنے کے لئے وہ پیرس اور برازیل جاتے۔ انہیں مستقبل کی پرواہ نہیں تھی، جینی اپنے خوب رو خاوند کے ساتھ بہت مگن تھی۔

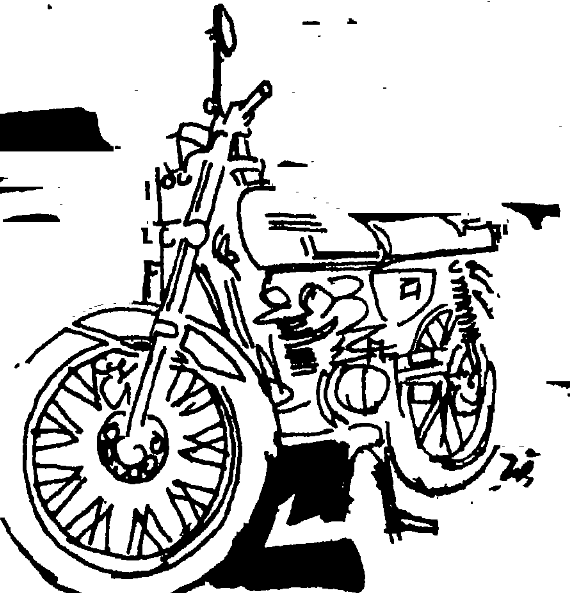
موٹر کار ایجاد ہوئی تو لندن کے رئیسوں میں موٹر چلانے کا فیشن زور پکڑ گیا، جارج نے بھی ایک موٹر کار خرید لی؛ دونوں میاں بیوی چھٹی کے دن دیہات میں موٹر دوڑاتے اور شکار کی پارٹیوں میں شریک ہوتے۔ جینی کو سادہ زندگی پسند نہیں تھی۔ وہ دیہات سے جلد اوب جاتی دیہات کی دھوپ اور تازہ ہوا اس کے دل کو افسردہ بنا دیتی۔۔۔ وہ رقص و سرود کی محفلوں کی رسیا تھی۔

ان کی شادی کو تیرہ برس گذر چکے تھے جینی کی عمر اب ۵۲ برس تھی۔ اب جینی نے اپنی سوانح عمری شائع کی۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی، اس کے بعد اس نے ایک ڈرامہ لکھا اس زمانے میں اسٹیلا کیمبل اسٹیج کی مشہور اداکارہ تھی، وہ اس ڈرامے میں کام کرنے کے لئے تیار ہوگئی، اسٹیلا کی عمر ۵۰ برس تھی۔ جارج کی عمر ۳۶ سال تھی۔ اسٹیلا اور جارج ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ جینی جارج کی بے وفائی برداشت نہ کر سکی۔ اس نے ۱۹۱۳ء میں جارج سے طلاق حاصل کر لی۔

تیرہ برس عیش و عشرت کی زندگی گذارنے کے بعد جینی اب پھر تنہا تھی طلاق کے ایک سال بعد اس کی ملاقات ایک نوجوان سے ہوگئی جس کا نام مانٹی گو تھا، مانٹی گو کی عمر ۳۷ سال تھی، جینی کی عمر ۶۰ سال تھی جینی اس عمر میں بھی خوب صورت تھی۔ ان کی کورٹ شپ ۴ سال تک جاری رہی ۱۹۱۸ء میں ان کی شادی ہوگئی۔ جینی کی عمر اپنی تیسری شادی کے وقت ۶۴ سال تھی وہ کہتی تھی کہ میں اپنے ہم عمر مرد سے شادی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اس کی شخصیت میں ایک مقناطیسی کیفیت تھی اس کے تیسرے خاوند کو اس سے بہت محبت تھی۔ وہ جینی کو دل و جان سے چاہتا تھا۔ تین سال تک وہ جینی کے ساتھ لندن میں رہا۔

جینی کی زندگی میں پھر بہار آگئی تھی اس کے گھر میں پھر رئیس زادوں کا تانتا بندھ گیا ایڈورڈ ہفتم کی ملکہ الیگزانڈرا جو اس کی بچپن کی سہیلی تھی، اس کے یہاں چائے پینے آتی تھی، مگر جینی کی زندگی کے دن پورے ہو چکے تھے ۱۹۱۸ء میں ایک روز جینی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے گر پڑی۔ یہ حادثہ اس کے لئے موت کا پیامی بن گیا۔ موت کے وقت اس کی عمر ۶۷ سال تھی۔

بھرے پورے ادھورے



کملیشور

گھر میں موٹر سائیکل کے آنے سے ایک نئی رونق آگئی تھی۔ موٹر سائیکل کے آتے ہی سب سے پہلے بیٹھک کی کھڑکیوں پر نئے پردے پڑ گئے تھے۔ جے پرکاش بابو نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ رادھا اب ساڑی بدل کر اور بال سنوار کر ہی باہر نکلنے لگی ہے۔ سبزی والا اب بھی آتا ہے لیکن رادھا مول تول پر اس سے اتنی تکرار نہیں کرتی جتنی پہلے کیا کرتی تھی۔

برآمدے میں موٹر سائیکل کھڑی رہتی تو ایسا لگتا جیسے گھر میں کوئی مہمان آگیا ہے۔ رادھا کی نظر اس بات پر بھی رہنے لگی کہ چاروں بچوں میں سے کوئی ننگے پاؤں باہر نہ نکلے۔ کروشیا سے اس نے بیٹھک کی میز کے لئے جالی دار ٹیبل کلاتھ بھی بُن لیا تھا اور ہر روز بچوں کے اسکول جانے سے پہلے اُن کے جوتوں پر پالش بھی کر دیا کرتی تھی۔

جے پرکاش بابو کو اس سے بڑا اطمینان ہوتا تھا۔ سیکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل خرید لانے کے بعد سے گھر میں عجیب سا بڑاپن آگیا تھا۔ بچے تمیز سیکھ گئے تھے۔ بیوی پڑوسیوں کو گھر بنانے کی ہدایتیں دینے لگی تھی اور دوسروں کے گھروں کی ... دیکھ کر اب زیادہ دُکھی ہونے لگی تھی۔ پڑوس والوں کی مشین پر وہ جے پرکاش بابو کے لئے دھاری دار نائٹ سوٹ سِل لائی تھی اور ہر رات انہیں زبردستی پہنا دیتی تھی۔

"سلیقہ تو تم نے سیکھا ہی نہیں!" رادھا کبھی کبھی انہیں لتاڑ دیتی۔ "ایسے اچھا نہیں لگتا کہ دھوتی اور بنیان پہن کر سویرے سویرے گھومنے لگو۔ صبح سویرے بھی کچھ لوگ آ ہی جاتے ہیں۔ اب وہ اپنے پیروں کے ناخنوں پر نیل پالش بھی لگانے لگی تھی۔

جے پرکاش بابو سو کر اٹھتے اور غسل خانہ سے واپس آتے تو انہیں اسٹول پر شیو کا سامان رکھا ہوا ملنے لگا تھا۔ یکایک رونما ہونے والی ان تبدیلیوں سے کبھی کبھی وہ حیران رہ جاتے تھے لیکن دل میں کہیں یہ اطمینان مزید گہرا بھی ہو جاتا تھا کہ اب گھر کچھ اوپر اُٹھ رہا ہے، ان کے معیارِ زندگی میں سدھار ہو رہا ہے۔ موٹر سائیکل کا اس قدر گہرا اثر ان کے رہن سہن پر پڑ جائے گا، یہ انہوں نے پہلے کبھی نہیں سوچا تھا۔

پڑوسی عورتوں کے درمیان رادھا بڑے شوق اور خود اعتمادی سے کہتی "سب سے پہلی چیز تو گھر ہے آدمی گھر بنالے تو سمجھو سب کچھ بنالیا۔ رادھا ضروری کے ... پاپا کہہ رہے تھے کہ ایک کھانے کی میز اور ... آج کل کون کھاتا ہے باورچی خانے میں بیٹھ کر ..."

جے پرکاش بابو کو اپنا بنتا ہوا گھر دکھائی دیتا تو نہال ہو جاتے۔ ایسا لگتا تھا جیسے رادھا میں ایک مرتبہ پھر لڑکی جیسی چُستی آگئی ہے۔ اُس نے بچوں کے سونے کا انتظام دوسرے کمرہ میں کر لیا تھا، اور دو کونوں میں پڑی ہوئی چارپائیوں کو جوڑ کر بچھا دیا گیا تھا۔ جو چارپائی ذرا نیچی تھی اُس کے نیچے اینٹیں لگا کر برابر کر لیا گیا تھا۔ اُن دونوں چارپائیوں سے بنے ہوئے ڈبل بیڈ پر جو بیں گھنٹے بستر بچھا رہتا تھا اور جے پرکاش بابو کا نائٹ سوٹ وہ بلاناغہ سرہانے رکھ دیتی تھی۔

گھر میں خواہ اور کچھ نہ آیا ہو مگر موٹر سائیکل کے آجانے سے ایک عجیب سی خوش حالی لگنے لگی تھی۔

"کچھ دن بعد نئی خرید لینا!"

"اور کیا۔ پہلے اس پُرانی موٹر سائیکل پر اچھی طرح چلانا سیکھ جاؤں گا، اس وقت تک نئی کا نمبر بھی آجائے گا۔"

"ایک روز ذرا ہمیں بھی گھما لاؤ۔ کتنے مہینے ہوگئے ہیں گھر سے باہر نکلے ہوئے۔"

"اب تم اپنے جھنجھٹ سے فارغ ہو تو پھر گھمانے لے جایا کریں گے۔ ذرا کہیں جھٹکا دھکا لگ گیا تو تکلیف میں پڑ جاؤ گی۔"

"یہ جھنجھٹ تم ہی لگا دیتے ہو۔" کھسکو اُدھر" رادھا بڑے پیار سے طعنہ دے کر آہستہ سے ان کے برابر میں لیٹ کر سو جاتی۔

ایک روز جے پرکاش بابو دفتر سے لوٹے تو انہیں دیر ہو گئی تھی اور موٹر سائیکل بھی اُن کے ساتھ نہیں تھی۔ رادھا نے دیکھا تو حیرت میں پڑ گئی۔ اس سے پہلے وہ کچھ پوچھے جے پرکاش بابو نے کہا: "ذرا سا تیل گرم کر دینا۔"

"کیوں؟ کیا ہوا؟"

"وہی سالی موٹر سائیکل سلپ ہو گئی . . . . پرانی تو ہے ہی۔ پرزے چست اور درست نہیں ہیں۔ وہ تو کہو جان بچ گئی، ورنہ دو ایک پسلی ایک ہو جاتی۔"

"موٹر سائیکل کہاں ہے؟"

"مرمت کے لئے ڈال آیا ہوں۔ چین ٹوٹ گئی۔ اگلا پہیہ الگ ہو گیا۔ کم بخت دھری سے ہی اُتر گیا . . . ."

"بڑی خیر ہوئی!" رادھا نے دہشت زدہ انداز میں کہا۔

رات کو جے پرکاش بابو اپنی کمر پر مالش کراتے رہے۔

"درد اس قدر ہو رہا ہے کہ معلوم ہوتا ہے ہڈی ہٹ گئی ہے . . . ."

"تم اس منحوس موٹر سائیکل کو بیچ ڈالو — لینا تو اب نئی لینا۔ پرانی چیز پرانی ہی ہوتی ہے۔"

اور جب مکینک نے مرمت کا خاصا بل بنا دیا تو جے پرکاش بابو نے بارہ سو میں خریدی ہوئی موٹر سائیکل آٹھ سو میں بیچ دی اور روپیہ بینک میں جمع کرا دئے۔

"یہ تم نے اچھا کیا۔" رادھا نے سنا تو بولی "اب اس روپے سے کوئی ضرورت کی چیز خرید لیں گے۔ مادھوری ریڈیو کی رٹ لگائے ہوئے ہے۔ نہ ہو تو . . . ."

"نہیں، نہیں، اس میں سے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرنا ہے آٹھ سو میں اور روپیہ جوڑتے جائیں گے۔ پھر نئی موٹر سائیکل خرید لائیں گے۔"

لیکن چوتھے مہینے ہی جب گھر میں نیا بچہ آیا تو اخراجات یکایک اٹھ کھڑے ہوئے۔ آٹھ سو کی رقم گھٹ کر جب پانچ سو کے قریب آ گئی تو جے پرکاش بابو فوراً بازار جا کر ساڑھے چار سو کا ریڈیو خرید لائے جو پچاس باقی بچے تھے اُن سے کچھ دوسری چھوٹی موٹی ضرورت کی چیزیں خرید لی گئیں۔

رادھا نے پڑوسیوں کے سامنے ایک بار پھر تقریر جھاڑی "کہنے لگے، دن بھر گھر میں جی اُکتا جاتا ہوگا۔ ریڈیو سے اکیلے پن کا احساس دور ہو جاتا ہے . . . . نہیں نہیں، قسطوں پر نہیں۔ نقد لائے ہیں۔ یہ قسط پر سودا کا جھنجھٹ کون پالے بہن جی۔"

دن بھر گھر میں ریڈیو چہکتا رہتا۔ جے پرکاش بابو کو اطمینان ہوتا کہ چلو یہ بھی ایک کام کی چیز آ گئی۔

ثابت گوبھی گھر میں پکی دیکھ کر تو وہ حیران ہی رہ گئے۔ اتنے میں رادھا نے گوبھی کی مُنی کو لٹاتے ہوئے فخر سے کہا "کیسی لگی؟"

"بہت بڑھیا۔ ترکیب کہاں سے سیکھی؟"

"ریڈیو پر کھانا پکانے کا پروگرام آتا ہے۔ اسی سے سیکھ کر بنائی ہے۔"

"بہت مزہ دار بنی ہے۔"

"ریڈیو پر سنگیت کی تعلیم کا پروگرام بھی آتا ہے۔ گھر میں ہارمونیم ہو تو مادھوری سیکھ لے۔ اگلے مہینے سے ہارمونیم سکھانے کا سبق شروع کر رہے ہیں ریڈیو والے۔ مادھوری کا بڑا دل چاہتا ہے سیکھنے کو۔" رادھا نے آہستہ سے کہا۔

"پیسے کہاں ہیں؟" جے پرکاش بابو نے سیدھا سا جواب دیا "ایک پیسہ نہیں بچتا۔"

"یہی دن ہیں اُس کے سیکھنے کے . . . . کل پرائے گھر چلی جائے گی۔"

"دیکھو . . ." جے پرکاش بابو نے کہا اور انہیں یکایک ایسا لگا کہ اوپر اٹھتا ہوا گھر اچانک کہیں پر اٹک گیا ہے۔ رادھا کے ناخنوں پر پالش ہے — چارپائیاں بھی ڈبل بیڈ بنی ہوئی ہیں۔ بچے بھی دوسرے کمرے میں سوتے ہیں۔ نائٹ ڈریس بھی ابھی ایک دو بار چل جائے گا۔ مگر کہیں کچھ ہے جو رک گیا ہے اور وہ پورے گھر کی خوش حالی کو قید کئے ہوئے ہے۔ زیادہ افسوس انہیں نہیں ہوا، مگر دل میں بُرا ضرور لگتا رہا۔

"دیکھ رہے ہو کتنے بال ٹوٹنے لگے ہیں!" اپنے بال سنوارتے ہوئے رادھا نے انہیں دکھایا تھا۔ "اتنی سی چوٹی رہ گئی!" اُس نے سینے پر بال لا کر اپنے انداز سے ناپتے ہوئے کہا تھا۔

"گھنے بھی اتنے نہیں رہے ہیں" جے پرکاش بابو نے اُس کی بات کی تائید میں کہا "یہ یکایک کیوں جھڑنے لگے؟"

"جب سے منی ہوئی ہے، تیزی سے جھڑنے لگے ہیں گانٹھ بھر جوڑا رہ گیا ہے!" اُس نے بال لپیٹ کر چھوٹا سا جوڑا بنا لیا تھا۔

ایک روز بچوں کی ہڑ دنگ میں ریڈیو دھڑام سے نیچے آ گرا۔ کیبنٹ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ نالیں کی ڈنڈیاں بری طرح اندر دھنس گئیں۔ مرمت کرنے والے نے نوّے روپے مرمت کی لاگت بتائی تو جے پرکاش بابو پریشان ہو گئے۔ تنخواہ میں سے نوّے روپے کاٹ کر نکال دینا ممکن نہیں تھا۔ آخر سوچ بچار کر کے وہ ڈھائی سو روپے میں ریڈیو

آئے اور یہ رقم پھر بینک میں جمع کر دی گئی۔

"اس میں سے اب ایک پیسہ نہیں نکالا جائے گا۔ ڈیڑھ سو مزید جوڑ کر نیا ریڈیو ہی آئے گا" انہوں نے اعلان کر دیا۔

بچے بھی خوش ہو گئے کہ یہ فیصلہ صحیح ہے۔

جے پرکاش بابو کو یہ اطمینان تھا کہ گھر کی حالت میں کوئی خاص فرق نہیں آیا تھا۔ رادھا کے پیر کے ناخنوں پر اب بھی پالش چمکتی ہے۔ بچے دوسرے کمرہ میں سوتے ہیں۔ نائٹ ڈریس ضرور پھٹ گئی ہے، لیکن چارپائیاں اب بھی ڈبل بیڈ بنی ہوئی ہیں۔ صرف یہ ہوا کہ گھر اپنی جگہ پر رکا ہوا ہے۔ رہن سہن جیسے ٹھہر کر رہ گیا ہے۔

"پھر مصیبت میں ڈال دیا نا!" رادھا نے جب ایک دن کہا تو جے پرکاش بابو حیران سے سنتے رہ گئے۔ انہیں خاموش دیکھ کر اس نے پھر طعنہ دیا "کہتی تھی کہ انتظام کر لو۔ لیکن نہیں — اب بھگتنا . . ." اس کی آنکھوں میں ہلکی شوخی اور مسکراہٹ تھی۔

"یہ تو تمہیں خیال رکھنا چاہئے . . ."

"یہ خوب رہی!"

"بڑی مشکل ہو جائے گی" جے پرکاش بابو نے کہا۔

"پڑوس والی بہن جی کو بھی ضرورت پڑ گئی تھی۔ خطرہ بھی کوئی نہیں۔ اسّی روپے میں ایک عیسائی نرس ہے، وہ کام کر دیتی ہے . . ."

"دکھا دو" جے پرکاش بابو نے بہت آسانی سے کہا اور خاموشی سے بیٹھ گئے۔

اگلے ہفتے ہی انہیں بینک سے سو روپے نکالنے پڑے اور سب ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔

بچے ہوئے روپیوں میں سے ایک سو بیس کا جب ہارمونیم لاکر انہوں نے مادھوری کے سامنے رکھ دیا تو رادھا بہت خوش ہوئی "چلو، پیسہ ضرورت کی چیز میں لگ گیا۔ مادھوری کا بڑا دل چاہتا تھا" جے پرکاش بابو کو بھی خوشی ہوئی۔ بچے ہوئے تیس روپیوں کی وہ چھوٹی موٹی ضرورت کی چیزیں خرید لائے۔

وہ ہارمونیم بہت دن بجتا رہا لیکن جب مادھوری کا شوق پورا ہو گیا تو اسے لپیٹ کر میز کے نیچے رکھ دیا گیا۔

کئی ہفتے بعد جب ایک روز مادھوری نے پھر ریاض کرنا چاہا تو دیکھا کہ ہارمونیم کا پردہ چوہوں نے کاٹ ڈالا ہے لکڑی بھی وہ جگہ جگہ سے کتر گئے تھے —— "مادھوری کے لئے کچھ سوچا —؟" ایک روز رادھا نے کہا تو جے پرکاش بابو نے تھوڑی فکر سے اسے دیکھا

"دیکھا تو ہے ایک آدھ جگہ" انہوں نے کہا۔

"میں آج دوپہر ادھر بازار گئی تھی تو بوا جی ملی تھیں۔ ایک لڑکا بتایا ہے انہوں نے!" رادھا بولی۔

"اچھا دیکھ لیں گے"

"اور سنو۔ یہ ہارمونیم بیچ ڈالو۔ مادھوری بجاتی تو ہے نہیں۔ بس۔ پڑا ہے۔ ماسٹر کے بغیر باجا بجانا سیکھے بھی تو کس طرح۔ کیوں؟"

"کتنے روپے مل جائیں گے؟ پڑا رہنے دو" انہوں نے کہا۔

"کیا فائدہ؟"

"اچھا"

اور تیسرے چوتھے دن جے پرکاش بابو ہارمونیم لے کر گئے اور ستّر روپے لے کر لوٹ آئے۔ روپے لاکر انہوں نے رامائن میں رکھ دئے اور بولے "اس میں سے کچھ خرچ نہ کرنا۔ سمجھیں؟ ضرورت کے لئے پڑے رہیں گے"

"ہاں چھوٹی موٹی ضرورتیں آ ہی جاتی ہیں"

رادھا نے کہا "چار پیسے پاس ہوں تو اچھا ہی ہے"

انہوں نے غور سے رادھا کو دیکھا۔ اس کے پیر کے ناخنوں پر پالش چمک رہی ہے — بچے دوسرے کمرے میں ہی سوتے ہیں۔ نائٹ ڈریس کے ٹکڑے گھر میں صفائی کے کام آ رہے ہیں۔ چارپائیاں ویسے ہی ڈبل بیڈ بنی ہوئی ہیں۔

"کل میں کچھ اون خرید لاؤں؟" کئی دن بعد رادھا نے کہا۔

"اس رقم میں سے لے لوں۔ یہ بھی تو ضروری ہی ہے۔ منّا کے پاس سوئٹر کہاں ہے!" اپنے بالوں میں تیل لگاتے ہوئے رادھا نے پھر افسوس سے اپنی چوٹی کو دیکھا اور خاموش ہو گئی۔

"تمہارے بال واقعی بہت گر گئے ہیں۔" جے پرکاش بابو نے بڑے خلوص سے کہا۔

"شادی کے وقت گھر بھر میں سب سے لمبے بال تھے ہمارے" رادھا بولی۔

"وقت کس تیزی سے گزر جاتا ہے!" جے پرکاش بابو نے حسرت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہارے بال بھی تو بہت سفید ہو گئے ہیں" رادھا بولی۔

"عمر کا تقاضا ہے"

"اتنی عمر ابھی کہاں سے ہو گئی ہے۔ تم سے زیادہ عمر والوں کے سیاہ بھنورا بال ہیں"

"تمہیں آملے کے تیل سے کچھ فائدہ ہوا؟" جے پرکاش بابو نے پوچھا۔

"کچھ بھی تو نہیں ہوا" رادھا کی آواز میں ہلکی سی مایوسی تھی۔

"اور کوئی تیل استعمال کر دیکھو . . ."

"کچھ نہیں ہوگا — تیئیس نمبر والی ہے نا، گپتا جی کے گھر میں؟ وہ سب کچھ استعمال کر کے دیکھ چکی ہیں . . ."

"اُن کے بال تو بہت لچھے ہیں . . ."
"نقلی لگالی ہیں"
"اُون خریدنے جانا تو تم بھی لیتے آنا"
"میں نہیں لاتی - مُردہ عورتوں کے ہوں کون جانے"

"ارے نہیں بھائی، نائیلون کے بھی ہوتے ہیں - اس میں کیا بات ہے ــــ سمجھیں، لیتی آنا ــ تمہارے جوڑا اچھا لگتا ہے . . . بال یا دانت خراب ہو جائیں تو آدمی کتنا بوڑھا لگنے لگتا ہے"

اور دوسرے ہی روز رادھا جاکر تین بچوں کے لیے پینتالیس روپے کا اُون خرید لائی - گھر لوٹی تو جے پرکاش بابو چارپائی پر بیٹھے چائے پی رہے تھے -

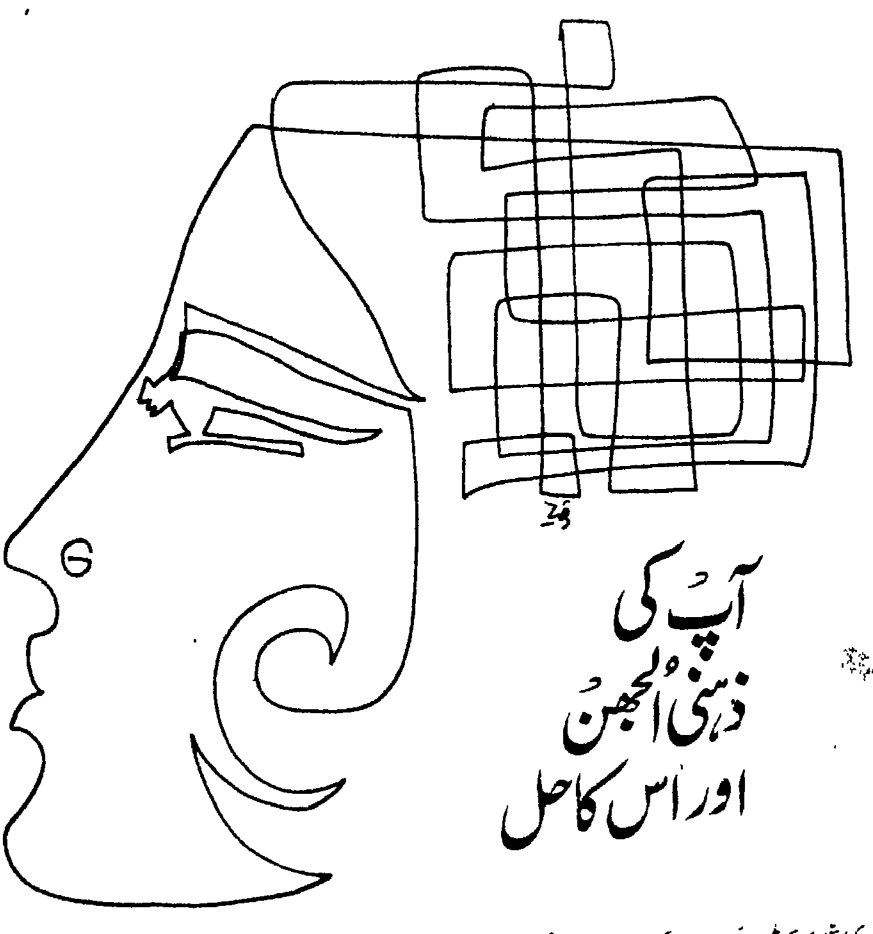
"ٹھیک ہے!" اُون دکھاتے ہوئے رادھا نے پوچھا -

"اچھے رنگ ہیں" جے پرکاش بابو بولے
"ارے! یہ تو ہم نے دیکھا ہی نہیں تھا"
"اچھا لگتا ہے؟" رادھا نے اپنے بھرے بھرے جوڑے میں پنوں کو دباتے ہوئے کہا -
"تم بالکل بدل گئیں" اُن کی آنکھوں میں پیار کی مدھم سی دمک اٹھی تھی -

"سولہ روپے بچ گئے تھے - اُن میں سے ایک یہ لیتی آئی ہوں" یہ کہتے ہوئے رادھا نے ایک پیکٹ جے پرکاش بابو کے ہاتھ میں پکڑا دیا "سوچا کہ کوئی ضرورت کی ہی چیز لیتی چلوں، ورنہ یہ سولہ بھی یوں ہی اُڑ جاتے"

"یہ کیا ہے؟"
"دیکھ لینا"
"ارے، یہ تم ناحق لیتی آئیں" ڈبا کھول کر شیشی دیکھتے ہوئے جے پرکاش بابو بولے "اس سے کہیں پوری طرح بال کالے ہوتے ہیں؟"
"بار بار لگانے سے ہو جاتے ہیں . . ."
رادھا بولی "لاؤ، رکھ آؤں - کل چھٹی ہے - لگا لینا"
"سب خرچ کر آئیں؟"
"سات روپے بچے ہیں - پانچ، سات دن تو نکل جائیں گے - مہینہ بھی پار آلگا ہے - اور اب فی الحال کوئی ایسی خاص ضرورت بھی نہیں ہے چل جائے گا" یہ کہتے ہوئے رادھا اُون اور خضاب کی شیشی سنبھالے اندر چلی گئی

جے پرکاش بابو اُسے غور سے دیکھتے رہے ناخنوں پر پالش ہے - کمرہ میں چارپائیاں بھی ڈبل بیڈ بنی ہوئی ہیں - بچے دوسرے کمرے میں سوتے ہیں گھر بھی جُوں کا توں ہے - پھر اُنہیں یکایک کچھ خیال آیا اور وہ وہیں سے بولے "سنتی ہو؟ اسے تصویر کے پیچھے رکھ دینا"



آپ کی ذہنی اُلجھن اور اس کا حل

س : میری شادی کو ڈھائی سال ہو چکے ہیں۔ میرے خاوند ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں لیکن شکل و صورت اور تعلیمی اعتبار سے میں ان سے بہتر ہوں۔ وہ مجھ سے محبت کا اظہار تو کرتے ہیں لیکن مجھے اس میں سچائی نظر نہیں آتی۔ وہ مجھ پر پیسہ خرچ کرتے ہیں۔ میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہیں۔ کبھی کبھار میرے مزاج کی تعریف بھی کرتے ہیں۔ لیکن انہوں نے کبھی میری خوب صورتی کی تعریف نہیں کی۔ مجھے ان کی ایک بات سے بہت تکلیف پہنچتی ہے وہ یہ ہے کہ میں ان کی خوشنودی کی خاطر ہر کام کو بہتر سے بہتر طریقے سے کرتی ہوں۔ لیکن وہ اس میں نقص نکالتے ہیں اور اُسے خود از سرِ نو کرتے ہیں۔ میں ضرورت سے زیادہ حساس ہوں۔ اُن کا یہ رویّہ مجھے آٹھ آٹھ آنسو رُلاتا ہے۔ اُمید ہے کہ آپ اس معاملے میں میری مدد کریں گے۔

ج آپ خود اپنے کہنے کے مطابق خوب صورت ہیں اور تعلیم یافتہ ہیں۔ آپ کے خاوند خوش نصیب ہیں کہ انہیں ایک خوب صورت اعلیٰ تعلیم یافتہ بیوی ملی۔ یہ جان کر بھی خوشی ہوئی کہ آپ اپنی شخصیت اور تعلیم کے اعتبار سے اپنے خاوند سے دو قدم آگے ہیں۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ کی شخصیت اور تربیت آپ کے خاوند کے لئے سرمایہ ثابت ہوگی۔

آپ نے لکھا ہے کہ آپ کے خاوند ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ عام طور پر ایک انسان کو خوب صورت اور تعلیم یافتہ بیوی پا کر خوش ہونا چاہئے۔ وہ اس کا گھر رشکِ چمن بنا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ لوگ اس کے خاوند کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس طرح سوسائٹی میں بھی اُسے ایک اہم مقام حاصل ہو جاتا ہے، مگر آپ کے بیان سے

ڈاکٹر بھاٹیہ ایک مشہور ماہرِ نفسیات ہیں۔ وہ بانو پڑھنے والوں کے سوالات کا جواب دیں گے اور ان کے نفسیاتی مسئلوں کا تجزیہ اور حل پیش کریں گے۔ پتہ : معرفت ماہ نامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

معلوم ہوتا ہے کہ خاوند کی طرف سے اظہارِ محبت کے باوجود آپ خوش نہیں ہیں ۔ بعض اوقات ایک خوب صورت بیوی خاوند کے لئے مسئلہ بھی بن جاتی ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب آپ دونوں محفلوں یا پارٹیوں میں شریک ہوتے ہیں تو ہر شخص آپ کے حُسن اور ذہانت کی تعریف کرتا ہے ۔ اس طرح آپ سوسائٹی کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہیں ۔ ایک خوب صورت بیوی جو لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جائے خاوند کے لئے دردِ سر بن جاتی ہے ۔ بظاہر انہیں آپ سے کوئی شکایت نہیں ۔ لیکن وہ اندر ہی اندر محسوس کرتے ہیں کہ آپ دوسروں کی توجہ کا مرکز بن گئی ہیں ۔ اس بات سے اُن کے دل میں کم تری کا احساس پیدا ہوتا ہے وہ اس احساس کو تسلیم نہیں کرتے ، لیکن لاشعوری طور پر یہ ان کے دل میں موجود ہے ۔ وہ آپ سے جھگڑا بھی نہیں کر سکتے ۔ کیوں کہ اُن کو آپ کے حُسن کی طاقت کا احساس ہے ۔ حُسن آپ کو ایک اندرونی طاقت عطا کرتا ہے ۔ وہ اس طاقت سے نہیں لڑ سکتے ، لیکن آپ کے کام میں نقص نکال کر اپنے دل کی چوٹ پر مرہم ضرور رکھ سکتے ہیں ۔ اس طرح ان کی کمی پوری ہو جاتی ہے ۔ آپ ان سے بہتر ہیں ، لیکن وہ آپ کو نیچا دکھا کر اپنے برابر لے آتے ہیں ۔ اس طرح وہ آپ کو بھی احساس دلاتے ہیں کہ آپ ان سے اُونچی نہیں ہیں ۔ مختصر یہ ہے کہ ان میں حسد کا مادّہ ہے ۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب انسان اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلے میں کم تر سمجھتا ہے تو اس بات سے اس کی ازدواجی زندگی پر بھی اثر پڑتا ہے ۔ وہ اس معاملے میں بھی اپنے آپ کو دوسروں سے کم تر اور نااہل سمجھتا ہے ۔ اس طرح اس کی ازدواجی زندگی پر بُرا اثر پڑتا ہے ۔

ازدواجی زندگی کی خوشیاں ایک فریق پر منحصر نہیں ہوتیں ۔ یہ مسئلہ آپ کی وجہ سے بھی اُلجھ سکتا ہے ۔ ہر عورت لاشعوری طور پر اپنی خوب صورتی اور کشش کو سمجھتی ہے اور اس کی قیمت جانتی ہے ۔ وہ ان اندرونی محسوسات کے تحت لاشعور میں اپنے خاوند کا دوسروں سے مقابلہ کرتی ہے ۔ دماغ کے کسی گوشے میں یہ خیالات پرورش پاتے رہتے ہیں ۔ اس مقابلے کی وجہ سے آپ کے پیار میں کمی آجاتی ہے ۔ خاوند اس کمی کو محسوس کر لیتا ہے ۔ وہ اس کمی کی تلافی اس طرح کرتا ہے کہ آپ کے کام میں نقص نکالتا ہے ۔ اگر آپ کے پیار میں کمی نہ ہو تو اس کی ضرورت نہیں رہتی ۔ بہتر یہ ہے کہ آپ اس بصیرت کی روشنی میں اپنا رویّہ بدلیں ۔ اور انہیں یہ احساس نہ ہونے دیں کہ آپ ان سے اُونچی ہیں ۔ ان کا رویّہ خود بخود بدل جائے گا ۔

س : مجھے بچپن سے ماں باپ کا پیار نہیں ملا ۔ مجھے گھر میں چُپ رہنے کی عادت ہو گئی ہے ۔ میرے منگیتر جب گھر آتے ہیں تو میں اُن سے بہت سی باتیں کرتی ہوں ۔ میں چاہتی ہوں کہ جو کچھ میں کہوں وہ اُسے وقتی طور پر ہی مان لیں ۔ لیکن وہ بھی ذرا ضدی ہیں ۔ اُن میں احساسِ برتری کا مادّہ زیادہ ہے ۔ میں کچھ کہوں تو کہہ دیتے ہیں کہ " مجھے معلوم ہے ۔ مجھے نہ سمجھاؤ ۔ اس طرح میرا احساسِ کم تری بڑھ جاتا ہے ۔ اور مجھے غصّہ میں ان سے لڑنے لگتی ہوں ۔ ہم دونوں میں پیار ہوتے ہوئے بھی کھنچاؤ پیدا ہو جاتا ہے ۔ کوئی حل بتائیے ۔

ج : قطعیت کے ساتھ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ آپ کے منگیتر میں احساسِ برتری زیادہ ہے ۔ لیکن میں آپ کو اپنے احساسِ کم تری کا وجہ سمجھا سکتا ہوں ۔ آپ کو بچپن میں ماں باپ کا پیار نہیں ملا ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے والدین نے آپ کے جذبات کو باہر نکلنے کا موقع نہیں دیا اور وہ اندر ہی اندر گھُٹ کر رہ گئے ۔ یہ کم تری کا احساس ان ہی کی دین ہے ۔ سوال یہ نہیں کہ آپ اپنے منگیتر سے زیادہ سمجھدار ہیں یا نہیں ، سوال یہ ہے کہ آپ میں احساسِ کم تری کیوں زیادہ ہے ۔ آپ کے بُرا ماننے کی وجہ یہی احساس ہے ۔ بچپن میں آپ کی بات کو اہمیت نہیں دی گئی ۔ آپ کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ آپ کی بات کا کوئی وزن نہیں ۔ آج بھی یہ ڈرامہ دُہرایا جا رہا ہے ۔ صرف کردار بدل گئے ہیں ۔ آج آپ کا واسطہ اپنے والدین کی بجائے اپنے منگیتر سے ہے ۔ آپ کے منگیتر آپ کی زندگی کے ساتھی بننے والے ہیں ۔ قدرتی طور پر آپ کی خواہش ہوتی ہے کہ آپ ان سے دل کھول کر باتیں کریں ۔ وہ آپ کی باتوں میں دلچسپی لیں ۔ تسلیم کریں ۔ لیکن معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے ۔ وہ آپ کی بات کو ٹال دیتے ہیں ۔ آپ یہ سمجھتی ہیں کہ آپ غلطی پر ہیں ، لیکن ایسا نہیں ہے ۔ دراصل ان بیچارے کو آپ کی اندرونی حالت کا علم نہیں ۔ وہ آپ کے احساسِ کم تری سے بے خبر ہیں ۔ انہیں معلوم نہیں کہ ان کا رویّہ آپ کے پرانے زخم کو کُرید تا ہے ۔ جس طرح آپ کے والدین آپ کو سمجھاتے تھے ۔ اس طرح آپ کے منگیتر بھی آپ کو سمجھاتے ہیں ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بچپن کا احساسِ کم تری تازہ ہو جاتا ہے اور آپ پریشان ہو جاتی ہیں ۔ آپ کے مسئلے کا حل یہ ہے کہ آپ جب اپنے منگیتر سے بات کریں تو یہ سوچ کر کریں کہ میں اپنے منگیتر سے نہیں بلکہ اپنے والدین سے دل کی بات

[illegible]

بہ بات ... [illegible] ... حقیقت یہ ہے
اصل مسئلہ ... والدین ... [illegible]
برداشت ... [illegible] ... آپ ... منگیتر سے زیادہ والدین کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ایک دفعہ یہ بات آپ کی سمجھ میں آجائے تو آپ اپنے منگیتر سے بات چیت میں فراخ دلی سے کام لیں گی۔ ان کی بات کا بُرا نہیں مانیں گی اور آپ کی گفتگو میں خود بخود نرمی آجائے گی۔

اگر آپ اپنے منگیتر کی بات تسلیم کر لیں تو یہ بات بھی آپ کے حق میں خوش گوار ثابت ہوگی۔ آپ ان کی ہر بات کو حتی الامکان حتی المقدور اُسے تسلیم کر لیں، ان کی قابلیت کو سراہیں، ان کی تعریف کریں، ان کی خوش گوار بات کا لطف اٹھائیں اور اچھی بات کو دل کھول کر تعریف کریں۔ آپ کے اس رویے سے ان کے طرزِ گفتگو میں نرمی آجائے گی۔ آپ ان سے جیسا سلوک کریں گی، ویسا ہی سلوک وہ آپ سے کریں گے۔ یہ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے۔ آپ جو کچھ انہیں [illegible] ... ہوگی۔

[illegible] ... حیثیت کے مطابق ... [illegible] ... کرتے ہیں ... [illegible] ... محبت ... [illegible]

[illegible] ... کے لئے ... [illegible] ... کریں ... [illegible]
... ساتھ ... [illegible]

● یہ جان کر خوشی ہوتی ہے کہ اگر آپ کے ازدواجی تعلقات خوشگوار نہیں۔ اگر آپ دوسروں کے ازدواجی تعلقات پر نظر ڈالیں گی تو آپ کو اپنے میں ہی تسلی ہو جائے گی اور آپ کو اپنی حالت غنیمت معلوم ہوگی۔

بعض لوگ اپنی بیویوں کو جماعی خوشی ہی دے سکتے ہیں۔ دراصل اس کی وجہ ان کی بے نیازی نہیں ہوتی، بلکہ احساسِ گناہ ہوتا ہے۔ والدین بچوں کو جنسی معلومات سے محروم رکھتے ہیں۔ ان باتوں پر خاموشی کا پردہ رہتا ہے۔ بچہ اس ماحول میں پرورش پاتا ہے تو اس کے لاشعور میں یہ باتیں بُرائی کے روپ میں جاگزیں رہتی ہیں۔ شادی کے بعد یہ باتیں یکایک جائز ہو جاتی ہیں، لیکن ذہنی کشمکش جاری رہتی ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ انسان جس بات کو رات میں روا رکھتا ہے، دن میں اس سے دور بھاگتا ہے۔ بات کو گناہ کرتا ہے دل میں اس سے توبہ کرتا ہے۔ عموماً ایسے خاندان انسانوں میں ... [illegible] ... کی عادت ہوتی ہے۔

بعض لوگ ... [illegible] ... پسند نہیں کرتے: اس ... [illegible] ... [illegible]

[illegible]
... ہے ...
[illegible]

انسان ... [illegible]
محبت دو طرفہ ہوتی ہے۔ اگر ... [illegible] نہ ملے تو انسان بیزار ہو جاتا ہے ... [illegible] کی طرح اپنے فرائض ... [illegible] ازدواجی زندگی کو ... [illegible] ہے۔ اسی طرح ... [illegible] پیدا ہو جاتی ہے ... [illegible] ہے۔ ایک سماجی مسئلہ ... [illegible] کے خاندان کے والدین ... [illegible] نہیں جاتے تھے ... [illegible] عادی ہوں۔ ان کو ایک ... [illegible] میں ... محسوس ہوتی ہو۔

اگر آپ ... [illegible]
[illegible]

میں کھیلی ہوئی ہوتی ہیں ۔ دوسرے انسان کی بات جانے دیجئے خود اسے اپنی اندرونی حالت کا علم نہیں ہوتا ۔ آپ اپنے ازدواجی تعلقات پر نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ کہیں کوئی کمی تو نہیں ۔ اگر کوئی کمی دکھائی دے تو آپ دونوں ٹھنڈے دل سے پُرسکون ماحول میں اس کا حل نکالیں ۔ یاد رکھیں کہ بحث کے دوران تیز کلامی یا جھگڑا نہ ہو ، ورنہ بحث کا مقصد فوت ہو جائے گا ۔

س : میری سب سے بڑی ذہنی الجھن میرے شوہر کی نیند ——— وہ دیر سے سو کر اٹھتے ہیں اور پھر فوراً آفس چلے جاتے ہیں ۔ آفس سے آتے ہیں تو اخبار پڑھنے میں مشغول ہو جاتے ہیں ۔ میرے اور میرے بچے کے لئے ان کے پاس کوئی وقت نہیں ہے ۔ ہماری شادی کو ڈیڑھ سال ہوا ہے ۔ ہم لوگ اکیلے رہتے ہیں ، اس لئے میں دن بھر بور ہوتی ہوں ۔ وہ میری بیماری کے دوران بھی بے پرواہ رہتے ہیں ۔ میری غلطیاں اور کمزوریاں نکال کر خوش ہوتے ہیں ۔ میری بات کبھی نہیں مانتے بتائیے میں کیا کروں ؟

ج آپ کے سوال کے جواب کا بہت بڑا حصہ اوپر لکھے ہوئے جوابوں میں مل جائے گا ۔ انہیں غور سے پڑھیں اور دیکھیں کہ یہ باتیں آپ پر کتنی چسپاں ہوتی ہیں ۔

آپ کے لئے مردوں کی نفسیات جاننا ضروری ہے ۔ یاد رکھئے کہ مرد اکثر تمام عمر ہی مرد ہوتا ہے بچپن میں وہ ماں کی محبت کا محتاج ہوتا ہے اور بڑا ہو کر بیوی کی محبت کا ۔ بیوی کی محبت میں ماں کی محبت کو تلاش کرتا ہے ۔ اس کے ذہن میں ماں اور بیوی دونوں گڈمڈ ہو جاتے ہیں ۔ وہ اکثر بیوی کے سامنے بھی بچہ بن جاتا ہے ۔

عورت اور مرد کے تعلقات کی ابتدا ازدواجی رشتوں سے شروع ہوتی ہے ۔ ان میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے ۔ یہ تعلقات دراصل ایک تھرمامیٹر کا کام دیتے ہیں ۔ اگر اس تعلق میں گرم جوشی ہو تو میاں بیوی کی زندگی سکھ چین سے گزرتی ہے ۔ اگر یہ تعلقات سرد پڑ جائیں تو زندگی میں دراڑ پڑ جاتی ہے ۔ عورت ان تعلقات میں بہت اہم رول ادا کرتی ہے ۔ اگر وہ اپنے شوہر سے ناراض ہے تو اس سے بے نیازی برتتی ہے ۔ کبھی اس کی حرکتوں سے چڑ کر پیچھے ہٹ جاتی ہے ، کبھی مرد کی کاہلی دیکھ کر اس سے بدلہ لیتی ہے ۔ آپ کے لئے ضروری ہے کہ آپ خود آگے بڑھیں ۔ روایتی جھجک سے کام نہ لیں ۔ آپ کے مسئلے کی بنیاد یہی تعلق ہے ، اسے سنوار لیں تو آپ اپنی خاوند کی توجہ کا مرکز بن جائیں گی ۔

س : میں تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ایک الجھن میں مبتلا ہوں ۔ میری عمر اس وقت ۲۹ سال ہے ۔ ابھی تک میری شادی نہیں ہوئی ۔ میرے والد نہیں ہیں اور بھائیوں کو اس بات کی کوئی فکر نہیں ۔ جب کوئی رشتے کی بات آتی ہے تو گھر والے اس پر توجہ نہیں دیتے ۔ میں اپنی سہیلیوں میں اکیلی کنواری ہوں ۔ وہ سب میرا مذاق اڑاتی ہیں ۔ اس بات سے میں ہر وقت پریشان رہتی ہوں ۔ میرا دل کسی کام میں نہیں لگتا ۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں مجھ سے کوئی غلط قدم نہ اٹھ جائے یا میں گھبرا کر خودکشی نہ کر لوں ۔ میں پرانے خیال کی لڑکی ہوں ۔ اپنے شادی کی بات کسی سے کہہ بھی نہیں سکتی میری صحت پر بُرا اثر پڑ رہا ہے ۔ شادی نہ ہونے کی وجہ سے میں احساسِ کمتری میں مبتلا ہوں ۔ میری مشکل کا کوئی حل بتلائیے ؟

ج اس مسئلے کا حل آپ کے گھر والوں پر منحصر ہے ۔ یہ ذہنی مسئلہ نہیں بلکہ ایک سماجی مسئلہ ہے ۔ آپ کے والد نہیں ہیں ۔ بھائی آپ کی شادی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے ہیں ، اس لئے آپ سے ناراض ہیں ۔ میرے خیال میں وہ آپ کی شادی کے لئے فکرمند ہیں ۔ لیکن ہمارے سماج میں شادی ایک سماجی اور معاشی مسئلہ ہے ۔ باپ قدرتی طور پر بیٹی کی شادی کے لئے بھائی سے زیادہ فکرمند ہوتا ہے ۔ ممکن ہے کہ آپ کے بھائی آپ کی شادی کے خرچ کی وجہ سے جی چراتے ہوں ۔ اگر وہ خود شادی شدہ ہیں تو اس بات کا امکان زیادہ ہو جاتا ہے ۔

آپ جھجک سے کام نہ لیں ۔ یہ بیسویں صدی ہے ۔ اُنیسویں کی پیروی کرنے سے کام نہیں چلے گا ۔ اگر آپ شرم و حیا اور تکلف میں مبتلا رہیں گی تو آپ کا مسئلہ حل نہیں ہوگا ۔ آپ اپنے بھائی بھاوج سے براہِ راست شادی کی بات کرتے ہوئے جھجکتی ہیں تو ان سے پوچھئے کہ آخر میں کیا کروں ۔ شادی کا ذکر زبان پر نہ لائیے ۔ صرف اپنے مستقبل کے متعلق سوال کیجئے ۔ یہ بات غصے میں نہ کیجئے ۔ ان سے بار بار یہی سوال دہرائیے ۔ اس طرح بات کرنے سے شادی کا معاملہ خود بخود سامنے آ جائے گا ۔ آپ کے شرمیلے پن سے انہیں غلط فہمی ہو سکتی ہے ۔ آپ کی خاموشی ان کو مطمئن کر دیتی ہے ۔ انہیں آپ کے دل کا حال معلوم نہیں ہوتا ۔

آپ نے خودکشی کا ارادہ ظاہر کیا ہے ۔ خودکشی کی خواہش صرف آپ کے اندر دبے ہوئے غصے کا اظہار ہے ۔ اس کے سوا کچھ نہیں ۔ یہ غصہ آپ کہیں اور نکالیں ، لیکن اپنے بھائی بھاوج سے ضرور بات کریں ۔ ایک دفعہ آپ کے مستقبل کا سوال سامنے آ گیا تو وہ اس کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے ۔

عورت

(رُباعیات)

باوا کرشن گوپال مغموم

(پائن بروک، نیوجرسی ریاستہائے متحدہ امریکہ)

تسلیم و رضا، صدق و صفا کی دیوی
ایماں کی جان، شرم و حیا کی دیوی
بے مہر و ریاکار زمانے میں ابھی
عورت ہی تو ہے اِک مہر و وفا کی دیوی

عورت ہی کے دَم سے ہے بہارِ ہستی
عورت ہی تو ہے دراصل نگارِ ہستی
رنگ اِس سے ہے، لُبانی سے ہے، حسن اِس سے ہے
فردوس بداماں ہے دیارِ ہستی

ہستی کا ہے اِک سروِ خراماں عورت
ہستی کا ہے اِک غنچۂ خنداں عورت
جسم اِس کا ہے برگِ گُل تر سے نازک
ہے نازشِ بُستان و بہاراں عورت

عورت ہی سے ہے گرمیٔ بزمِ عالم
ساتھی ہے خوشی کی، تو شریکِ ماتم
جاں بخش کہیں ہے، تو کہیں قاتل بھی
شعلہ ہے کہیں یہ، تو کہیں ہے شبنم

غم پاش فضاؤں میں ہے خنداں عورت
جمعیتِ خاطر کا ہے ساماں عورت
ہمدرد ہے، غمخوار و انیسِ جاں ہے
ہر درد و مصیبت کا ہے درماں عورت

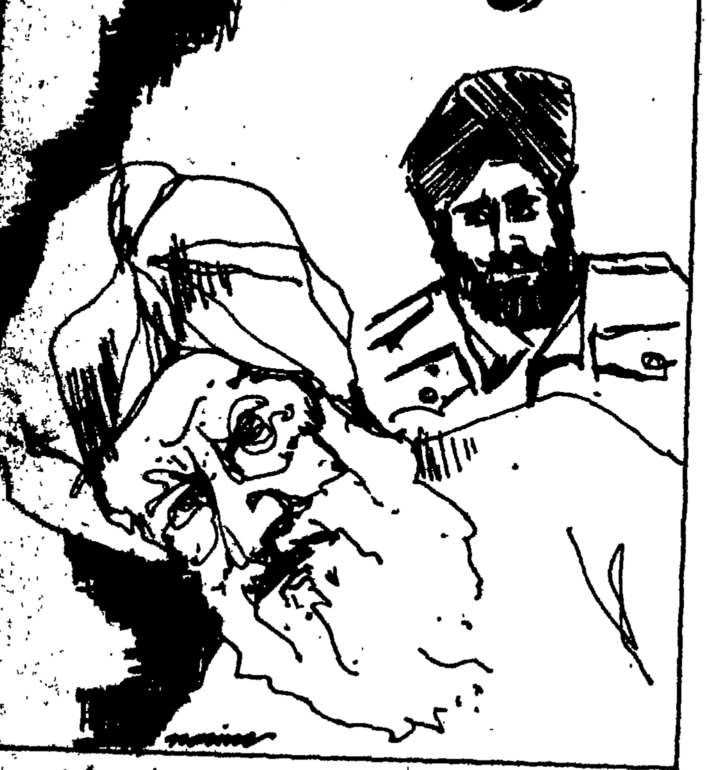




کیاآپ گلے کی تکلیفوں میں اکثر مبتلا رہتے ہیں اوراس کی وجہ سے سخت پریشان ہیں، لیکن یہ
نہ سمجھئے کہ ایسی پریشان کن بیماری سے گلا کاٹ دینے سے ہی چھٹکارہ مِل سکتا ہے۔ ذرا ٹھہرئیے! خالص
دیسی ادویات سے تیار کیا ہوا "ٹونسیلیکس" ایک بار، صرف ایک بار استعمال کرکے تو دیکھئے،
پھر آپ کو گلے کے غدود بڑھ جانے، گلے کی سرسراہٹ، خراش، گلے کے ورم، زخم اور دوسرے تمام امراض
کی شکایت نہیں رہے گی۔ اگر آپ کے علم میں کوئی ایسا مریض ہو جس کے گلے کے غدود (ٹانسلائٹس)
کا آپریشن ہونا ہے تو اسے اِس دوا کے بارے میں ضرور بتائیے گا کیوں کہ پھر اسے آپریشن کی ضرورت نہیں
پڑے گی۔ چھوٹے بچے جو کھٹی میٹھی چیزیں کھا کر گلا خراب کر لیتے ہیں ان کے لئے بھی یہ بہت کام کی دوا
ہے، ہر گھر میں اس کا رہنا بہت ہی ضروری ہے۔
قیمت فی شیشی: ۵ روپے
سُتح (یونانی اینڈ آیورویدک) لیباریٹریز، لال کنواں، دہلی ۶

دھرتی تلے کا بیل

عشرت اسیہ



امرت سر سے تھوڑی ہی دور چھوٹا سا گاؤں واقع تھا۔ اس گاؤں کی حالت بہت اچھی تھی۔ یہ گاؤں پکی سڑک کے کنارے کنارے بسا ہوا تھا۔ پھر مان سنگھ جتنی خوشی سے اس سفر پہ چلا تھا، اس کے سامنے تو لمبی سی لمبی دُوری بھی کم ہی معلوم ہوتی ـــــ اگرچہ اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا اور تانگے کا گھوڑا بھی تھکے تھکے قدم رکھ رہا تھا، مگر پھر بھی مان سنگھ کو کوئی فکر یا پریشانی لاحق نہ تھی۔

مان سنگھ کچھ ہی دن ہوئے اپنی پلٹن سے چھٹی پر آیا تھا اور اب وہ اپنے دوست کرم سنگھ کے گاؤں جا رہا تھا۔ فوج میں لوگوں کی جتنی پکی دوستی ہو جاتی ہے، شاید اور کہیں نہیں ہوتی۔ وہ دونوں ایک ہی بٹالین میں برما کے مورچے پر لگے ہوئے تھے۔ کرم سنگھ پہلے بھرتی ہوا تھا۔ اور اب تک حوالدار بن چکا تھا، جب کہ مان سنگھ ابھی ایک معمولی سپاہی ہی تھا۔ کرم سنگھ کے گاؤں میں کتنے ہی آدمی اس کے باپ سے پوچھتے رہتے تھے کہ وہ اب کب چھٹی پر آئے گا۔ اس کا سارے گاؤں سے میل جول تھا۔ جب وہ گاؤں آتا تو وہ اس سے جنگ اور غیر دیسوں کی کہانیاں سنا کرتے تھے۔ گاؤں کے کچھ اور نوجوان بھی فوج میں تھے لیکن جب وہ گاؤں آتے تھے تو ست سری اکال کے سوا اور کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔ لیکن کرم سنگھ جب گاؤں آتا تھا تو گاؤں کے کنوؤں پر بھی نہانے والوں کی بھیڑ لگ جاتی۔ سردیوں کے دنوں میں بھرا بھوبنے کے بھاڑ پر لوگ جمع ہو جاتے اور اس کی دلچسپ باتیں سنا کرتے تھے۔ کرم سنگھ کی بندوق کا نشانہ بھی پوری رجمنٹ میں مشہور تھا نشانے بازی کے مقابلوں میں اس کی گولی ٹھیک اسی طرح بیچ میں سے ہو کر نکلتی جیسے کسی نے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھا کے وہاں سے نکالا ہو۔ لڑائی میں اس کے پکے نشانے کے باعث ہی دُور چھپے ہوئے اور درختوں پر بیٹھے ہوئے کئی دشمنوں کا کام تمام ہوا تھا۔ کرم سنگھ کی گولی سے دشمن کا بچ نکلنا مشکل تھا۔

لڑائی کے دنوں میں بہت سی باتوں پر پابندی لگی ہوئی تھی۔ مثلاً وردی کے ساتھ، بینڈ باجے کے ساتھ پریڈ روزانہ نہیں ہوتی تھی بازار وغیرہ میں کوئی فوجی سویلین کپڑوں میں نہیں جا سکتا تھا۔ لڑائی بند ہونے کے بعد جب مان سنگھ کو چھٹی ملی تو کرم سنگھ بہت بے چین ہوا۔ اسے اس بات کا افسوس رہا کہ مان سنگھ کے ساتھ اس کی چھٹی بھی منظور کیوں نہیں ہوئی۔ اگر اسے بھی چھٹی مل جاتی تو دونوں ساتھ ساتھ گاؤں جاتے اور شاید دونوں اکٹھے ہی واپس آتے۔ امرت سر سے چھ ہڑ کانہ کوئی سا دُور تھا پچاس میل سے زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ یہ بات عجیب کہ چھ ہڑ کانہ کو "بار" کہتے تھے اور مان سنگھ کے گاؤں کو ماجھ کہتے تھے ـــــ پہلا نہر کے کنارے سے بسا ہوا تھا، اور دوسرے کو بسے ہوئے ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے تھے۔ مگر مان سنگھ کو چھٹی بڑی مشکل سے ملی تھی، کبھی کبھی

ٹھیک اس طرح جیسے لڑائی میں بہادری کے میڈل کبھی کبھی اور کسی کسی کو ہی ملا کرتے ہیں۔ اس لئے کرم سنگھ کو صبر کرنا پڑا۔

جب مان سنگھ گاؤں جانے کے لئے فوجی ٹرک میں بیٹھنے لگا تو کرم سنگھ نے کہا "ہمارے گھر بھی چلے جانا۔ جب گھر والے تمہیں دیکھ لیں گے، تو مجھ سے بھی آدھا ملنا ہو جائے گا اور پھر جب تم واپس آؤ گے اور وہاں کے حالات سناؤ گے تو ان سب سے میرا بھی آدھا ملنا ہو جائے گا" پھر اپنے گاؤں کے بارے میں مان سنگھ کی دلچسپی بڑھانے کے ارادے سے اس نے پوچھا "کبھی گئے ہو وہاں؟"

"نہیں، امرت سر تک ضرور گیا ہوں اس سے آگے نہیں گیا"

"وہاں کئی بڑے بڑے گوردوارے ہیں، سب جگہ ماتھا ٹیکنا، اور میرے گھر ہو آنا میں گھر والوں کو چٹھی لکھ دوں گا"

اور اسی وجہ سے مان سنگھ اب اپنی چھٹیوں کے آخری دنوں میں کرم سنگھ کے گاؤں جا رہا تھا۔

"بابا، میں مان سنگھ ہوں، چوہڑ کانہ والا" اس نے کرم سنگھ کے گھر کے دروازے پر بیٹھے ہوئے بوڑھے آدمی سے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"آؤ، آؤ، بیٹھو بیٹھو۔ بڑے بھاگ ہیں جو ہمارے گھر آئے"

مان سنگھ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کے آنے سے بوڑھا کچھ پریشان سا دکھائی دینے لگا پہلے تو وہ ادھر ادھر دیکھتا رہا، پھر بالکل چپ چاپ ہو کر زمین کی طرف تکنے لگا۔ مان سنگھ کو اپنے استقبال پر بڑی حیرت ہوئی۔ پھر اس نے سوچا، شاید یہ کوئی باہر کا آدمی ہے ــــ کرم سنگھ کا باپ نہیں۔ اس نے پوچھا "کیا آپ کرم سنگھ کے پتا جی ہیں؟"

"ہاں ــــ"

"کیا کرم سنگھ نے میرے بارے میں آپ کو کبھی کچھ بتایا تھا۔ میں....."

"ہاں بیٹا، وہ اکثر تمہارا ذکر کرتا رہتا تھا ــــ تم دونوں کی دوستی بہت پکی ہے نا۔ اس نے خط میں بھی لکھا تھا کہ تم ہمارے گھر آؤ گے...."

اتنا کہہ کر بوڑھا اٹھا اور چل دیا ــــ اس نے ایک بچھڑے کو کھول کر دوسری جگہ باندھا، اسے پچکارا، اور اس سے اپنا ہاتھ چٹوانے لگا۔

اس کے بعد بوڑھا گھر کے اندر گیا۔ اندر شاید چائے بنانے کو کہا۔ اس کے بعد جیسے وہ مان سنگھ کے پاس آنے سے ڈرتا ہو، وہ پھر آنگن میں بندھی ہوئی گھوڑی کے پاس آکر ٹھٹک گیا۔ اس نے گھوڑی کا چارہ پلٹا، اور تھوڑے سے چنے لا کر اس میں ملا دئے اور پھر وہ مان سنگھ کے پاس آیا۔ وہ مان سنگھ پر دھیان دینے سے زیادہ اپنے آپ سے الجھا نظر آ رہا تھا۔ مان سنگھ سے وہ نہ جانے کیوں آنکھیں چرا رہا تھا، اور جہاں تک بنے ادھر ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔

"جسونت سنگھ کہاں ہے؟" مان سنگھ نے کرم سنگھ کے چھوٹے بھائی کے بارے میں پوچھا۔

"ابھی آتا ہے، چری لینے گیا ہے"

اتنے میں کرم سنگھ کی ماں چائے لے کر آگئی۔

"ماتا جی، ست سری اکال" مان سنگھ نے کرم سنگھ کی ماں کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹ کھلے پھر بند ہو گئے، وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکی۔ مان سنگھ نے چائے کا گلاس لے لیا اور وہ جیسے آئی تھی اسی طرح چپ چاپ اندر چلی گئی۔ اس نے اپنے بیٹے کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں پوچھا۔ مان سنگھ کو بڑی حیرت ہوئی ــــ یہ کیسی ماں ہے؟ اُسے غصہ تو بہت آ رہا تھا، مگر وہ خاموش رہا۔ آج کی رات بھی یہاں ٹھہرنا اب اس کو مشکل نظر آ رہا تھا۔

"میں صبح ہوتے ہی یہاں سے چل دوں گا" اس نے سوچا ــــ

رات کو جسونت سنگھ آیا تو اس نے ذرا کھل کر اس سے بات چیت کی ــــ "جنگ کے زمانے میں کرم سنگھ کی گولی بہت مشہور ہے گولی نال میں سے نکلی نہیں کہ دشمن زمین پر گر پڑتا ہے۔ ساتھ رہتے ہوئے بھی ہمیں پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ دشمن کو کیسے دیکھ لیتا تھا۔ مان سنگھ اتنا کہہ کر رک گیا۔ اسے امید تھی کہ جنگ کے بارے میں اب اس سے بہت سی اور باتیں پوچھی جائیں گی۔ اس کے پاس بتانے کے لئے بہت کچھ تھا اور وہ سب کچھ بتا کر دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ مگر کیا کرتا؟ یہاں تو کوئی اس کی باتوں میں دلچسپی لیتا ہی نظر نہیں آ رہا تھا۔

کچھ لمحے سناٹا رہا ــــ پھر بوڑھے آدمی نے کہا۔ "جسونت، بھلا نہر کا پانی کب مل رہا ہے؟"

"پرسوں سویرے تین بجے....."

صبح سویرے کا نام سن کر مان سنگھ کو اپنی بات بڑھانے کا موقع مل گیا "بھئی کرم سنگھ کو اتنی صبح اٹھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اُسے صبح کی نیند بہت پسند ہے، اور وہ ہم

سب کے بعد ہی اٹھتا ہے۔ مان سنگھ اپنے
دوست کے بارے میں کہتے ہوئے نہیں
تھک رہا تھا لیکن اس کی باتوں سے کوئی دلچسپی
نہیں لے رہا تھا ـــــ سب چپ چاپ
بیٹھے تھے ـــــ جیسے کوئی مر گیا ہو!

مان سنگھ نے رات کا کھانا کھایا۔ کھانے
میں کئی چیزیں شاید اس کی وجہ سے ہی پکی تھیں۔
جسونت ایک ہاتھ سے پنکھا بھی جھل رہا تھا۔
اس وقت مان سنگھ کی جھلاہٹ اور غصہ کسی
حد تک دور ہو چکا تھا۔ اس نے سوچا اس کی خاطر
تواضع ٹھیک ہو رہی ہے۔

مان سنگھ کھانا کھا ہی رہا تھا کہ کرم سنگھ کا
چھوٹا بچہ آ پہنچا۔ مان سنگھ نے بڑی محبت کے ساتھ
اسے اپنی گود میں بٹھا لیا، اور پھر کہا "بیٹے اپنے پتا
کے پاس چلے گا؟ چلنا ہے تو میرے ساتھ چل۔"

مان سنگھ کے ان الفاظ کا بوڑھے پر
شدید رد عمل ہوا۔ وہ چلایا "جسونت کی ماں،
بچے کو لے جاؤ۔ یہ مان سنگھ کو ٹھیک طرح کھانا
نہ کھانے دے گا۔"

کرم سنگھ کی ماں آئی اور بچے کو لے گئی۔
مان سنگھ کے حلق میں نوالہ اٹک گیا۔ اس جگہ
اسے اپنا دم گھٹتا ہوا سا محسوس ہو رہا تھا۔
تھوڑی دیر بعد وہ بولا "یہاں سے ترن تارن
[illegible]ہ کتنی دور ہے؟"

"یہی کوئی دو تین میل ـــــ جسونت
تمہارے ساتھ چلا جائے گا اور دکھا دے گا۔"

جب وہ جسونت کے ساتھ گوردوارہ
دیکھنے گیا تو اس نے سوچا تھا کہ کم سے کم جسونت
تو اس سے خوب باتیں کرے گا ـــــ لیکن
راستے میں جسونت بھی گونگے کی طرح چپ چاپ
چلتا رہا۔ وہ کسی بات کا بہت مختصر سا جواب
دیتا اور چپ ہو جاتا۔ ادھر مان سنگھ چاہتا تھا
کہ ان لوگوں سے خوب باتیں کرے، آخر وہ ان
سب سے روز روز کہاں مل سکے گا.......

اس نے کہا "کرم سنگھ تو فوج میں مزے کر رہا
ہے۔ تم کیوں نہیں بھرتی ہو گئے؟"

جسونت سنگھ گھبرا گیا، جیسے چوری کرتے
پکڑا گیا ہو۔ پھر دیر بعد ٹھہر ٹھہر کر اس نے جواب
دیا۔ "ایک بھائی کم ہے کیا فوج میں؟ ـــــ
چری اور ایکھ آپ کے گاؤں میں کیسی ہوئی ہے؟
ہمارے یہاں تو دیکھو خوب ہوئی ہے" جسونت
نے بات بدلنے کی کوشش کی۔۔۔ لیکن مان سنگھ
تو اپنے دوست کے بارے میں باتیں کرنا چاہتا
تھا، کرم سنگھ کے گھر والوں نے اس کی خوب
خاطر تواضع ضرور کی تھی، لیکن پھر بھی وہ مطمئن
نہیں تھا۔ ایک انجانی سی چبھن اور کسک اسے
بے چین کئے ہوئے تھی۔ اس ساری آؤ بھگت
اور خاطر تواضع میں اسے عجیب سا کھوکھلا پن
محسوس ہو رہا تھا۔ نہ جانے کیوں؟

دوسرے دن صبح کو مان سنگھ واپس
جانے کی تیاری کر کے باہر دروازے پر بیٹھا ہوا
تھا کہ سامنے سے ڈاکیہ چلا آیا ـــــ وہ
قریب آ کر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ اس نے
پوچھا "کیا لائے ہو؟"

ڈاکیہ بولا "لانا کیا تھا، کرم سنگھ کے
پنشن کے کاغذات کے علاوہ اور کیا ہو سکتا
ہے؟ رجسٹری ہے۔"

کرم سنگھ کی پنشن؟ کیا مطلب؟ کیا
کرم سنگھ مارا گیا؟ ـــــ مان سنگھ گھبرا کر
کھڑا ہو گیا اور ڈاکیے کو گھورنے لگا۔

"ارے بھائی، اس گاؤں کے بچے بچے
کو پتہ ہے، اور آپ اس کے گھر پر بیٹھے ہوئے
پوچھ رہے ہیں کہ کیا کرم سنگھ مارا گیا؟ اطلاع
آئے ہوئے بھی پندرہ دن ہو گئے ہیں۔"

دو تین بار مان سنگھ کا سانس تیز ہوا،
سر سے ناک تک کے حصے کی عجیب شکل بن
گئی اور پھر آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کرم سنگھ
کے باپ اور بھائی نے ان آنسوؤں کو بہانے
میں مدد کی۔ کرم سنگھ کے باپ نے ڈاکیے کو
دیکھ کر سمجھ لیا تھا کہ تیر کمان سے نکل چکا ہے۔
آخر اس کے دوست کو پتہ چل ہی گیا۔ اب وہ کھل کر
دل ہلکا کرنے میں کوئی مشکل نہیں رہی۔

بہت دیر بعد مان سنگھ نے پوچھا
"آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

"ارے بھیا، چھٹی پر آئے ہو۔ ایسی خبر
سنا کر تمہاری چھٹی کا مزہ خراب کرنے سے فائدہ؟
جب واپس جاتے تو پتہ چل ہی جاتا ـــــ"

مان سنگھ جب اپنے گاؤں واپس چلا تو
اس کے راستے میں وہ گاؤں پڑے جن کے
ماحول اور فضا میں کرم سنگھ کے باپ کی پرورش
ہوئی تھی۔ جگہ جگہ قبریں اور سمادھیاں بنی ہوئی
تھیں، جو دشمن کے خلاف اس گاؤں کے
جوانوں کی بہادری اور شجاعت کی کہانیاں
سنا رہی تھیں۔ مان سنگھ کو بچپن میں سنی ہوئی
ایک کہانی یاد آ گئی کہ اس دھرتی کے نیچے
ایک بیل ہے جو ساری دھرتی کا بوجھ اپنے
سینگوں پر اٹھائے ہوئے ہے۔ مان سنگھ کو
کرم سنگھ کا باپ ـــــ بوڑھا باپ بھی
ایسا ہی معلوم ہوا، جو خود دکھ سے دبا ہوا
ہوتے پر بھی دوسروں کے دکھ کو اپنے اوپر
لینے کے لئے تیار تھا۔

بیگم مہرافروز



کھیل کھیل میں

"ہر وقت کھیل ہر گھڑی اچھل کود پورا وقت کھیل میں برباد کرتا ہے! بچے ازل سے یہ جملے سنتے چلے آئے ہیں اور نہ معلوم کب تک سنتے رہیں گے۔ والدین کا خیال ہے کہ کھیل کود سے بچہ خراب ہو جاتا ہے۔ اس کا وقت برباد ہوتا ہے، اس کے پڑھنے لکھنے میں حرج واقع ہوتا ہے۔

ہم نے ایسے ماں باپ دیکھے ہیں جو بچے کے لباس، خوراک اور تعلیم پر دل کھول کر روپیہ خرچ کرتے ہیں لیکن انہیں بچے کے لئے پانچ روپے کی گیند بھی خریدنا فضول خرچی معلوم ہوتی ہے۔ ایسے ماں باپ بھی ہیں جو قیمتی کھلونے بچے کو تحفہ میں دیں گے لیکن [illegible]

اِن کھلونوں کو خود چلا کر دکھائیں گے، خاص طور پر اپنے مہمانوں کے بچوں کے سامنے۔ مگر اپنے بچوں کو ان کھلونوں کو ہاتھ تک لگانے کی ممانعت کرتے ہوئے دوبارہ الماری میں بند کر دیں گے۔

ہم ایسے ماں باپ کو بھی جانتے ہیں جنہیں اس بات پر فخر ہے، کہ ان کا لڑکا جوان ہو گیا ہے مگر اس کے بچپن کے کھلونے جو انگلینڈ کے زمانے کے ہیں، ابھی تک جوں کے توں رکھے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کا وہی بچہ جوان ہو کر انٹر پاس کرنے کی کئی ناکام کوششیں کر کے کہیں کلرک ہو گیا ہے۔

آپ کھلونے کی اور کھلونے کے تعلق پر جو کچھ سمجھیں، در حقیقت یہ ہے کہ بچے کے کھیل، کھلونے اور شرارتوں پر ہی اس کے مستقبل کا دارومدار ہوتا ہے۔ نفسیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ بچہ پیدائش سے ہی خاص رجحانات کا مالک ہوتا ہے ہر رجحان بچے کے لئے کار آمد ہوتا ہے۔ والدین اور استاد تعلیم اور تربیت سے بچے میں کوئی نئی بات پیدا نہیں کرتے۔ ہم ان ہی پیدائشی رجحانات کی نشوونما کرتے ہیں۔ کھیل بھی بچے کا پیدائشی رجحان ہے۔ یہ اس کے مستقبل کے لئے بہت کار آمد ثابت ہوتا ہے۔

ہربرٹ اسپنسر نے اپنے برسوں کے مطالعہ اور تجربوں کے بعد کہا تھا کہ جس طرح انجن کی فالتو بھاپ نکالنے کے لئے ایک سیفٹی والو ہوتا ہے، بالکل اسی طرح بچے کی فالتو طاقت اور [illegible]

منفی جذبات کھیل کے دوران ختم ہو جاتے ہیں۔ اگر اس طرح انکاس نہ ہو تو آئندہ یہ طاقت ور اور نقصان دہ جذبات اسے مستقبل میں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ بچے کو جتنا کھیل کھیلنے کا موقع ملتا ہے، اتنا ہی اس کی بے راہ روی کم ہو جاتی ہے۔

کھیل کا میدان ہی وہ جگہ ہے جہاں بچہ اپنی انا کی تسکین بڑی آسانی سے کر سکتا ہے۔ ہر بچے میں غصہ، نفرت اور غرور پیدائشی جذبے ہوتے ہیں۔ یہی وہ جذبات ہیں جو نہ نکلنے کی صورت میں انسان کو تباہ کر سکتے ہیں۔ کھیل کھلاڑیوں اور دوستوں کی صحبت ان غلط جذبات کا رُخ موڑ دیتی ہے۔ نفرت کا رجحان کھلونوں کو توڑ پھوڑ کر تسکین پاتا ہے۔ غرور کا رجحان دوست کو پیٹ کر یا شکست دے کر آسودہ ہوتا ہے۔ اسپنسر کا دعویٰ ہے کہ بچے کو کھیل کھیلنے کا جتنا موقعہ دیا جائے گا، وہ زندگی میں اتنا ہی نارمل اور حالات سے نبھاؤ کرنے والا انسان بن جائے گا

اسپنسر کے علاوہ نفسیات کے دوسرے ماہرین کا بھی یہی خیال ہے کہ کھیل اور صرف کھیل ہی ایسا ذریعہ ہے جو بچے کے اچھے یا برے مستقبل کی گارنٹی دیتا ہے۔ بچے جتنی دیر تک کھیلتے رہیں گے؟ آئندہ زندگی کی ذمہ داریوں کے لئے اتنے ہی تیار ہوں گے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بچہ توڑ پھوڑ کر کھیل کھیلتا ہے۔ وہ موقع ملتے ہی آپ کی قیمتی گھڑی، قلم، شیشے یا ریڈیو پر حملہ کر دیتا ہے مگر یقین کیجئے کہ یہ سودا مہنگا نہیں۔ اس بچے نے آپ کی [illegible] کو توڑ پھوڑ کر جو نفع کمایا ہے اس کا اندازہ آپ نہیں لگا سکتے۔ یہ ذہانت کی علامت ہے جو بچہ توڑ پھوڑ کر ہی جوڑنا سیکھتا ہے۔ یاد رکھئے کہ جن بچوں کو تباہ کن کھیل کھیلنے اور توڑ پھوڑ کرنے کا موقعہ نہیں ملتا۔ ان کے ذہن اور تصور کی نشوونما نہیں ہوتی۔ اپنی گھڑی اور ریڈیو کو ضرور بچا کر رکھئے، لیکن بچے کو اس کے بدلے اپنی حیثیت کے مطابق چند کھلونے توڑنے کے لئے ضرور دیجئے۔ اسے گھر کی چند بے کار چیزیں برباد کرنے دیجئے۔ یہی تخریبی کھیل آگے چل کر تعمیری جذبہ بن جائے گا۔ جو بچہ لڑکپن میں توڑ پھوڑ کرنے میں آزاد ہوگا وہ مستقبل میں ایک ماہر انجینئر یا ماہر تعمیرات بن سکے گا۔ تاریخ کا ایک مقولہ ہے کہ ڈیوک آف ولنگٹن نے نپولین کے خلاف جنگ کھیل کے میدان میں ہی جیت لی تھی۔ کھیل کا میدان ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ اچھی طرح زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے۔ جو بچہ آج ایک کامیاب کھلاڑی ہے، وہ آئندہ ایک کامیاب شہری بن جاتا ہے۔

انسان کی شخصیت کو مکمل کرنے کے لئے اسکول اور گھر کافی نہیں ہیں۔ اس کے لئے کھیل کا میدان بھی ضروری ہے۔ کھیل کا میدان ہمیں بھائی چارہ سکھاتا ہے۔ ہمدردی اور فراخ دلی کا سبق سکھاتا ہے، وقت کی پابندی اور تنظیم کا درس دیتا ہے۔ جب بچہ اپنی ٹیم کے ساتھ مل کر کھیلتا ہے تو اسے ٹیم کے اصولوں اور قاعدوں کی پابندی کرنا پڑتی ہے۔ اس کا کھیل اسی طرح کامیاب ہو سکتا ہے۔ اصولوں کی یہ پابندی اور تنظیم جو مخالف ٹیم سے لڑ بھڑ کر حاصل ہوتی ہے، سالہا سال کے تجربہ کار پروفیسر بھی اسے نہیں سکھا سکتے۔ تنظیم کا جو احساس بچے کو اسکول یا گھر میں دلایا جاتا ہے وہ منفی ہوتا ہے یعنی یہ نہ کرو وہ نہ کرو۔ بچے کو ان احکامات کے ماننے اور اس کے نتیجے میں برآمد ہونے والی کامیابی کا اندازہ نہیں ہوتا۔ وہ ان احکامات کو نہیں سمجھتا اور ان کو ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس کے برخلاف کھیل کے میدان میں بچہ بہت جلدی تنظیم سیکھ جاتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ وقت کی پابندی نہ کرنے یا اصول کی خلاف ورزی کرنے کی سزا اس کی ٹیم کو بھگتنا پڑے گی۔ وہ اپنی مرضی سے تنظیم اور اصولوں کی پابندی کرنا سیکھتا ہے۔ پھر مستقبل میں وہ زندگی کے کسی پیچ میں شکست نہیں کھاتا۔

ولیم سٹرن نے کہا ہے کہ ایک ہاکی کا کھلاڑی اگر دس بار گیند کو مخالف گول میں ڈالنے کی کوشش کرتا ہے اور کامیاب نہیں ہوتا تو میچ ہار جانے کے بعد بھی وہ یا اس کی ٹیم مایوس نہیں ہوتی۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی کوشش میں پوری ٹیم کی قوت شامل تھی اسی لئے مخالف ٹیم کے جیتنے سے ان کا دل میلا نہیں ہوتا۔ اس طرح بچے کو "اسپورٹس مین اسپرٹ" کھیل کے میدان میں مفت ملتی ہے۔ فراخ دلی کا یہ جذبہ دنیا بھر کے ماہرین تعلیم اور نصاب تعلیم اسے نہیں سکھا سکتے۔ کھلاڑی بچے مستقبل میں زندگی کی ذمہ داریوں کو حوصلے اور جدوجہد سے نبھاتے ہیں۔ زندگی کی ہار جیت اور وقت کے اتار چڑھاؤ اس کے حوصلوں کو پست نہیں کر سکتے

یہی وجہ ہے کہ آج کل کے تعلیمی نصاب میں کھیلوں کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ جرمنی کے ایک ماہر نفسیات نے آج سے ۱۰۰ سال پہلے ایک طریقۂ تعلیم ایجاد کیا تھا۔ اس کے ذریعے بچے کو کھیل کھیل میں ہی ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی اس طریقہ کو "کنڈرگارٹن" کہتے ہیں۔ "کنڈرگارٹن" کا مطلب ہے "بچوں کا باغ"۔ اس طریقۂ تعلیم میں پڑھائی کی مجبوریت اور استاد کا خوف نہیں ہوتا اس کے علاوہ منفی احکامات بھی نہیں ہوتے۔ بچے مختلف کھلونوں سے کھیلتے ہیں۔ سب مل کر گیت

گاتے ہیں، ڈرامے کرتے ہیں، گیلی مٹی سے کھلونے بناتے ہیں۔ اس طرح ان کے تصور کی نشوونما ہوتی ہے۔ اور تعمیر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

اس طریقہ تعلیم کے بعد اٹلی کی میڈم مانٹی سوری نے بھی ایک طریقہ ایجاد کیا۔ یہ ان ہی کے نام پر مانٹی سوری سسٹم کہلاتا ہے یہاں بھی بچوں کو ایک مکمل انسان بنانے میں کھیل کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔

ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ یہ اسکول بہت مہنگے ہیں، صرف بڑے شہروں میں دستیاب ہیں اور اکثر والدین کی پہنچ سے باہر ہیں مگر آپ مایوس نہ ہوں، اپنے گھر کو ہی مفت کا کنڈر گارٹن بنادیں۔ قیمتی کھلونے نہ سہی، چند خالی ٹین، سگریٹ کے پیکٹ اور ماچس کی خالی ڈبیاں ہی کافی ہیں۔ ان چیزوں کو جمع کرنے یا توڑنے پھوڑنے میں آپ کا کوئی نقصان بھی نہیں ہوگا۔ آپ اپنے بچے کو اجازت دیجئے کہ وہ گھر میں اپنے دوستوں کو اکٹھا کرلے، جہاں انہیں ہل کر اچھل کود کرنے گانے بجانے اور شور مچانے کی ممانعت نہ ہو۔ اگر آپ ایسا کرسکے تو یقین کیجئے کہ آپ کا گھر کسی کنڈر گارٹن سے کم نہ ہوگا۔ اگر بچہ آپ کی بے پروائی کی وجہ سے آپ کی کسی قیمتی چیز کو توڑ پھوڑ دیتا ہے تو اسے سزا نہ دیجئے۔ یاد رکھیئے کہ بچے کا تجسس کا احساس اس کا بے حد قیمتی سرمایہ ہے، اسے ضائع نہ کیجئے۔ آپ کو بچے کے دودھ، گلوکوز اور بسکٹ کی طرح اس کی ذہنی بھوک کے لئے بھی خوراک فراہم کرنا ہے۔ الماری میں سجے ہوئے قیمتی کھلونے ماں باپ کی عزت کو چار چاند لگا سکتے ہیں، مگر بچے کے تجسس کی آگ کو نہیں بجھا سکتے۔

آج کل تعلیم کا بڑا زور و شور ہے، والدین اپنا سارا زور اس پر صرف کردیتے ہیں۔ مائیں فخر سے کہتی ہیں کہ ہمارا بچہ بہت شریف ہے، وہ گلی کے بچوں کے ساتھ نہیں کھیلتا، اگر وہ ان کے ساتھ کھیلتا تو ضرور بگڑ جاتا۔ یہ دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے۔ یاد رکھیے کہ وہ آئندہ زندگی میں گلی کے بچوں سے سیکھی ہوئی گالیاں بھول جائے گا۔ لیکن مل جل کر زندگی بسر کرنے کا جو گر وہ محلے کے بچوں سے سیکھے گا، وہ تمام عمر اس کے کام آئے گا۔

اگر آپ اپنے بچے کی صحیح جسمانی اور ذہنی نشوونما کی آرزومند ہیں، اگر آپ اسے ایک مکمل انسان بنانا چاہتی ہیں تو اس کی زندگی میں کھیل کھلونوں کی اہمیت کو سمجھئے۔ گھر کے پچھڑے کھول دیجئے۔ کھلونوں کی الماری کے تالے توڑ دیجئے ــــ آج اور ابھی!

[illegible]

[illegible]



وزیرِ اعظم کی بیوی
اپنے خاوند کے عہدے سے ناخوش تھی

دُنیا کے بیش تر بڑے آدمیوں کی کامیابی کے پیچھے اُن کی بیویوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ انگلستان کے سابق وزیرِ اعظم ہیرالڈ وِلسن کی کامیابی میں بھی میری وِلسن کا ہاتھ رہا۔ میری وِلسن کو سیاست سے لگاؤ نہیں ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا خاوند سیاست کو اختیار کرنے کے بجائے آکسفورڈ یونی ورسٹی کا پروفیسر بن جائے لیکن وِلسن کو سیاست سے عشق تھا۔ وہ بچپن ہی سے انگلستان کا وزیرِ اعظم بننے کا خواب دیکھتا تھا۔ میری وِلسن نے بہت کوشش کی کہ وِلسن سیاست سے کنارہ کش ہو جائے لیکن اسے اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔ آخر میری وِلسن نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا اور وہ اپنے خاوند کو اس کی منزلِ مراد حاصل کرنے میں مدد دینے کے لئے تن من لگ گئی۔

وِلسن ایک ذہین طالب علم تھا۔ وہ آکسفورڈ میں پڑھتا تھا۔ ایک دن وہ چہل قدمی کرتا ہوا شہر کے نواح میں چلا گیا وہاں ایک کلب کے لان میں میری ٹینس کھیل رہی تھی۔ وِلسن اس لڑکی کو دیکھ کر ٹھٹک گیا اور وہیں کھڑا اسے ٹینس کھیلتے دیکھتا رہا۔ اسے یہ لڑکی پسند آ گئی تھی۔ اس نے لڑکی سے راہ و رسم بڑھانے کے لئے کلب کی ممبری کی درخواست دے دی کلب کا ممبر بننے کے بعد اس کا تعارف میری سے ہو گیا۔ میری ایک فرم میں ٹائپسٹ کا کام کرتی تھی دونوں کی عمر ۱۸ سال تھی۔ وِلسن ابھی طالب علمی کے دور سے گذر رہا تھا۔ میری ہائی اسکول پاس کر کے ملازمت کر رہی تھی، دونوں دوست بن گئے۔ وِلسن اکثر میری کو ساتھ لے جاتا، کبھی سینما، کبھی تھیٹر اور کبھی آکسفورڈ کے پرانے ٹائپ کے ہوٹلوں میں چائے پیتے وقت گذر جاتا میری اور وِلسن کی محبت پروان چڑھتی گئی ——

وِلسن کو آکسفورڈ یونی ورسٹی سے وظیفہ ملتا تھا [illegible]

ہندوستان کے مانیٹر سے کچھ بڑا ہوتا ہے) میری خوش تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا ہونے والا خاوند آکسفورڈ کا پروفیسر بن جائے۔ اسے آکسفورڈ بہت پسند تھا۔ اسے اس شہر کے کالجوں کے سرسبز لانات اور اونچے مینار بہت بھلے لگتے تھے۔

وِلسن کو آکسفورڈ یونی ورسٹی سے بی اے کی ڈگری ملی۔ میری بھی [illegible] تھی۔ وِلسن نے یونی ورسٹی میں سب سے زیادہ نمبر

حاصل کئے تھے میری کا سر اس خیال سے فخر سے اونچا ہو گیا کہ اس کا شوہر یونی ورسٹی کا پروفیسر بنے گا۔ دُنیا میں اس کی عزت اور شہرت ہو گی۔ دُنیا اس کی ذہانت اور قابلیت کا لوہا مانے گی۔ وہ اپنے ذہن میں مستقبل کے خوش گوار خواب دیکھ رہی تھی۔ لیکن یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ وِلسن نے فیصلہ کر لیا کہ وہ [illegible] جائے گا اور سیاست میں عملی حصہ لے گا

میری کے خواب چکنا چور ہو گئے۔ لیکن اسے ولسن سے محبت تھی۔ وہ اس کی خاطر اپنے خوابوں کی قربانی دینے کے لئے تیار ہو گئی۔ اس دوران دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ انہوں نے جھٹ پٹ شادی کر لی اور لندن پہنچ گئے۔ میری کو گھر چلانے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ شادی سے پہلے اس نے اپنی ملازمت کو خیر باد کہہ دیا تھا اور اپنی ماں کے پاس چلی گئی تھی، جہاں اس نے چھ مہینے تک کھانا پکانے اور سینے پرونے کی ٹریننگ لی۔

لندن میں ولسن کو وزارت میں ایک اعلیٰ افسر کا عہدہ مل گیا اور اس کی ٹریننگ شروع ہو گئی۔ میری نے بھی لندن میں کام شروع کر دیا۔ وہ ہوائی حملے سے بچاؤ کے محکمے میں افسر بن گئی۔ لندن میں کچھ عرصہ گذارنے کے بعد ولسن آکسفورڈ واپس آ گیا۔ آکسفورڈ کے ایک کالج میں اسے ملازمت مل گئی۔ میری بہت خوش تھی۔ اُسے لندن کی ہماہمی سے نجات مل گئی تھی۔ اس نے پھر آکسفورڈ میں مستقل رہائش کے خواب دیکھنے شروع کر دئے۔ لیکن یہ خواب بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔ ولسن کے سر سے سیاست کا بھوت ابھی نہیں اُترا تھا۔

انگلستان ایک جمہوری ملک ہے۔ اس کی پارلیمنٹ ساری دنیا کی پارلیمنٹوں کی ماں کہلاتی ہے۔ گو وہاں آج کل ایک ملکہ حکومت کرتی ہے۔ لیکن اس کی حکومت برائے نام ہے۔ دراصل انگلستان کی ملکہ ایک خاندان ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس خاندان کو ملکہ کا اعزاز حاصل ہے۔ اس کی تنخواہ حکومت ادا کرتی ہے۔ لوگ اس کی بے انتہا عزّت کرتے ہیں لیکن اس کے ہاتھ میں طاقت نہیں۔ وہ ایک بہت خوبصورت گڑیا ہے۔ اس کے لئے عالی شان محلات ہیں، موٹر گاڑیاں ہیں، نوکر ہیں لیکن یہ سب کچھ [illegible]

کہ وہ حکومت کے کسی ملازم کو برخواست کر سکے۔ گو تمام افسروں کی تقرری اور علیحدگی اسی کے نام سے کی جاتی ہے، مگر حکومت کا سارا اختیار وزیر اعظم کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ کوئی بھی شہری اپنی قابلیت کے بل بوتے پر وزیر اعظم بن سکتا ہے۔ انگلستان کا ہر بچہ وزیر اعظم بننے کے خواب دیکھتا ہے۔ اگر اس میں رہنمائی کی قابلیت ہو تو اس کا خواب پورا ہو سکتا ہے۔ نمبر ۱۰ ڈاؤننگ اسٹریٹ انگلستان کے وزیر اعظم کی سرکاری رہائش گاہ ہے۔ یہ ایک بند گلی میں واقع ہے۔ باہر سے یہ ایک معمولی مکان معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے اندر ایک عالی شان عمارت ہے۔

جب انسان کے دل میں کسی کام کو کرنے کی لگن ہو تو قدرت اس کے اسباب خود بخود مہیا کر دیتی ہے۔ ولسن کو جلد ہی پارلیمنٹ کا ممبر بننے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر برطانیہ میں عام چناؤ ہوئے۔ انگلستان میں دو مشہور سیاسی پارٹیاں ہیں۔ ایک کنزرویٹو یعنی قدامت پسند یا سرمایہ دار پارٹی، اور دوسری لیبر پارٹی۔ ایک تیسری پارٹی لبرل پارٹی بھی موجود ہے، لیکن اس کا اثر نہ ہونے کے برابر ہے۔ کنزرویٹو پارٹی کے سربراہ ونسٹن چرچل تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے جیتنے کا سہرا انہی کے سر تھا۔ یہ بات انگریز قوم کی سوجھ بوجھ اور دانش مندی کی دلیل ہے کہ اس چناؤ میں چرچل کو شکست ہوئی۔ جو شخص انگلستان کو جنگ کے تاریک دور سے روشنی میں لایا اسی کو چناؤ میں ہار نصیب ہوئی۔ یہ جنگ جیتنے کا انعام تھا جو انگریزوں نے چرچل کو دیا۔ دراصل چرچل جنگ کا رسیا تھا۔ امن کے دور میں اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ چنانچہ لیبر پارٹی الیکشن جیت گئی۔ [illegible] وزیر اعظم بن گئے۔ انہوں نے ولسن کو [illegible] کا عہدہ پیش کیا۔

میری ولسن کے لئے یہ دور نہایت صبر آزما تھا۔ اسے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ آکسفورڈ اس کے دل و دماغ میں رچا ہوا تھا۔ اس نے ولسن کو بہت سمجھایا کہ وہ سیاست سے کنارہ کش ہو جائے۔ اس کی منزل آکسفورڈ ہے لندن نہیں، ترقی کی راہیں اس کا انتظار کر رہی ہیں، وہ ایک اعلیٰ دماغ کا مالک ہے، وہ آکسفورڈ میں بین الاقوامی شہرت کا مالک بن جائے گا، عزّت اور نیک نامی اس کے قدم چومے گی، لندن میں رہ کر اس کی صلاحیتیں برباد ہو جائیں گی، وہ معاشیات کا ماہر ہے، آکسفورڈ کے علمی ماحول میں اس کی قابلیت کو چار چاند لگ جائیں گے۔ میری اس کو لاکھ سمجھاتی رہی، لیکن ولسن نے اس کی ایک نہ سنی۔ تاہم ان کے درمیان ٹکراؤ کی نوبت نہیں آئی۔ ولسن ٹھنڈے دماغ کا مالک ہے۔ وہ غصّے میں کبھی آپے سے باہر نہیں ہوتا، بلکہ یہ کہنا بجا ہو گا کہ اسے غصّہ آتا ہی نہیں۔ اس کا مزاج ہمیشہ یکساں رہتا ہے۔ وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ آخر میری نے ہار مان لی اور ولسن کے شانہ بشانہ کام کرنے لگی۔

ولسن محکمۂ صحت کے نائب وزیر کے طور پر کام کر رہا تھا کہ اس کی زندگی میں ایک انقلاب آ گیا۔ انگلستان میں دوائیں مفت ملتی ہیں۔ وہاں کی ہیلتھ اسکیم ایک انوکھا تجربہ ہے۔ ہر کام کرنے والا اپنی تنخواہ میں سے ایک مقررہ رقم حکومت کو ٹیکس کے طور پر دیتا ہے، یہ ٹیکس انکم ٹیکس کے علاوہ ہے۔ جتنی رقم مزدور اپنی تنخواہ میں سے دیتا ہے، اتنی ہی رقم مالک کو بھی دینا پڑتی ہے۔ یہ رقم کروڑوں بلکہ اربوں روپے تک پہنچتی ہے۔ حکومت اس رقم کو لوگوں کے علاج پر خرچ کرتی ہے۔ ڈاکٹروں کی کوئی فیس نہیں ہوتی۔ نسخوں کی کوئی قیمت نہیں لی جاتی۔ بڑے سے بڑے آپریشن مفت کئے جاتے ہیں اس رعایت سے نہ صرف انگریز بلکہ باہر سے آنے والے

سیاح بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس زمانے میں اس رعایت میں مصنوعی دانت اور نظر کے چشمے شامل نہیں تھے۔ ولسن چاہتا تھا کہ یہ دونوں چیزیں بھی لوگوں کو مفت ملیں۔ حکومت نے یہ رعایت دینے سے انکار کر دیا۔ ولسن کے ضمیر نے اس بات کو گوارا نہیں کیا اور اس نے وزارت سے استعفٰی دے دیا۔

ایک نائب وزیر کے لئے جو نیا نیا حکومت میں شامل ہوا ہو اپنے عہدے استعفٰی دینا اچنبھے کی بات ہے۔ ولسن کے لئے یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں تھا اس نے کئی راتیں جاگ کر گذاریں۔ کیا وہ اپنے ضمیر کی آواز کو دبا دے؟ کیا وہ لیبر پارٹی کے اتحاد کے لئے سچائی کا گلا گھونٹ دے؟ میری ولسن اس آڑے وقت میں اس کے کام آئی۔ اس نے ولسن کی ہمت بندھائی اور اس کو فیصلہ کرنے میں مدد دی۔ وہ خود پارلیمنٹ گئی، اس نے گیلری میں بیٹھ کر ولسن کی تقریر سنی۔ ولسن نے اپنی تقریر میں لیبر پارٹی کو ملامت کی اور وزارت کو چھوڑنے کا فیصلہ سنایا۔ یہ زمانہ دونوں کے لئے کٹھن تھا۔ ولسن کی پارٹی کے لوگ اس کے مخالف ہو گئے۔ اس پر پارٹی میں پھوٹ ڈالنے کا الزام لگایا گیا۔ میری بہت پریشان تھی۔ ولسن کا مستقبل خطرے میں تھا لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ اس نے برابر اپنے خاوند کی حمایت کی اس زمانے میں چرچل مخالف پارٹی کے لیڈر تھے۔ چرچل نے میری کو ایک خط لکھا جس میں انہوں نے ولسن کے کیرکٹر کی بہت تعریف کی۔ انہوں نے لکھا کہ ایک نائب وزیر کے لئے اپنا عہدہ چھوڑ دینا کوئی معمولی بات نہیں لیکن انہوں نے جو کچھ کیا اچھا ہی کیا۔ چرچل کا یہ خط تاریکی میں روشنی کی کرن بن کر آیا۔

پریشانی کا یہ دور تھوڑے عرصے ہی رہا۔ جلد ہی ولسن اور حکومت میں مصالحت ہو گئی۔ ولسن کے ستارے عروج پر تھے۔ لیبر پارٹی کے سربراہ گیٹ سکل کا اچانک انتقال ہو گیا۔ لیبر پارٹی کو نیا لیڈر چننا تھا۔ مقابلے میں موجودہ وزیر اعظم کیلاہان اور جارج براؤن تھے۔ ولسن نے دونوں کو شکست دی اور لیبر پارٹی کا لیڈر منتخب کیا۔ اب اس کے لئے نمبر ۱۰ ڈاؤننگ اسٹریٹ کا راستہ صاف ہو گیا۔

اگلے الیکشن میں لیبر پارٹی جیت گئی اور ولسن وزیر اعظم بن گیا۔ اس وقت اس کی عمر ۴۸ سال تھی۔ اکتوبر ۱۹۶۴ میں وہ ملکہ سے اپنے عہدے کا چارج لے کر گھر پہنچا تو میری نے دروازے پر اس کا استقبال کیا۔ ولسن آٹھ سال وزیر اعظم رہا اس کے بعد اس نے لیبر پارٹی کے اندرونی انتشار سے بیزار ہو کر استعفٰی دے دیا۔ آج کل ولسن اور میری ریٹائرڈ زندگی گذار رہے ہیں۔ ●●

بیوٹی کالج

بے تحاشا وزن گھٹانا خوبصورتی کو نقصان پہنچاتا ہے!

شہناز حسین

۹۲-۸۸ گریٹر کیلاش، نئی دہلی۔ فون: [illegible]

آج کل وزن گھٹانے کا بہت فیشن نکلا ہے۔ ہر عورت دُبلا ہونا چاہتی ہے۔ جو یں زیادہ کھانے کی شوقین ہیں، وہ بھی طبیعت پر جبر کرکے ڈائٹنگ کر رہی ہیں۔ حُسن ہر عورت کا پیدائشی حق ہے اور واقعی مُٹاپا حُسن میں داغ لگا دیتا ہے۔ ہم عورتوں کے اس رجحان کے خلاف نہیں ہیں، لیکن یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ بے تحاشا وزن گھٹانا اچھا نہیں۔

انسانی جسم کے لئے پروٹین اور وٹامن اتنے ہی ضروری ہیں جتنا نشاستہ، چینی اور چکنائی وغیرہ۔ آپ نشاستہ (آٹا، میدہ، آلو، شکرقندی وغیرہ) چینی اور چکنائی کو اپنی غذا میں کم کر سکتی ہیں، لیکن خوراک میں پروٹین کا تناسب کم ہو جائے تو نقصان دہ ہوتا ہے۔ وزن کے متعلق ایک بات ذہن نشین کرلیں۔ اگر یہ بہت زیادہ ہو تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ۸-۱۰ کلو وزن آسانی سے کم کیا جا سکتا ہے۔ تھوڑی سی ورزش اور مناسب خوراک سے چند ہفتے میں یا چند مہینے میں ۱۵، ۲۰ پونڈ وزن کم ہو سکتا ہے تاہم وزن کم کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ جسم کا کھانا کم کر دیا جائے۔ کھانے کئی قسم کے ہوتے ہیں ایک وزن بڑھانے میں مدد کرتے ہیں، اور دوسرے کا وزن پر زیادہ اثر نہیں پڑتا۔ وزن بڑھانے والوں میں نشاستہ (روٹی، پراٹھے، کیلا، مٹھائیاں اور گھی شامل ہیں۔ دوسری قسم میں گوشت، مچھلی، انڈا اور سبزیاں ہیں۔ اگر آپ کو تلی ہوئی چیزوں کا شوق ہے،



اناناس کی پیسٹری آپ کو پسند ہے، چاکلیٹ آپ کی کمزوری ہے تو آپ کے لئے ان چیزوں کا چھوڑنا مشکل ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں آپ اپنی طبیعت پر جبر نہ کریں۔ اور اپنے من پسند کھانے یکسر موقوف نہ کریں۔ اس سے آپ میں بے دلی پیدا ہوگی۔ ہفتہ میں ایک دفعہ اپنا من پسند کھانا ضرور کھائیں، خواہ وہ آئس کریم ہو یا حلوہ پوری۔ اس طرح آپ کی من پسند خوراک بھی آپ کو مل جائے گی اور ڈائٹنگ پر بھی بُرا اثر نہیں پڑے گا۔ جب آپ ڈائٹنگ شروع کرتی ہیں تو جسم کا پانی کم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد فالتو چربی کا نمبر آتا ہے۔ بے تحاشا ڈائٹنگ خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہفتہ میں ایک کلو وزن کم کرنا بہتر ہے۔ اس معاملے میں صبر ضروری ہے۔ قدرت کے سب کام آہستہ آہستہ تکمیل پاتے ہیں، اس لئے وہ مکمل ہوتے ہیں۔ آپ بھی قدرتی طریقہ کار آزمائیں۔ اگر آپ نے بے صبری سے کام لیا تو اس کا نتیجہ اُلٹا نکلے گا۔ آپ کے چہرے پر جھرّیاں پڑ جائیں گی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمودار ہو جائیں گی۔

جب آپ ڈائٹنگ کریں گی تو یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گی کہ پہلے ہفتے میں آپ کا وزن گھٹنے کی بجائے اور بڑھ رہا ہے۔ اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں۔ جسم ڈائٹنگ کے حملے سے اپنا بچاؤ کرتا ہے۔ جب چربی کم ہونے لگتی ہے تو جسم پانی کو روک لیتا ہے۔ لیکن آپ نا اُمید نہ ہوں جسم کی یہ مدافعت عارضی ہوتی ہے۔ آپ اگر مستقل مزاجی سے ڈائٹنگ کرتی رہیں تو دوسرے ہفتے میں جسم کا یہ مدافعتی عمل بے کار ثابت ہوگا اور وزن کم ہونا شروع ہو جائے گا۔

ڈائٹنگ کے بارے میں ایک بات یاد رکھیں۔ چند ہفتے کی ڈائٹنگ کے بعد وزن گھٹنا بند ہو جاتا ہے۔ یہ قدرتی امر ہے۔ جسم چند کلو وزن کم کرنے کے بعد مزید تعاون سے انکار کر دیتا ہے۔ پھر ڈائٹنگ کے باوجود کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ آپ کے صبر کی آزمائش ہے۔ اکثر عورتیں اس دور میں پہنچنے کے بعد ہمت ہار دیتی ہیں۔ اگر آپ مستقل مزاجی سے ڈائٹنگ کرتی رہیں تو پھر واقعی وزن کم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

ابتدا میں وزن تیزی سے گھٹتا ہے۔ وزن گھٹنے کی رفتار ایک کلو فی ہفتہ ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جسم کا فالتو پانی کم ہو رہا ہے۔

پانی کم ہونا مقابلتاً آسان کام ہے۔ پانی کے بعد چربی کا نمبر آتا ہے۔ چربی کا کم ہونا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ پانی ختم ہونے کے بعد ہی اصل کام شروع ہوتا ہے۔ اب وزن گھٹنے کی رفتار بھی سست ہوجاتی ہے۔ اس دوران ہفتے میں آدھا کلو وزن گھٹنا بھی غنیمت ہے۔ یہ ڈائٹنگ کا دوسرا دور ہے اور یہی سب سے زیادہ صبر آزما ہوتا ہے۔ آپ بے صبری سے کام نہ لیں۔ اگر آپ کو ڈائٹنگ کے ہر طور سے واقفیت ہوجائے تو آپ کے لئے اس راستے پر چلنا آسان ہوجائے گا۔

کھانے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو آپ ڈائٹنگ کے دوران کھا سکتی ہیں۔ دوسرے وہ جن سے پرہیز کرنا لازم ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ مٹھائی، چکنی چیزیں اور نشاستہ ڈائٹنگ میں ممنوع ہے۔ ان سے سخت قسم کا پرہیز کریں۔ لیکن چکنی چیزوں میں مکھن مستثنیٰ ہے۔ مکھن کو یکسر موقوف نہ کریں۔ ہاں اس کی مقدار میں کمی کر سکتی ہیں۔ اگر آپ نے مکھن کھانا یکسر موقوف کر دیا ہے تو آپ کے چہرے پر جھریاں پڑ جائیں گی، چہرے کی جلد خشک ہوجائے گی، اور اس کی قدرتی چکنائی ختم ہوجائے گی۔ وہ چیزیں جو ڈائٹنگ کے دوران کھائی جا سکتی ہیں حسب ذیل ہیں:

سخت پنیر، گوشت، مچھلی (بھاپ میں پکی ہوئی) انڈے (ابلے ہوئے) پھل، سبزیاں۔

ڈائٹنگ شروع کرنے سے پہلے کیلوری کے نظام کو سمجھنا ضروری ہے۔ پہلے جسم میں کھانا پہنچتا ہے، جسے جسم ہضم ہونے میں مدد دیتا ہے۔ خوراک سے جسم میں طاقت آتی ہے کیلوری اسی طاقت کی اکائی کا نام ہے۔ انسان دن بھر کام کرتا ہے اور دوڑ دھوپ کرتا ہے تو اس کی طاقت خرچ ہوتی ہے۔ یہ طاقت خوراک سے واپس آجاتی ہے۔ اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ جب طاقت کی پیداوار اور خرچ برابر ہو تو وزن نہیں بڑھتا لیکن جب خوراک ضرورت سے زیادہ جسم میں پہنچ جائے تو فالتو طاقت چربی کی شکل میں جمع ہوجاتی ہے اور وزن بڑھ جاتا ہے۔ اگر آپ دن بھر سخت محنت کرتی ہیں تو آپ کو زیادہ طاقت کی ضرورت ہے۔ یہ طاقت خوراک مہیا کرتی ہے۔ اس صورت میں زیادہ کھانا مضر نہیں ہے بلکہ ضروری ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ مزدور عورتیں موٹی نہیں ہوتیں، اگرچہ ان کی خوراک وہی ہوتی ہے جو ڈائٹنگ کے لئے نقصان دہ ہے۔ یعنی روٹیاں یا چاول۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ خوراک جتنی کیلوریز پیدا کرتی ہے۔ یہ عورتیں اس سے زیادہ خرچ کر دیتی ہیں۔ آپ کو یہ بھی دیکھنا ہے کہ آپ کس قسم کا کام کرتی ہیں، آپ کی عادت کیا ہے، آپ کس قسم کی زندگی گزارتی ہیں۔ اگر آپ کے گھر میں نوکر چاکر ہیں تو قدرتی طور پر آپ کا کام بٹ جاتا ہے۔ آپ کو دوپہر کے کھانے کے بعد آرام کرنے کی عادت ہے تو اس سے بھی ڈائٹنگ پر اثر پڑتا ہے۔ اگر آپ سست اور کاہل ہیں تو آپ کی کیلوریز خرچ نہیں ہوتیں۔ اس صورت میں کیلوریز بدن میں جمع کرنا خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ اگر کیلوریز کی رفتار اوسطاً ۵ فی صد بھی بڑھ جائے تو نقصان ہوتا ہے۔ جو عورتیں یہ کہتی ہیں کہ میں تو بہت کم کھاتی ہوں لیکن پھر بھی میرا وزن نہیں گھٹتا وہ بظاہر سچ بولتی ہیں، مگر ورزش اور محنت کے بغیر کم کھانا بھی فالتو چربی جمع کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ عورتیں واقعی دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کم کھاتی ہیں، لیکن دن بھر [illegible] ہیں۔ چائے کے وقت کیک کا ایک پیس کھا لیا، گرمیوں میں کبھی آئس کریم کھالی، کبھی شربت پی لیا۔ ان چیزوں کا شمار کھانے میں نہیں ہوتا۔ مگر یہ اندازِ نظر غلط ہے۔ ایک اونس چاکلیٹ میں ۱۵۰ کیلوریز ہوتی ہیں۔ آئس کریم میں ۱۱۵ اور ملین کیک پیس میں ۸۰ کیلوری ہوتی ہیں۔ دو اونس مٹر کے دانوں میں ۷۵ کیلوریز، ایک سیب میں ۷۵ اور سلاد کے ایک پتے میں ۱۰ کیلوریز ہوتی ہیں۔ ایک اونس کھانے کے تیل میں کیلوریز کی مقدار ۲۴۰ ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کھانے کے علاوہ 'سنیکس' کی صورت میں سینکڑوں کیلوریز جسم میں پہنچا دیتے ہیں۔

ڈائٹنگ کرنے والی عورتوں کے لئے خوراک کا چارٹ بنا لینا مفید رہتا ہے۔ اگر وہ اس چارٹ کے مطابق کھائیں گی تو انہیں فائدہ ہوگا اور ان کی محنت کارگر ہوگی۔ ناشتے میں صرف ایک ابلا ہوا انڈا اور چائے لیں۔ چائے میں دودھ ہو، مگر شکر نہیں۔ شکر کی بجائے سکرین کی گولیاں استعمال کریں۔ اگر یہ ناشتہ کافی نہ ہو تو دو ابلے ہوئے انڈے لے سکتی ہیں۔ دوپہر کے کھانے میں صرف پھل کھائیں، روٹی سالن موقوف کر دیں۔ پھل اتنے کھائیں کہ پیٹ بھر جائے۔ گرمیوں میں آم، خربوزے، پپیتے کھا سکتی ہیں۔ شام کو صرف چائے پئیں۔ اس چائے میں بھی سکرین کا استعمال کریں۔ رات کے کھانے میں جو کھانا آپ کے گھر میں پکا ہو، کھائیں۔ اس وقت پرہیز نہ کریں۔ بس اتنی احتیاط کریں کہ عام خوراک سے قدرے کم کھائیں۔ ان کھانوں کے درمیان کچھ نہ کھائیں۔ [illegible] لیموں [illegible] اور نمک کا [illegible] پئیں۔ [illegible] کے کھانے کے دوران [illegible] گلاس پانی [illegible]۔ اس

[illegible] کی ایک متوازن غذا ہوگی۔ اس کے علاوہ [illegible] وقت [illegible] چاہئے۔ [illegible] بہت [illegible]۔ ڈاکٹر کے مشورے سے [illegible] کا استعمال [illegible] آپ [illegible] محسوس [illegible]۔

کھانے میں ہمیشہ پابندیٔ وقت کا خیال رکھیں۔ کھانا خوب چبا کر کھائیں۔ کھانے میں جلدی نہ کریں، اگر جلدی ہو تو کم کھانا کھائیں۔ کھانا آہستہ آہستہ کھانے سے اچھی طرح ہضم ہوتا ہے۔ چھوٹے لقمے بنائیں۔ ایک لقمے میں دو تین لقمے ہوتے ہیں۔ یہ دو لقمے انہیں الگ الگ کر لیں۔ اس طرح آپ کو ایک لقمہ کھانے کے لئے دگنا وقت درکار ہوگا۔ جلدی کھانے سے زیادہ کھایا جاتا ہے۔ جبکہ اور آہستہ آہستہ کھانے سے بھوک سے زیادہ نہیں کھایا جاتا۔ آہستہ آہستہ کھانے سے ہی خوراک کا ذائقہ اور لطف حاصل کیا جا سکتا ہے۔

کسی پارٹی یا تقریب میں جائیں تو اپنی پلیٹ کو کھانے سے نہ بھریں۔ بعض عورتوں کو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے جلدی سے کام نہ لیا تو کھانا ختم ہو جائے گا۔ بعض عورتیں کھانا اس لئے پلیٹ میں بھر لیتی ہیں کہ انہیں دوبارہ کھانے کی میز پر جانے کی ضرورت نہ ہو۔ یہ عادت غلط ہے اور آداب محفل کے بھی خلاف ہے۔

[illegible] کے دوران وزن کے گھٹنے بڑھنے کی رفتار کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ دو ہفتے میں ایک مرتبہ اپنا وزن معلوم کریں۔ اگر ایک پونڈ بھی بڑھ جائے تو کھانے کی مقدار بھی مناسب طور پر کم کر دیں۔ کھانے میں نمک کی مقدار بھی کم کر دیں۔ [illegible] نمک سے بچنا [illegible] کے علاوہ [illegible] مفید ہے۔

[illegible]

رکھنا ضروری نہیں کہ آپ کتنا کھا رہی ہیں، بلکہ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ آپ کیا کھا رہی ہیں؟ ایک وقت کا کھانا آپ کے جسم میں ایک ہزار کیلوریز پیدا کرتا ہے۔ اگر آپ کیلوریز کا دھیان رکھیں گی تو آپ کا مسئلہ آسان ہو جائے گا۔ ●●

سوال و جواب

رابعہ خاتون، امروہہ

س : گرمیوں میں میری گردن میں بہت پسینہ آتا ہے۔ گردن ہر وقت دھونا بھی ممکن نہیں۔ بتائیے میں کیا کروں!

ج : ایک صاف روئی کا ٹکڑا لیں اور اسے یوڈی کلون میں بھگو کر گردن کو اچھی طرح صاف کریں اور اس کے بعد تھوڑا سا ٹیلکم پاؤڈر چھڑک لیں۔ اس طرح تمام گرد و غبار صاف ہو جائے گا اور ٹھنڈک محسوس ہوگی۔

فرزانہ حسن، سہارن پور

س : میرے پیر گرمیوں کی گرد و غبار سے بہت گندے ہو جاتے ہیں، انہیں کس طرح صاف کروں؟

ج : ایک پیالی میں گرم پانی لیں اور اس میں ایک لیموں کا عرق نچوڑ لیں اور تھوڑا سا [illegible] (کھانے کا سوڈا) ڈال دیں اور پیر اس پانی میں آدھے گھنٹے تک ڈبوئے رکھیں۔ پھر پیروں کو پانی سے نکال کر [illegible] سے صاف کر کے خشک کر لیں۔ خشکی بھی دور ہو جائے گی اور پیر بھی خوب صاف ہو جائیں گے۔

بنت حسن، حیدر آباد

س : میرے [illegible] بہت [illegible] ہے۔ میں تیل بھی نہیں لگاتی۔

ج : گرمیوں میں [illegible] بال [illegible] ٹوٹ کے ہو جائیں گے اور [illegible] ہو جائے گا۔ اگر آپ تیل پسند نہیں کرتیں تو کوئی ہیئر کریم لگا لیا کریں۔

فیروزہ قریشی، دہلی

س : میں اکثر سستی محسوس کرتی ہوں [illegible] تمام دن [illegible] رہتی ہے [illegible] بھی اکثر رہتا ہے۔

ج : یہ علامات [illegible] آپ [illegible]

حبیبہ بیگم، میرٹھ

س : میرے بال بہت [illegible]

ج : آپ روزانہ پانچ دس منٹ تک بالوں کی مخالف سمت میں کنگھی کیا کریں۔ شروع شروع میں بال زیادہ گریں گے لیکن بعد میں رک جائیں گے اور بال جلدی اور صحت مند اگنا شروع ہو جائیں گے۔

ثریا نقوی، لکھنؤ

س : میں ماں بننے والی ہوں۔ کیا [illegible] جاری رکھنی چاہئے؟

ج : جی نہیں۔ آپ کے لئے [illegible] نہیں ہے صرف تلی ہوئی اور گرم [illegible] چیزوں سے پرہیز رکھئے۔ [illegible] اور سبزی [illegible] کا استعمال زیادہ رکھئے۔ ●●

عجیب باتیں

عجیب خبریں

کامیاب شادی کے لئے ناک کی پلاسٹک سرجری

امریکہ میں ریاست کیلی فورنیا کی ۲۲ سالہ ٹیری ڈولین اپنے ہی آفس میں کام کرنے والے ایک نوجوان جون کیبلاس سے بے انتہا محبت کرتی تھی، لیکن دونوں کی اوپر اٹھی ہوئی ناکیں شادی کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی تھیں۔ دونوں کو ایک دوسرے کی اوپر اٹھی ہوئی ناک پر اعتراض تھا۔ آخر کئی دن کے غور و خوض کے بعد دونوں نے پلاسٹک سرجری کے ذریعہ اپنی اپنی ناک درست کرنے کا فیصلہ کیا چنانچہ دونوں ایک ہی ساتھ اسپتال میں داخل ہو گئے اور پھر اسپتال سے باہر آتے ہی انھوں نے شادی کا اعلان کر دیا۔ شادی کی مبارک باد قبول کرتے ہوئے دونوں کی ناکوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔

فرانسیسی لڑکیوں کا انداز فکر

فرانس کے ایک میگزین "ایکسپریس" نے حال ہی میں پندرہ سے اٹھارہ سال کی عمر والی نوجوان لڑکیوں کے شادی بیاہ، کام کی نوعیت اور ان کی دلی خواہشات کے بارے میں ۲۲۰ لڑکیوں کے سامنے کچھ سوالات رکھے تھے، جن کے جوابات نہ صرف خاصے دلچسپ ہیں بلکہ نئی نسل کی لڑکیوں کے خیالات کی بھی اچھی طرح عکاسی کرتے ہیں۔ ان جوابات کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

● ۲۵ فی صد لڑکیوں کے دلوں میں لڑکا بننے کی تمنا تھی، کیوں کہ عورتوں کے مقابلے میں مردوں کو کام کرنے کے زیادہ مواقع حاصل ہوتے ہیں، جب کہ ۷۰ فی صد لڑکیاں اپنی نسوانیت پر مطمئن اور خوش تھیں۔

۱۹ فی صد لڑکیوں کا کہنا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ سنگین مسئلہ غذا کا ہے، پھر بے روزگاری کا اور پھر ایٹمی جنگ کا خوف ہے جو پوری انسانیت کے وجود کے لئے ایک زبردست خطرہ ہے۔ فرانسیسی نوجوان لڑکیوں کی بھاری اکثریت سیاست سے دور رہنا چاہتی ہے۔ ۹ فی صد لڑکیاں خود اعتمادی کو کامیابی کا ذریعہ سمجھتی ہیں۔ ۱۸ فی صد لڑکیاں سماجی اور انفرادی خصوصیات کو شہرت و کامیابی کا ذریعہ قرار دیتی ہیں۔ جب کہ ۱۴ فی صد لڑکیاں کامیابی کا ذریعہ اعلیٰ تعلیم اور انفرادی محنت کو شمار کرتی ہیں۔

۲۴ فی صد لڑکیاں تعلیمی اداروں میں، ۱۳ فی صد ایڈورٹائزنگ اور ۱۲ فی صد لڑکیاں سینما وغیرہ میں کام کرنا پسند کرتی ہیں۔

۴۱/۹ فی صد لڑکیاں شادی کو ضروری نہیں سمجھتیں جب کہ صرف ۲۰ فی صد [illegible] شادی کی خواہش مند ہیں اور یہ [illegible] سے زیادہ دو بچوں کی ماں بننا پسند کرتی ہیں [illegible] اس سے زیادہ نہیں۔

جڑواں بچوں کے سر [illegible] آپریشن

فرانس کے ایک اسپتال میں [illegible] نے دو جڑواں بچوں کے ملے ہوئے سروں کو آپریشن کے ذریعہ الگ کر کے دو [illegible] کے چنگل سے بچا لیا ہے۔ یہ آپریشن [illegible] کے اعتبار سے بہت ہی پیچیدہ [illegible] مسلسل ایکسرے اور جانچ کے [illegible] ان دونوں بچوں کے جڑے ہوئے [illegible] درمیان ایک باریک سا خلا [illegible] آپریشن کے بعد آسانی جدا کر دیا [illegible] اسپتال سے جاری ہونے والی ایک [illegible] رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ یہ دونوں [illegible] خوش نصیب تھے جو بچ گئے، ورنہ عام حالات میں جڑواں بچوں کے سر باہم اس طرح پیوست ہوتے ہیں کہ انہیں الگ نہیں کیا جا سکتا۔ سرکاری اعداد و شمار کی روشنی میں فرانس بھر میں اب تک اس قسم کے کل [illegible] بچے پیدا ہو چکے ہیں جن کی بڑی اکثریت آپریشن سے [illegible]

قبل ہی موت ہو گئی تھی۔ اس قسم کے بچوں کو طبی اصطلاح میں جڑی ہوئی کھوپڑیوں والا کہا جاتا ہے جن کا جڑواں بچوں کے اندر تناسب دو فی صد ہوتا ہے، یعنی ہر سو جڑواں بچوں میں سے کم از کم دو کی کھوپڑیاں باہم جڑی ہوتی ہیں۔

عورتیں مردوں سے زیادہ غسل کرتی ہیں

مغربی جرمنی میں میک اپ کا سامان تیار کرنے والی ایک کمپنی نے ملک کے بڑے بڑے شہروں کا ایک سروے کرنے کے بعد یہ انکشاف کیا ہے کہ ۸۰ فی صد عورتیں ہفتے میں کم سے کم تین بار غسل ضرور کرتی ہیں جبکہ ۹۰ فی صد مردوں کے غسل کا تناسب ہفتے میں صرف ایک بار کا ہے۔ کمپنی نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ یہ اس بات کی علامت ہے کہ عورتیں اپنی صحت کا مردوں سے کہیں زیادہ اہتمام کرتی ہیں اور اپنی جوانی تازگی اور کشش کو زیادہ سے زیادہ عرصے تک برقرار رکھنے کے لئے نہ صرف مردوں سے زیادہ غسل کرتی ہیں بلکہ میک اپ کی اشیاء بھی خوب استعمال کرتی ہیں۔

نئی نئی شادیاں رچانے کا ریکارڈ

[illegible] کے شہر [illegible] سے تعلق رکھنے والے ایک [illegible] نے جس کی عمر صرف ۲۶ سال ہے، شادی کرنے کا ایک نیا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ اس نے اپنی ۲۶ سالہ عمر میں اب تک کل ۳۲ شادیاں کی ہیں اور [illegible] وہ سامان کی طرح اپنی بیوی کو بھی بدلتا رہتا تھا۔ جب اس کی مطلقہ بیویوں سے اس کے بارے میں سوال کیا گیا تو اس نے بتایا کہ شادی کے وقت وہ اپنی نئی بیوی کو حسب عادت اپنی دائمی محبت کا یقین دلاتا ہے، لیکن پھر جلد ہی وہ کسی طوطے کی طرح اپنی آنکھیں پھیر لیتا ہے۔ چونکہ نئی نئی شادیاں رچانے میں اس کی شہرت کافی ہو چکی ہے، لہٰذا اب دیکھنا یہ ہے کہ ۳۳ ویں بیوی حاصل کرنے میں وہ کامیاب ہوتا ہے یا نہیں۔

بیویوں کی ادلا بدلی

جب لندن کے ایک نوجوان ہنری کیلی کو یہ معلوم ہوا کہ اس کی پیاری بیوی ایک دوسرے نوجوان میں دلچسپی لے رہی ہے تو وہ مارے غصے کے پاگل ہو گیا۔ لیکن جلد ہی اسے یہ احساس ہوا کہ اب غصہ کرنے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ چنانچہ اس نے فوراً ہی اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑا اور اس نوجوان کے گھر روانہ ہو گیا ـــــ اسے قتل کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنی بیوی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دینے کے لئے۔ نوجوان ہنری کی یہ بے مثال قربانی دیکھ کر حیران رہ گیا اور بے اختیار پکارا اٹھا کہ اب میری بیوی کا کیا ہوگا۔ دوسری طرف اس کی بیوی کی پریشانی بھی ہنری کی طرح چہرے سے عیاں ہو رہی تھی۔ اس کی بیوی کی پریشانی کو سمجھتے ہوئے اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور اس کی بیوی کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے بھی اس پیش کش کا جواب بڑی گرم جوشی کے ساتھ دیا۔ چنانچہ وہ چاروں ایک ساتھ عدالت گئے اور طلاق اور شادی کی سرٹیفکیٹ ایک ساتھ لے کر واپس آئے۔ اب یہ چاروں رقیب ہونے کی بجائے ایک دوسرے کے گہرے دوست ہیں۔

چھ سال کی بچی پانچ زبانوں کی ماہر

سوئٹزرلینڈ کی ایک چھ سالہ بچی لینا بیڈ فورڈ نے دنیا کی پانچ بڑی بڑی زبانوں کو پوری روانی کے ساتھ بول کر لوگوں کو حیرت زدہ کر دیا ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے شہر لوزان کی یہ چھ سالہ بچی فرانسیسی، اطالوی، جرمنی، انگریزی اور اسپینی زبان اچھی طرح بول اور سمجھ سکتی ہے۔ اس نے اطالوی، فرانسیسی اور جرمن زبانیں اس وجہ سے سیکھ لی ہیں کہ لوزان شہر فرانس، اٹلی اور جرمنی کی سرحد پر واقع ہے اور اس شہر میں تینوں زبانیں بولنے والے لوگ بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ اس کی ماں اسپینی ہے اس لئے اسپینی زبان اسے [illegible] اس کا باپ برطانوی ہے اس نے [illegible] سے انگریزی بھی سیکھ لی۔ اس طرح دنیا کی پانچ بڑی زبانیں سیکھ کر اس چھ سالہ بچی نے ایک عالمی ریکارڈ قائم کیا ہے۔ ■■

کہی سُنی

محترمہ!

میں تو سوچتا تھا کہ یہاں سے جانے کے بعد آپ نے مجھے یکسر بھلا دیا ہے، لیکن کل شام کی ڈاک سے "بانو" کا فروری ۱۹۷۷ کا شمارہ پاکر میرے وہم و گمان کی تردید ہو گئی۔ "بانو" مختار ہے تو میں اپنے آپ کو ادبی خلا میں محسوس نہیں کرتا۔

میری تصنیف (مجموعۂ نظم) موسومہ "بیداریٔ وطن" پر مرکزی سرکار کی طرف سے مجھے مبلغ دو ہزار روپے کا انعام دیا گیا ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے میری پینتیس سالہ محنت رائیگاں نہیں گئی اور اردو شاعری کے باب میں میری حقیر خدمات کا اعتراف کر کے میری حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔

بادا کرشن گوپال مغموم، پاٹن [illegible]، پولس لائن

پیاری بھابی!

افتتاحیہ "صبح" کے ذریعہ آپ نے واقعات کی صحیح عکاسی کی ہے۔ آنے والی نسلوں کو اس سے سبق سیکھنا چاہئے۔ [illegible] جا رہا ہے، اسے اخلاق کے دائرے میں باندھنا مشکل ہے۔

[illegible] سلیم فاروقی، [illegible]، سہارنپور

عزیز بھابی!

کئی ماہ سے "بانو" بہت تاخیر سے مل رہا ہے۔ [illegible]

اشاعت کا شکریہ۔ [illegible] کا لکھا ہوا افسانہ "میں نے پکارا" اور [illegible] نام کا "حقا" پسند آیا۔ میری کا کالج والیس ہوسٹیں کی خبریں اور باورچی خانہ تو اس شمارے کے ان مول موتی ہیں۔ نیا کالم "آپ کی ذہنی الجھن اور اس کا حل" افادیت سے بھرپور ہے۔ نیلوفر نوشی، آنبور

پیاری بھابی!

"افتتاحیہ" مارچ بہت ہی سبق آموز ہے۔ واقعی آپ اس دور کی عظیم صحافی ہیں۔ افتتاحیہ کا ایک ایک جملہ معنی خیز اور نصیحت آموز ہے۔ کاش ہماری سابق حکمران ان ہی اصولوں کو مدنظر رکھتیں تو ناکامی کا منہ ہرگز نہ دیکھتیں۔ معراج فاطمہ، دہلی

بھابی جان!

بانو: اپریل کا افتتاحیہ میرے لئے کچھ زیادہ ہی مفید ثابت ہوا اور میں نے اس پر عمل کرنا پوری طرح شروع کر دیا ہے۔ مجھے پہلے تنہائی بالکل پسند نہ تھی، لیکن افتتاحیہ میں تنہائی کے فوائد پڑھ کر دل کو کچھ تسلی ہوئی۔ رفیعہ شبنم عابدی کی نظم "زرد چٹھیاں شوہر کے نام....." حد سے زیادہ پسند آئی۔ اس کے لئے انھیں مبارکباد۔

محترمہ!

"کہی سنی" اپریل کے تحت بہن سلمیٰ بیگم (کانپور) کا مراسلہ نظر سے گزرا۔ انھوں نے اپنے مراسلہ میں تحریر فرمایا ہے کہ انھیں خالی بیٹھنا بالکل پسند نہیں ہے اور وہ گھر میں بیٹھ کر کوئی ایسا کام کرنا چاہتی ہیں کہ جو ان کے لئے مشغلہ بھی ہو اور کسی قدر آمدنی کا ذریعہ بھی۔ سلمیٰ صاحبہ کے مراسلہ سے اندازہ ہوا کہ ان کے دل میں پُرجوش کام کرنے کی خواہش انگڑائیاں لے رہی ہے لیکن وہ پردے میں رہنے کی وجہ سے اپنی دلی امنگوں کو عملی جامہ پہنانے سے مجبور ہیں۔

اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے اور خدمت خلق کے متعلق سوچنے اور ان پر عمل کرنے کا مردوں کی طرح عورتوں کو بھی پورا حق حاصل ہے اور جس طرح بے پردہ عورتیں اپنی آمدنی پیدا کر سکتی ہیں اور خدمت خلق کے کاموں میں حصہ لے سکتی ہیں اسی طرح پردے میں رہنے والی خواتین بھی پردہ کی قیود کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی آرزوؤں کو پورا کر سکتی ہیں۔ اس قسم کے کاموں کی انجام دہی کے لئے بے پردگی بالکل ضروری نہیں۔

اسلام کی ابتدائی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پردہ کرنے والی مسلم خواتین، انسانی زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے معاملات، یہاں تک کہ جنگی مہمات میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں یعنی اسلامی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ "اسلامی پردہ مسلمان عورتوں کی شخصیت کو بنانے سنوارنے میں نہ صرف یہ کہ حائل نہیں ہوتا بلکہ اس میں اور زیادہ جلا پیدا کرتا ہے۔" چنانچہ بہن سلمیٰ بیگم اور ان جیسی دوسری پردے میں رہنے والی بہنیں اپنے ذاتی اور دوسرے ضرورت مند بہن بھائیوں کے مسائل کو سلجھانے کی کوشش کریں تو انشاءاللہ وہ اپنے نیک اور عظیم مقاصد میں ضرور کامیاب ہوں گی۔

آج کے دور میں بھی بہت سی باپردہ خواتین سلائی، کڑھائی، بنائی، آرٹ، جلد سازی [illegible] کے ذریعہ معقول آمدنی حاصل کر رہی ہیں اور باپردہ خواتین کو علمی، سماجی اور تعمیری کاموں [illegible]

سے دلچسپی ہے وہ ان میدانوں میں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ اسی انداز پر سلمیٰ صاحبہ ہمت و حوصلہ کے ساتھ آگے بڑھیں تو وہ بھی اپنے مقاصد میں انشاء اللہ ضرور کامیاب ہوں گی۔
محمد اللہ، علی گڑھ

ڈیر بھابی؛

بانو؛ اپریل میں "چمکیلے اندھیرے" اور "محبت نامے" پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ بے اختیار قلم مبارک باد دینے کے لئے اٹھ گیا آپ کو انتخاب پر اور لکھنے والوں کو ذہانت پر۔
شکیلہ امیر، پریم نگر، جھالاشر

پیاری بھابی؛

میں بانو بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ بس آپ سے ایک شکایت ہے۔ بانو اتنی دیر سے کیوں نکلتا ہے؟ اس پر توجہ دیں۔ کشیدہ کاری اور "ان سے ملئے" مجھے بہت پسند آیا۔ آپ کسی ذہنی اُلجھن اور اس کا حل بھی بہت دلچسپ اور مفید کالم ہے۔ عرفانہ اختر

بھابی صاحبہ؛

بانو؛ مئی تاثیر کا طلسم بن گیا ہے۔ عورت کی زندگی کے مختلف اچھے برے پہلوؤں کو پیش کرکے آپ نے اسے آئینہ بنادیا ہے۔ مختار بانو کھوکھر کی نظم "جلتی روحیں" پڑھ کر بے ساختہ آنسوؤں کو روکنا مشکل ہوگیا۔ میں خود بھی ایسی ہی جلتی روحوں میں سے ایک ہوں۔
ع۔ ف۔ ناگپور

پیاری بھابی؛

تصویری فیچر "۱۹۷۶ کی مشہور خواتین" (بانو؛ مئی) دلچسپ اور معلومات افزا ہے، اگرچہ نامکمل ہے۔ اس فہرست میں اور بھی نام آسکتے تھے۔ شمیم منظر پوری کی کہانی "شریف آدمی" طنز کا تیر ہے۔ روشن آرا کی کہانی "پہلا جھوٹ"

"شادی شدہ زندگی کے کھوکھلے پن اور جھوٹ کے ستونوں پر اس کے قائم رہنے کی اچھی عکاسی کرتی ہے۔ رقیہ شبنم، سکندرآباد، آندھرا

بھابی ڈیر؛

بانو؛ مئی میں عطیہ پروین کا افسانہ "پلاؤ کھاتے ہیں احباب..." بہت پسند آیا۔ اس میں ایک بڑی دل دوز حقیقت کی عکاسی کی گئی ہے۔ کاش ہم عورتیں ماتمی موقعوں پر خرافات سے دامن بچانا اور دوسروں کے جذبات کا احترام کرنا سیکھیں۔ غم کے وقت انسان کتنا تنہا ہوتا ہے! عائشہ تنویر، بھوپال

بھابی صاحبہ؛

خدا کے لئے "آپ سے ملئے" کا کالم بند کردیجئے۔ اس سے مجھ جیسی لڑکیوں کی کڑھن اور بڑھتی ہے۔ ایک یہ لڑکیاں ہیں جو ساری دشواریوں کے باوجود کچھ کرکے دکھارہی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ روایتوں کی زنجیروں کو توڑنے کی ہمت بھی نہیں کرسکتے۔ کیوں کہ ہمیں اپنے بڑوں کی دل شکنی کا خوف مارے ڈالتا ہے۔ آپ ان روایت پرست بڑوں کو بھی تو سمجھا بجھا کو راہ راست پر لائیے۔
شگفتہ پروین، لکھنؤ

بھابی جان؛

"۱۹۷۶ کی مشہور خواتین" اور "ان سے ملئے" (بانو؛ مئی) پڑھ کر جہاں دل میں ولولہ جاگا، وہاں اسی شمارے میں "ہندوستان میں شادیاں" پڑھ کر دل کچھ بجھ بھی گیا۔ یوں کہنے کو تو ہندوستان میں عورت کو دیوی کا درجہ دیا جاتا ہے، لیکن شادی بیاہ کے معاملے میں، اور خصوصاً ازدواجی تعلقات کے میدان میں اس کی حیثیت ایک کھلونے، ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ریحانہ شمسی، کان پور

بھابی؛

میری سسرال والے ہمارے میکے کی بہ نسبت بہت زیادہ قدامت پسند ہیں۔ میں نے بی اے تک تعلیم حاصل کی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ کچھ کام کروں۔ میری سسرال والے میرے اس نقطۂ نگاہ کو اچھا نہیں سمجھتے اور میرے کام کرنے کو اپنی بے عزتی سمجھتے ہیں۔ مانا کہ میری سسرال والے کافی مالدار ہیں لیکن اس کا یہ تو مطلب نہیں کہ میں پیسہ ہی کمانا چاہتی ہوں۔ کچھ اپنی خواہشات بھی ہوتی ہیں جن کی تکمیل سے ذہنی سکون میسر آتا ہے اور اعتماد بڑھتا ہے۔ اب اُن کو کیسے سمجھاؤں کہ عورت کے کام کرنے سے کیسی خاندان کی ناک نہیں کٹتی۔ بھابی جتنا وہ لوگ میرے کام کرنے کے خلاف ہیں اتنی ہی شدت میری خواہش میں پیدا ہوجاتی ہے۔ کاش وہ لوگ مخالفت کے بجائے مجھ سے تعاون کرتے۔ مجھے ہمیشہ سے کچھ نہ کچھ کام کرنے کا شوق رہا ہے۔ میں ہر قیمت پر اپنے شوق کی تکمیل چاہتی ہوں۔ میں ایک ایسے ادارے سے واقف ہوں جو بڑے پیمانے پر سلے سلائے کپڑے ایکسپورٹ کرتا ہے۔ انہوں نے مجھ میں بہترین منتظم ہونے کی صلاحیت کو دیکھ کر مجھے اپنے ہاں کام کرنے کی آفر دی ہے۔ بھابی میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اگر میری سسرال والے مجھے کام کرنے کی اجازت دیں تو میں ان کا سر کبھی نیچا نہیں ہونے دوں گی۔ اور میرے دل میں ان لوگوں کی قدر و منزلت بڑھ جائے گی۔ ورنہ بیٹھے بیٹھے اندر ہی اندر کڑھتی رہوں گی اور کھا کما کر اپنا وزن بڑھاتی رہوں گی۔ بھابی آخر یہ سسرال والے ہماری خواہشات کو اہمیت کیوں نہیں دیتے؟ ن، نئی دہلی

نواب اصغر علی نور جہاں بیگم، دھنباد بازار

س : پوشیدہ بات زبان پر خود بخود کب آجاتی ہے؟

ج : ہم راز کی صورت دیکھ کر۔

س : آدمی دوسروں کو بے وقوف کب سمجھتا ہے؟

ج : جب وہ خود ضرورت سے زیادہ بے وقوف ہو۔

ایس۔ ضیاء الدین میو حسین آباد جپلا پلاموں

س : عمدہ کشیدہ کاری کے لئے کون سی کتاب بہتر ہے جس میں چادر، تکئے، قمیض، ساری، لیزی ڈیزی وغیرہ وغیرہ کی ڈیزائن آسان طریقے سے سمجھایا گیا ہو؟

ج : فرح کشیدہ کاری، زینت کشیدہ کاری، بانو کشیدہ کاری وغیرہ وغیرہ۔

ایس۔ محبوب بی، اڈونی، کرنول

س : ہم کاغذ کے لکھے کو ربڑ سے مٹا سکتے ہیں۔ دل کے لکھے کو کیسے مٹائیں؟

ج : وقت کا ربڑ دل کے لکھے کو بھی مٹا سکتا ہے۔

س : میرے شوہر بہت کماتے ہیں۔ پر بہت خرچ بھی کرتے ہیں میں کیا کروں؟

ج : اگر وہ کمانے کے باوجود کنجوس ہوتے تو آپ کی شکایت بجا تھی۔

س : گوری لڑکی کے سب عیب چھپ جاتے ہیں۔ کالی لڑکی اچھے نقوش کی مالک ہو تو بھی لوگ اسے خوب صورت نہیں کہتے۔ ایسا کیوں؟

ج : یہ ہماری بدذوقی ہے۔ ہماری نگاہ جلد کے نیچے تک نہیں جاتی۔

محمد سہیل اختر، جمشید پور

س : کیا زندگی صرف دکھ، تکلیف اور مصیبتوں کا نام ہے؟

ج : دکھ، تکلیف اور مصیبتیں زندگی میں نہیں انسان کے دل میں ہوتی ہے۔ انسان سکون اور خوشی کے لئے باہر کے واقعات کا محتاج نہیں۔ اس کی خوشی اس کے نقطۂ نظر پر منحصر ہے۔ ایسے لوگ ہر حال میں خوش رہتے ہیں۔

س : اگر ہر طرف سے حقارت اور ذلت ملے تو؟

ج : حقارت اور ذلت کو تسلیم نہ کیجئے۔ اپنی عزت نفس کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہیے۔

شمیم اختر سکونتوی، بہار شریف

س : جب دل کسی کی یاد میں تڑپنے لگے تو اس وقت کیا کرنا چاہئے؟

ج : دل میں ایک وقت میں ایک ہی خیال رہ سکتا ہے۔ آپ کسی کی یاد میں تڑپنے کے بجائے اپنے دل کو کسی اور مشغلہ میں لگائیے انتخاب آپ پر موقوف ہے۔

ایس۔ ایم۔ گائیڈ، اناؤ

س : اگر دنیا میں عورتوں کا وجود نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟

ج : نہ آپ کا سوال ہوتا اور نہ ہمارا جواب۔

ناہید، شبلی، فرقان شمسی، نگینہ

س : دوستی کا معیار کیا ہونا چاہئے؟

ج : اگر آپ کا دوست مصیبت میں گرفتار ہو تو آپ خوش نہیں رہ سکتے۔

س : خودداری کیا چیز ہے؟

ج : دوسروں کا احسان گوارا نہ کرنا۔ اپنی کھال میں مست رہنا۔

س : دل اگر نہ ہوتا تو؟

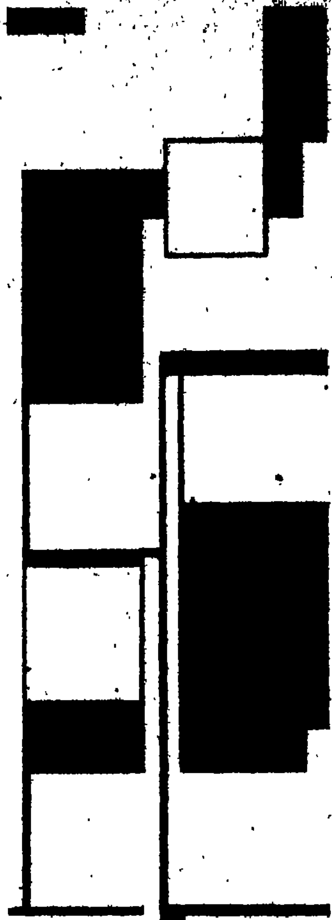
ج : انسان فسانوں اور غزلوں سے محروم ہوجاتا۔

نسیم مثنوی، کلکتہ ۱۴

س : زندگی پھولوں کی سیج ہے یا کانٹوں کا بستر؟

ج : دونوں۔ اگر زندگی میں کبھی کبھی کانٹوں کا بستر نہ ہو تو پھولوں کی سیج بے معنی بن جاتی ہے۔

س : مصیبت پڑی ہو اور ہمت نڈھال ہو تو کیا



اس عنوان کے تحت دلچسپ معلوماتی اور تفریحی سوالوں کے جواب دئے جاتے ہیں۔ ایک کاغذ پر یا پوسٹ کارڈ پر زیادہ سے زیادہ تین سوال لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کے لئے جگہ چھوڑیئے اور اپنا پورا نام پتہ لکھئے جس کاغذ یا کارڈ پر سوالات ہوں اس پر دفتر سے متعلق اور کوئی بات نہ لکھئے۔ اپنے سوالات اس پتہ پر بھیجئے : بزم بانو

ماہنامہ بانو آصف علی روڈ، نئی دہلی

کرنا چاہئے؟

ج : کوئی مصیبت مستقل طور پر بڑی نہیں ہوتی اور نہ محبت مستقل مشعل ہوتی ہے۔ ہر سیاہ بادل کے کناروں پر نقرئی حاشیہ ہوتا ہے۔

کریم پرویز، مظفر پور (بہار)

س : کوئی عورت اپنی اولاد کے ہوتے ہوئے کسی غیر کی اولاد کو ماں کا پیار دے سکتی ہے؟

ج : جس عورت میں ممتا کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کے بچوں کو بھی اپنے بچوں کی طرح پیار دے سکتی ہے۔

محمد کلیم علی آرزو، حسین نگر

س : نفرت محبت میں کب بدلتی ہے؟

ج : انسان محبت کی امید رکھے اور پا نہ سکے تو محبت نفرت میں بدل جاتی ہے انسان کو نفرت کے بدلے محبت ملے تو یہی نفرت محبت میں بدل سکتی ہے۔

س : بیوی کب بوجھ بن جاتی ہے؟

ج : جب وہ فرمائشوں کا بوجھ سر پر رکھ دے۔

ایس۔ ایم۔ جاوید اسلام، مدھوبنی، دربھنگہ

س : آج کل کے بچے زیادہ کیوں جھوٹ بولتے ہیں؟

ج : بچے کبھی جھوٹ نہیں بولتے ہیں۔ ان سے جھوٹ بلوایا جاتا ہے۔ اگر جھوٹ بول کر ان کی جان بچتی ہے تو وہ ضرور جھوٹ بولیں گے والدین کے لئے سچ سننا سچ بولنے سے زیادہ مشکل ہے۔

س : آج کل انسان اور حیوان میں کیا فرق رہ گیا ہے؟

ج : صرف دُم کا۔

حکیم وقار احمد خاں، گریڈیہہ

س : انسان جان بوجھ کر غلطی کب کرتا ہے؟

ج : انتقام کے جذبے میں یا حسد سے مجبور ہو کر۔

س : محبت میں قربانی کب جائز نہیں ہوتی؟

ج : جب وہ قربانی قربانی سمجھ کر دی جائے۔

س : گناہ میں اتنی لذت کیوں ہوتی ہے؟

ج : گناہ کی لذت اس کے بعد کے پچھتاوے کی مناسبت سے ہوتی ہے۔

شہزاد انور محی الدین انجانا، کٹیہار ۵

س : کیا ہر انسان کو رنج کے وقت کے لئے دوست بنانا چاہئے؟

ج : اگر آپ خود اپنے دوست ہیں تو دوست بنانے کی ضرورت نہیں۔

شمیم اختر، کلکتہ

س : سماج میں اپنا مقام بنانے کے لئے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہئے؟

ج : اپنا راستہ، اپنی خواہش، اہلیت اور قابلیت کے مطابق بنایئے۔ سماج میں مقام خود بخود مل جائے گا۔

کلام احمد آرزو، ہزاری باغ

س : پیار کا موسم کب آتا ہے؟

ج : ہندوستان میں ساون کے مہینے میں۔
مغربی ممالک میں دھوپ نکلنے پر۔
روس میں موسم گرما میں۔
جنوب مغربی بحر الکاہل میں تمام سال۔

س : مرد کے سامنے عورت کی کیا حقیقت ہے؟

ج : وہی جو گھڑے کے سامنے کمہار کی ہوتی ہے۔

شہناز نسیم، جھریا

س : ماں باپ کو اپنی لڑکی کی شادی کتنی عمر میں کرنی چاہئے؟

ج : اگر لڑکی تعلیم حاصل کر رہی ہو تو اسے فارغ ہونے کے بعد جب اچھا بر مل جائے۔

س : لڑکیوں کو تعلیم کہاں تک حاصل کرنی چاہئے؟

ج : جہاں تک ان کی قابلیت اور حالات اجازت دیں۔

قاضی سعید الدین، بدنیرہ گنگاٹی

س : خوبصورت اور خوب سیرت شریک زندگی کے متعلق آپ جیسے تجربہ کار اور صاحب رائے کا کیا نظریہ ہے؟

ج : سیرت کے ہم غلام ہیں صورت ہوئی تو کیا
سرخ و سفید خاک کی صورت ہوئی تو کیا

س : کیا دولت اولاد سے زیادہ عزیز ہوتی ہے؟

ج : لوگ اولاد کو بھی دولت سمجھتے ہیں۔ اس لئے دونوں کا پلڑا برابر رہتا ہے۔

محمد تمیز احمد، نظام آباد

س : ان پڑھ اور اندھے میں کیا فرق ہے؟

ج : اندھا بصارت سے محروم ہوتا ہے اور ان پڑھ بصیرت سے۔

س : انسان کو مسرت کہاں سے حاصل ہوتی ہے؟

ج : دوسروں کو مسرت کے مواقع مہیا کر کے۔

س : قلم اور تلوار دونوں میں کس کو بڑا مقام حاصل ہے؟

ج : ایک آدمی کی تلوار کوئی کارنامہ انجام نہیں دے سکتی، مگر ایک آدمی کا قلم دنیا کو ہلا سکتا ہے۔

نائلہ سلطانہ، واسع پور (دھنباد)

س : پیار کرنے والوں کی آخری منزل کہاں ہوتی ہے؟

ج : [illegible]

بینگن کا اچار

بینگن (گول) ۵۰۰ گرام
لہسن ۱۲ جوئے
ادرک ایک انچ کا ٹکڑا
لال مرچ ۱۰ عدد
ہلدی پاؤ چائے کا چمچہ
رائی ڈیڑھ ٹیبل اسپون
گڑ ۲ ٹیبل اسپون
چھوٹی الائچی ۸ عدد
دار چینی ایک انچ کا ٹکڑا
لونگ ۵ عدد
کالی مرچ ۱۰ عدد
سرکہ ¾ پیالی
سرسوں کا تیل ایک پیالی
نمک حسب ذائقہ
پودینے کی پتیاں ایک ٹیبل اسپون

بینگن کو دھو لیں اور کسی صاف کپڑے سے پونچھ کر خشک کر لیں۔ پھر چھیل کر آدھا آدھا انچ کے موٹے گول ٹکڑے کاٹ لیں۔

ادرک اور لہسن کو چھیل لیں پھر ادرک، لہسن اور لال مرچوں کو تھوڑا سرکہ ڈال کر سِل پر باریک پیس لیں۔

گڑ کو ایک کاٹ کر باقی کے سرکہ میں ڈال دیں۔

چھوٹی الائچی، دار چینی، لونگ اور کالی مرچوں کو سِل پر سرکہ [illegible] پیس لیں۔ ایک کڑھائی میں تیل ڈال کر آنچ پر گرم کریں پھر اس میں پسی ہوئی ادرک، لہسن، لال مرچ اور ہلدی ڈال کر بھون لیں [illegible] پھر اس میں بینگن کے ٹکڑے اور نمک بھی ڈال دیں [illegible] [illegible] سرکہ ڈال [illegible] پھر [illegible] ڈال کر

کڑھائی کو آنچ سے اتار لیں۔ ٹھنڈا ہو جائے تو کسی صاف اور خشک جار میں ڈال کر رکھ دیں۔ یہ اچار دو چار روز میں ہی ختم کر لیں ورنہ خراب ہو جائے گا۔

کشم لتا، کلکتہ

روے اور بیسن کے پکوڑے

روا آدھی پیالی
بیسن پاؤ پیالی
دہی پاؤ پیالی
لال مرچ پاؤ چائے کا چمچہ
ہری مرچ ۲ عدد
ہرے دھنیے کی پتیاں ۲ چائے کے چمچے
گرم مسالہ پاؤ چائے کا چمچہ
پیاز (چھوٹا سائز) ایک ڈلی
نمک حسب ذائقہ
گھی حسب ضرورت

روے اور بیسن کو چھان کر ملا لیں، دہی کو [illegible] اچھی طرح پھینٹ لیں۔ پیاز چھیل لیں پھر پیاز اور ہری مرچ کا باریک کچومر کاٹ لیں اور روے اور بیسن میں ملا دیں۔ لال مرچ، گرم مسالہ، ہرے دھنیے کی پتیاں اور نمک بھی ملا لیں پھر تھوڑا پانی اور دہی ڈال کر پکوڑوں کے بیسن کی طرح گھول لیں۔

ایک کڑھائی میں گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں، گھی گرم ہو جائے تو اس میں چھوٹی چھوٹی ٹکیاں تل لیں۔ سنہری ہو جائیں تو [illegible] اتاریں، نکال کر [illegible]

[illegible]

گھی کاغذ میں جذب ہو جائے تو ٹماٹر کی یا ہری چٹنی کے ساتھ گرم گرم نوش فرمائیں۔

مس تنویر عبداللہ، شکر نگر، حیدر آباد

چنے کی دال کی پوریاں

چنے کی دال ایک پیالی
آٹا ۲ پیالی
لال مرچ ۶ عدد
ہری مرچ ۴ عدد
لہسن ۴ جوئے
بڑی الائچی ۴ عدد
دار چینی ایک انچ کا ٹکڑا
سونف ۲ چائے کے چمچے
گھی حسب ضرورت
نمک حسب ذائقہ

دال کو صاف کر کے دو گھنٹے کے لئے بھگو دیں۔

پھر ایک دیگچی میں دال، ہری مرچیں، لال مرچیں، نمک اور گلنے کے انداز کا پانی ڈال کر دیگچی کو آنچ پر رکھ دیں۔ دال گل جائے اور پانی بالکل خشک ہو جائے تو آنچ سے اتار کر سِل پر پیس لیں۔

لہسن چھیل لیں، بڑی الائچی کے دانے نکال لیں پھر لہسن، بڑی الائچی کے دانے، سونف اور دار چینی کو بھی سِل پر پیس کر دال میں ملا دیں۔

آٹے میں نمک اور پانی ملا کر گوندھ لیں پھر اس کے چھوٹے چھوٹے دس پندرہ پیڑے بنا لیں۔ دال کے بھی اتنے ہی حصے کر لیں۔

ایک پیڑے کو ہتھیلی پر رکھ کر دوسرے ہاتھ سے اس کو تھوڑا سا پھیلا دیں اور اس پر ایک حصہ دال رکھ کر پیڑے کو دوبارہ بنا لیں۔ اسی طرح تمام پیڑے بنا کر رکھ لیں اور ان پر ایک صاف گیلا کپڑا ڈھانپ دیں۔

اب ایک کڑھائی میں گھی ڈال کر آنچ پر

رکھ دیں گھی گرم ہو جائے تو ایک پیڑے کی پوری
بنا کر ڈال دیں، ایک طرف سے بادامی ہو جائے تو
پلٹ دیں دوسری طرف سے بادامی ہو جائے تو گھی
سے نکال لیں اسی طرح تمام پوریاں تل لیں۔
ریحانہ خاتون، آسنسول۔

سیب کا سوپ

سیب	۵۰۰ گرام
کشمش (بڑے سائز کی)	۵۰ گرام
چینی	۲ چائے کے چمچے
انڈے کی سفیدی	ایک عدد
لیموں کا چھلکا	ایک عدد
کالی مرچ	حسب ذائقہ
نمک	حسب ذائقہ

سیبوں کو چھیل کر کچومر کاٹ لیں گٹھلیاں
پھینک دیں۔ لیموں کے چھلکے کے چار ٹکڑے کر لیں۔
کشمش کو صاف کر کے دس منٹ کے لئے گرم پانی
میں بھگو دیں۔
ایک دیگچی میں سیب کا کچومر لیموں کے چھلکے
چینی اور آٹھ پیالی پانی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں سیب
گل جائیں تو آنچ سے اتار لیں اور باریک چھلنی میں
ڈال دیں پھر چمچے سے مل کر چھان لیں۔
انڈے کی سفیدی کو ہلکا سا پھینٹ لیں
اب چھنے ہوئے سوپ کو دوبارہ آنچ پر
رکھ دیں پھر اس میں کالی مرچ، نمک، کشمش اور
انڈے کی سفیدی ڈال کر تیزی سے خوب اچھی طرح
ملا دیں اور گرم گرم نوش فرمائیں۔ نائمہ شیخ، بمبئی۔

اورنج سوفلے

انڈے	۳ عدد
جیلاٹین	۲ چائے کے چمچے
اورنج کلر	½ چائے کا چمچہ
اورنج ایسنس	½ چائے کا چمچہ
کریم	¾ پیالی
چینی	پاؤ پیالی یا حسب ذائقہ
چینی (بورا)	۲ چائے کے چمچے
لیموں کا عرق	۳ چائے کے چمچے
سنگترے کا عرق	½ پیالی
نمک	⅛ چائے کا چمچہ
چیری	۸ عدد

جیلاٹین کو ½ پیالی پانی میں بھگو دیں۔
لیموں کا عرق، سنگترہ کا عرق، چینی اور نمک
کو ایک چھوٹی دیگچی میں ڈال لکڑی کے چمچے سے ملائیں
اب ایک تھوڑی بڑی دیگچی میں چھوٹی دیگچی کو رکھ
دیں اور بڑی دیگچی میں اتنا پانی ڈال دیں کہ اس میں
چھوٹی دیگچی آدھی ڈوب جائے پھر دیگچی کو آنچ پر
رکھ دیں چھوٹی دیگچی میں چمچہ چلاتی رہیں چینی گھل جائے
تو اس میں جیلاٹین بھی شامل کر لیں جیلاٹین گھل جائے
تو آنچ سے اتار لیں اور چھوٹی دیگچی کو بڑی دیگچی سے
نکال کر برف پر یا ریفریجریٹر میں ٹھنڈا کرنے کے
لئے رکھ دیں جیلاٹین تھوڑا گاڑھا ہو جائے تو ریفریجریٹر
سے نکال کر اس میں ایسنس اور رنگ ملا دیں۔
انڈوں کو توڑ کر زردی اور سفیدی علیحدہ علیحدہ
کر لیں پھر زردی کو ہلکا سا پھینٹ لیں اور سفیدی
کو اتنا پھینٹیں کہ اس کے جھاگ سخت ہو جائیں
پھر زردی اور سفیدی کو جیلاٹین میں لکڑی کے چمچے
سے ملا دیں۔
پاؤ پیالی کریم کو چمچی سے پھینٹ کر تھوڑی
گاڑھی کر لیں پھر وہ بھی جیلاٹین میں شامل کر دیں۔
اب کسی گول یا چوکور سانچے میں ویکس پیپر
بچھا کر اس پر یہ محلول الٹ دیں اور سانچے کو ریفریجریٹر
کے برف کے خانے میں رکھ دیں جم جائے تو نکال لیں۔
باقی کی کریم میں ½ پیالی پانی اور بورا چینی
ملا کر چمچی سے اتنا پھینٹیں کہ کریم تھوڑی گاڑھی
ہو جائے تو سوفلے کو سانچے سے نکال کر ڈش میں رکھ
دیں پھر اس پر کریم پھیلا دیں اور چیری سجا دیں
پھر ڈش کو ریفریجریٹر کے نچلے خانے میں رکھ دیں۔
پیش کرتے وقت ہی ریفریجریٹر سے نکالیں۔
فرح، دہلی

مکھن پنیر چاول

چاول (سیلا)	۲۵۰ گرام
مٹر	۳۰۰ گرام
پنیر (ڈبے کا)	۵۰ گرام
پیاز (درمیانہ سائز)	ایک ڈلی
ہرے دھنیے کی پتیاں	۲ ٹیبل اسپون
مکھن	آدھی پیالی
نمک	حسب ذائقہ

چاولوں کو صاف کر کے پکانے سے دو گھنٹے
پہلے بھگو دیں۔
مٹر کے دانے نکال لیں پھر ایک دیگچی میں
مٹر کے دانے، نمک اور گلنے کے انداز کا پانی ڈال کر
آنچ پر رکھ دیں مٹر گل جائے اور پانی خشک ہو جائے
تو آنچ سے اتار لیں۔
پیاز چھیل کر کچومر کاٹ لیں، اب ایک
دوسری دیگچی میں پیاز کا کچومر اور مکھن ڈال کر آنچ پر
رکھ دیں پیاز ادھ کچری ہو جائے تو ہرے دھنیے
کی پتیاں اور چاول ڈال کر ایک دو منٹ بھون
لیں پھر نمک اور چاول گلنے کے انداز کا پانی ڈال
کر دیگچی کو ڈھانپ دیں چاولوں میں ایک کنی
رہ جائے تو مٹر کے دانے بھی اس میں شامل کر دیں
اور دیگچی کو دوبارہ ڈھانپ دیں چاول گل جائیں
اور پانی خشک ہو جائے تو پانچ سات منٹ کے
لئے دم پر ڈال دیں۔
ڈش میں نکالنے کے بعد پنیر کو کدوکش
میں کس کر اوپر سے چھڑک دیں۔ فردوس فاطمہ، ہبلی

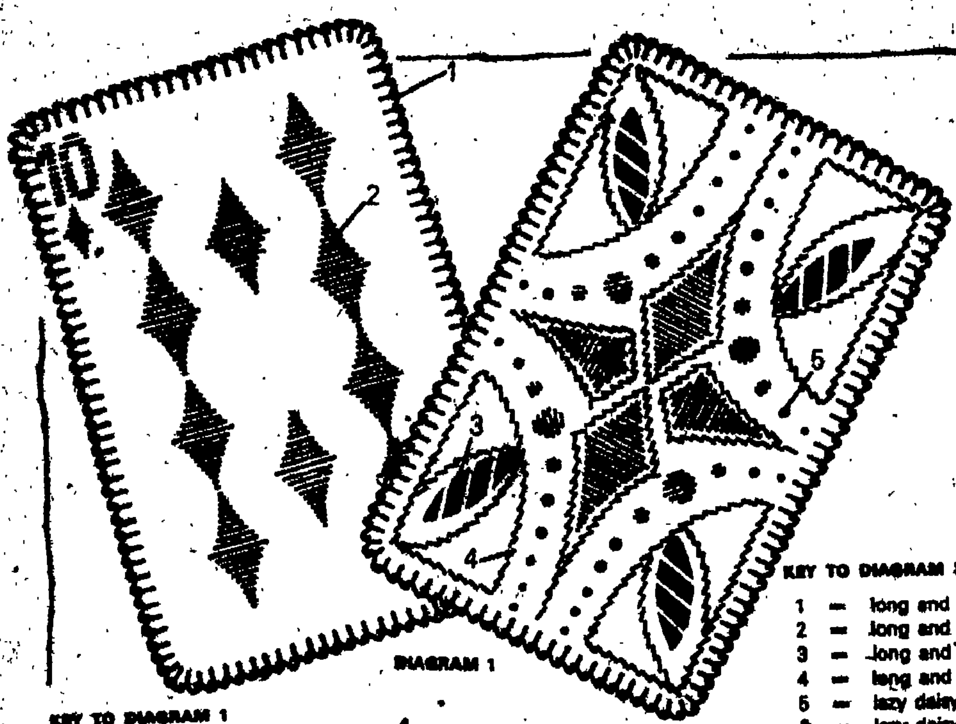


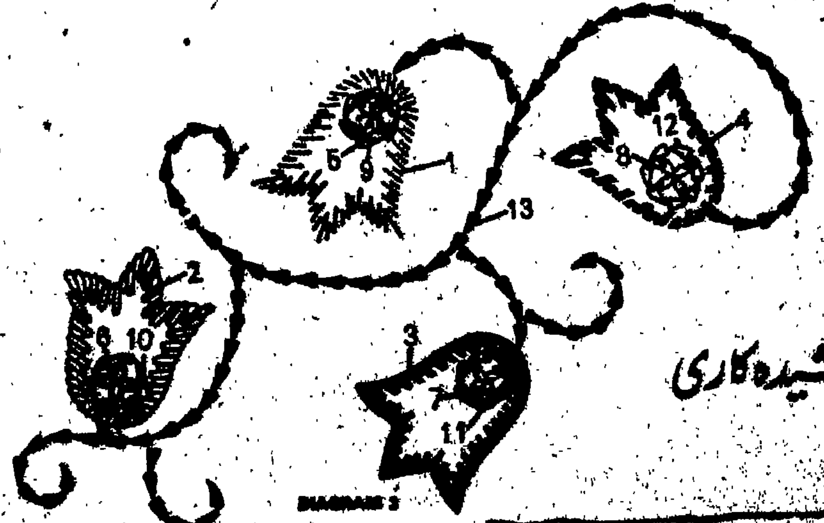
DIAGRAM 1

KEY TO DIAGRAM 2

1 — long and short stitch 33
2 — long and short stitch 186
3 — long and short stitch 94
4 — long and short stitch 19
5 — lazy daisy stitch 94
6 — lazy daisy stitch 19
7 — lazy daisy stitch 33
8 — lazy daisy stitch 186
9 — chain stitch 94
10 — chain stitch 19
11 — chain stitch 33
12 — chain stitch 186
13 — chain stitch 360

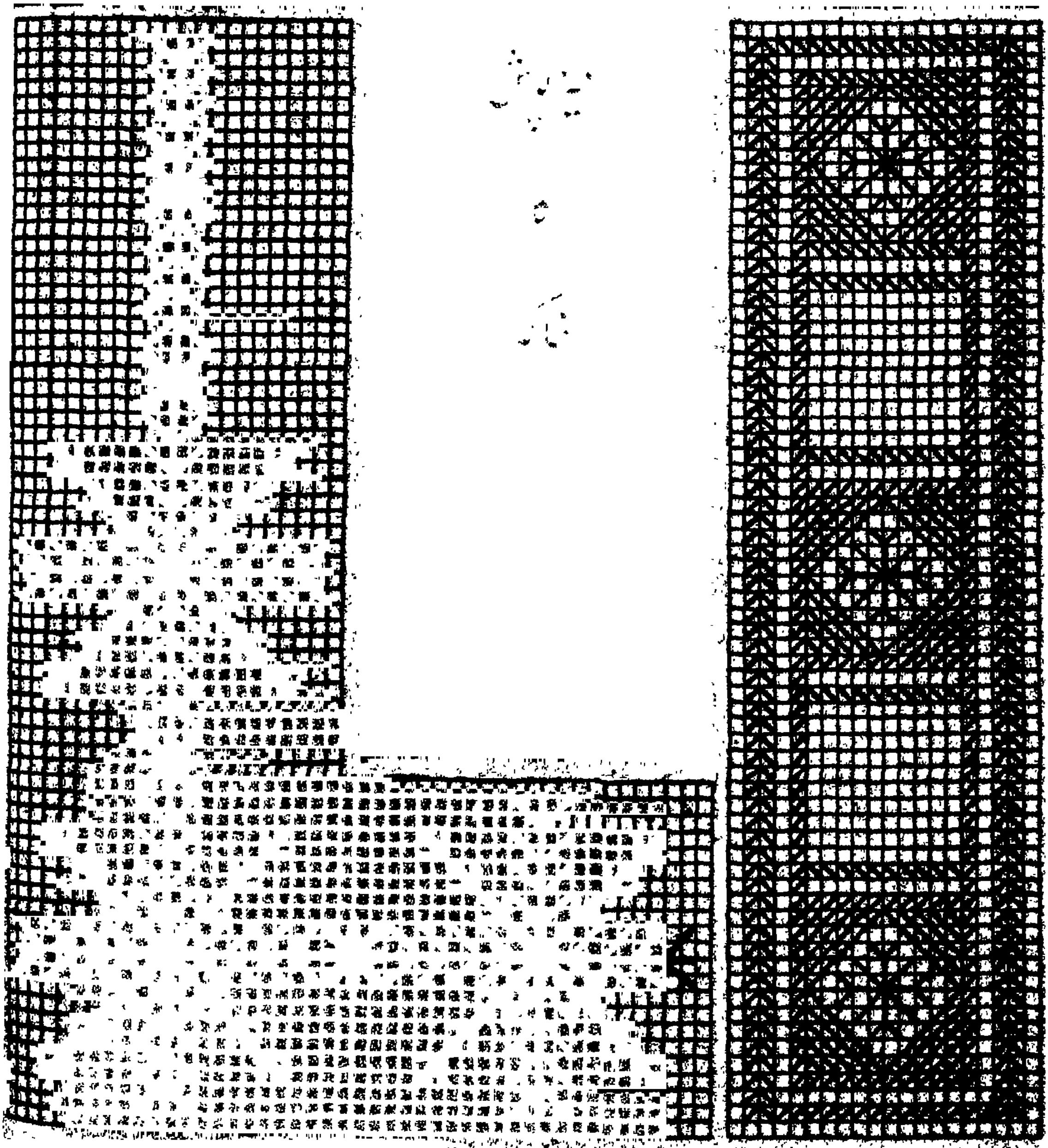
KEY TO DIAGRAM 1

1 — buttonhole stitch Black with 2 strands
2 — satin stitch 335 with 2 strands
3 — satin stitch 398 with 3 strands
4 — stem stitch 309 with 2 strands
5 — french knots 335 with 6 strands



دل کش کشیدہ کاری

DIAGRAM 2



میزپوش کو کراس اسٹچ سے خوب صورت بنائیے

[illegible]

پاگل	رئیس احمد جعفری	۵ روپے
پہلی لڑکی	رازداں۔ ایم۔ اے	۲ روپے ۲۵ پیسے
جاتی ہوئی بہار	وحشی محمود آبادی	۵ روپے
جذبۂ دل	معین شاہد	۵ روپے
رہ گزر	انیس مرزا	۵ روپے ۵۰ پیسے
زرینہ	رئیس احمد جعفری	[illegible] روپے
عشق بلاخیز	سید قاسم محمود	۶ روپے
ظالم	سعید امرت	۴ روپے
مجھے تم سے محبت ہے	نقی نور	۴ روپے ۲۵ پیسے
نئے قدم	ہاجرہ نازلی	۵ روپے ۵۰ پیسے
ننگا شہر	احمد شجاع پاشا	۶ روپے
رام محمد ڈیسوزا	علی رضا	۵ روپے
بیراگ (فلمی باتصویر کہانی)		۵ روپے
اسلام اور فیملی پلاننگ (مسئلہ ضبط ولادت)	علامہ زید ابوالحسن فاروقی	۷ روپے

شمع بک ڈپو

[illegible]

آٹھ ہزار روپے کے نقد انعامات کی شاندار تقسیم

شمع مِنی معمّہ نمبر ۲

صحیح حل شمع مِنی معمّہ نمبر ۲

د	ص	س	ت	■	■
م	و	و	م	■	■
ک	ب	گ	■	ٹ	چ
ت	ے	■	ص	س	م
ا	■	ے	ت	ل	ٹ
■	ی	تا	ا	ث	ٹ

شمع مِنی معمّہ نمبر ۲ آسان ثابت ہوا اور ڈھیروں بالکل دُرست حل ہم تک پہنچ گئے۔ ان دُرست حلوں پر پہلا انعام مبلغ پانچ ہزار روپے تقسیم کیا گیا۔

شمع مِنی معمّوں کی تیز رفتاری بے مثال ہے۔ دُرست حل ظاہر کئے جانے کے چند ہی گھنٹوں میں چیکنگ ختم کر کے تقسیم انعامات کا اعلان کر دیا گیا۔ جن پرستاروں نے صحیح حل بھیجنے کے لئے کامیابی حاصل کی تھی انہیں تقسیم انعامات کی تفصیلات بھی لکھوا دی گئیں — دوبارہ جانچ کے ۲ گھنٹے کم کا انتظار کئے بغیر ہی پہلے اور دوسرے انعامات کے منی آرڈر بھیج دئے گئے۔

بالکل دُرست حل ۹ موصول ہوئے جن پر پہلا انعام مبلغ پانچ ہزار روپے بحساب ۵۵۵ روپے ۵۶ پیسے فی حل تقسیم کیا گیا

۱۔ راج رانی صاحبہ زوجہ کرشن چند صاحب، مکان نمبر ۱۵/۲ نزد [illegible] سندر، بجرپور، شاہدرہ، دہلی ۳۲

۲۔ محمد جمیل الدین صاحب، مکان نمبر ۲۱-۳-۶، محلہ چیلہ پورہ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

۳۔ جے۔ اے قریشی صاحب، قریشی کتاب گھر، بہادر گنج، شاہجہاں پور۔

۴۔ کھتری محمد حسین صاحب، معرفت ادبی کتب خانہ، وزیر بلڈنگ بھنڈی بازار، بمبئی ۳

۵۔ قمر تسلیم صاحب، گیو اینڈ [illegible]، کچہری بازار، امروہہ۔

۶۔ شبیر احمد صاحب ولد نصیر احمد صاحب، موضع و ڈاکخانہ کھاری، ضلع بجنور۔

۷۔ یعقوب خاں صاحب، گولڈن کیفے، عشرت مارکیٹ، رامپور۔ ۲۴۴۹۰۱

۸۔ ماسٹر حبیب احمد صاحب مکان نمبر ۱۹۵۸، محلہ پہاڑی، دہلی ۱۱۰۰۰۶۔

۹۔ محمد عبداللہ شریف صاحب، معرفت سی او پیندر ریڈی صاحب، مکان نمبر آر ۲/۲۰، میونسپل کالونی، ملک پیٹھ، حیدرآباد ۵۰۰۰۳۶۔

ایک غلطی والے ۲۹ حل موصول ہوئے جن پر دوسرا انعام مبلغ تین ہزار روپے بحساب [illegible] روپے [illegible] پیسے فی حل تقسیم کیا گیا

[illegible]

[illegible]

شمع
مینی معمہ
نمبر ۲۱

Rs. 8,000/-

آٹھ ہزار روپے کے نقد انعام

پہلا انعام بالکل درست حل پر پانچ ہزار روپے دوسرا انعام ایک غلطی والے حل پر تین ہزار روپے

فیس داخلہ فی حل: ایک روپیہ۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ فیس داخلہ پوسٹل آرڈر، منی آرڈر یا شمع ادبی معمہ کے نقد کوپنوں کی شکل میں ادا کی جا سکتی ہے۔ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید اپنے حلوں کے ساتھ بھیجئے۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ ان کی فیس ایک ساتھ بھیج سکتے ہیں اور ہر حل پر علیحدہ انعام کے حق دار ہو سکتے ہیں۔ کوئی کوپن بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کوپن بھیجنے کی شرط کے علاوہ شمع ادبی معموں کی دوسری تمام شرائط شمع مینی معمہ پر بھی عائد ہیں۔ ان کی پابندی ضروری ہے۔

دفتر شمع (شمع ادبی معمہ) میں ڈاک سے اس معمے کے حل وصول ہونے کی آخری تاریخ: ۲۵ جون ۹۹ء ۵ بجے شام تک

شمع مینی معمہ نمبر ۲۱

ے	د	ن	س	۱	■
ن	ا	ہ	۲	■	۳
ٹ		۴	■	۵	
	ک	■	۶	ل	ک
■	■	۷	و		ن
■	■	م	ئ	ل	ے

اشارے

دائیں سے بائیں

۱۔ جنگل میں ہر نسل کے ۔۔۔ کچھ نہ کر تو یکساں طور رہتے ہیں لیکن وسائل، فنا و بقا کی مسلسل جدوجہد میں مصروف ہوتے ہیں

۲۔ ۔۔۔ کی ہر شے بنانے والے کی قدرت کا کمال ظاہر ہوتا ہے

۳۔ تجارت میں جب تک روپیہ جلد سے جلد ۔۔۔ کرنے لگے کامیابی نہیں مل سکتی

۴۔ اولاد ۔۔۔ صحیح تربیت کے لئے ماں کی پوری توجہ چاہیے

اوپر سے نیچے

۵۔ تھوڑے ہی عرصے میں ہر طرف بغاوت کے شعلے ۔۔۔ لگے اور پھر ظلم کا اندھیرا کافور ہو گیا

۶۔ قانون میں جھگڑا کرنے سے کچھ نہیں مل سکتا ہے۔ ۔۔۔ کچھ حاصل ہی کیا جا سکتا

۷۔ سالے تعلقات میں شگاف ۔۔۔ کیا آج کل جیسا پہلے تھا ویسا ہی

۸۔ ۔۔۔ کے ۔۔۔ [illegible]

شمع ادبی معمے (شمع مینی معمہ نمبر ۲۱) ماہنامہ شمع آصف علی روڈ، نئی دہلی

★ اب آپ ایک شمع ادبی معمے اور دوسرے شمع ادبی معمے کے حل بھیجنے کے درمیان اپنے ادبی ذوق کی تسکین کر سکتے ہیں ۔۔۔ مینی معمے کے ذریعے!

★ کوئی کوپن بھیجنے کی قید نہیں!

★ جتنے حل جی چاہے بھیجئے۔ اپنے تمام حلوں کی فیس یکجا ایک ہی منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا نقد ناموں سے بھیج سکتے ہیں

★ آپ ہر حل پر انعام کے حق دار بن سکتے ہیں۔ فیس داخلہ فی حل صرف ایک روپیہ

★ صرف آٹھ اشارے

انعام پانا کس قدر آسان!

★ فیس داخلہ بھیجنے کے لئے شمع ادبی معموں کے نقد کوپن استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ یا پوسٹل آرڈر، منی آرڈر بھیجئے۔ اپنے حلوں کے ساتھ منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا نقد کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید ضرور بھیجئے

صحیح حل: حل اور صحیح حل کا نتیجہ ماہنامہ "شمع" یا ماہنامہ "شمع" میں دیکھئے

★ شمع مینی معمہ نمبر ۲۱ کا نتیجہ جولائی ۹۹ء کے ماہنامہ شمع کے شمارے میں شائع کیا جائے گا۔

بانو

نئی دہلی

اشاعت کا اکتیسواں سال۔ ساتواں شمارہ

جولائی ۱۹۷۷

نگراں: یوسف دہلوی

مدیرہ: ازینت کوثر دہلوی   ادارۂ تحریر: شمیم آرا دہلوی   سعدیہ دہلوی

مالکان: شمع میگزین ● طابع و ناشر: یونس دہلوی ● مطبوعہ: ایس پی پریس ● ٹائٹل: بمبئی آفسیٹ پریس

عام شمارے کی قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے، سالانہ قیمت: اٹھارہ روپے (جس میں سالنامہ مفت ملتا ہے)

مقام اشاعت و صدر دفاتر: آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲   تار کا پتہ: "شمع" نئی دہلی   ٹیلی فون: ۲۷۲۰۶۶، ۲۷۲۰۹۲، ۲۷۲۰۹۸

دیگر دفاتر: بمبئی، کلکتہ اور مدراس

افتتاحیہ

جب ہم کسی موضوع پر غور و خوض کرتے ہیں تو عموماً ہماری رائے پہلے سے ہی ہمارے ذہن میں مرتب ہوتی ہے۔ بظاہر ہم تصویر کے دونوں رُخ دیکھتے ہیں، لیکن حقیقت میں ہم اپنا ہی نقطۂ نظر مقدم رکھتے ہیں اور ہمارا غور و فکر محض ہمارے پہلے سے کئے ہوئے فیصلہ کے لئے دلائل مرتب کرنے تک محدود ہوتا ہے۔ کسی چیز کا اصل رنگ دیکھنا ہمارے لئے دشوار ہے۔ ہماری آنکھوں پر پہلے سے جس رنگ کی عینک چڑھی ہوتی ہے، وہی رنگ ہمیں نظر آتا ہے۔ اگر ہم کسی انسان کو پسند کرتے ہیں تو اس کی بُرائی سُننا گوارہ نہیں کرتے، اگر کسی کو بُرا سمجھتے ہیں تو اس کی کوئی خوبی ہمیں متاثر نہیں کرتی۔ دونوں صورتوں میں فیصلہ ہمارے جذبات کرتے ہیں۔ یہ روبہ صحت نہیں ہے۔ مخالفت برائے مخالفت اور موافقت برائے موافقت، دونوں ہی صورتوں میں انسان اپنے جذبات کا قیدی بن کر رہ جاتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ کسی بھی موضوع پر نتیجہ تک پہنچنے سے پہلے ہم خود اپنے آپ سے سوال کریں کہ کہیں ہم نے یہ فیصلہ جذبات کی رو میں بہہ کر تو نہیں کیا؟ کیا ہم نے واقعی غیر جانب داری سے کام لیا ہے؟ ان سوالوں کا سچائی سے جواب دے کر ہی ہم اپنے اور دوسروں کے مسائل انصاف اور ایمان داری سے حل کرنے میں کام یاب ہو سکتے ہیں۔

زینت کوثر



بحرینی عورتوں کی رفتارِ ترقی

ثمینہ مطلوب احمد

بحرین خلیج عرب کا وہ ننھا سا ملک ہے جو سعودی عرب کے مشرقی ساحل پر خلیجِ عرب کے بالکل وسط میں واقع ہے۔ اسے عرب دنیا جزیروں کا ملک کہہ کر پکارتی ہے کیوں کہ صرف چار سو مربع میل کے رقبہ والا یہ ملک کل ۳۳ جزیروں پر مشتمل ہے۔ ان جزیروں میں دارالسلطنت منامہ سب سے بڑا ہے۔ منامہ بحرین کے بالکل شمال میں واقع ہے۔ راج دھانی ہونے کی وجہ سے تمام سرکاری دفاتر اور بڑی بڑی تجارتی کمپنیاں یہیں ہیں۔ بحرین کے امیر کا محل بھی یہیں ہے۔ دوسرے نمبر پر شہر محرق آتا ہے جسے ایک بہت بڑے پل کے ذریعہ منامہ کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ پٹرول کا جزیرہ "سترہ" ہے جہاں پٹرول کے بڑے بڑے کنوئیں ہیں، اور جہاں سے دنیا کے بہت سے ملکوں کو پٹرول بھیجا جاتا ہے۔ یہیں سے سعودی عرب کے پٹرول پائپ کی لائن بھی گزرتی ہے تاکہ سعودی پٹرول کو بحرین کی بندرگاہوں کے ذریعہ دنیا بھر کے ملکوں کو بھیجا جا سکے۔

دیگر عرب ملکوں کی طرح بحرین میں بھی آج کل دولت کی فراوانی ہے، پٹرول کی شکل میں کالے سونے کی دریافت سے یہاں کے لوگوں کا معیارِ زندگی کافی بلند ہو چکا ہے اور ترقی کی دوڑ میں یہ ننھا سا ملک بھی کافی تیزی کے ساتھ آگے کی طرف بڑھ رہا ہے لیکن اس کے باوجود اسے دیگر عرب ملکوں میں ایک نمایاں خصوصیت حاصل ہے اور وہ ہے قدیم روایات اور رسم و رواج کو جوں کا توں برقرار رکھنا اور شاید قدامت سے حد درجہ پیار اور لگاؤ ہی کی وجہ سے یہاں کے لوگوں کو اپنے مذہب سے گہرا اور بڑا جذباتی لگاؤ ہے۔

ایک مسلمان ملک ہونے کے ناطے اور پھر روایتی طور سے قدامت پرست ہونے کی وجہ سے



▲ دو لڑکیاں بحرین کے قومی لباس میں

یہاں کی عورتوں میں بھی دیگر خلیجی ریاستوں کی طرح تعلیم کا رواج نہیں تھا۔ پردے کی رسم کی شدت سے پابندی کی جاتی تھی۔ گزشتہ برسوں کے دورانِ تعلیم کے میدان میں بحرین نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ بحرین میں پہلے تعلیم کے دروازے صرف مردوں کے لئے کھلے تھے، عورتیں اس نعمت سے تقریباً محروم تھیں، مگر اب یہ بات نہیں ہے۔ لڑکیوں نے بڑی تیزی کے ساتھ تعلیم گاہوں کا رُخ کیا ہے اور بہت سی لڑکیوں نے تو امریکہ اور برطانیہ وغیرہ کی یونی ورسٹیوں میں بھی تعلیم پائی ہے۔ قاہرہ یونی ورسٹی سے فارغ التحصیل لڑکیوں کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ان کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ اس طرح عورتوں کی تعلیم کے میدان میں بحرین اپنی پڑوسی خلیج کی ریاستوں سے بہت آگے ہے۔



▲ زری کا روایتی کام ہو رہا ہے



▲ بحرین کی ایک سپاہی عورت



▲ شادی کا ایک جشن

بحرین میں عورتوں کی تعلیمی ترقی ہی قابلِ ذکر بات نہیں ہے، یہاں کی نسواں پولیس بھی عربوں اور غیر عرب ممالک کے لئے کافی دل چسپی کا باعث ہے۔ بحرین عرب دنیا کا وہ واحد ملک ہے جس نے پہلی بار عورتوں کی ایک باقاعدہ پولیس فورس قائم کی اور ان کی بہترین کارگزاری پر دنیا بھر کے ملکوں سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ بحرین میں عورتوں کی اسپیشل پولیس بنانے کا منصوبہ آج سے پندرہ سال پہلے بنایا گیا تھا اور وہ بھی صرف ایک محدود مقصد کے تحت ــــ یعنی بحرینی بندرگاہوں اور ہوائی اڈوں سے گزرنے والی مشتبہ عورتوں پر نظر رکھنا اور بوقتِ ضرورت ان کی جامہ تلاشی لینا، لیکن رفتہ رفتہ جب ان کی افادیت اور کارکردگی کا مظاہرہ ہونا شروع ہوا تو اس سلسلے میں مزید پیش رفت کی گئی اور نسواں پولیس کا ایک باقاعدہ ڈویژن بنایا گیا۔ اس سلسلے میں کیپٹن عائشہ ذوادی نے بہت نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ عائشہ ذوادی جب قاہرہ یونی ورسٹی سے بی اے کی ڈگری لے کر وطن واپس لوٹیں تو ان سے عورتوں کی پولیس کو منظم کرنے کے لئے کہا گیا اور انہوں نے چند سال کے اندر ایک انتہائی تربیت یافتہ اور منظم فورس تیار کر دی، جو آج کل بحرینی پولیس کے لئے ریڑھ کی ہڈی جیسی اہمیت اختیار کر چکی ہے۔ بحرین میں نسواں پولیس کا دائرہ کار صرف سماج کے ناپسندیدہ عناصر اور جرائم پیشہ لوگوں پر نظر رکھنا نہیں ہے۔ بلکہ بہت سے سماجی کام بھی ان کے فرائض میں داخل ہیں۔ وہ ملک کے کونے کونے میں عورتوں اور بچوں کے مسائل پر نظر رکھتی ہیں، بیمار عورتوں کو خود ہی لے جا کر اسپتال میں داخل کر دیتی ہیں اور چھوٹے بچوں کو ذہنی اور جسمانی تربیت دیتی ہیں تاکہ صحت مند ماحول میں ان کی مناسب نشو و نما ہو سکے۔ وہ بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی خبرگیری کرتی ہیں اور اگر انہیں حکومت کی طرف سے کسی مستقل مدد کی ضرورت ہوتی ہے تو یہی پولیس کی لڑکیاں ان کے بارے میں ایک مفصل رپورٹ تیار کر کے حکامِ بالا کو فیصلے کے لئے روانہ کر دیتی ہیں۔ ان سب کاموں کے علاوہ لڑکیوں کی یہ پولیس شہر کے پرائمری اور سکنڈری اسکولوں میں جا کر چھوٹے چھوٹے



▲ بحرین کی دو لڑکیاں

، بچوں اور بچیوں کو دست کاری سکھاتی ہیں، تاکہ آئندہ چل کر انہیں دوسروں کا دستِ نگر بن کر نہ رہنا پڑے۔

بحرینی عورتوں کا قومی لباس ذیلی ڈھالی میکسی سے کافی ملتا جلتا ہے۔ یہ لباس دو حصوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایک حصہ نیچے پہنا جاتا ہے اور پھر کسی برقعے کی طرح لبادہ نام کا کپڑا گردن پر ڈال لیا جاتا ہے

پرانی عورتیں سر پر دوپٹہ اوڑھتی تھیں، مگر نئے زمانے کی لڑکیاں سر کو کھلا رکھتی ہیں۔ زیورات کے سلسلے میں بحرینی عورتوں کا ذوق ہندوستانی عورتوں سے کافی حد تک ملتا ہے۔ گردن میں نیکلس، ہاتھوں میں کنگن اور انگوٹھی وغیرہ بالکل ہندوستان ہی کی طرح پہنی جاتی ہیں۔ ہاں ہمارے یہاں کی طرح چاندی کے زیورات کا رواج یہاں اب بالکل نہیں ہے۔ عورتیں زیورات سے لدی پھندی ہوتی ہیں، مگر وہ صرف سونے کے زیورات پسند کرتی ہیں۔ شادی کے موقعے پر سارے کے سارے زیورات لڑکے والوں کو ہی فراہم کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے علاوہ دلہن کا مزین جوڑا بھی سسرال ہی سے بن کر آتا ہے۔ اس جوڑے پر سونے اور چاندی کا کام ہوتا ہے اور آج کل ایک ایک جوڑے پر ۲۵ ہزار یا اس سے بھی زیادہ خرچ آتا ہے۔ اسی لئے یہاں



▲ شادی کے موقعہ پر روشن مناسبے ہیں

شادی کرنا بہت مہنگا پڑتا ہے۔ یہاں ہندوستان کی طرح لڑکی والوں پر نہیں۔ بلکہ لڑکے والوں پر شادی کے اخراجات کا بار پڑتا ہے۔ مہر کے نام پر لڑکی کے باپ کو بھی خاصی رقم دینا پڑتی ہے، تب جاکے کہیں شادی کی بات پکی ہوتی ہے۔ اسی رواج کی بدولت ایک زمانے میں یہاں غیر ملکی لڑکیوں سے شادی کو پسند کیا جانے لگا تھا۔ خاص طور سے ایسے غریب لوگ

جو لڑکیوں کے والدین کو کافی روپیہ نہیں دے سکتے تھے کسی غیر ملکی لڑکی کے ساتھ شادی کر لیتے تھے۔ لیکن اب لمبے چوڑے مہر کے خلاف بڑے پیمانے پر تحریک چلائی گئی ہے جس کی وجہ سے غیر ملکی لڑکیوں کے ساتھ شادی کے واقعات میں بہت حد تک کمی آگئی ہے۔ لیکن پھر بھی یہ رجحان ابھی تک ختم نہیں ہو سکا ہے۔

مجموعی طور سے بحرینی لڑکیوں کا مستقبل بہت شاندار ہے۔ پٹرول کی دولت دریافت ہونے کے بعد تو ان کے لئے تعلیم و ترقی کے میدان بہت ہی وسیع ہو گئے ہیں۔ اب ضرورت صرف مسلسل محنت اور جدوجہد کی ہے جس کا مادہ بحرینی لڑکیوں میں پوری طرح موجود ہے۔

○○

ن سلطانہ

اُس نے اپاہج بچّوں کے لئے زندگی وقف کردی

آج دنیا میں لاکھوں ایسے بچے خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں، جو بچپن میں پولیو کا شکار ہو گئے تھے۔ یہ کرشمہ ایک عورت کی لگن اور قوت ارادی کا رہین ہے۔ پولیو کا علاج دریافت ہوئے ۴۰ سال کا عرصہ گزر گیا ہے۔ امریکہ کے ڈاکٹر سالک نے پولیو کا ویکسین دریافت کیا تھا۔ پولیو کا مرض شیر خوار بچوں پر حملہ کرتا ہے اور انہیں زندگی بھر کے لئے اپاہج بنا دیتا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب چیچک کی طرح یہ مرض بھی دنیا سے ناپید ہو جائے گا۔ الزبتھ کینی اس زمانے میں پیدا ہوئی تھی، جب پولیو کا کوئی علاج نہیں تھا۔ ڈاکٹر اس مرض کو لاعلاج سمجھتے تھے۔ وہ مریض کی ٹانگیں ایک تختی سے باندھ دیتے اور اسے سیدھا لٹا دیتے۔ اس طرح مریض کی ٹانگیں ہمیشہ کے لئے اکڑ جاتیں، اور وہ عمر بھر کے لئے اپاہج ہو جاتا۔ سسٹر کینی نے اتفاقاً اس مرض کا علاج دریافت کیا۔ وہ نہ ڈاکٹر تھی نہ سائنس داں۔ وہ ایک معمولی نرس تھی جو آسٹریلیا کے ایک پس ماندہ علاقے میں مریضوں کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ ڈاکٹر اور سائنس داں ایک عرصے تک اس کے طریقۂ علاج کی مخالفت کرتے رہے، مگر سسٹر کینی نے ہمت نہ ہاری۔ آخر دنیا نے اس کے طریقۂ علاج کو مان لیا۔ آج ساری دنیا میں کینی انسٹی ٹیوٹ پولیو کا علاج کرتے ہیں۔

آسٹریلیا ایک بر اعظم ہے۔ یہاں آبادی صرف ساحلی علاقوں میں ہے۔ آسٹریلیا کا اندرونی حصہ خشک اور بنجر ہے۔ کینی اسی علاقے میں پیدا ہوئی۔ اس زمانے میں ریلیں اور موٹر کاریں نہیں تھیں۔ آمد و رفت کے لئے گھوڑے کا استعمال کیا جاتا تھا۔ کینی کو گھوڑ سواری کا بہت شوق تھا۔ وہ جب چھ سال کی تھی تو ماہر گھوڑ سوار سمجھی جاتی تھی۔ وہ دن بھر گھوڑے پر سوار رہتی۔ کبھی ڈاک خانے سے ڈاک لاتی، کبھی اپنے دادا کے فارم پر چلی جاتی، جو اس کے گھر سے دس میل دور تھا۔ وہ اسکول بھی گھوڑے پر بیٹھ کر جاتی۔

کینی کے بچپن میں ایک واقعہ ایسا پیش آیا، جس کی وجہ سے اس کی زندگی کا رخ بدل گیا۔ ان دنوں وہ پندرہ سال کی تھی۔ ایک دن اس نے گھوڑے پر زین کسی اور اسے سرپٹ دوڑایا۔ زین کچھ ڈھیلی تھی، اس لئے گھوڑے کی پیٹھ سے پھسل گئی۔ کینی بھی زین کے ساتھ زمین پر گر پڑی۔ اس کے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ قریب ترین ڈاکٹر ۴۰ میل دور رہتا تھا۔ کینی کی ماں نے اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جب کینی ڈاکٹر کے کلینک میں پہنچی تو وہاں کے ماحول سے بہت متاثر ہوئی۔ ڈاکٹر نے اس کی دلچسپی دیکھ کر اس سے سوال کیا "کیا تم آئندہ زندگی میں نرس بننا پسند کرو گی؟" کینی نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

کینی کو ہندوستان سے بہت محبت تھی۔ اس نے سنا تھا کہ ہندوستان ایک غریب ملک ہے۔ وہ عیسائی مشنری بن کر ہندوستانیوں کی خدمت کرنا چاہتی تھی۔ اسے اپنی ٹوٹی ہوئی ہڈی کا علاج کرانے کے لئے کچھ وقت ڈاکٹر کے پاس گزارنا پڑا۔ اس عرصے میں وہ نرسنگ کے پیشے کی طرف مائل ہو گئی۔ اس نے ڈاکٹر سے مالش کا فن سیکھا۔ اس کا ایک بھائی پیدائشی کمزور تھا۔ اس بھائی کو دوسرے بہن بھائی اپنی پیٹھ پر سوار کر کے ادھر ادھر لے جاتے۔ کینی نے ڈاکٹر سے سیکھ کر اپنے کمزور بھائی کی مالش شروع کر دی۔ کچھ ہی دنوں میں وہ خاصا طاقت ور ہو گیا۔ اگلے چند سال اسی طرح گزر گئے۔ ڈاکٹر اس سے نرس کا پیشہ اختیار کرنے کے لئے اصرار کرتا رہا، وہ انکار کرتی رہی۔ اس کے سر پر ہندوستان کا سودا سمایا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے سمجھایا کہ نرس بن کر وہ ہندوستانیوں کی بہتر خدمت کر سکتی ہے۔ کینی نے اس دلیل کے آگے ہتھیار ڈال دئے۔

کینی نے تین سال تک نرسنگ کی تربیت حاصل کی۔ نرس بننے کے بعد ایک بڑا علاقہ اس کے سپرد کر دیا گیا، لیکن اس کے پہلے ہی کیس نے اس کا نصب العین بدل دیا۔ ایک رات اسے ایک مریض کے یہاں جانا پڑا۔ مریض کا گھر تین میل دور تھا۔ وہ ایک طوفانی رات تھی۔ بارش ہو رہی تھی۔ آندھی کے جھکڑ چل رہے تھے۔ گھوڑے کی سواری ناممکن تھی۔ اس لئے اس نے یہ راستہ پیدل طے کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ بارش میں بھیگتی اور کیچڑ میں دھنستی گئی، لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ مگر گھپ اندھیرا ہو جانے سے وہ راستہ بھول گئی۔ یہ ایک پہاڑی علاقہ تھا۔ وہ ایک پہاڑ پر چڑھ گئی۔ جب وہ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچی تو بارش اچانک رک گئی۔ بادل چھٹ گئے اور چاند نکل آیا۔ چاندنی کی مدھم روشنی میں اسے راستہ نظر آ گیا اور مریض کے گھر پہنچ گئی۔ اب اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ہندوستان نہیں جائے گی۔ اس کے ملک کے قریب بھی ایسے مریض موجود ہیں جن کو اس کی زیادہ ضرورت ہے۔



اس فیصلے کے کچھ عرصے بعد اس کی زندگی کا سب سے اہم واقعہ پیش آیا۔ وہ ایک مریض کو دیکھنے گئی۔ مریض کی ایک دو سالہ بچی تھی۔ کینی کا ایسے مریض سے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ بچی پلنگ پر لیٹی تھی۔ اُس کا گھٹنا چہرے کی طرف تھا۔ پاؤں مُڑا ہوا تھا اور وہ درد سے کراہ رہی تھی۔ کینی نے بچی کے گھٹنے کو چھوا تو وہ چیخنے لگی۔ کینی ڈر گئی کہ یہ کون سا مرض ہے۔ اُس نے یہ بیماری کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اُس نے فوراً ڈاکٹر کو فون کیا اور اُسے سب تفصیلات بتائیں، ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ اسے پولیو ہو گیا ہے، اس کی کوئی دوا نہیں۔ ڈاکٹر نے اُسے مشورہ دیا کہ وہ لڑکی کی تکلیف کو رفع کرنے کے لئے کوئی بھی نسخہ استعمال کر سکتی ہے۔ ڈاکٹر نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ کینی نے بچی کی ٹانگ کو سینکنے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ باورچی خانے میں اُسے ایک فرائی پان نظر آیا۔ اُس نے فوراً فرائی پان میں نمک ڈال کر پانی گرم کیا۔ اُس فرائی پان کو ایک تکئے کے غلاف میں رکھ کر اس نے بچی کی ٹانگ کے نیچے رکھ دیا۔ بچی درد سے بلبلا اُٹھی اور چیخیں مارنے لگی۔ کینی نے فرائی پان اُٹھا لیا اور السی کی پلٹس بنا کر بچی کی ٹانگ پر رکھی۔ بچی پھر چیخنے لگی۔ کینی پریشان تھی۔ بچی کا درد کم کرنے کی کوئی ترکیب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ خشک اور تر سنکائی آزما چکی تھی۔ دونوں بے کار تھیں۔ اُس نے سوچا کیوں نہ بھاپ کا عمل آزمایا جائے۔ اُس نے ایک اُونی کمبل پھاڑا، اُس کی لمبی لمبی پٹیاں بنائیں اور ان کو اُبلتے ہوئے پانی میں بھگو کر نچوڑا۔ اُبلتے ہوئے پانی سے اس کی انگلیاں جل گئیں، لیکن اُس نے کوئی پرواہ نہ کی۔ اُس نے گرم گرم پٹیاں بچی کی ٹانگ کے گرد باندھ دیں۔ بچی نے کراہنا بند کر دیا۔ کینی نے دوبارہ پٹیوں کو بھگو کر ٹانگ کے گرد باندھا۔ بچی بالکل خاموش ہو گئی اور تھوڑی دیر بعد آرام سے سو گئی۔

بچی صبح کو سو کر اُٹھی تو اُس کی ٹانگ میں درد نہیں تھا، لیکن اس کے پاؤں ابھی تک ٹیڑھے تھے۔ کینی کو یاد آیا کہ اُس نے اپنے بھائی کی ٹانگوں پر مالش کر کے اُسے بھلا چنگا بنا دیا تھا۔ کیوں نہ یہی نسخہ یہاں آزمایا جائے۔ اُس نے آہستہ آہستہ بچی کی ٹانگوں کی مالش شروع کر دی۔ بچی کی ٹانگوں کے اعصاب نرم ہوتے گئے اور پھر اس کی ٹانگ سیدھی ہو گئی۔ کچھ دن کے علاج سے وہ بالکل تندرست ہو گئی۔

اس علاج میں کامیابی کے بعد کینی نے پولیو کی چھان بین شروع کر دی۔ کینی نے پٹھوں کی مالش سے اس بیماری پر قابو پایا تھا۔ ڈاکٹر کہتے تھے کہ اس بیماری کا پٹھوں سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک چھوت کی بیماری ہے، اس سے مرکزی اعصابی نظام خراب ہو جاتا ہے۔ پٹھے اعصابی نظام کے ماتحت ہیں، اس لئے ان میں بھی خرابی آ جاتی ہے۔ کینی کا مشاہدہ

اس کے برعکس تھا۔ اس کے خیال میں اس بیماری سے پٹھے براہِ راست متاثر ہوتے تھے۔ کینی کے پاس ڈاکٹری ڈگری نہیں تھی۔ وہ ایک معمولی نرس تھی، اس لئے نہ ڈاکٹروں سے اپنی بات منوا نہیں سکتی تھی۔ ڈاکٹر اس کا مذاق اُڑاتے، اُسے جاہل قرار دیتے، لیکن کینی نے ڈاکٹروں کی رائے کی پرواہ نہ کی۔ وہ اپنے طریقے سے پولیو کے مریضوں کا علاج کرتی رہی۔

ایک روز وہ اپنے گھر سے دُور ایک مریض کو دیکھنے گئی۔ یہ بھی ایک مریض تھی۔ یہ بچی درد سے کراہ رہی تھی اور اپنا پیٹ پکڑے لیٹی تھی۔ کینی شش و پنج میں مبتلا ہو گئی۔ اُسے شک تھا کہ لڑکی پر پولیو کا حملہ ہوا ہے، لیکن یہ اپنڈے سائیٹس بھی ہو سکتا ہے۔ دونوں کے علاج بھی ایک دوسرے کی ضد تھے۔ پولیو میں ٹانگ اور پیٹ کی سینکائی کرنا تھی۔ اپنڈے سائیٹس کی صورت میں سینکائی مہلک ثابت ہوتی۔ حرارت پہنچتے ہی اپنڈے سائیٹس پھٹ جاتی اور مریض کی موت واقع ہو جاتی۔ کینی کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ ڈاکٹر وہاں سے میلوں دُور تھا۔ مریض کا گھر ایک دُور افتادہ علاقہ میں واقع تھا۔ آخر اُسے ایک تدبیر سُوجھی۔ وہ گھر سے باہر نکلی اور زور سے چلائی "کوو — ای ی۔ ای ی!" آسٹریلیا میں اس پکار کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بہت مشکل میں پھنس گیا ہے اور مدد کے لئے پکار رہا ہے، جو بھی اس آواز کو سنتا ہے فوراً آواز کی طرف دوڑتا ہے۔ کینی کو یہ آواز بلند کرنے کے بعد ایک خیال آیا اور اس کا خون خشک ہو گیا۔ قریب ہی آسٹریلیا کے وحشی قبائل کی میٹنگ ہو رہی تھی۔ وہ آواز سنیں گے تو دوڑتے ہوئے آئیں گے، لیکن جب انہیں یہ معلوم ہوگا کہ انہیں ایک بیمار بچی کی مدد کے لئے بلایا گیا ہے تو وہ اُسے مار ڈالیں گے، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ وہ صدا بلند کر چکی تھی۔ اُس نے دروازہ بند کر لیا۔

قبائلیوں نے اس کی آواز سُن لی تھی تھوڑی ہی دیر میں سینکڑوں ننگ دھڑنگ لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ ان کے سیاہ اور چمکتے ہوئے جسم رنگین تصویروں سے آراستہ تھے۔ کینی نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا۔ جب اس نے قبائلیوں کے سردار کو مسکراتے ہوئے دیکھا تو اس کی جان میں جان آئی۔ سردار نے بڑی نرمی سے پوچھا "کیا بات ہے؟" ہم آپ کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟" کینی نے سردار کو پہچان لیا۔ کچھ عرصہ پہلے وہ اس کے زیرِ علاج رہا تھا۔ اس کی ٹانگ کٹ گئی تھی۔ کینی نے اس کی مصنوعی ٹانگ فِٹ کی تھی۔ سچ ہے نیکی کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ سردار نے ایک آدمی کو دوڑایا۔ ڈاکٹر نے کینی کے شبہ کی تصدیق کر دی۔ بچی پر پولیو کا حملہ ہوا تھا۔ کینی کے علاج سے وہ جلد اچھی ہو گئی۔

رفتہ رفتہ کینی کا طریقۂ علاج مشہور ہو گیا۔ ڈاکٹر اب بھی بضد تھے کہ کینی کا طریقۂ علاج دُرست نہیں۔ وہ جب سنتے کہ فلاں بچہ کینی کے علاج سے تن دُرست ہو گیا ہے تو کہہ دیتے کہ بچہ پولیو کا مریض ہی نہیں تھا۔ اس عرصے میں جنگ چھڑ گئی۔ کینی کو لندن جانا پڑا۔ لندن سے وہ فرانس گئی اور میدانِ جنگ میں زخمیوں کی دیکھ بھال میں جُٹ گئی۔ ایک دفعہ وہ چھٹیاں گزارنے لندن گئی۔ ایک شام وہ اپنی سہیلی کے ساتھ پارک میں چہل قدمی کر رہی تھی کہ اس کی ملاقات دو آسٹریلین سپاہیوں سے ہو گئی۔ وہ سپاہی اپنے زخموں سے صحت یاب ہو چکے تھے اور لندن گھومنے آئے تھے، لیکن اب ان کے پاس واپس جانے کے لئے پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ ان کا کیمپ لندن سے دُور تھا۔ ان کی گاڑی کے جانے میں نصف گھنٹہ باقی تھا۔ کینی نے ان کی بپتا سُنی تو ان کی مدد کرنے کے لئے بے چین ہو گئی۔ مگر پیسہ اس کے پاس بھی نہیں تھا۔ آخر اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ اُس نے اپنی سہیلی کو اپنے گھر دوڑایا تاکہ وہ اس کی یونی فارم لے آئے۔ کینی سویلین سُوٹ پہنے ہوئی تھی۔ اُس نے یہ سُوٹ بیچنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ سیکنڈ ہینڈ کپڑے خریدنے والے کی دکان پر گئی۔ اور اپنا سُوٹ بیچ کر دونوں سپاہیوں کو کرائے کے پیسے دے دئے۔ دُکان دار اتنا ظالم تھا کہ اس نے پیسے دیتے ہی سُوٹ اُتروا لیا۔ جب تک اس کی سہیلی گھر سے یونی فارم لے کر آئی کینی دُکان میں پھٹی کوٹ پہنے سردی سے کانپتی رہی۔

جنگ کے خاتمے پر کینی آسٹریلیا واپس

آ گئی۔ یہاں پھر وہی لڑائی دوبارہ شروع ہو گئی۔ ڈاکٹر کینی کے طریقۂ علاج کو ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ کینی نے علاج سے پہلے بچوں کے فوٹو لینا شروع کئے اور علاج کے بعد ڈاکٹروں کو معائنے کی صلاح دی۔ آخر وہ یہ جنگ جیت گئی۔

اب مسز کینی کی شہرت یورپ اور امریکہ تک پہنچ گئی تھی۔ امریکہ کے ڈاکٹروں نے اُسے اپنے یہاں آنے کی دعوت دی۔ وہ امریکہ گئی۔ اُس نے وہاں کئی سینٹر کھولے۔ امریکہ کے لوگوں نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اُس نے صدر روزویلٹ کے ساتھ لنچ کھایا۔ صدر روزویلٹ خود پولیو کے مریض رہ چکے تھے۔ مسز کینی نے پولیو کی جنگ جیت لی تھی۔ دنیا کے ڈاکٹروں نے اُس کے آگے ہتھیار ڈال دئے۔ آج دنیا کے کونے کونے میں مسز کینی انسٹی ٹیوٹ پھیلے ہوئے ہیں، جہاں پولیو کا علاج ہوتا ہے۔ ●●

ایم۔ عبداللہ



پانچ سال

میں جب پہلی بار کملا ایڈوانی سے ملا تو اس کی عمر ستر برس کے قریب ہو گی۔ تاہم اس عمر میں بھی وہ بوڑھی نہیں لگتی تھی۔ اس کے بال سفید تھے، لیکن اُس کا چہرہ جھریوں سے پاک تھا۔ بوڑھی ہونے کے باوجود اس میں نسوانی کشش موجود تھی۔ اُس کے اُٹھنے بیٹھنے اور چلنے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ اس نے بہت اچھے ماحول میں تربیت پائی ہے۔ وہ اپنے بھائی رام گڈوانی کے ساتھ رہتی تھی۔ رام گڈوانی بمبئی کا ایک مشہور وکیل تھا۔ میں جب اس سے ایک مقدمے کے سلسلے میں ملنے گیا تو میری ملاقات کملا سے بھی ہو گئی۔

کملا ایک سوشل ورکر تھی۔ وہ جس علاقے میں کام کرتی تھی میرا گھر اس کے قریب ہی تھا۔ وہ کبھی کبھی چلتے پھرتے میرے گھر چلی آتی۔ ہم چائے کے دوران اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے۔ تھوڑی دیر ٹھیرنے کے بعد وہ رخصت ہو جاتی۔ کملا بیوہ تھی۔ اُس کے شوہر کے انتقال کو پندرہ برس گزر چکے تھے۔ کبھی باتوں باتوں میں اس کے شوہر کا ذکر آجاتا تو اس کی آواز رُندھ جاتی۔ اور اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی اُداسی چھا جاتی۔ کملا اکثر اپنے کام کے متعلق باتیں کرتی۔ اس کو غریب اور پس ماندہ لوگوں سے ہمدردی تھی۔ وہ کئی رفاہی اداروں کی ممبر تھی۔

ایک روز جب کملا میرے گھر آئی تو بارش ہو رہی تھی۔ اُس نے اپنی چھتری بند کی۔ اور مجھ سے چائے کی فرمائش کی۔ وہ خاصی پریشان معلوم ہوتی تھی۔ جب چائے آگئی تو اُس نے کہنا شروع کیا۔ "ناتھ صاحب: آج ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ایک ہل مزدور کی بیوی گھر سے بھاگ گئی۔ مزدور نے پولیس میں رپورٹ درج کرائی۔ پولیس نے اس لڑکی کو ڈھونڈ نکالا۔ اُس کو بھگا نے والا اُس کا پڑوسی تھا۔ وہ لڑکی کہتی ہے کہ میں بالغ ہوں۔ مجھے اپنے پڑوسی سے محبت ہے میں اپنے خاوند کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی وہ مجھے مارتا ہے۔ میں اُس سے نفرت کرتی ہوں۔ پولیس نے اُس لڑکی کو ناری نکیتن میں داخل کر دیا ہے۔ اس کے پڑوسی پر مقدمہ چل رہا ہے۔ میں ناری نکیتن میں اُس لڑکی سے ملی۔ میں نے اُس کو بہت سمجھایا کہ وہ اپنے خاوند کے پاس چلی جائے۔ لیکن وہ کسی طرح تیار نہیں ہوئی۔ وہ اپنے خاوند سے طلاق لینا چاہتی ہے۔ بتائیے میں اُسے کس طرح سمجھاؤں۔ شادی ایک مقدس رشتہ ہے۔ اُسے توڑنا اچھا نہیں۔

میں نے کملا کی بات سنی تو حیران رہ گیا۔ وہ ایک عورت تھی۔ عورت ہونے کے ناطے اُسے عورت سے ہمدردی ہونا چاہیے۔ لیکن یہاں معاملہ برعکس تھا۔

میں نے کہا" وہ عورت حق پر ہے۔ اُسے اپنے خاوند سے طلاق لے لینا چاہیے۔ شادی ایک قلاش رشتہ نہیں، ایک عہد نامہ ہے۔ اگر ایک فریق عہدنامہ کی خلاف ورزی کرے تو دوسرے کو اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کا پورا حق ہے۔"

کملا نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں وہ بولی:" شادی ایک ایسا بندھن ہے جسے نبھانا ضروری ہے۔ ہر عورت کو اسے ایمان داری کے ساتھ نبھانا چاہیے۔"

میں نے کملا کی بات سنی تو بھڑک اٹھا" کملاجی، آپ کس زمانے کی باتیں کر رہی ہیں۔ یہ نیا زمانہ ہے نیکی اور بدی کے معیار بدل گئے ہیں۔"

کملا نے میری بات کاٹی" ماتھر صاحب نیکی اور بدی کے معیار نہیں بدلے، لوگ ضرور بدل گئے ہیں۔" میں اس سے بحث کرنے پر تل گیا۔ "کملاجی، انسان کے لئے بے تعلق ہو کر بات کرنا آسان ہے۔ جس پر گزرتی ہے وہی جانتا ہے۔"

کملا بولی" میں آپ کی بات سمجھتی ہوں۔ آپ سے بحث کرنے کی بجائے میں آپ کو اپنی داستان سناتی ہوں۔ اُس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ نیکی کا معیار کبھی نہیں بدلتا۔"

یہ کہہ کر اُس نے چائے کی چسکی لی اور دھیرے دھیرے بولنا شروع کیا۔

"میری پیدائش ایک ماڈرن گھرانے میں ہوئی تھی۔ میرے باپ ایک مال دار تاجر تھے انہوں نے مجھے اعلیٰ تعلیم دلائی۔ جب میں پندرہ برس کی تھی تو اُن کا انتقال ہو گیا۔ باپ کے مرنے کے بعد میرے بھائی اور ماں نے میری پرورش کی میں نے بی اے کیا، ایم اے کیا۔ میں ملازمت کرنا چاہتی تھی۔ گھر میں خالی بیٹھنا مجھے پسند نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے ایک اخبار کے دفتر میں نوکری کر لی یہاں میری ملاقات اپنے ہونے والے شوہر سے ہوئی۔ اُس کا نام رمیش بھاٹکر تھا۔ وہ اس اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود وہ جوان اور خوب صورت لگتا تھا۔ وہ مجھ سے بہت مہربانی سے پیش آتا۔ وہ کبھی میری غلطی پر ناراض نہ ہوتا بلکہ ہمدردی سے مجھے سمجھاتا۔ اسے ادب سے گہری دلچسپی تھی۔ اُس کی یہی دلچسپی مجھے اس کے قریب لے گئی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ محبت کس کو کہتے ہیں۔ مجھے وہ اچھا لگتا تھا۔ میں اُس سے مانوس ہوتی گئی۔ اس کی دلچسپی بڑھتی گئی اور ایک دن اُس نے مجھے شادی کا پیغام دے دیا۔

رمیش مجھ سے بیس سال بڑا تھا۔ عمر کا فرق ہماری شادی میں رکاوٹ ڈال سکتا تھا۔ لیکن میں نے اُس کی پروا نہیں کی۔ میری ماں اور بھائی دونوں اس معاملے میں غیر جانب دار رہے۔ اور رمیش سے میری شادی ہو گئی۔

شادی کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ رمیش اس انسان سے کتنا مختلف تھا جسے میں جانتی تھی شادی سے پہلے وہ میرا کتنا ہمدرد تھا۔ اُس کی محبت میں کتنا خلوص تھا۔ کتنی گہرائی تھی۔ لیکن شادی کے بعد وہ کتنا بدل گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ پرلے درجے کا کنجوس ہے۔ وہ خود غرض تھا۔ وہ کم تری کے احساس کا شکار تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر وہ جھنجھلا جاتا۔ دفتر میں کسی سے جھگڑا ہوتا تو گھر آ کر مجھ سے لڑتا۔ کچھ عرصے کے بعد یہ جھگڑا بھی بند ہو گیا اور وہ مجھ سے لاتعلق سا ہو گیا۔ میری حیثیت ایک نوکرانی کی ہو گئی۔ میں دل ہی دل میں گھٹتی۔ لیکن اب پچھتانے سے کیا ہوتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا میں نے خود ہی اُس کا انتخاب کیا تھا۔ اب اس کی شکایت کرنا بے جا تھا۔

زندگی کے دن یوں ہی گزرتے رہے۔ میں نے اپنے آپ سے سمجھوتہ کر لیا، اپنے دل کو مار لیا۔ میرا زیادہ وقت گھر میں گزرتا۔ کبھی کبھار رمیش کے ساتھ پارٹیوں میں جاتی تو تھوڑی دیر کے لئے دل بہل جاتا۔ ایک دن ہمیں ایک شادی کی پارٹی میں شریک ہونا تھا۔ رمیش کی طبیعت ناساز تھی۔ میں اکیلی ہی اُس پارٹی میں چلی گئی۔ وہ ایک سہانی شام تھی۔ میں وہ شام کبھی نہیں بھول سکتی۔ مہمان کوٹھی کے لان میں بیٹھے تھے۔ ایک کونے میں شہنائی بج رہی تھی۔ میں اکیلی ایک صوفے پر بیٹھی تھی۔ اچانک مہمانوں کی بھیڑ میں سے شوبھا نمودار ہوئی۔ شوبھا میری دوست تھی۔ اُس کے ساتھ ایک مرد تھا۔ شوبھا سیدھی میری طرف آئی اور بولی:" ارے کملا تم یہاں اکیلی بیٹھی ہو! ان سے ملو۔ یہ میرے بھائی ہیں کمل۔"

کمل نے مجھ کو سلام کیا۔ شوبھا بولتی رہی "کمل پچھلے مہینے امریکہ سے لوٹے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑے انجینئر ہیں۔ اب اس شہر کا خدا حافظ ہے دیکھنا کیسی آڑی ترچھی بلڈنگیں بنائیں گے کمل تم یہاں بیٹھو کملا کے پاس۔ میں ابھی آئی۔" شوبھا یہ کہہ کر چلی گئی۔ کمل میرے پاس صوفے پر بیٹھ گیا۔ ہم دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔

کمل کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک بااصول آدمی ہے۔ اُسے دکھاوے سے نفرت تھی۔ جو بات اُس کے دل میں تھی وہی زبان پر تھی۔ مجھے وہ بہت اچھا لگا۔ رخصت ہوتے وقت اُس نے

مجھ سے دوبارہ ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے وعدہ کر لیا۔

ہم اتوار کے روز شیراز ان کیفے میں ملے۔ میں اتوار کو ہمیشہ اپنے ہیئر ڈریسر کی دکان پر جاتی تھی اس کی دکان کے پاس ہی شیراز ان کیفے تھا۔ ہم ایک گھنٹے تک ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے میں نے اسے اپنی زندگی کی ساری کہانی سنادی وہ خاموشی سے میری باتیں سنتا رہا۔ مجھے اس سے کوئی راز چھپانا فضول معلوم ہوا۔ زندگی میں شاذونادر ہی ایسے لوگ ملتے ہیں جن سے دل کی بات کہی جا سکتی ہے۔ اس نے میری کہانی سن کر افسوس کا اظہار نہیں کیا، ہمدردی بھی نہیں جتائی۔ مجھے اس کی توقع بھی نہیں تھی۔ ہمدردی اور افسوس کا اظہار روایت پسند لوگ کرتے ہیں۔ کمل ان میں سے نہیں تھا۔ جب میرے سینے کا بوجھ ہلکا ہو گیا تو ہم ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔ چلنے سے پہلے اس نے کہا: "کملا، میں تم سے اگلی اتوار کو پھر ملوں گا اسی وقت اور اسی جگہ۔" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اگلی اتوار کو ہم ملے تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ باتوں باتوں میں کمل نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے ہاتھ کے لمس میں اس کے دل کا راز پوشیدہ تھا ایک گھنٹے کے بعد ہم دونوں اگلی اتوار کو پھر ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئے۔

پھر تو اتوار کے روز ایک گھنٹہ کے لئے ملنا ہمارا معمول بن گیا۔ یہ ایک گھنٹہ میری زندگی کا سرمایہ بن گیا۔ مجھے پورے ہفتے اس ایک گھنٹے کا انتظار رہتا۔ مجھے نہیں معلوم کہ مجھے کب کمل سے محبت ہوئی اور وہ کون سا دن تھا جب اس کی محبت نے میرے دل میں گھر کر لیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ محبت اچانک ہوتی ہے اور پہلی ہی نظر میں دلوں کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ مگر میری محبت آہستہ آہستہ پروان چڑھی۔ میں سوچتی کہ کیا واقعی مجھے کمل سے محبت ہے اگر مجھے کمل سے محبت ہے تو میں نے کس جذبے کے تحت رمیش سے شادی کی۔ شاید وہ ضرورت تھی۔ شاید میری نادانی تھی۔ مثل مشہور ہے کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ میں نہیں مانتی۔ محبت اندھی نہیں ہوتی، محبت کرنے والے اندھے ہوتے ہیں۔ محبت کی آنکھیں کبھی دھوکہ نہیں کھاتیں۔ میں نے انسیت کو محبت سمجھ لیا۔ میں نے رمیش سے شادی کرنے میں جلد بازی سے کام لیا۔ کاش کمل مجھ سے دو سال پہلے ملا ہوتا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں رمیش سے طلاق نہیں لے سکتی تھی اس زمانے میں ہندو عورت کو طلاق کا حق حاصل نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر مجھے یہ حق حاصل بھی ہوتا تو کمل مجھ سے شادی نہ کرتا۔ دوسرے آدمی کی بیوی بھگا کر اس سے شادی رچانا اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ ہم دونوں ایک ہی ناؤ میں سوار تھے ہمارے درمیان ایک خاموش سمجھوتا ہو گیا تھا۔ ہماری محبت کے لئے ہفتے میں ایک گھنٹہ کافی تھا۔ ہفتے مہینوں میں بدل گئے اور مہینے برسوں میں اس طرح بیس سال گزر گئے۔ ان بیس برسوں میں ہمارے درمیان کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہوئی۔"

میں کملا کی باتیں حیرت سے سن رہا تھا اگر یہ سچائی تھی تو میرے لئے ناقابلِ یقین تھی۔ کملا نے میرے دل کی بات پڑھ لی۔ وہ بولی: "مجھے معلوم ہے کہ آپ کو میری بات پر یقین نہیں آتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے۔ مجھے کمل سے محبت تھی۔ لیکن میں رمیش کی بیوی تھی۔ میں اس سے بے وفائی نہیں کر سکتی تھی۔ محبت کے لئے میں شادی کے اصول نہیں توڑ سکتی تھی۔"

میں اس کہانی کا انجام معلوم کرنے کے لئے بے قرار تھا۔ میں نے کملا سے پوچھا: "پھر کیا ہوا؟"

کملا نے چائے کی پیالی ختم کی اور بولی "بیس سال بعد رمیش چل بسا اور میں کملا ٹھاکرت کملا ایڈوانی بن گئی۔ کمل سے میری شادی ہو گئی بیس سال سے جو کشتی منجدھار میں بہہ رہی تھی، اسے کنارا مل گیا۔ کمل کے ساتھ گزرا ہوا ہر دن میری زندگی کا بیش قیمت خزانہ ہے۔ لیکن دنیا بنانے والے نے محبت کی باگ ڈور بھی اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔ شاید اسے ہماری خوشیاں پسند نہیں آئیں۔ قدرت نے ہماری روحوں کا ملاپ تو بیس سال تک گوارا کیا، لیکن وہ جسمانی ملاپ کو پانچ سال سے زیادہ برداشت نہ کر سکی شادی کے پانچ سال بعد کمل ایک مہلک بیماری میں مبتلا ہو گیا۔ اس زمانے میں کینسر کا کوئی علاج نہیں تھا۔ وہ پانچ مہینے میں ہی دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کے ساتھ گزارے ہوئے پانچ سال میری زندگی کا حاصل ہیں۔ یہ زمانہ کتنا مختصر تھا، لیکن زندگی کتنی بھرپور تھی۔ اب کمل کی موت کو پندرہ سال گزر چکے ہیں، لیکن مجھے ان پانچ برسوں کا ہر دن اس طرح یاد ہے جیسے کل کی بات ہو۔ محبت کبھی نہیں مرتی۔ موت کے بعد بھی نہیں۔"

کملا اپنی کہانی ختم کر چکی تھی۔ بارش رک گئی تھی۔ ہوا کی نمی نے طبیعت کو اداس کر دیا تھا۔ ہم دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ کملا ماضی کی یادوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ اچانک وہ جیسے خواب سے بیدار ہو گئی۔ اس نے خاموشی سے اپنی چھتری اٹھائی اور دروازے سے نکل گئی۔



مرزا محمود بیگ جیسے عظیم انسان صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہ کسی ایک فرد کا نام نہیں، ایک تہذیب کا نام ہے، ایک زندہ اور تابندہ روایت کا نام ہے۔ وہ مغل نسل تھے۔ اُن کے دادا، دادی نے ۱۸۵۷ کا غدر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ۱۸۵۷ کی دِلّی کا ہر حادثہ، ہر واقعہ اُن کے ذہن پر پوری طرح نقش تھا۔ اُن کی دادی ہر رات جن، بھوتوں، شہزادے شہزادیوں کی کہانیوں کی بجائے وہ اپنے پوتے کو غدر کی کہانیاں سُنایا کرتی تھیں۔

مرزا محمود بیگ میں مغلوں کی آن بان تھی ـــــ آواز مہذّب ـــــ لب و لہجہ شگفتہ، زبان شہد میں دُھلی۔ پچھلے سال وہ چلے گئے۔ جیسے گلاب کے پھول سے شبنم، جیسے دریا سے حباب۔ بیگ صاحب نے غدر کی سو سالہ تقریبات کے سلسلہ میں، ۱۸۵۷ کی دِلّی سے متعلق بہت سے مضامین لکھے تھے جو آل انڈیا ریڈیو سے نشر کئے گئے اور جو نہ صرف اُس دَور کی دِلّی کی عکاسی کرتے ہیں بلکہ دلّی کی پیاری زبان کا شاہ کار ہیں۔ ان کے یہ مضامین اُردو ادب کا سرمایہ ۔ اُردو کی آبرو، شان بن گئے ہیں۔

بیگ صاحب کے ان ہی مضامین کے مجموعے کا نام ہے 'دِلّی ۱۸۵۷ کی' جسے آپ پڑھ کر زبان کی چاشنی سے محظوظ ہو سکیں گے اور غدر کے دِنوں کی دِلّی اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں گے۔ قیمت: دس روپے

ملنے کا پتہ: **شمع بک ڈپو** آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اصل فارسی: علّامہ اقبالؒ

اُردو ترجمہ: اقبال کرشن

چھوڑ دے اے دُختر اب یہ دِل بَری
زیب مسلم کو نہ دے گی کافری
ہیچ ہے یہ غازہ پروردہ جمال
پھر نظر کی سیکھ تُو غارت گری
آنکھ تیری مثلِ شمشیرِ خُدا
جِس کے زخموں سے مِلی ہم کو بقا
ہے دلِ کامِل شہیدِ ضرب اُو
تیغ جس کی حامِلِ آبِ حیا
ہے ضمیرِ عصرِ حاضر بے نقاب
ہے کشاد اس کی نمودِ رنگ و آب
نورِ حق سے لے جہاں تابی کا درس
صد تجلّی پر ہے جو وقتِ حجاب
ہے جہاں کی محکمی از امہات
ہے نہاد اُن کی امینِ ممکنات
گر یہ نکتہ تُو نہ سمجھے تو سمجھ
ہے نظامِ عالم اِس کا بے ثبات
دے گئی مجھ کو خِرد پرور جنُون
پاک مادر کی نِگاہِ اندروں
چشم و دِل کیا پائے مکتب سے اِسے
کیا ہے مکتب میں بجز سحر و فسوں
کر ہماری شام سے پیدا سحر
کر قرآں سے دعوتِ اہلِ نظر
یاد کر اپنی تلاوت کا وہ سوز
تھی دِگر گوں جس سے تقدیرِ عمرؓ



دخترانِ ملت

فرحت قمر

میاں بیوی کے درمیان ذہنی فاصلے

جمال صاحب ایسے آدمی نہیں کہ اپنے گھر اور اپنی ذمہ داریوں کو بھول کر اپنے دوستوں میں شام گزاریں اور رات کو دیر سے گھر آئیں۔ شام کو وہ دفتر سے جلدی ہی گھر لوٹ آتے ہیں اور گھر پر ہی رہتے ہیں۔ پھر بھی ان کی بیوی کو ان سے شکایت ہے کہ جمال صاحب اُس سے دُور رہتے ہیں۔ اُدھر مسز جمال بھی ایک گھریلو عورت ہیں اور اُن کو جمال صاحب سے پُر خلوص پیار بھی ہے، مگر جمال صاحب کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسز جمال اُن سے بچنے کی کوشش کرتی ہیں اور اُن سے دُور دُور رہتی ہیں۔

یہ مسئلہ محض جمال صاحب اور مسز جمال کا نہیں ہے۔ ان گنت شادی شدہ جوڑے قریب رہتے ہوئے بھی اپنے کو ایک دوسرے سے دُور سمجھتے ہیں۔

یہ مسئلہ جسمانی قربت کا نہیں، بلکہ ذہنی قربت کا ہے اور یہ کافی اُلجھا ہوا مسئلہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ ایسی حالت میں شوہر بیوی ایک دوسرے سے نفرت بھی نہیں کرتے، ایک دوسرے سے بیزار ہو کر الگ ہونے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ قریب ہونے کی تمنا بھی رکھتے ہیں اور پھر بھی قریب نہیں ہو پاتے۔ ایک ایسا آدمی جس نے کوئی غلط کام کیا ہو تو یہ جانتے ہوئے دل کی گہرائی سے بُرا نہیں مانتا کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اُس نے غلطی کی ہے۔ اس کے برخلاف جب کسی ایسے آدمی پر الزام لگایا جاتا ہے جس نے وہ غلطی نہیں کی ہے تو وہ ایک دم مشتعل ہو جاتا ہے۔ اس طرح ایک دوسرے سے محبت رکھنے والے شوہر بیوی جب یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے درمیان ایک ایسی دیوار ہے جو محض جسمانی تعلق کے وقت تھوڑی دیر کے لئے ہی گرتی ہے ورنہ ہمیشہ حائل رہتی ہے تو ان کے دل کو زیادہ تکلیف پہنچتی ہے۔ ایسا ہونا فطری بھی ہے۔

نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی (امریکہ) کے عمرانیات کے پروفیسر ایڈورڈ ہال نے اس مسئلے پر تحقیقات کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جس طرح کچھ لوگ بڑی دعوتوں میں شریک ہونے، اسٹیج پر بولنے اور لوگوں کے سامنے آنے سے گھبراتے ہیں، اسی طرح کچھ لوگ ذہنی اور جذباتی طور سے اپنے قریبی دوستوں، یہاں تک کہ اپنے شریک حیات سے بھی دُور دُور رہتے ہیں۔ اپنے اس رویّے کے جواز کے لئے وہ کچھ ایسی مصروفیت میں گم ہو جاتے ہیں جس میں تنہائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ کوئی پڑھنے کو بہانہ بنا لیتا ہے، کوئی لکھنے کو۔ بیوی کے لئے یہ جواز ہی کافی ہوتا ہے کہ اس کو گھر کے کاموں اور ذمہ داریوں سے اتنا وقت ہی نہیں ملتا کہ شوہر کے ساتھ بیٹھ سکے۔ کچھ لوگ باہر کے کاموں میں اپنا زیادہ سے زیادہ وقت گزار کر اپنے شریک حیات سے دُور رہنے کا جواز پیدا کر لیتے ہیں۔ جب ایسے لوگوں کو کوئی پریشانی ہوتی ہے تو وہ اپنے شریک حیات کو نہیں بتاتے۔ گھر میں رہتے ہوئے بھی وہ اٹھتے بیٹھتے ہاتھ بھر کی دُوری اپنے درمیان قائم رکھتے ہیں۔ اس طرح رہتے ہوئے جب کبھی اس قسم کا شوہر اپنی بیوی سے کہتا ہے (یا اس قسم کی بیوی اپنے شوہر سے کہتی ہے) "مجھے تم سے محبت ہے" تو اُسے یہ دیکھ کر تعجب اور صدمہ ہوتا ہے کہ دوسرا اس کی بات کا یقین ہی نہیں کر رہا ہے۔

علم نفسیات کے مطابق اس قسم کے رویّے کی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں:

(۱) جو شخص بچپن میں اپنی ماں کے ہاتھوں میں رہا ہو، جس کی اپنی انفرادیت پر اس کی ماں کی شخصیت غالب رہی ہو ——— وہ بڑا ہو کر اپنے دوستوں اور اپنے شریک حیات سے بھی چوکنا رہتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کے بڑے ہونے پر بھی کوئی دوسرا اس پر غالب رہنے کی کوشش کرے۔

(۲) بہت سے شوہر اپنی بیوی کی مسلسل فرمائشوں سے بچنے کے لئے اور بہت سی بیویاں اپنے شوہروں کی ہر وقت کی نکتہ چینی اور مداخلت سے محفوظ رہنے کے لئے بھی یہ طریقہ استعمال کرنے لگتے ہیں کہ دُور دُور رہا جائے۔

(۳) جن بچوں نے اپنے ماں باپ کو اکثر لڑتے جھگڑتے دیکھا ہو، ان کی عادت ہو جاتی ہے کہ الگ تھلگ رہنے میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں اور پھر یہ عادت ان کی فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔

(۴) کچھ لوگ اپنے اندرونی خوف اور اندرونی خوف اور اپنے احساسِ کمتری کی وجہ سے دوسرے سے بے تکلف ہونا پسند نہیں کرتے۔ وہ اپنی بات اپنے ہونٹوں سے اس لئے نہیں نکلنے دیتے کہ کہیں دوسرا اس کو غلط نہ کہہ دے۔

وجہیں اور بھی ہو سکتی ہیں، لیکن ان سے نکلنے والا نتیجہ بہت اہم ہے ——— اور وہ یہ کہ شوہر اپنی بیوی سے یا اگر بیوی اپنے شوہر سے الگ



الگ سے رہتے ہیں تو اس کی وجہ نفرت نہیں بلکہ نفسیاتی ضرورت ہے۔ اُن کا الگ تھلگ رہنے والے کا مزاج ہی کچھ ایسا بن جاتا ہے کہ وہ اپنے خول کے اندر ہی خوش رہ سکتے ہیں۔ اس طرح کے افراد کا مقصد نہ کسی کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا ہوتا ہے اور نہ کسی کو کم تر سمجھنا۔ وہ تو بس اپنے خیالات اور جذبات کے ہاتھوں مجبور ہیں۔

پروفیسر ایڈورڈ ہال کی یہ ریسرچ اور اُن کے بیان کردہ اسباب و نتائج بہت سے شوہروں اور بہت سی بیویوں کے لئے راحت و مسرت کا پیغام ہیں۔ بیوی کی یہ شکایت فطری ہی سمجھی جاتی ہے کہ اس کے شوہر نامدار اس سے دُور دُور رہتے ہیں۔ کیوں کہ ان کو اس سے لگاؤ نہیں۔ شوہر صاحب کی یہ شکایت بھی جائز ہی لگتی ہے کہ بیوی ان کو ناپسند کرتی ہے۔ ان سے نفرت کرتی ہے۔ کیوں کہ وہ ان کے قریب ہی نہیں پھٹکتی — لیکن دراصل یہ وجہ نفرت یا ناپسندیدگی نہیں، بلکہ یہ ان کی فطرت و عادت ہے جو بہت سے انسانوں کو خاموش طبع اور کم آمیز بنا دیتی ہے۔

اِس مسئلے کا علاج کیا ہے؟

شادی شدہ زندگی کو خوش گوار بنانے کے لئے صلاح و مشورہ دینے والوں اور نفسیات دانوں نے اس سلسلے میں کچھ طریقے بتائے ہیں:

● بجائے اس کے کہ یہ کہا جائے "تم کو میرے معاملات سے دل چسپی ہی نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ باہر والے کمرے میں بیٹھو اور تم اس کی مخالفت کرتی ہو۔" یہ کہنا زیادہ مؤثر ہوگا "آؤ ذرا باہر والے کمرے میں بیٹھیں۔ تم سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔" اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ بُرائی نکالنے، کمی جتانے یا منفی پہلو دیکھنے کی بجائے اثباتی طریقے سے دوسرے کو اپنے قریب لانے کی کوشش کرنا چاہیئے۔

● دونوں میں سے جو بھی دوسرے کی قربت سے دُور نہ بھاگنا چاہتا ہو، یہ کوشش کرے کہ دُور بھاگنے والے کے ذاتی معاملات میں دل چسپی لے، ایسے کام کرے کہ دوسرے کو ایسا محسوس ہو کہ میری ذات میں دل چسپی لی جا رہی ہے اور میرا خیال رکھا جا رہا ہے۔ اُمید ہے کہ یہ احساس ہوتے ہی وہ اپنے حصار سے باہر آنے لگے گا۔

● کسی شخص نے اپنی ذات کے چاروں طرف جو حصار قائم کر رکھا ہے۔ اس میں زبردستی گھسنے کی کوشش نہیں کرنا چاہیئے ورنہ وہ شخص یا تو اپنے

حصار کو اور تنگ کرے گا یا فرار کی راہ اپنائے گا۔ اپنے اپنے حالات پر نظر ڈال کر ایسی تدبیر اپنانا چاہئیں کہ وہ شخص آپ کے داخلے کو مداخلت بے جانہ سمجھے۔ اس کے لئے بہترین اور آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ جس کام کو اس شخص نے آپ سے نہ ملنے کا بہانہ بنا رکھا ہے، اس کام میں دلچسپی لے کر اس کی مدد کیجئے۔

● گھر کے کسی کام کو مل کر کرنے سے، کوئی وقت صرف بیٹھ کر بات چیت کرنے کے لئے مخصوص کر لینے سے، ایک دوسرے کی پسند کے بارے میں بات کرنے سے، مل جل کر سیر کرنے یا کہیں آنے جانے سے بھی ایک دوسرے کے قریب ہونے میں مدد ملتی ہے۔

● جب ایک دوسرے سے کسی ضرورت کا اظہار کرنا ہو یا کوئی شکایت کرنا ہو تو بس بات کر ہی لینا چاہئے۔ یہ انتظار کرنا کہ دوسرا فریق خود سمجھ جائے گا یا خود اس کو احساس ہو جائے گا ہمیشہ غلط رہتا ہے۔ کہہ دینے میں حرج ہی کیا ہے؟

اس سلسلے میں میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ اگر شوہر بیوی کے خیالات میں مطابقت نہ ہو یا ان کے ذوق ایک دوسرے سے میل نہ کھاتے ہوں تب بھی ذہنی فاصلہ بڑھتا جاتا ہے۔ ذہنی سطح کا فرق بھی بالآخر دُوری کا سبب بن جاتا ہے۔ دونوں فریقوں میں سے ایک اگر ادب، سیاست، یا فن پر بات کرے اور دوسرا اگر سمجھ بھی نہ سکے تو نتیجہ خاموشی اور دُوری ہی میں نکلے گا۔ اگر ایک کی بات دوسرے کی سمجھ سے باہر ہو تو اس سے کیا بات کی جائے گی۔ ایسا اکثر ہوتا ہے اور ایسے معاملے میں جو شخص بلند سطح رکھتا ہے اس کو اپنی بلندی سے ذرا نیچے اتر آنے میں جھجک محسوس نہیں کرنا چاہئے۔ اگر ایک فن کار اپنی سیدھی سادی بیوی سے پڑوسیوں، رشتہ داروں، گھر کے معاملات اور اِدھر اُدھر کی باتوں کے بارے میں گفتگو کرے گا تو کوئی اپنے درجے سے گر نہیں جائے گا۔ یہ بات بالکل عارضی ہوگی اور گھر تک محدود ہوگی۔ اس سے اس کی شخصیت یا فن پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑے گا، بلکہ گھریلو زندگی خوش گوار ہونے کی صورت میں اس کو اپنے فن کے لئے ذہنی سکون ہی ملے گا۔ دوسری طرف یہ بھی کوشش کرنا چاہئے کہ جس فریق کی ذہنی سطح نیچی ہو یا جس میں کوئی خاص دلچسپی پیدا کرنا ہو اس کو نیچی سطح سے اوپر اٹھانے کی کوشش کرتے رہنا چاہئے۔ جب ایک موضوع کے ابتدائی پہلوؤں پر بات چیت ہوگی تو بالآخر اس کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور پڑے گا۔ اس طرح ذوق مشترک ہو جانے سے جذباتی فاصلے کم کئے جا سکتے ہیں۔

●●

رنگ دار عورتیں بے رنگ مرد

امریکی سائنس داں ڈاکٹر جے۔ بی۔ رائس کہتے ہیں کہ مرد اور عورت جان داروں کی قسموں میں دو بالکل مختلف انواع سے تعلق رکھتے ہیں ۔۔ اگر دونوں صنفیں اس حقیقت کو ذہن نشین کرلیں تو شوہر بیوی بدرجہا زیادہ باہمی مطابقت وموافقت کے ساتھ بسر کرسکیں گے۔ اگرچہ یہ کوئی نیا خیال نہیں ہے، مگر ڈاکٹر رائس اس حقیقت کو خوردبین اور دوسرے سائنسی آلات کی مدد سے ثابت کرنے کے لئے تیار ہیں۔

ڈاکٹر رائس نے باقاعدہ تفصیلی ریسرچ سے کئی نمایاں فرقوں کو ثابت اور واضح کردیا ہے جن سے اس بات کی بخوبی توجیہہ ہوجاتی ہے کہ طرفین کا اپنی ازدواجی زندگی میں ایک ساتھ بسر کرنا اکثر کیوں مشکل ہوجاتا ہے۔

اوّل یہ کہ دونوں صنفوں کے درمیان جسمانی درجۂ تپش میں نہایت اہم اور نمایاں فرق ہے۔ عورتوں کی جلد بدن کے نیچے چربی کی ایک تہہ کے ساتھ پیوست ہوتی ہے جو انہیں سردی سے محفوظ رکھتی ہے۔ اسی وجہ سے وہ اپنی ٹانگوں پر محض نازک اور مہین گالے نما نائلان رکھ کر سرد آب وہوا کی شدت کو بآسانی برداشت کرسکتی ہیں۔ اگر کوئی مرد ایسا کرے تو اس کی جان کے لالے پڑ جائیں۔ اسی سے ان بہت سے ازدواجی جھگڑوں کی وجہ معلوم ہوجاتی ہے جو بعض معمولی چیزوں، مثلاً بستر پر کمبلوں، رضائیوں وغیرہ کی نوعیت اور تعداد کے متعلق یا رات کو خواب گاہ کی کھڑکیاں یا روشنی کھلی رکھنے یا نہ رکھنے کی بابت آئے دن شوہر اور بیوی کو پیش آتے ہیں۔

ان سیکڑوں تحقیقاتی تجربات کے دوران ڈاکٹر رائس نے ہزاروں آدمیوں اور عورتوں کا درجۂ تپش نوٹ کیا ہے انہوں نے اندازہ لگایا ہے کہ معمولی اوسط صحت والی عورت کو کسی بھی تندرست و توانا مرد کے مقابلے میں ۲ فی صد کم حرارت کی ضرورت ہوتی ہے، اسی لئے مرد کو، جو غیر محفوظ ہوتا ہے، سردی



سے بچاؤ کے لئے زیادہ کپڑوں اور کمبلوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ چنانچہ عورت کو مرد کے سرمائی مطلوبات کا اندازہ اپنی حالت سے نہیں کرنا چاہئے۔

ڈاکٹر رائس نے چھ ماہ کی عمر والے لڑکے اور لڑکیوں کی مثال پیش کرکے بتایا کہ دونوں صنفوں کے درمیان فرق نہایت ابتدائی عمر سے ہی ظاہر ہونے لگتے ہیں ۔۔ انہوں نے یہ تجربہ کرکے دکھایا کہ جب لڑکیوں کے سامنے رنگ دار چیزیں پیش کی گئیں، تو وہ فوراً ہنس ہنس کر انہیں شوق سے لینے کو آگے بڑھیں، مگر جب یہی چیزیں لڑکوں کو پیش کی گئیں تو ان کا ردّ عمل رنگوں سے اتنی دلچسپی کا نہ تھا اور نہ انہوں نے لڑکیوں کی طرح کسی خاص رنگ کو زیادہ پسند کیا۔ یہ کوئی اتفاقی واقعہ نہ تھا کیوں کہ تمام عمروں کے مردوں اور عورتوں کے رنگ کے امتحانات کرنے سے ظاہر ہوا ثابت ہوگیا ہے کہ عورتیں مردوں کے مقابلے میں درحقیقت بہت زیادہ رنگ دیکھتی ہیں اور مردوں کی آنکھ رنگ کے معاملے میں اتنی زیادہ حسّاس نہیں ہوتی۔ عورتیں قدرتی رنگوں کے فرق کو بہت زیادہ باریکی کے ساتھ محسوس کرسکتی ہیں۔ اسی لئے عورتیں اپنے بدن کے کپڑوں اور اپنے کمروں کی آرائشی چیزوں کے رنگوں کے اتار چڑھاؤ میں نہایت نزاکت کے ساتھ توازن اور صحیح مطابقت حاصل کرنے کے لئے زیادہ کوشاں ہوتی ہیں۔

آئے دن کے واقعات اور روزمرّہ کی چیزوں سے نپٹنے اور ان کو سمجھنے اور سلجھانے میں عورتیں بیشتر الگ بچکولے ڈانواڈول ذہنیت رکھتی ہیں، حالانکہ مرد ایسی حالتوں میں اکثر زیادہ سمجھ دار، معاملہ فہم، باقاعدہ اور بااصول ہوتے ہیں۔ اس کی توجیہہ اس تازہ تحقیق شدہ حقیقت سے بخوبی کی جاسکتی ہے کہ زنانہ دماغ کی ساخت اور بافت مردانہ دماغ کی ساخت سے بالکل مختلف ہوتی ہے اور دونوں کے تار پود میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ یہ فرق بعض اوقات بہت نمایاں ہوجاتا ہے اور اسی فرق کی بدولت حیرت انگیز باتیں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔

مثال کے طور پر یہ دیکھئے کہ ایک مرد اور ایک عورت ایک ہی رسالہ یا اخبار پڑھنے میں اپنا اپنا مخصوص فطری رنگ ڈھنگ کس طرح ظاہر کرتے ہیں۔ مرد صفحہ بہ صفحہ باقاعدہ طور پر پڑھے گا۔ عورت سرورق یا سامنے کے صفحے پر سرسری نظر ڈال کر صفحے الٹتی ہوئی فیشن کے حصے کو تلاش کرکے دیکھے گی اور پھر گپ شپ والے کالم وغیرہ پر سے گزرے گی۔ صفحات کو الٹ پلٹ کرتی رہے گی یہاں تک کہ اس کی نظر کسی دل چسپ فیچر، مضمون یا نقشے یا کسی

تصویر پر پڑ جائے گی۔

عورت کے مقابلے میں مرد آزمائش یا تجربہ کرنے کا رجحان کم رکھتے ہیں۔ کسی خاص قسم کا صابن یا منجن حسبِ پسند مل جانے پر مرد اسی سے چمٹا رہتا ہے لیکن عورتیں ہمیشہ نو بہ نو چیزیں آزماتی رہتی ہیں اور ان سے لطف حاصل کرتی ہیں۔ وہ جہاں تک ممکن ہو اپنی وضع قطع اور بناؤ سنگھار کو بدلتے رہنا پسند کرتی ہیں کیوں کہ نئے قسم کا لباس پہننے اور نئی طرز سے بالوں وغیرہ کی آرائش کرنے سے عورت درحقیقت دوسری چیز معلوم ہونے لگتی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اس سے اس نے اپنی شخصیت کے کسی دوسرے پہلو کو دریافت کر لیا ہے۔ بہت سی حالتوں میں ہوتا بھی یہی ہے کہ لباس کی تبدیلی سے عورت کی شخصیت کچھ بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔

اس کے برعکس مرد عموماً نئی نئی طرز کے کپڑے پہننا پسند نہیں کرتے اور نئی وضع قطع اختیار کرنے میں پس و پیش کرتے ہیں کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایک طرح کی خود نمائی ہوگی۔

اس نظریہ کی اثبات میں کہ عورت اور مرد دو جدا انواع ہیں، ڈاکٹر رائس ان لڑکیوں کی مثالیں پیش کرتے ہیں جن کی تربیت اور پرورش بالکل اسی طرح کی گئی جیسے وہ لڑکے ہیں جب یہ لڑکیاں پختگی کی عمر کو پہنچیں تو وہ خصوصیتیں ظاہر کرنے لگیں جو نسوانی ہیں اس سے ثابت ہو گیا کہ ان کی یہ خصوصیتیں خلقی اور پیدائشی ہیں نہ کہ پرورش اور تربیت کے انداز کا نتیجہ۔

لیکن اس نظریہ کا سب سے زیادہ قوی ثبوت خوردبین سے بتدریج ظاہر ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر رائس نے بڑی دقتِ نظر سے یہ پتہ لگا لیا ہے کہ عورت کے جسم کے کروڑوں، اربوں خلیوں میں سے تقریباً ہر خلیہ مرد کی جسمانی ساخت کے خلیوں سے مختلف ہوتا ہے

ان تمام حقیقی جسمانی اختلافات اور طبعی فروق سے قطعِ نظر یہ مشہور و معروف حقیقت ہے کہ مردوں اور عورتوں کے خیالات اکثر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ دونوں کے تخیلات میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ غرض دونوں صنفوں کے درمیان ایک وسیع "نفسیاتی خلا" یا خلیج ہوتی ہے جو چند ہی حالتوں میں پُر کی جا سکتی ہے، یعنی ایسی بہت ہی کم یا صرف چند عورتیں ہوں گی جو بالکل مردوں جیسے خیالات رکھتی ہوں یا مردوں کے ہم خیال ہوتی ہوں۔ بڑی اکثریت تو ایسی ہوتی ہے جو صنفِ مقابل کے نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھ کر اس کے ساتھ مفاہمت یا سمجھوتا کر لیتی ہے، جس سے بالآخر ایک گونہ توازن حاصل ہو جاتا ہے۔

اگر ڈاکٹر رائس کے اس نظریہ کو حقیقت پسندی کے ساتھ تسلیم کیا جائے تو اُمید کی جا سکتی ہے کہ زوجین کے درمیان زیادہ مفاہمت پیدا ہو جائے گی اور آئے دن کی "خانہ جنگی" اور طلاقوں کی نوبت نہ آئے گی۔

آپ کی ذہنی اُلجھن اور اُس کا حل



س : مجھے یہ لکھتے ہوئے عجیب سا لگتا ہے کہ میں اپنی ممی کی حرکتوں سے سخت پریشان ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میری ممی میرے بوائے فرینڈس کو مجھ سے چھیننا چاہتی ہیں۔ ہمارا گھرانا بہت آزاد خیال ہے۔ ہمارے یہاں لڑکوں سے دوستی معیوب نہیں سمجھی جاتی۔

ہمارے رشتہ داروں میں کوئی بھی ماں اپنی بیٹیوں کا حق نہیں مارتی۔ ممی کی ان حرکتوں سے گھر میں کشیدگی رہتی ہے۔ ڈیڈی کچھ نہیں کہتے لیکن ایسا لگتا ہے کہ وہ بھی ممی کی حرکتوں سے نالاں ہیں۔

مجھے ڈر ہے کہ نوبت طلاق پر نہ آجائے کیوں کہ وہ بے چارے کافی بوڑھے ہیں۔ ممی ان کی بیٹی جیسی دکھائی دیتی ہیں۔ پھر بھی اُنہیں اپنی عمر کے مطابق رویہ اختیار کرنا چاہئے۔

اس کے لئے میں کیا کروں؟

ج : آپ کا گھرانا آزاد خیال ہے اور آزادی اپنا حق جتانے پر تلی ہوئی ہے۔ آپ کی ممی آپ کے بوائے فرینڈس کو چھین لیتی ہیں یا انہیں چھیننے کی کوشش کرتی ہیں، لیکن کیا ان کی دوستی دوستی تک ہی محدود رہتی ہے؟ اگر ان کی دوستی حد سے آگے نہیں بڑھتی تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ڈیڈی اور ممی کی عمروں میں بہت زیادہ فرق ہونے سے آپ کی ممی اپنی جذباتی اور ازدواجی زندگی میں ناآسودہ رہتی ہیں۔ جب آپ کے گھر میں کوئی روک ٹوک نہیں اور لوگ آزادی سے ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں تو پھر آپ کی ممی پر روک ٹوک کیسے لگ سکتی ہے۔ یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے آپ کا اپنی ممی سے کیا رشتہ ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جوان لڑکے ایک جوان لڑکی کو چھوڑ کر ایک ادھیڑ عمر کی عورت کی طرف مائل ہوں۔ اس کی وجہ آپ کی

ڈاکٹر بھاٹیہ ایک مشہور ماہرِ نفسیات ہیں۔ وہ بانو پڑھنے والوں کے سوالات کا جواب دیں گے اور ان کے نفسیاتی مسئلوں کا تجزیہ اور حل پیش کریں گے۔

پتہ : معرفت ماہ نامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

احتیاط بھی ہو سکتی ہے۔ یہ احتیاط آپ کو گناہ اور اس کے احساس سے محفوظ رکھتی ہے۔ آپ کے خیال میں احتیاط کا یہ مادہ آپ کی ممی میں نہیں ہے اس طرح آپ کے اور ان کے درمیان ایک مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس سے آپ کے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ آپ کے دل میں ان کے خلاف حسد کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے آپ کی شخصیت اُبھرنے نہیں پاتی۔ آپ کا غصہ فطری طور پر آپ کو پریشان کر دیتا ہے۔

بہتر ہوگا کہ آپ اپنی ممی سے کھُل کر بات چیت کریں۔ ان سے ہمدردی اور پیار سے ان کی زندگی کے حالات دریافت کریں۔ ممکن ہے کہ وہ اندر سے ناخوش ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ اپنی زندگی سے مطمئن نہ ہوں۔ نفسیاتی بیماریوں کی جڑ یہ ہوتی ہے کہ ہم اپنی ناخوش گوار یادوں کو ذہن کے تاریک گوشوں میں دبا دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کا اثر ختم ہو گیا۔ دراصل ان کا اثر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ وہ ذہن کے گوشوں میں کلبلاتی رہتی ہیں اور طرح طرح کے روپ دھار لیتی ہیں۔ اگر ہم ان ناخوش گوار یادوں کو از سرِ نو زندہ کریں اور انہیں ذہن کے تاریک گوشوں سے نکال کر شعور میں لے آئیں تو ان کا زہر ختم ہو جاتا ہے۔ اگر آپ اپنی ممی سے بات کریں اور ان کی زندگی کی تحقیقات کریں تو نہ صرف آپ کو ان کے مسئلے کا سبب معلوم ہو جائے گا بلکہ وہ بھی ناآسودگی کے محرکات سے واقف ہو جائیں گی۔ اس طرح ان کے نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا ہو جائے گی۔ آپ اس معاملے میں اپنے ڈیڈی سے بھی بات چیت کر سکتی ہیں اس مسئلے پر وہ بھی کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں۔

س : میں ذرا زیادہ ہی صفائی پسند ہوں۔ گھر کو صاف رکھنا اور خود صاف رہنا میری عادت ہے۔ لیکن میرے شوہر بہت ہی گندے ہیں۔ وہ ہفتوں نہیں نہاتے۔ گھر میں خوب کوڑا پھیلاتے ہیں۔ بچوں میں بھی گندگی کی عادت آگئی ہے۔ میں صفائی کرتے کرتے تنگ آچکی ہوں۔ شوہر اور بچوں کو سمجھاتے سمجھاتے تھک چکی ہوں۔ کیا ان کی یہ عادت دُور ہو سکتی ہے؟

ج : عادت فطرتِ ثانیہ ہوتی ہے۔ ایک بار جب پختہ ہو جائے تو مشکل سے ہی تبدیل ہوتی ہے اس بارے میں ایک نکتہ یاد رکھیں۔ انسان عموماً اپنی عادت کو نہیں بدلتا۔ اسے جتنا زیادہ سمجھایا جائے وہ اس میں اتنا ہی زیادہ پختہ ہو جاتا ہے۔ اس پر ضد سوار ہو جاتی ہے۔ اس لئے سمجھانے کا طریقۂ کار ہی غلط ہے۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اُلٹا ان کی عادت میں پختگی آجائے گی۔

آپ کا مسئلہ یہ ہے کہ آپ دونوں نے اپنے اپنے طریقۂ کار چن لئے ہیں اور وہ طریقۂ کار ایک

دوسرے کی ضد ہیں۔ اس طرح آپ دونوں مخالف کیمپ میں ہیں۔ ایسی حالت میں یہ جھگڑا کبھی ختم نہیں ہوگا۔ اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ آپ ان سے صفائی کے بارے میں کچھ کہنا بند کر دیں، ان کی زندگی کی دوسری ضرورتوں کی طرف دھیان دیں، ان کی دیکھ بھال کریں، ان پر توجہ دیں۔ ازدواجی تعلقات کی طرف خاص دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ جب آپ ان کی طرف دھیان دیں گی تو وہ بھی جواب میں آپ کی بات مانیں گے۔ آپ کی بات میں نفرت، غصے اور چڑچڑے پن کا عنصر نہ ہونا چاہئے۔ صفائی کی طرف انہیں کبھی توجہ دلائیں بھی تو پیار محبت سے، اپنا حق جتا کر نہیں بلکہ ان کا احسان سمجھ کر۔

ایک بات اور یاد رکھیں۔ بچّے کو جب ماں باپ کی توجہ نہیں ملتی تو وہ ان کی توجہ پانے کے لئے گھر میں گندگی پھیلاتا ہے ماں اسے ڈانٹتی ہے، پھٹکارتی ہے۔ اس طرح خواہ کسی شکل میں ہو، بچّے کو ماں کی توجہ مل جاتی ہے۔ ڈانٹ پھٹکار ہی توجہی سے بہرحال بہتر ہے۔ رفتہ رفتہ یہ طریقۂ کار بچّے کی عادت بن جاتا ہے اور بڑا ہو کر بھی وہ یہی طریقۂ کار اپناتا ہے جب وہ توجہ کی کمی پاتا ہے تو وہی اپنا پُرانا نسخہ آزماتا ہے یہ سب اس کے لاشعور سے نکلتا ہے۔ اسے اس بات کی خبر نہیں ہوتی کہ وہ محبت اور توجہ پانے کے لئے ایسا کر رہا ہے۔ وہ مختلف بہانے بناتا ہے، لیکن اصل بات وہی ہوتی ہے جو بچپن سے اس کے دل میں بیٹھ چکی ہے اور جس کی افادیت کا اسے یقین ہے۔ آپ کے خاوند اپنا بچپن کا نسخہ دُہرا رہے ہیں۔ آپ پہلے ان کی طرف توجہ دیں، صفائی کی بات بعد میں کریں۔

س : میری عمر ۲۰ سال ہے۔ میری پانچ بہنیں اور ایک بھائی ہے۔ میرے باپ ایک تاجر ہیں۔ ان کی مالی حالت کافی اچھی ہے لیکن وہ گھر میں پورا خرچ نہیں دیتے۔ گھر میں بڑی سخت پابندی ہے، ہمیں گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں۔ کھڑکی، دروازے پر بھی کھڑے نہیں ہو سکتے۔ وہ بڑی بہنوں کی شادی نہیں کرتے۔ روپیہ نہ ہونے کا بہانہ کرتے ہیں۔ نمود کے لئے ٹیلی فون، ٹیلی ویژن کے لئے ان کے پاس خوب پیسہ آجاتا ہے۔ صرف میں نے گھر میں بی اے پاس کیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ کہیں سروس کر لوں لیکن اس کے لئے بھی مجھے واقفیت نہیں۔ چھوٹا بھائی ۱۵ سال کا ہے۔ وہ بھی اس قابل نہیں کہ ہمیں سنبھال سکے۔ اُمید ہے کہ آپ کوئی حل بتائیں گے۔

ج : آپ کی مشکل کا حل اتنا آسان نہیں۔ جب گھر کا سربراہ ہی ذہنی بیماری میں مبتلا ہو تو بچوں پر قدرتی طور پر اثر پڑتا ہے۔ آپ کے والد اپنی پیدا کی ہوئی اولاد کو ہی بوجھ سمجھتے ہیں تو آپ کیا کر سکتی ہیں۔ ماں باپ کی بے وقوفیوں اور کمزوریوں کا اثر بچوں پر بھی پڑتا ہے۔ بچّے کتنے ہی بڑے ہو جائیں، وہ کافی حد تک ماں باپ کے محتاج رہتے ہیں۔ آپ چاہتی ہیں کہ کہیں سروس کر لیں۔ یہ کام اسی وقت ہو سکتا ہے جب آپ میں گھر سے نکلنے کی ہمت ہو۔ جب آپ کھڑکی دروازے پر بھی نہیں کھڑی ہو سکتیں تو سروس کیسے کریں گی؟ دراصل خرابی آپ کے باپ میں ہے علاج ان کا ہونا چاہئے۔ آپ سے زیادہ ان کو میری مدد کی ضرورت ہے۔ جب تک آپ گھر سے نکلنے کی کوشش نہیں کریں گی، لوگوں سے ملنے جُلنے کی ابتدا نہیں کریں گی، آپ سروس نہیں کر سکتیں۔

س : میری عمر ۴۱ سال ہے۔ شادی کو ۲۰ سال گزر چکے ہیں۔ میرے بچّے جوان ہیں۔ شوہر کافی اچھے ہیں۔ وہ بڑا اندازیہ مزاج رکھتے ہیں۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں لیکن جب کبھی میں کھانے بیٹھتی ہوں، اور پڑوس سے یا گھر میں کسی کے رونے یا سسکنے کی آواز سُن لیتی ہوں تو سارا کھانا زہر ہو جاتا ہے۔ طبیعت پریشان ہو جاتی ہے اور میں دسترخوان سے اُٹھ جاتی ہوں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

ج : ہر انسان کی زندگی میں کوئی نہ کوئی مسئلہ تو ہوتا ہی ہے۔ خدا نے آپ کو سب کچھ دیا ہے۔ شوہر بھی اچھے ہیں، آپ کے بچّے بھی ہیں اور آپ اپنے گھر میں سُکھی بھی معلوم ہوتی ہیں۔ اس کے باوجود آپ کے اندر ایک گھبراہٹ ہے جس کا سبب آپ کو معلوم نہیں۔ اس گھبراہٹ کی وجہ بچپن میں ہی تلاش کی جا سکتی ہے۔ انسان عموماً تکلیف سے گھبراتا ہے اور ناخوش گوار بات کا سامنا کرنے سے جھجکتا ہے نفسیات میں ایسا کرنا جائز نہیں۔ انسان کو جس چیز سے تکلیف پہنچتی ہے اس سے بھاگنا یا گھبرانا بے کار ہے۔ اس کا سامنا کرنا ضروری ہے۔ تکلیف کا تجربہ کرنے سے تکلیف کم ہو جاتی ہے۔ انسان آپریشن کے نام سے گھبراتا ہے اور ڈاکٹر کے یہاں جاتے سے جی چُراتا ہے لیکن ایک دفعہ جب وہ اس تجربے سے گزر جائے تو اس کا خوف کم ہو جاتا ہے۔ کسی تکلیف دہ خیال کو کچلنے سے کام نہیں چلتا۔ ایسی صورت میں وہ بار بار پریشان کرتا ہے آپ اپنی مشکل سے نہ گھبرائیں۔ بلکہ اس کا مقابلہ کریں اسے تسلیم کریں اور بچپن کی یادوں کو کُریدنے کی کوشش کریں شاید بچپن میں ایسا کوئی واقعہ پیش آیا ہو جس سے آپ کے ذہن کو تکلیف پہنچی ہو۔ اس وقت آپ نے اس واقعہ کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا، لیکن وہ آج تک آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتا بچپن میں کسی کے رونے یا سسکنے کی آواز سُن کر آپ نے کھانا چھوڑ دیا اور آپ بے حد پریشان ہو گئیں۔ ایسا کوئی واقعہ آپ کو یاد آجائے تو سمجھئے کہ علاج کی ڈور آپ کے ہاتھ میں آگئی۔ آپ اس واقعے کو بار بار یاد کیجئے، حتیٰ کہ وہ اپنی اہمیت کھو بیٹھے۔ کسی چیز کا تواتر اس کی اہمیت کو ختم کر دیتا ہے۔ اس طرح آپ اپنی مشکل پر قابو پالیں گی۔

مطبوعات شمع بک ڈپو، کھلونا بک ڈپو، بانو بک ڈپو اور مکتبہ دینیات

پاگل	رئیس احمد جعفری	۷ روپے
پہلی لڑکی	رازداں، ایم۔ اے	۳ روپے ۲۵ پیسے
جاتی ہوئی بہار	وحشی محمود آبادی	۵ روپے
جذبۂ دل	معین شاہد	۵ روپے
رہ گزر	انیس مرزا	۵ روپے ۵۰ پیسے
زرینہ	رئیس احمد جعفری	۷ روپے
عشقِ بلاخیز	سید قاسم محمود	۷ روپے
ظالم	سعید امرت	۴ روپے
مجھے تم سے محبت ہے	نقی نور	۴ روپے ۲۵ پیسے
نئے قدم	ہاجرہ نازلی	۵ روپے ۵۰ پیسے
ننگا شہر	احمد شجاع پاشا	۶ روپے
رام محمد ڈیسوزا	علی رضا	۵ روپے
بیراگ (فلمی باتصویر کہانی)		۵ روپے
اسلام اور فیملی پلاننگ (مسئلہ ضبطِ ولادت)	علامہ زید ابوالحسن فاروقی	۷ روپے

شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۲

سکھی ری میں تو پریم دیوانی...



امینہ

میرا بائی کے بھجن اور گیت شمالی ہند میں مشہور ہیں۔ وہ چتوڑ کے راجہ رانا سانگا کی بہو تھی، مگر چتوڑ کے راج پاٹ نے اس کو شہرت نہیں بخشی۔ اس کی عظمت اس کے گیتوں کی وجہ سے ہے۔ میرا بائی ایک پیدائشی شاعرہ تھی۔ وہ بھگوان کرشن کی پوجا کرتی تھی۔ وہی اس کے محبوب تھے، وہی اس کے دوست تھے اور وہی اس کے مددگار۔ وہ ہر آن اُن ہی کے تصور میں کھوئی رہتی۔ اس کا رُواں رُواں اُن کی عقیدت میں سرشار تھا — کرشن کے بہت سے نام ہیں: میرا انہیں زیادہ تر گردھر ناگر کے نام سے یاد کرتی تھی۔ گردھر ناگر۔ کائنات کے مالک — اس کا ہر بھجن ان ہی الفاظ پر ختم ہوتا تھا۔

میرا بائی کی شادی، پیدائش اور موت کی تاریخ اور مقام کے بارے میں مؤرخین کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکے ہیں، لیکن مؤرخین کے اندازے کے مطابق میرا کی پیدائش راجستھان میں ہوئی تھی وہ ۱۵۰۴ میں ضلع میرتا میں پیدا ہوئی۔ اس کے باپ کا نام رتن سنگھ تھا اور دادا کا نام راؤ دودا جی۔ اس کا سلسلۂ نسب راؤ جودھاجی راٹھور سے ملتا تھا۔ یہ وہی راؤ جودھاجی تھا جس نے جودھ پور بسایا تھا۔ میرا دس برس کی تھی کہ اس کی ماں چل بسی۔ میرا اپنے دادا کے پاس میرتا میں رہنے لگی۔ ایک سال کے بعد دادا کا سایہ بھی میرا کے سر سے اٹھ گیا۔ دادا کے مرنے کے بعد اس کا تایا وکرم دیو تخت پر بیٹھا — وکرم دیو نے اپنی بھتیجی کے لئے بر تلاش کرنا شروع کیا۔ اُسے اپنی تلاش میں کامیابی ہوئی۔ لیکن میرا بائی کی شادی راجہ بھوج سے ہو گئی۔ راجہ بھوج رانا سانگا کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ رانا سانگا ہندوستان کے راجپوتوں کا سردار تھا۔ اس شادی سے میرا چتوڑ راج کی بہو بن گئی۔ لیکن قسمت اس کی مخالف تھی۔ کچھ عرصے کے بعد اس کے خاوند کا انتقال ہو گیا اور اس کا خسر رانا سانگا فتح پور سیکری کی لڑائی میں کام آیا۔ اُدھر میرتا میں اس کا باپ بھی موت کا شکار ہو گیا۔ ۲۳ برس کی عمر میں وہ یتیم بھی ہو گئی اور بیوہ بھی۔

میرا کے بچپن کا زمانہ راجپوتانہ کے لئے بہت بُرا تھا۔ راجپوت خانہ جنگی میں مبتلا تھے۔ راج پاٹ کے لئے بھائیوں میں اور عزیزوں میں خوب لڑائیاں ہوتیں۔ میرا یہ سب دیکھتی اور دل ہی دل میں کڑھتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انسان زمین اور طاقت حاصل کرنے کے لئے کیوں

ایک دوسرے کا خون بہاتے ہے۔ راجپوتوں کی خانہ جنگی ملک کے لئے تباہ کُن تھی، رہی سہی کسر بابر کے حملے نے پوری کر دی۔ بابر نے ابراہیم لودھی کو پانی پت کے میدان میں شکست دی۔ راجپوت خوش تھے کہ بابر کی فتح نے افغان حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ بابر کے واپس جانے کے بعد شمالی ہند پر دوبارہ راجپوتوں کا قبضہ ہو جائے گا، لیکن بابر نے ہندوستان میں ہی قیام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بابر کے اس فیصلے نے راجپوتوں کی ساری اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اُنہوں نے بابر سے لڑنے کا تہیہ کیا۔ اس موقع پر راجپوتوں نے باہمی خانہ جنگی کو ترک کر دیا اور ایک جھنڈے کے تلے جمع ہو گئے۔ یہ جھنڈا چتوڑ کے رانا سانگا کا تھا۔ فتح پور سیکری میں گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ راجپوت ہار گئے اور رانا سانگا جنگ میں مارا گیا۔

میرا کا دل ان لڑائیوں اور خانہ جنگیوں کو دیکھ کر دنیا سے بیزار ہو گیا۔ وہ مذہب اور روحانیت کی طرف مائل ہو گئی۔ اُس نے وشنو طریقۂ عبادت کو اپنا لیا۔ ہندوؤں میں دو مشہور فرقے ہیں۔ ایک وشنو کو مانتا ہے اور دوسرا شیو کو۔ شیو کو ماننے والے خدا کو اپنے اندر تلاش کرتے ہیں۔ یہ نظریہ صوفیوں کے ہمہ اوست اور منصور کے نعرۂ انالحق سے زیادہ مشابہ ہے۔ ان کے یہاں خدا انسان سے باہر کوئی شے نہیں۔ انسان کو اُسے اپنے دل میں ہی تلاش کرنا چاہئے۔ اس کے برعکس وشنو کو ماننے والے خدا کو انسان سے علیحدہ شے مانتے ہیں۔ ان کے یہاں انسان خدا کو اپنے سے باہر تلاش کرتا ہے۔ اس تلاش کا ذریعہ بھگتی ہے۔ خدا کی عبادت کرنے اور اس کی تلاش میں گیت گانے سے منزل کا پتہ مل سکتا ہے۔ وشنو براہ راست خدا کی عبادت نہیں کر سکتے۔ بلکہ کسی دیوتا کو وشنو کا اوتار مان کر اس کی پوجا کرتے ہیں۔ کرشن بھی وشنو کے اوتار ہیں۔ جب خدا انسان کا بھیس بدل کر دنیا میں نازل ہوتا ہے تو اوتار کہلاتا ہے۔ میرا نے کرشن کو وشنو کا اوتار مان کر ان کی پوجا شروع کر دی۔ اور ان سے ایسی لَو لگائی کہ ساری سُدھ بُدھ گنوا بیٹھی۔

رانا سانگا کی موت کے بعد

راج کمار رتن سنگھ چتوڑ کا حکمراں بن گیا، لیکن رتن سنگھ بھی کچھ عرصے کے بعد مر گیا۔ رتن سنگھ کے بعد راج کمار وکرما دتیہ نے چتوڑ کا تخت سنبھالا۔ اُس نے میرا کو سمجھایا کہ وہ محل کو سادھوؤں کا اڈہ نہ بنائے۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ رانا سانگا نے بھی میرا کے بیوہ ہو جانے کے بعد اس کو ستی ہو جانے کا مشورہ دیا تھا۔ مگر میرا نے یہ مشورہ ٹھکرا دیا تھا۔ میرا تو کرشن کی دیوانی تھی۔ کرشن اس کے انگ انگ میں بسے ہوئے تھے۔ محل میں رانا کی سختیاں بڑھتی گئیں۔ میرا اپنے کرشن کے سامنے گاتی تھی، ناچتی تھی، رانا کی بدنامی ہوتی تھی۔ اُس نے محل میں ناچنے گانے کی ممانعت کر دی۔ میرا نے مجبور ہو کر شہر کے مندر میں جانا شروع کر دیا۔ وہاں کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ رانا کو بہت غصہ آیا۔ میرا کی شہرت بڑھتی گئی۔ لوگ اس کا احترام کرنے لگے۔ رانا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے میرا کو اپنے ظلم کا نشانہ بنایا۔ اس نے میرا کو ایک کوٹھری میں بند کر دیا۔ اُسے اپنے راستے سے ہٹانے کی کئی تدبیریں آزمائیں۔ اُس نے میرا کو اپنے بستر پر سونے کا حکم دیا جس پر کیلیں جڑی تھیں۔ میرا کو یہ بستر پھولوں کی سیج معلوم ہوا۔ رانا نے ایک باسکٹ بھیجی۔ اس میں ایک زہریلا سانپ چھپا ہوا تھا۔ میرا نے باسکٹ کا ڈھکنا اُٹھایا تو سانپ کی بجائے اُسے کرشن کے درشن ہو گئے۔ رانا نے ہمت نہ ہاری۔ اُس نے میرا کو ایک زہر کا پیالہ بھیجا۔ یہ زہر میرا کے لئے امرت بن گیا۔ رانا کی کوئی ترکیب کارگر نہ ہوئی۔

میرا اس روز روز کے ظلم و ستم سے تنگ آ گئی اور اُس نے اپنے میکے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میرتا میں اس کے چچا نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ لیکن راجستھان کے سیاسی حالات روز بروز خراب ہوتے جا رہے تھے۔ اس کا چچا بھی زیادہ عرصے تک اپنی گدی پر نہ بیٹھ سکا۔ اب میرا نے سفر کی ٹھان لی۔ پہلے وہ متھرا گئی۔ پھر برندابن میں کچھ عرصے رہی۔ کرشن جی نے برندابن میں اپنا بچپن گزارا تھا۔ وہ یہیں گائیں چراتے تھے، مکھن چراتے تھے، اپنے بھائی بلرام کے ساتھ کھیلتے تھے۔ اپنی گوپی رادھا کی سہیلیوں کے ساتھ چہلیں کرتے تھے۔ میرا برندابن میں بہت خوش تھی۔ کچھ عرصے برندابن میں رہنے کے بعد وہ دوارکا گئی۔ دوارکا گجرات میں سمندر کے ساحل پر آباد ہے۔ کرشن جی نے اپنی عمر کا آخری حصہ دوارکا میں گزارا تھا۔ میرا دوارکا میں پہنچ کر وہیں کی ہو گئی۔ وہاں وہ کرشن جی کے مندر میں رہنے لگی۔ دوارکا میں ہی اس کی موت ہو گئی۔ مرتے وقت اس کی عمر ۴۶ برس تھی۔

میرا کی زبان مارواڑی ہندی تھی۔ گو اس کے گیتوں میں گجراتی اور پنجابی کے بہت سے الفاظ بھی ملتے ہیں۔ اس کا ایک مشہور بھجن یہ ہے:

سکھی ری میں تو پریم دیوانی میرا درد نہ جانے کوئے
سُولی اُوپر سیج ہماری کس بِدھ سونا ہوئے
گھائل کی گت گھائل جانے اور نہ جانے کوئے
میرا کے پربھو گِردھر ناگر دوسرا نا کوئے

●●



شادی کیا ہے؟

ایم ناصر



ہزاروں سال پہلے دنیا میں شادی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ عورت اور مرد جب تک جی چاہتا ساتھ رہتے اور جب جی چاہتا ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے۔ اس رشتے میں عورت کی رضامندی کو زیادہ دخل نہ ہوتا۔ بعض اوقات ایک قبیلے میں مرد عورتوں سے زیادہ ہوتے۔ ان مردوں کے لیے عورتیں مہیا کرنا ایک مسئلہ بن جاتا۔ قبیلے کے جنگجو لوگ قریب کے علاقے پر چھاپا مارتے اور عورتوں کو باندھ کر ساتھ لے آتے۔ اس طرح مردوں کے لیے عورتیں مہیا ہو جاتیں۔

آہستہ آہستہ انسان تہذیب یافتہ ہو گیا۔ اب عورتوں پر پابندی عائد ہو گئی۔ انہیں اپنے مرد کو چھوڑنے کا اختیار نہیں تھا لیکن مرد جب چاہتا اپنی طاقت سے دوسرے مرد کی عورت پر قبضہ جما لیتا۔ یہ مثل مشہور تھی کہ گھوڑا اور عورت جس مرد کے قبضے میں ہوں اس کی ملکیت سمجھے جائیں۔ پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ تمام عورتیں قبیلے کے سردار کی ملکیت سمجھی جانے لگیں۔ وہ انہیں جس طرح چاہتا تقسیم کر دیتا۔ انسان اس طریقہ کار سے مطمئن نہیں تھا۔ طاقت اور پیسے کے بل پر انسان کئی کئی بیویاں رکھ سکتا تھا۔ بعض اوقات ان عورتوں کی تعداد سیکڑوں تک پہنچ جاتی تھی۔ جو علاقہ لڑائی میں ہار جاتا اس کی عورتیں فاتح قبیلے کی ملکیت سمجھی جاتی تھیں۔ عورتیں خریدی اور بیچی جاتی تھیں مگر ان کی قیمت ایک گھوڑے سے کم ہوتی تھی۔

عورت اور مرد کا تعلق ارتقائی منزلیں طے کرتا رہا۔ انسان اپنی عورت کو ہمیشہ کے لیے اپنی ملکیت بنانا چاہتا۔ وہ چاہتا تھا کہ دوسرا مرد اپنی طاقت اور دولت کے بل پر اس کی عورت کو چھین نہ سکے اور اس کی عورت کے جملہ حقوق اسی کے لیے محفوظ ہو جائیں۔ اس طرح شادی کا ادارہ ظہور میں آیا۔ شادی کی رسم کے بعد عورت ہمیشہ کے لیے اپنے مرد کی ملکیت سمجھی جانے لگی۔ کوئی دوسرا مرد اس کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ دوسرے مرد کی بیوی کو چھیننا معیوب قرار دیا گیا۔ اب انسان نے اطمینان کی سانس لی۔ اس طرح مرد اور عورت دونوں کو تحفظ حاصل ہو گیا۔ شادی کے بعد عورت کو احترام کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔

شادی کی سب سے بڑی خاصیت اس کی ہمیشگی ہے۔ ہندوؤں میں شادی جنم جنانتر کا ملاپ ہے۔ عیسائی مذہب میں شادی ایک مقدس رشتہ ہے۔ مسلمانوں میں شادی ایک عہدنامہ ہے۔ شادی کی شکلیں خواہ کتنی مختلف ہوں، ان میں ہمیشگی کا عنصر ضرور شامل رہتا ہے۔ ایڈلٹ کا تجربہ کبھی شادی کی اہمیت حاصل نہیں کر سکا۔ شادی کی یہ قطعیت اور ہمیشگی اس کا حسن بھی ہے اور اس کا عیب بھی۔ اگر میاں بیوی یہ گاڑی نہ چلا سکیں تو وہ اس گاڑی سے بآسانی اتر بھی نہیں سکتے۔ وہ شادی کا عہدنامہ توڑنا چاہتے ہیں لیکن توڑ نہیں سکتے۔ اس طرح شادی عمر قید کی سزا میں بدل جاتی ہے۔

آج کل مغربی ممالک میں محبت کو شادی کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ نظریہ بھی صحیح نہیں ہے اگر شادی کی بنیاد محبت ہوتی تو یہ اتنی کھوکھلی کیوں ثابت ہوتی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر محبت شادی کی بنیاد نہیں تو پھر شادی کی ماہیت کیا ہے۔ دراصل شادی کی بنیاد رفاقت ہے۔ یہ مرد اور عورت کا ایک ایسا انوکھا تعلق ہے جو وہ کسی دوسرے عزیز یا دوست کے ساتھ قائم نہیں

وہ ایک نشانی تیری



عطیہ پروین

سارے ڈاکٹر ہار گئے، عزیز ہار گئے ان کے بچے ہار گئے مگر اُن کی آنکھوں سے آنسو تو کیا لبوں سے آہ تک نہ نکلی۔

ایک رات اور ایک دن، چوبیس گھنٹے سے وہ بے حس و حرکت بیٹھی تھیں۔ پہلے اُن کی آنکھیں شوہر کی لاش پر گڑی رہیں، جب میت اٹھ گئی اور اس جگہ اگر اور لوبان کا دھواں ہی رہ گیا تو بھی اس دھوئیں کو تکتے ہوئے وہ گویا اپنے شوہر کی شبیہ دیکھتی رہیں ـــــ وہ شبیہ جو اب کبھی نظر نہیں آئے گی۔

دفن کے بعد مرد گھر آ گئے۔ ایک بار پھر رونے پیٹنے کا شور ہوا۔ چھوٹی لڑکی بجلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ روتے روتے اس کی آواز بیٹھ گئی تھی۔ وہ بار بار اپنے بڑے بھائی سے پوچھتی "بھیا! میرے ابا کو کہاں چھوڑ آئے!" اور لڑکا پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتا۔ کون تھا جس کی آنکھ نم نہ ہوئی ہو۔ بس ایک وہ نہ روئیں۔

آخر محلے والوں نے سمجھا بجھا کر فرش پر لمبا سا دسترخوان بچھا دیا۔ کڑوی روٹی کھانے کے لئے تھکے ماندے، غم سے نڈھال اُن کے بچے بھی بیٹھ گئے، عزیز اور احباب بھی ـــــ بڑا لڑکا اُن کے پاس آیا، اُن کو ہلایا ڈلایا، ہاتھ جوڑے، قسمیں رکھائیں کہ وہ بھی دو نوالے کھا لیں، مگر انھوں نے بس دھیرے سے سر کو دائیں سے بائیں جنبش دی۔ ان کی نظریں اپنے شوہر کی خالی جگہ سے پھر بھی نہ ہٹیں۔

مجبور ہو کر آنسو پونچھتے ہوئے لڑکا پھر دسترخوان پر جا بیٹھا۔ اُن کا جسم ساکن تھا۔ آنکھیں خشک تھیں، لیکن دماغ کام کر رہا تھا ـــــ دل خون کے آنسو رو رہا تھا مگر خدا جانے کیوں یہ لہو ان کی آنکھوں کا راستہ بھول گیا تھا۔

ان کی ویران آنکھوں میں ۲۰ برس کی ازدواجی زندگی کا ایک ایک عکس کسی تیز رفتار فلم کی طرح چل رہا تھا۔ وہ کسی طرح بھی یہ ماننے کو تیار نہیں ہو رہی تھیں کہ ان کے شوہر ہمیشہ کے لئے ان سے جدا ہو چکے ہیں۔

شادی کے بعد وہ دونوں ایک ہفتے کے لئے بھی الگ نہیں ہوئے تھے۔ اتنی طویل مسافت ساتھ ساتھ طے کر کے بھی دونوں ایک دوسرے سے اکتائے نہیں تھے۔ وہ اب تک دروازے پر کھڑی ہو کر شوہر کے گھر واپس آنے کا انتظار کیا کرتی تھیں۔ اب بھی ان کے شوہر ہر تیوہار پر ان کے لئے خوب صورت چوڑیاں لایا کرتے تھے اب بھی دونوں بات بات پر قہقہے لگایا کرتے تھے۔ بچے موہنہ بند کر کر کے ہنسا کرتے ذرا

ابا! اماں کو دیکھو......"

تینوں بچے بڑے ہو گئے تھے۔ اب اُن کے ریٹائر ہونے میں چند مہینے رہ گئے تھے اور وہ اپنے آبائی مکان میں رہ کر کسی بزنس کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

کون کہہ سکتا تھا کہ وہ اتنی جلدی جلدی ہی نہیں اچانک مر جائیں گے۔

کوئی بھی تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ مرے پڑے ہیں ایسا لگتا تھا سو رہے ہیں بہت گہری اور میٹھی نیند۔ چہرے کی سُرخی بھی تو سفید نہیں ہوئی تھی لبوں کی وہ مخصوص مُسکراہٹ بھی دُور نہ ہوئی تھی گٹھے گٹھے جسم کے اوسط قد کے مُسکراتے ہوئے انوار میاں شام کو اسی شان سے آئے تھے۔ معمول کے مطابق چائے پی تھی، بیوی سے ذرا سی ٹھٹھول کیا تھا، پھر نماز پڑھی تھی، اس کے بعد تینوں بچوں سے باتیں کرتے رہے تھے۔ پھر کھانا کھایا تھا، پھر آنگن میں ٹہل ٹہل کر مناجات پڑھتے تھے۔ پھر پان کھایا تھا اور حسبِ معمول کوئی کتاب لے کر لیٹ گئے تھے۔

جب اُن کو نیند آنے لگی تو بولے "بیگم بتی بند کر دینا۔"

بتی بند کر کے وہ اپنے بستر پر جانے لگیں تو دھیرے سے بولے: "ذرا سنو تو....."

"اے ہے بس! ہوش کی دوا کیجئے۔ اللہ رکھے سیانے سیانے بچے ہو گئے۔" وہ نئی دلہن کی طرح لجا گئی تھیں۔

"بچوں کے سیانے ہونے سے کیا ہوتا ہے ہم جوان تم ــــ خدا کی قسم ــــ تم اب بھی حسین ہو۔"

اور صبح کو ــــ

اللہ! صبح کو قیامت ٹوٹ پڑی۔

"اے میں کہتی ہوں کب تک سوئیں گے نماز بھی قضا ہو گئی۔ نہانے کا پانی بھی ٹھنڈا ہوا جاتا ہے۔" انھوں نے چادر کھینچ لی ــــ وہ سو رہے تھے لبوں پر مسکراہٹ تھی، چہرے پر آسودگی۔

"اٹھئے بھی! کیا بے پڑے ہیں!" وہ تنک گئی تھیں۔

وہ سوتے رہے۔

انھوں نے پھر ہلایا۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوئے تو گھبرا کر انھوں نے آوازیں دیں۔

"بانو! اختر! منور! دیکھو تو تمہارے ابا کیسا سوئے ہیں!"

پھر وہ دھم سے اسی جگہ بیٹھ گئیں جہاں کھڑی تھیں ــــ جہاں اب بھی بیٹھی تھیں۔

گھر عورتوں اور مردوں سے بھر گیا۔ فضا آہ و بکا سے بھر گئی۔ دن گزرا، رات آئی اور اب صبح کے پانچ بج رہے تھے ــــ وہ زمین کا پیوند ہو چکے تھے۔ ان کا نرم بستر فقیر کو دیا جا چکا تھا، چارپائی آنگن کے ایک کونے میں کھڑی کر دی گئی تھی، جسم سے اتارے گئے کپڑے بھی دے دئے گئے تھے۔

کھانا کھلنے کے بعد بانو پھر اُن کے پاس آ گئی۔

"اماں!" وہ سسک کر بولی: "اللہ! کچھ تو بولئے میرے ابا کہاں چلے گئے؟ یہ اُن کی نماز کا وقت ہے۔ انھوں نے مجھ سے وضو کا پانی بھی نہیں منگوایا۔"

اُن کی خشک آنکھیں روتی ہوئی بانو کو نہیں دیکھ رہی تھیں، وہ ایک کونے میں رکھی اس پلیٹ پر جمی تھیں جو ــــ ہاں جو اُن کے شوہر نے کھیر کھا کر پلنگ کے نیچے کھسکا دی تھی۔ لوگوں کے آنے جانے اور ٹھوکروں سے وہ پھسلی ہوئی دروازے کی آڑ میں چلی گئی تھی۔ اب اُن کا پلنگ ہٹا، لوگ ہٹے تو وہ صاف دکھائی دینے لگی۔

اُن کے دل میں ایک درد اُٹھا۔ نوعد کا درد، بے پناہ ٹیس۔ یہ آخری نشانی تھی اُن کے شوہر کی

"بیگم، ہمیں تو بھوک لگنے لگی۔" وہ ہنس کر بولے تھے۔

"توبہ ہے!" وہ شرما کر ہنسی تھیں پھر اُٹھ کر نعمت خانے سے کھیر نکال لائی تھیں ــــ اندھیرے میں چمچہ نہیں ملا تھا۔ انوار میاں نے بچوں کی طرح اُنگلی سے کھیر کھائی تھی، پھر پلیٹ جھک کر پلنگ کے نیچے کھسکا دی تھی۔

"وہی بچوں جیسی عادت!" وہ محبت بھری خفگی کے ساتھ بولی تھیں: "ڈانٹو نہیں بچوں کی ماں۔ صبح کو میں خود اس پلیٹ کو اُٹھا کر دھو کے رکھ دوں گا۔"

اللہ اللہ! پلیٹ رہ گئی اور وہ چلے گئے۔

بانو نے حیران ہو کر دیکھا وہ جو پتھر کی طرح جمی بیٹھی تھیں، بجلی کی طرح اُٹھیں، لپکیں اور وہ چھوٹی مکھیاں بھنکتی پلیٹ اُٹھا لی۔ پلیٹ انھوں نے آنکھوں سے لگائی، پھر لبوں سے، پھر دل سے۔ اُن کے ہاتھ کانپ رہے تھے، سنبھالنے کی کوشش کے باوجود چینی کی وہ چکنی اور نازک پلیٹ اُن کے ہاتھوں سے پھسلی اور پکے فرش پر چھناک سے جا گری۔

ایک دل خراش اور فلک شگاف چیخ سے گھر کے در و دیوار لرز اُٹھے۔

وہ ــــ

وہ جو اپنے شوہر کی میت پر بھی نہ رو سکی تھیں، اس چینی کی پلیٹ کے ٹکڑوں کو ہاتھوں میں بٹورتے ہوئے بلک بلک کر رو رہی تھیں۔

●●



تیس لاکھ عورتوں کا محبوب

حیدر بیابانی

اٹلی کے ایک غیر معمولی آدمی کا اب تک لگ بھگ تیس لاکھ سے بھی زیادہ عورتیں بوسہ لے چکی ہیں۔ یہ شخص ایک معمولی سپاہی تھا جو آج بھی اٹلی کے ایک شہر ردینا میں موجود ہے — لیکن ایک مجسمے کی شکل میں — جی ہاں اسے اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے تقریباً چار سو ستر برس ہو چکے ہیں لیکن اس بہادر سپاہی گندریو گنڈیلی کے مرمریں ہونٹوں پر آج بھی ساری دنیا کی خوب صورت سیاح عورتیں اپنے مخملی ہونٹوں کے بوسے ثبت کرتی رہتی ہیں۔

جان باز سپاہی گنڈریو کے اس مجسمے کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ جو عورت اس کے مرمریں ہونٹوں کو چوم لے گی زندگی بھر خوش و خرم رہے گی اور اسے تمام عمر اپنے شوہر، بچوں اور خاندان کی محبت اور چاہت ملتی رہے گی۔ اس لئے جب کوئی سیاح ردینا جاتا ہے تو یہ بات قطعی ناممکن ہو جاتی کہ اس کے ساتھ آئی ہوئی عورتیں گنڈریو کا مجسمہ دیکھنے کے لئے نہ جائیں اور جوشِ عقیدت سے اس سپاہی کے لبوں کو نہ چوم لیں کیونکہ ایسا کرنا اُن کے نزدیک آئندہ زندگی کے لئے نیک فال ثابت ہوتا ہے۔

سولہویں صدی کے اس غیر معمولی سپاہی کے قصے کہانیاں کسی ہیرو سے بھی زیادہ مشہور ہیں اور اس کی شخصیت کا اثر ایک جرنیل کی شخصیت کے اثر سے کہیں زیادہ اٹلی کے عوام کے ذہنوں پر چھایا ہوا ہے۔

یورپ کی کنواریاں اچھا شوہر مل جانے کی دُعا گنڈریو کے مجسمے کے مرمریں ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں سے چھو لینے کے بعد کیا کرتی ہیں۔ اس اُمید پر کہ ایسا کرنے سے دُعا یقیناً تاثیر سے ہم کنار ہوگی۔ یہ بات انیسویں صدی میں ساری اٹلی میں پھیل چکی تھی کہ گنڈریو صرف ایک بوسے کے عوض کنواری لڑکیوں کو سنہرے خوابوں کی وادیاں اور من پسند شوہر دلوانے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ تب سے روزانہ سیکڑوں لڑکیاں اپنی آرزوئیں گنڈریو کی مورتی کے سامنے پیش کرنے کے لئے حاضر ہوتی ہیں۔ اس مجسمے سے کنواریوں کی محبت و عقیدت اس وقت اپنی ساری حدیں توڑ دیتی ہے جب وہ محبت کی ماریاں پاس کھڑے ہوئے مجمع کو نظر انداز کر کے بے جان مجسمے کے ہاتھوں کو سہلاتی ہیں، اس کے چہرے کو پیار سے تھپتھپاتی ہیں اور ایک پیار بھرا بوسہ لے کر دھیرے دھیرے اس کے بے جان کانوں میں محبت آمیز باتوں کی سرگوشیاں کرتی ہیں۔

اس بہادر سپاہی کا یہ مجسمہ ردینا کی فنی کاوش کی زینت بنا ہوا ہے۔ اس مجسمے کو مشہور سنگ تراش ٹوبیولو مبازی نے بنایا تھا۔ یہ سنگ تراشی کا

ایک مکمل نمونہ ہے۔ ایک سپاہی کی شان و شوکت کے ساتھ تمام جنگی سامان سے لیس گدرلیو کی شخصیت میں وہ مردانہ وجاہت ہے جو فرشتوں کا ہی حصہ ہوگی۔ اٹلی کے ایک فن کار نے کہا تھا کہ "پتھر کے ہونٹ جیسے اس وقت جاگ اٹھتے ہیں جب کوئی خوب صورت عورت اپنے زندہ رسیلے ہونٹ اُن کے نزدیک لے آتی ہے۔" وہ عورتیں جو دنیا جاتی ہیں گدرلیو کے مجسّے کو دیکھنے کے بعد یہ اعلان کرتے ہوئے نہیں تھکتیں کہ انہوں نے اس سے پہلے ایسا خوب صورت مردانہ چہرہ نہیں دیکھا۔ ملبورن سے آئی ہوئی ایک نرس نے کہا "کچھ ایسا کرشمہ اس مجسّے میں نظر آتا ہے جو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔"

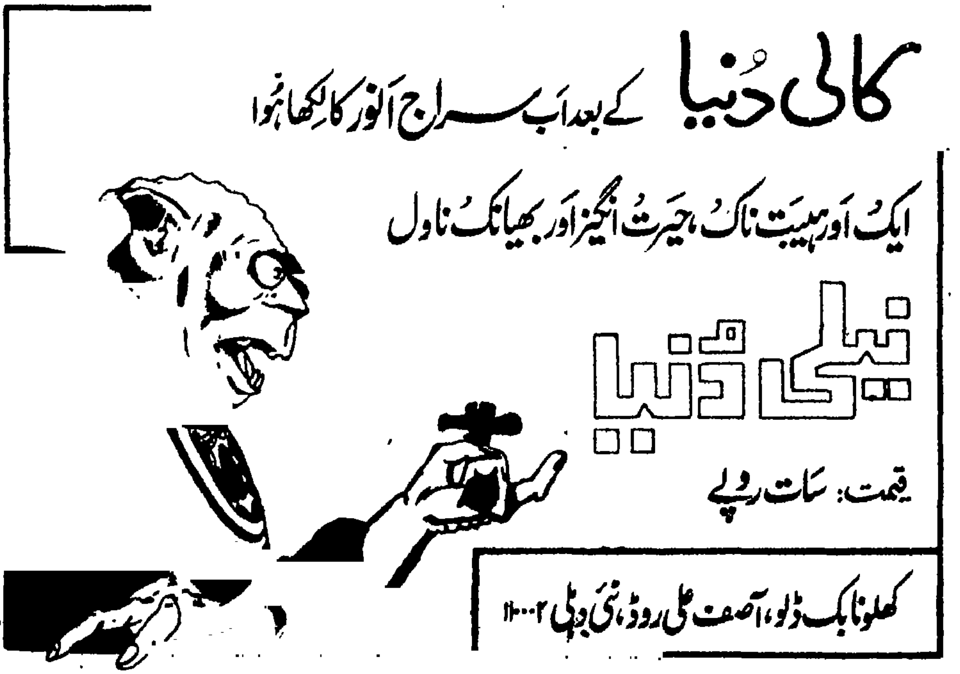
دن بھر کی بوسہ بازی کے بعد جب رات آتی ہے تو اکادمی کا محافظ علما اکادمی میں عام داخلہ روک دیتا ہے۔ اس وقت گدرلیو کے ہونٹ سمیت سارا چہرہ لپ اسٹک کی سُرخی سے جگمگاتا نظر آتا ہے۔ اسے صاف رکھنے کے لئے الکوہل میں ڈبوئے ہوئے کپڑے کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ابتدا میں پلاسٹک کے ماسک نما ٹکڑے سے اس کا چہرہ ڈھکنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن یہ تدبیر پسند نہیں کی گئی۔

آخر یورپ کی تمام عورتوں کا دل جیتنے والا یہ سپاہی کون تھا؟ اس کی بھی بڑی دل چسپ کہانی ہے۔ گدرلیو دنیا ہی میں ایک معمولی آدمی کے گھر میں پیدا ہوا۔ بڑا ہوا تو شاہی فوج میں بھرتی ہو گیا۔ وہ شہنشاہ کیڈریو سوم کا منظورِ نظر اور ایک دلیر سپاہی تھا۔ وہ اپنی ۳۳ برس کی سپاہانہ زندگی میں شہنشاہ کا وفادار ترین سپاہی رہا۔ اس نے بادشاہ کا ساتھ مرتے دم تک نہیں چھوڑا۔ مارچ ۱۸۱۵ء میں کیڈریو دالا کحلاوہ پالوآرسینی چلا گیا وہاں وہ شیر دل سپاہی ایک جنگ میں کام آ گیا۔ تقریباً ایک صدی بعد اٹلی کے مشہور شاعر گیبریل دا الونیج نے اس کے غیر معمولی کردار پر ایک غیر معمولی نظم قلم بند کر کے اسے ادبی دُنیا میں بھی جاوداں کر دیا۔

شاید پتھر کے ہونٹوں والے اس سپاہی کی سب سے زیادہ ہمت افزائی اور اُس کی کرشمائی طاقت کا اندازہ اس دن ہوا جب دنیا کی سب سے زیادہ مقبول اداکارہ و سیمیں بدن عورت صوفیہ لارنس رو نیا گئی اور اُن پتھریلے ہونٹوں کو بوسہ دیے بغیر نہ رہ سکی۔

(ترجمہ)

●●



پیار

ہمالیہ والا



وہ چاروں باغیچے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

ان میں سے دو میری طرف پیٹھ کئے ہوئے تھے، باقی دو مجھے دیکھنے لگے۔ ایک مرد تھا جس کی عمر لگ بھگ پچاس سال ہوگی، دوسری عورت تھی جو ادھیڑ عمر کی تھی۔ انھوں نے مجھے خوش آمدید کہا۔

ان دونوں کا نام پیٹر اور اینی تھا۔ جلد ہی میں ان کے ساتھ رہنے لگا۔ وہ بڑے مہمان نواز اور خوش خلق لوگ تھے۔ چونکہ وہ علاقہ قدرتی مناظر سے بھرپور تھا اس لئے میں مصور کی حیثیت سے وہاں پہنچا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہاں میں اچھی اچھی تصاویر پینٹ کرسکوں گا۔ روزانہ بلاناغہ میں کینوس، برش وغیرہ لے کر قریب کی پہاڑیوں کی طرف نکل جاتا۔

کچھ دن بعد میں نے محسوس کیا کہ پیٹر اور اینی آپس میں کھسر پھسر کرتے رہتے ہیں۔ جب میں ان کے سامنے جاتا تو۔ وہ دونوں اس طرح خاموش ہو جاتے جیسے کہ انھیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ یہ سلسلہ کافی دنوں تک چلتا رہا ایک دن میں نے پیٹر سے کہا "پیٹر بھیا، آپ دونوں میری پیٹھ پیچھے کیا راز داری کی باتیں کیا کرتے ہیں؟ کیا میرے متعلق؟ میں بہت دنوں سے دیکھ رہا ہوں اور ایک طرح کی گھٹن محسوس کر رہا ہوں اگر کسی وجہ سے میں آپ لوگوں کے لئے تکلیف کا باعث بن رہا ہوں تو مناسب ہوگا کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔ مجھے صاف صاف بتایئے میں بُرا نہیں مانوں گا۔"

"نہیں میرے بھائی" پیٹر بولا "ہماری پریشانی کا تعلق تم سے نہیں ہے ــــ میں تمہیں بتاتا ہوں۔ میرا بیٹا، آلیوشا، جیسا کہ تمہیں معلوم ہے، فوج میں بھرتی تھا۔ فوج میں جانے سے پہلے اس کی ملاقات لویا سے ہوئی تھی۔ آلیوشا اور لویا کی دوستی بھی عجیب تھی وہ ساتھ ساتھ گھومتے تھے مگر روایتی محبت کرنے والوں کی طرح انھوں نے عہد و پیمان نہیں باندھا۔ پھر بھی وہ ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ جب آلیوشا فوج میں بھرتی ہوا تو اس کی لویا سے خط و کتابت چلتی رہی۔ ہم سب یہی سمجھتے رہے کہ آلیوشا فوج سے واپس آکر لویا سے شادی کرے گا۔ تین مہینے پہلے آلیوشا واپس آگیا اور فارم پر کام کرتا رہے۔ مگر لویا اپنا سامان باندھ رہی ہے وہ کہیں اور جاکر پڑھنے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔"

"تو اس میں خرابی کیا ہے؟ یہ تو اچھی بات ہے" میں نے کہا "مجھے کوئی پریشانی نہیں نظر آتی۔"

"ہاں ــــ" پیٹر نے کہا "اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ مگر وہ دونوں پھر ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے۔ اور میرے بیٹے کا کہنا ہے کہ لویا جائے گی تو پھر واپس



اِن سے ملئے

نسیمہ عزیز

شادی کے بعد عورت گھر کی ہو کر رہ جاتی ہے۔ بچوں کی پیدائش کے بعد اس کی دنیا اور بھی محدود ہو جاتی ہے۔ لیکن کچھ باہمت عورتیں ان ذمہ داریوں کے باوجود سماجی اور تعلیمی سرگرمیوں کے لئے بھی وقت نکال لیتی ہیں۔ نسیمہ عزیز ایسی ہی ایک سوشل ورکر ہیں جو اپنی گھر کی ذمہ داریوں کے ساتھ سماج کی فلاح و بہبود کے لیے بھی کام کرتی ہیں۔

آج کل نسیمہ کی سرگرمیوں کا محور کریسنٹ پبلک اسکول ہے۔

مسلمان تعلیمی میدان میں دوسرے فرقوں سے بہت پیچھے ہیں۔ ۱۸۵۷ کی جنگِ آزادی کے بعد مسلمان انگریزوں سے نفرت کرتے تھے۔ انگریزوں نے مغلیہ سلطنت کا خاتمہ کر دیا تھا۔ مسلمانوں کی انگریزی تعلیم سے بیزاری اسی کا ردِ عمل تھی۔ سرسید نے اس رجحان کے خلاف آواز اٹھائی۔ ان کی پُرزور مخالفت ہوئی۔ لیکن وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہو گئے۔ مسلمانوں نے جدید تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی۔ اس کے باوجود مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد جدید تعلیم سے بے بہرہ رہی۔ آزادی سے پہلے پڑھے لکھے مسلمانوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔

آزادی کے بعد حکومت نے ہندوستانیوں کی تعلیم پر بھرپور توجہ دی۔ ہزاروں اسکول کھولے گئے۔ پرائمری اور بعد میں مڈل تک تعلیم مفت کر دی گئی۔ ہندوستان میں تعلیمی ادارے دو قسم کے ہیں۔ ایک سرکاری اسکول اور دوسرے پبلک اسکول۔ سرکاری اسکولوں میں داخلہ نسبتاً آسان ہے۔ لیکن ان اسکولوں کا معیارِ تعلیم قابلِ رشک نہیں ہے۔ پبلک اسکول تعلیم کے اعلیٰ معیار کے لئے زیادہ مشہور ہیں۔ یہ نسبتاً مہنگے بھی ہیں، لیکن پھر بھی ان اسکولوں میں داخلہ حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے برابر ہے۔ ان اسکولوں کی تعداد کم ہے اور داخلے کے امیدوار زیادہ ہیں۔ اس صورت حال میں صرف ان ہی بچوں کو داخلہ مل سکتا ہے جن کے والدین نہ صرف مال دار ہوں، بلکہ خود بھی پڑھے لکھے ہوں، اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوں اور بارسوخ ہوں۔ مسلمان چونکہ تعلیمی میدان میں پیچھے ہیں اس لئے ان شرائط کو پورا نہیں کر سکتے۔

دلی ہندوستان کی راجدھانی ہے اس شہر میں تعلیمی اداروں کی کمی نہیں۔ یہاں سرکاری اسکولوں کے علاوہ تقریباً دو درجن پبلک اسکول بھی ہیں۔ لیکن بات وہی ہے یہ اسکول زیادہ تر نئی دلی میں ہیں۔ ان میں داخلہ حاصل کرنا بہت دشوار ہے مسلمان والدین اگر دولت مند ہیں تو تعلیم یافتہ نہیں ہیں۔ اگر تعلیم یافتہ ہیں تو انہیں رسوخ حاصل نہیں ہے۔ وہ اپنے وسائل کے باوجود بچوں کو تعلیم نہیں دلا سکتے۔ یہ صورتِ حال افسوس ناک ہے۔ دلی کے کچھ سرکردہ شہریوں نے اس بارے میں ایک قدم اٹھایا ہے انہوں نے کریسنٹ پبلک اسکول کی داغ بیل ڈالی۔ سب سے پہلے روپیہ کا سوال درپیش آیا۔ اسکول کے لئے روپیہ جمع کرنے کا کام شروع ہوا۔ سابق ریلوے منسٹر محمد شفیع قریشی کی کوٹھی میں ایک میلہ لگایا گیا ہے۔ داخلے کے ٹکٹ اور اسٹالوں کے کرائے سے تقریباً ۲۵ ہزار

روپیہ کی آمدنی ہوئی لیکن یہ روپیہ بہت کم تھا۔ اسکول چلانے کے لئے تقریباً ۶ لاکھ روپیہ درکار ہے۔ مزید مالیات فراہم کرنے کی غرض سے اسکول کی طرف سے مئی میں دوسرے میلے کا انعقاد ہوا۔ یہ میلہ زینت المساجد سے ملحق ایک قطعہ زمین پر ترتیب دیا گیا۔ اسکول کے سامنے دوسرا سوال زمین کا تھا۔ دلّی میں زمین کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔ زمین حاصل کرنا ایک دشوار مسئلہ تھا۔ یہ مسئلہ دلّی کے وقف بورڈ نے حل کر دیا۔ زینت المساجد سے ملحق زمین اسکول کو عطا کر دی گئی۔ وقف بورڈ سے بھی کچھ روپیہ حاصل کیا گیا۔ اس طرح کریسنٹ پبلک اسکول کا قیام عمل میں آیا۔

جو لوگ اس اسکول کے قیام کے سلسلے میں کام کر رہے ہیں، نسیمہ ان میں پیش پیش ہیں۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں بچوں کی پرائیویٹ تعلیم کا بندوبست کیا گیا تاکہ ان کا تعلیمی معیار بلند ہو سکے۔ نسیمہ نے چند تعلیم یافتہ عورتوں کی خدمات حاصل کیں۔ ان عورتوں نے گرمیوں کی چھٹیوں میں بلا معاوضہ بچوں کو ٹریننگ فراہم کی۔ اس اسکول میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے۔ اس کے علاوہ اردو اور دینی تعلیم کا بھی انتظام ہے۔ دلّی کے پبلک اسکول زیادہ تر عیسائی مشنری چلاتے ہیں۔ اکثر لوگ اپنے بچوں کو اس وجہ سے عیسائی اسکولوں میں بھیجنا پسند نہیں کرتے۔ اب یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ جدید تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ اس اسکول کی ماہانہ فیس ۶۰ روپلے ہے۔ یہ رقم کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے، لیکن اسکول کی افادیت کو دیکھتے ہوئے یہ فیس مناسب ہے۔ نسیمہ کے خیال میں اس اسکول کے حالات امید افزا ہیں۔ اسکول میں نرسری سے ساتویں درجے کی تعلیم تک انتظام ہو چکا ہے۔ انہیں توقع ہے کہ یہ اسکول مستقبل میں ہائر سیکنڈری کے مرحلے تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

نسیمہ لکھنؤ میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد ڈاکٹر فریدی لکھنؤ کے ایک مشہور ڈاکٹر تھے۔ وہ مجلس مشاورت کے صدر رہے تھے۔ چند سال پہلے ان کا انتقال ہو گیا۔ نسیمہ نے لکھنؤ لوریٹو کونونٹ میں تعلیم حاصل کی۔ لکھنؤ سے انٹر پاس کر کے وہ علی گڑھ آ گئیں۔ علی گڑھ میں ابھی ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ ان کی شادی ہو گئی اور ان کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ان کو امید تھی کہ وہ شادی کے بعد تعلیم جاری رکھیں گی، لیکن ان کی یہ امید پوری نہ ہو سکی۔ ان کے شوہر عشرت عزیز فارن سروس میں ہیں۔ شادی کے بعد وہ اپنے خاوند کے ساتھ مراکش چلی گئیں۔ ان کی پہلی لڑکی مراکش میں پیدا ہوئی۔ مراکش میں عشرت عزیز کا قیام ساڑھے تین سال رہا۔ اس کے بعد ان کا تبادلہ بغداد ہو گیا اور وہ بغداد چلے گئے۔ بغداد میں تین سال رہنے کے بعد ان کا تبادلہ لبنان میں ہو گیا۔ انہوں نے لبنان کی راجدھانی بیروت میں ساڑھے تین سال قیام کیا اور پھر ہندوستان واپس آ گئے۔ اس طرح انہوں نے گیارہ سال ہندوستان سے باہر گزارے۔ آج کل عشرت عزیز دلّی میں کام کرتے ہیں۔

نسیمہ کو عرب ممالک میں مراکش بہت پسند ہے۔ یہاں انہوں نے فرنچ زبان سیکھی۔ مراکش پر پہلے فرانس کی عملداری تھی۔ یہ ملک یورپ سے بہت نزدیک ہے اس کے باوجود مراکش میں بیش تر عورتیں پردہ کرتی ہیں۔

نسیمہ انگریزی زبان کی شاعر بھی ہیں اور ڈرامہ نگار بھی۔ ان کی انگریزی شاعری کا مجموعہ "دن مور" کے نام سے شائع ہو چکا ہے اس طرح وہ ایک صاحبِ دیوان شاعر ہیں۔ انہوں نے تین ایکٹ کا ایک ڈرامہ بھی تصنیف کیا ہے۔ اس ڈرامہ کا نام "لے سلو ٹو مارو" ہے۔ یہ ڈرامہ نئی دلّی میں اسٹیج ہو چکا ہے۔ فیصل القاضی نے اس ڈرامے کو ڈائریکٹ کیا تھا۔ نسیمہ آج کل اپنا دوسرا ڈرامہ لکھ رہی ہیں۔

نسیمہ کو پارٹیوں میں جانے کا شوق نہیں وہ گنے چنے دوست پسند کرتی ہیں۔ انہیں باغبانی سے بہت دلچسپی ہے۔ نئی دلّی میں ان کے گھر میں ایک وسیع لان ہے۔ اس طرح ان کا باغبانی کا شوق پورا ہو جاتا ہے۔ انہیں زیورات پہننا پسند نہیں۔ گھر پر وہ اکثر شلوار قمیص پہنتی ہیں۔ گھر سے باہر ساڑی ان کا پسندیدہ لباس ہے۔ انہیں مطالعہ کا بہت شوق ہے۔ سوانح عمری اور ڈرامہ ان کے محبوب موضوعات ہیں۔

نسیمہ ایک آرٹسٹ بھی ہیں۔ شاعری اور ڈرامے کے علاوہ انہیں تصویریں بنانے کا بھی شوق ہے۔ وہ خشک پتوں اور ٹہنیوں سے بہت خوب صورت تصویریں بناتی ہیں۔ انہوں نے آل انڈیا ریڈیو میں بھی کام کیا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا آل انڈیا ریڈیو سے ان کے کئی انٹرویو بھی نشر ہوئے تھے ●●

فلورینس اسٹرن فیل جو مستقبل کو دیکھ سکتی ہے!



مناظر عاشق ہرگانوی

رات کا وقت تھا۔ فلورینس اپنے برآمدے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اچانک ایک اجنبی دھڑ دھڑاتا ہوا اندر آگیا۔

"میری قسمت کا حال بتایئے" اس نے کہا۔

"پہلے شریفوں کا سا رکھ رکھاؤ سیکھو۔ مجھے اس طرح کی ناشائستگی پسند نہیں" فلورینس نرم لہجے میں بولی "تمہارے لئے مناسب یہی ہے کہ تم نیویارک سے باہر رہو"

"نہیں یہ ممکن نہیں ہے۔ بھلا اس شہر کو میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟ یہاں میرا کاروبار ہے"

"لیکن تمہاری بھلائی نیویارک چھوڑنے میں ہی ہے" فلورینس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اجنبی نے اس پر عمل کیا اور نتیجے میں کامیابی نے اس کے قدم چومے۔

آج فلورینس کو دادی اماں کہا جاتا ہے۔ اس کے کارناموں سے اور اس کی پیش بینی کی قدرتی صلاحیت سے بہت سے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں اگر اسے کسی شخص کی استعمال کی ہوئی کوئی دھات چیز دے دی جاتی ہے تو محض اسی کے سہارے اس کے دماغ میں اس شخص کی مرئی تصویر ابھر آتی ہے اور وہ اس شخص کے بارے میں پوری معلومات فراہم کر دیتی ہے۔

فلورینس کی پیدائش پشکل میں ہوئی تھی سب سے پہلے اس قدرتی صلاحیت کا احساس اسے آٹھ برس کی عمر میں ہوا تھا۔ ایک دن وہ اسکول سے واپس آ رہی تھی۔ راستے میں قبرستان پڑتا تھا۔ وہ ایک قبر کے پاس رک گئی۔ اس قبر کے کتبے پر کچھ بھی لکھا ہوا نہیں تھا۔ ابھی وہ قبر کو دیکھ ہی رہی تھی کہ قبرستان کا محافظ وہاں گھومتا ہوا آ پہنچا۔

"تم کیا کر رہی ہو؟" اس نے فلورینس سے پوچھا۔

"ذرا کتبے پر نام پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی" اس نے جواب دیا۔

"لیکن اس پر تو نام لکھا ہوا نہیں ہے"

"کیسے نہیں ہے۔ دیکھئے صاف تو لکھا ہوا ہے —— ولیم جانسن"

قبرستان کے محافظ نے اپنی نوٹ بک کے اوراق الٹے۔ سچ مچ یہی نام تھا۔

بارہ برس کی عمر میں فلورینس اپنے گھر کے سامنے سے گذرنے والوں کے دلوں کے خیالات پڑھ لیتی تھی۔

چودہ برس کی عمر میں اسے پتہ چل گیا تھا کہ اس کے چچا کی موت کب ہوگی۔

جب وہ جوان ہوئی تو اس کی اس صلاحیت نے خود اسے ہی پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ اس کا سب سے بڑا نقصان اس وقت ہوا جب اس کی شادی ہربرٹ اسٹرن فیل سے ہوئی۔ وہ خود لکھتی ہے:

"مجھے ہر وقت پتہ چل جاتا تھا کہ میرا شوہر کیا سوچ

رہا ہے۔ پھر میں اپنا منہ بند نہیں رکھ سکتی تھی ــــ نتیجتاً طلاق ہو گئی۔"

فلورینس نے امریکہ کے ماہرین روحانیات کو سب سے پہلے ۱۹۲۰ میں متوجہ کیا تھا اس کے بہت سے ٹیسٹ لئے گئے اور ہر ٹیسٹ میں وہ کامیاب رہی۔ پھر اس نے اپنی اس صلاحیت سے وہ کارہائے نمایاں انجام دئے کہ امریکہ کے بیش تر ماہرین اس کی پیش بینی کی صلاحیت کو قدرت کا عطیہ ماننے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اب فلورینس اپنی اس صلاحیت کو دوسرے لوگوں کے لئے وقف کر کے خوش اور مطمئن رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مدد کے خواہش مندوں کے ہجوم میں ہمیشہ گھری رہتی ہے۔

فلورینس کے کام کا اپنا الگ انداز، ڈھنگ اور طریقہ ہے۔ ایک بار پولیس ایک لاپتہ عورت کا سراغ لگانے کے لئے پریشان تھی۔ پندرہ دن کی تلاش کے بعد بھی اس کا پتہ نہ چل سکا تھا۔ پولیس کے کتے ایک سڑک پر بڑھتے اور رک جاتے پھر گردن اٹھا کر بھونکنے لگتے اور واپس آجاتے تھے۔

آخر پولیس نے فلورینس سے مدد چاہی اس لاپتہ عورت کے استعمال کئے ہوئے کپڑے اسے دے دئے گئے اور فلورینس نے فوراً بتا دیا کہ وہ عورت فلاں سڑک سے جنگل کی سمت گئی تھی اور ایک حادثے کا شکار ہو گئی تھی۔ اس کی لاش فلاں مقام پر موجود ہے۔

بعد میں پولیس افسر نے فلورینس کے بتائے ہوئے مقام سے اس عورت کی لاش برآمد کر لی۔

ایک بار ایسکس کاؤنٹی میں واقع ایک جواہرات کی دوکان لوٹ لی گئی۔ جب پولیس اپنے طور پر ناکام ہو گئی تو وہ فلورینس کے پاس پہنچی۔ فلورینس نے بتایا "ڈاکوؤں میں ایک لنگڑا آدمی بھی تھا۔ میرے دماغ میں جو تصویر ابھری ہے اس میں پیتل کی ایک مسہری بھی ہے۔"

فلورینس کی نشان دہی پر پولیس کا کام آسان ہو گیا۔ پولیس نے تین لنگڑے بدمعاشوں کا پتہ چلا یا۔ ان میں سے تیسرا ایک پیتل کی مسہری پر سویا ہوا تھا۔ پولیس نے مسہری کھولی تو اس میں سے کچھ جواہرات بھی برآمد ہو گئے۔

ایک مرتبہ ٹیلی فون کمپنی کے منیجر نے فلورینس کو فون کیا اور ملنے کی خواہش ظاہر کرتے ہوئے وقت مانگا۔ فلورینس سے اجازت اور وقت ملنے پر وہ "روز وہائٹ" کے علاقے میں واقع اس کے گھر پہنچا تو کھویا کھویا سا تھا۔ فلورینس نے اس کی شکل دیکھتے ہی کہا "میرا خیال ہے کہ چند اہم کاغذ گم ہو گئے ہیں، جس کی وجہ سے آپ پریشان ہیں۔"

"جی ــــ جی ہاں۔ لیکن آپ کو کیسے پتہ چلا؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

دراصل ٹیلی فون کا سارا محکمہ فلورینس کی صلاحیت کو ماننے سے انکار کرتا رہا تھا اور خاص طور پر منیجر تو اس قسم کی باتوں پر یقین ہی نہیں رکھتا تھا۔ لیکن جب چند اہم کاغذ کھو گئے تو وہ فلورینس سے مدد لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ ویسے اسے امید نہیں تھی کہ فلورینس پتہ چلا لے گی۔

فلورینس نے جواب دیا "یہ میری چھٹی حس کا کرشمہ ہے۔"

پھر دیکھتے ہی دیکھتے فلورینس نے منیجر کے آفس کا ایک نقشہ تیار کیا اور منیجر کو بتایا کہ گم شدہ کاغذ آفس میں ہی فلاں مقام پر رکھے ہوئے ہیں۔

منیجر نے واپس جا کر جب بتائے ہوئے مقام پر دیکھا تو کاغذ واقعی وہاں موجود تھے۔

ایڈولف کورسس سوئم کا قصہ بھی بہت مشہور ہے۔ وہ شراب کے کارخانے کا مالک تھا۔ ۶۔ فروری ۱۹۶۰ کو وہ پُراسرار طور پر لاپتہ ہو گیا ــــ ایڈولف کا بھائی فلورینس کے پاس گیا۔ وہ بے حد غمگین تھا۔ اس نے گڑگڑا کر فلورینس سے مدد مانگی لیکن فلورینس نے پہلی شرط یہ رکھی کہ ایف، بی، آئی کی اجازت اسے ملنا چاہئے۔

ایڈولف کے بھائی نے دوڑ دھوپ کے بعد ایف، بی، آئی سے اجازت لے لی۔ اس کے بعد وہ فلورینس کے پاس دوبارہ پہنچا۔ اپنے ساتھ وہ ایڈولف کی ایک تصویر اور اس کی بیٹی کا بکسوا بھی لیتا گیا تھا۔

بکسوا ہاتھ میں لیتے ہی فلورینس کے مونہہ سے آہ نکل گئی۔ پھر وہ بتانے لگی "پُل پر ڈھیر سارا خون پڑا ہے۔ سر پر دو گولیوں کے نشان ہیں میں دیکھ رہی ہوں کہ جب تمہارا بھائی گھر سے نکلا تو اس کا تعاقب شروع ہو گیا تھا۔

اس کی لاش موسم گرما کے آخر میں ملے گی۔

وقت گذرنے پر ساری باتیں سچ نکلیں۔

۱۱ ستمبر کو ایڈولف کی لاش ملی۔ اس کے سر پر دو ہی گولیوں کے نشان تھے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران فلورینس نے فوج کے لئے بھی کام کیا تھا۔ ایک بار اس نے خبر دی کہ آئینا آئی لینڈ نام کی ایک چھاؤنی کو اڑا دینے کی کوشش کی جائے گی اور یہ کام کسی مزدور کا ہوگا جس کے ہاتھ میں ناشتے دان کے اندر مکمل ڈائنامائیٹ ہوگا۔ یہ بات بھی سچ نکلی تھی۔

ایک دن ایک عورت بدحواسی کے عالم میں فلورینس کے گھر کے اندر آگئی اور دھم سے بیٹھ گئی ــــ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک خالی پرس تھا۔ یہ پرس اس کی سترہ سالہ لڑکی کا تھا، جو گھر سے بھاگ گئی تھی۔ لڑکی نے یہ بھی دھمکی دی تھی کہ وہ خودکشی کر لے گی۔ فلورینس آرام سے بیٹھی

رہی۔اس کی پیشانی پر شکن تک نہ ابھری۔ اس نے
نایا "گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ جلد ہی واپس
بائے گی۔ اس وقت وہ پیٹس برگ میں ہے۔ وہ
سی لڑکے کے ساتھ بھاگ کر گئی ہے جس سے ملنے
پابندی لگائی گئی تھی۔"

فلورینس کے پاس طرح طرح کے
آتے ہیں، لیکن براہِ راست کم ہی لوگ اس سے
ال کرتے ہیں، اور بے دھڑک چلے آنے والوں کی
راد بھی کم ہی ہوتی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ
رینس کا "دربار" بدھ کے دن لگتا ہے۔ بدھ
دن وہ اپنے کمرے میں ایک مسیحا کی طرح بیٹھی
تی ہے۔

فلورینس کے گھر کے باہر اس کے نام کا ایک
رلگا ہوا ہے، جس پر یہ بھی لکھا ہوا ہے:

"اندر تشریف لائیے"

اندر ایک بڑا کمرہ ہے۔ یہی کھانے اور سونے کا کمرہ ہے۔ اس میں پچیس کرسیاں سلیقے سے رکھی ہوئی ہیں۔ جب کوئی آدمی اندر آتا ہے تو اپنا سوال لکھتا ہے اور اس کاغذ کو لفافے میں رکھ کر بند کر دیتا ہے۔ اسی میں فلورینس کی فیس بھی رکھنا ہوتی ہے اس کی فیس ایک پونڈ ہے۔ یہی اس کی آمدنی کا ذریعہ ہے۔

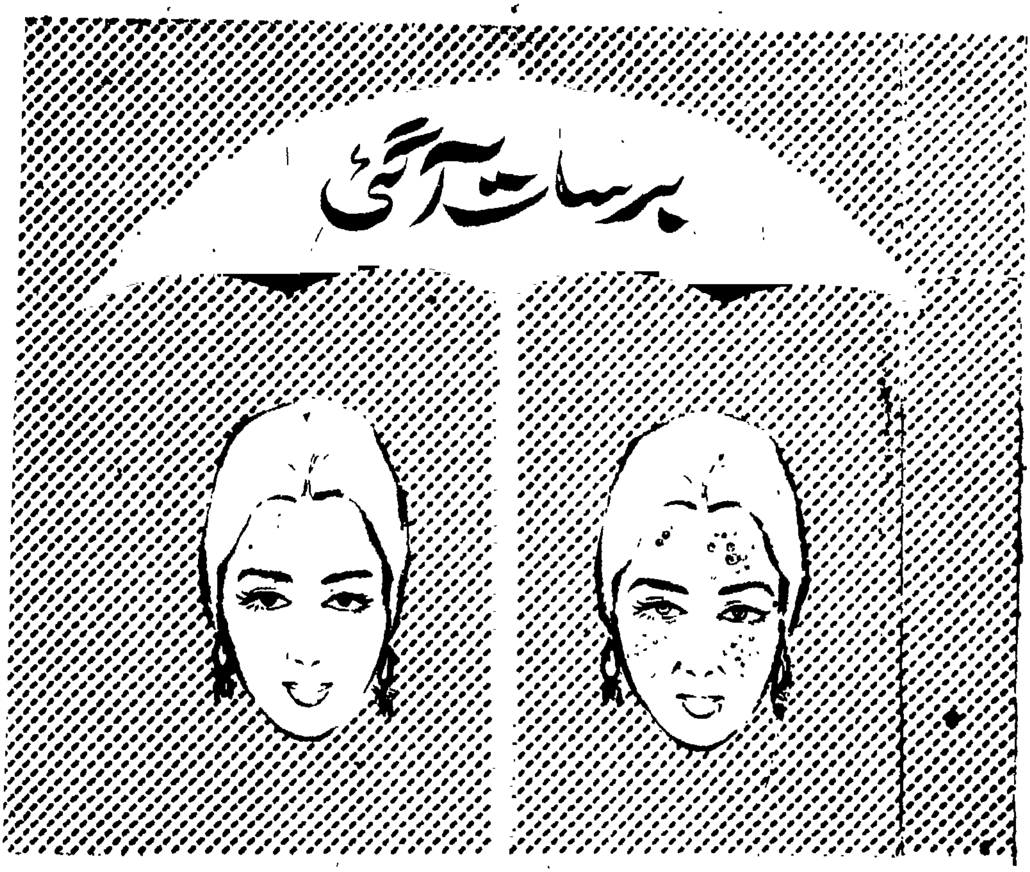
فلورینس سے زیادہ تر لوگ محبت، دولت اور ملازمت کے بارے میں سوال پوچھتے ہیں۔ لڑکیاں زیادہ تر یہ پوچھتی ہیں کہ ان کی شادی کب ہوگی۔ اور اگر شادی شدہ ہیں تو وہ یہ جاننا چاہتی ہیں کہ ان کا شوہر کتنا وفادار ہے اور وہ بے وفائی تو نہیں کر رہا ہے یا کرے گا۔

فلورینس کے پاس کوئی سیکریٹری نہیں ہے۔ وہ مصروفیت کی وجہ سے خطوں کے جواب نہیں دے سکتی اور نہ وہ خطوں کے ذریعہ کیس بھانی ہے وہ اس بات کا بھی خیال رکھتی ہے کہ اگر وہ کسی شخص کے مستقبل میں کوئی بڑا سانحہ یا حادثہ دیکھتی ہے تو بالکل نہیں بتاتی۔

ایک بار ایک تھیٹر کا ایجنٹ فلورینس کی شہرت سُن کر اس کے پاس آیا۔ وہ سچے دل سے فلورینس کا معتقد نظر آتا تھا۔ اس نے فلورینس کو تھیٹر کے لئے بک کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ فلورینس نے اس سے وعدہ بھی کر لیا لیکن اس کے جانے کے بعد اس کو احساس ہوا کہ وہ کبھی اس کے لئے کام نہیں کر سکے گی اور ایسا ہی ہوا۔

اس ایجنٹ کی کار کے حادثے میں موت ہو گئی۔

■■


برسات آگئی



ناظمہ سلطانہ واسع پور، دھنباد

س ۔ کسی کا دل موم کا ہوتا ہے اور کسی کا پتھر کا ایسا کیوں؟

ج یہ قدرت کا نظام ہے۔ شیر کی خوراک دوسرے جانور بنتے ہیں بادی النظر میں یہ بے رحمی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن دنیا اس طرح چلتی ہے۔

س ۔ عورت اس دنیا میں اتنی مجبور کیوں پائی جاتی ہے؟

ج اس کی آدھی مجبوری مردوں نے پیدا کی ہے اور آدھی خود اس نے اپنی حالت کو تسلیم کرکے۔ ماحول کے آگے ہتھیار ڈال کر۔

وقار احمد خاں، گریڈیہہ

س ۔ سچائی چھپانے سے کیوں نہیں چھپتی؟

ج سچائی چھپانا جرم ہے۔ انسان کو اس جرم کا احساس مارے ڈالتا ہے اور وہ اپنے سر سے گناہ کا بوجھ اتارنے کے لئے خود ہی سچائی پر سے پردہ اٹھا دیتا ہے۔

س ۔ کیا دولت سے محبت خریدی جاسکتی ہے؟

ج دولت سے محبت تو نہیں ہاں اُنسیت خریدی جاسکتی ہے۔

محمد فیاض قریشی، واسع پور، دھنباد

س ۔ کیا خودکشی واقعی زندگی سے ہارنے کی نشانی ہے؟

ج اس میں ہار جیت کی کوئی بات نہیں ہر انسان کے دل میں بدخواہش فطری ہوتی ہیں۔ ایک زندہ رہنے کی خواہش اور ایک موت کی خواہش۔ ہر انسان زندگی میں کسی نہ کسی موقع پر ضرور موت کی خواہش کرتا ہے۔ خودکشی کرنے والے میں موت کی خواہش شدید ہوتی ہے۔

س ۔ ہوشیار آدمی اپنی غلطی کا احساس کب کرتے ہیں؟

ج غلطی کا نتیجہ نکلنے سے پہلے۔

سلطانہ اقبال، چھپرہ، بہار

س ۔ کامیابی کوشش پر منحصر ہوتی ہے یا قسمت پر؟

ج قسمت پر کسی کا بس نہیں۔ کوشش کرنا ہمارے ہاتھ میں ہے جو چیز ہمارے اختیار میں ہے۔ ہم اسے ہی بروئے کار لاسکتے ہیں۔

س ۔ جب انسان جھوٹ کا دامن تھام لیتا ہے تو سچائی کیا کرتی ہے؟

ج انتظار۔ ۱۰۰ دن سنار کی، ایک دن لوہار کی۔

محمد صدیق، پربھنی

س ۔ انسان کو ایمان چھوڑنے پر کون مجبور کرتا ہے؟

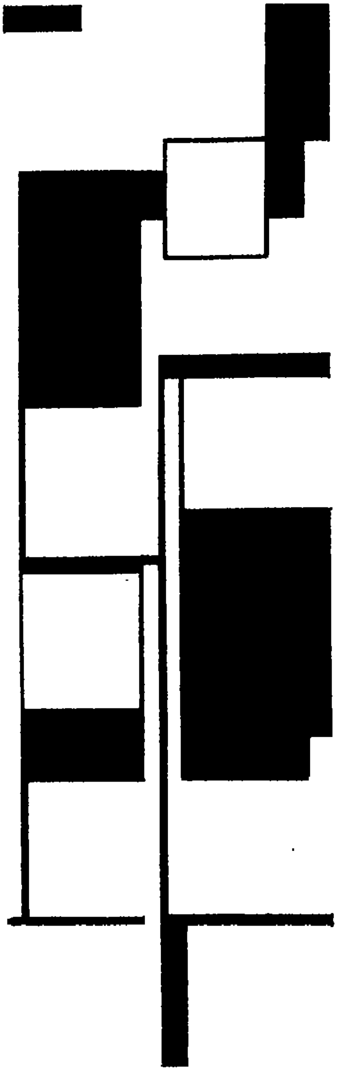
ج انسان ایمان چھوڑنے کا ذمہ دار خود ہے باہر کی ضرورتیں صرف بہانہ ہیں۔ اگر انسان کا یقین محکم ہو تو کوئی مجبوری اس کو ہلا نہیں سکتی۔

ایم قیصر امام، بھاگلپور

س ۔ انسان زندگی میں اصلی خوشی کب محسوس کرتا ہے؟

ج جب اسے یہ معلوم ہوجائے کہ اس کی ساری خواہشیں بے کار ہیں اور یہ کہ زندگی میں کوئی چیز اہمیت نہیں رکھتی۔

س ۔ عقلمند کے لئے اگر اشارہ کافی ہے تو



اس عنوان کے تحت دلچسپ معلوماتی اور ذہنی سوالات کے جواب دئے جاتے ہیں۔ ایک کاغذ یا پوسٹ کارڈ پر زیادہ سے زیادہ تین سوال لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کے لئے جگہ چھوڑیئے اور اپنا پورا نام پتہ لکھئے جس کاغذ یا کارڈ پر سوالات ہوں اس پر دفتر سے متعلق اور کوئی بات نہ لکھئے۔ اپنے سوالات اس پتہ پر بھیجئے: بزم بانو

ماہنامہ بانو، ۴ آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱

مدیرہ

بے وقوف کے لئے؟

ج دھمکی یا خوشامد۔

اسماء خاں، ملیح آباد، لکھنؤ

س۔ کسی سے بھلائی کرو پھر بھی برائی ملے تو کیا کرنا چاہیئے؟

ج برائی کا جواب برائی سے دینا عامیانہ بات ہے برائی کا جواب بھلائی سے دینا انسانیت کی معراج ہے۔ اس کے علاوہ بھلائی کرنے کے بعد اس کے بدلے کی خواہش کرنا بھلائی نہیں تجارت ہے۔

س۔ دو انسانوں کے بیچ میں برائی پڑ جائے تو کیا کریں؟

ج دو انسانوں کے دلوں کو جوڑنے کے لئے اگر جھوٹ کا سہارا بھی لیا جائے تو مضائقہ نہیں۔

نور جہاں بیگم نواب اصغر علی، دھنباد بازار

س۔ عورت اپنے شوہر سے کب ناخوش ہوتی ہے؟

ج جب وہ مستقل دیر سے گھر واپس آتا ہے

س عورت اپنے آپ کو کب خوش نصیب سمجھتی ہے؟

ج جب شوہر اسے پا کر اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھے۔

نشاط سیف معافی، نالندہ

س۔ چاند کے مونہہ پر سیاہ دھبے کیوں ہیں؟

ج تاکہ حسینوں کو اپنے چہرے کے عیب دیکھ کر صبر آ جائے۔

س۔ شاعر اور گویئے میں کیا فرق ہے؟

ج اگر شاعر کا کلام بے مغز ہو اور وہ ترنم کا سہارا لے تو اس میں اور گویئے میں کوئی فرق نہیں۔

صبیحہ ممتاز، وارث علی گنج، نوادہ

س۔ جو انسان انسان کے کام نہ آئے اسے کیا کہیں گے؟

ج اپنی کھال میں مست۔

س۔ عورت کا سب سے قیمتی زیور کیا ہے؟

ج نسوانیت۔ جس کی چمک کبھی ماند نہیں پڑتی۔ یہ زیور عورت کو قدرت نے عطا کیا ہے۔ باقی زیور مردوں کی دین ہیں جو عورت کو بے وقوف بنانے کے لئے گھڑے گئے ہیں۔

سید مقبول رحمانی، سکندر آباد

س۔ امیدوں کے چراغ کب بجھ جاتے ہیں؟

ج امیدوں کے چراغ کبھی نہیں بجھتے جب تک سانس تب تک آس۔

س۔ انسان ایک دوسرے سے حسد کیوں کرتا ہے؟

ج جب وہ خود میں دوسرے کے برابر ترقی کرنے کی اہلیت نہیں پاتا ہے۔

فردوس عرشی، کانپور

س۔ اگر انسان کافی جدوجہد کرتے پر بھی زندگی میں کامیاب نہ ہو تو کیا کرے؟

ج اسے لازم ہے کہ وہ بے صبری سے کام نہ لے خدا کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں

س۔ کامیابی حاصل کرنے کی ترکیب؟

ج یہ یقین کہ کامیابی ضرور حاصل ہوگی۔

س۔ دشمن اگر دوستی کا ہاتھ بڑھائے؟

ج فوراً ہاتھ تھام لیں۔

نعمت خواہکار، پرا سٹولہ، رانچی

س۔ عورت شعلہ ہے یا شبنم؟

ج نفرت ملے تو شعلہ محبت ملے تو شبنم۔

س۔ ضبط کی آخری منزل؟

ج دامن ضبط کا چھوٹ جانا۔ غبارے میں ایک حد تک ہوا بھری جا سکتی ہے۔ اس کے بعد وہ پھٹ جاتا ہے۔

سید مظفر عالم، دھرم پور، آسنسول

س۔ زر، زمین، زن تینوں جھگڑے کا باعث ہیں پھر بھی لوگ اس کے دیوانے کیوں ہیں؟

ج آج کل زر اور زمین ہی جھگڑے کا باعث ہیں۔ زن کے لئے لڑنا پرانے زمانے کے بہادروں کا شیوہ تھا افسوس کہ اب اس کا فیشن نہیں رہا۔

شبیر احمد گدی، چکردھرپور

س۔ ایک دیہاتی خوب صورت لڑکی حسین ہو کر بھی بد صورت لگتی ہے۔ مگر ایک شہری لڑکی حسین نہ ہو کر بھی بن سنور کر خوب صورت کیوں کہلاتی ہے؟

ج ان دونوں میں وہی فرق ہے جو تراشیدہ اور ناتراشیدہ ہیرے میں ہوتا ہے۔

شاہدہ عابدہ صابرہ خاتون، دھنباد

س۔ کوئی کسی کی مجبوریوں سے فائدہ کیوں اٹھانا چاہتا ہے؟

ج کوئی شخص دوسرے کی مجبوریوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا جب تک کہ دوسرا خود اسے اجازت نہ دے۔

س۔ عورت میں سب سے بڑی خصوصیت کیا ہے؟

ج اس کی چھٹی حس۔

اقبال شاطر، بھلائی نگر

س۔ کیسی لڑکیاں سسرال میں خوش رہتی ہیں؟

ج جو سسرال سے بہت زیادہ امیدیں وابستہ نہیں کرتیں۔

زینت خاتون، آسنسول

س۔ عورت کی سب سے بڑی خواہش کیا ہوتی ہے؟

ج ایک گھر جسے وہ اپنا کہہ سکے۔ ■■

دیس پردیس کی خبریں

وہ نو بچوں کی پیدائش سے ڈر گیا

بنگلہ دیش میں عبدالحکیم نام کے ایک کسان کے یہاں ۲۴ گھنٹوں میں نو بچے پیدا ہوئے۔ پہلے دو بچے تین گھنٹے کے وقفے سے پیدا ہوئے۔ بیس گھنٹوں کے بعد مزید بچے پیدا ہوئے۔ یہ بچے چند گھنٹے تک ہی زندہ رہ سکے۔ بنگلہ دیش میں فیملی پلاننگ کا پروگرام زور شور سے جاری ہے۔ عبدالحکیم کے کان میں بھی اس کی بھنک پڑ چکی تھی۔ وہ اتنے سارے بچوں کی پیدائش سے ڈر گیا۔ وہ سمجھا کہ اب اس پر حکومت کا عتاب نازل ہوگا۔ اُس نے بچوں کی پیدائش اور موت کو راز میں رکھا۔ رات کے سناٹے میں اُس نے اپنے بچوں کو قریب کے کھیت میں دفن کر دیا۔ کچھ دنوں بعد علاقے میں خبر پھیلی تو عبدالحکیم نے حکام کو بتایا کہ اُس نے حکومت کے ڈر سے اپنے بچوں کی پیدائش اور موت کا راز چھپائے رکھا تھا۔

منتر کا جاپ سادھو کی مصیبت بن گیا

بہار کے سابق وزیر اعلیٰ کارپوری ٹھاکر نے لوک سبھا کے ممبروں کو بتایا کہ ایک سادھو منتر پڑھنے کی وجہ سے گرفتار کر لیا گیا۔ یہ سادھو گنڈک ندی میں اشنان کرنے کے بعد "جے نارائن، جے نارائن" منتر کا ابھیاس کر رہا تھا۔ ایک سب انسپکٹر پولیس نے جب یہ منتر سُنے تو اُس نے سادھو کو جے پرکاش نارائن کا چیلا سمجھا۔ جے پرکاش اس وقت نظر بند تھے۔ سب انسپکٹر نے اس سادھو کو جے پرکاش نارائن کی حمایت میں نعرے لگانے کے جرم میں گرفتار کر لیا۔ اُسے میسا کے تحت بند کر دیا گیا۔

کٹے پھٹے ۱۰۰ روپے کے نوٹ کی قیمت ۳۰۰ روپے

گوا کی راجدھانی پاناجی میں ایک یورپین ہپی کے پاس ۱۰۰ روپے کا ایک کٹا پھٹا نوٹ تھا۔ بازار میں کوئی دکان دار اس نوٹ کو لینے کو تیار نہ تھا۔ یہ ہپی کئی بینکوں میں گیا، مگر کسی بھی بینک نے یہ نوٹ نہیں بدلا۔ جب یہ ہپی آخری بینک میں پہنچا تو بینک کے خزانچی کے انکار پر اُسے اتنا غصہ آیا کہ اُس نے کاؤنٹر پر بڑے زور سے مُکا مارا۔ کاؤنٹر کانچ کا تھا۔ اس کے کئی ٹکڑے ہو گئے۔ بینک منیجر نے پولیس کو طلب کر لیا۔ ہپی نے کاؤنٹر کے نقصان کا تاوان ادا کرنا منظور کر لیا۔ ۳۰۰ روپے دے کر وہ گرفتار ہونے سے بچ گیا۔

چُغلی کی وجہ سے جان گئی

بھیم جی اپنی بیوی سُنیتا کے ساتھ ممبئی کی ایک 'چال' میں رہتا تھا۔ سُنیتا کی عمر ۲۰ سال تھی۔ یہ نیا شادی شدہ جوڑا بظاہر خوش و خرم تھا لیکن سنیتا کے لئے خراب و خستہ حال ہو گیا تھا۔ اس کا پڑوسی بابو اس کے خاوند سے سنیتا کی چُغلی کھاتا۔ وہ اُسے بار بار یقین دلاتا کہ سُنیتا کا چال چلن خراب ہے۔ وہ اُسے اس کی بیوی کے متعلق من گھڑت کہانیاں سُناتا۔ وہ اکثر سنیتا پر آوازے کستا۔ سنیتا نے بہت دن صبر کیا۔ آخر ایک دن اُس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اور اُس نے بابو کے سینے میں چاقو گھونپ دیا۔ بابو زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا۔

سانپ کے کاٹے سے دو ہلاک، ایک کو عُمر قید

مہاراشٹر کے ضلع سانگلی میں سانپ نے ایک شخص کو کاٹ کھایا۔ یہ واقعہ گزشتہ سال ہوا تھا۔ اُس شخص کا بھائی فوراً اُسے مندر میں لے گیا۔ مندر میں سانپ کے کاٹے کا علاج جھاڑ پھونک سے کیا جاتا ہے۔ علاج کے لئے منتر پڑھے جا رہے تھے کہ پاروبائی مندر میں داخل ہوئی۔ پاروبائی ایک ۴۶ سالہ بڑھیا تھی۔ وہ مندر میں دیوتا کے درشن کرنے آئی تھی۔ وہ کچھ دیر ان منتروں کو بھی سُنتی رہی، جو سانپ کے زہر کو بے اثر کرنے کے لئے پڑھے جا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ گھر واپس چلی گئی۔ اُدھر منتروں کا پڑھنا بے سُود ثابت ہوا اور مریض چل بسا۔ کسی نے مریض کے بھائی رنگا کے دل میں یہ بات بٹھا دی کہ اس کے بھائی کی موت پاروبائی کی وجہ سے ہوئی ہے۔ کیوں کہ عورت کی موجودگی سے منتر بے اثر ہو گئے تھے۔ رنگا کو بھائی کے مرنے کا بہت صدمہ ہوا۔ اُسے اس بات کا یقین ہو گیا کہ پاروبائی ہی اس کے بھائی کی ہلاکت کی ذمہ دار ہے۔ وہ غصے سے دیوانہ ہو گیا۔ اس نے موقع پا کر پاروبائی کا سر تلوار سے جُدا کر دیا۔ رنگا پر قتل کا مقدمہ چلا۔ اس مقدمہ کا فیصلہ حال میں ہوا ہے۔ ۴۵ سالہ رنگا کو سانگلی سیشن کورٹ سے عمر قید کی سزا ہوئی ہے۔

ایک نام کے دو انسانوں نے مشکل میں ڈال دیا

گزشتہ دسمبر کو ایک شام کو ایک پارسی عورت بمبئی کے انڈیا گیٹ کے پاس چہل قدمی کر رہی تھی۔ یکایک اُسے اپنے بچپن کی ایک سہیلی نظر آئی۔ دونوں گلے ملیں۔ بہت دیر تک دونوں بچپن کی باتیں دہراتی رہیں۔

باتوں کا موضوع رفتہ رفتہ ماضی سے حال میں بدل گیا اور وہ اپنے موجودہ زمانے کی باتیں کرنے لگیں۔ باتوں باتوں میں ایک سہیلی نے زور سے کہا: "میں اس اندرا سے پریشان ہوگئی ہوں۔ اُس نے ہمارا ناک میں دم کر دیا ہے۔ کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ ..... وہ اتنا ہی کہنے پائی تھی کہ اُس کے پاس کھڑا ہوا ایک آدمی اس کی طرف بڑھا اور بولا "بائی، آپ حراست میں ہیں" اُس نے ایک جیپ کو اشارہ کیا۔ جیپ ان کے قریب آکر رُکی۔ وہ عورت میسا کے تحت گرفتار کر لی گئی۔ کئی روز کی دوڑ دھوپ کے بعد اس کو رہا کرا لیا گیا۔ اس عورت نے بتایا کہ اندرا اس کے بچوں کی آیا ہے۔ وہ اس آیا کو بُرا بھلا کہہ رہی تھی، اس وقت کی وزیرِ اعظم کو نہیں۔

ہیرے کا مالک نہیں ملتا

آندھرا پردیش کے اننت پور ضلع میں ایک قیمتی ہیرا ضلع کے خزانہ میں رکھا ہے۔ اس ہیرے کا وزن ۴۸ قیراط ہے اور اس کی قیمت کا اندازہ دو لاکھ روپیہ ہے۔ یہ ہیرا ۴ سال پہلے ایک گاؤں میں ملا تھا۔ پولیس نے اس ہیرے کے مالک کی بہت تلاش کی، لیکن اُسے کامیابی نہیں ہوئی۔

قیدی نے رِہا ہونے سے انکار کر دیا

حیدر آباد سینٹرل جیل میں ایک قیدی نے رہا ہونے سے انکار کر دیا، یہ قیدی ایک بھینسا ہے۔ اس بھینسے نے اپنے مالک کو سینگوں سے مار مار کر ہلاک کر دیا تھا اور اس کو قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ جج نے اقدامِ قتل کے جرم میں اُسے پانچ سال قید کی سزا دی تھی۔ بھینسے نے اپنی سزا کی مدت پوری کر لی۔ لیکن وہ جیل کے ماحول سے اتنا مانوس ہو گیا کہ اس نے جیل سے رہا ہونے سے انکار کر دیا۔ ناچار جیل کے کارکنوں نے اس کو جیل ہی میں کام پر لگا لیا۔

جونک مزے سے خون چوستی رہی

ضلع کورگ کے صدر مقام مرکرا میں ایک شخص کے حلق میں جونک نے اپنا گھر بنا لیا۔ وہ آٹھ روز تک اس کا خون چوستی رہی۔ جب یہ شخص حلق کی تکلیف کی وجہ سے اسپتال میں داخل ہوا تو ڈاکٹروں نے اس جونک کو دریافت کیا۔ اور اس بن بلائے مہمان سے چھٹکارا دلایا۔

کوڑا کرکٹ جمع کرنے والوں پر چُننے والوں کا احسان

بمبئی میں ہر روز ½ ۲ ہزار ٹن اچھا کوڑا جمع ہو جاتا ہے۔ یہ مقدار نیویارک کے کوڑے کے انباروں کا دسواں حصہ ہے۔ کوڑا اچھا اور بُرا دونوں قسم کا ہوتا ہے۔ اچھا کوڑا وہ ہوتا ہے جس میں پلاسٹک کا سامان، بوتلیں، کاغذ اور سوئیاں موجود نہ ہوں۔ کوڑا کرکٹ چُننے والے بچے یہ چیزیں کوڑے میں سے نکال لیتے ہیں۔ اس طرح فضا خراب کوڑے کے اثر سے زہر آلود نہیں ہوتی۔ اس طریقے یہ لوگ بالواسطہ طور پر شہر کی خدمت کرتے

قسم نبھانے کے لئے اُنگلی کاٹ لی

آندھرا پردیش کے ایک نوجوان طالب علم نے اپنے دوستوں کی موجودگی میں قسم کھائی کہ اگر کانگریس مرکز میں وزارت بنانے میں ناکام رہی تو وہ اپنی اُنگلی کاٹ دے گا۔ جب کانگریس الیکشن میں ہار گئی تو اس کے دوستوں نے اُسے تنگ کرنا شروع کیا۔ وہ اس کا مذاق اُڑاتے اس کی قسم یاد دلاتے۔ آخر تنگ آکر اُس نے اُنگلی کاٹ دی۔

چوری کرنے کیلئے مردانہ لباس پہننا

ضلع نیلور کی ایک عورت چوری کے ارادے سے ایک انگریزی دوا فروش کے گھر میں داخل ہوئی۔ اس عورت نے مردانہ لباس پہن رکھا تھا۔ گھر میں اس وقت ایک ۴۸ سالہ بڑھیا موجود تھی جو دوا فروش کی ماں تھی۔ چور نے اس عورت کے ہاتھوں سے زبردستی چوڑیاں اُتار لیں۔ ان سونے کی چوڑیوں کا وزن ۹ تولے تھا۔ بڑھیا نے مزاحمت کی تو چور نے اس کو پیٹنا شروع کر دیا اور چوڑیاں لے کر فرار ہو گئی۔

چور سپاہی کا کھیل

کٹک میں دو سپاہیوں کو فریب دہی کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ان سپاہیوں نے تنخواہ تقسیم ہونے کے بعد ایک سپاہی کی غیر حاضری کا فائدہ اٹھایا تھا اور اس کی تنخواہ ہتھیا لی تھی۔

خشک اور روغنی جلد کے لئے کچھ آزمودہ نسخے



تہناز حسین
۹۲-۸۸ گریٹر کیلاش، نئی دہلی۔ فون: ۶۱۱۶۴۴



پچھلے شماروں میں ہم نے میک اپ کے بارے میں بہت سی باتیں لکھی تھیں۔ اس بار ہم آپ کو جلد کی حفاظت اور چمک دمک کے لئے کچھ نسخے بتائیں گے۔ ان نسخوں کو عمل میں لانے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ آپ کی جلد کس قسم کی ہے

جلد تین قسم کی ہوتی ہے: خشک، روغنی اور نارمل۔

خشک جلد کی پہچان یہ ہے کہ یہ بہت شگفتہ ہوتی ہے، اس پر ہمیشہ نکھار رہتا ہے۔ کیل، مہاسے وغیرہ اس جلد پر نہیں نکلتے۔ سردیوں میں خشک ہوا چلتی ہے تو یہ جلد اکثر پھٹ جاتی ہے۔ جوانی میں اس جلد پر ہمیشہ تازگی رہتی ہے، لوگ اس کی شادابی پر رشک کرتے ہیں، لیکن یہ بہار چند روزہ ہوتی ہے۔ یہ بہت جلد اپنی تازگی کھو دیتی ہے اور اس پر بڑھاپے کے آثار سب سے پہلے آتے ہیں۔ جھریاں اور لکیریں سب سے پہلے ایسی ہی جلد پر نمایاں ہوتی ہیں، اس لئے اگر آپ کی جلد خشک ہے تو آپ کو چاہئے کہ جلد کی حفاظت جوانی سے ہی شروع کر دیں۔ پرہیز علاج سے بہتر ہوتا ہے۔ اگر آپ جلد کو برابر نمی پہنچاتی رہیں گی تو بڑھاپے میں اس کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہیں گی۔ اگر آپ جلد کی بہار سے ہمیشہ مطمئن رہیں گی تو آپ کو بعد میں پچھتانا پڑے گا۔ اس وقت علاج اور توجہ سے چنداں فائدہ نہ ہوگا۔ ہم پچھلے شماروں میں بتا چکے ہیں کہ ایسی جلد کو تر و تازہ رکھنے کے لئے موائسچرائزر کا باقاعدہ استعمال کرنا ضروری ہے موائسچرائزر کے باقاعدہ استعمال سے جلد کے نیچے مسامات میں نمی برقرار رہتی ہے اور جلد مرجھانے نہیں پاتی۔ اس کے علاوہ خشک جلد کو ملائم اور چکنا رکھنے کے لئے ہم کچھ اور نسخے بھی بتائیں گے۔

روغنی جلد کی پہچان آسان ہے۔ چہرے کو صابن سے دھو کر دس منٹ کے بعد ... اور سفید کاغذ یا سفید کپڑے کو پیشانی پر رگڑیں۔ روغنی جلد ہونے کی صورت میں یہ کپڑا یا کاغذ میلا ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ جلد روغنی ہونے کی صورت میں آپ یہ بھی مشاہدہ کریں گی کہ صابن سے منہ دھونے کے پندرہ منٹ بعد ہی آپ کا چہرہ دوبارہ چکنا معلوم ہونے لگتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر انگلیوں کو چہرے پر رگڑیں تو وہ بھی چکنی معلوم ہوتی ہیں کیل اور مہاسے روغنی جلد پر کثرت سے نکلتے ہیں۔ لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ایسی جلد بہت عرصے میں مرجھاتی ہے اور اس پر بڑھاپا بھی دیر میں آتا ہے۔

نارمل جلد وہ ہے جس میں یہ دونوں خوبیاں موجود ہوں، یعنی وہ نہ زیادہ چکنی ہو گی اور نہ زیادہ خشک۔

ذیل میں ہم کچھ نسخے پیش کرتے ہیں، آپ کی جلد جس قسم کی ہو، اسی قسم کا نسخہ استعمال کریں۔

اگر آپ کی جلد خشک اور کھردری ہے تو آپ کے لئے یہ لیپ مفید ہے۔ ایک انڈے کی زردی الگ کر لیں۔ اس زردی کو توڑ کر اس کا نصف حصہ ایک پیالی میں نکال لیں۔ آدھا چائے کا چمچہ روغنِ بادام اس میں بوند بوند کر کے ملائیں۔ زردی کو چمچے سے ملاتی جائیں، تاکہ روغن بادام انڈے کی زردی میں پوری طرح حل ہو جائے۔ دو انگلیوں کی مدد سے چہرے پر لیپ کریں۔ بیس منٹ انتظار کریں۔ پھر گرم پانی سے دھو ڈالیں، چہرے کی خشکی دور ہو جائے گی۔

چہرے کی تازگی کے لئے ایک اور لیپ حسب ذیل ہے:

دو بڑے چمچے باریک پسا ہوا میدہ لیں اس میں زیتون کا تیل ملائیں۔ زیتون کا تیل اتنا ملائیں کہ میدہ لئی کی طرح بن جائے۔ اس لئی کو

چہرے پر لگائیں۔ خشک ہو جانے پر عرق گلاب سے دھو ڈالیں۔ آج کل بارش کا موسم ہے، ایک برتن میں بارش کا پانی اکٹھا کر لیں اور اسے شیشی یا جار میں محفوظ کر لیں۔ عرق گلاب موجود نہ ہو تو بارش کے پانی سے چہرے کو دھوئیں۔ بارش کا پانی نل کے پانی سے ہلکا ہوتا ہے۔

عرقِ گلاب ذرا مہنگا ہے۔ اصلی عرقِ گلاب کا ملنا بھی مشکل ہے۔ اس کے علاوہ زیتون کا تیل بھی بہت گراں ہے۔ ہم آپ کے لئے ایک سستا نسخہ پیش کرتے ہیں، جس میں عرق گلاب بہت کم مقدار میں استعمال ہوتا ہے۔ دو بڑے چمچے میدہ کو دودھ میں اُبال لیں جب ٹوتھ پیسٹ کی طرح گاڑھا ہو جائے تو اس میں چند بوندیں عرق گلاب ملائیں۔ یہ لیپ نیم گرم ہی چہرے پر لگائیں۔ پندرہ منٹ کے بعد گرم پانی سے دھو ڈالیں۔

خشک جلد کے لئے اس لیپ کو آزمائیں:

چند بوندیں روغن بادام کی لیں، اس میں ایک چائے کا چمچہ بھر شہد ملائیں، اس محلول کو چہرے اور گردن پر لگائیں۔ پندرہ منٹ کے بعد بارش کے پانی سے دھو ڈالیں۔

روغنی جلد کے لئے یہ لیپ مفید ہے۔

تھوڑا سا کورن فلاور اور ٹیلکم پاؤڈر ملائیں (ٹیلکم پاؤڈر چہرے پر لگانے کے عام پاؤڈر کو کہتے ہیں) اس میں ٹھنڈا پانی ملائیں۔ جب ٹوتھ پیسٹ کی طرح گاڑھا بن جائے تو چہرے پر لگائیں۔ بیس منٹ کے بعد روئی کو یوڈی کلون یا آفٹر شیو لوشن میں بھگو کر چہرے کو صاف کریں۔

چہرے کی جلد کو سکیڑنے کے لئے یہ نسخہ آزمائیں: ایک انڈے کی سفیدی پھینٹ لیں۔ اور اسے چہرے پر پھیلائیں۔ خشک ہو جانے پر یوڈی کلون کی مدد سے صاف کریں۔

چہرے پر ہلکی جھریاں یا لکیریں نمایاں ہونے لگیں تو ان کے لئے یہ نسخہ آزمائیں: لیموں کے عرق کی چند بوندوں میں ایک چائے کا چمچہ بھر شہد ملا لیں اور چہرے پر لگائیں۔ کچھ دیر کے بعد نیم گرم پانی سے دھو ڈالیں۔

اگر جھریاں زیادہ نمایاں ہوں تو اس کے لئے یہ لیپ آزمائیں: ایک انڈے کی سفیدی ایک چھوٹا چمچہ کھیرے کا عرق، ایک بڑا چمچہ تازہ اور گاڑھا دودھ، ۲۰ بوندیں ٹنکچر بنزائن، عرقِ گلاب کی چند بوندیں —— ان تمام چیزوں کو یک جان کر لیں اور ایک ململ کے ٹکڑے پر پھیلا لیں۔ اس پر ایک ململ کا ٹکڑا رکھ لیں۔ اس طرح یہ لیپ ململ کی دو تہوں کے درمیان موجود رہے گا ان ٹکڑوں کو چہرے پر رکھ لیں۔ آدھے گھنٹے انتظار کرنے کے بعد ٹھنڈے پانی سے دھو ڈالیں۔

روغنی جلد کے لئے ایک اور نسخہ یہ ہے

ایک کھیرے کو کس لیں، اس میں چند بوندیں عرقِ گلاب ملائیں۔ اس کے بعد تھوڑا سا لیموں کا عرق بھی ملا لیں، اس کو ململ کی دو تہوں کے درمیان رکھ لیں۔ بیس منٹ تک چہرے پر لگا رہنے دیں پھر گرم پانی سے دھو ڈالیں۔

اس کے علاوہ سنگترے کے عرق سے بھی ایک لیپ تیار کیا جا سکتا ہے۔ انڈے کی زردی میں چند بوندیں سنگترے کے عرق کی ملا کر خوب پھینٹ لیں۔ پھر اس لیپ کو چہرے پر لگائیں۔ دس، پندرہ منٹ تک انتظار کریں، اس کے بعد ٹھنڈے پانی سے دھو ڈالیں۔

یوگا ورزشیں

ورزش نمبر ۱۔ یہ ورزش بازوؤں کو سڈول بناتی ہے اور فاضل گوشت ختم کرتی ہے۔

سیدھی کھڑی ہو جائیں ٹانگیں ملائے رکھیں۔ کمر سیدھی رکھیں۔ اگر ممکن ہو ہاتھوں کی مٹھیوں میں دودھ کی خالی بوتل پیپر ویٹ بھینچ لیں۔ اب دونوں ہاتھوں کو لیں اور مٹھیوں کو بڑے بڑے دائرے بناتے ہوئے گھمائیں ایک منٹ تک گھماتی رہیں۔ کے بعد مخالف سمت میں ایک منٹ تک اس دوران میں بازو سیدھے رہنے چاہئیں۔

ورزش نمبر ۲۔ یہ ورزش بھی بازوؤں کو سڈول بناتی ہے۔ اس ورزش میں ورزش نمبر ۱ سے زیادہ محنت درکار ہے۔

سیدھی کھڑی ہو جائیں۔ ٹانگوں کے درمیان تین انچ کا فاصلہ رکھیں۔ اب دونوں ہاتھوں کو کندھے تک اٹھائیں اور کہنیوں کو خم دے کر دونوں ہاتھوں کو سینے تک لے آئیں انگلیوں کو آپس میں ملا لیں۔ اب دونوں ہاتھوں کو اوپر سے گھما کر پیچھے کی طرف لے جائیں انگلیوں کو آپس میں ملا لیں بازو سیدھے رہنے چاہئیں۔ اب کمر کو پیچھے کی طرف جھکائیں — آہستہ آہستہ اور جتنا جھکا سکتے ہیں جھکائیں اب ۵ سیکنڈ انتظار کریں۔ اس کے بعد بدن کو آگے کی طرف جھکائیں۔ اور ساتھ ساتھ پیچھے کی طرف سے ہاتھوں کو ذرا اوپر اٹھائیں۔ ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں ملی رہیں۔ اب ۵ سیکنڈ انتظار کریں۔ یہ عمل دوبارہ دہرائیں۔

ورزش نمبر ۳ اس ورزش سے پیٹ کم ہو جاتا ہے اور فاضل چربی ختم ہو جاتی ہے۔

فرش پر بیٹھ جائیں۔ کمر سیدھی رکھیں اور

دونوں ٹانگوں کو آپس میں ملا لیں۔ دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھیں۔ اب بہت آہستہ پیچھے کی طرف جھکنا شروع کریں۔ یہاں تک کہ آپ فرش پر چت لیٹ جائیں۔ اس ورزش میں یہ بہت ضروری ہے کہ بہت آہستہ آہستہ پیچھے کی طرف جھکیں۔ جھکنے میں ہاتھوں کی مدد نہ لیں۔ اور ہاتھوں کا دباؤ گھٹنوں پر نہ ڈالیں۔ چت لیٹنے کے بعد گھٹنوں کے خم دے کر پیٹ کی طرف لائیں اور ٹانگوں کو اوپر کی طرف لے جائیں۔ اب بہت آہستہ آہستہ ٹانگوں کو نیچے کی طرف لائیں اور ساتھ ساتھ کمر کا اوپری حصہ بھی اٹھائیں کمر کا نچلا حصہ فرش پر ہی رہے۔ یہ ورزش خاصی محنت طلب ہے۔ مگر اس سے پیٹ گھٹتا ہے چار بار یہ عمل دہرائیں۔

ورزش نمبر ۴۔ یہ ورزش پیٹ گھٹاتی ہے۔ اس کے علاوہ کمر کی تکلیف بھی رفع کرتی ہے۔

ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل پر جھک جائیں۔ ہتھیلیوں کو پھیلا کر فرش پر رکھیں۔ بازو سیدھے رکھیں۔ اب سانس باہر نکالیں اور چند سیکنڈ کے لئے سانس اندر نہ لیں۔ اس دوران میں پیٹ کو اندر کی طرف کھینچیں اور کمر کو ذرا اوپر اٹھائیں تاکہ کمر میں کمان جیسا خم پیدا ہو جائے دو سیکنڈ انتظار کریں اور پھر پیٹ کو ڈھیلا چھوڑ دیں یہ عمل دس بار دہرائیں۔

ورزش نمبر ۵۔ یہ ورزش کولہوں کے لئے ہے۔ اس ورزش سے کولہوں میں گولائی پیدا ہوتی ہے اور فاضل چربی کم ہو جاتی ہے۔

فرش پر اوندھے مونہہ لیٹ جائیں۔ چہرے کو اس طرح اوپر اٹھائیں کہ تھوڑی فرش پر ٹک جائے۔ بازو سیدھے رکھیں اور بدن کے ساتھ لگائے رکھیں۔ ہتھیلیاں اوپر کی طرف رہیں۔ اب مٹھیاں بھینچ لیں اور ہاتھوں کے پچھلے حصے کو فرش پر زور سے دبائیں اور ساتھ ساتھ دائیں ٹانگ اوپر کی طرف لے جائیں۔ جتنا اوپر لے جا سکتی ہیں لے جائیں۔ ٹانگیں سیدھی رہنی چاہئیں۔ پانچ سیکنڈ انتظار کریں۔ اب آہستہ آہستہ ٹانگ کو فرش پر واپس لے آئیں۔ اب یہی عمل دوسری ٹانگ کے ساتھ دہرائیں۔ یہ عمل پہلے دائیں ٹانگ کے ساتھ پانچ بار اور پھر بائیں ٹانگ کے ساتھ پانچ بار دہرائیں۔

ورزش نمبر ۶۔ یہ ورزش کولہوں کے لئے ہے اور ذرا محنت طلب ہے۔ اس ورزش سے کولھے سڈول ہو جاتے ہیں۔ فرش پر چت لیٹ جائیں۔ اب دائیں ٹانگ اوپر اٹھائیں۔ گھٹنوں میں خم نہ پیدا ہو۔ اب اس ٹانگ کو آہستہ آہستہ بائیں ٹانگ کے اوپر سے اس طرح لے جائیں کہ ایک زاویہ قائمہ بن جائے۔ پانچ سیکنڈ انتظار کریں اور دائیں ٹانگ کو آہستہ آہستہ فرش پر واپس لے جائیں۔ اب یہی عمل بائیں ٹانگ کے ساتھ دہرائیں۔ یہ عمل ۴ بار پہلے دائیں اور پھر بائیں ٹانگ کے ساتھ دہرائیں۔

ورزش نمبر ۷۔ یہ ورزش پیٹ اور سینے کے درمیانی حصے کے لئے ہے۔ اس ورزش سے معدہ اور سانس کی جھلی کی خرابیاں دور ہوتی ہے۔ کولھے اور سینے کے درمیانی حصے سے چربی کم ہو جاتی ہے۔ اور ایک خوب صورت خم پیدا ہوتا ہے۔ یہ ورزش بہت آسان ہے۔ اور کسی جگہ اور کسی وقت بھی کی جا سکتی ہے۔ کرسی پر بیٹھ جائیں۔ اگر کرسی نہ ہو تو اسٹول چوکی یا پلنگ پر بھی بیٹھ سکتی ہیں۔ کمر سیدھی رکھیں۔ اور ہاتھوں سے کرسی کے کنارے پکڑ لیں۔ کناروں کو خوب مضبوطی سے پکڑیں اور ہاتھ سے نیچے کی طرف دبائیں۔ ہاتھوں کے دباؤ سے ایسا معلوم ہو کہ کرسی فرش میں دھنس جائے گی۔ پانچ سیکنڈ انتظار کریں یہ عمل پانچ بار دہرائیں۔

ورزش نمبر ۸۔ اس ورزش سے کولھے اور سینے کے درمیانی حصے کی چربی کم ہو جاتی ہے۔ ناف کے اوپری حصے کا گوشت بھی کم ہو جاتا ہے سیدھی کھڑی ہو جائیں۔ ٹانگوں کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ رکھیں۔ اب ہاتھوں کو سامنے کی طرف لا کر انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا لیں۔ بدن کو آگے کی طرف جھکاتی ہوئی۔ بازوؤں کو تیزی سے دائیں طرف لے جائیں۔ اور دائیں کندھے سے اوپر لے جائیں۔ پھر بازوؤں کو نیچے کی طرف لائیں اور گھٹنوں کے سامنے لے جا کر بائیں، کندھے کے اوپر لے جائیں۔ جب بازوؤں کو بائیں کندھے کی طرف لے جانے کے لئے گھٹنوں کے سامنے لائیں تو بدن آگے کی طرف جھکا لیں۔ جب بازوؤں کو اوپر کی طرف لے جائیں تو سانس اندر کی طرف لیں اور جب نیچے لائیں تو سانس باہر نکالیں۔ بازو کی گردش نصف دائرے میں رہنی چاہئے یہ عمل چار بار دہرائیں۔

ورزش نمبر ۹۔ یہ ورزش رانوں کے لئے ہے۔ اس ورزش سے رانوں میں گولائی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور فاضل گوشت کم ہو جاتا ہے۔ ایک الماری یا میز کے پاس کھڑی ہو جائیں اب ایک ہاتھ سے الماری کے اوپر کے حصے کو پکڑ لیں۔ دونوں ٹانگوں کے درمیان تھوڑا فاصلہ رکھیں۔ الماری کے پاس والی ٹانگ

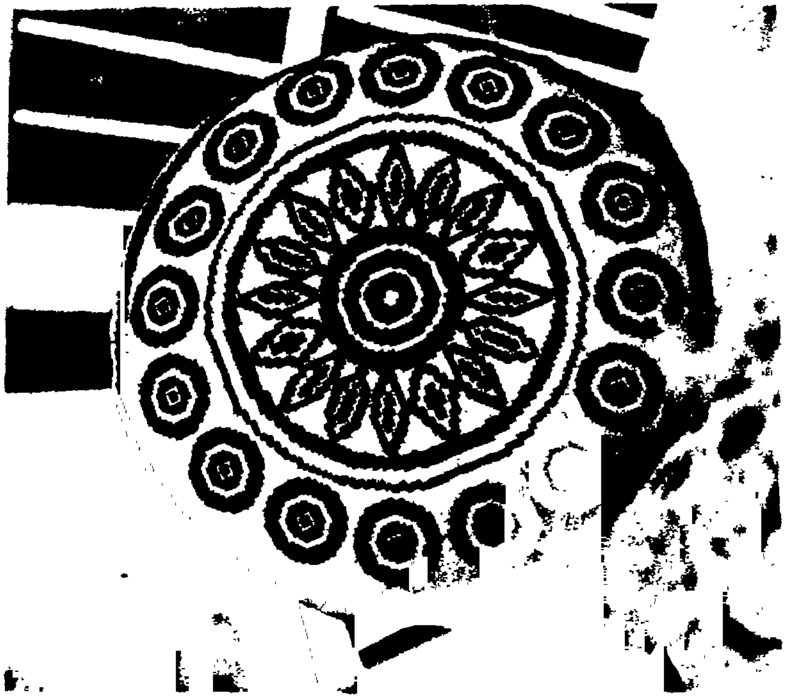
زور نہ ڈالیں۔ بلکہ دوسری ٹانگ پر زور ڈالیں۔ اب جس ہاتھ سے الماری کو پکڑا ہے۔ اس کی کہنی کو جھکائیں سر کو الماری کی طرف تھوڑا سا خم کریں۔ پیروں پر زور ڈال کر الماری سے دُور ہونے کی کوشش کریں۔ بغیر پاؤں ہلائے رانوں کے اندرونی حصے پر دباؤ ڈالیں پانچ سکنڈ انتظار کریں۔ اب مخالف سمت میں کھڑی ہو جائیں۔ اور یہی عمل دوسری ٹانگ کے ساتھ دہرائیں یہ عمل تین بار دائیں ٹانگ کے ساتھ اور تین بار بائیں ٹانگ کے ساتھ دہرائیں۔

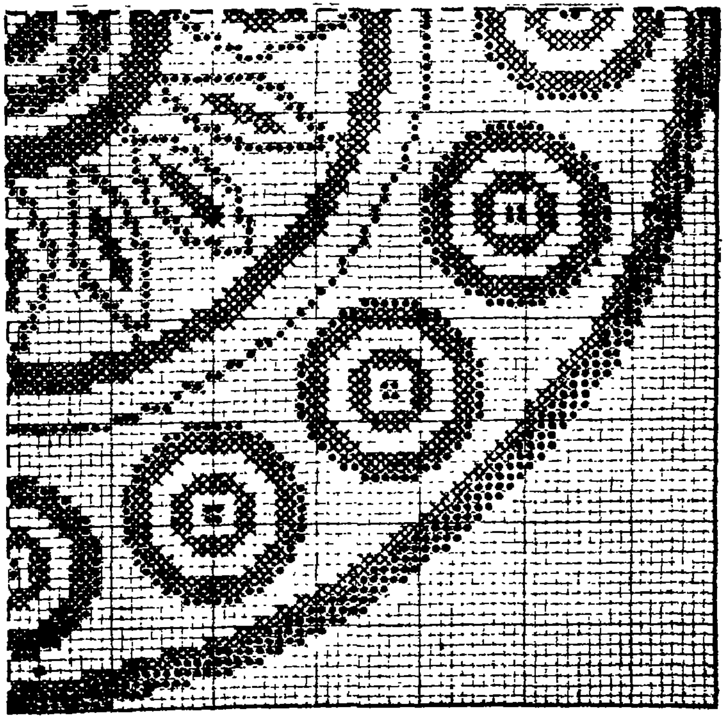
ورزش نمبر ۱۰۔ یہ ورزش رانوں کے لئے مفید ہے۔ رانیں سڈول ہو جاتی ہیں اور کولہوں کا گوشت بھی کم ہو جاتا ہے۔ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو جائیں۔ پیروں کو ملائے رکھیں۔ بازوؤں کو بدن سے چپکا لیں۔ پھر آہستہ آہستہ نیچے کی طرف دیوار کے سہارے کھسکنا شروع کریں۔ یہاں تک کہ آپ کا بدن اس حالت میں آ جائے جیسے کہ آپ کرسی پر بیٹھی ہوں۔ کمر کو سیدھا رکھیں۔ دس سیکنڈ انتظار کریں۔ یہ ورزش ذرا محنت طلب ہے۔ آہستہ آہستہ مشق کریں۔ اور مشق ہونے کے بعد ۵ بار دہرائیں۔

ورزش نمبر ۱۱۔ یہ ورزش سینے کے لئے مفید ہے۔ سینے میں سختی اور گولائی پیدا کرتی ہے اس ورزش کے لئے آپ کو ربڑ کی ایک سخت گیند کی ضرورت ہوگی۔ گیند ذرا بڑی ہو۔ اور بڑے سنگترے کے برابر ہو۔ گیند کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیں۔ گیند کے اوپر کے حصے پر ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسا لیں۔ گیند کو مضبوطی سے ہتھیلیوں سے دبائیں۔ اب کہنیوں کو موڑ کر ہاتھوں کو سینے تک لائیں۔ گیند سینے سے ۸ انچ دور رہنی چاہئے۔ اب گہرا سانس لیں۔ اور ہتھیلیوں کے نچلے حصے پر زور ڈال کر گیند کو دبائیں۔ پانچ سکنڈ انتظار کریں۔ چار بار یہ عمل دہرائیں۔

ورزش نمبر ۱۲ یہ ورزش سینے کے ڈھیلے پن کو دُور کرتی ہے۔ اس کے علاوہ کمر کے لئے بھی مفید ہے۔ فرش پر اوندھے مونہہ لیٹ جائیں۔ کہنیوں کو خم دے کر ہاتھوں کو چہرے کی طرف موڑ لیں۔ انگلیاں کندھے کے نیچے دبا لیں۔ انگلیوں کا رُخ چہرے کی طرف ہونا چاہئے۔ پیشانی فرش پر ٹکا لیں۔ اب آہستہ آہستہ ہاتھوں پر زور ڈال کر سر کو اوپر اٹھائیں۔ حتیٰ کہ کمر میں کمان جیسا خم پیدا ہو جائے۔ گردن کو پیچھے کی طرف جھکا لیں —— یہ عمل تین بار دہرائیں۔ ●●

کراس اسٹچ کا خوب صورت کُشن





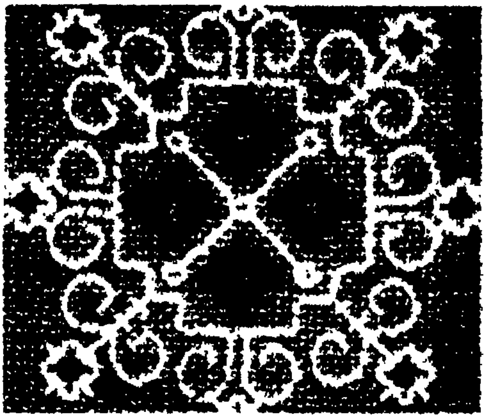
گرمیوں کے لئے
بچّوں کے لباس



کرُتے پر بنی ہوئی بیل لگائیے ــــ لباس



ٹرے کور





کہی اَن کہی

... صاحبہ :

بانو کی انفرادیت اور اعلیٰ معیار کی برقراری کے لئے آپ کی کاوشیں قابلِ تعریف ہیں۔ ہر صفحہ، ہر کالم انفرادیت و جدت کا حامل ہے۔ "آپ کی اُلجھنیں" میں جوابات اگر مختصر اور جامع طور پر ہوں تو مزید اُلجھنوں کے لئے گنجائش نکل سکتی ہے۔ "اِن سے ملئے" میں دہلی کے علاوہ دیگر شہروں کی مسلم خواتین کو بھی روشناس کرایا جائے۔ بہنوں کے لئے ملازمتوں کے سلسلے میں بھی رہبری کی جائے اور مختلف کیریر کے بارے میں بتایا جائے۔

ہارون رشید انصاری، بمبئی

محترمہ بھابی صاحبہ :

بانو کا تازہ شمارہ مئی : ۱۹۷۷ نظر نواز ہوا۔ 'بانو' ایک عرصے سے میرے مطالعے میں ہے۔ مضامین، افسانے اور نظمیں اعلیٰ، عمدہ، پرکشش اور معیاری ہوتے ہیں۔ 'افتتاحیہ' بانو کی جان ہوتا ہے۔ یوں تو 'بانو' میں شامل ہر کالم اپنی جگہ خوب صورت اور دل کش ہوتا ہے، لیکن 'اِن سے ملئے' والا کالم مجھے ان سب میں زیادہ پسند ہے۔ اسے جاری رکھئے ـــــ 'بانو' کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ صرف عورتوں کا رسالہ ہے، مناسب نہیں ـــــ اس سے ہم مرد بھی اُتنے ہی فیض یاب ہو سکتے ہیں جتنی کہ عورتیں ـــــ

میری خواہش ہے کہ "پسندیدہ اشعار" کا کالم 'بانو' میں پھر سے شروع کر دیا جائے۔ اُمید ہے آپ اس سلسلے میں غور فرمائیں گی۔

محسن باعش حسرت، کلکتہ

عزیزی بہن صاحبہ :

بانو مارچ ۱۹۷۷ موصول ہوا۔ محبت نوازی کا شکریہ۔ لیکن اپریل اور مئی ۱۹۷۷ کا شمارہ ابھی تک نہیں مل سکا۔ آخر کیا لکھوں۔ آپ کی بدعنوانیاں یا پوسٹ آفس کی ـــــ فیصلہ آپ پر۔ یہ مارچ ۱۹۷۷ کا شمارہ وی پی کے ذریعے وصول ہوا تھا۔

برابر ڈاک کا انتظار کرتے کرتے تھک چکی ہوں۔ آپ برائے مہربانی اپنے یہاں کے OFFICE WORKERS کو دیکھیں کہ آخر وہ کیا لاپرواہیاں کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے بھی دو کارڈ ارسالِ خدمت کر چکی ہوں، لیکن جواب سے ابھی تک محروم ہوں۔ بہرحال کسی بھی حال میں اِس کی جانچ کر کے فوراً مطلع کریں، آپ کی ممنون ہوں گی۔ آپ 'بانو' کو جس شان و شوکت کے ساتھ پیش کرتی ہیں، وہ صرف آپ ہی کا کام ہے۔ میرے پاس ایسے کوئی الفاظ نہیں کہ تعریف کروں اور اِس کی اِس طرح کی لاپرواہی دیکھ کر دل اُچاٹ سا ہو جاتا ہے، لیکن پھر بھی دل کو سمجھا لیا کرتی ہوں۔ شبیہہ فاطمہ، الٰہ آباد

پیاری بھابی صاحبہ :

اِس بار بانو خلافِ توقع قبل از وقت آگیا۔ دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ بھابی کوشش کیجئے کہ بانو پہلے کی طرح یہ وقت پر آنے لگے۔ 'افتتاحیہ' بانو ہر بار ایک سمجھ دار بزرگ کی طرح سامنے آتا ہے۔ دل و دماغ میں پیوست کرنے والی نصیحتیں، لڑائی جھگڑے وغیرہ سے دلی سکون ملتا ہے۔

بانو کے سال نامہ کا ابھی تک کچھ پتہ نہیں۔ دیکھ رہی ہوں اس بار بانو کا سال نامہ نہیں مل سکے گا، جن کی مئی جون تک کی خریداری ہے۔ بانو کا سنجیدہ نکھار دیکھ کر دل جھوم جاتا ہے اور اس کے ہر بول انمول ہوتے ہیں ـــ خدا کرے بانو سدا پھلتا پھولتا رہے۔ آمین۔

سلطانہ اقبال، چھپرہ (بہار)

بھائی جان :

آپ کا رسالہ بانو (مئی : ۱۹۷۷) نظر نواز ہوا۔ آپ کتنی محنت سے اسے قارئین کے سامنے پیش کرتی ہیں اور پھر دوگنی محنت کر کے اسے اتنی جلدی پیش کیا۔ میں آپ کی محنت پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔

اس مرتبہ افتتاحیہ کے بعد "۱۹۷۶ کی مشہور خواتین" (مطلوب احمد) سب سے زیادہ پسند آیا۔ واقعی ۱۹۷۶ میں یکے بعد دیگرے خواتین نے ایسے ایسے کارنامے کر دکھائے کہ سب ہی حیران رہ گئے کہ خواتین میں اچانک یہ جوش اور ولولہ کہاں سے پیدا ہو گیا ـــ وہ پیش گوئی کہ ایک دن عورتیں بھی مردوں کے شانہ بہ شانہ کام کریں گی، بالکل صحیح ثابت ہوئی۔ اُمید ہے عورتیں آئندہ بھی اسی طرح اصلاحی اور ترقیاتی میدان میں آگے آئیں گی۔

محمد سہیل اختر، جمشید پور

پیاری بھابی صاحبہ :

مئی کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ پڑھ کر دل

بے اختیار قہقہہ اٹھا۔ "ان سے ملئے" کا کالم بہت پسند آیا۔ عصمت جہاں کا اپنے کو حالات کے مطابق ڈھالنے کا کارنامہ قابل تحسین ہے۔ اس کے علاوہ سب نظمیں اور افسانے پسند آئے۔ خصوصاً "کبھی کشتی"، "جوڑی کالج"، "باورچی خانہ"، "بزم بانو"۔ دیس پردیس کی خبریں کافی دل چسپ لگے۔ بانو روز بروز حسین اور خوب صورت ہوتا جا رہا ہے۔ یہ سب آپ کی لگن اور محنت کا نتیجہ ہے جو ایسے اچھے رسالے سے ہم سب مستفید ہو رہے ہیں۔ خدا کرے بانو اسی طرح ادب کی دنیا میں درخشاں ستارے کی مانند چمکتا رہے۔

آپ بانو میں قلمی دوستی کا کالم شروع کر دیجئے تاکہ بانو پڑھنے والوں کا آپس میں بھی رابطہ قائم ہو جائے۔ اتنا اچھا رسالہ نکالنے پر میری طرف سے مبارک باد قبول فرمائیے۔

زاہدہ سیفی، ہردوئی

سویٹ بھابی:

میں بانو بہت دل چسپی سے پڑھتی ہوں۔ اس کے سب ہی مضامین اور افسانے معیاری ہوتے ہیں، لیکن افتتاحیہ تو اس کی جان ہے۔ کئی ماہ سے بانو کافی انتظار کے بعد میں ملتا ہے لیکن ملتے ہی طبیعت کھل اٹھتی ہے۔ بانو اپریل کے سب مضامین اور افسانے لاجواب تھے۔ "زنان خانہ"، "کالی رات سنہری سویرا" بہت ہی اچھے لگے۔ نیا کالم "آپ کی ذہنی الجھن اور اس کا حل" بہت اچھا ہے۔ اس کو جاری رکھیں۔

مس نزہت ناز، دریا پتی نگر

محترمہ مدیرہ صاحبہ:

بانو (مئی ۱۹۷۷ء) کے شمارے میں "ہندوستان میں شادیاں" کے عنوان سے جو مضمون شائع ہوا ہے اس میں مصنف نے "ادل بدل" کی شادیوں کو لفظ شغار سے تعبیر کیا ہے اور لکھا ہے کہ اسلام نے اس رواج کو ناپسند کیا ہے۔ شغار کو اسلام نے ناپسند ضرور لکھا ہے، لیکن شغار کا مطلب صرف ادل بدل کی شادی مراد لینا صحیح نہیں ہے۔ جو چیز اسلام کی نظر میں ناپسندیدہ ہے وہ در اصل یہ ہے کہ ادل بدل کی شادیوں میں لڑکیوں کی شادیوں کو ہی ایک دوسرے کا مہر قرار دیا جائے یعنی کوئی بھی مہر ادا نہ کرے۔ اسلام کہتا ہے کہ ہر شادی کا مہر مقرر ہونا چاہئے اور اسے ادا کیا جانا چاہئے۔ ادل بدل کی شادی میں کوئی برائی نہیں۔ برائی در اصل مہر مقرر نہ کرنے یا ادا نہ کرنے میں ہے۔ اسلام تو ان شرطوں کے علاوہ جو اس نے عائد کی ہیں ہر قسم کی شادیوں کو جائز کہتا ہے اور یہ بالکل عیاں ہے کہ ادل بدل کی شادی پر بھی ان شرطوں کے علاوہ اور کوئی پابندی نہیں ہے۔

عبدالباری مومن، بھیونڈی

ڈیر بھابی:

آپ نے بانو میں "آپ کی ذہنی الجھن اور اس کا حل" کالم دے کر ہم شرمیلی بہنوں پر بڑی مہربانی کی ہے، جو اپنی ذہنی الجھن خاص کر ازدواجی الجھن کے بارے میں اپنی سہیلی تک سے کچھ نہیں کہہ سکتی ہیں۔ کاش آپ اس کے لئے زیادہ سے زیادہ صفحے رکھیں۔ چاہے بانو کی قیمت بڑھا دیں۔ آپ ایسا مفید کالم کبھی نہ بند کریں۔

ایک بہن

محترمہ بھابی:

بانو پڑھنے کا موقع ملا۔ اس کی صحیح تعریف کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ پھر بھی میں کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کا رسالہ اردو ماہنامہ پیش کر کے آپ نے اردو کی بڑی اور ناقابل فراموش خدمت انجام دی ہے۔

ایم۔ اے رفیق شاہی، اعظم گڑھ

پچانوے سال کی عمر میں بیٹا پیدا ہوا

لکھنؤ میں مئو ناتھ بھنجن، ضلع اعظم گڑھ کے محلہ قاسم پورہ کے ایک پچانوے سالہ بوڑھے کے یہاں بیٹا پیدا ہوا۔ بچے کی پیدائش پر سارے قصبے میں تعجب اور مسرت کی ملی جلی لہر دوڑ گئی۔ ان کے بڑے لڑکے کی عمر بھی بہت زیادہ ہے۔ اور ان کے سب دانت بھی ٹوٹ چکے ہیں۔ لیکن فطری طور پر انہیں بھی اپنی بھائی کی آمد پر خوشی ہوئی۔ اس موقع پر قصبے کے بچوں نے ایک دل چسپ جلوس نکالا اور "دادا کی جوانی زندہ باد" کے نعرے بلند آواز میں لگاتے ہوئے ان کے گھر پہنچے اور مبارک باد پیش کی اور ساتھ ہی مٹھائی کی فرمائش بھی کی۔

سلطانہ اقبال، چھپرہ

محترمہ:

بانو، جون میں "اچھوتے آم" اور "بیکراں" اچھے لگے۔ کملیشور کا "بھرے پورے ادھورے" خود ان کے معیار کا نہیں ہے۔ "کھیل کھیل میں" الجھا ہوا نفسیاتی مضمون ہے۔

"دنیا کی کہانی، تصویروں کی زبانی"، "آپ فیصلہ کیجئے"، وغیرہ قسم کے کالم دوبارہ شروع کیجئے۔ ان کے بنا ایک سونا پن محسوس ہوتا ہے۔

علیم کھوت، بدگھہ

باورچی خانہ

آزمائش اور ترتیب: **رشیدہ خاتون**

مزے دار اور آزمودہ پکوان

کھٹی حیدرآبادی دال

ل مسور (دھلی ہوئی ثابت)	۲۵۰ گرام
ل مرچ	ایک چائے کا چمچہ
مرچ ثابت	ایک عدد
ی	آدھا چائے کا چمچہ
ن	۱۲ جوے
ب	آدھا چائے کا چمچہ
مرچ	۶ عدد
ے دھنیے کی پتّیاں	ایک ٹیبل اسپون
گودا	پاؤ پیالی
ں کا تیل	آدھی پیالی
	حسبِ ذائقہ

دال کو صاف کرکے آدھے گھنٹے کے لئے
دو دیں۔

لہسن کو چھیل کر آدھے جوے پیس لیں باقی
کو باریک باریک کاٹ لیں۔ ہری مرچوں کے باریک
باریک چھلّے کاٹ لیں۔ املی کے گودے کو ایک پیالی
پانی میں بھگو دیں۔ پھول جائے تو چھلنی میں چھان
کر رس نکال لیں۔ پھوک پھینک دیں۔

ایک دیگچی میں دال، پسی ہوئی لال مرچ،
ہلدی، ادرک، پسا ہوا لہسن، نمک اور دال گلنے
کے اندازکا پانی ڈال دیں اور دیگچی کو ڈھانپ کر
آنچ پر رکھ دیں جب پکنے لگے تو آنچ دھیمی کر دیں۔
جب آدھی گلی ہو جائے تو ہری مرچوں کو آدھا آدھا
کاٹ کر ڈال دیں۔ دال گل جائے تو املی کا رس ڈال
دو چار منٹ بعد آنچ سے اتار کر دال گھوٹنی سے
گھونٹ لیں۔

فرائی پان میں تیل اور ثابت لال مرچ ڈال
آنچ پر رکھ دیں۔ مرچ جل جائے تو تیل آنچ سے
اتار لیں اور مرچ نکال کر پھینک دیں تیل تھوڑا ٹھنڈا
ہو جائے تو اس میں کٹا ہوا لہسن ڈال دیں۔ لہسن
بادامی ہو جائے تو تیل سمیت دال میں ڈال دیں۔
ڈش میں نکالنے کے بعد ہری مرچوں کے
چھلّے اور ہرے دھنیے کی پتّیاں چھڑک دیں۔

شہناز پروین، حیدرآباد۔

لیموں اور ہری مرچ کا اچار

کاغذی لیموں	۸ عدد
ہری مرچ	۲۵۰ گرام
لہسن	۱۲۵ گرام
سرسوں کا تیل	آدھا لیٹر
نمک	حسبِ ذائقہ

لیموں کو دھو کر کسی صاف کپڑے سے پونچھ کر خشک کرلیں پھر ان کے چار چار ٹکڑے کرلیں لہسن چھیل لیں اب ایک صاف اور خشک مرتبان میں لیموں کے ٹکڑے، لہسن اور نمک ڈال دیں اور مرتبان کا ڈھکنا ڈھانپ کر تین دن دھوپ لگائیں چوتھے دن ہری مرچوں کو دھو کر کپڑے سے خشک کرلیں۔ اب کڑھائی میں تیل ڈال کر آنچ پر رکھ دیں تیل گرم ہو جائے تو ایک جوا لہسن کا ڈال دیں لہسن جل جائے تو کڑھائی کو آنچ سے اتار لیں اور لہسن کا جوا نکال کر پھینک دیں۔ دو چار منٹ بعد اس میں ہری مرچوں کو ڈنڈیوں کے ساتھ ڈال دیں۔ پانچ منٹ بعد مرچوں کو تیل سمیت لیموں والے مرتبان میں ڈال دیں اور مزید دو چار دن دھوپ لگانے کے بعد استعمال کریں۔

۔ تاج یاسمین، دہلی

آم کی پوریاں

میدہ	۲۵۰ گرام
آم (درمیانہ سائز)	۴ عدد
چینی (پسی ہوئی)	آدھی پیالی
گھی	حسبِ ضرورت

میدہ کو چھان لیں۔ آموں کو گھلا کر ان کا رس نکال لیں۔

میدہ کو آموں کے رس سے گوندھ لیں پانی نہ ڈالیں۔ رس کم ہو تو مزید ایک آم کا رس ڈال لیں۔

ایک کڑھائی میں گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں گھی گرم ہو جائے تو گندھے ہوئے میدہ کی چھوٹی چھوٹی پوریاں بنا کر ڈال دیں۔ ایک طرف سے بادامی ہو جائیں تو پلٹ دیں دوسری طرف سے بھی بادامی ہو جائیں تو گھی سے نکال لیں اور فوراً ہی پوری کے اوپر تھوڑی سی پسی ہوئی چینی چھڑک دیں۔ اسی طرح تمام پوریاں تل لیں۔ شام کی چائے کے ساتھ گرم گرم کھائیں

شاہدہ انور، علی گڑھ

آلو کے گل گلے

آلو	۲۵ گرام
انڈا	ایک عدد
میدہ	ایک پیالی
چینی	ایک پیالی
دودھ	ایک پیالی

زعفران	ایک چٹکی
گھی	حسب ضرورت

آلوؤں کو اُبال کر چھیل لیں پھر گرم گرم کو چمچے سے کچل کر بھرتہ بنالیں تھوڑے ٹھنڈے ہوجائیں تو ہاتھ سے آٹے کی طرح گوندھ لیں۔

دُودھ میں چینی ملالیں زعفران کو کچھ دیر کے لئے ایک چائے کا چمچہ گرم دودھ میں بھگو دیں۔ پھر کھرل میں باریک پیس کر دُودھ میں ملالیں انڈے کو پھینٹ کر دُودھ میں ملالیں اب میدہ اور آلوؤں میں دُودھ ملادیں۔

کڑھائی میں اچھا خاصا گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں گھی گرم ہوجائے تو محلول کو چمچے سے بھر کر کڑھائی میں ڈال دیں ایک طرف سے ہلکے بادامی ہوجائیں تو پلٹ دیں دوسری طرف سے بھی ہلکے بادامی ہوجائیں تو کاغذ پر اُتار لیں تاکہ فاضل گھی کاغذ میں جذب ہوجائے اسی طرح تمام گُل گُلے تل لیں، برسات میں شام کی چائے کے ساتھ بہت مزہ دیتے ہیں۔

عقیلہ بیگم، بجنور

بیسن کے سیو

بیسن	۵۰۰ گرام
لال مرچ	۲ چائے کے چمچے
سفید زیرہ (کٹا ہوا)	ایک چائے کا چمچہ
کالا زیرہ (کٹا ہوا)	آدھا چائے کا چمچہ
اُجوائن	پاؤ چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
گھی	حسب ضرورت

بیسن کو چھان کر اس میں گھی کے علاوہ باقی کی تمام چیزیں ملالیں پھر پانی سے آٹے کی طرح سخت گوندھ لیں۔ اب اس کے چار پیڑے بناکر رکھ لیں۔

کڑھائی میں زیادہ گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں گھی گرم ہوجائے تو گیہوں چھاننے کی چھلنی کو ایک ہاتھ سے پکڑ کر کڑھائی سے تھوڑا فاصلے پر کرلیں پھر ایک پیڑا بیسن کا چھلنی میں رکھ کر ہاتھ سے اس طرح دبائیں کہ بیسن چھلنی کے سُوراخوں سے نکل کر کڑھائی میں گر جائے اس کے بعد چھلنی کو ہٹالیں سیو بادامی ہوجائیں تو گھی سے نکال کر کاغذ پر رکھ دیں تاکہ فاضل گھی کاغذ میں جذب ہوجائے اسی طرح تمام سیو بناکر رکھ لیں، شام کی چائے کے ساتھ کھائیں یہ سیو کافی دن تک رکھے جاسکتے ہیں اگر چھوٹے بچوں کے لئے بنانے ہوں تو لال مرچ کی جگہ آدھا چائے کا چمچہ کالی مرچ ڈال لیں۔ فریدہ بیگم، دہلی

پنیر کے پکوڑے

پنیر	۲۵۰ گرام
بیسن	ایک پیالی
لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
ہری مرچ	۴ عدد
ہرے دھنیے کی پتیاں	ایک ٹیبل ا
نمک	حسب ذا
گھی	حسب ضرور

ہری مرچوں کا باریک کچومر کاٹ لیں

پھر بیسن میں ہری مرچ کا کچومر، لال مرچ، ہرے دھنیے کی پتیاں، نمک اور ایک پیالی پانی ملاکر گ لیں پنیر کو ہاتھ سے مل کر کچومر کرلیں اور بیسن میں شامل کردیں، کڑھائی میں گھی ڈال کر آنچ پر رکھ گھی گرم ہوجائے تو ٹیبل اسپون سے تھوڑا تھو پنیر ملا بیسن گھی میں ڈالیں پکوڑے ایک طرف بادامی ہوجائیں تو پلٹ دیں دوسری طرف سے بادامی ہوجائیں تو کاغذ پر اُتاریں تاکہ فاضل گھی کا میں جذب ہوجائے اسی طرح تمام پکوڑے تل لیں، شام کی چائے میں ٹماٹر کی چٹنی کے سا گرم گرم کھائیں۔ جمیلہ بانو، کلکتہ

آٹھ ہزار روپے کے نقد انعامات تقسیم کئے گئے۔ صحیح حل کوئی نہیں آیا

شمع مِنی معمّہ نمبر ۲۱ میں ایک ایک غلطی والے ۹۴ حلوں پر پہلا انعام

شمع مِنی معمہ نمبر ۲۱ اتنا مشکل تھا کوئی بھی پروانہ بہت ... نہیں نکالا اور پہلا انعام مبلغ پانچ ہزار روپے ایک ایک غلطی والے ۹۴ حلوں پر تقسیم کیا گیا۔ ان میں سے کسی بھی پروانے کی ایک غلطی کم ہوتی تو وہ اکیلا ہی پانچ ہزار روپے کے انعام کا حق دار بن سکتا تھا

شمع منی معموں کی تیز رفتاری لاجواب ہے۔ درست حل ظاہر کئے جانے کے بعد چند ہی گھنٹوں میں چیکنگ ختم کر کے تقسیم انعامات کی تفصیلات کا اعلان کر دیا گیا۔ جن پروانوں نے صحیح حل کی نکلیں نکالنے کے لئے لفافے بھیجے تھے انہیں پہلا انعام پانے والوں کے نام و مقام بھی تحریر کر دئے گئے اور دوسرے انعام کی تفصیلات بھی بتا دی گئیں۔ دوبارہ جانچ کے لئے کسی کلیم کا انتظار کئے بغیر تیسرے ہی دن تک پہلے اور دوسرے انعام کے منی آرڈر روانہ کر دئے گئے۔

ایک ایک غلطی والے ۹۴ حل موصول ہوئے جن پر پہلا انعام مبلغ پانچ ہزار روپے بہ حساب ۱۰۲ روپے ۵ پیسے فی حل تقسیم کیا گیا

۱ - محبوب احمد شیخ صاحب، مکان نمبر ۱۹، بلاک نمبر ۱۵، خانیوال (پاکستان)
۲ - بلونت سنگھ صاحب، ۴۲ اے جی بلاک، نئی بستی، سلیم پور، دہلی ۵۳
۳ - بہاری لال صاحب، ۲۵ / ۱۹، راجندر نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۰
۴ - گنگا رام ٹھاکر صاحب، ریجنل مینجر آفس، پنجاب نیشنل بینک، جھنڈے والان ایکسٹینشن، نئی دہلی
۵ - ایس، کے، ارورہ صاحب، پرائم منسٹر سکریٹریٹ، نئی دہلی
۶ - مسعود کامل صاحب، امپیریل پلاسٹکس، ۲۹۵۰ سڑک پریم نرائن، چوڑی والان، دہلی ۱۱۰۰۰۶
۷ - وی، این، دتہ صاحب، ۲۱۳/۱۱، جوشی روڈ، قرول باغ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۵
۸ - شیر علی تمال صاحب، جدید ... محلہ تھانہ کنڈہ، رام پور ۲۴۴۹۰۱
۹ - جے، اے قریشی صاحب، قریشی کتاب گھر، بہادر گنج، شاہجہاں پور
۱۰ - کے، کے سیٹھی صاحب، روم نمبر ۲۲۵ ٹرانسپورٹ بھون، پارلیمنٹ اسٹریٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱
۱۱ - سید مسعود علی صاحب، ایم، کام (علیگ) معرفت ریزرو بینک آف انڈیا، نئی دہلی
۱۲ - سید مسعود علی صاحب، ایم، کام (علیگ) معرفت ریزرو بینک آف انڈیا، نئی دہلی
۱۳ - گنگا رام ٹھاکر صاحب، ریجنل منیجر آفس، پنجاب نیشنل بینک، جھنڈے والان ایکسٹینشن، نئی دہلی
۱۴ - سرجی رام ملہوترا صاحب، کوارٹر نمبر ۳، سیکٹر ۸، آر، کے پورم، نئی دہلی
۱۵ - بی، ایل کھورانہ صاحب، ۲۳۔ اے، گرلز ہنڈنگ، دہلی ۱۱۰۰۰۷
۱۶ - وحید اللہ خاں صاحب، مکان نمبر ۲۲۳، رتن گلی نمبر ۷، دھرم پورہ، گاندھی نگر، دہلی ۱۱۰۰۳۱
۱۷ - محمد عباد اللہ صاحب آفس آف اے، جی ایچ ویسٹ بنگال آر اے ہیڈ کوارٹر سیکشن اولڈ نظام پیلیس ... فلور ۲۳۴ اے، جے، سی، بوس روڈ، کلکتہ ۷۰۰۰۲۰
۱۸ - منظور احمد صاحب، بنگال ٹیلیس لائنٹ، ۱۳۳ لوور چیت پور روڈ، کلکتہ ۷۰۰۰۷۳
۱۹ - محمد صدیق صوفی صاحب، ولد عبد الغفار صوفی صاحب معرفت اپنا بازار، لالہ رخ ہوٹل بلڈنگ، سری نگر ۱۹۰۰۰۱
۲۰ - اے، بی نو بہار معرفت جی، ایم، ہوش صاحب ایم اے بی ایل، پرانی رانچی، رانچی (بہار)
۲۱ - ریحانہ خاتون صدیقی صاحبہ، محلہ شکل ٹولی، سیوان (بہار)
۲۲ - طاہرہ بیگم صاحبہ، ۸۵ ڈ آر، حویلی کبیر خاں، نائی کی منڈی، آگرہ ۲۸۲۰۰۲
۲۳ - طاہرہ بیگم صاحبہ، ۸۵ ڈ آر، حویلی کبیر خاں، نائی کی منڈی، آگرہ ۲۸۲۰۰۲
۲۴ - محمد انور صاحب، مکان نمبر ۳۱ ڈ، نزد کوثر علی بلڈنگ، محلہ ملوپورہ، مظفر نگر۔
۲۵ - بلونت سنگھ صاحب، ۴۳، جی بلاک، نئی بستی، سلیم پور، دہلی ۵۳۔
۲۶ - نور الدین صاحب، ۹۰/۱ جے، بشیشر من بازار، وارانسی۔
۲۷ - ڈاکٹر ایچ ... از حیدر ہمدانی صاحب، ڈاک خانہ خیر آباد، ضلع اعظم گڑھ۔
۲۸ - محمد شعبان میر صاحب، مہاراج گنج، سری نگر ۱۹۰۰۰۲۔
۲۹ - برج لال شرما صاحب، اوک ورڈ، جاکو، شملہ نمبر ۱۔
۳۰ - محمد پاشاہ، ایس، جے، سی مارٹ، ۱۷۴، ڈی مارکیٹ، میسور۔
۳۱ - جگن ناتھ او برائے صاحب، ای، ایس ۲۲۳، مخدوم پورہ، جالندھر۔
۳۲ - نرنجن ناتھ صاحب، معرفت رشی ناتھ ریپیا، ریذیڈینسی روڈ، سری نگر۔
۳۳ - سلطان شاد رانچوی صاحب، محلہ پرانی رانچی (نزد مسجد) رانچی (بہار)
۳۴ - اسمعین محمد صاحب، ای ڈی او، مکان نمبر کیو / ۶/۱۰۶ - ڈ، جھونگڈھ، نلگنڈہ۔
۳۵ - ولراج کمار صاحب، واٹڈ کیپر (ہیلتھ اسٹور ڈپو) معرفت اے، سی - او - ایس، نادرن ریلوے، ملکو ... پ لدھیانہ

صحیح حل شمع مِنی معمّہ نمبر ۲۱

ے	د	ن	ر	پ[1]	■
ل	ا	ہ	ج[2]	■	بھ[3]
ٹ	ل	پ[4]	■	گھ[6]	ب
و	ک	■	ت	ل	ک
■	■	ہ	و	م	ن
■	■	م	ڑ	ل	ے

نوٹ: شمع منی معمہ نمبر ۲۰ کے ... [illegible] ... ۵۔ خواجہ ... ۶۔ احمد ... دلیرا لی طالب

دفاتر شمع کے پتہ میں نمبر کی تبدیلی

دفاتر شمع کی ڈاک اب نئی دہلی نمبر ۱ کے ڈاک خانے کی بجائے نئی دہلی نمبر ۲ کے ڈاک خانے سے تقسیم کی جانے لگی ہے۔ اس لئے اپنے خطوط کی جلد تقسیم کے لئے ہمارے پتے کے آخر میں واضح طور پر پن کوڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ لکھئے۔ ہمارا جواب بھی آپ کو جلد ملے، اس غرض سے اپنا پتہ لکھتے وقت بھی اپنے شہر کے آخر میں اپنے ڈاک خانے کا "پن کوڈ" لکھئے۔ اگر آپ کو ابھی تک اپنے پتے کے "پن کوڈ" کا علم نہیں تو اپنے قریب ترین ڈاک خانے سے یا اپنے علاقے کے پوسٹ مین سے دریافت کیجئے

۳۶۔ محمد نظام الدین صاحب، نیفری پیرہ اسسند گڑھ (اڑیسہ)
۳۷۔ مسنرعیاسروو سکسینہ صاحبہ، معرفت ایس گنپت راؤ صاحب، بمبئی ٹائمز ہاؤس، ملکنڈہ ۵۰۸۰۰۱
۳۸۔ ایس۔ عبدالقیوم صاحب، معرفت اسٹرل پولٹری سیل سینٹر، مانسہ، سریکنڈ ۱۴۰۰۱
۳۹۔ ایس۔ پی۔ سریواستوا صاحب، پنجاب نیشنل بنک، فیض آباد۔

۴۰۔ شمس الدین صاحب، کھال پاور اسٹیشن، کھال ضلع دہرہ دون۔

۴۱۔ مسنرعیاسروٹے صاحبہ دختر ایس گنپت راؤ صاحب، بمبئی ٹائمز ہاؤس، نلگنڈہ
۴۲۔ ایم۔ اے۔ خاں صاحب، اوپرب رنگ بک اسٹال، جودھپور ۲۲۲۰۰۲
۴۳۔ محمد نسیم صاحب، نیو شمع ہوٹل، مال روڈ، الموڑہ
۴۴۔ وشواناتھ پانڈے صاحب ولد جاردھا کشن صاحب، ریلوے روڈ، تربہ (فیروزپور)
۴۵۔ محمود مرزا صاحب، معرفت مشتاق صاحب، مالا شو کمپنی، چاندپول بازار، جے پور ۳۰۲۰۰۱
۴۶۔ عظیم احمد خاں صاحب، موضع ملک، ڈاک خانہ کوک، ایس۔ او۔ بدری ضلع پرمبھنی
۴۷۔ نجم الدین صاحب ۴/۳۱۴، لوڑھاپاڑا، رائے پور ۴۹۲۰۰۱
۴۸۔ جمیل صمدی صاحب، مڈل اسکول سرور، ڈاک خانہ مسرور (بھوپال)
۴۹۔ سری رام ملہوترا صاحب، کوارٹر نمبر ۳، سیکٹر ۱، آر کے پورم، نئی دہلی

دو غلطی والے ۵۲۵ حل موصول ہوئے جن پر دوسرا انعام مبلغ تین ہزار روپے بحساب ۵ روپے ۷۱ پیسے فی حل تقسیم کیا گیا:

۱۔ ستارہ ... بریلی ۲۔ محمد مشتاق، نئی دہلی ۳۔ سوشیلا ویری، دہلی ۴۔ سوشیلا ویری، نئی دہلی ۵۔ ... ۶۔ فاروق علی، دہلی ۷۔ مسعود علی، نئی دہلی ۸۔ مسعود علی، نئی دہلی ۹۔ جناب علی ... ۱۰۔ ... ۱۱۔ نسیم حلیم ... ۱۲۔ مسعود علی، نئی دہلی ۱۳۔ مسعود علی، نئی دہلی ۱۴۔ ... ۱۵۔ ... ۱۶۔ ... ۱۷۔ بلونت سنگھ ۱۸۔ بلونت سنگھ، دہلی ۱۹۔ بلونت سنگھ، دہلی ۲۰۔ ... [illegible]

[illegible]

☐ تمام حلوں کی جانچ نہایت احتیاط سے کی گئی ہے پھر بھی اگر آپ کو شبہ ہو کہ آپ کو کوئی انعام ملنا چاہئے تھا اور آپ کو نہیں ملا تو ۵ روپیہ جانچ کی فیس ... بھیج کر اس کی تصدیق کرا سکتے ہیں ... شکایت کے ساتھ ... فیس بھی ... اگر آپ کی شکایت درست ہوئی تو آپ کو انعام کی رقم ... واپس کر دی جائے گی ... شکایات ... ۲۸ جولائی ۱۹۷۵ تک ... انعامات روانہ کئے جا چکے ہیں۔ [illegible]

[illegible]

Rs 8,000.00

آٹھ ہزار روپے کے نقد اِنعام

پہلا انعام بالکل درست حل پر: پانچ ہزار روپے ۔ دوسرا انعام ایک غلطی والے حل پر: تین ہزار روپے

فیس داخلہ فی حل : ایک روپیہ ۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں ۔ فیس داخلہ پوسٹل آرڈر، منی آرڈر یا شمع ادبی معموں کے نقد ناموں کے ذریعے ادا کی جا سکتی ہے ۔ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانہ سے ملنے والی رسید اپنے حلوں کے ساتھ بھیجئے ۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں ۔ ان کی فیس ایک ساتھ بھیج سکتے ہیں اور ہر حل پر علیحدہ انعام کے حق دار ہو سکتے ہیں ۔ کوئی ٹوکن بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے ۔ ٹوکن بھیجنے کی شرط کے علاوہ شمع ادبی معموں کی دوسری تمام شرائط شمع منی معموں پر بھی عائد ہیں ۔ ان کی پابندی ضروری ہے ۔

دفاتر شمع (نئی دہلی) میں ڈاک سے اور دستی حل وصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۰ جولائی ۱۹۷۷ء، ۸ بجے رات تک

شمع منی معمہ نمبر ۲۲

■	ا	ی	ا		۱
۸	■	ے	ن		۲
ل	۷	■		ر	۳ ط
ا	ا	۶	■		۴ ن
ن	ک		۵	■	■
ی	ل	ے	ب	■	■

اشارے

دائیں سے بائیں

۱۔ اگر آپ نے راستہ نہ —— ہوتا تو میں ابھی تک اسی بھول بھلیاں میں بھٹک رہا ہوتا

۲۔ مجرم کے دل کا چور اسے چین سے —— نہیں دیتا ۔ اسے ہر لمحہ گرفتاری کا خوف ہوتا ہے

۳۔ جیسا دیس ویسا بھیس ۔ جب تک ان کی —— کا لباس نہیں پہنو گے وہ تمہیں اپنا نہیں سمجھیں گے

۴۔ ہر روز —— نئے قانون بنتے تھے، فرمان جاری ہوتے تھے اور کسی چون و چرا کی اجازت نہ تھی

اوپر سے نیچے

۵۔ تمہیں نرس کس بیوقوف نے بنا دیا ؟ تمہیں تو دوا ٹھیک سے —— بھی نہیں آتی

۶۔ ایک —— بیوی نہ گھر ٹھیک سے چلا سکتی ہے نہ بچوں کو مناسب تربیت دے سکتی ہے

۷۔ میں نے بھی بہت دکھ جھیلے ہیں ۔ میرے دل میں —— ہوئے گھاؤ کون دیکھ سکتا ہے

۸۔ کوئی —— تک نہ یہ سمجھا کہ انساں کہاں جاتا ہے آتا ہے کہاں سے

●●

شمع ادبی معمے (شمع منی معمہ نمبر ۲۲) ماہنامہ شمع، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱

شمع منی معمہ نمبر ۲۲ کا صحیح حل ۲ اگست ۱۹۷۷ کو صبح ساڑھے نو بجے ظاہر کر دیا جائے گا ۔ صحیح حل اور انعام پانے والوں کے نام اگست ۱۹۷۷ کے "بانو" میں شائع کئے جائیں گے ۔ انعام پانے والوں کی تفصیلات شمع ستمبر ۱۹۷۷ میں بھی شائع کی جا سکتی ہیں ۔



★ اب آپ ایک شمع ادبی معمہ دوسرے شمع ادبی معمے کے حل بھیجنے کے درمیان اپنے ادبی ذوق کی تسکین کر سکتے ہیں . . . منی معمہ کے ذریعے !

★ کوئی ٹوکن بھیجنے کی قید نہیں !

★ جتنے حل بھی چاہیں بھیجئے اپنے تمام حلوں کی فیس ایک یا ایک سے زیادہ منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا نقد ناموں سے بھیج سکتے ہیں

★ آپ ہر حل پر انعام کے حق دار بن سکتے ہیں فیس داخلہ فی حل صرف ایک روپیہ

★ صرف آٹھ اشارے انعام پانا کس قدر آسان !

★ فیس داخلہ بھیجنے کے لئے شمع ادبی معموں کے نقد نامے استعمال کئے جا سکتے ہیں ۔ یا پوسٹل آرڈر، منی آرڈر بھیجئے اپنے حلوں کے ساتھ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید ضرور بھیجئے ۔

صحیح حل : جوابی لفافہ بھیج کر منگوا لیجئے یا پھر اگلے ماہنامہ "بانو" یا ماہنامہ "شمع" میں دیکھئے ۔

★ شمع منی معمہ نمبر ۲۲ کا نتیجہ اگست ۱۹۷۷ کے "بانو" میں اور ستمبر ۱۹۷۷ کے شمع میں شائع کیا جائے گا ۔

اشاعت کا اکتیسواں سال، آٹھواں شمارہ

شمع

اگست ۱۹۷۷

نگراں:
یوسف دہلوی

مدیرہ زینت کوثر دہلوی   ادارۂ تحریر: شمیم آرا دہلوی   سعدیہ دہلوی

مالکان: شمع میگزین ● طابع وناشر: یونس دہلوی ● مطبوعہ ایس، پی، پرومیر ● ٹائٹل بمبئی آفسیٹ پریس

عام شمارے کی قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے، سالانہ قیمت: اٹھارہ روپے (جس میں سالنامہ مفت ملتا ہے)

مقام اشاعت وصدر دفاتر: آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ تارکاپتہ: "شمع" نئی دہلی ٹیلی فون: ۲۷۲۰۶۶، ۲۷۲۰۶۷، ۲۷۲۰۶۸

دیگر دفاتر: بمبئی، کلکتہ اور مدراس

افتتاحیہ

جب انسان کا کسی دشوار مسئلے سے اچانک سابقہ پڑجائے یا کوئی پریشانی لاحق ہو جائے تو وہ دوسروں سے ہمدردی پانے کی اُمید باندھ لیتا ہے۔ اور اگر دوسروں کی ہمدردیاں اس کی توقّعات پر پوری نہ اُتریں تو وہ مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ ردِّ عمل صحت مند نہیں۔ اگر انسان کو اپنے عزم اور ہمّت پر مکمّل یقین ہے تو اُسے اس بات کی پرواہ نہیں کرنی چاہئے کہ دوسرے اس سے ہمدردی کا اظہار لازمی کریں۔ اپنے آپ کو قابلِ رحم سمجھنے والا انسان راستے کی دشواریوں پر قابو نہیں پاسکتا۔

کچھ لوگ دوسروں کی ہمدردی حاصل کرنا اپنا حق سمجھنے لگتے ہیں اور یہی جذبہ انسان کی بنیادی کمزوری بن جاتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ انسان خود پر مکمّل اعتماد کرنا سیکھے اور اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ دوسروں سے رحم اور ہمدردی کی بھیک مانگنا مشکلات کا حل نہیں، کیوں کہ ہمدردی کی خواہش اس کی مشکلات کے احساس کو ہَوا دیتی ہے۔

اگر ہم دشواریوں کا سامنا کرتے وقت دوسروں کی طرف دیکھنے کی بجائے اپنے اندر بھروسہ پیدا کریں تو دوسروں کی ہمدردی حاصل کرنے کی خواہش ہمارے راستے کی رُکاوٹ کبھی نہیں بن سکے گی۔

●●

زینت کوثر مسعود



ریگستان کے میٹھے بیٹیاں

ریت کا سمندر حدِ نظر تک پھیلا ہوا ہے دُور دُور تک آبادی کا نشان نہیں۔ ہوا کے جھکڑوں میں گرم ریت ملی ہوئی ہے۔ آگ برساتی دھوپ ریت پر پڑتی ہے تو آنکھوں کو چکاچوند کر دیتی ہے جی نہیں، یہ عرب کا ریگستان نہیں! صحرائے اعظم بھی نہیں، یہ اپنے ہی ملک کا منظر ہے۔ ہندوستان میں جہاں برف پوش پہاڑ اور گل پوش وادیاں ملتی ہیں، وہاں جھلسا دینے والے ریگستان بھی موجود ہیں۔

راجستھان جغرافیہ کے ماہرین کے نزدیک افریقہ کے صحرائے اعظم کا ہی ایک حصّہ ہے۔ لاکھوں برس پہلے صحرائے اعظم کی سرحد راجستھان تک پہنچی تھی۔ پھر زمین میں کچھ دھما کے ہوئے اور زمین جگہ جگہ دھنس گئی۔ اس نشیب میں پانی بھر گیا۔ اس طرح خلیجِ عرب (جسے پہلے خلیجِ فارس کہتے تھے) اور بحرۂ قلزم وجود میں آئے۔ صحرائے اعظم کا ایک حصّہ عرب کا ریگستان بن گیا اور دوسرا راجستھان۔ تیل کے کنویں ریت کے سمندر کے نیچے ملتے ہیں۔ خلیجِ عرب کے ریگستان میں تیل کے بیش بہا ذخیرے دریافت ہوئے ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ ۱۰۰ سال بعد تیل کے یہ دریا بہتے ہوئے راجستھان تک پہنچ جائیں گے۔ اور ہمارا ملک تیل کی دولت سے مالا مال ہو جائے گا۔ لیکن یہ سب مستقبل کی باتیں ہیں۔ موجودہ زمانے میں راجستھان کا بیشتر علاقہ پانی کے لئے ترستا ہے۔ ریگستان میں کھیتی نہیں ہو سکتی۔ پانی کے بغیر انسان اور جانور بڑی کٹھن زندگی گزارتے ہیں راجستھان میں بارش کا اوسط ہندوستان میں سب سے کم ہے۔ (ویسے وہ مقام بھی ہندوستان میں ہی واقع ہے جہاں دنیا میں سب سے زیادہ بارش ہوتی ہے۔ یہ مقام چیراپونجی کہلاتا ہے) راجستھان میں بارش کی کمی کی وجہ یہ ہے کہ مانسون ہوائیں جو بحرۂ عرب سے بارش کی بوندوں سے لدی ہوئی آتی ہیں، راجستھان پہنچتے پہنچتے خشک ہو جاتی ہیں۔ راجستھان میں کوئی اونچا پہاڑ بھی نہیں ہے جس سے ٹکرا کر مانسون بارش میں تبدیل ہو جائے۔

سال میں ایک آدھ بار بارش ہو جائے تو راجستھان کے باشندوں کی عید ہو جاتی ہے۔ ندی نالے بھر جاتے ہیں۔ پانی زمین میں جذب ہو کر کنویں کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے صحرا میں جھاڑیاں پیدا ہو جاتی ہیں جس سے مویشیوں کے لئے چارے کا انتظام ہو جاتا ہے مگر تھوڑے ہی عرصے کے بعد دھوپ کی تمازت اور جھلسا دینے والی گرمی سے ندیاں پھر خشک ہو جاتی ہیں اور کنوؤں میں پانی پھر کم ہو جاتا ہے۔ ریت کی خاصیت ہے کہ وہ بہت جلد گرم ہو جاتا ہے اور اتنی ہی تیزی سے ٹھنڈا ہوتا ہے۔ دن میں ریگستان میں کیسی ہی آگ برستی ہو، شام ہوتے ہی ریت ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اسی لئے ریگستان کی راتیں بہت سہانی ہوتی ہیں۔ جاڑوں میں تو ریت برف کی طرح سرد ہو جاتا ہے

پانی کے بغیر زندگی کا تصور ناممکن ہے

انسانوں نے ہمیشہ دریاؤں کے کنارے شہر بسائے ہیں۔ جب دریا سوکھ گئے یا انہوں نے اپنا رخ موڑ لیا۔ تو شہر بھی ویران ہو گئے

اکبر نے فتح پور سیکری کا شہر بسایا تھا جو سیکری دریا کے کنارے واقع تھا۔ کچھ عرصے کے بعد سیکری کے سوکھ جانے سے فتح پور غیر آباد ہو گیا۔ اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ راجستھان کے لوگوں کو کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا۔ راجستھان میں کوئی بڑا دریا نہیں۔ صرف ندیاں اور نالے ہیں، یا کنوئیں ہیں۔ ان کا انحصار بارش پر ہے۔ چند سال پہلے کا ذکر ہے کہ راجستھان میں

چھوڑنا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے، لیکن جان سب کو پیاری ہوتی ہے۔ ان لوگوں نے اپنے گھروں کو تالے لگا کے، گھر کا سب سامان سمیٹا اور قافلہ بنا کر پانی کی تلاش میں نکل پڑے۔ انسانوں اور جانوروں کے یہ قافلے پانی کی تلاش میں مدھیہ پردیش پہنچ گئے۔ یہ قافلے تقریباً ایک لاکھ انسانوں پر مشتمل تھے مدھیہ پردیش میں انہیں اپنے مویشیوں کے لئے

ریگستان کے باشندوں کی زندگی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ میدانی علاقوں کے باشندوں کے لئے ریگستان کی زندگی اور وہاں کے رہنے والوں کا انداز فکر سمجھنا مشکل ہے وہ سوچتے ہیں کہ آخر یہ لوگ ریگستان کی صعوبتیں کیوں برداشت کرتے ہیں۔ وہ چاہیں تو دوسرے علاقوں کی طرف ہجرت کر سکتے ہیں جہاں انہیں اتنی تکلیفیں برداشت نہیں کرنا پڑیں گی۔ مگر



بارش بالکل نہیں ہوئی۔ سب ندیاں سوکھ گئیں، سارے کنوئیں خشک ہو گئے۔ مویشی پیاس کے سارے دم توڑنے لگے جانوروں کے بعد انسانوں کی باری تھی۔ ان لوگوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ان بنجر میدانوں سے ہجرت کر جائیں گے جہاں موت منہ کھولے ہوئے ان کا انتظار کر رہی ہے۔ انسان کے لئے گھر بار

چراگاہیں مل گئیں۔ ان قافلوں نے وہیں پڑاؤ ڈال دیا۔ ان لوگوں نے کھلے آسمان کے نیچے کئی مہینے گزار دئے۔ جب راجستھان میں بارش شروع ہوئی تو اس خوش خبری کے سنتے ہی انھوں نے پھر رخت سفر باندھا۔ اور اپنے وطن کو واپس چلے گئے۔ ہرے بھرے سرسبز علاقے کے رہنے والوں اور

یہ لوگ صحرا کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے۔ ان تپتے ہوئے صحراؤں میں ایک مقناطیسی کشش ہے جو انھیں یہاں رہنے پر مجبور کرتی ہے۔

جیسلمیر راجستھان کا ایک قدیم شہر ہے۔ یہاں راجپوتوں اور مغلوں کے درمیان کئی معرکے ہوتے تھے جیسلمیر راجستھان کا

قدیم شہر ہے۔ یہاں راج پوتوں اور مغلوں کے درمیان کئی معرکے ہوتے تھے۔ جیسلمیر کا قلعہ ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ جیسلمیر کے مکان راج پوت طرزِ تعمیر کے بہترین نمونے ہیں۔ یہ شہر بھی آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے۔ یہاں کے اکثر مکان مکینوں سے خالی ہیں۔ راجستھان

ہو گئے ہیں۔ لیکن یہاں کے رہنے والوں نے ابھی تک ہمت نہیں ہاری ہے۔ گاؤں کی عورتیں پانی کے مٹکے بھر بھر لانے کے لئے قریبی گاؤں میں جاتی ہیں۔ کچھ گاؤں ایسے ہیں جہاں عورتوں کو پانی لانے کے روزانہ آٹھ میل تک چلنا پڑتا ہے۔

کے کڑوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ کڑے پہنچے سے کہنی تک پہنچ جاتے ہیں۔ ہاتھی دانت کے علاوہ چاندی کے کڑے اور پازیب بھی پہنے جاتے ہیں۔ راجستھانی دُلہن زیورات میں لدی پھندی رہتی ہے دراصل یہ زیورات اُن لوگوں کے لئے سیونگ بینک کا کام دیتے



بچے کے لئے جھولتا بستر

کے آخری سرے پر بسا ہوا یہ شہر موت کے دہانے پر کھڑا ہے۔ راجستھان میں کئی شہر ہیں جن کو ریگستان آہستہ آہستہ ہڑپ کر رہا ہے باڑمیر اور لونی کے علاقوں میں ایسے کئی گاؤں ہیں جہاں پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں مل سکتا۔ ان دیہات کے سارے کنوئیں خشک

راجستھانی عورتیں رنگ برنگے

لباس کی شوقین ہوتی ہیں۔ ان کا بلاؤز بہت مختصر ہوتا ہے۔ چنّی اور گھاگھرے میں شیشے لگے ہوتے ہیں۔ راجستھانی عورتیں زیور پہننا پسند کرتی ہیں زیورات میں ہاتھی دانت کا چوڑا بہت مقبول ہے۔ یہ چوڑا ہاتھی دانت

ہیں۔ فصل اچھی نہ ہوا یا مہاجن کا قرض ادا کرنا ہو تو یہ زیورات گروی رکھ دیئے جاتے ہیں۔

راجستھان میں عموماً اینٹوں کے مکان نہیں بنائے جاتے، کیوں کہ اینٹیں مٹی سے بنتی ہیں اور یہاں مٹی کی قلت ہے۔ یہاں مکانوں میں پتھر کا استعمال ہوتا ہے۔ ارا ولی

پہاڑوں کا سلسلہ راجستھان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا ہوا ہے۔ ان ہی پہاڑوں کا پتھر عمارتیں بنانے کے کام آتا ہے۔ پتھروں سے بنے ہوئے مکان بہت مضبوط ہوتے ہیں۔ جودھ پور راجستھان کا ایک خوب صورت شہر ہے۔ یہ شہر ان ہی زرد پتھروں سے بنایا گیا ہے۔

ریگستان میں پانی زندگی کی علامت ہے اور خشک سالی موت کی۔ ریگستان میں پانی پہنچانا بہت دشوار ہے۔ آزادی کے بعد حکومت نے راجستھان میں نہر بنانے کا منصوبہ بنایا۔ یہ نہر مکمل ہونے کے بعد ۴۰۰ میل لمبی ہوگی۔ دریائے ستلج کا پانی اس نہر کے ذریعے راجستھان کے دور دراز علاقوں تک پہنچ جائے گا، اور ریگستان کی صدیوں کی پیاس ختم ہو جائے گی۔





انتظار کی قیدی

کہکشاں انجم



جیسے صدیاں گزر گئیں ــــ

ہاں، جیسے صدیاں گزر گئیں، مگر میرے خوابوں کو حقیقت کی دنیا نہ ملی۔ میرے خواب، ادھورے خواب اپنی تعبیر کے لئے مچل مچل گئے۔ پہلے تو بڑی اُمنگوں اور چاہتوں کے ساتھ میں نے انتظار شروع کیا تھا، رنگین سپنے سجاکر، آرزوؤں کا سنہرا جال بُنا تھا۔ لیکن برسوں کے انتظار کے بعد اب بھی میرے خوابوں کا شہزادہ کہاں تھا؟ کس نگری میں گم تھا؟ میں تو آج بھی وہیں تھی۔ جہاں سے چلی تھی۔ ابّا میرے خوابوں کے شہزادے کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک چکے تھے، امّی کی تمام دعائیں بے کار ہو چکی تھیں، لیکن انتظار تھا کہ ختم نہیں ہو رہا تھا۔ میرا وہ ان دیکھا انجانا شہزادہ سوچ ہی نہیں رہا تھا کہ سہاگ کا جوڑا، بھری بھری گداز کلائیوں میں زیب دیتا ہے، سوکھی ہڈیوں میں نہیں۔ سنہری افشاں، سیاہ گھٹاؤں میں سجتی ہے، سفید بادلوں میں نہیں۔ اور وقت ہے کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ میرے لئے رُکنے کی اُسے فرصت کہاں ہے؟

بہت پہلے ابّا نے مجاز کو تلاش کیا تھا۔ ہر طرح اُسے پرکھا، دیکھا، اور خوش ہوئے کہ اُن کی لاڈلی کو یہ شہزادہ سکھ کے محلوں میں رکھے گا۔ مگر شہزادے نے اِدھر دیکھا بھی نہیں۔ اُسے سُنہری پری درکار تھی۔

اُس کے بعد یوسف، ناصر کاظمی جانے کتنوں کے دروازے کھٹکائے گئے سب ہی سُنہری پری کے پرستار نکلے۔ پھوپوں کی شہزادی کی اُن کی نظر میں کوئی حقیقت نہ تھی۔ میں اپنے شہزادے کا انتظار کر کرکے پاگل ہو اُٹھی۔ پھر جانے کے لئے کیا ہوا، کہ سنا کوئی واقعی مجھے اپنانے کے لئے آرہا ہے۔ امّی جیسے ایک دم ساری فکروں کے بوجھ سے ہلکی ہو گئیں۔ ابّا کا جھکا ہوا سر غرور سے تن گیا کہ ان کی کوششیں بار آور ہوئیں۔ کنواریوں کے ارمان گیت بن کر کانوں میں رس گھولنے لگے، خوشیوں کے جذبات دھڑکن کی تھاپ بن کر اُبھرنے لگے ــــ میں نے سکھ کی سانس لی کہ میرا انتظار تو ختم ہوا۔ اور ارشی نے یہ خبر سنائی ــ "آنے والے شہزادے کو اپنا وارث چاہئے، اسی لئے وہ اپنی قیمت مانگے بغیر تم سے دوسری شادی کر رہا ہے۔" میرے

تصوّر کا شیش محل ایک چھناکے سے ٹوٹ گیا، اور برسوں کی سوئی ہوئی شہزادی اچانک جاگ گئی۔

میرا حاصلِ زندگی وہ لمحہ ــــ جب خوابوں کا فریب زدہ حصار توڑ کر میں آزاد ہو گئی۔ شہلا کہہ رہی تھی "ہائے نازش، ہم لڑکیاں کتنی مجبور ہیں، جو کسی کے خوابوں کو توڑ کر، کسی کی چاہتوں کو ٹھکرا کر اپنے مطلب کے لئے بھی آئے تو ہم اسے اپنانے پر مجبور ہوتے ہیں۔"

"نہیں نہیں شہلا، یہ نہ کہو۔" میں تڑپ سی گئی "میں بجیا نہیں ہوں جو میری طرح ایک عمر تک شادی کے انتظار میں زندگی کے قیمتی لمحات، گنوا کر بھی الطاف جیسے ناکارہ انسان کو اپنے خوابوں کا دیوتا بنا کر آج تک دکھوں کے ریگ زار میں پیار کی پیاس لئے بھٹک رہی ہے۔ میں اب تک سوئی ہوئی تھی۔ فرسودہ روایات نے مجھے جکڑ رکھا تھا۔ امی کے دقیانوسی نظریات اور غلط تربیت نے مجھے پھول کے سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ پھول جس کا مقصدِ حیات بس کسی کا شانے کی زینت بننا ہو۔ مجھے خود کبھی احساس نہ ہوا کہ میں پھول سے وہ شمع بھی بن سکتی ہوں جو آندھیوں میں جل کر روشنی بکھیرتی ہے۔

میں تو پتھر کی گڑیا بنی، اپنے خریدار کی منتظر رہی، اپنی زندگی کے قیمتی ماہ و سال گنواتی رہی ہوں۔ اپنے بُنے ہوئے جال میں اُلجھ کر انتظار میں، یہ ان مول زندگی لُٹانے کی بجائے کتنے ہی تعمیری کاموں میں لگ کر بوجھ بننے کے بجائے میں بوجھ اُٹھا بھی سکتی ہوں۔

لیکن آج سارے بندھن ٹوٹ گئے سارا تصوّر بکھر گیا۔ میں سپنوں کے سحر سے آزاد ہو گئی ہوں۔ اب مجھے نہ بکنا ہے، نہ خوابوں کا شہزادہ خریدنا ہے۔

مجھے خوابوں کا ان دیکھا، البیلا شہزادہ نہیں چاہئے، مجھے صرف جیون ساتھی کی، تلاش ہو گی، جس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر، ہر نشیب و فراز سے گزر کر، اپنی تمناؤں اپنی آرزوں کو حقیقت کا رنگ دینے کے لئے مجھے جدوجہد کرنا ہو گی۔

اور میرے ساتھ قدم سے قدم ملا کر، زندگی کے سفر میں ساتھ دینے والا ساتھی، جب بھی، جس موڑ پر بھی مجھے ملا میں اُسے اپنا لوں گی۔ اُس کے انتظار میں خود کو برباد نہ کروں گی۔



اُس نے انسانیت کی خدمت کے لئے اپنی جان دے دی

اس نے اپنی جان کی قربانی دے دی لیکن جھوٹ نہیں بولا۔ وہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بلجیم کے اسپتال میں کام کر رہی تھی. جہاں اُسے جرمنوں نے گرفتار کر کے گولی ماردی۔ اس بہادر عورت کا نام تھا ایڈیتھ کیویل

ایڈیتھ کیویل ۱۸۵۶ میں انگلستان میں پیدا ہوئی۔ وہ ایک سیدھی سادی غریب لڑکی تھی۔ اس کا باپ گاؤں کا پادری تھا۔ یہ لوگ بہت مہمان نواز تھے. گھر میں جو کچھ رُوکھی سُوکھی ہوتی، اپنے غریب پڑوسیوں کے ساتھ مل بانٹ کر کھلیتے اگر کبھی گھر میں گوشت پکتا تو کسی غریب دیہاتی کو کھانے میں شریک کرلیتے۔ اتوار کا دن ایڈیتھ سے کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ اس کا باپ کٹر عیسائی تھا۔ عیسائی اتوار کے دن کوئی کام نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ اتوار کے دن کھیل کود بھی منع ہے۔ اتوار آرام کا دن ہے۔ اس دن ایڈیتھ کی گڑیاں الماری میں رکھ دی جاتیں اور اس میں تالا لگ جاتا یہاں تک کہ کتابیں اور کشیدہ کاری کا سامان بھی مقفل کر دیا جاتا۔

ایڈیتھ کو انسانیت کی خدمت کا شوق تھا۔ اُس کا اندازہ اس کے بچپن کے ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ ایک رات اُس کے ماں باپ آپس میں گفتگو کر رہے تھے اُس کا باپ چاہتا تھا کہ گاؤں میں ایک اسکول کھولا جائے، لیکن اسکول کی بلڈنگ کے لئے روپیہ نہیں تھا۔ ایڈیتھ دوسرے کمرے سے اُن کی گفتگو سن رہی تھی۔ اُس نے دوسرے روز نورویچ کے بڑے پادری کو ایک خط لکھا۔ اس خط میں اُس نے پادری سے درخواست کی کہ اس کے گاؤں میں ایک اسکول قائم ہونا چاہئے پادری ایک ۱۲ سالہ لڑکی کا بچکانہ خط پڑھ کر مُسکرایا ہوگا۔ لیکن اس نے ایڈیتھ کو جواب میں خط لکھا کہ اگر اُس کے گاؤں کے لوگ چندہ کر کے ایک معقول رقم فراہم کریں تو وہ اتنی ہی رقم اُس میں شامل کر کے اسکول بنوا دے گا۔ جب یہ خط ایڈیتھ کو ملا تو اُس کا باپ حیران رہ گیا۔ اُس نے ایڈیتھ کو ڈانٹا اور اُسے بڑے پادری کو ایسا خط لکھنے پر سخت و سُست کہا۔ لیکن ایڈیتھ ہار ماننے والی نہیں تھی۔ وہ پادری کا خط پڑھ کر بہت خوش ہوئی اور روپیہ جمع کرنے میں لگ گئی۔

ایڈیتھ کو تصویریں بنانے کا شوق تھا۔ اس نے واٹر کلر سے سیکڑوں تصویریں بناڈالیں۔ یہ

تصویریں اُس کے گاؤں کے درختوں اور عمارتوں کی تھیں۔ کرسمس اور ایسٹر کے تہوار پر اُس نے یہ تصویریں لوگوں کو بھیجیں اور اُن سے اسکول کے لئے چندے کی اپیل کی۔ اس کے باپ نے ان تصویروں کے ساتھ ایک خط لکھ دیا، جس میں لوگوں سے چندہ طلب کیا گیا۔ اُس کی ماں نے لفافوں پر پتے لکھے۔ لوگوں پر اس اپیل کا خاطر خواہ اثر ہوا اور چندہ جمع ہونا شروع ہوگیا۔ سال بھر میں خاصی رقم جمع ہوگئی۔ ایڈیتھ نے پادری کو دوسرا خط لکھا، اور اسے اپنا وعدہ یاد دلایا۔ پادری قول کا پکا تھا۔ اسکول کی عمارت تیار ہوگئی۔

ایڈیتھ نے اپنے بہن بھائیوں کی طرح اپنے باپ سے ہی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ وہ پڑھنے لکھنے میں اتنی ہوشیار تھی کہ باپ نے اسے ایک بورڈنگ اسکول میں داخل کرا دیا۔ اسکول میں اُس نے فرنچ زبان سیکھی۔ اسے جلد ہی اس زبان پر عبور حاصل ہوگیا۔ جب اُس نے اپنی تعلیم مکمل کر لی تو باپ نے اس سے پوچھا کہ وہ آئندہ زندگی میں کیا کرنا چاہتی ہے۔ اُس نے جواب دیا "مجھے نہیں معلوم کہ میں کیا کرنا چاہتی ہوں، لیکن اتنا جانتی ہوں کہ میری زندگی انسانیت کی خدمت کے لئے وقف ہوگی۔"

اس زمانے میں لڑکیوں کے لئے ملازمت کے دروازے بند تھے۔ عورتوں کا کام کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس کے اسکول کی ہیڈ مسٹریس نے اُسے مشورہ دیا کہ وہ گورنس بن جائے۔ ایک رئیس کو اپنے بچّوں کے لئے گورنس کی ضرورت تھی۔ ایڈیتھ اس کام کے لئے راضی ہوگئی۔ اُس نے اس رئیس کے گھر میں سات سال کام کیا۔ بچّے بڑے ہوگئے تو اُس کا کام ختم ہوگیا۔ وہ پھر اپنی پرانی ہیڈ مسٹریس کے پاس گئی۔ ہیڈ مسٹریس نے اُسے ایک خوش خبری سنائی بیلجیم کے دارالخلافہ برسلز میں ایک رئیس مسٹر فرانسوا کو ایک گورنس کی ضرورت تھی۔ ایڈیتھ کو فرنچ زبان پر عبور حاصل تھا۔ ایڈیتھ یہ سن کر بہت خوش ہوئی اور اس نے برسلز جانے کی تیاری شروع کر دی۔

برسلز ایک خوب صورت شہر ہے۔ یہ 'چھوٹا پیرس' کہلاتا ہے۔ ایڈیتھ کیویل نے مسٹر فرانسو کے چاروں بچّوں کو پڑھانا شروع کر دیا۔ اس زمانے میں بیگم فرانسوا کے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایک دن انہوں نے ایڈیتھ سے کہا کہ اگر کوئی مجھ سے ملنے آئے تو کہہ دینا کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔ ایڈیتھ نے حیرانگی کے عالم میں پوچھا "لیکن مادام! میں کیسے کہہ سکتی ہوں کہ آپ گھر پر نہیں ہیں جب کہ آپ گھر پر موجود ہیں۔" بیگم فرانسوا شرمندہ ہوگئیں۔ انہوں نے ایڈیتھ کو سمجھایا کہ یہ جھوٹ سفید ہے، سیاہ نہیں۔ مگر یہ سب بے سود تھا۔ ایڈیتھ کو سچ بولنے کی تربیت دی گئی تھی اور وہ اس معاملے میں کسی قسم کا سمجھوتا کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔

ایڈیتھ کیویل برسلز میں پانچ سال رہی۔ یہ پانچ سال اُس کی زندگی کے بہترین سال تھے۔ اس کے بعد وہ انگلستان واپس آگئی۔ اس کا باپ سخت بیمار تھا۔ اُس نے ایک سال تک باپ کی تیمار داری کی۔ وہ صحت یاب ہوگیا۔ باپ کی تیمارداری کے دوران اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ نرس بنے گی۔ اسے اپنی منزل کا سُراغ مل گیا تھا۔

ایڈیتھ کے خاندان نے اُس کے فیصلہ کی پُرزور مخالفت کی۔ اُس زمانے میں نرسنگ کا پیشہ بُرا سمجھا جاتا تھا۔ سوسائٹی میں نرسوں کو بُری نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اُن کی ڈیوٹی بہت سخت تھی۔ تنخواہ برائے نام تھی۔ انہوں نے اُسے مشورہ دیا کہ وہ گورنس کا پیشہ نہ چھوڑے۔ لیکن ایڈیتھ کا فیصلہ پتھر کی لکیر تھا۔ اُس نے نرسنگ اسکول میں داخلہ لے لیا۔ جب اُس نے نرسنگ کی تربیت مکمل کر لی تو اُسے اپنی تربیت کو آزمانے کا موقع مل گیا۔ انگلستان کے ایک شہر میں ٹائی فائیڈ پھیل گیا۔ لوگ جانوروں کی طرح مرنے لگے۔ ایڈیتھ اس علاقے میں گئی۔ اُس نے اسکول کی عمارت کو اسپتال میں تبدیل کر دیا۔ اُس سے بھی کام نہیں چلا تو اس نے خیمے لگوائے، مریضوں کی تیمار داری کی، صفائی کا انتظام کیا اور کچھ ہی دنوں میں وہاں کی حالت سُدھر گئی۔

ایڈیتھ کئی سال تک انگلستان کے ہسپتالوں میں کام کرتی رہی۔ وہ نرسنگ کے اسکول کی مہتمم بن گئی۔ اُس زمانے میں اُس کے لئے برسلز سے پھر بلاوا آگیا۔ برسلز کے ڈاکٹر ڈی پاج نے اسے وہاں کے نرسنگ اسکول کو چلانے کی دعوت دی۔ ایڈیتھ فوراً ہی برسلز روانہ ہوگئی۔ برسلز نرسنگ کے معاملے میں لندن سے پیچھے تھا۔ وہاں نرسوں کا سرے سے وجود ہی نہیں تھا۔ گرجا کی راہبائیں ہی مریضوں کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ یہ راہبائیں نرسنگ سے نابلد ہوتی تھیں اور مردوں کی دیکھ بھال کرنے سے بھی گھبراتی تھیں۔ راہبائیں گرجا کی کنواریاں ہوتی ہیں۔ یہ تمام عمر کنواری رہتی ہیں۔ ڈھیلا ڈھالا سیاہ لباس پہنتی ہیں۔ اُن کے سر کے بال ہمیشہ ڈھکے رہتے ہیں۔ اُن کا کام عبادت اور انسانیت کی خدمت ہوتا ہے۔ لیکن یہ عورتیں مردوں کا لباس بدلواتے وقت گھبرا جاتی تھیں۔ نرس ایڈیتھ کیویل نے ان کنواریوں کی جگہ تربیت یافتہ نرسیں رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

نرسوں کا لباس عام عورتوں سے علیحدہ ہوتا ہے۔ ایڈیتھ نے برسلز میں بھی انگلستان کی نرسوں کا لباس رائج کیا۔ نرسیں اس لباس سے فوراً پہچان لی جاتی تھیں۔ بازار میں اُن کا مذاق اُڑایا جاتا۔ لوگ

ان پر آوازے کستے۔ نرسیں رات کی ڈیوٹی سے گھبرائیں مگر ایڈیتھ نے ان رکاوٹوں کی پروا نہیں کی۔ پہلے نرسیں مریضوں کی مرہم پٹی کے سوا کچھ نہ کرتی تھیں۔ اگر مریض چاہتا کہ نرس اُس کا سر دُھلادے یا اس کے بالوں میں کنگھی کر دے تو اُسے نرس کو رشوت دینا پڑتی۔ ایڈیتھ نے یہ سارا دستور بدل دیا۔ اب مریضوں کو چھوٹے موٹے کاموں کے لئے رشوت نہیں دینا پڑتی تھی۔

ایڈیتھ برسلز میں کئی سال رہی۔ اس دوران وہ کئی بار انگلستان چھٹیاں گزارنے آئی۔ اگست ۱۹۱۴ میں وہ انگلستان میں ہی تھی کہ جنگِ عظیم چھڑ گئی۔ اُس کی ماں نے اُسے برسلز جانے سے منع کیا۔ وہ انگلستان میں محفوظ تھی۔ اسے برسلز میں اپنی جان کو خطرہ میں ڈالنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن ایڈیتھ نے اپنی ماں کی ایک نہ سنی اور فوراً برسلز پہنچ گئی۔ اس کے برسلز پہنچتے ہی بیلجیم کے بادشاہ نے جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ جرمنی نے جنگ چھڑنے کے پندرہ دن کے اندر اندر بیلجیم پر قبضہ کرلیا۔ ایڈیتھ نے جنگ کی تباہ کاریاں اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ اُس کا اسپتال زخمیوں سے بھر گیا۔ ہر جگہ زخمیوں کی بھیڑ تھی، ہر طرف جرمنوں کے ظلم و ستم سے ستائے ہوئے لوگ تھے، غریبی اور بھوک تھی۔ لوگوں کا کاروبار تباہ ہوگیا تھا۔

جرمنی نے بیلجیم کے ہزاروں سپاہیوں کو قید کرلیا تھا۔ لیکن ابھی کچھ سپاہی جرمن سپاہیوں کے ہاتھ نہیں آئے تھے۔ وہ جنگلوں میں بھوکے پیاسے پھر رہے تھے۔ یہ مفرور سپاہی چپکے سے برسلز پہنچ جاتے اور ایڈیتھ کے اسپتال میں علاج کے لئے داخل ہو جاتے۔ یہاں اُن کا علاج ہوتا، ان کو بھرپور غذا ملتی۔ لیکن سوال یہ تھا کہ وہ اسپتال سے نکل کر کہاں جائیں۔ جرمنوں کا حکم تھا کہ ہر زخمی اسپتال سے صحت یاب ہو کر پولیس ہیڈکوارٹر پہنچے وہاں سے اُسے قیدیوں کے کیمپ میں بھیج دیا جاتا۔ وہاں اُن سے جانوروں سے بدتر سلوک کیا جاتا تھا۔ بیلجیم کے لوگوں نے ان زخمی سپاہیوں کو جرمنوں کے پنجے سے بچانے کے لئے ایک ترکیب نکالی۔ وہ لوگ ان سپاہیوں کو شہری لباس پہنا کر ہالینڈ روانہ کر دیتے۔ بھیڑ بھاڑ میں یہ لوگ پہچانے نہیں جاسکتے تھے۔ ہالینڈ غیر جانب دار ملک تھا۔ سپاہی وہاں پہنچ کر جرمنوں کی دست برد سے محفوظ ہو جاتے۔ بیلجیم میں میڈم ایکس کا نام مشہور ہوگیا۔ یہ پُراسرار خاتون ان سپاہیوں کی مدد کرتی اور اُن کو بحفاظت سرحد پار پہنچا دیتی۔

یہ وقت نرس کیویل کے لئے بڑا صبر آزما تھا۔ ایک طرف جرمنوں کا حکم تھا کہ ہر سپاہی کو اسپتال سے ڈسچارج کرتے وقت پولیس ہیڈکوارٹر جانے کی ہدایت دی جائے۔ دوسری طرف کیویل کے ضمیر کی آواز تھی جو ان سپاہیوں کو میڈم ایکس کے گھر بھیجنے پر مجبور کرتی تھی۔ اس نے زندگی بھر جھوٹ نہیں بولا تھا۔ وہ کیا کرے؟ آخر اُس نے ایک ترکیب نکالی۔ اس نے نرسوں کو ہدایت دی کہ جب سپاہی صحت مند ہو کر اسپتال سے نکلے تو اُسے دونوں راستے بتا دیں۔ پہلا راستہ پولیس ہیڈکوارٹر اور دوسرا راستہ مادام ایکس کے گھر کو جاتا تھا اس طرح وہ جرمنی کی پولیس کو مطمئن کرسکتی تھیں یہ جنگ کا زمانہ تھا۔ مفرور سپاہیوں کو دونوں ٹھکانے بتا دینا اتنا خطرناک نہیں تھا جتنا اُن کو اسپتال میں پناہ دینا اور جرمن پولیس کی نگاہوں سے چھپا کر رکھنا تھا۔ ایڈیتھ نے یہ خطرہ مول لینے کا فیصلہ کرلیا۔

ایک دن ایڈیتھ کیویل کے پاس ایک خط آیا۔ خط لکھنے والے دو انگریز فوجی افسر تھے۔ وہ زخمی تھے۔ انہوں نے ایک گرجا میں پناہ لی تھی۔ جرمن پولیس بھیڑیوں کی طرح اُن کو تلاش کررہی تھی۔ کیا ایڈیتھ چند روز کے لئے انہیں اسپتال میں پناہ دے سکتی تھی؟ ایڈیتھ کے لئے فیصلہ کن گھڑی آپہنچی تھی۔ اس کا کام زندگی کو بچانا تھا۔ وہ فوراً اُن سپاہیوں کی مدد کے لئے آمادہ ہوگئی۔ اُس نے کئی روز تک ان سپاہیوں کو اسپتال میں چھپائے رکھا، ان کا علاج کیا اور ان کو بحفاظت سرحد پار بھیج دیا۔ ان سپاہیوں نے اسے شکریہ کا خط لکھا۔ اس خط نے ایڈیتھ کی زندگی کا رُخ بدل دیا۔ وہ سپاہیوں کو اسپتال میں چھپانے اور انہیں سرحد پار بھجوانے کے کام میں جی جان سے منہمک ہوگئی۔

یہ کام بہت خطرناک تھا جرمن پولیس وقتاً فوقتاً اسپتال پر چھاپا مارتی رہتی تھی۔ انہیں شک ہوگیا تھا کہ اسپتال میں قیدی چھپے ہوئے ہیں لیکن ایڈیتھ بڑی ہوشیاری سے کام لیتی اور جرمن پولیس ناکام واپس چلی جاتی۔ پھر جرمنوں نے مفرور سپاہیوں کو پکڑنے کے لئے ایک چال چلی۔ انہوں نے کچھ جاسوس مفرور سپاہیوں کے بھیس میں اسپتال بھیجے۔ ایڈیتھ کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ وہ اصلی اور نقلی کا فرق پہچان لیتی۔ اُس نے انہیں بھی پناہ دی۔ ان جاسوسوں نے اُس کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ ایک دن جرمن پولیس نے ایڈیتھ کو گرفتار کرلیا۔ مفرور سپاہیوں کی مدد کرنے والی ٹولی گرفتار کرلی گئی۔ یہ لوگ تعداد میں تیس تھے۔ ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ مقدمے کے دوران ایڈیتھ کی ایک شریکِ کار مسز وِلکنس بہانے بنا کر الزام سے بری ہوگئی لیکن ایڈیتھ نے عدالت میں سچ بولا۔ اُس نے کہا: "میں نے واقعی قیدیوں کو سرحد پار بھجوانے میں مدد

کی تھی۔ میں ایک نرس ہوں۔ میرا کام زندگی کو بچانا ہے۔" ایڈیتھ کے اس بیان پر عدالت میں سنسنی پھیل گئی۔ ایڈیتھ چاہتی تو جھوٹ بول کر اپنی جان بچا سکتی تھی۔ لیکن اُس نے زندگی بھر جھوٹ نہیں بولا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ یہ بیان دے کر موت کو دعوت دے رہی ہے لیکن اُس نے پروا نہیں کی۔ جرمن عدالت نے اُس کے لئے موت کی سزا تجویز کی۔

ایڈیتھ کے لئے موت کی سزا کا اعلان سنتے ہی ساری دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ ایڈیتھ کی ماں نے جب یہ اعلان سُنا تو اُس نے امریکہ کے صدر کو خط لکھا۔ صدر نے اپنے سفیر کی معرفت جرمنوں سے اپیل کی لیکن جرمن اُسے سزا دینے پر تُلے ہوئے تھے۔ ایڈیتھ کی موت کا وقت قریب آ گیا تھا۔ مرنے سے پہلے اُس نے پادری سے کہا "میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ قوم پرستی کافی نہیں" یہ اُس کے آخری الفاظ تھے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ قوم اور وطن کا تصور انسانیت کے خلاف ہے۔ جرمن اور انگریز ایک ہی تہذیب اور ایک نسل سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن وطن پرستی نے ان کو ایک دوسرے کا دُشمن بنا دیا ہے۔ حب الوطنی بعض اوقات انسانیت کی دشمن بن جاتی ہے۔

۱۲ اکتوبر ۱۹۱۵ کی صبح کو ایڈیتھ اور اُس کے ایک ساتھی کو گولی مار دی گئی۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ جرمن سپاہیوں نے ایک عورت پر گولی چلانے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے اپنی بندوقوں سے ہوائی فائر کئے۔ ایڈیتھ گولیوں کی آواز سُن کر گر پڑی۔ جرمن کمانڈر نے جب یہ ماجرا دیکھا تو اپنا پستول نکالا اور ایڈیتھ کے سینے میں گولی داغ دی۔

ایڈیتھ کی موت کی خبر سُن کر ساری دُنیا میں غم اور غصے کی لہر دوڑ گئی۔ انگلستان میں ... نے اپنے سیاہ پیٹی کوٹ پھاڑ ڈالے اور ان کے ... جھنڈے بنا کر کھڑکیوں سے لٹکائے۔ جرمنوں ... خلاف ناراضگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک دن میں دس ہزار آدمی فوج میں ... ہو گئے۔ لندن کے سینٹ پال گرجا گھر میں ما... تقریب ہوئی بادشاہ اور ملکہ نے اُس میں شرکت کی۔ امریکہ کا موڈ بدل گیا۔ صدر ولسن نے جنگ کی تیاریوں کا اعلان کر دیا۔ اب جرمن گھبرا... اور انہوں نے ایڈیتھ کی موت کے بعد باقی قیدیوں کو رہا کر دیا۔

نرس کیویل نے سچ کی خاطر اپنی جان دے دی۔ اس کی قربانی رائیگاں نہیں گئی۔ کچھ عرصے کے بعد امریکہ بھی جنگ میں شامل ہو گیا اور جرمنوں کو شکست نصیب ہوئی۔ ■■



بزدل



عشرت امیر

اس وقت بارش ہو رہی تھی۔ شام کے ساڑھے پانچ یا چھ بج رہے تھے۔ شاہینہ نیشنل لائبریری کی سیڑھیوں پر سے اُتر رہی تھی۔ اُس کا گورا گورا چہرہ پانی کی بوندوں کے پڑنے سے چمک رہا تھا۔ اس کے بھورے رنگ کے رُوکھے بال جو ہمیشہ اُڑتے رہتے تھے، آج کچھ تھمے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ وہ ہلکے بھورے رنگ کی برساتی پہنے ہوئے تھی۔ ایک لمحے کے لئے وہ سیڑھیوں پر ٹھٹکی، پھر نیچے اترنے لگی۔ کار پارکنگ کے مقام پر اُس نے اپنے ڈیڈی کی کار دیکھ لی تھی — ڈیڈی اس وقت؟ ٹھیک ہی تو ہے۔ بارش ہو رہی ہے اور ڈیڈی بارش میں اُسے لینے ضرور آتے ہیں۔ اُس نے دیکھا، اس کے ڈیڈی گاڑی سے اتر کر اُس کی طرف ہی آ رہے تھے۔ ڈیڈی اب بھی دل کش شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ فوج میں اعلیٰ افسر رہ چکے ہیں، اب ریٹائر ہونے کے بعد انہوں نے اپنا بزنس کر لیا ہے — شاہینہ ریسرچ کر رہی ہے اور اسی سلسلے میں روزانہ لائبریری آتی ہے۔ آج اُس نے عرفان سے وعدہ کر لیا تھا کہ شام کو لائبریری سے فارغ ہو کر وہ اس کے ساتھ گھومنے چلے گی، دونوں کہیں بیٹھ کر کافی پئیں گے، باتیں کریں گے، ذرا اِدھر اُدھر گھومیں گے۔

شاہینہ نے دیکھا، عرفان سیڑھیوں کے پاس کھڑا تھا لیکن اُس سے پہلے کہ عرفان اُس کے قریب آتا، اُس کے ڈیڈی شاہینہ کے پاس آ گئے — انہوں نے عرفان پر ایک حقارت آمیز نظر ڈالی، پھر ناگوار لہجہ میں بولے: "عرفان، تمہارا آنا بے کار رہا۔ میں شاہینہ کو لے جا رہا ہوں۔"

اور — شاہینہ کو ایسا لگا کہ عرفان جو اچھا خاصا سیم شیم اور صحت مند ہے، جیسے بالکل کمزور ہو گیا ہے۔ اُس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ ابھی رو پڑے گا — شاہینہ نے سوچا عرفان بُری طرح نروس ہو گیا ہے — بھلا ڈیڈی کو یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟ اُن کا سارا پروگرام گڑبڑ ہو گیا تھا — شاید عرفان کو پوری شام برباد ہونے کا احساس ہو گا۔

شاہینہ نے بمشکل عرفان سے کہا: "عرفان تم گھر آجانا۔ میں کافی بنا کر تیار رکھوں گی۔"

"اچھا۔" عرفان نے دھیرے سے کہا —

"ارے ہاں، میں بھول گئی — آج رضوانہ اور شکیل نے ہمیں بُلایا ہے، رات کا کھانا کھلانے کی دعوت بھی دی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" عرفان نے کہا اور اپنے اسکوٹر کی طرف چلا گیا۔

شاہینہ کے ڈیڈی گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولے: "تم عرفان کے پیچھے کیوں دیوانی ہو رہی ہو؟ کیا نظر آتا ہے تمہیں اِس دو ٹکے کے نوجوان میں؟ اُسے گھر پر بُلانے کی کیا ضرورت تھی؟"

شاہینہ کو اپنے ڈیڈی پر غصہ آگیا۔ وہ بولی "ڈیڈی آپ عرفان کو دو ٹکے کا کیوں کہتے ہیں؟ کیا غریب لوگ انسان نہیں ہوتے؟ پھر وہ تو جلد ہی انجینئر بننے والا ہے۔"

"جب بنے گا تو دیکھا جائے گا۔" ڈیڈی نے کہا: "ویسے آج تم اُس کے ساتھ اپنی سہیلی کے گھر جارہی ہو، ورنہ میرا اور تمہاری ممّی کا ارادہ تھا کہ آج ہم سب کہیں باہر ہوٹل میں رات کا کھانا کھاتے۔"

"تو کیا ہوا؟ آپ اور ممّی چلے جائیے۔"

"نہیں تمہارے بغیر تمہاری ممّی جانے کو تیار نہیں۔"

"یہ بھی بھلا کوئی بات ہوئی!"

"اس کی وجہ یہ ہے کہ تم ہماری اکلوتی بیٹی ہو۔"

شاہینہ چُپ ہو رہی۔

تھوڑی دیر میں گھر آگیا۔ برآمدے میں شاہینہ کی ممّی کھڑی تھیں۔ شاہینہ کی طرح گوری، لیکن قد میں بہت چھوٹی۔ ایسا لگتا تھا جیسے شاہینہ کی بڑی بہن ہوں — شاہینہ سے اُن کی آنکھیں زیادہ بڑی اور خوب صورت تھیں اور چہرہ بھی کچھ زیادہ ہی چمکتا ہوا تھا۔

"چلئے، چائے تیار ہے۔ آج میں نے خاص طور سے کیک بنایا ہے۔" ماں کی بات کا جواب نہ تو شاہینہ نے دیا اور نہ اُس کے ڈیڈی نے — دونوں کے چہرے دیکھ کر شاہینہ کی ممّی سمجھ گئیں کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ وہ کبھی بیٹی کے چہرے کی طرف دیکھتیں اور کبھی شوہر کے چہرے کی طرف۔ اتنے میں شاہینہ کے ڈیڈی کڑوے لہجے میں بولے: "اس کیک کو حفاظت سے رکھو۔ ابھی تمہارا ہونے والا داماد آئے گا اُسے کھلانا۔"

"عرفان بلا تھا تم لوگوں کو؟"

"ہاں، اس برسات میں تمہاری لاڈلی بیٹی کو اسکوٹر پر بٹھا کر گھمانے کے لئے لے جانے والا تھا۔"

شاہینہ کی ممّی چُپ رہیں۔ وہ جانتی تھیں کہ باپ اور بیٹی کے بیچ میں عرفان آگیا ہے۔ دونوں میں عرفان کے مسئلے پر عجیب سا تناؤ رہتا ہے۔ کس لاڈ پیار سے انہوں نے بیٹی کو پالا تھا۔ وہ شاہینہ کو پڑھنے کے لئے امریکہ بھیجنا چاہتے تھے، لیکن ایم اے کرتے کرتے وہ عرفان کے چکر میں پڑ گئی اور اُس نے ملک سے باہر جانے سے انکار کر دیا — شاہینہ کے ڈیڈی کو اس انکار سے بہت بڑا دھکا لگا تھا — انہوں نے شاہینہ سے کہا تھا: "بیٹی جیسی تمہاری مرضی۔ لیکن اگر بعد میں تم نے محسوس کیا کہ تم نے غلطی کی ہے تو میں اپنی رائے نہیں بدل سکوں گا۔"

اور شاہینہ نے مضبوط لہجہ میں کہا تھا۔ "ڈیڈی، میرا باہر جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔"

اُس کے بعد شاہینہ کے ڈیڈی نے اپنی بیٹی سے عرفان کے سلسلے میں صاف طور سے کبھی کچھ نہیں کہا تھا — اُن کو دل ہی دل میں صدمہ ہے اُس کا اشارہ انہوں نے ضرور دے دیا تھا۔ پھر جب انہوں نے شادی کے بارے میں شاہینہ سے پوچھا تو اُس نے صاف کہہ دیا: "میں نے اپنے جیون ساتھی کا انتخاب کر لیا ہے۔" شاہینہ کے ڈیڈی کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ پوچھیں کہ وہ کون ہے؟ لیکن کچھ ہی دن میں وہ سمجھ گئے تھے کہ عرفان کے سوا وہ کوئی نہیں ہے۔ ان کو عرفان میں ویسے کوئی بُرائی نظر نہیں آئی تھی، لیکن وہ یہ ضرور سوچتے تھے کہ اُن کی اکلوتی بیٹی کے لئے وہ موزوں شوہر نہیں ہے۔ آج کل کی لڑکیاں تو اپنا بُرا بھلا خود سمجھنے لگی ہیں۔ اُن کے ایک دوست کی لڑکی نے ایک بہت امیر لڑکے کو پھانس لیا تھا۔ سب ہی لڑکیاں ہوشیار تھیں، سوا اُن کی بیٹی شاہینہ کے۔

شاہینہ نے دیکھا کہ اُس کی ممّی کچھ مایوس سی ہو رہی ہیں۔ وہ بولی "ممّی، ڈیڈی ٹھیک کہہ رہے ہیں، عرفان آنے والا ہے۔ اس وقت تک ہم لوگ چائے پیتے ہیں۔ اُس کے لئے میں بعد میں کافی بنا دوں گی — چلئے ڈیڈی، غصہ نہ کیجئے۔"

ڈیڈی نے اپنی بیٹی کی طرف نرم نظروں سے دیکھا — بھلا اس نکھٹو کے پیچھے یہ کیوں دیوانی ہو رہی ہے؟ وہ تو اس کے کپڑوں کا خرچ بھی برداشت نہیں کر سکتا۔

شاہینہ ممی سے باتیں کر رہی تھی۔ پھر اچانک وہ بولی "ممی، اگر میں دو ماہ بعد شادی کر لوں تو کیسا رہے؟"

ممی نے اس کے ڈیڈی کی طرف دیکھا پھر مسکرا کر بولیں "بہت اچھا ہے۔ کر لو نا — دیر کس بات کی ہے؟ شادی کی تیاری تو آج کل ایک ہفتہ میں ہو جاتی ہے۔ بس روپیہ ہونا چاہئے۔"

"روپیہ سے کیا ہوگا؟" شاہینہ نے پوچھا۔

"لو اور پوچھو، شادی میں روپیہ نہیں تو کیا پانی لگے گا؟ کیا سمجھتی ہے! برات آئے گی، جہیز تیار ہوگا، گھر مہمانوں سے بھرے گا۔ ان سب چیزوں میں روپیہ خرچ نہیں ہوگا تو پھر اور کیا ہوگا؟"

شاہینہ چپ ہو گئی — عرفان اس طرح کی شادی کی بات مانے گا بھی یا نہیں؟ شاید نہ مانے؟ نہیں، شاہینہ اس کو تیار کر لے گی — پھر اچانک شاہینہ نے ڈیڈی سے پوچھا "ڈیڈی، آپ عرفان کو کیوں نہیں پسند کرتے؟"

"کون کہتا ہے کہ میں اسے پسند نہیں کرتا۔ بس اسے بہت پسند کرتا ہوں، لیکن میں اسے اپنا داماد بنانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔"

"کیوں؟ اس میں کیا کمی ہے؟" شاہینہ کے گلے میں کچھ جل رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا ابھی آنسو نکل پڑیں گے۔

"اس میں سب سے بڑی کمی اس وقت یہ ہے کہ وہ ابھی صرف طالب علم ہے، کچھ کماتا نہیں۔ طالب علم کو صرف تعلیم پر دھیان دینا چاہئے، ابھی سے شادی وادی کے چکر میں نہیں پڑنا چاہئے۔"

"لیکن ڈیڈی، دو برس کے بعد وہ انجینئر ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے، لیکن دو برس تک وہ تمہارا خرچ کس طرح برداشت کرے گا؟ تمہیں کہاں رکھے گا؟"

"کیوں؟ میں جو کماتی ہوں — پھر میری بھی تیار ہے۔ اس کے بعد میری تنخواہ بھی بڑھ جائے گی۔ ہم لوگوں کا آرام سے گزارہ ہو جائے گا۔"

اب شاہینہ کی ممی بولیں "تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کماؤ گی اور وہ کھائے گا۔"

"ہاں ممی آخر اس میں برائی کیا ہے؟"

"یہ تو اچھی بات نہیں — کبھی کسی نے ایسی بات سنی ہے؟"

"ممی آپ تو پرانے زمانے کی باتیں کرتی ہیں۔ آج کل اس میں کوئی برائی نہیں سمجھی جاتی۔ بہت سی لڑکیاں ایسا کر رہی ہیں۔ غیر ممالک میں بھی ایسا ہو رہا ہے۔"

شاہینہ کے ڈیڈی نے کہا "اور کون کر رہا ہے؟ صرف اس کی سہیلی رضوانہ نے ایسا کیا ہے۔ اور تو کسی کے بارے میں میں نے سنا نہیں۔"

شاہینہ کے آنسو پلکوں پر آ گئے تھے۔

شاہینہ کے ڈیڈی میز پر سے اٹھتے ہوئے بولے "میں تمہیں روکوں گا نہیں۔ تم اگر سوچتی ہو کہ تم اس شادی سے خوش رہو گی تو ضرور کرو۔ میں سارا انتظام کر دوں گا۔"

شاہینہ کی ممی چپ بیٹھی رہیں۔ وہ سوچ رہی تھیں، شاہینہ کتنی ضدی ہو گئی ہے۔

اتنے میں عرفان آ گیا۔ شاہینہ کی ممی، اس کے سلام کا جواب دے کر وہاں سے اٹھ گئیں جیسے وہ اسے جتا دینا چاہتی تھیں کہ اس کا یہاں آنا زیادہ اچھا نہیں سمجھا جاتا۔

شاہینہ نے کافی بنائی اور کیک کی پلیٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی "کھاؤ ممی نے بنایا ہے۔"

"تم بھی بنانا جانتی ہو؟"

"نہیں — ابھی تو صرف ماں ہی بناتی ہیں۔ موقع لگا تو ان سے سیکھ لوں گی۔"

"موقع تو تمہارے دروازے پر کھڑا ہے۔"

"خیر دیکھیں گے — اور سناؤ، کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ہوں، کافی ذرا گرم دینا۔ برسات میں بھیگ کر آ رہا ہوں۔ تم تو بڑے باپ کی بیٹی ہو۔ موٹر میں چلی آئیں۔"

"ہاں۔ تمہارے پاس اسکوٹر تھا، ورنہ اپنے ساتھ لے آتی۔"

"تمہارے پاپا مجھے اپنے ساتھ لاتے؟"

"شاید ہاں۔ تم ان سے بلاوجہ ڈرتے ہو۔ ابھی تک تم نے ہم دونوں کے بارے میں ان سے کوئی بات بھی تو نہیں کی ہے۔"

عرفان چپ ہو گیا اور کافی پینے لگا — شاہینہ تیار ہونے چلی گئی۔ جلد ہی لوٹ کر بولی "چلو رضوانہ اور شکیل کے یہاں چلیں گے۔ وہیں محفل جمے گی۔"

عرفان کو کبھی بھی اس کے گھر میں سکون محسوس نہیں ہوتا تھا۔ وہ چلنے کے لئے فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ اتنے بڑے بڑے سجے سجائے کمرے، مگر پھر بھی نہ جانے کیوں ان میں اسے اپنا دم سا گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا — کمروں میں جگمگاتی روشنی کے باوجود اسے یہاں اندھیرا سا معلوم دیتا — شاید یہ اس کے اندر پھیلے ہوئے مایوسی

کے اندھیرے کا ردِعمل تھا۔

رضوانہ اور شکیل کے گھر میں سناٹا تھا۔ باتوں کی آواز نہیں آرہی تھی، رضوانہ خاموش بیٹھی تھی، اور اُس کی آنکھیں سُرخ نظر آرہی تھیں۔ شکیل کا چہرہ بھی اُترا ہوا تھا۔ شاہینہ نے پوچھا "کیا بات ہے؟ تم لوگ اس طرح کیوں بیٹھے ہو؟"

رضوانہ رُندھے گلے سے بولی "تمہیں تو میں نے خود ہی ابھی ابھی فون کیا تھا کہ تم لوگ آج کھانے پر نہ آنا۔ لیکن فون پر تمہارے ڈیڈی ملے۔ تم لوگ وہاں سے چل چکے تھے۔"

"لیکن ہوا کیا؟" عرفان نے پوچھا۔

رضوانہ سسکنے لگی، روتے ہوئے بولی: "شکیل کا آج رزلٹ آگیا ہے۔ کمپارٹمنٹل آیا ہے اب اُسے پھر امتحان دینا پڑے گا۔"

"لیکن ایسا کیوں ہوا؟"

"میری قسمت!" رضوانہ گرج کر بولی "میری قسمت کہنے سے کام نہیں چلتا۔ میں کس مشکل سے نوکری کرکے تمہیں پڑھا رہی ہوں۔ گھر کا سارا خرچ چلا رہی ہوں — یہ سب بھی تم نے کبھی سوچا ہے۔"

"میں مانتا ہوں کہ تم یہ سب کچھ کر رہی ہو" شکیل دبے لہجہ میں بولا۔

"تم اگر اس سے آدھی محنت بھی کر لیتے جتنی میں کرتی ہوں تو امتحان میں پاس ہو سکتے تھے۔ مُفت میں جب کھانے کو مل جاتا ہو، ہر طرح کا عیش و آرام مل رہا ہو، تو تمہیں ضرورت بھی کیا ہے محنت کرنے کی؟ پاس نہ ہونے سے تمہارے لئے کیا فرق پڑتا ہے؟"

شاہینہ نے رضوانہ کی طرف دیکھا۔

اُس کا خوبصورت چہرہ مسخ ہو گیا تھا۔ اتنے اوچھے الفاظ اُس کے مونہہ سے اچھے نہیں لگ رہے تھے۔

شکیل کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔ "میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ ہم لوگ شادی اس وقت کریں گے جب مجھے نوکری مل جائے گی۔ تم ہی نہیں مانی تھیں۔"

"بس بس، اپنی صفائی رہنے دو۔ تمہیں میری محنت اور اپنی ذمہ داریوں کا خیال ہوتا تو تم کبھی فیل نہ ہوتے۔"

شاہینہ اور عرفان ہکا بکا اُن کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس کے بعد رضوانہ جو کچھ بھی سخت سے سخت الفاظ کہہ سکتی تھی، اُس نے کہے اور شکیل نے بھی تیز لہجے میں جواب دیا۔ شکیل نے آخر میں کہا: "تم نے محبت کے نام پر مجھے پھنسا لیا۔"

عرفان نے سنجیدہ ہو کر شاہینہ سے کہا۔ "اب چلو۔ یہاں رُک کر کیا کرو گی؟"

راستے بھر عرفان چُپ رہا۔ شاہینہ اپنی کار میں آئی تھی۔ راستے میں شاہینہ نے عرفان کا ہاتھ تھامنا چاہا، لیکن عرفان نے فوراً ہاتھ دوسری طرف کر لیا۔

شاہینہ کے گھر آنے پر عرفان اپنا اسکوٹر لے کر فوراً ہی چلا گیا۔ شاہینہ کا مُوڈ بھی بگڑ گیا تھا — وہ بار بار سوچتی، کیا وہ بھی رضوانہ کی طرح عرفان سے یہی سب کچھ کہے گی؟ "تم نہیں جانتے، میں کس مشکل اور محنت سے کما کر لاتی ہوں تم نہیں جانتے، مجھے کس کس کی خوشامد کرنا پڑتی ہے اور کیا کیا سہنا پڑتا ہے۔"

شاہینہ کے دل پر جیسے ہتھوڑے پڑ رہے تھے، کیا عورت کی عزت اسی میں ہے کہ پہلے باپ کے اور پھر شادی کے بعد شوہر کی دست نگر رہے اور اگر خود کفیل ہو تو شوہر کو نیچا دکھائے؟ چھی چھی! رضوانہ تو بہت آئیڈیل بنتی تھی۔ اب اسے کیا ہوا!

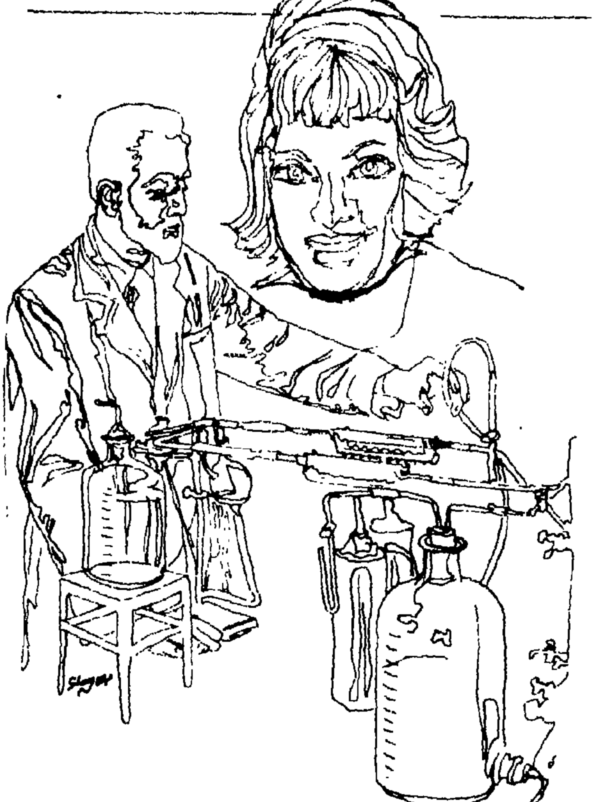
شاہینہ کو رات بھر نیند نہیں آئی — صبح کو وہ بہت دیر سے اُٹھی۔ اُس کے ڈیڈی اُس کے کمرے میں آئے اور بولے یہ خط عرفان نے بھجوایا ہے۔

شاہینہ نے خط لے لیا — عرفان نے شاہینہ کے ڈیڈی کو لکھا:

میں آج تک آپ کی عزت نہیں کر سکا، لیکن آج رضوانہ اور شکیل کے گھر جا کر دیکھا تو پتہ لگا کہ آپ جو کچھ کہتے ہیں وہ صحیح ہے۔ مجھے کبھی آپ سے اس مسئلے پر بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن شاہینہ کے ذریعہ میں آپ کے خیالات سے آگاہ ہو گیا تھا۔ ہمارے جیسے مستقبل کی اُمید آپ کرتے ہیں، وہ ہم نے کل اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔ آپ شاہینہ کو باہر پڑھنے کے لئے بھیجنا چاہیں تو ضرور بھیجیں، اور اگر شادی کرنا چاہیں تو بھی مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ وہ جہنم جو کل ہم لوگ دیکھ آئے ہیں، مجھے منظور نہیں۔ شاہینہ کو میں دو ایک دن میں ہمت کرکے سمجھا لوں گا۔

آپ کا عرفان

شاہینہ کو ایسا لگا جیسے زمین گھوم رہی ہے! ○○



دل کی موت

سعادت نظیر

ملا ہوئی تھی جسے لغتِ غمِ وجداں
کھلا ہوا ہے تباہی پہ آج وہ انساں
ستم تو یہ ہے کہ احساسِ زندگی نہ رہا
وفا کو ناز تھا جس پہ وہ رنگ ہی نہ رہا

شعورِ غم کی کمی سے عجیب اُلجھن ہے
جو آدمی ہے، وہی آدمی کا دشمن ہے
بات عقل کی ہے یاد، رنج کا ہے خلل!
ہے آج شعور سے محو بنانے حسنِ عمل

سلام نہ اب ایسے دورِ حکمت کو
بدل دیا ہے جہنم سے جس نے جنت کو
بنا سکے جو بشر نے نئے نئے خنجر
جو چلتے جاتے ہیں انسانیت کی گردن پر

عجیب اس کی طبیعت، عجیب فطرت ہے
بدل گیا ہے بہت آدمی، قیامت ہے!
یہ آج فلسفہ تو جھٹلانے والا ہے
یہ اب محال کو ممکن بنانے والا ہے

اسے ہے فکر ستاروں سے دُور جانے کی
یہی بتاتی ہے تاریخ ہر زمانے کی

کسی زمانے میں تھا "نور" ایک دانش مند
پہنچ چکی تھی بہت دُور جس کے فن کی کمند
وہ فیلسوف تھا، عالم تھا، صاحبِ زر تھا
خدا کے فضل سے سب کچھ اُسے میسر تھا

ہمیشہ منزلِ حکمت تھی اس کے پیشِ نظر
کہ رفتہ رفتہ ہوا پیشوائے اہلِ ہنر
کمالِ علم و ہنر و رنج و عمل میں فرزانہ
وفورِ جذبۂ حُبِّ وطن میں دیوانہ

ایسی صفات و کمالِ علوم آئینہ
نگاہ جس کی تھی محرومِ عاقبت بینی
بہار بخشِ تحقیق تھی خرد افروز
مگر تھی دل میں تعصب کی آگ یکسو

جنونِ حرص و ہوس نے کیا کچھ ایسا اثر
کہ اندھے ہو گئے اُس کے نگاہِ فکر و نظر
اسی خیال میں رہتا تھا گم وہ آٹھ پہر
تمام کُرۂ ارض میں تسخیر ہو تو ہو کیوں کر

علاوہ کرۂ ارضی کے خلا سے اُدھر
کروں میں کیسے مسخر نجوم و شمس و قمر؟
بہت حسین تھا پیکروں کے بن میں اس کا گھر
ہر ایک گوشہ رنگین تھا جس کا خوش منظر

زمین پہ اس نے بنائی تھی ایک تجربہ گاہ
مفکرین کی ٹھہری ہوئی تھی جس پہ نگاہ
بہ رنگِ تازہ، بہ انداز نو، بہ قدرتِ فن
مآلِ کار سے غافل اور اپنی دھن میں مگن

وہ تجربے وہیں ہر بار یوں کیے کرتا تھا
نئے نقوش میں رنگِ خیال بھرتا تھا
تماشہ دیکھتی تھی چھپ کے اُس کی نورِ نظر
بنی تھی پیکرِ حیرت وہ آئینہ پیکر

وہ فیلسوف نہ تھا ایک روز معمل میں
وہی اکیلی تھی انسانیت کے مقتل میں
اُبھر کے ذہن میں اشکال نو بہ نو آئے
اور اس کے ذوقِ تجسس نے پاؤں پھیلائے

غریب تجربہ گاہ و جہد کو دیکھتی تھی
قریب و دور فریبِ نظر کو دیکھتی تھی
کہاں وہ تجربہ گہ، اور کہاں وہ اک دختر
ہوا جو ایک دھماکا تو ہو گیا محشر

زمیں کے سینے میں طوفان آگ کا اُٹھا
فغاں کہ ہو گئی اک پل میں شعلہ پوش فضا
بس ایک شعلۂ جوّالہ تھا تمام مکاں
اک آسماں تھا تہہِ آسماں کہ اس کا دھواں

جھلس کے رہ گئی وہ نخل پھول سی لڑکی
گری خود اپنے ہی خرمن پہ عقل کی بجلی
چراغ گھر کا بجھا اور روشنی نہ رہی
وہ شعبدے نہ وہ تخئیل کی بت گری نہ رہی

وہ انجمن نہ رہی، صاحبانِ انجمن نہ رہی
طلسم کاریِ نقش و نگارِ فن نہ رہا
یہ حادثہ تھا کہ جاگ اُٹھے "نور" کے جذبات
بدل دیا غمِ دوراں سے اعتبارِ حیات

تصرفاتِ دماغی کا یہ مآل ہوا
کمالِ فکر و نظر باعثِ زوال ہوا
کہیں خرد کے لیے امتحاں نہ ہو جائیں
کچھ اور پھول بھی نذرِ خزاں نہ ہو جائیں

نظر کے سامنے انسانیت کی دنیا ہے
خلوصِ درد کا یہ جاں فزا تقاضا ہے
گداز دل بھی فروغِ ہنر کے ساتھ رہے
شعورِ درد شعورِ نظر کے ساتھ رہے

نظر فروز جو ہو گی سحر کی رعنائی
اُٹھے گا خواب سے انساں لے کے انگڑائی
حسین ہے رُخِ تعمیرِ فکرِ آدم کا
خطوطِ درد سے نقشا بنے گا عالم کا

اِک

سے

میں



ثریا رحمان

موسیقی اور شاعری کا چولی دامن کا ساتھ ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ دونوں خوبیاں شاذ و نادر ہی ایک انسان میں جمع ہوتی ہیں۔ ثریا رحمان اُن گنے چنے انسانوں میں ہیں جن کی ذات میں دونوں فن یک جا ہوگئے ہیں۔

مثل مشہور ہے کہ شاعر پیدا ہوتے ہیں اور مقرر بنائے جاتے ہیں۔ ثریا کی حد تک یہ بات اس لئے بھی ثابت ہوتی ہے کہ وہ ایک ادبی گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ اکبر الہ آبادی کی پر نواسی ہیں۔ اکبر الہ آبادی لسان العصر کہلاتے تھے۔ ان کی مزاحیہ شاعری اُردو ادب میں ایک مقام رکھتی ہے۔ ثریا کے والد سید بشیر حسین الہ آبادی بھی مشہور شاعر تھے۔ ان کے شعری مجموعہ "جام فروزاں" کو انعام مل چکا ہے۔ اس طرح شاعری کا شوق ثریا کو ورثے میں ملا ہے لیکن موسیقی کی بات جدا ہے۔ موسیقی کے لئے شوق کافی نہیں اس کے لئے بڑی محنت اور ریاض کی ضرورت ہے۔

ثریا کو بچپن میں افسانہ نگاری کا شوق تھا گیارہ سال کی عمر میں ان کا پہلا افسانہ شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کے یکے بعد دیگرے کئی افسانے شائع ہوئے ان کا سید گھرانا بہت قدامت پسند تھا۔ ان کے گھر میں شدید پردہ تھا۔ پردے میں بیٹھ کر افسانے لکھنا چنداں معیوب نہیں لیکن جب پردے میں رہنے والی لڑکی شاعری کرنے لگے تو لوگ چوکنے ہو جاتے ہیں۔ لڑکیوں میں شاعری رجحان خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے سماج میں رومانی فطرت مردوں کا ہی حصہ ہے۔ ثریا کے لئے ایک مصیبت اور کھڑی ہوگئی۔ وہ نہ صرف شاعری کے میدان میں قدم رکھنا چاہتی تھیں بلکہ موسیقی بھی سیکھنا چاہتی تھیں۔ یہ شکر ہے کہ یہ دونوں رجحان ایک ساتھ ظاہر نہیں ہوئے۔ ان کی شاعری شادی کے بعد شروع ہوئی۔ جب وہ شادی کے بعد روایت پسندی کے حلقے سے محفوظ ہوگئیں تو اس رجحان نے انگڑائی لی۔ ان کے شوہر عظمیٰ الرحمٰن نے ان کی ہمت افزائی کی۔ ان کی شاعری کی ابتدا ایک دلچسپ واقعہ سے ہوئی ۱۹۷۱ میں وہ اپنے شوہر کے ہمراہ میرٹھ سے لکھنؤ جا رہی تھیں۔ علی الصباح ان کی آنکھ کھلی انہوں نے کھڑکی کھولی تو باہر ایک بے حد حسین صبح طلوع ہو رہی تھی بے اختیار ان کے لبوں پر یہ شعر آگئے:

رات کے بطن سے صبح پھوٹی نہیں
زندگانی ابھی مجھ سے روٹھی نہیں
تم کو آنا ہے آجاؤ جلدی کرو
میرے دل کی ابھی آس ٹوٹی نہیں

ثریا پر جب ان اشعار کا نزول ہوا تو ان پر ایک کیف طاری ہوگیا۔ انہوں نے اپنے شوہر کو جگایا اور کہا۔

"جلدی اٹھو بہت اچھا شعر ذہن میں آیا ہے"

وہ ہڑبڑا کر اٹھے اور بولے "سو جاؤ، ریل میں شیر کہاں سے آگیا؟" ثریا نے کہا "ارے بھئی جنگل کا شیر نہیں

شاعروں والا شعر" غرض انہیں زبردستی جگا کر ثریا نے اپنے شعر سنائے۔ یہ غنیمت ہوا کہ ڈانٹ کے بجائے داد ملی اس کے بعد تو اشعار کا باقاعدہ نزول شروع ہوگیا اور ثریا کو بیاض بنانی پڑی۔ ان کا شعری مجموعہ "چشم خوں بستہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

ثریا کی موسیقی کی داستان ذرا مختلف ہے ــــ ان کا سنگیت کا ذوق ان کے لئے مصیبت بن گیا۔ انکے والد تعلیم یافتہ تھے وہ انکم ٹیکس افسر تھے، ادبی ذوق رکھتے تھے، مگر معاشرت میں قدامت پسند تھے۔ انہوں نے اپنی چاروں لڑکیوں کو تعلیم دلائی، لیکن یہ سب کچھ پردے میں رہ کر ہوا۔ ان کے گھر پر گورنس کا انتظام تھا۔ وہ گھر میں بیڈمنٹن کھیلتی تھیں۔ انہوں نے موٹر چلانا بھی سیکھا۔ ایک گورنس انہیں گھر پر کشیدہ کاری اور نقاشی کی تعلیم دیتی تھی۔ جب انہوں نے موسیقی سیکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ان کے والد پریشان ہوگئے۔ پردے میں رہنے والی لڑکیوں کا گانے بجانے سے کیا تعلق ہوسکتا ہے لیکن ثریا بضد تھیں کہ وہ موسیقی کی تعلیم ضرور حاصل کریں گی۔ آخر باپ نے ان کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے، لیکن یہ رعایت صرف ستار سیکھنے تک محدود تھی۔ ان کے والد کو عورتوں کا گانا پسند نہیں تھا۔ ستار بھی ثریا نے پردے میں رہ کر سیکھا۔ ثریا کے لئے اپنی روشنئ طبع مصیبت بن گئی۔ انہوں نے گانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور ستار سیکھنے پر اکتفا کی۔

ثریا نے علی گڑھ سے ہائی اسکول پاس کیا انہوں نے کان پور کے ڈی۔ اے۔ وی۔ کالج سے بی اے کیا۔ اس کے فوراً بعد ان کی شادی ہوگئی۔ ان کے شوہر علی الرحمٰن انجینئر ہیں۔ انہوں نے ثریا کی ہمت افزائی کی۔ دراصل شادی کے بعد ہی ثریا کی لیاقت اور اہلیت بروئے کار آئی۔ انہوں نے باقاعدہ گانے کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ ان دنوں یو پی میں بیگم اختر کا طوطی بولتا تھا۔ مرحومہ غزل کی ملکہ تھیں۔ حکومت ہند نے انھیں پدم شری کا اعزاز عطا کیا تھا۔ ثریا نے اُن کی نگرانی میں گانا سیکھنا شروع کر دیا۔ بیگم اختر کے کوئی اولاد نہیں تھی لیکن اُن کی معنوی اولاد بے شمار تھیں۔ اُن کی شاگردیں اُن کو امی کہہ کر پکارتی تھیں۔ ثریا ان کی سب سے پہلی مسلمان شاگرد تھیں۔ ثریا نے باقاعدہ موسیقی کی تعلیم کے لئے پریاگ سنگیت سمیتی میں داخلہ لیا۔ انہوں نے میوزک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔

بیگم اختر کی طرح غزل سرائی میں ثریا کا میدان بھی ہے، لیکن وہ دادرا، ٹھمری، خیال اور بھجن بھی گاتی ہیں۔ انہوں نے ہندوستانی لوک گیتوں میں بھی مہارت حاصل کی ہے۔ ان کے بندیل کھنڈی، بھوج پوری اور اتر کاشی لوک گیت آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہو چکے ہیں۔ ہز ماسٹرس وائس نے ان کے دو ریکارڈ تیار کئے ہیں۔ ان کے کچھ گیتوں کے مکھڑے یہ ہیں: راجہ بندیلہ، گاڑی والے، سیّاں کہے بولے نا، بالموا سے جا کہہ دو۔ ثریا کو ۱۹۷۵ میں بہترین گانے والی کا ایوارڈ مل چکا ہے۔ ثریا نے دلی، بمبئی، میرٹھ، لکھنؤ اور بہار کے کئی شہروں میں غزل سرائی میں داد حاصل کی۔ اب وہ ہندوستان سے باہر بھی اپنا سکہ جمانا چاہتی ہیں۔

ثریا آج کل لکھنؤ میں رہتی ہیں۔ یہاں ان کے شوہر سپرنٹنڈنگ انجینئر ہیں۔ ثریا کو پردے سے الرجی ہے انہوں نے شادی کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ پردے کو خیرباد کہہ دیا۔ وہ عورتوں کی آزادی کی حامی ہیں۔ انہوں نے خود آزادی کی فضا میں اپنے فن کو جلا دی ہے لیکن وہ حد سے بڑھی ہوئی آزادی کے خلاف ہیں۔ ان کے خیال میں آزادی کے ساتھ کچھ ذمہ داریاں بھی عاید ہوتی ہیں۔ اس لئے آزادی اور روایت پسندی میں توازن رہنا چاہئے۔ انہوں نے لکھنؤ اور میرٹھ میں سوشل ورک میں بھی حصہ لیا ہے ــــ سوشل ورک میں انہوں نے محسنہ قدوائی، بیگم اعزاز رسول اور حامدہ حبیب اللہ کے ساتھ تعاون کیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے میرٹھ میں ایک تقریب منعقد کی تھی۔ ۱۹۷۱ کی ہندو پاک جنگ کے بعد انہوں نے سپاہیوں اور افسروں کی بیواؤں کے لئے چندہ جمع کرنا تھا۔ یہ تقریب اسی سلسلے میں منعقد کی گئی تھی۔ ثریا نے اپنی مصروفیات اور شوق میں گھر کو نظرانداز نہیں کیا ہے۔ انہیں کھانے کا شوق ہے۔ ان کی شاندار صحت اس بات کی دلیل ہے۔ لیکن انہیں بہت زیادہ مرغن کھانے پسند نہیں وہ ہندوستانی، انگریزی اور چینی کھانے پکانا جانتی ہیں۔ انہیں چٹنی اور اچار بنانے میں مہارت حاصل ہے۔ ان کا مرغوب لباس ساڑی ہے انہیں مطالعہ کا شوق ہے۔ اردو نظم اور نثر پر ان کی گہری نظر ہے۔ فیض، ساحر اور فراق ان کے پسندیدہ شاعر ہیں ــــ فراق نے ان کے دیوان "چشم خوں بستہ" کا پیش لفظ لکھا ہے۔ جدید شاعروں میں وہ پرکاش بر تھی اور عمر انصاری کی مداح ہیں۔ عمر انصاری ان کے استاد بھی ہیں۔ ثریا کا قول ہے کہ اگر یہ خضر نما استاد ان کی مدد نہ کرتے تو ان کا دیوان شائع نہ ہوتا۔

ذیل میں ان کے کچھ چیدہ چیدہ اشعار درج ہیں۔ ان اشعار سے ان کی پروازِ فکر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے

صبح کی فکر نہ کچھ دل کو خبر شام کی ہے
آرزو پھر بھی کسی جنّتِ بے نام کی ہے

ــــ

زمانے بھر کی بلاؤں نے آکے گھیر لیا
بڑھا نہ اپنا کوئی ہاتھ دوستی کے لئے

ــــ

وعدہ کرکے نبھانا کٹھن ہے بہت
جان دینا بڑی بات ہوتی نہیں
ان کی آنکھوں کا پیغام پڑھنے کے بعد
ہم سے تو اب کوئی بات ہوتی نہیں

ــــ

پھر ٹوٹی ہیں کچھ زنجیریں
دھوم مچی ہے زنداں زنداں ★★





...ست کے مہینے میں کس طرح رہنا چاہیے

ڈاکٹر جیٹھانند راشٹروادی

اگست کے مہینے میں ہوا غیر معمولی مرطوب ہو جاتی ہے۔ بارش کے پانی میں بہت سی غلاظتیں مل جاتی ہیں۔ نباتات کے خشک پتے اور شاخیں وغیرہ بھیگ کر گلنے سڑنے لگتی ہیں، اور اُس کے بعد جب اُن پر تیز دھوپ پڑتی ہے تو ان سے گندے کثیف بخارات اُٹھ کر مرطوب ہوا میں مل کر اس کے فساد کو بڑھا دیتے ہیں۔ اس لئے جولائی کا مہینہ شروع ہوتے ہی بستی اور مکان کی صفائی کا اہتمام کیا جائے اور اس مہینے بھی اس کو جاری رکھا جائے۔

اس مہینے کی مرطوب آب و ہوا سے بدہضمی ہیضہ، دست اور پیچش کی شکایتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ملیریا بخار ہونے میں ہاضمے کی خرابی کو بھی دخل ہوتا ہے۔ اس لئے اپنے ہاضمے کو دُرست رکھنے کی کوشش کریں۔

اس مہینے صبح سویرے اُٹھنے کے بعد ضروریات سے فارغ ہو کر آبادی کے دُور سر سبز میدانوں یا باغوں میں سیر کیجئے۔ ممکن ہے آپ کے لوٹتے لوٹتے بارش ہونے لگے۔ لہٰذا بھیگنے سے محفوظ رہنے کے لئے چھتری اپنے پاس رکھئے۔ بارش میں دیر تک بھیگنا صحت کے لئے مضر ہے اس سے بخار اور نزلہ زکام کی شکایت ہو جاتی ہے۔ بعض آدمیوں کو اس سے وجع المفاصل گٹھیا ہو جاتا ہے۔

اگر آپ جسمانی طور پر کمزور ہیں تو اس مہینے معمولی سیر ہی آپ کے لئے بہترین ورزش ہے بلکہ اگر آپ مضبوط و توانا ہیں تو آپ اس مہینے میں سخت سے سخت ورزش کر سکتے ہیں۔ عام ورزشوں کے علاوہ جھولا جھولنا اس ماہ کی خاص ورزش ہے۔ جھولنے سے پھیپھڑوں کی خاصی ورزش ہو جاتی ہے۔ اگر پینگیں چڑھائی جائیں تو اس سے پھیپھڑوں کی ورزش کے علاوہ پنڈلیوں، رانوں، کلائیوں اور بازوؤں کے عضلات کی بھی خاصی ورزش ہو جاتی ہے، جس سے ٹانگیں اور ہاتھ مضبوط ہو جاتے ہیں۔

اس مہینے میں پکوان پکانے کا عام رواج ہے۔ پوڑے، گلگلے، پوریاں، کچوریاں، سہال، اندرسے وغیرہ خوب کھائے جاتے ہیں۔ لیکن اُن کے کھانے میں اعتدال اور احتیاط سے کام لیجئے۔ ورنہ بدہضمی ہو جائے گی۔

کھانے کے علاوہ پینے کی چیزوں میں بھی احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔ اب لسی، شربت اور ٹھنڈائی کا زمانہ نہیں۔ صبح کے ناشتے میں بسکٹ اور چائے مناسب ہے۔ اگر آپ کا معدہ اچھا ہے تو پراٹھا، پوری، کچوری، نمک پارے، اندرسے بھی ناشتے میں کھا سکتے ہیں۔ لیکن انہیں صرف بطور ناشتہ کھائیے۔ پیٹ بھر کر نہیں۔ بعض لوگ گرما گرم بھنے ہوئے چنوں کا ناشتہ کرتے ہیں۔ اُن کے موسم کے مطابق ہونے میں شک نہیں۔ محنت، مزدوری کرنے والے غریبوں کے لئے اچھی چیز ہے۔

دوپہر کے کھانے میں سادہ روٹی سبز ترکاریوں کی بھجیا اور بھنی ہوئی مونگ کی دال یا چنے کی دال کے ساتھ کھائیں۔ گوشت خور لوگ بھنا ہوا گوشت یا کم شوربے کا گوشت استعمال کریں اروی، سیتاپھل اور بھنڈی جیسی دیر ہضم ترکاریاں کم استعمال کریں۔ شام کے کھانے میں بھی ایسی ہی چیزیں استعمال کریں۔ گوشت خور کباب، کوفتے استعمال کر سکتے ہیں۔ لیکن دوپہر کا کھانا ہو یا شام کا اُس کے ساتھ لیموں ضرور استعمال کیا جائے۔ املی انار دانے یا سرکہ کی چٹنی کھائی جائے۔ تمام سبزیاں ترکاریاں اور پھل وغیرہ صاف اور تازہ ہوں۔ گلی سڑی یا کیڑے لگی کوئی چیز نہ ہو۔

دوپہر اور شام کے درمیان بھوک ستائے تو نمک پارے یا کوئی اور اسی قسم کی چیز کھا کر ایک پیالی چائے پی لیجئے۔ لیکن اس سے بھی بہتر ہے کہ انار، انگور اور سیب میں سے کوئی پھل بطورِ ناشتہ استعمال کریں۔

جن مقامات پر نلوں کے پانی کا بندوبست ہے وہاں یہ پانی پینے کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ لیکن پہلے اسے اُبال لیا جائے تو زیادہ اچھا ہے۔ یہی حال پختہ کنوؤں کے پانی کا ہے۔ جن مقامات پر کنویں کم گہرے ہوں یا جہاں دریاؤں، تالابوں کا پانی پیا جاتا ہو، وہاں پانی کو جوش دے کر یا مقطر کرکے پینا مناسب ہے۔

رات کو ایسی جگہ سویئے جہاں بارش ہونے کی صورت میں آپ بھیگنے سے محفوظ رہیں اور آپ کی نیند بھی خراب نہ ہو۔ اس طرح اگر رات کو بارش نہ بھی ہوئی تو شبنم سے حفاظت رہے گی۔ اگست کے مہینے میں مچھروں کی پیدائش افراط سے ہونے لگتی ہے۔ اُن کی نیش زنی سے محفوظ رہنے کے لئے پلنگ پر مچھر دانی لگایئے۔ اگر اس کا انتظام نہ ہوسکے تو باریک ململ کی چادر سے جسم کو ڈھک لیا جائے۔

اس مہینے میں صبح و شام، بلکہ ممکن ہو تو دوپہر کو بھی نہایئے۔ نہانے کے لئے صاف ستھرا پانی استعمال کیجئے۔ تالابوں، دریاؤں اور نہروں کا پانی اس مہینے میں بہت گندا ہوجاتا ہے۔ وہاں نہانے سے پرہیز کیجئے۔ بلا شبہ میں نہا سکتے ہیں، لیکن زیادہ دیر تک نہانا ہرگز مناسب نہیں۔

اس مہینے میں سفید اور باریک لباس پہننا ہے۔ کُرتے یا قمیص کے نیچے ایک باریک بنیان بھی نیم آستین ضرور ہونا چاہئے۔ اس بنیان یا آستین کو روزانہ بدلتے رہئے یا اسے دھو کر دھوپ میں خشک کرکے پہن لیا کیجئے۔

اگست کے کچھ پھلوں اور ترکاریوں کی خصوصیات جان کر آپ کو انہیں ٹھیک طرح استعمال کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

اگست میں انگور بہت آتے ہیں۔ انگور سب سے بہتر وہ ہیں جو بیل پر پکیں اور پکنے کے بعد بھی کئی روز تک بیل پر لٹکے رہیں۔ ایسے انگور بہت میٹھے ہوتے ہیں۔ انگور تمام میوؤں اور پھلوں میں افضل ہے۔ عمدہ پکے ہوئے انگور مزاج کے اعتبار سے گرم و تر ہوتے ہیں۔

چکوترے کا مزاج سرد و تر ہے۔ یہ جسم کو غذائیت دیتا ہے۔ گرم صفراوی مزاج کے لوگوں کے لئے خصوصیت سے مفید ہے۔ چکوترا جسم میں صفرا کا غلبہ ہو تو اس کو تسکین دیتا ہے معدے اور جگر کی گرمی کو کم کرتا ہے، بھوک کو تیز کرتا ہے، پیاس بجھاتا ہے اور فرحت بخشتا ہے۔ نزلہ زکام اور کھانسی کے مریضوں کے لئے مفید ہے۔

کرنا، جسے کٹا اور کھٹا بھی کہتے ہیں لیموں کی قسم کا پھل ہے اور سنترے کے برابر ہے۔ اس کا مزاج سرد و خشک ہے۔ اس کا رس نچوڑ کر شکر ملا کر پینے سے جسم کو غذائیت حاصل ہوتی ہے صفرا کا غلبہ ہو تو دُور ہو جاتا ہے۔ پیاس کو تسکین اور طبیعت کو فرحت ہوتی ہے۔ گرم صفراوی امراض میں مفید ہے۔ اس کے استعمال سے شراب کا خمار بھی اتر جاتا ہے۔

کمرکھ کا مزاج سرد و خشک ہے۔ اس میں غذائیت کم ہوتی ہے۔ یہ صفراوی تیزی کو دُور کرتی ہے، پیاس بجھاتی ہے، گرم مزاج اشخاص کے معدے کو قوت بخشتی ہے اور بھوک کو تیز کرتی ہے۔ تے اور سِل کی شکایت ہو تو اس کو دُور کرتی ہے۔

سینڈھ گرم و تر پھل ہے۔ پکی ہوئی سینڈھا کھانے سے جسم کو غذائیت حاصل ہوتی ہے یہ پیشاب لاتی ہے، قبض کشا ہے، خون کو صاف کرتی ہے۔ اُس میں کسی قدر بادی پن ہوتا ہے۔ اس کی اصلاح کے لئے نمک اور سیاہ مرچ کے ساتھ کھائیں تو بہتر ہے۔

پھوٹ کا مزاج سرد و تر ہے اُس میں غذائیت ہوتی ہے۔ ثقیل اور دیر ہضم ہے پیشاب خوب لاتی ہے۔ اس کے زیادہ کھانے سے بعض آدمیوں کو دردِ شکم ہو جاتا ہے۔

کندوری کا مزاج سرد و تر ہے۔ پکی ہوئی کندوری گرم و تر تاثیر رکھتی ہے۔ پکی ہوئی کھانے سے جسم کو غذائیت اور طبیعت کو فرحت حاصل ہوتی ہے۔ گوشت کے ساتھ پکا کر اُسے کھایا جائے تو یہ خون اور صفرا کے فساد کو دُور کرتی ہے۔ کسی قدر قابض ہے۔

سیتا پھل، اس کا مزاج سرد و تر ہے۔ یہ جسم کو فربہ کرتا ہے، ملین ہے، گرم صفراوی مزاج کے موافق ہے۔ لیکن یہ کچھ نفاخ بادی پیدا کرتا ہے۔

لوبے کی پھلیاں، لوبیے کی نرم و نازک پھلیاں گوشت کے ساتھ پکا کر کھائی جاتی ہیں اور لذیذ ہوتی ہیں۔ یہ جسم کو غذائیت دیتی ہیں۔ لیکن ثقیل اور دیر ہضم ہوتی ہیں اور نفخ پیدا کرتی ہیں، اس لئے بادی چیزوں میں شمار کی جاتی ہے۔ پکانے کے لئے اس کی ملائم پھلیاں حاصل کی جائیں اور ان کو اچھی طرح گلا لیا جائے ان میں گرم مسالہ اور ادرک ضرور شامل کی جائے

اپنے مزاج کے پیشِ نظر ترکاریوں اور پھلوں کے انتخاب میں سوچ سمجھ سے کام لینا چاہئے، تاکہ یہ مہینہ آپ کے لئے بیماریوں کا نہیں، صحت کا پیامی ثابت ہو۔

○○

ایک منزل دو راہیں



تحسین انصاری

ٹرین اپنی پوری رفتار سے چلی جارہی تھی اور اُس کے ساتھ اردگرد کی ہر شے بھاگی جارہی تھی۔ لہلہاتے کھیت، سوکھے اور اُجڑے درخت، سرسبز یا بنجر زمین سب کے سب۔ نجمہ دُنیا کی ہر کشمکش سے بے نیاز اپنے خیالات میں گم تھی۔ اُس کے نزدیک ساری دنیا تھمی ہوئی تھی اور صرف وہ گردش میں تھی۔ اُس کا ماضی اپنی پوری تلخیوں کے ساتھ اُس کی آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپکے جارہا تھا۔ الیاس اُس کے پہلو سے اُٹھ کر کمپارٹمنٹ کے دروازے میں جا کھڑا ہوا تھا۔ اُس نے بھیگی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ ویران نظروں سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اُس کی نظریں دور خلاؤں میں شاید اپنے مستقبل کو دیکھنے کی سعی ناکام کررہی تھیں۔ مستقبل جو تابناک بھی ہوسکتا تھا اور تاریک بھی۔

نجمہ نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ وہ ایک سال سے چلنے والی کشمکش کو ختم کرکے اپنے من مندر کے دیوتا کے ساتھ جارہی تھی۔ اُس نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ اُس کے والدین اسے الیاس کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دے دیں مگر یہ ممکن نہ ہوسکا۔ اُن کا کہنا تھا کہ وہ ایک غیر ذمہ دار اور ناکارہ لڑکے کے ساتھ اُس کی زندگی برباد نہیں کرسکتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ الیاس اپنے والدین کی چھوڑی ہوئی جائیداد کو سنبھال نہیں سکے گا اور ایک دن راستے کا بھکاری بن جائے گا۔

اُس کی آنکھوں میں خالد کی تصویر گھومنے لگی۔ کشادہ پیشانی، گھنگھریالے بال اور ہمیشہ مسکراتی آنکھیں کتنا اچھا لگتا تھا وہ! وہ اکثر سوچتی تھی کاش اُس نے الیاس سے زندگی بھر ساتھ دینے کا عہد نہ کیا ہوتا تو یقیناً خالد ایک اچھا جیون ساتھی ثابت ہوسکتا تھا۔ اور اُس کی بہن انجم کتنی پیاری لڑکی تھی کتنی محبت کرتے تھے۔ وہ دونوں اُس کے ساتھ

لیکن وہ کیا کرتی۔ اُس کا ضمیر ہمیشہ اسے اپنے عہد کو پورا کرنے کے لئے اکساتا رہتا تھا اور وہ ایک بااصول لڑکی تھی اس لئے اُسے الیاس سے شادی کرنے کے لئے مجبور ہونا پڑا۔

ان ہی دنوں اُس کے والدین نے اُس کی شادی خالد کے ساتھ طے کردی۔ اب اُس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ الیاس کے ساتھ کہیں دور چلی جائے۔

نجمہ نے اپنی بھیگی آنکھیں صاف کیں اور سوچنے لگی۔ اس کے والدین کو اُس کے فرار کا علم ہوچکا ہوگا۔ شادی کا گھر ماتم کدہ بن گیا ہوگا۔ اس کی ماں مسلسل رو رہی ہوگی۔ اُس کے والد رسوائی اور بدنامی کے خیال سے پریشان آرام کرسی میں پڑے ہوں گے۔ اُس کے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ کتنا اعتماد تھا انہیں اپنی لڑکی پر۔ اُس نے سوچا یہ دنیا کتنی عجیب جگہ ہے۔ جہاں کسی سے وفا کرنے کے لئے دوسروں سے بے وفائی کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔ تصورات نے اُسے پھر اپنے گھر پہنچا دیا۔ اُس نے دیکھا گھر میں سناٹا چھایا ہوا ہے برقی قمقموں کی وہ قطاریں جنہوں نے گھر کو بقعۂ نور بنا دیا تھا تاریکی میں ڈوب چکی ہیں۔ لوگ مکان کے سامنے سے قہقہے لگاتے گزر رہے ہیں جیسے کہہ رہے ہوں اب یہ لوگ کیسے کسی کو منہ

دکھائیں گے۔

نجمہ نے گھبراکر آنکھیں بند کرلیں۔ بات ختم ہوچکی تھی۔ لیکن اس کے اندر کی کشمکش ابھی تک جاری تھی۔ تیز دوڑتی ہوئی ٹرین کی رفتار کم ہوتی جارہی تھی اور کسی اسٹیشن کی آمد کی خبر دے رہی تھی۔ آخر ٹرین رُک گئی پلیٹ فارم پر مسافروں کا ہجوم تھا کمپارٹمنٹ کے سامنے ہی ایک بارات کھڑی تھی۔ ایک دم بھیڑ کمپارٹمنٹ میں گھس آئی کچھ عورتوں نے ایک بڑی پیاری سی دُلہن کو اُس کے قریب لا بٹھایا۔ سُرخ لباس میں سمٹی سمٹائی دُلہن زیورات سے لدی ہوئی تھی۔ اُس کے چہرے پر خوشی اور ملال کا عجیب رنگ تھا۔ اُس کے گھر یلے اور سسرال والوں کی بھیڑ تھی۔ نجمہ نے اُسے دیکھا اور اُس کے دل پر چوٹ سی لگی۔ اُس نے سوچا کل وہ بھی دُلہن بنے گی لیکن اُس کے گھر کوئی بارات نہیں آئے گی اُسے وداع کرنے والے کوئی اپنے نہیں ہوں گے۔ اور اسے لے جانے والا بھی سوا اُس کے شوہر کے اور کوئی نہیں ہوگا۔ ایک انجان مقام پر وہ مجسٹریٹ کی موجودگی میں ایک دوسرے کے ہوجائیں گے۔ اُن کے لیے اُن کے اپنے گھروں کے دروازے بند ہوچکے ہوں گے اور ان کے والدین رُسوائی اور بدنامی کے دامن میں مونہہ چھپائے سسک رہے ہوں گے۔

اس نے الیاس کی طرف دیکھا جو ٹرین سے اُتر کر پلیٹ فارم پر دُور تک چلا گیا تھا۔ اسی وقت اُس کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح ایک آواز اُتر گئی۔ کوئی دلہن سے کہہ رہا تھا: بیٹی آج رونے کا دن نہیں ہے۔ ماں باپ کے لئے اس سے زیادہ خوشی کا کوئی دن نہیں ہوتا کہ اُن کی بیٹی عزت و آبرو کے ساتھ اپنے شوہر کے گھر جائے۔ کوشش کرنا کہ آج کی طرح تمہارا مستقبل بھی تمہارے والدین کے لئے وقار کا ضامن رہے گا

نجمہ پر بجلی سی گری ــــ وہ بھی تو کسی کی بیٹی ہے ــــ والدین کی عزت۔ پھر وہ کیا کرے کیا ایک فرد کے لئے سارے خاندان کو بھول جائے؟ اُسی وقت دوسرے پلیٹ فارم پر مخالف سمت جانے والی ٹرین آکر رُکی۔ نجمہ نے الیاس کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک پلیٹ فارم پر کھڑا ہوا تھا۔ اُس نے الوداعی نظر الیاس پر ڈالی اور اپنا بیگ لے کر ٹرین سے اُتر گئی۔ اُسے اپنے شہر جانا تھا، اپنے گھر، وہ صرف ایک لڑکی نہیں تھی، وہ اپنے خاندان کی عزت و آبرو بھی تھی۔ آخر وہ اُسے کیسے فراموش کردیتی؟



ڈی۔ کے۔ کنول

بچوں کے لئے وقت نکالئے!

کیا آپ اپنے بچے کو بہت چاہتے ہیں؟

کیا آپ یہ نہیں چاہتے کہ آپ کا بچہ خوب پڑھے لکھے، اُسے اچھی سے اچھی تعلیم اور اچھی تربیت ملے، تاکہ بڑا ہو کر وہ ایک اچھا شہری ثابت ہو سکے؟ مجھے معلوم ہے کہ میرے ان سوالوں کا جواب آپ نفی میں نہیں دے سکتے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ اپنے بچے کو بے حد چاہتے ہیں، لیکن اس قدر چاہت کے باوجود آپ اپنے بچے کو مارتے پیٹتے ہیں، س کی حرکتوں سے آپ ناخوش رہتے ہیں۔ پنے بچے کے بارے میں، آپ کی سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ وہ آپ کو بلاوجہ پریشان کرتا رہتا ہے آپ کا موڈ کیسا ہی خراب ہو، لیکن وہ پھر بھی آپ سے بے تکے سوالات پوچھتا رہتا ہے۔ آپ اسے گھڑکتے جھڑکتے ہیں، لیکن وہ پھر بھی آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ آپ کو یہ بھی شکایت ہے کہ کل آپ لے جو کھلونا بڑے چاؤ سے اُسے لاکر دیا تھا وہ اُس نے توڑ تاڑ کے رکھ دیا۔ آپ حیران ہیں کہ جس کھلونے کے پانے کی خوشی میں وہ اپنا کھانا پینا بھی بھول چکا تھا، آج وہ اُس کھلونے کو توڑنے کے لئے کیوں اور کیسے تیار ہو گیا۔

غالباً آپ یہ سمجھتے ہوں گے کہ آپ کا بچہ بے وقوف ہے یا آپ کے دئے ہوئے کھلونے کے ساتھ اُسے کوئی دشمنی تھی۔ آپ اُس سے پوچھتے ہیں تو وہ بڑی معصومیت کے ساتھ جواب دیتا ہے "پاپا میں اُس کھلونے کو کھول کے دیکھ رہا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ کھلنے سے پہلے ہی ٹوٹ جائے گا"

انسانی زندگی کے تین اسٹیج ہیں " بچپن، جوانی اور بڑھاپا۔ پہلے اسٹیج میں آپ بچے کو جس قالب میں ڈھالیں گے وہ اسی میں ڈھل جائے گا۔ آپ اپنے بچے سے اس لئے نالاں ہیں کہ وہ آپ کے لائے ہوئے کھلونے توڑ دیتا ہے۔ آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ اُسے جو چیز لاکر دیں وہ اُسے سنبھال کر رکھے، اُسے الماری میں سجائے۔ وہ شوق سے سویرے اُس چیز کو دیکھے، مگر اُسے چھوئے نہیں۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو پھر آپ اُس کی ذہانت، اُس کی سمجھ داری اور شرافت کے قصیدے پڑھنے لگیں گے۔ دراصل آپ اس کی سوچ کی حدبندی کر دینا چاہتے ہیں اور اس طرح اُس کے دماغ کی زرخیزی ختم ہو جاتی ہے۔

اب آپ اسی کھلونے کی مثال لیجئے۔ بچہ آپ سے کہہ چکا ہے کہ اس کا یہ کھلونا اُسی کے ہاتھوں سے ٹوٹ چکا ہے۔ وہ اسے کھول کر یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آخر اُس کے اندر کیا۔ اُس کی زرخیز سوچ اُسے اس بات کی ترغیب دیتی ہے کہ وہ بھی اس کے میکنزم سے واقف ہو سکے۔ وہ جاننا چاہتا ہے کہ آخر یہ لوہے کا گھوڑا چابی ملنے سے چلتا کیسے ہے؟ یہ جو گڑیا رانی ہے، چابی ملنے سے اس کا انگ انگ کس طرح تھرکنے لگتا ہے۔ اگر اسے حوصلہ افزائی ملے تو ایک دن آپ دیکھیں گے کہ وہ بھی اپنے جوہر دکھائے گا۔

اسی طرح آپ پڑھائی کا معاملہ لیجئے اس میں بھی آپ زور زبردستی سے کام لیتے ہیں۔

دراصل آپ اس غلط فہمی کے شکار ہیں کہ صبح سے شام تک پڑھائی میں مگن رہنے سے ہی بچے کا مستقبل بن سکتا ہے۔

آپ زیادہ کے لالچ میں تھوڑے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں مطلب یہ ہے کہ صبح سے شام تک کتابوں سے چپکے رہنے والے بچے ذہنی اور جسمانی طور پر بیمار رہتے ہیں۔ پڑھائی کے ساتھ بچے کے لئے کھیل کود بھی ضروری ہے اگر آپ کا بچہ کھیلنے کودنے سے پرہیز کرتا ہے تو اس سے اس کی جسمانی پرورش و پرداخت متاثر ہو سکتی ہے۔ وہ آپ کو چاق و چُست نہیں، سُست اور مضمحل نظر آئے گا۔

اسی طرح کھانے پینے کی مثال لیجئے۔ والدین کی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کا بچہ خوب کھائے پیئے، تاکہ وہ آپ کو پہلوان نظر آئے۔ یہاں بھی آپ لالچ کر جاتے ہیں۔ آپ اس کے انکار کے باوجود زبردستی اس کے موُنہہ میں نوالے ٹھونس دیتے ہیں۔ وہ لاکھ منتیں کرتا ہے، مگر آپ اس کی ایک بھی نہیں سُنتے۔ اس طرح کھلائی پلائی ہوئی چیزیں بچے کے جسم کو بالکل نہیں لگتیں۔

اکثر جب بچے اپنی ماؤں سے کسی چیز کے لئے ضد کرتے ہیں تو وہ اُنھیں اس ضد سے باز رکھنے کے لئے کسی تاریک کمرے میں بند کر دیتی ہیں یا اُنھیں بھوت پریت کی فرضی کہانیاں سنا کر اُنھیں بزدل اور ڈرپوک بنا دیتی ہیں۔ اس طرح نفسیاتی طور پر وہ ہمیشہ ایک انجانے خوف میں مبتلا رہتے ہیں۔ کمرے میں اچانک بجلی بند ہو جائے تو اُن کے گرد وہ فرضی بھوت پریت تانڈو ناچنے لگتے ہیں۔ ڈر کے مارے اُن کا خون سُوکھ جاتا ہے اور گلے سے آواز نہیں نکل پاتی۔ ایسے بچوں سے جوانی میں بہادری کی توقع رکھنا فضول ہے۔

ایک آدھ گھر کو چھوڑ کر باقی گھروں میں دو یا دو سے زیادہ بچے ہوتے ہیں — والدین کی نظر میں پہلا بچہ زیادہ توجہ اور پیار کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ اس نرالی منطق کا اثر دوسرے بچوں پر پڑنا فطری ہے۔ وہ ماں باپ کی بے توجہی کی وجہ سے احساسِ کمتری کا شکار ہوتے ہیں۔ اُن کے دل میں نفرت اور حسد کی آگ سُلگ اُٹھتی ہے۔ اپنے بڑے بھائی کی تضحیک اُڑانے سے اُن کے دلوں کو ٹھنڈک پہنچتی ہے۔ اُن کی کامیابیاں اُنھیں ایک آنکھ نہیں بھاتیں اور ان کی ناکامیوں پر وہ بغلیں بجانے لگتے ہیں۔ اسی طرح والدین کے مونہہ سے ایک بچے کی سچی جھوٹی تعریفیں سن کر دوسرا بچہ جلاپے اور حسد کا شکار ہو جاتا ہے۔

بعض اوقات آپ کا بچہ آپ سے بے سر و پیر کے سوالات پوچھنے لگے گا۔ آپ اپنی بیوی کو کوئی اہم نکتہ سمجھا رہے ہیں تو وہ بیچ میں ٹانگ اڑائے گا۔ آپ فلاسفی پر لیکچر دے رہے ہیں تو وہ بھی غور سے سنے گا۔ وہ کوئی انوکھی چیز دیکھتا ہے تو اس کے بارے میں آپ سے استفسار کرتا ہے۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ دراصل ہر موضوع کے متعلق کچھ نہ کچھ جاننے کی اُسے ہمیشہ کرید لگی رہتی ہے، کیوں کہ یہ اُس کی سوچ کا تقاضا ہے۔ اگر آپ نے اُسے کتابوں کا ہی دستِ نگر بنا دیا تو باہر کی دنیا کے بارے میں اُس کی معلومات صفر کے برابر رہ جائیں گی۔

اب بچے کے فطری رجحان کی مثال لیجئے۔ بچہ ایک کوی یا مصوّر یا موسیقار، سائنس داں بننا چاہتا ہے۔ مگر آپ اُس کے فطری رجحان کی پروا کئے بغیر اُسے مصوّر کی بجائے وکیل بنا دیتے ہیں۔ بڑے ہو کر ایسے بچے زندگی کے محاذ پر کامیابی نہیں حاصل کرتے۔ وہ ہمیشہ اپنے اندر ایک خلیج، ایک کمی محسوس کرتے ہیں۔

والدین کو چاہئے کہ وہ بچوں کے نفسیاتی مسائل پر ہمیشہ خصوصی توجہ دیا کریں، کیوں کہ نفسیات کا تعلق دل اور دماغ سے ہے اور دل اور دماغ کا تعلق جسم سے۔ اپنے بچوں سے بے توجہی کبھی نہ برتئے۔ ذرا ذرا سی بات پر اُن کی دل آزاری نہ کیجئے۔ اُنہیں مارنے پیٹنے سے گریز کیجئے۔ ان سوچ کی دھارا کا رُخ کاٹنے کی کوشش نہ کیجئے۔ اگر بچے کو سنگیت سے لگاؤ ہے تو اُسے سنگیت سُننے یا سیکھنے کا موقع دیجئے۔ اگر وہ کہانی سُننے کے لئے ضد کرتا ہے تو اُسے کوئی مُفید اور بامقصد کہانی سُنا دیجئے۔ اگر وہ آپ سے کچھ جاننے کی کوشش کرتا ہے تو اُسے بڑے پیار سے سمجھا دیجئے۔

شیواجی مرہٹہ کی بہادری کے بے شمار قصے آپ نے سُنے ہوں گے۔ کہتے ہیں اُس کی ماں اُسے روز بہادروں اور بلوانوں کی کہانیاں سُنایا کرتی تھیں۔ ان کہانیوں سے وہ نفسیاتی طور پر اس قدر متاثر ہوا کہ ایک دن اُس نے اپنی بہادری اور دلیری کے جھنڈے سارے ملک میں گاڑ ہی دیئے۔

جھم

ل پھیلی یہ سرسبز معطر وادی
ا سے گلے ملنے کی تمنا دِل میں
اُٹھتی ہے پتلون کبھی، شرٹ کبھی
ناگاتا اِس اونچائی پہ چڑھ آیا ہوں
نیچے پھیلا ہوا وہ "گولف کلب" کا میدان
آگ پانی میں لگاتا ہوا رنگین شعلہ
اِک طرف دُور بلندی پہ کسی کی کٹیا
ہائے یہ دورِ گزشتہ کی حسین شانت جھلک
چند ہی لمحوں میں ہونے لگی بوندا باندی
نشّہ ہی نشّہ ہے، خاموشی ہی خاموشی ہے
پیڑ رِم جھم کی مدھر تال پہ سر دُھننے لگے
غسل کرتی ہوئی برسات میں ننگی وادی
دفعتاً دَم مِرا گھٹتا ہُوا محسوس ہُوا
مارکے پانی کے چھینٹے یہ "رشی"، کہتی تھی
درمیان شیشے کی مانند دھلی صاف سڑک
ہر قدم پر اُٹھی جاتی ہے یہ شفّاف سڑک
شوخ جھونکے جو ہواؤں کے مچل جاتے ہیں
بھیگے بادل مجھے چھُو چھُو کے نکل جاتے ہیں
چھتریاں رنگ برنگی لئے حسنِ مغرب
ڈگمگاتا ہوا وہ بن پئے حسنِ مغرب
اک طرف پھولوں کی آغوش میں نیلا تالاب
لاکھ ڈھونڈے سے بھی اب ملتا نہیں جسکا جواب
کیف سا چھانے لگا، موند لیں آنکھیں میں نے
عطر میں ڈوبی محسوس کیں سانسیں میں نے
میں نے مُنہ کر دیا آکاش کی جانب اپنا
جیسے میں دیکھ رہا ہوں کوئی سُندر سپنا
اِس پہ ٹھنڈک جو لگی، ہوگیا فوراً بیدار
"فیکٹری جانے کا ٹائم ہوا۔ اُٹھیے سرکار"
لیکر انگڑائی اُٹھا، ہنس دیا بیگم کے ساتھ
شہرِ ہنگام کہاں اور کہاں خواب کی بات!

ساگر چاپانوی

پہلی گھٹا

تپش اور تشنگی سے بھرے
خشک ایام کو
خوب سیراب کرتی
مچلتی ہوئی مسکراتی ہوئی
پھر آئی ہے ساون کی پہلی گھٹا
مہکنے لگی سانس دھرتی کی پھر
بہکنے لگے آسماں کے قدم
جھلتے ہوتے ان پریشان
خوابوں کی تعبیر کتنی حسین اور روشن ہے
جو . . . . .
تپش سے بھرے خشک ایام کے
آنسوؤں میں پلے تھے
ابھی تو بہت سی گھٹائیں۔
کھُلیں گی، برس کر تو برسیں گی کھُل کر
مگر آہ! وہ خواب سہمے ہوئے
سِسکتے ہیں جو دِل کے زندان میں
یہ دِل، میرا دِل کِس طرح گیت گائے
کہ مدفن ہے خوابوں کے ارمان کا
چلی جائے اے کاش ساون کی رُت
نہ پھر لوٹ کے آئے کالی گھٹا
جُھلستے رہیں یہ زمیں آسماں
میرے دِل کی طرح!

شبنم انیس



مطبوعات شمع بک ڈپو، کھلونا بک ڈپو، بانو بک ڈپو اور مکتبہ دینیات

افسانہ لکھ رہی ہوں	خوشباش بی اے	۴ روپے
اندھیری راتیں	ریوتی سرن شرما	۵ روپے ۵۰ پیسے
اندھیرے	اختر عادل روپ	۲ روپے ۵۰ پیسے
آگ اور دھواں	م۔م۔ راجندر	۳ روپے
ایک پیار ایک دھوکا	رام سرن شرما	۵ روپے
ایک گدھے کی سرگذشت	کرشن چندر	۴ روپے ۷۵ پیسے
اچھی صورت بری نگاہ	ریاض ارشد	۳ روپے ۷۵ پیسے
آہٹ	ستیہ پال آنند	۵ روپے
اجالا	قیسی رام پوری	۹ روپے ۵۰ پیسے
برجیس	قیسی رام پوری	۶ روپے
بے غیرت	مضطر ہاشمی	۶ روپے
برہمن	کرشن گوپال عابد	۷ روپے
چوٹ	دت بھارتی	۵ روپے ۵۰ پیسے
فریب مسلسل	شفیق بانو	۴ روپے
گناہ	دت بھارتی	۴ روپے
حاجی مراد	قیسی رام پوری	۶ روپے
ہزار راتیں	ش مظفرپوری	۷ روپے
ہزار داستان	فراق گورکھپوری	۳ روپے

شمع بک ڈپو آصف علی روڈ، نئی دہلی



وہ سسکتی رہی۔

وہ کافی دیر سے سسک رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں اور وہ بار بار اپنی بھیگی آنکھوں سے پرکاش کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ پرکاش چُپ کیوں ہے، وہ اُس کے سوال کا جواب کیوں نہیں دیتا۔ کہ اچانک پرکاش کی آواز نے اس کی سوچوں کے طویل سلسلے کو توڑ دیا۔

"دوست شانو، میں محبت میں آنسو بہانے کا قائل نہیں۔ میں نے دُکھ دیکھے ہیں، اُن سے بغاوت کی ہے۔ تم سے میرا کچھ بھی چھپا ہوا نہیں، نہ میں اور نہ میرا ماضی۔

تم نے صرف سکھ دیکھے ہیں۔ تمہارا بھی مجھ سے کچھ چھپا نہیں۔ تم اگر میری طرح ہی اپنے عارضی سکھ سے بغاوت کر لو تو شاید تمہارا چھوڑا ہوا سکھ اور میرا کھویا ہوا دکھ کسی تابناک مستقبل کے ضامن بن جائیں، اور پھر تم کوئی آن چھوئی کل کی ناری تو ہو نہیں جسے بے زبان جانور کی طرح کسی بھی کھونٹے سے باندھ دیا جائے۔ کیوں؟ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

شانو نے پرکاش کی طرف دیکھا، پرکاش کی آنکھوں میں چمک تھی، آواز میں حوصلہ۔ شانو کو اپنے دل کی دھڑکنیں واپس آتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ اِس سے پہلے کہ وہ پرکاش سے کچھ کہے، پرکاش پھر بول اٹھا "تم نے کالج کے سارے لڑکوں میں مجھے پسند کیا تم نے مجھے اپنی آتما کی گہرائیوں سے چاہا۔ یقیناً تم نے مجھ میں کوئی خاص بات ضرور دیکھی ہوگی۔ اسی لئے کہتا ہوں کہ صاف صاف سُن لو —— یوں چُپ رہنے، آنسو بہانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا، کچھ بھی تو نہیں تمہیں اگر کچھ پانے کی تمنا ہے تو کچھ گنوانا بھی ہوگا —— ہاں میں ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں۔ ایک طرف میں ہوں، میرے ساتھ تمہارا پیار، تمہاری اپنی زندگی۔ دوسری طرف تمہارے پتا کی خودسری، سرمایہ داری اور سونے چاندی کی سودے بازی اور تمہاری مرضی کے خلاف تمہاری شادی ہے؟"

ایک لمحہ کے لئے پرکاش چُپ ہو گیا اور پُرامید نگاہوں سے شالو کی طرف دیکھنے لگا جس نے پاس رکھے ہوئے گملے سے پام کے کئی پتّے نوچ پھینکے تھے۔
وہ کچھ اور گمبھیر ہو گیا اور آہستہ سے بولا "شالو، آج اگر تم نے حوصلہ ہار دیا اور کچھ نہ بولیں تو یاد رکھو ہمیشہ پچھتاؤ گی، روؤ گی، سسکو گی، تمہاری خوشیاں ہی تمہاری اپنی دشمن بن جائیں گی، میں جانتا ہوں مجھ سے بچھڑنے کا یہ زخم تمہارے لئے ناسُور بن جائے گا جو لمحہ لمحہ رِستا رہے گا، قطرہ قطرہ تمہاری زندگی غم میں پگھلتی رہے گی اور گھُٹ گھُٹ کر ایک دن تم مرجاؤ گی۔"
پرکاش خاموش ہو گیا اور کچھ دیر یونہی چُپ رہ کر شالو پر بھرپور نظریں ڈالتے ہوئے بولا "تم پڑھی لکھی روشن خیال اور نئے زمانے کی پروردہ ہو، زندگی اور زندگی کے نشیب و فراز کو اچھی طرح سمجھتی ہو۔ اپنے ماتا پتا سے کہہ دو کہ یہ میری زندگی ہے آپ کا دھرم کھاتہ نہیں، جس پر کسی کا بھی نام چڑھا دیا جائے۔ انہوں نے تمہاری پرورش کی ہے، ہر شخص کے ماں باپ کرتے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں، کوئی احسان نہیں، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا زندگی تمہاری ہو اور سانسوں پر کسی اور کا قبضہ، کہ جہاں تمہاری آرزوؤں کو قید کر لیا جائے تمہارے ہونٹوں کو سی دیا جائے، تمہیں اپنے جیون اور جیون ساتھی چُننے کا پورا اختیار ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ تمہیں تمہارے فیصلے کے لئے چھوڑ کر اور آخری بار یہ بتا کر کہ تم دل کے ناسور برداشت نہ کر سکو گی۔"
شالو کے دل میں یہ جملے بجلی کی سی سُرعت کے ساتھ اُتر گئے۔ اس کے ذہن کی اُلجھی ہوئی سوچیں سکون میں بدل گئیں۔ اب اس کے سامنے کوئی اُلجھن نہ تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر تبسم تھا۔ تبسم جس میں عزم تھا، حوصلہ تھا، کسی نئی پسندیدہ منزل کو پانے کی اُمید تھی۔ اس نے زور سے پرکاش کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے دبا دیا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں سارے عہد و پیماں کر کے لہراتی مسکراتی چلی گئی۔

پرکاش شالو کو سمجھا کر گھر آ گیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس نے زور سے آواز دی۔
"سُمن!"
سُمن اپنے کمرے سے باہر آئی، مگر وہ کچھ مضمحل سی تھی، پرکاش نے سُمن کی طرف توجہ نہ دیتے ہوئے کہا "ایک کپ چائے ذرا جلدی سے لاؤ، مجھے کلب جانا ہے۔"
سُمن چائے بنانے چلی گئی تو پرکاش صوفے پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ سُمن، میری بہن جو جھرنوں کی طرح گنگناتی مسکراتی رہتی ہے، آج اُداس کیوں ہے؟ میں نے تو اسے اتنے پیار، اتنے ناز سے پالا ہے، کبھی ماں باپ کی کمی کا احساس بھی ہونے نہیں دیا، اس کی مسکان ہی تو میری زندگی ہے۔ مجھے اپنی زندگی میں رنگ بھرنے سے پہلے تو اس کا گلشن آباد کرنا ہوگا ارے ہاں! یہ اس کا بی۔ اے کا آخری سال ہی تو ہے اگلے سال اس کی شادی کر دیں گے۔ اُس نے سوچا۔ پتہ نہیں کانپور والوں کا کیا رہا؟ پچھلے دنوں خبر آئی تھی کہ اگلے ہفتے آ رہے ہیں۔ اُنہیں تو آج کل ہی میں آ جانا چاہئے تھا یا پھر منظوری کا خط آتا۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ سُمن چائے، ناشتہ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولی "بھیّا یہ آپ کا لفافہ ہے۔"
پرکاش نے چائے کا ایک گھونٹ لیا اور لفافہ چاک کیا، تحریر دیکھتے ہی اُس کے چہرے پر تبسم کھِل اٹھا اور اُس نے لگ بھگ ہنستے ہوئے کہا۔ "لو بھئی تمہاری سگائی تو پکی ہو گئی۔ وہ لوگ تیار ہیں۔ کچھ اب تم بھی تیاری شروع کر دو۔"
سُمن گم صم کھڑی تھی۔ پرکاش نے اُس کی طرف دیکھا اور کُریدنے کے انداز میں پوچھا "کیوں کیا بات ہے؟ خاموش کیوں ہو؟ تمہیں تو خوش ہونا چاہئے۔"
سُمن نے اپنی نظریں زمین سے اوپر اٹھائیں بھیّا مجسم سوالیہ نشان بنا کھڑا تھا۔ اس نے غور سے اس کی آنکھوں میں جھانکا، جیسے اپنے ہی کسی سوال کا جواب تلاش کر رہی ہو۔ کمرے میں خاموشی تھی۔
سُمن نے خود کو سنبھالتے ہوئے کچھ جھجکتے ہوئے ڈوبتی آواز میں کہا "بھیّا — م — میں ستیش سے پیار کرتی ہوں اور ستیش — !"
وہ اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ پرکاش گرج!
"سُمن تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا! تمہیں کچھ ہوش ہے کہ تم کس سے بات کر رہی ہو! — شرم کہیں کی! لاڈ پیار سے پالنے، آزادی دینے اچھی تعلیم دلانے کا یہ مطلب نہیں کہ تم من مانی کرو میرے سامنے تمہیں یہ بات کہنے کی جرأت کیسے ہوئی!"
پرکاش کی آواز سے سارا کمرہ گونج رہا تھا اور سُمن سر تا پا لرز رہی تھی۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں میں ڈوب گئی تھیں اور اس کا دِل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اُس کے سامنے اَن گنت سوال کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ کہنے کو کہہ تو گئی تھی، مگر اسے یہ اُمید ہرگز نہ تھی کہ پرکاش پر اُس کا یہ ردِ عمل ہوگا۔ وہ تو سوچتی تھی کہ اُس کا بھائی کافی روشن خیال ہے۔
اتنے میں پرکاش جھلّا کر صوفے سے اُٹھ گیا اور چیخ کر بولا "کان کھول کر سُن لو، اب تو تمہارے ہونٹوں سے یہ لفظ سُن لئے ہیں لیکن آئندہ نہ سنوں، ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ جاؤ دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے!"
سُمن سہمی سہمی، مُردہ قدموں سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔
اور اب کمرے میں خاموشی تھی۔ بہت ہی گہری خاموشی۔ ●●



محبت کا تجزیہ

ایم کمال

ایک انگریز شاعر نے کہا ہے کہ جو آدمی محبت میں ناکام ہو جائے وہ اس آدمی سے بہتر ہے جس نے کبھی محبت نہ کی ہو۔ شاعری اور ادب محبت کے محور پر گھومتے ہیں۔ انسان کی محبت کے رنگ سے رنگین ہوتی ہے۔ کچھ لوگ محبت کو برا سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگ اسے پاگل پن قرار دیتے ہیں کچھ انسان محبت کے بغیر دنیا کو بے کار سمجھتے ہیں۔ آخر یہ جذبہ کیا ہے؟ یہ کیوں پیدا ہوتا ہے؟ اس کی کیا ضرورت ہے؟

ایک جرمن شاعر نے محبت کو قدرت کی چالاکی سے تعبیر کیا ہے۔ قدرت نے دنیا کو بسانے کے لئے محبت کا جال بچھایا ہے، تاکہ دنیا انسانوں سے آباد رہے۔ انسان محبت کے بغیر تنہائی محسوس کرتا ہے۔ تنہائی اُداسی کا پیش خیمہ ہے۔ محبت اُداسی کی دشمن ہے۔ ایک انسان کا دوسرے انسان کی محبت میں کھو جانا ایسا ہی ہے جیسے منجدھار میں پھنسی ہوئی کشتی کو سہارا مل جائے۔ محبت عدم سے وجود میں آتی ہے۔ افلاطون نے انسان کی انفرادیت کو بدقسمتی سے تعبیر کیا ہے۔ انسان کی نجات اسی میں ہے کہ وہ اپنی انفرادیت کو دوسرے انسان میں جذب کر دے۔ محبت اس نجات کا راستہ ہے۔ ایک مغربی مفکر کا قول ہے کہ محبت ایک ایسا سیلاب ہے جو روح کی گہرائیوں سے اُٹھتا ہے اور محبوب کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ محبت دراصل انسان کی تکمیل ہے۔ انسان محبت کے بغیر ادھورا ہے۔

محبت کرنے والے اپنی دنیا میں مگن رہتے ہیں۔ انہیں باہر کی دنیا سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اس دنیا میں صرف وہی سکہ چلتا ہے جس پر محبت کی چھاپ ہوتی ہے۔ محبت کرنے والوں کو اپنے محبوب میں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔ دراصل وہ محبوب کی اچھائیوں اور برائیوں سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ اگر محبت کرنے والا اپنی محبت کا جواز محبوب کی اچھائیوں میں تلاش کرتا ہے تو اُس کی محبت حقیقی معنوں میں محبت نہیں ہے۔ محبت جتنی ناسمجھ اور کم عقل ہو اتنی ہی سچی ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ لوگ اس مثل کا غلط مفہوم لیتے ہیں۔ اس کہاوت کا مطلب صرف یہ ہے کہ محبت باہر کی دنیا کے لئے اندھی ہوتی ہے اپنی دنیا میں اس کی آنکھیں کھلی رہتی ہیں۔ محبت کرنے والا اپنے محبوب میں وہ خوبیاں دیکھتا ہے جو دوسروں کو نظر نہیں آتیں۔ تاہم اس سے یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ وہ ان خوبیوں کو ایجاد کرتا ہے۔ ایسا کرنا خود فریبی کی علامت ہے۔ اور محبت میں دھوکا نہیں چلتا۔ دراصل دوسرے لوگ اس جادو کی آنکھ سے بے بہرہ ہوتے ہیں جو عاشقوں کا حصہ ہوتی ہے۔

محبت اچانک شروع ہوتی ہے۔ شاعروں نے اُسے پہلی نظر کا تیر کہا ہے۔ اس بات میں صداقت ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ محبت رفتہ رفتہ دل میں جگہ پاتی ہے۔ انسان کچھ عرصہ دوسرے انسان کے ساتھ گزارتا ہے۔ پھر یہ رفاقت محبت میں بدل جاتی ہے۔ لیکن محبت کے اس میں ایک لمحہ ایسا ہوتا ہے جب دوست یک لخت محبوب بن جاتا ہے۔ انسان ایسی محبت کا تجزیہ کرے تو اسے وہ لمحہ آسانی سے مل جائے گا۔ جب دوست کی شخصیت اچانک تبدیل ہو گئی ہو اور وہ محبوب بن گیا ہو۔

محبت کا جواب محبت سے نہ ملے تو وہ ایذا طلبی کے جذبے کے سوا کچھ نہیں۔ محبت ایک دوسرے کے دل میں سما جانے کا نام ہے۔ جب دوسرا دل اس کام کے لئے تیار نہ ہو تو محبت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ محبت کی پیدائش کا کوئی آڑ نہیں۔ محبت چھوٹی اور بڑی نہیں ہوتی تاریخ میں عظیم محبت کے قصے ضرور ملتے ہیں جن کے سامنے عام محبت چھوٹی اور حقیر معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ مقابلہ ہی غلط ہے۔ محبت چھوٹی بڑی نہیں ہوتی عظیم الشان محبت میں محبت کرنے والے خود عظیم ہوتے ہیں۔ اُن کے جذبات کی شدت ہی محبت کو عظیم بناتی ہے۔

ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ محبت ناکام کیوں ہوتی ہے۔ یہ سوال آج کے دور میں اور بھی زیادہ اہم ہے۔ آج محبت کرنے والے گزشتہ زمانے سے زیادہ آزاد ہیں۔ پھر اُن کی محبت کیوں تباہ ہو جاتی ہے؟ اگر محبت اندھی نہیں ہوتی تو انسان اس راستے میں کیوں ٹھوکریں کھاتا ہے؟ اس کی وجہ انتخاب کی غلطی ہوتی ہے۔ انسان اپنی محبت کے جذبے میں دوسرے فریق کو ایک ایسی مسند پر بٹھا دیتا ہے جس کا وہ لائق نہیں ہوتا دراصل اس کی وجہ سماج اور غلط تربیت ہے۔ بعض انسان خوب صورتی پر مرمٹتے ہیں بعض لوگ انسان کی ظاہری خوبیوں پر فریفتہ ہو جاتے ہیں انسان کی عزت، دولت، خوب صورتی اس کا طرز گفتگو اور ایسی ہی ظاہری خوبیاں دل کو دھوکا

دیتی ہیں اور انسان اُن کے جال میں پھنس جاتا ہے۔ ان خوبیوں کا محبت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا محبت انسان سے کی جاتی ہے؟ اُس کی خوبیوں سے نہیں۔ ان اچھائیوں کی دھند میں انسان کچھ نہیں دیکھ سکتا اور وہ گمراہ ہو جاتا ہے۔

آج سے ہزاروں سال پہلے محبت کا وجود نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ لوگ اس زمانے میں محبت سے بے بہرہ تھے۔ محبت کے متعلق لوگوں کا نقطۂ نظر وہ نہیں تھا جو آج ہے۔ اس زمانے میں لوگ محبت کو دیوانگی سمجھتے تھے۔ محبت کرنے والے کو آسیب زدہ اور پاگل قرار دیا جاتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ اس پر کسی منحوس ستارے کا اثر ہے یا وہ کسی کی بری نظر کا شکار ہوتا تھا۔ اسی لئے قیس کا دوسرا نام مجنوں تھا۔ مجنون عربی میں پاگل کو کہتے ہیں۔ تاریخ میں قیس اسی نام سے مشہور ہے۔ بچّے اس پر پتھر پھینکتے تھے لوگ اس پر آوازیں کستے تھے۔ لوگ عشق سے ناواقف تھے اس لئے اُس کی وارفتگی کو نہیں سمجھتے تھے۔ فرہاد کا پہاڑ کاٹ دودھ کی نہر لانا پاگل پن کے سوا اور کیا تھا۔ خسرو نے اُس کے پاگل پن سے فائدہ اُٹھایا اُس کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر نکال لائے تو شیریں اُس کی ہو سکتی ہے۔ فرہاد نے یہ کرشمہ پورا کر دیا تو خسرو نے فرہاد کو دھوکا دیا۔ اور فرہاد اپنے ہی کلہاڑی کی چوٹ سے مر گیا۔

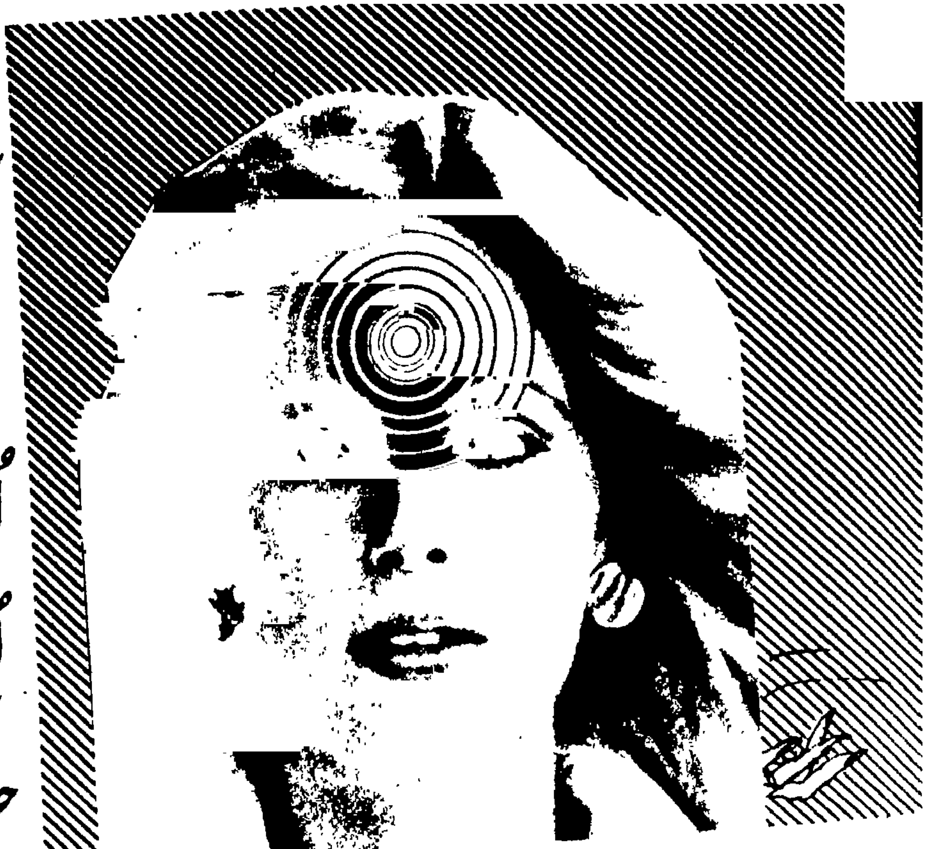
محبت ایک زندہ شے ہے۔ یہ ہر زندہ شے کی طرح پیدا ہوتی ہے پھلتی پھولتی ہے اور مر جاتی ہے محبت کرنے والے دل بیرونی مداخلت کی وجہ سے ایک نہ ہو سکیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اس صورت میں بھی محبت میں سانس باقی رہتا ہے۔ لیکن جب دو دل ایک دوسرے کے لئے دھڑکنا بند کر دیں تو یہ جدائی بڑی درد انگیز ہوتی ہے۔ یہ حقیقت میں محبت کی موت ہے۔ محبت کی ناکامی کا اثر دونوں فریقوں پر پڑتا ہے۔ محبت کے ماروں کو سمجھانا اور بہلانا بے کار ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وقت سب سے بڑا مرہم ہے اور ایک انسان کے لئے اپنی جان کو ہلکان کرنا بے سود ہے۔ مگر یہ بہلاوا اکثر بے کار ثابت ہوتا ہے۔ محبت کرنے والا کہتا ہے کہ میں اپنے محبوب کے بغیر جی نہیں سکتا۔ وہ سچ کہتا ہے۔ دراصل زندگی میں ایسی شے کا ہونا بہت ضروری ہے جس کے بغیر جینا بے کار معلوم ہو۔ انسان کو اُس شے کی ضرورت اتنی ہی شدت سے محسوس ہوتی ہے جتنی زندہ رہنے کے لئے ہوا کی — بلکہ اُس سے بھی کچھ بڑھ کر۔

محبت میں احساسِ گناہ بھی شامل ہوتا ہے یہ بات محققین کی سمجھ میں آج تک نہیں آئی کہ محبت کرنے والا احساسِ گناہ میں کیوں مبتلا ہوتا ہے شاید وہ محبت کو اپنی زندگی سے بڑھ کر عزیز رکھتا ہے۔ یہی بات اس کی ٹریجڈی ثابت ہوتی ہے۔ محبت جائز اور ناجائز کے تصور سے بالاتر ہے۔ عشق کا دیوتا اندھا ہے۔ قدیم یونان نے عشق کے دیوتا کا نام کیوپڈ رکھا تھا۔ یہ ایک معصوم لڑکا ہے۔ ہاتھ میں تیر کمان لے اڑتا پھرتا ہے۔ بے سوچے سمجھے تیر چلاتا ہے۔ اُسے اس بات کی پروا نہیں کہ اس کے تیر کے شکار ایک دوسرے کے نہیں ہو سکتے تاریخ میں بے شمار محبت کی داستانیں ملتی ہیں جو ٹریجڈی میں ختم ہوئیں۔ فرہاد کے لئے شیریں کا حاصل کرنا ناممکن تھا۔ وہ ایک سنگ تراش تھا شیریں ایران کے بادشاہ خسرو کی ملکہ تھی۔ رومیو اور جولیٹ ایسے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے جو ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ ہیر اور رانجھے کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا تھا۔ یہ داستانیں قدرتی طور پر ناکامی اور موت پر ختم ہوئیں۔

کچھ لوگوں کی رائے میں محبت ایک روشنی ہے۔ جو چیز اس روشنی کی زد میں آتی ہے، محبوب بن جاتی ہے۔ انسان اپنے وطن سے محبت کرتا ہے، انسانیت سے محبت کرتا ہے، علم و ادب سے دل لگاتا ہے۔ لیکن یہ محبت اس محبت کے مقابلے پھیکی ہے، جو ایک مرد اور عورت کے درمیان ہوتی ہے۔ کچھ لوگ افلاطونی محبت کے قائل ہیں۔ یہ محبت مرد اور عورت کے درمیان ضرور ہوتی ہے، لیکن اس میں جنس کا دخل نہیں ہوتا۔ یہ محبت بھی صحیح معنوں میں محبت نہیں ہے۔ محبت کو جسم نہ ملے تو وہ محبت نہیں رہتی۔ محبت میں جسم کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی اصطلاحوں کو عشقِ الٰہی کے اظہار میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ پیر فقیر، جوگی اور صوفی جب خدا سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں تو ان ہی اصطلاحوں کا سہارا لیتے ہیں۔ روحانی شاعری میں وصل، دیدار جیسی اصطلاحات کثرت سے ملتی ہیں۔ ان الفاظ سے دھوکا کھا جاتا ہے۔ کچھ کم عقل ماہرینِ نفسیات روحانی شاعری کی ان اصطلاحات کو جنسی ناآسودگی کی علامت قرار دیتے ہیں اور انگریز نے طلبا کے لئے دیوانِ حافظ کا مطالعہ ممنوع قرار دے دیا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ طلبا اپنی ناپختگی کی وجہ سے حافظ کی شاعری کی گہرائی تک نہیں پہنچیں گے بلکہ ان ظاہری الفاظ کو ہی اصلیت سمجھ بیٹھیں گے۔

محبت کا پیمانہ اپنے حقوق سے دستبرداری ہے۔ محبوب کی ناز برداری اور اپنے حقوق سے دست برداری جتنی زیادہ ہوگی محبت اتنی ہی گہری ہوگی۔ محبت انفرادیت کے لئے موت کا حکم رکھتی ہے۔ محبت کرنا تھوڑا سا مرنا ہے۔

آپ کی ذہنی اُلجھن اور اُس کا حل



س : میں نے اپنی پسند سے شادی کی ہے۔ ہماری تین سال کی ایک بچی بھی ہے مگر سسرال کا ایک فرد بھی مجھ سے خوش نہیں ہے۔ میرے شوہر کا رویّہ کبھی مجھ سے بہت اچھا رہتا ہے اور کبھی جھگڑتے ہیں تو سب کے سامنے میری بے عزتی کرتے ہیں اور بے تحاشا گالیاں دیتے ہیں ہماری ساس گھر کے جھگڑے کی ذرا ذرا سی باتیں میرے شوہر سے کہتی ہیں، حالانکہ میں ان کی بہت خدمت کرتی ہوں۔ شوہر کہتے ہیں کہ میں ماں کی غلطی ہونے کے وجود ان سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں یہ ناانصافی نہیں برداشت کر سکتی۔ نتیجے میں جسمانی اور ذہنی طور پر میں بیمار ہو گئی ہوں۔

ج : شادی سے پہلے کے حالات اور بعد کے حالات میں ہمیشہ فرق ہوتا ہے جب آپ نے خاوند کو پسند کیا تھا تو ان کا رویّہ دوسرا ہوگا۔ محبت کے دوران دونوں فریق ایک دوسرے کو اپنی بہترین صفات ہی دکھاتے ہیں کورٹ شپ کا زمانہ پھر کبھی نہیں واپس آتا شادی کے تلخ حقائق اسے بیں کر رکھ دیتے ہیں۔ یہ زمانے کی ریت ہے۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا شادی کے بعد بہت سے مسئلے پیدا ہو جاتے ہیں۔ شادی سے پہلے ان مسئلوں کا سان وگمان بھی نہیں ہوتا۔ شاید آپ کو یہ سُن کر اطمینان ہو کہ آپ اس معاملے میں اکیلی نہیں۔ کم و بیش ہر گھر کا یہی مسئلہ ہے۔ بہت کم لوگ شادی کے بعد خوش رہتے ہیں۔ ہر گھر میں کوئی نہ کوئی مسئلہ ضرور ہوتا ہے۔

ہندوستانی تہذیب کچھ ایسے مسئلے پیدا کر دیتی ہے ہمارے ملک میں ماں باپ کی عزت بہت اہم ہوتی ہے اُن کے لئے قربانی کرنا کارِ ثواب ہے۔ مغربی ممالک میں بچے ماں باپ کو وہ درجہ نہیں دیتے جو اس ملک کا خاصہ ہے۔ یہاں لڑکا اپنی خوشیاں ماں باپ کے لئے قربان کر دیتا ہے وہ اپنی زندگی خراب کر لیتا ہے لیکن

ڈاکٹر بھاٹیہ ایک مشہور ماہرِ نفسیات ہیں۔ وہ بانو پڑھنے والوں کے سوالات کا جواب دیں گے اور ان کے نفسیاتی مسئلوں کا تجزیہ اور حل پیش کریں گے۔

پتہ : معرفت ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ماں باپ کی ناراضگی مول نہیں لیتا۔ اس قربانی سے وہ خود بھی اُلجھنوں کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کی ذہنی بیماری کا اثر اس کے بیوی اور بچوں پر بھی پڑتا ہے۔

سب سے پہلے آپ کو اپنے خاوند کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگانا چاہیئے۔ آپ ان کے سلوک سے پریشان ہیں، لیکن اگر آپ اُن کی رُوح میں جھانک کر دیکھیں گی تو اُنہیں اپنے سے زیادہ پریشان پائیں گی۔ وہ آپکا مسئلہ سمجھتے ہیں۔ وہ بچے نہیں ہیں جو خواہ مخواہ دوسروں کی باتوں میں آجائیں۔ ماں کی بدسلوکی سے ان کا دِل کُڑھتا ہے۔ ان کو گھر والوں پر غصّہ آتا ہے، لیکن ماں کا ادب ان کے پاؤں کی زنجیر بن جاتا ہے۔ کس بیٹے میں ہمت ہے کہ وہ ماں سے لو ہا لے، انہیں سمجھائے کہ وہ اس کے معاملے میں دخل نہ دیں، اس کی بیوی کو ذلیل نہ کریں آپ کے خاوند اندر ہی اندر گھٹتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے غصّے کو نکال نہیں سکتے۔ لیکن غصّے کا اظہار ضروری ہے ان کا زور آپ پر چلتا ہے، اس لئے وہ ماں کا غصّہ آپ پر نکالتے ہیں۔ ظاہر ہیں یہ ناانصافی ہے لیکن اگر آپ ٹھنڈے دل سے اس بات کو سوچیں تو اُن کی جھنجھلاہٹ آپ کی سمجھ میں آجائے گی۔ اُن کو آپ سے ہمدردی ہے، لیکن وہ اس ہمدردی کا اظہار آپ سے لڑ کر کرتے ہیں۔ ایک دفعہ یہ نکتہ آپ کی سمجھ میں آجائے تو آپ کے دل میں بھی ان کے لئے ہمدردی پیدا ہو جائے گی۔

آپ کی ساس کی بدسلوکی آپ کے دل پر چوٹ لگاتی ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ آپ کے شوہر اپنی ماں کا زیادہ خیال کرتے ہیں اور آپ کا کم، اگر آپ اپنے شوہر کی مجبوری کو ماں سے ان کا پیار نہ سمجھیں تو آپ کے دل پر چوٹ کا اثر کم ہو گا۔ آپ کے دل میں جو حسد پیدا ہوتا ہے وہ بھی کم ہو جائے گا۔ دماغی اُلجھنیں زیادہ احساس کرنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ ساس اور شوہر کی بدسلوکی سے آپ ہمیشہ کُڑھتی رہتی ہیں، اپنے آپ کو کوستی رہتی ہیں اور سسرال والوں کو بھی۔ سوچنے کا یہ انداز صحت مند نہیں۔ آپ سارے ماحول کو ایک مجبوری سمجھ کر ٹال دیں۔

شادی سے پہلے آپ ضرور اپنی ماں سے جھگڑتی ہوں گی۔ آپ کی ماں آپ کو بُرا بھلا کہتی ہوں گی لیکن ان جھگڑوں میں کچھ ہی دیر بعد دِل صاف ہو جاتا ہے بیٹی کے دل میں ماں کی محبت کم نہیں ہوتی۔ آپ ان جھگڑوں کو بھی وہی اہمیت دیں تو آپ کی ساس کا دِل آپ کی محبّت سے خوش ہو جائے گا اور وہ جلد ہی اپنی غلطیوں کا احساس کر لیں گی۔ جب عورت کی جوانی گھٹتی ہے تو اس کا اعتماد بھی گھٹتا ہے۔ اُسے اپنی اہمیت گھٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اگر کوئی ان کو محسوس کرائے کہ وہ بھی انسان ہیں اور ان کی بھی اہمیت ہے تو ان کا اعتماد بحال ہو جائے گا اور پھر انہیں اس اعتماد کو حاصل کرنے کے لئے آپ سے لڑنا نہیں پڑے گا۔ آپ ساس سے مقابلہ کرنے کی بجائے ان سے ہمدردی کریں۔ اس طرح آپ ان کی خوشنودی حاصل کر لیں گی۔

اپنے خاوند سے بھی اس بارے میں گفتگو کریں۔ آپ دیکھیں گی کہ وہ آپ کے جذبات کو کچل کر خوش نہیں ہیں۔ وہ ایک گھڑی رات کے پیار سے زندگی کے مسئلوں کو حل نہیں کر سکتے۔ اگر یہ جھگڑے چلتے رہے تو آپ کی ازدواجی زندگی میں بھی فرق پڑ سکتا ہے اور آپ کے شوہر میں بے اعتنائی پیدا ہو سکتی ہے۔ اس طرح نہ صرف آپ کی ازدواجی زندگی خراب ہو جائے گی بلکہ کئی جسمانی بیماریاں بھی پیدا ہونے کا امکان ہے۔ آپ کے شوہر کسی نہ کسی دن اس بات کا احساس کریں گے کہ وہ بھی ان اُلجھنوں کی وجہ سے بیمار پڑتے جا رہے ہیں۔

س : میری عمر اس وقت ۲۶ سال ہے۔ میں غیر شادی شدہ ہوں۔ شادی کی خواہش ہر لڑکی کی طرح مجھے بھی ہے۔ میرے لئے کئی پیام آئے لیکن وہ منظور نہ ہوئے۔ اب ایک اچھا پیام آیا ہے، لیکن لڑکے کی فیملی گھر میں رہتی ہے۔ دو شادی شدہ بہنیں بھی گھر میں رہتی ہیں۔ بھرا پُرا گھر ہے مجھے بھیڑ بھاڑ سے وحشت ہوتی ہے۔ میں گھر میں اپنے والدین کے ساتھ اکیلی رہتی ہوں۔ بھائی بہن باہر رہتے ہیں۔ میں تعلیم یافتہ ہوں۔ ایسی جگہ رہنا چاہتی ہوں جہاں صرف لڑکا ہی ہو۔ آپ رائے دیں کہ میں کیا کروں؟

ج آپ کو گھر میں اکیلے رہنے کی عادت ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ بھرے پُرے گھر میں نہیں رہ سکتیں۔ آپ کو بھیڑ بھاڑ سے وحشت نہیں ہوتی بلکہ آپ نئے ماحول سے گھبراتی ہیں۔ آپ ڈرتی ہیں کہ کہیں آپ بھیڑ بھاڑ والے گھر کو نبھا نہ سکیں۔ یہ بات آپ کے مزاج پر منحصر ہے۔ اگر آپ کو چھوٹی چھوٹی باتوں سے تکلیف پہنچتی ہے، بے توجہی سے غصہ آتا ہے، گھبراہٹ اور جھنجھلاہٹ ہونے لگتی ہے تو اس شادی کے لئے بہت سوچ سمجھ کر 'ہاں' کیجئے۔

ہندوستانی سماج میں نئی بہو کو بڑے چاؤ سے بیاہ کر لایا جاتا ہے، اس کے ناز و انداز اور نخرے برداشت کرنے کی قسمیں کھائی جاتی ہیں لیکن یہ چاؤ چونچلے بس کچھ دن کے لئے ہوتے ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد یہ سب کچھ بدل جاتا ہے۔ سسرال میں زیادہ افراد ہوں، تو ظاہر ہے اُن کے مطالبے بھی زیادہ ہوں گے۔ سب کی خواہش ہوگی کہ آپ ان کی بات مانیں، ان کی خوشی کو مقدّم سمجھیں۔ خاطر مدارات تو عارضی ہوتی ہے لیکن مطالبے ہمیشہ رہتے ہیں۔ آپ ان مطالبوں سے ڈرتی ہیں۔

اس مسئلے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آپ شادی کی خواہش مند ہیں۔ لڑکی کی عمر جس قدر بڑھتی ہے شادی کے لئے گھبراہٹ بھی اتنی ہی بڑھتی ہے۔ اس وقت انسان کی سوچ کام نہیں کرتی۔ ایسے

حالات میں لوگ جلد بازی سے کام لیتے ہیں اور جو بھی پیام آئے اسے آنکھ بند کر کے منظور کر لیتے ہیں. اس کے برعکس لوگ کبھی کبھی ایسی تجویز بھی رد کر دیتے ہیں جو خوش آئند ہو سکتی ہے. آپ کے لئے جتنے بھی پیام آئے وہ آپ کی مرضی کے مطابق نہیں تھے۔ موجودہ پیام آپ کی مرضی کے مطابق معلوم ہوتا ہے آپ کو لڑکا پسند ہے، لیکن اس کا مشترکہ خاندان میں رہنا آپ کو پسند نہیں۔ اس کا کنبہ آپ میں گھبراہٹ پیدا کرتا ہے. آپ کو ڈر ہے کہ آپ اس نئے ماحول کو نہیں اپنا سکیں گی۔ کیا آپ لڑکے سے بات چیت کر سکتی ہیں؟ اگر وہ آپ کو یقین دلا دے کہ اس کے ماں باپ اور گھر والے آپ کو پریشان نہیں کریں گے تو آپ اطمینان سے آگے قدم بڑھا سکتی ہیں.

س : میری عمر ۲۱ سال ہے. میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا ہوں اور بالائی متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہوں والد اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، ماں ابتدائی تعلیم یافتہ ہیں۔ بہن بھائیوں میں سب سے بڑا ہوں. حلقۂ احباب وسیع ہے میں ذرا جذباتی ہوں. بہت جلد متاثر ہو جاتا ہوں. میں غیر محسوس طور پر خود سے باتیں کرنے کا عادی ہو گیا ہوں۔ اکثر تنہائی میں اپنے آپ بڑبڑانے اور باتیں کرنے لگتا ہوں. بعض اوقات دوست ٹوک دیتے ہیں تو شرمندگی ہوتی ہے. راہ چلتے لوگ پوچھ بیٹھتے ہیں کہ آپ کس سے باتیں کر رہے ہیں. میں اس عادت سے کس طرح نجات پاؤں؛

ج یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ آپ کو اپنی اُلجھن کا احساس ہے اور اس پر قابو پانے کی خواہش بھی ہے اس اُلجھن کا تعلق آپ کے گھریلو حالات سے ہے. آپ چھ بھائی بہنوں میں سب سے بڑے ہیں، بھائی بہنوں میں اکثر ذہنی کھنچاؤ ہوتا ہے. گھر میں بھائی بہن لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں اور ذہنی تناؤ قائم رہتا ہے۔ سب سے بڑے بھائی ہونے کے ناطے ماں باپ آپ سے کہتے ہیں کہ آپ کو چھوٹوں پر شفقت کرنا چاہئے، ان کی ضرورتوں کا خیال رکھنا چاہئے، حسد کا اظہار نہیں کرنا چاہئے۔ آپ گھر میں ہوں یا باہر آپ کو یہ اُلجھن اندر ہی اندر تنگ کرتی ہے. آپ کو اس بات کا یقین ہے کہ ماں باپ کا کہنا ماننا چاہئے مگر آپ کا دل و دماغ آپ کا ساتھ نہیں دیتا۔ دماغ ایسا موقع ڈھونڈتا ہے جب وہ کھل کر غصے کا اظہار کر سکے. اگر ماں باپ نے بھائی بہنوں کے جھگڑوں میں غلط فیصلہ کیا ہے اور آپ کے ساتھ ناانصافی کی ہے تو آپ چاہتے ہیں کہ انہیں صاف صاف بتا سکیں اور اپنا حق بھی جتا سکیں لیکن ماں باپ سے دل کی بات کہنا بے ادبی ہے خصوصاً جب وہ ان کی ناانصافی کے متعلق ہو۔ اگر آپ یہ بات کہہ بھی دیں تو کیا ضروری ہے کہ وہ آپ کی بات مان جائیں اور آپ کا حق تسلیم کر لیں۔ اُلٹا وہ آپ کو بدتمیز سمجھیں گے. وہ یہی کہیں گے کہ آپ بڑوں کی عزت نہیں کرتے اور چھوٹوں سے حسد کرتے ہیں اس طرح آپ کو جو تھوڑا بہت پیار والدین سے ملتا ہے وہ بھی ختم ہو جائے گا. یہی ذہنی کش مکش آپ کی اُلجھن کی ذمہ دار ہے۔

جب کسی انسان کو اپنے دل کی بات کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے اور وہ اپنے والدین یا دوستوں کی ناراضگی کے ڈر سے اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر سکتا تو مجبور ہو کر وہ اپنی شکایتیں خود کو سناتا ہے اور انہیں اپنے ہی کانوں سے سنتا ہے۔ اس طرح وہ خود اپنا راز دار بن جاتا ہے۔ ایسا کرنا بجا ہے میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ کسی باغ یا جنگل میں چلے جایا کریں، جہاں تنہائی ہو. وہاں ایک کونے میں بیٹھ کر دل کھول کر گھر کے مسئلوں پر غور کریں یہاں آپ اونچی آواز سے بھی بات کر سکتے ہیں. یہاں آپ کو ٹوکنے والا کوئی نہ ہوگا۔ یہاں آپ غیر محسوس طور پر باتیں نہیں کریں گے — اَن جانے میں سوال جواب نہیں کریں گے، بلکہ اپنی مرضی سے دل کھول کر باتیں کریں گے۔ آپ بغیر کسی جھجک کے اپنے مسئلوں پر سوچ سکیں گے اور آزادی سے بات کر سکیں گے. اس طرح آپ کا دبا ہوا غصہ اوپر آ جائے گا اور آپ کو خود اپنی ذہنی اُلجھنوں کا احساس ہو جائے گا دل کا بوجھ ہلکا ہو جانے پر آپ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کریں گے. جب آپ جان بوجھ کر اپنی مرضی سے اپنے مسئلوں کے متعلق سوچیں گے اور بولیں گے تو پھر ان جانے میں باتیں کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی. اس طرح آپ کی یہ عادت ختم نہ ہوئی تو کم ضرور ہو جائے گی۔

لو میرج

روشن آرا

میں چرچ گیٹ کے اسٹیشن پر اپنے ایک دوست کا انتظار کر رہا تھا کہ کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ یہ کمل تھا۔ میں اس سے بے اختیار لپٹ گیا۔ "کمل! تم یہاں کیسے؟ کب آئے؟ کہاں رہتے ہو؟"

کمل نے جواب دیا۔ "امیش، اتنے سارے سوالوں کا جواب ایک ساتھ دینا ممکن نہیں لیکن میں کوشش کروں گا۔ میں یہاں اپنے پیروں چل کر آیا ہوں۔ تمہارے دوسرے سوال کا مطلب شاید یہ ہے کہ میں ہندوستان کب واپس آیا؟ میرے دوست مجھے یہاں آئے ہوئے چھ ماہ ہو گئے ہیں۔ تیسرا سوال شاید میرے مکان سے متعلق ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ میں بمبئی کا رہنے والا ہوں اور باندرہ میں رہتا ہوں۔"

"بس کرو کمل تمہاری بال کی کھال



نکالنے کی عادت ابھی تک گئی نہیں۔ میں تو سوال پوچھ کر گناہ گار ہوگیا۔ اگر تمہارے پاس وقت ہے تو آؤ تھوڑی دیر بیٹھ کر باتیں کریں۔

میں یہاں اپنے ایک دوست کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن مجھے اس سے کوئی کام نہیں ہے۔ ہم دونوں اکٹھے ہی ٹرین میں جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ آج اپنے دفتر نہیں گیا۔"

کمل نے میرا ہاتھ پکڑا اور ہم اسٹیشن سے باہر نکل آئے۔

کمل اور میں لندن میں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ وہ ایک امیر و کبیر باپ کا بیٹا تھا۔ لندن میں بڑے ٹھاٹھ سے رہتا تھا۔ ہم دونوں انجینیرنگ کے طالب علم تھے۔ تین برس تک کالج میں ہم اکٹھے پڑھتے رہے۔ ڈگری لینے کے بعد میں ہندوستان واپس آگیا۔ اور کمل یورپ کی سیر کرنے چلا گیا۔ بمبئی میں اس کے باپ کا بہت بڑا کارخانہ تھا، جہاں بجلی کا سامان بنتا تھا۔

ہم نے چرچ گیٹ اسٹیشن پر قریب ہی ایک کیفے میں بیٹھ کر چائے پی۔ ایک گھنٹے تک ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ میں بمبئی میں نیا نیا آیا تھا۔ میری پوسٹنگ کو ابھی صرف دو مہینے ہوئے تھے۔ کمل نے مجھ سے اگلی اتوار کو ملنے کا وعدہ لیا۔ اور رخصت ہوگیا۔

اتوار کے روز میں کمل کے گھر گیا تو وہ میرا انتظار کر رہا تھا۔ اُس نے اپنے ماں باپ سے میرا تعارف کرایا۔ ہم نے اکٹھے بیٹھ کر چائے پی۔ پھر کمل نے کہا۔ "آؤ رمیش آج میں تمہیں بمبئی کی سیر کراؤں۔ بمبئی تمہاری دلی کی طرح تاریخی شہر تو نہیں پھر بھی بڑا دلچسپ شہر ہے۔"

میں کھڑا ہوگیا۔ کمل نے گیراج سے موٹر نکالی اور ہم دونوں بمبئی کی سیر کے لیے نکل پڑے۔

اس کے بعد اتوار کے روز کمل کے گھر جانا میرا معمول ہوگیا۔ کمل انجنیئر ہوتے ہوئے بھی فلسفی طبیعت کا مالک تھا۔ یورپ کے قیام نے اس کے خیالات میں تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ وہ جب ہندوستان سے گیا تو ہندوستانی تہذیب کا دلدادہ تھا۔ یورپ میں رہنے کے بعد وہاں کی تہذیب سے اُسے محبت ہوگئی۔ وہ ہندوستان کو ریاکاری کا مُلک کہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یورپ میں انسان آزاد ہے۔ وہ رسم و رواج کا غلام نہیں۔ وہاں کے لوگ انسان کی آزادی کا احترام کرتے ہیں۔ میں اکثر اس معاملے پر اس سے بحث کرتا۔ یورپ کی بے راہ روی اور جنسی آزادی کی مخالفت کرتا، لیکن وہ اپنی بات پر اَڑا رہتا۔ بمبئی میں اس سے ملاقات ہوئی تو یہ بحث پھر شروع ہوگئی۔ میں جب اس بحث سے تنگ آجاتا تو اس کی ہاں میں ہاں ملا کر اپنی جان چھڑا لیتا۔

ایک دن شام کو میں دفتر سے چلنے کی تیاری کر رہا تھا کہ کمل مجھ سے ملنے آگیا۔ میں اُس کی خلافِ توقع آمد پر حیران رہ گیا۔ وہ بہت پریشان تھا۔ اُس نے کہا: "کمل چلو، مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔"

میں نے جلدی جلدی کاغذات سمیٹے اور اس کے ساتھ چلنے کے لئے کھڑا ہوگیا۔

ہم دونوں ایک ریسٹورنٹ میں پہنچے۔ میں نے بیرے کو چائے کا آرڈر دیا۔ بیرے کے جاتے ہی کمل نے کہنا شروع کیا: "رمیش میں ایک مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ تم ہی اس کا حل نکال سکتے ہو۔"

میں نے پوچھا: "پہلے مصیبت تو بتاؤ آخر بات کیا ہے؟"

کمل نے کہا: "میرے ماں باپ میری شادی کی بات پکی کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا: "یہ تو خوشی کی بات ہے۔ تمہارے ماں باپ نے سوچ سمجھ کر ہی لڑکی کا انتخاب کیا ہوگا۔ کیا تم نے لڑکی کو دیکھ لیا ہے مگر ....!"

کمل نے بے صبری سے میری بات کاٹی: "تم پہلے پوری بات تو سن لو۔ میرے ماں باپ نے لڑکی کا انتخاب نہیں کیا، لڑکی کے ماں باپ نے میرا انتخاب کیا ہے اور جہاں تک لڑکی کو دیکھنے کا سوال ہے تو لڑکی میرے گھر میں ہے۔ وہ ایک زمیں دار گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ شہر کے طور طریقوں سے واقف نہیں۔ اس کے ماں باپ نے اُسے ہمارے گھر اس لئے بھیجا ہے تاکہ وہ اپنی ہونے والی سسرال سے واقف ہوجائے۔" میں نے کہا: "تم لوگوں کا یہ سسٹم اچھا ہے۔ اس طرح تم دونوں بھی ایک دوسرے کے قریب آجاؤ گے۔"

کمل جل کر بولا: "خاک اچھا ہے۔ محبت شادی کی بنیاد ہے اور یہاں صرف نبھانے کا سوال ہے۔ میں ایسی لڑکی سے شادی نہیں کرسکتا جو مجھ سے محبت نہیں کرتی۔"

میں نے پوچھا: "وہ لڑکی دیکھنے میں کیسی لگتی ہے؟" کمل نے کہا: "خاصی خوبصورت ہے۔ میٹرک پاس ہے۔ گھر کا کام کاج بہت سلیقے سے کرتی ہے، مگر مجھے ایک خادمہ کی نہیں، بیوی کی ضرورت ہے۔"

کمل سے بحث کرنا بے کار تھا۔ میں نے اس سے اگلی اتوار کو پھر ملنے کا وعدہ کیا اور رخصت ہوگیا۔

اتوار کی صبح جب میں کمل کے گھر پہنچا تو ایک لڑکی نے دروازہ کھولا۔ وہ بولی "میرا نام شوبھا ہے۔ کمل آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ آئیے!"

"میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔۔۔ تو یہ ہے وہ لڑکی۔ خاصی قبول صورت لڑکی تھی۔ سفید رنگ، چھریرا بدن، لمبا قد، لیکن مجھے جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ اس کی آنکھیں تھیں۔ کٹورا سی بڑی بڑی آنکھیں جن میں اُمید کے دیئے جل رہے تھے۔ ہم ڈرائنگ روم میں پہنچے تو وہ بولی "آپ بیٹھئے، کمل ابھی باتھ روم میں ہیں۔

میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

"آپ کو بمبئی کیسا لگا؟" میں نے پوچھا۔

"اچھا شہر ہے۔ مگر یہاں ہر شخص اپنے کام میں مگن رہتا ہے۔ کسی کو دوسرے کا حال پوچھنے کی فرصت نہیں۔ میں یہاں پہلے بھی آچکی ہوں۔ اُس وقت مجھے بمبئی پسند نہیں آیا تھا۔ لیکن اس دفعہ کی بات اور ہے۔ اب یہ شہر مجھے اچھا لگتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ مسکرائی میں نے سوچا یہ لڑکی بہت جلد سب باتیں سیکھ رہی ہے۔ وہ بمبئی کو اس لئے پسند کرتی ہے کہ یہاں اس کا ہونے والا پتی رہتا ہے۔

ہم ابھی باتیں کر رہے تھے کہ کمل آگیا۔ اُس نے شوبھا سے کوئی بات نہیں کی۔ شوبھا نے اس کے لئے چائے بنائی۔ چائے میں شکر نہیں ڈالی، دودھ نہیں ڈالا۔ اُسے معلوم تھا کہ کمل بغیر دودھ اور شکر کی چائے لیتا ہے۔ واہ۔ یہ لڑکی بہت تیزی سے کمل کے طور طریقوں سے واقفیت حاصل کر رہی ہے۔ میں نے دل میں سوچا۔

کمل نے چائے پی اور بولا "چلو، باہر چلیں۔"

باہر آسمان پر بادل تھے۔ موسم خوش گوار تھا۔ کمل نے گاڑی کا رُخ جوہو کی طرف موڑ دیا۔ جوہو پہنچ کر ہم دونوں سمندر کے کنارے ٹہلنے لگے۔ کمل نے کہنا شروع کیا "تم نے شوبھا کو دیکھا؟ وہ تمہیں کیسی لگی؟"

میں نے جواب دیا "اچھی خاصی لڑکی ہے۔ خوب صورت ہے۔ اچھے [illegible] کی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ تمہارا کتنا خیال کرتی ہے۔ آج جس انداز سے اُس نے تمہارے لئے چائے بنائی، اُس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ تمہارے لئے ایک سلیقہ مند اور سمجھدار بیوی ثابت ہوگی۔"

کمل بھڑک اُٹھا "مجھے تم سے یہی اُمید تھی، لیکن میرے دوست یہ شادی کا معاملہ ہے ملازمت کا انٹرویو نہیں۔ اس کے ماں باپ نے مجھے پسند کیا، اس لئے وہ مجھے پسند کرنے پر مجبور ہے۔ کیا وہ مجھے دل سے چاہتی ہے؟ میں اس کے لئے روٹی، کپڑے اور تحفظ کا سرچشمہ ہوں۔ وہ میرے لئے ایک چلتی پھرتی مشین سے زیادہ کچھ نہیں بن سکتی۔" کمل بولے جا رہا تھا۔ وہ میری کوئی بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ وہ مصر تھا کہ وہ محبت کی شادی کرے گا۔ ورنہ تمام عمر کنوارہ رہے گا۔ میں خاموش ہو گیا۔ میرے دل میں شوبھا کے لئے ہم دردی کا جذبہ جاگ اُٹھا۔ اس بے چاری کا کیا قصور ہے؟ زمانے کی ریت نبھا رہی ہے۔ اس سے زیادہ کیا کر سکتی ہے؟ کمل بولے جا رہا تھا "میں ہرگز یہ شادی نہیں کروں گا۔ وہ خود ہی مایوس ہو کر گھر چلی جائے گی۔"

کمل مجھ سے ہر اتوار کو ملتا۔ میں اس سے کرید کرید کر شوبھا کے بارے میں معلوم کرتا میرا خیال تھا کہ اتنے دن ساتھ رہنے سے کمل کے دل میں شوبھا کے لئے اُنسیت پیدا ہو جائے گی اور شوبھا کی محبت ٹھکانے لگنے لگے گی، لیکن مجھے ہر بار ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس طرح چار مہینے گذر گئے۔ میں کبھی کبھی شوبھا کی حمایت میں بولتا، لیکن وہاں تو مُرغے کی وہی ایک ٹانگ تھی "شادی کروں گا تو محبت کی، ورنہ نہیں۔"

میں اب کمل کی طرف سے ناامید ہو گیا تھا۔ مجھے بار بار شوبھا کا خیال آتا۔ اس طرح ہونے والی سسرال میں رہنے اور ٹھکرائے جانے سے اُسے کتنی اذیت پہنچتی ہوگی، مگر میں مجبور تھا۔ میں اس کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ کمل پر میرا بس چلتا تھا، لیکن میں یہاں بھی ہار گیا۔

ایک اتوار کو میں حسب معمول کمل کے گھر پہنچا۔ شوبھا نے دروازے پر میرا استقبال کیا۔ کمل گھر پر نہیں تھا۔ میں ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اس کا استقبال کرنے لگا۔ شوبھا میرے سامنے آکر بیٹھ گئی۔ اب اس کی آنکھوں میں اُمید کے دیئے روشن نہیں تھے۔ وہ کچھ بجھی بجھی سی تھی۔ وہ چائے بناتے ہوئے بولی۔ "آپ جب اگلی اتوار کو آئیں گے تو میں یہاں نہ ہوں گی۔" میں نے پوچھا "کیوں؟"

وہ بولی "میں جا رہی ہوں۔ میں نے پتاجی کو لکھ دیا ہے، وہ تین چار روز بعد مجھے لینے آجائیں گے۔"

میں نے پوچھا "مگر تم کیوں جا رہی ہو؟" اس نے جواب دیا "اب میرے سامنے

سے کیا فائدہ ہے؟"

میں بات سمجھ گیا۔ اب اس سے اور کچھ پوچھنا بے کار تھا۔ شوبھا چلی جائے گی۔ اس کے بعد اس کے ماں باپ کوئی اور گھر تلاش کریں گے۔ شوبھا کو وہاں بھیجیں گے۔ جب تک اُسے کامیابی نہ ہو جائے، یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ میں اس کی بے بسی دیکھ کر کانپ اٹھا۔

شوبھا نے شاید میرے دل کی بات پڑھ لی۔ وہ بولی "آپ اُن کے دوست ہیں۔ اُن کے دل کا حال جانتے ہیں۔ بتائیے انہوں نے مجھ میں کون سی کمی دیکھی جس کی وجہ سے وہ مجھے ٹھکرا رہے ہیں۔ سچ سچ بتلائیے۔ کیا وہ کسی اور لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟"

میں نے کہا "نہیں — یہ بات نہیں۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو کمل تم سے صاف صاف کہہ دیتا۔ وہ لگی لپٹی رکھنے والا انسان نہیں۔ اُسے دکھاوے سے نفرت ہے۔"

شوبھا بولی "میری سمجھ میں نہیں آتا آخر وہ کیا چاہتے ہیں؟"

میں نے سوچا اُسے بتا دینے میں کیا حرج ہے۔ جی کڑا کر کے بولا "وہ محبت کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔ جب تک انہیں یقین نہ ہو جائے کہ تم اُن سے محبت کرتی ہو، وہ تم سے شادی نہیں کریں گے۔" شوبھا کی بھنویں تن گئیں۔ اس کی پیشانی پر ناگواری کے اثرات ظاہر ہونے لگے۔ وہ تنک کر بولی "محبت؟ محبت کا شادی سے کیا تعلق ہے؟ میرے ماں باپ نے مجھے یہاں شادی کے لئے بھیجا ہے، محبت کرنے کے لئے نہیں۔"

میں نے کہا "تم اپنی رائے کی مالک ہو۔ تم نے مجھ سے کمل کے بارے میں پوچھا تھا۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا، میں نے تمہیں بتا دیا۔"

شوبھا سنجیدہ ہو گئی۔ وہ نظریں جھکا کر کچھ سوچتی رہی۔ پھر بولی "کیا آپ واقعی سچ کہہ رہے ہیں کہ وہ محبت کے بغیر شادی نہیں کریں گے؟"

میں نے جواب دیا "نہیں — وہ محبت کے بغیر شادی ہرگز نہیں کریں گے۔ یہ اُن کا اٹل فیصلہ ہے۔"

شوبھا خاموش ہو گئی۔ کمل ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ میں نے اس کا انتظار نہ کیا اور شوبھا سے رخصت لے کر گھر آ گیا۔

شوبھا سے ملاقات کے تیسرے روز میں دفتر میں بیٹھا تھا کہ کمل اچانک آ گیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک گلابی رنگ کا لفافہ تھا۔ اُس نے آتے ہی بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ خوشی اس کے رُوئیں رُوئیں سے پھوٹ رہی تھی۔ میں حیران تھا کہ آخر ماجرا کیا ہے؟ کیا شوبھا چلی گئی؟ کیا وہ اس کے جانے کی خوشی منا رہا ہے؟ مجھے اس کی یہ بات اچھی نہیں لگی۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے وہ بول اٹھا "رمیش میرے دوست، میری شادی ہو رہی ہے — اگلی اتوار کو۔ یہ تمہارا دعوت نامہ ہے۔"

میں نے بے اختیار پوچھا "اور شوبھا؟ اس کا کیا ہو گا؟"

کمل بولا "ارے پگلے، میں شوبھا سے ہی شادی کر رہا ہوں۔"

میں حیران رہ گیا۔ جو کام چار مہینے میں پورا نہیں ہوا، وہ یکایک دو روز میں کیسے پورا ہو گیا۔ ایسا کون سا جادو ہو گیا کہ کمل نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ کیا اُس نے اپنی ضد چھوڑ دی۔ مگر یہ سب اچانک کیسے ہو گیا۔ کمل میرے دل کی حالت سمجھ گیا۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ میں محبت کی شادی کروں گا۔ آخر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔" کمل مسکراتے ہوئے بولا۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کمل محبت کی شادی کر رہا ہے اور اس کی شادی شوبھا سے ہو رہی ہے۔ کل تک وہ جس شوبھا کے سائے سے بھی کتراتا تھا، آج وہی شوبھا اُس کی محبوبہ کیسے بن گئی۔

کمل نے میری مشکل حل کر دی۔ بولا "اتوار کی رات کو اپنے کمرے میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کہ شوبھا میرے پاس آئی۔ اُس نے اپنی زبان سے میری محبت کا اقرار کیا۔ وہ میری محبت میں مہینوں سے تڑپ رہی تھی، لیکن میری بے اعتنائی دیکھ کر اُس کی محبت جواب دے جاتی تھی۔ اُس نے اعتراف کیا کہ میں وہ پہلا شخص ہوں جس کے لئے اُس نے اپنا دل ہارا ہے۔ بے چاری شوبھا — میں بھی کتنا بے وقوف ہوں جو اُس کے دل کی بات نہ پڑھ سکا۔ اُس نے میری محبت میں بہت دکھ اٹھائے ہیں، مگر اب دکھ کا زمانہ بیت گیا ہے۔ میں نے اُس کے دل کی بات جان لی ہے۔ اگلے اتوار کو ہماری شادی ہے۔ تمہیں خاص طور پر دعوت دینے آیا ہوں۔ ابھی کئی جگہ جانا ہے۔ شادی کا انتظام کرنا ہے۔ معاف کرنا میں جلدی میں ہوں۔"

یہ کہہ کر اُس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر چلا گیا۔

پیاس لگے ساون میں

او نرموہی سجنا
تجھ سے میرا
جنم جنم کا ناطہ رے
میں نے تو ہر یُگ میں
تیرا ساتھ نبھایا
تجھ ہی کو تو پوجا رے
پت جھڑ بیتی، برکھا آئی
پھولوں پہ مسکان سجی
کالا بادل مینہہ برسائے
بہتی ندیا شور مچائے
پر یہ پاپی منوا نگوڑا
ساون میں بھی پیاسا رہے!
ساری رینا نیر بہاؤں
بھور بھئے، سو جاؤں
پل دو پل کی بات نہیں ہے
صدیوں کا یہ رونا رے
تجھ بن کیسا جینا رے
نیل گگن میں جتنے تارے
اتنے ہی میں پھول سجاؤں
تیری راہ نہاروں
یہ بھی کیسا ناطہ رے

اب تو سجنا آ جا رے!!

احمد کلیم فیض پوری



ساجن

جانے کیا کیا ساجن میرے
چھین چکے ہیں مجھ سے، سکھی ری
آنکھوں کا کاجل!
ماتھے کی بندیا!
ہاتھوں کی مہندی!
جُوڑے کا گجرا!

کتنے دنوں سے
آنگن میرا
سُونا سُونا
لاگے سکھی ری
جانے کیا کیا ساجن میرے
چھین چکے ہیں مجھ سے، سکھی ری

امبوا پہ جھُولے ڈالوں کیسے
پی کی بولی بولوں کیسے
بادل کارے گھِر گھِر آئیں
من میں مورے آگ لگائیں
بھید سکھی ری کھولوں کیسے
چین میرا سب چھین لیا ہے
جانے کیا کیا ساجن میرے
چھین چکے ہیں مجھ سے، سکھی ری

اب کے برس بھی آئے نہ ساجن
سکھ کا سندیسہ لائے نہ ساجن
برہا کی ماری
سب سے ہاری
کس سے کہوں — میں ؟
"اب کے برس جو
آئے تو پھر جائے نہ ساجن!"

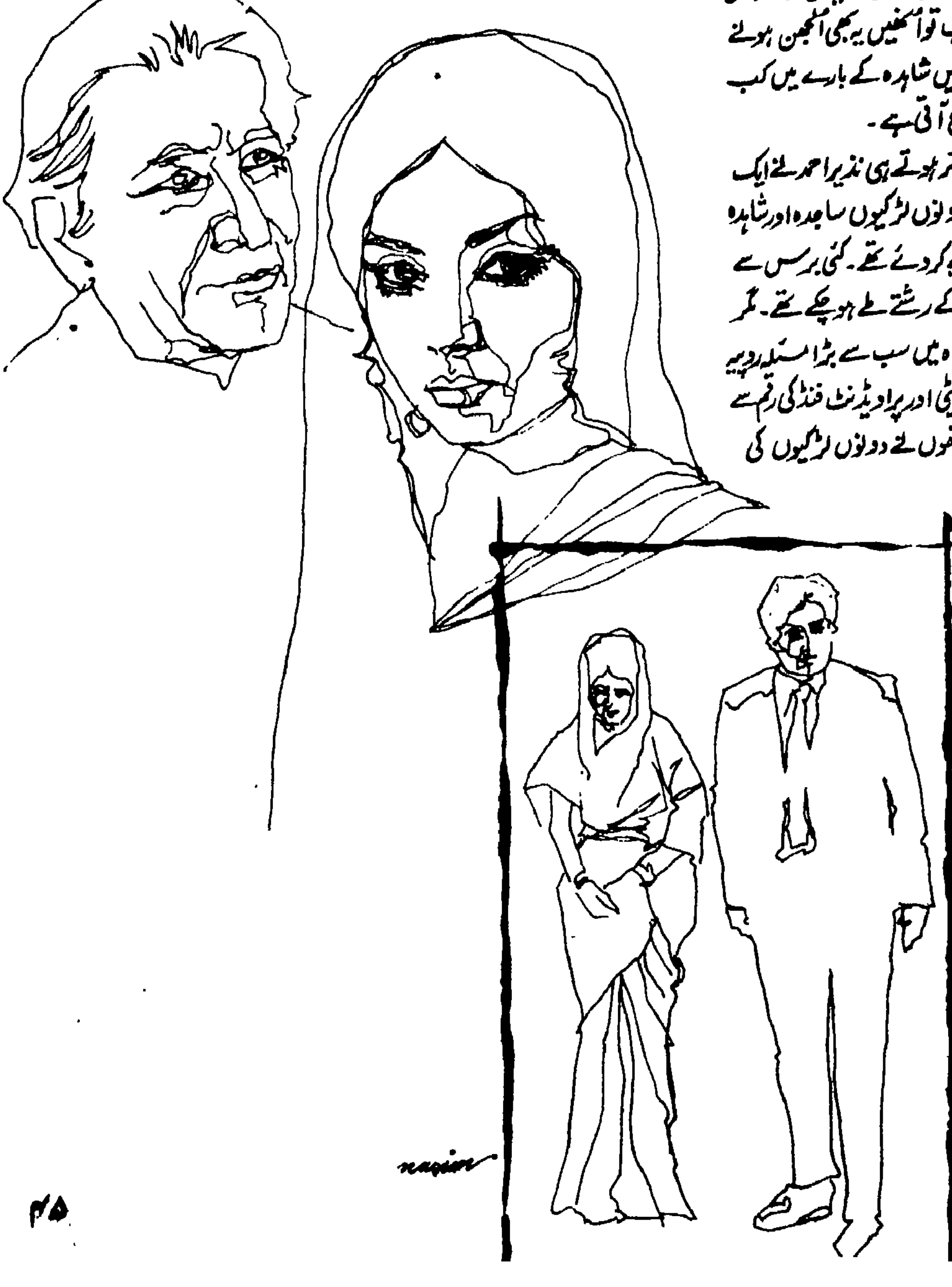
زرینہ زریں

گھر کی عزت

طٰہٰ آفندی

نذیر احمد کی راتوں کی نیند اور دن کا چین تو اسی روز سے اڑ گیا تھا جب انور میاں کا کارڈ آیا تھا کہ ساجدہ کا پاؤں بھاری ہے۔ دونوں لڑکیوں کی شادی سے فارغ ہو کر اُنھوں نے ابھی اطمینان کی سانس لی بھی نہ تھی کہ یہ نئی ذمہ داری آپڑی۔ اب تو اُنھیں یہ بھی اُلجھن ہونے لگی کہ پتہ نہیں شاہدہ کے بارے میں کب ایسی اطلاع آتی ہے۔

ریٹائر ہوتے ہی نذیر احمد نے ایک ساتھ اپنی دونوں لڑکیوں ساجدہ اور شاہدہ کے ہاتھ پیلے کر دئے تھے۔ کئی برس سے ان دونوں کے رشتے طے ہو چکے تھے۔ مگر شادی کی راہ میں سب سے بڑا مسئلہ روپیہ کا تھا۔ گریجویٹی اور پراویڈنٹ فنڈ کی رقم سے جیسے تیسے اُنھوں نے دونوں لڑکیوں کی



شادی کی اور دونوں اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔

پھر زمانے کا دستور نبھانے کا وقت آگیا۔ پہلی زچگی میکے میں ہوتی ہے۔ سوچ سوچ کر نذیر احمد سوکھ کر کانٹا ہوگئے۔ پہلے ہی دھان پان آدمی تھے۔ بڑی مشکل سے میاں بیوی کی گذر پنشن پر ہو رہی تھی۔ ریٹائرڈ ٹیچر کی پنشن ہی کتنی ہوتی ہے۔ اب یہ نیا خرچ کہاں سے پورا ہو؟

بڑے داماد انور میاں جنگلات میں چوکی دار تھے۔ بوڑھے باپ کے سوا ان کا اور کوئی نہ تھا۔ اور پھر تنخواہ کے علاوہ کچھ اوپر کی آمدنی بھی ہو جاتی تھی۔ نذیر احمد بے حد خوش تھے کہ ساجدہ اچھی قسمت لائی۔ مگر اب وہ کیا کریں؟

ایک روز انور میاں ساجدہ کو لے کر آ ہی گئے۔

لپکتے جھپکتے ماں باپ دروازے کی طرف دوڑے۔ ساجدہ روتی ہوئی ماں سے لپٹ گئی۔ باپ کے پاؤں چھوئے۔ نذیر احمد ساری فکریں بھول کر پدرانہ شفقت سے پگھل گئے اور شکایت آمیز لہجہ میں داماد سے بولے "انور میاں ایسی بھی کیا مصروفیت؟ اپنی آمد کا ایک کارڈ لکھ دیا ہوتا۔ ہم اسٹیشن پر آجاتے۔"

"کیا بتاؤں بابا" انور میاں بہانہ ڈھونڈتے ہوئے بولے بڑی مشکل سے چھٹی ملی اور پھر اچانک ہی آنے کا پروگرام بن گیا۔"

رشتہ داروں کی اِدھر اُدھر کی باتوں میں رات تو کٹ گئی۔ صبح ہوتے ہی نذیر احمد کو فکر لگ گئی۔ داماد گھر میں ہے۔ جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں پنشن ملنے میں ابھی پانچ دن باقی ہیں۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کریں تو کیا کریں؟ مہمان گھر میں ہو تو کچھ نہ کچھ اہتمام کرنا ہی پڑتا ہے۔ اور پھر بیٹی داماد کو ایک طرف کا سفر خرچ بھی دینا ہے۔ آج کل ساہوکار بھی قرض نہیں دے رہے تھے خصوصاً پنشن پانے والوں سے تو وہ بہت ہی بے رُخی برت رہے تھے۔ جب سے حکومت نے سودی لین دین کے معاملے میں سختی کی تھی ساہوکار بھی محتاط ہوگئے تھے۔ کون پیسے دے کر فضول کا دردِ سر مول لے؟

بہت دیر تک میاں بیوی نے کھسر پھسر کی۔ آخر نذیر احمد نے بیوی کی بنارسی ساڑی تھیلے میں ڈالی اور چپکے سے باہر نکل گئے کہ کہیں داماد کی نظر نہ پڑ جائے۔ مجبوری کیا کیا کام کرواتی ہے۔ اس سے پہلے بھی کئی بار یہ بنارسی ساڑی رہن گھر ہو آئی تھی۔ اور آڑے وقتوں کا سہارا بھی تھی۔ یہ نذیر احمد کو اپنی شادی میں ملی تھی۔ پرانے وقت کی قیمتی چیزوں میں لے دے کے بس یہی ایک چیز باقی رہ گئی تھی۔

مگر آج کوئی بھی ساہوکار اس ساڑی کو رہن رکھنے پر تیار نہیں تھا۔ دل پر پتھر رکھ کر انھوں نے فیصلہ کیا کہ چلو ساڑی فروخت ہی کئے دیتے ہیں۔ مگر کوئی خریدنے والا بھی نہ تھا۔ تقدیر بھی ضد پر اتر آئی تھی۔ سونے کی کوئی چیز ہوتی تو کبھی کی بک جاتی۔ سونا تو ہر حال میں خریدا جا سکتا ہے۔

صبح سے دوپہر ہوگئی اور پیسے مہیا کرنے کی کوئی صورت نہ نکلی۔ نذیر احمد کو یوں محسوس ہوا جیسے اُن کی کمر بیٹھ جائے گی۔ گھر کی عزت خاک میں مل جائے گی۔

وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح گھر میں داخل ہوئے۔ بیوی نے دیکھتے ہی تاڑ لیا کہ کام بنا نہیں۔ وہ بے چاری بھی کیا کر سکتی تھی۔ روہانسی ہو کر رہ گئی۔ ساری زندگی لڑکیوں کی پرورش اور شوہر کی خدمت میں گذر گئی۔ اب لڑکیوں کی شادی کے بعد زمانے کے دستور اور رسمیں نبھانا تھا۔ انور میاں سفر کی تکان دور کرنے کے لئے دالان میں سو رہے تھے۔ دوپہر ہو چلی تھی اور ابھی تک صرف چاول اور دال ہی آبالی گئی تھی۔

نذیر احمد چپ چاپ بیوی کے پاس آکر بیٹھ گئے۔ تھیلا انھوں نے ایک طرف رکھ دیا۔ بولتے بھی تو کیا بولتے؟

چند لمحے بعد قدموں کی آواز سن کر دونوں نے چونک کر دیکھا۔ ساجدہ کمرے میں آرہی تھی۔ بغیر کچھ کہے ساجدہ نے اپنا ہاتھ نذیر احمد کی طرف بڑھا دیا۔ اس کی ہتھیلی میں کانوں کا جھمکا چمک رہا تھا۔ نذیر احمد نے شادی پر آدھے تولے کے دو جھمکے ساجدہ کو دیئے تھے۔ بیٹی کی ہتھیلی میں جھمکا دیکھ کر وہ سارا مطلب سمجھ گئے۔ بیٹی ہی ماں باپ کی مجبوری سمجھ سکتی ہے۔

"بیٹی ...." وہ کچھ کہنا چاہتے تھے، لیکن ساجدہ دھیمی آواز میں ان سے پہلے بول پڑی "اُن سے کہہ دوں گی کہ کہیں گم ہوگیا۔ گھر کی عزت کا سوال ہے بابا"

نذیر احمد مٹھی بند کئے، سر جھکائے بھاری قدموں سے بازار کی طرف چل دیئے۔

■■

ں نے عقیدت کے جوش میں بچہ قربان کر دیا

ن سلطانہ



فلفل نسا آسام کی رہنے والی ہے۔ اس
عمر تیس سال ہے۔ اُس کی شادی دس سال
عمر میں ہی ہوگئی تھی۔ اس کے گاؤں کا نام —
ری ہے، جو آسام میں کامروپ اور درنگ
لی سرحد پر واقع ہے۔ فلفل نسا اپنے شوہر
شہر علی کے ساتھ رہتی ہے۔ اُس کے یہاں چھ
پیدا ہوئے۔ سب سے بڑا لڑکا شیر خوارگی میں
ہ بسا۔ حال ہی میں اُس نے اپنے سب سے
ٹے بیٹے دولو کو اپنے پیر کی نذر کر دیا۔ یہ نذر
ھڑیاں بپا کر دی گئی۔ اس عورت کے پاس
پیر کو خوش کرنے کے لئے کوئی چیز نہیں تھی۔
راس نے اپنے عزیز بچے کی قربانی دے دی۔
پیر صاحب کا نام سید کفیل الدین خوندکار
۔ وہ مُرشد آباد کا رہنے والا ہے۔ اُس کی
م سال ہے۔ وہ بڑا صحت مند اور خوبرو
ہے۔ وہ ہمیشہ دورے پر رہتا ہے۔ اُس
یدوں کا حلقہ وسیع ہے۔ کچھ بنگالی مسلمان جو
ایں آباد ہو گئے ہیں، اس پیر کو بہت مانتے ہیں۔
سا اس پیر کو بیس سال سے جانتی ہے۔ وہ بہت
رت ہے اُسے اس فقیر سے بے انداز عقیدت
س نے اپنے گھر میں ایک گوشہ بنا رکھا ہے
یشہ پاک صاف رہتا ہے۔ یہاں فلفل نسا
تی ہے۔ گزشتہ سال جب کفیل الدین اس
ں میں آیا تو فلفل نسا کو اپنی غربت کا شدید
س ہوا۔ ہر مُرید نے اپنی بساط کے مطابق پیر
ب کو نذرانہ دیا۔ لیکن یہ عورت اپنی غربت کی
مجبور تھی۔ اُس نے سوچا "میں اپنے پیر کو کچھ
ہ دے سکی۔ یہ میری بدنصیبی ہے۔ مگر میں
ہ تو نکال کر اُس کے پیروں پر رکھ سکتی ہوں۔"
کر یہ کام بھی انجام پا جاتا مگر وہ اُمید
سے تھی، وہ اس لئے اپنی بدنصیبی پر آنسو بہا کر چپ
ہو گئی۔

اس سال فقیر کفیل الدین گیارہ دن
کے لئے اس گاؤں میں آیا۔ وہ حسب معمول اپنے
مُرید باتو میاں کے یہاں ٹھیرا۔ باتو میاں کا گھر
فلفل نسا کے گھر سے تین سو گز دور ہے۔ فقیر کے اعزاز
میں روز مجلس منعقد ہوتی۔ فلفل نسا پابندی سے ان
مجلسوں میں شریک ہوتی۔ ایک دن اُس نے مجلس
میں پیر کا پیغام سُنا، مگر یہ پیغام حاضرین میں سے کسی
نے نہیں سُنا۔ دراصل یہ سب اُس کے لاشعور کی
کارستانی تھی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ پیر اس سے کچھ
مانگ رہا ہے۔ وہ اس کے لئے اپنا سب کچھ قربان
کر سکتی تھی، مگر اپنی غربت سے مجبور تھی۔ پیر کے شایانِ
شان کوئی نذر اُس کے پاس نہیں تھی۔ فقیر نے اعلان
کر دیا کہ وہ کچھ روز میں اُس گاؤں سے رُخصت
ہو جائے گا۔ فلفل نسا کی بے چینی اور بڑھ گئی۔

فقیر کے جانے میں تین روز باقی تھے۔ فلفل نسا
نے اُسے خواب میں دیکھا۔ فقیر مسکرایا اور غائب ہو گیا
دو روز بعد اُس نے پھر خواب دیکھا۔ سفید لباس
میں ملبوس دو عورتیں اس سے سوال کر رہی تھیں
کہ وہ خدا سے اپنی عقیدت کو کس طرح ثابت کر سکتی
ہے؟ اُس کے پاس خدا کی محبت کا کیا ثبوت ہے!
فلفل نسا نے ثبوت کے طور پر وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا
اس دوران اُس کے بچے دولو کی آنکھ کھل گئی اور
اُس نے رونا شروع کر دیا۔ فلفل نسا جاگ گئی۔

پیر کو ۱۳ اپریل کو گاؤں سے رُخصت
ہونا تھا۔ ۱۲ اپریل کو تمام مُرید باتو میاں کے
یہاں پیر کو الوداع کہنے کے لئے جمع ہو گئے۔ فلفل نسا
پریشان تھی۔ کل پیر چلا جائے گا اور وہ اُسے کچھ نہ
دے سکے گی۔ یہ خیال اس کے لئے سوہانِ روح بن
گیا۔ وقت تنگ تھا۔ وہ کیا کرے؟ کس طرح پیر کے
تئیں اپنی عقیدت کا ثبوت پیش کرے؟ اُسے تمام
رات نیند نہیں آئی۔ وہ پیر کو بغیر نذر دئے نہ جانے
دے گی۔ اُسے یکایک خیال آیا: کیوں نہ وہ اپنے
سب سے چھوٹے بچے کی قربانی پیش کر دے؟
بچے سے زیادہ قیمتی چیز کیا ہو سکتی ہے؟ اُس نے فیصلہ
کر لیا کہ وہ دولو کی قربانی پیش کرے گی۔ اس
وقت آدھی رات بیت چکی تھی۔ صبح کو پیر گاؤں سے
چلا جائے گا۔ اُس کے پاس سوچنے سمجھنے کا وقت
نہیں تھا۔ وہ پیر کی محبت میں اندھی ہو چکی تھی۔
اس نے آہستگی سے بچے کو اٹھایا، اور آخری بار
پیار کیا، آخری بار اُس کو اپنے سینے سے لگا کر دودھ
پلایا۔ اس کے بعد اس کو جلدی سے اٹھا کر گھر
کے ایک کونے میں لٹا دیا۔ پھر اس نے چھری اٹھائی
اور بسم اللہ کہہ کر بچے کے گلے پر پھیر دی۔ اُس
نے جلدی جلدی بچے کے سینے، پیٹ اور ہاتھوں کا

گوشت کاٹا، اُس کی بوٹیاں بنائیں اور ہنڈیاں میں ڈال کر پکالیں۔

صبح کو جب فلفل نسا اپنے بچّے کا سالن اور چاول پلیٹ میں رکھ کر پیر کے پاس لے گئی تو پیر ناشتہ کر چکا تھا۔ اُسے گوہاٹی کے لئے روانہ ہونا تھا۔ اُس نے اپنے مُریدوں سے کہا کہ وہ اُسے مل بانٹ کر کھالیں۔ بچّے کا باپ شیخ مظہر اُس دن گاؤں میں موجود نہیں تھا وہ کسی کام سے قریب کے گاؤں چلا گیا تھا۔ جب مُرید کھانے کے لئے بیٹھے تو انہیں گوشت میں عجیب سی بُو محسوس ہوئی۔ وہ آپس میں بحث کرنے لگے۔ اُن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کس جانور کا گوشت ہے۔ انہوں نے فلفل نسا سے پوچھا۔ وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ وہ مونہہ ہی مونہہ میں بڑبڑا رہی تھی۔ اس کا جواب کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ پیر نے مُریدوں کو مشورہ دیا کہ اگر انہیں یہ گوشت اچھا نہیں لگتا تو وہ اُسے دریا میں پھینک دیں۔

جب اس اندوہ ناک واقعہ کا انکشاف ہوا تو پیر گاؤں سے روانہ ہو چکا تھا۔ فلفل نسا کے بڑے بچّے نے گھر کے کونے میں ایک پوٹلی دیکھی۔ جب اُس نے یہ پوٹلی کھولی تو اُس میں سے کچھ خون آلود کپڑے برآمد ہوئے۔ اُس نے گھبرا کر پڑوسیوں کو اطلاع دی۔ پڑوسیوں نے گھر میں گھس کر تلاشی لی تو انہیں دو لوکے جسم کے باقی ماندہ ٹکڑے بھی مل گئے پولیس نے فلفل نسا کو قتل کے جرم میں گرفتار کر لیا۔

فلفل نسا آج کل حوالات میں ہے۔ گوہاٹی میڈیکل کالج کے شعبۂ نفسیات کا ایک کارکن اُس کا نفسیاتی امتحان لے رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہ پاگل ہے، سنکی ہے یا اس پر جادو کیا گیا ہے کامروپ کا ضلع کالے جادو کے لئے مشہور ہے جب فلفل نسا سے پوچھا گیا کہ اس نے اپنے بیٹے کی قربانی کی خبر کیوں چھپائی تو اس نے جواب دیا "میں چاہتی تھی کہ سب سے پہلے پیر کو اس کی خبر ہو۔ میں نے اسی کے لئے اپنے بچّے کا گوشت پکایا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ میری قربانی رائیگاں نہیں گئی۔" وہ پیر کو کئی دفعہ خواب میں دیکھ چکی ہے۔ ایک دفعہ اُس نے مقتول بچّے کی لاش بھی خواب میں دیکھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُسے اس بات کا کوئی غم نہیں وہ مطمئن ہے۔ جیل میں اُس کا بیان ٹیپ کیا گیا۔ یہ ٹیپ اُسے سنا دیا گیا۔ مگر اُس کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔ وہ یہی کہتی تھی کہ اللہ نے مجھے بچّہ دیا' اب میں نے اُس کی امانت اُسے لوٹا دی ہے۔

پیر نے فلفل نسا کو بتایا تھا کہ اُس کی ایک بیوی ہے۔ بعد میں اُسے اپنے رشتہ داروں سے معلوم ہوا کہ پیر نے کسر نفسی سے کام لیا۔ اُس کی تین بیویاں ہیں اور کئی بچّے ہیں۔

عاصمی رضا ملک، بھاگلپور

س۔ کیا غریب اور ایمان دار آدمی اس دنیا میں عزت کے ساتھ جی سکتا ہے؟

ج: دنیا میں کروڑوں غریب اور ایمان دار آدمی عزت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ غریب آدمی کے لئے ایمان داری کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں۔

نزہت پروین، محبوب نگر

س۔ زندگی حسین تحفہ ہے یا غموں کا بوجھ؟

ج: یہ آپ کے نقطۂ نظر پر منحصر ہے۔ اگر آپ تصویر کا روشن پہلو دیکھنے کی عادی ہیں تو زندگی ایک حسین تحفہ ہے۔ ورنہ غموں کا بوجھ

س۔ صرف اپنے ہی لئے جینے والوں کا کیا حال ہوتا ہے؟

ج: لوگ اس کے دکھ درد میں شریک نہیں ہوتے نہ ہی اس کی موت کا سوگ منایا جاتا ہے۔

س۔ تقدیر کیسے بگڑ جاتی ہے ---؟

ج: جب انسان یہ یقین کرلے کہ اس کی تقدیر بگڑ گئی ہے۔

نور جہاں بیگم نواب اصغر علی، دھنباد بازار

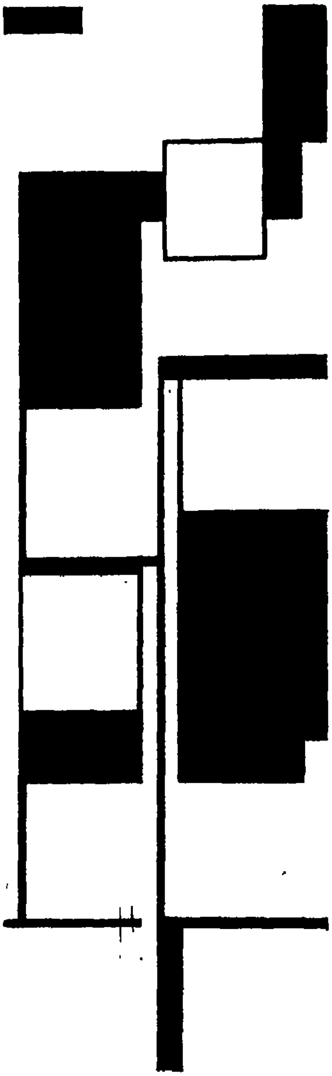
س۔ زیادہ تر عورتیں ہی شکی کیوں ہوتی ہیں؟

ج: عورتوں کو تحفظ کی ضرورت مردوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ وہ اپنے تحفظ کی بقا کے لئے ہر وقت چوکنی رہتی ہیں۔ یہی چوکنا پن شک میں بدل جاتا ہے۔

وقار احمد خاں بیراگی، سدا مڈھیہ دھنباد

س۔ انسان فراخ دلی سے کب کام لیتا ہے؟

ج: جب وہ فطری طور پر فراخ دل ہو۔ ورنہ اپنا کام نکالنے کے لئے۔ یا دوسروں سے اپنی تنگ دلی چھپانے کے لئے۔



س۔ انسان کو اپنی زندگی بہترین بنانے کے لئے کیا کرنا چاہئے؟

ج: زندگی کے چھوٹے موٹے فیصلے دماغ کی ہدایت کے موجب کرنا اور بڑے فیصلے کے لئے دل کو ٹٹولنا۔

اقبال شاکر، بھلائی نگر

س۔ ہندوستان کی عورتیں کس بات میں سب سے آگے ہیں؟

ج: خود کو مردوں کا غلام سمجھتی ہیں۔

س۔ عورتوں کی فرمائش اور مردوں کی آزمائشیں کب ختم ہوں گی؟

ج: جب تک فرمائشوں کے پورا کرنے والے اور آزمائش میں ڈالنے والیاں زندہ ہیں یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔

مس نیلو، علی گڑھ

س۔ انسان کا مخلص دوست کون ہوتا ہے؟

ج: انسان کا سب سے مخلص دوست خود اس کی اپنی ذات ہے۔

س۔ کیا اور داغوں کی طرح دل کا داغ بھی دھل سکتا ہے؟

ج: جی ہاں۔ دل کا داغ دھل تو جاتا ہے لیکن اپنا نشان چھوڑ جاتا ہے۔

صبیحہ ممتاز، بہار شریف

س۔ کام یابی محنت کرنے سے حاصل ہوتی ہے؟

ج: کام یابی محنت سے زیادہ یقین کا نتیجہ ہوتی ہے۔

خواجہ نذیر الدین، حیدرآباد

س۔ سب سے مخلص انسان کون ہے؟

ج: جو منہ پر آپ کی تعریف کرے۔

س۔ سب سے مقدس رشتہ کون سا ہے؟

ج: استاد اور شاگرد کا۔

اس عنوان کے تحت دل چسپ معلوماتی اور ذہنی سوالات کے جواب دئے جاتے ہیں۔ ایک کاغذ یا پوسٹ کارڈ پر زیادہ سے زیادہ تین سوال لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کے لئے جگہ چھوڑیئے اور اپنا پورا نام پتہ لکھئے جس کاغذ یا کارڈ پر سوالات ہوں اس پر دفتر سے متعلق اور کوئی بات نہ لکھئے۔ اپنے سوالات اس پتہ پر بھیجئے: بزم بانو

ماہ نامہ بانو ۴ آصف علی روڈ، نئی دہلی

ایم۔ اعجاز سرور، جینت گڑھ، بہار

س: احساس برتری اور غرور کیا ایک ہی چیز ہے؟

ج: احساس برتری کا دنیا میں کوئی وجود نہیں۔ انسان اپنے کم تر احساس کو چھپانے کے لئے خود تنہائی کا سہارا لیتا ہے۔ یہ صرف اس کے احساس کی تلافی ہے برتری کا احساس در اصل کمتری کے احساس کا دوسرا رُخ ہے۔

س: زندگانی کے تقاضے؟

ج: اپنے رُجحان کی تلاش اور دریافت —— اس کے بعد اس کی نشو و نُما۔

رضیہ تبسّم مسعود عالم، دھرم پور

س: کیا عورت مرد کو مجرم بنا سکتی ہے؟

ج: صرف اس مرد کو جس میں جُرم کا رجحان پہلے ہی موجود ہو۔

ایم نصیر عالم، گوبند پور، دھنباد

س: انسان کی زندگی ایک بُلبُلے کے برابر ہے تو موت؟

ج: بُلبُلے کا پھٹ کر سمندر میں ضم ہو جانا۔

س: پیار کی ڈور کہاں تک چھوڑنی چاہئے؟

حدِ نظر تک بلکہ اس سے بھی آگے۔

س: کیا ہم انسان سچ مچ انسان ہیں؟

ج: بہت تھوڑے لوگ انسان ہوتے ہیں۔ باقی دو پیروں پر چلنے والے جانور ہوتے ہیں۔

ایم۔ قیصر، بھاگل پور

س: انسان ان چیزوں کی تمنا کیوں کر بیٹھتا ہے جنہیں پانا ناممکن ہو؟

ج: انسان خواہش کرنے میں آزاد ہے اس کی خواہشوں پر کوئی پابندی نہیں کسی خواہش کا جلد پورا ہونا اس کی اہمیت کو کم کر دیتا ہے۔ اس لئے انسان ان چیزوں کی تمنا کرتا ہے جن کا پانا مشکل ہے۔ وہ منزل سے زیادہ ذوقِ سفر کو اہمیت دیتا ہے۔

تلاشِ طلب میں وہ لذت ملی ہے
دُعا کر رہا ہوں کہ منزل نہ آئے

محمد سہیل اختر، جمشید پور

س: انسان کو اپنی شہرت کب بوجھ معلوم ہوتی ہے؟

ج: جب وہ اسے بے مانگے مل جائے۔ بعض لوگ مشہور پیدا ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں کو شہرت ورثے میں ملتی ہے اور بعض لوگوں پر شہرت زبردستی لادی جاتی ہے۔ یہی لوگ شہرت کو بوجھ سمجھتے ہیں۔

تبسّم منصور، سہسرام، رہتاس

س: اُداس طبیعت کو خوش کیسے بنایا جائے؟

ج: یہ کوشش چھوڑ دیجئے۔ کبھی کبھی اُداس رہنے میں کوئی حرج نہیں۔

س: ذہنی پریشانی کو کس طرح دُور کروں؟

ج: دو متضاد خواہشوں میں سے ایک کو اپنا لیجئے

س: شوہر کی نظر میں عزت کس طرح پیدا کی جا سکتی ہے؟

ج: زبان میں شیرینی پیدا کر کے۔

ایس۔ محبوب بی، آدونی

س: آدمی تکلیف میں تو خدا کو یاد کرتا ہے اور خوشی میں بھول جاتا ہے؟

ج: انسان بچّے کی مانند ہے وہ کھیل کود میں ماں کو بھول جاتا ہے لیکن چوٹ لگتے ہی اسے پکارنا شروع کر دیتا ہے۔

وقار احمد خاں، بیگم وقار، گریڈیہہ

س: بدگمانیاں کیسے دُور ہو سکتی ہیں؟

ج: بدگمانیاں خود بخود دُور نہیں ہوتیں۔ اس کے لئے پُر خلوص کوشش ضروری ہے۔

س: کون لوگ بُرا کام کر کے بھی فخر محسوس کرتے ہیں؟

ج: جو بُرے کام کے عادی ہیں۔ ایک چور اپنی پہلی چوری پر شرمندہ ہوتا ہے۔ دوسرے موقع پر اس کام کو تسلیم کر لیتا ہے۔ پھر عادی ہو کر فخریہ بیان کرتا ہے۔

س: انسان قابلِ تعریف کب بن جاتا ہے؟

ج: جو قابلِ تعریف کام کر کے بھی تعریف کا خواہش مند نہ ہو۔

ایس۔ ایم۔ گائیڈ، اناؤ

س: مرد عورت کے بغیر نہیں رہ سکتا ہے پھر اسے اتنا حقیر کیوں سمجھتا ہے؟

ج: اسے اپنی محتاجی پر غصّہ آتا ہے اور اس کا غصّہ بجا ہے۔ وہ عورت کو حقیر سمجھ کر اس غصّہ کا اظہار کرتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی کلیہ ہے کہ جب انسان کو اپنی کمزوری پر غصّہ آتا ہے تو وہ دوسروں کو بُرا بھلا کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالتا ہے

رعنا خاتون، نگینہ

س: بھائی! طلاق ایک بُرا قدم ہے۔ پھر لوگ ایسا قدم کیوں اٹھاتے ہیں؟

ج: طلاق جائز چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز ہے۔ کوشش تو یہی ہونی چاہئے کہ اس کی نوبت نہ آئے لیکن بعض اوقات حالات اس قدر بگڑ جاتے ہیں کہ یہ قدم اٹھانا بہتر ہوتا ہے۔

س: طلاق کا سب سے بڑا سبب؟

ج: خودداریوں نے سر کو نہ جھکنے دیا شکیلؔ
حسرت سے ان کے نقشِ قدم دیکھتے رہے

جمیل احمد، گڈی

س: چلتی ہوئی لڑکی مُڑ مُڑ کر پیچھے کیا دیکھتی ہے؟

ج: یہی کہ کوئی "ہر کرم ہمنوا" اس کا پیچھا تو نہیں کر رہے ہیں۔

باورچی خانہ

مزے دار اور آزمودہ پکوان

آزمائش اور ترتیب : رشیدہ خاتون

قیمہ بھرے سموسے

قیمہ (مشین کا باریک)	۳۰۰ گرام
میدہ	۳/۴ پیالی
آٹا	پاؤ پیالی
لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
دھنیا (پسا ہوا)	پاؤ چائے کا چمچہ
سفید زیرہ (پسا ہوا)	آدھا چائے کا چمچہ
ہلدی	پاؤ چائے کا چمچہ
ہرے دھنیے کی پتیاں	ایک ٹیبل اسپون
ہری مرچ کا کچومر	ایک ٹیبل اسپون
ادرک کا کچومر	۲ چائے کے چمچے
پیاز کا کچومر	۲ ٹیبل اسپون
لہسن	آدھا چائے کا چمچہ
گھی	حسب ضرورت
نمک	حسب ذائقہ

ایک دیگچی میں پیاز کا کچومر اور ڈیڑھ ٹیبل اسپون گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں، پیاز بادامی ہو جائے تو اس میں لال مرچ، دھنیا، سفید زیرہ، ہلدی، لہسن نمک اور پاؤ پیالی پانی ڈال کر مسالہ بھون لیں پھر اس میں قیمہ ڈال دیں، قیمے کا پانی بھن جائے تو قیمہ گلنے کے انداز کا پانی ڈال کر دیگچی کو ڈھانپ دیں۔ قیمہ گل جائے اور پانی خشک ہو جائے تو اس میں ہری مرچ اور ادرک کا کچومر اور ہرے دھنیے کی پتیاں ڈال دیں۔ دو چار منٹ بھون کر آنچ سے اُتار لیں۔

میدہ اور آٹے کو ملا کر چھان لیں۔ پھر اس میں نمک اور ایک ٹیبل اسپون گھی ملا کر چپاتی کے آٹے سے ذرا سخت گوندھ لیں اور اس کے چھوٹے چھوٹے آٹھ یا دس پیڑے بنا لیں۔

پیڑوں پر ایک صاف اور موٹا کپڑا گیلا کر کے ڈھانپ دیں اب ایک پیڑے کو چکلے پر بیلن کی مدد سے تقریباً چار انچ کی گولائی میں بیل لیں۔ پھر ایک چھری سے اس کو بیچ میں سے کاٹ کر دو حصے کر لیں۔ ایک حصے کے آدھے حصے پر تھوڑا سا قیمہ رکھ کر اس پر باقی کا آدھا حصہ ڈھانپ دیں اور کناروں کو نم کر کے دبا دیں، تاکہ سموسہ کھُل نہ سکے۔ پھر سموسے پر بھی گیلا کپڑا ڈھانپ دیں۔ اسی طرح تمام سموسے بنا کر رکھ لیں۔ کڑھائی میں کافی گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں گھی گرم ہو جائے تو اس میں دو سموسے ڈال دیں، سموسے ایک طرف سے بادامی ہو جائیں تو اُنہیں پلٹ دیں۔ دوسری طرف سے بھی بادامی ہو جائیں تو کاغذ پر اُتار لیں تاکہ فاضل گھی کاغذ میں جذب ہو جائے گرم گرم سموسوں کو ہری چٹنی یا ٹماٹر کی چٹنی کے ساتھ کھائیں۔

تلے ہوئے انڈے

انڈے	۶ عدد
ڈبل روٹی کے سلائس (بڑے)	۶ عدد
ہرے دھنیے کی پتیاں	۲ ٹیبل اسپون
ہری مرچ	۵ عدد
کیری (کچا آم)	ایک عدد
نمک	حسب ذائقہ
گھی	حسب ضرورت

انڈوں کو سخت اُبال کر چھیل لیں۔ ہری مرچوں کی ڈنڈیاں توڑ لیں۔ کیری کو چھیل لیں اور کاٹ کر گٹھلی نکال دیں۔ پھر کیری، ہری مرچ اور ہرے دھنیے کی پتیوں میں نمک ملا کر سِل پر باریک چٹنی پیس لیں۔ کسی تیز چھری سے ڈبل روٹی کے ٹکڑوں کے کنارے کاٹ دیں۔ ایک گہری اور بڑی پلیٹ میں پانی ڈال کر ڈبل روٹی کے ایک ٹکڑے کو اس میں بھگو دیں ایک منٹ بعد ٹکڑے کو احتیاط سے پانی سے نکال کر ایک ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ لیں دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی سے دبا کر س کا پانی نکال دیں پھر اس پر چھری سے مکھن کی طرح چٹنی لگا دیں۔ اب اس پر ایک انڈا رکھ کر ڈبل روٹی سے اس کو سب طرف سے ڈھانپ دیں اور ہاتھ سے دبا دبا کر گولے کی طرح بنا لیں، اسی طرح تمام انڈوں کے گولے بنا لیں۔

کڑھائی میں زیادہ گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ گھی گرم ہو جائے تو گولوں کو سب طرف سے بادامی تل لیں، بادامی ہو جانے پر کاغذ پر اُتار لیں تاکہ فاضل گھی کاغذ میں جذب ہو جائے پھر انڈے کے گولوں کو چھری سے کاٹ کر ان کے دو دو ٹکڑے کر لیں۔ پلیٹ میں رکھتے وقت انڈے والا رُخ اوپر کی طرف رکھیں۔

دہی بھلّے

دال ماش (دُھلی ہوئی)	۳/۴ پیالی
دہی	۳ پیالی
لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
سیاہ زیرہ (ثابت)	آدھا چائے کا چمچہ
لہسن	ایک چائے کا چمچہ

پیاز (پسی ہوئی) ۲ ٹیبل اسپون
گھی حسبِ ضرورت
نمک حسبِ ذائقہ

دال کو صاف کر کے آٹھ گھنٹے کے لئے بھگو دیں پھر سِل پر باریک پیس کر اُس میں گھی کے علاوہ تمام چیزیں ملالیں اور دال کو اتنا پھینٹیں کہ دال پھول جائے

کڑھائی میں بھرپور گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں اب ایک سفید کاغذ کو تین اِنچ گولائی میں کاٹ لیں۔ اس گول کاغذ کو ہتھیلی پر رکھ لیں اور اس پر تھوڑی دال رکھ کر کاغذ سے برابر کا بھلّا بنالیں۔ پھر بھلّے کو کاغذ پر سے پھسلا کر گھی میں ڈال دیں۔ اسی طرح بھلّے بنا بنا کر گھی میں ڈال دیں۔ بھلّے ایک طرف سے بادامی ہو جائیں تو انھیں گھی سے نکال لیں اسی طرح تمام بھلّے تل لیں۔

ایک دیگچی میں پانچ پیالی پانی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ پانی اُبلنے لگے تو آنچ سے اُتار کر اس میں تمام بھلّے ڈال دیں۔ دو چار منٹ بعد بھلّوں کو پانی سے نکال لیں۔ تھوڑے ٹھنڈے ہو جائیں تو بھلّوں کو ہتھیلیوں سے ہلکے ہلکے دبا کر پانی نکال دیں۔

دہی کو خوب اچھی طرح پھینٹ لیں پھر اس میں آدھی پیالی پانی ملالیں۔ اب آدھے دہی کو ڈش میں ڈال دیں اور اس میں بھلّے ڈال کر باقی بھلّوں کے اوپر ڈال دیں۔ اوپر سے کچالو کا مسالہ چھڑک دیں۔

آلو ٹماٹر کے رول

آلو ۵۰۰ گرام
ٹماٹر ۲۵۰ گرام
ہری مرچ کا کچومر ایک ٹیبل اسپون
ہرے دھنئے کی پتیاں ایک ٹیبل اسپون
پیاز کا کچومر ۴ ٹیبل اسپون
کرم (سوکھی ڈبل روٹی کا چورا) ایک پیالی
انڈا ایک عدد
گھی حسبِ ضرورت
نمک حسبِ ذائقہ

آلوؤں کو دھو کر چھلکوں سمیت اُبال لیں۔ پھر انہیں چھیل کر چمچے سے کچل لیں۔ ٹماٹروں کو دس منٹ کے لئے کھولتے ہوئے پانی میں ڈال دیں پھر پانی سے نکال کر چمچے سے ان کو بھی کچل لیں۔ اس کے بعد چھلنی میں چھان کر ٹماٹروں کا گودا آلوؤں میں ملا دیں، پھوک پھینک دیں، ہری مرچ اور پیاز کا کچومر، ہرے دھنئے کی پتیاں، پاؤ پیالی کرم اور نمک بھی آلوؤں میں ملالیں پھر آلوؤں کے دو اِنچ لمبے اور ایک اِنچ موٹے رول بنالیں۔

انڈے میں دو چائے کے چمچے پانی ملا کر خوب اچھی طرح پھینٹ دیں پھر کڑھائی میں کافی گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ گھی گرم ہو جائے تو رول کو انڈے میں ڈبو کر اس پر کرم لپیٹ دیں، پھر کڑھائی میں ڈال دیں۔ رول بادامی ہو جائے تو کاغذ پر اُتار لیں تاکہ فاضل گھی کاغذ میں جذب ہو جائے اسی طرح تمام رول تل لیں۔ گرم گرم میں ٹماٹر کی چٹنی کے ساتھ کھائیں۔

مکئی کے گل گلے

مکئی کے دانے (پکے) ڈیڑھ پیالی
چینی آدھی پیالی
بادام کی گری ۱۰ عدد
زعفران ایک چٹکی
سوڈا (کھانے کا) ایک چٹکی
گھی حسبِ ضرورت

مکئی کے دانوں کو سِل پر خوب باریک پیس لیں، باداموں کو آدھے گھنٹے کے لئے گرم پانی میں بھگو دیں پھر ان کو بھی سل پر پیس لیں۔ زعفران کو کچھ دیر کے لئے ایک چائے کے چمچے بھر پانی میں بھگو دیں۔ پھر کھرل میں پیس لیں۔

گھی اور سوڈے کو چھوڑ کر باقی سب چیزوں کو ایک جگہ ملا کر خوب پھینٹیں پھر اس میں سوڈا بھی شامل کر لیں۔

کڑھائی میں کافی گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں گھی گرم ہو جائے تو اس میں بادامی رنگ کے گل گلے تل لیں اور کاغذ پر اُتار لیں تاکہ فاضل گھی کاغذ میں جذب ہو جائے۔ گرم گرم ہی کھائیں۔

ساگودانے کی پھول بڑیاں

ساگودانہ ۱۲۵ گرام
لال مرچ ایک چائے کا چمچہ
سفید زیرہ ایک چائے کا چمچہ
گھی حسبِ ضرورت
نمک حسبِ ذائقہ

ساگودانے کو صاف کر کے چار پیالی پانی میں ایک گھنٹے کے لئے بھگو دیں۔ پھر اس میں لال مرچ، سفید زیرہ اور نمک ملا کر آنچ پر پکنے کے لئے رکھ دیں تھوڑی تھوڑی دیر بعد چمچہ چلاتی رہیں۔ جب ساگودانہ کافی گاڑھا ہو جائے تو اسے آنچ سے اُتار لیں۔ ایک تھال میں ایک ٹیبل اسپون گھی مل دیں۔ پھر اس میں تھوڑی تھوڑی دوری پر ایک ایک ٹیبل اسپون ساگودانہ ڈال دیں اور ہوا میں سوکھنے کے لئے رکھ دیں۔

کڑھائی میں کافی گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں، گھی گرم ہو جائے تو دو تین پھول بڑیاں اس میں ڈال دیں اور چمچے سے بڑیوں کو گھی میں ڈبو دیں بڑیاں پھول جائیں، تو انہیں گھی سے نکال لیں۔ اسی طرح تمام بڑیاں تل لیں۔

یہ بڑیاں زیادہ تعداد میں بنا کر رکھی جا سکتی ہیں۔ بڑیاں سوکھ جائیں تو کسی ڈبے میں بند کر کے رکھ دیں۔ جب ضرورت ہو نکال کر تل لیں۔

کہنی سُنی

ڈیر بھابی :

شکر ہے کہ اب بانو وقت پر مل رہا ہے ــــ جولائی کے بانو میں "بحرینی عورتیں" سب سے زیادہ پسند آیا۔ "ایک نشانی تیری" بہت دل کش افسانہ ہے۔ بھابی آپ بانو کو غزل سے کیوں محروم رکھتی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو غزل سے الرجی ہے۔ چند سال پہلے "پسندیدہ اشعار" بانو میں شائع ہوتے تھے۔ پھر یہ سلسلہ بھی بند ہو گیا؟ آپ کی "ذہنی اُلجھن" کا کالم بہت اچھا ہے اس کو جاری رکھئے۔

شگفتہ پروین، لکھنؤ

محترمہ :

بانو میری بیوی پڑھتی ہیں۔ میں بھی فرصت کے وقت نظر ڈال لیتا ہوں۔ بانو کا بیشتر حصہ عورتوں کے لئے ہوتا ہے۔ "بیوٹی کالج" اور "کشیدہ کاری" سے بھلا مردوں کو کیا دل چسپی ہو سکتی ہے؟ "باورچی خانہ" سے ہمارا کیا واسطہ؟ لیکن ان چیزوں کو چھوڑ کر "بانو" مردوں کے لئے بھی اتنا ہی دل چسپی کا باعث ہے جتنا کہ عورتوں کے لئے۔ خصوصاً آپ کی ذہنی اُلجھن کا کالم ایک انقلابی قدم ہے۔ یہاں آپ اُردو کے سب رسالوں سے بازی لے گئیں۔ اِس کالم کو جاری رکھئے۔

باقر علی، بمبئی

ڈیر بھابی :

جولائی کے بانو کا سرورق دیکھ کر آپ کو داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ آئندہ بھی خالص مشرقی حُسن کو بانو کے سرورق کی زینت بنائیں گی۔ اِس بار افتتاحیہ پڑھ کر ایک تلخ حقیقت سامنے آگئی۔ آپ نے سچ کہا ہے کہ ہم تعصب کی عینک لگا کر مسئلوں کا حل تلاش کرتے ہیں۔ ہمارے جذبات ہمارے فیصلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ موجودہ حکومت کی اُردو زبان کے متعلق پالیسی اس بارے میں مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔ حکومت نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ اُردو کو ثانوی زبان کا درجہ دینے کو تیار نہیں۔ یہ اُردو کے ساتھ سراسر ناانصافی ہے۔ حکومت نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے کہ اُردو ملک کے شمالی حصہ کی بیش تر آبادی کی مادری زبان ہے ــــ اس کے علاوہ اُردو ہندوستان کے کونے کونے میں سمجھی جاتی ہے۔ قانون کا دباؤ کسی زبان کو ختم نہیں کر سکتا۔ اُردو زندہ ہے اور زندہ رہے گی۔

سلمیٰ نازنین، لکھنؤ

محترمہ :

جولائی کا بانو نظر نواز ہوا، ٹائیٹل دیکھ کر زبان پر بے اختیار یہ شعر آگیا :

نہیں آتی تو یاد اُن کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

"بحرینی عورتوں سے متعلق مضمون" بے حد معلوماتی ہے، "دورِ افتادہ بہنوں کو سمجھنے میں مدد مل جاتی ہے۔ "بیٹی کی رخصتی" بامقصد کلام ہے۔ "وہ ایک نشانی تیری" کو میں حاصلِ شمارہ سمجھتا ہوں۔ عطیہ پروین نے موت کے سانحہ کو جس خوش اسلوبی سے قلم بند کیا ہے اس کو میں نے پڑھ کر رونے اور رو کر پھر رونے کے لئے پڑھا ہے۔ "ان سے ملئے" کے تحت دہلی کے باہر والوں سے بھی تو ملایئے۔

عبدالنعیم خان، رانچی

محترمہ :

ہمارے گھر میں "بانو" کی بڑی عزت ہے۔ بیوی بچیاں اسے پڑھتی ہیں اور اگر بانو کی کوئی "ادا" انہیں خاص طور پر بھاتی ہے تو وہ میری توجہ کا بھی مرکز بن جاتی ہے۔ بانو: جولائی میں عطیہ پروین کی کہانی "وہ ایک نشانی تیری" میری بیوی اور بچیوں کو بے حد پسند آئی۔ مگر میرے ذہن میں اسے پڑھ کر احمد ندیم قاسمی کی ایک کہانی کی یاد تازہ ہو گئی۔ دونوں کہانیوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ احمد ندیم قاسمی کی کہانی میں پلیٹ نوکرانی کے ہاتھ سے ٹوٹ جاتی ہے اور "بیگم" کے دل کا خشک لہو پگھل کر آنکھوں کے راستے باہر آنے لگتا ہے۔ جب کہ عطیہ پروین کی کہانی میں "پلیٹ" خود "بیگم" کے ہاتھ سے ٹوٹ جاتی ہے۔

اختر راہی، بمبئی

ڈیر بھابی :

اِس بار بانو میں افسانوں کی کمی محسوس ہوئی لیکن عطیہ پروین کی معرکہ آرا کہانی نے اس کمی کی تلافی کر دی۔ بانو میں معلومات کا خزانہ تو ملتا ہے لیکن مزاح کی چاشنی نہیں ملتی۔ آپ بانو میں لطیفوں کا سلسلہ شروع کر دیں۔ چند سال پہلے بانو میں کارٹون چھپتے تھے، وہ بھی بند ہو گئے۔ ہنسنے ہنسانے کے لئے کچھ تو کیجئے۔

حمیدہ ناز، پٹنہ

محترمہ :

میں کئی سال سے بانو کا مطالعہ کر رہا ہوں آپ کا کالم "ان سے ملئے" مجھے بہت پسند ہے۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوتی ہے کہ عورت ترقی کے میدان میں آگے بڑھ رہی ہے۔ ملک ایک بہت بڑے سیاسی بحران سے گزر چکا ہے۔ عورتوں نے بھی اس بحران سے چھٹکارا پانے کی تحریک میں قابلِ قدر حصہ لیا ہے۔ کسی خاتون لیڈر کا انٹرویو بھی شائع کریں۔ انٹرویو کے بعد جو چیز مجھے سب سے زیادہ پسند آتی ہے وہ "آپ کی ذہنی اُلجھن اور اس کا حل" ہے۔ بانو میں کشیدہ کاری

کے صفحات دیکھ کر اُلجھن ہوتی ہے۔ آج کل تو ریڈی میڈ کپڑوں کا رواج ہے، ایسی حالت میں اس کالم کی افادیت عورتیں ہی سمجھ سکتی ہیں۔ میرے خیال میں آج کل عورتیں بازار سے بنا بنایا کپڑا خریدنا زیادہ پسند کرتی ہیں۔ اس کالم کو اگر ختم نہ کریں تو اس کے صفحات ضرور کم کر دیں۔

اختر علی، کلکتہ

ڈیر بھابی!

جولائی کا بانو منظر نواز ہوا۔ اُردو کا یہ واحد رسالہ ہے جس میں ہر قسم کے موضوعات پر مضامین شائع ہوتے ہیں افتتاحیہ سے لے کر کشیدہ کاری کے صفحات تک پورا رسالہ معلومات کا خزانہ ہے۔ اس بار آپ نے "بیوٹی کالج" میں سوال و جواب شائع نہیں کئے لیکن ان کی کمی یوگا مدنشوں نے پوری کر دی۔ نسیمہ عزیز کا انٹرویو خوب ہے۔ "پانچ سال" اور "وہ ایک نشانی تیری" اچھے افسانے ہیں۔ دنیا کی کہانی تصویروں کی زبانی" والا صفحہ بہت عرصے سے غائب ہے۔ اسے پھر سے شروع کیجئے نا۔

بانو میں ایک کمی عرصے سے محسوس کر رہی ہوں۔ بزمِ بانو کے تحت آپ کے جواب ہوتے ہیں، لیکن صرف ان سے ہماری تسلی نہیں ہوتی۔ پڑھنے والوں کی شرکت کے لئے کوئی اور تقریب بھی پیدا کیجئے۔ آپ کوئی ایسا عنوان شروع کیجئے جس پر پڑھنے والیاں اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں۔ اس طرح ہم بھی بانو کے ارتقا میں حصّہ دار بن جائیں گے۔

زبیدہ فاروقی، حیدرآباد

سوئیٹ بھابی!

گھر کے کاموں سے فراغت پائی تو باہر سے آکر بھیا نے خوب ناچ نچایا۔ کافی چھیڑ چھاڑ کے بعد انہوں نے میرا پیارا بانو ہاتھوں میں تھما ہی دیا۔ چند گھنٹوں میں ہی پورا پڑھ ڈالا۔ تمام مضامین بہت پسند آئے۔ سلطانہ اقبال کا "بچہ نوے سال کی عمر میں پیدا ہوا" پڑھ کر سب کو خوب ہنسی آئی۔ آپ کی ذہنی اُلجھن اور اس کا حل" بہت مفید کالم ہے۔ اس سے بہت سی بہنوں کو فیض پہنچے گا۔

مس مدیرہ انعام صدیقی، سہارنپور

بھابی صاحبہ!

جولائی کا "بانو" باصرہ نواز ہوا۔ افتتاحیہ بے حد قابلِ تعریف ہے۔ "ان سے ملئے" بھی بہت پسند آیا۔ ویسے بانو ہمیشہ کامیابی کی طرف گامزن رہا ہے۔ آپ ہم سب بانو بہنوں کو روشن خیالی اور ترقی کے میدان میں آگے بڑھانے کے لئے جدوجہد کر رہی ہیں۔ لائق ستائش ہے۔

انجم رحمان، مدراس

پیاری بھابی!

لفظ "عام" سے لوگوں کے چہرے پر جو اتار چڑھاؤ طاری ہوتا ہے، دیکھنے قابل ہوتا ہے۔ عورتیں زیادہ تر اپنی تیار کردہ چیزیں دوسروں کو دکھانے سے گھبراتی ہیں کہ کہیں وہ "عام" نہ ہو جائیں۔ کوئی بھی چیز کیوں نہ ہو جیسے کسی کرتے کا ڈیزائن، ساڑی کا چھاپہ یا پینٹنگ سوئیٹر کا نمونہ، وغیرہ۔

کھانے کا مطالبہ سامنے آنے پر بہنیں ضرور کچھ نہ کچھ بہانہ کر کے ٹال جائیں گی یہ کتنی بری بات ہے جہاں ایک طرف عورتیں کلب بناتی ہیں، سلائی وغیرہ کے اسکول کھولتی ہیں، وہاں ایسی تنگ نظر عورتیں بھی ہیں جو اپنی چیزوں کو "عام" ہونے کے ڈر سے دکھاتیں تک نہیں۔ اگر جو عورتیں کوئی ہنر خود جانتی ہیں دوسروں کو سکھانے سے گریز نہ کریں تو کتنی ہی بہنوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

ریشما کافی والا، اندور

پیاری بھابی!

میں بہت عرصہ سے آپ کے "بانو" کی خاموش مداح ہوں لیکن آج آپ سے کچھ باتیں کرنے کو جی چاہا جس کا نتیجہ یہ خط ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بانو کے تمام مقالے دلچسپ اور مفید ہوتے ہیں۔ کہانیوں کا معیار بھی اونچا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اگر ہم آپ کو اپنے ناچیز مشورے بھیجیں تو آپ کے بلند اخلاق سے امید کہ آپ ان پر غور فرمائیں گی، صرف بے جا تنقید نہ ہوگی۔ پہلی بات تو یہ کہ "بانو" میں بیرونی ممالک سے متعلق کچھ زیادہ ہی مضامین شائع ہوتے ہیں، ان میں کمی کریں۔

دوسرا مشورہ یہ ہے کہ ایسا کوئی مباحثہ شروع کریں جس کا موضوع دلچسپ ہو اور جس میں خواتین حصّہ لیں۔

آپ کہاں تک میرے خیال سے متفق ہیں؟

فیروزہ نظیر، ناگپور

محترمہ!

"بانو" ہر ماہ دیکھا کرتا ہوں۔ "افتتاحیہ" بہت حسین ہوتا ہے۔ اچھی باتیں اچھے انداز میں ہوتی ہیں۔ قابلِ رشک فکر ہوتی ہے اور قابلِ تقلید راہ نمائی۔ جون کے شمارے میں جزیرہ تحوبا کی عورتوں سے متعلق فیچر میں بعض باتیں قابلِ اعتراض ہیں۔ مثلاً ازدواجی تعلقات سے پیشتر ہی لڑکا اور لڑکی آزادانہ ملتے ہیں وغیرہ۔ اس قسم کی "معلومات" سے مشرقی تہذیب مجروح ہوتی ہے۔

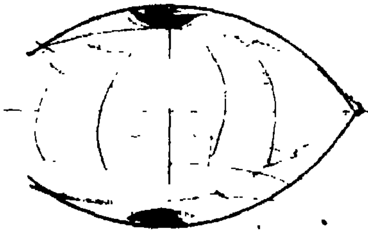
آر محمد یحییٰ، کرنول

پیاری بھابی!

جب "بانو" ہمارے گھر میں آتا ہے تو فوراً اس کے لئے چھینا جھپٹی شروع ہو جاتی ہے گھر میں بڑے آنٹی چھوٹی آنٹی، ممی اور ڈیڈی کے پڑھنے کے بعد "بانو" مجھے ملتا ہے کیونکہ میں گھر میں سب سے چھوٹا ہوں لیکن یہ جب بھی مجھے ملتا ہے، میں ایک ہی نشست میں اسے ختم کر لیتا ہوں اشاعت میں تاخیر کے عیب سے قطع نظر "بانو" آج بھی ہر لحاظ سے جاندار ہے۔ مجھے بانو میں سب سے زیادہ جو چیز پسند آتی ہے وہ اس کے مستقل عنوان ہیں۔ "آپ کی ذہنی اُلجھن اور اس کا حل" کا سلسلہ جو آپ نے حال ہی میں شروع کیا ہے مجھے سب سے زیادہ پسند ہے کسی اور اُردو رسالے میں کبھی نہیں دیکھا۔

ایس کے قطب الدین، حیدرآباد

دیس بدیس کی خبریں



جُواری نے بیوی کو داؤ پر لگا دیا

ضلع میرٹھ کے ایک گاؤں میں کالے نام ایک جواری نے اپنی بیوی کو داؤ پر لگا دیا۔ کالے ہمیشہ جُوئے کی بازی ہارتا تھا، لیکن جوا کھیلنے سے باز نہ آتا تھا۔ ایک دن وہ اپنے دوستوں کے ساتھ جوا کھیل رہا تھا۔ قسمت حسب معمول اُس کے خلاف تھی۔ چنانچہ وہ ہارتا ہی چلا گیا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں سے قرض لے کر کھیل جاری رکھا۔ لیکن وہ پھر بھی ہار گیا۔ اب اُس کے پاس جُوا کھیلنے کے لئے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ اُس کے ساتھیوں نے از راہِ مذاق اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنی بیوی کو داؤ پر لگا دے اور اُس کی مدد سے اپنا قرض اُتار دے۔ کالے راضی ہوگیا۔ اُس نے اس مذاق کو سچ سمجھا۔ اُس کی بیوی صغرا تین بچوں کی ماں ہے۔ صغرا کی عمر ۳۳ سال ہے۔ کالے نے صغرا کو سمجھایا کہ وہ اُسے ہار چکا ہے، اُسے اپنا قرض اُتارنا ہے یہ اُس کی عزت کا سوال ہے، اس لئے صغرا کو ایک رات کے لئے اُس کے ساتھیوں کے پاس رہنا پڑے گا۔ صغرا کے لئے خاوند کا حکم ماننے کے سوا کیا چارہ تھا۔ وہ راضی ہوگئی۔ صغرا کے باپ کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو اُس نے پولیس میں رپورٹ درج کرادی۔ پولیس نے صغرا کی تلاش شروع کردی۔ باوجود تلاش کے صغرا کا کوئی پتہ نہیں چلا۔

وزیر بے کاروں کی انجمن میں شامل ہوگیا

پچھلے ہفتے بے کاروں کی ایک کُل ہند انجمن قائم کی گئی۔ اس کی پہلی میٹنگ میں خاصی تعداد میں بے کار لوگ جمع ہوئے۔ اس میٹنگ کی صدارت سابق وزیر ہند مسٹر ٹی۔ اے۔ پائی نے کی۔ مسٹر پائی اندرا حکومت میں صنعت کے وزیر تھے۔

چھپکلی کا جنازہ

کٹک کے ایک تجارتی ادارے میں ایک بوڑھی چھپکلی عرصہ سے قیام پذیر تھی۔ اُس فرم کا منیجر اُس چھپکلی کو بہت عرصہ سے پہچانتا تھا۔ ایک دن یہ بوڑھی چھپکلی بیمار ہوگئی۔ اُس کی کمزوری اس قدر بڑھ گئی کہ وہ چھت سے فرش پر گر پڑی وہ سردی سے کانپ رہی تھی۔ منیجر نے فوراً ایک لیڈی ڈاکٹر کو فون کیا اور اُسے مریضہ کے تمام حالات بتائے۔ لیڈی ڈاکٹر نے جب یہ سنا کہ اُسے ایک چھپکلی کی تیمار داری کے لئے بلایا جا رہا ہے تو اُس نے آنے سے انکار کر دیا۔ منیجر نے انکار کی وجہ پوچھی۔ لیڈی ڈاکٹر نے بتایا کہ اُس کے پاس انسانوں کے علاج کے لئے دوائیں ہیں۔ چھپکلی کے علاج کے لئے نہیں۔ بر وقت علاج نہ ہونے کی وجہ سے چھپکلی کی موت واقع ہوگئی۔ چھپکلی کے بے بس اور موت دیکھ کر منیجر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اُس نے باقاعدہ اُس کی ارتھی تیار کرائی اُسے بڑے احترام کے ساتھ قبرستان میں دفن کیا گیا۔ اُس کی قبر پر منتروں کا جاپ ہوا، تدفین کے بعد تیس مہمانوں کو کھانا کھلایا گیا۔ ان مہمانوں میں ایک پالتو کتا بھی شامل تھا۔ کھانے کے بعد مرحومہ کی مغفرت کے لئے دعا کی گئی۔

کانگریس کی ہار دُولہا کی ہار بن گئی

ضلع مدورائی کے دو بھائی ماریاپن اور کروناندھی ایک ہی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ لڑکی کے ماں باپ اس صورتِ حال سے پریشان تھے۔ انہوں نے دونوں بھائیوں پر زور دیا کہ ان میں سے ایک دوسرے کے حق میں دست ہو جائے۔ اس طرح بھائیوں کے درمیان ایک انوکھا سمجھوتا ہوگیا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اگر کانگریس مرکز میں وزارت بنانے میں کامیاب ہوگئی تو لڑکی ماریاپن کو ملے گی، اگر جنتا پارٹی جیت گئی تو کروناندھی کو۔ کانگریس الیکشن ہار گئی اور ماریاپن کنوارا ہی رہ گیا جنتا پارٹی نے الیکشن جیت لیا اور کروناندھی نے دلہن کو۔

ایک دن کا مہمان

جنوبی ہند کے ایک قصبے میں ایک پرانے اور ٹوٹے ہوئے مکان سے ایک بچے کے رونے کی آوازیں آئیں۔ سارا قصبہ اس بچے کو دیکھنے کے لئے اُمڈ پڑا۔ کوئی عورت اُس بچے کو جنم دے کر اُسے وہاں چھوڑ گئی تھی۔ بچہ بُری طرح رو رہا تھا۔ لوگ اُسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ عورتیں اس کی حالت پر آنسو بہا رہی تھیں۔ سب اُس کی حالت پر رحم کھا رہے تھے لیکن کسی نے اُس کی غذا کا بندوبست نہیں کیا نہ کسی نے اُسے گود میں اُٹھایا۔ بچہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے روتا رہا، آخر شام کو ساڑھے سات بجے وہ بھوک سے بے تاب ہو کر چل بسا

بدروحوں سے بچاؤ

پونا کے ایک اخبار میں اس طرح کا اشتہار شائع ہوا ہے: "میرے دوستو! میرے گھر میں کچھ بدروحیں پچھواڑے کے دروازے سے داخل ہوگئی ہیں۔ انہوں نے میرے گھر کو آگ لگا دی ہے اب وہ میرے پیچھے پڑی ہوئی ہیں۔ وہ مجھے اس گھر سے نکالنا چاہتی ہیں۔ یہ گھر میں نے تیس سال کی محنت کے بعد بنایا ہے۔ میری مدد کرو اور مجھے ان جن بھوتوں سے بچاؤ۔"

امتحان کے سوالات کیسے حل کئے جائیں

اتر پردیش کے ایک کالج میں طلبا امتحان کے سوالات حل کر رہے تھے۔ نگراں امتحان کے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ یکایک ایک ڈپارٹمنٹ کا ذمہ دار افسر امتحان کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے آتے ہی ایک طالب علم کو جوابات لکھوانے شروع کر دیے۔ نگراں یہ سب تماشا دیکھتے رہے۔ انہوں نے خاموشی میں ہی مصلحت سمجھی۔ وہ طالب علم ایک وزیر کا بیٹا تھا۔

سیتلا ماتا کو خوش کرنے کا طریقہ

پیلی بھیت کے ایک گاؤں میں جیت رام نام کے ایک کسان کی نواسی چیچک میں مبتلا ہو کر مرگئی۔ کچھ عرصے بعد اس کی بیٹی بھی اسی موذی بیماری میں مبتلا ہوگئی۔ جیت رام درگا دیوی کا پجاری تھا۔ اس کا ایمان تھا کہ اگر وہ درگا ماں کو خوش کر دے تو اس کی بیٹی کو اس بیماری سے چھٹکارا مل جائے گا۔ وہ درگا ماں کو انسانی قربانی کی بھینٹ دینا چاہتا تھا۔ ایک روز وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہوگیا۔ جب پولیس کو اس کی کارروائیوں کا پتہ چلا تو وہ چھ انسانوں کی بھینٹ دے چکا تھا۔ پولیس نے تمام لاشیں برآمد کرلیں۔

نقلی چاندی کی قیمت

جنوبی ہند کے ارناکولم ضلع میں ایک برات دلہن کو لے کر رخصت ہو رہی تھی۔ رخصتی کے موقع پر کسی شخص نے کہا کہ دو چاندی کی پلیٹیں جو دولہا کو تحفے میں دی گئی تھیں نقلی چاندی کی ہیں اس بات پر دلہن والوں نے اعتراض کیا۔ وہ کہتے تھے کہ دونوں پلیٹیں اصلی چاندی کی ہیں۔ دونوں فریقوں میں تکرار شروع ہوگئی۔ اس تو تو میں میں کے درمیان کسی آدمی کا ہاتھ اتفاق سے دلہن کے گلے کی چین پر پڑ گیا۔ دلہن نے سمجھا کہ کوئی اس کے گلے کی زنجیر اتار رہا ہے۔ اس نے شور مچایا۔ دلہن والوں نے جب یہ ماجرا دیکھا تو انہیں بھی غصہ آگیا۔ انہوں نے دولہا والوں کو مارنا شروع کر دیا۔ دولہا والے بھی کم نہیں تھے۔ انہوں نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ اس لڑائی میں لاٹھیوں اور لوہے کے سریوں کا آزادانہ استعمال کیا گیا۔ اس کے نتیجہ میں چھ آدمی بری طرح زخمی ہوئے۔ بے چارا دولہا بھی نہ بچ سکا۔ اس کے سر پر چوٹیں آئیں۔ تمام زخمیوں کو ارناکولم اسپتال میں داخل کر دیا گیا جب لڑائی ختم ہوگئی تو دونوں پلیٹوں کا کہیں پتہ نہ چلا۔ اس افراتفری میں کسی چور نے دونوں پلیٹیں صاف کر دی تھیں۔

شہر کی سیر میں بیوی غائب

چنڈی گڑھ میں ایک اسکوٹر سوار نے اپنی بیوی کو پیچھے کی سیٹ پر بٹھایا اور شہر کی سیر کو روانہ ہوگیا۔ یہ اسکوٹر سوار مستی کے عالم میں تھا وہ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی پی گیا تھا۔ جب وہ شہر کی سیر کرنے کے بعد واپس گھر پہنچا تو یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ اسکوٹر کی پچھلی سیٹ خالی ہے۔

پراچین بھارت کا ویدک شہر

مایا پور گاؤں میں ایک نیا شہر آباد کرنے کی اسکیم زیر غور ہے۔ یہ گاؤں مغربی بنگال کے ندیا ضلع میں واقع ہے۔ اس نئے شہر کو تعمیر کرنے کا منصوبہ ہرے کرشنا فرقے نے بنایا ہے۔ ۲۱ شہر میں ۵۰ ہزار انسان بسائے جائیں گے۔ برہمن، چھتری، ویش اور شودر، چاروں ذاتیں اس شہر میں آباد کی جائیں گی۔ اس شہر میں ویدک زمانہ کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ ہزاروں برس پہلے کے ہندوستان کی ایک جھلک اس شہر میں مل سکے گی اس شہر میں شراب اور سگریٹ پینے کی مخالفت ہوگی تمام آبادی گوشت سے پرہیز کرے گی۔ جوئے خانے، ناچ گھر، قحبہ خانے یک سر معدوم ہوں گے۔ انسان کی تفریح کے لئے صرف دو راستے ہوں گے، جو دنگل اور تیرنے کے تالاب پر مشتمل ہوں گے اکھاڑوں میں زور آزمائی ہوگی۔ ہندوستان جیسے گرم ملک میں غسل اور تیراکی ضروری ہے۔ تیرنے کے تالاب مخلوط نہیں ہوں گے۔ مردوں اور عورتوں کے لئے الگ الگ 'کنڈ' بنائے جائیں گے عورتوں کا تیراکی کا لباس ساڑی ہوگا۔ مردوں کا لباس کچھا ہوگا۔ ناف سے گھٹنوں تک جسم کا حصہ اس کچھے سے چھپا رہے گا۔ اس شہر کی تعمیر میں ۱½ سو کروڑ روپیہ خرچ ہوگا۔ ہرے کرشنا فرقے کے ماننے والے یورپ اور امریکہ میں کثرت سے ہیں۔ اس فرقے کے پاس دولت کی کمی نہیں۔

●●

ناول

انداز نظر	صفیہ اختر	۲ روپے
ایک دل سو گھاؤ	کرشن گوپال عابد	۲ روپے ۷۵ پیسے
ایک لڑکی ہزار لڑکے	ظفر نیازی	۲ روپے ۷۵ پیسے
انڈین اسکاٹ لینڈ یارڈ	شہزادہ تبسم	۴ روپے ۲۵ پیسے
ان کا خیال	قیسی رام پوری	۵ روپے ۵۰ پیسے
انوکھا سنسار	عشرت رحمانی	۲ روپے
آدمی اور سکے	مہندر ناتھ	۲ روپے ۷۵ پیسے
الف لیلہ ہزار داستان		۶ روپے
۱۸۵۷ء کی دلی	مہیشور دیال	۳ روپے
آخری رات	ایم. اسلم	۵ روپے ۵۰ پیسے
اس پار	مضطر ہاشمی	۵ روپے ۲۵ پیسے
ایک رات	خورشید اختر	ایک روپیہ ۲۵ پیسے
اندیشۂ شہر	احمد جمال پاشا	۴ روپے
آنکھے بانکے	ہنس راج رہبر	۴ روپے ۲۵ پیسے
بدگمانی	عذرا جمال	۶ روپے ۷۵ پیسے
بھوک	نٹ ہمن	۳ روپے
بھابی	شوکت تھانوی	۵ روپے ۵۰ پیسے
بزدل	م. غوری	۳ روپے ۵۰ پیسے
دودھ کی قیمت	منشی پریم چند	۳ روپے
فاکہہ	اے. آر. خاتون	۷ روپے ۵۰ پیسے
فلمی پرستان	سعید امرت	۲ روپے
گل رعنا	شہزادہ تبسم	۳ روپے
گلشن	کشور ساہو	۳ روپے
گم شدہ لڑکی	بدنام رفیعی	۳ روپے

شمع بک ڈپو
آصف علی روڈ
نئی دہلی
110001



جلد کی شناخت اور حفاظت

ہم پچھلے شماروں میں جلد کی شناخت کے متعلق لکھ چکے ہیں۔ آج اس بارے میں ہم آپ کو مزید معلومات فراہم کریں گے۔

جلد کی حفاظت سے پہلے اس کی شناخت ضروری ہے۔ اس کے لئے آپ کو حسب ذیل باتوں پر دھیان دینا چاہیئے۔

اگر آپ کی جلد صابن سے دھونے کے دس منٹ بعد دوبارہ چمکنے لگتی ہے تو یہ جلد روغنی ہے۔ اس کے علاوہ روغنی جلد پر مسامات کھلے ہوتے ہیں اور چہرے پر باریک سوراخ سے دکھائی دیتے ہیں۔ بعض اوقات یہ سوراخ خاصے بڑے ہوتے ہیں کھلے ہوئے مسامات کے علاوہ روغنی چہرے پر سیاہ کیلیں بھی نمودار ہو جاتی ہیں، مہاسے بھی نکل آتے ہیں۔ چکنی جلد والے چہرے پر میک اپ زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرتا اور میک اپ رنگ بدلتا رہتا ہے۔ گلابی میک اپ زرد اور نارنجی رنگ اختیار کر لیتا ہے۔

اگر ان نشانیوں میں تین چوتھائی نشانیاں آپ کی جلد میں موجود ہیں تو سمجھ لیجئے کہ آپ کی جلد چکنی ہے۔ اس قسم کی جلد کی حفاظت کے لئے آپ کو صحت کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ صحت کے لئے آٹھ گھنٹے کی نیند لازم ہے۔ اگر آپ رات کو دیر تک جاگتی رہیں گی اور صبح کو سویرے اٹھ جائیں گی تو آپ کی نیند میں کمی واقع ہو جائے گی۔ نیند اور جلد کی صحت کا گہرا تعلق ہے۔



شہناز حسین
۹۲-۸۸ گریٹر کیلاش، نئی دہلی۔ فون: ۶۱۱۶۴۴



نیند کے بعد غذا کا نمبر آتا ہے۔ غذا میں تازہ پھل اور سبزیاں استعمال کرنا بہتر ہیں۔ تلی ہوئی چیزیں، مثلاً پھلکیاں، پکوڑے، آملیٹ وغیرہ سے پرہیز لازم ہے۔ بہرا کھٹے ثقیل اور مرغن غذائیں کم استعمال کریں۔ تازہ ہواؤں میں زور زور سے سانس لیں۔ اگر صبح کو تھوڑی سی ورزش کر سکیں تو سونے پر سہاگہ ہے

یاد رکھیئے کہ جلد اور صحت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اگر آپ کی صحت اچھی ہے تو جلد خود بخود تازہ اور شگفتہ رہے گی۔ سب سے ضروری چیز وقت کی پابندی ہے۔ کھانے اور سونے کا وقت مقرر کریں۔ کھانا خواہ کم کھائیں یا زیادہ لیکن وقت پر کھائیں۔ بعض عورتیں ان باتوں کا خیال نہیں رکھتیں۔ ان کا کھانے کا وقت مصروفیت میں نکل جاتا ہے۔ پھر یاد آتا ہے تو دو چار لقمے کھا لیتی ہیں بھوک کی تسلی وقت پر نہ ہو تو بھوک بند ہو جاتی ہے۔ یہی حال نیند کا ہے۔ اگر نیند کا وقت نکل جائے تو پھر نیند نہیں آتی ان دونوں چیزوں کے لئے وقت کی پابندی ضروری ہے۔

صحت کی دیکھ بھال کے بعد جلد کی حفاظت کا نمبر آتا ہے۔ بعض عورتیں یہ سمجھتی ہیں کہ صابن اور پانی سے جلد کو دھونا کافی ہے۔ صابن اور پانی بچوں کے لئے ٹھیک ہے بڑی عمر کی لڑکیوں کے لئے کافی نہیں۔ گرمیوں میں آندھیاں چلتی ہیں۔ برسات میں بھی خاک کیچڑ میں بدل جاتی ہے۔ حبس ہو تو پسینہ خوب آتا ہے۔ پسینہ پونچھنے کے لئے رومال یا تولیہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر رومال میلا ہو تو پسینہ صاف ہو جاتا ہے لیکن گرد و غبار کی تہیں جلد میں اور گہری ہو جاتی ہیں۔ صابن اور پانی سے جلد کی اوپری سطح صاف ہو جاتی ہے، لیکن یہ کافی نہیں ہے گرد و غبار جلد کے مسامات میں جذب ہو جاتا ہے اور ظاہری طور پر دکھائی نہیں دیتا۔

اس لئے چہرے کو کلینزنگ کریم سے صاف کرنا ضروری ہے۔ کیکلنس کلینزنگ کریم جلد کی صفائی کے لئے اچھی ہے۔ روغنی جلد کے

لئے صابن کا انتخاب بھی اہم ہے نیم یا مارگو سوپ روغنی جلد کے لئے مفید ہیں۔ رات کو سوتے وقت بھی نیم یا مارگو سوپ سے چہرے کو ہلکے ہاتھ سے دھوئیں جلد کو تولئے سے رگڑ کر خشک نہ کریں، بلکہ چہرے پر آہستگی سے تھپتھپا کر خشک کریں۔ اگر جلد پر مہاسے ہوں تو کوئی مہاسوں کی کریم لگائیں۔ اگر جلد پر چھوٹے چھوٹے دانے ہیں تو ایسی کریم لگائیں جس میں گندھک شامل ہو۔ روغنی جلد والوں کے لئے سیّال کلینسر کا استعمال مفید ہے۔ کریم کلینسر خشک جلد والوں کے لئے ہے۔ کریم کلینسر روغنی جلد کے لئے نقصان دہ ہے۔ اس سے مسامات بند ہو جاتے ہیں، ایکنے اور مہاسے بڑھ جاتے ہیں۔ ایکنے اور مہاسے مہارت سے چھپائے جا سکتے ہیں۔ ایک اسٹک سے ان کا رنگ ہلکا یا بھاری کیا جا سکتا ہے۔ روغنی جلد کے لئے یوڈی کلون بھی مفید ہے۔ تھوڑے سے ٹھنڈے پانی میں چند بوندیں یوڈی کلون ملا کر چہرے کو دھوئیں۔ اگر یوڈی کلون گھر نہ ہو تو اپنے شوہر سے تھوڑا سا آفٹر شیو لوشن بھی مستعار لے سکتی ہیں۔ یوڈی کلون سے جلد کی فالتو چکنائی کم ہو جاتی ہے۔

چہرے کی جلد کو دھونے کے بعد اس کی ٹوننگ کا نمبر آتا ہے۔ ٹوننگ کا مطلب ہے۔ جلد کو جگانا یا چھیڑنا۔ ٹوننگ سے میل کا آخری ذرہ بھی نکل آتا ہے اور مسامات عارضی طور پر بند ہو جاتے ہیں۔ اس کے لئے آپ کوئی بھی اسکن ٹونک لوشن استعمال کر سکتی ہیں۔ اگر آپ کے پاس فرج یا آئس بکس ہے تو یہ آپ کے بہت کام آ سکتا ہے۔ تھوڑا سا اسکن ٹونک لوشن ایک پلیٹ میں نکال لیں۔ اس میں چند روئی کے ٹکڑے بھگو دیں۔ اب اس پلیٹ کو فرج یا آئس بکس میں رکھ دیں۔ پلیٹ کو کسی طشتری سے ڈھانپ دیں تاکہ اس کی بو نہ پھیلے۔ اگر آپ اسے کھلا چھوڑ دیں گی تو فرج میں رکھی ہوئی دوسری چیزیں اس کی بو سے متاثر ہو جائیں گی اس طرح یہ لوشن آپ کو ہر وقت تیار ملے گا۔ آپ جب بھی منہ دھوئیں ایک روئی کے ٹکڑے کو نکال کر ٹھنڈا ٹھنڈا چہرے پر لگا لیں۔

اسکن ٹونک اگر پودینے اور شہد سے بنا ہو تو زیادہ فائدہ مند ہے۔ یہ ٹونک کھال کو سکیڑنے کے علاوہ اسے شگفتگی عطا کرتا ہے۔

ادھیڑ عمر میں آنکھوں کے نیچے کے مسامات کھلنے لگتے ہیں تو جبڑوں کی کھال نیچے لٹک جاتی ہے جب رخساروں کی ہڈیوں کے نیچے کے مسامات کھلتے ہیں تو بھی یہی واقعہ پیش آتا ہے۔ جبڑوں کی کھال نیچے لٹک جائے تو بھدی لگتی ہے۔ اسکن ٹونک سے ان جگہوں کے مسامات بند ہو جاتے ہیں اور جبڑوں کی کھال نیچے نہیں لٹکتی۔ اس کے لئے کوئی بھی ٹونک جس میں پودینہ، کھیرے، نیم ملا ہو، مفید ہے

کھال کی صفائی اور ٹوننگ کے بعد اس کو غذا پہنچانے کا سوال پیدا ہوتا ہے ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ جلد ایک زندہ شے ہے وہ سانس لیتی ہے تازہ ہوا نہ ملنے سے مرجھا جاتی ہے۔ نیند میں بھی جلد کام کرتی رہتی ہے جلد میں ہر لمحے پرانے خلئے نئے خلیوں میں بدل جاتے ہیں۔ جتنے خلئے مرجاتے ہیں اتنے ہی پیدا ہوتے ہیں اور جلد کا رنگ روپ خراب نہیں ہوتا بڑھاپے میں یہ تناسب کم ہو جاتا ہے۔ جتنے خلئے مرتے ہیں، اس کے نصف یا تین چوتھائی ہی از سر نو پیدا ہوتے ہیں۔ اسی لئے جلد پر جھریاں نمودار ہو جاتی ہیں سائنس داں یہ جاننے کے لئے سر توڑ کوشش کر رہے ہیں کہ بڑھاپا کیوں آتا ہے اور بڑھاپے میں انسان کے جسم میں کیا تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ جوانی میں خلیوں کی موت اور پیدائش کا تناسب برابر رہتا ہے اور جلد مرجھانے نہیں پاتی۔ اگر کسی دن سائنس دان خلیوں کی موت اور زندگی کا تناسب برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے تو گویا وہ بڑھاپے پر پر فتح پالیں گے۔ جلد کے لئے نیند بہت اہم ہے رات کے وقت ماحول پرسکون ہوتا ہے۔ سونے کے کمرے میں نہ دھوپ کی تمازت ہوتی ہے اور نہ گرد و غبار کی یورش۔ نہ تیز ہوا چلتی ہے اور نہ شور و غل ہوتا ہے۔ جلد کے خلئے آرام سے مصروفِ عمل رہتے ہیں اور دن کے برعکس ہر قسم کی بیرونی مداخلت سے محفوظ رہتے ہیں اس لئے رات کو جسم سے جلد کو غذا پہنچتی رہتی ہے۔ رات کو سوتے وقت کوئی نرشنگ کریم لگائیں۔ اگر اس کریم میں سنگترے کی آمیزش ہو تو زیادہ مفید ثابت ہوگی۔ کریم کو ٹھوڑی سے اوپر اور نیچے الگ الگ لگائیں اور الگ الگ مالش کریں ایک ہی وقت میں دونوں جگہ مالش نہ کریں اگر آپ کی کھال خشک ہے تو یہ کریم نصف گھنٹے کے بعد دوبارہ لگائیں۔ اگر آپ کی ناک اور ٹھوڑی چکنی رہتی ہے۔ تو ان جگہوں پر زیادہ کریم نہ لگائیں۔ اس کے علاوہ کہنیوں اور گردن پر ایسی کریم لگائیں جس میں بادام اور لینولین ملے ہوں۔ اس کریم کو کہنی پر اور گردن پر لگا رہنے دیں تاکہ ان جگہوں کی جلد

رات بھر آرام سے اپنی خوراک کھاتی رہے لینولین اور بادام ملی کریم آنکھوں کے نیچے والی جلد پر استعمال کرنا بھی مفید ہے۔ اس جگہ پر سیاہ حلقے پیدا ہو جائیں تو اس کریم سے کم ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس جگہ کی جلد بھی کس جاتی ہے اور اس پر جھریاں کم ہو جاتی ہیں۔ بادام میں ایک خاصیت ہے کہ وہ جلد کو سفید کرتا ہے۔ اس کریم کے استعمال کے بارے میں یہ خیال رکھیں کہ یہ کریم بیس منٹ سے زیادہ جلد پر نہ لگی رہے۔ اگر آپ نے رات بھر اس کو چہرے پر لگا رہنے دیا تو صبح کو آپ کی آنکھوں کے نیچے کا حصہ سوج جائے گا۔

اگر کریم میں ہلدی ملی ہو تو یہ بھی چہرے کے لئے مفید ہے۔ چہرے کے دھونے سے پہلے یہ کریم لگائیں تو جلد صاف ہو جاتی ہے عام طور پر نل کے پانی میں کلورین ملی ہوتی ہے۔ دریا کے پانی کو صاف کرنے کے لئے اس میں دوائیں ڈالی جاتی ہیں۔ یہ دوائیں جلد کے لئے اچھی نہیں۔ پانی کو ابال کر پئیں تو ان دواؤں کے اثرات کم ہو جاتے ہیں اور جلد پر ان کا خراب اثر نہیں پڑتا۔

سوال و جواب

شگفتہ پروین، آسنسول

س: میرے بال تیزی سے سفید ہو رہے ہیں۔ کیا میں خضاب استعمال کر سکتی ہوں؟

ج: آپ خضاب استعمال کر سکتی ہیں۔ جیسے کہ کاٹروٹون ایک اچھا خضاب ہے۔

حنا کوثر، بمبئی

س: مجھے پسینہ بہت آتا ہے۔ میں کمزوری محسوس کرتی ہوں۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟

ج: گرمی میں پسینہ آنا قدرتی ہے۔ پسینہ کے راستے نمک جسم سے نکل جاتا ہے۔ اس نمک کی تلافی کرنے کے لئے آپ دن میں جب بھی پیاس لگے نمک اور لیموں ملا ہوا پانی پیا کریں۔ دن میں کم از کم ۸ گلاس پانی ضرور پئیں۔

شائستہ نسیم، دہلی

س: میں جس علاقے میں رہتی ہوں وہاں کافی گرد و غبار ہوتا ہے۔ میں چہرے کو صاف کرنے کے لئے یوڈی کلون استعمال کرتی ہوں آپ اس کے علاوہ کوئی اور نسخہ تجویز کر سکتی ہیں؟

ج: صرف یوڈی کلون استعمال کرنا ٹھیک نہیں اس سے چہرے پر جھریاں پڑ جائیں گی۔ آپ عرق گلاب استعمال کریں۔ عرق گلاب میں چند بوندیں یوڈی کلون ملائیں۔ عرق گلاب چہرے کے لئے اکسیر ہے۔

خالد پرویز شمسی، آگرہ

س: میرے بال برسات میں تیزی سے گرتے ہیں۔ اس کا کوئی علاج بتائیں؟

ج: برسات میں اکثر سب کے بال گرتے ہیں آپ بال دھونے کے بعد جب تک بال خشک نہ ہو جائیں کنگھا نہ کریں۔ گیلے بالوں میں کنگھا کرنے سے بال زیادہ گرتے ہیں۔

شاہ جہاں بیگم، اندور

س: مجھے لپ اسٹک کا بہت شوق ہے مگر ہمارے ہاں اس چیز کو اعتراض کی نظر سے دیکھا جاتا ہے؟

ج: آپ نیچرل کلر کی لپ اسٹک استعمال کیا کریں۔ وہ ہونٹوں میں نکھار پیدا کرے گی اور دوسرے لوگوں کو احساس بھی نہ ہوگا کہ آپ لپ اسٹک لگائی ہوئی ہیں۔


خوب صورت ڈیزائن میں
دِل کش لباس


لڑکیوں کے لئے موسم گرما کا
دل کش لباس

آٹھ ہزار روپے کے نقد انعامات کی شاندار تقسیم!

شمع مِنی معمّہ نمبر ۲۲ میں چار صحیح حل آئے

صحیح حل شمع مِنی معمّہ نمبر ۲۲

	ا	ی	ا	جھ	۱ س
۵ پ		ے	ن	ی	۲ ج
ل	۶ ج		ف	ر	۳ ط
ا	ا	۷ پ		ت	۴ ن
ن	ہ	ڑ	۸ ا		
ی	ل	ے	ب		

شمع مِنی معمّہ نمبر ۲۲ آسان ثابت ہوا اور چار پروانے بالکل درست حل تک پہنچ گئے۔ ان چار درست حلوں پر پہلا انعام مبلغ پانچ ہزار روپے تقسیم کیا گیا۔

شمع مِنی معموں کی تیز رفتاری بے مثال ہے۔ درست حل ظاہر کئے جانے کے چند ہی گھنٹوں میں چیکنگ ختم کر کے تقسیم انعامات کی تفصیلات کا اعلان کر دیا گیا۔ جن پروانوں نے صحیح حل منگانے کے لفافے بھیجے تھے انہیں تقسیم انعامات کی تفصیلات بھی لکھ دی گئیں۔

دوبارہ پانچ کے لئے کسی کلیم کا انتظار کئے بغیر ہی پہلے اور دوسرے انعامات کے منی آرڈر بھیج دئے گئے۔

بالکل درست حل چار وصول ہوئے جن پر پہلا انعام مبلغ پانچ ہزار روپے بحساب ۱۲۵۰ روپے فی حل تقسیم کیا گیا:

۱۔ ایس عبدالقیوم صاحب، معرفت اسٹرال پولٹری سیل سینٹر، مائسمہ، سری نگر ۱۹۰۰۰۱

۲۔ جاوید اقبال صاحب، ۲۱۸۶، گلی نل والی، پہاڑی بھوجلہ، جامع مسجد، دہلی

۳۔ ببوخاں صاحب، گولڈن کیفے، عشرت مارکیٹ، رام پور

۴۔ غلام حسن بٹ صاحب، معرفت عبدالمجید بٹ، ملازم میونسپلٹی، ساکنہ سوہنہ دار، بازار بونم سرہ، سری نگر

ایک غلطی والے ۶۵ حل وصول ہوئے جن پر دوسرا انعام مبلغ تین ہزار روپے بحساب ۴۶ روپے ۱۶ پیسے فی حل تقسیم کیا گیا

۱۔ ببوخاں، رام پور ۲۔ محمد ندیم، شاہ جہانپور ۳۔ حشمت اللہ، دہلی ۴۔ ایچ۔ سی۔ ددھوا نئی دہلی ۵۔ ایس۔ سی۔ ددھوا، نئی دہلی ۶۔ ایچ۔ سی، ددھوا، نئی دہلی ۷۔ ارشاد خاں، رام پور ۸۔ ببوخاں، رام پور ۹۔ ایم۔ ایس۔ لانبہ، نئی دہلی ۱۰۔ ببوخاں، رام پور ۱۱۔ ببوخاں، رام پور ۱۲۔ جاوید اقبال، دہلی ۱۳۔ جاوید اقبال، دہلی ۱۴۔ جاوید اقبال، دہلی ۱۵۔ بلقیس فاطمہ، دیوبند ۱۶۔ بلونت سنگھ، دہلی ۱۷۔ بی۔ ایل کھورانہ، دہلی ۱۸۔ جاوید اقبال، دہلی ۱۹۔ امتیاز علی، دہلی ۲۰۔ ایچ۔ سی، ددھوا، نئی دہلی ۲۱۔ ببوخاں، رام پور۔

۲۲۔ کے سکے سیٹھی، نئی دہلی ۲۳۔ سنت لال، بدایوں ۲۴۔ سنت لال بدایوں ۲۵۔ سنت لال، بدایوں ۲۶۔ سنت لال، بدایوں ۲۷۔ سنت لال، بدایوں ۲۸۔ سنت لال، بدایوں ۲۹۔ مسعود علی، نئی دہلی ۳۰۔ مسعود علی، نئی دہلی ۳۱۔ پریم کمار، دہلی ۳۲۔ پریم کمار دہلی ۳۳۔ اے، ایچ، انصاری، راجوپی ۳۴۔ اے ایچ انصاری، راجوپی ۳۵۔ افضل حسین، راجوپی ۳۶۔ ردبی، دارالنسی ۳۷۔ تہنیت علی، حیدرآباد ۳۸۔ نور محمد، سری نگر ۳۹۔ سشما رانی، میرٹھ ۴۰۔ عبدالقیوم، سرینگر ۴۱۔ عبدالقیوم، سرینگر۔

۴۴۔ عبدالقیوم، سری نگر ۴۳۔ عبدالقیوم، سری نگر ۴۴۔ عبدالقیوم، سری نگر ۴۵۔ جاوید اختر، بہار شریف ۴۶۔ امیر حیدر، سہارنپور ۴۷۔ محمد امین، سری نگر ۴۸۔ دلشاد نیازی، سہارنپور ۴۹۔ دلشاد نیازی، سہارنپور ۵۰۔ غلام مصطفیٰ، سیوانڈیہہ ۵۱۔ نور نبی، نوگاؤں ۵۲۔ اشفاق احمد، پٹنہ ۵۳۔ وشوا ناتھ، زیرہ ۵۴۔ سادھو رام، سنگرور ۵۵۔ اشفاق حسین، فرخ آباد ۵۶۔ اشفاق حسین، فرخ آباد ۵۷۔ اقبال احمد، جموریا بازار ۵۸۔ محمد احمد، لہرپور ۵۹۔ شبنم غلام رسول، سری نگر ۶۰۔ محمد نور الہدیٰ، دربھنگہ ۶۱۔ محمد اقلیم، بلیا بلون ۶۲۔ رشید احمد، چھپیرہ ۶۳۔ معصوم رضا، نجف آباد ۶۴۔ طیبہ بیگم، بھپراؤں ۶۵۔ اظہار عالم، سہسرام۔

□ تمام حلوں کی جانچ نہایت احتیاط سے کی گئی ہے۔ پھر بھی اگر آپ کو شبہ ہے کہ آپ کو کوئی انعام ملنا چاہئے تھا اور آپ کو ابھی تک منی آرڈر نہیں ملا تو دوبارہ جانچ کی فیس ایک روپیہ، منی آرڈر سے "شمع منی معمہ، ماہنامہ شمع، آصف علی روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲" کو بھیج کر اس کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید یا ایک روپے کے ہمارے جاری کئے گئے نقد نامے کے ساتھ "کلیم سکشن، شمع منی معمہ نمبر ۲۲ ماہنامہ شمع، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲" کو اپنی شکایت لکھیں۔ ساتھ ہی یہ بھی تحریر کریں کہ آپ نے شمع منی معمہ نمبر ۲۲ کے کتنے حل بھیجے تھے، کس تاریخ کو بھیجے تھے۔ سادہ ڈاک سے، رجسٹرڈ ڈلیوری، رجسٹری سے بھیجے تھے یا دستی طور پر دفتر شمع، نئی دہلی میں ڈالے تھے اور متعلقہ حل کی فیس کس نمبر کے منی آرڈر پوسٹل آرڈر یا نقد نامے سے کس تاریخ کو بھیجی تھی اور تقسیم انعامات سے متعلق آپ کی شکایت کیا ہے۔ اگر آپ کی شکایت درست ہوئی تو آپ کو انعام میں حصہ دیا جائے گا اور دوبارہ جانچ کی فیس کا ایک روپیہ بھی واپس کر دیا جائے گا۔ اگر شکایت غلط ثابت ہوئی تو دوبارہ جانچ کی فیس واپس نہیں کی جائے گی۔ ہر حل کے بارے میں شکایت الگ آنی چاہئے اور اس کی فیس بھی الگ ادا کرنی ضروری ہے۔ اپنی شکایت میں یہ ضرور بتائیے کہ یہ اس حل کے بارے میں ہے۔ جس کی فیس . . . نمبر کے منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا نقد نامے کے ذریعے ادا کی گئی ہے۔ ایسی تمام شکایات ہمیں ۲۰ اگست ۱۹۷۷ تک مل جانی چاہئیں۔ پہلے اور دوسرے انعامات ادا کئے جا چکے ہیں۔

حوالے: شمع منی معمہ نمبر ۲۲ کے اشارے جن کتب سے اخذ کئے گئے تھے، اُن کے نام یا اُن کے مصنفوں کے نام یہ ہیں: دائیں سے بائیں: ۱۔ ظفر ۲۔ علی ۳۔ محسن ۴۔ سعید اور پہلے جب: ۵۔ فخر ۶۔ انصاری ۷۔ جمیلہ ۸۔ کلیات اقبال۔

□□

مذہبی کتب

سورہ کہف	۷۵ پیسے
درود اکبر	ایک روپیہ
تحفہ معراج	۵۰ پیسے
اسلام کا اصلاحی پروگرام	ایک روپیہ
مجاہدین کی کہانیاں	۷۵ پیسے
اکرام المسلمین	۵۰ پیسے
آخرت کے فکرمندوں کے پچاس قصے	۴۰ پیسے
آداب مشیت	۵۰ پیسے
اصلاح انقلاب	۲۷ پیسے

اسلام میں پردہ کی حقیقت	۴۰ پیسے
مختصر فضائل نبوی	ایک روپیہ
چھ باتیں	۴۰ پیسے
پیام عمل	۲۵ پیسے
دین خالص	۲ روپے ۵۰ پیسے
دعوت ذکر	۷۵ پیسے
حضرت عثمان غنیؓ	۴۰ پیسے
حضرت عمرؓ	۶۰ پیسے
حضرت علیؓ	۴۰ پیسے
فیضان الحروف	ایک روپیہ ۵۰ پیسے

مکتبہ ونشانات، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

شمع مِنی معمّہ نمبر ۲۳

Rs. 8,000.00

آٹھ ہزار روپے کے نقد اِنعام

پہلا انعام بالکل درست حل پر: پانچ ہزار روپے . دوسرا انعام ایک غلطی والے حل پر: تین ہزار روپے

فیس داخلہ فی حل : ایک روپیہ . آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں . فیس داخلہ پوسٹل آرڈر، منی آرڈر یا شمع ادبی معمّوں کے نقد ناموں کے ذریعے ادا کی جا سکتی ہے . نقد نامہ ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانہ سے ملنے والی رسید اپنے حلوں کے ساتھ بھیجئے . آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں . ان کی فیس ایک ساتھ بھیج سکتے ہیں اور ہر حل پر علیٰحدہ انعام کے حق دار ہو سکتے ہیں . کوئی ٹوکن بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے . ٹوکن بھیجنے کی شرط کے علاوہ شمع ادبی معمّوں کی دوسری تمام شرائط شمع مِنی معمّوں پر بھی عائد ہیں . ان کی پابندی ضروری ہے .

دفاتر شمع (نئی دہلی) میں ڈاک سے اور دستی حل وصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۷ اگست ۱۹۷۷ ، ۸ بجے رات تک

شمع مِنی معمّہ نمبر ۲۳

۱ س	۲ س	۳	۴	■	■
			ہ	■	■
ک		ی	■	۵ ج	
ن	ی	■	۶	ک	ڑ
ا	■	۷ ع	ی	ا	
■	۸ ا			ا	ر

اشارے

اوپر سے نیچے

۱ - عورت دھاڑیں مار کر رو لے تو مجھ پر اثر نہیں ہوتا . لیکن یہ چپکے چپکے ——— نہیں دیکھا جاتا

۲ - عورت جو کبھی ——— ہوئی گٹھڑی سی بنی ایک کونے میں پڑی رہتی تھی آج اپنے حقوق کے لئے

۳ - گٹھڑی سی بنی ایک کونے میں پڑی رہتی تھی آج اپنے حقوق کے لئے سامنے آ کر ——— ہوئی ہے

۴ - پوچھتے ہیں ——— کہ "غالب کون ہے؟" کوئی بتلاؤ ، کہ ہم بتلائیں کیا

دائیں سے بائیں

۵ - تجربات کی بھٹی میں ——— کر کوئی کندن بن جاتا ہے اور کوئی فقط راکھ

۶ - اجڈ سپاہی شاعرِ اعظم کو اسی طرح ——— کر کھینچتے ہوئے دربار میں لائے جیسے کسی چور یا اٹھائی گیر کو

۷ - ——— مرد اپنی خوش وقتی کے لئے کسی کی معصوم زندگی برباد کر کے اپنی کامیابی پر ایک ظالمانہ مسرت محسوس کرتا ہے

۸ - اب ——— کرنے سے کوئی فائدہ نہیں . وقت گیا بات گئی

●●

شمع ادبی معمّے (شمع مِنی معمّہ نمبر ۲۳) ماہنامہ شمع ، آصف علی روڈ ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

شمع مِنی معمّہ نمبر ۲۳ کا صحیح حل ۳۱ اگست ۱۹۷۷ کو نوٹس کے سامنے ظاہر کر دیا جائے گا . صحیح حل اور انعام پانے والوں کے نام ستمبر ۱۹۷۷ کے "بانو" میں شائع کئے جائیں گے . انعام پانے والوں کی تفصیلات شمع : اکتوبر ۱۹۷۷ میں بھی شائع کی جا سکتی ہیں .

★ اب آپ ایک شمع ادبی معمّہ اور دوسرے شمع ادبی معمّہ کے حل بھیجنے کے درمیان اپنے ادبی ذوق کی تسکین کر سکتے ہیں . . . مِنی معمّہ کے ذریعے !

★ کوئی ٹوکن بھیجنے کی قید نہیں !

★ جتنے حل جی چاہے بھیجئے اپنے تمام حلوں کی فیس ایک یا ایک سے زیادہ منی آرڈر ، پوسٹل آرڈر یا نقد ناموں سے بھیج سکتے ہیں

★ آپ ہر حل پر انعام کے حق دار بن سکتے ہیں فیس داخلہ فی حل صرف ایک روپیہ

★ صرف آٹھ اشارے انعام پانا کس قدر آسان !

★ فیس داخلہ بھیجنے کے لئے شمع ادبی معمّوں کے نقد نامے استعمال کئے جا سکتے ہیں یا پوسٹل آرڈر ، منی آرڈر بھیجئے . اپنے حلوں کے ساتھ نقد نامہ ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید ضرور بھیجئے .

صحیح حل : جوابی لفافہ بھیج کر منگوا لیجئے یا پھر اگلے ماہنامہ "بانو" یا ماہنامہ "شمع" میں دیکھئے .

★ شمع مِنی معمّہ نمبر ۲۳ کا نتیجہ ستمبر ۱۹۷۷ کے "بانو" میں اکتوبر ۱۹۷۷ کے شمع میں شائع کیا جائے گا .

[illegible]۱۹ء ۔ کا اکتیسواں سال، نواں شمارہ

نگراں:

یوسف دہلوی

مدیرہ: زینت کوثر دہلوی ادارۂ تحریر: شمیم آرا دہلوی سعدیہ دہلوی

مالکان: شمع میگزین ● طابع وناشر: یونس دہلوی ● مطبوعہ: ایس، پی پریس ● ٹائٹل: بمبئی آفسیٹ پریس

عام شمارے کی قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے، سالانہ قیمت: اٹھارہ روپے (جس میں سالا[illegible]نمبر مفت ملتا ہے)

مقام اشاعت وصدر دفاتر: آصف علی روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ [illegible]

افتتاحیہ

ہر انسان کے دل میں فطری طور پر یہ جذبہ ہوتا ہے کہ اس کے دوست، رشتہ دار اور دوسرے ہم عصر اس کی جائز و ناجائز بات مان لیں، اور اس کی بڑائی تسلیم کریں۔ اگر اس جذبہ کے ساتھ انسان میں ذہانت، تعلیم، خوش کلامی، بے غرضی اور اپنے جذبات پر پورا کنٹرول ہو تو وہ واقعی ایک عظیم رہنما بننے کے قابل ہے اور دوسروں کے لئے اس کا ہر مشورہ قابلِ غور ہے۔ ایسے آدمی کی ہر بات بلا کسی چون و چرا تسلیم کر لی جاتی ہے۔

بے غرضی، خلوص، خوش کلامی اور ذہانت کی کمی کے باوجود جو لوگ بڑا بننے کی اور اپنی بات کو اوپر رکھنے کی ضد کریں اور کوئی دوسرا ان کی بات ماننے کے لئے تیار نہ ہو تو ایسے لوگ غصہ اور چیخ و پکار کر کے دوسروں پر رعب بٹھا کر اپنی بات منوانے کی کوشش کرتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بجائے مسئلہ حل ہونے کے اور الجھ جاتا ہے، فضا بوجھل ہو جاتی ہے اور مزید پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

اپنی بڑائی دوسروں سے زبردستی کبھی نہیں منوائی جا سکتی۔ اپنے گھر، خاندان، محلے، شہر یا ملک کا لیڈر بننے کے لئے عقلِ سلیم، قوتِ سماعت، دور اندیشی، قربانی کا جذبہ اور اس [illegible]ت ضروری ہے۔



روزالین کارٹر کے شب و روز



▲ روزالین وائٹ ہاؤس میں

امریکہ کا صدر دنیا کا سب سے
طاقت ور انسان کہلاتا ہے۔ اس کے اختیارات
بہت وسیع ہوتے ہیں۔ وہ امریکی فوجوں کا افسرِ
اعلیٰ ہوتا ہے۔ اس کی کابینہ کے وزیر اس کے
خادم ہوتے ہیں۔ وہ صرف اس کے سامنے ہی
جواب دہ ہیں۔ امریکہ کا صدر چار سال کے لئے
منتخب ہوتا ہے۔ اس کے بعد اسے مزید چار سال
کے لئے صدر چُنا جا سکتا ہے۔ آٹھ سال سے
زیادہ کسی صدر کو حکومت کرنے کی اجازت
نہیں۔ صدر کی بیوی کی کوئی قانونی پوزیشن
نہیں ہوتی۔ وہ صرف صدر کی بیوی ہوتی ہے
اور بس۔ اس کے باوجود گذشتہ زمانے میں ان
"خواتین اول" نے میدانِ عمل میں حصہ لیا ہے
سابق صدر آن جہانی روز ویلٹ کی بیوی نے
اس بارے میں ایک عمدہ مثال قائم کی ہے۔
انہوں نے کئی بار دنیا کا سفر کیا۔ وہ درجنوں
اداروں کی صدر تھیں۔ آج کل روزالین کارٹر
ان ہی کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کر رہی ہیں
صدر کارٹر اور ان کی بیگم امریکہ کی ایک
جنوبی ریاست جارجیا کے رہنے والے ہیں۔ جارجیا
کے ایک گاؤں "پلینس" میں ان کا گھر ہے۔ صدر
کارٹر کا خاندانی پیشہ مونگ پھلی کی کاشت ہے
امریکہ کی جمہوریت کے لئے یہ بات قابلِ فخر
ہے کہ مونگ پھلی اگانے والا ایک کسان اس
ملک کا صدر منتخب ہو گیا۔ روزالین ایک
غریب خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ وائٹ ہاؤس
میں رہائش اختیار کرنے کے بعد بھی ان کے
معمولات میں زیادہ فرق نہیں آیا۔ صدارتی
محل کے ایک کونے میں ان کا دفتر ہے۔ وہ
اپنے دفتر میں ٹھیک ½9 بجے صبح پہنچ جاتی
ہیں اور فون گھمانا شروع کر دیتی ہیں۔
امریکیوں کا دستور ہے کہ وہ اپنے سارے مسائل
ٹیلی فون کے ذریعے ہی طے کرتے ہیں۔ ٹیلی فون
پر امریکن کی زندگی کا ایک لازمی جزو ہے۔ آج
کل روزالین کی توجہ کا مرکز دو مسئلے ہیں۔ پہلا
دماغی مریضوں کی نگہداشت اور دوسرا
عورتوں کے لئے برابر کے حقوق حاصل کرنا۔ یہ
ایک تعجب انگیز بات ہے کہ امریکہ جیسے ترقی یافتہ
ملک میں ابھی تک عورتوں کو مردوں کے برابر
حقوق حاصل نہیں۔ وہاں عورتوں اور مردوں
کی تنخواہیں برابر نہیں ہیں۔ اعلیٰ سرکاری عہدوں
کا دروازہ عورتوں کے لئے بند ہے۔ لوگوں کا
اندازہ ہے کہ ایک عورت کو امریکہ کا صدر بننے
کے لئے مزید سو سال کا عرصہ درکار ہے۔
روزالین ٹیلی فون پر بات چیت کے ساتھ روز



▲ روزالین اپنے گاؤں کے مضافات میں قدیم ریڈ انڈین باشندوں کے تیر دیکھ



ل بھی دیکھتی ہیں، خطوط کے جواب بھی
یا۔ دوپہر کو دفتر سے وہ آدھے گھنٹے کے
ائٹ ہاؤس کے ڈائننگ روم میں
اتی ہیں۔ وہاں وہ صدر کے ساتھ کھانا
ہیں۔ کھانے کے بعد وہ پھر اپنے دفتر
تی ہیں۔ ساڑھے چار بجے وہ نصف گھنٹہ
کے ساتھ گزارتی ہیں۔ اس کے بعد وہ
تک دفتر میں کام کرتی ہیں۔ اگر شام کو
کوئی تقریب نہ ہو تو روزالین دفتر سے گھر چلی جاتی ہیں۔ رات کا کھانا وہ صدر کے ساتھ کھاتی ہیں۔ صدر رات کے کھانے کے بعد بھی کام کرتے ہیں۔ یہ کام عموماً ۱۱ بجے رات کو ختم ہوتا ہے۔

وائٹ ہاؤس میں ہر ہفتہ کے دو دن اسٹاف میٹنگ کے لئے مقرر ہیں۔ منگل اور جمعرات کی صبح کو وائٹ ہاؤس کا اسٹاف روزالین کے دفتر میں آئندہ کا پروگرام طے کرتا ہے۔



وائٹ ہاؤس کے ملازمین کی تعداد ۱۸ ہے۔ ان میں ۱۶ مرد اور ۲ عورتیں شامل ہیں۔ اسٹاف میٹنگ کا ماحول دوستانہ ہوتا ہے۔ منگل، بدھ اور جمعہ کے دن روزالین ہسپانوی زبان سیکھتی ہیں۔ جنوبی امریکہ کے تقریباً تمام ملکوں میں ہسپانوی زبان بولی جاتی ہے۔ روزالین آئندہ چار برس میں جنوبی امریکہ کی تفصیلی سیاحت کا ارادہ رکھتی ہیں۔ ہر منگل کی رات کو ۷ بجے دونوں میاں بیوی تیز رفتاری سے پڑھنے کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان دونوں کے لئے یہ کورس بہت ضروری ہے کیوں کہ روزانہ سیکڑوں خط، اخبار اور رسالے پڑھنا ان کے فرائض میں داخل ہے۔

وائٹ ہاؤس میں پہنچ جانے کے بعد روزالین کی مصروفیات بہت بڑھ گئی ہیں، لیکن انہیں ایک دردِ سر سے چھٹکارا بھی مل گیا ہے۔ گزشتہ ۲۵ برس سے وہ روزانہ سورج نکلتے ہی بستر چھوڑ دیتی تھیں اور اپنے شوہر کے لئے ناشتہ بناتی تھیں یہ ناشتہ خاصا لمبا چوڑا ہوتا تھا اس میں پھلوں کے عرق، ٹوسٹ، انڈے، دلیہ مکھن، جام اور کافی شامل ہوتے تھے۔ آج کل صدر کارٹر اتنے بڑے ناشتہ کے لئے وقت نہیں نکال سکتے۔ وہ کہتے ہیں کہ انہیں اس ناشتے کی ضرورت ہی نہیں۔ ناشتے میں وہ صرف سنگترے کا عرق پیتے ہیں۔ اس ہلکے ناشتے کے بعد وہ اپنے آپ کو چاق و چوبند محسوس کرتے ہیں۔ روزالین کو افسوس ہے کہ انہیں یہ بات ۲۵ سال پہلے کیوں نہ معلوم ہوئی۔ اس طرح وہ ناشتہ بنانے کے دردِ سر سے تو بچ جاتیں۔

روزالین کی اوّلین مصروفیت دماغی بیماریوں کی روک تھام ہے۔ امریکہ میں افیون اور چرس کا استعمال روز بروز ترقی پر ہے۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ماحول کی سختی سے تنگ



روزالین کارٹر اپنے خاوند کے ساتھ



روزالین صدر کارٹر اور بیٹی ایمی کے ساتھ — صدر کا حلف اٹھانے کے بعد لوگوں سے ملتے ہوئے

آ کر افیون کی مدہوشی میں پناہ لیتے ہیں۔ کچھ لوگ فیشن کی خاطر ان چیزوں کو استعمال کرتے ہیں۔ بعض لڑکے تجسس کے تحت چرس کا استعمال کرتے ہیں۔ وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس کا کیا اثر ہوتا ہے نشہ کی ابتدا خواہ کسی جذبے کے تحت ہو، جلد ہی اس کی عادت پڑ جاتی ہے۔ نتیجہ میں آدمی دین کا رہتا ہے اور نہ دنیا کا۔ وہ طرح طرح کی دماغی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ امریکہ میں زندگی تیز رفتاری سے دوڑتی ہے۔ جو لوگ ہمت سے کام لیتے ہیں وہ زندگی کی دوڑ میں کامیاب ہو جاتے ہیں جو لوگ ہمت ہار جاتے ہیں وہ نشہ کی گولیوں سے اپنی مایوسی کا علاج کرتے ہیں۔

حکومت نے نشلی دواؤں کی روک تھام کے لئے ایک کمیٹی بنائی ہے۔ مگر روزالین اس کمیٹی کی صدر نہیں بن سکیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ کا صدر اپنی کسی قریبی رشتہ دار کو کوئی عہدہ نہیں دے سکتا۔ روزالین صدر کی سب سے قریبی "رشتہ دار" ہیں، اس لئے اس کمیٹی کا صدر دوسرا شخص نامزد ہوا اور روزالین کو اعزازی صدر کے عہدے پر ہی اکتفا کرنا پڑی۔ دماغی بیماریوں میں روزالین کی دلچسپی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ خود صدر کارٹر کے خاندان میں دو آدمی ان بیماریوں میں مبتلا رہ چکے ہیں۔

روزالین تنہائی پسند ہیں۔ ان کے بس چند گنے چنے دوست ہیں۔ ان کی ایک بہن کی سہیلی ان سے زیادہ قریب ہے۔ روزالین کی مصروف زندگی میں دوستوں کے لئے وقت نہیں وہ کافی پارٹیوں سے پرہیز کرتی ہیں اور تماشوں سے انہیں رغبت نہیں۔ صدر کارٹر کی انتخابی مہم کے دوران انہوں نے تنہا کئی ہفتے فلوریڈا میں گزارے تھے۔ فلوریڈا سیاحوں کا مرکز ہے۔ جاڑوں میں یہاں دھوپ نکلتی ہے اور موسم معتدل رہتا ہے۔ لاکھوں امریکی سیاح شمال کی سردی سے بچنے کے لئے فلوریڈا چلے جاتے ہیں، سمندر کے کنارے دھوپ کا غسل کرتے ہیں اور سمندر یا سوئمنگ پول میں تیرتے ہیں۔ روزالین نے فلوریڈا میں ایک دن کے لئے بھی ان تفریحات میں حصہ نہیں لیا — انہیں دھوپ اور گرد و غبار سے الرجی ہے۔ اس کے علاوہ انہیں کتوں اور پھولوں سے بھی الرجی ہے۔ یہی الرجی ان کے آڑے آ گئی۔ فلوریڈا میں انہوں نے خود کو اپنے خاوند کی انتخابی مہم میں ہی مصروف رکھا۔ روزالین ورزش سے بھی دور بھاگتی ہیں۔ صحت کے لئے وہ وٹامن کی گولیوں کا استعمال کرتی ہیں۔ انہوں نے کبھی سگریٹ چھوا تک نہیں۔ شراب سے بھی ہمیشہ پرہیز کیا ہے۔

چند سال پہلے تک روزالین [illegible] انسان تھیں۔ وہ بڑی شرمیلی عورت تھیں۔ وہ ہمیشہ اپنے خول میں بند رہنا پسند کرتی تھیں لیکن چند سال [illegible]

میں انقلاب آگیا۔ انہوں نے اپنی جھجک پر قابو پالیا اور اپنے آپ کو دنیا سے روشناس کرایا۔ اس کے لئے انہیں بڑی جدوجہد کرنا پڑی۔ وہ ایک معمولی سے گاؤں میں رہتی تھیں۔ ان کے گھر پر غریبی کا سایہ تھا۔ ان کا سماجی پس منظر قابل ذکر نہیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو ان ساری زنجیروں سے آزاد کیا۔ اس جدوجہد میں انہیں فتح نصیب ہوئی اور وہ اس قابل ہوگئیں کہ وائٹ ہاؤس میں ایک صدر کی بیوی کی حیثیت سے رہ سکیں۔

روزالین کی نئی زندگی کا آغاز

۱۹۵۳ سے ہوا۔ اس سال جمی کارٹر کے باپ کا انتقال ہوگیا اور جمی کو مونگ پھلی کے کھیتوں کی دیکھ بھال کے لئے واپس اپنے گاؤں آنا پڑا۔ اس سے پہلے کارٹر امریکی بحریہ میں ایک افسر تھے۔ روزالین کو ایک نیول افسر کی بیوی کی زندگی بہت پسند تھی۔ وہ دونوں پارٹیوں میں شریک ہوتے، دنیا بھر میں سفر کرتے اور آزادی کی زندگی گزارتے۔ روزالین کو گاؤں کی اکتا دینے والی زندگی پسند نہیں تھی۔ لیکن انہوں نے فرض کے آگے گردن جھکادی۔ ان کی زندگی کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان کو وہی کرنا چاہئے جو اس کے لئے ضروری ہے۔ روزالین اپنے شوہر کے ساتھ ان کے گاؤں پہنچ گئیں۔ پلینس ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اس کی آبادی تقریباً ۶۰۰ ہے۔ یہاں سے ریل بھی نہیں گزرتی۔

روزالین کو اس دُور افتادہ گاؤں میں زندگی گزارنا تھی۔ روزالین کا کہنا ہے کہ وہ گاؤں واپس پہنچ کر ہی کارٹر کے نزدیک آئیں۔ دونوں نے مل کر مونگ پھلی کے کھیتوں کی دیکھ بھال شروع کردی۔ اب روزالین کو احساس ہوا کہ کارٹر کو ان کی کتنی ضرورت ہے۔ وہ ہر مسئلے پر روزالین کی رائے معلوم کرتے۔ اس طرح دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے۔

امریکہ کی جنوبی ریاستوں کی عورتوں کا مزاج شمالی عورتوں سے مختلف ہوتا ہے۔ جنوب کی عورتیں اپنے خاوند سے بہت محبت کرتی ہیں اور ان کا ضرورت سے زیادہ خیال رکھتی ہیں۔ وہ اپنے شوہر کو اپنی خدمت سے اپنا محتاج بنادیتی ہیں۔ اگر ان کا شوہر زندگی میں کام یاب ہوجاتا ہے تو وہ خود کو اس کی کام یابی کا ذمہ دار سمجھتی ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ مرد بغیر ان کی مدد کے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔

روزالین کا بھی یہی خیال ہے۔ ۱۹۶۲ میں جب کارٹر جارجیا کی اسمبلی کے ممبر چنے گئے تو وہ ہر سال تین مہینے کے لئے اپنے گھر سے غیر حاضر رہتے اس دوران روزالین ہی کاروبار کی دیکھ بھال کرتیں۔ انہیں اپنی اہمیت کا احساس ہے وہ کہتی ہیں کہ اگر وہ جمی کی غیر حاضری میں کاروبار کی دیکھ بھال نہ کرتیں تو جمی کارٹر کبھی کام یاب نہیں ہوسکتے تھے۔ ۱۹۷۰ میں کارٹر جارجیا کے گورنر منتخب ہوئے۔ ان کی انتخابی مہم کی کام یابی روزالین کی جدوجہد کی رہین ہے۔ انہوں نے اپنے شرمیلے پن کو بالائے طاق رکھ کر اپنے بچوں کے ساتھ ساری ریاست کا دورہ کیا۔ ان کی مدد سے کارٹر گورنر بن گئے۔

۱۹۷۶ کی صدارتی مہم میں بھی یہی لائحہ عمل دہرایا گیا۔ روزالین صبح کو ۴½ بجے اٹھتیں اور دن بھر اپنے خاوند کی انتخابی مہم کے لئے کام کرتیں۔ اکثر آدھی رات تک ان کو سونا نصیب نہ ہوتا۔ صدارتی مہم کی کام یابی کے بعد انہیں ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں تقریر کرنی تھی۔ ان کی ٹانگیں لرز رہی تھیں، مگر انہوں نے تقریر جاری رکھی۔ تقریر کے خاتمے کے بعد انہیں خود اپنی کام یابی پر تعجب ہوا

صدر کارٹر اور روزالین کی شادی کو ۳۰ سال گزر چکے ہیں۔ دونوں میں بے حد محبت ہے۔ وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلتے ہیں۔ صدر کارٹر بازار میں بھی اپنی بیوی کو پیار کرنے سے نہیں چوکتے۔ ان کے تین بچے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا لڑکا چپ اپنی دادی کے ساتھ ہندوستان کے سابق صدر مرحوم فخرالدین علی احمد کے جنازے میں شرکت کے لئے ہندوستان آیا تھا۔



بگلا

روشن آرا

"بیٹا، تُو اتنے بڑے شہر میں اکیلا رہتا ہے رہتے ہوئے بھی تجھے گھر کا آرام حاصل نہیں۔ آخر تُو کب تک کنوارا بیٹھا رہے گا۔ میں تجھے شادی کے بغیر نہیں جانے دوں گی۔" ممتاز کی ماں نے بیٹے کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

ممتاز نے جواب دیا: "اچھا اماں، جیسی آپ کی مرضی۔"

ممتاز کی ماں کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اس کو گمان بھی نہیں تھا کہ اس کا بیٹا اتنی جلدی شادی کرنے پر رضامند ہو جائے گا۔ وہ خوشی سے بے قابو ہو گئی اور اپنے شوہر کو یہ خوش خبری سنانے کے لئے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

ممتاز ایک ڈاکٹر تھا۔ ایم بی بی ایس کرنے کے بعد اسے ایک اسپتال میں ملازمت مل گئی تھی۔ وہ ایک اچھا سرجن تھا۔ کچھ مدت کے بعد اس کا تبادلہ ملک کے دوسرے حصے میں ہو گیا۔ ممتاز کی ضروریات واجبی تھیں۔ اُسے شراب اور سگریٹ سے نفرت تھی، خصوصاً وہ عورتوں سے بہت ڈرتا تھا۔ اُس کا قول تھا کہ عورت مرد کا سکون برباد کر دیتی ہے، اُسے اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے چھڑا دیتی ہے، اُس کے دل میں نفرت کا بیج بو دیتی ہے۔ شادی کے بعد آدمی نہ دین کا رہتا ہے، نہ دُنیا کا۔ وہ صرف بیوی اور بچّوں کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان ہی خیالات کے تحت ممتاز اب تک کنوارا تھا۔ اُس کے ماں باپ شادی کے لئے اصرار کرتے تو وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ٹال جاتا۔ اس کی ماں بہت بگڑتی، لیکن وہ مجبور تھی۔ ممتاز کی ضد کے آگے اُس کی ایک نہ چلتی۔ آج ممتاز نے خلافِ امید شادی کے لئے 'ہاں' کر دی تو اُس کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ مغربی ممالک کی مائیں اپنے بیٹوں کو انجینئر، ڈاکٹر، سائنس داں بنانے کے خواب دیکھتی ہیں، لیکن ہندوستانی ماں کے لئے صرف ایک ہی خواب ہوتا ہے: وہ اپنے بچّے کو دُولہا بنا ہوا دیکھنا چاہتی ہے۔ بچّے کے سر پر سہرا دیکھنا ہی اس کی خواہشوں اور خوشیوں کی معراج ہے۔ ممتاز کی ماں نے اسی معراج تک پہنچنے کے لئے لڑکیوں کی تلاش شروع کر دی۔

ثروت نے بی اے پاس کرنے کے بعد بی ایڈ میں داخلہ لے لیا تھا۔ اُس کے ماں باپ آزاد خیال تھے۔ انہوں نے ثروت کی زندگی کا فیصلہ کرنے کا اختیار اس پر چھوڑ دیا تھا۔ ثروت ٹیچر بننا چاہتی تھی۔ اُسے ہندوستانی بیوی کا رول پسند نہیں تھا۔ وہ کہتی تھی کہ عورت میں شادی کے بعد سُرخاب کا پَر کیوں لگ جاتا ہے۔ جاہل سے جاہل اور پھوہڑ سے پھوہڑ عورت بھی دُلہن بن کر اپنی کنواری سہیلیوں پر اس طرح رُعب گانٹھتی ہے جیسے اُس کے نام لاٹری نکل آئی ہو۔ شادی سے عورت کو سماج میں ایک مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ مرد سماج میں عزت حاصل کرنے کے لئے بڑے پاپڑ بیلتا ہے، لیکن عورت ایک دفعہ سُرخ جوڑا پہن کر وہی مقام حاصل کر لیتی ہے۔ اس کے سُرخ جوڑے کے سامنے یونی ورسٹیوں کے سیاہ گاؤن ماند پڑ جاتے ہیں۔ ثروت نے بی۔ ایڈ پاس کیا تو اُس نے کئی اسکولوں میں ملازمت کے لئے درخواستیں بھیجیں۔ ابھی اُس کو جواب کا انتظار ہی تھا کہ ممتاز کے یہاں سے اُس کے لئے پیام آگیا۔ مگر ثروت شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ شادی کے خلاف نہیں تھی، لیکن اُسے اندیشہ تھا کہ [illegible] والا خاوند اُس کے نصب العین کی راہ میں [illegible] بن جائے گا۔ اُس نے اپنے ماں باپ کے [illegible] اپنے خدشے ظاہر کئے، لیکن انہوں نے اُس کو [illegible]

سُنی اَن سُنی کر دی۔ ان کا کہنا تھا کہ ممتاز بر سرِ روزگار ہے، اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے، نیک ہے، کنوارا ہے —— بس اور کیا چاہئے۔ یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو پھر دوسرا موقع نہ جانے کب ہاتھ آئے ماں باپ لاکھ روشن خیال ہوں، لیکن لڑکی کا پیام آتے ہی اُن کی ساری روشن خیالی دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ لڑکی پرایا دھن ہے، وہ ایک بوجھ ہے دوسرے گھر کی امانت ہے —— ماں باپ صدیوں سے یہ باتیں سنتے آئے ہیں۔ یہ باتیں اُن کے ذہن کے گوشوں میں بس گئی ہیں۔ اُن کے اصرار کے آگے ثروت مجبور ہو گئی اور اُس نے شادی کے لئے ہاں کر دی۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اسے اُمید تھی کہ اس کا خاوند اُس کی منزل کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنے گا۔

ثروت دلہن بن کر ممتاز کے گھر آ گئی —

سسرال میں اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ وہ اتنے لوگوں کی توجہ پا کر بہت خوش ہوئی۔ لیکن ممتاز اسے پسند نہ آیا۔ ہر انسان کے ذہن میں اپنے محبوب کا ایک خاکہ ہوتا ہے۔ وہ جس وقت اس خاکے سے ملتی جلتی صورت دیکھتا ہے۔ اپنا دل ہار دیتا ہے۔ مرد کو اگر اپنے خاکے سے ملتی جلتی صورت نہ ملے تو وہ اسی پر قناعت کر لیتا ہے۔ اس کی تسکین کے لئے دنیا میں بہت سے دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ محبت اس کی زندگی کا محض ایک حصہ ہوتی ہے۔ عورت کے لئے محبت ہی زندگی ہوتی ہے۔ اس کا اپنا آئیڈیل [...] تو اس کے دل کا آئینہ ٹوٹ جاتا ہے جب [...] مایوس ہو کر چاروں طرف نظر دوڑاتی ہے تو ساری عورتوں کو اسی مایوسی کا شکار دیکھتی ہے۔ اکیلے انسان کو مصیبت کا سامنا کرنا پڑے تو وہ گھبرا جاتا ہے، لیکن جب بہت سے انسان اسی مصیبت میں مبتلا ہوں تو دل کو ڈھارس ہوتی ہے صدیوں سے یہی ہوتا آیا ہے اور نہ جانے کب تک ہوتا رہے گا۔ ثروت نے بھی اپنے دل کو سمجھا بجھا کر راضی کر لیا۔

ممتاز کی چھٹیاں ختم ہو گئیں تو وہ ثروت کو اپنے ساتھ لے گیا۔ ثروت نئے شہر میں آ کر بہت خوش تھی۔ اُن کے پڑوسی بہت اچھے تھے۔ ممتاز جب تک اسپتال میں رہتا، ثروت وقت گزارنے کے لئے پڑوس کے مکان میں چلی جاتی۔ اُس کی پڑوسن مسز لال ایک سوشل ورکر تھیں۔ وہ اُسے مزے مزے کے قصے سناتیں۔ مسز لال کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ جب ثروت نے اُن کو بتایا کہ وہ ٹیچر بننا چاہتی ہے تو انہوں نے اُس کے لئے نوکری ڈھونڈنے کا وعدہ کر لیا۔ کچھ دن کی دوڑ دھوپ کے بعد انہوں نے ثروت کو بتایا کہ ایک بہت اچھے اسکول میں لیڈی ٹیچر کی جگہ خالی ہے۔ ثروت یہ سن کر بہت خوش ہوئی۔ اُس نے فوراً اسکول کی پرنسپل کو درخواست بھیج دی۔ ثروت نے ممتاز کو ابھی تک اپنی ملازمت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اُس کا ارادہ تھا کہ جب اسکول سے انٹرویو کال آئے گی تو وہ ممتاز کو یہ خوش خبری سنا دے گی۔ آخر خدا خدا کر کے انٹرویو کال آ گئی۔ ثروت بہت خوش تھی۔ ممتاز جب اسپتال سے واپس آیا تو چائے پینے کے بعد ثروت نے اُسے یہ خوش خبری سنائی۔ مگر یہ خبر سن کر ممتاز کی تیوری پر بل آ گئے اور اس کے چہرے پر ناگواری کی جھلک نمودار ہو گئی۔ ثروت سہم گئی۔ اس نے سوچا "اے خدا! یہ تو خبر سن کر بگڑ گئے!" اس کا اندازہ ٹھیک نکلا۔ ممتاز رُکھائی سے بولا "تمہیں نوکری کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا میری آمدنی کافی نہیں مجھے عورتوں کا ملازمت کرنا اچھا نہیں لگتا۔" ممتاز نے یہ کہہ کر انٹرویو کال کا خط ثروت کے ہاتھ سے لے لیا اور نہایت اطمینان سے اس کے چار ٹکڑے کر دئے ثروت دم بخود رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اس کا گلا رُندھ گیا۔ وہ خاموشی سے اٹھی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

کہتے ہیں کہ وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ ممتاز کے انکار نے ثروت کا دل توڑ دیا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ اس نے حالات سے سمجھوتا کر لیا جب اس کے یہاں پہلا بچہ پیدا ہوا تو اُس نے ملازمت کے خیال کو ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دیا۔ محمود بڑا پیارا بچہ تھا۔ ثروت کو اُس کی دیکھ بھال سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو مکمل عورت سمجھنے لگی۔ اُس نے ممتا کے جذبہ کا نام ہی سنا تھا، محمود کی پیدائش کے بعد اسے احساس ہوا کہ ممتا کا جذبہ حقیقت میں کیا ہے۔ تجربہ سب سے بڑا استاد ہے۔ اب محمود ہی اس کی دنیا تھا۔ محمود کو سینے سے لگا کر اُسے بڑا سکون ملتا۔ دو سال کے بعد رُوشی پیدا ہوئی تو اس کی ذمہ داریاں اور بڑھ گئیں۔ دونوں بچوں نے اس کا سارا وقت ہتھیا لیا۔ ممتاز بھی خوش تھا کہ اُس کی بیوی کا خیال بٹ گیا۔ بچوں نے اس کے سر سے ملازمت کا بھوت اتار دیا تھا۔

اسی طرح دس سال گزر گئے۔ محمود اب پانچویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ رُوشی تیسری کلاس میں تھی دونوں بچے بہت ذہین تھے۔ ثروت نے ابتدا میں کوشش کی کہ ان کا ہوم ورک کرانے میں ان کی مدد کرے، لیکن انہیں اس کی مدد کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ثروت کو خوشی تھی کہ اس کے بچے ذہین ہیں، لیکن دل کے کسی کونے میں اس کو مایوسی کا احساس بھی تھا۔ وہ سوچتی اس کے بچوں کو اس کی ضرورت نہیں۔ کاش اس کے بچے اتنے ذہین اور ہوشیار نہ ہوتے۔ کاش وہ اُن کو پڑھا

سکتی۔ اُن کے ساتھ بیٹھ کر اُن کے سوالات حل کرتی
کام نہ کرنے پر اُن کو ڈانٹتی۔ اُن کے ساتھ اپنا سر
کھپاتی۔ لیکن اُس کی آرزو دل میں ہی رہ گئی۔
اُس کے دل میں پھر ٹیچر بننے کی خواہش انگڑائیاں
لینے لگی۔ لیکن اُس نے اپنی خواہش کو سختی سے
کچل دیا۔

دونوں بچے صبح کو اسکول چلے جاتے اور
دوپہر کو اسکول سے واپس آتے۔ کھانا کھا کر وہ تھوڑا
آرام کرتے اور پھر پڑوس کے بچوں کے ساتھ کھیلنے
نکل جاتے۔ بچوں کے ساتھ ثروت کا تعلق آہستہ
آہستہ ختم ہو رہا تھا۔ بچوں کی اپنی الگ دنیا تھی۔ اپنے
الگ دوست تھے۔ اپنی الگ کتابیں تھیں۔ ثروت
کا کام اب صرف کھانا پکانا تھا۔ وہ مصروف رہنا
چاہتی تھی۔ اسے مجبوراً فرصت کے لمحات مطالعہ میں
گزارنے پڑتے۔ مگر مطالعہ کی بھی ایک حد ہوتی ہے
وہ کتابوں سے اُوب گئی۔ اس کی طبیعت میں چڑچڑا
پن پیدا ہو گیا۔ اس کا بلڈ پریشر بڑھ گیا۔ اس کا ہاضمہ
خراب ہو گیا۔ ان حالات میں قدرتی طور پر اس کا
نزلہ ممتاز پر گرتا۔ اس کی نظر میں وہی اس کی موجودہ
حالت کا ذمہ دار تھا۔ کاش وہ اسے ٹیچر بننے کی اجازت
دے دیتا۔ وہ یہ بھول جاتی کہ بچوں کی پیدائش کے
بعد اُسے اسکول کی ملازمت چھوڑنا پڑی تھی۔ جب طبیعت
میں چڑچڑا پن ہو تو انسان ناراض ہونے کے بہانے
تلاش کر لیتا ہے۔ وہ ممتاز سے خوب اُلجھتی۔ اس کی
ہر بات کاٹتی۔ ممتاز انسان کے جسم کی سرجری کر سکتا
تھا۔ اس کے دماغ کی نہیں۔ وہ پریشان ہو جاتا۔
لیکن اُس نے خاموش رہنے میں ہی مصلحت سمجھی
ثروت نے اس کا ناطقہ بند کر دیا۔ ممتاز اسپتال سے
دیر سے گھر آنے لگا۔ گھر میں بھی وہ خاموش رہتا۔
بھڑکے چھتے کو چھیڑنا ٹھیک نہیں تھا۔ وہ بچوں سے
اپنا دل بہلا لیتا۔ مگر ثروت تاک میں رہتی۔ وہ کسی
نہ کسی طرح دخل در معقولات کر کے جھگڑا شروع کر دیتی۔
ممتاز کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر ثروت
کو کیا ہو گیا ہے۔ اُسے معلوم تھا کہ ثروت خالی بیٹھنا
پسند نہیں کرتی۔ آخر اُسے ایک ترکیب سوجھی۔ اس
نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ثروت کو ٹیچر بننے میں مدد کرے
گا۔ اس نے اپنے دوستوں سے تذکرہ کیا۔ ایک
دن اسے معلوم ہوا کہ کسی اسکول میں ٹیچر کی جگہ خالی
ہے۔ اُس نے ثروت کو بتلائے بغیر اُس کی درخواست
ٹائپ کی اور ثروت کے سامنے رکھ دی۔ اسے یقین
تھا کہ ثروت اس درخواست کو پڑھ کر خوشی خوشی
اس پر دستخط کر دے گی۔ لیکن یہ دیکھ کر اس کی حیرت
کی انتہا نہ رہی کہ ثروت کی تیوری پر بل آ گئے۔ ثروت
نے درخواست ہاتھ میں لے کر آہستہ آہستہ اُس
کے چار ٹکڑے کر دیے۔ ●●



بیراگ اگر اس صدی کی واحد فلم ہے جس کا برسوں سے انتظار کیا جا رہا تھا تو ہماری یہ کتاب بھی اس صدی کی سب سے خوب صورت کتاب کہی جا سکتی ہے جس میں فلم کی مکمل کہانی، گانے اور بے شمار فوٹو اس انداز سے پیش کئے گئے ہیں کہ مونہہ سے بولتے ہیں۔ فلم کے ہر منظر کی ایسی تفصیل اور ایسی ایسی تصاویر کہ پوری فلم آنکھوں کے سامنے آجائے۔ فلم کے تقریباً تمام ڈائیلاگ جنہیں آپ بار بار دہرائیں گے کتاب بیراگ حاصل کرنے کے لئے آج ہی چھ روپے (پانچ روپے کتاب کی قیمت اور ایک روپیہ رجسٹری خرچ) کا منی آرڈر بھیج دیجئے اور منی آرڈر کرتے وقت ڈاک خانہ سے ملنے والی رسید اپنے خط کے ساتھ ہمیں بھیج دیجئے۔ ایجنٹ صاحبان بھی اپنے آرڈر جلد ارسال فرمائیں۔ شمع بک ڈپو۔ آصف علی روڈ۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

بیراگ نیا ایڈیشن



خط کا طوفان

شمیم ثومانی

کئی دن سے سرد جنگ جاری تھی۔

وارڈروب کے پاس کھڑے ہوئے شاہد نے پشت سے نامکمل سویٹر کی لمبائی کی پیمائش کرتے ہوئے راشدہ بالکل خاموش رہی۔ شاہد نے ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے انکھیوں سے راشدہ کو دیکھا، مگر اس کے چہرے پر بدستور سنجیدگی طاری رہی۔

شادی کی چار سالہ زندگی میں ایسا کئی بار ہوا تھا۔ دونوں کسی معمولی سی بات پر روٹھ چلا بیٹھے اور کئی کئی دن تک دونوں طرف سے مکمل خاموشی رہتی۔ چپ شاہ کا یہ روزہ اکثر راشدہ کی طرف سے کھلتا تھا۔ کئی دنوں کے دن برت کے بعد کا ملاپ ہر طور بے حد لطف انگیز ہی ہوتا۔ خوب شکوے شکایتیں ہوتیں دونوں طرف سے معافیوں کا لامتناہی سلسلہ چلتا۔ اور یوں اس ڈرامے کا اختتام ہمیشہ طربیہ ہوتا مگر اس بار یہ خاموش جنگ کچھ زیادہ ہی طول کھینچ چکی تھی۔ دراصل راشدہ شاہد کے لئے ایک ہائی نیک کا سویٹر بن رہی تھی جو قریب الختم تھا۔ راشدہ سوچ رہی تھی، کیوں نہ اس کے مکمل ہوتے ہی بات چیت شروع کی جائے، کیوں کہ اس طرح اسے بنائی کے لئے کافی وقت مل رہا تھا۔ خانہ داری کا سارا فرض بوڑھی ماما شکورن بڑی خوش اسلوبی سے سنبھال رہی تھی۔ ویسے ہفتے بھر کی یہ خاموشی راشدہ کے لئے اب ناقابل برداشت بن چکی تھی لہٰذا وہ شام سے ہی بات چیت شروع کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر رہی تھی اور زیر لب مسکرا بھی رہی تھی۔

شاہد کے کالج جاتے ہی اس نے دروازہ بند کر لیا۔ پھر اس کی مخروطی انگلیاں مشینی انداز سے سلائیوں سے کھیلنے لگیں۔ چند ہی منٹ بعد کال بیل چیخ اٹھی۔ وہ مسکرائی شاہد اپنا رومال صوفے پر چھوڑ گیا تھا۔ وہ رومال لے کر دروازے کی سمت لپکی۔ دل میں نامعلوم سا خوف لئے وہ سوچ رہی تھی۔ کیوں نہ ایک آدھ لفظ بول کر آغاز گفتگو ابھی سے کر لیا جائے۔ نہ جانے یہ مرد اس معاملے میں اتنے انا پرست کیوں ہوتے ہیں۔ مگر جب دروازہ کھول کر وہ باہر نکلی تو سامنے ڈاکیہ کھڑا تھا۔

شام کو جب شاہد کالج سے لوٹا تو گھر کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ راشدہ کے کپڑوں کی اٹیچی، میک اپ کا سامان، یہاں تک کہ اس کی ساری تصویریں جو دیواروں پر آویزاں تھیں، غائب تھیں۔ چند ہی لمحے بعد شکورن ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں اور رندھے گلے سے کہہ رہی تھی "بیٹا، میں نے بہو کو بہت روکا، بہت سمجھایا، مگر نہ جانے اس کے سر پر کون سا بھوت سوار ہوا کہ آناً فاناً اپنی ساری ذاتی استعمال کی چیزوں کو سمیٹ کر ٹیکسی منگوائی۔ اور جاتے جاتے سسکتے سسکتے کہہ گئی کہ اب میرا اس گھر سے رشتہ ٹوٹ گیا۔ اب میں ان کی صورت بھی نہ دیکھوں گی۔"

شاہد کے لئے یہ صورت حال قطعی غیر متوقع تھی۔ شادی کے ان چار برسوں میں

ایسی چھوٹی موٹی لڑائیاں کئی بار ہو چکی تھی مگر ایسی خوف ناک نوبت کبھی نہ آئی تھی ہر بار اس طرح کی معمولی جھڑپوں کے بعد جب ملن ہوتا تو دونوں کی باہمی محبّت و رفاقت کچھ اور گہری ہو جاتی۔ مگر اس مرتبہ جو ہوا وہ شاہد کے لیے ناقابلِ تصوّر تھا۔ اس کے دماغ میں ایک تیز سنسناہٹ طاری تھی۔ رات بھر اس کا ذہن تفکرات کے سمندر میں غوطے لگاتا رہا — کہیں راشدہ کی سیمابی فطرت اس بار کوئی گہرا مذاق تو نہیں کر رہی ہے؟ مگر وہ اپنا سارا سامان کیوں لے گئی؟ حد یہ کہ اپنی ساری تصویریں اور شادی کا البم بھی ساتھ لے گئی بار بار شاہد کا دل کسی نئے خدشے کا تصوّر کرتا، مگر فوراً اس کا ذہن تاویلیں پیش کر کے اسے مسترد کر دیتا شادی کے ان چار سالہ زندگی میں اُس نے راشدہ کو کتنا لوٹ کر چاہا تھا پھر راشدہ کی سمندر جیسی اتھاہ محبّت سے بھی تو منکر نہیں ہوا جا سکتا تھا۔ ایسی پُر شوق گہری محبّت چند لمحوں میں پانی کے کم زور بلبلے کی مانند ختم ہو گئی!

پورے چار روز تک شاہد کی زندگی جیسے خلا کے اندر بھٹکتی رہی۔ اُس نے کالج سے طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کر کے چھٹی لے لی۔ اس بیچ میں نہ تو اُس نے ٹھیک طرح کھایا پیا اور نہ ڈھنگ کے لباس پہنے۔ بوڑھی ماما شکوراں اس کی ہر ممکن دل جوئی کرتی رہی، مگر سب بے سود ثابت ہوا۔ برآمدے میں کرسی ڈال کر ہر آن وہ خیالوں میں کھویا رہتا۔ اسے ایسا لگتا جیسے راشدہ کسی بھی پل گنگناتی ہوئی پھولوں کی باڑھ کے پیچھے سے نمودار ہو گی۔ اور کوئی چبھتا ہوا شعر پڑھ کر اپنی شوخی بھرے انداز سے داد خواہ ہو گی۔ مگر یہ جاگنے کا سپنا کہاں پورا ہونے والا تھا شادی کے اس چار سالہ عرصے میں راشدہ کبھی اس کے بغیر میکے میں نہ رہی تھی۔ جب گئی تو شاہد کو ساتھ لے کر اور جب واپسی ہوئی تو دونوں ایک ساتھ واپس آئے۔ اور پھر شاہد کی ماں کی موت کے بعد تھا ہی کون جس پر گھر چھوڑا جاتا۔

پانچویں دن شاہد کو اپنے خسر ڈاکٹر ریاض احمد کا خط ملا۔ لکھا تھا: ..... "راشدہ کی زبانی تمام باتیں جان کر دل کو بے حد تکلیف پہنچی۔ چار سالہ شادی شدہ زندگی کوئی اتنی طویل مدّت تو نہیں کہ آدمی نا اُمید ہو جائے تم نے میری معصوم اکلوتی بچّی کے معصوم جذبات کے ساتھ ایک بھیانک کھیل کا منصوبہ بنایا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ تمہارا ناپاک منصوبہ اور گندے عزائم تمہارے دوست رحمٰن کے خط سے آشکارہ ہو گئے۔ اگر تمہارا دوست تمہاری اس پوشیدہ شادی میں شرکت کرنے سے معذوری ظاہر نہ کرتا تو شاید تم اتنا بڑا ڈراما چپکے سے کھیل بھی جاتے۔ بہرحال، میرا بیٹا فیاض احمد ابھی دورے پر ہے۔ اس کے آتے ہی عدالت میں تمہاری شادی رکوانے اور راشدہ کی جانب سے خلع کی درخواست داخل کر دوں گا۔ مجھے افسوس ہے کہ انگریزی کے اتنے بڑے روشن دماغ پروفیسر کی تنگ نظری پرکھنے پر مجھ سے چوک ہو گئی۔"

خط پڑھ کر شاہد پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا اسے ایسا لگا جیسے وہ بچوّں کی طرح چیخ چیخ کر رو دے گا۔ وہ رحمٰن کے اس خطرناک کھیل کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ آخر اُس نے دوستی کے لبادہ میں کس بات کا انتقام لیا تھا؟ دیر تک وہ سوچتا رہا، اور پھر ایک نئے عزم کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا۔

جب رحمٰن کو لے کر شاہد آسنسول پہنچا تو ڈاکٹر ریاض ساری باتیں جان کر ہکا بکا رہ گئے۔ چند ہی منٹ بعد رحمٰن اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں راشدہ سے کہہ رہا تھا۔ "دیکھو بھابی" سارا قصور میری میم صاحبہ کا ہے ویسے دیکھا جائے تو آپ کا قصور بھی کم نہیں ہے۔ ازدواجی زندگی کوئی کچا دھاگا تو نہیں ہوتا کہ جٹ کھینچو اور پٹ ٹوٹ جائے۔ آپ کو مکمّل تفتیش کے بعد ہی کوئی قدم اُٹھانا چاہیے تھا۔ دراصل جب آپ لوگوں کی شادی ہو رہی تھی تو میں نے ایک کارڈ کے ذریعہ شاہد سے شادی میں شرکت سے معذوری چاہی تھی۔ اس کارڈ کو مکمّل کر کے میں ایک کتاب میں رکھ کر لیٹر بکس کے سپرد کرنا بھول گیا تھا۔ آج سے ہفتہ عشرہ پہلے جب میری محترمہ گھر کی صفائی کر رہی تھی تو وہ کارڈ کتاب سے پھسل کر فرش پر گر گیا۔ محترمہ اسے دیکھ کر ضائع کرنا بھول گئی اور اس طرح وہ خط میرا نوکر پاس کے لیٹر بکس میں ڈال آیا۔ خط پر میں اتفاق سے تاریخ لکھنا بھی بھول گیا تھا۔ اور یوں وہ پرانا خط آپ کو مل گیا۔ یہ ہے پوری کہانی۔ اب آپ جو چاہیے سزا دیں۔ آپ کا خوش نما سینڈل اور میرا سر حاضر ہے" — مگر ٹھہرئیے، میری شادی ہوئے ابھی صرف چند ہی ماہ ہوئے ہیں۔ آخر کچھ تو خیال کیجئے۔"

راشدہ نے میکے میں سویٹر مکمل کر لیا تھا شاہد نے اُسے پہن کر راشدہ کو محبّت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے "پگلی" کہا اُس کی آنکھیں بے اختیار نم ناک ہو اُٹھیں اور پھر راشدہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

■■

آپ کی ذہنی اُلجھن اور اُس کا حل



س : میں ایک قدامت پسند گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ میں ایک لڑکے سے بے انتہا محبت کرتی ہوں، لیکن میں جانتی نہیں کہ وہ لڑکا بھی مجھ سے محبت کرتا ہے یا نہیں۔ میری محبت خاموش محبت ہے۔ میں نے اُس لڑکے سے کئی بار ڈھکے چھپے لفظوں میں محبت کا اظہار بھی کیا جواباً اس نے بھی اشاروں میں کچھ اسی طرح کی بات کہی۔ میں نہیں جانتی کہ پہلے میں اپنی محبت کا واضح اظہار کروں۔ اس پریشانی میں ہر وقت اُداس اور سوچ میں ڈوبی رہتی ہوں۔

ج آپ نے خط میں اپنی عمر کے متعلق کچھ نہیں بتایا لیکن یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ آپ ابھی لڑکی ہیں۔ آپ کا گھرانا قدامت پسند ہے۔ اس ماحول میں قدرتی طور پر دماغی گھٹن پیدا ہوتی ہے اس ماحول میں آپ آزادی سے سوچ نہیں سکتیں آزادی سے بات نہیں کر سکتیں اپنے مسئلے کو ٹھیک طرح سمجھ نہیں سکتیں۔ انسان جب جوانی کی منزل میں قدم رکھتا ہے تو اس کی زندگی میں ایک نیا رنگ آتا ہے۔ جوانی کی ترنگ میں عورت اور مرد کی قید نہیں۔ اس زمانے میں عورت اور مرد کا ایک دوسرے کی طرف کھنچنا قدرتی بات ہوتی ہے۔ نوجوانی میں یہ کشش اپنے شباب پر ہوتی ہے سماج اس کشش کے خلاف قوانین بناتا ہے اس طرح سماج اور فطرت میں ایک ٹکراؤ پیدا ہوتی

ڈاکٹر سبھاشیہ ایک مشہور ماہر نفسیات ہیں۔ وہ بانو پڑھنے والوں کے سوالات کا جواب دیں گے اور ان کے نفسیاتی مسئلوں کا تجزیہ اور حل پیش کریں گے۔

پتہ : معرفت ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ہے اور انسان اس کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے۔

ماں باپ کی خواہشیں ایک لڑکی کے لئے ایمان کا درجہ رکھتی ہیں۔ اگر وہ ان کو نہ مانے تو احساسِ گناہ میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اِدھر قدرت اپنا پورا زور صرف کرتی ہے۔ اس طرح ذہن میں ایک جنگ شروع ہو جاتی ہے۔

ہر جوان لڑکی ایک جوان لڑکے کا خواب دیکھتی ہے۔ ایسا ہونا قدرتی ہے۔ اگر اُسے کوئی لڑکا پسند آجائے تو وہ سمجھتی ہے کہ اُسے لڑکے سے محبت ہو گئی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ لڑکا بھی اُس کی دل کی آواز سن لے اور اُس سے محبت کا اظہار کرے۔ یہ عورت کی فطرت ہے۔ وہ ایسا سمجھنے میں حق بجانب ہے۔ لیکن وہ اس معاملے میں مبالغے سے کام لیتی ہے اور یہی اُس کی کمزوری ہے۔ آپ اپنی محبت کو اتنا گہرا نہ سمجھیں۔ یہ ایک دَور ہے جو ہر لڑکی کی زندگی میں آتا ہے۔ محبت اس دَور میں ذوقِ نمو کی تسکین ہے۔ آپ اُسے صرف جسمانی اور دماغی ہیجان کا اثر سمجھیں جو محبت کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے۔

اگر آپ کا گھرانا قدامت پسند نہ ہوتا تو آپ کے دل میں ایسے خیالات بہت سے لڑکوں کے بارے میں آتے۔ آپ بجائے ایک لڑکے کا خواب دیکھنے کے بہت سے لڑکوں کے خواب دیکھتیں۔ چونکہ آپ کو لڑکوں سے ملنے جلنے کی آزادی نہیں، اس لئے ایک ہی لڑکا آپ کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ جن لڑکیوں کا گھرانا قدامت پسند ہوتا ہے، [illegible] اس کے ساتھ اتنا آزاد خیال بھی کہ انہیں فلمیں دیکھنے کی اجازت ہوتی ہے وہاں لڑکیوں کے سینوں میں ایکٹر بس جاتے ہیں اور بیک وقت کئی کئی ہیرو اُن کے خوابوں کا مرکز بن جاتے ہیں۔ یہ سب قدرت کے نظام کے تحت پیش آتا ہے

اگر ہم یہ بات مان لیں کہ آپ کو اس لڑکے سے سچی محبت ہے تو ہم آپ سے ایک سوال پوچھتے ہیں، کیا آپ اس لڑکے سے شادی کر سکیں گی؟ اگر آپ اس لڑکے سے اظہارِ محبت میں پہل کریں اور وہ لڑکا بھی آپ کی محبت کا جواب محبت سے دے تو کیا یہ بیل منڈھے چڑھ جائے گی؟ کیا آپ اپنی محبت میں کامیاب ہو جائیں گی؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔ تو آپ اس محبت کے ساتھ وہی سلوک کریں جو فلم کے ہیرو کے ساتھ کیا جاتا ہے عام لڑکیاں جو فلم اسٹاروں پر مرتی ہیں اس بات کو جانتی ہیں کہ وہ اُن کی پہنچ سے باہر ہیں۔ لیکن وہ ذہن میں اُن کی محبت سے لطف اُٹھاتی رہتی ہیں یہ محبت بے ضرر ہے آپ بھی یہی نسخہ استعمال کیجئے۔ اُس لڑکے کی محبت کو کچلنے کی کوشش نہ کیجئے۔ بلکہ اُسے اپنے دل میں ایک خوش آئند خیال کی طرح قائم رکھئے۔ اس پر زیادہ زور صرف نہ کیجئے۔ آپ جتنا اُسے کچلنے کی کوشش کریں گی یہ اتنا ہی آپ کے اعصاب پر سوار رہے گی۔ آپ قدرت سے نہیں لڑ سکتیں، لیکن اُس کے ساتھ سمجھوتا کر سکتی ہیں۔ اس طرح کچھ عرصے میں ہی آپ اُسے بھلانے میں کامیاب ہو جائیں گے

اگر آپ کو یقین ہے کہ آپ کی محبت کامیاب ہو جائے گی، اگر وہ لڑکا واقعی آپ کی زندگی کا ساتھی بن سکتا ہے تو آپ کسی نہ کسی طرح اپنی طرف سے محبت کا اظہار کر دیں۔ ممکن ہے کہ وہ آپ کی محبت کا جواب بے رُخی سے دے۔ اس بات سے آپ کے دل کو ٹھیس تو ضرور پہنچے گی لیکن آپ کو درست راستہ مل جائے گا۔ آپ کشمکش سے نجات پا جائیں گی۔ آپ اپنے خیالات کو دماغ میں دبا کر نہ رکھیں۔ اس طرح آپ بہت سی ذہنی اُلجھنوں کا شکار ہو جائیں گی۔ آزادی سے اظہارِ خیال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

س : میں ایک سال سے بہت پریشان ہوں میری منگنی بچپن میں خالہ زاد بھائی سے ہوئی تھی وہ لڑکا کچھ آوارہ نکلا۔ اس پر میرے والدین نے منگنی توڑ دی۔ میں خود بھی یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ میرا شوہر بد معاش ہو۔ میری امی نے میری رائے لے کر میری منگنی دوسری جگہ کر دی لڑکا کافی تعلیم یافتہ ہے، اچھی پوسٹ پر ہے گھر کا کاروبار ہے، مگر اُس کے گھر والے گاؤں میں رہتے ہیں۔ امیر ہوتے ہوئے بھی اُن کا رہن سہن ذرا دیہاتی ہے۔ شادی کے بعد میں شہر میں ہی رہوں گی لیکن گاؤں میں آنا جانا تو رہے گا میری سہیلیاں اور رشتہ دار میرے سسرال والوں کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ انہیں گنوار اور اُجڈ کہتے ہیں یہ طعنے سُن سُن کر میرا دل گھبراتا ہے۔ تنہائی میں خون کے آنسو روتی ہوں۔ کئی کئی گھنٹے لیٹی رہتی ہوں یہاں تک کہ ہفتوں تک بیمار پڑی رہتی ہوں عمر بھر سسرال والوں کے ساتھ رہنا ہے۔ وہ ہمارے ماحول کے مطابق نہ ہوئے تو کیسے گزارہ ہو گا کیا کروں، دماغ کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر ہے

ج : آپ کا خط پڑھ کر آپ کی زندگی کے بارے میں تشویش پیدا ہوئی۔ آپ ایک عجیب کشمکش میں گرفتار ہیں۔ آپ کو اپنی سسرال پسند بھی ہے اور ناپسند بھی۔ یہ کشمکش ہی آپ کی زندگی کو اجیرن بنائے ہوئے ہے۔ آپ ایک طرف فیصلہ نہیں کر سکتیں۔ آپ کا خط پڑھ کر مجھے ایک واقعہ یاد آیا میرا ایک مریض اپنی مرضی سے شادی کر کے بیوی اپنے گھر لایا۔ شادی اُس نے اپنی پسند سے کی تھی اُس کے گھر والوں نے بہو میں کیڑے ڈالنے شروع کر دیئے۔ انہوں نے اُسے طعنے دیئے کہ وہ ایک

عورت گھر لے آیا جو کسی طرح بھی اُس کے قابل نہیں اس کے گھر والوں کی مُسلسل نکتہ چینی کا خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ اپنی بیوی سے بد دل ہو گیا۔ دھیرے دھیرے اُن کے درمیان اجنبیت کی دیوار کھڑی ہو گئی وہ ایک دوراہے پر کھڑا تھا۔ وہ نہ بیوی کو چھوڑ سکتا تھا اور نہ اُسے اپنا سکتا تھا۔ اُس کی دماغی اُلجھن اتنی بڑھ گئی کہ وہ خودکشی کرنے پہ آمادہ ہو گیا۔ خوش قسمتی سے وہ میرے پاس آیا۔ کچھ عرصے کے بعد وہ ٹھیک ہو گیا اور اُس نے اپنی بیوی کو پھر سے اپنے دل میں آباد کر لیا۔ آپ کا کیس کچھ اسی نوعیت کا ہے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ دوسرے کیا کہتے ہیں، سوال یہ ہے کہ آپ دوسروں کے کہنے پر احساسِ کمتری میں کیوں مبتلا ہو جاتی ہیں؟ آپ کے دل پر کیوں چوٹ لگتی ہے؟

شہری زندگی آج اس قدر پیچیدہ اور پریشان کُن بن گئی ہے کہ ہزاروں صاحبِ حیثیت شہری اس زندگی سے بھاگ کر دیہات میں پناہ لے رہے ہیں۔ شہر کے سربرآوردہ لوگوں نے اس مقصد کے لئے دیہات میں بڑے بڑے فارم کھول رکھے ہیں، تاکہ وہ اسی بہانے کچھ روز شہر کی گھٹن سے نجات حاصل کر سکیں۔ یہ لوگ کچھ روز دیہات میں گزار کر اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتے ہیں۔ آخر شہری زندگی میں ایسی کون سی خوبی ہے جو انسان وہاں اپنے کو ترجیح دیتا ہے؟ تنگ گلیاں اور بازار، شور و غل اور گھٹی ہوئی فضا میں انسان کی خوشی کے کون سے راز چھپے ہوئے ہیں؟ بہت سے پڑھے لکھے لوگوں نے دیہات میں کاشت شروع کر دی ہے اور مستقل وہیں رہتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو شہر والوں سے بہتر محسوس کرتے ہیں، شہر والے بھی ان کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ گاؤں کے لوگ شہر میں رہنے سے گھبراتے ہیں۔ وہ یہاں کی مصنوعی اور مشینی زندگی کو ناپسند کرتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ ضرور گاؤں میں ہی شادی کریں۔ مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ آپ خود کو مخمصے میں گرفتار نہ کریں۔ آپ نہ اِدھر فیصلہ کر سکتی ہیں اور نہ اُدھر بس آنسو بہاتی رہتی ہیں یہ حالت ٹھیک نہیں۔

آپ لوگوں کی پروا کریں اور نہ اپنے احساسِ کمتری کو اہمیت دیں۔ آپ کھلے دماغ سے سوچیں کہ کیا آپ کے ہونے والے شوہر آپ کی جذباتی ضروریات پوری کر سکتے ہیں؟ کیا وہ آپ کی توقعات پر پورے اُتر سکتے ہیں؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو آپ کسی کی پرواہ نہ کریں اگر آپ کو شوہر سے بھرپور پیار ملتا ہے تو پھر دنیا کی کوئی پرواہ نہیں۔ اس کے برعکس اگر آپ کا خیال ہے کہ آپ گاؤں میں رہ کر یا اپنے سُسرال والوں میں خوش نہیں رہ سکیں گی تو آنسو بہانے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ ہمت کر کے انکار کریں۔ آپ کے لئے دو ٹوک فیصلہ کرنا بہت ضروری ہے۔ ایسی شادی سے جس میں خوشی اور سکون حاصل نہ ہو کنوارا رہنا بہتر ہے۔

اگر آپ نے زندگی میں ماں باپ کا پیار پایا ہے تو آپ کا اعتماد آپ کی آئندہ زندگی کو خوش گوار بنا سکتا ہے۔ اگر آپ کے رشتہ داروں نے آپ کی عزت کی ہے تو آپ کی نبھانے کی قوت بڑھ جائے گی۔ اس وقت کی توجہ کا مرکز دنیا والوں کی روک ٹوک ہے۔ کچھ دیر کے لئے دنیا والوں کو اپنے ذہن سے نکال دیجئے اور اپنے آپ کو مرکز میں رکھ کر سوچئے کہ اس معاملے میں آپ کی ذاتی رائے کیا ہے۔ آپ کو کیا اچھا لگتا ہے اور کیا بُرا؟ جب آپ اپنے دل سے پوچھ کر فیصلہ کریں گی تو آپ کو سکون حاصل ہو گا۔ آپ دنیا والوں کی پروا نہ کریں اُن کا کام ہی طعن و تشنیع کرنا ہے۔ یاد رکھئے آپ کے محسوسات آپ کو دھوکا نہیں دے سکتے۔

س : کوئی مجھے شرمندہ کرتا ہے تو میں سوچتی ہوں کہ اُس سے بدلہ لوں گی۔ مگر بدلہ لینے کے موقع پر چُوک جاتی ہوں۔ مثلاً اگر کوئی میرے حریف کو شرمندہ کرے تو میں بجائے خوش ہونے کے اس کی طرف سے صفائی پیش کرتی ہوں۔ اس کے بعد کئی دن تک پریشان رہتی ہوں۔ کہ میں نے اُسے کیوں بچایا۔ ہر بار ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

ج : بدلہ لینا انسانی فطرت ہے۔ جب انسان کے دل کو ٹھیس پہنچتی ہے تو قدرتی طور پر اُسے غصہ آتا ہے اور وہ ٹھیس پہنچانے والے سے بدلہ لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ایسا سوچنا غلط نہیں۔ مگر ہم ہر وقت انتقام نہیں لے سکتے، ہر ٹھیس کا بدلہ نہیں چکا سکتے یہ تہذیب کے منافی ہے۔ سماج کے قانون ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتے اگر ہر انسان بدلہ لینے پر تُل جائے تو زندگی کی گاڑی ایک دن بھی نہیں چل سکتی۔ انسان کو ٹھیس اسی وقت لگتی ہے جب وہ اپنے آپ کو حقیر تصور کرے۔ صحت مند جسم پر اگر کوئی دھول جمائے تو چنداں اثر نہیں ہوتا، لیکن پھوڑے پر ہاتھ بھی لگ جائے تو انسان بلبلا اُٹھتا ہے۔ آپ باتوں کو بہت زیادہ محسوس کرتی ہیں جب آپ کو ٹھیس لگتی ہے تو آپ کا خون کھولتا ہے اور آپ انتقام لینا چاہتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آپ کو ٹھیس کیوں لگتی ہے، آپ کو غصہ کیوں آتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ بات جس سے آپ کو صدمہ پہنچا دوسرے انسان کے لئے معمولی بات ہو اور وہ اُسے ہنس کر ٹال جائے۔ مگر آپ ایسا

ہے اور انسان اس کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے۔ ماں باپ کی خواہشیں ایک لڑکی کے لئے ایمان کا درجہ رکھتی ہیں۔ اگر وہ ان کو نہ ملنے تو احساسِ گناہ میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ادھر قدرت اپنا پورا زور صرف کرتی ہے۔ اس طرح ذہن میں ایک جنگ شروع ہو جاتی ہے۔

ہر جوان لڑکی ایک جوان لڑکے کا خواب دیکھتی ہے۔ ایسا ہونا قدرتی ہے۔ اگر اُسے کوئی لڑکا پسند آجائے تو وہ سمجھتی ہے کہ اُسے لڑکے سے محبت ہو گئی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ لڑکا بھی اُس کی دل کی آواز سن لے اور اُس سے محبت کا اظہار کرے۔ یہ عورت کی فطرت ہے۔ وہ ایسا سمجھنے میں حق بجانب ہے۔ لیکن وہ اس معاملے میں مبالغے سے کام لیتی ہے اور یہی اُس کی کمزوری ہے۔ آپ اپنی محبت کو اتنا گہرا نہ سمجھیں۔ یہ ایک دَور ہے جو ہر لڑکی کی زندگی میں آتا ہے۔ محبت اس دَور میں ذوقِ نمو کی تسکین ہے۔ آپ اُسے صرف جسمانی اور دماغی ہیجان کا اثر سمجھیں جو محبت کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے۔

اگر آپ کا گھرانا قدامت پسند نہ ہوتا تو آپ کے دل میں ایسے خیالات بہت سے لڑکوں کے بارے میں آتے۔ آپ بجائے ایک لڑکے کا خواب دیکھنے کے بہت سے لڑکوں کے خواب دیکھتیں۔ چونکہ آپ کو لڑکوں سے ملنے جلنے کی آزادی نہیں، اس لئے ایک ہی لڑکا آپ کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ جن لڑکیوں کا گھرانا قدامت پسند ہوتا ہے، [illegible] کے ساتھ اتنا آزاد خیال بھی کہ انہیں سینما دیکھنے کی اجازت ہوتی ہے، وہاں لڑکیوں کے سینوں میں ایکٹر بس جاتے ہیں اور بیک وقت کئی کئی ہیرو اُن کے خوابوں کا مرکز بن جاتے ہیں۔ یہ سب قدرت کے نظام کے تحت پیش آتا ہے

اگر ہم یہ بات مان لیں کہ آپ کو اس لڑکے سے سچی محبت ہے تو ہم آپ سے ایک سوال پوچھتے ہیں۔ کیا آپ اس لڑکے سے شادی کر سکیں گی؟ اگر آپ اس لڑکے سے اظہارِ محبت میں پہل کریں اور وہ لڑکا بھی آپ کی محبت کا جواب محبت سے دے تو کیا یہ بیل منڈھے چڑھ جائے گی؟ کیا آپ اپنی محبت میں کامیاب ہو جائیں گی؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔ تو آپ اس محبت کے ساتھ وہی سلوک کریں جو فلم کے ہیرو کے ساتھ کیا جاتا ہے عام لڑکیاں جو فلم اسٹاروں پر مرتی ہیں اس بات کو جانتی ہیں کہ وہ اُن کی پہنچ سے باہر ہیں۔ لیکن وہ ذہن میں اُن کی محبت سے لطف اُٹھاتی رہتی ہیں یہ محبت بے ضرر ہے آپ بھی یہی نسخہ استعمال کیجئے۔ اس لڑکے کی محبت کو کچلنے کی کوشش نہ کیجئے، بلکہ اُسے اپنے دل میں ایک خوش آئند خیال کی طرح قائم رکھئے۔ اس پر زیادہ زور صرف نہ کیجئے۔ آپ جتنا اُسے کچلنے کی کوشش کریں گی یہ اتنا ہی آپ کے اعصاب پر سوار رہے گی۔ آپ قدرت سے نہیں لڑ سکتیں، لیکن اُس کے ساتھ سمجھوتا کر سکتی ہیں۔ اس طرح کچھ عرصے میں ہی آپ اُسے بھلانے میں کامیاب ہو جائیں گی۔

اگر آپ کو یقین ہے کہ آپ کی محبت کامیاب ہو جائے گی، اگر وہ لڑکا واقعی آپ کی زندگی کا ساتھی بن سکتا ہے تو آپ کسی نہ کسی طرح اپنی طرف سے محبت کا اظہار کر دیں۔ ممکن ہے کہ وہ آپ کی محبت کا جواب بے رُخی سے دے۔ اس بات سے آپ کے دل کو ٹھیس تو ضرور پہنچے گی لیکن آپ کو درست راستہ مل جائے گا۔ آپ کشمکش سے نجات پا جائیں گی۔ آپ اپنے خیالات کو دماغ میں دبا کر نہ رکھیں۔ اس طرح آپ بہت سی ذہنی اُلجھنوں کا شکار ہو جائیں گی۔ آزادی سے اظہارِ خیال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

س : میں ایک سال سے بہت پریشان ہوں۔ میری منگنی بچپن میں خالہ زاد بھائی سے ہوئی تھی وہ لڑکا کچھ آوارہ نکلا۔ اس پر میرے والدین نے منگنی توڑ دی۔ میں خود بھی یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ میرا شوہر بدمعاش ہو۔ میری امی نے میری رائے لے کر میری منگنی دوسری جگہ کر دی لڑکا کافی تعلیم یافتہ ہے، اچھی پوسٹ پر ہے گھر کا کاروبار ہے، مگر اُس کے گھر والے گاؤں میں رہتے ہیں۔ امیر ہوتے ہوئے بھی اُن کا رہن سہن ذرا دیہاتی ہے۔ شادی کے بعد میں شہر میں ہی رہوں گی لیکن گاؤں میں آنا جانا تو رہے گا میری سہیلیاں اور رشتہ دار میرے سسرال والوں کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ انہیں گنوار اور اُجڈ کہتے ہیں یہ طعنے سن سن کر میرا دل گھبرا جاتا ہے۔ تنہائی میں خون کے آنسو روتی ہوں۔ کئی کئی گھنٹے لیٹی رہتی ہوں یہاں تک کہ ہفتوں تک بیمار پڑی رہتی ہوں عمر بھر سسرال والوں کے ساتھ رہنا ہے۔ وہ ہمارے ماحول کے مطابق نہ ہوئے تو کیسے گزارہ ہو گا کیا کروں، دماغ کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر ہے۔

ج : آپ کا خط پڑھ کر آپ کی زندگی کے بارے میں تشویش پیدا ہوئی۔ آپ ایک عجیب مخمصے میں گرفتار ہیں۔ آپ کو اپنی سسرال پسند بھی ہے اور ناپسند بھی۔ یہ کشمکش ہی آپ کی زندگی کو اجیرن بنائے ہوئے ہے۔ آپ ایک طرف فیصلہ نہیں کر سکتیں۔ آپ کا خط پڑھ کر مجھے ایک واقعہ یاد آیا میرا ایک مریض اپنی مرضی سے شادی کر کے بیوی کو اپنے گھر لایا۔ شادی اُس نے اپنی پسند سے کی تھی اُس کے گھر والوں نے بہو میں کیڑے ڈالنے شروع کر دیے۔ انہوں نے اُسے طعنے دیے کہ وہ کیسے

عورت گھر لے آیا جو کسی طرح بھی اُس کے قابل نہیں اُس کے گھر والوں کی مُسلسل نکتہ چینی کا خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ اپنی بیوی سے بد دل ہوگیا۔ دھیرے دھیرے اُن کے درمیان اجنبیت کی دیوار کھڑی ہوگئی وہ ایک دوراہے پر کھڑا تھا۔ وہ نہ بیوی کو چھوڑ سکتا تھا اور نہ اُسے اپنا سکتا تھا۔ اُس کی ذہنی اُلجھن اتنی بڑھ گئی کہ وہ خودکشی کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ خوش قسمتی سے وہ میرے پاس آیا۔ کچھ عرصے کے بعد وہ ٹھیک ہوگیا اور اُس نے اپنی بیوی کو پھر سے اپنے دل میں آباد کرلیا۔ آپ کا کیس کچھ اسی نوعیت کا ہے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ دوسرے کیا کہتے ہیں، سوال یہ ہے کہ آپ دوسروں کے کہنے پر احساسِ کم تری میں کیوں مبتلا ہو جاتی ہیں؟ آپ کے دل پر کیوں چوٹ لگتی ہے؟

شہری زندگی آج اس قدر پیچیدہ اور پریشان کُن بن گئی ہے کہ ہزاروں صاحبِ حیثیت شہری اس زندگی سے بھاگ کر دیہات میں پناہ لے رہے ہیں۔ شہر کے سربرآوردہ لوگوں نے اس مقصد کے لئے دیہات میں بڑے بڑے فارم کھول رکھے ہیں، تاکہ وہ اسی بہانے کچھ روز شہر کی گھٹن سے نجات حاصل کرسکیں۔ یہ لوگ کچھ روز دیہات میں گزار کر اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتے ہیں۔ آخر شہری زندگی میں ایسی کون سی خوبی ہے جو انسان وہاں اپنے کو ترجیح دیتا ہے؟ تنگ گلیاں اور بازار، شور وغل اور گھٹی ہوئی فضا میں انسان کی خوشی کے کون سے راز چھپے ہوئے ہیں؟ بہت سے پڑھے لکھے لوگوں نے دیہات میں کاشت شروع کردی ہے اور مستقل وہیں رہتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو شہر والوں سے بہتر محسوس کرتے ہیں، شہر والے بھی ان کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ گاؤں کے لوگ شہر میں رہنے سے گھبراتے ہیں۔ وہ یہاں کی مصنوعی اور مشینی زندگی کو ناپسند کرتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ ضرور گاؤں میں ہی شادی کریں، مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ آپ خود کو مخمصے میں گرفتار نہ کریں۔ آپ نہ ادھر فیصلہ کرسکتی ہیں اور نہ اُدھر بس آنسو بہاتی رہتی ہیں یہ حالت ٹھیک نہیں۔

آپ لوگوں کی پرواہ کریں اور نہ اپنے احساسِ کم تری کو اہمیت دیں۔ آپ کھلے دماغ سے سوچیں کہ کیا آپ کے ہونے والے شوہر آپ کی جذباتی ضروریات پوری کرسکتے ہیں؟ کیا وہ آپ کی توقعات پر پورے اُتر سکتے ہیں؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو آپ کسی کی پرواہ نہ کریں اگر آپ کو شوہر سے بھرپور پیار ملتا ہے تو پھر دنیا کی کوئی پرواہ نہیں۔ اس کے برعکس اگر آپ کا خیال ہے کہ آپ گاؤں میں رہ کر یا اپنے سسرال والوں میں خوش نہیں رہ سکیں گی تو آنسو بہانے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ ہمت کرکے انکار کریں۔ آپ کے لئے دو ٹوک فیصلہ کرنا بہت ضروری ہے۔ ایسی شادی سے جس میں خوشی اور سکون حاصل نہ ہو کنوارا رہنا بہتر ہے۔

اگر آپ نے زندگی میں ماں باپ کا پیار پایا ہے تو آپ کا اعتماد آپ کی آئندہ زندگی کو خوش گوار بنا سکتا ہے۔ اگر آپ کے رشتہ داروں نے آپ کی عزت کی ہے تو آپ کی نبھانے کی قوت بڑھ جائے گی۔ اس وقت کی توجہ کا مرکز دنیا والوں کی روک ٹوک ہے۔ کچھ دیر کے لئے دنیا والوں کو اپنے ذہن سے نکال دیجیے اور اپنے آپ کو مرکز میں رکھ کر سوچیے کہ اس معاملے میں آپ کی ذاتی رائے کیا ہے۔ آپ کو کیا اچھا لگتا ہے اور کیا بُرا؟ جب آپ اپنے دل سے پوچھ کر فیصلہ کریں گی تو آپ کو سکون حاصل ہوگا۔ آپ دنیا والوں کی پرواہ نہ کریں اُن کا کام ہی طعن وتشنیع کرنا ہے۔ یاد رکھئے آپ کے محسوسات آپ کو دھوکا نہیں دے سکتے۔

س: کوئی مجھے شرمندہ کرتا ہے تو میں سوچتی ہوں کہ اُس سے بدلہ لوں گی۔ مگر بدلہ لینے کے موقع پر چوک جاتی ہوں۔ مثلاً اگر کوئی میرے حریف کو شرمندہ کرے تو میں بجائے خوش ہونے کے اس کی طرف سے صفائی پیش کرتی ہوں۔ اس کے بعد کئی دن تک پریشان رہتی ہوں کہ میں نے اُسے کیوں بچایا۔ ہر بار ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

ج: بدلہ لینا انسانی فطرت ہے۔ جب انسان کے دل کو ٹھیس پہنچتی ہے تو قدرتی طور پر اُسے غصہ آتا ہے اور وہ ٹھیس پہنچانے والے سے بدلہ لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ایسا سوچنا غلط نہیں۔ مگر ہم ہر وقت انتقام نہیں لے سکتے، ہر ٹھیس کا بدلہ نہیں چکا سکتے یہ تہذیب کے منافی ہے۔ سماج کے قانون ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتے۔ اگر ہر انسان بدلہ لینے پر تل جائے تو زندگی کی گاڑی ایک دن بھی نہیں چل سکتی۔ انسان کو ٹھیس اسی وقت لگتی ہے جب وہ اپنے آپ کو حقیر تصور کرے۔ صحت مند جسم پر اگر کوئی دھول جمائے تو چنداں اثر نہیں ہوتا، لیکن پھوڑے پر ہاتھ بھی لگ جائے تو انسان بلبلا اُٹھتا ہے۔ آپ باتوں کو بہت زیادہ محسوس کرتی ہیں جب آپ کو ٹھیس لگتی ہے تو آپ کا خون کھولتا ہے اور آپ انتقام لینا چاہتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آپ کو ٹھیس کیوں لگتی ہے، آپ کو غصہ کیوں آتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ بات جس سے آپ کو صدمہ پہنچا، دوسرے انسان کے لئے معمولی بات ہو اور وہ اُسے ہنس کر ٹال جائے۔ مگر آپ ایسا

نہیں کر سکتیں۔ جب آپ کو بدلہ لینے کا موقع ملتا ہے تو آپ چوک جاتی ہیں۔ بدلہ لینے کی بجائے آپ اپنے حریف کو شرمندگی سے بچا لیتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بدلہ لینے کی خواہش اخلاق اور تہذیب کے منافی ہے۔ بدلہ لینے سے معاف کرنا بہتر ہے۔ مذہب اور سماج ہمیں یہی سکھاتا ہے۔

بدلہ لینے کی خواہش آپ کے دل میں گناہ کا احساس پیدا کرتی ہے اس گناہ کے احساس سے بچنے کے لئے آپ اپنے جذبات کے خلاف عمل کرتی ہیں آپ مذہب اور سماج کا حکم بجا لائیں لیکن بدلہ لینے کی خواہش جوں کی توں رہی۔ آپ نے تہذیب کی شرائط پوری کر دیں لیکن اپنے دل کو مطمئن نہ کر سکیں۔ یہ بات آپ کی اندرونی کشمکش کا باعث بنتی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے آپ کو یہ ذہن نشین کرنا چاہئے کہ بدلہ لینا بُرا نہیں، یہ قدرتی امر ہے۔ لیکن آپ ایسا موقع کیوں آنے دیتی ہیں کہ آپ کا حریف آپ کو ٹھیس پہنچائے اور آپ خاموش رہیں۔ چھوٹی موٹی باتوں کو درگزر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن جب آپ اپنے حریف کو حد سے بڑھتا دیکھیں تو اُسے صاف کہہ دینا مناسب ہے کہ آپ کو اس کی بات اچھی نہیں لگتی۔ اس طرزِ عمل سے اس کو آپ کی ناراضگی کا احساس ہو جائے گا اور آپ کی شخصیت جان دار ہو جائے گی۔

جب آپ کو اس بات کا احساس ہو کہ آپ نے بدلہ لینے کا موقع ہاتھ سے کھو دیا ہے تو آپ خود سے یہ سوال کریں کہ آپ نے ایسا کیوں کیا۔ اس بارے میں سوچنے سے آپ کو اس خواہش کو پورا کرنے سے روکا گیا ہے بچپن سے ہی آپ کو اس طرح کی تربیت دی گئی ہے۔ جب آپ کو اپنی اندرونی حالت کا پتہ چل جائے گا تو آپ کو سکون محسوس ہوگا۔

س : میرے لڑکے کی عمر ۹ سال ہے۔ وہ ذہین ہے مگر حد سے زیادہ بے پرواہ ہے۔ وہ امتحان میں اچھے نمبر نہیں لاتا۔ ہمیں بہت پریشان کرتا ہے۔ ہم نے اُسے اچھا بنانے کی بہت کوشش کی سختی بھی کی مگر بے فائدہ ثابت ہوا۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ اس پر ڈانٹ پھٹکار نہ کروں لیکن اُس کی حرکتوں سے مجبور ہو کر مار پیٹ تک کرنا پڑتی ہے میرے شوہر بہت غصیلے ہیں۔ وہ بات بات پر اُسے ڈانٹتے اور مارتے ہیں۔ وہ چھوٹے بھائی کو مارتا ہے۔ اُسے نیند بھی کم آتی ہے۔ کوئی حل بتائیے۔

ج : بچّے کی شخصیت ماں باپ کے سلوک کا آئینہ ہوتی ہے۔ اُس کی ضد اور ہٹ دھرمی بھی اُن کی سختی کا ردِ عمل ہوتی ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ آپ کے خاوند غصیلے ہیں اور وہ بچّے کو مارتے ہیں۔ مگر بچہ پھر بھی شرارتوں سے باز نہیں آتا۔ اُسے نیند بھی کم آتی ہے۔ دراصل آپ جتنا بوجھ اُس پر ڈالتی ہیں وہ اتنا ہی بدکتا ہے۔ آپ اُس کو اس کے فرائض کے متعلق سمجھاتی ہیں۔ وہ سمجھنے کی بجائے الٹا ناراض ہو جاتا ہے۔ اپنے غصے کا اظہار کرنے کے لئے وہ آپ کے حکم اور خواہش کے برعکس کرتا ہے۔ وہ ایسا کرنے میں حق بجانب ہے میرے کہنے سے شاید آپ کے شوہر اُسے مارنا نہیں چھوڑیں گے اور نہ آپ اُسے پھٹکارنا بند کریں گی اس طرح اُس کا سُدھرنا دشوار ہے۔ اگر آپ میری صلاح مانیں تو ڈانٹنا اور اُسے مارنا پیٹنا بالکل بند کر دیں۔ اُس کے سامنے چھوٹے بھائی کی تعریف بھی نہ کریں تاکہ اُس میں جلن اور حسد کا مادہ پیدا نہ ہو آپ اپنے طرزِ عمل کو کچھ عرصے کے لئے بالکل بدل دیں۔ اس کی عزت کریں۔ اگر وہ کوئی اچھا کام کرے تو اُس کی تعریف کریں تاکہ اُسے محسوس ہو کہ اُس نے بھی ایک اچھا کام کیا ہے۔ جب وہ کوئی غلط کام کرے تو اُسے کچھ نہ کہیں۔ اُسے اپنے پاس بٹھا کر پوچھیں کہ اُسے کوئی تکلیف تو نہیں اگر وہ آپ کی شکایت کرے تو اُسے مان لیں۔ آپ کو واقعی اپنی غلطی کا احساس ہو جائے تو اُس سے معافی مانگنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ مجھے اندازہ ہے کہ یہ کام آپ کے لئے خاصا دشوار ثابت ہوگا۔ لیکن آپ کے بچّے سُدھرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی راستہ نہیں۔

بچّہ ماں سے زیادہ قریب ہوتا ہے اگر آپ اُس سے باپ کے غصّے کے بارے میں پوچھیں گی تو وہ رو رو کر باپ کی شکایت کرے گا۔ اس طرح اُس کا دل ہلکا ہو جائے گا اور وہ آپ کو اپنا سچا ہمدرد سمجھے گا۔ اگر باپ بھی اس پروگرام کو عملی صورت دینے میں آپ سے تعاون کریں تو مہینہ دو مہینے کے اندر ہی آپ کو بچّے میں فرق محسوس ہوگا۔

بچّہ گھر کے علاوہ اسکول میں بھی وقت گزارتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہاں وہ کسی استاد سے خائف ہو۔ اُس کے اسکول میں پتا کر معلوم کریں کہ اُس کے ساتھ ماسٹروں کا سلوک کیسا ہے۔ اُس کے بارے میں بچّے سے بھی پوچھیں کیا اُسے کسی ماسٹر سے شکایت ہے۔ عموماً استاد نالائق لڑکوں کو سزا دیتے ہیں۔ اس طرح اُن بچوں میں کم تری کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ اس بات کا بھی احتمال ہے آپ کے بچّے کا مسئلہ اسکول سے شروع ہوا ہو۔ اگر ایک ماسٹر بھی اس بچّے کی تعریف کرے گا تو اُس کا اعتماد بحال ہو جائے گا۔

مبارک قدم



ارشد صدیقی

سلطان صاحب ایک میڈیکل اسٹور کے مالک تھے۔ معقول آمدنی تھی۔ اوپر تلے کی تین لڑکیاں تھیں۔ ان سے چھوٹے دو بیٹے تھے۔ ایک بوڑھی ماں تھی۔ دو خود میاں بیوی تھے۔ اس طرح کل آٹھ نفوس پر مشتمل خاندان تھا۔ خاصے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ مگر سلطان صاحب کو لڑکیوں کی ہر آن فکر لگی رہتی تھی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ لڑکیاں بڑی تیزی سے ہاتھ پاؤں پسار رہی ہیں۔ بہت جلد یہ تینوں جوان ہو جائیں گی اس وقت ان کی شادی کا خرچ بھاری پڑے گا اس لئے سلطان صاحب نے لڑکیوں کی شادی کی خاطر بینک میں فکسڈ ڈپازٹ کر رکھا تھا

ان کا ارادہ تھا کہ تینوں بیٹیوں کی شادی ایک ساتھ کر دی جائے گی۔ حالانکہ بیگم سلطان اس بات کے خلاف تھیں۔ دو دو سال کا فرق ہونے کے باوجود تینوں لڑکیاں صحت اور قد میں برابر کی معلوم ہوتی تھیں۔

زندگی کی جد و جہد میں لگے ہوئے آدمی کو وقت کا زیادہ اندازہ نہیں ہوتا۔ اس کا وقت بہت تیزی سے گزر جاتا ہے۔ سلطان صاحب کے ساتھ بھی ایسا ہی تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے لڑکیاں جوان ہو گئیں۔ سلطان صاحب اور بیگم سلطان دونوں کو دامادوں کی تلاش ہوئی۔ جہیز وغیرہ کے انتظام کی خاطر رقم کی کمی نہ تھی۔

فکسڈ ڈپازٹ نے انہیں بڑا سہارا دیا آج کل جہیز کا انتظام اچھا ہو تو لڑکوں کی کمی نہیں ہوتی۔ پیسے پر مکھیوں کی طرح لڑکے گرتے ہیں۔ ہاں اس وقت کسی ایک لڑکے کا انتخاب مشکل معلوم ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ تو صرف غریب کے لئے پریشان کن ہوتا ہے، جس کے پاس بیٹی کو وداع کرنے کی خاطر داماد کو خریدنے کے لئے دولت نہیں ہوتی خیر سلطان صاحب کو داماد آسانی سے مل گئے تینوں اچھے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے بیگم سلطان فی الحال دو بیٹیوں کی شادی کرنا چاہتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا چھوٹی بیٹی کی ابھی عمر ہی کیا ہے صرف سولہ ہی تو ہوئی ہے۔ اور ویسے بھی تین کام ساتھ نہیں کئے جاتے۔ لیکن سلطان صاحب نے بیوی کے اس خیال کو دقیانوسی قرار دے کر رد کر دیا۔

تینوں لڑکیوں کی شادی ہو گئی اور تینوں لڑکیاں اپنی اپنی سسرال چلی گئیں۔

لڑکیوں کی شادی کو چار سال گزر گئے اس درمیان سلطان صاحب نے اپنے بڑے بیٹے ماجد کو اپنے ساتھ کام میں لگا لیا کیوں کہ وہ بلڈ پریشر کے مریض تھے اور ڈاکٹروں نے انہیں زیادہ بھاگ دوڑ کے کام سے دور رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ ماجد نے بڑی ہوشیاری سے دکان سنبھال لی۔ ہاتھ پاؤں سے بھی وہ ماشاء اللہ اچھا تھا۔ بیگم سلطان نے سوچا، گھر لڑکیوں کے سسرال چلے جانے سے سونا سونا لگتا ہے۔ اس لئے اب بہو لے آنا چاہئے۔ چھوٹا بیٹا شاہد ابھی پڑھ رہا تھا۔ ماجد کے لئے دلہن کی تلاش شروع ہو گئی۔ کافی تگ و دو کے بعد بیگم سلطان کو ایک لڑکی پسند آ گئی۔ حیثیت دار گھرانے کی لڑکی تھی۔ خوب صورتی میں بے مثال تھی۔ ماجد کی شادی اس سے طے ہوئی اور جلد ہی

دھوم دھام سے شادی کی تقریب منائی گئی۔ بیگم سلطان بہو پر نہال ہوئی جا رہی تھیں۔ لوگ انہیں اتنی خوب صورت بہو پانے پر مبارک باد دے رہے تھے اور وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھیں۔ بار بار وہ بہو کی پیشانی پر بوسہ دیتیں۔ عزیز، رشتہ دار اُن کی قسمت پر رشک کر رہے تھے۔

شادی کی گہما گہمی میں چار دن گزر گئے۔ سلطان صاحب کو کافی دوڑ دھوپ کرنا پڑی پڑی۔ دل کے مریض تو تھے ہی، اچانک اُن پر ہارٹ اٹیک ہوا۔ فوراً ڈاکٹروں کو بلایا گیا۔ ڈاکٹر نے اپنی پوری سعی کر ڈالی، لیکن کچھ افاقہ نہ ہوا۔ اُسی ڈاکٹر کے مشورہ سے سلطان صاحب کو ہاسپٹل لے جایا گیا۔ وہاں ڈاکٹروں کی ایک پوری ٹیم نے اُن کا معائنہ کیا۔ وہ سب سلطان صاحب کی جان بچانے میں لگ گئے۔ اُسی درمیان اُن پر دوسرا ہارٹ اٹیک ہوا اور پھر کیس سنبھالے نہ سنبھلا۔ بیگم سلطان بیوہ ہو گئیں۔

ابھی شادی کا شور و غل مدھم بھی نہ ہوا تھا کہ یہ اندوہناک واقعہ ہو گیا۔ بڑی بوڑھیاں بہو کے قدم کو منحوس بتا رہی تھیں۔ کوئی کہتا!

"چار دن میں تو یہ حال ہوا۔ آگے اللہ حافظ۔"

کوئی کہتا! "گھر کی تباہی کی یہ خوب صورت نشانی ہے۔" غرض طرح طرح کی باتیں سُنائی دے رہی تھیں۔ کئی دن تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اُڑتے اُڑتے یہ بات بہو کے کانوں میں بھی پڑی۔ اُس کو بہت رنج ہوا۔ لیکن بے چاری کرتی بھی کیا۔ خاموش رہی۔ بیگم سلطان کے کانوں میں بھی لوگوں نے یہ بات انڈیل۔ شروع میں تو بیگم سلطان نے کچھ عورتوں کو ڈانٹ بھی دیا، لیکن دھیرے دھیرے یہ بات اُن کے دل میں بھی گھر کرتی گئی اور وہ بہو سے بدظن ہو گئیں۔ حالات یہاں تک پہنچ گئے کہ اگر صبح کو اُٹھتے ہی بیگم سلطان کی نظر بہو پر پڑ جاتی تو وہ سارے دن "اللہ خیر" کا ورد کرتی رہتیں۔ بہو کو اس بات کا کافی ملال تھا، لیکن بے چاری کہتی کس سے؟ چُپ چاپ اس غم کو پیتی رہی۔ بیگم سلطان کے مزاج میں دھیرے دھیرے چڑچڑا پن آتا گیا۔ اب وہ بہو کو بُرا بھلا بھی کہتی رہتیں۔ کچن میں اس کو نہیں جانے دیا جاتا تھا۔ کھانا اُس کے کمرے میں پہنچا دیا جاتا۔ ماجد اُس کو سمجھاتا رہتا تھا، مگر وہ خود بھی ماں کی عادتوں سے تنگ آ چکا تھا۔ آخر کب تک یہ سلسلہ چلتا۔ روز روز کی بک بک جھک جھک سے تنگ آکر ماجد نے الگ مکان لے لیا۔ اِدھر دکان کا کام بھی اُس سے نہیں سنبھل رہا تھا۔ بیگم سلطان نے چھوٹے بیٹے شاہد کو بھی دکان پر لگا دیا۔ دونوں بھائیوں نے مل کر دکان کو کچھ سنبھالا۔

بہو کو الگ ہوئے دو سال بیت گئے گھر ایک بار پھر سُونا ہو چکا تھا اب تک بہو کا پاؤں بھی بھاری نہ ہوا تھا۔ اس بات کو بنیاد بنا کر بھی بیگم سلطان اُس کو کوسا کاٹا کرتی تھیں۔ کوئی بھی اُن سے ملنے آتا، وہ بہو کی نحوست کا حال ضرور بیان کرتیں۔ وہ کہتی تھیں، جب سے بہو گھر میں آئی ہے سارا گھر ہی برباد ہو گیا۔

گھر کے سُونے پن سے گھبرا کر بیگم سلطان نے شاہد کی بھی شادی کر دینا چاہی۔ بڑی منّت مُراد مانگ کر اس بار وہ بہو گھر میں لائیں۔ اس بہو کا نہ انہوں نے بار بار بوسہ لیا اور نہ زیادہ خوشی کا اظہار کیا۔ شاہد کے ضد کرنے سے انہوں نے ماجد کی بیوی کو بھی اس تقریب میں شامل کر لیا تھا۔ وہ آئی تو پھر شاہد نے اُسے ہفتوں جانے نہ دیا۔

شاہد کی بیوی کو لاٹری کے ٹکٹ خریدنے کا بہت شوق تھا۔ اپنی شادی سے کچھ دن پہلے بھی اُس نے چند ٹکٹ خریدے تھے۔ ایک روز وہ ٹکٹ اُس نے اپنے شوہر کو دے کر کہا۔ "کل اس لاٹری کا نتیجہ نکلنے کی تاریخ تھی۔ ذرا ان ٹکٹوں کو اخبار میں نکلے ہوئے نمبروں سے تو ملائیے۔"

شاہد نے بیوی کا دل رکھنے کی خاطر ان نمبروں کو ملایا تو وہ اُچھل پڑا۔ اُن ٹکٹوں میں ایک ٹکٹ سات لاکھ کے انعام کا تھا۔ وہ دوڑا دوڑا اماں کے پاس پہنچا۔

"امّی! امّی! دیکھئے ان ٹکٹوں میں سے ایک ٹکٹ پر سات لاکھ کا انعام نکلا ہے۔ یہ ٹکٹ آپ کی بہو نے خریدے تھے۔"

بیگم سلطان یہ سُنتے ہی اُچھل پڑیں "کیا کہا؟ سات لاکھ! اوہ میری اس بہو کے قدم کتنے مبارک ہیں۔ میں ابھی بہو پر سے صدقہ اتارتی ہوں۔ ایک وہ جنم جلی ہے کہ آتے ہی مجھے بیوہ کر دیا۔" بیگم سلطان دوسری بہو پر واری ہو رہی تھیں۔

اُسی روز ایک عورت نے بیگم سلطان کو بتایا کہ اُن کی پہلی بہو اُمید سے ہے۔ یہ سُنتے ہی بیگم سلطان چہکیں "یہ بھی میری اس بہو کے مبارک قدم کی بدولت ہے۔"

"مگر ماجد کی بیوی کو تین ماہ کا حمل ہے اور چھوٹی بہو تمہاری ابھی پندرہ دن ہوئے آئی ہے۔" اُس عورت نے بیگم سلطان پر چوٹ کی بیگم سلطان یہ سُن کر خاموش رہ گئیں اُن سے کچھ جواب بن نہ پڑا۔

●●

وارث

ابن قرۃ العین آمبوری



اماں بی نماز پڑھ رہی تھیں ۔ کچھ ہی دُور ۔ راشد بیٹھا پڑھنے میں مشغول تھا ۔

"آپ لوگوں کا خدا سے کیا رشتہ ہے ؟"

رحیمن نے پوچھا ۔

"کیا بک رہی ہے ؟" راشد نے رحیمن کو گھورا ۔

"میں ـــــ یہ پوچھ رہی تھی راشد بھائی کہ اللہ سے آپ سب کی کیسی رشتہ داری ہے ؟"

"یعنی کیا مطلب ؟" راشد اب بھی نہ سمجھا ۔

"میرے ابا نے کہا تھا کہ ان کی مل میں ٹھیک تنخواہ نہیں ملتی ۔ اگر مل والے ہمارے رشتہ دار ہوتے تو ابا کی تنخواہ ضرور بڑھتی ۔ مالکوں کو ہماری پرواہی نہیں" ۔

"وہ ٹھیک ہے ۔ مگر اپنے ابا کا دکھڑا یہاں سنانے کی کیا ضرورت ہے ؟"

"کیوں کہ میری اماں بھی اسی طرح نماز پڑھتی ہیں ۔ جانے کتنی دیر تک دامن پھیلا کر وہ اللہ سے دعا مانگتی رہتی ہیں ۔ مگر اللہ ہماری پرواہ نہیں کرتا ۔ اس لئے میں نے پوچھا تھا کہ کیا اللہ میاں آپ لوگوں کے خاص رشتہ دار ہیں ؟" رحیمن نے معصومیت کے ساتھ پھر سوال کیا ۔

راشد نے اماں بی پر ایک نظر ڈالی ۔ وہ رحیمن کی بات پر بے اختیار ہنس پڑا اور ہنستا ہوا وہاں سے اٹھ کر چلا گیا ۔

اتنے میں اماں بی نماز ختم کر چکی تھیں ۔ انہوں نے رعب دار لہجہ میں کہا "ہاں رحیمن ، ہم اللہ کے خاص بندے ہیں ۔ ہمارا دل اور ہماری عادت اتنی اچھی ہے کہ خدا ہم پر ہمیشہ مہربان رہتا ہے اور ہماری ساری دعائیں قبول کر لیتا ہے ۔ وہ دولت سے ہمیں ہمیشہ مالا مال کرتا رہتا ہے ۔"

بچی رحیمن مرعوب ہو کر رہ گئی ۔ اماں بی کے چار لڑکے تھے ۔ بڑے بیٹے ساجد کی شادی ہو چکی تھی ۔ باقی دو لڑکوں جاوید اور واجد کی شادی حال ہی میں ہونے والی تھی ۔ راشد سب سے چھوٹا تھا ۔ وہ ابھی تعلیم حاصل کر رہا تھا ۔ بچوں کی قابلیت دیکھ کر ملنے والے اماں بی کی خوش قسمتی کی سب داد دیتے تھے ۔ خود اماں بی کو بھی ناز تھا ۔ ان کا ماضی بھی اچھی طرح گزرا تھا ، اور اب مستقبل کی شاندار عمارت کے لئے بھی چار مستحکم ستون موجود تھے ۔ نہ کوئی فکر نہ کوئی غم ۔ آرام ہی آرام ۔

وقت گزرتا گیا ۔ رحیمن اب بچی نہیں رہی تھی ۔ وہ اب دولت مندوں کی خوشی اور غریبوں کے دکھ کو سمجھتی تھی ۔ وہ ان پڑھ تھی ۔ بناوٹی تہذیب کی باتوں سے کوسوں دور ۔ اس لئے وہ اماں بی سے مرعوب رہا کرتی تھی ۔ کیوں کہ اماں بی اللہ میاں کی خاص بندی تھیں نا ! مگر اللہ میاں سے ان کی خاص رشتہ داری کیونکر ہوئی یہ پوچھنے کی اسے دوبارہ کبھی جرأت نہ ہوئی ۔ جب یہ سوال رحیمن نے اپنی ہی اماں سلمیٰ سے کیا تو سلمیٰ نے کہہ دیا " پتہ نہیں بیٹی ، ان لوگوں نے کیسی بھلائیاں کی ہیں ۔ ہم لوگوں کی طرف سے تو خدا سدا آنکھیں بند کئے رہتا ہے "

ایک دن رحیمن گھر کی صفائی میں لگی ہوئی تھی ۔ راشد ریڈیو سن رہا تھا ۔ کچھ دور اماں بی بیٹھی پان کھا رہی تھیں ۔ اتنے میں راشد کے بڑے بھائی ساجد کی بیٹی بے بی بھاگتی آئی ، اس کے ہاتھ میں ٹیا سا اسٹیل

"انکل ! انکل ! آپ لیکٹ

بے بی نے راشد سے پوچھا ۔

"کہاں ہے بی بی ؟"

بے بی نے راشد کے قریب لاکر جلب دکھایا۔ "یہ دیکھئے بسکٹ!"

"اوہ - روٹی بسکٹ!" راشد ہنس پڑا۔ بے بی وہیں بیٹھ کر اطمینان کے ساتھ جگ سے نکال نکال کر روٹی کھانے لگی۔

"کیا مطلب؟ یہ روٹی بسکٹ کیا ہوا؟" امّاں بی نے جھپٹ کر جگ اٹھایا۔ جگ میں پانی تھا اور پانی میں روٹی کے بہت سے ٹکڑے۔

"ایں؟ یہ کیا حرکت ہے بے بی تمہاری"۔ امّاں بی کی آواز کرخت تھی۔

"کیوں دادی امّاں؟" بے بی معصوم نظروں سے دادی کو دیکھنے لگی۔

"یہ کیا غریبوں جیسی حرکت ہے؟"

"غریبوں جیسی حرکت؟ یعنی؟"

"یعنی تمہارا سر - میں پوچھتی ہوں روٹی یوں کیوں کھا رہی ہو؟"

"اچھا لگتا ہے مجھے۔"

"چھی چھی - اس طرح روٹی نہیں کھاتے۔ ہماری زبانوں کو اس طرح روٹی اچھی نہیں لگتی۔ ہماری زبانیں تو مزے مزے کی چیزوں کی عادی ہیں - ایسے طریقے سے تو غریب لوگ کھاتے ہیں۔ یہی روکھی سوکھی پسند بھی کرتے ہیں۔"

"مگر ہم کیوں پسند نہیں کر سکتے دادی اماں؟"

"غریبوں اور امیروں میں بہت فرق ہوتا ہے بی بی۔"

"وہ کیسے؟" بھلا بے بی کہاں چپ ہوتی تھی۔

"خدا ہم کو الگ الگ پیدا کرتا ہے۔"

"کیا غریب ایک ساتھ بہت سے پیدا ہوتے ہیں یعنی وہ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے دنیا میں آجاتے ہیں؟" بے بی کے معصوم سوال پر راشد کی ہنسی نکل گئی۔ وہ بھی اب ریڈیو کو چھوڑ امّاں بی کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"نہیں بے بی، میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ خدا دولت مندوں کو پوری توجہ کے ساتھ بناتا ہے، اس لئے دولت مند کی ہر چیز قیمتی ہوتی ہے - یعنی اُس کی آنکھ، ناک، مونہہ، زبان، ہاتھ پاؤں سب کچھ اَن مول ہیں - دیکھو دولت مندوں کے پیروں میں کس قدر قیمتی قیمتی جوتے ہوتے ہیں، یعنی امیروں کے پاؤں اس قابل ہوتے ہیں کہ خدا ان کے لئے قیمتی جوتے عطا کرتا ہے اس طرح ہماری قیمتی زبان کے لئے وہ بہت سے قیمتی لوازم بخشتا رہتا ہے۔ ہماری ہر حرکت میں امیرانہ شان ہوگی، جب کہ غریبوں کی ہر حرکت، ہر انداز میں غربت ہی غربت ٹپکے گی۔"

"اچھا؟" بے بی کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ اُس نے پاس ہی کھڑی ہوئی رحیمن کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا۔ رحیمن گھر صاف کرنا بھول کر امّاں بی کی باتیں سننے کے لئے آکر کھڑی ہوگئی تھی۔

"ہاں - اسی لئے تم ایسی حرکتیں کبھی نہ کرو - تم کو تو خدا نے خود بنایا ہے۔ تم دولت مند ہو۔ تمہاری ہر عادت، ہر انداز میں امیرانہ شان ہونا چاہئے۔"

"کیا غریبوں کو اللہ نے نہیں بنایا؟"

"نہیں - غریبوں کو فرشتے بناتے ہیں۔ فرشتے بے چارے بہت بھولے بھالے ہوتے ہیں۔ وہ کسی بات پر دھیان ہی نہیں دیتے، سمجھ بوجھ سے کام ہی نہیں لیتے۔ دولت مند انسانوں کو خدا خود تراش تراش کر بناتا ہے۔ انہیں بناتے وقت جو کچھ بھی کچی پکی مٹی ادھر اُدھر کی بچ جاتی ہے، اس کو بھی فرشتے ایک طرف ڈھیر لگاتے رہتے ہیں اور اللہ جب فرشتوں کو حکم دیتا ہے تو جھٹ پٹ حکم کی تعمیل کرنے لگتے ہیں۔ وہ اسی بچی ہوئی مٹی سے پتلے بنا کر زمین پر بھیج دیتے ہیں — معمولی مٹی کے بنے ہوئے پتلوں میں اچھے رکھ رکھاؤ کہاں سے آئیں گے - اس مٹی کی کشش تو پہلے ہی ختم ہو چکی ہے، اس لئے اُن کی نقل و حرکت بھی اچھی نہیں ہوتی - یہ دیکھ کر خدا معمولی مٹی کے بنے ہوئے پتلوں کی پیشانیوں پر غربت لکھ دیتا ہے اور اسی لئے وہ لوگ زندگی بھر خالی ہاتھ رہتے ہیں۔ شاید غریبوں کی بات بھی قبول نہیں ہوتی - بے چارے عمر بھر دعائیں مانگتے رہتے ہیں، مگر امیر نہیں بنتے - وہ تو بچی ہوئی مٹی کے بنے ہوئے ہیں نا؟ ان کی زبان میں اثر کہاں سے آئے؟ جھوٹی مٹی تو اثر کھو دیتی ہے نا! دیکھو، دنیا میں وہ بھی ہماری جھوٹی چیزوں پر گزارا کرتے کرتے ختم ہو جاتے ہیں۔"

معصوم بے بی حیرت میں ڈوب گئی — راشد ریڈیو سننے میں لگ گیا اور رحیمن کا دل مایوس ہوکر ڈوب رہا تھا۔ اُس نے تو امّی سے سنا تھا کہ خدا چاہے تو پل بھر میں امیر کو غریب اور غریب کو امیر بنا دیتا ہے.... مگر یہ کیا حقیقت تو اس کے برعکس ہے - یہ غریبی تو عمر بھر کا روگ ہے۔ کیا وہ بھی عمر بھر امّاں بی کے گھر کا کام کرتے کرتے دم توڑ دے گی؟ اُف! اُس نے بہت ہی بے بس ہوکر آسمان کو دیکھا۔

امّاں بی اپنے دونوں لڑکوں جاوید اور واحد کی شادی کی تیاری میں مصروف تھیں۔ رحیمن بھاگ بھاگ کر چھوٹے موٹے کام کرتی پھر رہی

تھی ۔ پڑوسی ہونے کی وجہ سے وہ رات کے دس بجے تک اماں بی کے گھر میں ہی رہتی تھی۔

جاوید اور واحد کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ دونوں بہوئیں بہت دولت مند اور اونچے گھرانوں سے آئی تھیں ۔ اماں بی تو اپنے قابل بچوں کی قسمت پر نازاں تھیں۔

جاوید اور واحد کی شادی کے دو تین ماہ بعد راشد اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ چلا گیا۔ اماں بی نہال ہو رہی تھیں ۔ راشد کو وہ بے حد چاہتی تھیں۔ اگر کبھی راشد کا خط آنے میں تاخیر ہو جاتی تو بار بار فون کر کے خیریت پوچھی جاتی ۔ راشد نے اپنے والدین کو لکھا کہ وہ امریکہ ہی میں شادی کر لینا چاہتا ہے۔ اماں بی کو بیٹے تو کچھ ملال ہوا کہ بیٹے کا سہرا نہ دیکھ سکیں گی۔ پھر انہوں نے اجازت دے دی۔ یہ بھی تو اُن کے لئے فخر کی بات تھی کہ اُن کے لخت جگر کی شادی امریکہ میں ایک انجینیر کی بیٹی سے ہو رہی ہے ۔

اماں بی راشد کو اور اس سے بھی زیادہ بہو کو دیکھنے کے لئے بے تاب تھیں ۔ وہ دنوں، مہینوں اور برسوں کا حساب لگاتی رہتیں۔ آخر راشد تعلیم ختم کرنے کے بعد اپنی بیوی کے ساتھ گھر آگیا ۔ اماں بی کے چہرے پر رونق آگئی ۔ اولاد ہو تو ایسی۔ سب لوگ والدین کی تعریف کرتے نہ تھکتے ۔ اماں بی کو اپنے وجود کی سطح بہت اونچی لگ رہی تھی ۔

پلک جھپکتے ہی چھ ماہ گزر گئے ۔ راشد اپنی بیوی کے ساتھ پھر امریکہ جا رہا تھا ۔ اماں بی نے دبی زبان سے کہا کہ "بیوی کو یہیں چھوڑ جاؤ" مگر راشد نے ہنستے ہوئے کہا "بھلا وہ یہاں کیسے رہ سکیں گی ماں ؟ ان کو تو یہاں کی کوئی بات پسند نہیں آئے گی۔ بہتر ہے کہ میں بھی امریکہ میں ہی بس جاؤں"

اماں بی ہکا بکا رہ گئیں ۔ بڑھ کر روکنے کی ہمت بھی نہ کچھ کہنے کی ۔ دل ہی دل میں تلملا رہی تھیں ۔ پھر انہوں نے اپنے اوپر قابو پا لیا اور خندہ پیشانی سے راشد کو رخصت کرنے لگیں ۔ والد نے راشد کو گلے لگاتے ہوئے پوچھا "کیوں راشد بیٹا اب کب آؤ گے ؟"

جواب میں راشد نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا "کہہ نہیں سکتا ابا جان ، دور کا معاملہ ہے آنے میں تاخیر بھی ہو جائے گی ۔ ہو سکتا ہے میرے آنے میں اتنی تاخیر ہو جائے کہ میرے یہ کالے بال آپ لوگوں کو سفید نظر آئیں ۔" اتنا کہتے کہتے راشد زور زور سے ہنسنے لگا ۔ بعض لوگوں کی ہنسی بھی کتنی پُرفریب ہوتی ہے ! خود ہنستے ہنستے دوسروں کو رُلا دیتے ہیں ۔

"راشد بھیا بھی چلے گئے اماں بی" رحیمن بھی روہانسی ہو گئی ۔ اس کو اماں بی کا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھ کر ترس آ رہا تھا ۔ "آپ کو تنہا چھوڑ گئے ۔ ہائے !" بے اختیار رحیمن کے ہونٹوں سے ہمدردی کے بول نکل پڑے ۔ اس کی آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں پھر اچانک وہ گھبرا گئی ۔ کہیں اماں بی کو ناگوار نہ گزرے ۔ وہ جلدی سے اپنے آنسو چھپاتی ہوئی وہاں سے کھسک گئی ۔ اماں بی نے پہلی بار رحیمن کو غور سے دیکھا ۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ ہمدردی تھی ۔ ایسی ہمدردی کبھی انہوں نے اپنے شادی شدہ لڑکوں کی آنکھوں میں اپنے لئے نہیں دیکھی تھی ۔ ایک دم اماں بی کو ایسا لگا جیسے اُن کی بے بس ہستی واقعی رحم کے قابل ہے ۔ وہ پوری طور پر لٹ چکی تھیں ۔ ان کے جگر کے ٹکڑوں نے نظریں پھیر لی تھیں ۔ پتہ نہیں کون سینے میں رہ رہ کر آری چلا رہا تھا ۔ اماں بی نے جلدی سے اپنا ہاتھ سینے پر رکھ لیا ، مگر بے سود ۔ وہ تو بہت اونچائی سے ایک دم آنہ زمین پر آ گری تھیں ۔ ایسے قابل بچوں پر کس قدر ناز تھا اُن کو ۔ اُف ! انہوں نے کتنا حقیقت سے دور خواب دیکھا تھا ! اچانک اُن کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا پڑ گیا ۔ رحیمن کی غریب امی سلمیٰ کتنی خوش قسمت نکلی ۔ سات لڑکیوں کو اُس نے جنم دیا تھا ۔ ہر لڑکی کی پیدائش پر مارے غم کے رو پڑتی تھی ، مگر ساتوں لڑکیوں کو غریب سلمیٰ نے کسی نہ کسی طرح پالا پوسا اور جان توڑ کوشش کر کے ساتوں کی شادی کر دی۔ اب کتنی پُرسکون زندگی ہو گئی ہے سلمیٰ کی ۔ چھ لڑکیاں سسرال آتی جاتی ہیں ۔ آخری بیٹی رحیمن سسرال نہیں جاتی ۔ وہ ماں کے ساتھ ہی رہتی ہے ۔ اگر کوئی سوال کرے "کیوں بی ، میکے میں ہی رہتی ہو ؟" تو رحیمن سادگی سے جواب دیتی ہے "کیسے چلی جاؤں امی کو تنہا چھوڑ کر ؟" سلمیٰ غریب ماں ہے ، پھر بھی اس کی بیٹیاں اور سب داماد اس کے کتنے قدر داں ہیں ۔ بچوں کی پرورش کے لئے سلمیٰ نے کتنے دکھ اٹھائے تھے ، سب سکھ میں بدل چکے ہیں ۔ اگر سلمیٰ کی طبیعت کچھ خراب ہو تو کس طرح سب لڑکیاں دوڑی دوڑی آتی ہیں ۔ اور سب کی سب اپنی امی کو گھیر کر بیٹھ جاتی ہیں ۔ جب تک امی ٹھیک نہ ہو جائیں ، لڑکیاں اطمینان کا سانس نہیں لیتیں ۔ اس کے برعکس اماں بی کے لڑکے کتنے بے پروا ہیں ۔ اگر اماں بی کو چکر آئے تو کہیں گے "آپ کو بلڈ پریشر ہے اماں بی ۔ چکر تو آئے گا ہی ۔ آپ چلنے وغیرہ سے پرہیز کیجئے ۔" اتنا کہہ کر وہ مطمئن ہو جاتے ہیں ۔ جب چکر آ کر طبیعت کچھ نا[illegible] ہو جاتی ہے تو کوئی بھی بہو اماں بی کے [illegible] نہیں بیٹھتی ۔ بس یہی رحیمن اماں بی کے [illegible] لگی بیٹھی رہتی ہے ۔ بڑے لڑکے ساجد تو [illegible]

لی تعلیم کی خاطر بیوی بچوں سمیت علی گڑھ چلے گئے ہیں ۔ جاوید اور واحد کو اتنی شاندار سسرال ملی تھی کہ دونوں بک گئے ۔ جاوید سسرال میں ہی رہنے لگا اور واحد، واحد کی بیوی چند ماہ اماں بی کے پاس رہی، پھر واحد چھوٹی موٹی بات پر لڑ جھگڑ کر اپنی بیوی کو اپنے ساتھ لے کر الگ گھر بسانے کے لئے چل دیا اور اب آخری بیٹے راشد نے بھی چوٹ دے دی ۔ اماں بی نے اپنی ساری اولاد کو قابل بنانے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا تھا اور جب بچے قابل ہو جاتے تھے تو اماں بی ان کے تئیں اپنا آخری فرض بھی ادا کر دیتیں ۔ یعنی ان کی شادی کر دیتیں ۔ تنہا باواجان چاروں لڑکوں کو اتنا قابل کیسے بنا سکتے تھے ۔ بچوں کے آگے اماں بی نے ہر چیز کو ہیچ سمجھا ۔ کتنی بہت سی جائیداد انہوں نے فروخت کر کے چاروں بچوں کی قسمت کو اونچا کرنے میں لگا دی تھی ۔ اب باواجان اپنی عمر کی آخری منزلوں میں تھے ——— اچانک اماں بی کا خون جیسے کھولنے لگا ۔ انہوں نے اپنا رُندھیایا ہوا گلا صاف کیا اور کھڑی ہو گئیں ۔

"سب ہم کو چھوڑ کر چلے گئے ۔ خیر، اب میں بھی مرتے دم تک کسی کا چہرہ نہ دیکھوں گی ۔ اب میں بھی وصیت نامہ لکھوائے دیتی ہوں ۔ اپنے بے وفا بچوں کو میں ایک پائی بھی نہ دوں گی ۔" اُنہوں نے اپنے شوہر سے کہا ۔

"تمہارے پاس اب رہ کیا گیا ہے بیگم ؟" باواجان کی آواز میں اُداسی کی جھلک تھی ۔

"کچھ نہ سہی، مگر یہ میرا اتنا بڑا گھر تو ہے ۔ یہ میں ہرگز اپنی بے مروت اولاد کو نہیں دوں گی ۔ تیرا کیا بھروسہ ۔ بار بار چکر آتے رہتے ہیں ۔ لیکن میرے بعد آپ کا کیا حال ہو گا ؟" اماں بی کی آواز بھر آئی ۔

باواجان نے دیکھا کہ اماں بی زندگی میں پہلی بار دکھی نظر آ رہی تھیں ۔ پھر اماں بی نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا ۔ "گھر میں دو تین نوکر ہیں، انہیں سب کو نکالے دیتی ہوں ۔ صرف ایک قابلِ اعتماد نوکر رکھ لیں گے ۔ میں وصیت نامہ بھی لکھوائے دیتی ہوں ۔ اگر ہمارے اعتماد کا نوکر ہم دونوں کی آخری دم تک اچھی طرح خدمت کرے گا وہی اس گھر کا وارث ہو گا ۔" اماں بی واقعی طیش میں آ چکی تھیں ۔

"مگر ایسا آدمی کہاں ملے گا — جس پر ہم پورا اعتماد کر سکیں ؟" باواجان کا دل بھی ٹوٹ چکا تھا ۔

"دنیا ابھی خلوص و محبت سے خالی نہیں ہوئی ہے ۔ سب لوگ ہمارے ان کم بخت بچوں کی طرح بے مروت نہیں ہیں ۔" اماں بی نے نفرت سے کہا ۔

"ٹھیک ہے بیگم ۔ ہم دونوں کو اپنی آئندہ زندگی کے لئے کسی اچھے محافظ کو تلاش کرنا ہے ۔" باواجان کی شکست خوردہ آواز ڈوب سی رہی تھی ۔

"دیکھ لیجئے ۔ میں ابھی اسی وقت گھر کا پورا انتظام بدل ڈالوں گی اور وصیت نامہ آج ہی لکھواؤں گی ۔"

"کس پر بھروسہ کرو گی ؟ پہلے کوئی قابلِ اعتماد آدمی بھی تو ملے ۔" باواجان گھبرا رہے تھے ۔ اُنہیں دنیا کا ہر فرد اپنے بچوں کی طرح بے مروت نظر آ رہا تھا ۔

"سوچ رہی ہوں، ہم رحیمن کو انتخاب کر لیں ۔ وہی ایمان داری سے ہم دونوں کی آخری دم تک اچھی طرح خدمت کر سکتی ہے ۔"

"ٹھیک ہے ۔ اس کی طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا ۔ رحیمن واقعی بہت وفادار ہے ۔"

جب اس بات کی خبر رحیمن کو ملی تو وہ دوڑی ہوئی آئی اور کہنے لگی ۔ "اماں بی، آپ دونوں تو سچ مچ میرے ماں باپ کی مانند ہیں ۔ میں آپ دونوں کی خدمت زندگی بھر کرتی رہوں گی ۔ مجھے گھر کی ضرورت نہیں ۔"

"ہاں بیٹی، تم ٹھیک ہی کہتی ہو ۔ تم ہماری ہی بیٹی ہو، اس لئے ہمارے گھر کی ہمارے بعد تم ہی وارث ہو گی ۔" جواب میں باواجان نے کہہ دیا ۔

اماں بی کے سینے میں تو آگ لگی ہوئی تھی ۔ بچوں کی طرف سے چوٹ کھائی ہوئی ماں رحیمن سے خلوص پا کر اس کی محبت اور ایمان داری پر اپنا گھر نچھاور کر دینے کا ارادہ کئے بیٹھی تھی ۔ انہوں نے چپکے سے پوشیدہ طور پر اپنا گھر رحیمن کے نام منتقل کر دیا ۔ رحیمن کو علم بھی نہ ہو سکا کہ گھر اس کے نام لکھ دیا گیا ہے ۔ وہ تو اُٹھتے بیٹھتے کہتی رہتی تھی ۔ "اماں بی، ہم غریب تو دُکھ درد اُٹھانے کے لئے ہی دنیا میں آئے ہیں ۔ آپ دونوں کی خدمت بھی میرے لئے تکلیف کی بات نہیں ۔ میں تو یوں ہی ساری عمر آپ دونوں کی دیکھ بھال کرتی رہوں گی ۔ میری خدمت کے معاوضے میں آپ مجھے اپنا گھر نہ دیں ۔ نہیں تو آپ کے بچے مجھے لالچی کہیں گے ۔ دنیا کے سُکھ کی مجھے کوئی پرواہ نہیں ۔ ہاں آخرت کے سُکھ کی ضرور خواہاں ہوں ۔"

اس بے چاری کو کیا پتہ تھا کہ اتنے بڑے گھر کی اب صرف وہ وارث ہے ۔

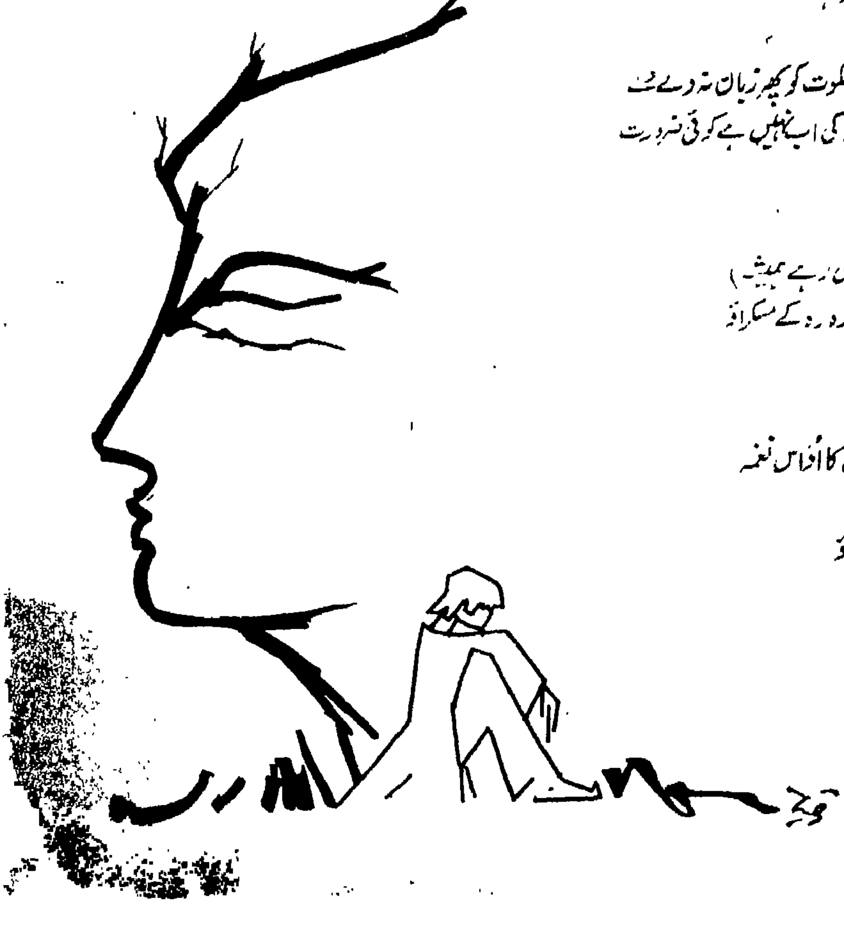
اُداس نغمہ

رحمٰن جامی

میں ایک نغمہ ہوں، زندگی کا اُداس نغمہ
جو سب سے چھپ کر تمہارے ہونٹوں پہ بس گیا ہوں
تمہاری تنہائیوں میں ماضی کی شوخ یادوں کا آسرا ہوں
مجھے اکیلے میں گنگناؤ

مگر یہ ایں غم
مرے لئے تم نہ جانے کیا ہو
مری محبت کی ابتدا ہو کہ انتہا ہو
(یہ کیسے کہہ دوں کہ بے وفا ہو)
تمہاری یادیں تمہارا مہکا ہوا تصور بھی بار ہونے لگا ہے دل پہ
کہ اب تو جیسے تمہاری فرقت ہی زندگی ہے
میں تم کو دیکھوں تو اجنبی کی صورت
اچٹتی نظروں سے صرف دیکھوں
جو تم ملو بھی تو مجھ سے انجان بن کے گزرو
کہ اس میں دونوں کی آبرو ہے
یہ آبرو اپنی زندگی ہے
یہ التفاتِ نگاہ میرے سکوت کو پھر زبان نہ دے دے
تمہاری حسرت زدہ توجہ کی اب نہیں ہے کوئی ضرورت

تمہارا گلشن ہرا بھرا ہے
(خدا کرے یہ ہرا بھرا ہی رہے ہمیشہ)
تم اپنے غنچوں کے ساتھ رہ کے مسکراؤ
بہار ہو تم
میں اک خزاں ہوں
میں ایک نغمہ ہوں زندگی کا اُداس نغمہ
کہ مجھ کو ہرگز نہ گنگناؤ
جو ہو سکے مجھ کو بھول جاؤ





اِن سے ملئے

کرشنا سی کند

ہندوستان کا آرٹ دیکھیے

دیکھیے ساری دنیا میں مقبول ہو رہا ہے۔ دو ہزار برس پہلے ہندوستان کی مصنوعات روم اور ایران کے شاہی خاندان میں فخر سے استعمال کی جاتی تھی۔ ہندوستان کا ریشم چین کے ریشم سے کم نہ تھا۔ لگ بھگ چودہ سو برس قبل ہندوستان کی یہ بیرونی تجارت بند ہو گئی، کیونکہ عربوں نے مشرق وسطیٰ پر قبضہ کر لیا اور بحری تجارت پر چھا گئے۔ ہندوستان سے یورپ مال جانا بند ہو گیا۔ یہ مال خشکی کے راستے جاتا تھا۔ جسے "ریشم کی سڑک" بھی کہا جاتا تھا۔ سولہویں صدی میں واسکوڈی گاما نے سمندر کے راستے ہندوستان کا ساحل تلاش کر لیا۔ اس کے بعد ہندوستان اور یورپ کے درمیان تجارت پھر شروع ہو گئی۔ انگریزوں نے ہندوستان کو جی بھر کے لوٹا اور انگلستان مالا مال ہو گیا۔ انگریزوں نے جو سب سے بڑا نقصان ہندوستان کو پہنچایا وہ اس ملک کی دستکاری کا خاتمہ تھا۔ ڈھاکے کی ململ خواب خیال ہو گئی۔ اس کی جگہ مانچسٹر کے کپڑوں نے لے لی۔ انگریز یہاں سے خام مال لے جاتے اور اپنے کارخانوں میں اسے تیار کر کے واپس ہندوستان بھیج دیتے۔ رفتہ رفتہ ہندوستان کی دستکاری ختم ہو گئی۔ آزادی کے بعد حکومت نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس ملک کی دستکاری کو دوبارہ زندہ کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ حکومت کی پالیسی اور عوام کی کوشش سے آج پھر ہندوستان دو ہزار برس پہلے کی روایت دہرا رہا ہے۔ ہندوستان کی مصنوعات یورپ اور امریکہ میں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہیں۔ ہندوستان کی نقاشی خواہ وہ کپڑوں پر ہو یا لکڑیوں پر۔ مغربی ممالک میں بہت پسند کی جاتی ہے۔ ہندوستان کے ڈیزائن یورپ میں مقبول ہیں۔ اس مقبولیت کا سہرا اس ملک کے نقاشوں اور ڈیزائن بنانے والوں کے سر ہے۔ کرشنا سی کند ایسی ہی ایک ڈیزائن بنانے والی ہیں۔

کرشنا دراصل ٹیچر ہیں وہ دہلی کے میرانڈا کالج میں انگریزی کی ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ ہیں۔ کالج میں پڑھانے سے جو وقت بچتا ہے اسے وہ نقاشی اور ڈیزائننگ میں صرف کرتی ہیں۔ ڈیزائن بنانا ان کا پیشہ نہیں، بلکہ ہابی ہے۔ یہ ڈیزائن وہ عموماً بید کی مصنوعات پر بناتی ہیں۔ آسام میں بید کے جنگلات بہت ہیں۔ آسام کی لکڑی میں ایک خاص لچک ہوتی ہے۔ جو شمالی ہند کی لکڑی میں نہیں ملتی۔ اس لکڑی کے بہت پتلے پتلے تار بنائے جا سکتے ہیں۔ ان تاروں سے چٹائیاں ٹیبل کور اور دیواروں پر سجنے والے پینل بنتے ہیں۔ کرشنا ایک پیدائشی مصور ہیں۔ ان کی لیاقت پڑھانے اور ڈیزائن بنانے پر ہی ختم نہیں ہو جاتی۔ وہ انگریزی زبان کی شاعر، مصنف اور ڈرامہ نگار بھی ہیں۔ وہ پیانو بھی بجاتی ہیں۔ انہیں بھارت ناٹیم سے بھی لگاؤ ہے۔

کرشنا تری پورہ (آسام) میں پیدا ہوئیں۔ پیدائش کے چند ہفتے بعد ہی ان کا خاندان بمبئی میں منتقل ہو گیا۔ ان کے باپ بمبئی میں ریزرو بینک میں ایک اعلیٰ افسر تھے۔ کرشنا نے ابتدائی تعلیم بمبئی کے کوئین میری کانوونٹ میں حاصل کی۔ سات سال بعد کلکتہ منتقل ہو گئیں۔ کلکتہ کے لورٹو …… انہوں نے سینئر کیمبرج کیا۔ پھر لورٹو کالج …… بی اے کیا، بی اے میں انہوں ……

یں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ انہیں جوبلی اسکالرشپ مل گیا۔ کلکتہ یونی ورسٹی سے ہی انہوں نے ایم اے کیا۔ اس بار عورتوں میں ان کی پہلی پوزیشن تھی۔ انہوں نے ۱۸ سال میں ایم اے پاس کرلیا۔ ان کے باپ چاہتے تھے کہ کرشنا آئی اے ایس کا امتحان دیں، لیکن وہ ٹیچر بننا چاہتی تھیں۔ ایم اے پاس کرنے کے بعد وہ چھٹیاں منانے کے لئے دلی آئیں۔ دلی کے قیام کے دوران انہوں نے میرانڈا کالج میں ٹیچر بننے کے لئے درخواست بھیج دی۔ یہ درخواست منظور ہوگئی۔ لیکن ان کی ماں نے ان کی درخواست نامنظور کردی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی اکلوتی بیٹی دہلی میں تنہا زندگی بسر کرے۔ کرشنا نے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی کوشش کی۔ مگر اس بار بھی ان کی ماں آڑے آگئیں۔ وہ کرشنا کو تنہا انگلستان بھیجنے پر راضی نہ ہوئیں۔ کرشنا کو آکسفورڈ نہ جانے کا بہت افسوس ہے۔ وہ کہتی ہیں "میں اپنی ماں کو اس غلطی کے لیے کبھی معاف نہیں کرسکتی"۔ کرشنا کا آکسفورڈ جانے کا ارمان دل میں ہی رہ گیا۔ ان کا حشر بھی وہی ہوا جو اس عمر میں ہر ہندوستانی لڑکی کا مقدر ہوتا ہے۔ ان کی شادی ہوگئی۔

کرشنا کی شادی کی داستان

ی دل چسپ ہے۔ وہ کولین برہمن ہیں، بنگال کے برہمنوں میں سب سے اونچی ذات سمجھی جاتی ہے۔ ان کی منگنی بچپن میں ایک برہمن لڑکے سے ہوگئی تھی۔ مگر کرشنا کو یہ رشتہ پسند نہیں تھا۔ انہوں نے ماں باپ کی مخالفت کے باوجود رشتہ توڑ دیا۔ انہیں ایک مسلمان لڑکے سے محبت ہوگئی۔ ماں باپ ان کے منگنی توڑنے سے پہلے ہی ناراض تھے، ایک مسلمان لڑکے سے شادی کی تجویز سامنے آنے پر ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ اس زمانے میں ایک کولین برہمن لڑکی کا ایک غیر برہمن خاندان میں شادی کرنا ہی عیب سمجھا جاتا تھا، غیر مذہب میں شادی کرنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ چنانچہ ماں نے جوڑ توڑ کرکے یہ شادی رکوا دی۔ یہ شادی تو رک گئی لیکن کرشنا نے ہمت نہ ہاری۔ وہ ایک دوسرے لڑکے کی محبت میں مبتلا ہوگئیں۔ یہ لڑکا نہ مسلمان تھا نہ برہمن۔ جگدیپ ایک پنجابی کھتری نوجوان تھے۔ وہ فوج میں لیفٹننٹ تھے۔ کرشنا کے والدین نے اس شادی کی بھی مخالفت کی۔ اس بار کرشنا نے اپنی من مانی کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ان کا ارادہ اٹل تھا۔ ان کی ماں پنجابیوں سے خائف تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ سارے پنجابی سکھ ہوتے ہیں۔ کلکتہ میں تقریباً تمام ٹیکسی ڈرائیور سکھ ہوتے تھے۔ شاید انہوں نے اسی بات سے یہ اندازہ لگایا تھا۔ مگر کرشنا کے باپ نے سمجھ داری سے کام لیا۔ انہوں نے کرشنا کو شادی کی اجازت دے دی۔ ان کی شادی سول میرج ایکٹ کے تحت ہوئی۔ شادی کی دوسری رسم روایتی طریقے سے ادا ہوئی۔ اس رسم میں کئی گھنٹے صرف ہوتے ہیں۔

شادی کے بعد جگدیپ کا تبادلہ دہلی ہوگیا۔ اس بار کرشنا کا ٹیچر بننے کا ارمان پورا ہوگیا۔ وہ میرانڈا کالج میں انگریزی کی لیکچرر مقرر ہوگئیں، کچھ عرصہ کے بعد جگدیپ کا تبادلہ نیپال ہوگیا۔ کرشنا کو بادلِ ناخواستہ میرانڈا کو خیرباد کہنا پڑا۔ نیپال میں یہ لوگ دو سال رہے۔ کرشنا کھٹمنڈو میں خالی نہیں بیٹھیں۔ وہ بھٹ گاؤں اور پٹن گئیں۔ انہوں نے نیپال کی مصوری کا مطالعہ کیا، وہاں کی نقاشی کی نقلیں اتاریں، اور نیپال کے آرٹ پر ایک کتاب مرتب کی۔ اس کتاب کی تیاری میں مسز دیال ان کی شریکِ کار تھیں۔ مسٹر دیال نیپال میں ہندوستان کے سفیر تھے۔ یہ کتاب بعد میں برٹش میوزیم کو پیش کی گئی۔ نیپال میں نقاشی کا مطالعہ کرنے کے علاوہ کرشنا نے مسز دیال کے تعاون سے سنسکرت ڈرامے بھی پیش کئے۔ یہ ڈرامے کھٹمنڈو میں اسٹیج کئے گئے۔

نیپال سے واپس آکر کرشنا دوبارہ میرانڈا میں ملازم ہوگئیں۔ جگدیپ کا تبادلہ نیفا اور پھر جموں ہوگیا۔ کرشنا اپنے خاوند کے ساتھ ان جگہوں پر قیام نہیں کرسکتی تھیں یہاں فوجی افسروں کی بیویوں کے لئے قیام کا بندوبست نہیں تھا۔ ایسے مقامات فوجی اصطلاح میں نان فیملی اسٹیشن کہلاتے ہیں۔ پانچ سال اس طرح گذر گئے۔ ۱۹۶۹ء میں یہ لوگ لندن چلے گئے، یہاں کرشنا نے کنگز کالج میں پی ایچ ڈی کے لئے کوشش کی، لیکن کچھ وجوہ کی بنا پر وہ پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل نہیں کرسکیں۔ اس کی بجائے انہیں برٹش کونسل سے اسکالرشپ مل گیا۔ انگلستان میں وہ چار برس رہیں۔ انگلستان کے قیام کے دوران انہوں نے یورپ کا دورہ کیا اور روس بھی گئیں۔ پھر انہوں نے امریکہ

یہ سفر بھی کیا۔ ۱۹۷۴ء میں وہ دہلی واپس آگئیں۔ لندن میں انہوں نے آرٹ کالج میں بھی دو سال گزارے۔ وہاں کی آرٹ گیلریاں اور میوزیم انہیں بہت پسند آئے۔ دہلی پہونچتے ہی وہ پھر میرانڈا کے اسٹاف میں شامل ہوگئیں۔

کرشنا کو پینٹنگ کا شوق اپنی ماں سے ورثے میں ملا ہے۔ ان کی ماں ٹیگور کی دوست تھیں۔ ان کا شانتی نکیتن سے گہرا تعلق تھا۔ مشہور آرٹسٹ جیمنی رائے ان کے ہم عصر تھے۔ وہ کلکتہ میں ہینڈی کرافٹ بورڈ کی ممبر رہ چکی ہیں۔ مارچ ۱۹۷۶ء میں اٹلی کے کچھ لوگوں نے کرشنا کے ڈیزائن دیکھے۔ بعد میں انہوں نے کرشنا کو اٹلی آنے کی دعوت دی۔ اٹلی میں ایک نمائش میں ان کے ڈیزائن رکھے گئے۔ اسی سال اکتوبر میں انہیں امریکہ آنے کی دعوت دی گئی۔ کرشنا کچھ عرصے نیویارک رہیں۔ وہاں انہوں نے ایک نمائش میں اپنے بنائے ہوئے ڈیزائن پیش کئے۔

کرشنا اپنے شوہر اور دو بچوں کے ساتھ رہتی ہیں۔ وہ اپنی ملازمت اور مشغولیات میں وقت صرف کرنے کے باوجود کچھ نہ کچھ وقت اپنے بچوں کے لئے ضرور نکال لیتی ہیں۔ ان کے خیال میں سارا وقت بچوں کی نذر نہ کرنا بچوں کے ساتھ ناانصافی نہیں ہے۔ ابتدا میں انہیں ضرور کچھ گناہ کا احساس ہوتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ بچوں کو پورا وقت نہ دےکر ان پر ظلم کر رہی ہیں۔ لیکن تجربے نے ثابت کر دیا کہ بچے ہر طرح کے ماحول میں اپنے آپ کو ڈھال لیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہ عورتیں جو اپنے بچوں کو پورا وقت دیتی ہیں، ان کی صحیح تربیت کرتی ہیں؟ کیا ان بچوں کو اپنی ماؤں سے کوئی شکایت نہیں؟ دراصل وقت کی مقدار اہم نہیں ہے۔ اس کی کوالٹی اہم ہے۔ ملازمت کرنے والی ماؤں کے پاس اپنے بچوں کے لیے وقت کم ہوتا ہے۔ وہ وقت کی اہمیت سمجھتی ہیں اور وقت کو قیمتی سمجھتے ہوئے اسے دانشمندی سے صرف کرتی ہیں۔

کرشنا کے خیال میں ہندوستانی سماج بہت قدامت پسند ہے۔ پڑھے لکھے اور روشن خیال خاندان کو بھی ذرا سا کھرچیں تو قدامت پسندی کی پرت صاف نظر آجائے گی۔ خود ان کا خاندان بہت اعلےٰ تعلیم یافتہ اور وسیع النظر کہلاتا ہے۔ لیکن جب ان کی شادی کا مسئلہ سامنے آیا تو ساری ترقی پسندی دھری رہ گئی۔ ان کے والدین نے ذات سے باہر شادی کرنے کی پرزور مخالفت کی۔ کرشنا تعلیم کو ترقی پسندی کا ستون نہیں سمجھتیں۔ یہ نقطۂ نظر کا سوال ہے۔ ایک انسان کم تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود ترقی پسند ہو سکتا ہے۔ خود ان کے ماں باپ دل سے قدامت پسند تھے مگر ان کی نانی، جو صرف بنگالی جانتی تھیں، ترقی پسند اور انقلابی ذہن کی مالک تھیں۔ ان کی نانی کی شادی ۱۲ سال کی عمر میں ہوگئی تھی۔ انہوں نے اسکول اور کالج کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی لیکن ان کے خیالات ترقی پسندانہ تھے۔ کرشنا کو اپنی زندگی کے مسئلوں کو سلجھانے میں اپنی نانی سے بہت مدد ملی۔

عورتوں کی آزادی کی جدوجہد کے بارے میں کرشنا کے خیالات عام ڈگر سے مختلف ہیں۔ ان کے خیال میں اعلےٰ طبقہ کی عورتوں کو آزادی کی خواہش نہیں۔ وہ اپنی من مانی کرتی ہیں۔ ان کے پاس نوکر چاکر ہیں، روپیہ ہے۔ وہ جس طرح چاہیں اپنا وقت گزار سکتی ہیں۔ انہیں پہلے سے ہی آزادی حاصل ہے۔ آزادی کی خواہش متوسط طبقے اور نچلے طبقے کی عورتوں میں زیادہ ہے۔ یہ عورتیں رسم و رواج کے بندھن میں بری طرح جکڑی ہوئی ہیں۔ انہیں معاشی آزادی حاصل نہیں ہوتی۔ وہ گھر کے خرچ کے لئے شوہر کی دست نگر ہوتی ہیں۔ شوہر اپنی اہمیت سمجھتا ہے۔ وہ جس طرح چاہتا ہے اپنا وقت گزارتا ہے۔ وہ شام کو دفتر سے آتا ہے تو دوستوں سے ملنے چلا جاتا ہے۔ بیوی گھر پر بیٹھی انتظار کرتی رہتی ہے۔ یہ خیال کہ یورپ کی عورتیں ایشیا کی عورتوں سے زیادہ آزاد ہیں، غلط ہے۔ یورپ میں عورتوں کو صرف سماجی آزادی حاصل ہے، تاریخی اور معاشی آزادی سے وہ محروم ہیں۔ کچھ برس پہلے تک سوئٹزرلینڈ میں عورت کو ووٹ کا حق حاصل نہیں تھا۔ اسے بینک میں اکاؤنٹ کھلوانے کی اجازت نہیں تھی۔ اب اسے یہ دونوں حق حاصل ہیں۔ فرانس میں صرف باپ کے پاسپورٹ میں ہی بچوں کا اندراج ہوتا تھا۔ ماں اس حق سے محروم تھی۔ ہندوستان میں حالات مختلف ہیں۔ یہاں عورت نہ سماجی طور پر آزاد ہے اور نہ معاشی طور پر۔ عورت کی اس بدحالی کے پیچھے ملکیت کا تصور ہے۔ شوہر بیوی کو اپنی جائداد سمجھتا ہے۔ اور یہیں سے ساری خرابیاں شروع ہوتی ہیں۔ اگر ہمارے ملک میں انفرادی آزادی قائم ہوجائے تو یہ مسئلہ ہی نہیں رہے گا۔ اس کے لئے مردوں کے

ذہن کو تبدیل کرنا ضروری ہے۔ اگر اس بارے میں مردوں کا نقطۂ نظر بدل جائے تو یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ عورت کی جدّوجہد بھی سطحی ہے۔ عورت نے تعلیم حاصل کی، سماج میں انقلاب لانے کی تیاری کی، لیکن نتیجہ کیا ہوا؟ وہی ڈھاک کے تین پات۔ اس نے شادی کی بچے ہوئے اور وہ مطمئن ہو گئی۔ اس کی تعلیم سے سماج کو کیا فائدہ پہنچا؟ مشاہدے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عورتوں کی آزادی کی سب سے بڑی دشمن خود عورت ہے۔ آج تک جتنے قانون عورت کو اس کا جائز حق دلانے کے لئے بنائے گئے ہیں وہ سب مردوں نے بنائے ہیں۔ اصل آزادی ذہن کی آزادی ہے۔

کرشنا ایک امیر گھر میں پیدا ہوئیں۔ تین برس کی عمر میں ان کے لئے ایک گورنس کا انتظام کیا گیا۔ ترپی پوزہ میں بید کے جنگل ان کے خاندان کی ملکیت تھے۔ ان کے والد ایک اعلیٰ افسر تھے۔ لیکن پھر بھی کرشنا کو اپنا حق حاصل کرنے کے لئے جدّوجہد کرنا پڑی۔ انہیں وہ سب کچھ بے طلب ملا جس کی ان کو ضرورت نہیں تھی، مگر جس چیز کی انہیں ضرورت تھی اس کے لئے انہیں لڑنا پڑا۔

کرشنا کو مذہب سے کوئی لگاؤ نہیں لیکن وہ خدا کی ہستی کو تسلیم کرتی ہیں۔ ان کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ خدا پر ان کا ایمان نہ رہا۔ ان کی بچی چند روز بیمار رہ کر چل بسی۔ بچی کی عمر ۳½ سال تھی۔ کرشنا سے خدا کی یہ ناانصافی نہیں دیکھی گئی — انہیں قسمت پر یقین نہیں رہا لیکن بعد میں جب ان کا زخم مندمل ہو گیا تو خدا پر ان کا اعتقاد بحال ہو گیا۔ ان کا یقین ہے کہ انسان کے کرم ہی اس کے آرام یا تکلیف کا فیصلہ کرتے ہیں، وہ کرم پچھلے جنم کے ہوں یا اس جنم کے، انسان اپنے کرم کے پھل سے بچ نہیں سکتا۔ فیشن کے متعلق کرشنا کی رائے عجیب ہے۔ ان کا خیال ہے کہ انسان جس چیز سے مرعوب ہوتا ہے، اس کی نقالی کرتا ہے۔ ہندوستان میں مغربی لباس پہننا پسند کیا جاتا ہے، اس لئے کہ ہم مغرب سے مرعوب ہیں۔ لڑکیاں لڑکوں کا لباس پہنتی ہیں تو اسمارٹ کہلائی جاتی ہیں۔ لیکن لڑکے لڑکیوں کا لباس پہن لیں تو لوگ انہیں پاگل سمجھیں گے۔ یہاں بھی وہی مرعوب ہونے کی بات کارفرما ہے۔ ♥



یاد آتے ہیں کتنا مجھے رات دن
وہ طرب خیز لمحے، وہ آنگن ، وہ گھر
جن کی آغوش میں میرا بچپن پلا
گونجتی تھی جہاں قہقہوں کی صدا
کوئی غم تھا نہ تھی فکر کوئی مجھے
ہر طرف عیش و عشرت کے سامان تھے
ہنستے اور کھیلتے دن گزرتے رہے
گلشنِ زندگانی کی ہر شاخ سے
پھول خوشیوں کے دامن میں چنتی تھی میں
نت نئے ریشمی خواب بنتی تھی میں

کتنا آباد گھر تھا ——— پریوار تھا
پیارے ماں باپ، مخلص بہن بھائی تھے
شوخ سکھیاں تھیں، معصوم احباب تھے
جن کے ہمراہ دالان میں بیٹھ کر
گڈے گڑیا کی شادی رچاتے تھے ہم
گیت بابل کے ڈھولک پہ گاتے تھے ہم
رفتہ رفتہ میں اک دن جواں ہوگئی
اور "نازو" سے "نزہت جہاں" ہوگئی

اور پھر ایک دن دور اک گاؤں میں
دھوم سے میری شادی رچادی گئی
سرخ جوڑے میں دلہن بنادی گئی
غم کی ڈولی میں لیتی ہوئی سسکیاں
اپنے گھر سے میں انور کے گھر آگئی
زندگی اک نئے موڑ پر آگئی

اب ہر سو اداسی ہے، تنہائی ہے
اب نہ ہمدم ہیں وہ اور نہ ہمراز ہیں
روح زخمی ہے ، احساس ہے مضمحل
دل فسردہ ہے اور آنکھ نمناک ہے
اپنی سسرال جس دن سے آئی ہوں میں
ایسا لگتا ہے جیسے پرائی ہوں میں

فیاض انور

مطبوعات شمع بک ڈپو، کھلونا بک ڈپو، بانو بک ڈپو اور مکتبہ دینیات

افسانہ لکھ رہی ہوں	خوشباش بی اے	۴ روپے
اندھیری راتیں	ریوتی سرن شرما	۵ روپے ۵۰ پیسے
اندھیرے	اختر عادل روپ	۲ روپے ۵۰ پیسے
آگ اور دھواں	م۔م۔ راجندر	۳ روپے
ایک پیار ایک دھوکا	رام سرن شرما	۵ روپے
ایک گدھے کی سرگزشت	کرشن چندر	۴ روپے ۵، پیسے
اچھی صورت بری نگاہ	ریاض ارشد	۲ روپے ۵، پیسے
آہٹ	ستیہ پال آنند	۵ روپے
اجالا	قیسی رام پوری	۹ روپے ۵۰ پیسے
برجیس	قیسی رام پوری	۶ روپے
بے غیرت	مضطر ہاشمی	۶ روپے
بہن	کرشن گوپال عابد	۷ روپے
چوٹ	دت بھارتی	۵ روپے ۵۰ پیسے
فریب مسلسل	شفیق بانو	۴ روپے
گناہ	دت بھارتی	۴ روپے
حاجی مراد	قیسی رام پوری	۶ روپے
ہزار راتیں	ش مظفر پوری	۷ روپے
ہزار داستان	فراق گورکھپوری	۳ روپے

شمع بک ڈپو آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱



عورت ہمالیہ کی چوٹی پر پہنچ گئی

ل سلطانہ

اقبال نے ہمالیہ کو ہندوستان کا سنتری اور پاسبان کہا ہے۔ ہمالیہ برف پوش پہاڑی کا ایک سلسلہ ہے جو پامیر سے شروع ہوتا ہے اور بھوٹان پر ختم ہوتا ہے۔ پامیر پاکستان اور روس کی سرحد پر واقع ہے۔ ہمالیہ کے سلسلۂ کوہ کی سب سے اونچی چوٹی ایورسٹ ہے۔ یہ چوٹی دنیا میں سب سے اُونچی ہے۔ اس کی اونچائی ۲۹ ہزار فٹ، یعنی تقریباً ۶ میل ہے۔ ہمالیہ کی چوٹیاں انسان کی ہمت کو ہمیشہ دعوت اور چیلنج دیتی رہی ہیں۔ پچھلے ۳۰ سال سے کوہ پیماؤں کی پارٹیاں ان بلندیوں کو سر کرنے کی کوشش کرتی رہی ہیں۔ ۱۹۵۳ میں ایورسٹ کی چوٹی کو پہلی بار سر کیا گیا۔ اس چوٹی کے سر کرنے والے سر ایڈ ہلری اور شیرپا تین سنگھ تھے۔

آج سے چند سال پیشتر کوہ پیمائی عورتوں کے لئے ناممکن سمجھی جاتی تھی۔ لیکن آج عورت اس میدان میں بھی مردوں کے دوش بدوش چل رہی ہے۔ ۱۴ جون ۱۹۷۷ کا دن کوہ پیمائی کی تاریخ میں ایک یادگار دن ہے۔ اس روز عورتوں کی ایک ٹیم نے کامت نامی چوٹی سر کرلی۔ اس چوٹی کی اونچائی ۲۵½ ہزار فٹ ہے۔ یہ کوہ پیما عورتوں کی پہلی مہم نہیں تھی، اس سے پہلے عورتوں کی تین ٹیمیں ہمالیہ کی مختلف چوٹیوں سے لوہا لے چکی ہیں تیسری ٹیم نے گذشتہ سال کامت پر چڑھائی کی تھی۔ اس ٹیم میں ہندوستان اور جاپان کی عورتیں شامل تھیں، مگر اس ٹیم کو موسم کی خرابی کے باعث ناکامی کا مونہہ دیکھنا پڑا اور کامت کی چوٹی سر ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اس ناکامی کے باوجود ان عورتوں نے ہمت نہ ہاری۔ اس سال انہوں نے پھر کامت پر چڑھائی کرنے کی ٹھانی۔ اس بار قسمت نے ان کا ساتھ دیا الغرض یہ چوٹی سر ہوگئی۔

یہ ٹیم چھ عورتوں پر مشتمل تھی۔ ان کے ساتھ دو شیرپا مزدور تھے۔ شیرپا مزدور کوہ پیمائی کا ایک اہم جزو ہوتے ہیں۔ یہ لوگ سکم اور نیپال کی سرحد کے قریب ایک گاؤں میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ بہت جفاکش اور محنتی ہوتے ہیں۔ یہ پیٹھ پر بھاری بوجھ اٹھا کر پہاڑوں پر چڑھتے ہیں۔ اس ٹیم کی لیڈر ڈاکٹر مینا اگروال تھیں۔ مینا اگروال گزشتہ سال کی جاپانی ٹیم میں بھی شامل تھیں۔ مینا اگروال کے علاوہ اس ٹیم کی بھارتی بینرجی، چندر پربھا ایتوال اور سترمنی برڈی بھی جاپانی ٹیم میں شامل تھیں۔ موجودہ ٹیم میں دو عورتوں کا اضافہ ہوا۔ ریکھا شرما جن کی عمر صرف ۱۸ سال ہے اس ٹیم کی سب سے کم عمر ممبر تھیں۔ چھٹی ممبر نجمہ ہمدانی اس ٹیم کی واحد شادی شدہ عورت تھیں۔ چند

اور بھارتی اسکول ٹیچر ہیں۔ بچھندری دفتر میں کام کرتی ہیں

کوہ پیما عورتوں کا یہ قافلہ ۱۵ مئی کو نئی دلی سے روانہ ہوا۔ دو روز بعد یہ لوگ جوشی مٹھ پہنچ گئے۔ جو ہردوار سے تقریباً سو میل دور ہے۔ یہاں بس کا سفر ختم ہوتا ہے۔ یہاں قلیوں کا انتظام کیا گیا۔ ۲۰ مئی کو یہ قافلہ ملاری پہنچ گیا۔ یہاں سے سخت چڑھائی شروع ہوگئی۔ ۲۴ مئی کو وسوندھرا تال میں کیمپ قائم کیا گیا۔ وسندھرا تال کی اونچائی ۱۴ ہزار فٹ ہے۔ کوہ پیما جب بلندیوں پر چڑھتے ہیں تو اپنا سامان لکا کھتے جاتے ہیں۔ یہ کوہ پیمائی کا اصول ہے۔ یہ کیمپ رات کو آرام کی غرض سے قائم کئے جاتے ہیں اور یوں ہی چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ کچھ کھانے پینے کی چیزیں بھی یہیں چھوڑ دی جاتی ہیں تاکہ واپسی میں یہ کیمپ تیار ملیں۔ اتنی اونچائی پر جہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا، چوری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اگلا کیمپ ۲۶ مئی کو لگایا گیا۔ گزشتہ سال جاپانی عورتوں کی ٹیم نے جس جگہ یہ کیمپ لگائے اسی جگہ ان عورتوں نے بھی کیمپ لگائے۔ کیمپ میں ہلکے پھلکے خیمے لگائے جاتے ہیں تاکہ سردی اور ہوا سے بچاؤ ہوسکے۔ فولڈنگ بستروں میں سویا جاتا ہے۔ کھانا گرم کرنے کے لئے چولہا سلگایا جاتا ہے۔

قسمت اس ٹیم پر مہربان تھی۔ پچھلے سال برف کے طوفان اور تیز تند ہواؤں کی وجہ سے یہ مہم ناکام ہوگئی تھی، لیکن اس سال موسم خوش گوار رہا۔ پہاڑوں پر ۱۲ ہزار فٹ کے گھاس اور درخت غائب ہو جاتے ہیں اتنی اونچائی پر کبھی کبھی ایک درخت ملتا ہے جسے برچ کہتے ہیں۔ زمانۂ قدیم میں اس درخت کی چھال پر کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ یہ چھال کبھی خراب نہیں ہوتی۔

دوسرا کیمپ ۳۱ مئی کو لگایا گیا۔ اب برف پوش پہاڑوں پر چڑھنا تھا۔ اتنی اونچائی پر ہوا بہت لطیف ہو جاتی ہے اور سانس لینا دوبھر ہو جاتا ہے۔ آہستہ چلنے سے بھی سانس پھول جاتا ہے۔ تیسرا کیمپ ۳ جون کو لگایا گیا۔ یہ ۱۷ ہزار فٹ کی بلندی پر تھا۔ چوتھا کیمپ ۶ جون کو قائم کیا گیا۔ چوتھے کیمپ کے بعد چڑھائی مشکل ہوگئی، ان عورتوں کے سامنے ایک برف پوش پہاڑ سینہ تانے کھڑا تھا۔ یہ کھڑی چڑھائی تھی جس پر چڑھنا بہت مشکل تھا۔ اس کام کے لئے رسّیوں کا استعمال کیا گیا۔ یہ کام بڑا خطرناک ہے۔ ذرا سی غلطی بھی جان لیوا ثابت ہوسکتی ہے۔ ایک عورت رسّی کو کمر سے لپیٹ کر پہاڑ پر چڑھی۔ پہلے کدال سے برف کو توڑا، اس پر اپنے پیر جمائے، برف کے سوراخ میں کیل گاڑی، اس کیل کے ساتھ لوہے کا حلقہ ہوتا ہے۔ اس میں سے رسّی گزاری جاتی ہے۔ اسی طرح کوہ پیما عورت نے کدال سے برف میں دوسرا سوراخ کرکے کیل گاڑی اور اسی طرح اوپر چڑھتی گئی۔ جب یہ عورت چوٹی پر پہنچ گئی تو باقی عورتیں بھی رسّی کی مدد سے اوپر پہنچ گئیں۔

کدال اور رسّیوں کی مدد سے چڑھنے کے لئے خاص تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہندوستان میں ایک ادارہ کوہ پیمائی کی تربیت دیتا ہے۔ یہ ادارہ دارجلنگ میں ہے ایورسٹ کے فاتح تین سنگھ اس کے ڈائریکٹر ہیں۔ چوتھے کیمپ سے پانچویں کیمپ تک پہنچنے کے لئے ۲ سو میٹر رسّی استعمال کی گئی۔ اس مہم میں سب سے زیادہ دشوار راستہ یہی تھا۔ اس کے بعد ان عورتوں کو کسی بڑی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ پانچواں کیمپ ۱۱ جون کو لگایا گیا۔ چوتھے کیمپ تک خوش گوار موسم نے ان کا ساتھ دیا۔ دھوپ اور کھلا آسمان ان کے سر پر تھا۔ ۶ جون کے بعد موسم تبدیل ہوگیا۔ تیز ہوائیں چلنا شروع ہوگئیں اور برفباری ہونے لگی۔ حدِ نظر تک برف ہی برف تھی رات کو برفیلی ہوائیں جسم میں گھس جاتی تھیں۔ برف کے اس لق و دق میدان میں یہ چھ عورتیں آبادی سے سینکڑوں میل دور کامت کی چوٹی فتح کرنے کے خواب دیکھ رہی تھیں۔ پانچویں کیمپ میں نجمہ ہمدانی کو ایک حادثہ پیش آگیا۔ ان کے پاؤں میں موچ آگئی۔ انہیں ایک ساتھی کے ساتھ پانچویں کیمپ میں چھوڑ دیا گیا۔

چھٹا کیمپ ۱۳ جون کو لگایا گیا۔ یہ آخری کیمپ تھا۔ کامت کی چوٹی کوہ پیما عورتوں کی نظروں کے سامنے تھی۔ دوسرے دن انہیں اپنی منزل کی طرف بڑھنا تھا۔ یہاں فیصلہ کیا گیا کہ صرف تین عورتیں آخری مہم میں شامل ہوں گی۔ یہ تین عورتیں بچھندری برڈی، بھارتی بنرجی اور چندر پربھا ایتوال تھیں۔ کوہ پیمائی میں انفرادیت کو ختم کرنا ہوتا ہے۔ فتح کا سہرا پوری ٹیم کے سر ہوتا ہے، اگر پوری ٹیم چوٹی کو سر نہیں کرسکتی۔ آخری مہم میں دو تین انسان ہی جاسکتے ہیں۔ ان کا انتخاب ٹیم کا لیڈر کرتا ہے۔ اس ٹیم کی لیڈر ڈاکٹر مینا اگروال تھیں وہ چوٹی پر نہیں گئیں۔ ریکھا شرما کم عمر تھیں انہیں

کوہ پیمائی کا زیادہ تجربہ نہیں تھا۔ بچنہ کے پاؤں میں موچ آگئی تھی۔ اس لیے یہ دونوں آخری مہم میں شامل نہیں ہوسکیں۔

۱۴ جون کو ۶ بجے تینوں عورتیں آخری کیمپ سے روانہ ہوگئیں۔ انہیں شام تک واپس آنا تھا۔ اب کسی کیمپ لگانے کا سوال نہیں تھا۔ اس دن موسم بڑا ایک خوش گوار ہوگیا۔ برف باری بند ہوگئی۔ آسمان کھل گیا دھوپ نکل آئی۔ تازہ برف پر چلنا بہت مشکل تھا۔ یہ عورتیں چلتے چلتے گھٹنوں تک برف میں دھنس جاتی تھیں۔ انہوں نے کریمپون پہن رکھے تھے (کریمپون وہ جوتے ہوتے ہیں جن میں کیلیں جڑی ہوتی ہیں۔ ان جوتوں کی مدد سے برف پر چلنا آسان ہوجاتا ہے۔ یہ جوتے برف میں نہیں دھنستے) ان بھاری جوتوں کے علاوہ کوہ پیماؤں آکسیجن کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ ان عورتوں کے پاس آکسیجن گیس کے سلنڈر تھے، جو ان کی پیٹھ پر بندھے تھے۔ یہ ایک حیرت انگیز بات ہے کہ ۲۵ ہزار فٹ کی بلندی پر بھی ان عورتوں کو آکسیجن کی ضرورت نہیں پڑی۔ مرد کوہ پیما اس سے کم بلندی پر ہی آکسیجن کے استعمال پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان عورتوں کے گیس کے سلنڈر ایک دفعہ بھی کام نہ آسکے۔

ان باہمت عورتوں کی آخری منزل بہت کٹھن تھی۔ ہر دس قدم کے بعد انہیں سانس کو ہموار کرنے کے لیے رکنا پڑتا۔ ابھی انہوں نے آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ برف باری شروع ہوگئی۔ برف باری کی وجہ سے اندھیرا ہوگیا۔ لیکن ان عورتوں نے ہمت نہ ہاری۔ منزلِ مقصود ان کے سامنے تھی اور ان کی ہمت کو دعوت دے رہی تھی۔ آخر جیت ان عورتوں کے ہاتھ رہی۔ سہ پہر کو تین بجے وہ کامت کی چوٹی پر پہنچ گئیں۔ ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ موسم بھی ان کی کامیابی کے ساتھ خوش گوار ہوگیا۔ کامت کی چوٹی سے انہیں تبت کی پہاڑیاں صاف نظر آرہی تھیں۔ انہوں نے وہاں دو جھنڈے نصب کیے۔ ایک ہندوستان کا ترنگا تھا۔ اور دوسرا کوہ پیمائی کے ادارے کا جھنڈا۔ ان کے ساتھ صرف ایک شیرپا مزدور تھا۔ اس نے بھی ایک رسی کا پرچم بنا کر لہرایا۔ یہ عورتیں دو منٹ تک کامت کی چوٹی پر رہیں۔ انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اور ساڑھے تین بجے کے قریب واپس چلنے کی تیاریاں شروع کردیں۔

پہاڑوں پر چڑھنا اترنے کے مقابلے میں کچھ آسان ہوتا ہے۔ اترتے وقت برف میں پھسلنے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ ان عورتوں کو بھی اترتے وقت کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ آسمان پر کہر چھا گئی تھی۔ انہیں محسوس ہوا کہ وہ راستہ بھول گئی ہیں۔ لیکن ان کا اندیشہ بے بنیاد ثابت ہوا۔ ابھی وہ آپس میں اس خدشے کا اظہار کر رہی تھیں کہ انہیں نچلے کیمپ سے شور وغل کی آوازیں سنائی دیں۔ کیمپ کی عورتوں نے انہیں اترتے دیکھ لیا تھا۔ وہ انہیں واپس آتے دیکھ کر خوشی سے نعرے لگانے لگیں۔ اس شور وغل نے کوہ پیمائی عورتوں کی رہ نمائی کی۔ انہیں اطمینان ہوگیا کہ وہ صحیح راستے پر ہیں۔ شام کے سات بجے یہ عورتیں کیمپ میں پہنچ گئیں۔ جب انہوں نے اپنی ساتھیوں کو فتح کی خوش خبری سنائی تو عورتوں کے دل خوشی سے جھوم اٹھے۔ سب نے سامان باندھا اور واپس چلنے کے لیے کیمپ اٹھالیا۔

جب یہ ٹیم پہلے کیمپ میں پہنچ گئی تو یہاں ان کے لیے ایک اور خوش خبری منتظر تھی۔ پچھلے سال جاپانی عورتوں کی ٹیم کامت کی مہم ہار گئی تھی، اس سال ان کی آنکھیں اس ٹیم کی کارگزاری پر لگی ہوئی تھیں جیسے ہی انہیں معلوم ہوا کہ ہندوستانی عورتوں کی ٹیم کامیاب ہوگئی ہے، انہوں نے اس ٹیم کے لیے مٹھائی کا تحفہ بھیجا۔ یہ تحفہ گو اس ٹیم کو دیر سے ملا مگر اس تحفے سے ان کی خوشی دوبالا ہوگئی۔

شاید وہ دن دور نہیں جب دنیا کی سب سے اونچی چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ بھی عورتوں کے قدموں کے نیچے ہوگی۔ مسز میرین نے ۱۹۸۲ میں ایورسٹ کو سر کرنے کی مہم کے لیے نیپال سرکار کو درخواست بھی بھیج دی ہے ۱۹۸۲ کی ٹیم عورتوں پر مشتمل ہوگی۔ اگر یہ خالص عورتوں کی ٹیم نہ بن سکی تو مردوں اور عورتوں کی مخلوط ٹیم بن جائے گی۔ ایورسٹ پر چڑھنے کے لیے حکومت نیپال کی اجازت حاصل کرنا ضروری ہے۔ ایورسٹ نیپال میں واقع ہے۔ نیپال کی حکومت درخواست پر غور کرکے فیصلہ دیتی ہے۔ بعض حالات میں یہ اجازت نہیں ملتی۔ کوہ پیمائی کی اجازت کے لیے کئی سال پہلے درخواست بھیجنی پڑتی ہے اگر حکومت کو یہ معلوم ہو جائے کہ ٹیم کے پاس کھانے پینے کا سامان ناکافی ہے یا مزدوروں کی کمی ہے۔ یا ٹیم ناتجربہ کار کوہ پیماؤں پر مشتمل ہے تو ایورسٹ پر چڑھنے کی درخواست نامنظور کردی جاتی

سب کی طرح



محمد خورشید سحر

"کتنا شریف اور ہونہار لڑکا ہے"

"خوب گورا چٹا ہے"

"ہاں بہن خدا نے ہماری سن لی۔ انشورنس کمپنی میں ہیڈ کلرک ہے"

"ارے!" دوسری عورتیں تعجب کا اظہار کرتیں "سنا ہے، سگریٹ تک نہیں پیتا"

امّی فخریہ انداز میں سینہ پھلا کر کہتیں۔

"ہزاروں میں ایک ہے۔ شریف النفس، ہونہار۔ تم سگریٹ کی پوچھتی ہو وہ تو پان بھی نہیں کھاتا"

"سینما آج کل کے لڑکوں کی بہت بڑی لت ہے" پڑوس کی دادی امّاں بات کو آگے بڑھاتیں۔

"بالکل نہیں دیکھتا امّاں" میری امّی گردن ہلا دیتیں "کسی سے دوستی نہ دشمنی۔ بالکل فرشتہ ہے"

یہ بات تو طے تھی کہ اس فرشتے سے سلمیٰ کی نسبت طے کی گئی تھی اور اسی سلسلے میں یہ ساری قصیدہ خوانی ہوتی تھی۔ ان ساری باتوں کو سن کر مجھے ایک طرح کی کد سی ہوگئی۔ نہ معلوم کیوں مجھے یہ باتیں غیر فطری سی معلوم ہوتیں۔ ایسا شخص، جس کے دل میں اچھا برا کوئی جذبہ نہیں ہوتا اس کے دل میں محبت بھی نہیں ہوتی، کیوں کہ محبت بجائے خود نفرت کی محرک ہوتی ہے ایک ایسا انسان جس کے سینے میں کبھی آرزوؤں کے نغمے نہیں ابھرتے جس کو دوستی کی خوشبو کبھی چھو کر نہیں گزرتی انسان کب ہوتا ہے؟ انسان تو وہ ہے، آرزوئیں جس کا پیچھا بدروحوں کی طرح کریں، یہاں تک کہ قبر تک بھی پیچھا نہ چھوڑیں، ہر طرح کے احساسات سے عاری انسان سے زیادہ غریب بھلا دنیا میں کون ہوگا؟ شاید اسی لئے اس رشتے سے میں کچھ دل برداشتہ سا تھا۔ امّی نے جب اس رشتہ کے بارے میں رائے طلب کرنے کی غرض سے مجھے بلوایا تو اس وقت میں سلمیٰ کے کمرے میں تھا۔ سلمیٰ پرغرور انداز میں چلتے ہوئے میرے قریب آئی۔

"بھائی جان" سلمیٰ نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ "میں اس ولی اللہ کا تذکرہ سنتے سنتے تنگ آگئی ہوں"

لفظ 'ولی اللہ' سن کر مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ مگر سلمیٰ کی صورت دیکھ کر خاموش ہوگیا۔

چند لمحے کے بعد میں نے کہا "گھومنے چلو گی؟"

"نہیں"

"سینما؟"

"بھائی جان!" سلمیٰ نے فریاد بھرے لہجے میں کہا اور میں بالکل خاموش ہوگیا۔ جانے درد کی کتنی گھڑیاں گزر گئیں، کیونکہ سلمیٰ وہی سوچتی تھی جو میں سوچتا تھا یہی وجہ تھی کہ میں امّی کے کمرے میں جانے کی بجائے باہر نکل آیا۔

میرے ذہن میں آندھی سی چل رہی تھی میں کیا کروں؟ اگر میں یہ رشتہ ناپسند کروں تو ظاہر ہے رشتے آج کل کے زمانے میں آسمان سے نہیں برستے۔ اگر سلمیٰ تعلیم یافتہ نہ ہوتی تو جاہل لڑکیوں کی طرح سلمیٰ کو اس 'ولی اللہ' کے پلّے باندھنے میں شاید مجھے کوئی عذر نہ ہوتا۔ مگر اب کیا ہو؟ نہ جانے کیوں جب بھی میں سلمیٰ کے ہونے والے شوہر کا تصور کرتا تو ایک احمق انسان کی تصویر ذہن میں ابھرتی۔ اپنے دل ہی دل میں سلمیٰ کا اور اس کا موازنہ کرتا اور کڑھتا۔ تصور میں دیکھتا کہ سلمیٰ کے پیروں میں زنجیریں ہیں، وہی فرسودہ جہالت کی زنجیریں، جو ٹوٹ رہی ہیں، ٹوٹ چکی ہیں، ایسی زنجیریں جنہوں نے عورتوں کو چاند ستاروں سے محروم کر رکھا ہے۔ صبح کیسے ہوتی ہے؟ دن اور رات کب گلے ملتے ہیں؟ ہواؤں کی وہ موسیقی کیسی ہوتی ہے، جب وہ شگوفوں کے بیچ میں سے ہوکر گزرتی ہے؟ شہروں کی چہل پہل کیا ہے؟ دریا کی روانی میں سبک روی کہاں سے آتی ہے صبا کلیوں کو کیسے گدگداتی ہیں؟ بچے اسکول میں کیسے بستہ لئے جاتے ہیں؟ ان کی مسکراہٹ کس طرح لوگوں کے دلوں

پیدا کرتی ہے۔ زنجیروں میں بندھی ہوئی عورتیں ان ساری مسرتوں سے محروم ہو جاتی ہیں۔ آہ وہ زنجیریں جنھوں نے عورتوں کی آنکھیں چھین لی ہیں آج یہ دیکھ کر کس قدر جی نہال ہوتا ہے کہ وہ زنجیریں پگھل رہی ہیں، ٹوٹ رہی ہیں نئی قدروں کے لئے نئے سماج کی تشکیل کی خاطر۔ مگر سلمیٰ کے نصیب میں کیا ہے؟

دو تین گھنٹے کی آوارہ گردی کے بعد میں نے لائف انشورنس کمپنی کے فرشتہ صفت ہیڈ کلرک کو جا ہی لیا۔ میں نے اس راز کو چھپائے رکھا کہ میں سلمیٰ کا بھائی ہوں۔

پہلی ملاقات تھی، اس لئے تکلف کی دیوار کافی اونچی رہی۔ واپسی پر امی نے سخت باز پرس کی: "نالائق! گھر کا بڑا لڑکا ہے، دو ماہ بعد شادی ہونے والی ہے، لیکن مونہہ سے کچھ نہیں پھوٹتا۔"

"کیا کہوں؟" میں نے معصومیت سے کہا۔

امی آبدیدہ ہو گئیں: "نگوڑا، تو ہمیشہ لا تعلق رہا ہے۔ ایک ہی تو بہن ہے اور تو اس سے مونہہ چھپائے پھر رہا ہے۔ ذرا چھان بین کر لڑکے میں کوئی عیب تو نہیں۔ یوں تو سبھی اس کی تعریفیں کرتے ہیں، لیکن تو بھی کچھ بھال لے۔ لڑکی کی زندگی کا سوال ہے۔"

"آپ خود ہی تو کہتی ہیں کہ سگریٹ تک نہیں پیتا!" میں نے مسکرا کر کہا۔

"ارے یہ تو لڑکے والوں کا کہنا ہے۔ تیرا فرض ہے کہ تحقیق کرے۔ تیرے ابا تو..." آنکھوں میں پھر نمی سی آنے لگی۔

"اچھی بات ہے امی۔" میں نے انھیں تسلی دی۔ "دو روز کے بعد آپ کو باخبر کر دوں گا۔"

دوسری ملاقات میں تکلف کی دیوار نیچی ہو گئی۔

تیسری ملاقات میں اُس نے تکلف کی دیوار کو بالکل مسمار کر دیا۔

جب ہم آفس سے نکلنے کو تھے تو اُس نے اپنی اسٹینو گرافر کو بلا کر کہا: "مس رتنا، کل سے آپ اتنا میک اپ کر کے نہ آیا کیجئے۔"

"کیوں؟" اسٹینو گرافر ہکا بکا رہ گئی۔

"اس لئے کہ لائف انشورنس کمپنی کے دفتر کی جگہ کوئی آپ کو شوکیس میں بند نہ کر دے۔"

"اوہ! یو ناٹی!" اسٹینو گرافر لچکتی ہوئی چلی گئی۔

"دیکھو،" اُس نے ٹھنڈی سانس لی۔ "کیا زمانہ آگیا ہے!"

"سینما چلو گے؟" میں نے اسے شہ دی۔

"بھائی میں تو ہفتے میں ایک بار سینما ضرور دیکھتا ہوں۔"

"بیوی کے ساتھ؟"

"ایسی قسمت کہاں؟" اُس نے ٹھنڈی سانس لی۔

"بیوی بد مزاج ہے؟"

"کہہ نہیں سکتا۔"

"کیا مطلب؟"

"ابھی شادی ہوئی نہیں ہے ہونے والی ہے۔ اللہ جانے، وہ گانے سینما دیکھتی بھی ہے یا نہیں۔ ارے، اُس کا ذکر چھوڑو۔ اُف مس رتنا کا میک اپ! ارے باپ رے!"

اُس کا اداکارانہ انداز مجھے پسند آیا۔ میں نے از راہ ہمدردی سگریٹ اُس کی طرف بڑھایا، جسے منظر نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا۔ میں نے کہا: "بھئی تم بے حد غمگین معلوم ہوتے ہو، چلو ایک ایک پیگ...."

"اچھی چیز نہیں ہے۔" اُس نے بُرا سا مونہہ بنایا۔ "ایک بار یاروں کے زور دینے پر چکھی تھی۔ آج! جانے لوگ کیسے پی لیتے ہیں۔ ہاں سگریٹ کی حد تک گناہ کر لینے میں مضائقہ نہیں۔"

"یار میں نے تو سُنا تھا تم سگریٹ، پان، سینما ان ساری واہیات چیزوں سے نفرت کرتے ہو۔"

"یہ ساری چیزیں واہیات ہیں؟" اس نے آنکھیں نکالیں۔

"امی تو یہی کہتی ہیں۔"

"امی؟"

"ہاں بھئی تمہاری نوشس دامن محترمہ۔"

"آپ؟" وہ ایک کالج کی طالبہ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

"تمہاری ساس کا چشم و چراغ۔"

"یعنی آپ...." وہ بوکھلا گیا۔ "معاف کیجئے گا ــــ دراصل ــــ دیکھئے ــــ"

"سارا بھانڈ پھوٹ گیا تمہارا۔" میں نے ذرا غصے میں کہا۔

کچھ دیر بعد ہنستے ہوئے میں امی سے کہہ رہا تھا: "امی، بیچارہ بہت ہی پیارا انسان ہے بالکل میری طرح اور سب کی طرح مکمل انسان" یہ کہتے ہوئے میں نے کنکھیوں سے سلمیٰ کو دیکھا جس کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ رقصاں تھی۔



ٹافی

شمیم عالم مصحفی

میں جیسے ہی سڑک پار کر کے سامنے کی گلی میں داخل ہوا، پیچھے سے کسی نے میرے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی پکڑ لی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک چار سال کی چھوٹی گڑیا سی خوب صورت بچی اپنی چھوٹی چھوٹی مخروطی انگلیوں سے میری انگلی پکڑے کھڑی تھی۔ میں نے بہت ہی پیار سے پوچھا "کیا بات ہے بیٹی؟"

"انکل! مجھے دس پیسے ٹافی کے لئے دو نا"

بچی کی توتلی زبان سے یہ بات سن کر میرے وجود پر بجلی سی گر پڑی۔ اس کے والدین پر مجھے بے حد غصہ آیا مگر پھر جب میں نے بچی پر نگاہ ڈالی تو اس کا معصوم چہرہ دیکھ کر میرا غصہ کافور ہو گیا اور مجھے اس پر پیار آ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا "بیٹی، تمہارا نام کیا ہے؟"

"پنکی"

"اچھا! بڑا خوب صورت نام ہے، پنکی بیٹی! یہ تو بتاؤ تمہارے ڈیڈی کیا کرتے ہیں؟"

"ممی کہتی ہیں، ڈیڈی سات سمندر پار پریوں کے بازار سے میرے لئے کھلونے لانے گئے ہیں"

"اور تمہاری ممی ــــــ؟"

"ممی دفتر میں کام کرتی ہیں۔ مگر انکل، مجھے ٹافی کے لئے دس پیسے دو نا"

"دس ہی کیوں بیٹی! چلو میں تمہارے لئے ٹافی کا پورا ڈبا خریدے دیتا ہوں"

اور جب میں نے پاس کی دکان سے ٹافی کا ڈبا خرید کر اس کے ہاتھوں میں دیا تو وہ دوڑتی ہوئی سامنے کی گلی میں داخل ہو گئی اور اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میں نے پنکی کو ٹافی کا ڈبا دے کر کتنی بڑی غلطی کی ہے حالانکہ مجھے بچوں کو ٹافی دیتے بہت انتہا خوشی ہوتی ہے، مگر اس وقت مجھے ایسا ہوا جیسے مجھ سے ایک بہت بڑا گناہ سرزد ہو

مجھے پنکی کو ٹانی ہرگز نہیں دینا تھی آج اس نے مجھ سے مانگی، ہوسکتا ہے کل کسی اور کے آگے اپنا ننھا سا ہاتھ پھیلائے اور پرسوں . . . . اس سے آگے سوچنے کے لئے میرا ذہن انکار کر رہا تھا میں بھاری بھاری قدموں سے چلتا ہوا گھر کی جانب چل پڑا۔

دوسرے دن دفتر جاتے وقت جب میں نے سڑک پار کی تو اس جگہ پر پنکی کو نہ دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی دفتر میں دن بھر سر جھکائے مشین کی طرح کام میں جٹا رہا۔ شام کو جیسے ہی دفتر سے باہر نکلا، کسی کی شیریں اور مترنم آواز سن کر کانوں میں گھنٹیاں سی بج اٹھیں۔

"ہلو جلیس"

"ارے شیریں، تم!"

"جناب کا انتظار بڑی دیر سے کر رہی ہوں"

"کیوں خیریت تو ہے؟ اور ہاں آج تم دفتر کیوں نہیں آئیں؟"

"سسرال سے چھوٹی بہن فرحت آ دھمکی اس لئے دفتر آنا ملتوی کر دیا۔ کل درخواست پیش کر دوں گی"

"اچھا آؤ پہلے کیفے میں گرما گرم کافی پئیں۔ پھر باتیں ہوں گی، کیوں کہ آج سردی کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی ہے"

جب میں اور شیریں کیفے کی چھوٹی سی کیبن میں بیٹھ کر کافی کی ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگے تو اچانک مجھے کل والی بات یاد آگئی۔ میں نے شیریں سے کہا۔ شیریں "کل میرے ساتھ کچھ اس قسم کے حالات پیش آئے ہیں جنہیں سن کر تمہیں بھی افسوس ہوگا۔ صبح کو دفتر آتے وقت جب میں سڑک پار کر کے گلی میں داخل ہو رہا تھا تو اچانک ایک چھوٹی سی خوب صورت بچی نے اپنی ننھی ننھی انگلیوں سے میری انگلی پکڑ لی اور مجھ سے دس پیسے ٹانی کے لئے مانگنے لگی۔ میری ہمدردی کے سوتے پھوٹ پڑے اور میں نے اسے ٹانی کا پورا ڈبا خرید دیا۔ مگر کیا بتاؤں شیریں، میں اس وقت سے اپنے آپ کو کتنا بڑا گناہ گار سمجھ رہا ہوں۔ میرا ضمیر مجھے بار بار ملامت کر رہا ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں دنیا کا سب سے بڑا مجرم ہوں لیکن شیریں، تم خود سوچو، اس کا مجرم صرف میں ہی تو نہیں۔ اس میں اس کے والدین بھی برابر کے شریک ہیں۔ والدین کی بے پروائی اور بے توجہی کے شکار نہ جانے ایسے کتنے بچے روز ہوتے ہوں گے۔ میں پوچھتا ہوں۔ اگر وہ بچوں کی پرورش صحیح طریقے سے نہیں کر سکتے تو بچے کی تمنا ہی کیوں کرتے ہیں؟ لعنت ہے ایسے والدین پر جو معصوم بچوں کی زندگی سے کھیلتے ہیں اور انہیں "سنہرے کل" کی روشنی عطا کرنے کی بجائے تاریکی اور جہالت کی گہری کھائی میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں"

"جلیس، خدا کے لئے اب چپ ہو جاؤ، مجھ غریب پر رحم کرو۔ میں اب اور کچھ نہیں سن سکتی کیوں کہ وہ معصوم بچی کوئی اور نہیں، میری اپنی ہی بچی تھی"

یہ کہہ کر شیریں سسکیاں لیتی ہوئی کیبن سے باہر نکل گئی، اور میں اپنی جگہ پتھر کا بت بنا کیبن کے پردے کو ہلتا ہوا دیکھتا رہا۔

فیشن

روز و شب، بڑھتا فیشن
جسم پہ لٹکا پیراہن
قدم قدم گھٹتا جائے
کیا کیا رُوپ بنائے
غیرتِ انساں، شرما جائے

آنکھوں سے پہلے پردہ اُٹھا تھا
لیکن اب تو
عُریاں سارے جسم ہوئے ہیں
میکسی، لُنگی اور شرارے
جنز اور بیل باٹم

مردوں کے ڈھب
عورت سے بدتر
جانے کیا ہوگا ؟
فرق بڑا ہی مشکل ہے
دونوں میں
بال ہیں دونوں کے شانوں پر بکھرے
اب چوٹی بھی گوندھی جائے گی
بڑھتا چلا ہے فیشن کا یہ زور
میرے وطن کے اُجلے پن پر
چھا جائے نہ تیرہ شبی کا دَور

نجم السحر سمیع



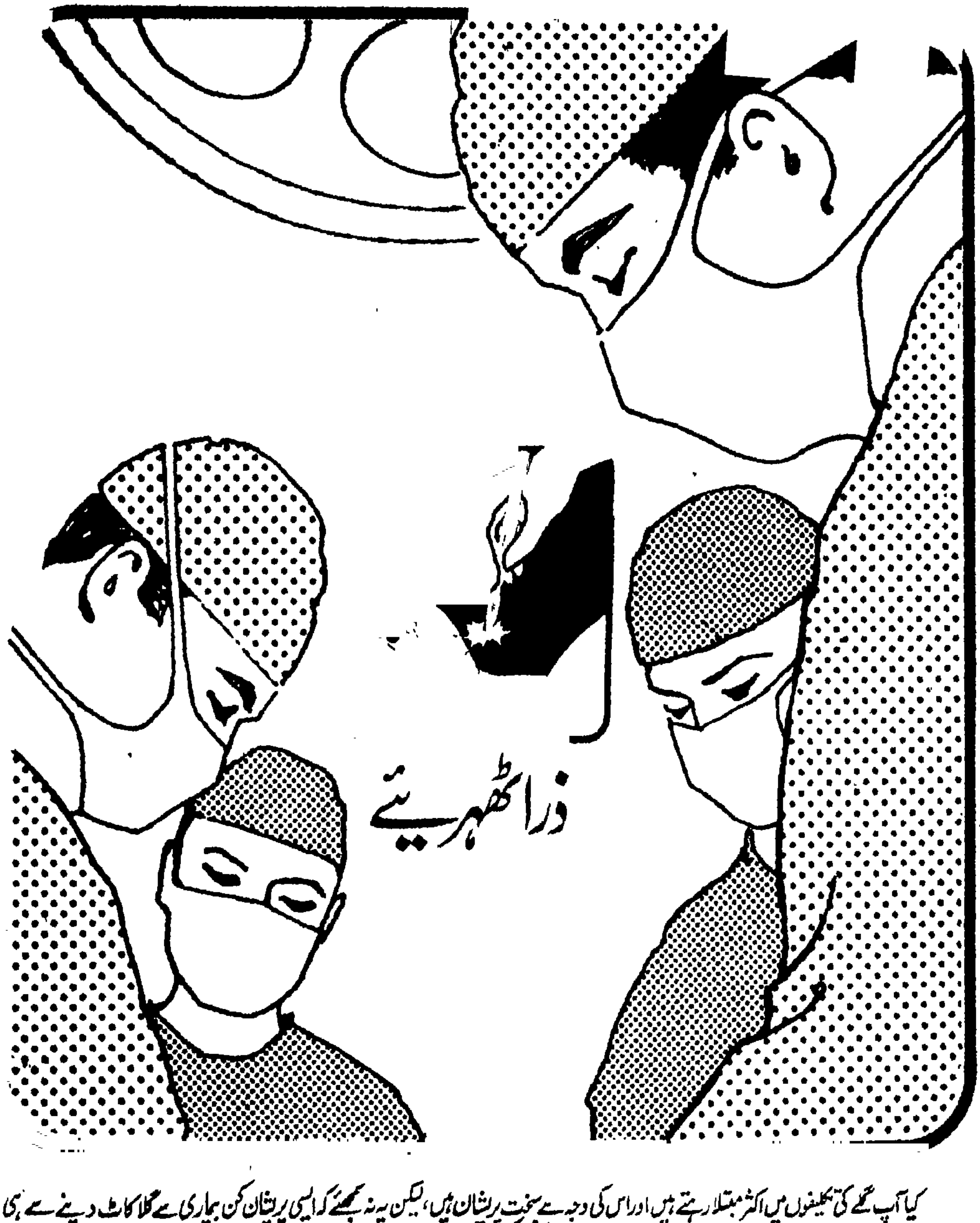
انتظار کی قید

میرے پریتم
بیٹھی ہوں میں
من کی سُونی پگڈنڈی پر
سانجھ کال سے
آشا دیپ جلائے

سمے کا پنچھی اُڑتا جائے
رات کا آنچل سمٹا جائے
چندا ڈھلتا جائے

آنے والے
ساگر جیسے
دل میں ڈوب نہ جائیں
آشاؤں کے سائے

و۔ ن۔ سیما



کیا آپ گلے کی تکلیفوں میں اکثر مبتلا رہتے ہیں اور اس کی وجہ سے سخت پریشان ہیں، لیکن یہ نہ سمجھئے کہ ایسی پریشان کن بیماری سے گلا کاٹ دینے سے ہی چھٹکارہ مل سکتا ہے۔ ذرا ٹھہریئے! خالص دیسی ادویات سے تیار کیا ہوا "ٹونسیلیکس" ایک بار، صرف ایک بار استعمال کر کے تو دیکھئے، پھر آپ کو گلے کے غدود بڑھ جانے کی سرسراہٹ، خراش، گلے کے ورم، زخم اور دوسرے تمام امراض کی شکایت نہیں رہے گی۔ اگر آپ کے علم میں کوئی ایسا مریض ہو جس کے گلے کے غدود (ٹانسلائٹس) اپریشن ہونا ہے تو اُسے اس دوا کے بارے میں ضرور بتایئے گا کیوں کہ پھر اُسے آپریشن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ چھوٹے بچے جو کھٹی میٹھی چیزیں کھا کر گلا خراب کر لیتے ہیں اُن کے لئے بھی یہ بہت کام کی دوا ہے۔ ہر گھر میں اس کا رہنا بہت ہی ضروری ہے۔ قیمت: پانچ روپے ـــــ شیخ (یونانی اینڈ آیورویدک) لیباریٹریز، لال کنواں، دہلی ٦



محبت کرنے والوں کی قسمیں

ایم۔ ناصر

مشرقی ممالک میں محبّت کی شادی کا رواج نہیں۔ مغربی ممالک میں بغیر دیکھے شادی کرنا ایک عجوبہ سمجھا جاتا ہے۔ اب ہمارے ملک میں بھی پرانی روایات آہستہ آہستہ ٹوٹ رہی ہیں۔۔ مغرب میں شادی محبت کا نتیجہ ہوتی ہے، اور مشرق میں محبت شادی کا۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں۔ شادی کے لئے ہر انسان کا ایک آئیڈیل ہوتا ہے۔۔ کچھ عورتیں مردوں میں وجاہت تلاش کرتی ہیں، کچھ خوش پوشی کو پسند کرتی ہیں۔ تعلیم یافتہ اور برسر روزگار ہونا تو خیر بنیادی شرائط ہیں۔ ہر انسان شادی کے لئے دوسرے فریق کا خوب صورت ہونا لازم قرار دیتا ہے۔ خوب صورتی ذوق پر منحصر ہے اس پر تمام انسانوں کا اتفاق نہیں ہو سکتا۔ ایک انسان دوسرے کو خوب صورت قرار دیتا ہے۔ دوسرا اسے واجبی شکل کا ٹھیراتا ہے۔ ہر انسان کا معیار جدا ہے۔ خوب صورتی کی تمام شرطیں ایک انسان میں پوری ہونا مشکل ہیں، اس لئے سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔

مثلاً ایک انسان چاہتا ہے کہ اس کا محبوب گورے رنگ کا ہو، اس کے بال گھونگھریالے ہوں، اس کا قد لمبا ہو، وہ خوش پوش اور خوش گفتار ہو یہ شرائط تعداد میں پانچ ہیں۔ یہ سب ایک انسان میں ملنا مشکل ہیں۔ اگر وہ لمبا ہے تو اس کے بال سیدھے ہیں۔ اگر بال گھونگھریالے ہیں تو رنگ کالا ہے اگر رنگ گورا ہے تو اسے کپڑے پہننے کا سلیقہ نہیں۔ غرض پانچوں چیزیں ایک ساتھ ملنا دشوار

تین حساب کے ماہرین نے اندازہ لگایا ہے کہ کسی بھی پانچ شخصوں کے ایک انسان میں جمع ہونے کا امکان ایک لاکھ میں ایک ہے۔ یہ اندازہ خاصا حوصلہ شکن ہے۔ ایک لاکھ انسانوں میں اپنا محبوب تلاش کرنے کے لئے عمرِ خضر درکار ہے۔ سمجھوتے کے لئے تین شرائط کا پورا ہونا کافی ہے اس کے لئے انسان کو فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ کن شرائط کو دوسروں پر فوقیت دے گا۔

انسان دوسرے فریق کا انتخاب خود کرے یا والدین کو اختیار دے، اس کی محبت اس کی فطرت کے تابع ہوتی ہے۔ ماہرینِ نفسیات نے محبت کرنے والوں کی چار قسمیں دریافت کی ہیں یہ تقسیم ماہرین کے سالہا سال کے تجربے اور مشاہدے کا نتیجہ ہے۔ محبت کی چاروں قسمیں یہ ہیں، ذہنی عقلی، نفسانی اور دیواتی۔ اس تجزیہ کا اطلاق عورتوں پر ہوتا ہے۔

ذہنی

ذہنی محبت کرنے والا اپنے آئیڈیل کی کھوج میں رہتا ہے۔ اس کے ذہن میں اپنی محبوبہ کا خاکہ موجود ہوتا ہے۔ یہ انسان ہجوم میں بھی اپنے آئیڈیل کو پہچان لیتا ہے۔ پہلی نظر کا تیر عموماً ایسے ہی لوگوں کا شکار کرتا ہے۔ ذہنی محبت کرنے والا اگر پہلی جھلک کے بعد اپنی محبوبہ کے قریب نہ آسکے تو کوئی مضائقہ نہیں — کوئی جلدی نہیں ہوتی۔ یہ انتظار کر سکتا ہے۔ یہ انسان تصویرِ یار کو دل کے آئینے میں چھپائے پھرتا ہے۔ یہ موقع کی تلاش میں رہتا ہے اور جب موقعہ ملتا ہے تو اس کے جذبات میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ محبوب کا سامنا کرتے ہی اس کی انتڑیوں میں بل پڑنے لگتے ہیں دم سکڑنے لگتا ہے، سانس تیز چلنے لگتا ہے دل کی دھڑکن کی رفتار بڑھ جاتی ہے۔

ذہنی محبت کرنے والے کی محبت کا معیار ذرا اونچا ہوتا ہے۔ معیار جتنا اونچا ہوگا اس کا ملنا اتنا ہی مشکل ہوگا۔ اسے ہر بات کا دھیان رہتا ہے۔ اس کی محبوبہ کون سی خوشبو استعمال کرتی ہے۔ اس کا جسم کتنا متناسب ہے اس کی جلد کیسی ہے۔ اسے جسمانی خوب صورتی کا ہی خیال نہیں رہتا وہ چاہتا ہے کہ اس کی محبوبہ اچھی صلاحیتوں کی مالک بھی ہو۔ اسے یقین ہوتا ہے کہ اس کی محبوبہ نہ صرف خوب صورت ہے بلکہ خوب سیرت بھی ہے۔ اس کے اس یقین کو عموماً ٹھیس لگتی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ وہ محبوب کے عیب کو عیاں نہیں ہونے دیتی۔ ذہنی محبت کرنے والوں کے بارے میں یہ مثل صادق نہیں آتی۔ یہ لوگ معمولی سے معمولی عیب کو بھی تاڑ لیتے ہیں۔

مثلاً ایک خوب صورت جسم میں ٹانگیں ٹیڑھی ہیں یا ایک خوب صورت چہرے پر ناک ذرا لمبی ہے یا ٹھوڑی کم زور ہے تو محبت کی وجہ سے ذہنی محبت کرنے والا ان عیبوں کو نظر انداز نہیں کرتا۔ اسے زندگی بھر ان عیبوں کا احساس رہتا ہے

ذہنی محبت کرنے والا اپنی زندگی سے مطمئن ہوتا ہے۔ اس کا حلقۂ احباب محدود ہوتا ہے۔ وہ چند گنے چنے دوستوں کو ہی پسند کرتا ہے اسے اپنے کام میں دل چسپی ہوتی ہے۔ وہ اپنے کارناموں پر فخر محسوس کرتا ہے اس کا بچپن خوش گوار گذرتا ہے وہ گناہ اور ملامت کے احساس کا شکار نہیں ہوتا اگر اس کی محبوبہ دور ہو تو وہ خط و کتابت سے محبت کو استوار رکھتا ہے۔ اپنے آئیڈیل کے ملنے کے بعد وہ جلد سے جلد شادی کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے لیکن بے تاب نہیں ہوتا۔ اس کی محبت میں ایک ٹھیراؤ ہوتا ہے۔ اس کی محبت انسانی زندگی کی طرح ہوتی ہے وہ ایک بچے کی طرح پیدا ہوتی ہے، جوان ہوتی ہے، پروان چڑھتی ہے اور بوڑھی ہو کر مر جاتی ہے لیکن یہ کوئی کلیہ نہیں بعض ذہنی محبت کرنے والے بڑھاپے تک محبت سے سرشار رہتے ہیں

محبت کی دوسری قسم نفسانی ہے

نفسانی محبت کرنے والے محبت کو ایک کھیل سمجھتے ہیں۔ وہ محبت کے رشتے کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ یہ لوگ آزاد رہنا پسند کرتے ہیں۔ محبت کی پابندی انہیں پریشان کر دیتی ہے۔ یہ نہیں چاہتے کہ ان کی زندگی کی خوشیاں کسی دوسرے انسان پر منحصر ہوں۔ یہ لوگ جذبات کو محبت کے کھیل سے دور رکھتے ہیں۔ ان کی نظر میں شادی ایک بندھن ہے اور بچے زنجیریں۔ یہ لوگ ہرجائی ہوتے ہیں کبھی اس ڈال پر تو کبھی اس ڈال پر۔ ان لوگوں کا مقولہ ہے کہ محبت ایک وسیع چیز ہے۔ اسے ایک عورت کے لئے محدود کر دینا ناانصافی ہے۔ ان کی زندگی میں محبت کے کئی دور آتے ہیں۔ ان کی محبت عارضی ہوتی ہے۔ جہاں محبت نے کوئی خطرناک موڑ لیا، یہ غائب ہو جاتے ہیں۔ اگر انہیں محبت میں ناکامی ہو تو انہیں کوئی افسوس نہیں ہوتا۔ اگر کوئی انہیں ٹھکرا دے تو ان پر غم کا پہاڑ نہیں ٹوٹتا۔ کوئی دوسرا ان سے بازی لے جائے تو یہ کھلاڑیوں کی اسپرٹ سے کام لے کر اسے معاف کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف زندگی میں یکے بعد دیگرے عشق لڑاتے ہیں بلکہ بیک وقت کئی لڑکیوں سے محبت کا دم بھرتے ہیں۔ یہ آسمان سے زمین پر نہیں گرتے بلکہ اکثر کھجور میں اٹک جاتے ہیں۔ عورتیں ان کے لئے بس کا سفر ہیں۔ ایک بس نکل گئی تو کوئی غم نہیں، دوسری بس مل جائے گی

نفسانی محبت کرنے والے اپنی محبوبہ کو خط

لکھنے سے گھبراتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ عین ممکن ہے کہ ان کی خط و کتابت بعد میں ان کے لئے مصیبت بن جائے۔ ملاقات کے دوران بھی یہ لوگ اِدھر اُدھر کی باتوں میں وقت صرف کر دیتے ہیں، محبت کا سنجیدگی سے اظہار اس اندیشے سے نہیں کرتے کہ یہ اظہار کہیں انہیں شادی کے بندھن میں نہ جکڑ لے۔ یہ محبوبہ کی تعریف میں کنجوسی سے کام نہیں لیتے، لیکن یہ تعریف بھی محتاط ہوتی ہے۔ ان لوگوں کے متعلق یہ خیال کرنا کہ یہ سراسر دھوکے باز ہوتے ہیں، چنداں صحیح نہیں ہے۔ یہ لوگ اپنی فطرت سے مجبور ہیں۔ نہیں کبھی کبھی اپنے ہرجائی پن کا احساس ہوتا ہے لیکن یہ احساس اتنا شدید نہیں ہوتا کہ یہ اپنا طرزِ عمل دل ڈالیں۔ ان لوگوں سے ان کے معاشقوں کے رے میں پوچھا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ لوگ محبت کے زران خاصے سنجیدہ تھے۔ ان کے دل میں اپنی محبوبہ دھوکہ دینے کا خیال تک نہیں آیا تھا لیکن آہستہ ہستہ ان کی فطرت محبت پر غالب آگئی اور یہ ایک ل سے اچک کر دوسری ڈال پر بیٹھ گئے۔

ان لوگوں کا بچپن اوسط درجے کا ہوتا ہے یال کہ یہ لوگ اپنی بچپن کی محرومیوں کی تلافی تے ہیں یا عورت سے کھیل کر اس سے انتقام لیتے ا چنداں صحیح نہیں ہاں یہ بات ضرور صحیح ہے کہ انہیں پن میں بے تحاشہ محبت نہیں ملتی۔ لیکن یہ لوگ درین کی بے توجہی یا نفرت کا شکار بھی نہیں ہوتے ا کے باوجود عورتوں کے ساتھ ان کا طرزِ عمل ب خیز ہوتا ہے۔ اگر یہ لوگ محبت یا شادی کے ن میں پھنس جائیں تو بری طرح پھڑپھڑاتے اور آزادی کے لئے زور مارتے ہیں۔ اگر آزادی سکے تو تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔

نفسانی محبت کرنے والے اپنی محبوبہ کی خامیاں رنے میں وقت ضائع نہیں کرتے یہ ان کے لئے ایک ناخوش گوار فریضہ ہے وہ جانور کو سدھارنے کے مقابلے میں سدھا ہوا جانور خریدنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اپنی محبوبہ کو سکھانا سمجھانا ان کے بس کا روگ نہیں۔ درزی کی دکان کے پھیرے لگانے سے ان کے خیال میں یہ بہتر ہے کہ ریڈی میڈ کپڑا خرید لیا جائے۔ ان لوگوں کی چھٹی حس محبت سے پیچھا چھڑانے میں ہمیشہ ان کی مدد کرتی ہے۔ اگر یہ لوگ بدقسمتی سے عشق کے چکر میں پھنس جائیں تو ایک آسان نسخہ آزماتے ہیں۔ زیادہ میل جول سے جی اُوب جاتا ہے۔ یہ اپنی محبوبہ سے اتنا میل جول بڑھاتے ہیں کہ محبت کا نازک آبگینہ ٹوٹ کر رہ جاتا ہے۔ روز روز کی ملاقاتوں سے یہ خود بھی بور ہو جاتے ہیں اور اپنی محبوبہ کو بھی بور کر دیتے ہیں۔ اس طرح محبت کا بندھن خود بخود ٹوٹ جاتا ہے۔

محبت کرنے والوں کی تیسری قسم عقلی ہے۔ یہ لوگ دنیا سے نرالے ہوتے ہیں۔ جذبات سے کوسوں دُور محبت کی بے تابیوں اور بے چینیوں سے آزاد۔ ان کے دل پر دماغ کی حکمرانی ہوتی ہے ان کی محبت کے اظہار میں کوئی گرم جوشی نہیں ہوتی۔ ان کی محبت کی انتہا دوسروں کو اُنسیت معلوم ہوتی ہے۔ ان کے لئے محبت ایک سراب کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ لوگ محبت کو دیوانگی سے تعبیر کرتے ہیں اور محبت کرنے والوں کو دھوکے باز سمجھتے ہیں۔

ان کی محبت اُنسیت سے شروع ہوتی ہے۔ ان کے لئے پہلی نظر کا تیر بے معنی شے ہے۔ محبت ایک طوفان کی طرح ان کے دل میں نہیں آتی، بلکہ ایک آہستہ بہنے والی ندی کی طرح ان کے دل میں گھر کرتی ہے۔ انہیں خود معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کون سا مہینہ یا سال تھا جب اُنسیت محبت میں بدل گئی۔

محبت کی رفتار اتنی مدھم اور بے آواز ہوتی ہے کہ اس تبدیلی کا انہیں پتہ نہیں چلتا۔ کب دوستی ختم ہوئی اور کب محبت شروع ہوئی، انہیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ ان کی دوستی کو محبت میں بدلنے کے لئے بڑا وقت درکار ہوتا ہے۔ رومانسو قسم کی محبت ان کے لئے ایک عجوبہ ہے۔ یہ لوگ اکثر بچپن کی دوستوں سے ہی شادی کرتے ہیں، پڑوسی یا رشتہ دار بھی ان کا دل جیت لیتے ہیں۔ یہ لوگ جن کو بچپن سے جانتے ہیں، جن کے مزاج سے واقف ہوتے ہیں، ان ہی کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں اگر اسکول یا کالج کی دوستی ہو تو یہ بھی محبت میں بدل جاتی ہے۔

یہ لوگ جذبات کی تسکین کے لئے شادی نہیں کرتے۔ انہیں اپنے جذبات پر پورا قابو حاصل ہوتا ہے۔ شادی ان کے لئے ایک سماجی ضرورت سے زیادہ نہیں۔ یہ لوگ اپنا گھر بسانا چاہتے ہیں۔ شادی گھر بسانے کے لئے ضروری ہے۔ شادی کے بعد وہ بیوی کو تحفظ مہیا کرتے ہیں۔ گھر کے آرام و آسائش فراہم کرتے ہیں، اس لئے کہ یہ ان کا فرض ہے۔ ان لوگوں میں ہمدردی کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ ان کی ہمدردی کو محبت کا نام دینا نادانی ہے۔ وہ اس لئے روپیہ کماتے ہیں کہ روپیہ کے بغیر گھر چلانا مشکل ہے۔ روپیہ کمانے کا مقصد بیوی کی فرمائشیں پوری کرنا نہیں ہوتا بلکہ گھر کی ضروریات پوری کرنا ہوتا ہے۔ ان کی ازدواجی زندگی خراماں خراماں چلتی ہے انہیں ناآسودگی کی بہ وانہیں ہوتی۔ ان کی زندگی جذباتی نشیب و فراز سے نہیں گذرتی۔ وہ اس بات کو قبول نہیں کرتے کہ جنگ کے بعد صلح ہو تو پیار میں مزہ آتا ہے۔ ازدواجی زندگی میں بیوی کو چوٹ پہنچانا اور پھر اس کے زخم بھرنا ان کی فطرت کے خلاف ہے۔ محبت

ان کے لئے ایک عادت ہے کسی نے عقلی محبت کرنے والے سے پوچھا "کیا تم اپنی بیوی سے محبت کرتے ہو؟" اس نے جواب دیا "میں اس کا عادی ہوگیا ہوں" ان لوگوں کی زندگی میں محبت کو اہمیت تو ہے مگر اس کی ضرورت نہیں۔

ایسے لوگوں کا بچپن اکثر مشترکہ خاندان میں گذرتا ہے۔ بھرا پرا گھر ہوتا ہے۔ بہن بھائی اور قریبی رشتہ دار بھی ساتھ رہتے ہیں ایسے گھر میں محبت بٹی ہوتی ہے، کسی ایک فرد پر مرکوز نہیں ہوتی جوانی میں بھی محبت کو مرکزیت حاصل نہیں ہوتی۔ یہ لوگ محبت کے خطرناک پہلو کے متعلق کبھی نہیں سوچتے۔ ان کے خیال میں ایسی باتیں ناولوں اور پکچروں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ محبت کے ڈرامے کتابوں میں پائے جاتے ہیں، زندگی میں نہیں ان لوگوں کی زندگی تحفظ سے بھرپور ہوتی ہے۔ یہ لوگ زندگی کی یکسانیت سے بور نہیں ہوتے، بلکہ یکسانیت کو پسند کرتے ہیں۔ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ کل بھی زندگی کا ڈھرا وہی ہوگا جو آج ہے۔ کل بھی زندگی کی گاڑی بندھی ٹکی رفتار سے چلتی رہے گی۔

محبت کی چوتھی قسم کو دیوانی محبت کا نام دیا گیا ہے۔ یہ قسم محبت اور نفرت کے بین بین ہے یہ بات سمجھنا ذرا مشکل ہے، لیکن دراصل محبت اور نفرت ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں انسان جس کے لئے آہیں بھرتا ہے، تڑپتا ہے بےچین رہتا ہے اس سے نفرت بھی کرتا ہے وہ اپنے محبوب کا محتاج ہے اس کی خوشی اپنے محبوب کی ایک غلط انداز نظر پر منحصر ہوتی ہے۔ یہ محتاجی ہی محبت میں نفرت کا عنصر شامل کر دیتی ہے۔

دیوانی محبت کا شکار بے خوابی میں مبتلا رہتا ہے۔ اسے بھوک نہیں لگتی۔ اس کے دل میں درد رہتا ہے جسم بخار میں مبتلا رہتا ہے اس کی ساری توجہ اپنے محبوب پر مرکوز ہوتی ہے وہ رات دن اسی کے متعلق سوچتا رہتا ہے۔ محبوب کی ایک محبت بھری نظر اس کے دل کو خوشیوں سے بھر دیتی ہے۔ محبوب کی ذرا سی بےرخی اس کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔ محبوب اس سے کتنا ہی محبت کا اظہار کرے اس کی تسلی نہیں ہوتی، اس کی پیاس نہیں بجھتی۔ وہ ہمیشہ محبوب کی بےوفائی کی شکایت کرتا ہے۔ اس کا اندیشہ کبھی نہیں مٹتا۔

دیوانی محبت کرنے والے حسد کا شکار ہوتے ہیں۔ اگر ان کے محبوب نے کسی سے ہنس کر بات کر لی تو قیامت آجاتی ہے۔ یہ محبت اکثر نامراد رہتی ہے لیکن مراد بر آجائے تو بھی اندیشے پیچھا نہیں چھوڑتے اب یہ خوف رہتا ہے کہ گوہر مراد کوئی دوسرا نہ چرا لے۔ یہ مسلسل رقابت اور جلن محبت کے جذبے کو نقصان پہنچاتی ہے۔ دراصل ایسا انسان اپنا دشمن خود ہی ہوتا ہے۔ یہ محبوب سے غیر مشروط اطاعت مانگتا ہے اس کے جسم اور روح سب پر قبضہ جمانا چاہتا ہے اس کے بعد بھی اگر کچھ بچ رہے تو اس کا مطالبہ بھی کر دیتا ہے۔ اس کا قول ہے کہ جب میں نے اپنا سب کچھ تمہارے حوالے کر دیا تو تمہیں بھی اپنا سب کچھ مجھ پر قربان کر دینا چاہئے۔ محبوب کے لئے یہ کڑی شرطیں پورا کرنا مشکل ہو جاتا ہے — عورت اس کی محبت سے خائف ہو جاتی ہے اور کسی نہ کسی طرح اپنی جان چھڑا لیتی ہے اس لئے اس قسم کی محبت اکثر ناکام رہتی ہے۔ یہ محبت عشق کی لافانی کہانیوں کی بنیاد ہے اور اکثر ٹریجیڈی پر ختم ہوتی ہے۔ رومیو جولیٹ، شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں اور ہندوستان میں ہیر رانجھا، سوہنی مہیوال اور باز بہادر روپ متی کے قصے دیوانی محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ ان میں ہر کہانی موت پر ختم ہوتی ہے۔

دیوانی محبت کرنے والا بچپن میں محبت سے محروم رہتا ہے۔ یہ محرومی اس کی پیاس بڑھا دیتی ہے۔ وہ محبت کے سارے پہلو جمع کر کے اپنے آئیڈیل کے حوالے کر دیتا ہے اور پھر اس کو تلاش کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کے محبوب میں ساری خوبیاں ہیں۔ وہ اسے دیوی کا رتبہ دے کر اس کی پوجا کرتا ہے۔ وہ اس کے خیال کو سینے سے لگائے رہتا ہے، اس کی اصلیت کی کھوج نہیں کرتا۔

ماہرین نفسیات کے مشاہدے کے مطابق ہر انسان میں جینے اور مرنے کی خواہش موجود رہتی ہے۔ دیوانی محبت کرنے والے انسان میں موت کی خواہش زندہ رہنے سے زیادہ ہوتی ہے۔ وہ محبت کے سہارے اس منزل کی طرف تیزی سے بڑھتا ہے۔

آخر میں ایک نکتہ قابلِ ذکر ہے۔ زندگی ہمیشہ بندھے ٹکے خانوں میں نہیں بٹ سکتی اس لئے یہ تقسیم کے خانے بھی مکمل نہیں ہیں۔ ان کی سرحدیں بھی قطعی نہیں ہیں۔ انسان ایک مشن ہے۔ اس کو اس طرح خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ کچھ انسان ایسے ہیں جو نصف عقلی اور نصف ذہنی محبت کا مجموعہ ہیں۔ کچھ میں نفسانی اور ذہنی محبت برابر تقسیم ہوتی ہے۔ دیوانی محبت کرنے والے بھی شاذ و نادر ہی ملتے ہیں۔ ان میں بھی عقلی یا ذہنی محبت کی آمیزش ہوتی ہے۔ کسی انسان پر یہ حکم لگانا کہ وہ محبت کے ایک ہی راستے پر چلنے والا ہے غلط ہے۔

●●

جھائیاں کیسے دُور کی جائیں؟

بیوٹی کالج

شہناز حسین
ایم-۹۲ گریٹر کیلاش، نئی دہلی ۱۱۰۰۴۸ فون ۶۴۰۸۹۴



چہرے پر جھائیاں بہت بدنُما معلوم ہوتی ہیں۔ ان سے دور رہنے اور ان کو دور کرنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ یہ پیدا کیوں ہوتی ہیں۔ جھائیاں غدود کے ناقص عمل سے پیدا ہوتی ہیں۔ جھائیاں حمل کے دوران بھی نمایاں ہو جاتی ہیں۔ اور وضعِ حمل کے بعد بھی۔ بعض اوقات حمل کے بعد جھائیاں خود بخود ختم ہو جاتی ہیں، لیکن کبھی کبھی حمل کے بعد بھی باقی رہتی ہیں۔ جلد کا نچلا حصہ ایپی ڈرمس کہلاتا ہے۔ اس جگہ کالے ذرّات، جو میلانین کہلاتے ہیں، پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد یہ ذرّات بڑھنا شروع ہو جاتے ہیں۔ دھوپ سے جھائیاں تیزی سے بڑھتی ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ جھائیاں جگر کی خرابی سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہ بات زیادہ صحیح نہیں ہے۔ جگر کی خرابی ان کی ایک وجہ ہو سکتی ہے، لیکن یہ واحد سبب نہیں ہے۔ اسی لئے جھائیاں باہری علاج سے ٹھیک ہو جاتی ہیں۔ میں نے ۱۸ سال کے تجربے کے بعد اس کا ایک سہل علاج دریافت کیا ہے۔ اور وہ ہے مرکری پرکلورائیڈ مگر اس کے استعمال میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ ایسا محلول جس میں مرکری پرکلورائیڈ صرف ۱/۲ فی صد ہو علاج کے لئے کافی ہے۔ اس سے زیادہ تعداد میں شامل ہو تو جلد پر چھالے پڑ سکتے ہیں۔ مرکری پرکلورائیڈ کا استعمال کسی بیوٹی ایکسپرٹ سے پوچھ کر ہی کریں۔

اس کے علاوہ ایسا صابن یا مرہم جس میں ہائیڈروجن پیرآکسائیڈ ہو جھائیوں کے لئے مفید ہے۔ قدرتی برف کو جلد پر ملنے سے بھی جھائیوں میں فرق پڑ جاتا ہے۔ اگر ہائیڈروجن پیرآکسائیڈ مرہم نہ مل سکے تو ہائیڈروجن پیرآکسائیڈ بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کچھ عورتوں کا تجربہ ہے کہ جھائیاں دورانِ حمل میں پیدا ہوئیں اور وضعِ حمل کے بعد غائب ہو گئیں، لیکن جب دوسری بار دورانِ حمل میں ظاہر ہوئیں تو وضعِ حمل کے بعد باقی رہ گئیں۔ دورانِ حمل میں جھائیوں کے پیدا ہونے کا سبب خون کی کمی ہے۔ اس کے لئے خون ٹیسٹ کرانا چاہئے۔ خون میں سفید اور سرخ ذرات ہوتے ہیں۔ سرخ ذرات ہیموگلوبین کہلاتے ہیں۔ اگر خون میں ان ذرات کا تناسب گھٹ جائے تو یہ بیماری خون کی کمی کہلاتی ہے۔ ان سرخ ذرات کا تناسب معلوم کرنے کے لیے ڈاکٹر سے خون ٹیسٹ کرایا جاتا ہے۔ اگر خون میں ہیموگلوبین کی کمی ہو تو ان سرخ ذرات کو بڑھانے کے لئے مناسب خوراک اور دوا کا انتظام ضروری ہے۔ غذا میں کلیجی کا استعمال خون کی کمی کو دُور کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ان دواؤں کا استعمال جن میں فولاد ملا ہے، بہتر ہے۔ ڈاکٹر کے مشورے سے آئرن یا فی فورا استعمال کی جا سکتی ہیں۔

جھائیوں کے کئی اور سبب بھی ہو سکتے ہیں۔ ماہواری کی بے قاعدگی یا رک رک کر آنا بھی اس کی وجہ ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ طویل بیماری کے نتیجے میں بھی جھائیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ کچھ موٹی عورتوں کو جلد دبلا ہونے کا شوق ہوتا ہے۔ وہ ایک دم کھانا بند کر دیتی ہیں۔ اس جلد بازی سے صحت کو نقصان پہنچتا ہے اور جھائیاں پیدا ہونے کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ بعض عورتوں کی جلد بہت حسّاس ہوتی ہے۔ انہیں دھوپ سے الرجی ہوتی ہے۔ دھوپ جِلد کی دشمن ہے۔ ان عورتوں کو جنہیں دھوپ سے الرجی ہے۔ دھوپ سے حتی الامکان بچنا چاہئے، ورنہ ان کے چہرے پر بھی جھائیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ دھوپ کے علاوہ بعض عورتوں کو خوشبو سے الرجی ہوتی ہے۔ یہ عورتیں عطر یا سینٹ کا استعمال کریں تو جھائیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جھائیوں کی ایک وجہ پیٹ کے کیڑے بھی ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ کو چینی بہت مرغوب ہو اور آپ رات کو دانت کٹکٹاتی ہوں تو آپ کو اپنا فضلہ ٹیسٹ کرانا چاہئے۔ اگر پیٹ میں کیڑے ہیں تو فوراً ان کا علاج کریں۔ دردِ قولنج کے مریض بھی جھائیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ آنتوں کی بیماریاں بھی جھائیاں

پیدا کر سکتی ہیں ۔ اندرونی خرابیوں میں جگر کی خرابی جھائیوں کی عام وجہ سمجھی جاتی ہے ۔ اگر جگر ٹھیک کام نہ کرتا ہو تو لیو ۵۲ یا لیور جن استعمال کیا جا سکتا ہے ۔

بہت زیادہ نروس یا جذباتی لوگ بھی جھائیوں کا شکار ہو سکتے ہیں جن عورتوں کو جلد غصہ آجاتا ہے یا جو عورتیں گہرے رنج میں ڈوبی رہتی ہیں یا اعصابی کشیدگی میں مبتلا ہوتی ہیں، جھائیوں کے مرض میں گرفتار ہو سکتی ہیں ۔ اگر کسی عورت کو گہرا صدمہ پہنچا ہو تو وہ عورت بھی جھائیوں میں مبتلا ہو سکتی ہے ۔

جھائیوں سے بچنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ دھوپ سے بچیں ۔ یورپ میں جھائیاں پیدا نہیں ہوتیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرد ممالک میں دھوپ میں تیزی نہیں ہوتی ۔ یورپ کے ڈاکٹر اس بیماری کو ایشیا کی بیماری کہتے ہیں ۔ جو جھائیاں دھوپ کی تمازت سے پیدا ہوتی ہیں وہ زندگی بھر ساتھ دیتی ہیں ۔ اس کے علاوہ گرمیوں میں جھائیاں زیادہ گہری بھی ہو جاتی ہیں ۔ جھائیوں کے دھبے مختلف سائز کے ہوتے ہیں یہ دھبے کبھی گول ہوتے ہیں کبھی بیضوی ۔ اگر جھائیاں ہلکی ہوں تو ان کا رنگ زردی مائل بھورا ہوتا ہے ، اگر گہری ہوں تو چاکلیٹ کا رنگ اختیار کر لیتا ہے ۔ بعض اوقات ان کا رنگ کالا بھی ہو جاتا ہے ۔ جھائیوں والا چہرہ دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ چہرے پر سیاہ رنگ کا جالا لگا ہوا ہے ۔

جو لوگ گرمیوں میں پہاڑ پر جاتے ہیں انہیں بھی احتیاط کی ضرورت ہے ۔ پہاڑوں پر ہوا لطیف ہوتی ہے ، اس لئے دھوپ کی تمازت میدان سے زیادہ ہوتی ہے ۔ سورج کی کرنیں ہوا کی لطافت کی وجہ سے سیدھی جلد میں گھس جاتی ہیں ۔ اس لئے پہاڑوں پر خاص طور سے دھوپ سے بچنے کی ضرورت ہے ۔ وہاں سن برن کریم استعمال کرنا مفید ہے ۔ دھوپ میں چھتری کا استعمال کرنا بہتر ہے ۔

کچھ عرصہ ہوا یورپ میں جلدی بیماریوں کے موضوع پر ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس کانفرنس میں جھائیوں پر بھی مقالے پڑھے گئے ۔ جلد کے ماہرین نے خوشبو کو جھائیوں کا ذمہ دار ٹھیرایا ۔ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں یورپ میں دھوپ کا مسئلہ نہیں ہے ۔ یوڈی کلون اور خوشبو لگا کر دھوپ میں نکلنا اور بھی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے ۔ اگر آپ خوشبو استعمال کرنے پر مجبور ہیں تو کم از کم ان جگہوں پر خوشبو نہ لگائیں جہاں جھائیاں پڑی ہوئی ہوں ۔

جھائیاں عموماً رخسار، کنپٹی اور گردن پر نمودار ہوتی ہیں ۔ کبھی کبھی جھائیاں زیادہ دھوپ لگنے سے ٹھیک بھی ہو جاتی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ دھوپ سے جلد تپ جاتی ہے ۔ اگر پہاڑوں پر دھوپ میں زیادہ رہا جائے تو اس سے بھی جلد پر سیاہ داغ پڑ جاتے ہیں ۔ آپ نے اکثر پہاڑ سے آنے والوں کے چہروں پر یہ سیاہ دھبے دیکھے ہوں گے ۔ لیکن یہ جلد جل کر اتر آتی ہے ۔ اور چہرہ صاف ہو جاتا ہے ۔ تیز دھوپ سے ایک فائدہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بغیر جھائیوں کی جلد بھی گہرے رنگ کی ہو جاتی ہے ۔ اس طرح دونوں خلط ملط ہو جاتے ہیں اور دونوں کا فرق نمایاں نہیں رہتا ۔

جھائیوں کا ایک سبب غلط دوا کا استعمال بھی ہو سکتا ہے ۔ اس کے علاوہ دواؤں کا زیادہ استعمال بھی جھائیاں پیدا کر سکتا ہے ۔ مثلاً ٹانک میں گندھک کا لیپ کیا اور چہرے پر جھائیاں نمودار ہو گئیں ۔ جسم میں ۵ غدود ایسے ہیں جن کی حرکت پر زندگی کا دارومدار ہے ان میں تھائی رائیڈ سب سے زیادہ اہم ہے ۔ اگر اس غدود کی حرکت میں نقص پیدا ہو جائے تو جھائیوں کے پیدا ہونے کا امکان ہو سکتا ہے ۔

مانع حمل دوائیوں اور مانع حمل سامان کے استعمال سے بھی جھائیاں ظاہر ہو سکتی ہیں ۔ آپ کو لازم ہے کہ دوران حمل دھوپ سے بچیں ۔ تمباکو کھانے والی اور سگریٹ پینے والی عورتوں کو بھی اس مرض میں مبتلا دیکھا گیا ہے ۔ خوشبودار کریم سے بھی جھائیاں پیدا ہو سکتی ہیں لیکن اس طرح جھائیوں کا امکان دس ہزار میں ایک ہے ۔

اگر آپ بھاپ کا غسل کرتی ہیں یا چہرے پر بھاپ استعمال کرتی ہیں تو اس سے بھی جھائیاں نمودار ہو سکتی ہیں ۔ اکثر زکام میں عورتیں سر اور موہنہ پر کپڑا ڈال کر گرم پانی میں زکام کی دوا ڈال کر سونگھتی ہیں ۔ اس اشتہاری ترکیب سے بھی جھائیاں پیدا ہو سکتی ہیں یا اگر جھائیاں پہلے سے ہیں تو بڑھ سکتی ہیں ۔ جلد کو بھینچ کرنے سے بھی جھائیاں آ سکتی ہیں ۔ جھائیوں کے علاج کے لئے وٹامن سی مفید ہے ۔ اس کی روزانہ مقدار ۲۵۰ ملی گرام کھانا بہتر ہے ۔ لیموں میں وٹامن سی بکثرت ہوتا ہے ۔ یہ وٹامن سی کا قدرتی ذریعہ ہے ۔ اس کے علاوہ جھائیوں کے لئے وٹامن بی کمپلیکس بھی مفید ہے ۔ وٹامن بی کی گولیوں میں نیبے کومول ، اچھی ہیں ۔ فولاد اور فاسفورس کی کمی کے لئے بی جی فوس یا فاسفومین استعمال کیا جا سکتا ہے ۔ ایسے تمام ٹانک جن میں گلیسرو فاسفیٹ ہوں جھائیوں کو دور کرنے کے لئے مفید ہیں ۔

شائستہ بیگم، امروہہ

س: میرے پیر بہت کھردرے اور میلے رہتے ہیں جب کہ میں ان کو بہت صاف رکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ بتائیے میں کیا کروں؟

ج: آپ پیروں کو گرم پانی سے دھو کر خوب اچھی طرح گلیسرین لگائیں اور نصف لیموں سے خوب اچھی طرح ایڑیوں کو رگڑیں۔ جاڑے کی سرد ہوا سے پیروں کو بچانے کے لئے موزے پہنیں۔

نور جہاں، دہرہ دون

س: میرے چہرے کی کھال خصوصاً جاڑوں میں خشک ہو جاتی ہے اور ویسے بھی میرے چہرے کی کھال بہت خشک ہے۔ اس کے لئے مجھے کیا کرنا چاہئے؟

ج: آپ بالائی سے چہرہ دھویا کریں اور اس کے بعد صابن کی بجائے بیسن سے چہرے کو صاف کریں۔ اتنا خیال رکھیں کہ بالائی تقریباً دس منٹ تک چہرے پر لگی رہے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اس کے علاوہ آپ دہی سے بھی چہرہ دھو سکتی ہیں۔

نسرین، آگرہ

س: پچھلے کچھ ماہ سے میں یہ محسوس کر رہی ہوں کہ میرا پیٹ پہلے سے کافی بڑھ گیا ہے جو کہ بدنما لگنے لگا ہے۔ براہ مہربانی پیٹ کم کرنے کی کوئی ترکیب بتائیے؟

آپ کھانا اتنا نہ کھایا کریں کہ جس سے پیٹ پھول جائے اور مشروبات میں بھی احتیاط رکھیں۔ ایک وقت میں تھوڑا تھوڑا پئیں۔ یہاں تک کہ پانی بھی بہ یک وقت کئی گلاس نہ پئیں۔ مقصد یہ ہے کہ کوئی بھی چیز ایک ہی وقت میں اتنی مقدار میں نہیں استعمال کرنا چاہئے کہ جس سے پیٹ تنا ہوا محسوس ہو۔ کیوں کہ پیٹ کو بار بار غبارے کی طرح پھلانے سے پیٹ میں لچک پیدا ہو جاتی ہے جو پیٹ کو باہر کی طرف بڑھنے میں مدد دیتی ہے۔ اگر آپ اس آسان ورزش پر عمل کریں تو آپ کو بہت جلد فرق محسوس ہوگا یعنی پیٹ کو ہر وقت اندر کی طرف دبا کر رکھنے کی عادت ڈالیں۔ جب بھی یاد آئے اندر کی طرف دبا لیا کریں۔ اس ورزش سے سانس کا کوئی تعلق نہیں۔ اگر آپ سارا دن پیٹ کو اندر رکھنے کی عادت ڈال لیں گی تو آپ کا بڑھا ہوا پیٹ بہت جلد اندر ہو جائے گا۔

زرینہ خان، دہلی

س: میرا دھوپ میں بہت آنا جانا رہتا ہے جس کی وجہ سے میرے چہرے کی جلد سوکھ جاتی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے کسی ایسی کریم کا نام بتائیں جس سے دھوپ میں میرے چہرے کی جلد کی حفاظت ہو سکے؟

ج: آپ لیکٹو کیلامائن لوشن لگا کر دھوپ میں جایا کریں، ورنہ دھوپ کی تمازت آپ کی جلد کو بے رونق کر دے گی۔

عائشہ سلطانہ، بنگلور

س: میری آنکھوں میں مستقل چیپڑ لگے رہتے ہیں۔ جب کہ میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد انہیں انگلی سے صاف کرتی رہتی ہوں۔ آپ ہی بتائیں کہ میں آنکھوں کو صاف رکھنے کا کون سا طریقہ اختیار کروں؟

ج: آپ کی آنکھیں صرف اسی لئے گندی رہتی ہیں کہ آپ ان کو انگلی سے صاف کرتی ہیں۔ انگلی میں ہزاروں جراثیم ہوتے ہیں۔ آپ روزانہ سوتے وقت ایک ایک بوند عرق گلاب ٹپکا لیا کیجئے۔

صوفیہ ناہید، کلکتہ

س: میرے چہرے کی جلد بہت چکنی ہے۔ میں روئی کو یوڈی کلون میں بھگو کر کبھی کبھار چہرے کو پونچھ لیتی ہوں۔ ایسا کرنے میں کوئی حرج تو نہیں؟

ج: اگر آپ کی جلد چکنی ہے تو کوئی حرج نہیں، لیکن یہ یاد رہے کہ خشک جلد کے لئے ایسا کرنا مناسب نہیں۔

عطیہ بیگم، تھانہ

س: چہرے کی جلد خشک ہے یا روغنی، اس کو پہچاننے کا کیا طریقہ ہے؟

ج: آپ ایک صاف روئی کا ٹکڑا لیجئے۔ اس کو گال اور پیشانی پر رگڑیئے۔ اگر وہ ٹکڑا صاف ہے تو جلد خشک ہے اور اگر میلا ہو جائے تو جلد روغنی ہے، لیکن اتنا ضرور یاد رکھیں کہ آزمائش منہ دھونے کے کچھ دیر بعد کرنی چاہئے۔



عرفانہ اختر، بیناپور، کھرگیا

س- لڑکیاں اپنے آپ کو ماں باپ پر بوجھ کیوں سمجھتی ہیں؟

ج اس لئے کہ ماں باپ انھیں بوجھ سمجھتے ہیں۔ ہمارے سماج نے لڑکیوں کو بوجھ بنادیا ہے۔ اور لڑکیوں نے اس غلط بات کو تسلیم کر لیا ہے۔

مہر جمال انور، ناتھ نگر، بھاگل پور

س- لوگ دوسروں کو خوش دیکھ کر کیوں جلتے ہیں؟

ج خوشی زمانے میں عنقا ہے۔ یہ بہت کم مقدار میں اور بہت تھوڑے وقت کے لئے حاصل ہوتی ہے۔ اس نایاب شے کو دوسرے کے پاس دیکھ کر حسد کرنا قدرتی امر ہے۔

س- اگر مصیبت میں اپنے بھی ساتھ چھوڑ دیں تو؟

ج بے گانوں کو اپنا بنانے کی کوشش کیجیے۔

ایم شمیم صدیقی، سیوہارہ، بجنور

س- سوکھی لکڑی اور سونی زندگی میں کتنا فرق ہے؟

ج دونوں صورتوں میں آگ بھڑک سکتی ہے

س- جس گھر میں خوشی کا نام نہ ہو؟

ج اس کے رہنے والے معمولی سی خوشی کی بھی قدر کرتے ہیں۔

محمد فیاض قریشی، واسع پور

س- دل لگی مصیبت کب بن جاتی ہے؟

ج جب وہ زبانی نہ ہو اور عمل کا روپ دھار لے۔

س- انسان شیطان کب بن جاتا ہے؟

ج جب اس پر لالچ کا بھوت سوار ہو جائے۔

س- خود کشی کون لوگ کرتے ہیں؟

ج ذہنی بیمار۔

شبیر احمد گدی، چکردھرپور

س- عورت کی عداوت کیا اس کی محبت سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے؟

ج یہ بات مردوں کی گھڑی ہوئی ہے؟ دنیا میں جتنی قتل اور غارت گری عداوت کی وجہ سے پیش آتی ہے۔ اس میں عورت کا حصہ صفر کے برابر ہے۔

انجم رحمان، مدراس

س- حد سے زیادہ ہمدردی؟

ج کبھی کبھی نقصان پہنچاتی ہے۔

نورجہاں بیگم، دھنیاد بازار بہار

س- بیوی کب روتی ہے؟

ج جب سارے ہتھیار بے کار ثابت ہو جائیں تو آنسو آخری ہتھیار ثابت ہوتے ہیں اور اثر انگیز بھی۔

س- دوسروں پر احسان کر کے آدمی کب پچھتاتا ہے؟

ج جب اسے احسان کے بدلے کی امید ہو اور یہ امید بر نہ آئے۔

محمد سعید منصوری، جمشید پور

س- انسان سکون کب کھو دیتا ہے؟

ج جب اس کی خواہشیں کچھ کچھ پوری ہونے لگیں اور نئی خواہشوں کا ہجوم اس کے سر پر سوار ہو جائے۔

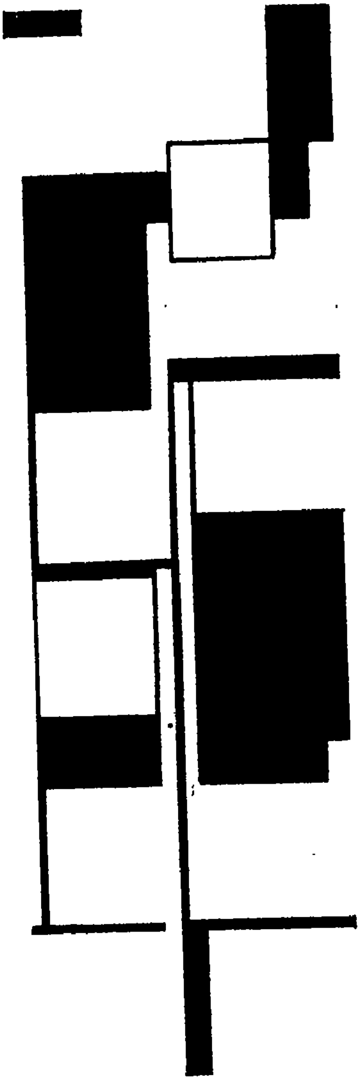
سلطان احمد اشک، ہزاری باغ، بہار

س- آخر مرد عورت کو نیچ کیوں سمجھتے ہیں؟

ج ظاہر میں یہ بات سچ ہے لیکن باطن میں مرد عورت کو اپنے سے بلند سمجھتا ہے۔

س- کیا مرد کے سامنے عورت کی کوئی عزت نہیں؟

ج کیوں نہیں۔ ہمارے ملک میں عورت کو



اس عنوان کے تحت دل چسپ معلوماتی اور نفسیاتی سوالوں کے جواب دئے جاتے ہیں۔ الگ کاغذ پر یا پوسٹ کارڈ پر زیادہ سے زیادہ تین سوال لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کے لئے جگہ چھوڑیئے اور اپنا پورا نام پتہ لکھئے جس کاغذ یا کارڈ پر سوالات ہوں اس پر دفتر سے متعلق اور کوئی بات نہ لکھئے۔ اپنے سوالات اس پتہ پر بھیجئے: بزم بانو

ماہ نامہ بانو ۲ آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱

مدیرہ

دیوی کہا جاتا ہے۔

سید محمد اصغر، جمشید پور

س۔ کیا ہر غم کے بعد پھر خوشی ملتی ہے؟

ج: ضرور ملتی ہے ورنہ لوگ خوشی کی قدر نہ کریں۔

ڈبلو سالے۔ زخمی، گریڈیہہ، بہار

س۔ مصیبت کے وقت انسان کو کیا کرنا چاہئے؟

ج: اُسے یہ اُمید رکھنی چاہئے کہ مصیبت عارضی ہے۔ جس طرح دنیا میں ہر چیز عارضی ہے خوش گوار مستقبل کی اُمید اسے سکون بخشتی ہے۔

س۔ آدمی اپنے گناہوں کا اعتراف کب کرتا ہے؟

ج: جب اُسے یہ اُمید ہو کہ اُسے گناہوں کی سزا نہیں ملے گی۔

س۔ انسان احساس کمتری کا شکار کب ہو جاتا ہے؟

اپنے سے بلند انسان کو دیکھ کر۔

کلام احمد آرزو، ہزاری باغ

س۔ کیا زبان چلانا ہر عورت کا پیدائشی حق ہے؟

ج: مردوں نے زبان کے سوا عورت کے پاس چھوڑا ہی کیا ہے۔

وقار احمد خاں، بیگم وقار، گریڈیہہ

س۔ آدمی میں شائستگی کب آتی ہے؟

ج: شائستہ لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے۔

س۔ انسان اپنی قسمت پر کب فخر کرتا ہے؟

ج: جب اُسے بن مانگے مُراد مل جائے۔

محمد افضل آرزو، واسع پور، دھنباد

س۔ مصیبت میں جب کوئی راہ نظر نہ آئے تو کیا کرنا چاہئے؟

ج: تھوڑا سا انتظار۔ دنیا میں کسی چیز کو ثبات نہیں ہر چیز عارضی ہے مصیبت بھی۔

س۔ محبت کامیاب کب ہوتی ہے؟

ج: محبت کو کامیابی اور ناکامی میں تقسیم کرنا غلط ہے اس کے معیار جدا ہیں۔ محبت بعض اوقات کامیاب ہو کر بھی ناکام رہتی ہے۔ اور ناکام ہو کر بھی کامیاب

س۔ کیا شادی کرنا ضروری ہے؟

ج: اگر آپ ساری عمر ہوٹل میں رہنا پسند کریں اور اسپتال میں مرنا تو شادی ضروری نہیں۔

شاہدہ پروین، صاحب گنج

س۔ غموں کا سایہ اگر کبھی ساتھ نہ چھوڑے تو کیا کرنا چاہئے؟

ج: اس کی سہل ترکیب یہ ہے کہ آپ غموں کا ساتھ چھوڑ دیجئے غم کا خیال سر پر سوار رہے گا۔ تو اس کا سایہ آپ کا ساتھ نہ چھوڑے گا آپ دماغ میں جان بوجھ کر خوش گوار خیالات بسایئے۔

س۔ سادگی بذات خود حسن ہے پھر بھی لڑکیاں فیشن کے پیچھے کیوں بھاگتی ہیں؟

ج: ہم جانتے ہیں کہ سادگی میں حسن ہے۔ لیکن حسن کو زیادہ جاذب نظر بنانے کے لئے فیشن کا سہارا لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کے علاوہ لڑکیوں کو ان اداروں کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے جو فیشن کی دنیا میں نت نئی ایجادیں کرتے ہیں۔ ورنہ اُن کا کاروبار ٹھپ ہو جائے گا۔

س۔ دعا کب اثر نہیں کرتی؟

ج: جب آپ کو یقین ہو کہ آپ کی دعا اثر نہیں کرے گی۔ ایک شاعر نے ایسے موقع کے لئے ایک ترکیب بتائی ہے

؎ مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی
آخر تو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

ایس، کے، معین الدین، مومن پورہ

س۔ دل کی باتیں دل میں کب رہ جاتی ہیں؟

ج: جب گفتگو کرنے کے لئے وقت کم ہو۔ یا دوسرے کی بسیار گوئی بولنے کا موقعہ نہ دے۔

س۔ دنیا میں کوئی ایسی چیز بھی ہے جو بغیر پیسوں سے خریدی جا سکتی ہے؟

ج: دنیا میں تمام بیش قیمت چیزیں مفت ملتی ہیں۔ مثلاً ہوا پانی اور دھوپ

مس شوکت جہاں، پاکوڑ

س۔ کیا یہ سچ ہے کہ خاموشی سے ذہنی سکون ملتا ہے؟

ج: جی ہاں۔ لیکن یہ خاموشی مکمل ہونی چاہئے زبان خاموش اور دل پریشان ہو تو یہ خاموشی خطرناک ثابت ہوتی ہے۔

س۔ انسانیت کو دفنا کر کیا کوئی سماج ترقی کر سکتا ہے؟

ج: دنیا میں اتنی بڑی قبر نہیں مل سکتی جس میں انسانیت دفن ہو جائے۔

فیاض قریشی، ناظمہ سلطانہ، واسع پور

س۔ محبوب کب دامن چھڑانے لگتا ہے؟

ج: جب اُسے تنگیٔ داماں کی شکایت ہو جائے۔

سید ضیاء التوحید آہن پور، چھپرہ

س۔ کسی کو دیکھ کر رحم کھانا کیا معنی رکھتا ہے؟

ج: کسی پر رحم کھانا اس سے دشمنی کرنے کے برابر ہے۔ کسی کو رحم کے قابل سمجھنا اس کی توہین کرنا ہے۔

دیس بدیس کی خبریں

ہندوستان میں سانپوں کی کارستانیاں

ہندوستان میں سانپ اپنی کارگزاری دکھانے میں بہت مستعد ہیں۔ اُن کی مشغولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہمارے ملک میں ہر سال تیس ہزار سے چالیس ہزار انسان سانپ کے کاٹنے سے مرجاتے ہیں۔ یہ اعداد و شمار ماہرین کے لئے حیرت انگیز ہیں۔ ہندوستان میں زہریلے سانپوں کا تناسب ۵ فی صد بھی نہیں۔ ۹۵ فی صد سانپ زہریلے نہیں ہوتے۔ اس کے باوجود انسانوں کی اتنی بڑی تعداد سانپ کے کاٹنے سے مرجاتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ سانپ کی دہشت ہو۔

جج سادھو بن جائیں گے

الٰہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جناب استھانہ نے تجویز پیش کی ہے کہ ججوں کے لئے گیروا لباس پہننا لازم قرار دیا جائے۔ زعفرانی رنگ قدیم زمانے سے سادھوؤں اور سنتوں کا لباس رہا ہے۔ یہ لباس رُوحانیت کا مظہر ہے۔ حق و انصاف کی کرسی پر بیٹھنے والے کے لئے رُوحانیت کا علم بردار ہونا ضروری ہے جب جج اس لباس کو پہن کر کرسی پر بیٹھیں گے تو وہ کسی کی رو و رعایت نہیں کریں گے اور نہ کسی سے خوف کھائیں گے۔ گیروا رنگ اُن کو ہمیشہ حق اور انصاف کی یاد دلاتا رہے گا۔

چراغ تلے اندھیرا

ایمرجنسی کے زمانے میں نس بندی کی مہم زور و شور سے جاری تھی۔ ہزاروں کسان اور مزدور روزانہ نس بندی کیمپ میں لائے جاتے اور جبریہ فارغ کردئے جاتے۔ اس دوران مغربی ہندوستان کے ایک شہر میں ایک وزیر کی بیوی کے یہاں آٹھواں بچہ پیدا ہوا۔ حکومت کے افسروں کے لئے یہ بات باعثِ شرم تھی۔ انہوں نے وزیر با تدبیر سے باادب درخواست کی کہ اب انہیں بھی نس بندی کروانا لازم ہے۔ وزیر نے جواب دیا کہ وہ اُسے معاف رکھیں۔ اُس نے بہانہ بنایا کہ اُس کے گاؤں میں اس مقصد کے لئے جڑی بوٹیوں کا علاج موجود ہے، وہ اس علاج سے ضرور فائدہ اٹھائے گا۔

شادی کی باری چھیننے کا نتیجہ

اتر پردیش کے قصبہ حسن گنج میں ایک شخص نے اپنے چھوٹے بھائی کو قتل کر دیا۔ قتل کی وجہ یہ تھی کہ چھوٹا بھائی بڑے بھائی سے پہلے اپنی شادی رچا رہا تھا۔

ضرورتِ رشتہ

کٹک کے اخبار سماج میں حسب ذیل اشتہار شائع ہوا ہے:

"ضرورت ہے۔ ایک بنگالی یا اڑیہ لڑکی کی۔ لڑکی کے لئے منگنی کے بعد کیمسٹ کا کورس سیکھنا ضروری ہوگا، تاکہ شادی کے بعد وہ میرے بیٹے کا ہاتھ بٹا سکے۔ میرے بیٹے کی دواؤں کی دکان ہے۔"

عورتوں کو بے جوڑ شادیوں کی شکایت نہیں رہے گی

کیرالہ کے تری چور ضلع میں ایک انوکھی اور بے جوڑ شادی ہوئی۔ دولہا کی عمر ۲۳ سال ہے۔ اُس کا نام مجید ہے۔ دُلہن کا نام اچھوتاماں ہے۔ اُس کی عمر ۵۳ سال ہے۔ اچھوتاماں تین بار کی طلاق یافتہ ہے۔ اس کے چار بچے ہیں۔

ایک پیسے پر جھگڑا

گوا میں تیل صاف کرنے کے تین بڑے کارخانے ہیں۔ یہ کارخانے حکومت کی ملکیت ہیں ٹرکوں اور ٹینکروں کی ایک بڑی تعداد تیل کو باہر لے جاتی ہے۔ کچھ عرصے سے ٹرکوں کے مالکان اور تیل کی کمپنیوں کے درمیان جھگڑا چل رہا ہے، جس کے نتیجے میں ٹرکوں کے مالکان نے ہڑتال کردی ہے۔ جھگڑے کی بنا ٹرکوں کے کرائے میں ایک پیسے کا اضافہ ہے۔

قبیلے میں زندگی کی لہر

ہندوستان کے جنوب مشرق میں جزائر انڈیمان واقع ہیں۔ یہ کالے پانی کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ یہاں کئی قبیلے آباد ہیں۔ ایک قبیلہ صرف ۲۱ انسانوں پر مشتمل ہے۔ اس قبیلے میں دس برس سے کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ ۱۱ مئی ۷۷ء کا دن اُن لوگوں کے لئے ایک یادگار دن ثابت ہوا، جب دس سال کے بعد یہاں ایک بچہ پیدا

ہوا اور ان لوگوں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔

انسانی قربانی کی رسم آج بھی موجود ہے

اڑیسہ کے پوری ضلع میں کچھ لوگوں نے ایک انسان کی قربانی دینے کا فیصلہ کر لیا۔ پولیس کو بروقت اس بات کا علم ہوگیا اور اس سلسلے میں چھ آدمیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس طرح قربانی کا شکار ہونے والے انسان کی جان بچ گئی۔

حکومت کا نشہ

جیند میں ایک میونسپل افسر نے ایک رکشا والے کے تھپڑ رسید کیا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے اس غریب کو اس بات پر بھی مجبور کیا کہ وہ زمین پر جھک کر اپنی ناک سے لکیر کھینچے۔ اس ظلم کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ رکشا والے نے ۵۰ پیسے کرایہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ کرایہ اس افسر کو چار کیلومیٹر تک کھینچنے کے عوض تھا۔

سائیکل پر بیٹھ کر گنگا پار کی

دوارکا پرشاد چوراسیہ میرپور کے ایک مشہور سائیکل سوار ہیں۔ انہوں نے چار مٹی کے تیل کے ڈبوں کو باندھ کر ان پر اپنی سائیکل کھڑی کر لی اور اسی حالت میں انہوں نے گنگا کو پار کر لیا۔

ایمرجنسی کی رعایت سے بچوں کے نئے نام

بڑودہ کے وکیل جتیندر ویاس کے یہاں ایک لڑکا اور ایک لڑکی ایمرجنسی کے دوران پیدا ہوئے۔ وکیل صاحب نے اپنی لڑکی کا نام 'میسا' رکھا اور لڑکے کا 'پارول'۔ میسا وہ بدنام قانون ہے جس کی رو سے کسی بھی شہری کو بغیر کسی وجہ کے جیل میں ٹھونس دیا جاتا تھا۔ پارول وہ قانون ہے جس کی رعایت سے قیدی کچھ دنوں کے لئے جیل سے گھر آ سکتا ہے۔ 'پارول' کی مدت ختم ہونے کے بعد اُسے واپس جیل جانا پڑتا ہے۔

لڑکیوں کو چھیڑنے کا نتیجہ

بہار کے موضع سیدنا تلہ سے ایک برات گذر رہی تھی۔ کچھ لڑکیاں گاؤں کے کھیتوں میں کام کر رہی تھی۔ وہ برات دیکھنے کے لئے کھڑی ہوگئیں۔ براتیوں میں چند سر پھرے لوگوں نے ان پر آوازے کسنے شروع کر دئے۔ لڑکیوں نے ان کی بدتمیزی پر مونھ بنا لیا۔ کچھ لڑکیوں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ہوتے ہوتے بات بڑھ گئی اس اثنا میں کچھ لڑکیاں بھاگی بھاگی گاؤں پہنچ گئیں اور گاؤں والوں کو تمام حالات سے آگاہ کیا۔ گاؤں والے فوراً موقع پر پہنچ گئے۔ اور انہوں نے باراتیوں پر اینٹیں اور پتھر برسانے شروع کر دئے کچھ براتی زخمی ہوگئے۔ براتیوں کے پاس بندوق تھی۔ انہوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ اس فائرنگ کے نتیجے میں گاؤں والوں کا ایک آدمی ہلاک ہوگیا۔

مچھروں کی مستعدی

انڈین کونسل آف میڈیکل ریسرچ کے اندازے کے مطابق پانڈیچری کا ہر ایک باشندہ مچھروں کی مستعدی کا شکار ہوتا ہے۔ مچھروں کے کاٹنے کا اوسط ایک دن میں ۲۴۲ ہے۔ اس طرح پانڈیچری کا رہنے والا ہر انسان اپنے آپ کو ہر روز ۲۴۴ بار مچھروں کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔

آدمی کے کاٹنے سے سانپ کی موت

مدھیہ پردیش کے ایک گاؤں بلودابلزار میں ایک آدمی نے سانپ کو کاٹ لیا۔ اس واقعہ کے ۱۵ منٹ بعد سانپ مر گیا۔ سانپ کو کاٹنے والے کا نام گبتو میاں ہے۔ اُن کی عمر ۶۰ سال ہے۔ گبتو میاں کا بیان ہے کہ وہ کئی سال سے ایک بُوٹی کا استعمال کر رہے ہیں۔ اس بُوٹی کا نام سوندھ کچلہ ہے۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ اُس کا استعمال انسان کو ہر قسم کے زہر سے محفوظ رکھتا ہے۔ گذشتہ سال ایک ایسے شین کتے نے گبتو میاں کو کاٹ لیا تھا۔ ۲۴ گھنٹے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ وہ کتا مر گیا۔

ایک انوکھا احتجاج

موتی لال کامرس کالج کلکتہ میں بی اے کے پہلے سال کا امتحان تھا۔ لڑکے اپنے ساتھ کتابیں اور نوٹس لائے تھے۔ وہ اُن کی مدد سے پرچہ حل کرنا چاہتے تھے۔ نگراں نے انہیں نقل کرنے کی اجازت نہیں دی۔ نتیجے میں لڑکوں نے امتحان کا بائیکاٹ کر دیا اور امتحان کے کمرے سے باہر آگئے۔

ایک تربوز خریدنے پر تحفہ مفت

بمبئی میں مسز ڈی سوزا نے ایک تربوز خریدا۔ اس کی قیمت ڈھائی روپے تھی۔ جب وہ تربوز لے کر گھر پہنچیں تو انہوں نے اس میں ایک سوراخ دیکھا۔ جب تربوز کے دو ٹکڑے کئے گئے، تو انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تربوز میں ایک سانپ نے بسیرا کر رکھا تھا!

ایک عجیب الخلقت بچہ

جنوبی ہند میں ایک عورت نے ایک لڑکی کو جنم دیا جس کے ۳ سر ہیں۔ ۲ سروں پر چہروں کے نقوش واضح ہیں تیسرے سر پر چہرے کے نقوش موجود نہیں ہیں۔

آزمائش اور ترتیب : رشیدہ خاتون

باورچی خانہ

مزے دار اور آزمودہ پکوان

کوفتے پلاؤ

قیمہ باریک	۲۵۰ گرام
چاول	۲۵۰ گرام
لال مرچ	۳ عدد
ہری مرچ	۴ عدد
ہلدی	پاؤ چائے کا چمچہ
الائچی بڑی	۲ عدد
لونگ	۵ عدد
ادرک	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
لہسن	آدھا چائے کا چمچہ
پیاز	(درمیانہ سائز) ۲ ڈلی
تیز پات	۲ عدد
انڈا	ایک عدد
ہرے دھنیئے کی پتیاں	آدھی پیالی
گھی	حسبِ ضرورت
نمک	حسبِ ذائقہ

چاولوں کو صاف کر کے پکانے سے دو گھنٹے پہلے بھگو دیں۔

لونگ، الائچی، ہری مرچ نمک اور ہرے دھنیئے کی آدھی پتیوں کو سل پر باریک پیس کر قیمے میں ملا دیں پھر قیمے کو بھی سل پر خوب باریک پیس لیں، انڈا پھینٹ کر قیمے میں ملائیں پھر قیمے سے بہت چھوٹے چھوٹے کوفتے بنائیں

کڑھائی میں گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں گھی گرم ہو جائے تو اس میں کوفتوں کو تل لیں پھر گھی سے نکال کر علیحدہ رکھ لیں۔

پیاز چھیل کر لچھے کاٹ لیں۔ ایک دیگچی میں پیاز کے لچھے اور آدھی پیالی گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں، پیاز بادامی ہو جائے تو آدھی پیاز گھی سے نکال کر کسی پلیٹ میں پھیلا دیں باقی پیاز میں ادرک، لہسن، ہرے دھنیئے کی پتیاں، ہلدی، نمک اور چاول ڈال کر ایک دو منٹ بھون لیں پھر چاول گلنے کے اندازکا پانی ڈال کر دیگچی کو ڈھانپ دیں۔ چاولوں میں ایک کنی رہ جائے تو آنچ سے اتار لیں۔ اب آدھے چاول دیگچی سے نکال لیں۔ باقی کے چاولوں پر تلے ہوئے کوفتے رکھ دیں، ان پر بقیہ چاول بھی ڈال دیں۔

ایک فرائی پان میں دو ٹیبل اسپون گھی اور لال مرچ ڈال کر آنچ پر رکھ دیں مرچیں پھول جائیں تو گھی سمیت چاولوں کی دیگچی میں ڈال دیں اور دیگچی کو ڈھانپ کر دوبارہ دھیمی آنچ پر رکھ دیں۔ پانچ سات منٹ بعد دم پر ڈال دیں۔

ڈش میں نکالنے کے بعد اوپر سے تلی ہوئی پیاز چھڑک دیں

شاہی سویاں

سویاں	۱۲۵ گرام
دودھ	۲ کلو
بادام	۱۵ عدد
پستہ	۲۰ عدد
ناریل (سوکھا)	۲ انچ کا ٹکڑا
کشمش	۲۰ عدد
زعفران	آدھا چائے کا چمچہ
چھوٹی الائچی	۴ عدد
چینی	ایک پیالی
گھی	پاؤ پیالی

دودھ کو ابال کر دھیمی آنچ پر اتنا پکائیں کہ دودھ کی مقدار آدھی رہ جائے پستہ، باداموں کو کچھ دیر کے لئے گرم پانی میں بھگو دیں۔ پھر موٹا موٹا کاٹ لیں۔ ناریل کو بھی باریک کاٹ لیں۔ کشمش کو دھو کر ڈنڈیاں توڑ لیں۔ زعفران کو کچھ دیر کے لئے دو چائے کے چمچے پانی میں بھگو دیں پھر کھرل میں باریک پیس لیں۔

ایک دیگچی میں گھی اور الائچیاں ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ الائچیاں بادامی ہو جائیں تو سویاں ڈال کر ہلکا سا بھون لیں، پھر دودھ کی مقدار آدھی رہ جائے تو چینی پستہ، بادام، کشمش اور زعفران ڈال دیں اگر زعفران نہ ہو تو کیوڑہ ڈال دیں۔ سویاں حسبِ ضرورت گاڑھی ہو جائیں تو آنچ سے اتار لیں۔

شیر خرمہ

سویاں	۶۰ گرام

دودھ	۲ کلو
چھوارے	۲۰۰ گرام
ناریل (سوکھا)	۵۰ گرام
بادام	۵۰ گرام
پستہ	۵۰ گرام
چرونجی	۲۵ گرام
الائچی (چھوٹی)	۶ عدد
چینی	ایک پیالی
کیوڑہ	پاؤ پیالی
گھی	۵ ٹیبل اسپون

دودھ کو اُبال لیں۔ چھواروں کی گٹھلیاں نکال کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرلیں۔ ناریل کو باریک باریک کاٹ لیں۔ بادام اور پستے کو کچھ دیر کے لئے گرم پانی میں بھگو دیں۔ پھر چھلکے اتار کر موٹا موٹا کاٹ لیں الائچی کے دانے نکال کر انہیں بھی موٹا موٹا کوٹ لیں۔ اب سوئیوں کو گھی میں ہلکا سا بھون لیں۔

دودھ میں چھوارے ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ چھوارے گل جائیں تو اس میں سوئیاں ڈال دیں۔ پانچ دس منٹ پکنے کے بعد چینی، پستہ، بادام، ناریل اور چرونجی ڈال کر آنچ دھیمی کر دیں، دودھ گاڑھا ہو جائے تو الائچی کے کوٹے ہوئے دانے ڈال دیں اور مزید پانچ سات منٹ پکا کر آنچ سے اتار کر کیوڑہ ڈال دیں۔

لکھنوی دوپیازہ

گوشت (بوٹیاں)	۵۰۰ گرام
پیاز	۵۰، گرام
لال مرچ	۸ عدد
گرم مسالہ	ایک چائے کا چمچہ
لہسن (لپسا ہوا)	۲ چائے کے چمچے
ادرک (لپسا ہوا)	۲ چائے کے چمچے
دہی	ایک پیالی
گھی	ایک پیالی
نمک	حسبِ ذائقہ

گوشت کو دھو لیں۔ مرچوں کی ڈنڈیاں توڑ لیں، پیاز چھیل کر لچھے کاٹ لیں، دہی کو خوب اچھی طرح پھینٹ لیں۔

اب ایک دیگچی میں گھی اور آدھی پیاز کے لچھے ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ پیاز بادامی ہو جائے تو اس میں ادرک، لہسن، نمک اور گوشت ڈال دیں۔ دو چار منٹ بھون کر لال مرچ، باقی کی پیاز اور گوشت گلنے کے انداز کا پانی ڈال کر دیگچی کو ڈھانپ دیں اور آنچ دھیمی کر دیں۔ گوشت گل جائے اور پانی خشک ہو جائے تو دہی ڈال دیں۔ دہی کا پانی خشک ہو جائے اور گھی چھوڑ دے تو گرم مسالہ چھڑک کر دیگچی کو آنچ سے اُتار لیں۔

سُوجی کی کٹلٹ

سُوجی	۲۵۰ گرام
بیسن	آدھی پیالی
لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
رائی	ایک چائے کا چمچہ
ہری مرچ	۳ عدد
ہرے دھنیے کی پتیاں	ایک ٹیبل اسپون
گھی	حسبِ ضرورت
نمک	حسبِ ذائقہ

بیسن کو چھان کر اس میں لال مرچ، ہلکا سا نمک اور پانی ملا کر گھول لیں۔ ہری مرچ کا باریک کچومر کاٹ لیں۔

کڑھائی میں پاؤ پیالی گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں اور اس میں رائی ملا دیں۔ رائی بادامی ہو جائے تو اس میں سُوجی ڈال دیں۔ چمچہ برابر چلاتے رہیں۔ سُوجی بادامی ہو جائے تو ایک پیالی پانی ڈال دیں۔ دو ایک منٹ بعد اس میں ہری مرچ، ہرے دھنیے کی پتیاں اور نمک ڈال دیں۔ سُوجی پھول جائے تو آنچ سے اُتار لیں اور کسی چھوٹی سی گھی لگی تھالی میں ایک چائے کا چمچہ گھی ہاتھ سے چپڑ کر سُوجی کو اس تھالی میں پھیلا دیں۔ اور چمچے سے سب طرف سے برابر کر دیں۔ سُوجی ٹھنڈی ہو جائے تو کسی تیز چھری سے اس کے دو انچ لمبے اور ایک انچ چوڑے کٹلٹ کاٹ لیں۔

فرائی پان میں ایک ٹیبل اسپون گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ کٹلٹ کو بیسن میں ڈبو کر فرائی پان میں ڈال دیں۔ کٹلٹ ایک طرف سے بادامی ہو جائے تو پلٹ دیں۔ جب دونوں طرف سے بادامی ہو جائے تو گھی سے نکال لیں۔ اسی طرح تمام کٹلٹس تل لیں۔

کہنی سُنی

ڈیر بھابی جان:

اگست کے شمارے میں میری کہانی "انتظار کی قیدی" کی اشاعت کے لئے شکریہ

ابھی پچھلے دنوں ایک جدید کہانی کار میری کہانیوں پر تنقید کر رہے تھے کہ میں فن سے بالکل ناواقف ہوں۔ میں نے کہا تھا کہ مجھے کہانی کار ہونے کا دعویٰ کب ہے؟ کوئی واقعہ، کوئی بات جب مجھے مجبور کر دیتی ہے کہ اُسے دوسروں کو سمجھاؤں تو کچھ ٹوٹا پھوٹا لکھ لیتی ہوں۔

اس شمارہ کا اداریہ بے حد حوصلہ افزا ہے۔ خدا کرے لوگ اسے سمجھیں، اس سے اثر قبول کریں، اس پر عمل پیرا ہوں۔

کہکشاں انجم، چنڈی گڑھ

ڈیر بھابی؛

بہت دنوں کے بعد آپ سے مخاطب ہوں۔ لیکن 'بانو' کا مطالعہ پابندی سے جاری رہا ہے۔ ماشاءاللہ بانو مستقلاً خوب سے خوب تر کی طرف جا رہا ہے۔

اگست کا بانو ایک ہی نشست میں 'چاٹ' ڈالا۔ پورے شمارے کی جان ایم کمال کا مضمون "محبت کا تجزیہ" ہے "ایک منزل دو راہیں" اور "بزدل" جیسے افسانوں کی حوصلہ افزائی نہ ہو تو بہتر ہے۔ زمانہ بہت آگے جا چکا ہے۔ کہانی "شیشہ و تیشہ" بہت خوب ہے۔ "لو میرج" بھی اچھی اور ہلکی پھلکی کہانی ہے۔ "گھر کی عزت" بھی قابلِ تعریف ہے۔

اِس کے علاوہ بانو کو تو آپ روز بروز نئے نئے زاویے سے سجا رہی ہیں۔ اس گلدستے کے پھولوں کے رنگ مزید دلکش اور مزید مختلف النوع ہو رہے ہیں اس کے لئے آپ تعریف کی مستحق ہیں۔

یاسین عباسی، علی گڑھ

پیاری بھابی:

تصویری فیچر "ریگستان کے بیٹے بیٹیاں" (بانو: اگست) پڑھ کر سارے سراپا میں جیسے دلولوں کی لہر دوڑ گئی۔ واقعی سخت کوشی کی زندگی کے کچھ اور ہی مزے ہیں۔ تن آسانی کی زندگی میں وہ سنسنی خیز لطف کہاں؟ پھر ناسازگار حالات اور آئے دن کی قدرتی آفات کے باوجود اِن جی دار لوگوں کا ریت کے دامن سے لپٹے رہنا اور مستقلاً ترکِ وطن نہ کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ واقعی ریگستان کے بیٹے بیٹیاں ہیں۔ ریگستان کو اِن سے پیار ہے اور اِن کو ریگستان سے۔ ایسا پیار آسمانی آفتیں بھی نہیں مٹا سکتیں۔

شگفتہ نسرین، بھوپال

بھابی صاحبہ؛

'بانیاں' "ایک منزل دو راہیں" اور 'لو میرج' بہت پسند آئیں۔ 'آپ سے ملئے' کے تحت آپ نے بانو کے پروانوں کو ثریا تمکین سے ملوا کر احسان کیا ہے۔ بانو تو یوں بھی بہت دلچسپ اور سبق آموز ہے، لیکن اگر آپ ہماری رائے جاننا چاہیں تو میں یہی کہوں گا کہ اس میں ایک کالم لطیفوں کا بڑھا دیا جائے اس سے بانو کی شگفتگی اور بڑھ جائے گی۔

وزیرالدین، سہسرام

سوئیٹ بھابی:

اِس بار کا "افتتاحیہ" مجھ جیسے کم زور دل لڑکی کو جو ہمیشہ دوسروں کی ہمدردی اور پیار کی محتاج اور آرزومند رہتی ہے، ایک نئی ہمت، ایک نئی خود اعتمادی، ایک نئی خودداری عطا کر گیا۔

فلفل لنسا کا "اندھا مذہبی جنون" دیکھ کر دل تڑپ گیا، جس نے اپنے دل کے سکون کے لئے اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو قربان کر دیا

عورتوں کے اِسی اندھے اعتقاد اور مذہبی جنون سے فائدہ اُٹھا کر آج ہزاروں ڈھونگی پیر فقیر ان بھولی بھالی عورتوں کو لُوٹتے رہتے ہیں۔ کسی عورت کے بچہ نہ ہو، شوہر کی طرف سے پریشان ہو، مالی مشکلات میں پھنسی ہوئی ہو تو یہ فقیر اُن کی اُن مشکلات کو حل کرنے کا جھانسہ دے کر اُن سے اچھی خاصی رقم اینٹھ لیتے ہیں بہنوں کو چاہئے کہ اِن ڈھونگی پیروں فقیروں سے ہمیشہ ہوشیار رہیں صرف خدا پر بھروسہ کریں اور اُسی کو مدد کے لئے پکاریں اُس سے بڑا کوئی مددگار نہیں۔

شریفہ شمعون علی، اندور

محترمہ:

اگست کے شمارے میں "کہنی سنی" کے تحت اختر راہی صاحب نے عطیہ پروین کے افسانے "وہ ایک نشانی تیری" (بانو: جولائی) سے متعلق جو کچھ بھی لکھا ہے، وہ رواداری کے منافی ہے موصوفہ کے بہت سے افسانے ملک کے مستند جرائد میں آئے دن چھپتے رہتے ہیں۔ اتنی شہرت کے ہوتے ہوئے اُنہیں دوسروں کے یہاں خوشہ چینی کرنے کی کیا ضرورت ہے بھلا راہی صاحب

کو اپنے ذہن پر اس قدر اعتماد تھا تو وہ ایک ادیب کے ناطے موصوفہ کو براہِ راست لکھ کر انہیں مطلع کر دیتے، آپ کو خط لکھ کر اس بات کی تشہیر کرنا نامناسب تھی۔ میری دانست میں اس "حقیقت کشائی" سے عطیہ پروین کی افسانہ نگاری پر کوئی حرف نہیں آسکتا اور نہ کسی کو اس بات سے اثر لینا چاہئے۔

بابر رحیم خاں، جمشید پور

ڈیر آنٹی:

اگست کا افتتاحیہ بہت پُر اثر ہے سیدھا دل میں اُتر گیا۔ "کہی سُنی" میں ایک بہن نے "بزم بانو" کا کالم ختم کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ ایسا ہرگز نہ کریں۔ ہمیں یہ کالم بہت پسند ہے۔ اس کے ذریعہ گویا بہنیں مل بیٹھتی ہیں اور آپس میں بات چیت کرلیتی ہیں میں پڑھے بغیر بانو کسی کو نہیں پڑھنے دیتی ہوں یہ میری عادت ہے آپ ہی کوئی دوسرا طریقہ بتلائے کہ دونوں بہنوں میں صلح ہو جائے۔

یاسمین سلطانہ پیاری سلطانہ، گنٹور

محترمہ بھابی جان!

آپ نے مستقل عنوان "آپ کی ذہنی اُلجھن اور اُن کا حل" کے تحت جو سلسلہ شروع کیا ہے، یقیناً بہت پسندیدہ ہے۔ بانو کی دو بڑی خصوصیتیں ہیں، جس کے لئے آپ واقعی دادِ تحسین کی مستحق ہیں۔ اوّل یہ کہ اس میں مختلف قسم کی لذت اور چاشنی ہے جس سے ہر آدمی کو اپنے ذوق کا سامان مل جاتا ہے۔ دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ بانو کا آپ نے جو معیار رکھا ہے اُس میں تخریبی پہلو کی کہیں سے جھلک بھی نہیں دکھائی دیتی۔ میں نے بہت سے رسالوں کو معیار گرتے ہوئے دیکھا ہے لیکن بانو کے معاملہ میں مجھے کوئی ایسا خدشہ نہیں کیوں کہ اس کا معیار بلند سے بلند تر ہی ہوتا نظر آتا ہے

مظفر الحق، پٹنہ

محترمہ!

میں چند ماہ قبل تک "بانو" پڑھنا اپنے لئے باعث ہتک سمجھتا تھا۔ سوچتا تھا، یہ تو لڑکیوں کا پرچہ ہے۔ لیکن ایک دن ریل سے سفر کرتے ہوئے مجبوری میں مجھے بانو خریدنا پڑا کیوں کہ حسنِ اتفاق سے وہاں اردو کا کوئی دوسرا پرچہ نہ تھا۔ شروع سے آخر تک سرسری نگاہ میں ہی بانو مجھے معیاری نظر آیا۔ اور جب میں نے اس کے مضامین پڑھے تو حیران رہ گیا اور شرمندہ بھی کہ خواہ مخواہ اتنے اچھے پرچے کے خلاف دل میں تعصب لئے بیٹھا تھا۔ اس روز سے ہر مہینے "بانو" کا بے تابی سے انتظار کرنے لگا ہوں۔

زاہد ندیم، پٹنہ

سوئیٹ بھابی:

اگست کا شمارہ ہر اعتبار سے خوب ہے۔ بس اس کی تاخیر سے آمد ذرا کھل گئی۔ تاخیر کے عیب سے قطع نظر بانو آج بھی ہر لحاظ سے جان دار اور روز بروز رُو بہ ترقی ہے۔ میری چھوٹی بیٹی شہلا وقار اُردو پڑھنے سے دُور بھاگتی تھی، مگر صرف بلا ناغہ "بانو" خود پڑھنے کے شوق میں اُس نے اُردو سیکھی ہے، جس کے لئے ہم دونوں کی طرف سے مبارک باد قبول فرمائیں۔

بیگم وقار احمد خاں، گریڈیہہ، بہار

ڈیر بھابی:

اِس بار بانو کے افتتاحیہ نے مجھے اُلجھن میں ڈال دیا۔ ہمدردی ایک انسانی جذبہ ہے۔ ایک اخلاقی فرض۔ لیکن آپ نے کس خوبی سے اِس کو ملامت کا نشانہ بنایا ہے بھابی جواب نہیں آپ کا۔ انسان ہمدردی کرنے والے کو اچھا سمجھتا ہے۔ لیکن ہمدردی تلاش کرنے والے کو بھی بُرا نہیں سمجھتا۔ دراصل دونوں قسم کے انسان ایک دوسرے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ہمدردی جتانے والے کو بُرائی ملتی ہے۔ اور تلاش کرنے والے کو زخم کا مرہم۔ آپ کے تیر کا نشانہ وہ لوگ ہیں جو ہمدردی کی تلاش میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ ہمدردی جتانے والوں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا وہ احساسِ برتری کا شکار نہیں ہوتے ہیں۔ ہم اُس دُکھ میں شریک ہوتے ہیں جو ہمیں لاحق نہیں۔ اِس طرح ہم خود کو دُکھی انسان سے اونچا سمجھتے ہیں۔ اس سے ہماری اَنا کو تسکین ملتی ہے۔ ناہید، بمبئی

ڈیر بھابی:

اگست کے بانو میں سلمیٰ نازنین کے خط نے مجھے بہت متاثر کیا۔ انہوں نے سچ کہا ہے کہ تعصب کی عینک لگی ہو تو دیکھنے والا حقیقت کو اُس رنگ میں دیکھتا ہے جس رنگ کا شیشہ ہو آج کل حکومت حق و انصاف کی بنیاد پر گذشتہ حکومت کے اُن سربراہوں کا پردہ فاش کر رہی ہے جو حکومت کے نشہ میں مست ہو کر عوام کی آزادی کچل رہے تھے۔ لیکن جب اردو کا سوال آتا ہے تو یہ حق و انصاف کہاں چلا جاتا ہے اردو بولنے والوں کے لئے اِس معاملے میں دونوں حکومتیں برابر ہیں، ضروری ہے کہ اردو کو اُس کا مقام دیا جائے، کم از کم یوپی اور بہار میں اردو کو ثانوی درجہ ملنا چاہئے۔ نثار احمد، مونگیر

دل کش بیل



شمع
منی معمّہ
نمبر ۲۴

★ اب آپ ایک شمع ادبی معمہ اور دوسرے شمع ادبی معمہ کے حل بھیجنے کے درمیان اپنے ادبی ذوق کی تسکین کر سکتے ہیں منی معمہ کے ذریعے!

★ کوئی ٹوکن بھیجنے کی قید نہیں!

★ جتنے حل جی چاہے بھیجئے اپنے تمام حلوں کی فیس ایک یا ایک سے زیادہ منی آرڈر پوسٹل آرڈر یا نقد ناموں سے بھیج سکتے ہیں

★ آپ ہر حل پر انعام کے حق دار بن سکتے ہیں فیس داخلہ، فی حل صرف ایک روپیہ

★ صرف آٹھ اشارے انعام پانا کس قدر آسان!

★ فیس داخلہ بھیجنے کے لئے شمع ادبی معموں کے نقد نامے استعمال کئے جا سکتے ہیں یا پوسٹل آرڈر، منی آرڈر بھیجئے۔ اپنے حلوں کے ساتھ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید ضرور بھیجئے۔

صحیح حل: جوابی لفافہ بھیج کر منگوا لیجئے یا پھر اگلے ماہ نامہ "بانو" یا ماہ نامہ "شمع" میں دیکھئے۔

★ شمع منی معمہ نمبر ۲۴ کا نتیجہ اکتوبر ۱۹۷۷ کے "بانو" میں، نومبر ۱۹۷۷ کے شمع میں شائع کیا جائے گا۔

Rs. 8,000.00

آٹھ ہزار روپے کے نقد اِنعام

پہلا انعام بالکل درست حل پر: پانچ ہزار روپے۔ دوسرا انعام ایک غلطی والے حل پر: تین ہزار روپے

فیس داخلہ فی حل: ایک روپیہ۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ فیس داخلہ پوسٹل آرڈر، منی آرڈر یا شمع ادبی معموں کے نقد ناموں کے ذریعے ادا کی جا سکتی ہے۔ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانہ سے ملنے والی رسید اپنے حلوں کے ساتھ بھیجئے۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ ان کی فیس ایک ساتھ بھیج سکتے ہیں اور ہر حل پر علیحدہ انعام کے حق دار ہو سکتے ہیں۔ کوئی ٹوکن بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ٹوکن بھیجنے کی شرط کے علاوہ شمع ادبی معموں کی دوسری تمام شرائط شمع منی معموں پر بھی عائد ہیں۔ ان کی پابندی ضروری ہے۔

دفاتر شمع (نئی دہلی) میں ڈاک سے اور دستی حل وصول ہونے کی آخری تاریخ، ۲۴ ستمبر ۱۹۷۷ء ۸ بجے رات تک

شمع منی معمّہ نمبر ۲۴

۴ م	۳	۲ کھ	۱	■	■
	لا	ے	لا	■	■
	ا		■	ل	۵
و	ن	■	ت	ا	۶
م	■	ت			۷ م
■	ے	ن	ا	ل	۸

اشارے

اوپر سے نیچے

۱۔ عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ ـــــ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

۲۔ گاؤں سے آئے ہوئے اتنا زمانہ بیت گیا۔ ابھی تک وہ ـــــ یاد آتے ہیں

۳۔ ـــــ تم کو دل لگانے کے لئے نہیں۔ خدمت اور عبادت کے لئے بھیجا گیا ہے

۴۔ یہ ـــــ عورت آج اپنی دنیا لٹ جانے پر بین کر کے در و دیوار ہلا رہی ہے۔ لیکن اس کی دنیا آباد تھی ہی کب

دائیں سے بائیں

۵۔ ـــــ کر کسی سے بات کر لینا دل میں کینہ رکھنے سے ہزار درجہ بہتر ہے

۶۔ بس اس ایک ـــــ پر مکمل یقین لے آؤ۔ تمہارے دل کے سبھی دکھ دور ہو جائیں گے اور سکونِ قلبی حاصل ہوگا

۷۔ مادیت کے اِس دور میں انسانی ـــــ کو بھی سکوں میں تولا جاتا ہے اور

۸۔ حرکت میں برکت ہے۔ ہاتھ پیر ـــــ والا کبھی بھوکا نہیں رہتا

●●

شمع اَدَبی معمّے (شمع مِنی معمّہ نمبر ۲۴) ماہ نامہ شمع، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱

شمع منی معمہ نمبر ۲۴ کا صحیح حل ۲۴ ستمبر ۱۹۷۷ کو صبح ساڑھے نو بجے ظاہر کر دیا جائے گا۔ صحیح حل اور انعام پانے والوں کے نام اکتوبر ۱۹۷۷ کے "بانو" میں شائع کئے جائیں گے۔ انعام پانے والوں کی تفصیلات شمع، نومبر ۱۹۷۷ میں بھی شائع کی جا سکتی ہیں


نت نئے ڈیزائن میں
لڑکیوں کے
خوب صورت لباس





آٹھ ہزار روپے کے نقد انعامات کی شاندار تقسیم!

شمع منی معمہ نمبر ۲۳ میں چھبیس صحیح حل آئے

صحیح حل شمع منی معمہ نمبر ۲۳

		و	کھ	س	س
		ہ	ڑ	ہ	س
ل	ج		ی	م	ک
ڑ	ک	پ		ی	ن
س	ا	ی	ع		ا
س	ا	ک	ن	ا	

شمع منی معمہ نمبر ۲۳ آسان ثابت ہوا اور چھبیس پڑھنے والے بالکل درست حل تک پہنچ گئے۔ ان چھبیس درست حلوں پر پہلا انعام مبلغ پانچ ہزار روپے تقسیم کیا گیا۔

شمع منی معموں کی تیز رفتاری بے مثال ہے۔ درست حل ظاہر کئے جانے کے چند ہی گھنٹوں میں چیکنگ ختم کر کے تقسیم انعامات کی تفصیلات کا اعلان کر دیا گیا۔ جو پڑھنے والوں نے صحیح حل ملانے کے لئے بھیجے تھے انہیں تقسیم انعامات کی تفصیلات بھی لکھ دی گئیں۔

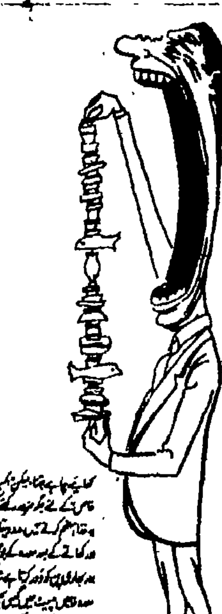
دوبارہ جانچ کے لئے کسی کلیم کا انتظار کئے بغیر ہی پہلے اور دوسرے انعامات کے منی آرڈر بھیج دئے گئے۔

بالکل درست حل چھبیس وصول ہوئے جن پر پہلا انعام مبلغ پانچ ہزار روپے بحساب ۱۹۲ روپے ۳۱ پیسے فی حل تقسیم کیا گیا:

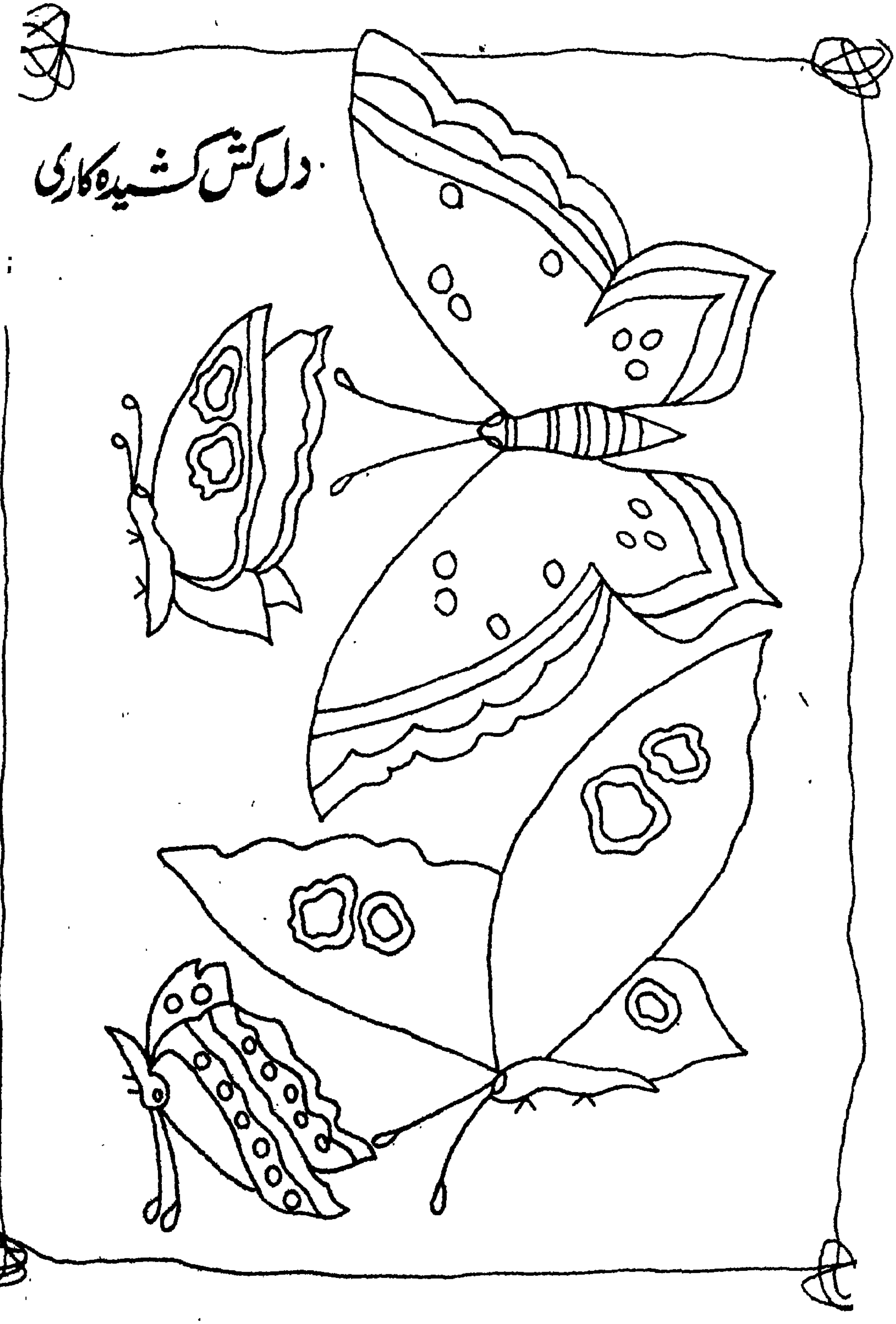
۱۔ لیاقت علی احسان علی انصاری صاحب، ترپال کی چال، راجپور گومتی پور، احمد آباد
۲۔ ایس۔ ایل۔ احمد صاحب معرفت حکیم عبدالواسع صاحب، محلہ نیر پور، بہار شریف (نالندہ)
۳۔ عبدالمجید شاہ صاحب معرفت ڈیپارٹمنٹ آف کیمسٹری، امر سنگھ کالج، سری نگر
۴۔ حسیب احمد صاحب معرفت رحمن واچ کمپنی، نیا بازار، سیوان (بہار)
۵۔ چندہ خاں صاحب، دوکاندار، محلہ سوتھ، بدایوں
۶۔ قدیر احمد صاحب مکان نمبر ۲۰۵۱، احاطہ تیلی صاحب، سوداگران، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶
۷۔ ڈاکٹر دھرم دیو صاحب، آر۔ ایم۔ پی، ڈی ۲۸، راجوری گارڈن، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۷
۸۔ محمد ابراہیم انصاری صاحب، ۱۸۰۹، کٹرہ شیخ چاند، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶
۹۔ نور احمد صاحب، عابد سنز، نئی سڑک، مراد آباد
۱۰۔ ثروت جہاں صاحبہ معرفت سید آل رضا رضوی صاحب پرنسپل آفیسر لوناکرک چارٹی، ڈاک خانہ لونا ضلع دھنباد
۱۱۔ وجے کمار کھوسلہ صاحب، ۶۵ زیرو روڈ، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳
۱۲۔ لالہ ... پرشاد صاحب، پرشادی لال روڈ، نزد تاڑی خانہ، مراد آباد
۱۳۔ محمد اقبال احمد صاحب معرفت جیون سوپ کمپنی، مقام و ڈاک خانہ جھنڈا بازار ضلع بردوان
۱۴۔ محمد انیس صاحب این۔ ایم۔ اے، زنانہ اسپتال، بھوری ضلع کھیری ۲۶۲۸۰۴
۱۵۔ درگا پرشاد صاحب سنار، پرانی بستی، ضلع بستی ۲۷۲۰۰۲
۱۶۔ غلام رسول صاحب مکان نمبر ۱/۷۱، راجہ پورہ، وارانسی ۲۲۱۰۰۱
۱۷۔ محمد اسلام صاحب معرفت حلیم ستری نمبر ایچ۔ اے بی روڈ، ڈاک خانہ ریشڑا ضلع ہگلی
۱۸۔ ضیاء الہادی صاحب، نزد جامع مسجد، ڈاک خانہ مجھا مغربی چمپارن (بہار)
۱۹۔ جگت پالی صاحبہ دختر سنت رام صاحب، ڈی ۴۳۵ پچھالین، کالکا جی (دہلی)
۲۰۔ ایم اکبر علی خاں صاحب، ٹرنک روڈ، رائے چوٹی ۵۱۶۲۶۹ ضلع کڑپہ
۲۱۔ محمد عمر حاجی داؤد صاحب، ۲۸۰، قصبہ پیٹھ، شولاپور
۲۲۔ محمد خواجہ معین الدین صاحب، فوٹو چیٹ، کلواکرتی ۵۰۹۳۲۴ (محبوب نگر)
۲۳۔ آر۔ ملیشم، ایل۔ ڈی۔ سی، ... آفس، سنگا ریڈی ۵۰۲۰۰۱ ضلع میدک
۲۴۔ سنت رام ... دولت ... ضلع انبالہ
۲۵۔ ایچ۔ محمد شاہنواز صاحب ... روڈ، ... ۵۷۲۱۰۱ (کرناٹک)
۲۶۔ سی۔ محی الدین پیران صاحب جیولرز، ڈیلوٹی (آندھرا)، کڑپہ ۵۱۶۰۰۱

ایک غلطی والے ۲۰۰ حل وصول ہوئے جن پر دوسرا انعام مبلغ تین ہزار روپے بحساب ۱۴ روپے ۳۸ پیسے فی حل تقسیم کیا گیا

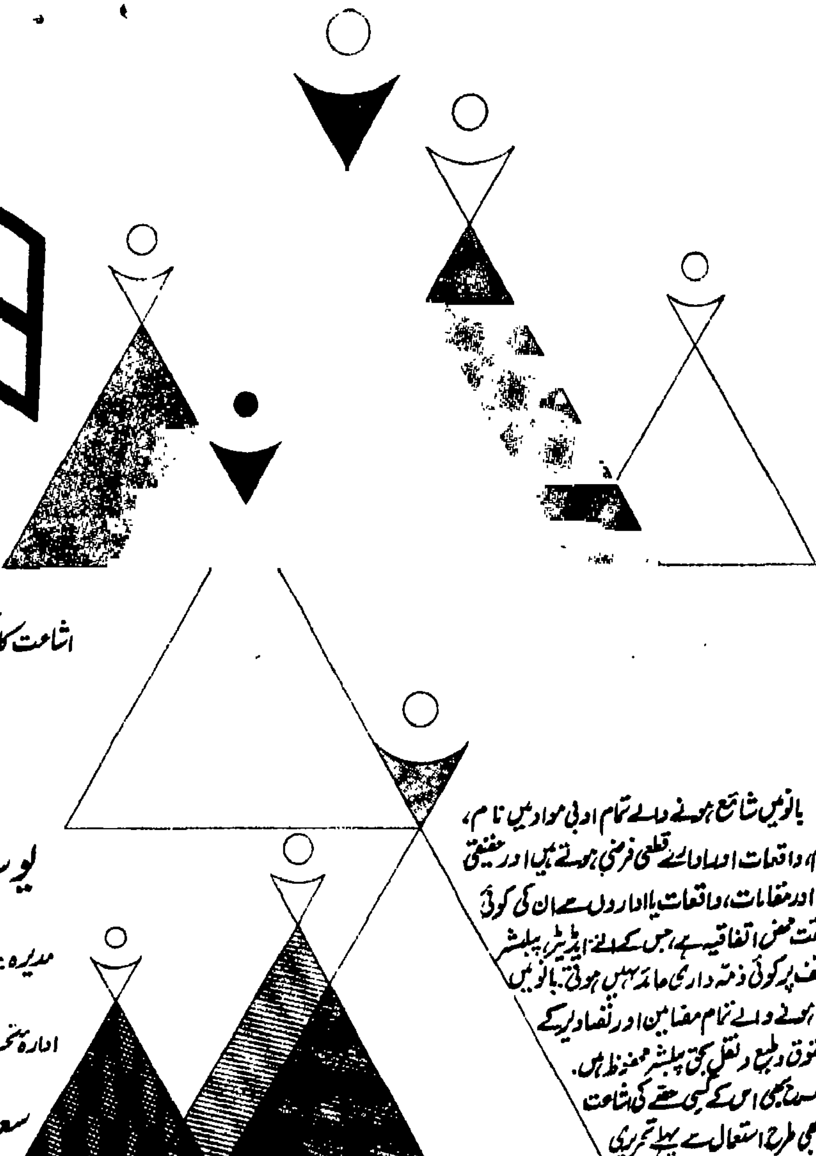
دفاتر شمع کے پتہ میں نمبر کی تبدیلی



دل کش کشیدہ کاری



اکتوبر ۱۹۷۷



اشاعت کا اکتیسواں سال، دسواں شمارہ

نگراں:

یوسف دہلوی

مدیرہ: زینت کوثر دہلوی

ادارۂ تحریر: شمیم آرا دہلوی

سعدیہ دہلوی

مالکان: شمع میگزین ● طابع و ناشر: یونس دہلوی ● مطبوعہ: ایس، پی پریس ● ٹائٹل: بمبئی آفسیٹ پریس

عام شمارے کی قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے، سالانہ قیمت: اٹھارہ روپے (جس میں سالنامہ مفت ملتا ہے)

مقام اشاعت و صدر دفاتر: آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ تار کا پتہ: "شمع" نئی دہلی ٹیلی فون: ۲۷۲۰۶۶، ۲۷۲۰۶۷، ۲۷۲۰۶۸

دیگر دفاتر: بمبئی، کلکتہ اور مدراس

افتتاحیہ

ہر انسان کے دِل میں فطری طور پر نفرت اور محبت کے عناصر ہر وقت موجود ہوتے ہیں،
جب کوئی بہت بڑا مسئلہ حل کرنا ہو یا خاندانی جھگڑوں کے تصفیہ کا موقع آئے تو
انسان کے ذہن میں ان دونوں متضاد جذبات کا آپس میں زبردست ٹکراؤ ہوتا ہے۔
یہی ٹکراؤ انسان کے کردار کی کسوٹی ثابت ہوتا ہے۔ یہی وہ امتحان ہے
جس سے گزر کر انسان کی اعلیٰ ظرفی اور بالغ نظری کا پتہ چلتا ہے۔

اگر انسان دوسروں کے مسائل کو سلجھاتے وقت اپنے نفس پر قابو پا سکے اور
نفرت کے جذبہ کو کچلنے میں کامیاب ہو جائے، تو بغیر کسی جھگڑے فساد کے
بڑی خوش اسلوبی اور ذمہ داری کے احساس کے ساتھ معاملہ کو سلجھا سکتا ہے۔
اس کے برعکس، جو انسان اپنے دل سے حسد اور نفرت کے جذبات کو
ختم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو اسے ثالث بننے سے گریز کرنا لازم ہے، خواہ اسے
کسی ایک فریق سے کتنی ہی ہمدردی یا محبت کیوں نہ ہو،
کیوں کہ وہ اپنی ذہنی ناپختگی کی وجہ سے معمولی سی بات کا بھی بتنگڑ بنوا دے گا،
اور ایک فریق سے اپنی جذباتی وابستگی کے باعث
یک طرفہ فیصلے فریقین پر ٹھونسنے کی کوشش کرے گا۔ ایسا شخص کتنے ہی اوصاف کا مالک
یا کتنا ہی قریبی رشتہ دار کیوں نہ ہو اس کی بات کو وزن نہ دینا یقیناً سمجھداری کا ثبوت
ہو گا، کیوں کہ اپنے نفس کو قابو میں نہ رکھنے والا انسان ذہنی طور پر نابالغ ہوتا ہے،
جب کہ ثالث بننے کے لئے پختہ ذہنی، ناوابستگی اور
غیر جانبداری بے حد ضروری ہے۔

زینت کوثر دھلوی

ناگا عورتیں

ام۔ کمال

چپٹی ناک، چھوٹا قد، سانولا رنگ اور چینیوں کے سے خد و خال ۔۔۔۔ یہ ناگا لینڈ کی عورت کی تصویر ہے۔ ناگا لینڈ میں مختلف قبائل آباد ہیں۔ سب سے بڑا قبیلہ انگامی ہے ۔۔ ناگا لینڈ کی راج دھانی کوہیما انگامی علاقے میں ہے۔ شمال میں چین کی سرحد کے پاس لوٹا اور [illegible] قبیلے آباد ہیں۔ برما کی سرحد کے پاس سے ما قبیلہ رہتا ہے۔ سے ما قبیلہ ناگاؤں میں سب سے زیادہ بدصورت مانا جاتا ہے۔ مردوں کے خد و خال تو کچھ غنیمت لگتے ہیں، لیکن یہاں کی عورتیں کافی حد تک بدصورت ہوتی ہیں۔

ناگا عورتوں کا لباس بہت مختصر ہوتا ہے۔ بس ایک پیٹی کوٹ جو ناف سے گھٹنوں تک لٹکتا رہتا ہے، اور ایک معمولی سا کپڑا سینہ ڈھانکنے کے لئے۔ یہ کپڑا بھی آج کل استعمال ہوتا ہے۔ ماضی میں تو عورتیں ننگا سینہ ہی لئے پھرتی تھیں۔ نابالغ لڑکیاں آج بھی اسی طرح رہتی ہیں ۔۔ سے ما قبیلے میں لڑکیوں کے سر مونڈے جاتے ہیں۔ یہ سر منڈائی ۱۲ ، ۱۴ برس تک جاری رہتی ہے۔ لڑکی بالغ ہو جاتی ہے تو اسے سر کے بال بڑھانے کی آزادی ہوتی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ شکل میں نابالغ لڑکی کی پہچان ہو جائے اور بات چیت میں احتیاط برتی جائے۔ دوسری وجہ غالباً جوؤں کی زیادتی ہے۔ سر منڈانے سے جوؤں کا تدارک ہو جاتا ہے۔

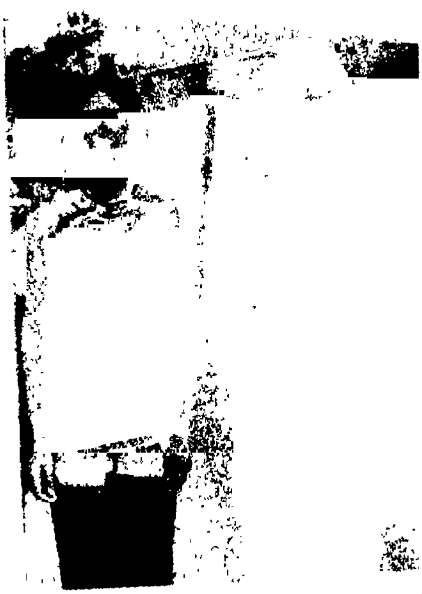
سے ما قبیلے میں ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کا رواج ہے تو سہی، مگر صرف امیر آدمی ہی اس رواج کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ بیویوں کی تعداد کی کوئی قید نہیں۔ بعض زمیں دار سات بیویاں تک رکھتے ہیں۔ گھر میں درجنوں بچے ہوتے ہیں۔ سے ما بیویاں آپس میں پیار محبت سے رہتی ہیں۔ اس کے برعکس لوٹا قبیلے میں عورتیں آپس میں لڑتی جھگڑتی ہیں۔ انگامی اور آؤ قبیلے میں بچوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہوتی ۔۔ سے ما قبیلے میں بچوں کو ترکش کے تیر کہا جاتا ہے۔ ترکش میں جتنے تیر ہوں گے، انسان اتنا ہی محفوظ رہے گا۔ لڑکے بڑھاپے کا سہارا ہوں گے اور لڑکیاں شادی کی قیمت دلائیں گی۔ یہ لوگ محبت کے اظہار کے قائل نہیں۔ ان کے پاس محبت جتانے اور محبت بھری تسکین کرنے کے لئے وقت نہیں۔ یہاں ایک فصل سال بھر کے لئے کافی نہیں ہوتی۔ اس لئے ابھی ایک فصل کاٹ کر کھلیانوں میں رکھی اور دوسری فصل کی کاشت شروع کر دی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو دیکھے بغیر شادی کر لیتے ہیں، بلکہ لڑکے لڑکی کی مرضی کے ساتھ ساتھ ماں باپ کی رضامندی بھی شامل ہوتی ہے۔ یہاں [illegible] کی آوارگی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس کے برعکس انگامی قبیلے میں شادی [illegible] کرتی لڑکی کنواری رہتی ہے۔ سے ما قبیلے میں ایک رواج یہ بھی ہے کہ باپ کے مرنے کے بعد بیٹا اپنی سوتیلی ماں سے شادی کر سکتا ہے۔ اس طرح مرنے والے کا روپیہ پیسہ اور زمین گھر ہی میں رہتی ہے۔ ان دیگروں میں جو اہمیت ماموں کے رشتے کو حاصل ہے وہ کسی رشتہ دار کو حاصل نہیں ہوتی۔ جنوبی ہند کے نائر قبیلے میں بھی ماموں کو یہی اہمیت حاصل ہے۔ ٹراونکور اور کوچین کی ریاستوں میں بیٹے کی بجائے بھانجا تخت کا وارث ہوتا تھا۔ ان ریاستوں میں مادری سلسلۂ نسل جاری تھا۔ یعنی یہاں نسل باپ سے نہیں بلکہ ماں سے چلتی تھی۔ ممکن ہے کہ زمانۂ قدیم میں ناگا لینڈ میں بھی یہی مادری سلسلۂ نسل رائج رہا ہو۔

سے ما قبیلے میں طلاق آسان ہے۔ اگر بیوی بدچلن ہو تو اسے گھر سے نکال دیا جاتا ہے۔ شادی پر دیا ہوا زیور ضبط کر لیا جاتا ہے۔ عموماً بیوی کو ایک [illegible] جرمانے میں دینا پڑتی ہے۔ بیوی [illegible] ہے۔ اس [illegible] روپے واپس کرنے پڑتے ہیں۔ سے ما کے پڑوسی قبیلے آؤ [illegible] عورتیں اکثر طلاق [illegible] رہتی ہیں۔ یہاں [illegible] کی آزادی ہے۔ شادی شدہ عورت کا دل کسی دوسرے [illegible] پر آجائے تو اسے اپنے [illegible] کی ضرورت نہیں۔ وہ جب دل چاہے



◄ عورتیں بہت سرور میں ہیں

◄ ان کا ایک ناگا کنبہ



شوہر کو اپنے دام میں واپس کر کے اُس سے پیچھا چھڑا سکتی ہے۔ اس آزادی میں صرف ایک رُکاوٹ ہے۔ یہاں بیوی کو تین سال تک مل کر رہنا پڑتا ہے۔ علیٰحدگی تین سال کے بعد ہی ہو سکتی ہے۔

چند سال پہلے ناگاؤں کا اہم ترین مشغلہ سر کاٹنا تھا۔ دشمنوں کے علاوہ اجنبی بھی اس مشغلے کا نشانہ بن جاتے تھے۔ نوجوان سروں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تھے۔ سر خواہ دھوکے سے کاٹا جائے یا لڑائی میں، بہرحال سر کاٹنے والے کی عزت کو چار چاند لگا دیتا تھا۔ عورتوں کے سر بہت مشکل سے دستیاب ہوتے تھے، کیوں کہ عورتیں اپنے گھروں سے باہر نہیں نکلتی تھیں اور لڑائیوں میں حصّہ نہیں لیتی تھیں۔ سر کاٹنے کا رواج تقریباً ختم ہو گیا ہے۔

سے ما قبیلے میں مُردوں کو جلایا نہیں جاتا، اُنہیں گھر کے سامنے ہی دفنایا جاتا ہے۔ اگر مرنے والا مرد ہے تو اس کی قبر کے گرد چار دیواری کھینچ دی جاتی ہے۔ قبر پر سائے کے لئے چھپر ڈال دیا جاتا ہے۔ عورتوں کی قبر چار دیواری اور سائے سے محروم رہتی ہے۔ سے ما قبیلے کا عقیدہ ہے کہ موت کے بعد وہ تمام جانور اس کی رُوح سے انتقام لیتے ہیں جنہیں اُس نے اپنی زندگی میں مارا ہو، اس لئے انسان کی موت کے فوراً بعد اس کا محبوب کُتا بھی مار دیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ اپنے مالک کی رُوح کی حفاظت کرے اور اُسے باقی جانوروں کے انتقام سے بچائے۔ اگر مرنے والے کے پاس کوئی کُتا نہیں تو ایک کُتا اس کے نام سے خرید کر مار دیا جاتا ہے۔ کوئی اس کُتے کو کھاتا ہے۔ اگر ایک کُتا کسی انسان کو کاٹ لے تو اُسے فوراً کاٹ کر کھا لیا جاتا ہے، اس طرح اُن کے خیال میں کُتے کے کاٹے کا علاج ہو جاتا ہے۔

ان لوگوں کی خوراک ناقص ہے۔ یہ لوگ صرف چاول پر گزارا کرتے ہیں۔ چاول کے ساتھ یہ کبھی کبھی گوشت بھی کھاتے ہیں۔ انہیں اچھا کھانا پکانا نہیں آتا۔ یہ ہر چیز کو اُبال کر کھاتے ہیں۔ بھوننا، مسالہ ڈالنا اور بگھارنا اُن کے لئے ایک عجوبہ شے ہے۔ یہ لوگ جانور کی کوئی چیز ضائع نہیں کرتے۔ اُس کی کھال اور آنتیں تک کھا جاتے ہیں۔ صرف سینگ، کھُر اور ہڈیاں چھوڑ دیتے ہیں۔ مینڈک اور پرندوں کو یہ ہڈیوں سمیت کھا جاتے ہیں۔ یہ لوگ بلّی، چوہے اور شیر کو نہیں کھاتے۔ سبزیوں میں صرف بانس اور پانی کا چوہا کھاتے ہیں۔ پانی کا چوہا پیٹ کے امراض خاص طور پر پیچش کے لئے مفید سمجھا جاتا ہے۔ چمگادڑ اور گلہری اس لئے نہیں کھاتے کہ اس سے ان کے خیال میں پاگل ہو جانے کا خطرہ ہے۔ چمگادڑ کا گوشت کھانے سے ان کے عقیدے کے بموجب انسان رات بھر مارا مارا پھرتا ہے۔ گلہری کا گوشت



کھانے والا دن میں بے مقصد اِدھر اُدھر پھرتا ہے ۔ بندر کھانا بھی منع ہے ۔ کیوں کہ اس کا گوشت کھانے سے انسان شور مچانے لگتا ہے ۔ بندر کا گوشت بوڑھے لوگ کھا سکتے ہیں ۔ یہ لوگ پانی کا استعمال بہت کم کرتے ہیں ۔ چاول کی شراب انہیں بہت پسند ہے ۔ آج کل چائے کا رواج بھی ہو گیا ہے ۔



▲ ناگا بینڈ کا کھلا ہوا مکان

◄ کپڑا بننے کی مشین

دنیا کے دوسرے پس ماندہ قبیلوں کی طرح سے ما قبیلہ بھی بھوت پریت اور جادو ٹونے پر اعتقاد رکھتا ہے ۔ یہ لوگ کوڑیوں کا ہار پہنتے ہیں ۔ کسی انسان کے گلے سے ہار اُتارنا سخت گناہ تصور کیا جاتا ہے ۔ اس کے لئے جُرمانہ بھرنا پڑتا ہے ۔ مرد عورت کے بیٹی کوٹ کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا ۔ اگر وہ اس جُرم کا مرتکب ہو جائے تو پھر اُسے شکار نہیں ملتا ۔ ایک عورت نے غصے میں اپنے خاوند کی بندوق پر اپنا پیٹی کوٹ دے مارا ۔ وہ بندوق پھر کبھی نہیں چلی ۔ اس آدمی کو زندگی بھر اس بندوق کا شکار کرنا نصیب نہیں ہوا ۔ کسی کے گھر کی آگ بجھانا بھی گناہ تصور کیا جاتا ہے ۔ اگر کوئی انسان دوسرے کے گھر کا چولہا ٹھنڈا کر دے تو اُسے جُرمانہ بھرنا پڑتا ہے مرغ گھر کے باہر قربان کرنا پڑتا ہے ۔ مُرغ کی قربانی سے پہلے کوئی شخص گھر میں داخل نہیں ہو سکتا ۔ اگر گاؤں میں آگ لگ جائے اور گھر تباہ ہو جائیں تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ آگ نے اپنی بھینٹ حاصل کر لی ۔ پھر بہت لمبے عرصے تک آگ کا خدشہ نہیں رہتا ۔ اگر کوئی انسان اپنا مکان تعمیر کرنا چاہے تو وہ مکان کی تعمیر شروع کرنے سے تین روز پہلے گوشہ نشین ہو جاتا ہے ۔ اس وقت وہ کسی اجنبی کو دیکھنا پسند نہیں کرتا ۔







[illegible]

[illegible]

[illegible]

کسی سے بات چیت نہیں کرتا، کسی کو کھانا نہیں کھلاتا۔ مکان عموماً بانس سے بنائے جاتے ہیں۔ بانس زمین میں گاڑنے سے پہلے اس جگہ مرغ مار کر دفن کر دیا جاتا ہے۔ مرغ کو بانس سے ٹکرا ٹکرا کر مار دیتے ہیں۔ اس کے بعد دعا مانگی جاتی ہے:

"مکان کی آبادی بڑھے، گئے بڑھیں، مویشیوں اور آدمیوں میں اضافہ ہو۔ بیماریوں سے حفاظت ہو۔" دوسرے دن سوّر ذبح کیا جاتا ہے۔ مکان کی نیو رکھنے والے کو ران اور باقی کام کرنے والوں کو ہاتھ، سونہہ اور سینہ دیا جاتا ہے۔ مکان تعمیر ہونے کے بعد ایک مرغ کو مار کر چھت سے لٹکا دیا جاتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے گھر چھوڑنا پڑے تو چھپّر میں سوراخ کر دیا جاتا ہے تاکہ گھر کی روح آسانی سے نکل جائے۔ گھروں کے سامنے آسیب سے بچنے کے لئے انگریزی کے حرف وائی کی شکل میں ڈنڈے نصب ہوتے ہیں۔ اس طرح گھر نظرِ بد سے محفوظ رہتا ہے۔

فصل کو کیڑوں سے بچانے کے لئے بلی بالی جاتی ہے۔ ایسی بلّی کی خاص قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ اُن کے خیال میں اگر کوئی انسان اس بلّی کی قیمت ادا نہ کرے تو اس کی آواز بیٹھ جاتی ہے۔ فصل کٹتے وقت خاص احتیاط سے کام لیا جاتا ہے۔ اس موقع پر یہ لوگ پیاز نہیں کھاتے۔ "کُتّے، بلّی اور گائے سے دُور بھاگتے ہیں، جنازے میں شریک نہیں ہوتے، کپڑا نہیں رنگتے۔" اگر کوئی عورت اس موقع پر کپڑا رنگتی دکھائی دے تو اُبلتے ہوئے پانی کا مٹکا اس کے سر پر پھوڑ دیا جاتا ہے، اس طرح اس کے گناہ کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ دوسرے گھر میں کھانا بھی منع ہے۔ کالا دھاگا دھوپ میں نہیں سکھایا جاتا۔ اگر یہ دھاگا صندوق میں بند ہو تو اس کو فصل کٹنے کے زمانے میں صندوق سے باہر بھی نہیں نکالتے۔

ہمالیہ والا



خدمت گار

میں ساحل کے پاس کھڑا سمندری پرندوں کو پانی میں غوطہ لگاتے اور پھر اپنے پَر پھڑپھڑاتے دیکھ رہا تھا۔ حدِ نظر تک کوئی نہیں تھا۔ تیل پانی پر تیر رہا تھا، جس کی وجہ سے پانی کا رنگ سبزی مائل ہو گیا تھا۔ کوئی جہاز بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ قریب بنے ہوئے گودام خالی تھے اور کھنڈر بنتے جا رہے تھے۔ عجیب بے جان فضا تھی۔

میں پھر پرندوں کو دیکھنے لگا۔ پرندے بھی میری طرح بھوکے تھے۔ میں بھوکا بھی تھا اور تھکا ماندہ بھی۔ میں نے اپنی خالی جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا غم بھولنے کی کوشش کی۔ جیب میں صرف کچھ کاغذات تھے۔ لیکن کاغذ سے پیٹ نہیں بھرتا۔ پیٹ بھرنے کے لئے روٹی چاہئے، جو میرے پاس نہیں تھی۔

کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے مُڑ کر دیکھا۔ پولیس کا سپاہی تھا۔ میں نے اپنے شانے چھڑانے کی کوشش کی۔

"خدمت گار!" اُس نے کہا اور میرے شانے اور مضبوطی سے پکڑ لئے۔

"افسر!" میں نے جواب دیا۔

"یہاں کوئی افسر نہیں ہے،" وہ بولا۔ "سب خدمت گار ہیں۔"

"میری خطا کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"خطا؟" وہ طنزاً مسکرایا۔ پھر بولا "تم غمگین نظر آتے ہو!"

یہ سُن کر میں نے ایک قہقہہ لگایا۔

...بات ہے؟ ... اس کا چہرہ غصّے کی وجہ سے بگڑ سا گیا تھا۔ میں نے سوچا شاید وہ کسی طوائف کو سمندر کے کنارے ریت پر اپنا دھندا کرتے ہوئے نہیں پکڑ سکا، یا پھر کسی گندی نالی میں مست پڑے ہوئے شرابی پر ہاتھ نہیں ڈال سکا، اسی لئے مجھے گرفتار کرنا چاہتا ہے۔

میں سوچ ہی رہا تھا کہ سپاہی نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنا دی۔ پولیس کے ہتھّے چڑھنا، کئی دن تک ان کی پٹائی سہنا اور پھر جیل۔ اس سے تو اچھّا تھا کہ سمندر میں ڈوب مرتا۔

اُس نے مجھے ایک جھٹکے سے اس طرح کھینچا گویا میں کوئی جانور ہوں۔

"میرا جُرم کیا ہے جناب؟" میں نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"قانون یہ ہے کہ ہر شخص کو خوش رہنا چاہیئے۔"

"میں خوش ہوں، جناب" میں نے اپنی آواز میں خوشی بھرنے کی کوشش کی۔

"غلط"

"لیکن میں نے اس قانون کے بارے میں کبھی نہیں سُنا"

"کبھی نہیں سُنا؟ یہ چھتّیس گھنٹے پہلے ہی نافذ ہوا ہے۔ نافذ ہونے کے چوبیس گھنٹے بعد ہر قانون پر عمل شروع ہو جاتا ہے۔"

"مجھے اس کا بالکل علم نہیں ہے۔"

"یہ قانون تمام اخبارات میں شائع ہو چکا ہے۔ لاؤڈ اسپیکر پر اس کا اعلان ہوا ہے —— خدمت گار، تم نے پچھلے چھتّیس گھنٹے کہاں گذارے؟"

وہ مجھے گھسیٹ رہا تھا۔ مجھے سردی اور بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اپنے سراپا پر نظر ڈالی۔ میرے کپڑے پھٹے ہوئے تھے، ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی۔

راستے میں ہر فرد خوشی کا مصنوعی لبادہ اوڑھے ہوئے نظر آیا۔ جیسے ہی راہ گیر پولیس کے سپاہی کی جھلک دیکھ لیتا، اُس کا چہرہ روشن ہو جاتا۔ ہر شخص بڑی تیزی سے چل رہا تھا جیسے اپنے دفتر یا فیکٹری سے پوری توانائی اور چُستی کے ساتھ لوٹ رہا ہو۔ میں نے دیکھا کہ لوگ —— جلدی جلدی بھاگ رہے تھے کہ سپاہی کی دسترس سے دُور رہیں اور کسی گھر میں، کسی کارخانے میں پناہ لے لیں۔

جیسے ہی ہم ایک چوراہے کے پاس پہنچے ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کا سامنا ہو گیا۔ وہ ہم سے اتنا قریب تھا کہ ہم دونوں سے بچ کر نکل نہیں سکا۔ قانون کے مطابق اُس نے سپاہی کو ادب سے سلام کیا اور میری طرف دیکھ کر کہا "ملک دشمن!"

اُس نے ضابطے کی کارروائی کی تھی، اس لئے میں نے بُرا نہیں مانا۔ مگر مجھے ایسا لگا کہ ایسا کرتے ہوئے اُس کی آنکھیں نم تھیں۔ اتنے میں ایک سیٹی کی آواز سُنائی دی۔ وہ گھنٹی تھی جس کے بجتے ہی کارندے اپنا کام ختم کر کے ہاتھ مونہہ خوب اچھی طرح دھوتے تھے تاکہ قانون کے مطابق وہ سب خوش دکھائی دیں۔ کارخانوں اور دفتروں سے باہر نکلتے ہوئے انہیں خوش اور مطمئن نظر آنا تھا اور حکومت کے گُن گانے تھے۔

تھانے کے باہر دو سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ اُنہوں نے اپنی رائفل کے دستے سے میری کمر ٹھونکی۔ پھر ہم اندر پہنچے۔ ایک بڑی سی میز کے پاس ایک آدمی سر پر آہنی ٹوپی پہنے ہوئے بیٹھا تھا۔ وہ شاید انسپکٹر یا ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ۔ پھر ایک دوسرا آدمی، جو سادہ لباس میں دوسری کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ پوچھ گچھ شروع۔

"تمہارا پیشہ؟"

"خدمت گار" اگر بے کار نوجوان کہتا تو مار پڑتی۔

"تم حال میں کہاں کہاں تھے؟"

"میں ایک قیدی تھا۔"

"کب اور کہاں؟"

"پولیس لاک اپ نمبر ۱۲ میں —— کل رِہا ہوا تھا۔"

"رہائی نامہ؟"

میں نے اپنی جیب سے رہائی نامہ نکال کر اُن کے سامنے رکھ دیا۔

"تمہارا جُرم کیا تھا؟"

"میں خوش نظر آیا تھا!"

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا

"ہمیں صاف صاف بتاؤ؟"

"صاحب، ایک مہینہ پہلے مجھے گرفتار کیا گیا تھا —— پولیس کا خیال تھا کہ میں مخالف گروپ کا ایجنٹ ہوں اور اس لئے قانون کے خلاف خوش نظر آتا ہوں۔"

سوال و جواب کے بعد مجھے بڑی بے دردی سے پیٹا گیا۔ پھر مجھے پولیس لاک اپ میں بند کر دیا گیا —— دو مہینے کے لئے۔

خوشی سے سرشار چہرے کی وجہ سے مجھے ایک ماہ پولیس کی حراست میں رہنا پڑا، غمگین چہرے کی وجہ سے دو ماہ —— میرا خیال تھا کہ اب کی بار پولیس لاک اپ سے (زندہ) نکل سکا تو بغیر چہرے کے رہوں گا۔ (مرکزی خیال ایک جرمن کہانی سے)

●●

تیری تصویر حسیں، تیرا تصور بھی حسیں
تیری آغوش میں ہنستے ہیں تر و تازہ گلاب
ایک عورت ہے کہ سپنوں بھرا سنسار ہے تو
وہ نکھرتی ہوئی رنگینیٔ گلزار ہے تو

تیرا دھرتی کی دلآویز دلہن ہے لیکن
غالب و میر کی غزلیں ہیں کہ تیری آنکھیں
تجھ کو دیکھے تو جبیں مہ تاباں جھک جائے
جن کے اعجاز سے رفتارِ دو عالم رک جائے

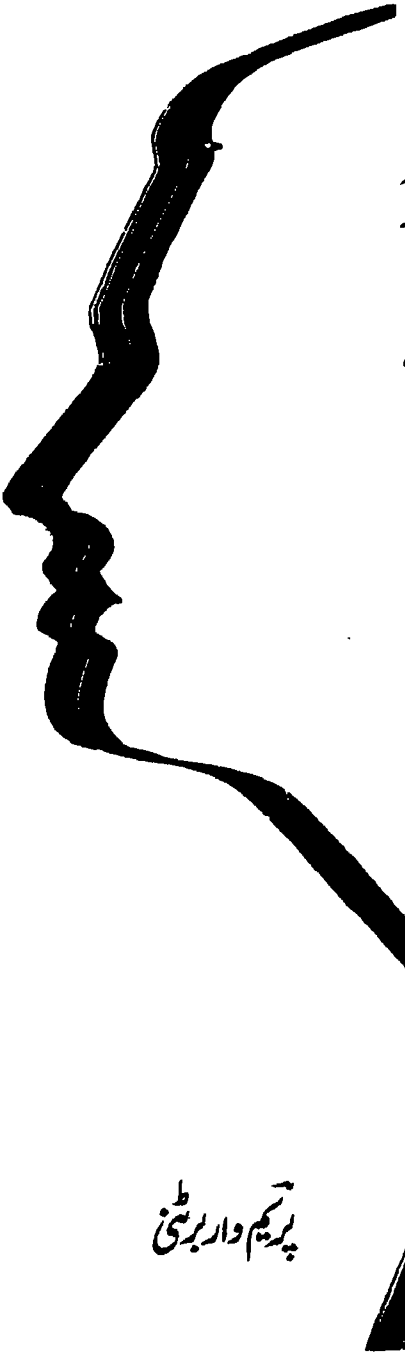
تیری منزل کا مسافر، ترا جیون ساتھی
کیوں نہیں وہ تری زلفوں کی گھٹاؤں کا اسیر
بے خبر گردشِ حالات سے کیوں ہے آخر
اسکو شکوہ "بھری برسات" سے کیوں ہے آخر

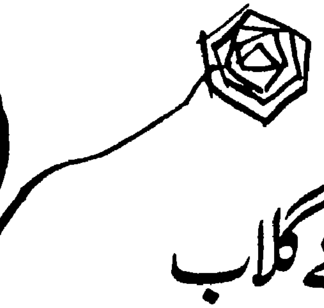
تیرے آنچل کی مہک اس کے مقدر میں نہیں
زندہ خوابوں سے تری گود بھری ہے جس نے
وہ کسی اور کے جلوؤں کا پرستار ہے کیوں
تو اسی شخص کے جذبات سے بیزار ہے کیوں؟

تم اگر دونوں خفا ہو تو سرِ بزمِ وفا
جانے کس سمت سمندر میں بہہ جاتے ہیں
کون دے، دل کے پُر اسرار سوالوں کا جواب
تین سپنوں کے دیئے، تین ستاروں کے گلاب

ایک ہو جاؤ محبت کے سفر میں، ورنہ
زندگی ایک بیاباں کے سوا کچھ نہ سہی
روکے تنہائی لپٹ جائے گی تم دونوں سے
اس میں آئی تو بہار آئے گی تم دونوں سے

تم کہ ہو ایک ہی افسانۂ دل کے عنواں
حسن اور عشق کے خوابوں کو نہ تقسیم کرو
پیار ہے تم کو گھر آنگن کی بہاروں سے اگر
اپنے نوخیز گلابوں کو نہ تقسیم کرو





گھر آنگن کے گلاب

(ایک تکون ایک کہانی)

پریم وار برٹنی



ذرا ٹھہریئے

کیا گاندھی جی ایک ظالم شوہر تھے؟

ن. سلطانہ



یہ آج سے سو برس پہلے کی بات ہے جب ملکہ وکٹوریہ کو قیصرِ ہند بنا دیا گیا تھا۔ پہلی جنوری ۱۸۷۷ء کے دن ملکہ کے محبوب وزیرِ اعظم ڈزرائیلی نے وکٹوریہ کے نام کے ساتھ شاہنشاہِ ہند کا خطاب چسپاں کر دیا۔ یہ سال ہندوستان کی تاریخ میں ایک یادگار سال ہے، لیکن اس کی وجہ صرف ملکہ وکٹوریہ کی بادشاہت نہیں۔ اس سال ایک چھ برس کی بچی کی منگنی بھی قرار پائی۔ یہ بچی گوکل داس ناکن جی کی بیٹی تھی — گوکل داس پوربندر کے ایک کھاتے پیتے تاجر تھے۔ اس بچی کا نام کستوربا تھا۔ اس کے منگیتر کا نام موہن داس کرم چند گاندھی تھا۔ یہ لڑکا کستوربا کا ہم عمر تھا۔ بعد میں یہی لڑکا مہاتما گاندھی کے نام سے مشہور ہوا۔

پوربندر، گجرات کی ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ گاندھی جی کے باپ اس ریاست کے دیوان تھے۔ وہ بڑے رعب داب کے انسان تھے۔ انہوں نے چار شادیاں کیں۔ ان کی چوتھی بیوی کا نام پتلی بائی تھا۔ ان کی تینوں بیویوں کا انتقال ہو چکا تھا۔ پتلی بائی اپنے شوہر سے بہت چھوٹی تھیں۔ ان کے یہاں چار بچے پیدا ہوئے؛ ایک لڑکی اور تین لڑکے۔ گاندھی جی ان میں سب سے چھوٹے تھے۔ اس زمانے میں پردے کی سختی تھی۔ عورتیں گھروں سے باہر نہیں نکلتی تھیں۔ مرد گھر کے اندر نہیں جا سکتے تھے، حتیٰ کہ خاوند کو بھی زنانے میں گھسنے کی اجازت نہیں تھی۔ عورت کی دنیا اس کا گھر تھا۔ عورتوں کی تعلیم کا رواج نہیں تھا۔ چھوت چھات کی پابندی میں بڑی سختی تھی۔ عورت کے لئے اپنے شوہر کی خدمت کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ وہ پوجا پاٹ کرتی۔ کھانا پکاتی، رات کو سنگھار کرتی، زیور اور کپڑے بنواتی، تیل اور مہندی کا استعمال کرتی، مردوں کو کھانا کھلانے کے بعد خود کھاتی۔ اس زمانے میں بچپن کی شادی کو پسند کیا جاتا تھا۔ لڑکی ماں باپ پر بوجھ ہوتی تھی۔ اس کی شادی پر بہت روپیہ خرچ ہوتا تھا۔ سینکڑوں رشتہ داروں کو کھانا کھلایا جاتا۔ ہزاروں برتن فراہم کرنے پڑتے۔ اس

کے علاوہ نوکر چاکر، بینڈ باجے اور سواریوں کا انتظام بھی کرنا پڑتا۔ متوسط درجے کے لوگوں کے لئے لڑکی کی شادی ایک عذاب سے کم نہیں تھی۔

گاندھی جی کے باپ سرکاری ملازم تھے وہ تاجر نہیں تھے، اس لئے اپنے سمدھی گوکل داس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ خرچ میں کفایت شعاری کرنے کے لئے انہیں ایک ترکیب سوجھی۔ کیوں نہ ایک تیر سے تین شکار کئے جائیں۔ موہن داس کے ساتھ اُن کے بڑے بھائی اور چچا زاد بھائی کی شادی کر دی جائے۔ اس طرح ایک ہی وقت میں تین شادیاں نبٹ جائیں گی۔ گاندھی جی کی منگنی ہو چکی تھی۔ دوسرے لڑکوں کے لئے بھی جلدی سے لڑکیاں تلاش کی گئیں اور شادیوں کا مہورت نکلوایا گیا، لیکن ایک ایسی رکاوٹ پیش آئی کہ معلوم ہوتا تھا یہ شادیاں نہیں ہو سکیں گی۔ گاندھی جی کے باپ پوربندر کی ملازمت چھوڑ چکے تھے۔ وہ اس زمانے میں ریاست راج کوٹ کے دیوان تھے۔ راجہ نے انہیں کسی کام سے روک لیا۔ اس زمانے میں ریل گاڑی اور موٹر نہیں تھی، بیل گاڑیوں میں سفر ہوتا تھا۔ راج کوٹ سے پوربندر کا سفر پانچ روز میں طے ہوتا تھا۔ آخر راجہ نے دیوان کی مشکل حل کر دی۔ اس نے اپنی گھوڑا گاڑی دیوان کو دے دی۔ گھوڑا گاڑی سے یہ سفر تین روز میں پورا ہو جاتا تھا، اس طرح دیوان اپنے بیٹوں کی شادی کے وقت پوربندر پہنچ سکتے تھے، لیکن یہ سفر بھی بغیر تکلیف کے طے نہ ہو سکا۔ پوربندر کے قریب گھوڑا گاڑی اُلٹ گئی اور دیوان سخت زخمی ہو گئے۔ ان کے رشتہ داروں نے تجویز پیش کی کہ شادیاں ملتوی کر دی جائیں، لیکن وہ نہ مانے۔

وہ اس حالت میں شادی میں شریک ہوئے کہ سر سے پاؤں تک پٹیاں بندھی ہوئی تھیں — گاندھی اپنے بھائی اور چچا کے لڑکے کے ساتھ پالکی میں بیٹھے اور اپنی سسرال پہنچے۔ وہ سب سے کم عمر دولہا تھے۔ ان کی عمر صرف ۱۳ سال تھی۔ پتلی بائی نے اپنے لڑکے کا ہاتھ دلہن کے ہاتھ پر رکھا۔ پھیرے ہوئے۔ دولہا دلہن نے ایک دوسرے کے منہ میں کانسر مٹھائی دی۔ اور پھر کستوربا اپنی سسرال آ گئیں۔ گوکل داس نے اپنی بیٹی کو زیورات سے لاد دیا تھا۔ یہ سب لوگ بہت خوش تھے۔ گاندھی جی اپنی کم عمری کی وجہ سے نروس تھے۔ وہ دُبلے پتلے اور کم زور تھے، ان کا قد بہت چھوٹا تھا۔ ان کے کان بہت لمبے اور خرگوش کی طرح باہر نکلے ہوئے تھے، ان کی ناک لمبی اور موٹی تھی، لیکن ان کا سینہ چوڑا تھا۔ وہ کسی بھی زاویہ سے خوب صورت نہیں لگتے تھے۔ ان کا کوئی دوست نہیں تھا۔ وہ خود کو تنہا محسوس کرتے تھے۔ دنیا میں صرف ایک ہستی تھی جس سے اُن کو لگاؤ تھا اور وہ تھی پتلی بائی۔

شادی سے پہلے گاندھی جی نے ازدواجی تعلقات پر ایک کتاب خریدی، اُسے پڑھا۔ اس کے علاوہ ان کی بڑی بھابی نے بھی ان کو سمجھایا، لیکن شادی کی رات وہ سب کچھ بھول گئے۔ بعد میں اُنہوں نے ایک کتاب کا مطالعہ کیا، جس میں بیوی کے فرائض سمجھائے گئے تھے۔ بیوی کا فرض تھا کہ وہ اپنے شوہر کو خدا کا درجہ دے، اُس کا حکم مانے۔ گاندھی جی نے ان ہدایات پر عمل کیا۔ اُنہوں نے کستوربا کو حکم دیا کہ وہ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلے، ان کی غیر موجودگی میں کسی سے بات نہ کرے، لیکن کستوربا پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ مندر جاتی۔ اپنی سہیلیوں سے ہنسی مذاق کرتی۔ گاندھی جی کو اپنی بیوی کی نافرمانی پر غصہ آتا۔ ان کو ضد تھی کہ میں کستوربا کو ایک مثالی بیوی بنا کر چھوڑوں گا۔

وہ اندھیرے میں بہت ڈرتے تھے۔ بھوت پریت کا خوف ان کے دماغ پر چھایا رہتا۔ اس کے علاوہ وہ سانپوں سے بھی ڈرتے تھے۔ ان کے کمرے میں رات بھر بتی جلتی رہتی، اس کے برعکس کستوربا کو روشنی میں نیند نہ آتی۔ وہ بتی گل کر دیتی اور گاندھی کا پارہ آسمان پر چڑھ جاتا۔ دونوں میاں بیوی کی بول چال بند ہو جاتی۔ گاندھی جی اس زمانے میں میٹرک کے طالب علم تھے۔ شادی کی دل چسپیوں میں وہ ایسے کھوئے کہ کتابوں کو کھول کر نہ دیکھا۔ چنانچہ وہ سالانہ امتحان میں فیل ہو گئے۔ ان کی کم زوری بڑھ گئی۔ کستوربا کچھ دن کے لئے میکے چلی گئیں۔ جب تک وہ گھر پر رہتیں، گاندھی جی اُن سے لڑتے رہتے لیکن اُن کے میکے جانے کے بعد وہ کچھ اُداس ہو گئے۔ اُنہوں نے سسرال چٹھی لکھی اور کستوربا کو واپس بلا لیا۔

کستوربا پڑھنا لکھنا نہیں جانتی تھیں۔ گاندھی جی نے اُنہیں پڑھانا شروع کیا، لیکن کستوربا کو پڑھنے لکھنے سے مطلق دل چسپی نہیں تھی۔ اس بات پر آئے دن جھگڑا ہوتا اور وہ اپنے میکے پوربندر چلی جاتیں۔ گاندھی جی پھر اُداس ہو جاتے اور خط لکھ کر انہیں راج کوٹ بُلا لیتے۔ اس دوران کستوربا اُمید سے ہو گئیں۔ اس زمانہ میں حاملہ کے ساتھ عجیب سلوک کیا جاتا تھا۔ زچہ کو ایک علیحدہ کمرے میں رکھا جاتا تھا۔ یہ کمرہ عموماً گندا رہتا۔ اس میں کھڑکیاں اور روشن دان نہیں ہوتے تھے۔ زچہ کو گندا سمجھا جاتا تھا۔ دایہ

اکثر نچلی ذات کی عورتیں ہوتیں۔ تعجب ہے کہ ان سب باتوں کے باوجود کچھ بچے زندہ رہ جاتے۔ زچہ کو خدا کے بھروسے پر چھوڑ دیا جاتا۔ کستوربا کے بچہ پیدا ہوا، لیکن تین دن بعد ہی مر گیا۔ گاندھی جی نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ بچپن کی شادی کا یہی انجام ہوتا ہے۔ ان حالات میں ان کے بچے کی موت قدرتی تھی۔

طالب علمی کے زمانے میں گاندھی جی بہت کم زور تھے۔ اسکول میں مہتہ نامی ایک لڑکا ان کا دوست بن گیا۔ اُس نے گاندھی جی کو سمجھایا کہ گوشت کھانے سے انسان طاقت ور بن جاتا ہے۔ اُس نے انگریزوں کی مثال دی جو گوشت کھاتے ہیں ——— یہی وجہ ہے کہ وہ ہندوستان پر حکمرانی کرتے ہیں۔ گاندھی جی اس کی باتوں میں آ گئے اور اُنہوں نے مہتہ کے ساتھ گوشت کھانا شروع کیا۔ گوشت کھانے سے ان پر گناہ کا احساس سوار ہو گیا، لیکن انہوں نے پروا نہ کی۔ کستوربا مہتہ کو پسند نہ کرتی تھیں۔ وہ گاندھی جی کو سمجھاتیں کہ مہتہ اچھا لڑکا نہیں ہے، اس لئے وہ اس سے دوستی نہ رکھیں ——— گاندھی جی اس بات پر ناراض ہو جاتے۔ وہ کستوربا کو ڈانٹ دیتے۔ کہتے کہ اُنہیں اپنے خاوند کو مشورہ دینے کا کوئی حق نہیں۔ مہتہ نے گوشت کھانے کے علاوہ گاندھی کو یہ بھی سمجھایا کہ عورت ذات پر بھروسہ کرنا غلط ہے۔ یہ سبق پا کر گاندھی جی نے کستوربا پر زیادہ سختی شروع کر دی۔

سالانہ امتحان میں گاندھی جی پاس ہو گئے۔ راج کوٹ میں کوئی کالج نہیں تھا۔ کالج میں داخلے کے لئے اُنہیں احمدآباد جانا پڑا۔ اس دوران میں کستوربا پھر حاملہ ہو گئیں ——— گاندھی جی کی ماں چاہتی تھیں کہ ان کا بیٹا وکیل بن جائے۔ کسی نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے بیٹے کو انگلستان بھیج دیں۔ وہ راضی ہو گئیں۔ وہ ڈرتی تھیں کہ وہاں جا کر ان کا لڑکا گوشت کھائے گا، شراب پئے گا، میموں کے پیچھے پیچھے بھاگے گا۔ اس مسئلے کا یہ حل نکالا گیا کہ گاندھی جی یہ قسم کھائیں کہ وہ ان چیزوں سے پرہیز کریں گے۔ گاندھی جی نے قسم کھائی اور انگلستان روانہ ہو گئے۔

گاندھی جی انگلستان سے تین سال بعد لوٹے۔ اس دوران ان کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ گاندھی جی سے یہ چیز چھپائی گئی تھی تاکہ ان کی پڑھائی پر بُرا اثر نہ پڑے۔ انگلستان سے واپس آنے کے بعد گاندھی جی پکے صاحب بہادر بن گئے تھے۔ اُنہوں نے گھر میں انگریزی ماحول پیدا کر دیا۔ انگریزی کراکری حاصل کی گئی۔ صبح کے ناشتے میں پورج اور ڈبل کھائی جانے لگی۔ اُن کے اور کستوربا کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا۔ کستوربا جیسی تھیں ویسی ہی رہیں۔ اُنہوں نے گاندھی جی کی غیر موجودگی میں بھی پڑھنا لکھنا نہ سیکھا۔ کسی نے گاندھی جی کو مشورہ دیا کہ وہ بمبئی چلے جائیں، راج کوٹ چھوٹا شہر ہے۔ یہاں بڑے مقدمے نہیں مل سکتے۔ گاندھی جی بمبئی چلے گئے، لیکن وہاں اُنہیں ناکامی کا مونہہ دیکھنا پڑا۔ وہ عدالت کے کمرے میں نروس ہو گئے اور ایک لفظ بھی نہ بول سکے۔ ان کی خوب ہنسی اُڑائی گئی۔ وہ دل برداشتہ ہو کر واپس راج کوٹ پہنچ گئے۔

گاندھی جی کا پہلا لڑکا ہری لال اب خاصا بڑا ہو گیا تھا۔ وہ ان کے انگلستان جانے سے پہلے ہی پیدا ہو چکا تھا۔ اب ان کے یہاں دوسرا بچہ پیدا ہوا، اس کا نام منی لال رکھا گیا۔ راج کوٹ میں گاندھی جی کا کام خاصا چلنے لگا۔ کچھ عرصے کے بعد اُنہیں ایک کیس کے سلسلے میں جنوبی افریقہ جانا پڑا۔ تین سال بعد وہاں سے واپس راج کوٹ آئے۔ اُن کی بہن رلیا بائی بیوہ ہو گئیں۔ اس کے بچوں کا بار بھی اُنہیں اُٹھانا پڑا۔ انہیں افریقہ سے واپس آئے ہوئے زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ وہاں کے لوگوں نے اُنہیں تار دے کر پھر بلا لیا۔ گاندھی جی نے افریقہ کے قیام کے دوران اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کر دیا تھا۔ وہاں اُنہیں خاصی کامیابی نصیب ہوئی۔ افریقہ میں کالے لوگوں کو جانوروں سے بدتر سمجھا جاتا تھا۔ کالا آدمی فرسٹ کلاس میں سفر نہیں کر سکتا تھا۔ گھوڑا گاڑی میں اُسے پائیدان پر بیٹھنا پڑتا تھا۔ گاندھی جی نے اس ظلم کے خلاف آواز اٹھائی۔ وہاں کے ہندوستانی باشندے ان سے متاثر ہوتے اور اُنہیں افریقہ بلا لیا۔

اس بار سفر میں کستوربا اور ان کے دونوں بچے بھی ان کے ساتھ تھے۔ افریقہ پہنچ کر گاندھی جی اور کستوربا کے درمیان تنازعہ شروع ہو گیا۔ گاندھی جی سوٹ پہنتے تھے، ٹائی کالر لگاتے تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ کستوربا انگریز عورتوں کی طرح اسکرٹ پہنیں، چمڑے کے بنے ہوئے جوتے پہنیں۔ اگر اسکرٹ نہیں پہن سکتیں تو ایک لمبا گاؤن پہنیں، جس کے دونوں طرف لیس لگی ہو۔ بالوں میں کریپ لگائیں۔ کستوربا نے انگریزی لباس پہننے سے صاف انکار کر دیا۔ گاندھی جی کے اصرار پر وہ رونے لگیں۔ آخر

گاندھی جی نے اُن سے سمجھوتہ کرلیا کستوربا پارسی وضع کی ساڑی اور جوتے پہننے پر راضی ہوگئیں۔ گاندھی جی نے ہری لال، منی لال اور اپنے بھانجے کو بھی جوتے پہنائے، اُنہیں جوتے پہننے سے بہت تکلیف ہوتی تھی۔ وہ رونے لگے، لیکن باپ کی ضد کے آگے ان کی ایک نہ چلی۔

افریقہ پہنچ کر کستوربا پھر حاملہ ہوگئیں۔ افریقہ میں کالے آدمیوں کیلئے ڈاکٹروں کا انتظام نہیں تھا۔ کچھ حبشی دائیاں پرائیویٹ دائی کا کام کرتی تھیں، لیکن وہ صاف ستھری نہیں ہوتی تھیں۔ اُن کی لاپرواہی سے زچہ اور بچہ دونوں کو خطرہ ہوسکتا تھا۔ تربیت یافتہ نرس کا فراہم کرنا مشکل تھا۔ آخر اُنہیں ایک ترکیب سوجھی۔ وہ بازار سے ایک کتاب خرید لائے۔ اس کتاب میں بچے کی پیدائش کے متعلق ہدایات درج تھیں۔ اپنے تیسرے بچے رام داس کی پیدائش پر وہ خود نرس بن گئے۔ ان کی آگاہی سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ بچے کی جان بچ گئی۔ لیکن کستوربا بہت کمزور ہوگئیں۔

افریقہ میں بڑے بچوں کی تعلیم گاندھی جی کے لئے ایک مسئلہ بن گئی۔ اُنہوں نے اپنے بچوں کے لئے ایک انگریز گورنس کا انتظام کیا۔ کستوربا پریشان ہوگئیں۔ وہ چھوت چھات کی قائل تھیں۔ اُن کے گھر میں ایک ملیچھ عورت آئے اور اُن کے بچوں کو پڑھائے، ان کو کسی طرح منظور نہیں تھا۔ لیکن گاندھی جی نے ان کی ایک نہ سنی۔ اسی پر بس نہیں بلکہ اُنہوں نے ماں بیٹوں کو چھری کانٹے سے کھانے کا حکم دیا۔ ایک دن ان کے گھر ایک کوڑھی نے صدا دی۔ گاندھی جی نے اُسے رات بھر اپنے گھر مہمان رکھا۔ کستوربا کوڑھ سے بہت ڈرتی تھیں۔ اُنہوں نے بہت واویلا مچایا۔ گاندھی پہاڑ کی طرح اٹل تھے۔ اُنہوں نے رات بھر کوڑھی کو مہمان رکھا۔ اُس کے زخموں پر پٹیاں باندھیں اور دوسرے دن اُسے رخصت کر دیا۔

ایک دفعہ حجام نے ان کے بال کاٹنے سے انکار کر دیا۔ اُنہوں نے قینچی اور کنگھا خرید لیا اور خود ہی اپنے بال تراش لئے۔ یہی نہیں بلکہ اُنہوں نے دھوبی کو بھی چھٹی دے دی۔ اُنہوں نے کستوربا کو حکم دیا کہ وہ میلے کپڑے خود دھوئیں۔ کستوربا کے لئے یہ بہت آزمائش کا وقت تھا۔ وہ میلے کپڑے دھوتی ہیں تو ان کا دھرم بگڑتا ہے، میاں کی نافرمانی کرتی ہیں تو دھرم بگڑتا ہے۔ آخر وہ کیا کریں؟ اُنہوں نے مجبور ہو کر گاندھی جی کے آگے ہتھیار ڈال دئے۔ ایک دفعہ گاندھی جی کی زیادتی حد سے بڑھ گئی۔ اُنہوں نے کستوربا سے مہمان کا پاخانہ صاف کرنے کے لئے کہا۔ اب معاملہ حد سے گزر چکا تھا۔ وہ اُسے بھنگن بنا دینا چاہتے تھے۔ کستوربا نے سختی سے انکار کر دیا۔ گاندھی جی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ــــ کستوربا کا ہاتھ پکڑا اور اُسے گھسیٹتے ہوئے مکان کے پھاٹک تک لے گئے اور اُسے گھر سے نکل جانے کا حکم دیا۔ کستوربا رونے لگیں۔ اُنہوں نے رو رو کر گاندھی جی سے التجا کی کہ وہ اُسے گھر سے نہ نکالیں۔ دنیا میں اب ان کا کون ہے۔ وہ کہاں جائیں گی؟ اُن کا گھر یہاں سے ہزاروں میل دور ہے۔ کیا وہ اسی لئے اُسے بیاہ کر لائے تھے۔ کستوربا کے آنسو دیکھ کر گاندھی جی کا دل پسیج گیا اور انہوں نے بیوی کو گھر سے نکالنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

کستوربا اپنی ذات پر ہر ظلم سہنے کو تیار تھیں، لیکن اپنے بچوں کی بپتا دیکھ کر اُن کا دل بھڑک اُٹھا۔ افریقہ میں اسکول گورے بچوں کے لئے مخصوص تھے۔ گاندھی جی کی شہرت اور عزت کے پیش نظر ان کو اپنے بچے اس اسکول میں داخل کرنے کی اجازت مل گئی۔ مگر گاندھی جی ایسی کسی رعایت سے فائدہ اُٹھانا نہیں چاہتے تھے، جس سے باقی ہندوستانی محروم رہیں، اس لئے اُنہوں نے اپنے بچوں کو خود پڑھانے کا فیصلہ کر لیا۔ گاندھی جی کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اپنے بچوں کو باقاعدہ تعلیم دے سکیں، لیکن اُنہوں نے اپنی ضد نہ چھوڑی۔ کستوربا نے ان کی بہت منت سماجت کی کہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم سے محروم نہ رکھیں، لیکن وہ نہ مانے۔ بڑا لڑکا ہری لال ہندوستان میں پڑھتا تھا۔ اُنہوں نے منی لال اور رام داس کو خود پڑھانا شروع کر دیا۔

گاندھی جی آہستہ آہستہ اپنی قانونی پریکٹس چھوڑ رہے تھے۔ اُنہوں نے عملی سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اُنہوں نے گھر کا فرنیچر بیچ دیا۔ کستوربا کے زیورات فروخت کر دئے۔ کستوربا نے بہت کوشش کی کہ ان کے باپ گوکل داس کے دئے ہوئے زیور نشانی کے طور پر چھوڑ دئے جائیں، مگر گاندھی جی نہ مانے۔ کچھ دن کے لئے کستوربا ہندوستان چلی گئیں۔ لیکن جلد ہی واپس افریقہ لوٹ آئیں۔ افریقہ آنے کے بعد ان کے یہاں آخری بچہ پیدا ہوا۔ اس کا نام دیوداس رکھا گیا۔ اس دفعہ بھی گاندھی جی نے دائی کا کام انجام دیا۔ وہ افریقہ میں باقاعدہ نرسنگ کی تربیت حاصل کر چکے تھے۔

ہری لال کی عمر اب ۱۲ برس تھی ــــ وہ ہندوستان سے میٹرک پاس کر چکے تھے۔ وہ کالج میں داخلہ لینا چاہتے تھے، لیکن گاندھی جی کی رائے بدل چکی تھی۔ اُن کے خیال میں اسکول اور کالج بے کار تھے۔ انسان محنت مشقت سے جو کچھ سیکھتا ہے نہ کہ زندگی بھر اس کے کام آتا ہے۔ وہ چاہتے

تھے کہ ان کے لڑکے محنت مشقت کریں۔ سادہ زندگی بسر کریں۔ اپنی ضرورتوں کو گھٹائیں۔ بس یہی تعلیم کا نچوڑ ہے۔ ہری لال بضد تھے کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے کوئی پیشہ اختیار کریں، لیکن گاندھی جی کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ یہیں سے دونوں باپ بیٹوں کے تعلقات میں بگاڑ پیدا ہوگیا۔ پھر ان میں زندگی بھر صلح نہ ہو سکی۔ ہری لال شرابی اور آوارہ ہوگیا۔ اُس نے گھر چھوڑ دیا۔ وہ عمر بھر اپنے باپ سے نالاں رہا۔ وہ اپنے باپ کو اپنی لااُبالی زندگی کا ذمہ دار سمجھتا تھا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ اپنے باپ کو صرف چڑانے کی خاطر مسلمان ہوگیا — اُس نے اپنا نام عبداللہ رکھا۔ بعد میں وہ پھر آریہ سماجی ہوگیا۔ کستوربا اپنے بیٹے کی حالت دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتیں۔ اُن کے لئے آگے کنواں اور پیچھے کھائی والا معاملہ تھا۔ ایک طرف چہیتا بیٹا تھا اور دوسری طرف شوہر۔ اُنھوں نے اپنا دھرم نبھایا اور بیٹے کی یاد کو دل سے نوچ کر پھینک دیا۔ ہری لال باپ کی موت کے چند مہینے بعد چل بسا۔ وہ دق کے موذی مرض میں گرفتار تھا۔

جب گاندھی جی افریقہ سے واپس ہندوستان چلنے کے لئے تیار ہوئے تو وہاں کے ہندوستانی باشندوں نے ان کو تحفوں سے لاد دیا۔ ہندوستانیوں کے حقوق منوانے کے لئے گاندھی جی نے بہت کوشش کی تھی اور وہ اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہوئے۔ لوگوں نے کستوربا کو ہیرے کا ایک نیکلس بھی پیش کیا جو کستوربا نے خوشی خوشی قبول کرلیا۔ گاندھی جی نے لوگوں کو تمام تحائف واپس کر دئے اور کستوربا کو بھی ہار واپس کرنے کا حکم دیا۔ کستوربا نے ہار واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ یہ ہار مجھے دیا گیا ہے اور میری ملکیت ہے۔ اُنھوں نے گاندھی جی سے کہا۔ "تم نے میرے سارے زیور بیچ دئے۔ اب مجھے اپنی بہوؤں کے لئے زیور فراہم کرنے ہیں۔ یہ ہار میں اپنی بہو کو پہناؤں گی۔" گاندھی جی نے کستوربا کی دلیل کا جواب دیتے ہوئے کہا: "یہ ہار تمہیں ضرور ملا ہے، لیکن صرف اس لئے ملا ہے کہ تم میری بیوی ہو۔ یہ بھی میری محنت کا صلہ ہے، اس لئے تمہیں یہ ہار واپس کرنا ہوگا۔" بچوں نے بھی گاندھی جی کی حمایت کی۔ کستوربا مجبور ہو گئیں اور انہوں نے وہ ہار واپس کر دیا۔ گاندھی جی نے ہار بیچ کر روپیہ بینک میں رکھا اور اس روپیے کو وہاں کے ہندوستانیوں کی بھلائی کے لئے وقف کر دیا۔

عام عورتیں گاندھی جی کے رویّہ کو کیا کہیں گی — آدرش وادی یا ستم گر؟ اور خود کستوربا کا اس رویّہ کے بارے میں کیا خیال تھا؟ کون جانے!

●●

آپ کی ذہنی اُلجھن اور اُس کا حل



س : میری شادی کو تین سال گذر گئے ہیں۔ میرے ایک بچّہ ہے۔ میں گریجویٹ ہوں، لیکن میرے خاوند تعلیم کے معاملے میں صفر ہیں، اگرچہ جسمانی لحاظ سے وہ میرے مقابلے میں کئی گنا ہیں۔ ہمارے گھر کا اسٹینڈرڈ بہت گرا ہوا ہے۔ یوں تو میرے شوہر کاروباری آدمی ہیں، لیکن مجھے ایک ایک پیسہ کے لئے ترسنا پڑتا ہے۔ وہ خود اپنی ہر خواہش پوری کر لیتے ہیں، لیکن میں ایک رومال لینے کی بات بھی نہیں کر سکتی۔ ہماری ساس بہت پھوہڑ ہیں۔ وہ ہماری ذات کی نہیں ہیں۔ ہم لوگوں کی زبان بھی نہیں سمجھ سکتیں۔ ہر وقت میرے ماں باپ کو بُرا کہتی رہتی ہیں۔ دونوں ماں بیٹے مجھے کبھی پڑھائی کا طعنہ دیتے ہیں، کبھی پڑھی لکھی جاہل قرار دیتے ہیں، کبھی مجھ پر چوری کا الزام لگاتے ہیں، کبھی ذلیل کرتے ہیں۔ سوچتی ہوں کہ خودکشی کر لوں یا گھربار چھوڑ دوں۔ یہ شادی نہ جانے کیسے ہو گئی۔ میرے میکے میں سب تعلیم یافتہ ہیں اور یہاں سب جاہل ہیں۔ تین نندیں ہیں۔ وہ بھی تعلیم سے کوری ہیں۔

ج آپ کا سوال آپ کی جذباتی زندگی سے تعلق نہیں رکھتا۔ یہ مسئلہ آپ کے گھر کے ماحول کا ہے۔ یہ ایک اہم مسئلہ ہے۔ شدید آپ کے سسرال والوں میں ہوتا ہے۔ آپ کو سمجھانے سے کیا فائدہ ہوگا۔ خودکشی اس کا حل نہیں۔ خودکشی کا خیال دل میں اس وقت آتا ہے جب کوئی اور

ڈاکٹر سبھاشیہ ایک مشہور ماہرِ نفسیات ہیں۔ وہ بانو پڑھنے والوں کے سوالات کا جواب دیں گے اور ان کے نفسیاتی مسئلوں کا تجزیہ اور حل پیش کریں گے۔
پتہ : معرفت ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

حل نہ ہو اور نہ کوئی انسان ہماری مدد کے لئے تیار ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کبھی اپنے ماں باپ سے اس مسئلے پر کھُل کر بات نہیں کی۔ آپ کے خاوند کی عادتیں ایسی ہیں کہ ان کے ساتھ زندگی گذارنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

سوال لکھنے والی بہنیں عموماً اپنی گھریلو زندگی کے حالات تو لکھتی ہیں، لیکن اپنے اندرونی خیالات اور جذبات کا اظہار نہیں کرتیں۔ اندرونی جذبات سے میری مُراد ازدواجی زندگی کے حالات سے ہے۔ اس کے متعلق معلومات ہونا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنی سطحی اور باہر کے حالات کی۔ اگر عورت کے ساتھ خاوند کا سلوک اچھا نہ ہو تو اس کے پیار میں فرق آجاتا ہے اور وہ اندر ہی اندر اس کی محبت کو ٹھکرا دیتی ہے۔ ایسا ہونا قدرتی ہے۔ پھر اس کی ازدواجی زندگی ایک فرض کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ فرض بھی ایسا جو عموماً ناخوش گوار ہوتا ہے۔ جب دل ہی مرجائے تو ازدواجی تعلقات میں خوشی میسّر نہیں ہوسکتی۔ ان معاملوں میں انسان ایک دوسرے کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ جب ازدواجی زندگی ایک ناخوش گوار فرض بن کر رہ جائے تو خاوند سمجھ جاتا ہے کہ عورت اسے دل سے نہیں چاہتی۔ وہ اپنی خواہش پوری کرنے کے باوجود ناآسودہ رہتا ہے ازدواجی تعلقات دوطرفہ ٹریفک ہیں۔ ایک فریق کے اطمینان سے کام نہیں چلتا۔ اس بارے میں آپ خود سمجھ سکتی ہیں۔ اگر آپ سمجھتی ہیں کہ کلیتاً آپ کے خاوند کا قصور ہے تو اپنے ماں باپ سے بات چیت کریں۔ اس کے بعد یہ طے کریں کہ آپ کو اپنے خاوند کے ساتھ رہنا ہے یا انہیں چھوڑ دینا ہے۔ خودکشی کوئی حل نہیں۔ ایک بار آپ اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کرلیں تو اپنے والدین پر اپنا ارادہ ظاہر کرسکتی ہیں اور اپنے ارادے کو پورا کرنے کے لئے ضد بھی کرسکتی ہیں۔ آپ کے والدین اپنی بیٹی کی تکلیف سمجھ سکتے ہیں۔ وہ ضرور آپ کی مدد کریں گے۔ آپ کو خود ہی فیصلہ کرنا ہے کہ آپ اپنی آئندہ زندگی کیسے گذاریں۔ آپ پڑھی لکھی ہیں۔ اپنے خاوند سے علیحدہ ہوکر نوکری کرسکتی ہیں۔ آپ خواہ دوسری شادی کریں یا کوئی اور کام کریں، یہ اس سے بہتر ہے کہ اپنی زندگی کو اس گھٹن میں گذار دیں اور اپنی زندگی کے دن جیسے تیسے کرکے پورے کریں۔ آپ اپنے ماں باپ سے صلاح و مشورہ کرکے اپنے خاوند کے سامنے اپنی تجویز پیش کریں۔ اگر وہ آپ کی ضرورتوں کے لحاظ سے گھر کے حالات بدلنے کو تیار رہیں تو بڑی خوشی کی بات ہوگی، ورنہ الگ ہوجانا اچھا ہے جب تک آپ اپنی کمزوری اور خوف کا اظہار کرتی رہیں گی، کوئی بات طے نہیں ہوگی۔ خاوند آپ کی کمزوری اور ڈر سے فائدہ اٹھائے گا۔ لیکن جب اسے یہ معلوم ہوجائے گا کہ آپ اپنے فیصلے پر قائم ہیں تو وہ بدل جائے گا۔

س: میری عمر بیس سال ہے۔ میں ایم۔ایس سی کی طالبہ ہوں۔ میری منگنی ہوچکی ہے۔ اس کے بعد بھی مجھے ایک لڑکے سے پیار ہوگیا ہے۔ اس لڑکے کو معلوم ہے کہ میری منگنی ہوچکی ہے۔ اس کے باوجود وہ مجھ سے پیار کرتا ہے۔ دھیرے دھیرے میں خود بھی اسے چاہنے لگی ہوں۔ ۱۹۷۸ میں میری شادی ہونے والی ہے۔ ایک طرف ماں باپ کی عزّت اور دوسری طرف پیار۔ بتائیے میں کیا کروں۔ میں نے اس لڑکے کو بہت سمجھایا کہ وہ میرے راستے سے ہٹ جائے لیکن وہ نہیں مانتا۔ میرا منگیتر بھی پڑھا لکھا خوب صورت اور اچھے گھر کا ہے۔ سوچ سوچ کر میرے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ جو آپ بتائیں وہی کروں گی۔

ج: آپ کا خط پڑھ کر آپ کی اُلجھن سے ہمدردی پیدا ہوئی۔ ایسی اُلجھنیں ہر انسان کی زندگی میں آتی ہیں اور ہمیشہ آتی رہیں گی۔ آپ کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی منگنی کے بعد آپ کی ایک اور لڑکے سے ملاقات دھیرے دھیرے پیار میں بدل گئی۔ ملاقاتیں جب بڑھ جاتی ہیں تو محبّت کی شکل اختیار کرلیتی ہیں۔ ایک مشہور ماہرِ نفسیات کے قول کے مطابق محبت ۹۰ فی صد حد تک ملاقاتوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ محبت اور شادی میں ہمیشہ ایک ٹکراؤ سا رہا ہے۔ محبت کا احساس شادی سے پہلے زیادہ ہوتا ہے یہی محبت جب شادی میں بدل جاتی ہے تو کسی نہ کسی دروازے سے بھاگ جاتی ہے۔ جو بات دو انسانوں کے درمیان شادی سے پہلے ہوتی ہے وہ شادی کے بعد نہیں رہتی۔ محبّت عورت کی کمزوری ہے۔ وہ محبّت کے سامنے مجبور اور بے بس ہوجاتی ہے۔ مرد جب عورت سے محبّت کرتا ہے تو قدرتی طور پر عورت کے دل میں اس کا ردِّعمل ہوتا ہے۔ عمل جتنا شدید ہوگا ردِّعمل بھی اتنا ہی گہرا ہوگا۔ دنیا کی ۹۰ فی صد عورتیں ردِّعمل کی پابند ہوتی ہیں۔ آپ کی محبّت دراصل اس لڑکے کی محبّت کا آئینہ ہے، اپنے آپ کچھ بھی نہیں۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ آپ میرے مشورہ سے اپنے احساس کو بدل دیں گی گہرے اور شدید احساس کو بدلنا دشوار ہوتا ہے آپ اپنے سامنے دو سوال رکھیں۔ آپ سوچئے کہ اگر آپ اپنے والدین سے یہ کہہ دیں کہ میں اپنے منگیتر سے نہیں بلکہ اس لڑکے سے شادی

کروں گی تو کیا آپ کو خوشی ہوگی۔ ماں باپ کی ناراضگی کا خیال نہ کیجئے۔ صرف اپنی خوشی کو دھیان میں رکھئے۔ اس بات کو خوب سوچئے اور کئی دن تک سوچتی رہیئے۔ کئی دن تک سوچنے کے بعد بھی اگر آپ کا جواب اثبات میں آتا ہے تو آپ یہ تجویز اپنے ماں باپ کے سامنے رکھ سکتی ہیں۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر آپ کے والدین طوعاً و کرہاً اس شادی پر راضی ہو گئے تو کیا یہ بات مناسب معلوم ہوگی۔ ممکن ہے کہ آپ کا خیال ہو کہ وہ دھیرے دھیرے آپ کے انتخاب سے متفق ہو جائیں گے، لیکن یہ بہت لمبی اور آگے کی بات ہے۔ آپ اس لڑکے کے بارے میں زیادہ نہ سوچیں۔ سوال یہ نہیں ہے کہ وہ کیا سوچتا ہے، سوال یہ ہے کہ یہ سب آپ کو کیسا لگتا ہے۔ عورت اپنے محبوب کا دل توڑنا نہیں چاہتی اور یہی اس کی کمزوری ہے۔ اس لڑکے کی منگنی نہیں ہوئی ہے، آپ کی منگنی ہو چکی ہے۔ اس لڑکے کو کوئی الجھن نہیں، آپ کو ہے۔ وہ آپ کو ایک دوسرے امیدوار سے جیتنا چاہتا ہے اس طرح مرد کی انا کو تسکین ملتی ہے۔ وہ آپ کو حاصل کر کے یہ مقابلہ جیتنا چاہتا ہے۔ محبت یہ مقابلہ جیتنے کا ذریعہ ہے۔ اگر آپ اس کی جگہ ہوتیں اور وہ آپ کی جگہ، تو وہ ہرگز یہ منگنی نہ توڑتا اور والدین کی بات مان لیتا۔

آپ پڑھی لکھی ہیں، اس لئے آپ میری بات آسانی سے سمجھ سکتی ہیں۔ جب دو نوجوان لڑکے اور لڑکی محبت کا اظہار کرتے ہیں تو ان کے جذبات میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ ہیجان اس عمر میں قدرتی طور پر پایا جاتا ہے۔ لڑکی اسی ہیجان کو محبت کا نام دیتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کو کیا نام دیا جا سکتا ہے؟ یہ ہیجان محبت معلوم ہوتا ہے۔ لڑکی کو اس ہیجان کو پیدا کرنے والے سے محبت ہو جاتی ہے۔ یہ ہے محبت کی حقیقت۔ اس بات سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ یہ احساس شادی شدہ جوڑوں میں ہی ایک دوسرے کے لئے پیدا ہوتا ہے۔ بیوی میں یہ احساس خاوند کو چھوڑ کر کسی دوسرے انسان کے لئے بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح خاوند کے دل میں دوسری عورت کے لئے بھی جگہ پیدا ہو سکتی ہے۔ اس طرح یہ احساس گناہ کے احساس کے ساتھ بڑھتا ہے۔ آپ اپنے دل میں اس احساس کی وجہ سے گناہ کے احساس کو جگہ نہ دیں۔ یہ قدرت کا نظام ہے۔ آپ احساسِ گناہ کو الگ کرتے ہوئے سوچیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ اس لڑکے سے نہیں بلکہ اپنے ہیجان اور احساس پیدا کرنے والے سے شادی کرنا چاہتی ہیں۔ آپ چاہتی ہیں کہ جو شخص آپ کے دل میں جذبات کا طوفان پیدا کر دیتا ہے، آپ کی شادی اسی سے ہو۔ آپ یہ سمجھیں کہ ایسا سوچنا قدرتی ہے۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اس بات کو بے فکری سے اپنے دل میں جگہ دیں۔ اس سے فرار اختیار نہ کریں ممکن ہے کہ بات آپ کی سمجھ میں آجائے اور آپ کو اپنی منگنی توڑنے کی ضرورت نہ پڑے۔

آپ کچھ دن کے لئے اس لڑکے سے ملنا جلنا بند کر دیں اور اوپر لکھی ہوئی ہدایتوں پر عمل کریں۔ مجھے امید ہے کہ آپ کو صحیح راہ مل جائے گی۔ اس طرح آپ اس الجھن سے نجات حاصل کر لیں گی۔

س : میں بہت پریشان ہوں۔ میں ایک لڑکے سے محبت کرتی ہوں۔ وہ لڑکا پڑھا لکھا اور خوب صورت ہے۔ اسے ہمارے گھر میں کوئی نہیں جانتا، نہ کسی کو یہ بات معلوم ہے کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ اگر یہ بات معلوم ہو جائے تو گھر میں طوفان کھڑا ہو جائے۔ میرے والدین میری شادی اپنے رشتہ داروں میں کرنا چاہتے ہیں، لیکن وہ لوگ جاہل اور گنوار ہیں۔ میں پڑھی لکھی ہوں۔ وہ لوگ مجھے بالکل پسند نہیں۔ میں اپنے والدین کے سامنے زبان بھی نہیں کھول سکتی۔ بتائیے میں کیا کروں۔

ج آپ کا سوال اوپر کے سوال سے ملتا جلتا ہے۔ اسے پڑھئے اور سوچئے۔ آپ کو ضرور اپنی الجھن سے نجات مل جائے گی۔

س : میری منگنی میرے والدین نے میری خالہ کے لڑکے کے ساتھ کر دی ہے۔ ہم نے لڑکے کو اور اس کے ماں باپ کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اگر ہماری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو ہرگز شادی نہ کرتا۔ منگنی کر کے ہم پھنس گئے۔ میری والدین مشرقی تہذیب کے حامی ہیں۔ کہتے ہیں کہ زبان دے کر پھرنا بے عزتی کی بات ہے۔ لوگ کیا کہیں گے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ عید بعد میری شادی ہے۔ میں اپنے مونہہ سے نہیں کہہ سکتی کہ میں یہ شادی نہیں کروں گی کیوں کہ میں مشرقی تہذیب کی پروردہ ہوں۔ میرا ضمیر اس بات پر بھی ملامت کرتا ہے جب میں سوچتی ہوں کہ خودکشی کر لوں۔ کوئی حل بتائیے۔

ج جو مسئلہ آپ نے پیش کیا ہے وہ اتنا مشکل نہیں جتنا دکھائی دیتا ہے۔ خودکشی اس کا حل نہیں۔ ہم لوگ اپنی تہذیب کے دائرے میں اس قدر پھنسے ہوئے ہیں کہ نکلنے کا راستہ دیکھ کر بھی نہیں نکل سکتے۔ ہم اپنے تمدن اور تہذیب کو ہی زندگی مان لیتے ہیں اور نقلی روایات کو نبھانے کے لئے اپنی اصل زندگی قربان

کردیتے ہیں۔ انسان نے سماج میں رہنے کے لئے اور سماج کو چلانے کے لئے تہذیب بنائی تھی، نہ کہ روایتوں کی غلامی کے لئے۔ مشکل یہ ہے کہ انسان پہلے اپنے فائدے کے لئے ہی کوئی چیز پیدا کرتا ہے، لیکن رفتہ رفتہ اسی کا غلام بن کر رہ جاتا ہے۔

آج کا زمانہ مختلف ہے۔ پرانی تہذیب آخری سانس لے رہی ہے۔ یہ تہذیب ٹوٹ کر ایک نئی شکل اختیار کر رہی ہے۔ اس عمل کو کوئی نہیں روک سکتا۔ آپ کے والدین اس بات کو مانتے ہیں کہ آپ کی منگنی کر کے انہوں نے غلطی کی ہے۔ ایک ذرا سی بات رکھنے کے لئے ساری زندگی کی غلامی مول لینا کہاں کی عقلمندی ہے دراصل پرانی تہذیب ان کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے اور انہیں اس تہذیب کے جال کو توڑنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ آپ ان کے سامنے اپنا مسئلہ رکھیں۔ بے جا شرم سے کام نہ لیں۔ آج کی شرم ساری زندگی کی غلامی کا سبب بن جائے گی۔ کیا ضروری ہے کہ زبان کا پاس کیا جائے اور زندگی کو ختم کر ڈالا جائے۔ ہر انسان کو زندہ رہنے کا حق ہے۔ اسے حق ہے کہ وہ زندگی میں چین و آرام حاصل کرے، اپنے دامن میں زندگی کی خوشیاں بھر لے۔ اگر شادی سے پہلے ہی والدین اپنی اولاد کی خوشیوں کا گلا گھونٹ دیں تو اولاد پیدا کرنے سے کیا فائدہ۔ آپ اپنے والدین سے ضد کریں کہ وہ یہ منگنی توڑ دیں۔ اس طرح وہ آپ کو بھی زندگی بھر کے دکھ اور تکلیف سے بچا لیں گے اور خود کو بھی۔ بیٹی کا دکھ ماں باپ کا دکھ ہوتا ہے۔ کیا انہیں آپ کو دکھی دیکھ کر تکلیف نہیں ہوگی آپ انہیں میرا جواب دکھائیں۔ شاید انہیں عقل آجائے اور وہ زبان کا پاس نہ کرتے ہوئے یہ رشتہ توڑ دیں۔

س : میری عمر ۱۹ سال ہے۔ میں انٹرمیڈیٹ کی طالب علم ہوں۔ مجھے اپنے دولہا بھائی کے چھوٹے بھائی سے بے حد پیار ہے۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ وہ بھی مجھے جنون کی حد تک چاہتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے نہ ہمارے والدین راضی ہیں۔ اور نہ ان کے، اس لئے کہ ہماری بہن کی شادی ان کے بڑے بھائی سے ہو چکی ہے۔ ہم دونوں اپنے والدین کی عزت کرتے ہیں۔ اس لئے ان سے شادی کی بات کہہ نہیں سکتے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ کسی دوسرے کے ساتھ زندگی گذار نہیں سکتی بتایئے میں کیا کروں؟

ج آپ کے سوال کا جواب مشکل نہیں، مگر اس کا حل مشکل ہے۔ آپ نے ٹھیک لکھا ہے کہ آپ جس انسان سے محبت کرتی ہیں اس کے سوا کسی دوسرے کے ساتھ زندگی نہیں گذارنا چاہتیں۔ آپ کی محبت کسی سے ہو اور شادی کسی اور سے تو اس طرح ذہنی اختلاف کا مرکز بن جائے گا۔ میرے خیال میں آپ کے والدین کا انکار بے معنی ہے۔ اگر دونوں بہنیں ایک ہی گھر میں رہیں تو کیا مضائقہ ہے۔ بلکہ یہ تو اچھی بات ہے۔ آپ اپنی بہن کو تیار کریں اور انہیں سمجھا بجھا کر راضی کر لیں۔ وہ آپ کے والدین کو راضی کر لیں گی۔ آپ شادی کرنا چاہتی ہیں، آپ لڑکے کے ساتھ بھاگنا نہیں چاہتیں، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ والدین کے اعتراض کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ آپ لڑکے سے بھی کہیں کہ وہ ماں باپ سے اس خواہش کا اظہار کرے اگر والدین اپنی ضد پر اڑے رہے تو زندگی خراب ہو جائے گی۔ آپ بے جا شرم سے کام لیں۔ اس وقت کی تھوڑی سی جھجک اور شرم آپ کو ساری زندگی کے لئے دکھی بنا دے گی۔ آپ تو دوسری جگہ شادی کرنے سے انکار کر دیں۔ میرے خیال میں آپ کے والدین راضی ہو جائیں گے اور وقت آنے پر سب ٹھیک ہو جائے گا۔

س : میری عمر ۱۹ سال ہے۔ شادی کو تین سال ہو گئے ہیں۔ میرے شوہر کی عادت اچھی ہے مجھ سے بہت محبت سے پیش آتے ہیں۔ لیکن ان کی ایک عادت سے میں بہت پریشان ہوں مہینے میں ایک دو بار ایسا ضرور ہو جاتا ہے کہ وہ مجھ سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ ناراضگی کی وجہ بھی نہیں بتاتے۔ بس کھنچے کھنچے سے رہتے ہیں۔ اس سے مجھے بہت کوفت ہوتی ہے۔ ان کی ساری محبت جھوٹی اور دکھاوا معلوم ہوتی ہے پھر جلد ہی ان کی ناراضگی ختم ہو جاتی ہے اور وہ پہلے کی طرح محبت کرنے لگتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ اس سلسلے میں میری مدد فرمائیں گے۔

ج جب دو انسان اکٹھے رہتے ہیں تو کسی نہ کسی وقت اختلاف اور کھنچاؤ پیدا ہو سکتا ہے جب یہ اختلاف اور کھنچاؤ تھوڑے وقفے کے لئے ہو تو یہ جھوٹی محبت اور دکھاوے کی نشان دہی نہیں کرتا، بلکہ یہ محبت کا ہی ایک حصہ ہوتا ہے۔ اگر دو انسان گڈے گڑیا کی طرح رہیں اور ہر وقت ہنستے رہیں تو یہ محبت نہیں ہے۔ بلکہ دکھاوا ہے، خود فریبی ہے۔ جو مرد عورت ہر وقت اور ہر بات پر ہنستے رہتے ہیں وہ ایک دوسرے سے محبت نہیں کرتے۔

میں آپ سے ایک سوال پوچھتا ہوں۔ آپ کے خاوند آپ سے محبت کرتے ہیں اور آپ سے اچھی طرح پیش آتے ہیں۔ اگر وہ

تھوڑی دیر کے لئے آپ سے ناراض ہو جاتے ہیں تو آپ سمجھتی ہیں کہ ان کی ساری محبّت مٹی میں مل گئی۔ کیا یہ انصاف ہے؟ آپ سے ان کی ذرا سی ناراضگی برداشت نہیں ہوتی۔ آپ ان کی محبّت کو دکھاوا کہتی ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہیں آپ کی اپنی محبّت تو دکھاوا نہیں، جو تھوڑی سی ناراضگی سے ختم ہو جاتی ہے۔ آپ ذرا سی بے توجّہی سے ان سے کھنچ جاتی ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

اگر آپ تھوڑا سا اپنی ازدواجی زندگی کے متعلق بھی سوچیں تو آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ کہیں ان کی ناراضگی اس لئے تو نہیں کہ آپ دونوں کے ازدواجی تعلّقات میں کچھ کمی آجاتی ہے۔ مرد اکثر عورت سے اس لئے بھی کھنچ جاتا ہے۔ ان کا آپ سے ناراض ہونا اور پھر ملتفت ہونا اس بات کی دلیل ہے جب آپ کے ازدواجی تعلقات خوش گوار ہوتے ہیں تو وہ آپ سے محبت سے پیش آتے ہیں اور جب ان میں کمی آجاتی ہے تو وہ ناراض ہو جاتے ہیں۔ اُمّید ہے کہ آپ میری باتوں پر غور کریں گی۔

س: میرے شوہر جنہوں نے مجھے ایک بار دیکھ کر شادی کی، میرا بے حد خیال رکھتے ہیں۔ وہ میری ہر ہر خواہش کو پورا کرتے ہیں، ہر بات میں میری رائے ضرور لیتے ہیں، میرے بہن بھائیوں سے خوب مذاق کرتے ہیں

وہ شرمیلے نہیں ہیں مگر آپ یقین نہیں کریں گے کہ انہوں نے شادی کے ایک مہینے بعد تک مجھ سے ٹھیک طرح سے بات نہیں کی۔ گھمانے لے جاتے تو میرے اور اپنے درمیان بالشت بھر کا فاصلہ رکھتے۔ میری عمر ۲۳ سال ہے اور اُن کی ۲۵ سال۔ میں نے ایسے شوہر دیکھے ہیں جو ایک ہفتے کے لئے بھی بیوی سے الگ نہیں رہ سکتے۔ مگر میں ان سے تین چار ماہ دُور رہوں تو بھی انہیں پروا نہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ شادی سے پہلے کسی عورت سے محبّت کرتے تھے۔ یا میں انہیں پسند نہیں آئی دو سال سے میں اس آگ میں جل رہی ہوں۔

ج: آپ کا یہ اندیشہ بے بنیاد ہے کہ آپ کے شوہر آپ کو پسند نہیں کرتے یا انہیں کسی دوسری لڑکی سے محبت ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اپنا زیادہ وقت گھر پر نہ گذارتے۔ میرے پاس ایسے کئی کیس آتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کتنا ہی خوش مزاج اور باہمّت کیوں نہ ہو، وہ ازدواجی تعلّقات میں شرمیلا ہوتا ہے۔ آپ کا کہنا کہ وہ شرمیلے نہیں ہیں، صرف ان کے ظاہری برتاؤ کی نشان دہی کرتا ہے۔ شادی کے بعد ان کی بے اعتنائی اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ ازدواجی تعلقات صحیح شکل اختیار نہیں کر سکے ہیں۔ ایسا کیوں ہوا؟ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ دراصل انسان اپنی خواہشوں کو کھُل کر دیکھنا نہیں چاہتا۔ انسان اپنی ناتجربہ کاری یا ماحول کی سختی کی وجہ سے خائف رہتا ہے اسے اپنی ناکامی کا اندیشہ رہتا ہے۔ یہ خوف اس میں جھجک پیدا کرتا ہے اور وہ دُور دُور ہی رہتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ آدمی کتنا ہی تیز کیوں نہ ہو محبّت کے معاملے میں بچّہ ہی رہتا ہے۔ کچھ انسان پہل کرتے ہوئے جھجکتے ہیں۔ دنیا کا قاعدہ یہ ہے کہ پہل مرد کی طرف سے ہوتی ہے، مگر کچھ لوگوں میں نسوانیت کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ پہل عورت کی طرف سے ہو۔ عورت کی فطرت ایسی ہے کہ وہ پہل کر ہی نہیں سکتی۔ وہ خواہش کے باوجود خاموش رہتی ہے۔ وہ پہل کرنے کے لئے سوچتی بھی نہیں وہ نہ صرف اس میں اپنی بے عزّتی سمجھتی ہے بلکہ اسے اس بات سے شرمندگی بھی ہوتی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اس کی خواہش ہی غلط ہے۔ اگر آپ شرمندگی اور جھجک کے احساس کو نظر انداز کر سکیں تو اچھا ہے۔ آپ کی طرف سے پہل ہو گی تو ان کے خیالات میں بھی تبدیلی آجائے گی۔

آپ اپنے خاوند کی وفاداری پر شک نہ کریں اور ان کی بے اعتنائی پر نہ جھنجلائیں۔ وہ آپ سے محبّت کرتے ہیں، آپ کے ساتھ وقت گذارتے ہیں، ہر بات میں آپ کی رائے لیتے ہیں۔ آپ کی اُلجھن کی بنیاد اُن کی نسوانیت ہے۔ آپ کا تعاون اُن میں خود اعتمادی پیدا کرے گا۔



بیراگ اگر اِس صدی کی واحد فلم ہے جس کا برسوں سے انتظار کیا جا رہا تھا تو ہماری یہ کتاب بھی اِس صدی کی سب سے خوب صورت کتاب کہی جا سکتی ہے جس میں فلم کی مکمل کہانی، گانے اور بے شمار فوٹو اس انداز سے پیش کئے گئے ہیں کہ مونہہ سے بولتے ہیں۔ فلم کے ہر منظر کی ایسی تفصیل اور ایسی ایسی تصاویر کہ پوری فلم آنکھوں کے سامنے آجائے۔ فلم کے تقریباً تمام ڈائیلاگ جنہیں آپ بار بار دہرائیں گے
کتاب بیراگ حاصل کرنے کے لئے آج ہی چھ روپے (پانچ روپے کتاب کی قیمت اور ایک روپیہ رجسٹری خرچ) کا منی آرڈر بھیج دیجئے اور منی آرڈر کرتے وقت ڈاک خانہ سے ملنے والی رسید اپنے خط کے ساتھ ہمیں بھیج دیجئے۔ ایجنٹ صاحبان بھی اپنے آرڈر جلد ارسال فرمائیں۔ شمع بک ڈپو۔ آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

بیراگ
نیا ایڈیشن

ملازمت

اعراج احمد جلیلی



شادی کے لئے رضیہ کا اصرار دن بہ دن بڑھتا جا رہا تھا۔ اور میں تھا کہ اُسے مسلسل تین برس سے جھوٹی تسلّیاں دیتا آ رہا تھا۔ اس روز بھی سارے دن مختلف دفتروں اور کمپنیوں کی خاک چھان کر میں تھکا ملا آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا رضیہ کے گھر پہنچا تو گیٹ پر امجد سے ملاقات ہو گئی۔۔۔ امجد جو میرا چچازاد بھائی ہے اور پولیس انسپکٹر کے عہدے پر فائز ہے۔

"کہیں کچھ بات بنی بھی یا نہیں؟" اُس نے ہمیشہ کی طرح فوراً سوال جڑ دیا۔

"نہیں ۔۔۔ ابھی تک کچھ نہیں ہوا۔"

میں نے آہستہ سے پسینہ پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

آخر کب تک یوں ہی بھٹکتے رہو گے؟ میں کہتا ہوں پولیس میں کیوں نہیں بھرتی ہو جاتے۔"

"تم تو جانتے ہو کہ پولیس کی نوکری مجھ سے نہیں ہو سکتی، میں ٹھہرا ادیب آدمی۔ یہ سب مجھ سے نہیں ہو سکتا۔" یہ کہتے ہوئے میں اندر چلا گیا اور امجد بڑبڑاتا ہوا اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے آگے نکل گیا۔

رضیہ امجد کی چھوٹی بہن ہے۔ اس کے گھر میں میرا آنا جانا بچپن سے تھا۔ ایک تو ہماری رشتہ داری تھی دوسرے امجد اور رضیہ سے میری کافی گھٹتی تھی۔ مجھے اندر آتا دیکھ کر چچی نے سر پر پلّو ڈالتے ہوئے کہا "آؤ بیٹا صبح کے گئے اب آئے ہو۔ تھک گئے ہوگے۔ ہاتھ دھو کر بیٹھو میں تمہارے لئے چائے تیار کرتی ہوں۔"

اس گھر میں سب ہی مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ بی اے کرنے کے بعد تو میں نے باقاعدہ سارے خاندان میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ جیسے ہی مجھے ملازمت مل جائے گی میں رضیہ سے شادی کروں گا لیکن بدقسمتی سے تین سال گذرنے کے باوجود مجھے ملازمت نہ مل سکی۔ رضیہ کی خوب صورتی اور سلیقہ شعاری کے ہر طرف چرچے تھے۔ کچھ لوگوں نے چچی کے کان بھرنے شروع کر دیے تھے۔ "آخر کب تک جوان لڑکی کو گھر پر بٹھائے رکھو گی۔ کہیں اور اس کے ہاتھ پیلے کیوں نہیں کر دیتیں۔" خود چچی لوگوں کو جواب دیتے دیتے شاید تھک گئی تھیں۔ اب تو انہوں نے باقاعدہ کسی اچھے اور کماؤ لڑکے کی تلاش بھی شروع کر دی تھی ویسے بھی رضیہ کے لئے بھلا لڑکوں کی کیا کمی تھی۔ چچی کا ہلکا سا اشارہ کافی تھا۔

منہ ہاتھ دھو کر میں رضیہ کے کمرے میں چلا آیا۔ اس کمرے سے میری وابستگی بچپن سے رہی ہے یہاں ہم نے بچپن میں شرارتیں کیں، کتابیں پھاڑیں اور بڑے ہوئے۔ اس کمرے کی ہر چیز میری پسند کی ہے میری پسند کی کتابیں، پردے، فرنیچر اور خود رضیہ جسے آج سے تین سال پہلے میں نے اپنی بانہوں میں بھر کر کہا تھا۔ "میں تمہیں اپنی دلہن بناؤں گا" اور وہ شرما گئی تھی۔

کچھ ہی دیر میں رضیہ اپنے ہاتھوں میں چائے کی ٹرے لئے اندر داخل ہوئی۔ چائے کی پیالی میرے ہاتھوں میں تھما کر سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے وہ آہستہ سے بولی۔ "تمہاری ملازمت کا کیا ہوا؟"

"ابھی تک کچھ نہیں ہوا رضو۔ ویسے میں پوری کوشش کر رہا ہوں۔ دفتروں کے چکر لگاتے

لگا تے میرے جوتے گھس گئے ہیں۔" میں نے اپنے جوتوں کی طرف اشارہ کیا۔

"بھائی جان کہہ رہے تھے کہ اگر ایک مہینے کے اندر تمہیں ملازمت نہیں ملی تو وہ کہیں اور میرے رشتے کی بات چیت شروع کر دیں گے۔" یہ کہتے ہوئے رضیہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ دوپٹے کو اپنے مونہہ میں دبا کر سسکنے لگی۔ چائے پینا میرے لئے دشوار ہوگیا۔ پیالی وہیں رکھ کر میں باہر نکل آیا۔

کچھ ہی دن بعد مجھے ایک دفتر میں انٹرویو کے لئے بلایا گیا۔ میں خوشی سے پاگل سا ہوگیا۔ اس نوکری کو میں کسی بھی قیمت پر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا میں نے کئی سفارشی خطوط جمع کر لئے، کئی بڑے بڑے لوگوں سے ٹیلی فون کروائے، ہر وہ کوشش کر ڈالی جس سے میں یہ ملازمت حاصل کر سکتا تھا، کیوں کہ یہ نوکری میرے لئے انتہائی ضروری تھی۔ میں جانتا تھا اگر میں یہاں کام یاب ہوگیا تو رضیہ — اور میرے درمیان کھڑی ہوئی تمام دیواریں ایک ہی جھٹکے میں گر سکتی ہیں۔

خدا خدا کر کے انٹرویو کا دن آیا۔ اپنے بہترین کپڑے زیب تن کر کے میں آفس پہنچا تو سامنے کے کمرے میں ایک لڑکی بیٹھی دکھائی دی — اُسے نظر انداز کرتا ہوا میں اندر داخل ہوگیا۔ اسی دفتر میں مسعود بھی کام کرتا تھا۔ وہ میرا بہت اچھا دوست تھا اور دفتر کے منیجر پر اس کا خاصا اثر تھا — آج کا انٹرویو منیجر صاحب ہی لینے والے تھے۔ مسعود کو پکڑ کر میں باہر لے آیا اور سرگوشی کے انداز میں بولا "مسعود تم تو جانتے ہو کہ یہ ملازمت میری اور رضیہ کی شادی کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ اس لئے منیجر صاحب سے کہہ کر کسی نہ کسی طرح یہ ملازمت مجھے دلا دو۔"

میری بات سُن کر اپنے ہاتھوں سے سر کو پکڑتے ہوئے اُس نے کہا "بڑی عجیب بات ہے۔ ملازمت ایک ہے اور امیدوار دو ہیں۔ ایک تم اور دوسری وہ لڑکی جو وہاں بیٹھی ہے۔ تم دونوں کے لئے یہ ملازمت حاصل کرنا ضروری ہے۔ تمہارے لئے اس وجہ سے کہ تم رضیہ سے شادی کر سکو اور اس لڑکی کے لئے اس لئے کہ لڑکے والوں نے الٹی میٹم دے دیا ہے کہ اگر لڑکی کو یہ ملازمت نہیں ملی تو وہ اُس کی منگنی توڑ دیں گے۔ یہ بات ابھی کچھ ہی دیر پہلے لڑکی کے بھائی نے مجھ سے کہی ہے۔ بہر حال تم یہاں بیٹھو میں تمہارے سلسلے میں منیجر صاحب سے بات کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر مسعود اندر چلا گیا۔

اور میں اپنا بیگ سنبھالتا، تمام سفارشی خطوط کے ٹکڑے ٹکڑے کرتا، ایک سرسری نظر اُس لڑکی پر ڈالنے کے بعد باہر نکل گیا۔



بچّوں سے کیسے بولیں؟

انور مرزا

والدین اپنے بچّے کو جان بوجھ کر برہم
ہیں کرنا چاہتے، مگر پھر بھی وہ اکثر ان کی
اراضگی کا سبب بن جاتے ہیں۔ درحقیقت جب
وہ بچّوں کے ساتھ موقع کے اعتبار سے صحیح
سلوک نہیں کرتے یا صحیح لہجے میں نہیں بولتے تو
بچے بگڑ اٹھتے ہیں۔

جن والدین کو اپنے بچّوں سے یہ شکایت
ہے کہ وہ ان کا کہنا نہیں مانتے انہیں چاہئے
کہ وہ ان کے ساتھ نئے طریقے سے بولنا سیکھیں
گر آپ بچّوں کے ساتھ دوسرے والدین کی
باتیں توجہ سے سنیں گے تو آپ کو خود ہی احساس
ہو جائے گا کہ وہ ایک دوسرے کی بات سُن
نہیں رہے ہیں۔ ان میں سے ایک فریق۔ ماں

یا باپ۔ نصیحت دے رہا ہو گا، تنقید کر رہا ہوگا
الزام لگا رہا ہو، اور دوسرا فریق۔ بچہ۔ کسی
بات سے انکار کر رہا ہو گا یا کسی بات کے لئے
ضد کر رہا ہو گا۔

بچّوں کی اس ناراضگی کی وجہ والدین
میں پیار یا عمل کی کمی نہیں بلکہ معاملہ فہمی اور
خوش مزاجی کی کمی ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر نو سالہ اختر ایک روز
غصّے میں بھرا گھر آیا، کیوں کہ بارش ہونے کی وجہ
سے ان کی کلاس پکنک پر نہیں جا سکی تھی۔
عام طور پر جب وہ ناراض ہوتا تھا تو سارے
گھر کو سر پہ اٹھا لیتا تھا۔ لیکن اس بار اس کی
ماں نے فیصلہ کیا کہ اس کا غصّہ ٹھنڈا کرنے
کے لئے وہ پرانی گھسی پٹی باتیں نہیں دہرائے
گی، جو اس کے غصّے کو اور بھی بھڑکایا کرتی تھیں
لہٰذا اس نے یہ نہیں کہا "بارش میں نے تو کی
نہیں۔ پھر مجھ پر غصّہ اتارنے کا مطلب؟"
اس کی بجائے اس نے کہا "تمہیں تو واقعی
مایوسی ہوئی ہے!"

"جی ہاں!" اختر نے کہا۔

"تم تو اچھے خاصے تیار ہو کر گئے تھے

لیکن بارش آگئی"، ماں نے کہا۔

"جی ہاں۔ مگر اب چارہ ہی کیا تھا؟" اختر نے کہا اور وہ ایک لمحوں کے لئے خاموش ہوگیا۔ پھر بولا "خیر کوئی بات نہیں، کبھی اور دن سہی۔" اس کا غصّہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اس کے بعد وہ دن بھر کھیلنے کودنے میں لگا رہا اور ماں کو اپنی معاملہ فہمی پر مسرّت ہوئی۔

بچہ جب بہت زیادہ مشتعل ہوتا ہے تو وہ اپنی بات پوری طرح سمجھا نہیں پاتا، لیکن اس کے باوجود وہ چاہتا ہے کہ اسے پوری طرح سمجھا جائے۔ اس وقت والدین کا فرض ہے کہ اس پر ناراض ہونے کی بجائے اسے سمجھانے کی کوشش کریں۔

پانچ سال کا ایک لڑکا جب پہلی بار اسکول گیا تو کلاس میں ٹنگی ہوئی تصویروں کو دیکھ کر کہنے لگا "یہ اتنی بھدی تصویریں کس نے بنائی ہیں؟"

اس کی ماں نے بُرا مانتے ہوئے کہا، "اس قدر خوب صورت تصویروں کو بھدا کہنا بُری بات ہے۔"

اس وقت ٹیچر نے لڑکے کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے مسکرا کر کہا "یہاں سب خوب صورت تصویریں ہی نہیں بناتے۔ تم جیسی بھی تصویریں بنانا چاہو، بنا سکتے ہو۔"

یہ سنتے ہی لڑکے کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ اسے اپنے دل میں چھپے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ درحقیقت وہ ان تصویروں کو بھدا کہہ کر یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ "اگر کوئی لڑکا اچھی تصویر نہ بنا پاسکے تو اس کا کیا حشر ہوتا ہے؟" اسے اپنے بارے میں ڈر تھا کہ وہ شاید اچھی تصویریں نہیں بنا سکے گا۔ ٹیچر نے اس کا وہ ڈر دور کر دیا تھا۔

بچے والدین سے بحث کرنا پسند نہیں کرتے اور نصیحت یا نکتہ چینی سننا تو انہیں مطلق گوارا نہیں ہوتا۔ اگر والدین کو انہیں کوئی نصیحت کرنا ہی ہے تو سب سے پہلے ان کے ساتھ عزت سے پیش آنا چاہئے۔ اگر بچہ کہتا ہے کہ میں حساب میں اچھا نہیں ہوں تو اسے اس طرح نصیحت دینا غلط ہے "تمہیں محنت کرنا چاہئے۔ محنت کروگے تو حساب میں ہوشیار ہو جاؤگے۔" نصیحت سے اس کا اعتماد اور کم ہوگا اور اس کی اندرونی مخالفت اور بڑھے گی۔ لہٰذا اس سے یہ کہنا چاہئے۔ "ہاں حساب آسان نہیں ہے اس کے لئے کافی محنت کرنا پڑتی ہے۔ شاید تمہیں ڈر ہے کہ حساب میں فیل ہوگئے تو ہم ناراض ہوں گے۔ ایسی بات نہیں ہے۔ اگر حساب پر ذرا زیادہ محنت کروگے تو پاس ہو جاؤگے۔"

بچوں کے دل میں اپنے والدین اور ٹیچروں کے لئے جہاں پیار ہوتا ہے وہیں مخالفت بھی ہوتی ہے۔ جہاں وہ ان کی عزت کرتے ہیں وہاں ان سے نفرت بھی کرتے ہیں۔ ان دونوں مخالف جذبوں کو سمجھنا ضروری ہے۔ اکثر جب بچہ اپنی زبان یا حرکتوں سے والدین سے نفرت کا اظہار کرتا ہوتا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ وہ ان کا پیار پانے کا آرزومند ہوتا ہے۔ پیار نہ ملنے کی صورت میں وہ ان سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ ان کی مخالفت پر کمربستہ ہو جاتا ہے۔

بچوں کو کسی غلط کام سے روکنے کے لئے ڈانٹنا یا غصّہ ظاہر کرنا نامناسب ہے اس کا ان پر اُلٹا اثر پڑ سکتا ہے۔ اگر بچے کو سمجھایا جائے کہ اس کا وہ کام غلط کیوں ہے تو وہ بآسانی اسے چھوڑ دے گا۔ وجہ بتائے بغیر صرف ڈانٹنے سے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی ناراضگی ظاہر کرنے کے لئے اس کام کو پھر کرے اور بار بار کرے۔

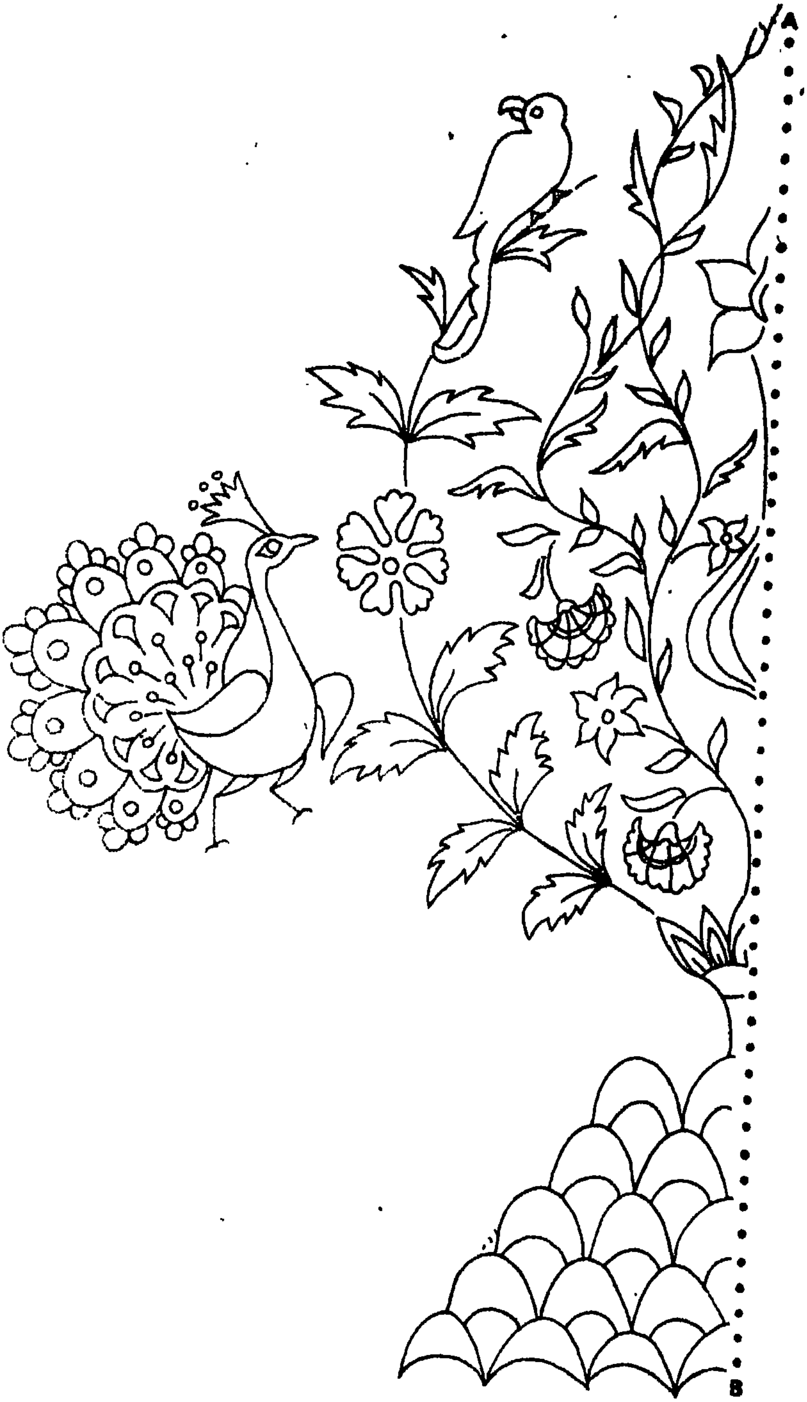
ایک چھوٹی سی لڑکی اپنے گھر کی دیوار پر رنگ برنگی پنسلوں سے کچھ لکھ رہی تھی۔ ماں نے دیکھا تو اسے بے حد غصّہ آیا۔ وہ اسے چانٹا مارنے کے لئے آگے بڑھی۔ لیکن بیٹی کا خوف زدہ چہرہ دیکھ کر وہ رُک گئی۔ پھر اس نے اپنے غصّے پر قابو پاتے ہوئے اس سے کہا "دیواریں لکھنے کے لئے نہیں ہوتیں۔ لکھنے کے لئے کاغذ بنایا گیا ہے۔ آؤ، میں تمہیں کاغذ دیتی ہوں۔ جتنے کاغذ چاہو، بھرنا۔"

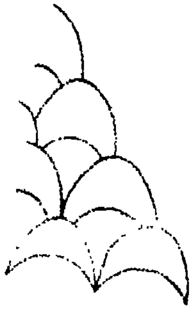
یہ سنتے ہی لڑکی کے چہرے سے خوف دُور ہوگیا اور اس نے خوش ہو کر کہا "تم کتنی اچھی ہو ماں!"

شروع میں ماں غصّے کی حالت میں لڑکی سے شاید کہتی "کیا ستیاناس کر دیا ہے دیوار کا۔ کیا تمہیں اتنی بھی عقل ہے؟ مار مار کے چمڑی اُدھیڑ دینا چاہئے تمہاری، تب کہیں عقل آئے گی تمہیں۔ ٹھیرو، آنے دو تمہارے ڈیڈی کو۔ وہ تمہاری چمڑی اچھی طرح اُدھیڑیں گے۔" ان باتوں سے لڑکی کے دل میں خوف کے ساتھ نفرت بھی بھر جاتی اور ممکن ہے کہ وہ ضد میں آکر دوسری دیواروں پر بھی لکھتی۔

والدین کے لئے ضروری ہے کہ وہ بچوں کے دل کے جذبات کو سمجھیں اور ان کی سطح پر آکر ان سے سلوک کریں، انہیں پیار دیں، ان کے ساتھ اچھی طرح پیش آئیں اور انہیں یقین دلائیں کہ ان کے ہوتے ہوئے انہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

(انگریزی سے ترجمہ)


A
B



کرنا چاہتی ہیں - اپنی راہ خود بنانا چاہتی ہیں -

نزہت کا دوسرا شوق موسیقی ہے -

آرٹ کی طرح موسیقی کا ذوق بھی قدرت کا عطیہ ہے - قدرت نے اس بارے میں بھی کافی فیاضی سے کام لیا ہے - نزہت کلاسیکل موسیقی کی دلدادہ ہیں - اُنہوں نے موسیقی کے کئی مقابلوں میں حصّہ لیا ہے اور ہر بار انعام حاصل کیا ہے - موڈرن آرٹ کی طرح کلاسیکل موسیقی بھی عام انسانوں کی سمجھ سے بالاتر ہے - فلمی گانے یا ہلکے پھلکے گیت ہر شخص سمجھ لیتا ہے، لیکن کلاسیکل موسیقی کو سمجھنا اور سراہنا ٹیڑھی کھیر ہے - اسے نزہت گل کی مشکل پسند طبیعت سمجھئے یا خداداد صلاحیت کہ اُنہوں نے اس میدان میں بھی کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیئے - وہ کلاسیکل موسیقی کے علاوہ ہلکے پھلکے گانے بھی گاتی ہیں - طبلہ، ستار، ہارمونیم اور گٹار بھی بجالیتی ہیں۔

نزہت کو اداکاری سے بھی دل چسپی ہے - اُنہوں نے کئی ڈراموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں - کچھ عرصہ ہوا اُن کے کالج میں موہن راکیش کا مشہور ڈرامہ "آدھے ادھورے" اسٹیج ہوا - نزہت نے اس ڈرامے میں ہیروئن کا رول بہت خوبی سے نبھایا - اُن کی اداکاری کی صلاحیت دیکھ کر یہ خدشہ ہوتا ہے کہ کہیں اُنہیں فلمی دنیا نہ اُچک لے - ان میں فلمی ہیروئن بننے کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں -

اداکاری کے ساتھ ساتھ اُنہیں کہانیاں اور ڈرامے لکھنے کا بھی شوق ہے -

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ آرٹسٹ گھر کی طرف سے بے پروا ہوتے ہیں - مرد آرٹسٹ کے بارے میں تو یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے - آرٹسٹ کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو، گھرداری میں صفر ہوتا ہے - شاید یہی اس کی عظمت کی نشانی ہے - اس کے علاوہ اسٹوڈیو میں تصویریں بنانے والے کھیلوں سے بھی دُور بھاگتے ہیں - آرٹسٹ اور کھلاڑی کا ایک ہی فرد میں جمع ہونا بہت مشکل



نزہت گل کی ہنرمندی کے نمونے

ہے - نزہت نے اس کلیہ کو بھی غلط ثا
فنونِ لطیفہ میں اتنی گہری دل چسپی کے باو
کھیلوں میں بھی دل چسپی رکھتی ہیں - کھا
میں اُنہیں مہارت حاصل ہے - وہ جس خو
برش اور رنگ استعمال کرتی ہیں اُسی خو
اور دھاگے سے بھی کام لیتی ہیں - ان کے
حُسن اور سلیقہ ہے - ظاہری خوب صورتی
قدرت نے اُنہیں باطنی خوبیوں سے بھی نواز

نزہت ایک مہذب اور تعلیم یافتہ
سے تعلق رکھتی ہیں - ان کی دوسری بہنیں کا
اسکولوں میں تعلیم حاصل کر رہی ہیں - ان کے
سیّد مہدی اصغر شہر کے ایک کامیاب تاجر ہ
ایک اچھے گانے والے بھی ہیں - غزل سرا
مرثیہ خوانی سے اُنہیں خصوصی دل چسپی ہے -
شعر و ادب کا بھی ذوق رکھتے ہیں - علم و فن کی
نزہت نے ورثے میں پائی ہے - نزہت کی و
مالیر کوٹلہ سے تعلق رکھتی ہیں - وہ نواب مالیر کوٹلہ
عزیزوں میں سے ہیں - مالیر کوٹلہ مشرقی پنجاب
ایک چھوٹی سی ریاست ہے - مشرقی پنجاب اور
کے سنگم نے ذہانت اور حُسن کے اس مجموعے کو جنم
ہے - انسانی نسل کے ماہرین تحقیقات کے بعد ا
نتیجے پر پہنچے ہیں کہ میاں اور بیوی کے خاندانو
جتنا زیادہ فاصلہ ہوگا، اولاد اتنی ہی ذہین ہوگ
اس کے برعکس قریبی رشتہ داروں میں شادیاں کر
اولاد میں ماں باپ کی بیماریاں اور برائیاں دوچن
ہو جاتی ہیں - اس اصول کو مدِنظر رکھتے ہوئے نزہ
کی صلاحیتیں فطری معلوم ہوتی ہیں - غیر کفو میں شا
کی وجہ سے ماں باپ کی خوبیاں نزہت میں اضا
کے ساتھ جمع ہو گئی ہیں - ان کی والدہ بھی ایک
تعلیم یافتہ خاتون ہیں -

نزہت ایم - اے کی طالب علم ہیں - وہ
اپنے کالج کی ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں کی روحِ
رواں ہیں -

●●

مسافر
(سیما کے نام)



بزدل نہ کہو اے ہم سفرو　　میں خائفِ طولِ راہ نہیں
میں اپنے دل سے ہوں مجبور　　میں لوٹ کے اب گھر آؤں گا
پھر اُس کی یاد نے گھیرا ہے　　اب کتنی دُور سویرا ہے
پھر یاد کے بادل ہیں چھائے　　وہ تاریکی میں دو سائے
وہ قصے ساری راتوں کے　　وہ پیلے کنگن ہاتھوں کے
وہ ہاتھ کی مہندی باغوں سی　　وہ روشن آنکھ چراغوں سی
وہ خوشیاں مانگنے سونے کی　　وہ ایک انگوٹھی سونے کی
وہ سُندر باہیں صندل سی　　وہ گہری زلفیں بادل سی
وہ نازک کلیاں ہونٹوں کی　　وہ نیلی جھیلیں آنکھوں کی
وہ ریشمی تکیے پھول کڑھے　　وہ کان کے بُندے موتی جڑے
وہ دھانی جمپر اوٹ لگا　　وہ سُرخ دوپٹہ گوٹ لگا
وہ ساری راتیں جاگنے کی　　وہ مالا کالے دھاگے کی
وہ لہجہ دھیرے دھیرے کا　　وہ ناک میں کانٹا ہیرے کا
وہ پیار جھیلیں بھری بھری　　وہ ہاتھ کی چوڑی ہری ہری
وہ راتیں پانے کھونے کی　　وہ چین گلے میں سونے کی
وہ سپنے جانے پہچانے　　وہ چھوٹے اونی دستانے
وہ وقت سے پہلے بتیا رہی　　وہ تیری ذاتی الماری۔
اب ٹھہرا تو مر جاؤں گا۔　　میں لوٹ کے اب گھر جاؤں گا

وہ چہرہ جو لاثانی ہے
وہ چہرہ جو نورانی ہے

راحت قیصری

زبان اور بے زبان مخلوق

ایم عبداللہ



خدا نے ہمیں اشرف المخلوقات بنایا ہے زبان نے ہم کو جانوروں سے ممتاز کیا ہے لیکن ہم ان بے زبانوں کے ساتھ ناروا سلوک کرتے ہیں ہماری زبان میں جانوروں کے لئے اچھے الفاظ کم ہی ملتے ہیں۔ ہم جب کسی کو بے عقل اور مونہہ پھٹ سمجھتے ہیں تو اسے جانور کے نام سے پکارتے ہیں یہ جانوروں کے ساتھ سراسر ناانصافی ہے۔ اگر خدا جانوروں کو انسان جیسی سمجھ عطا کرتا تو نہ معلوم وہ ہمیں کس طرح یاد کرتے لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ انسان کے بخشے ہوئے خطابات سے کبھی خوش نہ ہوتے۔

انسان نے گدھے کو ہمیشہ بے وقوف سمجھا ہے بے وقوف انسان کو گدھے کے نام سے پکارا جاتا ہے گدھا بلا چون وچرا اپنے مالک کا حکم بجا لاتا ہے اس کی پیٹھ پر کتنا ہی بوجھ لاد دیا جائے وہ اُف نہیں کرتا کسی انسان میں اطاعت کا مادہ ہو اور وہ محنتی بھی ہو تو وہ گدھا بن جاتا ہے اگر وہ چالاک ہے، دوسرے کی آنکھ کا سُرمہ چرا سکتا ہے تو پھر وہ لومڑی کہلاتا ہے۔ اسی طرح مکاری اور چالاکی کی صفت کے لئے بھی ایک جانور ہی کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص ضدی منہ پھٹ دھیٹ ہے تو وہ اڑیل ٹٹو ہو جاتا ہے۔ اگر بھاری بھرکم ہے تو ہاتھی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اگر اس کی گردن موٹی ہے تو اس کے لئے لوگوں کو گینڈے کی تشبیہ یاد آتی ہے۔ انسان کی قوتِ ہضم اچھی ہو اور وہ موٹا تازہ ہو تو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ کھا کھا کر دُنبہ ہو رہا ہے۔ اس کے برعکس اگر اس کی قوتِ ہضم کمزور ہو تو پھر اس پر یہ مثل صادق آتی ہے، کھائے بکری کی طرح اور سُوکھے لکڑی کی طرح۔ لمبے آدمی کو اُونٹ سے تشبیہ دی جاتی ہے اور سُوکھے ہوئے انسان کو ٹِڈا کہا جاتا ہے۔ ہم عموماً سور اور چھپکلی کا نام لیتے ہوئے ڈرتے ہیں اس لئے ایک کو ’جنگل والا‘ اور دوسرے کو ’دیلدار والی‘ پکارتی ہیں۔ گھوڑے کو دوسری بیوی کی طرح سمجھا جاتا ہے، دوہاجو کی بیوی اور سوداگر کا گھوڑا، جتنا اچھلے اتنا تھوڑا۔ کتا بے چارہ ایک وفادار جانور ہے، لیکن اس کی دُم ہمیشہ ٹیڑھی رہتی ہے۔ بارہ برس نلوے میں رکھنے کے بعد بھی سیدھی نہیں ہوتی۔ انسان کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہو تو وہ دھوبی کا کتا بن جاتا ہے، جو نہ گھر کا رہتا ہے نہ گھاٹ کا۔ انسان دوسرے کی نقل کرے تو بندر کہلاتا ہے اور اگر اپنے کام میں مگن رہتا ہے تو کولہو کا بیل بن جاتا ہے۔ عورت موٹی اور سانولی ہو تو اسے دیکھ کر بھینس یاد آتی ہے۔

شاعروں نے بھی جانور کا خوب استعمال کیا ہے۔ محبوب کی آنکھیں ہرنی کی آنکھوں سے ملتی جلتی ہیں۔ چیتے کی کمر اور مورنی کی چال حسین تشبیہیں ہیں۔ انسانوں کی یہی ایک جماعت ہے جس نے جانوروں کو اچھے نام سے یاد کیا ہے — انہوں نے محبت کی شدت کو شمع اور پروانہ کی مثال دے کر ثابت کیا ہے۔ چاند اور چکور محبت کی دوسری مثالیں ہیں۔ یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ یہ فہرست بہت مختصر ہے، اتنی مختصر کہ شاعروں اور ادیبوں کو دو خوب صورت پرندے خود ایجاد کرنے پڑے ایک عنقا اور دوسرا ہُما۔ ایک وقت میں ایک ہی عنقا زندہ رہ سکتا ہے۔ جب اس کی موت قریب آتی ہے تو وہ خس وخاشاک میں چھپ جاتا ہے۔ اس کے نالے کی گرمی سے گھاس میں آگ لگ جاتی ہے۔ وہ جل بھُن کر راکھ ہو جاتا ہے لیکن اس راکھ میں سے دوسرا عنقا پیدا ہوتا ہے ہُما ایک ایسا پرندہ ہے جس کا سایہ کسی انسان کے

سر پر پڑ جائے تو وہ بادشاہ بن جاتا ہے۔ یہ دونوں من گھڑت محاورے بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔ اس لئے دونوں کا وجود ادب کی کتابوں کے علاوہ کہیں نہیں ملتا۔ ہندوستان میں گائے کی پوجا ہوتی ہے۔ اسے ماں کا رتبہ دیا جاتا ہے سیدھی سادی عورت کو گئو کہا جاتا ہے۔ لیکن یہی عورت اگر بے وقوفی کی حد تک معصوم ہو تو اللہ میاں کی گائے بن جاتی ہے۔ اللہ میاں کی گائے ایک سیاہ رنگ کا کیڑا ہوتا ہے جو بڑی سادگی سے زمین پر چلتا ہے۔ اسے چھیڑو یا اُلٹ پلٹ کرو تو وہ کچھ نہیں کرتا۔ اسے غصہ نہیں آتا۔ وہ اپنا رُخ نہیں موڑتا، بس ناک کی سیدھ میں چلا جاتا ہے۔ ہندوستان میں ہنومان کی بھی پرستش ہوتی ہے لیکن اگر کوئی عورت سر جھاڑ منہ پہاڑ دکھائی دے تو بندریا بن جاتی ہے۔ اگر کوئی چیز ناانصافی سے تقسیم کی جائے تو بندر بانٹ کہلاتی ہے۔

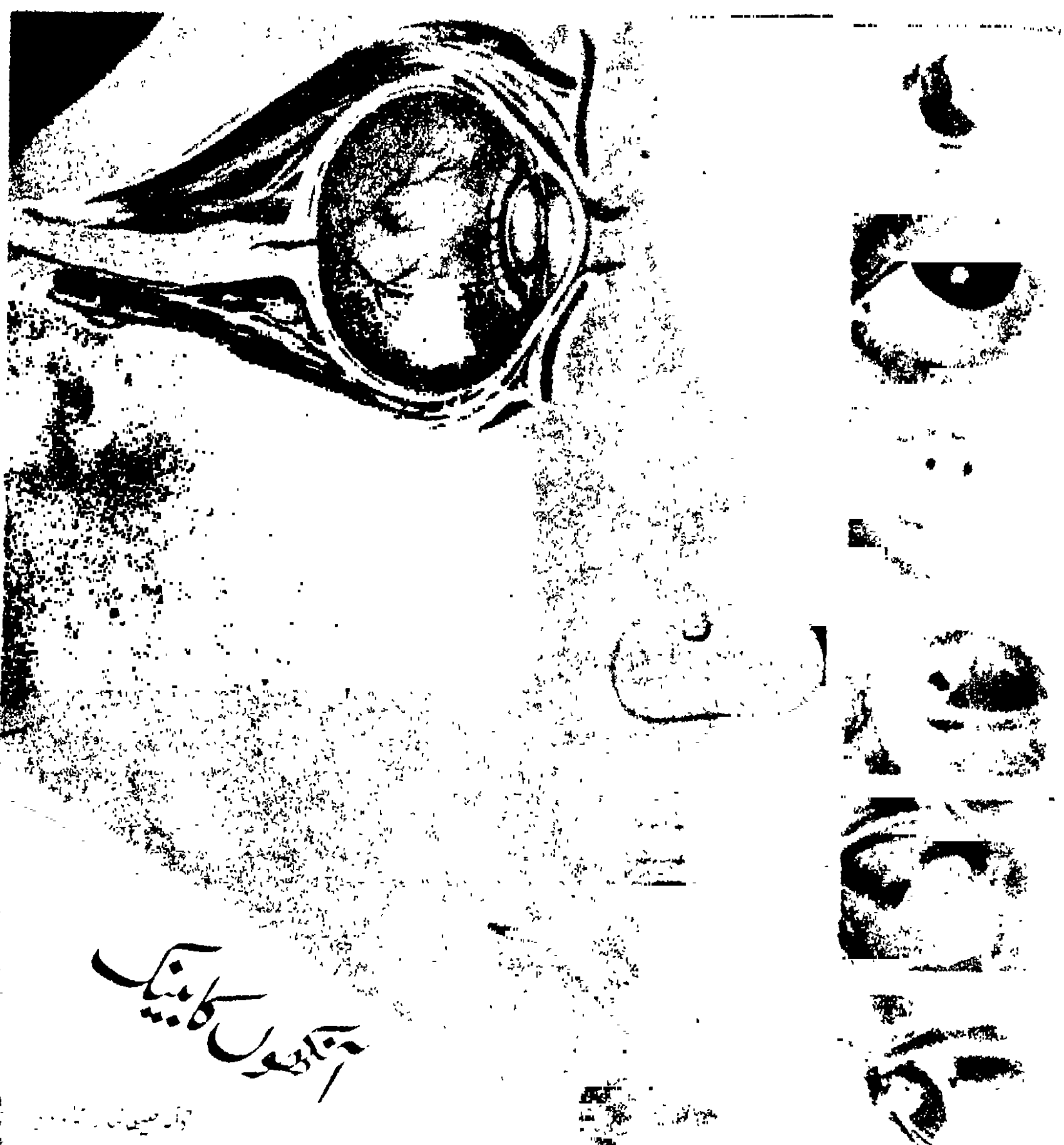
پرندے بھی انسان کے تیرِ ستم سے محفوظ نہیں۔ کوئی انسان سینہ تان کر چلے تو لقا کبوتر بن جاتا ہے۔ ہنستے ہنستے وہ لوٹن کبوتر کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ انسان کسی بات کی ٹھان لے تو وہی مرغے کی ایک ٹانگ یاد آتی ہے۔ رات بھر جاگنے والے کو چمگادڑ یا اُلو سے تشبیہ دی جاتی ہے اُلو کے معاملے میں رات کو جاگنے کے علاوہ نحوست مستزاد ہوتی ہے۔ خاوند بیوی پر جان چھڑکے تو ضرور بیوی نے اس کو اُسی منحوس جانور کا گوشت کھلایا ہے۔ کسی کی ناک خمیدہ ہو تو طوطے کی ناک بن جاتی ہے۔ اگر کسی کا حافظہ اچھا نہ ہو تو اسے طوطے کی طرح رٹنا پڑتا ہے۔ بے وقوف انسان اُلو کی دُم فاختہ کہلاتا ہے۔ اگر کوئی معمولی حیثیت کا انسان لمبے چوڑے دعوے کرے تو اس پر یہ مثل صادق آتی ہے: کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ۔ بات بات پر عیب نکالنے والے کو آنکھ پھوڑ ٹڈے سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اگر کوئی انسان دوسرے کی محنت پر عیش کرے تو لوگ کہتے ہیں کہ دُکھ جھیلیں بی فاختہ اور کوّے انڈے کھائیں۔ جن لوگوں کی فطرت میں شرارت ہوتی ہے وہ گندے انڈے کہلاتے ہیں۔

رینگنے والے جانوروں میں سب سے خطرناک ناگن ہوتی ہے۔ یہ لقب عورتوں کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ اس کا کاٹا پانی بھی نہیں مانگتا۔ لوگ اسے خوش دیکھنے کے لئے اس کی پوجا کرتے ہیں۔ سنا ہے کہ ناگن ضرور انتقام لیتی ہے۔ انسان دکھاوے کے لئے آنسو بہائے تو یہ مگرمچھ کے آنسو کہلاتے ہیں۔ اگر کوئی انسان وسائل کے موجود ہونے کے باوجود بھی اپنا ماحول تبدیل نہیں کرتا تو وہ موری کا کیڑا بن جاتا ہے جو موری میں رہ کر ہی خوش ہوتا ہے۔ کتابیں پڑھنے کا شوق ہو تو انسان کتابوں کا کیڑا بن جاتا ہے کتابیں پڑھنے کے بعد بھی انسان عقل مندی کا اظہار نہ کرے تو گدھے پر کتابیں لادی گئی ہیں۔ شاعروں نے ابرو کو بچھو اور سیاہ زلفوں کو ناگن سے تشبیہ دی ہے۔ (دونوں ابرو دونوں گیسو چار موذی ہیں بہم)۔

اب سمندری جانوروں کی باری آتی ہے۔ انسان اپنے محبوب کی یاد میں اس طرح تڑپتا ہے جیسے بن پانی کے مچھلی۔ سست رفتار آدمی کچھوے کی چال چلتا ہے۔ اگر انسان کسی کو اپنے جال میں پھانس لے تو گویا مچھلی کانٹے میں پھنس گئی۔

مغربی ممالک بھی اس معاملے میں ہم سے پیچھے نہیں۔ وہاں ہر وقت نکتہ چینی کرنے والی عورت کو کُتیا کے لقب سے نوازا جاتا ہے۔ عورتوں کو یہ سن کر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، دراصل ان ملکوں کے رہنے والے کتوں سے بہت پیار کرتے ہیں۔ ان کا یہ پیار جنون کی حد تک پہنچ جاتا ہے کتوں سے ان کی محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ فرانس کے بازاروں میں کتوں کے لئے علیحدہ پیشاب خانے بنائے گئے ہیں۔ سویڈن اس معاملے میں فرانس سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔ وہاں کتوں کے لئے خاص حمام موجود ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس لقب میں پیار اور بے زاری دونوں مشترک ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں عورتوں کے لئے دوسرا لقب بلی ہے۔ چالاک اور مکار عورت کو بلی کہا جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ عورت کی فطرت بلی سے مشابہ ہے۔ جب اس کے بالوں پر پیار سے ہاتھ پھیرو تو یہ پنجہ مارتی ہے۔ اگر اس کو لات مارو تو یہ خُر خُر کرکے گود میں بیٹھ جاتی ہے۔ کتے اور بلی کا فرق نمایاں کرنے کے لئے یہ مثل مشہور ہے۔ اگر کتے سے تین دن مہربانی کا برتاؤ کیا جائے تو وہ اسے تین سال تک نہیں بھولتا۔ لیکن بلی سے تین سال تک مہربانی برتی جائے تو وہ اسے تین دن میں بھول جاتی ہے۔

انگریزی زبان میں بھی جذبات کے اظہار کے لئے جانوروں کی مدد لی گئی ہے۔ بزدل آدمی کے سینے میں مرغ کا دل ہوتا ہے۔ عورت بکری کی طرح بے وقوف ہوتی ہے۔ مرد ریچھ کی طرح وحشی اور بدمزاج ہوتا ہے۔ تتلیاں قابلِ اعتبار نہیں ہوتیں، آج اس پھول پر تو کل اس پھول پر۔ یہ صفت بھی عورت کے لئے مخصوص ہے۔ خارپشت احتیاط کے لئے مشہور ہے خرگوش تیز رفتار سے دوڑنے والے کو کہتے ہیں۔ مغرور اور ضدی شخص سانڈ کا سر رکھتا ہے۔ بے ڈھنگی چال ہاتھی کی چال کہلاتی ہے۔ جب انسان کو کچھ سجھائی نہ دے تو اسے چمگادڑ کہتے ہیں۔ سب لوگ ایک طرح سوچنے لگیں تو یہ بات ریوڑ کی ذہنیت کہلاتی ہے۔ ہندوستان میں یہ صفت 'بھیڑ چال' کے نام سے موسوم ہے۔



آنکھوں کا بینک

ہمارے ملک میں لاکھوں انسان ایسے ہیں جو مکمل یا جزوی طور پر اندھے ہیں اور آنکھوں جیسی نعمت سے محروم ہیں۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ان کی آنکھوں کی پتلی کا نازک پردہ (کارنیا) غیر شفاف ہے۔ بعض کا اندھاپن کارنیا کے مکمل غیر شفاف ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے اور بعض کا جزوی غیر شفاف ہونے کا نتیجہ۔ کارنیا کئی اسباب اور امراض کے باعث غیر شفاف اور خراب ہو جاتا ہے۔ اکثر یہ کسی قسم کے زخم یا چوٹ لگنے سے یا کسی دوسری بیماری ہونے سے خراب ہوتا ہے۔ اس کا علاج عموماً آپریشن سے کیا جاتا ہے، مگر پھر بھی بعض اوقات کامیاب علاج نہیں ہوتا۔ جدید طرزِ علاج میں خراب اور غیر شفاف کارنیا کو نکال کر اس کی جگہ اچھا اور صحت مند شفاف کارنیا لگایا جاتا ہے۔ یہ بالکل کارگر علاج ہے۔ اس کے لئے بالکل تازہ مرے ہوئے آدمی کی اچھی اور صحت مند آنکھ نکال کر محفوظ کر لی جاتی ہے اور اچھی آنکھ کا کارنیا خراب کارنیا کی جگہ لگا دیا جاتا ہے۔ تازہ مرے ہوئے آدمی (یعنی مرنے کے بعد پندرہ منٹ کے اندر) کی آنکھ اچھی حالت میں نکال کر اس کو آنکھوں کے بینک میں بہتر گھنٹے کے اندر محفوظ کیا جاتا ہے۔ اس جدید طریقہ ہائے



علاج سے اندھاپن دور ہوجاتا ہے اور اندھا آدمی دوبارہ دیکھنے کے قابل ہوجاتا ہے۔ اس طرح آنکھوں کا بینک ضائع ہوجانے والی آنکھوں کو دوبارہ بصارت دے دیتا ہے اور ہزاروں بدنصیب انسانوں کو اس جدید عمل جراحی سے بینائی عطا کرتا ہے۔ یہ عمل مخصوص تجربہ کار جراحوں اور ڈاکٹروں کے ہاتھوں سے ہوتا ہے۔ یہ بینک ڈاکٹروں اور نرسوں کو ایک خاص نوعیت کی تعلیم دینے میں بھی سہولت مہیا کررہا ہے اور ان کو آنکھوں کو جمع کرنا، انہیں محفوظ کرنا اور آنکھوں کی جگہ کی جراحی کرکے وہاں نیا کارنیا لگانے کی ٹریننگ بھی دے رہا ہے اور اس سلسلہ میں ریڈ کراس سوسائٹی اور دوسرے رفاہی ادارے بینک سے تعاون کرتے ہیں۔ انسانیت کے خیرخواہ لوگ رضاکارانہ طور پر اپنی آنکھیں مرنے کے بعد بینک کو دان کے طور پر دے دینے کی ہدایت کردیتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ خراب آنکھوں کی جگہ دوسری اچھی آنکھ پوری کی پوری نہیں لگائی جاتی، بلکہ خراب آنکھ کا باریک پردہ نکال کر اچھی آنکھ کا پردہ جو بہت باریک ہوتا ہے اس کی جگہ لگایا جاتا ہے۔

بصارت کے لئے کارنیا بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اور کارنیا ہی آنکھ کا وہ حصّہ ہے جو زیادہ نازک ہے اور ذرا سے زخم اور مرض سے متاثر ہوجاتا ہے خراب کارنیا آنکھوں اور پورے جسم کو امراض میں مبتلا کرنے کا باعث بن سکتا ہے۔ کارنیا کے خراب ہونے کی بہت سی علامتیں ہیں۔ مثلاً اس کا جسامت میں موٹا ہوجانا ہے، جو کم حیاتین اور کم طاقت بخش اجزاء والی غذا کے استعمال سے ہوتا ہے۔ وٹامن کی کمی بھی اس بیماری کو پیدا کرتی ہے۔ بہت سے امراض جن میں بڑے کو ما، چیچک، امراض خبیثہ، تپ دق، زخم، غذا کی کمی اور خراب غذا سے پیدا ہونے والی بیماری، اینیمیا (خون کی کمی) یہ سب کارنیا کے اندھے پن کا سبب بن سکتے ہیں۔ کارنیا کے روبے مستقل طور پر بھی ہوجاتے ہیں۔ اکثر لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ کارنیا کے روبے دور کرنے کے لئے تیز اثر آنکھوں کی دوا آنکھوں میں لگاتے ہیں، تاکہ روبے دور ہوجائیں، مگر وہ ایسا کرکے اپنی آنکھوں کو مستقل طور پر اندھا کرلیتے ہیں۔ کارنیا کی بیماری ہونے پر انسان کو غفلت نہیں برتنا چاہئے اس کا علاج آنکھوں کے ماہر ڈاکٹر سے کرانا ضروری ہے

کارنیا کے قطعی خراب ہوجانے کی صورت میں وہ کارنیا کو بدلنے کا مشورہ دے سکتا ہے اور ایسی صورت میں آنکھوں کا بینک ہی اس کی مدد کرسکتا ہے۔

آنکھوں کا بینک خون کے بینک کی طرح کام نہیں کرتا۔ خون کے بینک میں خون تو انسان کے جسم سے نکالا جاتا ہے، اس کو مختلف سائنسی طریقوں سے محفوظ کیا جاتا ہے اور مختلف طبی اداروں کو حادثات میں زندگی بچانے کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ مگر آنکھوں کے بینک کی کارگزاری مختلف ہے یہ بینک آنکھوں کا عطیہ تازہ مرے ہوئے آدمیوں کے جسم سے اس صورت میں حاصل کرتے ہیں، جب وہ اپنی زندگی میں برضا و رغبت اور رضاکارانہ طور پر اپنی آنکھیں اس مقصد کے لئے وقف کرچکا ہو۔ پھر ان آنکھوں کو محفوظ کیا جاتا ہے اور دوسرے اندھوں کو جو ان کی ضرورت محسوس کرتے ہیں آپریشن سے لگادیا جاتا ہے۔ اندھوں کے نام اور پتے درج کرکے باضابطہ ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بینک ایک اور فہرست بھی تیار کرتا ہے جس میں ان ماہر چشم ڈاکٹروں کے پتے ہوتے ہیں جو خصوصی ٹریننگ لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک مکمل ریکارڈ عطیہ دینے والوں اور عطیہ حاصل کرنے والوں کا رہتا ہے۔ اس محکمے کی جانب سے ایک تربیتی کورس کا انتظام کیا جاتا ہے، تاکہ نوجوان ماہرین امراض چشم تجربہ اور تعلیم حاصل کریں۔

اس طرح آنکھوں کا بینک ہزاروں بصارت سے محروم ہوجانے والوں کو آنکھوں کے نئے نور اور زندگی کی نئی روشنی کی نوید سناتا ہے۔ ضرورت ہے کہ عوام بھی اس کے ساتھ بھرپور تعاون کریں اور مرنے کے بعد اپنی آنکھیں دوسروں کو دینے کے لئے وقف کردیں تاکہ ان کی آنکھیں ایک نئے پیکر میں زندہ رہیں اور اسے خوشی بخشیں۔

ذرا اور ٹھہر

قصۂ محنت و آلام سے تھک کر اکثر
تیری تصویر کی جانب ہی تکا کرتا ہوں
تیری آنکھوں میں حسیں خواب نظر آتے ہیں
اور میں دیکھ کے خوابوں کو ڈرا کرتا ہوں

میری آنکھوں میں تھرکتے ہیں بھیانک سائے
نور آنکھوں کا تری اس میں نہ ضم ہو جائے
بیم و امید کی اس کشمکش پیہم میں
یہ بھی ہے خوف ترا پیار نہ کم ہو جائے

میری محبوب! مری ہمدم و دلبر تجھ سے
دور ہوں میں کہ ابھی تاب نہیں شانوں میں
اس قدر ہے یہ گراں غربت و افلاس کا دور
زندگی قید ہے اس دور کے کچھ دانوں میں

اک محبت پہ تری کارِ جہاں بس تو نہیں
ہاں یہاں معرکۂ جد و جہد اور بھی ہیں
بحر میں اک ترا گرداب نہیں ہے تنہا
اس میں پوشیدہ تھپیڑوں کے کئی دور بھی ہیں

اک کشتی کے لیے میں ہوں ابھی سرگرداں
دور تک گرچہ نہیں کشتی و ساحل کا پتہ
پھر بھی اک رشتۂ امید لیے ہاتھوں میں
ڈھونڈتا پھرتا ہوں بے نام سی منزل کا پتہ

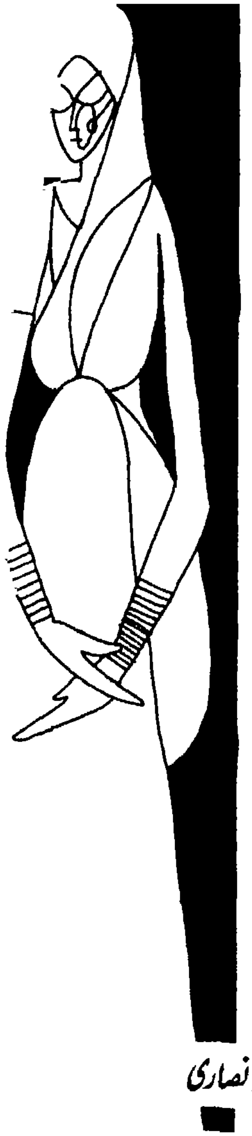
اپنی کمزور نگاہوں پہ نظر کیوں نہ رکھوں
میں رہوں گا تری آنکھوں کے سہارے کب تک
اپنی آنکھوں سے ہی دکھلاؤں جہاں میں تجھ کو
یہ تمنا ہے رہوں چرخ کے نیچے جب تک

چشم معصوم کا احسان اٹھاؤں کیسے
تو نے راہوں میں بکھیرے جو اجالے، کم ہیں؟
یہ جہاں عرصۂ تقدیر و محن ہے جس میں
میرے احساس تری یاد سے تازہ دم ہیں

میری محبوب! مری جان ذرا اور ٹھہر
تجھ سے دوری مری توہینِ محبت تو نہیں
کیسے دے دوں ابھی باہوں کا سہارا تجھ کو
میری باہوں میں ابھی طاقت و ہمت تو نہیں

بوجھ اپنا ہی اٹھانے کی نہیں تاب ابھی
تو ذرا قدرِ گراں بار گزر جانے دے
کٹ ہی جائیں گے ہمارے غم و اندوہ کے دن
میرے پژمردہ خیالات سنور جانے دے

بدرالدین انصاری



شبِ انتظار

کالی کالی ہے اُجڑی اُجڑی سی
مضمحل مضمحل، اُداس اُداس
اے شبِ ہجر سوگ وار ہے کیوں
کیا تجھے میرے دُکھ کا ہے احساس

جس طرف بھی نظر اٹھاتا ہوں
ایک پُرہول ہُو کا عالم ہے
دوست ہیں بس اُداسیاں میری
بس خموشی ہی میری ہمدم ہے

کان پڑتی نہیں کوئی آواز
کوئی سایہ نظر نہیں آتا
ہو چکا ہے ہر اک سہارا دور
اک اندھیرا ہے جو نہیں جاتا

خوف سے تھرتھرانے لگتا ہوں
کوئی پتّہ جہاں کھڑکتا ہے
دل میں طوفان جاگ اٹھتے ہیں
اور تیزی سے وہ دھڑکتا ہے

صبح کس واسطے نہیں ہوتی
جانے کتنی طویل ہے یہ رات
اب تو وحشت سی ہو چلی ہے مجھے
آ چلی ہے زباں پہ دل کی بات

حسبِ وعدہ تم آ گئے ہوتے
رات نصف کی گزر چکی ہوتی
دب چکی ہے جو شب کے سائے میں
زندگی وہ اُبھر چکی ہوتی

حضور سہسوانی



پرایا بوجھ

بلقیس حبشیہ

"ایک اکیلی جان کیا کیا کروں! میرے بھی دو ہاتھ ہیں، کوئی دس تو نہیں۔ پھر میرے پیچھے ایک کام تھوڑا ہی ہے۔ سب کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ میں تو گویا اس گھر کی نوکرانی ہوں۔" آپی باورچی خانہ میں زور زور سے برتنوں کو پٹختے ہوئے بڑبڑا رہی تھیں اور ادھر دولہا بھائی کمرے میں چیخ رہے تھے: "ڈھنگ کا کھانا نہیں وقت پر چائے نہیں، کمرے میں میری کوئی چیز جگہ پر نہیں۔ گھر ہوا سرائے ہوگیا۔"

دولہا بھائی کے اس طنز پر حنا روہانسی ہوگئی۔ نچوڑے ہوئے کپڑوں کو تار پر پھیلا کر گیلے ہاتھ اوڑھنی کے کونے سے پونچھتی وہ جلدی سے سے باورچی خانے میں آئی۔

"آپا، آپ جائیے دولہا بھائی کے پاس۔ باقی کام میں دیکھ لوں گی۔"

"اب کیا خاک کام کرے گی؟ کالج کا وقت ہوگیا ہے۔" آپا جل کر بولیں۔

"آپا — صبح سے میرے ہاتھ بھی تو خالی نہیں۔ سب کمروں میں جھاڑو لگائی۔ ناشتہ تیار کیا، ناشتے کے برتن مانجھے بچوں کو نہلایا، اور اب سب کپڑے دھو کر آرہی ہوں۔ میں بھی کب بے کار بیٹھی ہوں۔"

"ہاں ہاں، گھر بھر کا کام سب تیرے ہی تو ذمہ ہے۔ دوسری پڑھنے والی لڑکیاں گھر کا کام نہیں کرتی ہوں گی۔"

"میں یہ کب کہہ رہی ہوں؟" آپا کے جواب پر حنا کھسیانی ہوگئی۔

"اب گھر کے کام کے لئے نوکر رکھنا ہوگا۔" دولہا بھائی نے گویا ترکش سے تیر چھوڑا، جو حنا کے دل میں جا گڑا۔ اس کی آنکھیں گیلی ہوگئیں۔ اتنا تو کام کرتی ہوں۔ وہ سوچنے لگی۔ صبح سے اٹھ کر کالج جانے تک اور کالج سے آتے ہی رات گئے تک کام۔ کتاب کھولنے کی فرصت نہیں ملتی۔ پھر بھی یہ لوگ کہتے ہیں کہ میں کام ہی نہیں کرتی۔ اس کے دل کا درد آنسو بن کر پلکوں پر اٹک گیا۔

"اب وہاں کھڑی کیا کر رہی ہے؟ کالج کا وقت ہوگیا ہے۔ کیا تیری کنگھی چوٹی بھی مجھے ہی کرنا ہوگی۔" آپا کی تیز کراری آواز حنا کے احساس پر چھری بن گئی۔

"اور دیکھو کالج سے آتے آتے کچھ اون خرید لانا۔ بچی اور وکی کے لئے سوئیٹر بنانا ہے۔" آپا نے اس سے کہا۔

اب گھر کے کاموں کے علاوہ ان کاموں کے لئے میں وقت کہاں سے لاؤں حنا دل ہی دل میں سوچنے لگی۔

"اور اپنے دولہا بھائی کی قمیض میں بٹن ٹانک دیے تھے؟"

"جی ہاں"

"اور میرے پیٹی کوٹ کے لئے کروشیا کی لیس کیا ابھی تک تیار نہیں ہوئی؟"

"جی وہ بھی تیار ہوگئی ہے۔"

"تو پھر اسے پیٹی کوٹ پر کب ٹانکو گی؟ اچھا اب کالج چلی جاؤ۔ جلدی کرو۔ تم تو بڑی کاہل ہوتی جا رہی ہو۔ مجھ کو ہی

تمہارے سب کاموں کی فکر رکھنا پڑتی ہے۔"

"یہ لو اسکول کی فیس۔" آپا نے دس کا نوٹ حنا کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔ حنا کو آپا کا یہ انداز بڑا تحقیر آمیز معلوم ہوا۔

"اور اسکول کی بس والوں نے بھی اس ماہ سے اپنا کرایہ بڑھا دیا ہے۔ تمہارے دولہا بھائی ناراض ہو رہے تھے۔ میں اکیلی جان کس کس کے لئے دکھ جھیلوں۔ اب تم کالج پیدل جایا کرو۔"

اب میں آپا پر بوجھ بنتی جا رہی ہوں حنا سوچنے لگی۔ امی ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ لیکن میں ابھی بے سہارا تو نہیں ہوئی۔ پڑھائی کا یہ سال ختم کر کے میں واپس اپنے گاؤں چلی جاؤں گی۔

"امی تو بے حس ہیں۔ ان کو لڑکیوں کے مستقبل کا ذرا بھی خیال نہیں۔ بے چاری حنا پڑھائی کے لئے کس قدر تڑپتی ہے کیا ہے اگر اُسے میرے ساتھ شہر بھیج دیں۔ رضوی صاحب کی سالی چار سال سے بہن کے پاس رہ کر پڑھائی کر رہی ہے۔ لیکن امی کو تو اپنی لڑکیوں پر جیسے بھروسہ ہی نہیں۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ میرا بس چلے تو ابھی تجھے اپنے ساتھ شہر لے جاؤں اور کالج میں داخل کرادوں۔" آپا کی کہی ہوئی برسوں پرانی باتیں حنا کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ آپا نے خود ہی اُسے اپنے ساتھ چلنے کے لئے راضی کیا۔ امی تو انکار ہی کر رہی تھیں، جس پر آپا ناراض بھی ہو گئی تھیں۔ یا اب یہ رنگ تھا:

"پڑھنا — ہر وقت پڑھنا — سوا اس کے اور کوئی کام کاج ہی نہیں بند کر دے یہ کتابیں ورنہ جلا دوں گی۔ اور دیکھ کمرے میں لٹنے کا سامان رکھا ہے۔ مشین نکال اور جلدی جلدی تکیے کے کچھ غلاف اور چادروں کے کونوں پر سلائی مار۔ اور ہاں آج ہی ان پر چھوٹے چھوٹے ڈیزائن ٹریس کر لینا۔ بچے پھول دار تکئے اور چادروں سے بہت خوش ہوتے ہیں مجھے تو کشیدہ کاری سے بڑی دلچسپی تھی مگر کیا کروں جب سے چشمہ لگا ہے کم بخت دو ٹانکے بھی نہیں مار سکتی۔ اور وہ پنکی اور رونی کے سوئیٹروں کا کیا ہوا؟"

"صرف آستینیں جوڑنا رہ گئی ہیں۔"

"ٹھیک ہے اپنے دولہا بھائی کے لئے بھی اُون لے آؤ۔ اُن کا سوئیٹر بھی پرانا ہو گیا ہے۔ مگر بھئی اُن کے لئے کوئی اچھا سا نمونہ ڈالنا۔ خوب یاد آیا۔ تم مسز جارج کو تو جانتی ہو۔ مسز کھنہ کے بے بی کی برتھ ڈے پارٹی پر اتنا خوب صورت سوئیٹر پہن کر آئی تھیں۔ میں تو بس دیکھتے ہی للچا گئی۔ کہنے لگیں گھر آکر ہی سے نمونہ سیکھ لینا۔"

"چلی جاؤں گی کسی دن اُن کے گھر ڈیزائن سیکھنے۔" حنا نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

"کسی دن ڈاکٹر صوفی کے گھر بھی چلی جانا۔ ان کے ڈرائنگ روم کے صوفہ سیٹ پر جال پر رنگین دھاگوں سے بڑے خوب صورت بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں۔ تم تو ایک نظر دیکھ کر سیکھ جاؤ گی۔ کیوں نہ ہم بھی ایک سیٹ تیار کر لیں۔ کپڑا تو میرے پاس رکھا ہے۔"

"ارے کیا کر رہی ہے؟ ابھی تک سلائی ختم نہیں ہوئی! اُف وہ بھی! جوان بچی ہے۔ لیکن ہاتھ پاؤں میں ذرا بھی پھرتی نہیں۔"

آپا کی یہ باتیں تو اُس کا جی جلا کر رکھ دیتی تھیں۔ صبح سے شام تک کولہو کے بیل کی طرح اپنے کام برابر لئے جائیں گی اور اوپر سے یہ لفظوں کے چابک!

"گھر میں جتنے ہیں سب بیکنے۔ سب نمک حرام ہیں کسی کو میری پروا نہیں۔ کسی کو میری فکر نہیں۔"

"کیا ہے بھئی؟ کیوں چیخ رہے ہیں؟" آپا دولہا بھائی کی طرف لپکیں۔

"دو دن پہلے تمہیں یہ بش شرٹ پریس کرنے کے لئے دی تھی۔ اب پہننے کے لئے جو دیکھتا ہوں تو جوں کی توں رکھی ہے۔"

"اوہ! بھول گئی۔ سیکڑوں کام تھے ہیں میرے پیچھے۔ آپ بھی تو ہر کام بس مجھے ہی بتائیں گے۔ یہ نہیں کہ کچھ کام حنا کو بھی سونپ دیں۔ کم بخت دماغ بھی کیسا ہو گیا ہے۔ پل کے پل میں بات ذہن سے نکل جاتی ہے۔"

"گھر میں رہنے والے ہر انسان کو اپنے فرض کا احساس ہونا چاہئے۔" دولہا بھائی بولے۔ "حنا کو یہاں آئے چھ سات ماہ ہو رہے ہیں مگر اب بھی وہ اپنے آپ کو اس گھر کا مہمان ہی سمجھتی ہے۔ اور آخر کیوں نہ سمجھے، تمہاری لاڈلی جو ہے۔"

"آگ لگے اس لاڈ پیار کو۔ اپنے کئے پر پچھتا رہی ہوں وہ تو مجھے پرایا سمجھتی ہے، اور شاید اپنا دشمن بھی۔ ایک ذرا سا مار کیا لیا، صبح سے روئے جا رہی ہے کمرے سے باہر تک نہیں نکلی۔"

دولہا بھائی نے ایک زور کا قہقہہ

لگایا۔ جانے کس خوشی میں: "بیگم! بہن بھائی کی محبت کانٹے دار پھول۔ اسے بس دُور سے دیکھو چھوؤ اور لہولہان۔"

"کالج جاتے ہوئے چوراہے پر کس سے گفتگو کر رہی تھیں؟" گھر کی چوکھٹ پر قدم رکھتے ہی آپا حنا پر گرجیں۔

"کب آپا؟" حنا خوف و ہراس سے بولی۔

"آج صبح۔ تمہارے دُولہا بھائی نے آکر مجھ سے بتایا۔" "اچھا!" حنا کچھ یاد کرتے ہوئے بولی: "وہ تیواری جی ہوں گے۔"

"کون تیواری جی! وہ غضب ناک ہوکر بولیں۔ شرم نہیں آتی مردوں سے گفتگو کرتے ہوئے۔ میری ناک نہ کٹوا بابا! ورنہ امّی ابا کے سامنے مجھے نیچا دکھائے گی۔"

"میں کیا کروں آپا۔ وہ اپنے کپڑے کے روپے مانگ رہے تھے۔ اُس روز دولہا بھائی اور بچوں کے کپڑے اُن کی دُکان سے خرید کر لائی تھی۔ دس روپے باقی رہ گئے تھے۔ آپ سے کہہ دیا تھا ہی میں نے۔"

"اب آ رہی ہو کالج سے! شام ہونے کو آئی۔"

"آپا! آج پیدل آئی ہوں۔ اس لئے ذرا دیر ہو گئی۔"

"ذرا دیر کہہ رہی ہے اسے؟ اور کیا کل تو کافی ہاؤس گئی تھی؟"

"جی ـــ وہ ـــ"

"اُفوہ ری مکّار لڑکی!" آپا نے اک دم حنا کی چٹیا پکڑلی۔ "تو انہوں نے ٹھیک ہی کہا۔ تو اب گویا مِس صاحبہ کو کافی ہاؤس اور کلب وغیرہ کا بھی شوق چرایا ہے۔ بہت کل پُرزے نکال رہی ہے لکھوں امّی کو ایک خط؟"

"آپا! میری بات تو سُنئے۔ ہماری مِس ہیں نا۔ کل اُن کا برتھ ڈے تھا اس لئے وہ کالج کی تمام لڑکیوں کو لے کر کافی ہاؤس گئی تھیں۔ میں نے بہت انکار کیا آپا مگر۔۔۔"

"جا جا! زیادہ باتیں نہ بنا۔" آپا نے اُسے دھکیلتے ہوئے کہا۔

"بجلی کا بل ـ پندرہ روپے! غضب!" آپا نے اپنا سر پکڑ لیا: "جب کہ گھر میں بجلی کا چولہا بھی نہیں۔"

"ایک بجلی کا چولہا نہ ہونے سے کیا ہوتا ہے؟" دُولہا بھائی نے بات کو آگے بڑھایا۔ "رات رات بھر بلب جلیں گے تو کیا خرچ نہ آئے گا۔"

"رات بھر!" آپا نے دُولہا بھائی کا جملہ دہرایا۔ اور پھر جیسے اُن کی سمجھ میں سب بات آ گئی۔

"بھئی حنا! میرے یہاں ایسے شاہی ٹھاٹ نہ چلیں گے۔ تمہیں جو کچھ پڑھائی کرنا ہے دن میں کر لیا کرو۔"

میرے اللہ! حنا دل ہی دل میں رو اُٹھی۔ امّی ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ پیڑ اپنے ہی پھل پھول اور پتّوں کا بوجھ تنہا سہتا ہے دوسرے پیڑ کی ٹہنی اگر کاٹ کر اُسے لگا دی جائے تو وہ سوکھ جاتی ہے۔ پہلے مجھ سے اتنی محبت کرنے والی آپا اب کس قدر بدل گئی ہیں۔

"بھئی بیگم! تم میری پیاری بیوی ہو اور وہ صرف سالی۔ تمہیں جو اُس سے ہمدردی اور محبت ہوگی وہ مجھے نہیں ہو سکتی۔ لیکن سچ بات یہ ہے کہ روز بروز تمہارا برتاؤ اس کے ساتھ سخت سے سخت تر ہوتا جا رہا ہے۔ وہ غریب پڑھائی کیا خاک کرے گی۔ دن بھر تو اُسے کولہو کے بیل کی طرح گھسیٹتی رہتی ہو۔ تم بھی کچھ اپنے ہاتھ پاؤں ہلایا کرو۔"

"اچھا! تو گویا آپ اُس کی بھلائی کر رہے ہیں۔ خوب سمجھتی ہوں یہ بے جا حمایت" آپا لال پیلی ہوگئیں اور دندناتی ہوئی حنا کے کمرے میں آئیں۔ حنا بچوں کو کپڑے بدلوا رہی تھی۔ بہن کو بے حد غصے میں دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو گئی۔ آپا نے حنا کو مونہہ سے تو کچھ نہ کہا، لیکن دونوں بچوں کا ہاتھ گھسیٹتی ہوئی کمرے سے باہر لے چلیں۔

"خبردار! اب اگر حنا سے کچھ کام کرایا۔ میں ابھی مر نہیں گئی ہوں۔" وہ پٹی اور وکّی کے پیٹھ پر ایک ایک دھپ جماتے ہوئے بولیں۔ اور پھر موٹے موٹے آنسو ان کے رُخساروں پر بہنے لگے۔ بہن کے آنسو دیکھ کر حنا کا دل پگھل گیا۔

"آپا! کیا بات ہے؟" وہ بہن کے آنسو پونچھنے لگی۔

"چل ہٹ پرے۔" آپا نے اُسے دھکا دیا۔ "میں تجھے تیری تعلیم مکمل کرانے اور تیری زندگی سنوارنے کے لئے لائی تھی۔ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ اپنے پیروں پر خود کلہاڑی مار رہی ہوں۔"

اور حنا اپنے آپ کو مجرم نہ ہوتے

ہوتے بھی مجرم سمجھے گی۔

"حنا! اے حنا!" دولہا بھائی اُسے کمرے میں پکار رہے تھے۔

"گھر میں حنا کے علاوہ بھی کوئی رہتا ہے یا نہیں؟" آپا دندناتی ہوئی دولہا بھائی کے کمرے میں پہنچیں۔ "کیا کہہ رہے تھے حنا سے؟ خاموش کیوں ہیں؟ کہئے نا!"

"تم سے تو کوئی کام کو کہے اور سو رہو۔" دولہا بھائی کا دماغ بھی گرم ہو گیا۔ "اس سے بہتر ہے خود ہی کر لوں۔" وہ باورچی خانے میں شیونگ کے لئے گرم پانی لانے کے لئے جاتے ہوئے بولے۔

"ٹھہریئے! میں لا دوں باورچی خانے میں حنا پکار رہی ہے وہاں جانے کی ضرورت نہیں۔"

"عجیب عورت ہے!" دولہا بھائی نے گھور کر آپا کو دیکھا اور کندھے پر تولیہ ڈالے غسل خانے میں چلے گئے۔

کمرے کی لائٹ بجھا کر موم بتی کی روشنی میں کیوں پڑھ رہی ہو؟" دولہا بھائی کی آواز پر حنا چونک گئی۔

"جب تک تمہیں پڑھنا ہو لائٹ جلتی رہنے دیا کرو۔" دولہا بھائی نے بجلی جلا دی۔ "خرچ میں دیتا ہوں، تمہاری آپا اپنی جیب سے نہیں بھرتیں۔" آدھی رات کے وقت دولہا بھائی کو اپنے کمرے میں دیکھ کر حنا کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

"خدا کے لئے دولہا بھائی ....." اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔ اس کی سراسیمگی کو دیکھ کر دولہا بھائی نے قہقہہ لگایا۔ حنا نے سوچا، آپا نے اتنی رات گئے دولہا بھائی کو اس کے کمرے میں قہقہے لگاتے دیکھ لیا تو قیامت آجائے گی۔ ان کی عنایتیں روز بروز میرے لئے کیوں بڑھنے لگی ہیں۔ خدایا! یہ کمرے میں سے چلے کیوں نہیں جاتے! اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔ "اب مجھے نیند آرہی ہے۔" اس نے بڑھ کر لائٹ بجھا دی اور دروازہ بند کرنے کے لئے آگے بڑھی۔

"اپنی آپا سے بہت ڈرتی ہو۔ کیوں؟" دولہا بھائی نے ہنستے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ حنا چونک کر پیچھے ہٹی تو تپائی پر رکھی ہوئی پانی کی صراحی دھکے سے زمین پر گر پڑی۔ وہ پھیلی ہوئی کتابیں سمیٹنے کے لئے جھکی۔

"ار ــــ رے ــــ رے۔ کتابیں گیلی ہو رہی ہیں۔" دولہا بھائی بھی کتابیں اُٹھانے کو جھکے۔ اور موم بتی کی مدھم روشنی میں حنا سے ٹکرا گئے۔

"خدا کے لئے دولہا بھائی، آپ کمرے سے باہر چلے جایئے۔" وہ ہانپنے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ دوڑ کر خود ہی کمرے کے باہر نکل جائے اتنے میں آپا دروازے میں گویا ہاتھ میں تلوار لئے کھڑی نظر آئیں۔ حنا کی تو روح فنا ہو گئی۔ وہ تھر تھر کانپنے لگی۔

"کیا ناٹک ہو رہا تھا؟" آپا نے پہلا تیر چھوڑا۔ "وہ ــــ وہ" حنا سے کچھ بولا نہ گیا۔ رنگے ہاتھوں پکڑے جانے والے مجرم کی طرح وہ ایک دم رونے لگی۔

"پانی سر سے اوپر ہو چلا ہے۔ بہتر ہے تم یہاں سے فوراً چلی جاؤ۔"

"ہا..... ں..... " حنا نے بہ مشکل "کہاں میں چلی جاؤں گی؟" وہ اپنا اسباب سمیٹنے لگی۔ ٹپ ٹپ اُس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

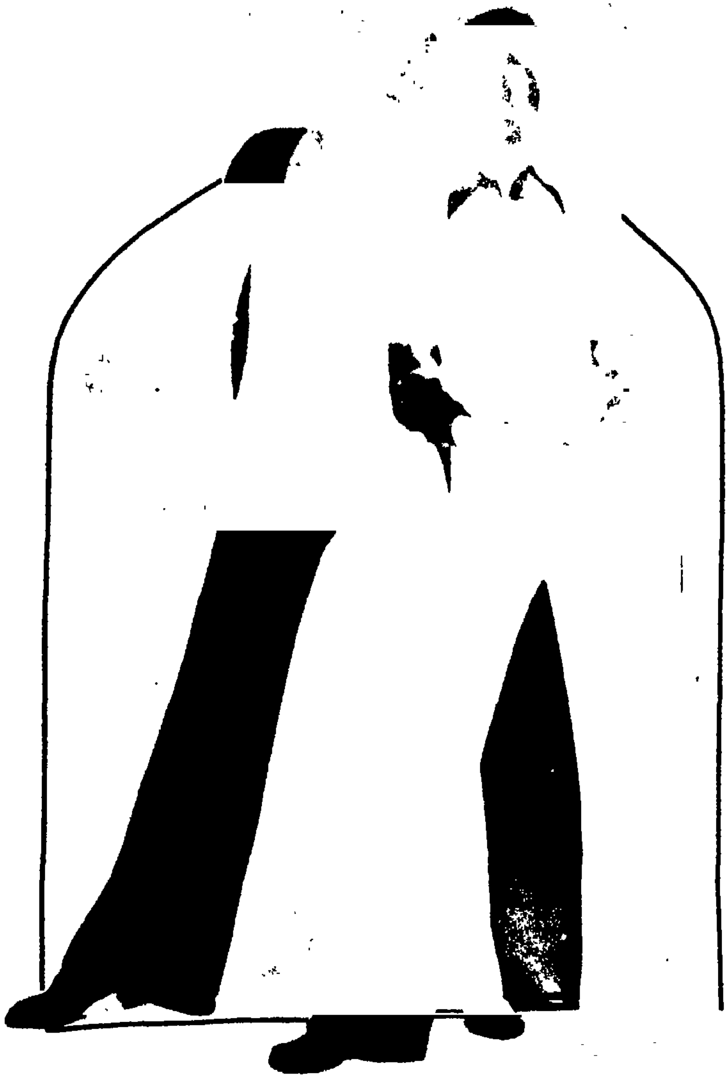
صبح کو کرائے کے روپے ہاتھ میں تھماتے ہوئے آپا نے نفرت سے موتہہ موڑ لیا۔

جب حنا اپنے گھر کے زینے پر چڑھ رہی تھی تو اُس کے پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔ اُس کی غیر متوقع بلا اطلاع آمد پر امّی حیران رہ گئیں۔

"امّی!" سامان کی بقچی زمین پر پھینک کر حنا دوڑ کر امّی سے لپٹ گئی اور زار و قطار رونے لگی۔ اور امّی نے گویا اُس کے آنسوؤں کی زبانی تمام کہانی سن لی۔

"مجھے معلوم تھا کہ تم ایک نہ ایک دن وہاں سے ضرور نکال دی جاؤ گی۔ میں نے تمہیں لکھا تھا نا کہ اپنی بہن کا ہر حکم مانا کرو۔ کوئی ایسی ویسی حرکت بھی ہرگز نہ کرنا۔"

نہیں امّی۔ وہاں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں آپا کا ہر حکم سر آنکھوں پر بجا لائی۔ لیکن آپ جانتی ہیں امّی، کوئی عورت چاہے وہ میری سگی بہن کیوں نہ ہو، اپنے گھر پر منڈلاتا ہوا سایہ نہیں دیکھ سکتی چاہے حقیقت میں کچھ نہ ہو اور اُس کا محض وہم ہی ہو۔ امّی اب میں کبھی وہاں نہیں جاؤں گی کہیں بھی نہیں جاؤں گی۔ آپ مجھے اپنے پاس رکھئے یا کسی بھی جہنم میں دھکیل دے دیجئے مگر وہاں میں کبھی نہیں جاؤں گی۔" یہ کہہ کر حنا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ●●



مرد ـــــ عورت لباس کے معاملے میں ایک راہ پر

رینہ زرین

سولھویں صدی کے ایک ادیب
پ بیوزنین نے کہا تھا: "جنسِ مخالف سے
ں میں مشابہت اختیار کرنا اپنی جنس کو تنز
اہے"۔ اُس ادیب نے شوخ رنگ کی بجائے
رنگ کے کپڑے استعمال کرنے پر عورتوں
یہ مشورہ دیا تھا۔ لیکن آج وہ تبدیلی (یا
انہ اور زنانہ پوشاک کی یکسانیت) جو محض
ں کے رنگوں سے شروع ہوئی تھی، اب
بے سے لباس ہی کی تبدیلی (اور نتیجے میں
انیت) کا رُوپ اختیار کر رہی ہے۔

ایک طرف تو عورتیں مردوں کے لباس
رہی ہیں اور دنیا کے تمام ماہرین فیشن یہ
ن گوئی کر رہے ہیں کہ عورت اور مرد کا لباس
ہی دنوں میں ایک ہو جائے گا۔ اور دوسری
ت یہ ستم ظریفی ہے کہ مرد اپنے لباس اور وضع
ع کے معاملے میں عورتوں کے انداز اختیار
نے لگے ہیں۔ موجودہ نسل کے لڑکے شکل و
رت میں بھی زنانہ پن پیدا کرنے پر خاص توجہ
یتے ہیں۔ برطانیہ میں ایسے لڑکوں کے گروہ
"ماڈز" کہتے ہیں۔ یہ لڑکے نہ صرف زُلفیں
ے ہیں بلکہ میک اَپ کے سامان کی مدد سے نوک
ک بھی سنوارتے ہیں۔ وہ عورتوں کے بلاؤز
، ملتا جلتا جیکٹ پہنتے ہیں۔ کاندھے پر زنانہ
ے بھی لٹکائے رہتے ہیں اور حیران کن بات
یہ ہے کہ یہ تمام نوجوان شریف گھرانوں کے
م و چراغ، اسکولوں اور کالجوں کے طالب علم
تے ہیں۔

امریکہ میں ملبوسات کے ایک "ڈیزائنر
ن ڈیزائنر نے حال ہی میں ایسے تیار شدہ لباس
یٹ میں پیش کئے ہیں، جنہیں عورت اور مرد
نوں ہی ایک ساتھ استعمال کر سکتے ہیں۔ اس

افشاں کی مرضی بھی معلوم کی ہے آپ نے۔

"افشاں ؟ میں اسے اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ وہ ایک بالکل الگ سی لڑکی ہے۔ اُسے مجھ پر مکمل بھروسہ اور مجھے بھی اس پر مکمل اعتماد ہے۔ میں نے جب بھی اُسے کریدا، اس کی رائے ہمیشہ یہی رہی کہ ہم جیسا فیصلہ کریں گے بہتر کریں گے۔"

اب آپ بھی سن لیجئے میرا فیصلہ — میں ہرگز اسے اپنی لڑکی نہیں دوں گی کیوں کہ — کیوں کہ وہ کالا ہے — بدصورت ہے کنجوس ہے ...." جیسے وہ پھٹ پڑی۔ برسوں سے دفن آتش فشاں آج اُبل پڑا تھا — اس کی آواز حلق میں رُندھ کر رہ گئی اور وہ لحاف سر تک ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

خان صاحب مسعود احمد نے بارہا عذرا کی آنکھوں میں ایسے ہی شراروں کی جھلک دیکھی تھی، مگر آج کے مقابلے میں وہ پرچھائیں تک نہ تھے — یہ نفرت کا تاثر — اور اس بار اس کی ایسی بے پناہ شدت! وہ چکرا کر رہ گئے، وہ برابر کے کمرے میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ سنولائے ہوئے چہرے پر لاتعداد چیچک کے نشانات آج کچھ اور واضح ہو گئے تھے۔ یہ وہی چہرہ تھا جسے ہمیشہ وہ آئینے میں شخصیت اور عہدے کے میک اپ میں لپیٹ کر دیکھتے تھے — اور مطمئن تھے۔ آج وہی اوپری پرت، وہی شخصیت کا ظاہری خول اُترتا دکھائی دیا۔

ایک زور کی آواز ہوئی۔ شیشہ کرچی کرچی ہو کر بکھر گیا — خان صاحب مسعود احمد کے ہاتھ میں گل دان کا ایک ٹوٹا حصہ کا یہ آواز ٹوٹنے سے پیدا ہوئی تھی جس اپنے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ شاید یہ روشن دان کے راستے ہو کر پائیں باغ اَدھ کھلی کسی کلی کو لمحہ بھر کے لئے سہارا دے کے نازک سے آئینے کی بازگشت کتنی مدت سُنائی دیتی ہے۔ کتنے دیر پا اس کے ا ہوتے ہیں — کتنے اَدھ کھلے پھول اس گھن گرج میں سہم کر مرجھا جاتے ہیں خان صا مسعود احمد کو ایسا لگا جیسے کچھ مرصے ب کی اچھی بیٹی افشاں رو رو کر اپنی ماں سے کہہ "اُف امی جان یہ آپ نے کیا کیا، دیکھ لیا ہوتا — کیا مجھے بھی آپ ہی کے نقش پر چلنا چاہئے ؟ کیا پھر کوئی دل کا نازک ٹوٹنا چاہئے ؟"

●



شہناز حسین
ایم-۹۲ گریٹر کیلاش ،نئی دہلی ۱۱۰۰۴۸ فون ۶۴۲۰۶۹۲

بیوٹی کالج

ہم پچھلے شماروں میں بتا چکے ہیں کہ جلد ایک زندہ شے ہے۔ وہ سانس لیتی ہے۔ جتنی ضرورت تازہ ہوا کی پھیپھڑوں کو ہے اتنی ہی جلد کو بھی ہے۔ بھاری میک اَپ سے جلد کے مسامات بند ہوجاتے ہیں اور جلد سانس نہیں لے سکتی۔ لیکن میک اَپ کے بغیر گذارہ بھی نہیں۔ شادی بیاہ کی محفل ہو یا کوئی پارٹی، عورتیں بغیر میک اَپ کے گھر سے نکلنا پسند نہیں کرتیں۔ عورت کا جتنا زیادہ وقت گھر پر گذرتا ہے، بغیر میک اَپ کے گذرتا ہے۔ یہ اس کے حق میں بہتر بھی ثابت ہوتا ہے۔ میک اَپ دراصل جلد کے عیب کو چھپانے کے لئے کیا جاتا ہے۔ اگر آپ کی جلد تازہ اور شگفتہ رہتی ہے تو اسے میک اَپ کی ضرورت نہیں۔

اگر آپ گھر پر رہتی ہیں، کوئی کام نہیں کرتیں اور ملازمت کے لئے باہر نہیں نکلتیں تو پھر میک اَپ نہ کریں۔ اگر آپ ملازم ہیں اور آپ کو دفتر یا اسکول جانا پڑتا ہے تو کم از کم چھٹی کے دن آپ کو کوئی نہیں دیکھتا۔ اس دن جلد کو سانس لینے دیں اور اسے آرام دیں۔ دفتر سے یا شاپنگ سے فارغ ہوکر گھر پہنچیں تو آپ کی جلد کی تکان دور کرنے کے لئے حسب ذیل نسخہ کارآمد ثابت ہوگا:

ایک برتن میں گرم پانی لیں۔ اس میں ایک لیموں کا عرق ملا لیں۔ دو بڑے چمچے سوڈا بائی کارب بھی اس میں شامل کرلیں۔ ایک چائے کا چمچہ یوڈی کلون اور دو بڑے چمچے نمک بھی ملا لیں۔ اب کسی پلنگ یا کرسی پر بیٹھ کر اس محلول میں پاؤں ڈالیں نصف گھنٹہ تک انتظار کریں، پھر پاؤں نکال کر خشک تولئے سے تھپتھپائیں۔ تولئے سے رگڑ کر صاف نہ کریں۔ جلد ایک جاندار شے ہے اس کو بے رحمی سے رگڑنا ٹھیک نہیں۔ جلد کو صاف کرنے کے بعد کسی کریم کی مالش کریں۔ آپ اس علاج کے بعد اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کریں گی

جسم اور چہرے کے ساتھ ہاتھ اور پاؤں کی حفاظت بھی ضروری ہے۔ عورتیں جسم کو ٹھنڈا رکھنے کے لئے غسل کرتی ہیں۔ یہی عمل ہاتھ پاؤں کے لئے بھی ضروری ہے۔ پیروں کے ناخن اکثر بے پروائی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ ان ناخنوں کو صاف کرنے کے لئے ایک روئی کا پھاہا لیں۔ اس میں کیوٹیکل کریم لگاکر ناخن صاف کریں۔ جسم میں پیروں کی اہمیت سب سے کم سمجھی جاتی ہے۔ پیروں کی ایڑیاں خراب اور میلی رہتی ہیں۔ ایڑیوں کی کھال پھٹ جاتی ہے

اس کے لئے سب سے اچھا نسخہ صابن اور پیومیس اسٹون ہے۔ پیروں کو گیلا کر کے پیومیس اسٹون سے انہیں رگڑیں۔ یہ ایک قسم کا پتھر ہوتا ہے اس سے جلد کے داغ دھبے دور ہوجاتے ہیں، جلد پر فالتو بال بھی اسی سے صاف ہوجاتے ہیں۔ رات کو سوتے ہوئے پیروں پر لیمن کلینزنگ کریم لگائیں۔ اگر پاؤں گرم اور تکان آلودہ ہوں تو خالص یوڈی کلون پیروں پر تھپتھپانے سے پیروں میں ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے اور پیروں کو آرام ملتا ہے۔

جلد پر فوری تازگی لانے کے لئے گلاب اور گلیسرین کا محلول تیار کریں۔ تین حصے گلاب اور ایک حصہ گلیسرین سے یہ محلول تیار کیا جاتا ہے اسے کسی ٹھنڈی جگہ رکھیں۔ اگر گھر میں فرج ہو تو اس محلول کو ایک شیشی میں بھر کر اس میں رکھ دیں۔ جب تکان محسوس ہو اس محلول کو روئی میں بھگو کر جلد پر لگائیں۔ پیروں کے ساتھ ساتھ ہاتھوں کا بھی دھیان رکھیں۔ ناخن خاص طور پر صاف رکھیں۔ اگر آپ کو ناخن بڑھانے کا شوق ہے۔ تو ناخنوں کا میل صاف کرتی رہیں کسی انگریزی دوا فروش سے ایک نیل برش خرید لیں۔ یہ ایک بہت چھوٹا برش ہوتا ہے وقتاً فوقتاً اس برش سے ناخنوں کا نچلا حصہ صاف کرتی رہیں۔ نیل پالس لگانے سے ناخن کے نچلے حصے کا میل نہیں دکھائی دیتا۔ یہ میل صحت کے لئے نقصان دہ ہے۔ ناخنوں پر سُرخ نیل پالش کی بجائے قدرتی رنگ کی پالش لگائیں۔ یہ پہل نیل پالش کہلاتی ہے۔ اگر نیل پالش لگانے کا وقت نہ ہو تو ہاتھوں کو یوں ہی رہنے دیں — وارنش استعمال نہ کریں۔

اگر ہاتھوں میں چپچپاہٹ رہتی ہو تو اس کے لئے ہاتھوں [illegible]
[illegible]

کر دے گی اور ہاتھ چپکنے بند ہو جائیں گے۔ ہاتھوں میں پسینہ زیادہ آتا ہو تو یہ نسخہ استعمال کریں: ایک لیموں کا عرق نکال لیں۔ اس میں ایک چائے کا چمچہ بھر چینی ملا لیں۔ اس میں چند بوندیں یوڈی کلون کی شامل کر لیں۔ اس محلول کو ہتھیلیوں پر لگائیں، اور دونوں ہتھیلیوں کو ایک دوسرے سے رگڑیں۔ اس سے ہتھیلیاں صاف اور خشک ہو جائیں گی گردن کے پچھلے حصے میں پسینہ آتا ہو تو تھوڑا سا یوڈی کلون روئی کے ٹکڑے میں لگا کر گردن کو تھپتھپائیں۔ گردن کی چکناہٹ کم ہو جائے گی۔ مردوں کی قمیص کے کالر اکثر چکنی گردن کی وجہ سے جلد میلے ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی یہ نسخہ آزما سکتے ہیں۔

اگر آپ کو کسی وجہ سے صبح کے وقت میک اپ کرنا پڑے تو اس میک اپ کو شام تک نہ لگا رہنے دیں۔ دوپہر تک اسے اتار دیں، اور جلد کو ہوا لگنے دیں۔ اگر شام کو کہیں دوبارہ جانا ہے تو تازہ میک اپ کریں۔ بالوں کی وضع قطع جلدی جلدی نہ بدلیں دھوپ بالوں کو نقصان پہنچاتی ہے۔ اگر آپ ہیر ڈائی استعمال کرتی ہیں تو اس کے استعمال کے بعد دھوپ میں نہ نکلیں۔ اگر دھوپ میں نکلنا ہی پڑے تو چھتری کا استعمال کریں یا سر پر اسکارف لپیٹ لیں کیوں کہ دھوپ سے خضاب کا رنگ بدل جاتا ہے۔ دھوپ خضاب کا رنگ اڑانے میں بہت مدد کرتی ہے۔ دراصل دھوپ بال سفید کرنے کا ایک قدرتی نسخہ ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے دھوپ میں بال سفید نہیں کیے۔ اس مثل میں سچائی ہے۔

تین طرح کی جلد کے لئے دھوپ بہت نقصان دہ ہے۔ پہلی وہ جلد جسے ہم سُرخ و سفید کہتے ہیں جس کو دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ کسی یورپین کی جلد ہے۔ دوسری جلد وہ ہے جس پر زرد زرد دانے ہوتے ہیں جنہیں انگریزی میں فریکلز کہتے ہیں یہ زرد دانے بھی اکثر سفید جلد پر ہوتے ہیں۔ تیسرا نمبر ان عورتوں کا آتا ہے جن کے بال سُرخ ہوتے ہیں۔ تینوں قسمیں دھوپ میں جل بھن جاتی ہیں۔ آپ نے کبھی ایسے یورپین مرد یا عورت کو دیکھا ہوگا، جو ہندوستان میں بہت مدت سے رہتا ہو، یا پھر ان مسافروں یا ہپیوں کو دیکھا ہوگا جو مشرقی ملکوں سے سفر کرتے ہوئے ہندوستان آتے ہیں۔ اُن کی جلد چمڑے کی طرح براؤن اور خشک ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ دھوپ سے بچنے میں غفلت برتتے ہیں۔

جن عورتوں کے چہرے پر چھائیاں ہوں ان کے لئے دھوپ زہر کا کام کرتی ہے۔ اگر آپ کو دھوپ میں زیادہ بیٹھنا پڑے اور چہرہ تمتما جائے تو اس کا علاج یہ ہے کہ گنگنے پانی میں سوڈا بائی کارب ڈال کر نہائیں ایک بالٹی میں دو بڑے چمچے سوڈا بائی کارب کے ڈال لیں۔ اس طرح نہانے سے چہرے اور جسم سے دھوپ کا اثر کم ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جلد پر کیلے مین لوشن لگائیں۔ یہ لوشن صرف اس جگہ لگائیں جہاں دھوپ اثر انداز ہوئی ہو۔ اگر دھوپ میں بیٹھنے یا چلنے سے دردِ سر کی شکایت ہو جائے تو اسپرین کی دو گولیاں کھا کر اندھیرے کمرے میں لیٹ جائیں۔ جب تک دھوپ کا اثر چہرے پر ہے دوبارہ دھوپ میں نہ نکلیں۔ زیادہ دھوپ لگنے سے چہرے پر سُرخ دھبے پڑ جاتے ہیں جنہیں سن برن، کہتے ہیں۔ سن برن کے علاج کے ساتھ دھوپ سے پرہیز بھی لازم ہے۔

دھوپ سے آنکھوں کو بھی نقصان پہنچتا ہے اگر آپ کی آنکھوں کا رنگ ہلکا ہے تو نقصان پہنچنے کا زیادہ احتمال ہے۔ اس سے بچنے کے لئے دھوپ کا چشمہ لگائیں۔ آج کل براؤن رنگ کا چشمہ فیشن میں داخل ہے۔ لیکن براؤن رنگ کے شیشے دھوپ کی نقصان پہنچانے والی شعاعوں کو نہیں روک سکتے دھوپ میں الٹرا وائیلٹ شعاعیں آنکھوں کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ کالے اور نیلے رنگ کے شیشے ہی ان شعاعوں کو روک سکتے ہیں۔ بازار میں بنے بنائے چشمے ملتے ہیں۔ انہیں خریدنے سے بہتر ہے کہ آپ اپنی پسند کا چشمہ بنوائیں شیشوں کا انتخاب خود کریں۔ کالے شیشوں کا نام "بی ٹو" ہے۔ یہ شیشے سیاہ شیشے کے برابر مفید تو نہیں۔ لیکن براؤن شیشوں سے بہتر ثابت ہوتے ہیں۔

صحت اور جلد کی دیکھ بھال کے لئے سانس لینے کا طریقہ جاننا بھی ضروری ہے۔ ہم دن میں ہزاروں بار سانس لیتے ہیں۔ سانس لینے کا عمل لاشعوری طور پر جاری رہتا ہے۔ اگر ہم اپنے سانس لینے کے طریقے پر غور کریں تو ہمیں انکشاف ہوگا کہ ہم بہت چھوٹے سانس لیتے ہیں۔ کبھی دکھ کے اظہار پر ہی گہرا سانس لیا جاتا ہے، جسے "آہ" کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ عمل بھی عموماً لاشعوری ہوتا ہے۔ گہرے اور ٹھنڈے سانس بھرنے والے کو پتہ نہیں ہوتا کہ وہ گہرا سانس لے رہا ہے۔ اس کا مخاطب ہی اس سانس کو پہچان سکتا ہے۔ گہرا سانس لینا صحت کے لئے ضروری ہے لیکن یہ سانس جان بوجھ کر لینا چاہیے۔ گہرے سانس کو دکھ کے موقع کے لئے اٹھا رکھنا غلط ہے۔ صبح کو اٹھ کر کھلی ہوا میں دس بار گہرے سانس لیں۔ اس عمل سے صحت کو فائدہ پہنچتا ہے ہم اپنی زندگی کا ¾ حصہ چھوٹے سانس لیتے ہوئے گزار دیتے ہیں۔ اس طرح پھیپھڑوں کو زیادہ آکسیجن نہیں ملتی۔ دن میں کبھی کبھی چار پانچ بار گہرے سانس ضرور لیں۔ سانس آہستہ آہستہ لیں اور آہستہ آہستہ ہی باہر نکالیں۔ اس سے آپ کی جلد تر و تازہ رہے گی۔

سوال و جواب

شمیم اختر، بمبئی۔

س: کیا سر میں روزانہ تیل لگانا ضروری ہے؟

ج: جی نہیں —— ہفتہ میں ایک دن کافی ہے۔ جتنا سر میں تیل پڑا ہوا ہوگا خاک مٹی بالوں میں اتنی ہی زیادہ چپکے گی۔ ہفتہ میں ایک بار رات کو اچھی طرح بالوں میں تیل لگائیں۔ بالوں میں تیل لگانے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک کٹوری میں تیل گرم کر کے روئی کے ایک ٹکڑے کو تیل میں بھگو کر بالوں کی جڑیں کھول کھول کر لگاتی رہیں پھر ایک تولیہ سر کے اردگرد باندھ کر سو جائیں۔ صبح سر دھو ڈالیں۔ زلفی ہیر آئل اور زلفی شیمپو پاؤڈر کا استعمال بالوں کے لئے بہترین ہے۔

مانہ سلطانہ، دہلی۔

س: میری کمر میں درد سا رہتا ہے، میں جھک کر چلنے کی عادی ہوں۔

ج: جھک کر چلنے والے ہمیشہ کمر کی تکلیف میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ بہتر ہے کہ آپ جبر کر کے اپنی کمر کو سیدھا رکھنے کی عادت ڈالیں۔ آپ کی چال بھی خوب صورت ہو جائے گی۔ اور اس کے علاوہ آپ کمر سیدھی رکھنے کی وجہ سے اسمارٹ بھی نظر آئیں گی۔ چارپائی کے بجائے آپ فرش پر بغیر گدے کے سویا کریں۔

مانانہ، کلکتہ۔

س: مجھے گھریلو فیشل بتائیں۔ میں بیوٹی سیلون نہیں جا سکتی۔

ج: سب سے اچھا گھریلو فیشل دلیہ ہے۔ ذرا سا دلیہ پکا کر گاڑھا گاڑھا ہلکا نیم گرم تمام چہرے پر لگالیں اور دس پندرہ منٹ تک لیٹی رہیں۔ جب سوکھنے لگے تو ٹھنڈے پانی سے چہرہ دھو ڈالیں۔ یہ عمل ہفتہ میں ایک دن کافی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو روزانہ بھی خشک دلیہ صابن کے طور پر استعمال کر سکتی ہیں۔ اگر خشک دلیہ ہتھیلی میں لے کر اس میں تین یا چار بوندیں لیموں کا عرق اور ذرا سا پانی یا دودھ ملا کر گاڑھا گاڑھا چہرے پر ہلکے ہلکے نیچے سے اوپر کی طرف رگڑیں پھر چہرہ دھو ڈالیں تو روزانہ اس عمل سے چہرے کا رنگ نکھر آئے گا۔ دلیہ چہرے کے لئے بہترین چیز ہے۔

حنا یاسمین، بنگلور۔

س: میں لیموں کا عرق چہرے پر لگاتی ہوں مگر اس سے بھی میرے مہاسے کم نہیں ہوتے۔

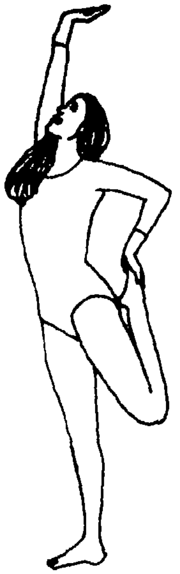
ج: لیموں کا عرق ڈائرکٹ چہرے پر لگانا چہرے کی جلد کے لئے سخت نقصان دہ ہے —— مہاسوں کا بہترین علاج یہ ہے کہ آپ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں کسی بھی قسم کی دوائی نہ لگائیں چکنی کریمیں بھی مہاسوں کی تعداد دُگنا کر دیتی ہیں۔

یوگا ورزشیں

ورزش نمبر ۱:

یہ ورزش بازوؤں اور ٹانگوں کو طاقت بخشتی ہے۔ ٹانگیں اور بازو کھل جاتے ہیں۔ چال میں وقار پیدا ہوتا ہے۔ جسم کا تناسب صحیح رہتا ہے۔ سیدھا کھڑا ہونے میں آسانی ہوتی ہے۔

فرش پر سیدھی کھڑی ہو جائیں۔ آہستہ آہستہ دایاں بازو اٹھائیں۔ ہتھیلی کو کسی بریکیٹ پر ٹکالیں۔



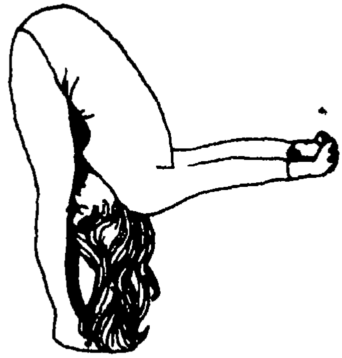
بائیں ہاتھ کو پیچھے لے جا کر بایاں پیر پکڑ لیں۔ بائیں بازو کو جس قدر پیچھے لے جا سکتی ہیں لے جائیں۔ سر کو پیچھے کی طرف جھکائیں۔ یہ دھیان رہے کہ جسم کا توازن نہ بگڑنے پائے۔ دس سیکنڈ انتظار کریں۔ اب دایاں بازو آہستہ آہستہ سامنے لائیں۔ اور ساتھ ساتھ بائیں پیر کو فرش پر واپس لے آئیں۔

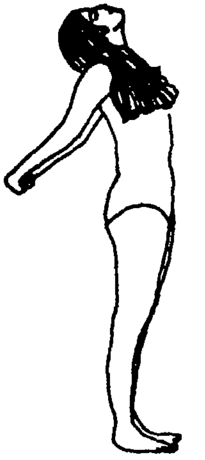
یہ ورزش دوبارہ بائیں بازو کو اٹھا کر عمل میں لائیں۔ اس بار دائیں ہاتھ سے دایاں پیر پکڑیں ابتدا میں اگر یہ ورزش مشکل معلوم ہو تو دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہو سکتی ہیں۔

ورزش نمبر ۲

یہ ورزش گردن اور کندھوں کا کھنچاؤ کم کرتی ہے۔ سینے کو بڑھاتی ہے پیٹ گھٹاتی ہے۔

فرش پر سیدھی کھڑی ہو جائیں۔ بازوؤں کو پیچھے کی طرف لے جائیں۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پھنسا لیں۔ لمبا سانس لیں۔ کہنیاں سیدھی رکھیں۔ سر کو پیچھے کی طرف جھکائیں۔ سینے کو پیچھے کی طرف جھکا کر کمر کو کمان بنالیں۔ اب سانس باہر نکالیں سیدھی کھڑی ہو کر فوراً ہی آگے کی طرف کو جھکائیں۔







حتیٰ کہ سر گھٹنوں سے لگ جائے۔ ہاتھ سامنے کی طرف پھیلے رہیں۔ دس سیکنڈ انتظار کریں۔ آہستہ آہستہ اوپر اٹھیں۔ آنکھیں بند کرلیں۔ اور جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیں یہ ورزش دو بار دہرائیں۔

ورزش نمبر ۳ :

یہ ورزش بھی سینے کو بڑھانے اور سخت کرنے کے لئے ہے۔

فرش پر سیدھی کھڑی ہو جائیں، پیروں کے درمیان ۲ انچ کا فاصلہ رکھیں۔ ہاتھوں کو پیچھے کی طرف لے جائیں۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پھنسا لیں۔ ہاتھوں کو پیچھے کی جانب جس قدر دور لے جا سکتی ہوں لے جائیں۔ کولہے اور گھٹنوں کے اعصاب کو اکڑا لیں۔ اندر کی طرف لمبا سانس لیں ٹھوڑی کا رُخ چھت کی جانب کر کے سینہ کو پھیلائیں۔ آنکھیں بند کرلیں۔ پانچ سیکنڈ انتظار کر کے ہاتھوں کو واپس لے آئیں۔ یہ ورزش چار بار دہرائیں۔

ورزش نمبر ۴ :

یہ ورزش بھی سینے کو بڑھاتی ہے۔

فرش پر سیدھی کھڑی ہو جائیں۔ ہاتھوں کی طرف لے جا کر انگلیاں آپس میں پھنسا لیں ہا... کو سیدھا رکھیں۔ بدن کو آگے کی طرف جھکا کر ... قائمہ بنا لیں، سر کو اوپر اٹھائیں ہاتھوں کو اوپر کی ... اٹھائیں۔ لمبا سانس لیں۔ پانچ سیکنڈ انتظار کر... سانس باہر نکالیں، آنکھیں بند کر کے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیں۔ یہ ورزش دو بار [illegible]

ارمان، کٹھوکرتالاب۔ گیا۔

س: شادی اگر ایک جُوا ہے تو اُسے کیوں کھیلا جاتا ہے؟

ج: شادی جُوا نہیں۔ قدرت کی ایک چال ہے جس کا مقصد نسلِ انسانی کو برقرار رکھنا ہے دنیا کا تقریباً ہر انسان اس سازش کا شکار ہوجاتا ہے۔

س: لیڈر اور وکیل میں کیا فرق ہے۔ جب کہ دونوں ہی جھوٹ بولتے ہیں؟

ج: وکیل صبح ۱۰ بجے سے ۵ بجے شام تک جھوٹ بولتا ہے اور اس کا جھوٹ عدالت کے کمرے تک محدود رہتا ہے — لیکن لیڈر کے لئے ایسی کوئی قید نہیں۔

شبیر احمد منتال۔ گل برگہ

س: زندگی اور موت میں کیا فرق ہے؟

ج: وہی جو سفر اور پڑاؤ میں ہے۔

س: زندگی مہنگی کب پڑتی ہے؟

ج: جب اسے چند خواہشوں کے ہاتھ فروخت کر دیا جائے۔

س: زندگی میں لوگ جھوٹ کیوں بولتے ہیں؟

ج: زندگی میں تھوڑی سی مٹھاس لانے کے لئے سچ عموماً کڑوا ہوتا ہے۔

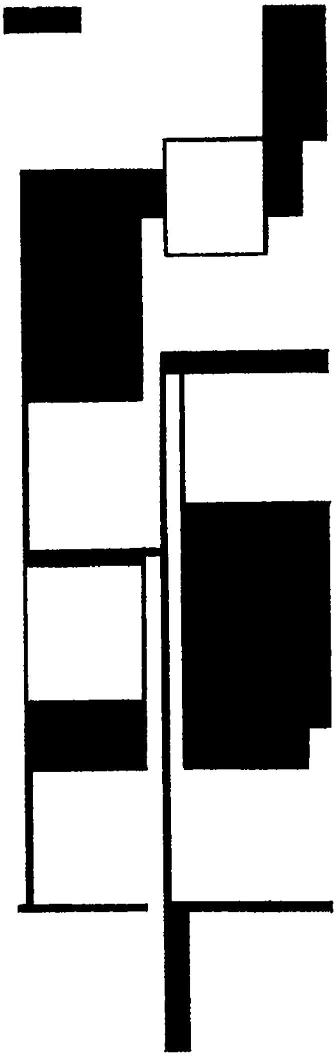
سید مقبول رحمانی۔ بھولک پور مشیر آباد

س: بیوی شوہر کا کون سا رُخ پسند نہیں کرتی؟

ج: بے رُخی یا جب اس کا رُخ دوسری عورت کی طرف ہو جائے۔

س: جان بوجھ کر لوگ گمراہ کیوں ہو جاتے ہیں؟

ج: مہم جوئی کی وجہ سے۔ ہر انسان جانتا ہے کہ چوری کی سزا جیل ہے۔ لیکن پھر بھی کچھ لوگ تجربہ کر کے اس بات کو سمجھنا چاہتے ہیں۔



اس عنوان کے تحت دلچسپ معلوماتی اور ذہنی سوالوں کے جواب دئے جاتے ہیں۔ ایک کاغذ پر یا پوسٹ کارڈ پر زیادہ سے زیادہ تین سوال لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کے لئے جگہ چھوڑیئے اور اپنا پورا نام پتہ لکھئے جس کاغذ یا کارڈ پر سوالات ہوں اس پر دفتر سے متعلق اور کوئی بات نہ لکھئے۔ اپنے سوالات اس پتہ پر بھیجئے: بزم بانو

ماہنامہ بانو ۴ آصف علی روڈ، نئی دہلی نمبر ۲

— مدیرہ

س: کیا کچھ ایسے بھی راز ہوتے ہیں جو بیوی کو نہیں بتائے جاتے؟

ج: وہ خواب جو دن میں دیکھے جاتے ہیں — خصوصاً جب ان خوابوں میں بیوی کا کوئی رول نہ ہو۔

نظیر الحسن شاہین۔ مرار پور۔ گیا (بہار)

س: اگر کسی کا ذہن ہمیشہ ارمانوں کی تربت میں کھویا رہے تو؟

ج: ارمانوں کی تربت پر فاتحہ پڑھئے اور ان کا پیچھا چھوڑ دیجئے۔

شاہدہ نجمی، رانچی۔

س: چولہے کی آگ میں اور دل کی آگ میں کیا فرق ہے؟

ج: چولہے کی آگ سے ہاتھ جلتا ہے۔ اور دل کی آگ سے دماغ۔

س: جب آدمی کا جسم جل جاتا ہے تو وہ مرہم لگاتا ہے۔ اور دل جل جائے تو کون سا مرہم لگائے؟

ج: وقت کا مرہم۔

نثار فاطمہ، بھاگل پور، بہار۔

س: لالچی آدمی کب پچھتاتا ہے؟

ج: اپنے لالچ کا حساب چکاتے وقت۔

س: خود غرض انسان کی کیا پہچان ہے؟

ج: جب وہ غرض مند ہوگا تو خلافِ معمول بہت اخلاق سے گفتگو کرے گا۔

نکہت تبسم، بنگلور۔

س: محبت ایک سے ہو مگر چاہنے والوں کی تعداد زیادہ ہو — ایسے میں کیا کرنا چاہئے۔

ج: تنگ دامن وقت کم گل بے حساب
انتخاب اے دستِ گلچیں انتخاب

ممتاز جہاں انصاری، لکھنؤ۔

س: ایک ماں اپنے بیٹے کو زیادہ پیار کرتی ہے یا شوہر سے؟

ج: شوہر سے ـــ لیکن اگر محبت کا جواب محبت سے نہ ملے تو ساری محبت بیٹے پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ یہ نتیجہ بیٹے کے لئے صحت مند نہیں ہوتا۔

س: ایک ماں اپنی بہو کا ڈولہ گھر آتے دیکھ کر زیادہ خوش ہوتی ہے یا بیٹی کا ڈولہ سسرال جاتے دیکھ کر خوش ہوتی ہے؟

ج: بیٹی ہمارے سماج میں ایک بوجھ ہے ـــ یہ بوجھ جتنی جلد اُتر جائے اتنا ہی خوشی کا باعث ہوتا ہے۔

س: میری ممی، پاپا آپس میں زیادہ لڑتے ہیں۔ بتایئے میں کیا کروں؟

ج: آپ اس جھگڑے کا اثر قبول نہ کریں۔ سمجھ لیجئے کہ دو دوست آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔ میاں بیوی کا جھگڑا عموماً عارضی ہوتا ہے۔

محمد جہانگیر عادل، کٹیہار

س: عورت مفکرین کے فکر کی باعث اور فلسفی کی بحث کا موضوع کیوں بنتی ہے؟

ج: مفکرین نے اپنی کوتاہ فہمی کی بنا پر عورت کو ایک معمہ قرار دیا ہے یہ لوگ خود ہی معمہ بناتے ہیں اور خود ہی اسے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

س: شہرت کس طرح حاصل کی جا سکتی ہے؟

ج: شہرت کی تلاش چھوڑ دیجئے۔ آپ کی بے نیازی آپ کی شہرت کا باعث بن جائے گی۔

س: کسی انسان کے جرم کو کب معاف کرنا چاہئے؟

ج: جب وہ اپنے جرم کا اعتراف کر لے۔

محمد حاجو قریشی، دھنباد۔

س: لہو کا رنگ سفید کب ہوتا ہے؟

ج: جب دل کا رنگ سیاہ ہو جاتا ہے۔

س: محبت میں لوگ کب دھوکا کھاتے ہیں؟

ج: جب محبت میں غرض شامل ہو جاتی ہے۔

س: جُدائی میں اتنی تڑپ کیوں ہوتی ہے؟

ج: یہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ جب اسے کوئی چیز میسر نہ ہو تو وہ اس کے لئے تڑپتا ہے۔ میسر ہو جائے تو اس سے جلد ہی بور ہو جاتا ہے۔

محمد شوکت علی، سمستی پور۔

س: آدمی اپنی قسمت پہ ناز کب کرتا ہے؟

ج: جب وہ وسائل کی عدم موجودگی کے باوجود خوش رہتا ہے۔

س: خاموشی بوجھ کب بن جاتی ہے؟

ج: جب دل کی بات زبان پہ نہ آ سکے۔

محمد منہاج الحق صدیقی، کٹیہار۔

س: کیا انسان کو صرف اپنے لئے جینا چاہئے؟

ج: اپنے لئے جینا آدمیت ہے۔ دوسروں کے لئے جینا انسانیت ہے۔

س: دوستی دشمنی میں کب بدل جاتی ہے؟

ج: جب دوست زندگی کی دوڑ میں بہت آگے نکل جائے۔

قاضی سعید الدین، بڈیرہ، گنگائی۔

س: دولت، عورت اور جوانی کیا ان پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے؟

ج: بھروسہ صرف اپنے آپ پر کرنا لازم ہے۔

بیگم امین احمد انصاری، چکرودھر پور (بہار)

س: دیہات اور شہر کی لڑکیوں میں کیا فرق ہے؟

ج: وہی جو تراشے ہوئے اور ناتراشیدہ ہیرے میں ہوتا ہے۔

محمد سعید منصوری، جمشید پور۔

س: انجام کب محسوس ہوتا ہے؟

ج: عقل مند کو آغاز میں ہی۔

س: ایماندار دوست کی پہچان کب ہوتی ہے؟

ج: جب وہ آپ کی ناراضگی کی پرواہ نہ کرے اور آپ کو اپنے عیبوں سے روشناس کرا دے۔

س: آس کے دیپ کب بجھنے لگتے ہیں؟

ج: اکثر جب منزل قریب آ جائے۔

محمد جہانگیر خاموش، دھنباد

س: خود غرض دوست کی کیا پہچان ہے؟

ج: وہ ملاقات کے وقت اپنے دونوں ہاتھ پیچھے رکھتا ہے۔

س: کیا عشق مختلف چیزوں سے بھی ہو سکتا ہے؟

ج: جی ہاں ـــ اچھے کھانے سے۔ پھولوں سے۔ دولت سے۔ عزت سے اور کچھ بُری عادتوں سے بھی۔

نورجہاں بیگم نواب اصغر علی، دھنباد بازار

س: انسان کس چیز کی تلاش میں دربدر بھٹکتا ہے؟

ج: دراصل خوشی کی تلاش میں۔ لیکن بظاہر دولت، عزت اور محبت کی کھوج میں ـــ اسے تجربے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب لیبل جھوٹے ہیں۔ اور اس کی تلاش جاری رہتی ہے۔

س: انسان گذرا ہوا زمانہ کب یاد کرتا ہے؟

ج: جب گذرا ہوا زمانہ خوش گوار اور حال ناگوار ہو۔ بڑھاپے میں اکثر ایسا ہوتا ہے۔

ثروت زہرہ بیگم، دہلی۔

س: کسی کی بُری عادت کو کیسے چھڑایا جا سکتا ہے؟

ج: اُسے اپنی بُری عادت کو چھوڑنے کا مشورہ نہ دیا جائے۔ اُسے صرف [illegible] [illegible]

دیس بدیس کی خبریں



مردے نے ہائر سیکنڈری کا امتحان پاس کرلیا

آسام میں ایک مردے نے ہائر سیکنڈری کا امتحان دیا۔ جب نتیجہ نکلا تو یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گیا کہ کامیاب لڑکوں کی فہرست میں اُس کے نام کی بجائے اُس کے باپ کا نام درج ہے۔ اس کے باپ کی موت کو کئی سال گزر چکے تھے، لیکن ہائر سیکنڈری بورڈ نے اُسے امتحان میں پاس کردیا!

مُردہ عورت زندہ ہوگئی

بنگال کے مدناپور ضلع میں ایک شخص نے اپنی بیمار بیوی کو مدد اسپتال میں داخل کرایا۔ پندرہ روز کے بعد وہ اپنی بیوی کی خیریت معلوم کرنے کے لئے اسپتال پہنچا۔ جب وہ وارڈ میں پہنچا تو اس کی بیوی کا بستر خالی تھا۔ اُس نے نرس سے اپنی بیوی کے متعلق سوال کیا۔ نرس نے اُسے بتایا کہ دو روز ہوئے اس کی بیوی کی موت ہوگئی۔ وہ روتا ہوا گھر واپس پہنچا اپنی بیوی کی آخری رسوم ادا کیں، اس کی روح کی شانتی کے لیے شرادھ کا بندوبست کیا۔ پھر دو روز کے بعد کسی نے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے اپنی مرحوم بیوی کو دروازے پر کھڑا پایا۔ بیوی نے اسے بتایا کہ وہ سیدھی اسپتال سے آ رہی ہے۔ شوہر نے بیوی کا بیان ماننے سے انکار کردیا اور اسے گھر سے نکال دیا۔ بیوی نے مایوس ہوکر اپنے باپ کے گھر میں پناہ لی۔ شوہر کی بدسلوکی سے اس بے چاری کا دل ٹوٹ گیا۔ اس کی بیماری بڑھ گئی اور دوسرے ہی دن وہ چل بسی۔

شادی کا گھر میدانِ جنگ بن گیا

قصبہ اشوک گڑھ میں ہرچرن سنگھ اپنے بیٹے کی برات لے جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ سارے گھر میں شادیانے بج رہے تھے۔ یکایک لچھمن سنگھ کوئی بات طے کرنے کے لئے دُولہا کے گھر پہنچ گیا۔ لچھمن سنگھ دُلہن کا باپ تھا۔ دونوں سمدھیوں میں کسی بات پر تکرار شروع ہوگئی۔ جھگڑے نے طول کھینچا تو لچھمن سنگھ نے بندوق نکال لی۔ اس کے پاس ایک دو نالی بندوق کے علاوہ ایک ریوالور بھی تھا اُس نے بندوق اور ریوالور سے فائر کرنا شروع کردیا۔ شادی کے گھر میں بھگدڑ مچ گئی۔ اس افراتفری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے لچھمن سنگھ ایک کار میں بیٹھ کر فرار ہوگیا۔

کم سن لڑکی جمناسٹک چیمپین

پندرہ سالہ میریا فلاٹووا روس کی جمناسٹک چیمپین قرار دیا گیا۔ فلاٹووا مانٹریال میں اپنے کارنامے اولمپک میں دکھا چکی ہے جب اس کو اولمپک چیمپین قرار دینے کا تمغہ دیا گیا تھا۔ حال ہی میں ماسکو میں منعقد ہونے والے مقابلے میں فلاٹووا نے جمناسٹک کا وہ شاندار مظاہرہ کیا کہ نہ صرف تماشائی بلکہ روس کے حکمراں بھی عش عش کر رہے تھے۔ میریا دنیا کی دوسرے نمبر کی جمناسٹک کھلاڑی مانی جاتی ہے۔ پہلا درجہ رومانیہ کی ایک نوعمر لڑکی کو حاصل ہے۔ آئندہ ماسکو اولمپک میں پندرہ سالہ میریا دنیا کی چیمپین بننے کے خواب دیکھ رہی ہے۔



بار برا جلد ہی خلا میں جانے والی ہیں

باربرا زک ۲۰۰۰ کی پہلی خاتون بننے والی ہے جو خلائی پرواز کرے گی۔ یہ یورپ کی تاریخ میں پہلی خلاباز خاتون ہوگی تیس سالہ زک جرمنی کی خلائی رسد گاہ میں ایک اعلیٰ سائنسی تحقیقاتی مرکز کی ڈائرکٹر بھی ہے۔ وہ بہترین پائلٹ بھی ہے اور ہر قسم کے جہاز کو آسانی سے اڑالیتی ہے۔ زک ایک عمدہ کھلاڑی بھی ہے۔ بہت سے مقابلوں میں وہ انعامات بھی حاصل کرچکی ہے خلائی سفر کے لئے جو عورتیں امیدوار ہیں ان میں زک کا نام سرفہرست ہے اور وہ دن دور نہیں جب باربرا زک یورپ کی پہلی خلاباز خاتون بن جائے گی۔



جنگ میں مرنے والے سپاہیوں کی
بیواؤں کی شادیاں

مرکزی وزیر داخلہ جناب چرن سنگھ کی اہلیہ خواتین کے مسائل میں خاصی دلچسپی لیتی ہیں اور ان کی ہر معاملے میں خاطر خواہ مدد کرتی ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے لاجپت نگر دہلی میں ایک سادہ سی تقریب میں جنگ میں مرنے والے پانچ فوجیوں کی بیواؤں کی شادیاں کرائیں۔ یہ شادیاں ایک تنظیم کے تحت ہوئیں۔ جس کا نام "وار وِڈو ایسوسی ایشن" ہے۔ تقریب میں مسٹر چرن سنگھ جے پور کی مہارانی اور اس تنظیم کی صدر موہنی گری بھی شامل ہوئیں۔ موہنی نے بتایا کہ ایک گریجویٹ نے اس بیوہ سے شادی کی جس نے اپنے شوہر کے مرنے کے پانچ دن بعد ایک بچے کو جنم دیا تھا۔ ایک شادی سکھ رسم و رواج کے مطابق عمل میں آئی اور باقی ہندو رسم کے تحت کی گئیں۔

وزیرِ اعظم کے خلاف عورتوں کا
مظاہرہ

ایمرجنسی کے دوران عوام میں خوف چھایا ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے کوئی بھی شخص اپنی شکایات یا مطالبات پیش نہیں کرسکتا تھا۔ اب وہ دور ختم ہوگیا ہے۔ اب ہر شخص اپنی اپنی مشکلات حکومت کے روبرو بیان کرسکتا ہے۔ وزیر اعظم جناب مرارجی ڈیسائی کی رہائش گاہ پر خواتین کے وفد کئی مرتبہ جاچکی ہیں۔ اور اپنے مسائل سے انہیں آگاہ کرتے رہتے ہیں۔

حال ہی میں خواتین نے وزیرِ اعظم کے عورتوں کے بارے میں ایک بیان کو قابل اعتراض سمجھا اور وزیر اعظم سے اس کی تردید چاہی یہ بات قابل تعریف ہے کہ وزیرِ اعظم نے ان کا اعتراض تسلیم کرلیا۔ ◄

سپاہی کی نیند

مٹیا برج (کلکتہ) کے علاقے میں ایک سپاہی پہرہ دیتے دیتے سوگیا۔ اس سپاہی کے ساتھ ایک ہوم گارڈ کا سپاہی بھی تھا وہ بھی اپنے دوست کے ساتھ نیند کے مزے لے رہا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کچھ لوگ سپاہی کی رائفل لے اڑے۔

آندھرا پردیش کی خاتون گورنر

حال ہی میں چار ریاستوں کے نئے گورنر مقرر کئے گئے ہیں ان میں ایک خاتون بھی شامل ہیں۔ راجیہ سبھا کی سابق ممبر شاردا مکرجی کو آندھرا پردیش کا گورنر بنایا گیا ہے۔ شاردا مکرجی ہندوستان کے فضائیہ کے سربراہ ایر مارشل سبروتو مکرجی کی اہلیہ ہیں۔ سبروتو مکرجی پہلے ہندوستانی تھے جو فضائیہ کے سربراہ بنے۔ شاردا مکرجی سیاسی زندگی میں شوہر کی وفات کے بعد داخل ہوئی تھیں اور آج گورنر کے عہدے تک پہنچ گئی ہیں۔

□□



سوئیٹ بھابی :

یوں تو ہر ماہ کا بانو لاجواب ہوتا ہے لیکن اِس بار تو آپ نے غضب کر دیا۔ افسانے ایک سے بڑھ کر ایک۔ "روزالین کارٹر کے شب و روز" پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ آپ کی "اُلجھنیں" میں کتنوں کو ہی اپنی اپنی اُلجھن کا حل مل جاتا ہوگا۔ "اِن سے ملئے" میں کبھی ۱۹ ماہ تک بے تاج کے بادشاہ بن کر راج کرنے والے سنجے کی بیوی مینکا گاندھی سے بھی ملائیے۔

ستمبر کے بانو میں قرۃ العین کے افسانے "وارث" کو میں نے کئی بار پڑھا۔ وجہ ؟ میں بھی دو لڑکوں کی ماں ہوں اور شادی سے پہلے میں ہمیشہ اپنی سہیلیوں کے بیچ میں کہا کرتی تھی کہ لڑکوں کی ماں لڑکیوں کی ماں کے مقابلے میں زیادہ خوش نصیب ہوتی ہے۔ لڑکیوں کی ماں سے زیادہ بدنصیب اِس دنیا میں کوئی نہیں۔ کیوں کہ لڑکی مجبوری کا دوسرا نام ہے۔ لڑکی کی ماں کو دوسروں کے سامنے خاص طور سے لڑکی کے سسرال والوں کے سامنے اکثر ذلیل ہونا پڑتا ہے۔ لڑکیاں سسرال میں جا کر دُکھی ہوں تو ماں کے لئے یہ صدمہ ناقابلِ برداشت ہوتا ہے، مگر "وارث" پڑھ کر میرا سوچنے کا ڈھنگ بدل گیا ہے اور میرے خیالات نے دوسرا موڑ لے لیا ہے۔ میں سنجیدگی سے اِس بات پر غور کر رہی ہوں کہ بڑے ہو کر میرے لڑکے بھی اپنی بہو کے ہو کر رہ گئے تو ؟ تو کیا اُس وقت مجھے لڑکی کی کمی محسوس ہوگی ؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ لڑکا ہو یا لڑکی اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور اولاد کا سکھ اُن کو ہی ملتا ہے جن کی قسمت میں لکھا ہو۔

شریفہ شمعون علی، اندور

محترمہ بھابی صاحبہ :

بانو کا افتتاحیہ پُر مغز بھی ہوتا ہے اور حُسنِ بیان کا شہ پارہ بھی، جس کی وجہ سے وہ تاثیر کا جادو بن جاتا ہے۔ میں نے ہر مہینے کے افتتاحیہ کو غور سے پڑھ کر اپنی شخصیت، اپنی زندگی اور اپنے ماحول کو سنوارنے کے لئے بہت کچھ سیکھا ہے۔ میری طرح نہ جانے کتنی ہی بہنیں آپ کے ارشادات پر عمل کر کے ایک نئے سُکھ، ایک نئی مسرت، ایک نئے اطمینان سے ہم کنار ہو رہی ہوں گی۔

زرینہ زریں، دہلی ۶

بھابی صاحبہ :

شاید امریکہ کے صدر کارٹر کی ہندوستان میں آمد کا علم آپ کو پہلے سے ہی ہو گیا تھا (وہ اکتوبر میں آئیں گے) اسی لئے ستمبر کا بانو اپنے دامن میں "روزالین کارٹر کے شب و روز" سجائے ہوئے ہے۔ یہ فیچر مجھے تو بہت ہی پسند آیا۔ روزالین کارٹر کا مزاج وضعِ زندگی اور مصروفیتوں کا نقشہ خود ہمارے یہاں کی پڑھی لکھی عورتوں کے لئے بھی قابلِ تقلید نمونہ بن سکتا ہے۔

صفیہ اکبر، سری نگر

محترمہ :

مضمون "محبت کرنے والوں کی قسمیں" (بانو : ستمبر) اچھا تجزیہ ہے، مگر کسی قدر گمراہ کن بھی ہے۔ محبت کرنے والوں کو اس طرح بندھے ٹکے خانوں میں بانٹنا مشکل ہے۔ آدمی بہرحال رنگ بدلنے والی مخلوق ہے۔ وہ کبھی اپنے حالات اور کبھی محبت کے حالات کی وجہ سے محبت کرنے والوں کے ایک زمرے سے دوسرے زمرے میں بھی جا سکتا ہے۔

ایم۔ ناصر کی کڑی زمرہ بندی کی وجہ سے مجھ پر جو زیادتی ہوئی ہے اُس کی تلافی کون کرے گا؟ میرے دل کی ملکہ صرف اِس لئے مجھ سے دور ہو گئی کہ اِس مضمون کو پڑھ کر اُس نے مجھے (پتہ نہیں کیوں) نفسانی محبت کرنے والوں کے زمرے میں رکھا اور یہ فیصلہ کیا کہ میرے ساتھ زندگی گزارنا اُس کے لئے ایک ناگوار بوجھ بن جائے گا۔ اِس ستم کی تلافی اب کیسے ہو؟

شکیل احسن، احمد آباد

سوئیٹ بھابی :

خدا کے لئے آپ "عورتیں ہمالیہ کی چوٹی پر پہنچ گئیں" (بانو : ستمبر) کی قسم کے مضامین نہ چھاپا کیجئے۔ کچھ گنی چُنی بہنوں کو شاید اِن سے ولولۂ عمل مل جاتا ہو، مجھ جیسی لاکھوں کم نصیبوں کو تو ایسے مضامین پڑھنے کے بعد اپنے بے بال و پر ہونے کا احساس اور بھی شدت سے ستانے لگتا ہے۔

صالحہ فاروقی، بھوپال

محترمہ مدیرہ صاحبہ :

میں کئی سال پہلے تک بانو کا خریدار رہا تھا، لیکن پرچے کا معیار گرتے دیکھ کر مجھے یہ سلسلہ بند کر دینا پڑا تھا۔ اِسی درمیان چند شماروں کو دیکھنے کے بعد مجھے اپنے فیصلے پر نظرثانی کرنا پڑی۔ نتیجے کے طور پر مئی ۱۹۷۷ سے میں دوبارہ بانو کا خریدار بن گیا۔

مئی کے بعد سے پانچ شمارے دیکھنے کے بعد آپ سے مخاطب ہونے کی جرأت کر رہا ہوں، جہاں تک افسانوں کا تعلق ہے کئی نئے لکھنے والوں کو آپ نے شامل کیا ہے، لیکن ان میں کتنے کامیاب ہیں، اس کا فیصلہ آپ خود کر سکتی ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی نہ ہو، لیکن اس کے ساتھ پرچے کے معیار کا خیال رکھنا بھی بہت ضروری ہے اب جیسے محترمہ روشن آرا صاحبہ کا افسانہ "پہلا جھوٹ" (مئی : ۱۹۷۷) یقیناً ایک قابل تعریف اور کامیاب افسانہ تھا، لیکن ان ہی کے افسانے "تو میرے" (اگست : ۱۹۷۷) کا پلاٹ بے حد کمزور اور خیال آرائی پر مبنی ہے۔ ستمبر کے شمارے میں این قرۃ العین آمبوری کا افسانہ بیک وقت دو افسانوں کو پیش کرتا ہے —— انہوں نے شروع کیا تھا کچھ اور لیکن انجام کسی اور افسانے کا لکھ دیا۔ کہکشاں انجم نے اپنے افسانے "انتظار کی تبدیلی" (اگست : ۱۹۷۷) میں عنوان کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ کہانی کے آخر میں کی ہوئی تقریر کچھ زیادہ ہی بور کرتی ہے۔

ستمبر کے شمارے میں افسانہ "نانی" اور "سب کی طرح" پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوا، جیسے کہانی اور اس کے پلاٹ کے متعلق بیان کردہ تمام تعریفوں پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ "بکھرے پورے ادھورے" (کملیشور : جون ۱۹۷۷) اور "دھرتی تلے کا بیل" (عشرت امیر : جون ۱۹۷۷) جیسے افسانے اب کیوں نہیں شائع ہو رہے ہیں۔ مجھے خوف ہے کہ سال نامہ کے ساتھ آپ مزید بور بیت نہ ارسال فرمادیں۔

امتیاز حسین، سہرسہ (بہار)

ڈیر سجابی صاحبہ :

آپ کے افتتاحیہ نے اپنے سابقہ ریکارڈ خود ہی توڑ دیے ہیں۔ ستمبر کا افتتاحیہ بہت پسند آیا۔ مگر کہانیوں میں قسیم عالم مصطفیٰ کی "نانی" کافی کمزور رہی۔

ارشد صدیقی، الہ آباد

ڈیر آنٹی :

جب دل غم سے مجبور ہو تو ایسے وقت میں آپ کا افتتاحیہ دل کو سکون اور حوصلہ بخشتا ہے۔ ستمبر کا افتتاحیہ بالخصوص ولولہ خیز رہا۔ اس بار سرورق بھی بہت خوب صورت ہے۔ کہانیاں بھی سب کی سب پسند آئیں۔

یاسمین سلطانہ، گنتور

پیاری سجابی :

ستمبر کا بانو ملتے ہی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ فوراً صرف اس کی ورق گردانی ہی نہیں کی بلکہ پورا شمارہ بہت جلد ہی پڑھ ڈالا۔

اس شمارے کے افتتاحیہ نے دل و دماغ پر اپنا پورا اثر ڈالا ہے۔ واقعی یہ صفحہ ہر شخص کو کچھ سوچنے سمجھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

'بدلہ' 'مبارک قدم' اور 'وارث' سبق آموز کہانیاں ہیں۔ بانو تیز رفتاری سے آگے کی طرف رواں دواں ہے۔ اس کا معیار بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا ہے۔

وزین الدین، سہسرام

ڈیر سجابی :

ستمبر کا درخشندہ شمارہ دست یاب ہوا۔ سرورق اور اندر کے صفحات پر بکھرے ہوئے جواہر پاروں کو پڑھ کر دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ پورے ہندوستان میں آج تک خواتین کے لئے اتنا اچھا اور خوب صورت جریدہ جلوہ افروز ہوا ہے اور نہ مستقبل میں امید ہی کی جا سکتی ہے۔

قسیم عالم مصطفیٰ کی کہانی "نانی" ایک نفسیاتی اور سبق آموز کہانی ہے۔ بینکی کا کردار آج کے دور کی بے حسی کی غمازی کرتا ہے۔ آج ہمارے درمیان نہ جانے کتنی بینکیوں کا مسئلہ درپیش ہے۔

اس کے علاوہ قسیم ثومانی کی کہانی "خط کا طوفان" بھی بے حد پسند آئی جس کے لئے مصنف مبارک باد کے مستحق ہیں۔

مس وحیدہ ناز، گریڈیہ

محترمہ :

ستمبر کے شمارے میں کہانیاں "وارث" اور "سب کی طرح" پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ بے اختیار قلم مبارک باد دینے کے لئے اٹھ گیا۔ افتتاحیہ بہت ہی سبق آموز ہے۔ اس کا ایک ایک جملہ معنی خیز اور نصیحت آمیز ہے۔ بانو جیسے ادبی رسالے میں غزل کی کمی بہت ہی کھٹکتی ہے۔ جب آزاد نظمیں تک جگہ حاصل کر لیتی ہیں تو اردو ادب کی آبرو، اپنی غزل سے اتنا بیر کیوں؟

جاوید مہدی، مونگیر

محترمہ :

بانو ستمبر میں 'بدلہ' 'وارث' 'خط کا طوفان' کہانیاں خاص طور پر پسند آئیں۔ 'آپ کی ذہنی الجھن اور اس کا حل' کا کالم خاصا مفید ہے۔ آپ نے "افتتاحیہ" کے تحت بڑے کام کی بات بتائی ہے۔ بانو واقعی ایک معیاری، دل چسپ اور شائستگی آموز رسالہ ہے، جس کا مطالعہ شریف گھرانے کی لڑکیوں اور عورتوں کے لئے حد درجہ مفید ہے۔

داے۔ این۔ قدوائی، لکھنؤ

آزمائش اور ترتیب: رشیدہ خاتون

باورچی خانہ

مزے دار اور آزمودہ پکوان

زعفرانی فیرنی

دودھ	ایک لیٹر
چاول	آدھی پیالی
چینی	آدھی پیالی
زعفران	آدھا چائے کا چمچہ
کیوڑہ	ایک چائے کا چمچہ
پستے	دس عدد
ورق	حسب ضرورت

چاولوں کو صاف کر کے دھو لیں پھر رکھ کر سل پر باریک پیس لیں۔ زعفران کو کچھ دیر کے لئے کیوڑہ میں بھگو دیں پھر کھرل میں باریک پیس لیں۔ پستوں کی ہوائیاں کاٹ لیں۔

دودھ کو دیگچی آنچ پر رکھ دیں جب دودھ تقریباً پونا لیٹر باقی رہ جائے تو اس میں پسے ہوئے چاول ڈال دیں جب دودھ کافی گاڑھا ہو جائے تو چینی بھی ڈال دیں اور چمچہ چلاتی رہیں چینی گھل جائے اور فیرنی جمنے کے قابل ہو جائے تو زعفران ملا کر آنچ سے اتار لیں پھر کسی ڈش میں یا مٹی کی سکوریوں میں نکال لیں فیرنی تھوڑی ٹھنڈی ہو جائے تو ورق لگا کر اوپر سے پستوں کی ہوائیاں چھڑک دیں۔

ماش کی دال گوشت

ماش کی دال	۲۵۰ گرام
گوشت (بوٹیاں)	۴۰۰ گرام
لال مرچ	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
گرم مسالہ	ایک چائے کا چمچہ
ادرک	۲ چائے کا چمچہ
ہری مرچ	۵ عدد
ہرے دھنیے کی پتیاں	۲ ٹیبل اسپون
دودھ	ڈیڑھ پیالی
بالائی یا کریم	۴ ٹیبل اسپون
لہسن	ایک چائے کا چمچہ
پیاز	ایک ڈلی
گھی	پاؤ پیالی
نمک	حسب ذائقہ

دال کو صاف کر کے تین گھنٹے کے لئے بھگو دیں پیاز اور ادرک کو چھیل کر لچھے کاٹ لیں۔ ہری مرچوں کے لچھے کاٹ لیں۔ گوشت کو دھو لیں۔

ایک دیگچی میں پیاز کے لچھے اور گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں پیاز بادامی ہو جائے تو لال مرچ، ہلدی، لہسن، ادرک، نمک اور پاؤ پیالی پانی ڈال کر مسالہ بھون لیں پھر گوشت ڈال دیں۔ گوشت کا سارا پانی جذب ہو جائے تو گوشت گلنے کے انداز کا پانی ڈال کر دیگچی کو ڈھانپ دیں گوشت گلنے میں تھوڑی کسر باقی ہو تو دال ڈال دیں پانچ سات منٹ بعد دودھ کو گرم کر کے ڈال دیں دال گل جائے اور دودھ خشک ہو جائے تو دیگچی کو آنچ سے اتار لیں ڈش میں نکالنے کے بعد اس پر بالائی ڈال دیں اور ہری مرچ، ہرے دھنیے کی پتیاں اور گرم مسالہ بھی چھڑک دیں۔

ثابت پھول گوبھی

گوبھی کا پھول	ایک عدد
مٹر	۵۰۰ گرام
لال مرچ	پاؤ چائے کا چمچہ
کالی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
ہری مرچ	۴ عدد
لیموں کا عرق	ایک ٹیبل اسپون
ہرے دھنیے کی پتیاں	۴ ٹیبل اسپون
ٹماٹو کیچپ	پاؤ پیالی
میدہ	۲ چائے کے چمچے
مکھن	۴ ٹیبل اسپون
نمک	حسب ذائقہ

مٹر چھیل کر دانے نکال لیں ایک دیگچی میں مٹر کے دانے، ایک ٹیبل اسپون مکھن، کالی مرچ، نمک اور مٹر گلنے کے انداز کا پانی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں مٹر گل جائے اور پانی خشک ہو جائے تو آنچ سے اتار لیں۔

ہری مرچوں کی ڈنڈیاں توڑ لیں، ہری مرچوں اور ہرے دھنیے کی پتیوں میں تھوڑا سا نمک ملا کر سل پر باریک پیس لیں اور اس میں لیموں کا عرق ملا لیں۔ ایک فرائی پان میں ایک ٹیبل اسپون مکھن اور میدہ ڈال کر آنچ پر رکھ دیں چمچے سے ہلاتی رہیں آدھے منٹ کے بعد اس میں لال مرچ، ٹماٹو کیچپ نمک اور آدھی پیالی پانی ڈال دیں۔ چمچہ برابر چلاتی رہیں، ساس تھوڑا گاڑھا ہو جائے تو آنچ سے اتار لیں۔

گوبھی کے پھول کے پتے اور ڈنٹھل کاٹ کر پھینک دیں پھول ثابت رہنے دیں پھر ایک دیگچی میں تھوڑا نمک اور اتنا پانی ڈال کر آنچ پر رکھیں جس میں پھول ڈوب جائے پانی ابلنے لگے تو اس میں گوبھی کا

پھول ڈال دیں پانچ سات منٹ بعد اَدھ گلا ہوجائے تو پانی سے نکال لیں اور پانی پھینک دیں اب ایک دوسرے فرائی پان میں دو ٹیبل اسپون مکھن ڈال کر آنچ پر رکھ دیں مکھن پگھل جائے تو اس میں گوبھی کا پھول سیدھا رکھ دیں دو چار منٹ بعد پانی خشک ہوجائے تو پلٹ دیں ایک دو منٹ بعد فرائی پان سے نکال لیں پھر اس پر ہری مرچ اور ہرے دھنیے کی چٹنی سب طرف مل دیں۔ دو ٹیبل اسپون مٹر کے دانے نکال کر علیحدہ رکھ لیں باقی مٹر کے دانوں کو ایک سیدھی پلیٹ میں پھیلا دیں پھر ان پر گوبھی کا پھول رکھ کر ساس ڈال دیں اوپر سے باقی مٹر کے دانے گوبھی پر چھڑک دیں۔

دِل پسند قورمہ

گوشت (ران کا)	۵۰۰ گرام
لال مرچ	۶ عدد
ہری مرچ	۴ عدد
لونگ	۵ عدد
چھوٹی الائچی	۳ عدد
ادرک	ایک انچ کا ٹکڑا
لہسن	ایک چائے کا چمچہ
پیاز (درمیانہ سائز)	۶ ڈلی
دہی	ایک پیالی
گھی	ایک پیالی
نمک	حسبِ ذائقہ

گوشت کے دو دو انچ کے چوکور ٹکڑے کرالیں ادرک چھیل کر باریک کاٹ لیں ہری مرچوں کی ڈنڈیاں توڑ کر پھینک دیں اور مرچوں کے چھ ٹکڑے کرلیں پیاز چھیل کر لچھے کاٹ لیں۔ دہی کو خوب اچھی طرح پھینٹ لیں۔

ایک دیگچی میں پیاز کے لچھے اور گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں پیاز بادامی ہوجائے تو اس میں لال مرچ، لہسن اور نمک ڈال دیں، اور ایک منٹ بھوننے کے بعد گوشت ڈال دیں اور خوب بھونیں گوشت کا بساندہ پانی بھن جائے اور گوشت پر تھوڑی سرخی آجائے تو دہی ڈال دیں دہی کا پانی بھن جائے تو بقیہ تمام مسالے اور گوشت گلنے کے اندازے کا پانی ڈال دیں اور آنچ دھیمی کردیں۔

گوشت گل جائے اور مسالہ گھی چھوڑ دے تو آنچ سے اتار لیں۔

انڈے بھرے ٹماٹر

انڈے	۶ عدد
ٹماٹر (بڑا سائز)	۹ عدد
کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
لال مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
لہسن	آدھا چائے کا چمچہ
پیاز (درمیانہ سائز)	ایک ڈلی
گھی	حسبِ ضرورت
نمک	حسبِ ذائقہ

انڈوں کو سخت اُبال کر چھیل کر باریک کچومر کاٹ لیں تین ٹماٹروں کا کچومر کاٹ لیں باقی کے چھ ٹماٹروں کے اوپر سے آدھا انچ موٹا گول ٹکڑا کاٹ لیں پھر کسی تیز چھری سے اس کے بیچ کا گودا نکال کر ٹماٹروں کے کچومر میں ملا دیں پھر نمک اور کالی مرچ ملاکر ٹماٹروں کے اندر مل دیں۔

ایک دیگچی میں پیاز کا کچومر اور پاؤ پیالی گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں، پیاز بادامی ہوجائے تو اس میں لال مرچ، لہسن، نمک اور ٹماٹروں کا کچومر ڈال دیں ٹماٹروں کا گودا گھل جائے اور تھوڑا گھی چھوڑ دے تو آنچ سے اتار لیں۔

ایک کڑھائی میں زیادہ گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں گھی گرم ہوجائے تو ایک ٹماٹر کو جالی کے چمچے پر رکھ کر گھی میں ڈال دیں ایک منٹ نکال کر ڈش میں رکھ لیں پھر ٹماٹر کے اندر انڈے رکھ دیں اسی طرح تمام ٹماٹروں کو تل کر انڈے رکھ لیں کھانے سے چند منٹ پہلے ٹماٹروں کے اوپر ٹماٹروں کا پکا ہوا شوربہ ڈال دیں ہرے دھنیے کی پتیاں چھڑک دیں۔

کدو کا اچار

کدو (ہرا گھیا)	۵۰۰ گرام
لال مرچ	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
ہری مرچ	۸ عدد
رائی	۲ ٹیبل اسپون
ہینگ	ایک چٹکی
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
ادرک	آدھا انچ کا ٹکڑا
نمک	حسبِ ذائقہ

کدو کو چھیل لیں پھر بیچ سے دو ٹکڑے کرکے بیج نکال کر پھینک دیں پھر کدو کے ایک ایک انچ کے ٹکڑے کرلیں۔

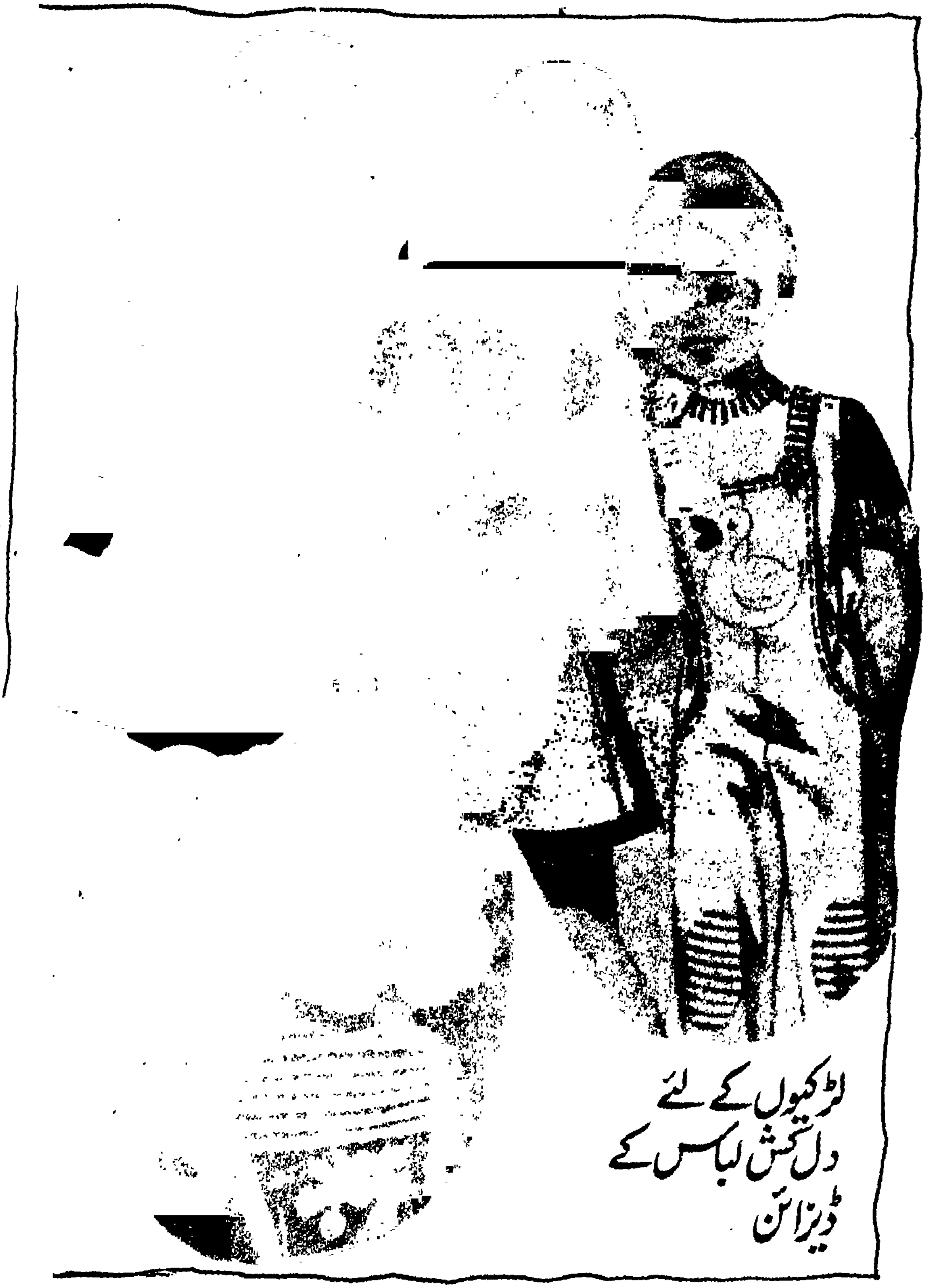
رائی کو سل پر سوکھا باریک پیس لیں ادرک کو بھی چھیل کر سل پر باریک پیس لیں۔ ہری مرچوں کی ڈنڈیاں توڑ کر پھینک دیں اور ہری مرچوں کے لمبائی کے رُخ سے چار چار ٹکڑے کرلیں۔

اب ایک دیگچی میں کدو اور آدھی پیالی پانی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں پانچ سات منٹ بعد اس میں تمام مسالے اور نمک ڈال کر خوب اچھی طرح ملادیں پانی خشک ہوجائے اور مسالہ کدو کے ٹکڑوں پر لپٹ جائے تو آنچ سے اتار لیں ٹھنڈا ہوجانے کے بعد کسی صاف اور خشک شیشی میں بھر لیں

یہ اچار دو چار روز سے زیادہ نہیں رہ سکتا اس لئے اس کو جلدی استعمال کریں۔ ○ ○

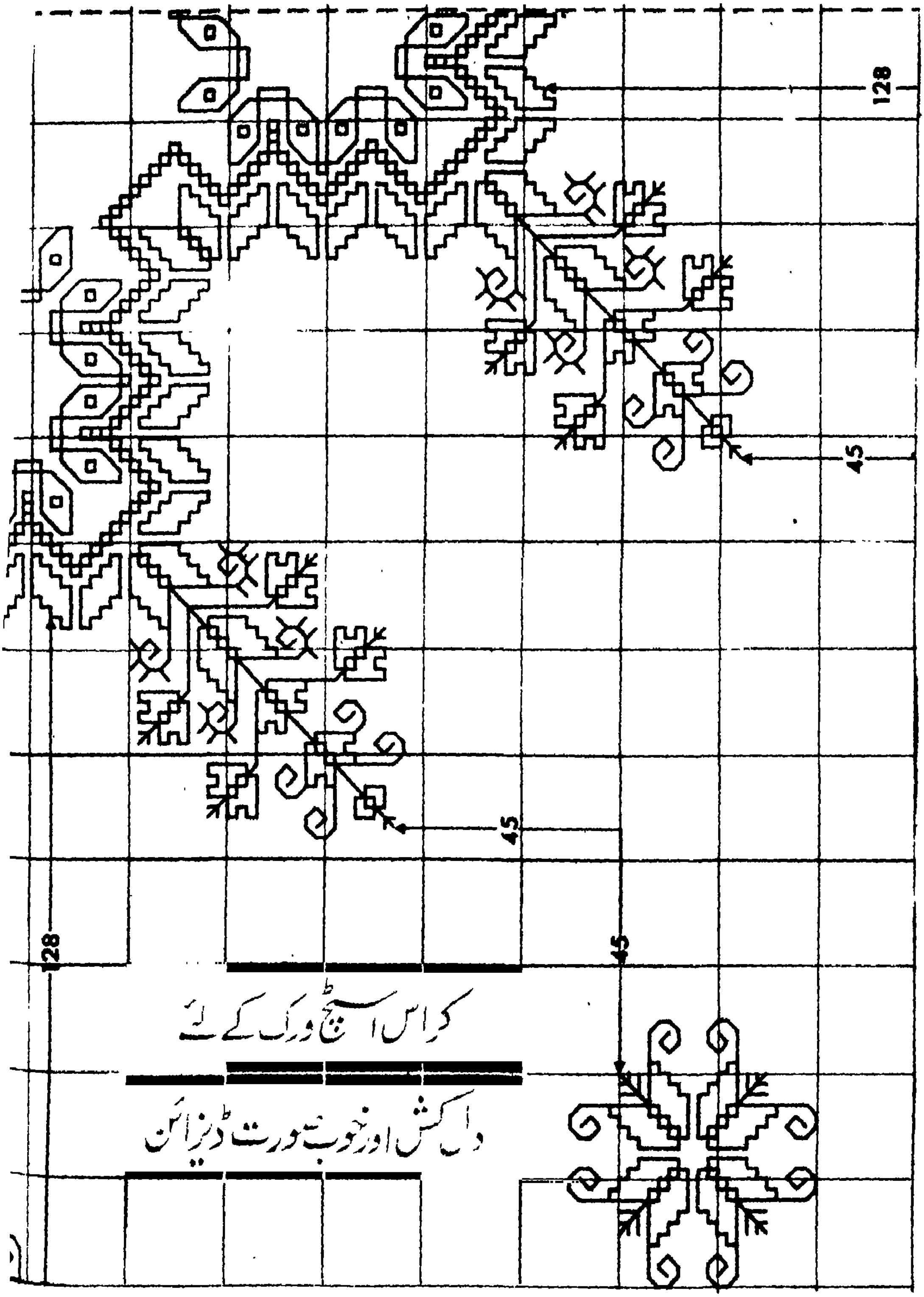
فراکوں کے دو نئے اور دل کش نمونے





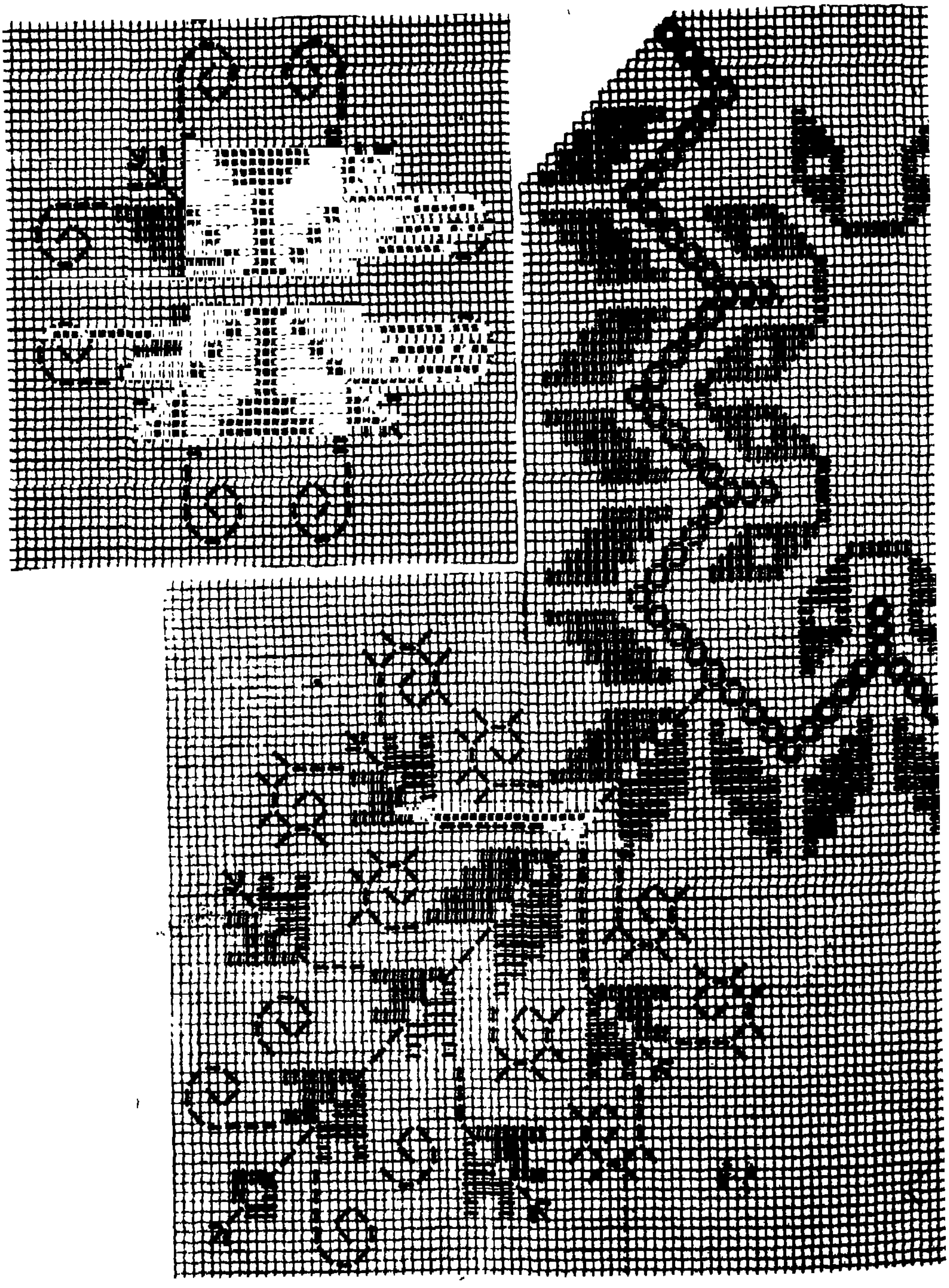
لڑکیوں کے لئے دل کش لباس کے ڈیزائن





کراس اسٹچ ورک کے لئے

دل کش اور خوبصورت ڈیزائن





اللہ والے
ضیاء تسنیم

[illegible]

آٹھ ہزار روپے کے نقد انعامات کی شاندار تقسیم

شمع منی معمہ نمبر ۲۴ میں ۲۲ صحیح حل آئے

شمع منی معمہ نمبر ۲۴ آسان ثابت ہوا اور ۲۲ پروانے بالکل درست حل تک پہنچ گئے۔ ان بائیس درست حلوں پر پہلا انعام مبلغ پانچ ہزار روپے تقسیم کیا گیا۔

شمع منی معموں کی تیز رفتاری بے مثال ہے۔ درست حل شائع کئے جانے کے چند گھنٹوں میں چیکنگ ختم کر کے تقسیم انعامات کی تفصیلات کا اعلان کر دیا گیا، جن پروانوں نے صحیح حل منگانے کے لئے لفافے بھیجے تھے، انہیں تقسیم انعامات کی تفصیلات بھی فوراً روانہ کر دی گئیں۔ دوبارہ جانچ کے لئے کسی کلیم کا انتظار کئے بغیر ہی پہلے اور دوسرے انعامات کے منی آرڈر بھیج دیے گئے۔

صحیح حل شمع منی معمہ نمبر ۲۴

م	ے	کھ	ک		
ع	ہ	ے	ہ		
ص	ا	ت		ل	م
و	ن		ت	ا	ب
م		ت	و	ر	م
	ے	ن	ا	ل	ہ

حوالے: شمع منی معمہ نمبر ۲۴ کے اشارات [illegible] کتب سے لئے گئے تھے، ان کے نام [illegible] ۱۔ [illegible] ۲۔ غالب ۳۔ [illegible] ۴۔ اقبال ۔ [illegible] ۵۔ رفیق ۶۔ مناظرہ ۔ رام ۸۔ احمد۔

بالکل درست حل ۲۲ وصول ہوئے جن پر پہلا انعام مبلغ پانچ ہزار روپے بحساب ۲۲۷ روپے ۲۸ پیسے فی حل تقسیم کیا گیا

۱۔ آر۔ ملیشم صاحب، ایل۔ ڈی۔ سی، ضلع پرپیشنا آفس، سنگاریڈی ۵۰۲۰۰۱، میدک۔

۲۔ سید محمود عالم صاحب، موضع میاں بگھا، پوسٹ کریادلپور، ضلع گیا (بہار)

۳۔ مولراج کمار صاحب عرف راج امرتسری ولد لالہ آتم ج لال کمار ۲ - ۳ سین پورہ۔ امرتسر - ۱۴۳۰۰۱۔

۴۔ محمد حسین صاحب، میوانی دواخانہ، بس اڈے کے پاس، جنگل پیپرتھانہ، ضلع گورکھپور۔

۵۔ محمد ابراہیم صاحب انصاری، ہشکرا بازار، پوسٹ ڈھولی، ضلع مظفرپور۔

۶۔ ذکی احمد صاحب، معرفت شمع شیلر، زنانہ اسپتال روڈ، فیض آباد۔

۷۔ میر مظفر اقبال ذوقی صاحب ولد نذیر احمد میر، محلہ سورہ مسجد، سری نگر ۱۹۰۰۰۲۔

۸۔ مشتاق احمد صاحب ملاشہ، مقام ڈاک خانہ، خیرآباد ۲۷۶۴۰۳، ضلع اعظم گڑھ۔

۹۔ جگت رام ریتہ صاحب، مکان نمبر ۱۶۴۔ نیکی ڈھکی، جموں۔

۱۰۔ جے۔ اے۔ قریشی صاحب، قریشی کتاب گھر، بہادر گنج، شاہجہاں پور۔

۱۱۔ محمد شریف فاروقی صاحب، سرہندی گیٹ، مالیرکوٹلہ (پنجاب)

۱۲۔ سید لئیق [illegible] صاحب معرفت حکیم عبدالواسع، محلہ سٹیرپورہ، بہار شریف ۸۰۳۱۰۱، ضلع نالندہ۔

۱۳۔ نثار خاں صاحب، گھیر محمود خاں، رام پور۔

۱۴۔ اندر سنگھ معشوق صاحب، ۹۱۲۔ گلابی باغ، دہلی ۱۱۰۰۰۷۔

۱۵۔ سنت لال صاحب، مالک میسرز سنت لال اشوک کمار کلاتھ مرچنٹ ۲۹۔ پنجابی مارکیٹ، بدایوں

۱۶۔ ملک احمد صاحب، بنگال فلیش لائٹ ۱۳۳۔ لوئر چیت پور روڈ، کلکتہ ۱

۱۷۔ ڈاکٹر دھرم دیو صاحب، آر۔ ایم۔ پی۔ ڈی ۲۸، راجیندر گارڈن، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۷

۱۸۔ محمد شفیع ملک صاحب، کاٹھ پورہ، سادی کدل، سری نگر ۱۹۰۰۰۲

۱۹۔ غلام قادر انجاری صاحب، خواجہ بازار، رعنا واری، سری نگر ۳ ۱۹۰۰۰۔

۲۰۔ محمد مظہر الحق صاحب کنڈکٹر نمبر ۱۲ کے۔ ایس۔ آر۔ ٹی۔ سی، جالکا ڈپو، بلاری (کرناٹک)

۲۱۔ محمد مختار صاحب، سینئر میڈیکل انسپکٹر پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کیمپ، سندھور، ضلع ناگپور۔

۲۲۔ اے۔ سی۔ او براسٹ صاحب۔ ای۔ ایس۔ ۲۴۳۔ مخدوم پورہ، جالندھر سٹی۔

ایک غلطی والے ۱۳۹ حل وصول ہوئے جن پر دوسرا انعام مبلغ تین ہزار روپے بحساب ۲۱ روپے ۶ پیسے فی کس تقسیم کیا گیا

[illegible]

[illegible]

تمام حلوں کی جانچ نہایت احتیاط سے کی گئی ہے، پھر بھی اگر آپ کو شبہ ہے کہ آپ کو کوئی انعام ملنا چاہئے تھا اور آپ کو ابھی تک منی آرڈر نہیں ملا تو دوبارہ جانچ کی فیس ایک روپیہ، منی آرڈر سے "شمع منی معمہ" ماہنامہ شمع آصف علی روڈ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ کو بھیجیں۔ اس کی ٹنگ خانے میں لکھئے والی رسید پر ایک مدد کے جاری کئے گئے نقد نمبر کے ساتھ "کلیم برائے شمع منی معمہ نمبر ۲۴" ماہنامہ شمع، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ کو اپنی شکایت بھیجیں۔ ساتھ ہی یہ بھی تحریر کریں کہ آپ نے شمع منی معمہ نمبر ۲۴ کے کتنے حل بھیجے تھے، ساتھ ہی ٹکٹ سے اور ساتھ ہی رجسٹری سے بھیجے تھے یا عام طور پر، ہمارے دفتر نئی دہلی میں بھیجے تھے یا کسی اور شہر سے، منی آرڈر یا نقد نامے سے کس تاریخ کو بھیجے تھے، اور تقسیم انعامات سے متعلق آپ کی شکایت کیا ہے۔ اگر آپ کی شکایت درست ہوئی تو آپ کو انعام میں حصہ دیا جائے گا اور دوبارہ جانچ کی فیس کا ایک روپیہ بھی واپس کر دیا جائے گا۔ اگر شکایت غلط ثابت ہوئی تو دوبارہ جانچ کی فیس واپس نہیں کی جائے گی۔ ہر حل کے بارے میں شکایت الگ آنی چاہئے اور اس کی فیس بھی الگ ادا کرنی ضروری ہے۔ اپنی شکایت میں یہ ضرور بتائیے کہ آپ کے حل کے بارے میں آپ کو کیا شبہ ہے۔ ... منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا نقد نامے کے ذریعہ ادا کی گئی ہے۔ ایسی تمام شکایات ۲۹ اکتوبر ۱۹۷۷ تک مل جانی چاہئیں۔ پہلے اور دوسرے انعامات روانہ کئے جا چکے ہیں۔

شمع مینی معمہ نمبر ۲۵

★ اب آپ ایک شمع ادبی معمہ اور دوسرے شمع ادبی معمہ کے حل بھیجنے کے درمیان اپنے ادبی ذوق کی تسکین کر سکتے ہیں . . . مینی معمہ کے ذریعے!

★ کوئی ٹوکن بھیجنے کی قید نہیں!

★ جتنے حل جی چاہے بھیجئے اپنے تمام حلوں کی فیس ایک یا ایک سے زیادہ منی آرڈر پوسٹل آرڈر یا نقدناموں سے بھیج سکتے ہیں

★ آپ ہر حل پر انعام کے حق دار بن سکتے ہیں فیس داخلہ فی حل صرف ایک روپیہ

★ صرف آٹھ اشارے انعام پانا کس قدر آسان!

★ فیس داخلہ بھیجنے کے لیے شمع ادبی معموں کے نقدنامے استعمال کئے جا سکتے ہیں یا پوسٹل آرڈر، منی آرڈر بھیجئے۔ اپنے حلوں کے ساتھ نقدنامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید ضرور بھیجئے۔

صحیح حل: جوابی لفافہ بھیج کر منگوایئے یا پھر اگلے ماہ نامہ "بانو" یا ماہ نامہ "شمع" میں دیکھئے۔

★ شمع مینی معمہ نمبر ۲۵ کا نتیجہ نومبر ۱۹۷۷ کے "بانو" میں، دسمبر ۱۹۷۷ کے شمع میں شائع کیا جائے گا.

Rs. شمع مینی معموں کی سلور جوبلی کے موقع پر خصوصی پیش کش:

15,000.00

پندرہ ہزار روپے کے نقد اِنعام

پہلا انعام بالکل درست حل پر: دس ہزار روپے. دوسرا انعام ایک غلطی والے حل پر: پانچ ہزار روپے

فیس داخلہ فی حل : ایک روپیہ۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ فیس داخلہ پوسٹل آرڈر، منی آرڈر یا شمع ادبی معموں کے نقدناموں کے ذریعے ادا کی جا سکتی ہے۔ نقدنامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانہ سے ملنے والی رسید اپنے حلوں کے ساتھ بھیجئے۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ ان کی فیس ایک ساتھ بھیج سکتے ہیں اور ہر حل پر علیحدہ انعام کے حق دار ہو سکتے ہیں۔ کوئی ٹوکن بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ٹوکن بھیجنے کی شرط کے علاوہ شمع ادبی معموں کی دوسری تمام شرائط شمع مینی معموں پر بھی عائد ہیں۔ ان کی پابندی ضروری ہے۔

دفاتر شمع (نئی دہلی) میں ڈاک سے اور دستی حل وصول ہونے کی آخری تاریخ، ۲۹ اکتوبر ۱۹۷۷، ۸ بجے رات تک

اشارے

دائیں سے بائیں

۱۔ صرف ایک شراب پینے سے انسان —— کی برائیوں میں پڑ جاتا ہے

۲۔ دن رات اسی امید میں —— ہوں۔ کبھی تو یہ مصیبتیں ختم ہونگی

۳۔ شادی کو —— سودا کہنے سے پہلے یہ تو سوچ لو کہ شادی سودا ہے بھی یا نہیں

۴۔ زندگی کا اصل لطف تو بس —— نے حاصل کیا ہے دوست۔ آؤ اسی بات پر ایک اور جام کبھی نہیں

اوپر سے نیچے

۵۔ روپیہ —— کے ڈھنگ بھی ہیں انہی امیروں سے سیکھنے چاہییں

۶۔ ان کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ ان لوگوں کی زندگی میں —— کا کہیں نام ونشان

۷۔ اطلس وکمخواب پہننے والے بھی ایک دن زمین کے نیچے —— ہونگے خاموش اور لاچار

۸۔ ہو چکیں، غالبؔ! بلائیں —— تمام ایک مرگ ناگہانی اور ہے

شمع مینی معمہ نمبر ۲۵

ح	ر	ط		۱	■
ا	ت		۲ ر	■	۵
ا	ر	۳	■	۶ م	
م	۴	■	۷		ا
■	■	۸			ن
■	■	ب	ے	ت	ے

شمع ادبی معمے (شمع مینی معمہ نمبر ۲۵) ماہ نامہ شمع، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

شمع مینی معمہ نمبر ۲۵ کا صحیح حل، ۲ نومبر ۱۹۷۷ کو صبح ساڑھے نو بجے ظاہر کر دیا جائے گا۔ صحیح حل اور انعام پانے والوں کے نام نومبر ۱۹۷۷ کے "بانو" میں شائع کئے جائیں گے۔ انعام پانے والوں کی تفصیلات شمع: دسمبر ۱۹۷۷ میں بھی شائع کی جا سکتی ہیں

اشاعت کا اکتیسواں سال، گیارہواں شمارہ

نومبر ۱۹۷۷ء

نگراں: یونس دہلوی

مدیرہ: زینت کوثر دہلوی

ادارۂ تحریر: شمیم آرا دہلوی

سعدیہ دہلوی

مالکان: شمع میگزین ● طابع و ناشر: یونس دہلوی ● مطبوعہ: ایس۔پی پروسیس ● ٹائیٹل: بمبئی آفسیٹ پریس

عام شمارے کی قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے ● سالانہ قیمت: اٹھارہ روپے (جس میں سالنامہ مفت ملتا ہے)

مقام اشاعت و صدر دفاتر: آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ تار کا پتہ: "شمع" نئی دہلی ٹیلی فون: ۲۷۳۰۶۶، ۲۷۴۲۶۷، ۲۷۰۶۸
دیگر دفاتر: بمبئی، کلکتہ اور مدراس

افتتاحیہ

محفل میں کسی بھی نوعیت کی گفتگو ہو وہاں موجود ہر شخص اس میں تھوڑا بہت حصہ ضرور لینا چاہتا ہے۔ اگر کسی کی تعریف ہو رہی ہو تو اس میں شامل ہونا اچھی بات ہے، لیکن اگر کسی کی بُرائی کی جارہی ہو تو اس بُرائی میں شریک ہونا مناسب نہیں۔ چند دوست احباب جہاں مل کر بیٹھتے ہیں، وہاں گفتگو کا رُخ بڑی آسانی سے کسی بھی طرف موڑا جا سکتا ہے، اس لئے ہمیشہ ایسا موضوع اختیار کرنا چاہئے جس سے کسی کی بُرائی یا دل آزاری نہ ہوتی ہو، خواہ وہ شخص محفل میں موجود ہو یا نہ ہو۔

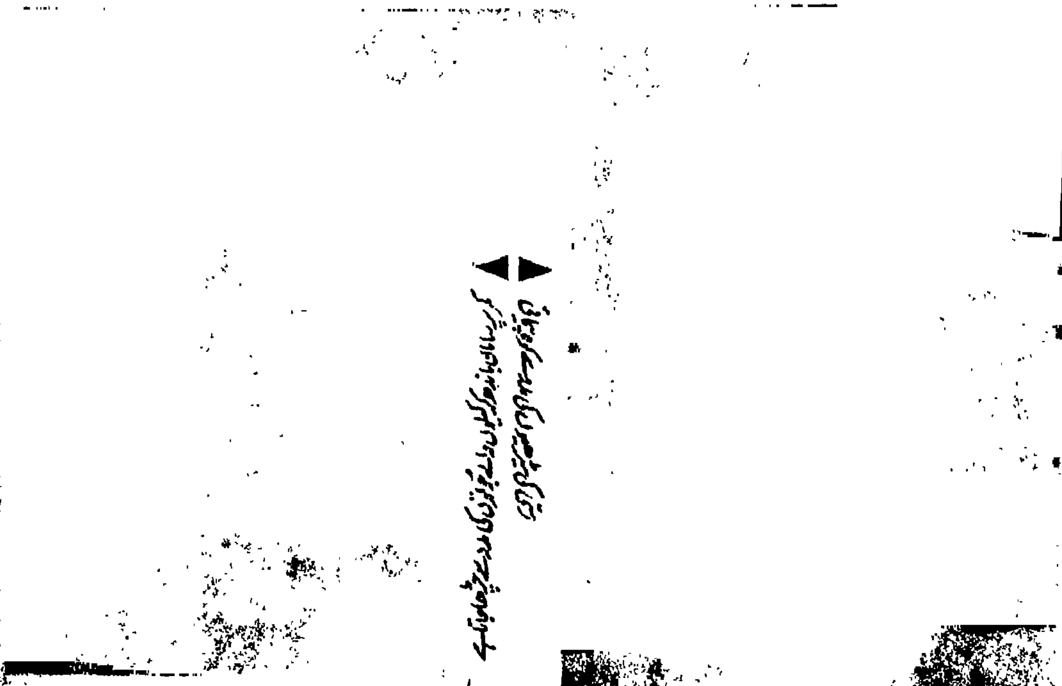
بُرے سے بُرے انسان میں بھی کہیں کوئی پہلو ضرور ایسا نظر آسکتا ہے جو قابلِ تعریف ہو۔ اگر ایسے شخص کا ذکر ضروری ہو تو صرف اس کی اچھائیوں پر نظر رکھنا یقیناً اعلیٰ ظرفی اور بلند خیالی کی نشانی ہوگی۔

کسی کے راز فاش کرنا یا افواہوں پر کان دھرنا وقتی طور پر تو دل بہلاوے کا سامان بن سکتا ہے لیکن اس کے نتیجے میں آپس کے تعلقات خراب ہو سکتے ہیں اور کئی سماجی بُرائیاں جڑ پکڑ سکتی ہیں۔

کسی کی تعریف کرنے سے دوسروں کی نظر میں آپ کی عزت اور وقعت بڑھے گی۔ اس کے برخلاف کسی کی بُرائی یا عیب جوئی سے دوسروں کے دل میں آپ کی اپنی عزت کم ہو جائے گی۔ خواہ وقتی طور پر لوگ آپ کی ہاں میں ہاں کیوں نہ ملا دیں۔

بات چیت کا موضوع ہمیشہ ایسا ہونا چاہئے جس سے محفل میں ایک خوش گوار تاثر قائم ہو سکے۔ اور آپ کے محفل سے چلے جانے کے بعد لوگ آپ کی کمی محسوس کریں۔ ایسا تاثر تب ہی چھوڑا جا سکتا ہے جب آپ اپنی زبان اور اپنے جذبات اور احساسات پر کڑا قابو رکھیں۔

زینت کوثر



▲ رسی کی سیڑھیوں کی مدد سے کوہ پیمائی

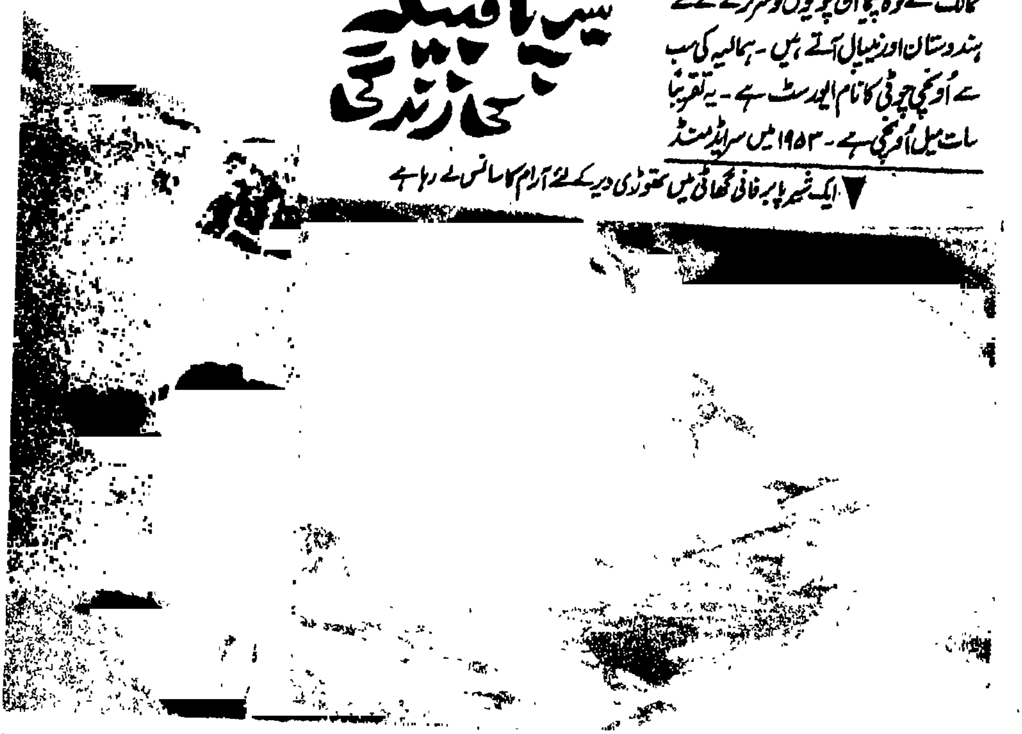
▼ کمر پر سامان باندھ کر کیلوں والے جوتوں کی مدد سے چڑھا جاتا ہے

▼ ایک کیمپ سے دوسرے کیمپ کی طرف

ایم۔ عبداللہ

شیرپا قبیلے کی زندگی

ہمالیہ کی چوٹیاں انسان کے حوصلے کو للکارتی ہیں۔ ہر سال موسم گرما میں مغربی ممالک سے کوہ پیما ان چوٹیوں کو سر کرنے کے لئے ہندوستان اور نیپال آتے ہیں۔ ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی کا نام ایورسٹ ہے۔ یہ تقریباً ساڑھے پانچ میل اونچی ہے۔ ۱۹۵۳ میں سر ایڈمنڈ



▼ ایک شیرپا برفانی گھاٹی میں تھوڑی دیر کے لئے آرام کا سانس لے رہا ہے

لاری اور شیرپا ٹین سنگھ نے یہ چوٹی سر کی تھی۔ ٹین سنگھ کی کامیابی نے شیرپا قبیلے کو ساری دنیا سے روشناس کرا دیا۔ یہ قبیلہ کوہ پیماؤں کا ساتھی ہوتا ہے۔ اور ان کے سفر کا انتظام کرتا ہے۔ شیرپا لوگ بڑے جفاکش اور حوصلہ مند ہوتے ہیں۔ یہ لوگ سخت سردی کو جھیل سکتے ہیں۔ یہ قبیلہ ہمالیہ کے دامن میں رہتا ہے۔ برف سے ڈھکی چوٹیاں ان کی نگہبانی کرتی ہیں۔ ان لوگوں کے گاؤں عموماً ۱۰ ہزار سے ۱۴ ہزار فیٹ کی اونچائی پر ہوتے ہیں۔ یہ لوگ سکم سے شمال مشرق اور شمالی نیپال میں رہتے ہیں۔

ہندوستان میں اس قبیلے کے لوگوں کو بھوٹیہ کے نام سے پکارا جاتا ہے، لیکن یہ نام انہیں پسند نہیں۔ شیرپا تہذیبی اعتبار سے تبت سے زیادہ قریب ہیں۔ ان کی زبان، لباس، مذہب تبت کے لوگوں سے ملتا جلتا ہے۔ تبت پر چین کے قبضے سے پہلے یہ لوگ تبت میں شادیاں بھی کرتے تھے۔ چین کے حملے کے بعد ان لوگوں کا تعلق ہندوستان اور نیپال کے لوگوں سے بڑھ گیا ہے۔

شیرپا علاقے میں کڑاکے کی سردی پڑتی ہے۔ جاڑوں میں ۳، ۴ فیٹ برف پڑتی ہے۔ اس موسم میں کھلے میدانوں میں نکلنا کم کرنا دشوار ہوتا ہے، اس لئے بوڑھے اپنے گھروں میں دبکے رہتے ہیں جب کہ جوان اور مضبوط جسم کے لوگ گرم علاقوں میں چلے جاتے ہیں۔ یہ لوگ سفر کے شوقین ہوتے ہیں اور گرم علاقوں میں چھوٹی موٹی تجارت سے گذارہ کرتے ہیں۔ جاڑے کی آمد سے پہلے ہی یہ اپنے مکانوں کو تالا لگا کر جنوب کی طرف نکل جاتے ہیں۔ سردی کے آخر میں

اُن کے سال کا نیا دن آتا ہے۔ یہ دراصل جاڑے سے نجات اور بہار کی آمد کا نقیب ہوتا ہے۔ ایران میں نوروز مارچ کے آخری ہفتے میں منعقد ہوتا ہے۔ ایران کی طرح شیرپا علاقے میں بھی سال کا نیا دن بڑے زور و شور سے منایا جاتا ہے۔ شیرپا لوگ ہندوستان میں کہیں بھی ہوں، نوروز پر ضرور اپنے گھر پہنچ جاتے ہیں۔ نوروز کو یہ لوگ لوسر کہتے ہیں۔ لوسر کے بعد برف پگھلنا شروع ہو جاتی ہے، پھول کھلتے ہیں اور بہار کے موسم کا آغاز ہو جاتا ہے۔

شیرپا لوگوں کا ذریعۂ معاش مویشی پالنا اور زراعت ہے۔ مویشی ان کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ یاک ایک پہاڑی جانور ہے۔ یہ بھینس کے برابر ہوتا ہے، لیکن طاقت میں گینڈے سے مشابہت رکھتا ہے۔ یہ جانور دس ہزار فیٹ یا اس سے زیادہ کی بلندی پر پایا جاتا ہے۔ یاک اور ہندوستانی گائے کی مخلوط نسل بھی بہت مشہور ہو گئی ہے۔ مخلوط نسل کے جانور یاک سے زیادہ قیمت پاتے ہیں۔ یاک کا اُون اور مکھن بہت شوق سے استعمال کئے جاتے ہیں۔ شیرپا کے لوگ تبت کے باشندوں کی طرح نمکین چائے پیتے ہیں۔ اس میں دودھ کی جگہ یاک کا مکھن ڈالا جاتا ہے۔ کوہ پیمائی شیرپا لوگوں کے لئے ایک نیا ذریعۂ معاش ہے۔ یہ لوگ مغربی کوہ پیماؤں سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بات کر لیتے ہیں۔ اب یہ لوگ باقاعدہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ایڈمنڈ ہلاری نے نامچے بازار میں شیرپا بچوں کے لئے ایک اسکول کی داغ بیل ڈالی ہے۔

شیرپا قبیلے میں شادی کی رسمیں بڑی عجیب ہیں۔ دو بھائی ایک ہی بیوی پر قناعت کرتے ہیں۔ اگر دو بھائی الگ شادی کریں، تو بھی دونوں بیویاں مشترکہ رہتی ہیں اور ایک بیوی ایک ہی مرد کی جائیداد نہیں تصور کی جاتی۔ ازدواجی معاملات میں شیرپا آزادی کے قائل ہیں۔ ان کے یہاں صرف ایک پابندی ہے جس پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔ کوئی مرد اپنی ذات میں شادی نہیں کر سکتا۔ چچا اور ماموں کی لڑکی سے شادی ممنوع ہے۔ پھوپھی اور خالہ کی لڑکی سے بھی کوئی شیرپا شادی نہیں کر سکتا۔ ایک عورت صرف دو بھائیوں کی بیوی بن سکتی ہے — اگر خاندان میں تین بھائی ہوں تو اس کا حل یہ ہے کہ پہلے اور تیسرے بھائی کی شادی ایک عورت سے ہو جاتی ہے اور منجھلا بھائی سادھو بن جاتا ہے۔ وہ بے چارہ عمر بھر کنوارہ رہتا ہے۔ شیرپا قبیلے میں تین سے زیادہ لڑکے شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں۔ چار بھائیوں کے خاندان میں پہلا اور دوسرا بھائی ایک عورت سے شادی کرتے ہیں۔ تیسرا اور چوتھا بھائی دوسری عورت سے۔ دونوں بھائی ایک ساتھ دولہا بن کر لڑکی کو بیاہنے جاتے ہیں۔ تاکہ دلہن کے مشترکہ خاوند تصور کئے جائیں۔

شیرپا مردوں کے ایک سے زیادہ شادی کرنے کا رواج بہت کم ہے۔ چھوٹے بھائی کو بڑے بھائی کی بیوی سے شادی کرنے کا حق ہوتا ہے۔ اسی طرح چھوٹی بہن کے لئے بڑی بہن کی موت کے بعد اپنے بہنوئی سے شادی کرنا لازم ہوتا ہے۔ اس کا بہنوئی اس کی مرضی کے بغیر دوسری عورت سے شادی نہیں





▲ کوہ پیما پشت پر سامان باندھ کر پہاڑ پر چڑھ رہے ہیں

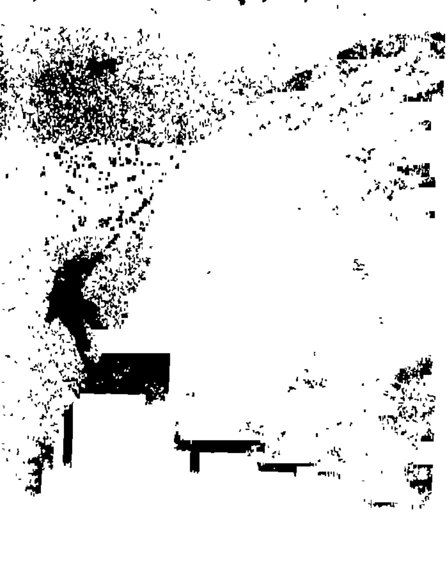
► پہاڑ کی چوٹی پر جھنڈا لہرانے کی رسم

کر سکتا۔ اگر کوئی مرد کسی دوسرے آدمی کی بیوی سے ناجائز تعلقات پیدا کرلے تو اسے مظلوم خاوند کو تاوان دینا پڑتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی عورت کسی دوسری عورت کے مرد سے

▼ کھڑی چڑھائی کو رسی کی مدد سے طے کیا جاتا ہے

▼ دو چوٹیوں کا درمیانی فاصلہ رسی کے سہارے طے کیا جا رہا ہے





آشنائی پیدا کر لے تو اس مرد کو اس مرد کی بیوی کو تاوان دینا پڑتا ہے۔

شیرپا لڑکے لڑکیاں اپنا شریکِ حیات خود چنتے ہیں، اگرچہ والدین بھی بعض اوقات یہ فرض انجام دیتے ہیں۔ شیرپا قبیلے میں شادی ایک لمبا عمل ہے۔ یہ ڈراما چار ایکٹ میں کھیلا جاتا ہے۔ پہلے ایکٹ میں لڑکے کا کوئی رشتہ دار ایک بوتل چھانگ لے کر لڑکی کے والدین کے گھر جاتا ہے۔ (چھانگ چاول کی شراب کو کہتے ہیں) اگر لڑکی کے والدین اس چھانگ کی بوتل کو ہاتھ نہ لگائیں اور شراب پینے سے انکار کر دیں تو معاملہ یہیں ختم ہو جاتا ہے اور لڑکے والا بے نیل و مرام واپس آ جاتا ہے۔ اگر لڑکی کے والدین چھانگ کا تحفہ قبول کر لیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ بیل منڈھے چڑھ گئی۔ اس ایکٹ کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ لڑکا اگر بالغ ہے تو وہ ہونے والی سسرال میں اس وقت تک راتیں بسر کرے گا جب تک ان کے یہاں بچہ نہ پیدا ہو جائے۔ اگر لڑکا پیدا ہو جائے تو سونے پر سہاگہ ہے۔ اگر اس دوران کوئی ناچاقی پیدا ہو جائے یا لڑکے لڑکی کے مزاج میں موافقت نہ ہو تو یہ ڈراما یہیں ختم ہو جاتا ہے اور لڑکا اپنے گھر واپس جاتا ہے۔ لڑکے والوں کی کوشش ہوتی ہے لڑکی کا گھر ان کے گاؤں میں ہو یا کسی قریبی گاؤں میں، تاکہ لڑکا وہاں پر رات بسر کر کے صبح کو اپنے گھر پہنچ جائے۔

جب کئی سال گزرنے کے بعد لڑکے اور لڑکی کے والدین کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ رشتہ مضبوط ہو گیا ہے اور لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے سے خوش ہیں تو اس ڈرامے کا دوسرا ایکٹ شروع ہوتا ہے۔ لڑکے کے والدین اور رشتہ دار لڑکی والوں کے گھر جاتے ہیں۔ یہ برات اکثر ۵۰ - ۶۰ انسانوں پر مشتمل ہوتی ہے، مگر اس برات میں دولہا نہیں ہوتا۔ لڑکی کے گھر والے لڑکے والوں کی خاطر مدارات کرتے ہیں۔ انہیں چھانگ پلاتے ہیں۔ چاول اور گوشت کھلاتے ہیں۔ یہ دعوت نہ صرف لڑکی کے والدین کے گھر میں ہوتی ہے بلکہ لڑکی کے رشتہ دار بھی لڑکے والوں کی دعوتیں کرتے ہیں۔ اس دعوت کے عوض لڑکے والوں کو ناچنا اور گانا پڑتا ہے۔ دعوتوں اور رقص و سرور کا یہ سلسلہ دو تین دن تک چلتا رہتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ لڑکا اور لڑکی ان ہنگاموں سے دور رہتے ہیں۔ لڑکی لاتعلق سی اپنے گھر کا کام کاج کرتی رہتی ہے۔ دو تین روز کے جشن کے بعد دولہا والے گھر واپس چلے جاتے ہیں۔ اب دوسرا ایکٹ ختم ہو جاتا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ شادی کی بات پکی ہو گئی۔

دوسرے ایکٹ کے بعد کئی مہینے گزر جاتے ہیں تو تیسرا ایکٹ شروع ہو جاتا ہے۔ اب لڑکے والوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ لڑکی کو اپنے گھر لے آئیں گے۔ لڑکے والے پھر برات لے کر لڑکی کے گھر جاتے ہیں۔ دوسرے اور تیسرے ایکٹ میں یہ فرق ہے کہ اس میں شادی کی رسم بھی ادا کی جاتی ہے۔ ایک دن اور ایک رات شراب کا دور چلتا ہے۔ چاول اور گوشت کی دعوت ہوتی ہے۔ رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوتی ہیں۔ شادی کی رسم یہ ہے کہ دولہا اور دلہن کی پیشانی پر مکھن کا ٹیکہ لگایا جاتا ہے۔ اب گویا شادی مکمل ہو گئی۔ دلہن رخصتی کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔ لڑکی کے والدین اُسے جہیز دے کر رخصت کرتے ہیں۔ والدین کے علاوہ لڑکی کے رشتہ داروں سے بھی یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ لڑکی کے جہیز میں کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور کریں۔ جہیز میں عموماً اونی قالین، نمدے، یاک کے اون کی چٹائی اور بعض اوقات مویشی بھی شامل ہوتے ہیں۔

چوتھا ایکٹ اور آخری ایکٹ دولہا کے گھر پہنچنے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اب لڑکے کی سماجی حیثیت اونچی ہو چکی ہے۔ اب وہ اپنے نام سے نہیں پکارا جاتا بلکہ اپنے لڑکے کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ مثلاً شمبو کا باپ یا نرملا کا باپ۔ دلہن کو گھر میں لانے سے پہلے یہ اشد ضروری ہے کہ اس کے بچہ پیدا ہو چکا ہو۔ بچہ پیدا نہ ہو تو انسان کی سماجی حیثیت بلند نہیں ہوتی۔

شیرپا صلح پسند ہوتے ہیں۔ وہ کسی جانور کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارتے۔ گو جانوروں کا گوشت پکانے اور کھانے میں انہیں کوئی عار نہیں۔ بعض اوقات مغربی کوہ پیماؤں کے ساتھ سفر میں انہیں مرغ کاٹنے کے لئے کہا جاتا ہے وہ صاف انکار کر دیتے ہیں۔ یورپین کوہ پیماؤں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ وہ مرغ کا گوشت تو بڑے شوق سے کھاتے ہیں، لیکن اُسے کاٹتے وقت اُن پر احساسِ گناہ طاری ہو جاتا ہے۔ اُن کے جانوروں کو ذبح کرنے کے لئے تبت سے قصائی آتے ہیں۔ یہ قصائی سال میں ایک بار آتے ہیں اور بوڑھے اور ناکارہ جانوروں کو کاٹ کر واپس چلے جاتے ہیں۔



بنو خالہ

مسرور جہاں

بنو خالہ کو اچانک گھر میں داخل ہوتے
دیکھ کر میں مارے خوشی کے چلّا پڑی۔ بنو خالہ نے
سے لپٹے کی چادر اُتار کر تخت پر رکھی۔ مجھ سے
گلاس پانی مانگ کر پیا۔ تب جا کر اُن کے
سں ذرا درست ہوئے۔

اتنے میں امّاں بھی کچن سے نکل کر آگئی
تھیں۔ اُنہیں دیکھ کر پوچھا "اے ہے بنو،
پرسوں تو تمہارا خط آیا تھا کہ عید کے
آؤ گی۔ اب اچانک کیسے آگئیں؟"

"ہاں باجی لکھا تو تھا۔ وہ مگوڑے
نجمہ کے ابّا نے کل مجھے اڑتیس روپے دئے
کہ جا کر بازار سے ڈالڈا کا ٹین لے آؤ۔ تم
جانو باجی کہ ڈالڈا آج کل بازار سے عنقا
ہو رہا ہے۔ جب کبھی بازار میں دس پانچ
ٹین دکھائی دے جاتے ہیں، وہ کشمکش پڑتی
ہے کہ خدا کی پناہ۔ عورتیں مردوں پر اور
مردوے عورتوں پہ — پھر دلّی کی پنجابی
اور سندھی عورتیں تو دھکا پیل میں مردوں
کے بھی کان کاٹتے ہیں۔ ارے اُن کے ہاتھ
کے ایک ہی دھکے سے کرارے سا کرارہ مرد
بھی دُور جا پڑتے ہے۔ بس تو میں ڈالڈا
لینے بازار گئی۔ ایک گھنٹہ لائن میں کھڑی رہی۔
لیکن ایک گھنٹہ کی تپسیا کے بعد جو غور کیا تو میں
آگے بڑھنے کی بجائے دُکان سے اور دُور
ہو گئی تھی۔ قطار میں کتنی ہی نئی عورتیں
گھس آئی تھیں۔ وہ آپا دھاپی مچی تھی کہ اللہ
دے اور بندہ لے۔ بس بھیّا میں نے تو کھینچ
کھانچ کر خود کو عورتوں کی یلغار سے نکالا اور
بھنّائی ہوئی سیدھی اسٹیشن پہنچ گئی۔"

"اے ہے بنو، خدا کی سنوار تمہاری
حرکتوں پہ — گھر سے نکلیں ڈالڈا لینے اور
پہنچ گئیں لکھنؤ — میاں غریب تم کو ڈھونڈتا
پھر رہا ہوگا؟ بچّے الگ پریشان ہوں گے۔"
امّاں نے سینے پر دو ہتڑ مار کر فریاد کی۔

"ارے باجی، آپ بھی کیسی باتیں
کرتی ہیں۔ گھر نہ پہنچوں گی تو وہ اپنے
آپ ہی سمجھ جائیں گے کہ میں لکھنؤ چلی گئی اور
بچّے بھی کون سا دودھ پیتے ہیں۔ خیر سے
سیانے ہیں۔ بس آپ شنّو سے ایک کارڈ
لکھوا کر ڈال دیجئے۔ چھٹّی ہوئی۔"

بنو خالہ نے ناشتے کی سینی اپنے سامنے
کھسکائی اور روغنی ٹکیہ اور انڈا نوش فرمانے
لگیں۔

"اے واہ! کیسی اچھی خوشبو ہے۔
دیسی گھی میں ٹکیاں پکی ہیں۔ وہاں دلّی والے
تو مُردار ڈالڈے کے نام پر موبل آئل تک
کھلا دیں ہیں۔ کم بخت چوٹٹے، بے ایمان۔
میں نے لاکھ بار کہا کہ دلّی سے تو اپنا لکھنؤ ہزار
درجہ اچھا ہے۔ لیکن وہ نجمہ کے ابّا کب مانے
ہیں۔"

بنو خالہ نے ناشتہ کیا۔ دو کپ چائے
کے پئے اور پھر اپنی چادر سرہانے رکھ کر اطمینان
سے لیٹ رہیں۔ میں نے تکیہ لا کر دیا تو مُندی
مُندی آنکھیں بڑی الکسی سے کھول کر کہنے
لگیں "شنّو، آج ہی ایک کارڈ لکھ کر اپنے
خالو کو ڈال دے۔ رات بھر ریل کی چھک
چھک بھک بھک میں نیند ہی نہیں آئی۔"

"بنو خالہ، آج تو اتوار ہے۔ کل ڈاک
نکلے گی۔" میں نے کہا۔

"اچھا اچھا —" اور بنو خالہ خرّاٹے
لینے لگیں۔

بنو خالہ میری امّاں کی رشتے کی بہن
ہیں۔ ان کے اپنے بہن بھائی تو سب پاکستان
چلے گئے۔ لیکن بنو خالہ نے جانے سے صاف

انکار کر دیا۔ دراصل پندرہ سال قبل اُن کی پھلوٹھی کی لڑکی رئیسہ چھ سال کی عمر میں کھو گئی تھی، جب ہی سے یہ ذرا سنکی ہو گئی ہو گئی تھیں۔ پاکستان جانے سے بھی انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ اگر کبھی رئیسہ گھر واپس آئی تو میں نہ ملی تو غریب کیسا تڑپے گی۔ حالانکہ نہ رئیسہ ملی اور نہ اُس کی کوئی خیر خبر ہی معلوم ہوئی۔ بس بے چاری بنّو خالہ عزیزوں کی جدائی کا داغ دل پر لئے تکلیفیں جھیلتی رہیں۔ اُن کے میاں درزی کا کام کرتے تھے۔ کئی سال پریشانی میں گزرے تو وہ سب کو لے کر دہلی چلے گئے۔ بنّو خالہ اوّل تو جانے پر راضی ہی نہ تھیں۔ بہت سمجھانے بجھانے کے بعد راضی بھی ہوئیں تو اس شرط پر کہ جب اُن کا جی چاہے گا، لکھنؤ چلی آئیں گی۔ میاں نے یہ سوچ کر وعدہ کر لیا تھا کہ سیدھی سادی سنکی بنّو خالہ کے بس کی بات کہاں کہ اکیلے اتنا لمبا سفر کر لیں۔ لیکن بنّو خالہ تو بس اپنے کام کی بنّو خالہ تھیں۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ کسی کام سے گھر سے نکلتیں اور پھر وہ گھر واپس جانے کی بجائے ٹرین میں بیٹھ جاتیں۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا اُن کی بے پروائی اور اطمینان دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ وہ شوہر اور بچوں کو بتائے بغیر چلی آئی ہیں۔ دوپہر تک اسی تخت پر پڑی سوتی رہیں۔

بنّو خالہ نے برقعہ اوڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ اب اس کی جگہ لٹھے کی سفید چادر اوڑھتی تھیں۔ غرارے کی بجائے شلوار قمیص پہننے لگی تھیں۔ اونچے قد اور مضبوط ہاتھ پاؤں کی بنّو خالہ اس لباس میں پٹھان یا افغان عورت لگتی تھیں۔

شام کو بنّو خالہ عزیزوں سے ملنے جو گئیں تو کئی دن لاپتہ رہیں۔ امّاں صبح و شام اُن کی منتظر رہتی تھیں۔ حد ہے کہ جب خالو نجمہ اور شاہد کے ساتھ چوتھے دن گھبرائے بوکھلائے ہمارے گھر آئے تو خود ہمیں بنّو خالہ کا پتہ نشان نہیں معلوم تھا۔ خالو نے بتایا کہ دو دن تو وہ ساری دہلی کی خاک چھانتے پھرے۔ پولیس میں رپورٹ لکھائی۔ پھر تھک ہار کر سوچا کہ چل کر لکھنؤ میں دیکھیں، شاید چلی ہی گئی ہوں۔ میرا پوسٹ کارڈ بھی اُن کو نہیں ملا —— امّاں خالو کی پریشانی کا حال سن کر بنّو خالہ کو باتیں سنانے لگیں اور بے چارے خالو، نجمہ اور شاہد کو ہمارے پاس چھوڑ کر عزیزوں میں بنّو خالہ کو تلاش کرنے چلے گئے۔

بڑی بھاگ دوڑ کے بعد وہ انہیں مُتّن ماموں کے گھر پر ملیں اور خالو کو دیکھ کر اُلٹا اُن سے ہی اُلجھ پڑیں کہ وہ ان کو ڈھونڈنے کیوں چلے آئے۔ اور جب پتہ چلا کہ بچّے بھی آئے ہیں تو بھی جھکی واپس آئیں اور لوٹھا کی لوٹھا نجمہ اور تاڑ کے تاڑ شاہد کو گلے سے لگا کر ایسا پھپھک پھپھک کر روئیں کہ جیسے دنیا کی ساری مائیں تو جلّاد ہیں اور ایک بس یہی ممتا والی ماں ہیں۔ امّاں تو ان کی اس دھاندلی پر جل بھن کر رہ گئیں اور اُن کو الگ کرتے ہوئے بڑبڑائیں

"اے بی، جب ان بچّوں کو چھوڑ کر چلی آئی تھیں، اُس وقت نہ سوچا تھا کہ غریب ہلکان پریشان ہوں گے۔ اب ممتا پھڑ پھڑا رہی ہے"

"اے باجی ممتانہ پھڑپھڑاتی تو مُتّن بھائی کے ہاں سے کیوں آتی۔ اب سوچ رہی ہوں کہ بے کار ہی دہلی سے چلی آئی۔ وہ نگوڑا ڈالڈا بھی ہاتھ سے گیا اور مفت میں بچّے بھی ہلکان ہوئے۔ خدا کی سنوار ہو ان پنجابیوں اور سندھیوں پر جنہوں نے دھکیل دھکال کر پیچھے کر دیا۔ ورنہ آرام سے ڈالڈا لے کر گھر چلی جاتی ..." وغیرہ

خالو کام کے حرج کی وجہ سے نہیں رُکے۔ بنّو خالہ کے پاس بچّوں کو چھوڑ کر دہلی روانہ ہو گئے۔ اور بنّو خالہ بچّوں کے ساتھ خاندان بھر میں گھومتی پھریں۔ اور پھر لوٹ کر ہمارے گھر نہیں آئیں۔ ایک دن مُتّن ماموں نے آکر بتایا کہ وہ شاہد کو ساتھ لے کر دہلی چلی گئی ہیں اور نجمہ کو چھوڑ گئی ہیں کہ اسے ذرا کچھ ہنر سلیقہ سکھا دو۔ چار روز میں پرائے گھر جائے گی تو کیا کرے گی؟ اب نجمہ مُتّن ماموں کی لڑکی سے آری زردوزی بنانا سیکھنے لگی۔

نجمہ کو مُتّن ماموں کے گھر چھوڑنے کے بعد بنّو خالہ نے ڈیڑھ سال تک اس کی کوئی خیر خبر نہ لی۔ جب بھی اُن کو خط لکھا جاتا، خالو کا کبھی جواب آتا کہ وہ الہ آباد گئی ہیں، کبھی یہ لکھا ہوتا کہ آگرہ گئی ہیں —— بنّو خالہ کی سیلانی طبیعت ان کو ایک جگہ ٹکنے ہی کب دیتی تھی۔

ایک دن مُتّن ماموں نے آکر امّاں سے کہا کہ بنّو کو خط لکھ دو کہ نجمہ کی بات طے ہو گئی ہے، آکر دو بول پڑھوا دیں۔ سیانی لڑکی کو کہاں تک بٹھائے رہیں گے۔ اگر کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو بنّو سب سے پہلے آکر اُن ہی کی داڑھی پکڑیں گی —— حالانکہ مُتّن خالو داڑھی نہیں رکھتے تھے۔

ورنہ یہ جملہ انہوں نے محاورے کے طور پہ ہی کہا تھا۔

اماں نے مجھ سے خط لکھوا کر بنّو خالہ کو بھیج دیا۔ ایک ہفتے کے بعد بنّو خالہ آدھمکیں ہمیشہ کی طرح خالی ہاتھ اور بے سروسامان۔ لیکن بیٹی کی شادی کی خبر سے بے حد مسرور تھیں۔

اماں نے پوچھا "بنّو، تم کو نجمہ کی شادی کی اطلاع ملی، لیکن یوں ہی خالی ہاتھ چلی آئیں۔ آخر بیٹی کی شادی ہے کچھ تو انتظام کرنا ہوگا۔"

"ہاں باجی، یہ بات تو آپ نے ٹھیک بتائی۔ میں آج ہی نجمہ کے ابا کو خط لکھتی ہوں کہ روپیہ بھیج دیں۔"

خالو نے تین سو روپے منی آرڈر سے بھیج دئے۔ روپے ملے تو خالہ بھنّا گئیں۔ "جھاڑو پٹے مردوئے کی عقل پہ لو، بیٹی کی شادی کے لئے تین سو روپلی بھیجے ہیں۔ قسم ہے اپنے مرے ہوتے ماں باپ کی جو میں اس سے زیادہ ایک کوڑی بھی خرچ کروں۔ اسی میں پوری شادی کر دوں گی۔"

اور پھر بنّو خالہ اسی دن پُتّن ماموں کے گھر چلی گئیں اور جاتے جاتے کہہ گئیں کہ دن تاریخ طے ہو جائے تو کہلوا دوں گی۔ سب لوگ شادی میں ضرور آئیں۔ اماں نجمہ کے نیک نصیبے کی دعا مانگتی ہی رہ گئیں۔ اور بنّو خالہ شاہد کا ہاتھ پکڑ کر ڈیوڑھی پھلانگ گئیں۔

ایک روز پُتّن ماموں نے آکر بتایا کہ کل نجمہ کا مغرب بعد عقد ہے۔

اماں نے نجمہ کو دینے کے لئے دو جوڑے رکھے تھے اور کچھ برتن بھی قلعی کرا رکھے تھے۔ میں نے چادر اور تکیہ غلاف کا ایک سیٹ کاڑھا تھا، وہ بھی نجمہ کے لئے نکال کر سامان میں شامل کیا۔ دوسرے دن ہم لوگ لدے پھندے پُتّن ماموں کے گھر پہنچے۔

بنّو خالہ کھرّی چارپائی پر پڑی سو رہی تھیں۔ نجمہ بیٹھی مسالہ پیس رہی تھی۔ نہ کہیں فرش بچھا تھا نہ مہمان تھے۔ گھر میں شادی جیسی کوئی بات نظر نہیں آ رہی تھی — سوا اس کے کہ پُتّن ماموں کے چھ بچے نہائے دھوئے اُجلے کپڑوں میں ملبوس اُچھل کود رہے تھے اور طوفانِ بدتمیزی برپا کر رہے تھے۔

اماں نے خالہ کو جگایا، نجمہ کو سل پر سے اُٹھایا اور اُس کو نہلا دھلا کر ایک کنارے پلنگ پر بٹھایا۔ میں نے مہندی پیس کر اُس کے ہاتھوں پیروں میں لگائی۔ اتنی دیر میں اماں نے اندر کے دالان اور باہر کے کمرے میں فرش بچھوایا، کچھ پان بنائے اور چھ بجے سے بارات کا انتظار شروع ہو گیا۔ رات کے نو بج گئے، لیکن بارات کو نہ آنا تھا نہ آئی۔ بنّو خالہ بڑبڑاتی جاتی تھیں اور کھٹر پٹر کرتی پھر رہی تھیں۔ پُتّن ماموں کے لڑکے کو دولہا والوں کے گھر دوڑایا گیا تو وہاں سے جواب آیا "نہ دولہا کا جوڑا آیا نہ سہرا ابھی۔ برات کیا خاک آتی۔"

"ارے ان خدائی خواروں نے کیا چوتھلیے ایمان سمجھا ہے ہمیں؟ جوڑا سہرا کیا ہم کھا جائیں گے۔ اے برات تو لے آتے۔ میری عقل پر تو جھاڑو پھری ہے۔ سارا سامان رکھ کر بھول گئی۔ جاؤ اور لے جا کر اُن کے مونہہ پر دے مارو اور کہو کہ اب آ جائیں اپنے موتوں سوتوں کی برات لے کر۔"

لڑکے کو سامان لے کر دوڑایا گیا۔ تب کہیں جا کر رات کو دس بجے بارات آئی۔ برات کیا تھی ٹوٹی ماری پانچ عورتیں تھیں اور چھ سات مرد۔ سمدھنوں کا سُرخی پوڈر اُتر گیا تھا۔ بے چاریاں آتے کے ساتھ ہی جماہیاں لینے لگیں۔ ماموں مولوی کو بلانے گئے تو مولوی نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ آدھی رات کو اتنے جاڑے پالے میں نکاح پڑھانے نہیں جائیں گے۔ صبح کو دیکھا جائے گا۔

بنّو خالہ نے سُنا تو چراغ پا ہو گئیں۔

"اے، اور لو، خدا کی شان ان مولویوں کو بھی دن لگے ہیں۔ ایسی تیسی ان مولویوں کی۔ خدا کی قسم میں نجمہ کو بے نکاح کے رخصت کر دوں گی۔ جب جی چاہے گا سسرال والے خود ہی نکاح پڑھوا دیں گے۔"

بنّو خالہ ایک دم آؤٹ ہو گئیں۔

اماں نے سمجھا بجھا کر انہیں ٹھنڈا کیا "بنّو، براتی بے چارے سردی میں ٹھٹھر رہے ہیں۔ کچھ چائے وائے کا بھی انتظام کیا ہے؟"

"باجی، میں نے تو سارے دودھ کا شربت بنا ڈالا۔ نجمہ کے ابا کے ہاں رسم ہے کہ نکاح کے بعد براتیوں کو دودھ کا شربت دیا جاتا ہے، پھر کھانا کھلایا جاتا ہے۔ تو جب تک نکاح نہ ہو جائے، شربت پلائی کی رسم نہ ہو جائے ہم انہیں کچھ بھی نہیں کھلا پلا سکتے۔ ویسے خدا کا شکر ہے کہ نہاری بھی رکھی ہے اور روٹیاں بھی دھری ہیں۔"

"تو کیا براتی ساری رات بھوکے رہیں گے۔ نکاح تو صبح سے پہلے ہونے سے

رہا۔" اماں بُڑبُڑ ہو کر بولیں۔

"مجبوری ہے باجی۔" بنّو خالہ نے جواب دیا۔

امّاں نے اُن کی ذرا بھی پروانہ کی۔ دودھ شربت چولہے پر کھولا کر اس میں چائے کی پتی ڈالی۔ اور مہمانوں کو گرم گرم چائے پلائی۔ بنّو خالہ ساری رات ڈھولک پر سہرے، رخصتی گاتی رہیں۔ جیسے شادی اُن کی بیٹی کی نہ ہو کسی محلّے کی لڑکی کی ہو۔ مزہ یہ کہ بے چاری سمدھنوں کو بھی اپنے ساتھ گانے میں لگالیا۔

فجر کی نماز کے بعد عقد ہوا۔ نیچے کچھے شربت کو چکھا کر رسم ادا کی گئی۔ پھر بنّو خالہ نے چولہا جلا کر رات کی ٹھنڈی بنی ہوئی نہاری چولہے پر چڑھادی۔ یہ انتظام دیکھ کر امّاں نے پوچھا کہ صبح صبح نہاری کیوں گرم ہو رہی ہے؟"

"باجی، بے چارے مہمان رات سے بھوکے ہیں۔ اب کھانا کھلا دوں۔ تب بچّی کو رخصت کروں۔"

نجمہ رخصت ہوگئی تو امّاں بھی رکشا بُلوا کر چلنے کو تیار ہوگئیں۔ بنّو خالہ لاکھ لاکھ روکتی رہیں کہ نہاری روٹی کھا کر جائیے، لیکن امّاں نے ایک نہ سنی اور گھر چلی آئیں۔

بنّو خالہ دہلی روانہ ہو رہی تھیں تو امّاں سے ملنے آئیں۔ امّاں نے اُن سے پوچھا۔ "بنّو، نجمہ کی شادی میں کتنا روپیہ خرچ کیا؟"

"دوسو ساٹھ روپے خرچ کئے۔ چالیس روپے کرائے کے لئے بچالئے۔"

"شاباش بڑا اچھا انتظام کیا۔" امّاں نے ہنس کر داد دی۔ بنّو خالہ نے بھی ہنس کر داد وصول کی اور دہلی روانہ ہوگئیں۔

ایک دن اچانک ایک عورت ہمارے گھر آئی، اُس نے امّاں کو بتایا کہ وہ بنّو خالہ کی لڑکی رئیسہ ہے۔

ہم سب لوگ حیران تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ رئیسہ تو بیس اکیس سال پہلے کھوگئی تھی۔ استفسار پر اُس نے اپنا پورا واقعہ سنایا کہ کس طرح رکاب گنج سے اُسے ایک آدمی بہلا پھسلا کر لے گیا۔ پھر ایک آشرم میں رکھا گیا، جہاں اُس کی طرح اور بھی بچّے تھے۔ پھر اُسے نیپال لے جا کر بیچ ڈالا گیا۔ جس آدمی نے اُسے خریدا تھا، اُس نے اپنے لڑکے کے ساتھ اُس کی شادی کردی۔ اب اس کے چار بچّے ہیں۔"

اپنی داستان ختم کر کے وہ بے چاری دھواں دھار رونے لگی۔ ہمیں یقین آگیا کہ یہ بنّو خالہ کی لڑکی رئیسہ ہی ہے۔ اسی وقت بنّو خالہ کو تار دے دیا گیا۔ ہم نے رئیسہ کو بڑی دلجوئی اور آرام سے رکھا۔

بنّو خالہ آئیں تو رئیسہ کو دیکھ کر پچھاڑ کھا گئیں۔ پھر گلے سے لگا کر اتنا روئیں کہ ہم سب بھی رو دئے۔ ایک بار پھر رئیسہ نے اپنی داستان سنائی جسے سن کر بنّو خالہ اُسے لپٹا کر دیر تک روتی رہیں۔ لگتا تھا کہ اب وہ رئیسہ کو ساری زندگی اسی طرح جکڑے رہیں گی۔

ذرا حواس درست ہوئی تو رئیسہ نے کہا "امّاں، اب میں تمہارے پاس ہی رہوں گی۔ اب میں اس کفرستان میں واپس نہیں جاؤں گی۔ کم بخت سب کافر ہیں۔ میں بچّوں کو بھی چھوڑ دوں گی۔" رئیسہ نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"اری تو کیا تیرا میاں ہندو ہے؟"

بنّو خالہ رئیسہ سے اس طرح دور سرکیں، جیسے وہ ابھی تک کسی نجس چیز کو لپٹائے ہوئے تھیں۔

"ہاں امّاں۔" رئیسہ نے اقرار کیا۔

"تو بھی اتنے دن ہندو رہی؟"

"کیا کرتی ... مجبور تھی؟"

"اری مُردار، جان تو دے سکتی تھی۔" بنّو خالہ نے دوہتڑ مار کر کہا۔

"امّاں ... جان بڑی پیاری ہوتی ہے۔" رئیسہ پھپھک پھپھک کر رو دی۔

"اور اب بچّوں کو بھی چھوڑ دے گی؟ تو اتنی ظالم ہوگئی ہے رئیسہ۔ ارے میں اکیس سال تیری محبت میں تڑپتی رہی۔ اری تو سچ مچ کافر ہوگئی ہے۔ خبردار، جو میرے پاس رُکنے کی ہمت کی۔ جا لوٹ جا، اب تیری گذر میرے پاس نہیں ہوگی۔"

اور بنّو خالہ اکیس سال کی بچھڑی لڑکی کو اکیس گھنٹے بھی برداشت نہ کر سکیں اور اُسی وقت دہلی کے لئے سوار ہوگئیں۔ شاید آج اُن کا انتظار دم توڑ چکا تھا۔ وہ تو اپنی اُسی رئیسہ کی منتظر تھیں جو چھ سال کی چھوٹی سی بچّی تھی اور ہل ہل کر بالکل اُن ہی کے سے انداز میں نماز پڑھتی تھی۔ اب اُسے اپنے خیالوں کے برعکس دیکھ کر وہ اُسے قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھیں۔

بنّو خالہ کے جانے پر رئیسہ ایسا بلک بلک کر روئی جیسے وہی اُن کی ماں ہو اور اب وہ اُن سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ رہی ہو۔ اُسی رات رئیسہ بھی نیپال روانہ ہوگئی، کبھی لوٹ کر نہ آنے کے لئے۔

ماں

تھا تیرا ہمارے سر پہ
ن تھی جواں
م جانبِ منزل تھا رواں
دم کے لئے روشنی خود بڑھتی چلی آتی تھی

یں چیز ہے کیا؟
بس دو قدم میرے تھے
ی تیری دعاؤں کی مجھے
منزل کی دکھاتی تھی سدا
دامن کی ہوا
نستا
بادِ صبا
وزش کہ صد راحتِ جاں
ں بچپن میرا ہوتا تھا جواں
جوانی پہ بھی ہوتا تھا لڑکپن کا گماں

تِ شوق مری
ال میری تمناؤں کی
کی طرح ہمیشہ تو سلگتی ہی رہی
میں اپنی تو جلتی ہی رہی
کے شعلوں کی لپک سے بھی مگر ہم کو بچایا تو نے
ل اپنا دکھایا نہ ہمیں
درد سنایا نہ ہمیں
دتی ہوئی آنکھوں کو چھپایا ہم سے

شوق مری
ے گھر سے کچھ اس طرح گئی

بوئے گل جیسے چمن سے جائے
مشک جس طرح ختن سے جائے
کون اب موجِ حوادث کے تھپیڑوں سے بچائے گا مجھے؟

اب نظر کس کی رہے گی مری خاطر در پر؟
منتظر کون رہے گا مرے اک خط کے لئے؟
کس کے لب پھول دعاؤں کے کھلائیں گے اب؟
حوصلہ جینے کا اب کس کی نظر دے گی مجھے؟

ماں،
اب مری آنکھ سدا خاک میں خوں بوتی رہے گی یوں ہی
زندگی حسنِ نمو کھوتی رہے گی یوں ہی!

علقمہ شبلی



اور مسلمان قیدیوں کے لئے نماز باجماعت کا انتظام کیا
جس طرح ہر برائی میں اچھائی کا عنصر پوشیدہ ہوتا ہے
اسی طرح جیل کی چار دیواری ہندو مسلم ملاپ کا سبب
بن گئی۔ جماعتِ اسلامی اور جن سنگھ کے لیڈر ایک
دوسرے کے قریب آگئے۔ انہوں نے ایک دوسرے
کا نزدیک سے مطالعہ کیا۔ برسوں کی غلط فہمیاں
دور ہوگئیں۔ سابق حکومت کے پروپیگنڈے کا بھانڈا
پھوٹ گیا۔ جن سنگھ کے لیڈر اٹل بہاری باجپئی نے
جامع مسجد کے ایک جلسہ میں شاہی امام سید عبداللہ
بخاری کو گلے لگا لیا۔ ہندو مسلم اتحاد کے نعرے بلند
ہوئے۔ یہ اتحاد جو خلافت کی تحریک کے ختم ہو جانے
پر ٹوٹ گیا تھا، پھر زندہ ہو گیا۔ ہندوؤں اور
مسلمانوں نے مل کر حکومت کے خلاف
آواز اٹھائی۔ اور نتیجے میں کانگریس کو
شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

خورشید دلی کی رہنے والی ہیں۔ اُن
کے والد ڈاکٹر حبیب اللہ دلی کے ہیلتھ
آفیسر تھے۔ وہ دریا گنج میں رہتے تھے۔
خورشید نے ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی۔
۱۹۴۷ کے فسادات کی وجہ سے اُن کی تعلیم
کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ انہوں نے جامعہ
سے پرائیویٹ میٹرک کا امتحان پاس کیا
اُس کے بعد اُن کی شادی ہو گئی۔ وہ علی گڑھ
سے بی اے کرنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے
امتحان کی تیاری کی، بی اے کے دو پرچے
بھی کئے، لیکن پھر ایک ذاتی مجبوری کی
وجہ سے وہ تمام پرچے مکمل نہیں کر سکیں۔
اس زمانے میں عورتوں کی ملازمت کو
اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ مسلمانوں
میں تعلیم کی کمی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔
بیشتر مرد بھی تعلیم سے بے بہرہ رہتے ہیں
عورتیں بے چاری کس گنتی میں آتی ہیں۔
خورشید نے اپنی دو بہنوں کے ساتھ مل کر
تعلیم نسواں کا بیڑا اٹھایا۔ انہوں نے دلی
میں تین تعلیمی سنٹر کھولے۔ جامع مسجد کے
مرکز کی بنا مرحوم شفیق الرحمٰن قدوائی
کی بیگم نے رکھی۔ اس مرکز میں بچیوں کی تعلیم
کے علاوہ تعلیم بالغان کا انتظام بھی تھا۔
اس اسکول میں پرائمری تک تعلیم کا انتظام تھا
صبح سے دوپہر تک بچیاں تعلیم حاصل کرتیں
دوپہر کو بڑی عمر کی لڑکیاں اور عورتیں آجاتیں
یہاں انہیں پڑھنے لکھنے کے علاوہ سینا پرونا
اور کشیدہ کاری بھی سکھائی جاتی۔ کئی سال
تک خورشید قدوائی اس مرکز کو کامیابی
سے چلاتی رہیں، پھر چند مجبوریوں کی بنا پر انہیں
یہ مرکز چھوڑنا پڑا۔ آج کل اسے حبیبہ قدوائی
چلا رہی ہیں۔

خورشید کی سرگرمیوں کا مرکز

ابتدا میں تعلیم نسواں تھا۔ وہ عملی سیاست
سے الگ تھلگ رہتی تھیں۔ شادی کے بعد
اُن کو عملی سیاست میں حصہ لینا پڑا۔ سیاست
قدوائی خاندان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اُن
کے خاوند عتیق الرحمٰن قدوائی سوشلسٹ پارٹی
کے رکن تھے۔ وہ مرحوم ڈاکٹر منوہر لوہیا کے
ساتھ کام کرتے تھے۔ اس زمانے میں دلی
کے مشہور لیڈر میر مشتاق احمد بھی سوشلسٹ
پارٹی کے رکن تھے۔ ڈاکٹر لوہیا کے انتقال
کے بعد سوشلسٹ پارٹی کے دو ٹکڑے
ہوگئے۔ اس افراتفری میں خورشید اور
عتیق الرحمٰن نے سوشلسٹ پارٹی سے استعفیٰ
دے دیا اور جن سنگھ میں شامل ہوگئے۔ وہ
اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر اس نتیجہ
جن سنگھ کو نظر انداز نہیں کیا
جن سنگھ کی اہمیت کا اندازہ اس
لگایا جا سکتا ہے کہ ایک بار ڈاکٹر
اپنے انتخاب کے سلسلے میں جن س
مدد لینا پڑی تھی۔ سوشلسٹ پارٹی ا
کے نصب العین میں بہت فرق
وقت جارج فرنانڈیس نے ڈاکٹر لو
مخالفت کی تھی۔ جارج فرنانڈیس
مشہور سوشلسٹ ہیں۔ وہ آج کل مر
کابینہ میں وزیر ہیں۔ لوہیا فرنانڈیس
سے متفق تھے کہ جن سنگھ ایک فرق
جماعت ہے۔ اور انہیں اس پارٹی
سے الیکشن لڑنا زیب نہیں دیتا، لی
مجبور تھے۔ جن سنگھ کی مدد کے بغیر
الیکشن ہار جاتے۔ یہ مدد ایک خاموش
کے تحت لی گئی۔ خورشید اور عتیق ال
کو یہ بات ناپسند تھی۔ دونوں میاں بی
اس دوغلے پن کے خلاف ہو گئے۔ جب
میں ایک پارٹی کی مدد کے بغیر کام نہ
سکتا تو ظاہر ہے اس کی مخالفت کیا م
رکھتی ہے؟ یہ ریاکاری ہے، عوام کو
دینا ہے۔ اس خفیہ کارروائی سے
کہ آدمی سیدھا جن سنگھ میں شامل ہو
اس وجہ سے دونوں میاں بیو
میں شامل ہو گئے۔ انہیں اس پا
شامل ہوئے گیارہ سال گذر چ
گذشتہ دنوں جے پرکاش ن
کی رہنمائی میں وزارت برطرف کر
تحریک اٹھی۔ اس تحریک کا پہلا نشا
گجرات تھا۔ نتیجہ میں گجرات کی اسمبلی

دی گئی ہے۔ انتخابات ہوئے۔ خورشید اُس زمانے میں آل انڈیا جن سنگھ کی ورکنگ کمیٹی کی ممبر تھیں۔ لوگوں نے ان پر اعتراضات کی بوچھار کر دی۔ خورشید کے پاس ان اعتراضات کا ایک ہی جواب تھا۔ اعتراض کرنے والوں کو انہوں نے یہی مشورہ دیا کہ جن سنگھ کا منشور پڑھیں۔ اس منشور میں یہ بات کہیں نہیں لکھی ہوئی ہے کہ مسلمان اس جماعت میں شریک نہیں ہو سکتے۔ یہ بات غلط ہے کہ یہ جماعت خالص ہندو جماعت ہے۔ مسلمان جن سنگھ سے خائف ہیں۔ وہ اس سے دُور دُور رہتے ہیں۔ یہی ناواقفیت ان کے اعتراض کا سبب ہے۔ جب تک ایک انسان کسی جماعت میں شامل نہیں ہوگا، اس کا منشور نہیں پڑھے گا اس کے ممبروں سے ربط ضبط نہیں بڑھائے گا وہ اس جماعت سے کیسے واقفیت حاصل کرے گا؟ سُنی سنائی باتوں پر یقین کرنا عقلمندی نہیں۔ ایک جماعت کا نصب العین اس میں داخل ہوئے بغیر صحیح طور پر سمجھ میں نہیں آسکتا۔ خورشید جن سنگھ میں گیارہ سال سے ہیں۔ وہ پہلے دلّی اسٹیٹ ورکنگ کمیٹی کی ممبر رہیں، پھر آل انڈیا جن سنگھ کی ورکنگ کمیٹی کی ممبر بنیں۔ اب آر ایس ایس کے متعلق بھی لوگوں کی غلط فہمی دُور ہو رہی ہے مسلمان آر ایس ایس میں شامل ہونے کے لئے تیار ہیں۔ مستقبلِ قریب میں اس بات کا امکان بھی ہے۔

آج سے پانچ سال پہلے خورشید نے دلّی کارپوریشن کا الیکشن لڑا تھا۔ وہ جن سنگھ کی طرف سے دلّی کارپوریشن کی ممبری کی امیدوار تھیں۔ مگر وہ اس الیکشن میں ہار گئی تھیں۔ اس دفعہ انہوں نے جامع مسجد کے علاقے سے کونسل کے لئے الیکشن لڑا۔ اُن کے مقابل حبیبہ قدوائی تھیں۔ حبیبہ کے شوہر ابرار الرحمٰن قدوائی اُن کے شوہر کے چچازاد بھائی ہیں۔ حبیبہ اُن کے شوہر کی رشتہ کی بہن بھی ہیں۔ اس طرح وہ خورشید کی نند بھی ہیں اور جٹھانی بھی۔ مگر اس مقابلے میں ہار جیت نے اُن کے ذاتی تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ حبیبہ نے جب خورشید کی کامیابی کی خبر سُنی تو وہ خود پھولوں کا ہار لے کر اُن کے پاس آئیں اور انہیں مبارک باد دی۔

پچھلے الیکشن نے ہندوستان میں ایک خاموش انقلاب برپا کر دیا۔ کانگریس پارٹی کو جو ہندوستان کی آزادی کے دن سے حکومت کر رہی تھی، اس الیکشن میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ایمرجنسی کے خاتمے کے بعد اُمیدواروں کو الیکشن کے لئے صرف دو مہینے کی مہلت ملی۔ ان دو مہینوں میں بڑی گہما گہمی رہی۔ تمام شمالی ہند الیکشن کے بخار میں مبتلا رہا۔ خورشید نے جن سنگھ کے اُمیدواروں کی حمایت میں یو پی کے کئی اضلاع کا دَورہ کیا۔ پارلیمنٹ کا یہ الیکشن تاریخ ساز ثابت ہوا۔ خورشید الیکشن کے سلسلے میں بریلی، بدایوں، بلرام پور اور دوسرے اضلاع میں گئیں۔ جب شمالی اور مغربی ہندوستان میں صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن ہوئے تو خورشید نے ایک بار پھر شمالی ہند کا دَورہ کیا۔ وہ گجرات، راجستھان، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، پنجاب ہریانہ، یوپی، بہار اور بنگال گئیں۔ اس الیکشن میں بھی کانگریس کو شکست کا سامنا پڑا۔ لیکن اس بار لوگوں کا غصہ ٹھنڈا ہو چکا تھا، اس لئے مرکز کی طرح اس بار جنتا پارٹی کے تمام اُمیدوار کامیاب نہیں ہوئے۔

خورشید کی ننھیال مدتوں سے دلّی میں سکونت پذیر تھی۔ دلّی میں پنجابی سوداگروں کا ایک محلہ ہے جس کا نام حویلی حسام الدین حیدر ہے۔ یہ حسام الدین حیدر اُن کے نانا کے جدِ امجد تھے۔ خورشید کے دادا بہار کے رہنے والے تھے۔ وہ [illegible] آکر دلّی میں بس گئے تھے۔ اس [illegible] خورشید خالص دلّی والی ہیں۔

خورشید جدید اور قدیم کے سنگم کی قائل ہیں۔ دلّی کی جامع مسجد کو خوب صورت بنانے کے لئے جو قدم اُٹھایا گیا تھا خورشید کی رائے میں نامناسب تھا۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں کے نیچے ایک قدیم بازار تھا، یہاں سیکڑوں دکانیں تھیں یہاں رات دن چہل پہل رہتی تھی۔ اب اس جگہ باغ بن گیا ہے جہاں آوارہ اور اوباش لوگ رات کو بسیرا کرتے ہیں۔ حکومت نے اس باغ کے نیچے دکانیں بنائی ہیں۔ بہتر یہ ہوتا کہ یہ دکانیں اسی باغ کی جگہ بنائی جاتیں، جامع مسجد کا حُسن قائم رکھنے کے لئے یہ دکانیں سُرخ اینٹوں سے بنائی جاتیں تو بہتر ہوتا۔ اس طرح جامع مسجد سے بازار کی ہم آہنگی قائم رہتی ایمرجنسی کے دوران دلّی کے ترکمان

گیٹ سے سیکڑوں انسانوں کو نکال دیا گیا۔ ترکمان گیٹ کا علاقہ مسمار کر دیا گیا۔ ان لوگوں کو دریائے جمنا کے پار بھجڑی پور بھیج دیا گیا، جہاں انہیں مہینوں کھلے آسمان کے نیچے زندگی گزارنا پڑی۔ خورشید کی رائے میں حکومت کا یہ قدم غیر منصفانہ تھا۔ اگر حکومت ترکمان گیٹ کو کسی اسکیم کے تحت مسمار کرنا چاہتی تھی تو وہاں کے رہنے والوں کے لئے پہلے سے نئے مکان تیار کرنے ضروری تھے۔ اس طرح یہ منتقلی آسان ہو جاتی۔ حکومت کی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے ان لوگوں کو ناقابلِ بیان مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔

خورشید فیملی پلاننگ کے حق میں ہیں لیکن وہ اس معاملے میں زبردستی کی قائل نہیں۔ اُن کی شادی ۱۹۵۴ء میں ہوئی تھی۔ اُن کے صرف تین بچے ہیں۔ انہوں نے خود فیملی پلاننگ پر عمل کیا ہے۔ فیملی پلاننگ کے حق میں کافی پروپیگنڈا ہوا ہے، لیکن یہ پروپیگنڈا ہی اس کے حق میں زہر ثابت ہوا۔ لوگ اس کے بارے میں بات کرتے ہوئے جھجکتے ہیں۔ صدیوں کی جھجک ایک دن میں دور نہیں ہو سکتی۔ لوگ فیملی پلاننگ کے لئے تیار ہیں، لیکن وہ اس بات کو شہرت دینا نہیں چاہتے۔ اگر یہ کام خاموشی سے کیا جاتا، اگر نس بندی کرانے والوں کی تشہیر نہ کی جاتی، اگر ان کے لئے انعام و اکرام کا انتظام نہ ہوتا تو یہ پروگرام زیادہ کامیاب ہوتا۔ اس کے علاوہ فیملی پلاننگ کی کامیابی کے لئے تعلیم ضروری ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کے یہاں اولاد کم ہوتی ہے۔ تعلیم خود بخود فیملی پلاننگ کی راہ بھاتی ہے۔ حکومت کو فیملی پلاننگ پر روپیہ خرچ کرنے کے بجائے تعلیم پر روپیہ خرچ کرنا چاہئے۔

آزادیٔ نسواں کے بارے میں خورشید کی رائے معتدل ہے۔ وہ نہ عورتوں کی جہالت اور پردے کی قائل ہیں اور نہ حد سے بڑھی ہوئی آزادی کی۔ عورتوں کی آزادی کے معنی یہ نہیں کہ وہ سگریٹ پیئیں، مردانہ لباس پہنیں، پارٹیوں میں جائیں، لڑکوں کے ساتھ ڈانس کریں۔ آزادی بے راہ روی کا نام نہیں۔ خود اُن کا خاندان مذہبی روایات کا حامل رہا ہے۔ اُن کے باپ ڈاکٹر تھے لیکن وہ مولوی بھی تھے۔ اُن کے خاوند حافظِ قرآن ہیں۔ اُن کے ایک بھائی کنیڈا میں ہیں۔ وہ وہاں ایک افسر بھی ہیں اور مولوی بھی۔ دوسرے بھائی نے ایک جرمن لڑکی سے شادی کی ہے۔ اُن کے چار بچے ہیں۔ یہ چاروں بچے روزے رکھتے ہیں۔ خورشید خود صوم و صلوٰۃ کی پابند ہیں۔ مسلم پرسنل لا کے متعلق خورشید نے تبصرہ کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کے خیال میں یہ علما کا مسئلہ ہے۔ لیکن وہ مسلم پرسنل لا میں صرف ایک ترمیم چاہتی ہیں: ایک سے زیادہ شادی کرنے کے خلاف قانون ضرور بننا چاہئے۔

خورشید کو زیورات کا شوق نہیں اور نہ انہیں قیمتی اور بھڑکیلے لباس سے لگاؤ ہے۔ گھر میں وہ عام طور پر شلوار قمیص ہی پہنتی ہیں، لیکن گھر سے باہر ساڑی پہنتی ہیں۔ وہ کھانا پکانے میں ماہر ہیں۔ دلی مرغن اور لذیذ کھانے کے لئے مشہور ہے۔ خورشید نے دلی والوں کی روایت قائم رکھی ہے۔ ابتدا میں اُن کے سسرال والے حیرت کرتے تھے کہ وہ اتنا اچھا کھانا کیسے بناتی ہیں۔ اُن کا خیال تھا کہ خورشید نے کسی ماہر باورچی سے مدد لی ہے۔

خورشید بہت مصروف خاتون ہیں۔ وہ ۱۱ بجے سے ۵ بجے تک دفتر کے کام کرتی ہیں۔ دفتر کے کام کے بعد بھی انہیں آرام نصیب نہیں ہوتا۔ سچ تو یہ ہے کہ انہیں دفتر سے زیادہ گھر پر کام کرنا پڑتا ہے۔ انہیں اپنی ہر دل عزیزی کی پوری قیمت چکانی پڑتی ہے۔ وہ صبح کو ۸½ بجے سے ۱۱ بجے تک گھر پر کام کرتی ہیں۔ اُن کے گھر پر لوگوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ دفتر سے آنے کے بعد ۸ بجے سے رات کے ۱۰ بجے تک پھر محفل گرم ہو جاتی ہے۔ لوگوں کی شکایتیں سننا، اُن کی عرضیاں پڑھنا، اُن کی تکلیفوں کا حل نکالنا، بس یہ ہیں خورشید قدوائی کے شب و روز۔ وہ اپنے بچوں کے لئے بھی وقت نہیں نکال سکتیں۔ اُن کے تین بچے ہیں۔ بڑی لڑکی بی اے کر چکی ہے، دوسرا لڑکا بی اے سیکنڈ ایئر میں ہے۔

فرصت کے وقت خورشید ناول اور افسانے پڑھتی ہیں۔ اے۔ آر۔ خاتون اُن کی محبوب مصنفہ ہیں۔ اس کے علاوہ اُن کو فسانۂ آزاد بھی بہت پسند ہے۔ اُن کے شوہر عتیق الرحمٰن قدوائی ایک جرنلسٹ ہیں۔ وہ دلی سے ایک ہفتہ وار اخبار "قومی آواز" نکالتے ہیں۔

پیاسا ساون

خیال انصاری



میں نے کروٹ بدلی تو دیکھا کہ شگفتہ ابھی تک جاگ رہی ہے۔ آنکھیں کھولے، وہ ایک ٹک کھڑکی کے پار خلا میں گھورے جا رہی تھی۔ آنکھیں قدرے بھیگی ہوئی تھیں۔ گالوں پر آنسوؤں کی نمی چمک سی رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ گھنٹوں خاموشی سے روئی ہے۔ میں نے اس کے سر اور رخساروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا "شگفتہ! کیا بات ہے؟ ابھی تک جاگ رہی ہو؟ کیا آج پھر اُمی جان نے کچھ کہا ہے؟"

اس نے بڑی اداسی سے میری جانب نگاہیں کیں اور میں نے شرمساری سے اپنی نظریں نیچی کرلیں، کیوں کہ میں اس سے نظریں نہیں ملا سکتا تھا۔ میں نے اس کے گیلے گالوں پر اپنی ہتھیلی رکھ دی۔ اس نے یاس بھری نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں دوبارہ چھلک پڑیں۔ میں نے پھر نرمی سے پوچھا "شگفتہ، بولتی کیوں نہیں؟ آخر کیا بات ہے؟ کیوں گھٹے جا رہی ہو؟" حالانکہ میں سب جانتا تھا، سب سمجھتا تھا۔ اُمی جان نے آج بھی دن بھر اس پر فقرے کسے ہوں گے۔ ڈائن، کوکھ جلی، منحوس، چڑیل، جیسے خطابوں سے اسے زخمی کیا ہوگا۔ میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ اسے رات بھر نیند کیوں نہیں آتی۔ سوتے میں چونک چونک کر کیوں وہ ہراساں سی اُٹھ بیٹھتی ہے۔ بار بار پیاسی پیاسی نظروں سے کیوں مجھے دیکھتی ہے اور میں — میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی کیسا انجان بن جاتا ہوں۔ آخر میں مرد جو ٹھہرا۔

لیکن مجھے اس کا بھی تو اعتراف ہے کہ تین سال گذر جانے پر بھی میں آج تک شگفتہ کو وہ سچی خوشی نہ دے سکا جس کے لئے اس کا تن من ترس رہا ہے۔

مجھے اس کا بھی اعتراف ہے کہ بیتے دنوں کی ہزاروں راتیں ہم نے ساتھ ساتھ ایک چار دیواری کے بیچ گذاری ہیں، لیکن میں نے اسے کبھی بے خوف، گہری نیند سوتے نہیں دیکھا، مطمئن اور آسودہ حال نہیں پایا۔ رات تو گویا اس کے لئے ایک عذاب، ایک قہر بن کر آتی ہے — ہر رات اس کی آنکھوں نے نئے نئے ڈھنگ سے مجھ سے کچھ مانگا ہے لیکن میں اس کی تشنگی دور نہ کر سکا۔ کیوں؟ کیوں کہ میں بھی تو مجبور ہوں۔ میں اسے دنیا کی ساری نعمتیں دے سکتا ہوں، لیکن وہی ایک خوشی نہیں دے سکتا جس کی اس کی پیاسی نظروں کو تلاش ہے، جس سے اس کی پھیلی ہوئی باہیں اور گود اب تک محروم ہیں۔

"شگفتہ — میری پیاری شگفتہ!" میں اسے پیار اور اپنائیت کے گہرے جذبات سے مغلوب ہو کر اپنی باہوں میں چھپا لیتا ہوں۔

اور پھر اس کی سسکیاں بندھ جاتی ہیں۔

آخر یہ کیسی عورت ہے ؟ میں یہ سوچ سوچ کر پاگل سا ہوا جاتا ہوں۔ آخر کہاں سے اس نے اتنا صبر حاصل کیا ہے ! کس جذبے کے تحت اس نے اپنے دل میں میرے لئے اتنی محبت، اتنا خلوص، اتنا ایثار جمع کر لیا ہے! میں نے بار ہا نہ صرف سوچا ہے بلکہ اس کا خلوصِ دل کے ساتھ خود اس سے اظہار بھی کیا ہے، اسے احساس بھی دلایا ہے کہ میں شجرِ بے برگ و ثمر ہوں، تمہاری خوشیوں بھری آرزوئیں کہیں مجھ سے کوئی گھنی چھاؤں نہ پاکر کڑی دھوپ میں جھلس نہ جائیں، تمہاری حسرتیں دم نہ توڑ دیں اور تمہاری تشنگی کو کہیں اور بھی نہ بڑھادیں۔ اتنا ہی نہیں میں نے چپکے چپکے اپنی کمزوریوں کا رونا بھی رویا ہے اسے حقیقت سے آشنا بھی کیا ہے۔ اُسے آنے والے سیاہ دنوں سے باخبر بھی کیا ہے۔ لیکن اس نے ہمیشہ سسک کر میرے مونھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور مجھے خاموش کر دیا۔ وہ اپنے آنسوؤں کو آنچل سے خشک کر کے کہتی —

"بولو — تم ہی کہو — جس کی قدرت کا یہ ادنیٰ سا کرشمہ ہو کہ عیسیٰ کو بغیر باپ کے مریم کی کوکھ سے جنم دے۔ اس کی قدرت سے نا امیدی، اس کی مصلحت سے بیزاری، اس کی شانِ کریمی سے محرومی تو کفر کے مصداق ہے" اور میں اس کی ایثار پیشہ محبت کے نشے میں سرشار ہو کر چپ سادھ لیا کرتا۔ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ سارے گھر میں تنہا میری ذات اس کی ہمدرد اور غمگسار ہے اور اسے ٹوٹ کر چاہتی ہے۔ اس احساس کی وجہ سے میں اپنے دل میں اس کے لئے مزید ہمدردی کا جذبہ محسوس کرتا۔ لیکن اس کے ساتھ میں بے بس بھی تھا۔ گھر بھر اس کا دشمن ہو چلا تھا۔

امّی جان آتے جاتے اس کے کاموں میں کیڑے نکالنے لگی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے پر تاک جھانک اور شک کی نظروں سے اسے تولنے لگی تھی۔ میں نے اگر کبھی انہیں ان کی ان باتوں پر دبے لفظوں میں روکا ٹوکا یا انہیں سمجھانے کی کوشش کی تو ان کا غصہ اور بھی بھڑک جاتا تھا اور وہ گِن گِن کر میری ہمدردی کا بدلہ شگفتہ سے لیتی تھیں۔ شگفتہ نے آخر تنگ آکر مجھے ہی منع کر دیا —

"آپ امّی جان کو نہ روکیں۔ آخر وہ کب تک اپنے ارمانوں پر اوس پڑتی سہہ سکیں گی ؟ کون ماں نہیں چاہتی کہ اس کے آنگن میں اس کے پوتے، پوتی کھیلیں۔"

امّی جان ہی کی طرح والد صاحب نے بھی نگاہیں پھیر لیں تھیں۔ بھائی بہن تو خیر کمسن تھے، ناسمجھ تھے، لیکن امّی جان نے ایک دن انہیں بھی بھڑکا دیا۔

"منّو اور منّی دونوں کان کھول کر سن لو۔ تم لوگوں کو دن بھر اس کے پاس دیر تک بیٹھا دیکھا تو تمہاری خیر نہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ اس منحوس کا سایہ بھی تم پر پڑے" اتنا ہی نہیں بلکہ انہوں نے مجھے شگفتہ کو طلاق دینے پر اکسایا، نئے رشتے کا لالچ دیا، دوسری کنواری لڑکیوں کی تعریفوں کے [illegible] باندھے۔ انہوں نے شگفتہ سے بھی کہا "کام کاج کر کے تم یہاں نیچے کمروں یا دالان میں نہ رہا کرو۔ اپنے کمرے میں اوپر چلی جایا کرو، ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ ہمیں تمہاری خدمت اور سلیقے کی ضرورت نہیں"

اور شگفتہ مجسم محرومی اور مایوسیت کی تصویر بنی سب کچھ سنتی، سب کچھ سہتی اور اُف تک نہ کرتی۔ امّی جان کے ایک ایک اشارے اور حکم پر وہ شاخِ بید کی طرح لچک لچک جاتی۔ کبھی اس نے اپنے اندر کے کرب کا احساس اپنے چہرے یا حرکات سے ظاہر نہ ہونے دیا۔

میں نے شہر کے ہر چھوٹے بڑے ڈاکٹر، حکیم سے رجوع کیا۔ ہزاروں روپے دواؤں انجکشنوں کی نذر کئے۔ مگر سب نے یہی کہا "افسوس — آپ بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہیں" یہ جملہ جتنی بار میں سنتا اتنا ہی مجھے خود سے شدید نفرت ہوتی۔ اپنی کمزوری اور شگفتہ کی محرومی پر افسوس ہوتا۔ اور پھر میں شگفتہ کے مزید قریب ہوتا جاتا۔ اس کے دکھ درد بانٹنے کی کوشش کرتا۔ شگفتہ تو ایک زرخیز زمین کی طرح تھی۔ لیڈی ڈاکٹر مس انجنا نے صاف طور سے پہلے ہی ٹسٹ میں کہہ دیا تھا۔

اُس دن وہ چپکے چپکے گھنٹوں روتی رہی۔ جب اُس نے خود پر قابو پا لیا تو اس نے چہرے کے سارے کرب اور دل کے سارے بوجھ کو اتار پھینکا اور مجھ سے لپٹ کر مجھے حوصلہ دینے لگی۔

"مجھے تمہارے سوا تمہاری محبت کے اور کچھ نہیں چاہئے۔ تم مجھے خود سے جدا کرنے کا بھی خیال دل میں نہ لانا اور خود کو اس مایوسی کے کرب سے بچائے رکھنا۔ اللہ کی جب مرضی یہی ہے تو ہمیں کوئی افسوس نہ ہونا چاہئے اس کی ساری ہی نعمتیں کسی ایک گھر، کسی ایک شخص کی میراث تو نہیں۔ وہ ہمیں جس طرح بھی نوازدے ہمیں اس پر ہی صبر و شکر کرنا چاہئے۔ بس ایک بات ہے۔ خدا کے لئے امّی جان کو یہ راز کبھی نہ بتلانا۔ اُن کی ساری امیدوں پر پانی پھر جائے گا۔ وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکیں گی۔

لیکن امّی جان کی لغزش میں دن بدن اضافہ

ہی ہوتا گیا۔ آخر وہ بھی تو بیچ حالات سے بے خبر تھیں اُن کا بھی کیا قصور ؟ اور پھر شگفتہ نے جب ان کی جلی کٹی باتوں پر دھیان دینا ہی چھوڑ دیا تو ان کی نفرت میں ضد اور دشمنی کا رنگ غالب آگیا میں نے بارہا سوچا کہ سب کچھ بتا دوں، لیکن مجھ میں کسی طرح بھی ہمت نہ ہوئی کہ میں خود کہہ دوں ! "امی! شگفتہ میں کوئی کھوٹ نہیں ــــ سب کمی مجھ میں ہے ــــ مجھ میں، تمہارے بیٹے میں۔"

ایک دن، جب یہ زہر میرے سارے جسم میں پھیل کر مجھے سڑانے لگا تو میں نے ہمت باندھی۔ لیکن شگفتہ نے میرے پیر پکڑ لیے۔ مجھے خدا کا واسطہ دیا، اپنی محبت اور قربانی، اپنے صبر و ضبط کی قسمیں دیں۔ میں رُک گیا۔ لیکن امی جان تو اولاد کے لئے دیوانی سی ہوئی جا رہی تھیں۔ میں عجب دوراہے پر کھڑا مر مر کر جی رہا تھا۔

آج صبح جب میں دفتر کے لئے روانہ ہو رہا تھا تو امی جان کچن میں شگفتہ سے کسی بات پر اُلجھ کر اس پر برس رہی تھیں۔ میں نے مداخلت کرنا چاہی تو وہ مجھ پر بھی برس پڑیں۔

"نالائق! زن مرید! نہ جانے اس جنم جلی نے تجھے کیا کھلا پلا دیا ہے! سُن لے کان کھول کر اب میں اس کوکھ جلی کو مزید اس گھر میں برداشت نہیں کر سکتی۔ تجھے اب کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا ہی پڑے گا۔"

اتنا کہہ کر وہ پیر پٹکتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ میں نے سسکتی ہوئی شگفتہ کو دلاسا دیا اور بوجھل قدموں سے دفتر چلا گیا۔

دن بھر میں دفتر میں اپنے گھر، ماں اور شگفتہ کے متعلق سوچتا رہا ــــ پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ اب تو مجھے ڈر سا لگ رہا تھا۔ خدا جانے امی جان کیا چاہتی ہیں۔ شگفتہ کے دل و دماغ پر کیا بیت رہی ہوگی۔ کہیں وہ کوئی غلط اقدام نہ اٹھائے۔ آخر وہ بھی تو انسان ہے کب تک ظلم سہتی رہے گی؟ صبر و ضبط کی بھی تو کوئی حد ہوتی ہے! ـ وہ ضرور فکرمند ہو کر گھلی جا رہی ہوگی امی جان کے فیصلے پر ــــ وہ سوچ رہی ہوگی امی جان ضرور اب مجھے طلاق دلوا دیں گی، یا پھر سوکن لا بٹھائیں گی۔ دونوں صورتوں میں آخر وہ کس طرح خود کو راضی کر سکے گی۔ خدا جانے کون سی آفت آنے والی ہے میرے گھر پر۔"

جب میں شام کو تھکا ماندہ، اُداس اُداس گھر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ماں دانت پیس پیس کر شگفتہ کو کوس رہی ہیں: "کمینی! تجھے میرا گھر چھوڑنا ہوگا، مجھے تیری جیسی منحوس کوکھ جلی چڑیل نہیں چاہئے ــــ میں نے دوسری بہو ڈھونڈ لی ہے۔ بس ہو چکا اب تیرا بہت راج اس گھر پر۔"

میں گھر کی چوکھٹ پر کھڑا سن رہا تھا، دیکھ رہا تھا۔

"اپنی نئی بہو پر میں تیرا منحوس سایہ بھی پڑنے پڑنے نہ دوں گی۔ نکل جا میرے گھر سے۔ مہر، جہیز، شادی کا خرچ، سب میں ادا کر دوں گی ــــ تو کس ہوش میں ہے کمینی!"

شگفتہ گھگھیائی "رحم کیجئے امی جان ! میں سوکن کو بھی برداشت کر لوں گی، لیکن خدا کے لئے مجھ سے میرا گھر، میرا سہاگ نہ چھینو۔ میں سب کی نوکرانی بن کر اس گھر میں رہنا گوارا کر لوں گی۔ آج تک میں نے اپنے میکے والوں کو یہاں کے حالات سے ذرا بھی باخبر نہیں کیا ہے۔ ان کے دل پر کیا بیتے گی اچانک یہ سب سن کر؟ میں آپ سے رحم کی بھیک مانگتی ہوں۔ مجھے اتنا ذلیل نہ کیجئے۔ مجھے ان سے جدا نہ کیجئے ــــ امی جان!"

وہ سسکتی ہوئی ماں کے قدموں سے لپٹ گئی۔ لیکن امی جان پر تو نفرت کا بھوت سوار تھا۔ وہ بگڑ پڑیں اور شگفتہ کے بال پکڑ کر اسے دروازے کی طرف کھینچنے لگیں۔ دو تین تھپڑ بھی جما دیئے ــــ "کمینی۔ میں کسی بھی حالت میں تیرا وجود اس گھر میں برداشت نہیں کر سکتی تو ایک منٹ بھی اب اس گھر میں رہ نہیں سکتی نکل۔ ابھی نکل اس گھر سے۔"

اور پھر شگفتہ کے صبر و ضبط کی ساری حدیں ٹوٹ گئیں۔ میں بُت بنا دیکھا کیا۔

اس نے للکار کر کہا "سُن لیجئے امی جان! میرے میکے سے مجھے یہ سبق دے کر رخصت کیا گیا ہے کہ سسرال سے مر کر ہی باہر نکلنا۔ سو امی جان آج ایسا ہی ہوگا۔ اب آپ مجھے نہیں میری لاش کو ہی اس گھر سے باہر نکال سکتی ہیں۔ اور ــ اور کان کھول کر سن لیجئے امی جان ــــ" اس نے سسکتے ہوئے کہا۔ "جب اولاد کی، پوتی پوتے کی اتنی ہی آرزو تھی تو ــــ تو خود پہلے آپ نے بھی کسی مرد کو پیدا کیا ہوتا۔ ایک کیا دس بہوئیں آپ لے آئیں، آپ کی آرزو کبھی پوری نہیں ہوگی ــ کبھی نہیں ــ کبھی نہیں!" غصے میں بھی سسکتی ہوئی سب کچھ کہہ گئی۔

اور پھر دوسرے ہی لمحے امی جان ایک سوکھے درخت کی مانند چرا کر زمین پر آ رہیں اور بے ہوش ہو گئیں۔

اور میں نے اپنے دامن سے آنکھیں ملتے ہوئے آگے بڑھ کر شگفتہ کو گلے لگا لیا۔

مجھے ایسا لگا جیسے آج میرے گھر سے نحوست کا گہرا سیاہ کہرا چھٹ گیا، ذہن و دل پر رکھا ہوا ایک بھاری بوجھ اُتر گیا۔

ٹانگ

شہناز عشرت امیر



آج کل رمیش کو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا سارا وجود محض اس کی ایک ٹانگ میں سمٹ کر رہ گیا ہے۔ اس کی ایک دُکھتی سُوکھتی ٹانگ میں۔

تین ماہ پہلے پروموشن کا آرڈر جیب میں رکھے سیٹی میں کوئی دُھن بجاتا اور دھڑ دھڑاتا آفس بلڈنگ کی سیڑھیاں اُتر رہا تھا کہ اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ لڑھکتا ہوا نیچے آگرا۔ اتنی زور کا دھماکا ہوا تھا کہ لوگ دوڑ پڑے تھے۔ اس کے ساتھیوں نے اسے اٹھایا تھا۔ وہ بے ہوش ہوئے جا رہا تھا۔ اس کی سائیکل کے ساتھ اُسے بھی ٹیکسی میں لاد کر لوگ اسے گھر چھوڑنے آئے تو رمیش درد سے کراہتا ہوا اپنے ساتھ اس سائیکل کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا جو چلائی جا سکتی ہے خود بخود نہیں چلتی۔

اس کے بعد سے رمیش کو بار بار یہ محسوس ہوتا رہا ہے جیسے وہ بار بار گرتا رہا ہے اور ہمدردی میں کوئی نہ کوئی اسے اٹھاتا رہا ہے لیکن وہ ہے کہ جیسے اس طرح گر کر رہ گیا ہے کہ اٹھ ہی نہیں سکتا۔

اُس دن پہلی تاریخ تھی۔ ہر پہلی تاریخ کو رمیش اپنی بیوی شیلا کے ساتھ پکچر جاتا رہا تھا۔ کھانا بھی اس شام وہ باہر ہی کھاتے۔ شیلا ہر پہلی تاریخ کی طرح گلابی ساڑی پہنے، بالوں میں گلاب کا پھول لگائے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ دروازہ کھولتے ہوئے شیلا نے جب رمیش کی یہ حالت دیکھی تو ایک انجانے خوف سے وہ کانپ گئی تھی —— کراہتے ہوئے رمیش نے شیلا کے بالوں میں لگے ہوئے گلاب کے ساتھ شیلا کی آنکھوں میں آنسو بھی دیکھے اور اس کے جسم کو کپکپاتے ہوئے بھی دیکھا۔

رمیش جسمانی طور پر کم زور نہیں تھا لیکن اس وقت تکلیف اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ دائیں ٹانگ کے ہلتے ہی وہ تڑپ اٹھتا تھا۔

شیلا نے گلابی ساڑی اُتار کر دوسری ساڑی پہن لی تھی۔ گلاب کا پھول بھی بالوں میں سے نکال پھینکا تھا اور اس کی ٹانگ میں بام لگا کر سینکنے لگی تھی۔

اس کے بعد تین ماہ گزر گئے۔ شیلا نے اپنے بالوں میں گلاب نہیں لگایا۔ رمیش کی سُوکھتی ٹانگ کے ساتھ آنگن میں لگے گلاب کے پودے بھی سُوکھنے لگے تھے —— رمیش نے کئی بار کہا بھی "تم گلاب کیوں نہیں لگاتیں —— لگایا کرو نا" مگر جواب میں کنکھیوں سے رمیش کی ٹانگ کو دیکھتے ہوئے شیلا چُپ ہی رہ جاتی تھی ——

رمیش کا دل چاہتا، شیلا کچھ کہے، کچھ بولے، گلاب کے بارے میں یا اس کی ٹانگ کے بارے میں، لیکن شیلا کچھ نہیں کہتی تھی۔ اور شیلا کی اس خاموشی سے رمیش کو ڈر لگنے لگا تھا۔

شیلا کی آنکھیں آم کی قاشوں کی طرح بڑی بڑی اور رسیلی تھیں۔ رمیش ان آنکھوں پر فدا تھا۔ کنکھیوں سے دیکھتی ہوئی شیلا کی ایک نظر اس کے رگ و پے میں بجلی سی دوڑا دیتی تھی —— لیکن اس وقت شیلا کا کنکھیوں سے دیکھنا —— جیسے گلاب کا کانٹا ہو، جو گلاب کی طرف بڑھتے ہوئے اس کے ہاتھوں میں بار بار چبھ جائے۔ رمیش حیران تھا کہ قصوروار کس کو ٹھہرائے۔ اپنے ہاتھوں کو یا ان کانٹوں کو؟

ایک رات رمیش کی ٹانگ کا درد کم تھا۔ قریب بیٹھی شیلا کو اس نے جذباتی ہو کر اپنے قریب کر لیا تھا اور چاہتا تھا کہ اپنے ہونٹوں کی پیاس بجھا لے کہ اچانک اس کی ٹانگ میں ٹیس کی شدید لہر اٹھی اور وہ درد سے چیخ پڑا۔ سپردگی کے جذبات میں ڈوبی شیلا جیسے اچانک ہوش میں آگئی اور دور ہٹ گئی اور پھر وہ سینکنے کے لئے گرم پانی لینے چلی گئی۔

اُف! اس وقت شیلا نے کتنی پیاسی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ رمیش کو ایسا لگا جیسے وہ سناٹے میں ڈوبتا جا رہا ہے، جہاں ہر سوال ایک بازگشت بن کر رہ جاتا ہے، جواب نہیں بنتا۔

گرم پانی سے سینکائی کرتی ہوئی شیلا اور دکھتی ٹانگ لئے رمیش کے درمیان ساری رات وہ سناٹا ننگی تلوار کی طرح لٹکتا رہا۔

دن میں باتھ روم جانے کے لئے بھی رمیش کو شیلا کا سہارا لینا پڑتا۔ ایک دن اچانک کھانا کھلاتے کھلاتے شیلا نے کہا "تم کہو تو میں کوئی سروس کر لوں اب گھر میں دل نہیں لگتا۔

رمیش نے کھانے کی پلیٹ اٹھا کر پھینک دی۔ چلایا "کیوں، اب دل کیوں نہیں لگتا؟ کیا میں مر گیا ہوں؟ یا میں اب کما نہیں سکتا؟ کیا ہو گیا ہے مجھے؟ بولو!

شیلا رو پڑی۔ "پتہ نہیں کیا ہے تمہیں۔ جب سے تمہاری ٹانگ میں چوٹ لگی ہے، ہر بات کا الٹا مطلب نکال لیتے ہو" شیلا ٹوٹی ہوئی پلیٹ کے ٹکڑے جمع کرنے لگی۔

آفس میں فائلوں کے سامنے جھکے ہوئے رمیش کی آنکھوں میں سارے دن وہ پلیٹ کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے گھومتے رہے تھے ——

سیدھی بات کا الٹا مطلب اب وہ لیتا ہے یا —— اب کوئی بات سیدھی ہی نہیں رہی تھی؟ کیوں کہا شیلا نے ملازمت کے لئے، جب وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ رمیش کو اس کا ملازمت کرنا قطعی پسند نہیں ہے۔ شادی کے بعد جب ان آٹھ برسوں میں ملازمت کا سوال کبھی نہیں اٹھا تو ان تین مہینوں میں کیا ہو گیا ہے کہ شیلا سروس کرنے کے بارے میں سوچنے لگی ہے؟ اس ٹانگ کے علاوہ اور تو کچھ نہیں ٹوٹا ہے، پھر کیوں ایسا لگتا ہے کہ سب کچھ اس پلیٹ کی طرح ٹوٹ گیا ہے، بکھر گیا ہے، اور وہ خود بھی اس ٹوٹے اور بکھرے ہوئے کو سمیٹنے کی کوشش میں ٹوٹنے لگا ہے۔

رمیش کی ٹانگ کا علاج برابر ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر یہ نہیں کہتے تھے کہ وہ ٹھیک نہیں ہو سکے گا مگر یہ بھی نہیں کہتے تھے کہ وہ جلد اچھا ہو جائے گا۔ اس غیر یقینی حالت میں جھولتا ہوا رمیش کبھی کبھی اپنے سارے جسم پر نظر ڈالتا ہے تو اسے اپنی دائیں ٹانگ کے سوا سب کچھ ٹھیک ٹھاک نظر آتا ہے۔

اور یہ دیکھ کر رمیش الجھ کر رہ جاتا ہے۔

شیونگ کا سامان لے کر بیٹھ جاتا ہے تو اسے تولیہ نہیں ملتا۔ چاہتا ہے کہ اٹھ کر تولیہ لے لے، لیکن دکھتی ٹانگ اٹھنے نہیں دیتی۔ شیلا کو آواز دیتا ہے، شیلا تولیہ لے کر فوراً آتی ہے اور تولیہ دے کر فوراً ہی چلی جاتی ہے۔ کہتی ہے "دال جل جائے گی"۔ شیو کرتے وقت رمیش کو پانی ٹھنڈا محسوس ہوتا ہے۔ وہ شیلا کو بلائے بغیر ٹھنڈے پانی سے ہی شیو بنانے لگتا ہے اور اس دوران رمیش کو دیر تک یاد آتا ہے کہ صرف تین ماہ پہلے تک وہ شیو کا سامان خود اٹھا کر لاتا تھا، تولیہ لا سکتا تھا، پانی گرم کر سکتا تھا اور باتھ روم میں پانی کی بالٹی رکھتی ہوئی شیلا کو جب وہ دیر تک اپنے بازوؤں میں سمیٹے رکھتا تھا تو شیلا کی دال کبھی نہیں جلتی تھی —— رمیش سوچتا ہے کہ کیا ہو گیا ہے اسے جو وہ "وہ" نہیں رہ گیا۔ کیوں اسے ایسا لگتا ہے۔ اس کا وجود محض اس کی دائیں ٹانگ میں سمٹ کر رہ گیا ہے۔ کیوں؟ کیوں؟

ماں روزانہ پوچھتی ہے "تیری ٹانگ کا درد کیسا ہے؟" رمیش چاہتا ہے کہ ماں پوچھے "اب وہ کیسا ہے؟" لیکن ماں بھولے بغیر ٹانگ کے درد کو ہی پوچھتی ہے، اور پھر ٹھنڈی سانس لے کر بڑبڑانے لگتی ہے "ارے میرے کرم جو میرے بڑھاپے میں تیری ٹانگ کو دکھ لگ گیا"

رمیش کہنا چاہتا ہے "ماں، کیا تو کبھی اس ٹانگ کو بھول کر اس کے بارے میں اور کچھ نہیں بول سکتی"۔ لیکن رمیش سمجھ گیا کہ ماں اور شیلا اب صرف ٹانگ کی بنیاد پر ہی رمیش کے بارے میں سوچ سکتے ہیں، جیسے ٹانگ کے علاوہ

رمیش کی کوئی حیثیت ہی نہ ہو۔

رمیش صرف ایک ہفتہ چھٹی پر رہا، پھر پابندی سے دفتر جانے لگا۔ ہر مہینہ پہلی تاریخ کو پوری تنخواہ لاتا رہا۔ لیکن اس پہلی کے بعد پھر کبھی وہ لمحہ نہیں آیا جب اس نے سیٹی میں کوئی دُھن بجائی ہو، جب شیلا نے بالوں میں گلاب لگایا ہو، جب ماں نے اس سے کچھ اور پوچھا ہو، یا جب بے بی ٹھمک کر اس سے لپٹ گئی ہو ــــ اپنے ننھے جسم کا سارا بوجھ اس کی گود میں سونپ کر۔

بے بی دوڑتی آتی ہے اور پھر اچانک ٹھٹھک کر کھڑی ہو جاتی ہے، اور پھر اس کی دُکھتی ٹانگ سے دُور دُور رہ کر اس کے قریب آتی ہے۔ اُس دن وہ رونے ہی لگی تھی "پاپا آپ کب ہمیں پہلے کی طرح گود میں لے کر پیار کریں گے؟ اتنے دن تو ہو گئے، آپ کی ٹانگ کب ٹھیک ہو گی؟"

اور شیلا بے بی کو ڈانٹنے لگی تھی ــ "ہش.... بے بی، اس طرح نہیں کہتے" "کیا پاپا مجھے اب بھی پیار نہیں کرتے۔"

اور اس رات رمیش کے کانوں میں بے بی کے معصوم الفاظ گونجتے رہے تھے۔ اُس رات وہ سوچتا رہا تھا، کیوں شیلا کی ہمدردی اسے ذلیل کرتی ہوئی سی لگتی ہے۔ کیوں ماں کا اس کی ٹانگ کے بارے میں بار بار پوچھنا اُسے زہر لگتا ہے؟ کیوں بے بی کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اُسے اب پہلے کی طرح پیار نہیں کرتا۔

اور ان سوالوں کے جواب سوچتے سوچتے اس کا ہاتھ بے اختیار اپنی دُکھتی ہوئی ٹانگ پر چلا جاتا۔

جب سے ٹانگ میں چوٹ لگی ہے وہ رکشا میں بیٹھ کر اپنے گھر واپس آتا ہے۔ آفس میں بھی جیسے سب لوگ اس پر ترس کھاتے ہیں، اپنے ساتھیوں کی ہمدردی اسے توہین سی محسوس ہوتی ہے۔

دفتر کے ساتھیوں میں سکینہ اس کا سب سے گہرا ساتھی تھا۔ وہ گھنٹوں حضرت گنج میں گھومتے رہتے، کافی پیتے، قہقہے لگاتے اور سگرٹیں پھونکتے رہتے۔ دونوں ایک شام بھی ایک دوسرے کے بغیر نہیں گزارتے تھے ــــ لیکن اب سکینہ اس سے دُور دور رہتا ہے، بس کبھی کبھی دھیرے سے پوچھتا ہے "کہو یار، اب تمہاری ٹانگ کا کیا حال ہے؟"

اور رمیش کو ایسا لگتا ہے کہ اس کی پوری زندگی کے درمیان اس کی ٹانگ بُری طرح حائل ہو گئی ہے۔ ●●



عورت اور مرد کا فرق

ایم کمال

عورت اور مرد کے فرق کا شدید احساس موجودہ زمانے کی دین ہے۔ آج سے سیکڑوں سال پہلے یہ احساس اتنی شدت کے ساتھ موجود نہیں تھا۔ اس زمانے کی سوسائٹی دو طبقوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک اعلیٰ طبقہ تھا، دوسرا ادنیٰ طبقہ۔ درمیانے طبقے کے لوگوں کا وجود نہیں تھا۔ اعلیٰ اور ادنیٰ طبقے میں عورتوں نے مردوں کے دوش بدوش کام کیا۔ عورت تخت پر بیٹھی اُس نے ملکوں پر حکمرانی کی۔ انگلستان کی ملکہ الیزبتھ اوّل، روس کی زارینہ کیتھرین، ہندوستان کی ملکہ رضیہ سلطان اور چین کی ملکہ سوزی اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ ان عورتوں نے مردوں سے بہتر حکمرانی کی۔ ادنیٰ طبقے میں مزدور اور کسان عورتیں کھیتوں میں کام کرتی آئی ہیں صنعت و حرفت اور دستکاری میں وہ ہمیشہ مردوں سے آگے رہیں۔ ان دونوں طبقوں میں عورت اور مرد کے فرق کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ سارا جھگڑا درمیانے طبقہ کا ہے۔

درمیانہ طبقہ یورپ اور امریکہ میں ۱۰۰ برس سے زیادہ پرانا نہیں۔ ہمارے ملک میں یہ اسی صدی کی پیداوار ہے۔ یہ طبقہ ہی صنفی فرق کو زیادہ محسوس کرتا ہے۔ متوسط طبقہ مذہب کی آڑ لے کر عورت کو دبانا چاہتا ہے لیکن اس کوشش میں اُسے زیادہ کامیابی نصیب نہیں ہوتی۔

کوئی بھی مرد یا عورت مکمل مرد اور عورت نہیں ہوتا۔ ہر مرد میں کچھ حصہ نسوانیت شامل ہوتی ہے اسی طرح ہر عورت میں کچھ حصہ مردانگی کا ہوتا ہے۔ ان عناصر کا تناسب ٹھیک رہے تو گاڑی ٹھیک چلتی ہے۔ اگر مرد میں نسوانیت کا عنصر بڑھ جائے تو اُسے زنانے کا خطاب دیا جاتا ہے۔ اگر عورت میں مردانہ پن کا عنصر بڑھ جائے تو اُسے مرکار خطاب دیا جاتا ہے۔ دونوں کی دلچسپیوں اور صلاحیتوں کا دائرہ الگ الگ ہے۔ عورت اور مرد کی کچھ صفات مشترک ہوتی ہیں۔ مثلاً ہم یہ بات نہیں کہہ سکتے کہ حوصلہ اور ہمت مردوں کی جاگیر ہے۔ عورت بھی بے خوف اور باہمت ثابت ہوتی ہے۔ لیکن ان دونوں کا دائرہ عمل الگ الگ ہے۔ عورت کی ہمت اور بے خوفی مدافعانہ ہے، جبکہ مرد کی ہمت جارحانہ ہے۔ ہم جب کسی مرد کو [illegible] دیکھتے ہیں تو اسے عورت کے خطاب سے نہیں نوازتے بلکہ اُسے ایک بزدل مرد سمجھتے ہیں۔ یوں تو یہ بات بھی بحث طلب ہے کہ عورت کا حوصلہ صرف مدافعت کے وقت بروئے کار آتا ہے۔ گذشتہ جنگِ عظیم میں روس کی جنگ جو عورتوں نے اس خیال کو غلط ثابت کر دیا ہے۔

عورتوں کے لئے جو صفات مخصوص کر دی گئی ہیں ان میں [illegible]

سے گریز، غرور، حسد، رشک، جھجک، شرم، پاکیزگی، رحم دلی، کھلنڈراپن، بچوں سے محبت، چلبلاپن، عیاری اور مکاری۔ ان صفات کا مشاہدہ کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ عورت کی فطرت میں داخل ہیں یا اُس نے یہ باتیں ماحول سے مجبور ہو کر سیکھی ہیں۔ کچھ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ یہ صفات فطری ہیں۔ ماحول فطری صفات کو بدل نہیں سکتا۔ مثلاً اگر کوئی طبقہ سیکڑوں سال سے سبزی خور رہا ہے تو اُس کے یہ معنی نہیں کہ اُس کی گوشت کھانے اور اسے ہضم کرنے کی اہلیت ختم ہو گئی ہے۔

عورت اور مرد کے فرق میں جسمانی ساخت کا فرق سب سے زیادہ اہم ہے۔ مرد کی شخصیت کا مرکز اُس کا دماغ ہے۔ عورت کی شخصیت کے دو مرکز ہیں۔ ایک دماغ اور دوسرا رحم۔ عورت کے لئے ازدواجی زندگی مرکزیت کا درجہ رکھتی ہے۔ مرد کے لئے وہ ایک اضافی چیز ہے۔ عورت کا سب سے اہم کام تخلیقِ انسانی ہے۔ وہ انسان کو پیدا کرتی ہے اُس نے دنیا کو انسانوں سے مالا مال کر دیا ہے۔ عورت کی یہ صلاحیت اُسے مردوں سے ممتاز کرتی ہے۔ عورت کی باقی تمام صلاحیتیں اس ایک صلاحیت سے ہی پیدا ہوتی ہیں۔ ممتا کا جذبہ اسی کی دین ہے۔ رحم دلی، شفقت، محبت سب اس درخت کی شاخیں ہیں۔

عورت مادے کی طرح ٹھوس اور جامد ہے۔ وہ زمین کی طرح غیر متحرک مگر زرخیز ہے۔ اس کی شخصیت وسیع تر ہو سکتی ہے، بدل نہیں سکتی۔ مرد ارتقا کے مختلف مدارج طے کرتا ہوا اپنی منزل تک پہنچتا ہے۔ عورت ارتقا کی منزلیں طے نہیں کرتی۔ وہ ہمیشہ ایک جیسی رہتی ہے۔ اسی لئے ایک عورت دوسری عورت کو ایک نظر میں پہچان لیتی ہے، لیکن مرد کو سمجھنے میں اُسے دیر لگتی ہے۔ گھریلو جھگڑوں کی بنیاد یہی سست رفتاری ہے۔ عورت کے لئے مرد کو سمجھنا آسان نہیں۔ وہ اس راستے کو آہستہ آہستہ طے کرتی ہے۔

ایک اور صفت جو عورت کو مرد سے ممتاز کرتی ہے، اُس کی چھٹی حس ہے۔ چھٹی حس کا ذہانت اور منطق سے کوئی تعلق نہیں۔ جہاں بڑے بڑے ذہین اور عقل مند ہار جاتے ہیں، وہاں عورت اپنی چھٹی حس سے فوراً بات سمجھ جاتی ہے۔ زمانۂ قدیم سے لوگ عورت کی اس صفات سے متاثر ہو رہے ہیں۔ کبھی انہوں نے اُسے جادوگرنی سمجھ کر ہلاک کر دیا، کبھی اُسے دیوی جان کر مندر میں بٹھا دیا۔ ستم ہے کہ آج ان جادوگرنیوں اور دیویوں کو مردوں کے برابر تنخواہ بھی نہیں ملتی۔

یہ صحیح ہے کہ عورتوں میں رشی منی پیر پیغمبر اور سائنس داں نہیں ہوئے، لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ عورت چور، ڈاکو، ظالم اور قاتل نہیں ہے۔ مرد آسمان میں پرواز کرتا ہے، عورت زمین پر رہتی ہے۔ مرد کارخانے لگاتا ہے، عورت کو کھیتی پسند ہے۔ مرد کو چاند پر پہنچنے کی فکر ہے اور عورت کو صبح کے ناشتے کی مرد کا دماغ ایک ریڈیو سیٹ کی طرح ہے۔ وہ فضا سے خیالات حاصل کرتا ہے اور ان خیالات کو نئی شکل عطا کرتا ہے۔ عورت وجود کی گہرائی سے سچ کی کان دریافت کرتی ہے مثل مشہور ہے کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ عورت شاید اسی لئے دنیا میں کوئی عظیم کام انجام نہیں دیتی کہ عورت کو بیوی میسر نہیں ہوتی۔

عورت میں ذمہ داری کا احساس پریشان کن حد تک موجود ہوتا ہے۔ گھر کی ذمہ داری، شوہر اور بچوں کی ذمہ داری اس کو ہر وقت گھیرے رہتی ہے۔ اس میں ذمہ داری کا احساس خود بخود پیدا ہوتا ہے مرد پر ذمہ داری باہر سے لادی جاتی ہے۔ وہ طوعاً و کرہاً اپنی ذمہ داری نبھاتا ہے اور ناخوش گوار فرض کو ذمہ داری سمجھ کر انجام دیتا ہے۔ عورت کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک چار یا پانچ سالہ بچہ اپنے کھلونوں سے کھیل رہا ہے۔ ماں اس سے کہتی ہے کہ کھیل بند کرو۔ آیا کے ساتھ باغ میں جاؤ۔ بچہ جواب دیتا ہے کہ میں پہلے اپنا کھیل ختم کر لوں، جس کے معنی یہ ہیں کہ کھلونے چاہتے کہ پہلے اُن کا کام ختم کیا جائے۔ جو کام کھیل سمجھ کر شروع کیا گیا تھا، وہی اب ذمہ داری بن گیا۔ اسی لمحہ سے بچے میں اخلاقی ذمہ داری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ عورت میں اس اخلاقی ذمہ داری کا احساس عمر بھر رہتا ہے۔

عورت میں ہم دردی کا احساس مرد سے مختلف ہوتا ہے۔ مرد انسان کی تکلیف کو ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔ عورت دوسرے انسان کی تکلیف کو اس طرح محسوس کرتی ہے جیسے وہ تکلیف خود اس کو ہو۔ جس طرح ایک عضو انسانی جسم کا حصہ ہوتا ہے، اسی طرح عورت اپنے ماحول کا جزو ہوتی ہے اس لئے عورت اپنے ماحول سے الگ نہیں رہ سکتی۔ وہ تنہائی سے گھبراتی ہے۔ اگر اسے اپنے ماحول سے الگ کر دیا جائے تو اُس کا

وجود بے معنی ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے جذباتی تعلق بہت اہم ہے۔ اس تعلق کے مٹ جانے سے وہ تباہ ہو جاتی ہے۔ وہ اپنا وقت گذارنے کے لئے ملازمت کر سکتی ہے، سوشل ورک کر سکتی ہے، لیکن یہ کام اُس کی تنہائی کا علاج نہیں ہو سکتے۔

عورت وقار کی تصویر ہوتی ہے اور مرد عزت کی جستجو میں رہتا ہے۔ عزت اور وقار میں بنیادی فرق ہے۔ عزت ایک مصنوعی جذبہ ہے۔ اس کو سماج نے پیدا کیا ہے۔ ہر سماج میں عزت کا معیار مختلف ہوتا ہے۔ جس طرح ایک کلب کے قواعد صرف اس کے ممبروں پر نافذ ہوتے ہیں، اسی طرح ایک سوسائٹی کا فرد اپنی ہی سوسائٹی کے قواعد کی پابندی پر مجبور ہوتا ہے۔ سماج میں عزت حاصل کی جاتی ہے اس طرح یہ موتی کی آب کی طرح ختم بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس، وقار ایک ٹھوس چیز ہے یہ عورت کے وجود کا ایک اٹوٹ حصہ ہے۔ عورت اپنی بے راہ روی کے باوجود اپنا وقار قائم رکھ سکتی ہے جب کہ مرد کی عزت موتی کی آب کی طرح ہوتی ہے، جو ایک دفعہ ختم ہو جائے تو دوبارہ حاصل نہیں ہوتی۔ عورت تباہ اور برباد ہو سکتی ہے، لیکن وہ وقار نہیں کھو سکتی۔ ایک طوائف بھی غیر مہذب بات سننے پر تیوری چڑھا لیتی ہے اور اپنے وقار پر آنچ نہیں آنے دیتی۔

یہ بات مشہور ہے کہ مرد کی زندگی عمل کی تصویر ہوتی ہے اور عورت کی زندگی ردِ عمل کے طور پر گھومتی ہے۔ لیکن یہ ایک سطحی اندازہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ محبت اور عشق میں ازدواجی و رفاقتی زندگی میں عورت مرد کے عمل کی محتاج ہوتی ہے۔ لیکن اگر ہم گہری نظر سے جائزہ لیں تو ہم پر یہ راز آشکار ہوگا کہ مرد کا عمل دراصل اس کا ردِ عمل ہی ہے۔ اگرچہ ظاہری طور پر کوئی یہ کارروائی دیکھ نہیں سکتا۔ مثلاً مرد عورت پر فریفتہ ہوتا ہے، اُس کے گھر کے چکر کاٹتا ہے، اس کو عشقیہ خطوط لکھتا ہے۔ اس سے اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے۔ یہ سب دراصل عورت کی نگاہِ غلط انداز کا کرشمہ ہوتا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں عورتیں ایک گھسی پٹی چال چلتی ہیں۔ وہ کسی مرد کو پسند کر لیں تو اُس کے سامنے سے گذرتی ہوئی اپنا رومال گرا دیتی ہیں مرد تہذیب کے تقاضے سے مجبور ہو کر وہ رومال اُٹھا لیتا ہے اور اسے عورت کے حوالے کر دیتا ہے۔ عورت مسکرا کر اُس کا شکریہ ادا کرتی ہے، اور مرد کا کام تمام ہو جاتا ہے۔ اُس کے بعد جو سلسلہ شروع ہوتا ہے وہ اسی نگاہِ غلط انداز کا نتیجہ ہوتا ہے۔ عورت مرد کے دل میں ہیجان پیدا کرتی ہے اور اُس کے جذبات میں آگ لگا دیتی ہے، مگر یہ کارروائی اتنی سبک ہوتی ہے کہ دیکھنے والوں کو نظر نہیں آتی اس کے علاوہ عورت کو انتخاب کا حق حاصل ہوتا ہے۔ اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ مرد کی محبت کو تسلیم کرے یا اُسے ٹھکرا دے۔ پہلی صورت میں مرد خوشی کے مارے پھولا نہیں سماتا، دوسری صورت میں اُس کی انا کا غبارہ پچک جاتا ہے۔ وہ ٹھکرا دینے والی عورت کو ہرجائی اور آوارہ کے نام سے پکارتا ہے دراصل مرد محبت کا کھیل کھیلتا ہے لیکن ہار جیت کا فیصلہ عورت کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

مرد اور عورت کے طرزِ عمل کا یہ فرق ہی ان کے درمیان اختلاف کا باعث بن جاتا ہے۔ یہ اختلاف اذیت ناک ثابت ہوتا ہے، مگر اس اختلاف سے بچنا مشکل ہے مرد جب عورت سے محبت کرتا ہے تو وہ بھی اُس کا جواب محبت سے دیتی ہے۔ ایک دفعہ عورت کے جذبات بیدار ہو جائیں تو اُس کی شخصیت محبت کے سیلاب میں غرق ہو جاتی ہے۔ یہ جھیل زندگی بھر پانی سے بھری رہتی ہے مرد کی محبت ایک پودے کی طرح ہوتی ہے پودا آہستہ آہستہ پروان چڑھتا ہے، اُس میں پھول کھلتے ہیں لیکن کچھ عرصہ کے بعد پھول مرجھاتے ہیں اور پودا سوکھ جاتا ہے۔ دنیا میں ہر عمل کا یہی انجام ہوتا ہے۔ مرد کی محبت بھی ٹھنڈی پڑ جاتی ہے، اُس کی آگ بجھ جاتی ہے۔ وہ محبت کی راہیں طے کرتا ہوا بے رُخی کی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ عورت اس منزل تک نہیں پہنچتی۔ عورت کی محبت کی جھیل کبھی نہیں سوکھتی۔ اُن مردوں کی تعداد جو اُکتا کر عورت کو چھوڑ دیتے ہیں ان عورتوں سے کہیں زیادہ ہے جو مرد کو اسی وجہ سے چھوڑ دیتی ہیں وقت کا یہ ظلم مرد اور عورت کے مابین ایک دیوار کھڑی کر دیتا ہے۔ مگر یہ قدرت کی ناانصافی ہے۔ اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔

عورت کے وقار کا مسئلہ ایک بار پھر سامنے آتا ہے۔ عورت کا وقار اُس کی خود سپردگی کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ یہ خود سپردگی ازدواجی تعلقات کی کامیابی کے لئے بہت ضروری ہے۔ عورت سمجھتی ہے کہ ان تعلقات کے دوران اُس کا وجود ہی کافی ہے۔ مرد اس نقطۂ نظر کو عدم تعاون اور بے رُخی سمجھتا ہے اس طرح غلط فہمیاں پیدا ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ یہ غلط فہمی دونوں کے لئے اذیت کا باعث بن جاتی ہے۔ ●●



سکھی چلی ساجن کے دیس

ظفر سنبھلی

آج تو چھوڑ کر اپنے بابل کا گھر !　　آج تُو بن کے دُلہن چلی جائے گی
کتنی آنکھوں کے موتی بکھر جائیں گے　　اپنی فرقت سے تو سب کو تڑپائے گی

سب کی آنکھوں میں گھومے گی صورت تری
دل دُکھا دے گی ماں کا ضرورت تری

تھاپ ڈھولک کی سُن سُن کے تڑپے گی تو　　سکھیاں گائیں گی جب مِل کے بابل کے گیت
لیکن اِس غم سے یہ بھی مِلے گی خوشی　　آج سے تجھ کو مِل جائے گا کوئی میت

پہلے پہلے تو تو جس سے شرمائے گی
بعد میں اُس کی عظمت پہ اِترائے گی

اور چاہیں گے اب تجھ کو بھائی بہن　　شفقتیں باپ کی اور بڑھ جائیں گی
کام آئیں گی ماں کی دُعائیں سدا　　جو تری آرزوں کو مہکائیں گی

ہو نہ میکے سے تجھ کو بچھڑنے کا غم
تجھ پہ سُسرال کا اِس قدر ہو کرم

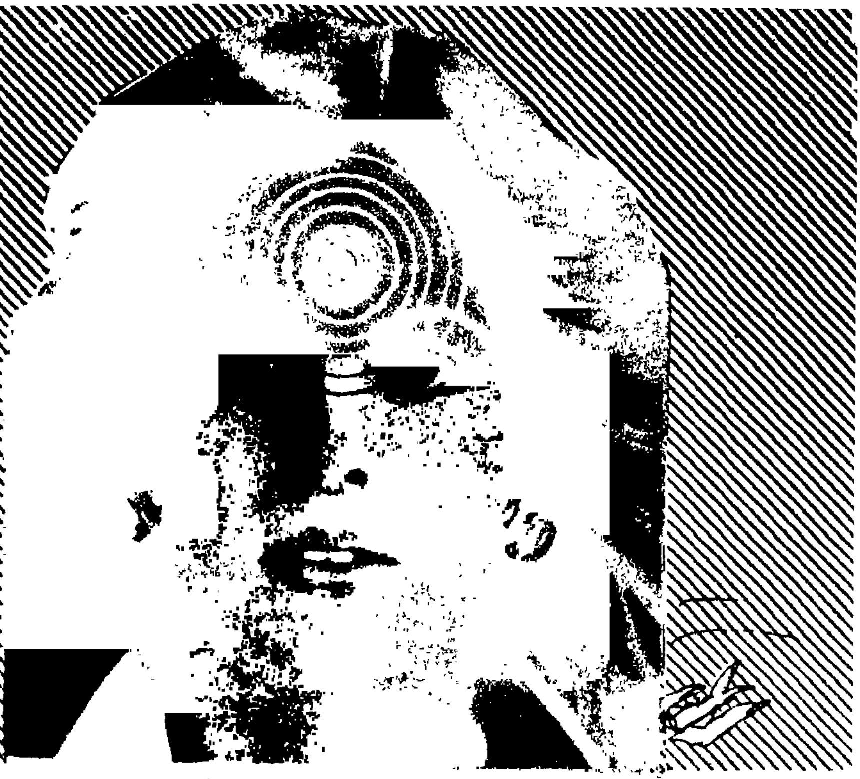
سُرخ جوڑے کی خوشبو اُڑے نہ کبھی　　ہاتھ تیرے حِنا سے گلابی رہیں
چاند سے تیرے رُخ کو لگے نہ گہن　　زندگی بھر تجھے سب سُہاگن کہیں

کر سکھی ! تو سکھی کا یہ تحفہ قبول !
وقتِ رُخصت، میں دیتی ہوں اشکوں کے پھول



کیا آپ گلے کی تکلیفوں میں اکثر مبتلا رہتے ہیں اور اس کی وجہ سے سخت پریشان ہیں، لیکن یہ نہ سمجھئے کہ ایسی پریشان کن بیماری سے گلا کاٹ دینے سے ہی چھٹکارہ مل سکتا ہے۔ ذرا ٹھہریئے! خالص دیسی ادویات سے تیار کیا ہوا "**ٹونسیلیکس**" ایک بار، صرف ایک بار استعمال کر کے تو دیکھئے، پھر آپ کو گلے کے غدود بڑھ جانے گلے کی سرسراہٹ، خراش، گلے کے ورم، زخم اور دوسرے تمام امراض کی شکایت نہیں رہے گی۔ اگر آپ کے علم میں کوئی ایسا مریض ہو جس کے گلے کے غدود (ٹانسلائٹس) کا آپریشن ہونا ہے تو اُسے اس دوا کے بارے میں ضرور بتایئے گا کیوں کہ پھر اُسے آپریشن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ چھوٹے بچے جو کھٹی میٹھی چیزیں کھا کر گلا خراب کر لیتے ہیں اُن کے لئے بھی یہ بہت کام کی دوا ہے۔ ہر گھر میں اس کا رہنا بہت ہی ضروری ہے۔ قیمت: پانچ روپے ـــــ شمع (یونانی اینڈ آیورویدک) لیباریٹریز، لال کنواں، دہلی ۶

آپ کی ذہنی اُلجھن اور اُس کا حل



س : میری بیوی بہت ضدی اور تنک مزاج ہے۔ ہماری شادی کو دو سال ہو چکے ہیں۔ میں اُس سے بہت محبت کرتا ہوں، لیکن اُس کی اس عادت کی وجہ سے بہت پریشان رہتا ہوں۔ کبھی کبھی تو مجھے بہت زور کا غصہ آتا ہے، لیکن اس کا اظہار میں خاموش رہ کر کرتا ہوں۔ وہ رات کو رو دھو کر اپنے رویّہ کی معافی مانگ لیتی ہے، لیکن دوسرے دن اُس کا اثر پھر ختم ہو جاتا ہے۔ ضد کرتی ہے کہ دوا نہیں کھاؤں گی، کھانا نہیں کھاؤں گی۔ طبیعت خراب ہے لیکن کام ضرور کروں گی، کسی پارٹی میں نہیں جاؤں گی آپ ہی بتلائیے میں کروں۔ ؟

ج : آپ کا خط پڑھ کر اندازہ ہوا کہ آپ دونوں ہی ضد پر اڑے ہوتے ہیں۔ یاد رکھئے ایک ضد کا جواب دوسری ضد سے نہیں دیا جا سکتا۔ آپ کی بیوی ضد کرتی ہیں کہ اُن کی بات مانی جائے اور آپ ضد کرتے ہیں کہ آپ کی بات تسلیم کی جائے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کی ضد آپ کی بیوی کے بھلے کے لئے ہے، اس لئے وہ ہٹ دھرمی نہیں۔ لیکن جب دو انسانوں کا ٹکراؤ ہوتا ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ دونوں ہی ضدی ہیں۔ مثال کے طور پر ماں اگر بچّے کو دودھ پلانا چاہے تو وہ حق بجانب ہے، اس لئے کہ دودھ اُس کی صحت کے لئے ضروری ہے، لیکن بچّہ دودھ پینے سے انکار کرے تو یہاں بھی دونوں ضدی کہلائیں گے۔ اگرچہ حقیقت میں ماں کی ضد ضد نہیں ہے۔ وہ بچّے کے بھلے کے لئے ہے اور بچّے کی ضد واقعی ضد ہے۔

آپ کی بیوی کی ضد کوئی نئی بات نہیں اور نہ یہ آپ کی شادی کے بعد پیدا ہوئی ہے۔ اس عادت کا تعلق اُن کی ابتدائی زندگی سے ہے۔ وہ نہیں چاہتیں کہ اُن سے زبردستی کسی بات کو منوایا جائے۔ اس سلسلے میں وہ مجبور ہیں۔ ضد کرنا اُن کی خواہش نہیں ہے، بلکہ ان کی جذباتی ضرورت ہے۔ میری رائے میں آپ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیجئے۔ وہ دوا کھائیں یا نہ کھائیں، آرام کریں یا نہ کریں، آپ ان کو بچّہ نہ سمجھیں، بلکہ ایک ذمّہ دار انسان سمجھیں۔ اس طرح ان کی جذباتی ضرورت پوری ہو جائے گی۔ رفتہ رفتہ انہیں اپنی غلطیوں

ڈاکٹر بھاٹیہ ایک مشہور ماہرِ نفسیات ہیں۔ وہ بانو پڑھنے والوں کے سوالات کا جواب دیں گے اور ان کے نفسیاتی مسئلوں کا تجزیہ اور حل پیش کریں گے۔ پتہ : معرفت ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۲ ۱۱۰۰۰

کا احساس ہو جائے گا۔ آپ انہیں یہ احساس دلائیں کہ آپ ان پر اپنی رائے ٹھونسنا نہیں چاہتے، خواہ وہ ان کے بھلے کے لئے ہی کیوں نہ ہو۔ انہیں اس بات کا موقع دیجئے کہ وہ خود اپنے معاملات طے کریں۔ آپ صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ انہیں کبھی کبھی یاد دلا دیں کہ وہ جو مناسب سمجھیں کریں۔ دوا کھانا یا آرام کرنا ہے یا کسی پارٹی میں جانا ہے، اس بات کا فیصلہ آپ ان ہی پر چھوڑ دیں۔ اس طرح آپ کا غصہ ایک پیار بھرے مشورے میں بدل جائے گا اور ان کے طرزِ عمل میں نمایاں فرق آ جائے گا۔

اپنی ازدواجی زندگی کے متعلق بھی سوچیں کیا وہ تسلی بخش ہے؟ اگر نہیں ہے تو آپ اس بارے میں بھی ان سے بات چیت کریں۔

س: میں ایک متوسط طبقے کی لڑکی ہوں۔ انٹر سائنس میں پڑھتی ہوں۔ تین سال ہوئے میں ایک لڑکے سے پیار کرتی تھی۔ فرسٹ ائیر کے بعد ہم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ میں اس لڑکے کے متعلق اچھی طرح معلومات حاصل نہ کر سکی انٹر میں پہنچ کر میں ایک دوسرے لڑکے میں دلچسپی لینے لگی۔ وہ لڑکا بھی مجھ میں دلچسپی لینے لگا۔ وہ حالات کا مارا ہوا تھا۔ مجھے اس سے ہمدردی ہو گئی۔ اتفاقاً پہلا لڑکا بھی اسی کالج میں پہنچ گیا اب ہم تینوں ایک ہی کالج میں ہیں یہاں معلوم ہوا کہ پہلا لڑکا اچھا لڑکا نہیں ہے وہ بری صحبت میں رہتا ہے۔ دونوں لڑکے مجھ سے پیار کرتے ہیں، اور شادی کو تیار ہیں، سمجھ میں نہیں آتا، میں کیا کروں؟

ج: آپ کے مسئلہ میں کوئی الجھن نہیں، اگر کوئی الجھن ہے تو صرف آپ کے دماغ میں ہے انگریزی میں ایک کہاوت ہے کہ "میں کیک کھانا بھی چاہتی ہوں اور اسے کھانا بھی" یہ ممکن نہیں آپ چاہتی ہیں کہ آپ کے سلائس کے دونوں طرف مکھن لگا ہو۔ آپ اس بات پر خوش ہیں کہ دو دو لڑکے آپ سے محبت کرتے ہیں۔

اِس عمر میں جب کوئی لڑکا پیار کرتا ہے تو لڑکی کے وجود میں ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ یہ قانونِ قدرت ہے۔ انسان کا نفس چاہتا ہے کہ وہ اس محبت کا مزہ لے، اس سے لطف اٹھائے اس طرح اس کی خودی کو غذا پہنچتی ہے، اس کے ذوقِ نمو کی تسکین ہوتی ہے۔ آپ کی الجھن کا حل آپ کے خط میں ہی موجود ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ جب پہلے لڑکے کا چال چلن اچھا نہیں اور اس کی صحبت بھی خراب ہے تو پھر ایسی کیا چیز ہے جو آپ کو اس کی طرف کھینچ رہی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ دونوں لڑکے آپ سے شادی کرنے کے لئے تیار ہیں۔ کیا انٹرمیڈیٹ کا طالب علم آپ سے شادی کر سکتا ہے؟ کیا وہ شادی کے بعد گرہستی کا بوجھ اٹھا سکتا ہے؟ ابھی تو وہ خود طالب علم ہے اس نے دنیا میں قدم نہیں رکھا ہے۔ اگر آپ انٹرمیڈیٹ کی طالب علم ہیں تو آپ اور وہ ہم عمر ہوئے۔ آپ کو ایسا لڑکا ملنا چاہئے جو دنیا میں داخل ہو چکا ہو، جو کاروبار یا ملازمت کر رہا ہو، جو آپ کا بار اٹھا سکے۔ یقیناً یہ لڑکا آپ سے عمر میں بڑا ہونا چاہئے۔ آپ کے خط سے یہ بات تو ظاہر ہوتی ہے کہ دونوں لڑکے آپ سے شادی کرنا چاہتے ہیں، لیکن یہ بات صاف نہیں ہوتی کہ یہ شادی ہو بھی سکتی ہے یا نہیں۔ اگر ہو سکتی ہے تو پھر آپ کو ہی طے کرنا ہے۔ شادی کے لئے جو باتیں دیکھی جاتی ہیں مثلاً کیا لڑکا اچھا ہے، گھر بار اچھا ہے؟) وہ آپ دیکھ لیں اور خود ہی فیصلہ کریں کہ کس لڑکے کے ساتھ آپ کی زندگی سنور سکتی ہے۔ میری رائے میں آپ ایک آدھ سال کے لئے شادی کا خیال دماغ سے نکال دیں۔ اس پر دھیان دیں کہ کوشش اس عمر میں قدرتی طور پر ہوتی ہے۔ اس طرح سوچنے کے بعد آپ کو معلوم ہو گا کہ یہ کشش تقریباً ہر لڑکے میں موجود ہے۔ ہر لڑکے کا اظہارِ محبت آپ کے جسم میں ہیجان پیدا کر سکتا ہے اس انکشاف کے بعد آپ کا راستہ آسان ہو جائے گا۔ آپ دوسرے لڑکوں سے بھی ملیں، اپنے سماجی دائرے کو وسیع کریں۔ اس طرح آپ کے خیالات میں بھی وسعت پیدا ہو جائے گی اور آپ کی الجھن خود بخود حل ہو جائے گی۔

س: میری عمر ۲۲ سال ہے۔ میری شادی کو دو سال گزر گئے ہیں۔ میرا ایک سال کا بچہ ہے۔ میں متوسط طبقے کے کاروباری گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ والد اور چھوٹے بھائی کے ساتھ کاروبار میں ہاتھ بٹاتا ہوں۔ میرے والد اچھی آمدنی ہونے کے باوجود گھریلو اخراجات میں سختی سے کام لیتے ہیں، ان کی سختی کی وجہ سے میری بیوی اور سسرال والے مجھے الگ کام کرنے کے لئے کہتے ہیں۔ میری اپنی کوئی مالی حیثیت نہیں کہیں سے کچھ ملنے کی امید بھی نہیں۔ بیوی کو سمجھاتا ہوں تو وہ میکے چلے جانے کی دھمکی دیتی ہے۔ ایک طرف بیوی بچے کا خیال، دوسری مالی مسائل کی کمی۔ اس کے علاوہ میں علیحدہ ہو کر گھر والوں کو تکلیف بھی دینا نہیں چاہتا۔ بڑی الجھن میں ہوں۔ کوئی راستہ بتائیے۔

ج: جو سوال آپ نے کیا ہے اس کا حل آپ کے پاس نہیں ہے تو میرے پاس بھی نہیں یہ معاملہ خالی دماغی الجھن کا نہیں، بلکہ زندگی کے اس مسئلے کا ہے، جس پر کسی کا کنٹرول نہیں۔ آپ کی بیوی اور سسرال والے آپ پر زور دیتے ہیں کہ آپ اپنے والد سے الگ ہو جائیں۔ میرے خیال میں وہ اتنے بے وقوف نہیں کہ آپ کو ہوا میں محل بنانے کے لئے کہیں۔ جب آپ کے پاس پیسہ نہیں تو وہ کس طرح علیحدہ

ہونے پر زور دے سکتے ہیں ؟ آپ ان سے بات چیت کریں۔ اپنے حالات ان کے سامنے رکھیں۔ وہ آپ کو الگ کام کرنے کے لئے کہتے ہیں تو ان سے پوچھئے کہ اس بارے میں خود ان کی تجویز کیا ہے۔ کیا وہ لوگ آپ کی کوئی مدد کر سکتے ہیں یا خالی مشورہ ہی دے سکتے ہیں ؟ دوسری بات یہ ہے کہ آپ اپنے والد صاحب سے بہت ڈرتے ہیں۔ جب ان کے پاس پیسہ ہے تو وہ گھر کے اخراجات میں سختی سے کام کیوں لیتے ہیں۔ یہ نامناسب ہے۔ آپ اس بات پر ان سے بحث کریں، انہیں سمجھائیں، ان سے خوف نہ کھائیں، ہمّت سے کام لیں۔ ممکن ہے کہ آپ ان کے رویّہ کو بدلنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ اپنے والد سے ڈرتے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ آپ ان سے ڈرتے ہیں۔ اسی لئے وہ آپ کو دباتے ہیں۔ آپ اپنے دل سے ان کا ڈر نکال دیجئے۔ جب انہیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ آپ ان سے نہیں ڈرتے تو وہ آپ کو نہیں دبا سکیں گے۔

س : میرا سوال بہت ہی الجھا ہوا ہے۔ میرے شوہر اکثر شہر سے باہر رہتے ہیں۔ مہینوں مجھے ان سے جدا رہنا پڑتا ہے۔ ان کا کام ہی ایسا ہے۔ میں ان کی غیر موجودگی میں اپنے ایک رشتہ دار لڑکے میں دل چسپی لینے لگی۔ ہماری چاہت ایک دوسرے کے لئے بہت بڑھ گئی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے بغیر رہ نہیں سکتے۔ جب میرے شوہر گھر آتے ہیں تو میں بور ہو جاتی ہوں۔ میرے بچے بھی ہیں، پھر بھی وہ لڑکا مجھ سے شادی کرنے کے لئے تیار ہے۔ مانا کہ یہ الجھن میری ہی پیدا کی ہوئی ہے لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ حالات اتنے سنگین ہو جائیں گے۔ آپ اپنا مفید مشورہ مجھے دیں۔

ج : جب شوہر کام کے سلسلے میں بیوی سے لمبے عرصہ کے لئے دور رہتا ہے تو اس طرح کی دل چسپی اور الجھی ہوئی کہانیاں اکثر پیدا ہوتی ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ کا تعلق اس لڑکے سے کتنا بڑھ چکا ہے۔ کیا آپ اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کر چکی ہیں ؟ اگر ایسا ہے تو میں آپ کو کیا مشورہ دے سکتا ہوں۔ اگر آپ کو یہ دوسرے صاحب ہی اچھے لگتے ہیں تو میری صلاح سے یہ آپ کو بُرے نہیں لگیں گے۔ پھر بھی آپ نے میرا مشورہ مانگا ہے تو میرا فرض ہے کہ میں آپ کو صحیح مشورہ دوں۔

آپ تنہائی میں بیٹھ کر ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ آپ کی یہ حالت کیسے پیدا ہوئی۔ آپ سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچیں گی کہ یہ آپ کے شوہر کے لمبے عرصے تک جدا رہنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ بہتر تو یہ ہے کہ آپ اپنے شوہر سے ہی اس بارے میں بات چیت کریں اگر ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ دونوں لمبے عرصے تک ایک دوسرے سے جدا نہ رہیں تو آپ کو یہ قدم اٹھانے کی ضرورت ہی نہ رہے گی لیکن ہے کہ آپ کے شوہر آپ کی تکلیف کا خیال کر کے اپنے کام میں ایسی تبدیلی پیدا کر دیں کہ انہیں بہت عرصے تک گھر سے باہر نہ رہنا پڑے۔ اس طرح آپ کے مسئلے کا حل نکل سکتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ کچھ عرصے کے لئے اپنے نئے چاہنے والے سے ملنا جلنا بند کر دیں۔ ان سے الگ رہ کر دیکھیں کہ آپ کو کیسا محسوس ہوتا ہے۔ اگر آپ محسوس کرتی ہیں کہ آپ کو صرف دوسری شادی میں ہی خوشی مل سکتی ہے تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

شادی گناہ نہیں ہے۔ یہ ایک سماجی مسئلہ ہے دراصل آپ کی اس حالت کی ذمّہ دار صرف ایک شے ہے، اور وہ ہے ازدواجی تعلقات سے یک سر محرومی۔ اگر یہ تعلقات آپ کے شوہر کے ساتھ کچھ بنے رہتے تو یہ حالت پیدا نہ ہوتی۔ اس محرومی نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ آپ کے رشتہ دار نے آپ کے خیالات کو شکل عطا کی اور آپ امیدوں کے جھولے پر جھولنے لگیں۔ میرے خیال میں آپ کا مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے۔ آپ کو یہ فیصلہ کرنے میں خاصہ وقت لگے گا کہ آپ آخری قدم اٹھا سکتی ہیں یا نہیں۔ آپ کی دوسری شادی سماج میں تشہیر کا باعث بن جائے گی۔ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے بڑی ہمّت درکار ہے

س : میں ایک قدامت پرست، متوسط گھرانے کی معمولی شکل وصورت کی لڑکی ہوں۔ کالج میں نہ چاہتے ہوئے بھی میری دوستی ایک لڑکے سے ہو گئی۔ اب ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں زیادہ دوستی ہونے پر مجھے معلوم ہوا کہ وہ لڑکا بہت اونچے اور دولت مند گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ خوب صورتی بھی اس گھرانے کی جاگیر بنی ہوئی ہے۔ ہم دونوں کے گھر والوں کو ہماری محبت کا علم نہیں۔ میرے خیال میں اس لڑکے کے گھر والے مجھ سے رشتہ کرنے پر کبھی رضامند نہیں ہوں گے۔ میں نہ خوب صورت ہوں اور نہ دولت مند۔ وہ لوگ مغرور بھی ہیں۔ مجھے یہی فکر لگی رہتی ہے کہ اب کیا ہوگا۔ اگر میری شادی ہو بھی گئی تو میں اتنے خوب صورت اور مال دار گھرانے میں کس طرح رہ سکوں گی۔ سوچتی ہوں کہ اس لڑکے سے ملنا جلنا بند کر دوں۔ وہ بے وفا سمجھ کر مجھے بھول جائے گا۔ میری راتوں کی نیند اور دن کا چین ختم

دیتا ہے۔

ج: آپ کا خط پڑھ کر آپ سے ہم دردی پیدا ہوئی۔ اس سے پہلے کہ آپ اپنی شکل و صورت کو معمولی سمجھ کر اور اپنی غریبی کے متعلق سوچ سوچ کر بیمار ہو جائیں یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ وہ لڑکا بھی آپ سے محبت کرتا ہے یا نہیں۔ اس بات کا فیصلہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ آپ اس کے سامنے شادی کا مسئلہ چھیڑیں دیکھئے وہ کیا کہتا ہے۔ اگر وہ واقعی شادی کرنے کو تیار ہے اور آپ کی خاطر اپنے گھر والوں سے ٹکر لینے کو آمادہ ہے تو وہ واقعی آپ سے محبت کرتا ہے۔ شادی کا معاملہ اسی کو طے کرنا ہے۔ اگر وہ خالی محبت کرنا چاہتا ہے اور شادی کی ذمہ داری اپنے والدین کے سپرد کرنا چاہتا ہے تو آپ اس سے ملنا جلنا ترک کر دیں اس میں آپ کی بھلائی ہے۔ اس میں بے وفائی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ آپ کی الجھن بالکل ختم ہو جائے گی۔ اگر بات ایک طرف ہو جائے اگر وہ اپنے والدین سے ڈرتا ہے اور شادی کی ذمہ داری اُن ہی کو سونپتا ہے تو آپ کے دل پر چوٹ لگے گی۔ آپ اس سے ترکِ تعلق پر مشکل سے راضی ہوں گی۔ لیکن آپ کو یہ کڑوی گولی نگلنا پڑے گی۔ اس کے بعد حالات بہتر ہو جائیں گے۔ آج آپ اس لڑکے سے اس امید پر مل رہی ہیں کہ وہ آپ سے اتنا قریب ہو جائے کہ شادی کے لئے انکار نہ کر سکے۔ یہ صورتِ حال آپ کے ذہن میں الجھن پیدا کرتی ہے۔ آپ امید اور ناامیدی کے درمیان لٹکتی رہتی ہیں اس لئے دو ٹوک فیصلہ کر لینا بہتر ہے۔ اس کا نتیجہ اچھا نکلے گا۔ اگر یہ شادی ناممکن ہے تو اس حقیقت کو تسلیم کر لینا ہی بہتر ہے۔ وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ آپ کے زخم کچھ عرصہ میں ضرور مندمل ہو جائیں گے۔

س: میں تین بچوں کی ماں ہوں۔ سب سے بڑے بچے کی عمر ۱۵ سال ہے۔ میرے شوہر کاروبار کرتے ہیں اور کاروباری مصروفیتوں میں مجھے بالکل نظر انداز کر چکے ہیں۔ ویسے مجھے آرام کی ہر چیز میسر ہے۔ بچوں کا خیال اور گھر کا کام ہی میری زندگی ہے۔ میں ایک جذباتی عورت ہوں۔ مگر شوہر کی رفاقت اور محبت سے یک سر محرومی نے مجھے نڈھال کر رکھا ہے۔ میں اس بارے میں اپنے شوہر سے بھی بات چیت کر چکی ہوں، مگر انہیں کسی بات کی پروا نہیں۔ اس اکیلے پن اور تنہائی سے میں تنگ آ گئی ہوں۔ اپنی اس کوفت اور تنہائی سے کیسے نجات پاؤں؟

ج: جب آپ کے شوہر آپ کی طرف سے بے پروا رہتے ہیں اور آپ کا خیال نہیں کرتے تو اس مسئلے کا ایک حل خود آپ کے ہاتھ میں ہے۔ کیا آپ اس حقیقت کو مان کر اس پر راضی برضا ہو سکتی ہیں کہ وہ آپ کی پروا نہیں کرتے تو آپ کی بلا سے۔ اِن کی بے پروائی کو اصلیت مان کر آپ اپنا دل کسی اور کام میں لگائیں۔ مثلاً آپ چھوٹے بچوں کو پڑھا سکتی ہیں یا سوشل ورک کر سکتی ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ آپ کی توجہ کا مرکز آپ کے شوہر کی جگہ کوئی مفید کام ہو جائے۔ آپ کو اس سے فائدہ ہوگا۔ دن بھر کڑھنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ کسی نئے کام میں دلچسپی لینے سے آپ کا خیال بٹ جائے گا اور شوہر کی بے پروائی کی کوئی اہمیت نہیں رہے گی۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ کے شوہر آپ کا خیال کیوں نہیں کرتے؟ کیا وہ آوارہ گرد ہیں؟ کیا وہ کسی دوسری عورت کی محبت میں گرفتار ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ان کی بے پروائی کا کیا سبب ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اس صورتِ حال کی ذمہ دار آپ خود ہوں کہیں آپ میں تو کچھ کمی نہیں ہے۔ جب عورت یہ سوچتی ہے کہ اس کا خاوند اس سے محبت نہیں کرتا تو وہ بھی اس سے بے رُخی کا برتاؤ کرتی ہے۔ ازدواجی تعلقات میں یہ بے رُخی بہت اہم رول ادا کرتی ہے۔ دراصل بیوی کی بے رُخی اور سرد مہری اُس کے دبے ہوئے غصے کا اظہار ہوتا ہے۔ عورت کے پاس اس سے بڑا ہتھیار نہیں ہے۔ وہ اسے بے دریغ استعمال کرتی ہے۔ یہ بے رُخی ازدواجی تعلقات میں بے لطفی پیدا کرتی ہے مرد سمجھتا ہے کہ عورت اس سے محبت نہیں کرتی وہ اپنے غصے کا اظہار بیوی سے بے پروا رہ کر رہتا ہے۔ اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے، لیکن ایسا ہی ہوتا ہے اور عموماً ہر گھر میں ہوتا ہے۔ عورت سمجھتی ہے کہ ازدواجی تعلقات میں اس کی شرکت ہی کافی ہے۔ وہ اپنی نسوانیت سے مجبور ہے۔ شرم و حیا اس کے آڑے آ جاتی ہے۔ عورت کو کم زور سمجھا جاتا ہے۔ کسی بات میں اس کا پہل کرنا اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ ازدواجی تعلقات میں بھی عورت کی یہی بے جا شرم کارفرما رہتی ہے۔ بہت سے مرد عورت کی اس شرم و حیا کو بے رُخی کا نام دیتے ہیں۔ وہ نہیں سمجھتے کہ سماج نے عورت کو ایسی ہی تعلیم دی ہے۔ مرد چاہتا ہے کہ عورت بھی ازدواجی تعلقات میں گرم جوشی کا اظہار کرے۔ آپ اس معاملے پر بھی غور کریں۔ ممکن ہے کہ اس طرح سوچ بچار کرنے کے بعد آپ کی گتھی سلجھ جائے۔

●●

بے بی

ہمالیہ والا



سائیکل کی گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ پھر اخبار دالان میں گرنے کی آواز آئی! اشوک بابو نے جھک کر اخبار اٹھا لیا۔ ہفتہ وار ایڈیشن ہونے کی وجہ سے اخبار میں زیادہ صفحے تھے، زیادہ اشتہار تھے۔ اشوک بابو نے پہلے 'ضرورتِ رشتہ' کے اشتہارات پر نظر دوڑائی اور سکون کی سانس لیتے ہوئے سوچا "شکر ہے آج مجھے کسی اشتہار کا جواب دینا نہیں پڑے گا۔"

بے بی جب نہا کر دالان میں آئی تو اشوک بابو اُسے دیکھتے ہی رہ گئے۔ وہ نئی ساڑی پہنے ہوئے تھی اور بڑی خوب صورت لگ رہی تھی۔ اشوک بابو نے اخبار اُسے دیتے ہوئے پوچھا

"یہ ساڑی تم نے کب خریدی؟"

"اوہ ——" بے بی کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "پچھلے مہینے خریدی تھی۔"

"گھر کا ٹیکس ادا کرنا ہے۔" وہ بولے "میں سوچتا ہوں کہ تمہاری تنخواہ ملنے پر ادا کر دوں ——"

"ہوں ——" بے بی نے ناراضگی سے کہا "سب کچھ میری تنخواہ سے ہی ہوتا رہے گا کیا؟ میرے بڑے بھائی کچھ روپیہ کیوں نہیں بھیجتے؟ اس ماہ بھی میں گھڑی نہیں خرید سکوں گی، ہے نا؟"

اشوک بابو کے پاس اپنی بیٹی کی برہمی کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ خاموش رہے۔ پھر بے بی کو کچھ خیال آیا تو وہ پوچھ بیٹھی "کل آپ کا انٹرویو تھا نا —— کیا ہوا ڈیڈی؟"

اشوک بابو نروس سے ہو گئے۔

"وہ جہاز راں کمپنی کا اشتہار تھا نا؟" بے بی نے یاد دلایا "انہوں نے لکھا تھا کہ ریٹائرڈ لوگوں کی ضرورت ہے۔"

"ہاں ——" اشوک بابو کو جیسے یاد آیا۔ "وہ انٹرویو تو کل ہو گا۔"

"مجھے اچھی طرح یاد ہے، ڈیڈی، وہ سنیچر کو یعنی کل تھا ——"

اشوک بابو نے جلدی جلدی اپنی جیب سے انٹرویو کا خط نکالا —— سنیچر کو ہی انٹرویو تھا —— بے بی کی ماں بہت زیادہ مایوس ہوئی۔ اس نے کہا "آپ ایسی اہم اور ضروری باتوں کو بھی بھول جاتے ہیں۔ آج سہ پہر کو آپ کو سیٹھ کالونی جانا ہے یاد ہے یا وہ بھی بھول گئے؟"

"ہاں یاد ہے، میں ضرور جاؤں گا ——" اشوک بابو نے کہا۔

دن کا کھانا کھا کر بے بی اپنی دوست کے ساتھ میٹنی شو دیکھنے چلی گئی۔ اشوک بابو اخبار پڑھتے پڑھتے اپنی آرام کرسی پر سو گئے۔ جب وہ اٹھے تو چار بجنے والے تھے۔ انہوں نے جلدی سے تیار ہو کر سیٹھ کالونی کی راہ لی۔ انہیں معلوم ہوا تھا کہ وہاں بے بی کے لئے رشتہ ملنے کا امکان ہے۔ اسی لئے وہ لڑکے کے باپ سے بات چیت کرنے جا رہے تھے۔

مسٹر شرما لڑکے کے باپ تھے۔ انہوں نے خاطر مدارات کرنے کے بعد کہا۔

"میں رامو سے پوچھوں گا۔ میں صرف کوشش کر سکتا ہوں۔ کچھ دن پہلے وہ اپنے چچا سے کہہ رہا تھا کہ اس کا ابھی شادی کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔"

"مگر ——" اشوک بابو کچھ کہتے کہتے رُک گئے۔ انہیں مسٹر شرما کی باتیں سُن کر یک گونہ تسکین ہوئی۔

"ہمارے یہاں بھی دو کنواری لڑکیاں ہیں" مسٹر شرما بولے۔ "رامو کہتا ہے کہ جب تک دونوں کی شادی نہیں ہو جاتی وہ شادی نہیں کرے گا۔"

"شاید ان کا خیال ٹھیک ہی ہے۔" اشوک

بابو بولے۔
"میں پھر بھی راموسے بات کر دیکھوں گا" مسٹر شرما نے کہا "اگر وہ مان گئے تو میں آپ کو مطلع کروں گا"
اشوک بابو اپنے گھر لوٹنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

بس اسٹاپ کے قریب پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ پان کی دُکان سے ہٹ کر کچھ عورتیں بیٹھی تھیں ——— اور ان میں ان کی اپنی بیٹی بے بی بھی شامل تھی۔ انہوں نے اپنے آپ کو دُکان کے پیچھے چھپالیا۔ بے بی بڑی بے زاری سے سامنے خلا میں گھور رہی تھی۔ اس کے قریب ہی دو چار لوفر ٹائپ کے لڑکے کھڑے تھے۔ وہ سگریٹ کا دھواں پھونک رہے تھے، کھانس رہے تھے، ہنس رہے تھے اور گا رہے تھے۔ اشوک بابو نے بڑی بے بسی محسوس کی۔ ان بدمعاش لڑکوں کو اپنی رذیل حرکتوں سے وہ روک بھی نہیں سکتے تھے۔ اشوک بابو غصے میں لال پیلے ہونے لگے۔ ان کا بس چلتا تو وہ لڑکوں کو مار مار کر ٹھیک کر دیتے۔ آج کل کے لڑکے بڑے بے ہودہ ہو رہے ہیں۔ اکیلی جوان لڑکیوں کو گھورنا اور اشارے کرنا کہاں کی شرافت ہے؟ لیکن اشوک بابو کو معلوم تھا کہ لڑکے تو پھر بھی لڑکے ہوتے ہیں، بہت سے ایسے بیاہتا مرد بھی دیکھنے کو ملتے ہیں جو ایسی پست حرکتوں سے باز نہیں آتے۔

بے بی میٹنی شو دیکھ کر واپس جا رہی تھی ——— ہر روز جب تک وہ دفتر سے گھر پہنچتی ہے تو شام کے اندھیرے پھیل چکے ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے روزنہ بے بی کو ایسے حوادث سے گذرنا پڑتا ہو ——— بس اسٹاپ پر شرارت کم ہی ہو سکتی ہے ——— انہوں نے سوچا ——— کیوں کہ یہاں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ دوسرے راستوں اور آفس کا کیا حال ہوگا؟ وہاں اگر بے بی کو کسی نے چھیڑا تو حفاظت کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ کاش بے بی کی شادی ہو جاتی تو یہ فکر اور ذمہ داری اور بے بی کی عزت کے لئے یہ خوف ان کو دامن گیر نہ ہوتا۔ انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

اشوک بابو کو یاد تھا کہ پہلے لڑکیوں کی شادی کرنا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ ان کی بڑی لڑکی کی شادی بہت جلد ہو گئی تھی ——— اس وقت وہ صرف نویں کلاس میں پڑھ رہی تھی ——— ان کے دونوں بیٹے بھی بعد میں شادی کر کے الگ الگ شہروں میں رہنے لگے تھے مگر بے بی کے لئے رشتہ ابھی تک طے نہیں ہو سکا تھا۔ وہ کئی سال سے کوشش کر رہے تھے، مگر اب تک کچھ نہیں ہوا تھا۔ آج بھی ناکامی ہی کا مونہہ دیکھنا پڑا تھا۔ شاید بے بی کی قسمت میں ابھی شادی نہیں لکھی ہے۔ پھر انہوں نے سوچا کہ یہ بے بی کی قسمت کا دوش ہے یا ان کی کوششوں میں خلوص کی کمی ——— اس خیال کے آتے ہی اشوک بابو بہت گھبرائے۔ کہیں یہ سچ تو نہیں؟

شاید انہیں بے بی کی شادی میں دلچسپی نہیں تھی ——— یہ آوارہ خیال پھر اشوک بابو کے ذہن میں گھس آیا۔ لاشعور میں وہ نہیں چاہتے کہ بے بی شادی کر کے گھر چھوڑ جائے۔ دلچسپی اور خلوص سے ہی کامیابی ملتی ہے۔ اخبار کے اشتہارات دیکھ کر یہ کہنا کہ "شکر ہے مجھے آج اشتہارات کا جواب نہیں لکھنا ہے" کیا خلوص ظاہر کرتا ہے؟ میرے خدا یہ کیسے خیالات ہیں؟ جیسے بھی خیالات ہوں شاید سچائی پر مبنی ہیں۔

اشوک بابو شاید بے بی کے رشتے کے لئے دل سے واقعی کوشاں نہیں تھے۔ بے بی ان کی سب سے چھوٹی اولاد تھی۔ لاڈ پیار سے بے بی کچھ حد تک بگڑ گئی تھی۔ انہوں نے بے بی کو پوری آزادی دے رکھی تھی ——— جہاں چاہے وہ جا سکتی تھی، جو چاہے کر سکتی تھی ——— شاید اس لئے کہ وہ ہر مہینے اپنی تنخواہ لا کر فرماں بردار بچے کی طرح ان کے حوالے کر دیتی تھی۔ اگر بے بی نے ٹیڑھا راستہ اپنا لیا تو کیا ہوگا؟ کیا ہوگا؟ کچھ نہیں! انہوں نے اپنے آپ سے سوال کیا اور جواب بھی دے ڈالا۔

اشوک بابو چاہتے تھے ——— ہر رینالڈ کاہل بابا کی طرح ——— کہ ان کی زندگی کی شام سکون اور آرام سے کٹ جائے۔ بے بی کے ہاتھ پیلے کرنے کا ایک ہی مطلب تھا ——— ہر مہینے، ڈھائی سو روپے کی آمدنی بند ——— اور یہ ان کے لئے بہت بڑا سانحہ تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ زندگی ہی بدل جائے گی، نہ صرف بے بی کی، اپنی بھی۔ ان کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اپنے بیٹوں سے پیسے مانگنے کی ان میں ہمت نہیں تھی ——— ہمت بھی ہوتی تو مدد کی امید فضول تھی، کیوں کہ ان کی بہوئیں ماشا اللہ اپنی مٹھی بند رکھنے میں ماہر تھیں۔ سچ تو یہ تھا کہ اشوک بابو کسی انٹرویو میں جانا ہی نہیں چاہتے تھے ——— انٹرویو میں جانے کا مطلب تھا نوکری ——— اور وہ تن آسانی کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ نوکری کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔

یہ سب باتیں سوچتے سوچتے، ایک ——— بھیانک خیال ان کے دل و دماغ کو جھنجوڑ گیا۔
کیا بے بی عمر بھر کنواری ہی رہ جائے گی؟
"میرے خدا، میری مدد کر ——— میں کیا کروں؟" انہوں نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ دو آنسو ان کی آنکھوں میں جھلملائے اور انہوں نے ایک عزم کے ساتھ قدم آگے بڑھایا۔ وہ کام کریں گے اور بے بی کو اپنا تکیہ نہیں بنائیں گے

(مرکزی خیال ایک تامل کہانی سے)

اکتوبر میں صحت کی حفاظت کیسے کی جائے

اکتوبر کے تیسرے اور چوتھے ہفتے میں عموماً سردی بڑھ جاتی ہے اور گھر کے اندرونی کمروں میں سونے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں گھر کے تمام کمروں میں سفیدی کرنا چاہئے اور در و دیوار کو گرد و غبار اور مکڑی کے جالوں وغیرہ سے پاک رکھنا چاہئے۔ ہر روز صبح کو تازہ پانی سے غسل کرنا چاہئے۔ اگر ٹھنڈا پانی جلد کو گوارا نہ ہو تو نیم گرم پانی سے نہانا چاہئے مگر نہانے کے دوران میں ہوا کے جھونکے بدن کو نہ لگنے پائیں۔ موسم سرما کی شدت سے بچاؤ اور جسم کی آسائش کے لئے کرتا یا قمیص پہننے سے پہلے اونی بنیان کا استعمال زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ اگر غسل کے بعد سردی کچھ زیادہ محسوس ہو تو کپڑے پہننے کے بعد چند منٹ تک چادر یا کمبل اوڑھ لینا چاہئے تاکہ بدن میں گرمی پیدا ہو۔ تندرست آدمی کو چاہئے کہ وہ ڈنڈ بیٹھک لگائے، کسی اکھاڑے میں کشتی لڑے یا کوئی اور مناسب ورزش کرے۔ آدمی کم زور ہو تو اسے چاہئے کہ طلوع آفتاب سے ایک گھنٹہ پہلے بیدار ہو کر پہلے تو حوائج ضروری سے فارغ ہو، پھر کسی باغ یا کھیت وغیرہ میں ٹہلے، اس کے بعد غسل کر کے ناشتہ کرے۔

صبح کے ناشتے میں روغنی روٹی یا پراٹھا پوری، کچوری، نمک پارے اور چائے استعمال کئے جاسکتے ہیں۔ اگر معدے میں گرانی محسوس ہو تو صرف بسکٹ اور چائے مناسب رہے گی۔ اگر چائے پسند نہ ہو تو بسکٹ، دودھ اور دلیا موزوں ناشتہ رہے گا۔ غذا خواہ کسی قسم کی ہو پہلی شرط یہ ہے کہ معدہ اسے ہضم کرلے۔

دوپہر کے کھانے میں فصلی تازہ ترکاریاں (گوشت کے ساتھ یا گوشت کے بغیر) اور چپاتی کھانی چاہئے۔ ترکاریوں میں شلجم، چقندر اور گاجریں اچھی رہیں گی۔ ان کے علاوہ پھول گوبھی، بند گوبھی، گانٹھ گوبھی، آلو اور پالک کا ساگ کھا سکتے ہیں دوپہر کا کھانا کھا چکنے کے بعد چند دانے انگور کے یا سیب، سنترہ وغیرہ کھائیں۔

رات کے کھانے میں شلجم، چقندر، گاجر آلو (گوشت کے ساتھ یا گوشت کے بغیر) پکوا کر روٹی کے ساتھ کھائیں۔ اگر چاول سے رغبت ہو تو دال اور شوربے کے ساتھ کھا سکتے ہیں۔ رات کا کھانا اتنی مقدار میں کھانا چاہئے کہ معدے پر بار نہ ثابت ہو اور صبح کو بستر سے اٹھتے پر طبیعت ہلکی پھلکی رہے۔

اکتوبر میں رات کے پچھلے پہر موسم کچھ زیادہ سرد ہو جاتا ہے، اس لئے کھلے میں نہیں سونا چاہئے۔ البتہ برآمدہ اچھا رہے گا۔ اگر کسی ہوادار کمرے میں سوئیں تو کمبل، لحاف یا کوئی دبیز چادر احتیاطاً پائنتی رکھ لینا چاہئے تاکہ سردی محسوس ہونے کی صورت میں اوڑھ سکیں اکتوبر میں عموماً مچھروں کی اکثریت ہوتی ہے۔ ان سے بچنے کے لئے مچھر دانی استعمال کریں اگر یہ ممکن نہ ہو تو ہاتھ پاؤں اور چہرے پر روغن سنترہ، روغن لیموں، روغن سرسوں یا روغن تارا میرا میں سے کوئی ایک تیل لگالیں۔

ستمبر کی طرح اکتوبر میں بھی آب و ہوا صحت کے لئے عموماً خراب رہتی ہے، اس لئے کچھ لوگ ملیریا اور دوسری بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کھانے، پینے اور سونے جاگنے میں ذرا سی بے احتیاطی ہو جائے تو آدمی زکام، کھانسی، نزلہ یا نمونیہ میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ اس قسم کے بخار کے بعد اکثر بیماروں کو جگر طحال (تلی) وغیرہ کی شکایتیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا غذا اور آرام کا اس مہینے میں خاص خیال رکھئے۔

اکتوبر میں کھانے کے قابل پھل اور ترکاریاں بہت سی ہیں۔ بھوبرا خواہ خشک ہو یا تازہ، اس میں وٹامن اے۔ بی پائے جاتے ہیں۔ یہ بدن کو غذائیت پہنچاتا ہے اور اس میں طاقت اور حرارت پیدا کرتا ہے۔ اس کے مسلسل استعمال سے بدن فربہ ہوتا ہے۔ یہ دماغ اور گردوں کو قوی بناتا ہے اور بینائی کو تیز کرتا ہے۔ اس کا دودھ پیاس بجھاتا ہے۔ طبیعت کو فرحت بخشتا ہے اور بدن کو غذائیت بہم پہنچاتا ہے۔ پیٹ میں کیڑے پیدا ہونے لگیں تو ناریل کا دودھ انہیں ہلاک کر دیتا ہے۔ اگر اس کا رس چوس کر پھوک پھینک دیں تو معدے میں کسی قسم کی گرانی پیدا نہ ہوگی۔ ویسے یہ بجائے خود ثقیل ہے۔ اگر اسے کھانا ہی چاہیں تو شکر مصری کے ساتھ کھائیں تاکہ جلد ہضم ہو جائے۔

اکتوبر کا ایک اور مفید پھل امرود ہے اس میں کافی غذائیت ہوتی ہے۔ امرود مفرح اور مقوی قلب ہونے کے علاوہ قبض کشا پھل ہے اسے کھانا کھانے کے بعد کھانا چاہئے۔ غذا سے پہلے کھائیں تو قبض پیدا کرتا ہے۔ اس کی قاشیں تراش کر اوپر سے نمک اور سیاہ مرچ چھڑکیں اور لیموں کا رس نچوڑ کر کھائیں۔ کیلا اس مہینے کے لئے قدرت کا خاص عطیہ ہے یہ گویا انسان کے لئے قدرتی حلوہ ہے۔ کیلے میں پروٹین کثیر مقدار میں موجود ہوتے ہیں۔ اس کے لئے شکر اور نشاستہ بھی وافر مقدار میں ہوتا ہے۔ ●●

پہلا بچّہ
چراغِ خاندان ہے
اُسے توانا اور
صحت مند بننے کا
پورا موقع دیجئے۔



اس کے لئے لازم ہے کہ دوسرا بچّہ مزید تین سال تک پیدا نہیں ہونا چاہئے...

پہلے تین سال بچّے کی ذہنی اور جسمانی نشو ونما کے لئے اہم ہیں۔ یہی وقت ہے جب بچّے کو آپ کے پورے پیار اور نگہداشت کی ضرورت ہے۔ یہ تبھی ممکن ہے اگر آپ پہلے بچّے کو سنبھالنے اور پالنے کی ذمہ داری لیں۔ دو بچّوں کی پیدائش کے درمیان تین سال کا وقفہ

ماں اور بچّہ دونوں کی صحت کے لئے بڑا ضروری ہے یہ وقفہ نرودھ، گولیوں یا آئی۔یو۔ڈی کے استعمال سے یقینی بنایا جا سکتا ہے۔

مزید تفصیلات کے لئے اپنے قریب ترین صحت مرکز سے رجوع کیجئے

پہلے بچّے کا حق اور ادھیکار — ملے تین سال تک پورا پیار

davp-77/130

بچوں کی تعلیم کا ایک عملی طریقہ

ایم ناصر



آج کل اس بات کا بہت چرچا ہے کہ مردوں نے عورتوں پر بڑے ظلم ڈھائے ہیں۔ انھوں نے صدیوں سے عورتوں کو غلام بنا کر رکھا ہے۔ عورتوں نے اس ظلم کے خلاف آواز بھی اٹھائی مگر اس شور شرابے میں لوگ اس ظلم کو بھول جاتے ہیں جو بچوں پر کیا جاتا ہے مرد اور عورت دونوں اس گناہ میں شامل ہیں۔ وہ اپنی جہالت اور حکمرانی کے نشے میں بے خود ہو کر بچے کو پیس کر رکھ دیتے ہیں۔ یہ ظلم کرنے والے بچے کے دشمن نہیں ہوتے، یہ خود اس کے والدین ہوتے ہیں۔

بچہ اپنی پیدائش کے وقت ایک کورے کاغذ کی طرح ہوتا ہے۔ والدین اپنی مرضی سے اس کاغذ پر بچے کا مستقبل تحریر کرتے ہیں۔ والدین اس کے لئے جس راہ کا انتخاب کریں بچے کو اس پر چلنا پڑتا ہے۔ اس بات میں شاید زیادہ مضائقہ بھی نہیں۔ لیکن اس ارادے کو پورا کرنے کے لئے جن طریقوں کا استعمال ہوتا ہے وہ عموماً غلط ہوتے ہیں۔ والدین کو جب اپنے ارادوں میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ اس ناکامی کا سارا الزام بچے پر تھوپ دیتے ہیں۔ والدین کو حکمرانی کا حق ہے، لیکن وہ اس حق کا ناجائز استعمال کرتے ہیں۔

والدین کے بعد استادوں کا نمبر آتا ہے۔ یہاں بھی وہی طریقہ دہرایا جاتا ہے۔ استاد سب بچوں کو ایک ہی لکڑی سے ہانکتا ہے۔ اسے اسکول کا کورس پورا کرنا ہوتا ہے۔ اگر کوئی بچہ اس کی بات نہیں سمجھتا تو اسے کند ذہن اور نالائق تصور کیا جاتا ہے۔ ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ سے بھی کام نہ چلے تو پھر اسے اسکول سے نکال دیا جاتا ہے۔ والدین اور استاد دونوں ہی اسے نالائق سمجھتے ہیں۔ ان دونوں کی سازش سے بچے کا مستقبل تباہ ہو جاتا ہے۔

آج کل تعلیم کا زور و شور ہے۔ والدین اپنے بچوں کو بہتر سے بہتر اسکول میں داخل کرانا چاہتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اچھے اسکول میں

بچے کا داخلہ کرانے کے بعد ان کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ اب یہ ذمہ داری استادوں کے سر ہے۔ استادوں کو یہ شکایت رہتی ہے کہ والدین بچے پر دھیان نہیں دیتے اور ہوم ورک میں ان کی مدد نہیں کرتے۔ والدین اور استادوں کے درمیان یہ چپقلش جاری رہتی ہے اور بچہ چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پستا رہتا ہے والدین اس بات کو نہیں سمجھتے کہ اسکول اور کالج کی تعلیم بچے کو صرف ملازمت کے لئے تیار کرتی ہے۔ اس کے علاوہ آج کل لڑکیوں کے لئے جہیز میں بی اے کی ڈگری ہونا بھی لازمی ہے۔ تعلیم کا اصل مقصد بچے کی شخصیت کی تکمیل کرنا ہے، اس کے رجحان کو دریافت کرنا اور اسے سنوارنا ہے۔ مگر آج کل تعلیم خود کو بازار میں فروخت کرنے کے لئے حاصل کی جاتی ہے۔ دنیا کے بہت سے بڑے بڑے آدمی اسکول اور کالجوں کی تعلیم سے محروم رہے ہیں۔ چرچل اسکول سے نالائق کا خطاب پاکر نکل گئے تھے۔ امریکہ کے سابق وزیر خارجہ ڈلس کو ۱۴ برس کی عمر تک لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا۔ نپولین نے کسی کالج میں تعلیم حاصل نہیں کی۔ جواہر لال نہرو سولہ برس تک کسی اسکول میں داخل نہیں ہوئے۔ اندرا گاندھی میٹرک سے آگے نہیں بڑھ سکیں۔ کیا روایتی تعلیم کی کمی سے ان لوگوں کو نقصان پہنچا؟

روایتی تعلیم کے خلاف سب سے پہلے ایک عورت نے بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔ اس عورت کا نام ماریا مانٹی سوری تھا۔ یہ اٹلی کی رہنے والی تھیں۔ مانٹی سوری نے بچوں کے طریقہ تعلیم میں ایک انقلاب بپا کر دیا۔ انھوں نے

بچوں کے پیروں سے روایتی تعلیم کی زنجیریں کاٹ دیں۔ انھوں نے اپنے اسکول کا نام "بچوں کا گھر" رکھا۔ اس گھر میں بچہ کو کام کرنے کی پوری آزادی تھی۔ ٹیچر کو ڈائرکٹر کا نام دیا گیا۔ اس کا کام فقط ماحول اور بچے کے درمیان ایک کڑی بننا ہے۔ یہ اسکول ایک بڑا سا کمرہ ہوتا ہے۔ اس کے باہر ایک باغیچہ یا کمپاؤنڈ کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اسکول میں بجائے ڈیسک اور کرسیوں کے چوکیوں کا انتظام ہوتا ہے۔ یہ چوکیاں زمین سے تھوڑی اونچی ہوتی ہیں کچھ بچے فرش پر ہی پڑھتے ہیں۔ فرش پر بیٹھنے والے بچے اور چوکیوں کے آگے بیٹھنے والوں میں فرق محسوس نہیں ہوتا۔ اس طرح تمام بچے ایک دوسرے کے کام کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ بچوں کو ایک لائن میں نہیں بٹھایا جاتا۔ اس طرح بیٹھنے سے کمرے پر کلاس روم کا شبہ ہوتا ہے۔ دو یا تین بچے ایک ساتھ بیٹھتے ہیں۔ اگر کوئی لڑکا اکیلا کام کرنا پسند کرتا ہے تو اسے تنہا چھوڑ دیا جاتا ہے۔

ڈھائی سال کے بچے کو جو تھوڑا بہت بول سکتا ہے، اور رفع حاجت کے انتظام کو سمجھتا ہے، بچوں کے گھر میں داخل کیا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے بچے کو عملی سبق دیا جاتا ہے۔ کمرے کی صفائی جھاڑ پونچھ چوکیوں کی پالش اور بٹن ٹانکنا وغیرہ اسے سکھایا جاتا ہے۔ اس طرح بچے کو اپنی اہمیت کا احساس ہوتا ہے وہ اپنا کام کرنا خود سیکھتا ہے۔ جب وہ اپنے ماحول کا عادی ہو جاتا ہے تو اس کی تعلیم شروع ہوتی ہے۔ اس کو لکڑی کے رنگین چوکور اور تکونے ٹکڑوں کے ذریعے جومیٹری سکھائی جاتی ہے۔ گولیوں کے ذریعے حساب سمجھایا جاتا ہے۔ یہ گولیاں رنگین ہوتی ہیں اس طرح بچہ کھیل کھیل میں حساب اور جیومیٹری سیکھ جاتا ہے ایک دفعہ بچوں کے گھر میں ایک لڑکے کا امتحان لیا گیا۔ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔ اس کے سامنے جیومیٹری کی مختلف اشکال رکھی تھیں اور وہ انھیں چھو چھو کر بتاتا تھا۔ اس کے سب جوابات صحیح نکلے۔ ان گھروں میں بچوں کا مشاہدہ بہت تیز ہو جاتا ہے۔ ایک دفعہ تین سال کے بچے نے ڈائرکٹر سے کہا "جناب آپ کا چہرہ ۵ کنارے والا ہے"۔ ڈائرکٹر حیران رہ گیا۔ اس نے آئینہ دیکھا تو واقعی اس کا چہرہ ۵ کونوں والا تھا۔ اسے زندگی بھر اس بات کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔

بچہ اس آزاد ماحول میں سانس لیتا ہے تو اس کی صلاحیتیں خود بروئے کار آتی ہیں۔ اس کو کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔ وہ نرسری کی نظمیں گاتا ہے۔ اور بے خوف ہو کر گفتگو کرتا ہے۔ بچے کو زبان سکھانے کے لئے انگریزی کے حروف کارڈ پر چسپاں کر دیئے جاتے ہیں یہ حروف ریگ مال کے کاغذ سے تیار کئے جاتے ہیں۔ بچہ پہلے دن حروف پر اپنی انگلیاں پھیرتا ہے پھر حروف کی آواز کو سنتا ہے اس طرح بچہ ہر حرف کی آواز بخوبی ذہن نشیں کر لیتا ہے۔ مانٹی سوری نے برسوں تک بچوں کی نفسیات کا مطالعہ کیا انھیں یقین ہو گیا کہ روایتی تعلیم بچے کی شخصیت کو تکمیل کرنے کے بجائے اسے گھونٹ دیتی ہے۔ انھوں نے تعلیم کا ایک نیا طریقہ دریافت کیا۔ ان کی توجہ کا مرکز وہ گمنام بچہ تھا جو اسکول کی غلط تعلیم کی وجہ سے گمراہ ہو رہا تھا۔ انھوں نے اس گمنام بچے سے خطاب کیا! تم مجھے راستہ دکھاؤ میں تمہارے پیچھے پیچھے چلوں گی۔ وہ ۴۵ سال تک اس راہ پر چلتی رہیں۔ ان کی انتھک کوشش اور استقلال سے ایک نیا طریقہ تعلیم وجود میں آیا جس کا نام لوگوں نے ان ہی کے نام

پر مانٹی سوری سسٹم رکھا۔ ان کا طریقۂ تعلیم کنڈر گارٹن میں استعمال کیا جاتا ہے۔

مانٹسوری کا قول ہے کہ بچہ ایک بہت بڑی صلاحیت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ یہ صلاحیت ہے ماحول کو اپنے اندر جذب کرنا، ماحول بُرا ہو یا بھلا بچہ بہت جلد اپنے گرد و پیش کی باتوں کو جذب کر لیتا ہے۔ والدین اس حقیقت سے بے خبر رہتے ہیں۔ وہ بچہ کو نادان سمجھتے ہیں اور اس کی جذب کرنے کی صلاحیت نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ نظریہ گمراہ کن ہے۔ مانٹی سوری کے خیال کے مطابق ہر بچے میں ترقی کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے یہ قدرت کا عطیہ ہے۔ مثال کے طور پر بچہ بڑوں کی گفتگو سن کر بولنا سیکھ جاتا ہے اسے کوئی بولنا نہیں سکھاتا یہ اہم کام وہ خود انجام دیتا ہے۔ بچے کی اپنی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ ایک دفعہ اکبر بادشاہ کو بچے کی قدرتی زبان معلوم کرنے کا شوق چرایا۔ اس نے کچھ بچوں کو شیر خوارگی کے دوران ایک مکان میں بند کر دیا۔ ان کو دودھ پلانے والیاں گونگی تھیں۔ نوکر چاکر سب گونگے تھے بچے اس ماحول میں پلتے رہے۔ کئی برس کے بعد اکبر انہیں دیکھنے گیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بچے گونگی آیاؤں اور گونگے نوکروں کی طرح غیں غیں کر رہے تھے۔ اس افسوس ناک تجربے سے بادشاہ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ بچے کی کوئی قدرتی زبان نہیں ہوتی۔

مانٹی سوری نے اپنے مشاہدات کے دوران یہ بھی دریافت کیا کہ ہر بچے میں سیکھنے کی بے تحاشا اہلیت ہوتی ہے۔ یہ بھی قدرت کا عطیہ ہے۔ بچے میں تجسس کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز کے متعلق سوال کرتا ہے، یہ کیا چیز ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ والدین ان سوالات کو مہمل سمجھتے ہیں۔ وہ بچے کو بار بار سوالات کرنے پر ڈانٹ دیتے ہیں ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے۔ بچہ ڈانٹ کھا کر خاموش ہو جاتا ہے۔ اس کا تجسس مر جاتا ہے۔ والدین اس کے علاوہ بچوں پر کنٹرول بھی قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اسے تانگے میں جتا ہوا گھوڑا سمجھتے ہیں کہ جس طرف باگ موڑی گھوڑا اسی طرف مڑ گیا۔ والدین اسے اپنے طور پر کچھ باتیں سکھانا چاہتے ہیں، اپنی مرضی اس پر ٹھونسنا چاہتے ہیں۔ بچہ جو بات سیکھنا چاہتا ہے اسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ والدین کو بچے کی سیکھنے کی صلاحیت اور خواہش سے زیادہ اپنے سکھانے پر ناز ہوتا ہے۔ یہ بالغوں کی دنیا ہے۔ یہاں جو بڑے چاہتے ہیں وہی صحیح سمجھا جاتا ہے بچے غلام تصور کئے جاتے ہیں۔ غلامی کا یہ سب سے گھناؤنا پہلو ہے سماج بچوں کے حقوق کو نہیں مانتا۔ بچے جب تک بڑے نہ ہو جائیں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ مانٹی سوری طریقہ تعلیم میں بچہ ہی اصل محور ہے۔ اس طریقۂ تعلیم میں بچہ الفاظ سے کھیلتے کھیلتے لکھنے کی طرف مائل ہوتا ہے۔ ساڑھے چار سال کی عمر میں وہ لکھنا شروع کر دیتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مانٹی سوری اسکول میں تعلیم کی رفتار بہت سست ہے۔ یہ خیال غلط ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ بچہ خود بخود کوئی کام سیکھے۔ اس سلسلے میں وقت کی کوئی اہمیت نہیں۔ قدرت نے ہر کام کے لئے ایک وقت مقرر کیا ہے۔ انسان کے بنائے ٹائم ٹیبل غیر فطری ہیں۔

چھ سال کی عمر میں بچہ حساب اور جیومیٹری اور لکھنا پڑھنا سیکھ جاتا ہے۔ اسے دس تک حساب کے پہاڑے یاد ہو جاتے لیکن وہ اور اسکولوں کے بچوں کی طرح ان پہاڑوں کو طوطے کی طرح رٹ کر یاد نہیں کرتا، بلکہ ان کو سمجھتا ہے۔ مانٹی سوری اسکول اور عام اسکول میں یہی فرق ہے۔ عام اسکول میں بچے کو ایک خالی برتن سمجھا جاتا ہے، جسے استاد جلدی جلدی بھرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ مانٹی سوری سسٹم میں والدین کو بھی مناسب ہدایتیں دی جاتی ہیں تاکہ وہ بچوں کی نفسیات کو سمجھ سکیں اور ان کی شخصیت کی بھرپور نشو و نما میں ہاتھ بٹا سکیں۔

مانٹی سوری سسٹم میں بچہ کی تعلیم ۲ ½ سال سے ۶ سال تک چلتی ہے۔ آج مانٹی سوری سسٹم کے ماہرین ۶ سال سے ۱۲ سال تک مزید تعلیم دینے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ مغربی ممالک میں یہ توسیع عمل میں آ بھی چکی ہے۔ ہندوستان کے مانٹی سوری سسٹم ڈائرکٹر کا کہنا ہے کہ انہیں ۶ سال کی عمر میں جیب خرچ ملنے لگا تھا مگر اس جیب خرچ کے ساتھ ذمہ داریاں بھی عاید تھیں۔ انھیں اپنی پنسل نوٹ بک بلکہ ٹوتھ پیسٹ بھی ان ہی پیسوں سے خریدنا پڑتا تھا۔ اس طرح انھیں بچپن سے ہی ذمہ داری کا احساس ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر مانٹی سوری نے ۲۵ سال تک یورپ میں اپنے طریقۂ تعلیم کو فروغ دیا۔ ۱۹۳۹ء میں وہ ہندوستان آئیں۔ ہندوستان میں انھوں نے ۱۰ سال اس سسٹم کو رائج کرنے میں صرف کئے۔ ۱۹۴۹ء میں وہ یورپ واپس چلی گئیں۔ ... اسکول کا ٹیچر بننا بہت آسان ہے۔ داخلے کے لئے کم از کم تعلیمی لیاقت میٹرک ہے کم سے کم ۱۸ سال۔ زیادہ کی کوئی حد نہیں۔ فیس ۲۵۰ روپے اور کورس کی مدت ½ ۹ مہینے۔ ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے۔ اس سال یہ کورس بنگلور میں ہو رہے ہیں۔ پتہ یہ ہے: ڈائرکٹر، آئی ایم ٹی سی، ۲ وایڈ ورڈ روڈ، بنگلور۔ ۵۶۰۰۵۲۔

کل دنیا اسکی ہو



ہر ماں اور باپ کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اُن کا لاڈلا دنیا کی آنکھ کا تارا بنے۔ صرف اُن کا ہی نہیں، قوم کا ملک کا بھی نام روشن کرے، دنیا کی ذمہ داریوں کا بوجھ اُٹھائے۔ یہ خواہش اپنی جگہ ٹھیک ہے مگر آپ نے اس سلسلہ میں کیا کچھ کیا ہے۔ اس کی ابتدا پنگوڑے میں ہی کرنی چاہیے۔ اپنے لاڈلے کو "ممتا" دیجئے یہ ننھے بچوں کا خاص ٹانک ہے جو ایک ماں کی طرح ان کی حفاظت کرتا ہے۔ جسم میں کیلشیم کی کمی کو دُور کر کے ہڈیوں کے ٹیڑھے پن کو روکتا ہے۔ ننھے بے زبان بچوں کو قبض سے نجات دلاتا ہے۔ نزلہ اور زکام میں بھی مفید ہے۔ بچوں کو ہنستا اور خوش و خرم رکھنا ہی "ممتا" کا کام ہے۔ اپنے بچے سے پیار ہے تو اُسے "ممتا" ہی دیجئے اور دیکھئے وہ کتنی جلدی جلدی پروان چڑھتا ہے۔

قیمت: پانچ روپے ——— چھوٹی شیشی، تین روپے

شمع لیبارٹریز، لال کنواں، دہلی



قاصد

منصور احمد

"ارشد، میرا ایک کام کرے گا؟"
نہیں نہیں۔ میں اتنی بارش میں
ں نہیں جاؤں گا۔ تم روز روز مجھے
ا بھیجتی ہو۔"
صفیہ نے ننھے ارشد کے مونہہ پر
ر کھ دیا۔ "ارے آہستہ بول، میرا اچھا
ئی۔" یہ کہہ کر صفیہ نے اپنے صندوق میں
شیشے کی گولیاں نکالیں۔ رنگ برنگی گولیاں
دیکھ کر ارشد کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ مگر
وہ بزدلی سا انکار کرتے ہوئے بولا: "یہ تو
چھ گولیاں ہیں۔ آج تم سعید کو بھیج دو۔ میرے
کپڑے بھیگ جائیں گے۔" صفیہ نے لپک کر
دوبارہ صندوق کھولا اور اس میں سے چھ
گولیاں اور نکالیں اور بولی: "لے اب
پوری بارہ گولیاں ہو گئیں۔ میرا اچھا بھائی
تو میری چھتری لے جا۔"

ارشد نے صفیہ کے ہاتھ سے گولیاں
لے لیں اور کہا: "اچھا باجی، لاؤ کہاں ہے وہ
خط۔"

صفیہ نے جلدی سے خط راشد کی
جیب میں ٹھونس دیا اور اسے چھتری دیتے
ہوئے بولی: "انہیں کالج جانے میں دیر
ہو رہی ہو گی۔ دس بج چکے ہیں۔ جلدی جا،
میرا اچھا بھیا۔"

ارشد نے چھتری اٹھائی چھتری اٹھائی، گولیاں نیکر کی جیب میں رکھیں اور گھر سے نکل گیا۔

نسیم اپنے کمرے میں بیٹھا ارشد کی راہ تک رہا تھا۔ اُسے صفیہ کے خط کا انتظار تھا۔ وہ کالج جانے کے لیئے کپڑے تبدیل کر چکا تھا۔ اُسے دیر ہو رہی تھی لیکن وہ اپنی کتابیں ڈھونڈنے کے بہانے اپنے کمرے میں گھس گیا۔ چند منٹ بعد ہی ارشد اُس کے کمرے میں پہنچ گیا۔ ارشد کو دیکھتے ہی نسیم کی باچھیں کھل گئیں۔ اُس نے ارشد سے کہا: "ارشد میاں بہت دیر لگا دی تم نے۔ میرے لئے کچھ لائے ہو؟"

ارشد نے جیب سے پرچہ نکالا اور نسیم کے حوالے کر دیا۔ نسیم نے جلدی سے پرچہ لے کر جیب میں رکھ لیا، اپنی الماری کھولی اُس میں چند ٹافیاں نکالیں اور ارشد کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا— "ارشد میاں، تمہاری چاکلیٹ تو ختم ہو گئی ٹافیوں سے کام چلے گا؟" ارشد نے ہاتھ بڑھا کر ٹافیاں لے لیں اور انہیں جیب میں ٹھونستے ہوئے بولا: "بھائی جان، باجی نے اس خط کا جواب مانگا ہے....." وہ ابھی کچھ اور کہنے والا تھا کہ نسیم کی ماں کمرے میں آ گئیں۔ نسیم نے فوراً ارشد کی بات کاٹ دی اور بولا "ارشد میاں تمہارے لئے کہانیوں کی کتاب اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔ شام کو ضرور لیتا آؤں گا۔"

نسیم کی ماں نے ارشد کو دیکھا تو بولیں "ارے، تو یہاں کب آیا؟ میں نے تو تجھے گھر میں آتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اتنی بارش میں بھیگتا ہوا آیا ہے۔ کیا کوئی ضروری کام تھا؟"

نسیم نے کہا "ماں، میں نے اس سے کہانیوں کی کتابیں لانے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر میں بھول گیا۔ چلو ارشد میں تمہیں گھر پہنچا دوں۔" یہ کہہ کر نسیم نے ارشد کا ہاتھ پکڑا اور دونوں گھر سے باہر آ گئے۔

ارشد کی عمر سات آٹھ سال تھی وہ صفیہ کا خالہ زاد بھائی تھا۔ صفیہ کی خالہ کا مکان اُس گلی میں تھا جس میں صفیہ کے والدین رہتے تھے۔ ارشد صفیہ کے بھائیوں کے ساتھ کھیلنے کے لئے اُن کے گھر چلا جاتا۔ سب بچے آنگن میں گولیاں کھیلتے۔ صفیہ کے بھائیوں کا نشانہ بہت اچھا تھا۔ وہ اکثر ارشد سے گولیاں جیت جاتے۔ اس جیت میں نشانہ بازی کے علاوہ بے ایمانی کا دخل بھی ہوتا۔ معصوم ارشد کبھی اُن کی چوری پکڑ لیتا تو وہ الٹا اُسے ڈانٹ کر بھگا دیتے۔ ارشد روتا ہوا صفو باجی کے پاس چلا جاتا۔ صفو باجی اس سے بہت محبت سے پیش آتیں۔ وہ بھائیوں کو ڈانٹ کر اُس کی باری اس کو دلوا دیتیں۔ کبھی کبھی وہ اس کو گولیاں خریدنے کے لئے پیسے بھی دے دیتیں۔ ارشد صفو باجی سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ وہ بھی ارشد کو بہت چاہتی تھیں۔

ایک دن ارشد صفو باجی کے گھر گیا تو اُس نے دیکھا کہ وہ پلنگ پر بیٹھی کچھ لکھ رہی ہیں۔ ارشد کو دیکھتے ہی پہلے تو وہ کچھ گھبرائیں لیکن پھر مسکرانے لگیں۔ انہوں نے اُسے بہت پیار سے اپنے پاس بلا لیا۔ اور بولیں: "ارشد، ایک کام کرے گا؟"

ارشد نے حیرت سے اُن کی طرف دیکھا اور بولا: "کیا کام ہے، باجی؟"

صفیہ نے اُس کے ہاتھ میں ایک پرچہ تھما دیا اور کہا "یہ پرچہ نسیم میاں کو بھجوانا۔ گلی کے باہر سائیکل والے کی دکان ہے، جہاں سے تو کرایہ کی سائیکل لیتا ہے۔"

ارشد نے کہا "ہاں ہاں باجی، وہ بشیر سائیکل والا۔ اس نے ایک نئی سائیکل منگائی ہے۔ اس کا کرایہ آٹھ آنے گھنٹہ ہے مگر میرے پاس چونی نہیں ہے۔ صرف دو آنے ہیں۔ آدھ گھنٹہ سائیکل چلانے کے لئے چار آنے چاہئیں۔"

صفو نے جلدی سے اُس کی بات کاٹی: "میں تجھے دونی دے دوں گی مگر تجھے میرا ایک کام کرنا ہوگا۔ بشیر سائیکل والے کی دکان کے برابر میں ایک زینہ ہے بشیر کی دکان کے اوپر نسیم میاں رہتے ہیں۔ یہ پرچہ ان کو دے دے۔ مگر یہ پرچہ صرف ان ہی کے ہاتھ میں دینا ہے۔ ان کے ساتھ میں اُن کی ماں بھی رہتی ہیں۔ انہیں خبر نہ ہو۔" یہ کہہ کر صفیہ نے پرچہ ارشد کی جیب میں رکھ دیا اور پرس میں سے دونی نکال کر اُس کے ہاتھ میں رکھ دی۔

ارشد کچھ دیر تک صفیہ کو حیرت سے دیکھتا رہا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر باجی یہ کام اس سے کیوں لے رہی ہیں۔ یہ کام تو گھر کا نوکر بھی کر سکتا تھا۔ اس پرچے میں ایسی کون سی بات ہے جس کی خبر نسیم میاں کی ماں کو بھی نہیں ہونا چاہیئے اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ لیکن وہ صفو

باجی سے بہت پیار کرتا تھا۔ وہ اُن کے لئے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ وہ بولا "اچھا باجی! میں ابھی یہ پرچہ نسیم میاں کو دے کر آتا ہوں۔"

ارشد صفیہ باجی کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچا۔ بشیر کی دکان پر چمچماتی سائیکل کھڑی تھی۔ ارشد کو ڈر تھا کہ اتنے میں یہ سائیکل کوئی دوسرا لڑکا کرائے پر نہ لے لے۔ وہ اپنا کام جلد ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے زینے پر چڑھ کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک نوجوان نے دروازہ کھولا۔ ارشد نے پوچھا "نسیم میاں یہیں رہتے ہیں؟"

نوجوان نے جواب دیا "ہاں! میں ہی نسیم ہوں۔ تمہیں مجھ سے کچھ کہنا ہے؟"

ارشد نے جلدی سے صفیہ کا پرچہ جیب سے نکالا اور نسیم کے ہاتھ میں دے دیا "یہ پرچہ صفو باجی نے آپ کے لئے دیا ہے۔"

یہ بات سنتے ہی نسیم کے لہجے میں تبدیلی آگئی۔ اُس نے ارشد کو گود میں اُٹھا لیا "تمہارا کیا نام ہے؟"

ارشد نے اپنا نام بتایا تو نسیم نے اُس سے ہاتھ ملایا "آج سے تم میرے دوست ہو آؤ! اندر آؤ۔"

ارشد نے کہا۔ "نہیں! مجھے سائیکل چلانا ہے۔ اگر کوئی دوسرا لڑکا لے گیا تو مجھے انتظار کرنا پڑے گا۔"

نسیم نے کہا۔ "خیر میاں۔ جاؤ تم سائیکل چلاؤ۔ جب سائیکل واپس کرنے آؤ گے تو میں تمہیں بشیر کی دکان پر ملوں گا۔ میرا ایک پرچہ اپنی باجی کو دے دینا۔" ارشد جلدی میں تھا۔ اس نے "اچھا" کہہ کر نسیم سے پیچھا چھڑایا۔ اور سائیکل والے کی دکان پر پہنچ گیا۔ جب وہ سائیکل واپس کرنے دکان پہنچا تو نسیم اس کا منتظر تھا۔ وہ ارشد کو ایک کونے میں لے گیا۔ اس کے ہاتھ میں چاکلیٹ کا ایک پیکٹ دیا اور بولا "ارشد میاں! جاؤ یہ پرچہ اپنی باجی کو دے دینا۔ مگر دیکھو کسی کو خبر نہ ہو۔"

اس طرح ارشد ایک قاصد بن گیا۔ صفیہ اور نسیم کے درمیان خطوں کا تبادلہ چلتا رہا۔ دونوں ارشد کی خاطر مدارات کرتے۔ وہ اکثر سوچتا کہ خط میں ایسی کیا بات ہوتی ہے جس کے لئے اُسے انعام ملتا ہے؟ اگر وہ کبھی دیر سے آتا تو باجی اُس سے ناراض ہو جاتی ہیں۔ لیکن جلد ہی کچھ سوچ کر اُسے گلے لگا لیتی ہیں۔ ارشد کے لئے خطوں کا یہ لامتناہی سلسلہ ایک معمّہ تھا۔ آخر ایسا کون سا سوال ہے جس کا جواب ایک خط میں نہیں دیا جا سکتا؟ یہ نسیم میاں کون ہیں؟ باجی سے اُن کا کیا تعلق ہے؟ باجی کہتی ہیں کہ یہ اُن کے دُور کے رشتہ دار ہیں۔ اگر یہ رشتہ دار ہیں تو گھر میں کیوں نہیں آتے؟ باجی کے گھر میں کوئی بھی پردہ نہیں کرتا۔ عید کے دن سارے رشتہ دار باجی کے یہاں جمع ہو گئے تھے۔ ایک نسیم میاں ہی نہیں آئے۔ یہ کیسے رشتہ دار ہیں کہ کبھی باجی کے گھر میں جھانکتے بھی نہیں؟

ایک دن ارشد نسیم کا خط لے کر صفیہ کے گھر پہنچا تو صفیہ نے اُس کے ہاتھ سے خط جھپٹ لیا اور پڑھنا شروع کیا۔ خط پڑھتے ہی اُس کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ارشد بھونچکا رہ گیا۔ اُس نے سوچا ضرور کوئی مر گیا ہے۔ ایک دفعہ اماں بھی ایسا ہی ایک خط پڑھ کر رونے لگی تھیں اُس نے ماں سے رونے کی وجہ پوچھی تھی تو ماں نے بتایا تھا کہ اُن کی پھوپھی کی بیٹی مر گئی تھی۔ اس دفعہ بھی ضرور کوئی مر گیا ہے۔ اس نے صفیہ سے پوچھا "باجی آپ رو کیوں رہی ہیں؟ کون مر گیا ہے؟"

صفیہ نے اُس کے مونہہ پر ہاتھ رکھ دیا "کوئی نہیں مرا۔ میری قسمت ہی خراب ہے۔"

ارشد کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا "قسمت کیا چیز ہے باجی؟"

صفیہ نے آنسو پوچھے اور بولی "ابھی تو چھوٹا ہے۔ جب بڑا ہو جائے گا تو تیری سمجھ میں سب کچھ آجائے گا۔"

ارشد نے سوچا کہ وہ نسیم میاں سے پوچھے گا کہ آخر اس خط میں ایسی کون سی بات تھی کہ صفیہ باجی اُسے پڑھ کر رونے لگیں۔

اگلی دفعہ جب وہ نسیم کا خط لے کر آیا تو اس خط کو پڑھ کر صفیہ کی باچھیں کھل گئیں۔ اُس نے ارشد کو چمٹا کر پیار کر لیا۔ ارشد کی سمجھ جواب دے گئی۔ یہ باجی بھی عجیب چیز ہیں کبھی نسیم میاں کا خط پڑھ کر رونے لگتی ہیں اور کبھی ہنسنے لگتی ہیں۔ اگر نسیم میاں صفیہ کو ستاتے ہیں تو وہ خالہ اماں سے ان کی شکایت کیوں نہیں کرتیں؟ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر یہ سب باتیں گھر والوں سے کیوں چھپائی جاتی ہیں۔ کیا خالہ اماں باجی کی دشمن ہیں؟ باجی اُسے راز داری کی تاکید کیوں کرتی ہیں؟ اگر کسی کو معلوم ہو گیا تو کیا قیامت آجائے گی؟

ارشد کو قاصد کا رول ادا کرتے

کرتے اب ایک سال ہوگیا تھا۔ وہ اپنی کارگزاری سے خوش تھا۔ صفیہ اُسے شیشے کی گولیاں دیتی، سائیکل کے کرایہ کے پیسے دیتی۔ نسیم میاں اس کے لئے کہانیوں کی کتابیں لاتے، اُسے چاکلیٹ اور مٹھائی دیتے۔ ارشد خوش تھا کہ اُسے دونوں طرف سے انعام و اکرام ملتا ہے۔ یکایک حالات نے پلٹا کھایا اس نے دیکھا کہ صفیہ باجی کی شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا ہے۔ میراثنیں گیت گا رہی ہیں۔ مگر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ صفیہ باجی اپنی شادی سے خوش نہیں۔ وہ چپکے چپکے آنسو بہاتی رہتی ہیں۔ گھر میں سب لوگ خوشیاں منا رہے ہیں اور باجی اکیلے تکیے میں مونہہ دیئے رو رہی ہیں ایک دن وہ نسیم میاں سے ملنے گیا تو وہاں موٹا سا تالہ پڑا تھا۔ اُس نے بشیر سائیکل والے سے پوچھا بشیر نے بتایا کہ نسیم میاں گھر چھوڑ کر کہیں چلے گئے ہیں۔ ان کی تعلیم مکمل ہوگئی ہے اور انہیں کسی دوسرے شہر میں ملازمت مل گئی ہے۔

صفیہ باجی کی شادی ہوگئی۔ ارشد کو حیرت تھی کہ نسیم میاں اس شادی میں کیوں شریک نہیں ہوئے۔ وہ صفیہ باجی کو کتنا چاہتے تھے، اُن کا خط کتنے شوق سے پڑھتے تھے معلوم ہوتا ہے انہیں صفیہ باجی کی شادی کی خبر ہی نہیں ہے۔ اس نے صفیہ باجی سے اس بارے میں پوچھنا بھی چاہا، لیکن اُن کی موٹی موٹی سُرخ آنکھیں دیکھ کر ہمت نہیں پڑی۔

ایک سال بعد صفیہ باجی میکے آئیں تو اُن کی گود میں ایک پیارا سا بچہ تھا۔ انہوں نے ارشد کو گلے سے لگا لیا۔ صفیہ باجی بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔ اُن کے ساتھ اُن کے شوہر بھی تھے۔ وہ بہت خوب صورت جوان تھے۔ انہوں نے بھی ارشد سے دوستی گانٹھ لی صفیہ باجی اب بہت خوش دکھائی دیتی تھیں۔ ہر وقت اپنے بچے کو سینے سے چمٹائے رکھتیں۔

پندرہ سال گذر گئے۔ ارشد نے بی اے پاس کیا۔ تعلیم سے فارغ ہوتے ہی اس کو ملازمت مل گئی۔ ملازمت کے سلسلے میں اسے کویت جانا تھا۔ اُس نے پاسپورٹ کے لئے درخواست دی۔ اُس نے سُنا تھا کہ پاسپورٹ کی درخواست حکومت کے کسی اعلیٰ افسر کی تصدیق ہو جائے تو پاسپورٹ جلدی مل سکتا ہے۔ اُس نے اپنے ایک دوست سے اس بات کا تذکرہ کیا۔ اُس کے دوست نے اُس کی مدد کرنے کا وعدہ کر لیا۔ اُس نے ارشد کو بتایا کہ اُس کے چچا نسیم احمد حکومت کے اعلیٰ افسر ہیں۔ چچا سے فون پر ملاقات کا وقت طے ہوگیا۔

دوسرے دن ارشد نسیم احمد کی کوٹھی پر پہنچا۔ اُس نے چوکی دار کے ذریعہ اندر اطلاع کرائی۔ چوکی دار نے اُسے ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے لئے کہا۔ تھوڑی دیر میں صاحب خانہ ڈرائنگ روم میں تشریف لائے۔ ارشد تعظیماً کھڑا ہوگیا۔ ارشد نے چچا کی صورت دیکھتے ہی اُس کے مونھ سے بے اختیار نکلا "نسیم میاں!" لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ سنبھل گیا۔

صاحب خانہ نے اُ...
دیکھا اور بولے "تم مجھے جان...
ارشد بوکھلا گیا۔ اُس...
دیا: "آپ نسیم میاں ہیں۔ آ...
پہچانا نہیں، میں ارشد ہوں
آپ ہمارے پڑوسی تھے۔"
نسیم صاحب چونک...
واقعات ایک فلم کی طرح اُن...
کے سامنے سے گذرنے لگے۔ ...
کے لئے کھو سے گئے۔ پھر فوراً ...
بولے "ارے تم! ارشد ہو...
بھئی، میں تمہیں بالکل نہیں پہ...
سولہ سال ہوئے جب تمہیں ...
دیکھا تھا۔" یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹ...
نے نوکر کو چائے لانے کے لئے کہ...
ہو گئے۔ انہیں ارشد کا سامنا کر...
شرم آرہی تھی۔ ارشد جوان ہوگیا...
اُسے معلوم ہو چکا ہوگا کہ میرے...
کے درمیان کسی قسم کی خط و کتابت...
تھی۔ انہوں نے بے خیالی میں ار...
ڈالی تو اس کی نگاہوں میں شرار...
رہی تھی۔ نوکر چائے لے آیا تو انہو...
چائے بنائی، اور ارشد سے اُس...
کے بارے میں سوال کرنے لگے۔ ار...
گفتگو کے دوران وہ جھینپے جھینپے...
انہوں نے گفتگو کا رُخ ماضی کی طر...
نہیں دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد انہو...
ارشد کا پاسپورٹ فارم اُٹھایا او...
سے قلم نکال کر اُس پر دستخط کر دیئے

نغموں کی شہزادی

سِراج زیبائی



میری سانسوں کی مہک اے مرے نغموں کی زباں
تیرے ہونٹوں کا تبسّم میرے افکار کی جاں
دل کی محفل میں مہکتی ہوئی تصویر ہے تو
میری چاہت کے حسیں خواب کی تعبیر ہے تو
تجھ سے وابستہ مری جان ہے، میرا ایماں
میری سانسوں کی مہک، اے مرے نغموں کی زباں
تُو جو مُسکائے، فرشتوں کو بھی رشک آجائے
گنگنائے تو بہاروں کی کلی جھُوم اُٹھے!!
تیرے چہرے پہ حسیں چاند ستارے، قرباں
میری سانسوں کی مہک، اے مرے نغموں کی زباں
دل کی دھڑکن میں ترے حُسن کی خوشبو پھیلے
جھوم کر چاند ترے پیار کے نغمے گائے!
ذرّے ذرّے میں ترے حُسن کے جلوے ہیں نہاں
میری سانسوں کی مہک اے مرے نغموں کی زباں
مست ناگن کی طرح تُو جو کبھی اِٹھلائے
چاندنی ناز کرے، بادِ صبا شرمائے
تجھ سے روشن ہے مرا دل، مری دنیا ہے جواں
میری سانسوں کی مہک اے مرے نغموں کی زباں
تیرے قدموں میں محبت کا چلن ملتا ہے
تری آغوش میں فن کار کو فن ملتا ہے
میرے اشعار کی خوشبو اے مری روحِ رواں
میری سانسوں کی مہک اے مرے نغموں کی زباں

مطبوعات شمع بک ڈپو، کھلونا بک ڈپو، بانو بک ڈپو اور مکتبہ دینیات

افسانہ لکھ رہی ہوں	خوش باش بی اے	۴ روپے
اندھیری راتیں	ریوتی سرن شرما	۵ روپے ۵۰ پیسے
اندھیرے	اختر عادل روپ	۲ روپے ۵۰ پیسے
آگ اور دھواں	م۔م۔ راجندر	۲ روپے
ایک پیار ایک دھوکا	رام سرن شرما	۵ روپے
ایک گدھے کی سرگذشت	کرشن چندر	۴ روپے ۲۵ پیسے
اچھی صورت بری نگاہ	ریاض ارشد	۲ روپے ۲۵ پیسے
آہٹ	ستیہ پال آنند	۵ روپے
اجالا	قیسی رام پوری	۹ روپے ۵۰ پیسے
برچھیں	قیسی رام پوری	۶ روپے
بے غیرت	مضطر ہاشمی	۶ روپے
برہمن	کرشن گوپال عابد	۷ روپے
چوٹ	دت بھارتی	۵ روپے ۵۰ پیسے
فریب مسلسل	شفیق بانو	۴ روپے
گناہ	دت بھارتی	۴ روپے
حاجی مراد	قیسی رام پوری	۶ روپے
ہزار راتیں	ش مظفر پوری	۷ روپے
ہزار داستان	فراق گورکھپوری	۳ روپے

شمع بک ڈپو آصف علی روڈ نئی دہلی

تصویر کی قیمت

اندور کے موضع طہار گڈھ میں دو بھائیوں کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ یہ دونوں بھائی ایک تصویر کے لئے لڑ رہے تھے۔ ایک بھائی کہتا تھا کہ یہ تصویر میں رکھوں گا، دوسرا کہتا تھا کہ یہ تصویر میرے پاس رہے گی۔ دونوں میں سے کوئی بھی اس تصویر کی جدائی گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ جھگڑا باتوں سے شروع ہو کر لاتوں تک پہنچ گیا، اور پھر دونوں نے لاٹھیاں نکال لیں۔ اور ایک دوسرے پر پل پڑے، پڑوسیوں نے یہ ماجرا دیکھا تو بیچ میں کود پڑے اور بڑی مشکل سے دونوں کو الگ کیا۔ جھگڑے کے دوران ایک بھائی کے سر پر لاٹھی کی چوٹیں لگیں۔ اس کو فوراً اسپتال پہنچا دیا گیا۔ جو تصویر اس جھگڑے کا سبب بنی وہ کسی دیوی یا دیوتا کی نہیں تھی بلکہ ایکٹریس ہیما مالنی کی تھی!

مالکہ مکان کا غصہ

کان پور کی غلامی لین میں ایک مکان کی مالکہ اپنے کرایہ دار سے کسی بات پر ناراض ہو گئی۔ اس عورت کو اتنا غصہ آیا کہ اس نے ایک دوسرے آدمی کی مدد سے اپنے کرایہ دار کو تیسری منزل سے نیچے پھینک دیا۔ کرایہ دار چوٹوں کی تاب نہ لا کر چل بسا پولیس نے اقدام قتل کے جرم میں لینڈ لیڈی کو گرفتار کر لیا۔

زبان کی بھینٹ

کان پور کا ایک نوجوان راج پال تپیشوری دیوی کا بھگت تھا۔ وہ دیوی کو خوش کرنے کے لئے کوئی نذر دینا چاہتا تھا۔ ایک دن وہ رات کے سناٹے میں تپیشوری کے مندر میں داخل ہوا۔ اس نے اپنی جیب سے ایک چاقو نکالا، اپنی آنکھیں بند کیں اور چاقو کے ایک ہی وار سے اپنی زبان کاٹ ڈالی یہ خون آلودہ زبان اس نے دیوی کے چرنوں میں رکھ دی۔

حق بحق دار رسید

بہار میں ایک مسافر ریل کے ڈبے میں داخل ہوا۔ جب وہ ہاتھ منہ دھونے کے لئے باتھ روم گیا تو اس نے دیکھا کہ باتھ روم کا آئینہ غائب ہے۔ اس آئینے کی جگہ یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے: "ریلوے قوم کا سرمایہ ہیں۔ میں نے اس سرمائے میں سے اپنا حصہ لے لیا ہے"

نیلے خون میں لال خون کی آمیزش

موناکو کی راج دھانی مانٹی کارلو میں پرنس اے نیر نے اپنی بیٹی کیدولین کی منگنی کا اعلان کر دیا۔ مانٹی کارلو ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔ یہاں دنیا کا سب سے بڑا جوا خانہ ہے۔ شہزادی کیدولین بہت عرصے سے اپنے خوابوں کے شہزادے کی تلاش میں تھیں۔ کچھ عرصے کے لئے انگلستان کے ولی عہد شہزادہ چارلس بھی ان کے دوستوں میں رہے تھے، لیکن اب ان سب افواہوں کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ کیدولین کا منگیتر فلپ جونائٹ ہے۔ وہ پیرس کے ڈپٹی میئر کا بیٹا ہے۔ کیدولین کی ماں نے اپنی بیٹی سے وعدہ لیا تھا کہ وہ ۲۱ برس کی عمر سے پہلے شادی نہیں کرے گی کیدولین نے یہ وعدہ نبھایا۔ وہ ۲۳ جنوری ۱۹۷۸ کے دن ۲۱ سال کی ہو جائے گی۔ کیدولین کی منگنی سے اس کے ماں باپ زیادہ خوش نہیں ہیں۔ موناکو کا شاہی خاندان 'بلیو بلڈ' کہلاتا ہے اور فلپ ایک عام آدمی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ دونوں کی عمر میں کافی فرق ہے کیدولین ابھی ۲۱ سال کی بھی نہیں جب کہ فلپ کی عمر ۳۷ سال ہے۔

ایک دل پایا ایک دل کھویا

چند ہفتے پہلے انگلستان کے ایک چھوٹے سے قصبے میں ایک ۵ سالہ لڑکی دل کی بیماری میں مبتلا ہو گئی۔ لڑکی کی بیماری کا علاج انگلستان میں نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا آپریشن بہت نازک تھا۔ لڑکی کے والدین نے جنوبی افریقہ کے ڈاکٹر کرسچین برنارڈ سے رابطہ قائم کیا۔ ڈاکٹر برنارڈ یہ آپریشن کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ ڈاکٹر برنارڈ عالمی شہرت کے مالک ہیں وہ ایک انسان کا دل دوسرے انسان کے سینے میں فٹ کر چکے ہیں

حال ہی میں انہوں نے ایک انسان کے سینے میں چمپانزی کا دل لگایا ہے) اب سوال خرچ کا تھا۔ لندن سے جنوبی افریقہ تقریباً ۸ ہزار میل دُور ہے۔ اس قصبے کے لوگوں نے آپس میں چندہ کر کے ایک لاکھ روپیہ جمع کیا۔ لڑکی اپنی ماں کے ساتھ کیپ ٹاؤن پہنچ گئی۔ اس کے دل کا آپریشن ہوا۔ یہ آپریشن کامیاب ثابت ہوا۔ لڑکی کا دل ٹھیک ہوگیا، لیکن لڑکی کی ماں ہیلن ہیری اپنا دل ہار بیٹھی۔ اس کی چچی زاد بہن کیپ ٹاؤن میں رہتی تھی۔ ہیلن اُس کے خاوند کی محبت میں گرفتار ہوگئی۔ پہلی نظر میں وہ اُسے دل دے بیٹھی۔ جب ماں اور بیٹی واپس انگلستان پہنچیں تو ہیلن کا خاوند اپنی بیوی اور لڑکی سے ملنے ہوائی اڈے پہنچا۔ ہیلن نے اُس سے کہا کہ وہ اس سے دُور ہی رہے خاوند کی خوشی پر اوس پڑ گئی۔ اس کی بیٹی صحت مند ہوگئی تھی، لیکن اُس کی بیوی عشق کے مرض میں مبتلا ہوگئی تھی۔ ہیلن کی عمر ۲۳ سال ہے اور اُن کے خاوند کی عمر ۲۲ سال۔ ہیلن نے واپس کیپ ٹاؤن جانے کا فیصلہ کر لیا ہے، جہاں وہ اپنے بہنوئی سے شادی کرے گی۔ ہیلن کا خاوند اب بھی پُرامید ہے کہ ہیلن اس ارادے سے باز آجائے گی۔

خاوند یا ملازمت؟

اجودھیا پرشاد اور ان کی بیوی کیلاش وتی دونوں ٹیچر تھے۔ کئی برس سے وہ ایک ہی شہر میں ملازم تھے۔ زندگی آرام سے گزر رہی تھی۔ اچانک کیلاش وتی کا تبادلہ دوسرے شہر میں ہوگیا۔ اجودھیا پرشاد نے اپنی بیوی سے کہا کہ اُس کے تبادلے کی وجہ سے انہیں دو گھروں کا بوجھ اٹھانا پڑے گا۔ بہتر یہی ہے کہ وہ اپنی ملازمت سے استعفٰی دے دے، تاکہ دونوں میاں بیوی ایک ساتھ رہ سکیں۔ کیلاش وتی ملازمت چھوڑنے پر راضی نہ ہوئی۔ اس نے کہا کہ ہم ہفتے میں دو روز کے لئے ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں۔ کیلاش وتی دوسرے شہر چلی گئی۔ اب اسے اجودھیا پرشاد کی محبت سمجھا جائے یا گھر چلانے کی نااہلیت کہ اُس نے اپنی بیوی پر مقدمہ دائر کر دیا۔ قانون میں ایک دفعہ ہے جس کے تحت خاوند اپنی بیوی کو ازدواجی تعلقات استوار کرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ قانون خاوند کے اس حق کو تسلیم کرتا ہے۔ اس قانون کے تحت خاوند اپنی بیوی کو اس کے میکے سے بھی لا سکتا ہے۔ قانون اور پولیس اس میں خاوند کی مدد کرتی ہے۔ یہ مقدمہ پنجاب اور ہریانہ ہائی کورٹ میں پیش ہوا۔ فاضل ججوں کی فل بنچ نے اس مقدمہ کو سُنا۔ انہوں نے خاوند کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ خاوند کا کہنا تھا کہ اس کی بیوی نے جان بوجھ کر اپنا تبادلہ دوسرے شہر میں کرایا ہے۔ ہائی کورٹ نے فیصلہ کیا کہ بیوی کے لئے اپنی ملازمت سے استعفٰی دینا ضروری ہے۔ بیوی کا پہلا فرض ملازمت کرنا نہیں ہے، بلکہ خاوند کے آرام کا خیال رکھنا ہے۔

جس کو راکھے سائیاں.....

پچھلے دنوں ایران کی شہزادی اشرف پہلوی اپنی ساتھیوں کے ساتھ کار سے سفر کر رہی تھیں کہ ایک گذرتی ہوئی کار سے اُن پر گولیاں چلائی گئیں۔ شہزادی اشرف بال بال بچ گئیں، لیکن اُن کی بیش خدمت خاتون مسز خانوری گولی لگنے سے ہلاک ہوگئیں۔ شہزادی اشرف ایک رولس رائس میں سفر کر رہی تھیں۔ یہ واقعہ جنوبی فرانس کے ساحل پر پیش آیا۔ اُن کے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک ایرانی تاجر بھی زخمی ہوئے۔ شہزادی اشرف تہران کے لئے روانہ ہوگئیں۔ انہوں نے کہا: "میں خدا کی مہربانی سے بچ گئی ہوں۔ میرا بچنا ایک معجزہ ہے۔ میں موت سے نہیں ڈرتی۔ موت سیڑھیوں سے گر کر بھی آسکتی ہے۔" شہزادی نے مزید کہا کہ وہ شکرانے کے طور پر تمام مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کریں گی۔ شہزادی اشرف شاہِ ایران کی جڑواں بہن ہیں۔ اُن کی عمر ۵۷ سال ہے۔

بجھتے چراغ کی لو

ملیشیا کی راجدھانی کوالالمپور میں بابا عمر نامی ایک آدمی نے اپنی جائداد گروی رکھی اور اپنے سیونگ اکاؤنٹ سے روپیہ نکالا، صرف اس لئے کہ اپنی محبوبہ کو جیل سے چھڑا سکے۔ اس نے عدالت پہنچ کر جرمانہ ادا کر دیا۔ جب اس کی محبوبہ آزاد ہوگئی تو عمر نے ایک ٹیکسی کو رکوا، اپنی سائیکل کو اس پر لادا اور بیحد خوش و خرم اپنے گھر پہنچ گیا۔ اپنے گھر پہنچ کر وہ دونوں شادی کی تیاری میں مصروف ہوگئے۔ یہ شادی اس عدالت میں ہونا تھی جس نے محبوبہ کو جرمانے کی سزا دی تھی۔ بابا عمر کی عمر ۸۱ سال ہے۔ اس نے ۱۷ بار شادی کی اور اتنی ہی بار طلاق دی۔ بابا عمر کی محبوبہ کی عمر ۴۴ سال ہے۔ عمر کی یہ اٹھارہویں شادی ہے۔

بزمِ بانو

صفیہ سلطانہ، دھاروار ۴

س : زیادہ سوچنے سے ذہن پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ بھائی کیا آپ مجھے اس سوچ بچار سے بچا سکتے ہیں؟

ج سوال زیادہ سوچنے کا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ آپ کیا سوچتی ہیں۔ اگر آپ خوش گوار باتوں کے متعلق سوچتی ہیں تو اس کے آپ کے ذہن پر خوش گوار اثر پڑتا ہے۔

قاضی سعید الدین، بدنیرہ گنگائی

س : کیا حقیقت میں زندگی بارِ گراں ہے؟

ج یہ سوال نقطۂ نظر کا ہے۔ کچھ لوگ اپنا بوجھ سر پر اُٹھائے پھرتے ہیں۔ کچھ خدا کے بھروسے پر چھوڑ کر زندگی گزارتے ہیں۔

س : دین خزانہ ہے تو علم کیا ہے؟

ج خزانہ کی کنجی۔

مس فرزانہ صدیقی، کوسیارہ (پلاموں)

س : بھائی جان! موجودہ دَور میں نیکی اور ہمدردی کا نتیجہ؟

ج نیکی اور ہمدردی کسی دَور میں ضائع نہیں ہوتی۔ یہ اپنا انعام آپ ہیں۔

س : بھائی جان! اپنے آپ کو زیادہ عقل مند سمجھنے کا نتیجہ؟

ج ٹھوکر کھانے کے بعد سامنے آتا ہے۔

منت خوابکار، رانچی ۲

س : اگر نیک اُمیدیں کرنے کے بعد بُرا صلہ ملے تو؟

ج انجیل کا ایک مقولہ ہے کہ خدا کے رحم و کرم کے لائق وہ لوگ ہیں جو نا اُمید نہیں کرتے کیوں کہ وہ کبھی نا اُمید نہیں ہوتے۔ جب اُمید ہی نہ ہوگی تو نا اُمیدی بھی نہیں ہوگی

س : شادی بربادی ہے یا خانہ آبادی؟

ج شادی کے آئین میں پابندی کی جائے تو خانہ آبادی ورنہ بربادی۔

س : انسان اپنی ذات سے کب اور کیوں نفرت کرنے لگتا ہے؟

ج اپنی ذات سے نفرت کے جراثیم بچپن میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس میں والدین کا بڑا ہاتھ رہتا ہے۔

صبیحہ ممتاز، بہار شریف

س : بے خودی انسان کو کہاں پہنچا دیتی ہے؟

ج بے خودی انسان کی منزل ہے وہ اُسے خدا تک پہنچا دیتی ہے۔

ڈبلو۔ اے۔ زخمی، گریڈیہہ

س : انسان میں خود غرضی کب آجاتی ہے؟

ج جب اس کی ذات ہی اس کی تمناؤں کا مرکز بن جائے اور جب اُسے تحفظ کا احساس نہ ہو۔

س : انسان کی سب سے بڑی خواہش کیا ہوتی ہے؟

ج تحفظ اور سکون۔

متین صدیقی، حیدر آباد

س : پیار اگر جرم ہے تو اس کی سزا؟

ج ایک کانٹا جو دل میں کھٹکتا رہتا ہے۔

س : ڈوبتے کو سہارا دو یا؟

ج اُسے ناکارہ بنا دیتا ہے۔

ایس۔ ایم۔ بگائیڈ، اٹاوہ

س : محبت میں خلوص ہو تو؟

ج وہ محبت ہے ورنہ وقت گزاری کا سامان۔

اِس عنوان کے تحت دلچسپ معلوماتی اور ذہنی سوالوں کے جواب دئے جاتے ہیں۔ ایک کاغذ پر یا پوسٹ کارڈ پر زیادہ سے زیادہ تین سوال لکھئے۔ ہر سوال کے بعد جواب کے لئے جگہ چھوڑیئے اور اپنا پورا نام پتہ لکھئے۔ جس کاغذ یا کارڈ پر سوالات ہوں اس پر دفتر سے متعلق اور کوئی بات نہ لکھئے۔ اپنے سوالات اس پتہ پر بھیجئے:

بزمِ بانو

ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

— مدیرہ

زینت کوثر، آسنسول

س : آج کل کی لڑکیاں لڑکوں کی خوب صورتی دیکھتی ہیں یا دولت ؟

ج ہمارے خیال میں شخصیت۔

س : زندگی کب بوجھ معلوم ہونے لگتی ہے ؟

ج جب انسان آرزوؤں کے بوجھ تلے دب جائے۔

غفور احمد، گلبرگہ ۴ (کرناٹک)

س : آج کل کی لڑکیوں کے اصلی چہرے کیسے پہچانے جا سکتے ہیں ؟

ج جب آپ اپنا اصلی چہرہ پہچان لیں۔

س : کیا خوب صورت عورت کی محبت انسان کو خدا سے ملا سکتی ہے ؟

ج محبت خوب صورت عورت کی ہو یا معمولی عورت کی۔ اگر یہ سمجھ کر کی جائے کہ یہ ایک مقدس جذبہ ہے تو ایسا ہونا ممکن ہے، لیکن ایسا ہوتا نہیں۔ محبت کے ساتھ عموماً احساسِ گناہ شامل ہوتا ہے۔

محمد سلیم خاموش، ہزاری باغ

س : محبت اندھی ہوتی ہے یا محبت کرنے والے اندھے ہوتے ہیں ؟

ج محبت کرنے والے ـــــ انہیں محبوب کے عیب دکھائی نہیں دیتے۔

س : خیالات کب بدلتے ہیں ؟

ج جب حالات بدل جائیں۔

نرگس علی، بھتنا ہا

س : ماں کو اپنے بچّے سے زیادہ محبت ہوتی ہے یا اپنے شوہر سے ؟

ج بچّے سے ـــــ بچّے کی محبت پیدائش سے پہلے اس کے دل میں گھر کر لیتی ہے۔

فرحت نظیر، جھاجھا

س : بیوی کی آرزو کیا ہوتی ہے ؟

ج کبھی شوہر غلام ہو جائے اور کبھی شوہر حکم چلائے۔

محمد تمیز احمد، نظام آباد

س : انسان کی خوشی عارضی کیوں ہوتی ہے ؟

ج خوشی کا دار و مدار خواہشات کی تکمیل پر ہے۔ خواہشات بھی عارضی ہوتی ہیں۔

س : تقدیر کب ساتھ دیتی ہے ؟

ج جب نیت سالم ہو۔

س : قرض کیا ہے ؟

ج ایک ایسی شے جو تعلقات کو ناخوش گوار بنا دیتی ہے۔

س : محبت کا انجام ؟

ج بے خوابی، دردسری، خفقان، رسوائی اور بعض اوقات شادی۔

نسرین ملک، ملیح آباد

س : دوستی کی معراج ؟

ج اپنے سے زیادہ دوست کا خیال۔

س : چالاک و عیار انسان کب تک مزے اڑاتا ہے ؟

ج جب تک اس کی چالاکی کا بھرم قائم رہتا ہے، لیکن یہ بھرم بلبلے کی مانند ہوتا ہے۔

وقار احمد خاں، گریڈیہہ

س : دوسروں کو راہ بتانے والا خود کب ٹھوکر کھا جاتا ہے ؟

ج جب وہ خود اس راہ پر نہ چلے۔

س : انسان کو کڑوی بات بھی کب اچھی لگتی ہے ؟

ج جب وہ شیریں دہن کے منہ سے نکلے۔

س : انسان خود کو کمزور کب محسوس کرتا ہے ؟

ج جب اُسے اپنے سے زیادہ دوسروں پر بھروسہ ہو۔ اور یہ بھروسہ چھن جائے۔

شہلا ذکی، نہٹور

س : بھابی! کیا فرائض کو نبھانا عبادت ہے ؟

ج خوشی خوشی اپنے فرائض کو انجام دینا عبادت ہے۔ مصیبت سمجھ کر نہیں۔

س : دنیا کو بے وفا کیوں کہا جاتا ہے ؟

ج دنیا آپ سے الگ نہیں۔ دنیا آپ کا آئینہ ہے۔

مس سرور صوفیہ پروین، جھاجھا

س : زندہ دلی کب نقصان دہ ثابت ہوتی ہے ؟

ج جب محفل میں سارے مردہ دل ہوں۔

س : زندگی کی خوشی کس بات میں پوشیدہ ہے ؟

ج آرزوؤں کو سمیٹ کر طاقِ نسیاں میں رکھئے۔

کلام احمد آرزو، ہزاری باغ

س : عورت کی زندگی میں بہار کب آتی ہے ؟

ج جب اس کو محبت کی چھتر چھایا مل جائے۔

سلطانہ اقبال، چھپرہ (بہار)

س : کوئی بھلائی کا بدلہ برائی سے دے تو ؟

ج اگر کتا آپ کو کاٹ لے تو کیا آپ بھی اُسے کاٹیں گے۔

نئی

"سویٹ سجابی"

ہر نیا شمارہ ہاتھ میں لے کر سوچتی ہوں کہ اس بار 'کہتی سنی' کے ذریعے میں بھی آپ کی تعریف کروں مگر میری اور بہنیں مجھے اتنا موقعہ ہی نہیں دیتیں وہ میرا کام خود ہی نمٹا دیتی ہیں۔ ویسے بھی "بانو" کی تعریف کے قابل میرے پاس الفاظ نہیں۔

اکتوبر کے بانو میں سب سے زیادہ خوب صورت کہانی "پرایا بوجھ" اور "فیصلہ" تھیں، دل کی گہرائیوں میں اتر جانے والی دونوں کہانیاں لکھنے والی دونوں مصنفہ کو میری جانب سے مبارک باد۔ اور آپ کی ذہانت کا تو کوئی جواب ہی نہیں نہ جانے اتنے خوب صورت خوب صورت مضامین افسانے اور "آپ کی ذہنی الجھن اور اس کا حل" آپ کس طرح ہم جیسی لڑکیوں تک پہنچا دیتی ہیں ہم سب بہنیں ہزار بار بھی آپ کا شکریہ ادا کریں تو کم ہے۔ اور ہاں بھابی جان اک چھوٹی سی التجا ہے بانو میں "پسندیدہ اشعار" کو جگہ دیجیے گا آپ کی قسم بانو کی خوب صورتی میں چار چاند لگ جائیں گے۔ اور مجھے بھی بے حد خوشی ہوگی دیکھتے ہیں آپ کہاں تک میری رائے سے اتفاق کرتی ہیں۔

شاداب پروین دیوانی میرٹھ

سویٹ سجابی:

اکتوبر ۱۹۷۷ کا بانو نظر نواز ہوا ایک ہی نشست میں شروع سے آخر تک پڑھ ڈالا۔ افتتاحیہ کے لئے تعریف کرنا تو سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہے۔ افسانوں میں ملازمت اور پرایا بوجھ بے حد پسند آئے۔ خاص طور پر "پرایا بوجھ" کی تعریف کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں مصنفہ نے ایک حقیقت کو خوب صورت افسانے کا رنگ دے ڈالا ہے۔ اس کے لئے آپ کو اور مصنفہ کو مبارک باد امید ہے اسی طرح کے افسانے بانو میں شائع ہو کر اس کے حسن میں چار چاند لگا دیں گے۔ سال نامہ کب تک شائع ہو رہا ہے خدارا انتظار کی کوفت جلد از جلد دور کیجئے۔

نکہت فرح، نزہت عابدی، امراوتی کیمپ

ڈیر سجابی:

اکتوبر کا بانو ملا۔ اس دفعہ افسانوں کی تعداد کم تھی۔ لیکن اس کی تلافی دل چسپ اور معلوماتی مضامین سے ہوگئی۔ ن سلطانہ کا مضمون "کیا گاندھی جی ایک ظالم شوہر تھے" پسند آیا۔ گاندھی جی کی زندگی میں کستوربا کے علاوہ اور بہت سی عورتیں آئیں یہ عورتیں عقیدت اور احترام کے جوش میں دنیا کے مختلف حصوں سے آئی تھیں۔ ان کے جنوبی افریقہ کے قیام کے دوران کئی عورتیں ان کی مقناطیسی قوت سے مسحور ہوگئی تھیں۔ ایک منحنی اور کم زور انسان میں ایسی کیا طاقت تھی کہ عورتیں ان کے

ہلک بند نہیں رہنے چاہئیں۔

دہلی

ے پر چمک لانے کے لئے کوئی یلو نسخہ بتائیں۔

ایں صرف کھیرے کا عرق ایک اا چیز ہے جو مسام کے اندر پہنچ تا ہے۔ جس کی وجہ سے کھال میں پن پیدا ہو جاتی ہے۔ ورنہ کوئی بھی سام کے اندر نہیں پہنچ پاتی ـــــ یرے کا عرق روئی کے ٹکڑے میں کر چہرہ پر لگانے سے چہرے میں ڈتی چمک پیدا ہوتی ہے۔

بریلی

جی کمر میں درد رہتا ہے میں جھک کر ہنے کی عادی ہوں۔ کیا جھک کر سے درد ہو سکتا ہے۔

معل بالکل ہو سکتا ہے۔ آپ کمر کو اگت تختے کی طرح سیدھی رکھیں۔ کارپائی پر نہ سوئیں۔ بلکہ فرش پر ایں۔ فرش پر بھی گدے کا استعمال حاب تو زیادہ بہتر ہے۔

ڈیہ

ہاں حال ہی میں بچی ہوئی ہے ہوا ناک بہت پھیلی ہوئی ہے۔ ے کرنا چاہیئے۔

یہ اج سویرے اس کی ناک کو انگلی ہے کی مدد سے دبا دیا کریں پینل صبح کے علاوہ دن میں بھی اور بلر ہیں تو بہت جلد ناک پتلی کر مے گی۔ بڑے بچوں کے لئے بھی یہ کیا جاسکتا ہے۔

جا ہیں۔ لیکن دوا کا استعمال پورے چہرے پر
جاتا ہے۔ دوا لگاتے وقت دو قسم کے برش
معال ہوتے ہیں۔ عام جگہ پر بڑے برش
معال کئے جاتے ہیں، گہری جھرّیوں پر بہت
ک اور چھوٹے برش کا استعمال ضروری ہے،
ہ دوا جھرّیوں کی تہہ میں پہنچ جائے۔ مہاسوں
نشان اور پھوڑوں کی سیاہی پر خاص توجّہ
جاتی ہے۔ اس بات کی خاص احتیاط رکھی
تی ہے کہ فینول برش سے نیچے نہ گرے۔ دوا
اتنی ہی مقدار برش میں ہونا چاہیئے جتنی
روری ہو۔ اگر برش سے دوا گرنے لگے تو اس
خرابی کا امکان ہو سکتا ہے۔ یہ احتیاط دوا
نے والے کی مہارت پر موقوف ہے۔ اگر
ی جگہ دوا ضرورت سے زیادہ لگ جائے تو
اروئی سے صاف کر دی جاتی ہے۔

اس علاج میں بے صبری کی گنجائش
ں۔ ایک ہی نشست میں سارے چہرے
دوا نہیں لگائی جاتی۔ اس کا یہ مطلب نہیں
دوا لگانے والا علاج سے پہلے جلد پر تجربہ کرتا
تا ہے۔ یہ تجربہ تو اسے بہت پہلے کرنا پڑتا
علاج شروع کرنے سے پہلے بغل کے اندرونی
میں فینول لگائی جاتی ہے۔ اگر اس دوا کا
پر خراب اثر ہو تو علاج نہیں کیا جاتا۔ بغل
ندرونی حصّے کے انتخاب سے فائدہ یہ ہے
ہ وہاں جلد کے جلنے کا نشان بھی پڑ جائے
ہر سے دکھائی نہیں دیتا۔ یہ علاج کئی نشستوں
ورا کیا جاتا ہے۔ آنکھوں کے چاروں طرف
اسے بہت احتیاط سے دوا لگائی جاتی ہے۔
بکہ دوا لگاتے وقت برش میں اتنی فینول
ہے کہ وہ نم رہے۔ اس بات کی سخت
اکی جاتی ہے کہ دوا آنکھوں میں نہ لگ

جائے۔ اگر ایسا ہو جائے تو فوراً نمک کے پانی سے آنکھوں کو دھویا جاتا ہے۔

اگر کیمو سرجری کسی جوان عورت کے چہرے پر کی جائے تو عموماً سارے چہرے پر دوا لگائی جاتی ہے، لیکن پپوٹوں کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جب فینول کھال پر لگتی ہے تو چہرے کی جلد برف کی مانند سفید ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد سرخ ہو جاتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چہرے پر ورم آ گیا ہے۔ اس کے بعد جلد کا رنگ آہستہ آہستہ سیاہی مائل ہو جاتا ہے۔ جلد کی سیاہی سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اگر دوا صحیح تعداد میں اور صحیح تناسب سے لگائی گئی ہے تو سیاہی جلد ہی دور ہو جاتی ہے۔ عموماً پہلے دن صرف چہرے پر دوا لگائی جاتی ہے، دوسرے دن گردن اور گلے پر۔ دوا لگانے کا عمل پیشانی سے شروع کیا جاتا ہے، پھر گالوں کی باری آتی ہے اور اس کے بعد پپوٹوں کی۔ ہونٹوں کے قریب کی جگہ چھوڑ دی جاتی ہے۔ ہونٹوں کو فینول سے بچانے کی سخت ضرورت ہے۔

یہ علاج بہت آہستہ آہستہ عمل میں لایا جاتا ہے تاکہ مریض کا ردِّ عمل معلوم ہوتا رہے۔ دوا لگنے کے بعد کھال کے جلنے کا احساس ہوتا ہے اور ہلکی ہلکی درد کی لہریں اٹھتی ہیں۔ کھال کے جلنے کا احساس تقریباً ایک گھنٹہ رہتا ہے۔ اس کے بعد درد ختم ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی جلنے کے اثر سے جلد میں زہرباد ہو سکتا ہے۔ اس کا فوری علاج کیا جاتا ہے۔ جب دوا چہرے پر لگی ہو تو گیلے چہرے پر ایک خاص قسم کا پاؤڈر چھڑکا جاتا ہے۔ یہ پاؤڈر گیلے چہرے پر جم جاتا ہے۔ ایک ہفتہ تک یہ پاؤڈر اسی طرح چہرے سے چپکا رہتا ہے۔ ایک ہفتے کے بعد خود بخود جھڑ جاتا ہے۔ کیمو سرجری کا مطلب یہ ہے کہ فینول سے چہرے کی جلد کی پہلی تہہ کو جلا دیا جائے اور جلد کی دوسری تہہ ظاہر ہو جائے۔ جلد کی پہلی تہہ کے اترنے کا عمل فینول لگانے کے تیسرے یا چوتھے دن شروع ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی یہ عمل دوسرے دن ہی شروع ہو جاتا ہے، مگر یہ قبل از وقت ہوتا ہے۔ اس عمل کو روکنے کے لئے ایک خاص قسم کا تیل استعمال کیا جاتا ہے۔ اس تیل سے جلد پر سرخی آ جاتی ہے۔ کبھی کبھی چہرے کی کھال بھی پھٹ جاتی ہے یہ علاج کے منافی ہے۔ کھال کو آہستہ آہستہ جل کر اترنا چاہیئے۔ کھال کے پھٹ جانے کی صورت میں فوراً کوئی اینٹی بایوٹیک دوا استعمال کرائی جاتی ہے تاکہ زہرباد نہ ہو جائے سب سے آخر میں پیشانی کی کھال اترتی ہے۔ یہ تمام کارروائی ۱۵ دن میں مکمل ہو جاتی ہے۔ اوپر کی کھال جل کر اتر جاتی ہے اور نیچے کی تازہ اور گلابی کھال اوپر آ جاتی ہے۔ چار ہفتے میں چہرہ نارمل ہو جاتا ہے۔ دھوپ اور موسم کی خرابیوں سے جھلسا ہوا چہرہ تازہ اور شگفتہ ہو جاتا ہے۔ مہاسوں کے نشانوں اور سیاہ دھبّوں سے بھرا ہوا چہرہ ان نقائص سے پاک ہو جاتا ہے۔ یہ نشان عموماً ختم ہو جاتے ہیں، اور اگر بالکل ختم نہ ہوں تو کم ضرور ہو جاتے ہیں۔

بہت سی عورتیں مجھ سے سوال کرتی ہیں کہ اس علاج کے بعد جلد کو اپنی اصلی حالت پر آنے میں کتنا وقت لگتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تازگی اور شگفتگی ہمیشہ نہیں رہ سکتی۔ میرا جواب یہ ہے کہ یہ علاج خاصا دیرپا ہے۔ بوڑھی عورتیں کیمو سرجری کے بعد ۱۰ سے ۲۰ سال تک چھوٹی دکھائی دیتی ہیں۔ دراصل اس

بات کا دارومدار انفرادی ردِ عمل پر ہے۔ چہرے کے کونوں پر جلد پھیلی ہوئی ہو تو سکڑ جاتی ہے۔ مونہہ کے دونوں طرف عمودی لائنیں غائب ہو جاتی ہے۔ پپوٹوں کی کھال تنگ ہو جاتی ہے۔ اگر آنکھوں کے نیچے کا حصہ بھاری اور لٹکا ہوا ہو تو اس کا بھاری پن ختم ہو جاتا ہے۔ آنکھ اور کنپٹی کے درمیان اکثر لکیریں پڑ جاتی ہیں۔ یہ لکیریں زیادہ ہنسنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہ کوّے کے پنجے سے مشابہ ہوتی ہیں انہیں انگریزی میں 'کوّے کے پاؤں' کہتے ہیں یہ لکیریں بھی کیمو سرجری سے ختم ہو جاتی ہیں۔ گردن پر فینول لگاتے وقت بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ گردن اور گلے میں خون کی روانی چہرے سے کم ہوتی ہے۔ اس لئے ان حصّوں کو نارمل ہونے میں زیادہ وقت لگتا ہے۔ نئی کھال اپنی تازگی کو ۵ سے ۱۰ سال تک قائم رکھ سکتی ہے۔

چہرے کی جھرّیوں اور نشانوں کو ختم کرنے کے لئے میڈیکل سائنس نے کئی علاج دریافت کئے ہیں۔ ایک علاج یہ ہے کہ چہرے کو ایک برش سے صاف کیا جاتا ہے۔ یہ برش لوہے کے تاروں سے بنایا جاتا ہے۔ یہ عمل ریگ مال سے دیوار کا رنگ چھڑانے کے مترادف ہوتا ہے۔ اس سے چیچک کے داغ صاف ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ عمل خاصا تکلیف دہ ہے اور اس میں کافی دیر لگتی ہے۔ دوسرا علاج پلاسٹک سرجری ہے۔ اس میں چہرے کی کھال کو کھینچ کر صاف کیا جاتا ہے۔ کھال کی بالائی سطح کو باقی تہوں سے الگ کر لیا جاتا ہے۔ یہ عمل ایک سلائی کی مدد سے کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد کھال کو کان کی لو تک کھینچ کر لے جاتے ہیں۔ فاضل جلد کو کاٹ دیا جاتا ہے۔ آپریشن کا نشان بھی باقی نہیں رہتا یہ نشان کان کے پاس سر کے بالوں کے نیچے چھپا دیا جاتا ہے۔ گردن کی کھال کو بھی اسی طرح کھینچ کر ٹھوڑی کی طرف لے جاتے ہیں۔ اور آپریشن کا نشان ٹھوڑی کے نیچے چھپ جاتا ہے۔ پلاسٹک سرجری خوب صورتی کو قائم رکھنے کے لئے بہت کم استعمال کی جاتی ہے۔

اگر جلد پر جلنے کا نشان ہو یا ناک بہت چھوٹی یا بہت بڑی ہو تو پلاسٹک سرجن سے رجوع کرنا چاہیئے۔ یہ علاج مہنگا ہے۔ ایک آپریشن پر ایک ڈیڑھ ہزار روپیہ خرچ ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس کیمو سرجری چہرے کے پیدائشی نقص ٹھیک نہیں کر سکتی، مثلاً یہ چپٹی ناک کو ستواں نہیں بنا سکتی، لیکن پرانی جلد کو جلا کر نئی جلد سے چہرے کو حسین اور جوان ضرور بنا سکتی ہے۔

آخر میں یہ بات بتانا ضروری ہے کہ کیمو سرجری کے لئے کسی ماہر ڈاکٹر یا بیوٹی ایکسپرٹ کی خدمات حاصل کرنی چاہیئے۔ اس دوا کو خود آزمانا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

سوال جواب

شہناز بیگم، صاحب آباد

س : میری کھال بہت خشک ہے۔ کیا میں چہرے پر بالائی لگا سکتی ہوں۔

ج آپ بالائی لگا سکتی ہیں۔ لیکن دس منٹ سے زیادہ چہرے پر بالائی نہ لگی رہنے دیں کیوں کہ چہرے کے مسام زیادہ دیر تک بند نہیں رہنے چاہئیں۔

جمیلہ خاتون، دہلی

س : چہرے پر چمک لانے کے لئے کوئی گھریلو نسخہ بتائیں۔

ج دنیا میں صرف کھیرے کا عرق ایک ایسی چیز ہے جو مسام کے اندر پہنچ جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے کھال میں چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ ورنہ کوئی بھی چیز مسام کے اندر نہیں پہنچ پاتی —— کھیرے کا عرق روئی کے ٹکڑے میں بھگو کر چہرہ پر لگانے سے چہرے میں قدرتی چمک پیدا ہوتی ہے۔

آمنہ بیگم، رائے بریلی

س : میری کمر میں درد رہتا ہے میں جھک کر بیٹھنے کی عادی ہوں۔ کیا جھک کر بیٹھنے سے درد ہو سکتا ہے۔

ج جی ہاں بالکل ہو سکتا ہے۔ آپ کمر کو ہر وقت تختے کی طرح سیدھی رکھیں۔ اور چارپائی پر نہ سوئیں۔ بلکہ فرش پر سوئیں۔ فرش پر بھی گدّے کا استعمال نہ کریں تو زیادہ بہتر ہے۔

شمیم آرا، لکھنؤ

س : میرے ہاں حال ہی میں بچی ہوئی ہے اُس کی ناک بہت پھیلی ہوئی ہے۔ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

ج آپ صبح سویرے اُس کی ناک کو انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے دبا دیا کریں اگر یہ عمل صبح کے علاوہ دن میں بھی کئی بار کریں تو بہت جلد ناک پتلی ہو جائے گی۔ بڑے بچوں کے لئے بھی یہی عمل کیا جا سکتا ہے۔

سلمہ صدیقی ۔ دہلی

س : میری آنکھوں میں جھریاں پڑگئی ہیں کیا آپ بتا سکتی ہیں اس کی کیا وجہ ہے۔

ج : آپ تولئے سے چہرہ خشک کرتے ہوئے آنکھوں کے نچلے حصہ کو بہت زور سے رگڑتی ہوں گی۔ اس طرح سے پوچھنے سے آنکھ کے حلقے کی رگیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ آئندہ احتیاط رکھیں اور آنکھوں کے حلقے ہر وقت چکنے یا گیلے رکھیں۔ کھیرے کا عرق بھی مفید ہوگا۔ لیکن زیادہ چکناہٹ بھی نقصان دہ ہے۔

یوگا ورزشیں

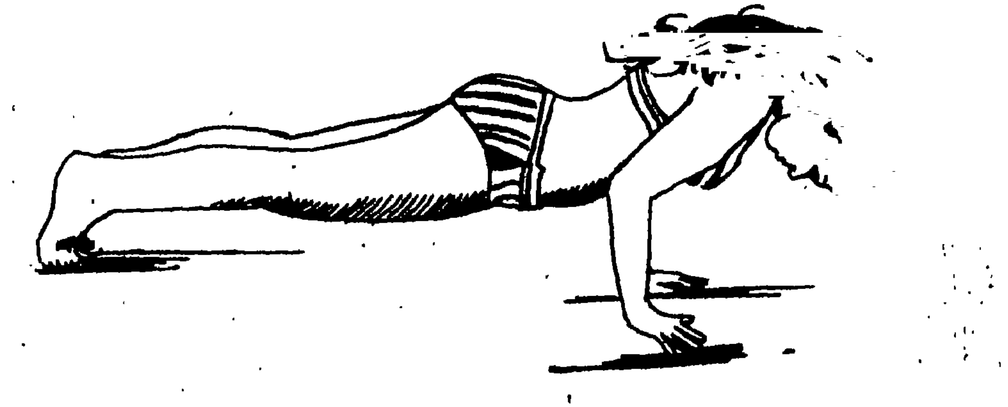
ورزش نمبر ۱

یہ ورزش ہاضمہ کو قوت بخشتی ہے۔ اس کے علاوہ مثانہ آنتیں گردے کو بھی فائدہ پہنچاتی ہے۔ فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھ جائیں گھٹنے علیحدہ رکھیں۔ دونوں ہتھیلیوں کو فرش پر ٹکالیں۔ دونوں ہتھیلیاں دونوں گھٹنوں کے درمیان رہیں۔ پھر آگے کو جھکیں۔ اور کہنیوں کو پیٹ کی طرف لے جائیں۔ بدن کے بوجھ کو بازوؤں پر لیں۔ اب ٹانگیں پیچھے کی طرف لے جائیں۔ جسم فرش کے متوازی رہے۔ صرف پنجے زمین پر ٹکیں۔ ایک منٹ انتظار کریں۔ یہ خاصی مشکل ورزش ہے۔ کچھ دنوں کی مشق کے بعد ہی آسانی سے عمل میں لائی جا سکتی ہے۔ یہ ورزش ایک بار ہی کافی ہے۔

ورزش نمبر ۲

یہ ورزش اعصابی تھکن سے نجات دلاتی ہے۔ اس ورزش سے غصہ فرو ہو جاتا ہے۔ پریشانی رفع ہو جاتی ہے۔ فرش پر چت لیٹ جائیں۔ بازوؤں کو جسم سے لگالیں۔ جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیں۔ جسم میں کوئی حرکت نہ رہے۔ دنیا بھر کے خیالات سے دماغ کو پاک کریں۔ صرف سانس کی آمد و رفت پر دھیان رکھیں۔ سانس آہستہ اور گہرے لیں۔

تصویر ورزش نمبر ۱



تصویر ورزش نمبر ۲



باورچی خانہ

مزے دار اور آزمودہ پکوان

آزمائش اور ترتیب : رشیدہ خاتون

تلا ہوا گوشت

گوشت	بغیر ہڈی کا ۵۰۰ گرام
لال مرچ	۲ چائے کے چمچے
ٹماٹر	(درمیانہ سائز) ۴ عدد
انڈے	۴ عدد
گرم مسالہ	ایک چائے کا چمچہ
گھی	حسب ضرورت
نمک	حسب ذائقہ
لیموں کا عرق	پاؤ پیالی
پیاز	(درمیانہ سائز) ۲ ڈلی

گوشت کے ایک ایک انچ کے چوکور ٹکڑے کرلیں اور دھوکر کسی صاف کپڑے سے خشک کرلیں۔ پھر اس پر لال مرچ، نمک، گرم مسالہ اور لیموں مل کر آدھے گھنٹے کے لئے رکھ دیں۔

ٹماٹروں کے پاؤ پاؤ انچ موٹے گول قتلے کاٹ لیں۔ پیاز چھیل کر باریک لچھے کاٹ لیں۔

کڑھائی میں زیادہ گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں گھی گرم ہو جائے تو اس میں آدھے گوشت کے ٹکڑے ڈال دیں بادامی ہو جائیں تو گھی سے نکال لیں اور گھی میں باقی کا گوشت ڈال دیں۔ بادامی ہو جائے تو اس کو بھی گھی سے نکال لیں۔

اب ایک پھیلی ہوئی ڈش میں تلا ہوا گوشت رکھ دیں اس پر پیاز کے لچھے پھیلا دیں پیاز پر ٹماٹر رکھ دیں ٹماٹروں کے اوپر انڈے تل کر رکھ کر پیش کریں۔

بیگن کا اچار

بیگن	گول ۵۰۰ گرام
لال مرچ	۱۰ عدد
ہلدی	پاؤ چائے کا چمچہ
چھوٹی الائچی	۸ عدد
لونگ	۵ عدد
کالی مرچ	۱۰ عدد
دارچینی	ایک انچ کا ٹکڑا
رائی	ڈیڑھ ٹیبل اسپون
ادرک	ایک انچ کا ٹکڑا
لہسن	۱۲ جوے
سرکہ	پونی پیالی
گڑ	(باریک کٹا ہوا) ۲ ٹیبل اسپون
سرسوں کا تیل	ڈیڑھ پیالی
نمک	حسب ذائقہ

بیگن کو دھوکر کسی صاف کپڑے سے خشک کرلیں پھر آدھا آدھا انچ موٹے گول قتلے کاٹ لیں لہسن اور ادرک کو چھیل لیں۔

لال مرچوں کی ڈنڈیاں توڑ لیں اب ان تینوں چیزوں کو تھوڑا سرکہ ملا کر سل پر باریک پیس لیں باقی کے سرکہ میں گڑ ڈال کر ایک گھنٹے کے لئے رکھ دیں۔

چھوٹی الائچی، دارچینی، لونگ اور کالی مرچوں کو سوکھا سل پر پیس لیں۔

ایک کڑھائی میں تیل ڈال کر آنچ پر رکھ دیں اب اس میں پسی ہوئی ادرک لہسن، لال مرچ اور ہلدی ڈال کر بھون لیں اور اس کے بعد بیگن اور رائی ڈال دیں آنچ بہت دھیمی کر دیں بیگن گل جائیں تو گڑ ملا ہوا سرکہ ڈال دیں پانچ منٹ بعد اس میں سوکھا پسا ہوا مسالہ ڈال کر اچھی طرح ملا دیں اور کڑھائی کو آنچ سے اتار لیں۔

ٹھنڈا ہو جانے کے بعد کسی صاف اور خشک جار میں رکھ دیں۔

بھاپ کے چاپ

چاپ	۸ عدد
لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
سفید زیرہ پسا ہوا	ایک چائے کا چمچہ

لہسن ایک چائے کا چمچہ
سرکہ ۲ ٹیبل اسپون
انڈے ۲ عدد
گرم سوکھی ڈبل روٹی کا چورہ آدھی پیالی
گھی حسب ضرورت

چاپوں کو دھو کر ہلکا سا کچل لیں۔
انڈوں کو پھینٹ لیں۔

ہرے دھنیے کی پتیوں کو سل پر موٹا موٹا پیس کر اس میں انڈے اور کرم کے علاوہ تمام چیزیں ملا لیں اب اس کو چاپوں پر خوب اچھی طرح مل کر دو گھنٹے کے لئے رکھ دیں۔

فرائنگ پان میں گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں گھی اتنا ڈالیں جس میں چاپ ڈوب جائیں گھی گرم ہو جائے تو چاپ کو پہلے انڈے میں ڈبوئیں پھر اس کو کرم میں لپیٹ کر تلیں چاپ ایک طرف سے بادامی ہو جائیں تو پلٹ دیں دوسری طرف سے بھی بادامی ہو جائیں تو گھی سے نکال لیں اسی طرح تمام چاپ تل لیں۔

اب ایک چوڑے پیندے کی دیگچی میں پاؤ پیالی گھی ڈال کر تمام چاپ برابر برابر رکھ دیں پھر دیگچی کو ڈھانپ کر اس کا منہ آٹے سے بند کر کے دو چار انگاروں پر رکھ دیں پندرہ بیس منٹ بعد آنچ سے اتار لیں چاپ تیار ہیں۔

قورمہ پلاؤ

گوشت (بوٹیاں) ۵۰۰ گرام
بادام ۵۰۰ گرام
لال مرچ ۴ عدد
پیاز (درمیانہ سائز) ۵ ڈلی
لہسن (پیسا ہوا) ۲ چائے کے چمچے
ادرک (پیسا ہوا) ۲ چائے کے چمچے
گرم مسالہ (پیسا ہوا) ایک ٹیبل اسپون
دہی پونی پیالی
گھی پونی پیالی
نمک حسب ذائقہ

چاولوں کو صاف کر کے پکانے سے دو گھنٹے پہلے بھگو دیں۔ گوشت دھو لیں۔ پیاز چھیل کر لچھے کاٹ لیں۔ لال مرچوں کو بغیر گھی کے ہلکا سا بھون کر پیس لیں۔ باداموں کو کچھ دیر کے لئے گرم پانی میں بھگو کر چھلکے اتار دیں پھر موٹا موٹا کاٹ کر ہلکا سا تل لیں۔ دہی کو خوب اچھی طرح پھینٹ لیں ایک دیگچی میں گھی اور پیاز کے لچھے ڈال کر آنچ پر رکھ دیں پیاز بادامی ہو جائے تو آدھی پیاز گھی سے نکال کر کسی صاف کاغذ پر پھیلا دیں باقی پیاز میں گوشت نمک مرچ لہسن اور ادرک ڈال کر خوب بھونیں پھر گوشت گلنے کے انداز کا پانی ڈال کر دیگچی کو ڈھانپ دیں گوشت گل جائے تو دہی ڈال دیں دہی کا پانی بھن جائے تو چاول ڈال کر دو چار منٹ بھون لیں۔ اب چاول کے گلنے کے انداز کا پانی ڈال دیں چاول گل جائیں اور پانی خشک ہو جائے تو دم پر چھوڑ دیں۔ چاول ڈش میں نکالنے کے بعد ان پر باقی کی تلی ہوئی پیاز اور بادام چھڑک دیں۔

ران (درمیانہ سائز کا) ایک عدد
لال مرچ ۲ چائے کے چمچے
کالی مرچ (پسی ہوئی) ایک چائے کا چمچہ
گرم مسالہ (پسا ہوا) ڈیڑھ چائے کا چمچہ
کچری ۴ عدد
انجیر ایک عدد
کالا نمک ایک چٹکی
نون سادر ایک چٹکی
لیموں کا عرق پاؤ پیالی
ہری مرچ ۶ عدد
لہسن ۸ جوے
گھی ۲ پیالی
نمک حسب ضرورت

ران کی چکنائی اتار کر دھو لیں پھر کھانا کھانے کے کانٹے سے خوب گود لیں لہسن چھیل لیں لہسن اور ہری مرچوں کے علاوہ تمام مسالوں کو تھوڑا پانی ملا کر سل پر خوب باریک پیس لیں پھر تمام مسالوں کو ران پر دونوں طرف لگا کر دو گھنٹے کے لئے رکھ دیں اب اس پر لیموں کا عرق لگا کر دوبارہ کانٹے سے گود کر مزید دو ڈھائی گھنٹے کے لئے رکھ دیں اب ایک چوڑے پیندے کی دیگچی میں گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں گھی گرم ہو جائے تو اس میں لہسن کے جوے اور ہری مرچیں ڈال دیں۔ ایک منٹ بعد اس میں ران بھی ڈال دیں اور دیگچی کو ڈھانپ دیں آنچ دھیمی کر دیں آدھے گھنٹے کے بعد ران کو پلٹ دیں جب ران کا پانی خشک ہو جائے تو آنچ سے اتار لیں۔

ں کی فراکوں کے لئے نئے ڈیزائن





لڑکیوں کے لئے جدید ڈیزائن کے دل کش لباس



پندرہ ہزار روپے کے نقد انعامات تقسیم کئے گئے صحیح حل کوئی نہیں آیا

صحیح حل شمع مِنی معمہ نمبر ۲۵

خ	سا	ط	س	د	
ا	ت	ہ	کا		ب
ا	ر	ب		م	ن
م	ہ		پ	ج	ا
		س	شا	ن	ن
		ب	ے	ت	ے

ایک غلطی والے ۳۵ حل موصول ہوئے جن پر پہلا انعام مبلغ دس ہزار روپے بحساب مبلغ ۲۸۵ روپے ۷۱ پیسے فی حل تقسیم کیا گیا۔

۱۔ ثمینہ صاحبہ، معرفت "شگاف" ۴۰۰ ۲-۱۴-۱۳، حیدرآباد ۵۰۰۰۱۲
۲۔ ایچ صاحب، نیلر ماسٹر، ۲۰۵ الانچی منڈی، الہ آباد ۲۱۱۰۰۳
۳۔ عبدالاحد قرہ صاحب، کہنہ مزار، بسری نگر ۱۹۰۰۰۲
۴۔ محمد ابراہیم صاحب، کلاتھ اسٹور، مقام جیاری بازار، ڈاک خانہ روپ نرائن پور، ضلع بردوان
۵۔ جاوید اقبال صاحب، ۲۱۸۶ گلی نل والی، پہاڑی بھوجلہ، جامع مسجد، دہلی ۱۱۰۰۰۶
۶۔ معصوم حیدر صاحب، معرفت گل صفدر صاحب ایڈوکیٹ، محلہ جابر پور بیگم، بھاگل پور ۲
۷۔ انوار علی خاں صاحب معرفت عبدالستار خاں صاحب، رفعت پورہ، مراد آباد
۸۔ کے۔ کے سیٹھی صاحب، روم نمبر ۲۲۵، ٹرانسپورٹ بھون، پارلیمنٹ اسٹریٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱
۹۔ حسیب احمد صاحب، معرفت چمن وائن کمپنی، سیا بازار، سیوان (بہار)
۱۰۔ عبدالرؤف صاحب ولد بشیر احمد مرحوم، چٹائی ساز، محلہ بارزئی، شاہجہان پور
۱۱۔ عبدالحفیظ نعیمی صاحب، ۳/۵۳، تیل خانہ، بلی بھیت
۱۲۔ ریحانہ تبسم صاحبہ، کہنہ مزار، بسری نگر ۱۹۰۰۰۱
۱۳۔ نصرت حسین خاں صاحب، جیل گوڑہ، کولسیری آفس، ڈاک خانہ جیل گوڑہ، ضلع دھنباد ۸۲۸۱۱۰
۱۴۔ محمد فیروز صاحب، مکان نمبر ۲۹۱۰، لال دروازہ، مسجد کی پائین، دہلی ۱۱۰۰۰۶
۱۵۔ آر۔ پیارے جان صاحب، نمبر ۱/۷، کے۔ لال باغ، فورٹ روڈ، چودھویں کراس، مدد والی، بنگلور
۱۶۔ محمد مجاہد فاروقی صاحب، ایل۔ ٹی ڈسٹرکٹ ٹی بی کنٹرول سینٹر، نزد جنرل پوسٹ آفس، کلکتہ ۷۰۰۰۰۱
۱۷۔ محمد جمیل صاحب، جیاری بازار، ڈاک خانہ روپ نرائن پور، ضلع بردوان
۱۸۔ محمد سعید صاحب معرفت نظام الدین صاحب، پکا بازار، آسنسول
۱۹۔ ثمینہ صاحبہ، معرفت "شگاف" ۴۰۰ ۲-۱۴، حیدرآباد ۵۰۰۰۱۲
۲۰۔ محمد سعید خاں صاحب، ٹی اسٹال، مقابل کیور ریلوے، سنہری مسجد، بلی بھیت
۲۱۔ کے۔ کے سیٹھی صاحب، روم نمبر ۲۲۵، ٹرانسپورٹ بھون، پارلیمنٹ اسٹریٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱
۲۲۔ این۔ سی۔ گوئل صاحب، ایم اے، دہلی کانپور گوندیا ٹرانسپورٹ کمپنی، لاہوری گیٹ، دہلی
۲۳۔ عبدالاحد قرہ صاحب، کہنہ مزار، بسری نگر ۱۹۰۰۰۲
۲۴۔ محمد جمیل صاحب، جیاری بازار، ڈاک خانہ روپ نرائن پور، ضلع بردوان
۲۵۔ کے۔ کے سیٹھی صاحب، روم نمبر ۲۲۵، ٹرانسپورٹ بھون، پارلیمنٹ اسٹریٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱
۲۶۔ محمد سعید صاحب معرفت نظام الدین صاحب، پکا بازار، آسنسول
۲۷۔ ریحانہ تبسم صاحبہ، کہنہ مزار، بسری نگر ۱۹۰۰۰۲
۲۸۔ کے۔ کے سیٹھی صاحب، روم نمبر ۲۲۵، ٹرانسپورٹ بھون، پارلیمنٹ اسٹریٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱
۲۹۔ شہزادی بیگم صاحبہ، دختر ایم۔ اے وحید صاحب، نسیم گل، ننداکاری، عثمان آباد (مہاراشٹر)
۳۰۔ کے۔ کے سیٹھی صاحب، روم نمبر ۲۲۵، ٹرانسپورٹ بھون، پارلیمنٹ اسٹریٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱
۳۱۔ اخلاق بیگم صاحبہ، ۲۷ شیلا پال، فرید آباد ۲۰۲۰۰۱
۳۲۔ بی۔ کے سنگھ صاحب، اسٹیٹ بینک آف انڈیا، گرافکا کرن ناتھ، ضلع کھمسیری
۳۳۔ رضا علی خاں صاحب، شیخ محلہ، الموڑہ ۲۶۳۶۰۱
۳۴۔ محمد ادریس خاں صاحب، ایم۔ اے، بی۔ ٹی، شیرشاہ سوری، کٹیہار، ضلع پورنیہ
۳۵۔ کے۔ کے سیٹھی صاحب، روم نمبر ۲۲۵، ٹرانسپورٹ بھون، پارلیمنٹ اسٹریٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

انعام میں اضافہ!

Rs. 10,000.00

دس ہزار روپے کے نقد انعام

پہلا انعام بالکل درست حل پر: چھ ہزار روپے۔ دوسرا انعام ایک غلطی والے حل پر: چار ہزار روپے

فیس داخلہ فی حل : ایک روپیہ۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ فیس داخلہ پوسٹل آرڈر، منی آرڈر یا شمع ادبی معموں کے نقد ناموں کے ذریعے ادا کی جا سکتی ہے، نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید اپنے حلوں کے ساتھ بھیجئے۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ ان کی فیس ایک ساتھ بھیج سکتے ہیں اور ہر حل پر علیحدہ انعام کے حق دار ہو سکتے ہیں۔ کوئی ٹوکن بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ٹوکن بھیجنے کی شرط کے علاوہ شمع ادبی معموں کی دوسری تمام شرائط شمع مِنی معموں پر بھی عائد ہیں۔ ان کی پابندی ضروری ہے۔

دفاتر شمع (نئی دہلی) میں ڈاک سے اور دستی حل وصول ہونے کی آخری تاریخ، ۲۶ نومبر ۱۹۷۷، ۸ بجے رات تک

شمع مِنی معمہ نمبر ۲۶

■	ی		س		۱ م
۵	■	ل		ل	۲ د
	۶ ک	■		س	۳ ط
کھ		۷ س	■	ی	۴
ن			۸	■	■
ا	ی	ی	ے	■	■

اشارے

دائیں سے بائیں :

۱۔ —— تہذیب کو ہمارے یہاں سب سے افضل اور برتر مانا جاتا ہے

۲۔ —— میں پھنس کر کوئی نہیں نکل پاتا۔ ہم تو سیدھی بات جانتے ہیں

۳۔ شہر شہر اور بستی بستی گھوم کر میں نے ہر —— کے زیورات کے نمونے جمع کئے ہیں

۴۔ ہیں اور —— دنیا میں سخن ور بہت اچھے کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

اوپر سے نیچے :

۵۔ انسان کے کردار کو —— چاہیئے۔ شرافت کو دیکھنا چاہیئے۔ اوپری ٹیپ ٹاپ سے مرعوب ہونا غلط ہے

۶۔ زندگی —— خوبصورت ہے۔ ہم چاہیں تو اسے اور بھی حسین بنا سکتے ہیں

۷۔ میری محبت میں خلوص ہی خلوص ہے۔ خود غرضی —— برابر بھی نہیں

۸۔ اپنی سرحدوں —— باہر جا کر ہمیں ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہئے جس سے ملک کے نام پر حرف آئے

●●

شمع ادبی معمے (شمع مِنی معمہ نمبر ۲۶) ماہنامہ شمع، آصف علی روڈ، نئی دہلی

شمع مِنی معمہ نمبر ۲۶ کا صحیح حل ۲۹ نومبر ۱۹۷۷ کو صبح ساڑھے نو بجے ظاہر کر دیا جائے گا۔ صحیح حل اور انعام پانے والوں کے نام دسمبر ۱۹۷۷ کے "بانو" میں شائع کئے جائیں گے۔ انعام پانے والوں کی تفصیلات شمع: جنوری ۱۹۷۸ میں بھی شائع کی جا سکتی ہیں۔

شمع مِنی معمہ نمبر ۲۶

★ اب آپ ایک شمع ادبی معمہ اور دوسرے شمع ادبی معمے کے حل بھیجنے کے درمیان اپنے ادبی ذوق کی تسکین کر سکتے ہیں مِنی معمے کے ذریعے!

★ ٹوکن بھیجنے کی قید نہیں!

★ جتنے حل جی چاہے بھیجئے۔ اپنے تمام حلوں کی فیس ایک یا ایک سے زیادہ منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا نقد ناموں سے بھیج سکتے ہیں

★ آپ ہر حل پر انعام کے حق دار بن سکتے ہیں۔ فیس داخلہ، فی حل صرف ایک روپیہ

★ صرف آٹھ اشارے
انعام پانا کس قدر آسان!

★ فیس داخلہ بھیجنے کے لئے شمع ادبی معموں کے نقد نامے استعمال کئے جا سکتے ہیں یا پوسٹل آرڈر، منی آرڈر بھیجئے۔ اپنے حلوں کے ساتھ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک خانے سے ملنے والی رسید ضرور بھیجئے۔
صحیح حل: جوابی لفافہ بھیج کر منگا لیجئے یا چھپے ہوئے ماہنامہ "بانو" یا ماہنامہ "شمع" میں دیکھئے۔

★ مِنی معمہ نمبر ۲۶ کا نتیجہ دسمبر ۱۹۷۷ کے "بانو" میں اور جنوری ۱۹۷۸ کے شمع میں شائع کیا جائے گا۔

اشاعت کا اکتیسواں سال ۔ بارہواں شمارہ — دسمبر ۱۹۷۷

نگراں: یوسف دہلوی مدیرہ: زینت کوثر دہلوی ادارۂ تحریر: شمیم آرا دہلوی سعدیہ دہلوی

عام شمارے کی قیمت:
ایک روپیہ پچاس پیسے۔
سالانہ قیمت: اٹھارہ روپے
(جس میں سالنامہ مفت ملتا ہے)

مالکان: شمع میگزین
طابع و ناشر: یونس دہلوی
مطبوعہ: ایس۔پی پروسیس
ٹائٹل: بمبئی آفسیٹ پریس

مقامِ اشاعت و صدر دفاتر: آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ تار کا پتہ: "شمع" نئی دہلی ٹیلی فون: ۲۷۳۰۶۶ ، ۲۷۲۰۶۷ ، ۲۷۲۰۶۸ ، ۲۷۲۰۶۷
دیگر دفاتر: بمبئی، کلکتہ اور مدراس

افتتاحیہ

انسان کی زندگی میں ایسے لمحے اکثر آتے رہتے ہیں
جب اُسے اپنی قوتِ فیصلہ کو بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ بعض فیصلے
جلدبازی میں کئے جاتے ہیں اور
بعض بہت سوچ بچار کے بعد۔ کوئی اہم فیصلہ کرنے سے پہلے انسان کے
دِل ودماغ میں ایک ہنگامہ بپا ہوتا ہے۔
دِل اور دماغ کے درمیان رسّہ کشی شروع ہو جاتی ہے۔
وہ یہ جانتا ہے کہ اُسے فیصلہ کرنے میں عقل سے کام لینا چاہیئے،
پھر بھی اکثر وہ جذبات سے مغلوب ہوکر فیصلہ کرتا ہے۔
فیصلے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک عارضی اور وقتی۔ دوسرے اہم
فیصلے جو مستقل اور پائیدار ہوتے ہیں اور بڑے
فیصلے کہلاتے ہیں۔ یہ پوری زندگی پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ چھوٹے فیصلے
وقتی ہوتے ہیں جو
روزمرہ کے کام نبٹانے کے لئے کئے جاتے ہیں۔
اہم فیصلے، جن پر آئندہ زندگی کا دارومدار ہے عقل ودانش کی رہنمائی
میں کرنے لازم ہیں، لیکن چھوٹے فیصلوں کے لئے
بہت سوچ بچار کرنا یا دماغ پر بوجھ ڈالنا اور سوچنے میں زیادہ وقت
لگانا غیر ضروری ہے۔
دراصل عملی زندگی میں ترقّی کرنے والے وہی لوگ ہوتے ہیں جو جلد
فیصلہ کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔

زینت کوثر دہلوی



لدّاخی عورتیں ایک میلے میں ◄

لدّاخی عورتیں

عبدالغنی شیخ

دُنیا کے ہر علاقے کی عورتیں خوب صورت بننا چاہتی ہیں۔ اپنا حُسن بڑھانے کے لئے وہ میک اَپ کا سہارا لیتی ہیں، خوش نُما لباس اور زیورات کی شوقین ہوتی ہیں۔ لدّاخی عورتیں بھی اس سے مستثنےٰ نہیں۔ لیکن لباس اور فیشن کے پیمانے جُداجُدا اور انداز مختلف ہوتے ہیں۔ کسی مُلک کا جغرافیہ اور آب وہوا بھی اس مُلک کے رہنے والوں کے رہن سہن اور لباس پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ لدّاخ میں سردیوں میں کڑاکے کی سردی پڑتی ہے، اس لئے وہاں عورتیں سردیوں میں اُونی پیشواز یا چُغے پہنتی ہیں۔ لدّاخی عورت کا سرپوش 'پیرق' بہت مشہور ہے۔ یہ سانپ کی طرح گاؤ دم کی شکل کا ہوتا ہے۔ ایک پیرق کی قیمت تین چار ہزار روپے سے پچاس ہزار روپے تک ہوتی ہے۔ اس پر بیش قیمت نیلے فیروزے، سُرخ مونگے وغیرہ جڑے ہوتے ہیں۔ قدیم مصر میں بھی اس قسم کا سرپوش پہنا جاتا تھا۔ پیرق کے ساتھ دونوں کانوں پر سیاہ رنگ کے کپڑے کے ٹکڑے یا بھیڑ کے بچّے کی کھال پہنی جاتی ہے۔ امیر عورتیں کپڑے کی بجائے سمور کے دنبالے لگاتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ لدّاخی رانی کے کان میں درد ہوا تو اُس نے کھال کا ایک ٹکڑا اپنے دونوں کانوں پر لگا دیا۔ درباری خواتین نے اس کی تقلید کی۔ تب سے ہی پیرق کے ساتھ یہ دنبالہ لگانا ایک فیشن بن گیا۔

مُلک کی آزادی کے بعد بہت سی عورتوں نے پیرق کو خیرباد کہا، لیکن اس کی عمومی مقبولیت میں کمی نہیں آئی۔ آج بھی بہت سی پڑھی لکھی لڑکیاں پیرق پہنتی ہیں، جن میں لوک سبھا میں لدّاخی ممبر رانی پروتی دیوی بھی شامل ہیں۔

ہر لدّاخی عورت موتیوں کی مالا ضرور پہنتی ہے، جس میں مونگے اور فیروزے قرینے سے پروئے ہوتے ہیں۔ بیچ میں حسب حیثیت چھوٹا یا بڑا سونے کا آٹھ کونوں والا جھومر لگا ہوتا ہے۔ لدّاخی عورت زیورات کے لئے سینت سینت کر روپیہ پیسہ اندازکرتی ہے۔ دیہات میں آج بھی اکثر عورتیں پیٹھ پر بکری کے لمبے بالوں والی کھال اوڑھتی ہیں۔ اکثر اوقات بکرے کے گوشت اور کھال کی قیمت برابر ہی بیٹھتی ہے۔ چنانچہ قصاب سفید بالوں والی کھال دیکھ کر ہی بکری کے دام زیادہ ادا کر دیتا ہے۔ عورتیں کانوں میں موتی پروئے ہوئے بڑے بڑے کنڈل لگاتی ہیں اور سینگ کے کنگن پہنتی ہیں۔ ایک یورپین نے لکھا ہے:





▲ دو لداخی لڑکیاں، ایک بودھ دوسری مسلم، یوم جمہوریہ پر نائب صدر جمہوریہ کو لداخ کا روایتی سفید ریشمی رومال پیش کر رہی ہیں

لداخی عورت کے زیورات میں تبت کا سونا، شمالی امریکہ اور ایران کے فیروزے، اٹلی کے مونگے اور چین اور جاپان کے موتی استعمال ہوتے ہیں۔"

ماضی میں لداخی عورتیں زیورات میں لدی پھندی رہتی تھیں۔ وہ نیلی پیلی اور سرخ دھاریوں والی پوشاک پہنتی تھیں۔ اپنے چغے پر کمر سے ایک پٹی باندھتی تھیں، جس پر پیتل کی ایک چمچی، سوئی دان، پیتل کا ایک مجرب آئینہ اور بھانت بھانت کے زیورات لدے ہوتے تھے۔ ایک انگریز سیاح مور کرافٹ ۱۸۲۰ میں لداخ آیا تھا۔ وہ لداخی عورتوں کے لباس اور اس کے لوازم دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا۔ مور کرافٹ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے: "لداخی عورت اپنے پورے لباس میں یورپ کی کسی بھی راج دھانی کی تمام فیشن زدہ خواتین میں تہلکہ مچا سکتی ہے۔"

آزادی کے بعد لداخی عورتوں کی پوشاک میں تبدیلیاں آئی ہیں۔ وہ آج بیل باٹم، شلوار اور قمیص پہننے لگی ہیں۔ تبتی لباس 'چھوبیت' ان کا پسندیدہ پہناوا ہے۔

لداخی عورتیں بناؤ سنگھار پر بھی بہت توجہ دیتی ہیں۔ پہلے وہ شیمپو کی جگہ بالوں کی نشوونما کے لئے ایک جھاڑی جھکو کر سر پر ملتی تھیں۔ چہرے کی جھریاں اور چھائیاں دور کرنے کے لئے ٹماٹر کی قسم کے رسیلے دانے استعمال کئے جاتے تھے۔ غازے کی بجائے عورتیں ایک رنگین کاغذ استعمال کرتی تھیں جو تبت سے درآمد کی گئی چائے کی ٹکیوں پر لپٹا ہوا ہوتا تھا۔ وہ سرخی کے لئے کاغذ کو چہرے پر مل لیتی تھیں۔ آج لداخی عورتیں پوڈر، کریم، غازہ اور سینٹ استعمال کرتی ہیں۔

قبائلی اور پہاڑی علاقوں کی طرح ماضی قریب میں لداخ میں دو تین بھائیوں کے لئے ایک مشترکہ بیوی ہوتی تھی۔ اب یہ رسم تقریباً ختم ہوگئی ہے۔ لداخی عورتوں کو شروع سے ہی سماجی آزادی حاصل رہی ہے۔ عورت کے بغیر یہاں ہر مجلس ادھوری ہوتی ہے۔ آپ تیوہاروں اور میلوں میں مردوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ عورتیں دیکھیں گے۔ اس سے ایک اجنبی کا پہلا تاثر یہ ہوتا ہے کہ لداخ میں عورتوں کی آبادی زیادہ ہے اور انہیں غیر معمولی آزادی حاصل ہے۔ آزادی یہاں عورتوں کو واقعی حاصل ہے، لیکن آبادی مردوں کی ہی زیادہ ہے۔ غیر لداخیوں کا یہ مشاہدہ بھی ہے کہ لداخی عورتیں مردوں کے مقابلے میں زیادہ صحت مند، محنتی اور ہشاش بشاش ہوتی ہیں۔

لداخ کی مسلم اور بودھ عورتوں کے لباس میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مسلم عورتوں میں پردہ نہیں ہوتا۔ وہ برقعے کے نام سے ناآشنا ہیں۔ تاہم مسلم عورت پیرق نہیں پہنتی۔ ماضی میں کسی غیر لداخی مسلم نے اسے غیر شرعی قرار دے کر بند کرایا تھا۔ اس کی جگہ اکثر مسلم عورتیں

سر پر دوپٹہ اوڑھتی ہیں۔

لداخی عورتوں کو ناچ گانوں سے غیر معمولی لگاؤ ہے۔ شادی بیاہ اور خوشی کی ہر مجلس میں رقص و سرود کی محفل گرم ہوتی ہے۔ لوک ناچ سے ناواقفیت ایک لداخی کے لئے معیوب سمجھی جاتی ہے۔ اونچے خاندانوں کی عورتیں شادی بیاہ تیوہاروں اور عام مجلسوں میں دمامے کی تھاپ اور شہنائی کی لے پر بڑے ذوق و شوق سے لوک ناچ پیش کرتی ہیں۔ اس ناچ میں پنجاب اور راجستھان کے مقبولِ عام لوک ناچوں جیسی تیزی، گرمی، چابک دستی اور سبک روی نہیں ہے، تاہم یہ رقص لداخی مزاج، روایت اور تمدنی پس منظر کی عکاسی ضرور کرتا ہے۔ ناچنے والوں کے بازوؤں کی حرکات اور انگلیوں کی جنبش اشارہ کرتی ہیں کہ وہ ڈال سے پھول توڑ کر مہمانوں کی نذر کر رہی ہیں۔

لداخ میں جہیز کی لعنت نہیں ہے۔ لڑکی کے گھر والے حسبِ توفیق جو کچھ دے دیں، (یا نہ دیں) اُسے قبول کیا جاتا ہے۔ لڑکے والے ذرا بھی قیل و قال نہیں کرتے۔ کوئی سودے بازی نہیں ہوتی۔ جہیز کے لئے کوئی پیشگی شرط نہیں رکھی جاتی۔

لداخ میں شادی بیاہ میں اسراف نہیں ہوتا۔ بیاہ والی شادی بھی مروج ہے اور خاموشی سے دلہن کو دولہا کے گھر لے آنے کی رسم بھی ہے۔ اسے 'چوری کی شادی' بھی



▲ لوک سبھا میں لداخ کی ممبر پارلیمنٹ پدما دیوی سرپوش، پیرق اور لداخی لباس میں



▲ لداخ کی درد نسل کی عورتیں جن کے آریائی خون میں پچھلے دو تین ہزار برس میں کسی غیر خون کی آمیزش نہیں ہوئی



۱: لداخی لڑکیاں بن سنور کر شریک ہیں

کہا جاتا ہے۔

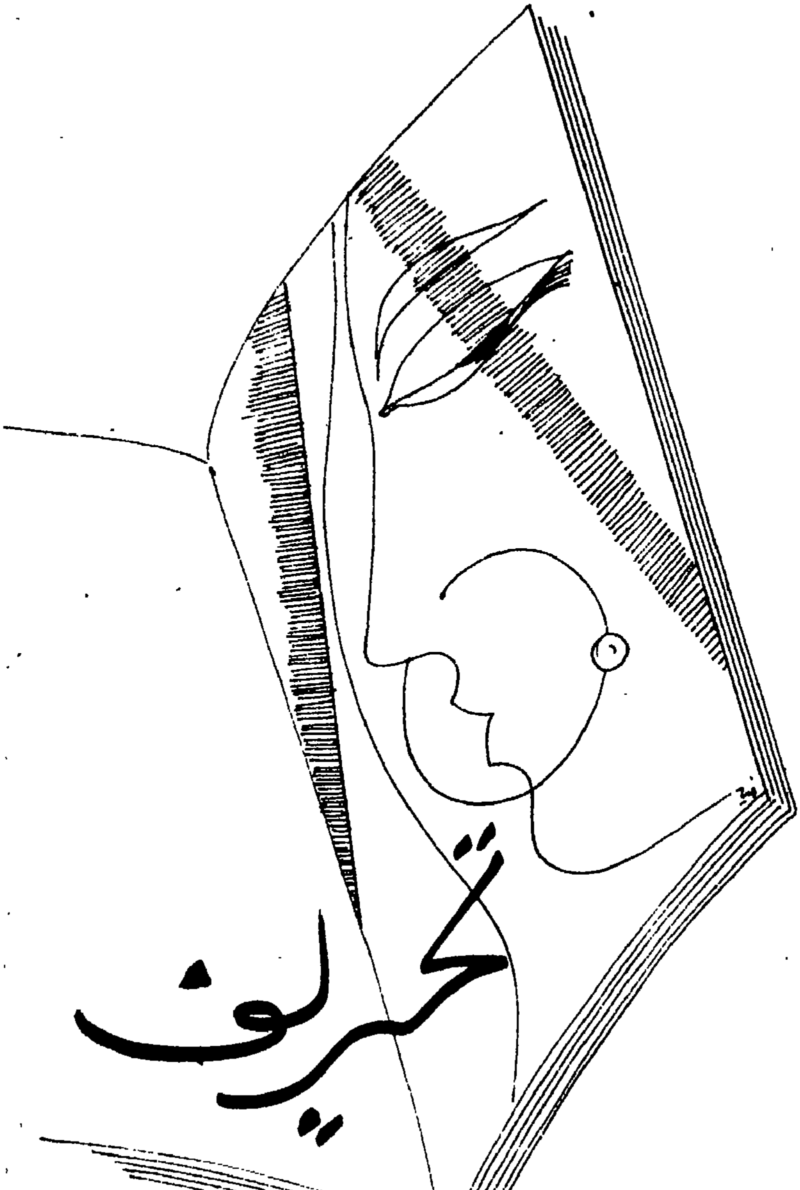
لداخ ایک وسیع علاقہ ہے۔ یہاں کی بکھری ہوئی سوا لاکھ آبادی میں درد، موں، منگول اور بلتی نسلوں کے لوگ بستے ہیں۔ درد نسل کرگل اور لیہہ تحصیلوں کے درمیانی علاقوں میں رہتی ہے۔ کہتے ہیں یہ دنیا میں واحد درد نسل کے لوگ ہیں، جن کے آریائی خون میں دوسرے کسی خون کی آمیزش نہیں ہوئی ہے۔ ان کے خدوخال اور ناک نقشے تیکھے اور رنگ گورا اور سفید ہوتا ہے۔ عورتیں بالوں میں متعدد چوٹیاں گوندھتی ہیں۔ وہ اپنی ٹوپی کو عجیب عجیب زیورات پھولوں اور سکوں وغیرہ سے سجاتی ہیں۔ ان کے رسم و رواج بھی بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ وہ انڈا، دودھ استعمال نہیں کرتے۔ ان کے معاشرہ میں جنسی آزادی کو عیب نہیں مانا جاتا۔

آزادی سے قبل لداخ میں ناخواندگی عام تھی۔ خاص طور پر لڑکیوں کو تعلیم دینا اسراف اور فضول بات سمجھی جاتی تھی۔ اب لڑکیوں کی تعلیم عام ہو گئی ہے۔ بہت ساری لداخی لڑکیاں سری نگر، جموں، دہرہ دون اور دہلی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی ہیں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں آنے کے لئے پر تول رہی ہیں۔ بہت سی میٹرک پاس لڑکیاں دفتروں میں کام کر رہی ہیں۔ کئی لیڈی ڈاکٹر اور بی ایڈ لڑکیاں لداخ میں اپنا فریضہ سر انجام دے رہی ہیں۔

لداخی معاشرے کا سرسری مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ہر لداخی عورت کسان، مزدور یا ملازم کی حیثیت سے اپنے شوہر یا کنبے کی مدد کرتی ہے۔

لداخی عورتیں اپنے گھروں کی زیبائش اور آرائش کی طرف بہت توجہ دیتی ہیں۔ ماضی میں لداخ آتے ہوئے یورپین سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں لکھا ہے کہ لداخی صاف ستھرے نہیں رہتے لیکن وہ اپنے گھروں کو آئینے کی طرح سجاتے ہیں۔ طاق پر سجاوٹ کے لئے رکھے چمچماتے برتنوں سے آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔

لداخ ایک سرحدی علاقہ ہے اور فوجی نقطۂ نظر سے خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اکثر لداخی عورتیں بندوق چلانا جانتی ہیں۔ سچ مچ لداخی لڑکیاں بڑی عجیب ہیں۔ کھیتوں میں ہل چلاتی ہیں۔ اسکولوں اور کالجوں میں پڑھتی پڑھاتی ہیں، دفتروں میں کام کرتی ہیں اور پھر پہاڑوں اور میدانوں میں جنگی مشق میں حصہ لیتی ہیں۔ ●●



تحریف

کتابِ عشق و وفا کھلی ہے
وہ باب جس میں
مری محبت کا واقعہ —— اور ——
تمہارے حُسن و ادا کا قصّہ
لکھا ہوا ہے ——
(تمہارا ذکرِ جفا جہاں ہے ——
—— مرا بھی ذکرِ وفا وہاں ہے)
مگر تمہارا تھا نام جس جس جگہ
کسی نے ——!!؟
وہاں وہاں سے مٹا دیا ہے
(کہ اُس پہ گویا مہین پردہ گرا دیا ہے)
اور اُس جگہ
خطِ کشیدہ لفظوں میں یہ لکھا ہے
کہ ——
"اب یہ سرمایہ غیر کا ہے"

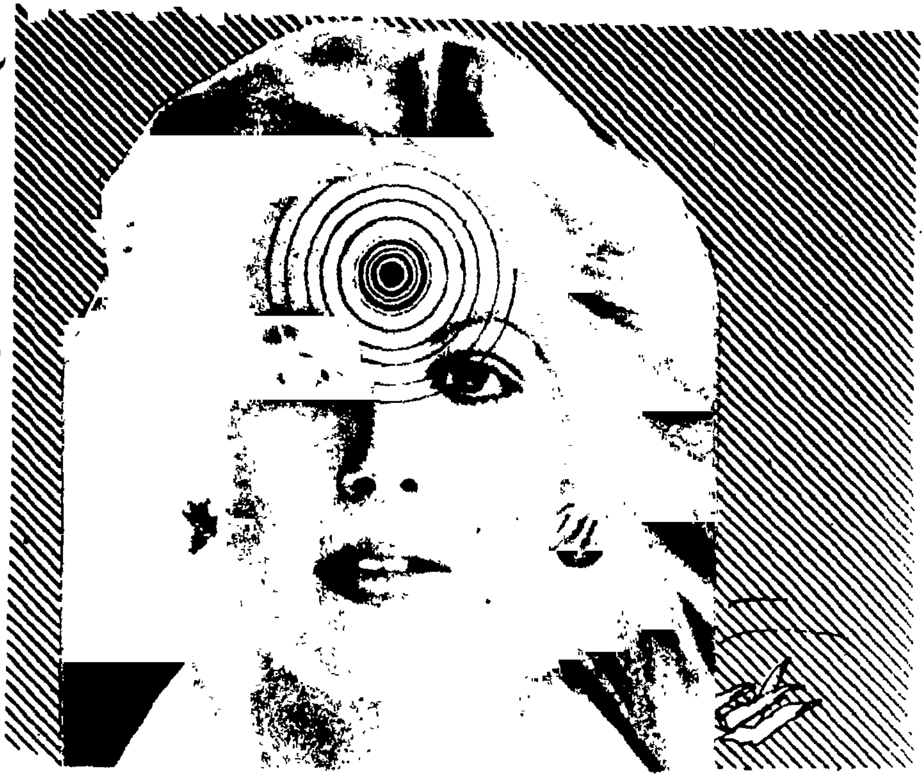
رحمٰن جامیؔ

شمع بک ڈپو، کھلونا بک ڈپو، بانو بک ڈپو اور مکتبہ دینیات

پاگل	رئیس احمد جعفری	۷ روپے	
پہلی لڑکی	رازداں ایم۔اے	۳ روپے	۲۵ پیسے
جاتی ہوئی بہار	وحشی محمود آبادی	۵ روپے	
جذبۂ دل	معین شاہد	۵ روپے	
رہ گزر	انیس مرزا	۵ روپے	۵۰ پیسے
زرینہ	رئیس احمد جعفری	۷ روپے	
عشقِ بلاخیز	سید قاسم محمود	۷ روپے	
ظالم	سعید امرت	۴ روپے	
مجھے تم سے محبت ہے	نقی نور	۴ روپے	۲۵ پیسے
نئے قدم	ہاجرہ نازلی	۵ روپے	۵۰ پیسے
ننگا شہر	احمد شجاع پاشا	۶ روپے	
رام محمد ڈیسوزا	علی رضا	۵ روپے	
بیراگ (فلمی باتصویر کہانی)		۵ روپے	
اسلام اور فیملی پلاننگ (مسئلہ ضبطِ ولادت)	علامہ زید ابوالحسن فاروقی	۷ روپے	

شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۲

آپ کی ذہنی اُلجھن اور اُس کا حل



س : میرے سامنے اتنی مشکلات ہیں ان کا حل شاید اس زندگی میں تو ممکن نہیں۔ میں ایک کلاس ٹو گزیٹیڈ آفیسر ہوں۔ میرا نکاح نو سال کی عمر میں میرے چچازاد بھائی سے ہو گیا تھا ان کی عمر ۱۹ سال تھی۔ جب میں انٹر میں پہنچی تو مجھے اپنے نکاح کا علم ہوا۔ ایم اے۔ ایل ٹی کرنے کے بعد ایجوکیشنل سروس میں میرا انتخاب ہو گیا اور میں نے ملازمت کر لی۔ آٹھ سال لیکچرر رہنے کے بعد میں پرنسپل ہو گئی۔ میری سروس سے پہلے ہی میری رخصتی ہو گئی تھی۔ جب میں تیرہ سال کی تھی تو میرے خاوند نے دوسری لڑکیوں سے محبت کی پینگیں بڑھانا شروع کر دیں۔ جب میرا پہلا بیٹا ہوا تو اس وقت بھی اسپتال میں وہ ایک نرس کی محبت میں مبتلا ہو گئے۔ ان کا سلوک میرے ساتھ درندوں جیسا ہے۔ میری ساس اور نندیں ان کے عیب سے چشم پوشی کرتی ہیں۔ ایک بار میں چھٹی لے کر پانچ مہینے سسرال میں رہی وہاں مجھ پر ہر قسم کا ستم توڑا گیا۔ فاقوں سے لے کر مار پیٹ تک۔ میں سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ کیوں کہ یہی میرے ماں باپ کی تاکید تھی وہ مجھ پر بہت گندے الزام لگاتے ہیں۔ میرا لڑکا ۱۵ سال کا اور لڑکی ۱۰ سال کی ہے۔ ابھی پرسوں ہی انہوں نے مجھ پر حملہ کر دیا اور میرا گلا دبا دیا۔ سوچتی ہوں خودکشی کر لوں یا طلاق لے لوں پھر بچوں کا خیال آتا ہے۔ میرے خاوند بی اے ہیں شکل بے حد معمولی ہے، جب کہ لوگوں کا کہنا ہے کہ میں اچھی شکل و صورت اور خوب صورت جسم کی مالک ہوں۔ لیکن مجھے اس سے مطلب نہیں۔ مجھے صرف خلوص چاہئے۔ بتلائیے میں کیا کروں؟

ج : آپ نے اپنے سوال کا جواب اپنے خط کی ابتدا میں دے دیا ہے۔ یعنی یہ کہ آپ کے سامنے اتنی مشکلات ہیں کہ ان حل شاید زندگی میں تو ممکن نہیں۔ آپ کا یہ جواب صحیح ہے۔

انسان اشرف المخلوقات ہے۔ لیکن جب اسے کسی بات کی لت پڑ جائے تو وہ جانور سے بدتر ہو جاتا ہے۔ خواہ یہ عادت نشے کی ہو یا جوئے کی۔ افیون کی ہو یا عورت کی۔ ایک دفعہ ان میں مبتلا ہونے کے بعد ان سے چھٹکارا پانا مشکل ہو جاتا ہے۔ آپ نے افیمچی کے متعلق سنا ہوگا۔ وہ کتنا ہی اپنی عادت چھوڑنے کی کوشش کرے مگر کامیاب نہیں ہو سکتا۔ آپ کے خاوند

ڈاکٹر بھاٹیہ ایک مشہور ماہرِ نفسیات ہیں۔ وہ بانو پڑھنے والوں کے سوالات کا جواب دیں گے اور ان کے نفسیاتی مسئلوں کا تجزیہ اور حل پیش کریں گے۔

پتہ : معرفت ماہ نامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۲۔۰۰۱۱

کا بھی یہی حال ہے۔ وہ پڑھے لکھے ہیں لیکن انہیں عورتوں کی لت ہے۔ وہ افیمی کی طرح یہ عادت نہیں چھوڑ سکتے۔ ان کا علاج مشکل ہے۔ رہی آپ کی بات۔ یہ غور طلب ہے۔ ہمارے ملک کی تہذیب میں عورت کو برداشت کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ اس تربیت میں ظلم کو برداشت کرنے کی تاکید کا عنصر زیادہ ہے۔ عقل اور حوصلہ سے کام لینے کی تلقین کا عنصر کم ہے۔ آپ پڑھی لکھی ہیں، کما سکتی ہیں۔ یہ آپ کا پہلا سہارا ہے۔ اندھیرے میں یہی امید کی کرن ہے۔ آپ کے خاوند آپ کے ساتھ مار پیٹ کرتے ہیں، آپ پر گندے الزام لگاتے ہیں۔ آپ کا نوجوان بیٹا گھر میں ہے۔ ایک لڑکی بھی ہے۔ وہ بھی شعور رکھتی ہے۔ یہ باتیں بچوں کے ذہن پر برا اثر ڈالتی ہیں۔ آپ یہ سمجھتی ہیں کہ ایک دن آپ کڑھ کڑھ کر مر جائیں گی۔ اس سے آپ کو کیا ملے گا؟ آپ نہ یہ ظلم برداشت کیجئے۔ اور نہ خودکشی کے متعلق سوچئے۔ آپ کے لئے واحد راستہ طلاق ہے۔ آپ یہ سمجھتی ہیں کہ ایسا کرنا بچوں کے لئے برا ہے۔ یہ خیال غلط ہے۔

دراصل یہ بات بچوں کے لئے اچھی ہے۔ روز روز کے جھگڑوں سے بچوں پر زیادہ برا اثر پڑتا ہے۔ اگر آپ ہمت سے کام لے کر طلاق لینے کی کوشش کریں تو آپ کا دماغ الجھن سے آزاد ہو جائے گا مجھے یقین ہے کہ اس طرح آپ کی زندگی خوش گوار ہو جائے گی، آپ اپنے بچوں کی بہتر تربیت کر سکیں گی، آپ کے ذہن سے بوجھ اتر جائے گا

اگر آپ طلاق لینے کا پکا ارادہ کر لیں تو ممکن ہے کہ آپ کے خاوند کو ہوش آ جائے اور وہ اپنی عادتوں کو بدلنے کی کوشش کریں اگر وہ اس تبدیلی پر آمادہ ہوں تو ان کو سنبھلنے کا موقع ضرور دیں۔ اگر وہ اپنی عادتوں کو نہ چھوڑیں تو آپ اپنی جان جوکھوں میں نہ ڈالیں اور نہ بچوں کی زندگی خراب کریں۔

آپ نے لکھا ہے کہ آپ خوب صورت ہیں اور دل کش جسم کی مالک ہیں۔ ممکن ہے کہ مستقبل میں آپ کو بہتر شریکِ زندگی مل جائے آپ نے مجھ سے مشورہ مانگا ہے تو میرا مشورہ حاضر ہے۔ صلاح دینا میرا کام ہے اور ہمت سے کام لینا آپ کا کام۔ اگر آپ کو اس معاملے میں مزید مشورہ طلب کرنا ہو تو مجھے ذاتی خط بھی لکھ سکتی ہیں۔

س : ہم چھ بہنیں ہیں۔ میں گھر میں سب سے زیادہ خاموش رہتی ہوں۔ مجھے بہت کم غصہ آتا ہے۔ مگر میری بہنیں کبھی کبھی ایسی بات کہہ دیتی ہیں کہ میں غصہ سے بے حال ہو جاتی ہوں اور نہ جانے ان کو کیا کیا کہہ ڈالتی ہوں۔ پھر میں ان سے بات نہیں کرتی۔ لیکن جب میں بستر پر دن کی باتوں پر غور کرتی ہوں تو اپنی بدزبانی پر مجھے بے حد افسوس ہوتا ہے۔ سوچتی ہوں کہ ایک سنجیدہ اور خاموش طبع لڑکی کو یہ بدزبانی زیب نہیں دیتی۔ میں خدا سے توبہ کرتی ہوں کہ اب کسی چھوٹے یا بڑے کی باتوں کا جواب نہیں دوں گی۔ لیکن دوسرے دن پھر وہی حال ہوتا ہے، جس کی وجہ سے میری صحت گرتی جا رہی ہے، بھوک نہیں لگتی، نیند بھی نہیں آتی۔ اس کا کیا حل ہے؟

ج : آپ نے لکھا ہے کہ آپ خاموش طبع اور سنجیدہ ہیں۔ آپ اپنی بہنوں سے بات نہیں کرتیں۔ دراصل یہ خاموشی خاموشی نہیں، نہ یہ سنجیدگی کا اظہار ہے۔ یہ خاموشی اور سنجیدگی دراصل ایک گہرے غصے کا اظہار ہے۔ آپ اس غصے کو اندر ہی اندر دباتی ہیں، اپنے علاج خاموشی سے کرتی ہیں۔ آپ نے یہ لکھا کہ آپ کی عمر کیا ہے۔ آپ اپنی بہنوں چھوٹی ہیں یا بڑی۔ آپ کے خط سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ان سے جلتی ہیں۔ یہ حسد آپ کے دل میں احساسِ گناہ پیدا کرتا۔ یہی احساسِ گناہ آپ کی خاموشی کا باعث ہے۔ جب ہم کسی سے حسد کرتے ہیں تو اس کا برا چاہتے ہیں۔ اگر وہ انسان اپنا قریبی عزیز ہو تو اس کے لئے برا چاہنا دل میں گناہ کے احساس کو جنم دیتا ہے۔ آپ اس گناہ کے احساس کو خاموشی سے دباتی ہیں۔ گفتگو کرنے سے اس بات کا اندیشہ ہے کہ آپ کے دل کی بات آپ کی زبان پر آ جائے گی اور آپ کے دل کا حال آپ کی بہنوں کو معلوم ہو جائے گا۔

بہنوں کے درمیان جھگڑے ہونا ایک عام بات ہے۔ تقریباً ہر گھر میں ایسا ہوتا ہے۔ ایک بہن زیادہ ذہین اور خوب صورت ہو ماں باپ کی چہیتی ہو تو ایسا ہونا قدرتی ہے۔ دوسری بہن میں احساسِ کم تری بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ کوئی بری یا بڑی بات نہیں۔ اگر آپ حسد کا شکار ہیں اور اپنی بہن کو جلی کٹی بھی سنا دیتی ہیں تو یہاں تک بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ آپ کے دل میں جو آیا آپ نے کہہ دیا۔ جب آپ کے دل پر چوٹ لگے تو آپ زبان سے اس کا اظہار کر سکتی ہیں۔ اس طرح روز روز جھگڑنے سے آپ کی صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑے گا۔ لیکن آپ ایسا نہیں کرتیں۔ آپ اپنے غصے کو دبا کر رکھنا چاہتی ہیں، اور جب انجانے میں اس کا اظہار ہو جاتا ہے تو آپ خدا سے توبہ کرتی ہیں۔ یہ توبہ کرنا آپ کے احساسِ گناہ کی

نشان دہی کرتا ہے۔ توبہ گناہ کے بعد ہی کی جاتی ہے۔ بار بار توبہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ شدید گناہ کے احساس میں مبتلا ہیں۔

میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ اپنے غصے کو نہ دبائیں، اور نہ سنجیدگی اور خاموشی کا لبادہ اوڑھیں۔ جس طرح آپ کی بہنیں آپ کو سناتی ہیں، آپ بھی ان کو سنا دیں۔ اس طرح گناہ کا احساس کم ہو جائے گا۔ آپ اندر ہی اندر جلنا بند کر دیں گی، آپ توبہ نہ کریں۔ اس کی بجائے بہنوں سے دوستانہ برتاؤ کریں۔ جب آپ ایسا کریں گی تو آپ کے دل میں ایک خوشی سی پیدا ہوگی۔ آپ کا احساسِ گناہ کم ہو جائے گا اور آپ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کریں گی تو آپ کے دل میں ایک خوشی سی پیدا ہوگی۔ آپ کا کس بات کی کمی ہے، اس پر غور کریں۔ آپ کن باتوں پر دل ہی دل میں کڑھتی رہتی ہیں، کبھی کبھی اس مسئلے پر بھی بہنوں سے بات چیت کریں لیکن لڑائی جھگڑے کے بغیر۔ آپ ان سے دل کھول کر باتیں کریں، خوب اپنے دل کا بخار نکالیں، جو دل میں ہو وہ کہہ دیں۔ آپ انہیں بتا دیں کہ آپ کس بات میں ان سے کم ہیں۔ ان کی جو بات آپ کو بُری لگے وہ بھی بتا دیں اس طرح آپ کے درمیان دوستی پیدا ہو جائے گی۔

غصہ کرنا بُرا نہیں۔ غصے کو گناہ سمجھ کر توبہ کرنا بُرا ہے۔ اگر آپ اپنے غصے کا اظہار کریں گی تو توبہ کی ضرورت ہی باقی نہ رہے گی۔ جھگڑا ہوا، کچھ آپ نے کہا اور کچھ آپ کی بہنوں نے اور جھگڑا ختم۔ رات گئی بات گئی۔ مستقبل کے متعلق نہ سوچیں اور نہ لڑنے کا پروگرام بنائیں۔ یہی سوچیں کہ جب کبھی دوبارہ جھگڑا ہوا تو دیکھا جائے گا۔ آپ کا بہنوں سے مل کر بات چیت کرنا ضروری ہے۔ اس طرح تین چار روز میں ہی آپ کے لیے ایک نئی راہ نکل آئے گی۔

س : میں بہت پریشان ہوں۔ میری مشکل حل کیجئے۔ میرا ایک چچازاد بھائی ہے جو مجھ سے بے حد محبت کرتا ہے۔ دراصل میں اپنی وجہ سے پریشان ہوں۔ مجھے کوئی نہ کوئی تکلیف ضرور ہوتی ہے۔ سال میں چھ مہینے بیمار رہتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ میں اس سے شادی کر کے اس کی پریشانیوں میں اضافہ کروں۔ مگر مجھے شادی سے انکار کرتے ہوئے ڈر بھی لگتا ہے۔ وہ جذباتی آدمی ہے۔ مرنے سے بھی نہیں ڈرتا۔ اس کی ماں مجھے مانگتی ہے۔ اس کا سارا گھر مجھے بے حد پیار کرتا ہے۔ میرے گھر والوں کی مرضی بھی یہ ہے کہ یہ رشتہ ہو جائے۔ میں بھی اسے خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ مگر سوچتی ہوں کہ اسے یہ خوشی مجھ سے نہیں ملے گی۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ بیماری ہمیشہ رہے۔ ویسے خدا نہ کرے میں ایسی کوئی بیمار بھی نہیں مجھے ایسی کوئی بیماری نہیں جو خطرناک ہو۔ نہ جانے کیوں میں جینا نہیں چاہتی۔ ہمارے گھر کا کوئی فرد صحت مند نہیں ہے۔ مجھے ہر وقت یہی فکر رہتی ہے میں نہ اس کو پانا چاہتی ہوں اور نہ کھونا۔ میری عمر ۲۲ سال ہے۔ وہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ بس میں اپنی وجہ سے پریشان ہوں۔ خدا کے لیے کوئی حل نکالئے۔

ج : کچھ لوگ اپنی مشکلوں کا حل تلاش کرتے ہیں اور آپ ایک حل کو مشکل بنا کر پیش کر رہی ہیں۔ آپ اپنے چچازاد بھائی سے پیار کرتی ہیں۔ وہ بھی آپ سے محبت کرتا ہے۔ اس کے گھر والے بھی اس رشتہ کے لئے تیار ہیں۔ آپ کے گھر والے بھی یہی چاہتے ہیں۔ صرف آپ کا دماغ نہیں چاہتا۔ آپ کا دل محبت کا نام سن کر بیمار پڑ جاتا ہے۔ آپ نے اپنی بیماری کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ آپ نے ان تمام باتوں کے متعلق لکھا ہے جن کا حل موجود ہے، نہیں لکھا تو اپنی بیماری کے متعلق۔ جب بیماری ہی نہ معلوم ہو تو اس کا علاج کیسے کیا جا سکتا ہے؟ یہ کون سی بیماری ہے جو آپ کے دل میں ڈر اور خوف پیدا کرتی ہے؟

اگر یہ بیماری آپ کے ذہن میں ہے تو واقعی اس بیماری کا کوئی نام نہیں۔ آپ جوان ہیں۔ اس عمر میں عورت کے دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ ہماری تہذیب ان خیالات کو بُرا سمجھتی ہے۔ لیکن قدرت پر تہذیب کا زور نہیں چلتا۔ یہ خیالات خواب میں بھی ظاہر ہوتے ہیں اور دن میں بھی دماغ پر تسلط جما لیتے ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ کے ان خیالات کا مرکز آپ کا چچازاد بھائی نہ ہو۔ بلکہ کوئی اور ہو۔ یہ بات آپ کے دل پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔

جنسی خیالات جسم کا سب سے ضروری حصہ ہیں۔ اگر اسی خیالات کا رُخ کسی دوسرے انسان کی طرف ہو تو اس کا یہ مطلب یہ نہیں کہ آپ کو اس لڑکے سے محبت نہیں ہو سکے گی۔ وجود میں ان خیالات کی بھرمار ہو تو ان کو دبانے سے انسان بیمار پڑ جاتا ہے۔

ہمارے سماج میں مرد اور عورت کے لئے الگ الگ اخلاقی معیار ہیں۔ مرد کو آزادی ہے کہ وہ جو جی چاہے کرے۔ اس کے خیالات پر کوئی پابندی نہیں۔ اگر اس کے دماغ میں جنسی خیالات دوڑتے رہیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ عورت کو ان خیالات سے دُور رہنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ عورت نے مرد کو جنم دیا ہے۔ جس نے

مرد کو جنم دیا وہ ان خیالات سے کیوں محروم رہے؟ یہ سراسر ناانصافی ہے۔ آپ اپنے دل و دماغ کو ڈھیلا چھوڑ دیں اور اپنی شادی کی طرف توجہ دیں۔ آپ کی صحت آپ کے "ہاں" کہنے پر اچھی ہونے لگے گی۔ اگر آپ کے خیالات ادھر اُدھر دوڑتے ہیں تو ان کی دوڑ کو قدرتی امر سمجھ کر نظر انداز کر دیں۔ ان کی طرف زیادہ توجہ نہ دیں۔ اس طرح آپ کی صحت بھی بحال ہو جائے گی اور آپ اپنی الجھن سے بھی نجات حاصل کر لیں گی۔

س: میں بہت عرصہ سے سوچ رہی تھی کہ آپ کو اپنی ازدواجی زندگی کے متعلق لکھوں، لیکن میرا قلم ساتھ نہیں دیتا تھا۔ میں ایک شادی شدہ عورت ہوں۔ میرے چار بچے ہیں میرے خاوند میری ہر ضرورت کا خیال رکھتے ہیں مجھے گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں۔ پھر بھی نہ جانے کیوں ایک تنہائی اور اُداسی کا احساس مجھے گھیرے رہتا ہے۔ میں زندگی سے بور ہو جاتی ہوں۔ میرے گھر کے قریب ایسے لوگ نہیں رہتے ہیں۔ جن سے میل جول پیدا کیا جائے۔ یہ لوگ اپنے ہیں، لیکن غیروں سے بدتر ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ خود کو مصروف رکھوں۔ میں سلائی کڑھائی کر کے اپنا شوق پورا کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن یہ بات میرے شوہر کو پسند نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مرد کے ہوتے ہوئے عورت کو کام کرنے کی ضرورت نہیں، اس کا کام صرف چولہا جھونکنا ہے۔ وہ ہمت بڑھانے کی بجائے میرا مذاق اُڑاتے ہیں۔ گھر میں سلائی کی مشین لانے کو کہتی ہوں تو وہ نہیں مانتے۔ گھر سے باہر جا کر سیکھنے بھی نہیں دیتے۔ میں گھر میں بیٹھے چپ چاپ کتابیں پڑھتی ہوں، مگر ان سے بھی بور ہو جاتی ہوں۔ اتنی لمبی عمر کس طرح گزاروں گی، میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

ج: آپ کے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ گھر میں آپ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور میں اتنی دور سے بندھے ہوئے ہاتھوں کو کھول نہیں سکتا۔ اپنی ہتھ کڑیوں کو توڑنے کی ہمت اپنے کے اپنے ہاتھوں میں ہونا چاہئے۔ آپ کے خاوند عام خاوندوں کی طرح ہیں۔ ان کا سوچنے کا انداز بھی وہی ہے جو عام خاوندوں کا ہوتا ہے شاید ان کو آپ کو ناگواری کا احساس نہیں۔ آپ کی شکایتوں کو وہ ایک عام بیوی کی شکایتیں سمجھ کر ٹال جاتے ہیں۔ آپ کے دماغ پر کتنا بوجھ ہے، آپ کی زندگی کتنی بور ہے۔ ان کو آپ کے مسئلے کی شدت کا احساس نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح آپ کی ازدواجی زندگی بھی متاثر ہو گئی ہو۔ اور یہ زندگی جذبات سے خالی ہو کر محض ایک معمولی بن گئی ہو۔ اگر آپ کے درمیان اس وجہ سے کھنچاؤ ہو تو اسے بات چیت سے حل کیا جا سکتا ہے۔

آپ اپنے خاوند کو پیار سے سمجھائیں، انہیں اپنی بوریت کا احساس دلائیں، انہیں اپنی ضرورتیں بتائیں۔ ان سے پوچھیں کہ میں کیا کروں اگر وہ آپ کی رائے سے متفق نہیں ہیں تو ان کی اپنی رائے کیا ہے؟ وہ آپ کے مسئلے کو کس طرح حل کر سکتے ہیں؟ خالی چولہا جھونکنے سے کسی کی زندگی نہیں گزر سکتی۔ ممکن ہے کہ اس طرح آپ کی مشکل کا حل نکل آئے۔

س: میرے والدین مجھے دوسرے بھائی بہنوں کی نسبت کم چاہتے ہیں۔ میں اپنے ماحول سے بےزار اور غمگین رہتی ہوں۔ ہر وقت سوچنا میری عادت بن گیا ہے۔ میری پریشانی کا سبب میرا غصہ ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ زندگی کی ہر ہر تلخی کو فراخ دلی سے برداشت کروں۔ میں اس کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتی ہوں، لیکن کبھی کسی بات پر اتنا غصہ آتا ہے کہ میں اپنے حواس میں نہیں رہتی۔ ایک طوفان آ جاتا ہے اور میں اتنی جذباتی ہو جاتی ہوں کہ جان دینے کی سوچنے لگتی ہوں۔ مجھے اپنے غصے سے سخت پریشانی ہے۔ میں ایک حوصلہ مند اور ٹھنڈے دل کی مالک بننا چاہتی ہوں۔ کیا آپ میری مدد کریں گے؟

ج: آپ نے لکھا ہے کہ آپ کے والدین آپ کو دیگر بھائی بہنوں سے کم چاہتے ہیں۔ یہ احساس کم و بیش ہر بچے کے دماغ میں ہوتا ہے اگر آپ کے بھائی بہنوں سے پوچھا جائے تو شاید وہ بھی یہی بات دہرائیں گے۔ گھر کا ہر فرد یہی سوچتا ہے کہ اسے پیار نہیں ملتا۔ اس بات سے احساسِ گناہ پیدا ہوتا ہے جو لوگ ان جذبوں کو قدرتی سمجھتے ہیں۔ ان میں گناہ کا احساس بھی کم ہوتا ہے۔ گناہ کا احساس بھائی بہنوں سے حسد کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر حسد کو گناہ نہ سمجھا جائے تو بچے والدین کی طرف خود بخود بڑھتے ہیں، ورنہ پیچھے ہٹتے ہیں اور ان سے بات کرتے وقت جھجکتے ہیں۔ آپ بھی یہی کرتی ہیں۔ دوسروں کو کیا ملتا ہے اسے بھول جائیے۔ آپ ماں باپ سے کھل کر بات کریں۔ انہیں خوش کرنے کی کوشش کریں۔ غصہ آئے تو اس کی پروا نہ کریں۔ اس طرح آپ کے دل کا غبار نکل جائے گا اور آپ کی طبیعت میں ٹھہراؤ اور سکون رچ جائے گا۔

خاموشی سزا

ابن قرۃ العین آمبوری



نازلی نے سُنا ضرور تھا کہ اُس کے منگیتر کالے ہیں، لیکن جب اُس کی سہیلی نے کہا "بھئی! تو کہاں تیرے منگیتر کہاں؟ زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اللہ تو سچ مچ چاند ہے۔ اور تیرے اُن کا رنگ تو سبحان اللہ! میری بات مان پگلی! اُس رشتہ سے انکار کر دے۔ تجھ جیسی حسین پری کے لئے کسی شہزادے کو ہی انتخاب کرنی چاہئے۔ تیرے مقابل تو وہ دیو لگتا ہے۔"

نازلی کا دل بجھ گیا۔ وہ شرم کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔ اُس کو احساس تھا کہ اُس کے حُسن کے چرچے خاندان بھر میں ہیں مگر یہ والدین کو کیا ہو گیا؟ آخر اتنی حسین بیٹی کے لئے انہوں نے اتنا بدصورت بَر کیوں پسند کیا؟ وہ بجھے دل کے ساتھ سوچتی رہی۔ وہ ایک شریف خاندان کی ہستی تھی۔ پردے کا پابند گھرانہ تھا۔ اس لئے نازلی نہ ہونے والے منگیتر کو دیکھ سکی، اور نہ اُس رشتہ سے انکار کر کے بے شرمی کا ثبوت دے سکی۔

نازلی کے والد صاحب سے زیادہ اس رشتہ سے ممتاز علی خوش تھا۔ اُس نے نازلی سے خود ہی سمجھانے والے انداز میں کہا "بھئی! آدمی کی سیرت کو دیکھنا چاہئے۔ عورت ہو یا مرد اُس کے دل کو پرکھنا چاہئے۔ خوب صورتی پر جان نہ دو، ہمیشہ خوب صورت دل پر جان دو۔"

نازلی کچھ شرمائی سی، کچھ حیران سی اُس کے اشارے کو سمجھ گئی اور مطمئن بھی ہو گئی، کیوں کہ ممتاز علی اُس کا چچا زاد بھائی ہی نہیں، اُس کا ہم خیال اور ہم مزاج بھی تھا۔ ممتاز علی نازلی سے دو سال چھوٹا تھا، مگر نازلی ممتاز علی کی باتوں کی قدر کرتی تھی، کیوں کہ ممتاز علی ہمیشہ سوجھ بوجھ کی باتیں کیا کرتا تھا۔

نازلی کی شادی کو کئی سال گذر گئے۔

اس دوران نازلی پرویز اور ایاز کی ماں بھی بن گئی۔ ممتاز علی آج کل بہت خوش تھا۔ اُس کا دل رہ رہ کر مچل اُٹھتا تھا۔ گھر میں ایسی ہی تو باتیں ہو رہی تھیں جو ارمانوں اور جذبات کو مچلنے پر مجبور کر رہی تھی۔ امّی کئی دنوں سے بہو کی تلاش میں تھیں۔ نہ جانے کتنے گھروں میں وہ جا جا کر لڑکی دیکھ آئی تھیں۔ ممتاز علی جب بھی آفس سے گھر آتا تھا، ممتاز علی کی ہونے والی بیوی کے متعلق ہی تذکرہ ہوا کرتا تھا۔ آج بھی ممتاز علی بہت ہی ترنگ میں گنگناتا ہوا گھر میں داخل ہوا وہ یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ آج امّی کے چہرے سے بے حد خوشی ٹپک رہی تھی۔ کچھ دیر بعد چھوٹی بہن کے ذریعہ پتہ چلا کہ ایک لڑکی امّی کو پسند آ گئی ہے۔ اس لڑکی کے متعلق آپس میں ہونے والی گفتگو کو سُن کر یہ سمجھنے میں اُسے دیر نہ ہوئی کہ بہنوں کو لڑکی پسند نہیں آئی ہے مگر امّی تھیں اُسی لڑکی کے گُن گا رہی تھیں۔

ممتاز علی تو اُن معاملوں میں بڑوں کی پسند کا قائل تھا۔ نازلی نے ممتاز علی کی موجودگی میں ہی امّی کی ہمت بندھائی "ہمارا خوب صورت بھیا تو لاکھوں میں ایک ہے۔ صورت ہی نہیں، دل بھی حسین ہے۔ میرا بھیا ظاہری باتوں پر جان دینے والا نہیں، اوپری چمک دمک سے کبھی مرعوب ہونے والا نہیں۔ اچھے انسانوں کی قدر کرنے کی صلاحیت اس میں ہے۔ فاخرہ کی شکل زیادہ اچھی نہیں تو کیا ہوا؟! اچھے دلوں کی پہچان رکھتا ہے ممتاز علی!"

نازلی کی باتوں میں فخر کی جھلک تھی۔

امّی کو بھی ممتاز علی پر بھرپور اعتماد تھا اس لئے فاخرہ سے ممتاز علی کا رشتہ طے ہو گیا۔ شادی کے دن گھر میں خوب گہما گہمی تھی۔ دُلہن کے قریب بیٹھتے ہوئے ممتاز علی کی بڑی بہن نے نازلی کو ٹہوکا دے کر کہا "اے بی نازلی، دیکھ تو ہے چاند، مگر تیرے وہ ہیں تیرے برعکس — ہماری دُلہن کو دیکھ، خود چاہے جیسی بھی ہو، لیکن دولہا کیسا ملا ہے۔ میرا بھیا تو بالکل شہزادہ ہے، شہزادہ"

نازلی خاموش رہی۔ دُلہن فاخرہ کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔

سہاگ رات کو ممتاز علی نے فاخرہ کا گھونگھٹ اُٹھایا تو اُس دل کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ امّی کی پسند پر حیران رہ گیا۔ دُلہن کا ہاتھ تھامے وہ اُس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ چند منٹ کے لئے جیسے اُس کو سکتہ سا ہو گیا۔ پھر اُس نے محسوس کیا کہ فاخرہ کا دل شدت کے ساتھ دھڑک رہا ہے۔ اُس کے دل میں ہمدردی اور محبت گڈ مڈ ہو کر طوفان بن گئی۔ دوسرے دن ممتاز علی خوش ہی نظر آتا تھا۔ اُس کے چہرے پر کسی طرح کی ناگواری نہیں تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُس کو دُلہن پسند آگئی ہے۔ امّی کے سینے سے ایک بڑی خلش دُور ہو گئی۔ انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور نازلی کو تو ممتاز علی کی اعلیٰ ظرفی پر پہلے ہی اعتماد تھا۔

فاخرہ شادی کے پورے ایک سال بعد پہلی بار کسی تقریب میں شریک ہونے والی تھی۔ پتہ نہیں یہ اتفاق کی بات تھی یا کچھ اور کہ اب تک کسی بھی تقریب میں سسرال والے اُس کو ساتھ نہیں لے گئے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے ہی ساس صاحبہ نے اُسے جلد تیار ہونے کا حکم دیا تھا۔ فاخرہ جلدی جلدی بال بنانے لگی۔

"سب لوگ تیار ہو چکے ہیں، اب تاخیر کس بات کی؟" بڑی نند نے نازلی کو دیکھا۔

"ٹھہرو، ابھی فاخرہ تیار نہیں ہوئی۔" ساس صاحبہ نے کہا۔ یہ سب لوگ فاخرہ کے کمرے کے قریب کھڑے باتیں کر رہے تھے۔

"اوہ! فاخرہ کی تیاری ہی کیا؟ وہ صرف کپڑے بدل لیں تو ٹھیک ہے۔ غازہ، پوڈر یا دوسرے بناؤ سنگار کی اُنہیں ضرورت ہی نہیں بھلا یہ سب استعمال کرنے سے وہ کون سی پری بن جاتی ہیں؟" بڑی نند کی طنز بھری آواز فاخرہ کو سنائی دی۔ بال بناتے بناتے فاخرہ کا ہاتھ رُک گیا۔ جواب میں نازلی کچھ کہہ رہی تھی۔ مگر کیا کہہ رہی تھی، فاخرہ ٹھیک طرح سُن نہ سکی وہ سنّاٹے میں رہ گئی؟ وہ خود بھی ممتاز علی کے مقابلے میں خود کو بالکل بدصورت ہی تصور کرتی تھی۔ لیکن اگر کوئی شخص کسی کی بدصورتی پر طنز کرتا ہے تو دل پر چوٹ ضرور لگتی ہے۔ فاخرہ بھی روہانسی ہو گئی۔ اُس نے بمشکل بال بنائے۔ اور جلدی سے صرف کپڑے تبدیل کر کے کمرے سے نکل آئی۔

اسی وقت خلافِ توقع ممتاز علی آفس سے جلد گھر آگیا۔ فاخرہ پر اُچٹتی سی نظر ڈال کر اُس نے پوچھا: "ارے امّی کہاں کی تیاری ہے؟"

"تمہیں تو کسی عزیز کی شادی کی بھی یاد نہیں رہتی بیٹا۔"

"آں، ہاں — ٹھیک ہے، مگر کیا یہ فاخرہ بھی —؟"

"کیوں بھلا؟ فاخرہ کو کیوں نہ لے جاؤں گی؟"

"نہیں، فاخرہ کو رہنے دیجئے امّی۔ آپ لوگ ہی جا کر آجائیے۔" ممتاز علی اپنی بات پر بضد تھا۔ نازلی خاموش کھڑی تھی۔ آخر امّی ناگواری کے ساتھ نازلی وغیرہ کو لے کر چلی گئیں اور فاخرہ بجھے دل کے ساتھ کمرے میں آگئی۔ وہ آئینے سے نظریں ملاتے ہوئے بھی ندامت محسوس کر رہی تھی۔ نہ جانے کیوں اُسے ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے بڑی نند کے ساتھ ممتاز علی نے بھی اُس کے مونہہ پر تھپڑ لگایا ہو۔

دن یوں ہی گذرتے گئے۔ دوسرے سال فاخرہ ایک بچے کی ماں بن گئی۔ جمال بالکل باپ کی خوب صورتی لے کر آیا تھا۔ مگر پتہ نہیں کیوں فاخرہ کو کچھ خوشی کیوں محسوس نہ ہوئی۔ دو سال میں فاخرہ اچھی طرح جان گئی تھی کہ ممتاز علی پردے کا کتنا قائل تھا۔ زیادہ تر وہ فاخرہ کو کہیں بھیجتا ہی نہیں تھا۔ کبھی کبھار بھیجتا بھی تو جانے سے پہلے اچھی طرح تاکید کر کے بھیجتا تھا۔ حد تو یہ کہ واپسی پر بھی فاخرہ سے پوچھتا: "ٹھیک طرح جا کر آئی ہو نا؟ کہیں کسی کے سامنے بے پردگی تو نہیں ہوئی؟" فاخرہ ایسے سوالات پر جھلا بھی جاتی تھی۔ اُس کا جی چاہتا کہ پوچھے "آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں؟ کیا

مجھ پر رتی بھر بھی اعتماد نہیں؟" مگر وہ صرف سوچ کر رہ جاتی۔ فاخرہ تعلیم یافتہ تھی۔ ساتھ ہی ہوش مند بھی تھی۔ وہ خوب سمجھتی تھی کہ اُس کی زندگی میں ممتاز علی کی ہستی کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ ہمیشہ ممتاز علی کی خواہش کو مدِ نظر رکھ کر ہی چلا کرتی تھی۔ ممتاز علی بھی بیوی پر صرف حکم چلانا ہی جانتا تھا بعض اوقات وہ بیوی کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر بھی اُسے بُری طرح ڈانٹ دیتا۔ بے چاری فاخرہ سر جھکائے سب کچھ چُپ چاپ سُن لیتی۔

ایک دن ممتاز علی کو گھر آنے پر پتہ چلا کہ رشتے کی بہن کوثر کی منگنی کی تقریب میں سب لوگ گئے ہوئے ہیں۔ شام کا وقت تھا۔ وہ لیٹے لیٹے کوئی رسالہ دیکھتا رہا۔ پھر اُکتا کر سو گیا۔ جب اُس کی آنکھ کھُلی تو کافی اندھیرا ہو چکا تھا۔ باہر سے فاخرہ اور بہنوں کی بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"اُفوہ! تم تو بالکل اُن کے سامنے چلی گئیں!" یہ فاخرہ کی بڑی نند کی آواز تھی۔

"آپا کیا میں جان بُوجھ کر گئی تھی؟ مجھے کیا معلوم تھا وہاں جاوید بھائی ہوں گے؟" جواباً فاخرہ نے کہا۔

"ہاں، ہم جس کمرے میں بیٹھے تھے، نانی سے بات کرنے کے بعد بے چاری بھابی اسی کمرے میں آئیں تھیں۔ انہیں کیا پتہ تھا کہ اس وقت تک ہم اس کمرے سے ہٹ چکے ہوں گے۔ اور وہاں ہمارے بجائے جاوید بھائی موجود ہوں گے۔" یہ چھوٹی نند تھی، جو ہمیشہ فاخرہ کی طرف داری کرتی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ تم جان بُوجھ کر گئی تھیں یا انجانے میں، بہر حال تمہارا آج اچھی طرح پردہ ٹوٹ گیا۔ ممتاز علی سُنے گا تو کیا کہے گا؟" بڑی نند نے پھر تشویش ظاہر کی۔

"چھوڑیئے نا۔ ہم لوگ اس بات کا ذکر ہی نہ کریں گے۔ چھوٹی نند نے اب بھی ہمدردی جتائی۔

مگر ان لوگوں کی باتیں سُن کر ممتاز علی کا دماغ گھوم ہوگیا۔ وہ سیدھا جاکر سب پر برس پڑا۔ فاخرہ کو تو اُس نے کھری کھری سُنا ڈالیں۔ سب دم بخود رہ گئے۔ بہنوں کے دل پر بھائی کی باتوں کا اثر ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، فاخرہ کے دل کو تو ممتاز علی کے الفاظ چیرتے چلے گئے۔

دوسرے دن بھی ممتاز علی فاخرہ سے برہم اور بیزار رہا۔ فاخرہ سہمی سہمی سی اس کا ہر کام کرتی رہی۔ تین چار دن کے بعد ممتاز علی کا غصہ کچھ کم ہوا۔ اور اُس نے فاخرہ سے باتیں کی، مگر انداز اُکھڑا اُکھڑا سا ہی تھا۔ مارے خوف کے فاخرہ نے پھر کہیں بھی جانے کے لئے قدم نہ اُٹھایا۔ اب وہ میکے بھی نہیں جاتی تھی۔ اس طرح بے چاری سسرال میں قیدی بن کر رہ گئی۔

ان سب باتوں کا علم نازلی کو نہ تھا۔ وہ تو زیادہ تر اپنی سسرال میں ہی رہتی تھی۔ کبھی کبھار میکے آتی بھی تو چند دن رہ کر چلی جاتی۔ جانے کیوں، ممتاز علی نازلی سے پہلے کی طرح گھُل مل کر بات کرنے سے کتراتا۔ نازلی ممتاز علی کو کچھ بدلے ہوئے پا کر یہ سمجھ گئی کہ زیادہ تر مرد لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں یعنی شادی کے بعد اپنوں سے دُور ہو ہی جاتے ہیں۔

فاخرہ دوسرے بچے کی ماں بننے والی تھی اُس کی طبیعت ناساز رہنے لگی۔ اُس کو میکے کی یاد آتی، پھر بھی وہ میکہ جا نہ سکی۔ میکے سے بھی کئی بار بلاوا آیا، مگر ممتاز علی کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے بھیجنے سے انکار کر دیتا۔ کسی نہ کسی طرح دن گذرتے گئے۔ پھر فاخرہ نے سسرال میں ہی ایک بچی کو جنم دیا۔ بچی [illegible] پر گئی تھی۔ ناک نقشہ ہُو بہُو فاخرہ کا [illegible] رنگ؟ بچی فاخرہ سے بھی کالی تھی۔ فاخرہ نے بچی کو سینے سے لگایا اور بے اختیار اُس کے سینے سے اطمینان کا سانس نکلا۔

فاخرہ کی ماں بہنیں مجبوراً ناگواری کے ساتھ اُس کی سسرال آکر چلی گئیں۔ پھر دو ماہ بعد میکے والے زبردست فاخرہ کو لے گئے۔ مگر میکے میں اُس کا دل نہ لگا۔ دل میں کسی طرح کا خوف یا گھبراہٹ ہو تو خوشیوں بھری محفل میں بھی رونق نظر نہیں آتی۔ اس طرح فاخرہ میکے سے جلد ہی لوٹ آئی۔ جمال سے بھی زیادہ چاہت فاخرہ کو بچی کی تھی۔ وہ بچی کو پل بھر کے لئے بھی اپنی نظروں سے دُور ہونے نہیں دیتی تھی۔ اِدھر نازلی بھی سسرال سے آئی ہوئی تھی گھر کا ماحول خوش گوار تھا نازلی بار بار بچی کو پیار کرتی اور فاخرہ سے کہتی "یہ میری بہو ہے۔ پرویز کی امانت"۔

شام کا وقت تھا نازلی، فاخرہ وغیرہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتوں میں لگے ہوئے تھے فاخرہ کی گود میں اُس کی چھ ماہ کی کھیل رہی تھی اتنے میں ممتاز علی آفس سے آگیا۔ نازلی سے وہ رسمی باتیں ہی کر سکا تھا کہ اُس کے چند دوست آگئے ممتاز علی نے دونوں کو ڈرائنگ روم سے ہٹ جانے کا اشارہ کیا۔ فاخرہ گھبراہٹ میں بچی کو وہیں چھوڑ خود ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔

"آفاہ! یہاں تو ہمارے استقبال کو مُنّی صاحبہ بھی موجود ہیں!" ایک دوست نے داخل ہوتے ہوئے ہانک لگائی۔

"کیا یہی ممتاز کی صاحب زادی ہیں؟" یہ دوسرے دوست تھے۔

" ممتاز علی چُپ تھا۔

"بتاؤ یار، یہ تمہاری بچی ہے؟" ایک بچی کو

اُٹھاتے ہوئے پوچھا۔

دوستوں کی آواز نازلی اور فاخرہ کو صاف سُنائی دے رہی تھی۔ دونوں ڈرائنگ رُوم سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھیں۔

"ایں ــــ نہیں تو۔ یہ بچّی پڑوس کی ہے"۔ ممتاز علی کی آواز اُبھری۔ نازلی چونک پڑی۔ فاخرہ کا چہرہ تاریک ہوگیا۔

"کیا یہ تمہاری بچّی نہیں؟ ارے بھئی کسی نے کہا تھا کہ بچّی بالکل بھابی جیسی ہے، اسی لئے میں نے سوچا تھا۔ بھابی کو نہ سہی بچّی کو تو دیکھ لوں" یہ پہلی آواز تھی۔

"تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو، ممتاز تو کہتا ہے ہماری بھابی کافی اچھی ہیں۔" دوسرے دوست نے کہا۔

"بھابی زیادہ تر کہیں آتی جاتی نہیں۔ ابھی تک ہم نے اپنی بھابی کی ایک ہلکی سی جھلک بھی نہیں دیکھی۔"

"واہ یار، تم تو اپنی بیوی کو سات پردوں کے اندر چھپائے رکھتے ہو" یہ تیسرے دوست کی آواز تھی۔

"اچھی چیزوں کو ہمیشہ پوشیدہ ہی رکھنا پڑتا ہے۔ شاید ہم لوگ بھابی کو نظر لگا دیں گے۔ خیر، اب تو اپنی بچّی کو دکھا دو یار، تاکہ تھوڑی خواہش تو ہماری بھی پوری ہوسکے۔" "افسوس ہے آج میں بچّی کو نہ دکھا سکوں گا کیونکہ وہ یہاں نہیں ہے، ننھیال گئی ہوئی ہے۔" ممتاز علی کی آواز میں بلا کی سنجیدگی تھی۔

فاخرہ کا چہرہ تاریک سے تاریک تر ہوتا چلا گیا۔ اور پتہ نہیں کیوں نازلی بے انتہا شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔ بعد میں نازلی نے تنہائی میں یہ باتیں افسوس ناک لہجہ میں فاخرہ کی چھوٹی نند کو بتائیں۔ تب چھوٹی نند نے ممتاز علی کی ساری اعلیٰ ظرفی کو نازلی کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ نازلی حیران رہ گئی۔ وہ فاخرہ کے پاس آئی۔ فاخرہ اُداسی کے ساتھ بچّی کو گود میں لئے بیٹھی تھی۔ نازلی کو اُس پر ترس آرہا تھا۔ ممتاز علی دوستوں کے جانے کے بعد اندر آگیا۔ آتے ہی اُس نے فاخرہ سے کہا۔

"صبح کو بچّی کو ننھیال بھیج دو۔"

"کیوں؟" فاخرہ نے بے بسی سے پوچھا

"بہتر ہے کہ بچّی وہیں رہے۔ جب بڑی ہو جائے گی تو بُلا لیں گے۔" ممتاز علی کا انداز رُوکھا تھا۔

اگر دوستوں کی اور اُس کی باتیں نہ سُنی ہوتیں تو فاخرہ کچھ بھی نہ سمجھ پاتی، لیکن اب دل کو ٹھیس لگی۔ کچھ کہنا چاہا تو آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ وہ کانپتے ہوئے بچّی کو اُٹھا کر کھڑی ہوگئی۔ پھر کمرے سے نکلتے ہوئے رُک کر نازلی سے بولی۔

"باجی آپ اپنے بھائی سے کہہ دیجئے کہ پھر میں اس گھر میں قدم نہیں رکھوں گی۔ آج میں خوب پہچان چکی ہوں کہ انہیں میری صُورت سے نفرت ہے۔ جو آدمی اپنی کالی کلوٹی بچّی کو اپنی اولاد کہتے میں بے عزّتی سمجھے وہ بھلا بدصُورت بیوی کو کیسے قبول کر سکے گا۔ جو کچھ مجھے سننا تھا سُن چکی، جو کچھ کرنا تھا کر چکی۔ اب مزید توہین میں برداشت نہ کر سکوں گی۔ میں ہر بار اپنی توہین پر گھر کی عزّت کی خاطر مُسکراتی رہی۔ یہ سچ ہے کہ میری صُورت اُن کے رُوپ کے قابل نہیں۔ مگر کیا کیا جائے؟ یہ میری قسمت کی بھول تھی۔ سب کہتے ہیں میں خوش نصیب ہوں۔ شوہر کی نظریں قدر و محبت کی بجائے ہمیشہ نفرت و حقارت جھانکتی رہیں، یہی میری خوش قسمتی ہے! وہ بھی کیا کریں؟ کب تک وہ سب کی نظروں سے مجھے چھپائے رکھیں گے؟ کب تک مجھے قید میں رکھ کر یہی کہتے رہیں گے کہ اُن کی بیوی صورت و شکل کی کافی اچھی ہے۔ اگر بات میری ذات تک محدود ہوتی تو ہو سکتا ہے میں یوں ہی گھٹ گھٹ کر اُف بھی کئے بغیر مر جاتی مگر اب میں اپنی معصوم اولاد کی بے عزّتی برداشت نہ کر سکوں گی۔ وہ کالی کلوٹی ہے، اس لئے میرے سرتاج اُسے نظروں سے دُور رکھنا چاہتے ہیں اس لئے کسی کے حسین چہرے کو آنچ لگنے سے پہلے اُس کے ساتھ ہی میں بھی دفع ہو رہی ہوں" فاخرہ پوری قوّت کے ساتھ بول رہی تھی۔ وہ سر سے پاؤں تک تھرتھرا رہی تھی خود کو سنبھالتی ہوئی وہ بچّی کو لے کر کمرے سے نکلی۔ کمرے سے نکلتے ہی وہ چکرا گئی۔ اُس کو گرتے دیکھ کر نازلی کی چیخ نکل گئی۔ سب دوڑے دوڑے آئے۔ سب نے مل کر فاخرہ کو سنبھال لیا مگر فاخرہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ ایک انجکشن لگا کر ڈاکٹر مطمئن رہنے کا مشورہ دے کر چل دیا۔

ممتاز علی ان سب باتوں سے لاتعلق دکھائی دے رہا تھا، جیسے فاخرہ سے اُس کا کوئی واسطہ ہی نہ رہا ہو۔ اب ممتاز علی اس بات پر اکڑ چکا تھا کہ "کس قدر دلیری سے وہ زبان چلا رہی تھی۔ اس میں اس قدر ہمت کہاں سے آگئی؟ اتنی زبان درازی!" اس نے اسی بنا پر فاخرہ سے بولنا بند کر دیا۔

فاخرہ کو نازلی نے بہت سمجھایا بجھایا اور چند دن تک اُسے اپنے ہی کمرے میں رہنے کا مشورہ دیا۔ نازلی ہر وقت فاخرہ کے ساتھ ہی لگی رہتی۔ بے چاری فاخرہ مارے غم کے بے حد دُبلی پتلی ہوگئی۔ نازلی کو ممتاز علی کا سلوک دیکھ کر ذہنی اذیت ہوئی۔

یہ بھی اتفاق تھا کہ فاخرہ کے بڑے بھائی عزیز الرحمان، جو ہندوستان سے باہر رہتے تھے

ان ہی دنوں فاخرہ سے ملنے آئے۔ عزیزالرحمان کے ساتھ فاخرہ کے خالہ زاد بھائی کمال بھی تھے۔ فاخرہ پہلے تو ہچکپائی، مگر بھائی کی موجودگی میں کیا کرسکتی تھی؟ دونوں سے ملاقات کرنا ہی پڑی ممتاز علی بھی موجود تھا۔ وہ ان سب سے اچھی طرح ملا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں کے رُخصت ہو جانے پر فاخرہ کمرے سے نکلنے ہی والی تھی کہ ممتاز علی کا زناٹے دار ہاتھ اُس کے گال پر پڑا۔

بے اختیار فاخرہ کی چیخ نکل گئی۔ "عزیز صاحب تو خیر تمہارے بھائی تھے، مگر کمال کے سامنے تم کیوں آئیں؟" بہت اپنی حد سے آگے بڑھتی جا رہی ہو۔ بہتر ہے چلی جاؤ ہمیشہ کے لئے" ممتاز علی کی تلخ آواز فضا میں گونجی۔ اسے پتہ نہ تھا کہ عزیزالرحمان ابھی بالکونی میں ہی تھے۔ فاخرہ کی چیخ سُن کر وہ تیزی سے پلٹ آئے۔ ممتاز علی کی تلخ باتیں بھی انہیں صاف سنائی دیں۔ بے اختیار انہوں نے فاخرہ کو کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ اچانک پدرانہ محبت پاکر فاخرہ بلک پڑی۔ "بھیا! بھیا! میں یہ کیسی قسمت لے آئی؟" وہ سسکتی ہوئی بے ہوش ہوگئی۔ ممتاز علی ہکا بکا ہوکر وہاں سے کھسک گیا۔ گھر کے سارے افراد جمع ہوگئے ان میں نازلی بھی تھی۔ سب کے چہروں پر شرمندگی چھائی ہوئی تھی۔ عزیزالرحمان کسی سے اجازت لئے بغیر دونوں بچوں سمیت بے ہوش بہن کو لے کر چلے گئے۔ سب سکتے میں رہ گئے۔

جب وہ لوگ جاچکے تو نازلی ممتاز علی کے سر پر پہنچ گئی۔ ممتاز ہمیشہ نازلی کی بات مانا کرتا تھا، مگر اس موڑ پر آکر وہ بدل گیا تھا۔

"آج سے تمہارا اور میرا رشتہ ٹوٹ گیا ممتاز!"

"اوفوہ، بہت غصہ میں بھری ہوئی ہو کیا بات ہے؟"

"تم اس قدر بدل کیوں گئے ہو۔ میں اچھی طرح پہچان گئی، واقعی مرد کا دل اور ہے اور زبان اور۔ دل کچھ چاہتا ہے، زبان کچھ کہتی ہے اتنے دنوں تک تم فاخرہ کو کس بات کی سزا دے رہے تھے؟"

جواب میں ممتاز علی چُپ رہا۔

"کہہ دو نا، اسے تم اُس کے رنگ رُوپ کی سزا دے رہے تھے۔ افسوس مجھے معلوم نہ تھا کہ اندرونی طور پر تم بھی بے حد پست ہو۔ تمہارے جیسے مردوں سے تو ہم عورتیں بہتر ہیں جو بدصورت سے بدصورت شوہروں کو بھی قبول کرلیتی ہیں۔ ہم اپنے بدصورت شوہر کو دیکھ دیکھ کر چڑتے نہیں، ان کو شرمندہ کرا کے اُن کی ہستی کی توہین نہیں کرتے۔ اپنے رشتے داروں سے بدصورت شوہر کو چھپائے نہیں رکھتے۔ مگر تم مرد لوگ اتنے کم ظرف کیوں ہو؟ کس قدر سطحی آدمی نکلے تم! تم نے پہلے مجھ سے کہا تھا نا کہ خوب صورتی پر جان نہ دو، خوب صورت دل پر جان دو۔ ہمیشہ سیرت کی قدر کرنا چاہئے۔ تم ایسی اونچی اونچی باتیں کیوں کرتے تھے؟ کسی کی سیرت کی قدر کرنے کی جب تم میں اہلیت نہیں تو پھر تم دوسروں کو مشورہ کیوں دیتے تھے؟ اگر اس بات کا مجھے پہلے ہی پتہ چل جاتا تو ایک مجبور کی زندگی نہ بگڑتی۔ خیر اب اچھی طرح جان لو، آئندہ تم مجھے زندہ نہ سمجھنا۔ میں تم سے کوئی تعلق ہی نہ رکھوں گی۔" نازلی سر سے پاؤں تک سُرخ ہوچکی تھی۔ ایک منٹ بھی ٹھہرے بغیر وہ وہاں سے چلی گئیں۔

ممتاز علی کا دماغ چکرا گیا۔ ایک دم اُسے اپنا کردار گہرائی کی طرف گرتا محسوس ہوا۔

نازلی سچ مچ ممتاز علی سے ناراض ہوچکی تھی ایک ہی گھر میں ہوتے ہوئے بھی اُس نے ممتاز علی سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ نازلی کی والدہ نے ممتاز علی کی امی کو مشورہ دیا کہ کسی نہ کسی طرح بہو کو بلوا بھیجیں۔ مگر سوال یہ تھا کہ لانے کے لئے جائے گا کون؟ پتہ نہیں فاخرہ کے گھر والے کیسے استقبال کریں گے؟ آخر نازلی کی والدہ نے فاخرہ کو فون کیا کہ جتنی جلد ہوسکے آجائے۔ جواب میں فاخرہ کی بجائے اُن کے بھائی کی آواز آئی: "ہم فاخرہ کو کبھی نہ بھیج سکیں گے۔ اب ہم اس رشتہ کو توڑ دینا چاہتے ہیں!"

گھبرا کر نازلی کی والدہ نے فون رکھ دیا۔ یہ کیا؟ معاملہ تو بہت ہی اُلجھ گیا تھا۔ سب فکرمند ہوگئے۔ ممتاز علی کو پہلی بار احساس ہوا کہ جب اپنے ہی نگاہیں پھیرلیں تو دل میں کتنا درد ہوتا ہے۔ اُس نے نازلی کو منایا اور اُس کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ فاخرہ کو لینے کے لئے سب لوگ جائیں۔

فاخرہ کے میکے میں ان لوگوں کا استقبال اچھی طرح کیا گیا۔ ممتاز علی ڈرائنگ رُوم میں ہی بیٹھ گیا۔ بڑوں نے اپنی اپنی طرف سے بہلانے کی کوشش کی مگر عزیزالرحمان ہر بار سختی سے صاف جواب دیتے۔ "اپنی بہن کی اتنی بے عزتی میں گوارا نہ کرسکوں گا۔ زندگی بھر کے لئے میری بہن قیدی ہوجائے مجھے منظور نہیں۔ یہ لوگ ڈرائنگ رُوم سے باہر باتیں کر رہے تھے۔ سب کی آواز ممتاز علی کو صاف سُنائی دے رہی تھی۔

"مگر۔۔۔ مگر بچوں کا کیا ہوگا؟" نازلی کی والدہ نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"آپ لوگ چاہیں تو شوق سے انہیں لے جائیے، ورنہ یہیں رہنے دیں۔ مانا کہ ہم شریف نہیں، پھر بھی ہم دوسروں کی اولاد کی بے عزتی نہیں کریں گے۔ مجبور ہستیوں کو حقیر نہیں سمجھیں گے۔"

اب ممتاز علی کو اپنی ہستی بہت حقیر لگنے لگی۔ ندامت سے اس کا دل زمین میں اُترنے لگا فاخرہ بُت کی طرح چُپ تھی۔ شاید اپنے غصیلے بھائی کے خوف سے ایک لفظ بھی نہیں بولی تھی۔ ممتاز علی نے اپنی ہمت کو یک جا کیا پسینہ صاف کرتا ہوا اُٹھا اور دندناتا ہوا ڈرائنگ رُوم سے نکل کر سیدھا فاخرہ کے کمرے میں گھس گیا۔ سب حیران رہ گئے۔ پھر اندر سے ہی ممتاز علی نے آواز لگائی "نازلی، فاخرہ کو لے آئیے ذرا۔"

نازلی سناٹے میں آگئی۔ پتہ نہیں ممتاز علی کیا فیصلہ سُنانے والا ہے؟ دھڑکتے دل کے ساتھ فاخرہ کو لے کر کمرے میں پہنچی۔ نازلی کمرے میں چلی گئی۔ فاخرہ بچّی کو کاندھے میں ڈالے دروازے کے پاس ہی کھڑی رہی۔

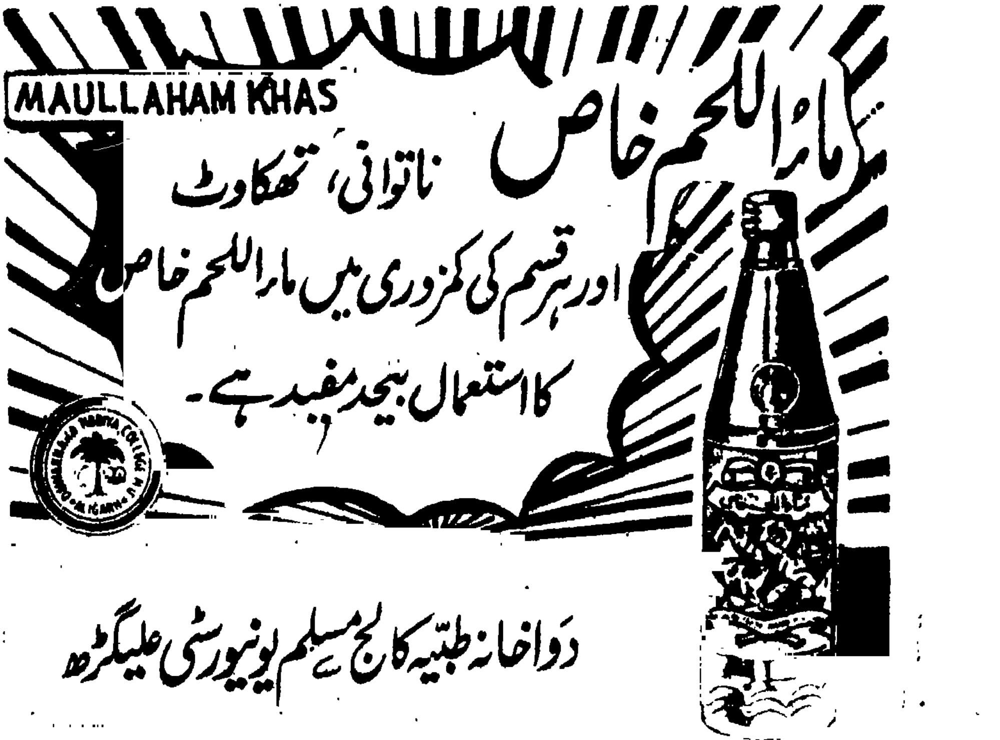
"فاخرہ، معلوم نہیں میرے دماغ کو کیا ہو گیا تھا؟ شکر ہے تم نے میری آنکھیں کھول دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں، پھر کبھی میں تمہیں شکایت کا موقع نہ دوں گا۔ میری غلطیوں کو نظر انداز کر دو۔ میں تمہاری محبت کا قدر کرتا ہوں۔ بولو، کیا تم اب میری چاہت کو ٹھکرا دو گی؟"

فاخرہ کے چہرے پر ایک لہر آئی جیسے کڑی دھوپ میں ٹھنڈی ہوا کی ایک جھونکا آتا ہو۔

ممتاز علی نے موقع کو غنیمت جانا اُس نے دو قدم بڑھ کر کہا "لاؤ فاخرہ، بچّی کو مجھے دے دو۔ اور اب چلو تم ہمارے ساتھ۔" وہ اب پوری طور پر ہار مان چکا تھا

نازلی نے سوچا: جو انسان اپنی غلطیوں کو سچے دل سے تسلیم کر لیتا ہے وہ بہت جلد اپنے کردار کو بلندی کی طرف لے جاتا ہے۔ پھر نازلی کے ہونٹوں پر فاتحانہ مُسکراہٹ آگئی۔ ماحول میں جو عجیب طرح کی اُداسی چھائی ہوئی تھی، وہ ایک پل میں بہار میں تبدیل ہو گئی۔

"میں تو ارادہ کر چکا تھا کہ فاخرہ کی دوبارہ شادی کر کے اپنے حسن پر گھمنڈ کرنے والے لوگوں کو یہ جتا دوں کہ بے چاری عورت گُھٹ گُھٹ کر مرنے کے لئے ہی پیدا نہیں ہوئی، بلکہ اُس کو چاہت نہ ملے تو اُسے وہ لڑ کر حاصل کر سکتی ہے۔" مگر — اتنا کہہ کر عزیز الرحمان اپنے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگے۔





رُوٹھے صنم

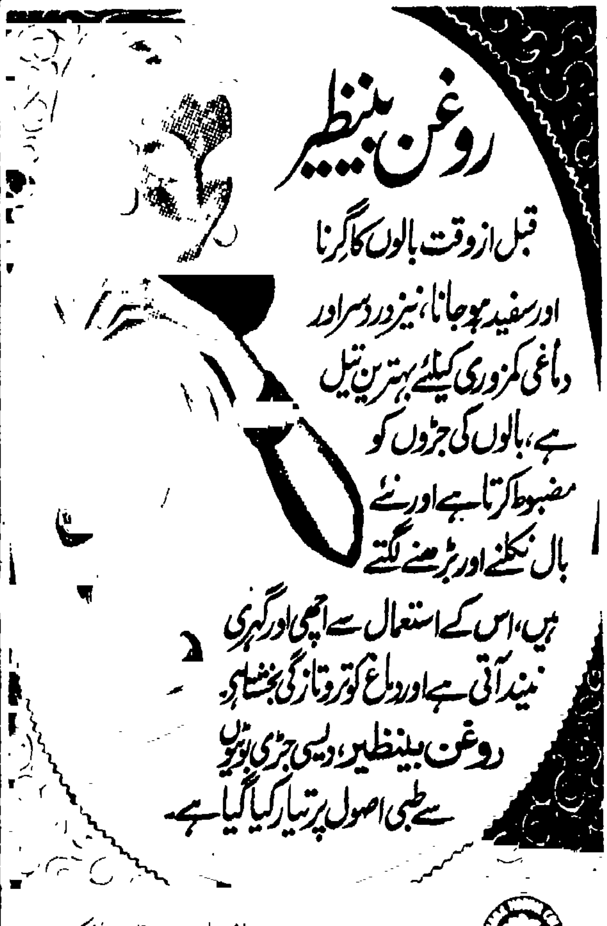
جانے کس بات پہ روٹھے ہو صنم
تم کو ناؤں تو مناؤں کیسے
گھر یہ اپنا
جو کبھی باغ تھا اُمیدوں کا
آرزوؤں کا تمناؤں کا
ہر طرف پیار کی خوشبو جو بسی رہتی تھی
نکہت و نور کی بارش سی ہوا کرتی تھی
آج کیوں
حسرت و یاس کے پہرے ہیں یہاں
غم کے سائے بھی گھنیرے ہیں یہاں
کتنے دن، کتنے مہینے گزرے
جانے کس بات پہ رُوٹھے مجھ سے
بات کرنا بھی گوارہ نہ کیا۔

درد ہی درد بھرا ہے دِل میں
اور ہلکی سی کسک جاگتی ہے
کوئی شے دِل کو بھاتی ہی نہیں!
شام دفتر سے جب آجاؤ گے تم
تم سے پوچھوں گی "میری شامِ اَلم
ہائے کب تک یونہی ترسے گی آجانے کے لئے؟"

احمد کلیم فیض پوری

بہن جی ....

آپ روزانہ اس مارکیٹ سے گذرتی ہیں جنرل اسٹورز کے شوکیس دیکھتی رہتی ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ آپ کسی چیز کی متلاشی ہیں مگر قوت فیصلہ میں یا تو کمی ہے یا پھر کسی ایسی شے کی تلاش میں ہیں جو کہ آپ کو اسی طرح مایوس نہ کرے جس طرح آپ پہلے ہو چکی ہیں۔ اگر آپ کسی ہیر آئل کی تلاش میں ہیں تو میرا مشورہ مانئے بازاری خوشبودار تیلوں کا پیچھا چھوڑیئے اور دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا بنایا ہوا خالص یونانی اجزاء پر مشتمل بالوں کا تیل روغن بے نظیر روزانہ استعمال کیا کیجئے۔ جو واقعی بے نظیر ہے۔



دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اِن سے مِلئے

باربرا شومیکر

دلّی میں دنیا کے تقریباً تمام ملکوں کے سفارت خانے موجود ہیں۔ سفارت خانے کے افسروں کا وقت اپنے فرائض کی انجام دہی میں گزر جاتا ہے۔ لیکن ان کی بیویوں کے لئے اپنا وقت کاٹنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اجنبی زبان اور اجنبی تہذیب ان کے راستے کی رُکاوٹ بن جاتی ہے۔ یہ عورتیں ہندوستان میں ملازمت نہیں کر سکتیں۔ گھر کی دیکھ بھال اور پارٹیوں کا اہتمام ہی ان کی ذمہ داری ہوتا ہے۔ سفارت خانے کے افسروں کے علاوہ کچھ غیر ملکی لوگ ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل کے لئے بھی ہندوستان آتے ہیں۔ ان کے قیام کا عرصہ بھی مختصر ہوتا ہے۔ اس مختصر عرصے میں وہ ہندوستان کے رہنے والوں سے تعلقات نہیں بڑھا سکتے۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے ہم وطنوں سے ملیں۔ غالب نے کہا ہے کہ سفر میں ہمدم دیرینہ کا ملنا خضر و مسیحا کی ملاقات سے بہتر ہے۔ امریکن عورتوں کی ایک ایسی ہی انجمن دلّی میں قائم ہے جس کے ذریعے دلّی میں مقیم یا دلّی آنے والی امریکن عورتیں ایک دوسرے سے مل سکتی ہیں۔ اس انجمن کا نام امریکن ویمنز ایسوسی ایشن ہے — باربرا شومیکر اس انجمن کی صدر ہیں۔

اس انجمن کے ممبروں کی تعداد ۱۲۵ ہے۔ اس انجمن کی صدارت کے لئے انتخاب نہیں ہوتا۔ اس کا صدر نامزد کیا جاتا ہے۔ اس اس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا دائرہ سماجی اور رفاہی سرگرمیوں تک محدود ہے۔ کبھی کبھی یہ عورتیں گروپ بنا کر ہندوستان کی سیاحت کے لئے نکل جاتی ہیں۔ ایک گروپ میں ۴۰، ۵۰ عورتیں ہوتی ہیں۔ اس طرح اُنہیں سفر میں تنہائی کا احساس بھی نہیں ہوتا اور خرچ بھی کم آتا ہے۔ اس انجمن کی میٹنگ ہر مہینے منعقد ہوتی ہے۔ اس کی ممبری کی فیس برائے نام ہے یعنی صرف ۲۰ روپے سالانہ۔

باربرا اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہیں۔ ان کے باپ یو ایس ایڈ میں ایک افسر تھے۔ یہ ادارہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، دنیا بھر کے ملکوں کو امریکی امداد مہیا کرتا ہے۔ یہ امداد زیادہ تر پس ماندہ اور غریب ملکوں کو دی جاتی ہے۔ ہندوستان میں بھی اس ادارے نے برسوں کام کیا ہے۔ چند سال ہوئے ہندوستان میں یہ ادارہ بند کر دیا گیا۔ باربرا کے باپ کا اپنے کام کے سلسلے میں کئی ایشیائی ملکوں میں قیام رہا۔ باربرا نے بھی باپ کے ساتھ ان ملکوں کی سیاحت کی۔ ان کا بچپن تھائی لینڈ اور افغانستان میں گزرا۔ امریکہ میں اُنہوں نے چینی زبان میں ڈگری حاصل کی۔ کالج سے فراغت پاتے ہی اُنہوں نے ہانگ کانگ کا رُخ کیا۔ وہاں اُنہیں ایک امریکن بینک میں ملازمت مل گئی۔ بینک میں کچھ سال کام کرنے کے بعد ان کی شادی ہو گئی — اُن کے شوہر امریکن سفارت خانے میں کام کرتے ہیں۔

انگریزی کے مشہور ادیب کپلنگ نے کہا تھا کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب، یہ دونوں متوازی لکیریں کبھی نہیں مل سکتیں۔ آج کل رسل و رسائل کی سہولتوں کی وجہ سے دنیا کے ملکوں کے درمیان فاصلہ کم ہو گیا ہے۔ ہندوستان اور امریکہ کے درمیان سفر ۲۴ گھنٹے میں مکمل ہو جاتا ہے۔ لاکھوں سیاح ہر سال اِدھر سے اُدھر جاتے ہیں۔ دُنیا سُکڑ کر رہ گئی ہے۔ ایک مُلک کے باشندے دوسرے مُلک کی تہذیب اور تمدن کا قریبی مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ ایک دوسرے سے کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اس کے باوجود کپلنگ کی رائے اپنی جگہ اٹل ہے۔ مشرق اور مغرب کی تہذیب کا فرق نہیں مٹ سکتا۔ ہمارے مُلک میں لڑکیوں کا ملازمت کرنا معیوب سمجھا

جاتا ہے۔ اگر ماں باپ مالدار ہوں اور لڑکی کی کفالت آسانی سے کرسکتے ہوں تو یہ بات اور بھی معیوب ہو جاتی ہے۔ جہاں ایک لڑکی صرف مالی مجبوریوں کی بنا پر ملازمت یا تجارت کرسکتی ہے۔ امریکہ میں لڑکے اور لڑکی دونوں کے لئے والدین کا محتاج ہونا برا سمجھا جاتا ہے۔ انہیں بچپن سے ہی یہ تربیت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھیں۔ ان میں چھوٹی عمر سے ہی کام کرنے کی عادت پیدا کی جاتی ہے۔ باربرا خود اپنے کالج کی تعلیم کا بار اٹھاتی ہیں۔ ان کے باپ نے کالج کے پہلے سال میں تو ان کی تعلیم کا خرچ اٹھایا۔ دوسرے اور تیسرے سال میں انہوں نے باربرا سے کہہ دیا کہ میں صرف کالج کی فیس ادا کروں گا۔ کھانے پینے اور رہائش کے خرچ کا انتظام تمہیں خود اٹھانا ہے۔ اس خرچ کو پورا کرنے کے لئے باربرا نے ایک شراب خانے میں ویٹریس کی ملازمت کر لی۔ چوتھے سال کے دوران بھی یہی ہوا۔

امریکہ میں لڑکیاں ۱۴، ۱۵ برس کی عمر میں لڑکوں کے ساتھ گھومنا شروع کر دیتی ہیں۔ اسے وہاں 'ڈیٹنگ' کہتے ہیں۔ انگریزی میں ڈیٹ کے معنی تاریخ کے ہیں۔ اس نام کی وجہ شاید یہ ہے کہ لڑکا اور لڑکی ملنے کے لئے ایک تاریخ مقرر کر لیتے ہیں۔ اگر کوئی لڑکی ۱۵، ۱۶ برس کی عمر میں بھی ڈیٹنگ نہ کرے تو والدین کو فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ ان کے خیال میں جو لڑکی لڑکے کے ساتھ سیر سپاٹے کو نہیں جاتی، وہ ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس لئے والدین خود اپنی لڑکی کو ڈیٹنگ کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ ان کی رائے میں لڑکی کو ابتدائی عمر میں لڑکوں کی نفسیات کا مطالعہ کر لینا چاہیئے۔ ان سے ملنا جلنا چاہیئے۔ آخر انہیں اپنی زندگی ایک مرد کے ساتھ ہی گزارنی ہے۔ جو لاڈ پیار اور شفقت لڑکی کو ماں باپ سے ملتی ہے وہ خاوند سے نہیں ملتی۔ لڑکی کو ڈیٹنگ سے والدین اور شوہر کا فرق معلوم ہو جاتا ہے۔ اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ مرد عورت سے کیا چاہتا ہے۔ ڈیٹنگ کے رواج کے ذریعے لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کو قریب سے دیکھ لیتے ہیں۔ ابتدا میں ماں باپ چاہتے ہیں کہ ان کی لڑکی ایک لڑکے کی ہو کر نہ رہ جائے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کی لڑکی مختلف لڑکوں سے ملے جلے، ان کے ساتھ گھومے تاکہ اسے ان لڑکوں میں سے اپنے مزاج کے مطابق لڑکا ڈھونڈنے میں آسانی ہو۔ اگر لڑکی ابتدا میں ایک لڑکے کے ساتھ بندھی ہو جائے تو ماں باپ کو ناگوار گزرتا ہے۔ باربرا نے بھی ۱۴ سال کی عمر میں ایک نوجوان کے ساتھ گھومنا شروع کر دیا تھا۔ اس نوجوان کی عمر بیس سال تھی۔ عمر کا یہ فرق خلافِ معمول تھا۔ عموماً لڑکیاں اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ ہی گھومتی ہیں۔ باربرا نے اس نوجوان کے ساتھ گھومنا شروع کیا تو والدین نے عمر کے اس فرق پر اعتراض کیا۔ مگر باربرا اس نوجوان کو پسند کرتی تھیں۔ اگرچہ اس سے شادی کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ وہ اس نوجوان سے مانوس تھیں، لیکن انہیں اس سے محبت نہیں تھی۔ انسیت اور محبت کا فرق ہر عورت آسانی سے سمجھ سکتی ہے۔ باربرا نے اس نوجوان کے علاوہ اور کئی نوجوانوں کے ساتھ ڈیٹنگ کی۔ آخر انہیں اپنا مطلوبہ مرد مل گیا۔ یہ یانوس شومیکر تھے۔ یانوس سے ان کا رومانس تین سال تک چلتا رہا۔ کورٹ شپ کا یہ عرصہ امریکن معیار سے طویل معلوم ہوتا ہے، مگر باربرا مجبور تھیں ان کے بوائے فرینڈ دوسرے شہر میں رہتے تھے۔ وہ کبھی کبھار ہی مل سکتے تھے۔ پھر باربرا شادی کے لئے تیار نہیں تھیں، لیکن جب ان کے بوائے فرینڈ کا اصرار بڑھتا ہی گیا تو مجبوراً انہوں نے 'ہاں' کر دی۔ شادی کے وقت ان کی عمر ۲۳ سال تھی۔ باربرا کی رائے میں عورت کو ۲۳ سال کی عمر سے پہلے شادی نہیں کرنا چاہئے۔

باربرا کے لئے مشرقی شادیاں تعجب کا باعث نہیں ہیں۔ ان کے خیال میں شادی کا مقصد ایک ہی ہے: میاں بیوی ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوں، ان میں اپنائیت ہو، دونوں مل کر گھر کی ذمہ داری سنبھالیں۔ بچوں کی پرورش کریں۔ مشرق اور مغرب کی شادیوں میں ظاہری فرق کتنا ہی ہو، لیکن دونوں کی منزل ایک ہے۔ امریکہ میں اتنی چھان پھٹک کے باوجود میاں بیوی میں نہیں بنتی۔ وہاں طلاق کا تناسب مشرقی ملکوں سے کہیں زیادہ ہے۔ ہندوستان میں لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو دیکھے بغیر شادی کر لیتے ہیں وہ ایک دوسرے کے متعلق کچھ نہیں جانتے، اس کے باوجود یہاں شادیاں زیادہ کامیاب رہتی ہیں۔ امریکہ میں لڑکے اور لڑکی کو ایک دوسرے کا دیکھنا ہی کافی نہیں ہوتا، انہیں ایک دوسرے کو سمجھنے اور پہچاننے میں عرصہ لگ جاتا ہے اس کے باوجود اکثر شادیاں طلاق پر ختم ہوتی ہیں۔

عورتوں کی آزادی کی تحریک کے بارے میں باربرا کا خیال ہے کہ یہ مردوں کی دنیا ہے دنیا میں ان ہی کے بنائے ہوئے قانون چلتے ہیں۔ مردوں میں عورتوں کے خلاف تعصب کا

مادہ موجود ہے۔ خصوصاً تجارت اور ملازمت کے میدان میں یہ تعصب اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ عورت گھر میں رہے، بچوں کی پرورش کرے اور خاوند کا حکم بجا لائے تو مرد اس سے راضی ہے۔ جہاں اُس نے گھر کے باہر قدم رکھا، ملازمت اور تجارت میں دخل دیا، مرد کا تعصب بیدار ہو گیا۔ کیا ہندوستان اور کیا امریکہ اس تعصب میں سب برابر ہیں۔ باربرا ہانگ کانگ میں ایک امریکن بینک میں کام کرتی تھیں۔ بینک کے کارکنوں میں بھی یہی جذبہ کارفرما تھا۔

باربرا امریکہ پہنچ کر قانون کی تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ اُن کے باپ کی عمر ۵۷ سال ہے۔ اُنہوں نے حال ہی میں قانون کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی ہے۔ ہندوستان میں لوگ جلد بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان میں ۶۰ برس کا آدمی زندگی کا سفر پورا کر لیتا ہے۔ اُس کی اُمنگوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ وہ نہ صرف ملازمت سے ریٹائر ہو جاتا ہے بلکہ آرزوؤں اور اُمنگوں سے بھی کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ باربرا کے باپ کی ۵۷ سال کی عمر میں قانون کی تعلیم حاصل کرنا یہاں ایک اعجوبہ سمجھا جائے گا — لیکن امریکہ میں یہ ایک عام بات ہے کہ ایک لڑکی اور اس کی ماں ساتھ ساتھ ہائی اسکول پاس کرتے ہیں۔ اگر وقت نے کسی انسان کو تعلیم حاصل کرنے کی مہلت نہ دی تو وہ بعد میں اپنا ارمان پورا کر سکتا ہے۔ اس میں عمر کی قید نہیں۔ اس میں شرم اور جھجک کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ باربرا کے دادا اور دادی البتہ بوڑھے ہیں۔ دادا کی عمر ۸۲ سال ہے۔ دادا اور دادی الگ تھلگ رہتے ہیں۔ اس معاملے میں بھی امریکن تہذیب ہندوستان سے مختلف ہے۔

ہندوستان میں جوان بیٹوں پر بوڑھے والدین کا بوجھ اُٹھانا لازم ہے۔ امریکہ میں ان کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ باربرا کے دادا ایک گاؤں میں رہتے ہیں۔ اُن کی زندگی اپنے بچوں کی زندگی سے الگ ہے۔ وہ بڑھاپے میں آرام سے اور سکون سے رہنا چاہتے ہیں — بیٹوں، پوتوں اور پرپوتوں کے شور و غل سے دُور دونوں میاں بیوی اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔ اُن کا اپنا گھر ہے، اپنے شوق ہیں۔ وہ کتابیں پڑھتے ہیں، مچھلی کا شکار کھیلتے ہیں، گاؤں میں چہل قدمی کرتے ہیں۔ وہ کسی پر بوجھ بننا نہیں چاہتے نہ کسی کا بوجھ برداشت کرنا چاہتے ہیں۔ جو وقت اور روپیہ اُنہوں نے اپنی اولاد پر خرچ کیا ہے وہ اس کا معاوضہ طلب نہیں کرتے۔

امریکہ کے لوگ جنون کی حد تک آزادی کے پرستار ہیں۔ خاندان میں ماں باپ کی اجارہ داری تسلیم نہیں کی جاتی۔ لڑکا اور لڑکی جب بڑے ہو جائیں تو ماں باپ کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتے۔ باپ بیٹے کی زندگی میں دخل نہیں دیتا۔ باربرا اپنے والدین کی اکلوتی لڑکی ہیں۔ لیکن اُنہوں نے جوان ہوتے ہی ہانگ کانگ کا رُخ کیا اور وہاں ایک بینک میں ملازم ہو گئیں۔ ان کے باپ بڑی آسانی سے ان کی کفالت کر سکتے تھے، لیکن یہ امریکن معاشرت کے خلاف ہے۔

باربرا پروٹسٹنٹ عیسائی ہیں لیکن وہ تنگ نظر نہیں ہیں۔ اُنہیں بدھ مت پسند ہے۔ تھائی لینڈ کے قیام کے دوران اُنہیں اس مذہب کے مطالعے کا موقع ملا تھا — وہ آواگون کی قائل ہیں۔ اُن کے خیال میں تناسخ کا عقیدہ بہت سی اُلجھنوں کو حل کر دیتا ہے۔ دنیا میں امیر غریب کا فرق کیوں ہے؟ کچھ لوگوں کو بے محنت آرام و آسائش حاصل ہے۔ کچھ لوگ محنت کے باوجود نانِ شبینہ کو ترستے ہیں — ایسا کیوں ہوتا ہے؟ قدرت کی یہ ناانصافی سمجھ میں نہیں آتی۔ لیکن 'کرم' کے عقیدے سے یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ عیش و آرام میں زندگی گزارنے والا انسان اپنے پچھلے کرموں کا پھل بھوگ رہا ہے۔ یہی بات مصیبت زدہ انسان کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔

امریکنوں کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ وہ بہت کھاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ گزشتہ برسوں میں یہ بات سچ ہو، لیکن آج کل امریکن اپنی غذا میں بہت احتیاط برتتے ہیں۔ باربرا کا وزن صرف ۱۰۰ پونڈ ہے۔ چند سال پہلے ان کا وزن ۱۲۰ پونڈ تھا، لیکن اُنہوں نے رفتہ رفتہ اُسے کم کر لیا۔ اب وہ خود کو پہلے سے زیادہ تندرست و توانا محسوس کرتی ہیں۔ انہیں کھیلوں کا کافی شوق ہے۔ گالف اور برف پہ سکی انگ کرنا اُن کے محبوب کھیل ہیں۔ وہ ایک اچھی تیراک ہیں۔ اس کے علاوہ اُنہیں پارٹیوں میں جانا پسند ہے۔ موسیقی میں اُنہیں جاز پسند ہے۔ یہ بہت تیز آواز موسیقی ہوتی ہے — امریکہ کے نوجوان اس موسیقی کے شیدائی ہیں۔ باربرا کو مطالعہ کا بھی شوق ہے۔ وہ سوانح عمری، سفرنامے اور ناول شوق سے پڑھتی ہیں۔ اُنہیں سیاحت میں بھی دلچسپی ہے، لیکن سیاست سے ان کو کوئی لگاؤ نہیں۔

●●

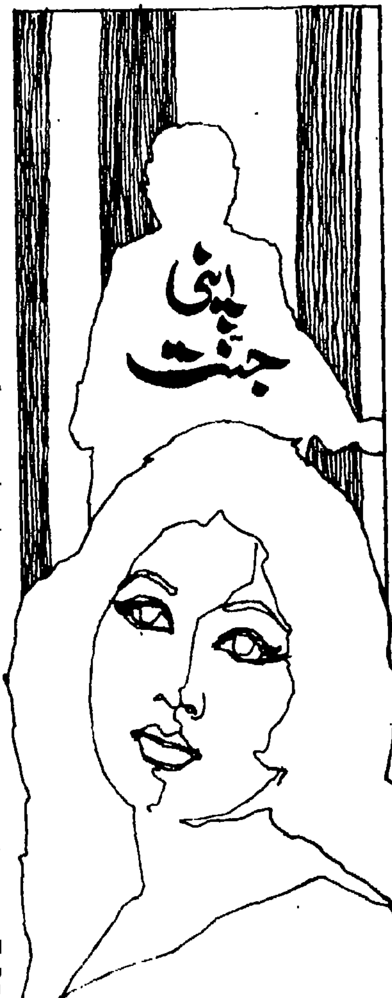


کل دنیا اسے گھورے

ہر ماں اور باپ کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اُن کا لاڈلا دنیا کی آنکھ کا تارا بنے ۔ صرف اُن کا ہی نہیں ، قوم کا ملک کا بھی نام روشن کرے ، دنیا کی ذمّہ داریوں کا بوجھ اُٹھائے ۔ یہ خواہش اپنی جگہ ٹھیک ہے مگر آپ نے اس سلسلہ میں کیا کچھ کیا ہے ۔ اس کی ابتدا پنگوڑے میں ہی کرنی چاہیے ۔ اپنے لاڈلے کو " ممتا " دیجئے یہ ننھے بچوں کا خاص ٹانک ہے جو ایک ماں کی طرح ان کی حفاظت کرتا ہے ۔ جسم میں کیلشیم کی کمی کو دور کر کے ہڈیوں کے ٹیڑھے پن کو روکتا ہے ننھے بے زبان بچوں کو قبض سے نجات دلاتا ہے ۔ نزلہ اور زکام میں بھی مفید ہے ۔ بچوں کو ہنستا اور خوش و خرّم رکھنا ہی " ممتا " کا کام ہے ۔ اپنے بچے سے پیار ہے تو اُسے " ممتا " ہی دیجئے اور دیکھئے وہ کتنی جلدی جلدی پروان چڑھتا ہے ۔

قیمت : پانچ روپے ——— چھوٹی شیشی : تین روپے

شمع لیباریٹریز ، لال کنواں ، دہلی



اظہار عثمانی

دروازے کی گھنٹی بہت دیر تک بجتی رہی۔

رات کے ایک بجے کا عمل ہوگا۔ زرینہ جاگ رہی تھی، لیکن گھنٹی کی آواز سننے کے باوجود وہ بستر سے نہیں اٹھی تھی۔ بوڑھا چوکی دار بہت بے چین تھا، مگر وہ مجبور تھا۔ زرینہ نے شام کو ہی اُسے دروازہ نہ کھولنے کی ہدایت کر دی تھی۔ اب اگر وہ دروازہ کھولتا تو صبح ضرور اُس کی چھٹی ہو جاتی۔ مالکن کے سامنے مالک کی ایک نہ چلتی تھی — یہ بات چوکی دار اچھی طرح جانتا تھا۔ زرینہ آج اشرف کو سبق سکھانا چاہتی تھی۔ رات کو کلب جانا اشرف کا معمول بن گیا تھا۔ وہ روزانہ ڈنر کے بعد کلب چلا جاتا اور رات کو بارہ ایک بجے اور کبھی دو دو بجے تک واپس آتا۔ رات کے اندھیرے میں زرینہ کو خوش نما اور خوب صورت کوٹھی اشرف کے بغیر بھوت بنگلہ معلوم ہوتی وہ کوٹھی کے سب ہی کمروں کو بند کرا دیتی اور بیڈ روم میں اپنی پھول سی بچی کے ساتھ خود بھی بند ہو جاتی۔ زرینہ کو ڈرا سہا دیکھ کر ایک سال کی معصوم بچی بھی دم ساد لیتی اور ماں کے سینے سے لپٹ جاتی۔ کتنی ہی بار اس بات پر ان دونوں کا جھگڑا بھی ہوا تھا۔ کتنی ہی بار اشرف نے کلب نہ جانے کے وعدے بھی کیے تھے، قسمیں بھی کھائی تھیں۔ لیکن جیسے ہی رات کے نو بجتے اس کی انگلیوں میں کلبلاہٹ شروع ہو جاتی۔ تاش کے پتوں کی سرسراہٹ سے اپنی طرف کھینچتی۔ وہ بے قابو ہو جاتا اور اپنا ہر وعدہ فراموش کر دیتا۔ اُس کی قسم رات جوان ہوتے ہوتے بوڑھی ہو کر دم توڑ دیتی۔ وہ سب کچھ بھول کر کلب چلا جاتا۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ اپنی بیوی اور بیٹی سے محبت نہ کرتا ہو۔ زرینہ بہت خوب صورت تھی۔ وہ اس پر جان چھڑکتا تھا۔ اور بیٹی کو تو وہ اپنی جان کا ٹکڑا سمجھتا تھا۔ لیکن کلب کا ماحول اس کی زندگی میں کچھ اس طرح رچ بس گیا تھا کہ اس کے لئے کلب سے فرار ناممکن سا ہو گیا تھا۔ کئی بار وہ زرینہ کو بھی کلب لے گیا تھا، لیکن زرینہ کبھی چند منٹ سے زیادہ وہاں نہ رُک سکی تھی۔ اُسے کلب کے ماحول میں عجیب گھٹن کا احساس ہوتا اور وہ بے چین سی ہو جاتی۔ اس وقت اشرف کو اپنے دوستوں کے سامنے شرمندگی محسوس ہوتی اور دونوں فوراً گھر واپس لوٹ آتے۔

اشرف اب برآمدے میں پڑی ہوئی آرام کرسی پر دراز سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ رات بہت سرد تھی۔ زرینہ رضائی میں لیٹی دوبارہ گھنٹی بجنے کا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن بہت دیر تک گھنٹی نہیں بجی۔ اچانک رضائی کی لطف انگیز گرمی نے اسے سردی کا احساس دلا دیا۔ اشرف باہر سردی میں کانپ رہا ہوگا۔ وہ تڑپ گئی اور فوراً بستر سے اٹھ گئی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دروازے کے پاس پہنچ گئی۔ قریب تھا کہ وہ دروازہ کھول دیتی، لیکن اس کا ہاتھ چٹخنی کے پاس جا کر رک گیا۔ اس کے جسم میں سختی اور تناؤ پیدا ہو گیا۔ اشرف کا رویہ اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ خوف اور دہشت کے وہ چند گھنٹے جو وہ اشرف کے بغیر گزارتی تھی، اس کی زندگی کے ناسور بن گئے تھے۔ اس درمیان اُسے کچھ ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ کسی خوف ناک جنگل میں ہی پھول سی بچی کے ساتھ کسی جھاڑی میں چھپی بیٹھی رہی ہو۔ رات کے سناٹے میں اُسے چوکی دار کی سیٹی کی آواز کتنی خوف ناک معلوم ہوتی تھی۔

آج وہ دروازہ نہیں کھولے گی۔ اس نے فیصلہ کیا۔ مگر پھر بھی وہ کواڑ سے لگی کھڑی رہی۔ وہ واپس اپنے کمرے میں نہیں گئی۔ اس کے لئے یہ ناممکن تھا کہ اشرف

سردی میں کانپتا رہے اور وہ نرم و گرم بستر میں لپٹی رہے۔ چند منٹ بعد ہی زرینہ سردی سے کانپنے لگی۔ وہ صرف سلیپنگ گاؤن پہنے ہوئے تھی۔ وہ تھرتھراتی رہی، کانپتی رہی لیکن اُس کے باوجود کواڑ سے لگی کھڑی رہی اس درمیان اشرف نے کئی سگریٹ پھونک دئے تھے۔ اُس نے بستر کو جسم سے اچھی طرح لپیٹ لیا تھا اور کالر کھڑے کرکے کان بھی بند کرلئے تھے۔ وہ سردی سے بالکل محفوظ تھا لیکن اُس کا غصہ بڑھتا جارہا تھا۔ اُس نے کئی بار سوچا کہ زور زور سے آوازیں دے اور دروازہ پیٹنا شروع کردے، لیکن پھر اسے خیال آیا کہ اُس کے پڑوسی کیا سوچیں گے تھوڑی دیر تک وہ خاموش بیٹھا رہا اور پھر سوچنے لگا کہ پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا۔ کتنی ہی باران میں شدید جھگڑا بھی ہوا تھا۔ اُس کے باوجود زرینہ گھنٹی کی آواز سنتے ہی دروازہ کھول دیتی تھی۔ وہ دونوں خاموشی سے بستر پر لیٹ جاتے تھے۔ آپس میں کوئی بات نہ کرتے، لیکن دوسری صبح تک سب کچھ معمول پر آجاتا تھا۔ اچانک اشرف کے ذہن میں کسی حادثے کے امکان نے سر اُٹھایا۔ اُسے خطرے کا احساس ہوا اور دوسرے ہی لمحے وہ سب کچھ بھول کر زور زور سے آوازیں دینے لگا اور دروازہ پیٹنے لگا۔ زرینہ گھبرا گئی اُس نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ ان چند لمحوں میں اشرف پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ اس کی سانس اس طرح تیز تیز چل رہی تھی جیسے وہ میلوں کسی ریگستان میں دوڑتا رہا ہو۔

"زرینہ!" وہ زور سے چلایا اور زرینہ سے لپٹ گیا۔

اس واقعہ کو ایک ہفتہ گذر گیا۔ اشرف اُس کے بعد کلب نہیں گیا۔ اُس کے دوست کلب نہ آنے کی وجہ اُس سے روز ہی پوچھتے۔ آفس کے بڑے صاحب نے بھی اُسے کلب آنے کی دعوت دی تھی۔ سول سرجن نے ٹیلی فون پر اُس سے اُس کی خیریت اُس لئے دریافت کی تھی کہ وہ ایک ہفتے سے کلب نہیں آیا تھا۔ ایس، ڈی، ایم اور ڈی، ایم صاحب کے ٹیلی فون بھی آچکے تھے۔ سب کو یہی شکایت تھی کہ اشرف کے بغیر کلب سُونا سُونا رہتا ہے۔ لیکن اشرف نے کلب نہ جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ وہ کلب سے بھاگ رہا تھا اور اُس کے دوست واپس اسے کلب میں کھینچ رہے تھے۔ وہ عجیب کشمکش میں مُبتلا تھا۔ شام سے ہی اُس کی طبیعت میں بوجھل پن آجاتا اور وہ کھویا کھویا سا رہتا۔ زرینہ سے بھی وہ کم ہی بات کرتا۔ وہ روزانہ ڈنر کے بعد کسی ناول میں کھو جاتا اور ناول پڑھتے پڑھتے سو جاتا۔ اسی طرح ایک ماہ گزر گیا۔

وہ اشرف کے لئے بے انتہا خوشی کا دن تھا۔

اشرف کا پروموشن ہو گیا تھا۔ وہ چھوٹے صاحب سے بڑا صاحب بن گیا۔ جس جگہ اُس کا تبادلہ ہوا تھا وہ شہر بہت چھوٹا تھا۔ اشرف کی خوشی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ نئی جگہ پہنچ کر اُسے دوستوں کے اصرار، تقاضوں اور طعنوں سے نجات مل جائے گی۔

اس چھوٹے سے شہر میں آئے ہوئے اشرف کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ وہ اپنے کام میں بے حد مصروف رہتا تھا۔ اُس نے پوری طرح اپنے ڈویژن کا معائنہ بھی نہ کیا تھا۔ لیکن اس مختصر سے عرصے میں ہی زرینہ گھبرا گئی تھی۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے انہیں یہاں آئے ہوئے برسہا برس گذر گئے ہوں۔ اس شہر میں دن بھر دھول بھری آندھیاں چلتیں اور شام سے ہی چاروں طرف اندھیرا چھا جاتا۔ یہاں نہ اچھے پکچر ہال تھے، نہ تفریحی مقامات نہ کوئی بڑا شاپنگ سینٹر۔ کبھی کبھی سڑک پر اُن کی کار جب بیل گاڑیوں اور رکشاؤں کے درمیان پھنس جاتی تو زرینہ جھنجھلا جاتی۔

"سکریٹری صاحب تو آپ کے اچھے دوست ہیں۔ آپ ان سے تبادلے کے لئے کہئے۔ وہ آپ کی بات کبھی نہ ٹالیں گے۔" ایک رات سونے سے پہلے زرینہ نے اشرف سے کہا۔

اشرف صرف مسکرا کر رہ گیا۔

زرینہ جھنجھلا گئی: "میں دیکھ رہی ہوں آپ یہاں آکر بہت خوش ہیں۔"

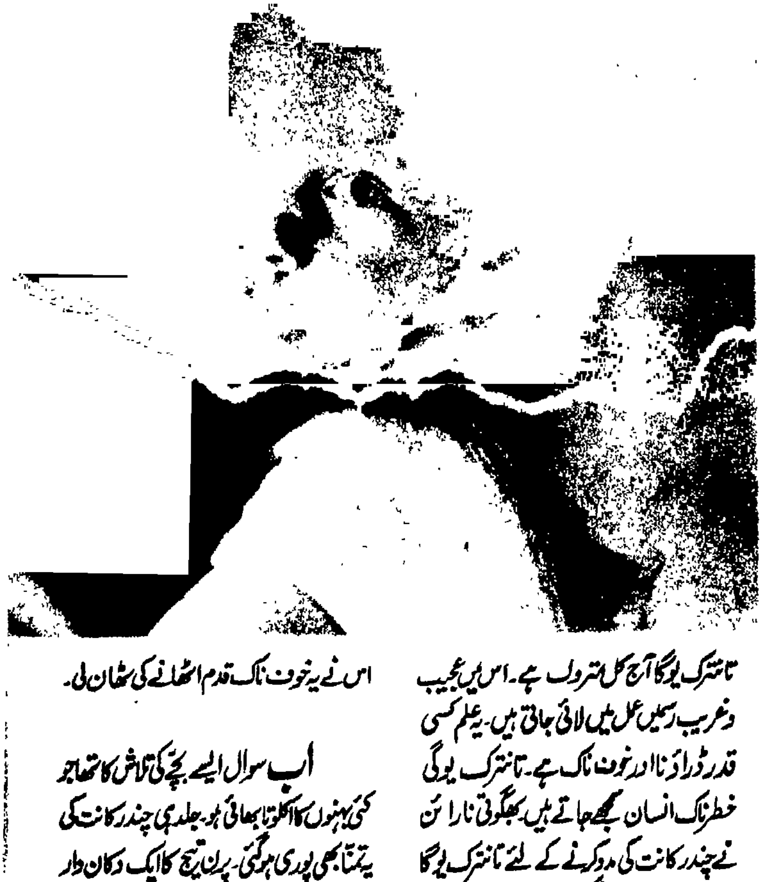
"ہاں زرینہ میں بہت خوش ہوں"

اشرف نے پاس لیٹی ہوئی بچی کے اوپر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "زرینہ میں اُس رات کو زندگی بھر نہیں بھول سکتا جس رات میرے ذہن میں کسی حادثے کے اندیشے نے سر اُبھارا تھا۔ میں تمہارے اور اپنی بیٹی کے بغیر ایک لمحے بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ زرینہ ابھی مجھے اپنے آپ پر قابو پالینے دو۔ زندگی بہت لمبی ہے۔ جلد ہی ہم پھر کسی بڑے شہر میں پہنچ جائیں گے۔" یہ تبادلہ تو میں نے خود اپنی مرضی سے اس چھوٹے شہر میں کرایا ہے۔" اشرف بہت جذباتی ہو گیا اور اُس نے بچی کو سینے سے لپٹا لیا۔

●●

اولاد کی خواہش نے قاتل بنادیا

ایم ناصر



سادہ لوح چندر کانت ڈیسائی

پرن تیج میں عرضی نویسی کا کام کرتا تھا۔ پرن تیج گجرات کے ضلع سابر کنٹھا میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ چندر کانت کی عمر ۵۵ سال ہے۔ اس کی شادی کو بیس سال گذر چکے ہیں۔ اس کے یہاں کوئی اولاد نہیں ہے۔ چندر کانت اور اس کی بیوی اولاد کے خواہش مند ہیں۔ ان بیس برسوں میں انہوں نے سینکڑوں نسخے آزمائے لیکن کوئی دوا کارگر نہ ہوئی۔ مجبور ہو کر انہوں نے اپنی محبّت نچھاور کرنے کے لئے دو تین کتّے پال لئے۔ لیکن انسان کا بدل جانور نہیں ہو سکتے۔ چندر کانت کی بیوی ادھیڑ عمر کی ہو رہی تھی۔ ادھیڑ عمر کی ہو جانے کے بعد عورت کے بچّہ پیدا نہیں ہوتا۔ چندر کانت کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ اس کی بیوی کے پاس وقت کم ہے۔ اس کے لئے بچّے کی خواہش جنون کی شکل اختیار کرتی جا رہی تھی۔

اب سے نو مہینے پہلے چندر کانت نے اولاد پانے کے لئے اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ وہ حکیموں اور ویدوں کے علاوہ پنڈتوں اور سیانوں کے پاس بھی گیا۔ وہ کسی ایسے صاحبِ کرامت بزرگ کی تلاش میں تھا جو اس کے گھر میں اولاد کا چراغ روشن کر دے۔ اس تلاش کے دوران اس کی ملاقات بھگوتی نارائن سے ہوئی۔ بھگوتی نارائن کالیکا مندر کا مجاور تھا۔ وہ تانترک یوگا جانتا تھا۔ تانترک یوگا ہزاروں سال پرانا علم ہے۔ موجودہ زمانے میں یوگا کی چار قسمیں ہیں۔ راج یوگا، کرم یوگا، بھگتی یوگا اور ہٹھ یوگا۔ تانترک یوگا ان سب سے مختلف ہے اس علم پر معدودے چند آدمیوں کا اجارہ ہے۔

تانترک یوگا آج کل کنٹرول ہے۔ اس میں عجیب وغریب رسمیں عمل میں لائی جاتی ہیں۔ یہ علم کسی قدر ڈراؤنا اور خوف ناک ہے۔ تانترک یوگی خطرناک انسان سمجھے جاتے ہیں۔ بھگوتی نارائن نے چندر کانت کی مدد کرنے کے لئے تانترک یوگا کا سہارا لیا۔ اس نے اگھور پنتھ سادھو کا حوالہ دیتے ہوئے چندر کانت کو بتایا کہ اگر وہ کسی ایسے بچّے کی قربانی دے دے جو کئی بہنوں کا اکیلا بھائی ہو تو اس کی بیوی کی کوکھ بھر سکتی ہے۔ اور اگر ایسے سات بچّے قربان کر دئے جائیں تو چندر کانت کے یہاں ایک بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ چندر کانت اولاد کی خواہش میں دیوانہ بن گیا تھا۔ اس نے یہ خوف ناک قدم اٹھانے کی ٹھان لی۔

اب سوال ایسے بچّے کی تلاش کا تھا جو کئی بہنوں کا اکلوتا بھائی ہو۔ جلد ہی چندر کانت کی یہ تمنّا بھی پوری ہو گئی۔ پرن تیج کا ایک دکان دار بدھی پرشاد سکھاڑیا سات بچّوں کا باپ تھا۔ ان میں چھ لڑکیاں تھیں اور ایک لڑکا۔ لڑکے کا نام ٹینو تھا۔ ٹینو باپ کا چہیتا تھا۔ اپنی بہنوں کی آنکھ کا تارا تھا۔ ٹینو کی عمر چار سال تھی۔ چندر کانت نے اپنی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ٹینو کا انتخاب کیا۔ اس کام میں ہوشیاری کی ضرورت تھی۔ ٹینو بدھی پرشاد کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ اسے اپنی

نظروں سے اوجھل ہی نہیں ہونے دیتا تھا چندرکانت نے اس مشکل کا حل بھی دریافت کرلیا۔ اس نے ایک نوجوان صبّا میاں کی خدمات حاصل کیں ـــ صبّا میاں ۲۱ سالہ نوجوان ہے ۔ وہ اس زمانے میں بے کار تھا۔ چندرکانت نے ٹینو کو ورغلانے کے لئے اس کی خدمات حاصل کرلیں۔ ٹینو اکثر اپنے باپ کے ساتھ دکان پر بیٹھتا تھا۔ صبّا میاں نے بدھی پرشاد کی دکان پر آنا جانا شروع کردیا۔ اس نے ننھے ٹینو سے راہ ورسم پیدا کرلی۔ بدھی پرشاد بھی خوش تھا کہ صبّا میاں اس کے بچّے کا دل بہلا رہا ہے ۔ اسے کیا خبر تھی کہ یہ نوجوان اس کے بچّے کے لئے موت کا فرشتہ ثابت ہوگا۔

ٹینو بہت جلد صبّا میاں سے مانوس ہوگیا۔ ۲۷ اگست کی دوپہر کو دونوں آخری بار ساتھ دیکھے گئے۔ اس کے بعد ٹینو غائب ہوگیا جب شام ہوگئی تو بدھی پرشاد فکرمند ہوگیا کہ ٹینو اتنی دیر تک کہاں رہ سکتا ہے؟ اس نے بچّے کی تلاش شروع کردی۔ پرن تیج چھوٹا سا قصبہ ہے۔ اس قصبے میں ایک بچّے کی تلاش دشوار نہیں تھی۔ لیکن ٹینو کا کہیں پتہ نہ چلا۔ بدھی پرشاد حیران تھا کہ آخر ٹینو کو آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی۔ اس نے تھک ہار کر پولیس کو اطلاع دی۔ پولیس نے فوراً چھان بین شروع کردی۔ پولیس کو لوگوں سے پوچھ گچھ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ ٹینو عموماً صبّا میاں کے ساتھ کھیلتا تھا۔ پولیس نے صبّا میاں کو حراست میں لے لیا۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ٹینو کا باپ ہی صبّا میاں کو پولیس کے چنگل سے چھڑانے کے لئے پہنچ گیا۔ اس نے تھانے دار کو بتایا کہ وہ ناحق صبّا میاں پر شک کر رہا ہے وہ تو اس کے بچّے کا دوست ہے۔ وہ اسے کیسے اغوا کرسکتا ہے! دو روز اس پریشانی میں گذر گئے، ٹینو کا کہیں پتہ نہ چلا۔ ۲۹ اگست کو اس خوف ناک ڈرامے کا نتیجہ سامنے آگیا ـــ قصبے سے تین کیلو میٹر دور ایک کھیت میں ٹینو کی لاش مل گئی۔ کسی نے اس معصوم بچّے کو گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا۔ ٹینو کی گم شدگی قتل کے کیس میں بدل گئی۔ پولیس نے پھر صبّا میاں سے پوچھ گچھ شروع کی اور اس تفتیش کے دوران اس خوف ناک واقعہ کی تصویر سامنے آگئی۔

۲۷ اگست کی دوپہر کو صبّا میاں ٹینو کو ورغلا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ چندرکانت ٹلیسائی اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے بچّے کو قربانی کے لئے تیار کرنا شروع کیا۔ پہلے ٹینو کا سر مونڈا گیا۔ سر مونڈنے کے دوران چوٹی کے بال چھوڑ دئے گئے۔ پھر گرم لوہے سے ٹینو کے جسم کے مختلف اعضا داغے گئے۔ اس کے بعد اس کی گردن کے گرد ایک ربن لپیٹا گیا۔ پھر اس ربن سے گلا گھونٹ دیا گیا اور اس کی لاش کو قریبی کھیت میں پھینک دیا گیا۔

۲۸ اگست کو راکھی کا تیوہار تھا۔ ٹینو کی بہنیں اس دن اپنے چھوٹے بھائی کا انتظار کر رہی تھیں۔ بدھی پرشاد بھی اس تیوہار کی تیاریوں میں مشغول تھا۔ اس دن بہنیں اپنے بھائی کو راکھی پہنانے والی تھیں، اس دن وہ خدا سے اپنے بھائی کی خوش حالی اور لمبی عمر کا بردان مانگنے والی تھیں۔ لیکن ان کی آرزو ان کے دل میں رہ گئی۔ انہیں کیا خبر تھی کہ وہ جس بھائی کے لئے خدا سے لمبی عمر کی دعا مانگ رہی ہیں وہ پہلے ہی موت کی نیند سو چکا ہے۔

پولیس نے چندرکانت ٹلیسائی، صبّا میاں اور بھگوتی نارائن کو اقدام قتل کے جرم میں گرفتار کرلیا۔ بھگوتی نارائن کا بیان ہے :

"میں نے چندرکانت کو تانترک یوگا کے متعلق ضرور بتایا تھا، لیکن میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ چندرکانت اس نسخہ کو عملی جامہ پہنانے لگا۔ چندرکانت اولاد کے لئے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس بارے میں اگھوری پنتھ سادھوؤں نے جو کچھ لکھا تھا میں نے اسے بتادیا۔ میں نے اسے کسی بچّے کے قتل کرنے کے لئے نہیں اکسایا۔"

قانون میں قتل کی ترغیب دینا قتل کرنے کے مترادف ہے۔ اس جرم کی بھی وہی سزا ہے جو قتل کی ہے۔ بھگوتی نارائن پر قتل کی ترغیب دینے کا الزام ہے۔

چندرکانت کی بیوی سے پوچھ گچھ کی گئی تو اس نے پورے واقعے سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس نے کہا "مجھے اس بات کی خبر نہیں کہ کب چندرکانت نے یہ اسکیم بنائی اور اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس نے کیا قدم اٹھائے۔ مجھے اولاد کی خواہش ضرور ہے لیکن میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ چندرکانت اولاد کے لئے کسی بچّے کا خون بھی کرسکتا ہے۔"

بھگوتی نارائن نے پولیس کو بتایا کہ چندرکانت ۲۷ اگست کی رات کو گیارہ بجے کالیکا مندر پہنچا تھا۔ وہاں اس نے دیوی کی پوجا کی تھی۔ رات کے پچھلے پہر تقریباً چار بجے وہ پھر مندر پہنچا تھا وہ تنہا تھا۔ پجاری کا خیال ہے کہ قتل کی واردات اس پانچ گھنٹے کے وقفے میں ہی عمل میں آئی ہوگی۔

اس واقعے سے پرن تیج کے باشندوں میں غم و غصّہ کی لہر دوڑ گئی۔ قصبے کی ساری دکانیں بند رہیں۔ ٹینو کی چتا کے پاس دس ہزار آدمیوں کا ہجوم اکٹھا ہوگیا۔ ہجوم مجرموں کے خلاف نعرے لگا رہا تھا حالات اتنے مخدوش ہوگئے کہ حکومت کو امن قائم رکھنے کے لئے اسپیشل پولیس کا سہارا لینا پڑا۔

□□



ملاقات

ایم کمال

انسان کی زندگی میں بارہا ایسا ہوتا ہے کہ وہ گھنٹوں اپنے عزیزوں اور دوستوں کی محفل میں گفتگو کرتا ہے، لیکن اُسے تکان محسوس نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس بارہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد ہی تھک جاتا ہے۔ اس گفتگو کے دوران اُس نے بولنے والے کا رول ادا کیا ہے یا سننے والے کا، اُس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایک جگہ ہم تبادلۂ خیالات کے بعد اپنے آپ کو تازہ دم محسوس کرتے ہیں اور دوسری جگہ تکان سے نڈھال ہو جاتے ہیں۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟

جب ہم کسی ایسے عزیز یا دوست سے ملتے ہیں جس سے ہم بے تکلف ہوں اور جس سے اپنے دل کی بات بے کھٹکے کہہ سکیں تو ہم بولتے بولتے نہیں تھکتے۔ اگر وہ دوست بھی آپ سے اتنا ہی بے تکلّف ہے تو آپ اُس کی بات سنتے سنتے نہیں تھکتے۔ تکان یا بوریت کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب ہم چہرے پر تصنع کی نقاب چڑھا کر ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ اگر کوئی عزیز یا دوست جسے ہم پسند نہیں کرتے ہمارے گھر آتا ہے تو دنیا داری سے مجبور ہو کر ہم خندہ پیشانی سے اُس کا استقبال کرتے ہیں ہنس ہنس کر اُس سے باتیں کرتے ہیں، بناوٹ کی نقاب ہمارے چہرے پر چڑھ جاتی ہے۔ ہم اس کی کامیابی پر اس کو مبارک باد دیتے ہیں، اُس کے غم میں ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں، لیکن ہمارا دل ہماری زبان کا ساتھ نہیں دیتا۔ کچھ دیر بعد جب یہ محفل برخواست ہوتی ہے تو اچانک ہمیں تکان کا احساس ہوتا ہے۔ کبھی سر میں درد شروع ہو جاتا ہے، اور کبھی جمائیاں آنے لگتی ہیں۔ دراصل ہم اپنے دوست سے ملے تو ہیں لیکن ہماری اُس سے ملاقات نہیں ہوئی۔

ہم روزانہ گھر میں، بازار میں، دفتر میں دوستوں کی محفل میں لوگوں سے ملتے ہیں، لیکن شاذ و نادر ہی اُن سے ہماری ملاقات ہوتی ہے

ملاقات کے لئے جسمانی قرب ضروری نہیں

خاوند دفتر سے آیا۔ اُس نے چائے پی اور اخبار لے کر بے تعلق سا بیٹھ گیا۔ بیوی نے اُسے دن بھر کی رپورٹ دینا شروع کی۔ خاوند بظاہر سُن رہا ہے، لیکن اُس کا دل کہیں اور ہے۔ جلد ہی وہ

جمائیاں لینا شروع کر دیتا ہے۔ اُس کی تھکان میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ خاوند اور بیوی کئی سال سے ایک گھر میں رہتے ہیں، ایک چھت کے نیچے سوتے ہیں، لیکن جسمانی قرب کے باوجود وہ ایک دوسرے سے میل نہیں پاتے۔ دونوں اپنے اپنے خول میں چھپے بیٹھے ہیں۔

ملاقات کے لئے وقت کی کوئی اہمیت نہیں، ہم خیالی بھی ملاقات کے لئے ضروری نہیں انگلیوں کا ایک لمس ہی کافی ہے۔ ہم افسانوں میں پڑھتے ہیں کہ محفل میں مرد نے پانی کا گلاس مانگا۔ عورت گلاس بھر کر لائی اور مرد کو پیش کیا گلاس لیتے وقت دونوں کی انگلیاں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں۔ اس حادثے سے انگلیوں میں بجلی کا کرنٹ دوڑ گیا۔ اس حادثے کا وقفہ ایک سیکنڈ سے کم تھا، لیکن ملاقات ہوگئی۔ ایک بوڑھی عورت سے کسی نے سوال کیا کہ تمہاری زندگی کا سب سے خوش گوار حادثہ کب اور کیسے پیش آیا۔ اُس عورت نے جواب دیا: "میں جوانی میں بس سے سفر کرتی تھی۔ ایک دفعہ ایک نوجوان کنڈکٹر میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اُس مسکراہٹ میں ہزاروں قصیدے پوشیدہ تھے۔ یہ میرے حسن کی خاموش تعریف تھی پگلی بھولی یہ ملاقات میں آج تک نہیں بھول سکی۔ چالیس سال سے یہ خوش گوار حادثہ میرے دل کو گرما رہا ہے۔ اُس کی تپش آج تک کم نہیں ہوئی۔"

جب دو انسان ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو اُن کے درمیان ایک غیر مرئی شے پیدا ہوتی ہے۔ جو اُن دونوں کی ملاقات کراتی ہے ہم اُس شے کو محبت کا نام بھی دے سکتے ہیں اسے جسمانی کشش بھی کہہ سکتے ہیں، اس کو رُوح یا آتما کے مائل ہونے کا نام بھی دیا جا سکتا ہے ہم اُسے خواہ کسی نام سے پکاریں ملاقات کے وقت اُس کا موجود ہونا ضروری ہے۔ یہ انسانی ہم دردی سے مختلف ہے۔ ہم دردی بعض اوقات مضر ثابت ہوتی ہے۔ لوگ ہم دردی کو قبول کر لیتے ہیں، لیکن ہم دردی جتانے والے کو پسند نہیں کرتے ہم دردی حوصلہ شکن ثابت ہوتی ہے۔ یہ ہم خیالی بھی نہیں ہے۔ بلاشبہ ہم خیالی انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتی ہے، لیکن یہ ملاقات کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔ ملاقات ہجوم میں نہیں ہو سکتی۔ دو تین یا زیادہ سے زیادہ چار آدمی ہی صحیح معنوں میں ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں۔ ملاقات کے دوران گفتگو بھی ضروری نہیں، بلکہ خاموشی میں ایک دوسرے کی موجودگی کو زیادہ محسوس کیا جاتا ہے۔

جب ہم کسی سے ملتے ہیں تو اُس کو اپنا نقطۂ نظر سمجھاتے ہیں۔ ہمیں اکثر اس کام میں مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اُس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہم اپنے دل میں خود اپنے نقطۂ نظر سے مطمئن نہیں ہوتے۔ ہمارا نظریہ واضح نہیں ہوتا ہم اندیشے میں مبتلا ہوتے ہیں۔ گفتگو میں دشواری اسی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اگر ہمارا نظریہ بالکل صاف ہے، اگر ہمارے ذہن میں اس کے متعلق کوئی شبہ نہیں تو اکثر دوسرے کو باور کرانے کی نوبت بھی نہیں آتی۔ ہمارا اعتماد غیر مرئی طور پر ہماری رہ نمائی کرتا ہے اور دوسرا فریق ہمارے اظہار کے بغیر ہی ہمارا نقطۂ نظر سمجھ جاتا ہے۔

اگر ہم کسی کو اپنا شریکِ راز نہیں بنانا چاہتے تو ملاقات کا امکان کم ہو جاتا ہے میاں بیوی کے جھگڑوں میں یہی اختلاف کار فرما ہوتا ہے۔ بیوی چاہتی ہے کہ شوہر اُسے سب کچھ بتا دے اُس کی پچھلی زندگی کیسے گذری؟ وہ کل رات کو دیر سے کیوں آیا؟ وہ دوستوں سے کیا باتیں کرتا ہے؟ وہ یہ ساری باتیں جاننا چاہتی ہے عورت کی فطرت ہی کچھ ایسی ہے۔ وہ باہمی تعلقات میں راز داری پسند نہیں کرتی۔ اُسے راز جاننے اور اس کو مشتہر کرنے میں لطف آتا ہے عورتیں اِدھر کی اُدھر کرنے میں ماہر ہوتی ہیں وہ افواہ پھیلانے میں سرگرمی سے حصّہ لیتی ہیں۔ یہ ملاقات کا منفی پہلو ہے۔ عورتیں جلد ہی گھل مل جانا پسند کرتی ہیں۔ مرد ملاقات میں آہستہ روی سے کام لیتا ہے۔ وہ عورت کے اس رُجحان سے چڑ جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ عورت اُسے بے وقوف بنا رہی ہے۔ وہ اس کا شکار بننا نہیں چاہتا۔ بعض اوقات عورت بھی ان حالات کا شکار ہو جاتی ہے۔ مرد اُس سے کوئی راز اگلوانا چاہے اور عورت اس کے لئے تیار نہ ہو تو یہاں بھی ملاقات کا امکان کم ہو جاتا ہے۔

ملاقات کی راہ میں رکاوٹیں

کون کون سی ہیں؟ پہلی رکاوٹ تو یہی ہے کہ دو مختلف انسانوں کے شعور کی سطح مختلف ہوتی ہے۔ یہاں اگر ہم دو انسانوں کی بجائے مرد اور عورت کہیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ مرد اور عورت کے شعور کی سطح میں قدرتی طور پر فرق ہوتا ہے۔ زندگی مرد کے لئے مختلف ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک وقت میں زندگی کا ایک ٹکڑا اُس کی پوری توجہ کا محتاج ہوتا ہے، باقی ٹکڑوں سے وہ بے اعتنائی برتتا ہے۔ ایک تاجر کو روپیہ کمانے کے سوا کوئی کام نہیں ہوتا۔ ایک سائنس داں اپنی لیبارٹری میں کام کرتا ہے۔ اُسے نہ کھانے کا ہوش رہتا ہے اور نہ بیوی بچوں کا۔ ایک مصنف یا شاعر راتوں

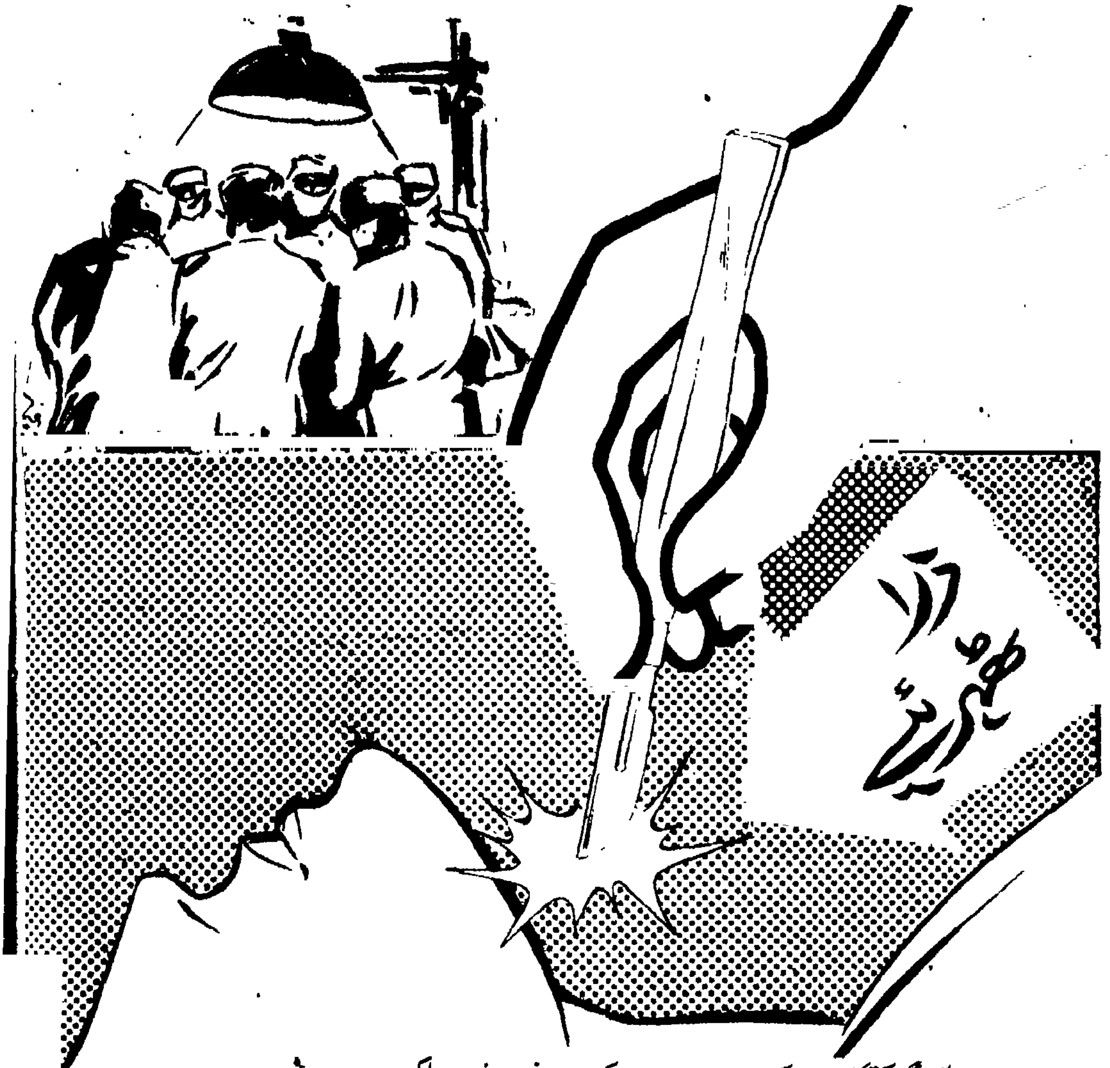
وکا مذسیاہ کرتا ہے۔ لکھنا ہی اُس کی توجہ کا مرکز ہے، زندگی کی باقی ضروریات اُس کی توجہ کے قابل ہیں۔ توجہ کی یہ مرکزیت مرد کے کردار کا اہم حصہ ہے ، کے برعکس عورت کے شعور کی سطح تمام دنیا کا اطہ کرتی ہے۔ عورت کے لئے زندگی مختلف ٹکڑوں میں بٹی ہوئی نہیں ہے۔ زندگی کا ہر پہلو اس کی توجہ کا محتاج ہے۔ اسی لئے اس میں رحم اور محبت کے جذبات مرد کے مقابلے میں زیادہ ہوتے ہیں۔ اُس کی پوری انسانی برادری سے ہمدردی ہوتی ہے۔ مرد کے لئے انسان سیاسی اور مذہبی جماعتوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ عورت کے لئے ہر انسان ایک انسان ہے۔ مرد بھاپ کو دیکھ کر اُس سے دخانی انجن بنانے کی بات سوچتا ہے، عورت اسی بھاپ کو دیکھ کر اُس میں آلو پکانے کی بات سوچتی ہے۔ مرد چاند کو دیکھ کر اُس کی سطح پر پہنچنے کا پروگرام بناتا ہے، عورت اُس کی گھنٹوں روشنی سے لطف اندوز ہوتی ہے رد مشین بناتا ہے۔ عورت ان مشینوں کی گڑگڑاہٹ کو ناپسند کرتی ہے، لیکن مشین سے بنا ہوا کپڑا شوق سے پہنتی ہے۔ مرد وقتی طور پر عورت کے شعور کی سطح پر اُتر سکتا ہے۔ اس وقت اُس کے دل میں انسان کی محبت سما جاتی ہے۔ دنیا اُس کے لئے ایک اکائی بن جاتی ہے۔ ایسے میں مرد شاعری کرتا ہے، تصویریں بناتا ہے۔ جب مرد عشق میں گرفتار ہوتا ہے تو اُس کا شعور عورت کے شعور کی سطح پر آجاتا ہے۔ محبت میں اُس کی توجہ کی مرکزیت ختم ہو جاتی ہے اور اُس کی کہانی داد جہاں معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح عورت جب تجارت کرتی ہے، سائنس کی تحقیقات کرتی ہے، مقالے لکھتی ہے تو وہ مرد کے شعور کی سطح پر پہنچ جاتی ہے۔ اُس کی توجہ زندگی کے ایک حصے پر مرکوز ہو جاتی ہے۔

بدقسمتی سے مرد اور عورت کے شعور کی سطح کا یہی فرق ان میں ملاقات نہیں ہونے دیتا۔ جب ہم مرکزیت کی سطح پر کھڑے ہوں تو ہمیں دوسرے سطح پر کھڑا ہوا انسان بے وقوف نظر آتا ہے۔ ہمیں وہ اتنا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو اس کی بات سننا بھی گوارا نہیں ہوتا۔ شاعری تاجر کے پلے نہیں پڑتی۔ سائنس داں کو گھر کا حساب کتاب فضول معلوم ہوتا ہے۔ سیاست داں مصوری کو تضیعِ اوقات سمجھتا ہے۔ جب مرد گھر پہنچ کر بیوی کو کاروبار کی باتیں سناتا ہے تو وہ بور ہو جاتی ہے۔ بیوی جب شوہر کو پڑوسن کی بدسلوکی کی بات سناتی ہے تو وہ بے اعتنائی کا اظہار کرتا ہے۔ دونوں اپنی اپنی سطح پر کھڑے ہیں۔ اُن کی ملاقات نہیں ہو سکتی۔ اس میں مصلحت سے کام نہیں چلتا۔ بیوی مصلحت سے کام لے کر شوہر کی دفتر کی رپورٹ میں دلچسپی دکھا سکتی ہے اس طرح شوہر بھی مصلحتاً بیوی سے ہنڈیا جل جانے کی داستان سن سکتا ہے، لیکن بات نہیں بنتی۔ جب تک دل اور دماغ یک جا نہ ہوں، ملاقات کا امکان کم ہی ہوتا ہے۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان میں شعور کی دونوں سطحیں خلط ملط ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ایک فقیر ہمارے دروازے پر صدا لگاتا ہے۔ ہمارے دل میں رسّہ کشی شروع ہو جاتی ہے۔ ایک طرف دل کہتا ہے: بے چارہ غریب ہے۔ اُس کی مدد کرنا لازم ہے۔ دوسری طرف دماغ کہتا ہے: بھیک مانگنا جرم ہے۔ ہمیں اس کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیے۔ پہلی آواز کہتی ہے: فقیر کو جھڑکنا اچھا نہیں۔ دوسری آواز کہتی ہے: یہ فقیر نہیں، مسٹنڈا ہے، مفت خورا ہے اس کو دروازے میں نہ گھسنے دو۔ آخر اس رسّہ کشی کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ ہم دونوں آوازوں میں سمجھوتا کرا دیتے ہیں۔ ہم فقیر کو کچھ نہیں دیتے، لیکن اُس سے نرمی سے کہہ دیتے ہیں: "بابا معاف کرو۔" اُس کے برعکس عورت جب کسی خاک نشین فقیر کو دیکھتی ہے تو اُس کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے شعور میں کوئی رسّہ کشی نہیں ہوتی۔ وہ فوراً ہی فقیر کی جھولی میں کچھ نہ کچھ ڈال دیتی ہے۔

توجہ کی مرکزیت بالغ مردوں کا شیوہ ہے بچے اس سے محروم ہوتے ہیں۔ وہ زندگی کے تمام شعبوں میں دلچسپی لینا چاہتے ہیں۔ انہیں اس بات کا شعور نہیں ہوتا کہ زندگی مختلف حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ سماج اُن کے اس حسین تصور کو تباہ کر دیتا ہے۔ انہیں اس بات کی تعلیم دی جاتی ہے کہ انہیں زندگی کے کسی ایک شعبے میں ترقی کرنا ہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب انسان اپنی توجہ زندگی کے دوسرے شعبوں سے ہٹا لے۔ انجام کار وہ اس کوشش میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اقتدار کے بھوکے لیڈر، دولت کے پجاری تاجر، سب اسی شعور کی دین ہیں۔ اسکول اور کالج اس معاملے میں سماج کی مدد کرتے ہیں۔ یہاں بھی لڑکوں کو کسی نہ کسی طرح اچھے نمبروں سے پاس ہونے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ ان کا احساس کچل دیا جاتا ہے۔

ہر ملاقات ایک معجزہ کی مانند ہے۔ اس کی تشریح نہیں کی جا سکتی اور نہ یہ کسی پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق عمل میں آتی ہے لیکن زندگی میں ایسے لمحات ضرور آتے ہیں جب ہم ملاقات کی لذت سے آشنا ہوتے ہیں۔



کیا آپ گلے کی تکلیفوں میں اکثر مبتلا رہتے ہیں اور اس کی وجہ سے سخت پریشان ہیں، لیکن یہ نہ سمجھئے کہ ایسی پریشان کن بیماری سے گلا کاٹ دینے سے ہی چھٹکارہ مِل سکتا ہے۔ ذرا ٹھہریئے! خالص دیسی ادویات سے تیار کیا ہوا "ٹونسیلیکس" ایک بار، صرف ایک بار استعمال کرکے تو دیکھئے، پھر آپ کو گلے کے غدود بڑھ جانے، گلے کی سرسراہٹ، خراش، گلے کے ورم، زخم اور دوسرے تمام امراض کی شکایت نہیں رہے گی۔ اگر آپ کے علم میں کوئی ایسا مریض ہو جس کے گلے کے غدود (ٹانسلائٹس) کا آپریشن ہونا ہے تو اسے اِس دوا کے بارے میں ضرور بتائیے گا کیوں کہ پھر اسے آپریشن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ چھوٹے بچے جو کھٹی میٹھی چیزیں کھا کر گلا خراب کر لیتے ہیں ان کے لئے بھی یہ بہت کام کی دوا ہے، ہر گھر میں اس کا رہنا بہت ہی ضروری ہے۔ قیمت فی شیشی: ۵ روپے

شمع (یونانی اینڈ آیورویدک) لیباریٹریز، لال کنواں، دہلی ۶



کیا آپ ایک منصف مزاج ماں ہیں؟

شہناز عشرت امیر

اگر ہم اچانک کسی ماں سے یہ سوال کریں کہ کیا آپ ایک منصف مزاج ماں ہیں تو وہ انتہائی غصّہ اور حیرت کے ساتھ یہی جواب دیں گی: "جی ہاں، کیوں نہیں! ماں تو اپنے تمام بچّوں کو ایک سا ہی پیار دیتی ہے۔" یہ حقیقت بھی ہے کہ منصف مزاج ماں نہ ہونے کا الزام تمام مادَر پر عائد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ماں کے تمام بچّے خود اُس کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں اور اُسے وہ تمام بچّے بغیر کسی امتیاز کے عزیز ہوتے ہیں۔ لیکن اُس کے ساتھ یہ بھی مشاہدے میں آیا ہے کہ بعض مائیں اپنے ہی بچّوں میں سے کسی ایک کے ساتھ خصوصی امتیاز برتتی ہیں اور کسی ایک بچّے کے ساتھ اُن کا پیار حد سے زیادہ ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مائیں یہ سب کچھ اَن جانے میں کرتی ہیں، کبھی اُن سے اُن کے جانب دارانہ رویّہ کے بارے میں پوچھئے تو وہ ہنس کر کہتی ہیں: "ہاں بھئی میرے بچّے تو چار ہیں، لیکن جو محبت اور پیار مجھے اپنے بڑے بیٹے سے ہے، وہ کسی سے نہیں۔" ایسا کہتے وقت وہ بھول جاتی ہیں کہ باقی بچّوں پر اُس بات کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ اکثر بچّے ماں کی اس ناانصافی کو شدّت سے محسوس کرتے ہیں اور برداشت نہیں کر پاتے۔ ایسی صورت میں بچّوں کے چھوٹے سے ذہن میں ماں کی طرف سے شبہ بھرے خیالات جنم لیتے ہیں۔

اگر ہم جائزہ لیں کہ مائیں اس غیر منصفانہ رویّہ اور جذبے میں کیوں اور کس طرح مبتلا ہوتی ہیں تو یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ مائیں یہ سب کچھ جان بوجھ کر نہیں کرتیں، بلکہ اَن جانے میں ایسا ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دو بچے ہیں۔ اتّفاق سے ایک خوبصورت ہے اور دوسرا بدصورت، تو دیکھا گیا ہے کہ خوب صورت بچے سے ماں باپ کا لگاؤ زیادہ ہوتا ہے۔ یا فرض کیجئے ایک لڑکا ہے اور ایک لڑکی، تو والدین لڑکے کو زیادہ چاہتے ہیں۔ خوب صورت بچے کے ناز نخرے اُٹھائے جاتے ہیں، اُس کی دیکھ بھال کی جاتی ہے، آنے جانے والے بھی بلا سوچے سمجھے اُس کی ہی تعریف کرتے ہیں، اس کو ہی گود میں لے کر پیار کرتے ہیں۔ خوب صورت بچے سے بے انتہا پیار کا یہ مظاہرہ بدصورت بچے کے ذہن پر بہت بُرا اثر ڈالتا ہے۔ پھر بات بات پر اُس کو ڈانٹنا، یا اُس کی بدصورتی کا رونا رونا بچے کو بُری طرح احساسِ کمتری کا شکار بنا دیتا ہے۔ اُس کا دل ٹوٹ جاتا ہے اور وہ احساسِ محرومی کا شکار بھی ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو تنہا اور غیر محفوظ تصوّر کرنے لگتا ہے، اپنے خوب صورت بھائی کے لئے اُس کے دل میں انتقامی جذبہ پیدا ہونے لگتا ہے۔ دھیرے دھیرے وہ اُس سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ وہ خود اعتمادی سے

محروم ہوتا چلا جاتا ہے اور اس طرح جب وہ بڑا ہوتا ہے تو یہ تمام کمزوریاں اُس کی شخصیت کا اہم جزو بن کر رہ جاتی ہیں۔

ایک ماں کے لئے یہ بات کسی طرح مناسب نہیں کہ وہ جسمانی نقص یا کمی کے باعث بچوں میں امتیازی سلوک کرے۔ کچھ ماہرینِ نفسیات کا کہنا ہے کہ پہلے بچے سے والدین کو قدرتی طور پر زیادہ لگاؤ اور پیار ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بات دُرست ہو لیکن والدین خصوصاً ماں کو اس بات کا مظاہرہ تمام بچوں کے سامنے نہیں کرنا چاہئے۔ اگر بچے کا اعتبار اپنے والدین پر سے اُٹھ گیا تو شاید آگے وہ دنیا میں کسی پر بھی اعتبار نہیں کر سکے گا۔ یہ بات بھی غلط ہے کہ بڑے بچوں کو تو بات بات پر ڈانٹ دیا جائے اور چھوٹے بچوں کو سر پر چڑھا لیا جائے۔ بڑا بچہ اگر کسی چیز کے لئے ضد کرتا ہے تو اُسے یہ کہہ کر ڈانٹ دیا جاتا ہے کہ تم بڑے ہو اور چھوٹا بچہ اگر نامناسب ضد بھی کرتا ہے تو اُسے پورا کر دیا جاتا ہے۔ یہ سب باتیں غلط ہیں اور بچوں کی ذہنی اور صحت مند نشو و نما کی راہ میں زبردست رکاوٹ بن جاتی ہیں۔

اس بات کا خاص دھیان رکھنے کی ضرورت ہے کہ اگر کسی بات کے لئے بڑے بچوں کو منع کیا گیا ہے تو وہ کام چھوٹوں کو بھی نہ کرنے دیا جائے۔ اسی طرح اگر آپ بچوں کے ساتھ بازار جاتی ہیں اور بڑے بچے کی پسند کی چیز آپ نہیں خریدتیں، تو چھوٹے بچے کی پسند کی چیز بھی نہ خریدئے۔

بہت سے والدین اپنے بیٹوں کو تو اعلیٰ تعلیم دلانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن لڑکیوں کو ہائی اسکول کے بعد گھر میں بٹھا دیتے ہیں اس طرح کے خیالات آج کل کے زمانہ میں احمقانہ اور فرسودہ ہیں۔ آج لڑکیاں زندگی کے ہر شعبے میں لڑکوں کے شانہ بہ شانہ چل رہی ہیں۔ لیکن بعض لوگ آج بھی اس معاملے میں لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں کچھ گھرانوں میں اگر باپ روشن خیال ہے اور وہ اپنی لڑکی کو اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتا ہے تو مائیں آڑے آ جاتی ہیں۔ یہ روش ٹھیک نہیں۔

ایک منصف مزاج ماں کا فرض ہے کہ وہ بچوں میں کبھی امتیاز نہ برتے۔ اور اگر آپ نے ایک منصف مزاج ماں کا رول ادا کیا تو یقینی طور پر آپ کے بچے بڑے ہو کر صحت مند اور تعمیری شخصیت کے حامل نکلیں گے۔ ■■



بے قراری

شمیم عالم مصحفی

"ڈارلنگ، شو کا وقت قریب ہوتا جارہا ہے۔ تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔"

"بیگم، عشا کا وقت ہو چکا ہے۔ نماز تو ادا کر لینے دو۔"

"اُف ڈیر، نماز آکر قضا پڑھ لینا۔ کبھی تو میری خواہش کا احترام کیا کرو۔"

"بیگم، خدا سے خوف کھاؤ، کثرت سے استغفار پڑھو۔ نفسانی خواہشوں پر قابو پانا ہی حقیقی عبادت ہے۔ فلم دیکھنے کی غرض سے نماز قضا کر دو۔ استغفراللہ! استغفراللہ!"

رحیم میاں اپنی بیوی عائشہ کی باتیں سن کر مشتعل ہوگئے۔ اور اپنی خم دار سیاہ داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے استغفار پڑھنے لگے۔ عائشہ نے جب میاں کو بار بار استغفار پڑھتے دیکھا تو اور زیادہ چراغ پا ہوگئی اور کہنے لگی: "میری تو قسمت ہی پھوٹی تھی، جو تم جیسے مولوی کے پلے باندھ دی گئی جہاں ذرا فرصت ملی، گھر کے کسی کونے میں مصلیٰ بچھایا اور وظیفے میں گم ہوگئے۔ میں پوچھتی ہوں اگر

اتنے ہی متقی اور پرہیزگار تھے تو مجھ سے شادی ہی کیوں کی تھی؟ کسی مولوی کی ہی لاڈلی بیاہ لاتے تو ہم دونوں کے حق میں بہتر ہوتا۔ ہائے، شادی سے پہلے کیسے کیسے خواب دیکھے تھے میں نے!"

"ارے بیگم، تم تو بات بات پر خفا ہو جاتی ہو۔ واللہ تمہاری خفگی میرے لئے سوہان رُوح ہے۔ تم میری زندگی، میری کائنات، میری برسوں کی عبادت کا ثمرہ ہو۔ خدا کے لئے غصہ تھوک دو۔ اللہ تعالےٰ اپنی مقدس کتاب میں فرماتا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ طاقت ور انسان وہی ہے جس نے اپنے غصے پر قابو پالیا۔"

"چُپ بھی رہو جی! مُشت بھر داڑھی رکھ کر جھوٹی باتیں نہ کہو۔ تمہاری زندگی، تمہاری کائنات اور تمہاری عبادت کا ثمرہ میں نہیں یہ مصلّیٰ ہے، جس پر بیٹھے دن رات وظیفے میں گم رہتے ہو۔ کبھی تم نے مصلّیٰ سے رُخ پھیر کر بھی دیکھا ہے کہ کوئی اور بھی تمہاری نظرِ التفات کا محتاج ہے۔"

"دیکھو بھئی، میرے مصلّیٰ کو اپنی سوکن نہ بناؤ۔ بس نمازِ فرض ادا کر لوں، پھر چلتا ہوں فلم نو بجے شروع ہوگی۔ ابھی تو فقط ساڑھے آٹھ بجے ہیں۔ تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔"

نماز سے فارغ ہو کر رحیم میاں رکشا لانے کے لئے چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد رکشا لے کر واپس آئے تو بیوی نے اُس پر ساڑی کا پردہ لگانے سے قطعی انکار کر دیا۔ مگر میاں کی ضد اور مسکین صوُرت کو دیکھ کر مجبوراً پردہ لگوانا ہی پڑا۔ پھر رحیم میاں اپنی بیوی کے ساتھ ہی پردے کے اندر چلے گئے، تاکہ بات بھی پردے میں رہے رکشا سینما ہال کی جانب چل پڑی۔

سینما ہال میں کافی بھیڑ تھی۔ رحیم میاں اپنی جان پہچان کے لوگوں سے نظریں بچاتے ہوئے ٹکٹ کاؤنٹر تک پہنچے، مگر وہاں بڑے بڑے حرفوں میں "ہاؤس فل" کی تختی لگی دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی۔ بیوی کو یہ بُری خبر سناتے ہوئے انہیں بڑی خفت محسوس ہوئی، مگر کرتے کیا؟ واپسی میں راستے کی مسافت بیوی کی خرافات سُن سُن کے کٹی۔ رحیم میاں نے لاکھ سمجھایا کہ نئی فلم لگی ہے۔ ٹکٹ چند روز قبل ہی ایڈوانس بک ہو چکے ہیں، مگر بیوی نے ایک نہیں سُنی اور اعلانِ جنگ کر دیا۔

رحیم میاں کی شادی ہوئے مشکل سے آٹھ مہینے ہوئے تھے، مگر میاں بیوی دونوں کا مزاج ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھا اور دونوں کے خیالات میں زمین، آسمان کی سی دُوری تھی۔ رحیم میاں کسی پرائیویٹ دفتر میں کلرکی کرتے تھے چونکہ گھر کا ماحول مذہبی تھا اس لئے صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے اور داڑھی بھی نوجوانی سے ہی رکھ چھوڑی تھی۔ اُس کے بالکل برعکس اُن کی بیوی عائشہ مذہب سے بے گانہ تھی۔ وہ جب سے رحیم میاں کی دُلہن بن کر آئی تھی، رحیم میاں کا قلبی سکون درہم برہم ہو گیا تھا۔ عائشہ مغرب کے سانچہ میں ڈھلی ایک الہڑ دوشیزہ تھی۔ اُسے روزہ نماز سے دُور کا بھی داسطہ نہ تھا۔ ہم مزاج نہ ہونے کی وجہ سے میاں بیوی میں نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔

آج جب عائشہ فلم دیکھے بغیر واپس چلی آئی تو اُسے اپنی ہتک محسوس ہوئی۔ اپنی بے بسی اور بے چارگی پر بے حد غصہ آیا۔ رات گئے تک اپنی قسمت کو کوستی رہی اور میکے جانے کی دھمکیاں دیتی رہی۔

دوسری صبح عائشہ سچ مچ اپنے میکے چلی گئی۔ رحیم میاں نے بھی اُسے روکنے کی کوشش نہیں کی، کیوں کہ بات کچھ اتنی بڑھ گئی تھی کہ خود اُن کا دل بھی یہی چاہتا تھا کہ روز روز کی بک بک جھک جھک سے بہتر یہی ہے کہ چند مہینے کے لئے دونوں ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر لیں۔

رحیم میاں کو بیوی سے جُدا ہوئے ابھی آٹھ روز ہی ہوئے تھے کہ انہیں اپنے اکیلے پن کا احساس شدت سے ستانے لگا۔ انہیں ایسا محسوس ہونے لگا جیسے عائشہ کے بغیر اُن کی تمام خوشیاں بے کیف ہوں، اُن کی ساری عبادت ادھوری اور ناقص ہو۔ رحیم میاں مصلّیٰ پر بیٹھ کر وظیفے میں گم ہونے کی لاکھ کوشش کرتے، مگر اُن کا دھیان عائشہ کی جُدائی میں اُلجھ کر رہ جاتا۔ وہ دلبستر پہ ساری ساری رات کروٹیں بدلتے رہتے، مگر آنکھوں میں نیند کا سایہ تک نظر نہ آتا۔ آخر ایک دن رحیم میاں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر عائشہ کے نام ایک خط تحریر کیا: "تمہارے بغیر زندگی کا ہر لمحہ بے کیف ہے۔ میری عبادت تک تمہاری قربت کا محتاج ہو کر رہ گئی ہے۔ خدارا پچھلی تمام باتوں کو بھول کر فوراً چلی آؤ کیوں کہ تمہارے بغیر میں اب ایک پل بھی نہیں رہ سکتا۔"

خط ڈاک کے سپرد کر کے رحیم میاں دفتر چلے گئے۔

دوپہر کو کھانا کھانے کے لئے جب وہ گھر پہنچے تو گھر میں اپنی بیوی عائشہ کو اپنا منتظر دیکھ کر اُن کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک پڑے۔ وہ فورِ جذبات سے مغلوب ہو کر انہوں نے عائشہ کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

ایک انگریز عورت کانگریس کی صدر بن گئی

ن سُلطانہ

انگریزی میں ایک کہاوت ہے کہ فلاں شخص زندگی سے بڑا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کی تصویر زندگی کے فریم میں فٹ نہیں ہوتی۔ ایسا شخص عام آدمیوں سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو دنیا کے مطابق نہیں ڈھالتا، بلکہ یہ کوشش کرتا ہے کہ دنیا اس کے بنائے ہوئے سانچے میں ڈھل جائے۔ اینی بیسنٹ بھی ان ہی لوگوں میں تھیں وہ کوئی معمولی عورت نہیں تھیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے معرکے سر کئے وہ جب تک انگلستان میں رہیں، حکومت اور روایتی مذہب کے خلاف لڑتی رہیں۔ پھر ان کی سرگرمیوں کا دائرہ ہندوستان تک پھیل گیا۔ ہندوستان ان کا وطن بن گیا۔ ہندوستانیوں نے بھی ان کی محبت کا جواب محبت سے دیا۔ وہ انڈین نیشنل کانگریس کی صدر منتخب ہوئیں۔ انہوں نے ہندوستان کی آزادی کے لئے قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں۔ وہ عورت سے بڑھ کر ایک تحریک تھیں، ایک جذبہ، ایک شعلہ تھیں۔ ان سے لڑنا آسان کام نہیں تھا۔ انہوں نے اپنی خطابت کے زور پر بڑے بڑے معرکے سر کئے ان کی تحریروں نے حکومت کے ایوان میں تہلکہ مچا دیا۔

اینی بیسنٹ ۱۸۴۷ء میں لندن میں پیدا ہوئیں وہ پانچ برس کی تھیں کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ان کی ماں ایک راسخ العقیدہ عیسائی تھیں۔ بچپن میں ہی اینی پر ماں کا رنگ چڑھ گیا۔ یہ رنگ ان کی ماں سے بھی گہرا تھا۔ نوجوانی میں ان کی منگنی فرینک بیسنٹ نامی ایک پادری سے ہو گئی۔ وہ مسٹر بیسنٹ سے محبت نہیں کرتی تھیں لیکن ان کی ماں بیمار تھیں اور ان کی ماں نے اس شادی پر اصرار کیا اس لئے اینی نے اپنا سر جھکا دیا۔ شادی کے وقت ان کی عمر بیس سال تھی۔

شادی کے دو سال بعد ان کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ ایک سال بعد ایک لڑکی کا اضافہ ہوا لڑکی کی پیدائش کے ایک سال بعد دونوں بچوں پر کالی کھانسی کا حملہ ہوا اس زمانے میں میڈیکل سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی تھی دونوں بچے موت کے دہانے پر پہنچ گئے۔ اینی نے ان کی جان توڑ خدمت کی۔ انہوں نے موت کو اپنے گھر کے دروازے سے واپس کر دیا۔ یہ واقعہ ان کی زندگی میں ایک انقلاب کا باعث بن گیا ــــ بچے تندرست ہو گئے۔ مگر اینی بیسنٹ بیمار پڑ گئیں ان کے ذہن میں ایک جنگ شروع ہو گئی۔ انہوں نے سوچنا شروع کیا: خدا اپنے بندوں کو دوزخ میں کیوں جھونکے گا؟ خدا کی حمد کی جاتی ہے لیکن خدا نے اس دنیا میں کتنی بے رحمی اور سفاکی روا رکھی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سُولی پر چڑھ کر دنیا کے تمام گناہ گاروں کا بوجھ اپنے سر کیوں لیا؟ انجیل مقدس میں بہت سی غلطیاں ہیں۔ یہ غلطیاں کیوں ہیں؟ ان کے ذہن میں یہ جنگ ساڑھے تین سال تک جاری رہی۔ اس جنگ کا فیصلہ دہریت کے حق میں ہوا اور اینی بیسنٹ خدا کی ہستی سے منکر ہو گئیں۔

اینی کے ذہن میں انقلاب آیا تو ان کی شادی بھی اس کی زد میں آ گئی۔ ان کے خاوند ایک پادری تھے وہ ایک دہریہ بیوی کو کیسے برداشت کر سکتے تھے؟ ان کے خاوند نے ان سے کہا کہ یا تو وہ خدا کی ہستی کو مانیں یا گھر سے نکل جائیں۔ اینی بیسنٹ کے خیال میں ان کا گھر میں رہنا ریاکاری کے برابر تھا۔ اینی کی ماں کا دل اپنی بیٹی کی ضد کے سامنے ہار گیا۔ وہ معاملے کی نوعیت کو سمجھ گئیں اینی بیسنٹ نے اپنے خاوند سے طلاق حاصل کر لی اور انگلستان میں دہریت کی تبلیغ میں مشغول ہو گئیں۔ انگلستان کے پادری اور قدامت پرست لوگ ان سے بدظن ہو گئے۔ ان کے خلاف مضامین شائع ہوئے، لوگوں نے ان پر کیچڑ اچھالی، لیکن اینی نے ہمت نہ ہاری۔ وہ ایک شعلہ بیان مقرر تھیں۔ انہوں نے خود محسوس کیا کہ ان کی زبان میں جادو ہے۔ انہوں نے اس جادو کو جگانے میں کفایت شعاری سے کام نہیں لیا۔ وہ گھنٹوں بے تکان بولتیں الفاظ ایک آبشار کی شکل میں ان کے مونہہ سے نکلتے۔ ان کے مخالفوں کو کوئی جواب بن نہ پڑتا تقریروں کے علاوہ اینی نے اپنی تحریروں سے بھی دہریت کی تبلیغ کی۔ دہریت کی تبلیغ کے دوران وہ چارلس بریڈلا کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئیں۔ بریڈلا دہریوں کا امام تھا۔ وہ آزاد خیالی کا حامی تھا۔ وہ روایت اور مذہب کا جانی دشمن تھا۔ اس کے علاوہ مشہور مصنف جارج برنارڈ شا بھی دہریوں کی سوسائٹی کا سرگرم کارکن بن گیا۔ اینی بیسنٹ جب چالیس سال کی ہو گئیں تو ان کی زندگی میں ایک اور انقلاب آیا۔ وہ دہریت کو چھوڑ کر مذہب کی طرف مائل ہو گئیں مگر یہ عیسائی مذہب نہ تھا۔ اس نئے مذہب کا نام تھیوسوفی تھا۔ ایک روسی عورت میڈم بلاواٹسکی اس کی مبلغ تھیں۔ اینی بیسنٹ کی ملاقات میڈم بلاواٹسکی سے ہوئی تو وہ ایک ہی نظر میں ان کی گرویدہ ہو گئیں۔ تھیوسوفی ایک پیچیدہ مذہب ہے۔ یہ انسان کے کئی بار جنم لینے پر یقین رکھتا ہے۔ تھیوسوفی کے نظریہ کے مطابق اس دنیا کو چلانے والے کچھ ماسٹر یا گرو ہیں جو پہاڑوں میں رہتے ہیں۔ اس مذہب کا مرکز مدراس میں ہے چنانچہ اینی بیسنٹ نے مدراس جانے کی ٹھان لی۔

اینی بیسنٹ ہندوستان آئیں تو یہیں کی ہو کر رہ گئیں۔ انہوں نے یہاں کی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ انہوں نے یہاں بچوں کے لئے اسکول کھولے، بنارس میں سینٹرل ہندو ہائی اسکول کی بنیاد ڈالی۔ یہ اسکول بعد میں کالج اور پھر بنارس ہندو یونیورسٹی میں تبدیل ہو گیا۔ بنارس کے لوگ انہیں

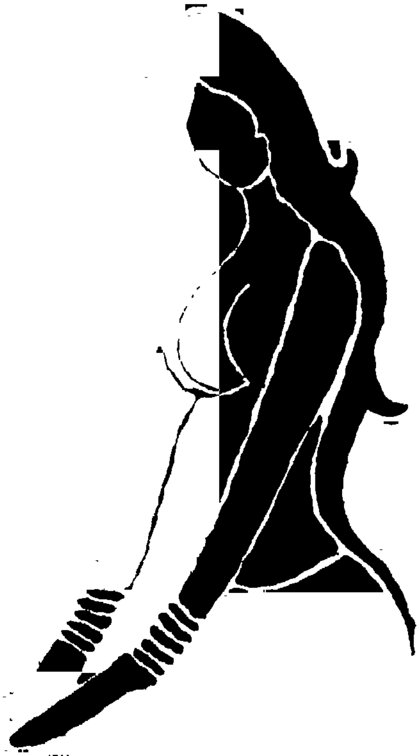
بسنتی دیوی کے نام سے پکارتے تھے۔ انہوں نے ہندو دھرم کا مطالعہ کیا اور اس پر کتابیں لکھوائیں۔ تعلیم کے میدان سے نکل کر وہ سیاست کے اکھاڑے میں کود پڑیں۔ دراصل وہ نچلا بیٹھنا نہیں جانتی تھیں۔ ان کی شخصیت میں پارے کی صفت تھی انہوں نے ہندوستان کے طول و عرض کا دورہ کیا وہ سفر کے دوران تکان محسوس نہیں کرتی تھیں۔ ان کے جسم میں بے پناہ قوت تھی۔ وہ ہندوستان کی آزادی کی جنگ میں جی جان سے شریک ہو گئیں یہ تلک اور گوکھلے کا زمانہ تھا۔ گاندھی جی ابھی تک افریقہ میں تھے۔ اس زمانے میں مکمل آزادی کا نعرہ منظرِ عام پر نہیں آیا تھا۔ ہندوستان کے لیڈروں نے ہوم رول کا مطالبہ کیا تھا۔ اینی بیسنٹ نے ہوم رول لیگ کی بنیاد ڈالی۔ ہندوستان کے لوگ ایک انگریز عورت پر اعتبار کرتے ہوئے جھجکتے تھے۔ تلک نے تو ان سے ملنے سے بھی انکار کر دیا تھا لیکن یہ عورت ثابت قدمی سے اپنے مسلک پر ڈٹی رہی

اینی بیسنٹ بیس سال تک ہندوستان میں رہیں۔ ہندوستان کے تئیں ان کی عقیدت اور محبت دیکھ کر کانگریس نے ان کو ۱۹۱۷ کے سالانہ اجلاس کے لئے صدر چن لیا۔ یہ جلسہ کلکتہ میں منعقد ہوا۔ گاندھی جی افریقہ سے واپس آچکے تھے ابتدا میں اینی بیسنٹ گاندھی جی کی شخصیت سے متاثر ہوئیں، لیکن بعد میں دونوں شخصیتوں کا ٹکراؤ ناگزیر ہو گیا۔ گاندھی جی کی رائے تھی کہ ہندوستانیوں کو انگریزوں سے عدم تعاون کرنا چاہئے۔ ہندوستانیوں کے لئے لازم ہے کہ وہ سرکاری نوکریاں چھوڑ دیں، کالج اور یونیورسٹیوں میں پڑھنا چھوڑ دیں، وکیل عدالت کو خیرباد کہہ دیں۔ اس طرح حکومت کا سارا انتظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اینی بیسنٹ کے خیال میں یہ پاگل پن تھا انہوں نے گاندھی جی پر کڑی نکتہ چینی کی۔ ایک دفعہ بنارس میں سینٹرل ہندو کالج کا سالانہ اجتماع ہوا۔ اسٹیج پر راجہ مہاراجہ براجمان تھے۔ ان راجاؤں نے دل کھول کر اس ادارے کو چندہ دیا تھا۔ اینی بیسنٹ ان کی احسان مند تھیں۔ راجاؤں نے قیمتی لباس پہن رکھے تھے۔ ان کے گلے میں موتیوں کی مالائیں تھیں، سر پر قیمتی طرے تھے۔ اس جلسے میں گاندھی جی کو بھی دعوت نامہ بھیجا گیا۔ گاندھی جی نے کھدر پہننا شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے اسٹیج پر پہنچ کر کہا کہ ان راجاؤں کو قیمتی کپڑے اتار دینے چاہئیں۔ ان پر کھادی پہننا فرض ہے۔ ہندوستان کے لوگوں کو لنگوٹی بھی مشکل سے نصیب ہوتی ہے۔ اتنی غربت اور مصیبت کے درمیان راجاؤں کو اپنے مال و دولت کی نمائش کرنا زیب نہیں دیتا۔ اس تقریر سے حاضرین میں کھلبلی مچ گئی۔ راجاؤں نے مونہہ بنالیا۔ انہوں نے کالج کو چندہ اس لئے نہیں دیا تھا کہ انہیں بلا کر ان کی بے عزتی کی جائے۔ اینی بیسنٹ بھی ان سے پشیمان تھیں۔ انہیں کالج کے معاونوں اور مربیوں کی توہین گوارا نہ ہوئی۔ انہوں نے گاندھی جی کو تقریر کرنے سے روک دیا۔ گاندھی جی کسی سے دبنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے تقریر جاری رکھی۔ راجاؤں نے واک آؤٹ کرنا چاہا۔ آخر اینی بیسنٹ سے نہ رہا گیا۔ انہوں نے زبردستی گاندھی جی کو روکا اور ان سے اسٹیج سے اترنے کے لئے کہا۔ اس ہنگامے سے ان کے درمیان دراڑ پڑ گئی۔ رہی سہی کسر کانگریس کے سالانہ اجلاس میں پوری ہو گئی۔ گاندھی جی نے عدم تعاون، بدیشی مال کے بائیکاٹ، ہڑتال اور ستیہ گرہ کی تجویز پیش کی ان کی رائے میں انگریزوں سے لڑنے کے لئے یہی ہتھیار کارگر تھے۔ اینی بیسنٹ نے ان کی شدید مخالفت کی، وہ آئینی لڑائی لڑنا چاہتی تھیں۔ کانگریس کو ان دونوں تجویزوں میں سے ایک کو چننا تھا۔ گاندھی جی کی تجویز کثرت رائے سے مان لی گئی۔ اینی بیسنٹ کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ گاندھی جی نے سیاست کے میدان میں ان کو ہرا دیا۔ اینی کا سیاسی مستقبل تاریک ہو گیا اینی کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ہندوستان کے دروازے ان کے لئے بند ہو گئے ہیں اور ان کی بیس سال کی محنت اکارت گئی ہے۔

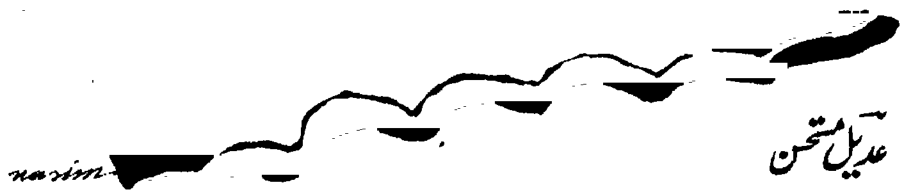
گاندھی جی ہندوستان کے بے تاج بادشاہ تھے۔ اینی بیسنٹ اب سیاسی پس منظر میں تھیں لیکن انہوں نے ہندوستان کی سیاست کو خیرباد نہیں کہا۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے کام کرتی رہیں۔ محمد علی جناح سے ان کی ٹکر ہوئی۔ یہاں بھی انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۹۲۹ میں کلکتہ کی آل پارٹیز کانفرنس میں مسلمانوں کو مرکزی اسمبلی میں ۲۵ فی صد نمائندگی دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ جناح ۳۰ فی صد پر مصر تھے۔ اینی بیسنٹ نے ان سے کہا کہ ۲۵ فی صد ہو یا ۳۰ فی صد اقلیت اقلیت ہی رہے گی۔ جناح نہ مانے۔ ۳۰ فی صد نمائندگی سے نکل کر وہ ۱۴ نکات پر آگئے ہندو مسلمانوں کے درمیان خلیج وسیع ہوتی گئی۔ ان جھگڑوں کو نمٹانے کے لئے لندن میں دو بار گول میز کانفرنس ہوئی لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات نکلا۔ اینی بیسنٹ کی صحت جواب دے رہی تھی ۱۹۳۳ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ موت کے وقت ان کی عمر ۸۶ سال تھی۔

اینی بیسنٹ کی تحریر میں ایک وصف یہ تھا کہ ان کے لکھے ہوئے حروف ہمیشہ ایک جیسے رہتے تھے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی انسان ایک طویل خط لکھنے بیٹھتا ہے تو اس کی تحریر کا پہلا صفحہ اس کی تازگی اور شوق کا مظہر ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کے دماغ اور ہاتھوں کی تکان اس کے آڑے آجاتی ہے۔ چوتھے یا پانچویں صفحہ کی تحریر پہلے صفحہ سے مختلف ہوتی ہے۔ لکیروں میں استقامت نہیں رہتی۔ الفاظ کی شکل بدل جاتی ہے۔ گہری نظر سے دیکھا جائے تو آخری صفحہ پہلے صفحہ سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ اگر تحریر طویل ہے تو یہ فرق اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ اینی بیسنٹ اگر بیس صفحے بھی لکھتیں تو ان کی تحریر کے پہلے اور آخری صفحہ میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا۔

وقت کی دھوپ



سوزِ تنہائی فضاؤں میں ہوئی ہے رقصاں
کمسنی آج جوانی پہ لگے ہے خنداں
خوشنما ہیں در و دیوار مگر افسردہ
شوخ سکھیوں کے حسیں چہرے ہیں کچھ آزردہ
ایک دوشیزہ سجی بیٹھی ہے تنہائی میں
ہر ادا اُس کی ہے شرابور ہے رعنائی میں
دیکھ لیتی ہے کبھی نیچی نگاہوں سے اُدھر
ایک ہنگامہ محفل ہے جہاں شادی کا گھر
ساتھی بچپن کے سب انجان نظر آتے ہیں
ہر طرف عقد کے سامان نظر آتے ہیں
دل ہے بے قابو اُمنڈتے ہوئے طوفانوں سے
اک شمع دور چلی جائے گی پروانوں سے
اِس سے پہلے کہ کوئی درد لے دل میں انگڑائی
بے خیالی سے زمانے میں نہ ہو کچھ رسوائی
خط جو غیروں نے لکھے تھے وہ جلا ڈالے ہیں
کچھ نئے طرز کے محلات بنا ڈالے ہیں
فکرِ فردا ہے مگر ماضی کے پہلو بھی ہیں
مسکراتی ہوئی آنکھوں میں کچھ آنسو بھی ہیں
ڈر ہے چلمن سے سہیلی بھی کوئی دیکھ نہ لے
رُخِ معصوم پہ اشکوں کی نمی دیکھ نہ لے
کوئی کیا جانے جو گزری ہے صنم خانوں پر
وقت کی دھوپ اُتر آتی ہے دالانوں پر



عدیل ممتحن

شمع کشیدہ کاری



جس میں ہر قسم کی بیلیں، بوٹیاں، کروشیا کا کام، مونوگرام، کراس اسٹچ، ساڑھیوں اور دوپٹوں کے ڈیزائن۔ غرض یہ کہ شمع کشیدہ کاری بہنیں اپنے پاس رکھ کر فخر محسوس کریں گی ——

اردو اور ہندی میں —— قیمت! آٹھ روپے

شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی — ۱۱۰۰۰۱



چوٹ

م ۔ ع ۔ غم

رم جھم —— رم جھم ——

سردیوں کی بارش تھی۔ سہ پہر کے تین بجے تھے۔ قمر جہاں اپنے کمرے میں بیٹھے تک لحاف تانے لیٹی تھیں۔ تھوڑی دیر پہلے انہوں نے نوکر کو خریداری کے لئے بازار بھیجا تھا اور اب اُس کے لوٹنے کی منتظر تھیں۔ خادمہ نازی بالائی منزل پر صوفیہ کے پاس تھی۔

اچانک دروازے پر اسکوٹر کے آکر رکنے کی آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی اسکوٹر کا ہارن مخصوص لَے کے ساتھ بجایا گیا۔ یہ نجم کی آفس سے واپسی کا اعلان تھا۔ قمر جہاں فوراً لحاف ہٹا کر اپنے سفید ہوتے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرتی ہوئی دالان میں نکل آئیں۔ اُسی وقت صوفیہ زینے سے صحن کے بائیں سمت بنے ہوئے زینے سے کھٹ کھٹ کرتی ہوئی نیچے آرہی تھی۔ اُسے دیکھ کر قمر جہاں کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں۔

"کیا تم انسانوں کی طرح نہیں چل سکتیں؟ ...وں کی طرح چوکڑیاں کیوں بھر رہی ہو؟"

قمر جہاں صوفیہ کو گھورتے ہوئے بولیں۔

صوفیہ کا مونہہ لٹک گیا۔ رُخساروں کے گلاب مُرجھا گئے۔ وہ خاموشی سے قمر جہاں کے قریب آکر کھڑی ہو گئیں۔ قمر جہاں نے ایک جھٹکے سے اس پر سے نگاہیں ہٹا کے بیرونی دروازے پر مرکوز کر دیں۔

چند لمحوں کے بعد نجم اسکوٹر کو مکان کے باہر کی طرف بنے ہوئے اس کے مخصوص ٹھکانے پر چھوڑ کر گھر میں داخل ہوا۔ وہ سر سے پاؤں تک پانی میں شرابور تھا۔ صحن کو عبور کر کے وہ دالان میں آیا۔

"آج تم آفس سے جلدی ہی چلے آئے۔ اور وہ بھی پانی میں بھیگتے ہوئے۔ ایسی کیا بات ہے؟" قمر جہاں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"امی، نزہت آرہی ہے۔ ابھی آفس میں مجھے عثمان کا تار ملا ہے۔" نجم نے کوٹ اُتار کر صوفیہ کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"کب آرہی ہے نزہت؟ کیا عثمان نہیں آرہے ہیں؟" قمر جہاں نے پُر مسرت لہجے میں پوچھا۔

"عثمان کیسے آسکتے ہیں۔ چوبیس گھنٹے تو انہیں مریض گھیرے رہتے ہیں۔" نجم نے جواب دیا۔ "اُن کے کسی دوست کی فیملی آج پنجاب میل سے مراد آباد جا رہی ہے۔ اُن ہی کے ہمراہ وہ نزہت کو بھیج دیں گے۔"

"پنجاب میل میں شاہ جہاں پور تو شاید ساڑھے چھ بجے آتا ہے۔" قمر جہاں چونکتے ہوئے بولیں۔ "عثمان بھی بالکل بچے ہیں۔ اگر یہ تار تمہیں وقت پر نہ ملتا تو؟"

"تو نزہت اسٹیشن سے گھر تک تنہا چلی آتی۔ وہ کوئی بچی تو نہیں۔" نجم نے ہنستے

ہوئے کہا۔ پھر ٹائی کھول کر صوفیہ کو دیتے ہوئے بولا "صوفیہ، تم بھی تیار ہو جاؤ۔ چھ بجے اسٹیشن چلیں گے۔"

"ہرگز نہیں ـــــ" صوفیہ اسٹیشن نہیں جائیں گی۔ عورتوں کو بے مقصد سڑکوں پر گھومنا زیب نہیں دیتا۔"

صوفیہ کا چہرہ جو ایک پل کے لئے شوہر کی بات پر چمکا تھا، بجھ کر رہ گیا۔

"لیکن امی، صوفیہ گھر سے بے مقصد کہاں نکلیں گی۔ ہم دونوں نزہت کے استقبال کو جائیں گے۔" نجم نے کہا۔

"میں نے کہا نا کہ صوفیہ نہیں جائیں گی۔" قمر جہاں نے نجم کو گھورا۔ "نزہت کو لانے کے لئے تم اکیلے جاؤ گے۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" نجم کی نظریں جھک گئیں۔

یہ پہلا موقع نہیں تھا، جب قمر جہاں نے صوفیہ کو جھڑکا تھا یا اُس پر کوئی پابندی لگائی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ ساس کی حیثیت سے وہ روایت کے جال میں بُری طرح اُلجھ کر رہ گئی تھیں۔ اس کا واضح ثبوت نہ صرف صوفیہ کے ساتھ اُن کا رویہ تھا بلکہ اس سے بھی پہلے وہ برتاؤ تھا جو وہ اپنی بڑی بہو گلنار کے ساتھ روا رکھ چکی تھیں۔

قادر نجم کے بڑے بھائی تھے۔ آٹھ برس پہلے والد کا انتقال ہوگیا تھا۔ شوہر کے مرنے کے ایک سال بعد قمر جہاں نے قادر کی شادی کر دی تھی۔ اُس وقت نجم انجینیرنگ کے آخری سال میں تھا اور نزہت انٹر میں۔ قادر لائق بیٹے بھی تھے اور محبت کرنے والے بھائی بھی۔

لیکن شادی کے چھ ماہ بعد ہی گلنار کے ساتھ قمر جہاں کے نازیبا سلوک نے اُنہیں اپنے گھر والوں سے دُور کر دیا تھا۔ وہ اپنے ایک خالی پڑے ہوئے مکان میں منتقل ہوگئے تھے۔ اب اُن کا پانچ برس کا لڑکا اور اُس سے دو سال چھوٹی ایک لڑکی بھی تھی۔ قادر کے والد زمین دار تھے۔ شہر میں خاصی جائداد ہونے کے علاوہ دیہات میں کاشت کی زمین بھی بڑی مقدار میں تھی۔ ساری جائداد کا انتظام بھی قادر ہی کرتے تھے۔ اکثر وہ آمدنی کا حساب دینے ماں کے پاس آتے تھے۔ کبھی کبھی بچوں کو بھی لے آتے۔ قمر جہاں کبھی ان کے گھر نہیں گئیں۔ گلنار علیحدہ ہونے کے ایک ہفتے بعد ان سے ملنے آئی تھیں، لیکن قمر جہاں کے تیر و نشتر سے اس قدر گھائل ہوکر گئی تھیں کہ دوبارہ اسی موقع پر اس گھر میں چند روز کے لئے قدم رکھا تھا جب سال بھر پہلے ایک دن کے فرق سے نجم اور نزہت کی شادیاں ہوئی تھیں۔

قمر جہاں نے اپنی دونوں بہوؤں کا انتخاب خود کیا تھا، لیکن اپنی پسند کو خود سراہ نہیں سکی تھیں۔ نجم کو صوفیہ سے گہری محبت تھی۔ قمر جہاں اُس کے سامنے جو ستم صوفیہ پر توڑتیں، ان پر وہ ان کے سامنے تو دل مسوس کر رہ جاتا، لیکن تنہائی میں صوفیہ کی غم گساری کرنے کی کوشش ضرور کرتا۔ آج بھی یہی ہوا۔

قمر جہاں نازلی کے ساتھ نزہت کے استقبال کے سلسلے میں مصروف ہوگئیں اور نجم نے صوفیہ کے ساتھ بالائی منزل پر اپنے کمرے کا رُخ کیا۔

"تمہارے ساتھ امی کا برتاؤ دیکھ کر بڑی کوفت ہوتی ہے۔" کمرے میں پہنچ کر نجم نے کہا۔

"کیا وہ یہی سلوک کرنے کے لئے تمہیں بہو بنا لائی تھیں؟"

"امی ہماری بزرگ ہیں۔ ہمیں ان پر تنقید کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔" صوفیہ نے نجم کا کوٹ اور ٹائی ہینگر پر ٹانگ کر اس کے قریب آتے ہوئے کہا۔

"لیکن اُنہیں تمہارے حقوق کو پامال کرنے کا حق کب پہنچتا ہے۔" نجم نے ناخوش گوار انداز میں کہا۔ "اگر وہ میرے جسم کی بوٹی بوٹی کر دیں تو میں اُف نہیں کروں گا، لیکن تم تو میری زندگی ہو۔ تمہیں مصائب سے بچانا میرا فرض ہے۔ افسوس کہ میں تمہیں امی کے مظالم سے نجات نہیں دلا سکتا۔"

"جذبات کی رَو میں بہہ کر آپ حقیقت سے چشم پوشی کر رہے ہیں۔" صوفیہ نے نجم کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کی زندگی کی شریک ہوں۔ امی کا مجھ پر بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ آپ پر۔ پھر میں اُن کے غصے کو کیوں نہیں برداشت کر سکتی؟"

"تمہارا اندازِ فکر تمہاری اعلیٰ ظرفی کی دلیل ہے اور شاید تمہاری پریشانیوں کا باعث بھی۔" نجم نے جواب دیا۔

"اچھا، اب آپ بھیگے ہوئے کپڑے تبدیل کیجئے۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔ چائے پی کر شاید آپ کا موڈ سنبھل جائے۔"

صوفیہ ہنستی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔ نجم کی سوچ میں ڈوبی ہوئی آنکھیں اس دروازے پر جمی رہ گئیں، جس سے نکل کر صوفیہ باہر گئی تھی۔

چھ بجے سے پہلے بارش بند ہوگئی تھی لیکن آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ صوفیہ

باتوں سے نجم کی طبیعت بہل گئی تھی۔ وہ اکیلا اسٹیشن چلا گیا اور ساڑھے سات بجے تک نزہت کو لے کر لوٹ آیا۔

نزہت چھ مہینے پہلے صرف ایک دن کے لئے اپنے شوہر ڈاکٹر عثمان کے ساتھ میکے آئی تھی۔ اس کے بعد سلسلۂ ربط صرف خط و کتابت کے ذریعے قائم رہا تھا۔ اس لئے اس کے آتے ہی گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ کھانے کے بعد سب لوگ قمر جہاں کے کمرے میں جمع ہو گئے۔ سردی سے بچاؤ کے لئے کمرے میں ایک انگیٹھی میں کوئلے دہک رہے تھے۔ سب چہک رہے تھے۔ صوفیہ ضرور قمر جہاں کے لحاظ سے چپ چپ سی تھی۔ نزہت ہنس ہنس کر اپنے شوہر، ساس اور چھوٹی نند کے بارے میں بتا رہی تھی۔ اس کی باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ سسرال میں خوش و خرم زندگی گزار رہی ہے۔

"بھابی، آپ بڑی بجھی بجھی نظر آ رہی ہیں۔" اچانک نزہت نے صوفیہ کو مخاطب کیا۔ "پچھلی بار میں آئی تھی تب تو آپ ایسی گم صم نہیں تھیں؟"

"تمہاری باتوں میں کھو گئی تھی۔" صوفیہ نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "سناؤ، کب تک رہنے کا ارادہ ہے؟"

"ابھی تو وہ آئی ہے اور تم اس کے جانے کی بات کرنے لگیں۔" قمر جہاں نے صوفیہ کو گھورا۔ "کیا تمہیں نزہت کا آنا ناگوار گزرا ہے؟"

صوفیہ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ سہم گئی۔ قمر جہاں کے کھردرے لہجے نے نزہت کو چونکا دیا۔ نزہت کے رخسار پل بھر کے لئے انگیٹھی میں دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح دہک کر رہ گئے۔

"اچھا نزہت، صبح بات کریں گے۔ اس وقت سر میں درد ہو رہا ہے۔ سونا چاہتا ہوں۔" نجم نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "تم بھی تھکی ہوئی ہو، آرام کر لو۔"

نجم کے ساتھ صوفیہ بھی کھڑی ہو گئی۔

ماحول کے تناؤ کا احساس نزہت کو بھی ہوا۔ بھرپور نظروں سے اس نے نجم کے سپاٹ اور صوفیہ کے پژمردہ چہروں کا جائزہ لیا اور بہت کچھ جو اس کی سمجھ میں نہیں تھا، اچانک ہی سمجھ میں آ گیا۔

رات بھر وقفے وقفے سے پھوار پڑتی رہی تھی۔ صبح ہوتے ہوتے بادل چھٹ گئے اور سورج نکل آیا لیکن دھوپ میں تیزی نہیں تھی۔ سرد پُروائی کے جھونکے جسموں کو چھیدے ڈال رہے تھے۔

گزشتہ شام سے سویرے ناشتے کی میز تک نزہت کو یہ بات سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی کہ قمر جہاں کو صوفیہ سے بھی ویسی ہی پرخاش ہے جیسی برسوں پہلے انہیں اپنی بڑی بہو گلشن سے تھی۔ ناشتے پر بھی انہوں نے صوفیہ کو محض اس بات پر جھڑک دیا تھا کہ اس نے دوسروں کی طرح انہیں بھی بغیر نمک کی چائے پیش کر دی تھی جب کہ وہ چائے میں نمک پینے کی عادی تھیں۔ اس وقت بھی نزہت نے صوفیہ کی تذلیل پر نجم کے رخساروں کو لال ہوتے دیکھا تھا۔ بھائی کے دلی کرب اور بھاوج کی بدقسمتی کا اندازہ لگا کر نزہت کو گہرا صدمہ پہنچا۔

ناشتے کے بعد قمر جہاں کسی کام کی طرف متوجہ ہو گئیں تو نزہت نجم اور صوفیہ کے ساتھ ان کے کمرے میں چلی آئی۔

"بھائی جان، پرسوں اتوار ہے۔ مجھے لکھنؤ پہنچا دیجئے گا۔" نزہت نے کہا۔

"کل ہی تو آئی ہو اور ابھی سے جانے کی سوجھ گئی۔" صوفیہ مسکرا کر بولی۔ "یہ عجلت کیوں؟"

"کچھ روز ہنسی خوشی آپ لوگوں کے ساتھ گزارنے آئی تھی، لیکن یہاں کے گھٹے گھٹے ماحول میں سانس لینا بھی دشوار ہو رہا ہے۔" نزہت نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" نجم نے چونک کر کہا۔

"بھابی کے ساتھ امی کا رویہ کچھ ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔" نزہت نے نجم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھتی تھی کہ بھائی صاحب اور بھابی جان کے چلے جانے کے بعد امی نے اپنے برتاؤ میں لوچ پیدا کر لیا ہوگا لیکن ان کا رویہ جوں کا توں ہے۔ میں آپ کی چھوٹی بہن ہوں، لیکن مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی جھجک نہیں کہ امی آپ کی خوشیوں سے کھیل رہی ہیں اور انہوں نے گھر کے ماحول کو تلخ اور بدمزہ بنا ڈالا ہے۔"

چند لمحوں تک نجم اور صوفیہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہ گئے۔

"تمہاری صاف گوئی کے جواب میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ زندگی میں بہت سی باتیں ناپسندیدہ ہوتے ہوئے بھی برداشت کرنا پڑتی ہیں۔" بالآخر نجم نے کہا۔

"مجھے آپ کی مجبوریوں کا احساس ہے۔ آپ امی کو تنہا نہیں چھوڑ سکتے۔ لیکن بھائی جان یہ سعادت مندی تو آپ کی زندگی کو گھن لگا دے گی۔"

"تم اپنے دماغ کو نہ الجھاؤ۔" صوفیہ نے پرخلوص لہجے میں کہا۔ "تمہارے لئے سب کے دل میں گنجائش ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ تم کچھ عرصہ یہاں قیام کرو۔"

"میں خود غرض بن کر نہیں رہ سکتی — اگر

ٹھہرواں گی تو آپ کو آپ کا صحیح مقام دلانے کی کوشش ضرور کروں گی "

نجم اور صوفیہ خاموش رہ گئے ۔ تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد نجم آفس چلا گیا ۔ نزہت صوفیہ سے گپ لڑاتی رہی۔ اُس نے صوفیہ کے قہقہے بھی سُنے اور اس کی آنکھوں کی چمک بھی دیکھ لی ۔ امی کے سامنے یہ قہقہے کہاں اُڑ جاتے ہیں ؟ آنکھوں کی یہ چمک کہاں کھو جاتی ہے ؟ نزہت نے سوچا اور اُسی لمحے اُس نے اپنے دل میں صوفیہ کے لئے گہری ہمدردی محسوس کی ۔

اُسی روز دوپہر کو نزہت نے اپنی ساس ریحانہ خاتون کو ایک خط لکھا اور نوکر کے ذریعے خاموشی سے پوسٹ کرا دیا۔

اگلے چند روز اپنے سینے میں ایک خاموش طوفان دبائے گزر گئے ۔ نزہت کی موجودگی میں قمر جہاں کا برتاؤ صوفیہ کے ساتھ کچھ اور بھی صبر آزما ہو گیا تھا ۔ تیسرے دن نزہت تاجدار نگر سدار سے ملنے گئی ۔ وہ صوفیہ کو بھی لے جانا چاہتی تھی۔ لیکن قمر جہاں نے اُسے جانے کی اجازت نہیں دی تھی ۔

نزہت کو آئے ہوئے ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ عثمان کا تار آیا ۔ انہوں نے دوسرے روز دوپہر کی ٹرین سے ریحانہ خاتون کے پہنچنے کی اطلاع دی تھی ۔ ریحانہ خاتون بڑی پُر وقار خاتون تھیں ۔ صرف اہم ترین موقعوں پر ہی گھر سے نکلا کرتی تھیں ۔ اُن کے آنے کی خبر سے ہر شخص حیرت میں پڑ گیا۔

اگلے روز صبح کو ریحانہ خاتون کے لئے ایک کمرہ خاص طور سے سجایا گیا ۔ نجم نے اُس دن آفس سے چھٹی لے لی تھی ۔ گیارہ بجے وہ اسٹیشن چلا گیا ۔ ریحانہ خاتون ایک نوکر کے ساتھ آئیں ۔ نجم اُنہیں لے کر گھر آیا تو قمر جہاں نے بڑے احترام سے اُن کا استقبال کیا ۔ نزہت اور صوفیہ نے اُنہیں تعظیم دی ۔

ریحانہ خاتون کو قمر جہاں ، صوفیہ اور نجم کے ساتھ بٹھا کر نزہت اُن کا اسباب اُن کے کمرے میں رکھوانے چلی گئی ۔ قمر جہاں اور نجم سے رسمی گفتگو کے بعد ریحانہ خاتون صوفیہ سے اُس کے روزمرّہ کے معمول کے بارے میں باتیں کرنے لگی ۔ صوفیہ نے بڑے ادب اور سُلجھے ہوئے انداز میں اُن سے گفتگو کی۔

یہاں آ کر نزہت نے اپنی بھابی صوفیہ کی بڑی تعریفیں لکھی تھیں " ریحانہ خاتون نے قمر جہاں سے کہا " اب صوفیہ سے بات کر کے مجھے احساس ہو رہا ہے کہ واقعی آپ نے نزہت کی کمی صوفیہ جیسی سلیقہ مند بہو لا کر پوری کر لی ہے "۔

شاید یہ ریحانہ خاتون کی شخصیت کا سحر تھا کہ اُن کے اظہارِ خیال پر قمر جہاں کے نتھنے پھڑکتے پھڑکتے رہ گئے ۔

اُسی وقت نزہت نے آ کر کھانا تیار ہو جانے کی اطلاع دی ـــــ ریحانہ خاتون کھانے سے پہلے نہا کر سفر کی تھکن اُتارنا چاہتی تھیں۔ اُن کے لئے فوری طور پر غسل کا بندوبست کیا گیا۔

کھانے کی میز خواتین سے آباد ہوئی ۔ نجم کسی کام سے گھر سے چلا گیا تھا ۔

" ممی ، شمسہ کیسی ہے ؟" کھانے کے دوران نزہت نے پوچھا ۔

" اُس نے بہت پریشان کیا " ریحانہ خاتون نے مسکرا کر جواب دیا " تمہارے آنے کے دو دن بعد ہی کہنے لگی تھی کہ یا تو بھابی کو بُلا لیجئے یا مجھے اُن کے پاس جانے دیجئے ۔ عثمان نے بھی اُسے خوب ڈانٹ دی "

" آپ شمسہ کو بھی کیوں نہیں لے آئیں ؟" قمر جہاں بولیں ۔

" اُس کے کالج کے حرج اور عثمان کی تنہائی کے خیال سے نہیں لائی ۔ اب پرسوں نزہت کو ہی اس کے پاس لے جاؤں گی "

" پرسوں ؟" قمر جہاں چونکیں " کچھ دن تو رہئے "

" مجبوری ہے ۔ اب آپ ہی صوفیہ کے ساتھ ہمارے یہاں آئیے گا " ریحانہ خاتون نے کہا۔

قمر جہاں کچھ نہیں بولیں ۔ کھانے کے بعد ریحانہ خاتون آرام کرنے کے لئے اپنے کمرے میں چلی گئیں ۔ نزہت اُنہیں چھوڑنے چلی گئی ۔ صوفیہ نے بالائی منزل کی راہ لی اور قمر جہاں اپنے کمرے میں پہنچ کر نزہت کے آنے کا انتظار کرنے لگیں ۔

آدھا گھنٹہ گزر گیا ، نزہت نہیں آئی ۔ قمر جہاں کو اُلجھن ہونے لگی ۔ وہ نزہت کے ذریعے ریحانہ خاتون کو مزید کچھ دن کے لئے نزہت کو اپنے پاس چھوڑ جانے پر آمادہ کرنا چاہتی تھیں ۔ انہوں نے سوچا کہ نزہت شاید صوفیہ کے پاس چلی گئی ہو ۔ وہ اُسے بلانے کی خاطر کمرے سے نکلیں ۔ نازلی کسی کام سے نیچے آ کر واپس اُوپر جا رہی تھی ۔ اُس نے بتایا کہ نزہت اوپر نہیں ہے ۔ قمر جہاں شش و پنج کے عالم میں ریحانہ خاتون کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں ۔

کمرے کے پاس پہنچ کر اُنہیں ٹھٹک جانا پڑا ۔ کمرے کا دروازہ بھڑا ہوا تھا اور اندر سے نزہت کی آواز آ رہی تھی " یقین کیجیے ، ممی ، بھابی کے ساتھ امی کا رویّہ بہت تکلیف دہ

ہے ۔ یہ بھابی کی ہی ہمت ہے کہ وہ امی کا ہر جبر برداشت کرلیتی ہیں۔"

"لیکن تم اور میں اس سلسلے میں کیا کرسکتے ہیں؟" ریحانہ خاتون کی آواز آئی ۔

"میں نے آپ کو اس لئے بلایا ہے کہ آپ امی کے سامنے میرے ساتھ اُس سے بھی بُرا برتاؤ کیجئے جیسا امی بھابی کے ساتھ کرتی ہیں ۔ آج کسی بات سے ناراض ہو کر اُن کے سامنے میرے تھپڑ مار دیجئے گا تاکہ اُنہیں احساس ہو کہ جو ظلم وہ اپنی بہو پر کررہی ہیں، وہ اُن کی بیٹی پر اُس کی سسرال میں بھی کیا جاسکتا ہے ۔ اس طرح شاید وہ اپنی غلطی کو سُدھارنے کی کوشش کریں۔"

"تمہاری تو مت ماری گئی ہے ۔" ریحانہ خاتون کی ہلکی سی ہنسی سُنائی دی۔ "یہ نازک مسئلے کہیں اس قسم کی طفلانہ حرکتوں سے حل ہوتے ہیں ۔ مناسب یہی ہے کہ تم صوفیہ کو سمجھاؤ کہ اگر وہ اپنا حق کما نہیں سکتی تو اُسے چھین لے۔"

"تو آپ تھپڑ نہیں ماریں گی؟" نزہت کی مرمریں آواز اُبھری ۔

"تھپڑ مارنے سے تمہارے پھول جیسے رخسار پر چوٹ نہیں لگے گی؟"

"چوٹ تو امی کے دل پر لگے گی ..."

قمر جہاں آگے نہیں سُن سکیں ۔ یہ اُن کی بیٹی تھی جو اُن سے نفرت کررہی تھی ۔ بہو کب تک بغاوت نہیں کرے گی؟ نجم کب تک بڑے بھائی کی تقلید نہیں کرے گا؟ اُن کا سر گھومنے لگا ۔ وہ ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف چلیں ۔

یہ محض اتفاق تھا کہ اُس وقت بھی صوفیہ بے دھیانی میں اُچھلتی کودتی زینے سے اُتر رہی تھی ۔ قمر جہاں کو دیکھتے ہی اُس کا رنگ زرد پڑ گیا اور اُس کے قدم آخری سیڑھی سے چپک کر رہ گئے ۔

قمر جہاں نے اُسے دیکھا ۔ پھر وہ ڈولتے ہوئے قدموں سے صوفیہ کے قریب پہنچیں اور اُس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولیں "بیٹی، زینہ آہستہ طے کیا کرو ۔ ذرا سی غفلت سے چوٹ لگ جاتی ہے۔"

صوفیہ نے قمر جہاں کے شفیق لہجے پر چونک کر اُن کے چہرے پر نظر ڈالی، لیکن اس وقت اُسے اُن کی آنکھوں میں ممتا کے موجیں مارتے ہوئے سمندر کے علاوہ اور کچھ نظر نہ آسکا ۔

■■

شائع ہوگئی ہے

شمع ۱۹۷۸

فلمی ستاروں کی سالگرہ اور پتے

مستقبل کے لئے معلومات



شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی

اہم خصوصیات : انگریزی، قمری، ہندی تاریخیں، فلم اسٹاروں کے پتے اور تاریخ پیدائش۔ ستاروں کے نیک و بد اثرات اور اس کے ساتھ ہی دل چسپ اور معلوماتی مضامین۔ ایک عدد شمع پاکٹ جنتری منگانے کے لئے ایک روپیہ بذریعہ منی آرڈر یا ایک روپے کے ڈاک ٹکٹ بھیج دیں۔

۱۹۷۸

تاجرانہ نرخ : پانچ سو سے کم تعداد میں منگانے پر ۶۰ روپے سیکڑہ۔ پانچ سو یا اس سے زائد منگانے پر ۵۰ روپے سیکڑہ — مال ریل پارسل کے ذریعے منگانے پر پارسل خرچ ہم دیں گے — ڈاک سے منگانے کی صورت میں ڈاک خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔

شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

بزم بانو

شہناز خانم، نئی دہلی۔

س: غلط فہمیاں کب جنم لیتی ہیں؟

ج: ناراضگی کا جذبہ غلط فہمیوں کو پیدا کرتا ہے جب انسان کسی سے ناراض ہوتا ہے تو غلط فہمیاں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں اور اس کی ناراضگی کا جواز مہیا کرتی ہیں۔

بے بی سلطانہ شمیم سلطانہ، گنٹور

س: دنیا میں ایسی کون سی جگہ ہے جہاں خوشی ہی خوشی ملے؟

ج: وہ جگہ انسان کا دل ہے۔ خوشی کو اپنے سے باہر تلاش کرنا سراب کے پیچھے بھاگنا ہے دراصل خواہشوں کے خاتمہ کا نام ہی خوشی ہے۔

س: سکھ کیا ہے اور دکھ کیا ہے۔ دونوں میں سے زیادہ وجاہت کس کی ہوتی ہے؟

ج: سکھ محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ دکھ جلدی محسوس ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان سکھ چاہتا ہے اور دکھ سے دور بھاگتا ہے۔ کچھ ذہنی بیمار ایسے بھی ہیں جنہیں دکھ اٹھانے میں سکھ ملتا ہے۔

نسرین سلطانہ، پروین سلطانہ۔ آندھرا۔

س: جب کسی کی یاد آنے لگے تو، اور دل تڑپنے لگے تو کیا کرنا چاہیئے؟

ج: یاد آتی ہے تو آنے دیجئے۔ دل تڑپتا ہے تو تڑپنے دیجئے۔ آپ ان لوگوں سے زیادہ خوش نصیب ہیں جنہیں نہ کسی کی یاد آتی ہے اور نہ ان کا دل تڑپتا ہے۔

سیّد پرویز قادری، سیوان (بہار)

س: کیا یہ درست ہے کہ غریبی انسان کو گمراہ بنا دیتی ہے؟

ج: عیش کی زندگی میں انسان خدا کو بھول جاتا ہے غریبی اس کو خدا کی یاد دلاتی ہے اس حد تک غریبی اچھی رہنما ثابت ہوتی ہے۔ لیکن اگر یہ سلسلہ مسلسل ہو جائے تو انسان گمراہ ہو سکتا ہے۔

افلاس کھینچتا ہے ایمان کی طرف
کم بخت مسلسل ہو تو کافر کر دے

ثروت زہرہ بیگم، نئی دہلی۔

س: خواب جتنا حسین ہوتا ہے حقیقت اتنی ہی تلخ ہوتی ہے کیوں؟

ج: اگر حقیقت تلخ نہ ہو تو خواب کا سارا حسن ختم ہو جائے۔ خواب دیکھنا تقریباً انسان کے اختیار میں ہے۔ حقیقت ماحول سے پیدا ہوتی ہے بعض اوقات حقیقت کی تلخی دور کرنے کے لئے انسان حسین خواب دیکھتا ہے۔

س: انسان کا ضمیر کب خاموش ہو جاتا ہے؟

ج: مجبوری میں بعض اوقات لالچ میں بھی انسان کا ضمیر خاموش ہو جاتا ہے۔

مدینہ قمر، گیا۔

س: غریبی سے تنگ آگئی ہوں، بتایئے کیا کروں!

ج: غریبی صرف دولت کی کمی کا نام ہے۔ دنیا کی تمام قیمتی چیزیں مفت ملتی ہیں۔ ہوا دھوپ اور پانی زندگی کے لئے بہت ضروری ہیں لیکن یہ چیزیں غریب اور امیر کو یکساں ملتی ہیں۔ خیالات غریبی کے تابع نہیں۔ انسان اپنی سوچ میں آزاد ہے۔ بہتر ہوگا آپ غریبی کے خیال کو اپنے دماغ پر طاری نہ کریں۔

پرویز قادری، سیوان (بہار)

س: بے سہارا انسان کو کیا کرنا چاہیئے؟

ج: اگر دنیا میں کوئی سہارا نہ ملے تو خدا کا سہارا ہر وقت موجود ہے۔

اِس عنوان کے تحت دلچسپ معلوماتی اور مذہبی سوالوں کے جواب دئے جاتے ہیں۔ ایک کاغذ پر یا پوسٹ کارڈ پر زیادہ سے زیادہ تین سوال لکھئے ہر سوال کے بعد جواب کے لئے جگہ چھوڑئیے اور اپنا پورا نام پتہ لکھئے۔ جس کاغذ یا کارڈ پر سوالات ہوں اس پر دفتر سے متعلق اور کوئی بات نہ لکھئے۔ اپنے سوالات اس پتہ پر بھیجئے:

بزمِ بانو

ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

—— مدیرہ

گوہر پروین، بھاجھا (بہار)

س: لوگ اس دور میں اتنے پریشان کیوں نظر آتے ہیں؟

ج: آپ نے گذشتہ زمانہ نہیں دیکھا۔ پریشانی ہر دور میں انسان کے ساتھ رہی ہے — گذشتہ زمانے میں کچھ زیادہ ہی۔

س: دل میں بے پناہ غم ہو تو کیا کرنا چاہئے؟

ج: اس بے پناہ دولت کو بے دریغ لٹا دیجئے۔

سید حیدر امام اسرار، سلیم پور۔

س: عورتیں جذباتی کیوں ہوتی ہیں؟

ج: اس سوال کا جواب دوسرا ہو سکتا ہے کہ مرد حقیقت پسند کیوں ہوتے ہیں؟ مرد کی توجہ ایک وقت میں ایک چیز پر مرکوز ہوتی ہے اگر وہ دولت چاہتا ہے یا عزت کا طلب گار ہے۔ تو اسے دوسری چیزوں سے کوئی واسطہ نہیں رہتا۔ عورت کے دل میں تمام دنیا کا درد سمٹ آتا ہے۔ اس کی توجہ سارے گرد و پیش پر مرکوز ہوتی ہے۔

شان محمد خان، امروہہ

س: درد دل ناقابل برداشت کب ہو جاتا ہے؟

ج: جب آپ اس کا پیچھا نہ چھوڑیں۔ اسے سینے سے لگائے رہیں۔ اگر دل کا درد جسمانی ہے تو اس کا علاج اسپتال میں ہے اور اگر یہ محبت کی پیداوار ہے تو اس کا علاج آپ کے پاس ہے۔ اس کے متعلق جتنا سوچیں گے یہ درد انتہائی ناقابل برداشت ہو جائے گا۔

س: سسکتی آہوں کا انجام؟

ج: پھول برسانے والی مسکراہٹیں ——
بقول شاعر:
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

عاصی رضا ملک، بھاگل پور۔

س: خوشی اور غم میں کیا رشتہ ہے؟

ج: دونوں کا منبع دماغ ہے۔ دونوں عارضی چیزیں ہیں۔ اس کے علاوہ ایک کے بغیر دوسرے کا احساس دشوار ہے جس طرح اندھیرے کے بغیر روشنی کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی اس طرح غم کے بغیر خوشی میسر نہیں ہوتی۔ خوشی اور غم میں چولی دامن کا رشتہ ہے۔

احسان المظفر، اروَل (گیا)

س: انسان کے لئے بہترین زیور کون سا ہے؟

ج: بہترین زیور عقل ہے۔ لیکن یہ خریدا نہیں جا سکتا۔ اس کے بعد علم۔ یہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد دولت جو نمائشی زیور خرید سکتی ہے۔

س: علم اور عقل میں کیا مناسبت ہے؟

ج: عقل سونا ہے اور علم مینا کاری۔

س: حاسد انسان کا نتیجہ؟

ج: صحت کی خرابی۔

عرفانہ اختر، بنیا پوکھر، گیا۔

س: انسان اپنے ہنر اور ذہن کو کب بوجھ سمجھتا ہے؟

ج: جب وہ اپنے ہنر اور ذہن کی قیمت وصول کرنا چاہے اور یہ قیمت اسے نہ ملے۔ یا وہ ایسے سماج میں پیدا ہو جہاں لوگ اس کے ذہن کی ناقدری کریں۔

س: ہنر اور ذہن سے اپنے میں بڑائی کیوں محسوس ہوتی ہے؟

ج: ذہن قدرت کا عطیہ ہے۔ اس پر ناز کرنا بجا ہے۔ ہنر انسان خود حاصل کرتا ہے۔ اسے اپنی مہارت پر فخر کرنا جائز ہے۔

ایم۔ ایچ۔ صدیقی، کٹیہار۔

س: کیا تعلیم یافتہ عورتیں سرکش اور ضدی ہوتی ہیں؟

ج: سرکشی اور ضد کا تعلیم سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا تعلق عورت کی فطرت ہے۔ کچھ عورتیں فطری طور پر سرکش اور ضدی ہوتی ہیں تعلیم سے ان کی سرکشی میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے اور کمی بھی واقع ہو سکتی ہے۔ یہ ماحول پر منحصر ہے۔

س: عورت جذباتی کب بن جاتی ہے؟

ج: جذبات عورت کی زندگی میں ہر ہر منٹ موجود رہتے ہیں۔ عورت جذبات کا دوسرا نام ہے۔

محمد جہانگیر عادل، کٹیہار۔

س: کیا ایک جھوٹ کو بار بار بولنے سے وہ سچ ہو جاتا ہے؟

ج: جی ہاں یہ ایک افسوس ناک حقیقت۔ دنیا کے بے شمار لیڈروں نے اس نسخے کو کامیابی سے آزمایا ہے۔

س: کیا انسان کو صرف اپنے لئے ہی جینا چاہئے؟

ج: اپنے لئے صرف جانور ہی جیتے ہیں۔ انسان سماج میں رہتا ہے۔ وہ چاہنے پر بھی صرف اپنے لئے نہیں جی سکتا۔

مدیرہ بانو صدیقی، سہارن پور۔

س: سچی دوستی کس کو کہتے ہیں؟

ج: سچی دوستی میں دوست کے عیب نظر نہیں آتے۔ دوست کو دیا ہوا قرض بھی یاد نہیں رہتا۔ دوستی میں احسان نہیں ہوتا اور نہ معافی مانگنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ دوست کے ساتھ گذارے ہوئے گھنٹے منٹوں میں گذر جاتے ہیں۔

دیس بدیس کی خبریں

شیشے کی عورت

نئی دلی میں ایک زراعتی نمائش ہو رہی ہے۔ اس نمائش میں ایک شیشے کی عورت سب کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ یہ عورت جرمنی سے آئی ہے۔ اس میں بجلی کے رنگین قمقموں سے عورت کے اندرونی اعضاء دکھائے گئے ہیں۔

نئی مس ورلڈ

سویڈن کی حسینہ میری این لندن کے بین الاقوامی مقابلۂ حسن میں ملکۂ عالم منتخب ہوگئیں۔ سویڈن کی حسینائیں یہ مقابلہ دو دفعہ پہلے بھی جیت چکی ہیں۔ مس ہالینڈ اور مس جرمنی نے دوسرا اور تیسرا مقام حاصل کیا۔ اس مقابلۂ حسن میں دوسری بار مس سوازی لینڈ نے حصہ نہیں لیا۔ یہ سیاہ فام حسینہ ہیں۔ اور افریقہ کے ملک سوازی لینڈ سے مقابلۂ حسن میں حصہ لینے آئی تھیں۔ گذشتہ سال جنوبی افریقہ کے مقابلۂ حسن میں شرکت کے خلاف احتجاج کے طور پر افریقہ کے کئی ملکوں نے اپنی امیدواروں کو واپس بلالیا تھا۔

بھگوان کا مقدمہ خارج

راجستھان ہائی کورٹ کی جودھ پور بنچ میں ایک عجیب مقدمہ پیش ہوا۔ اس مقدمے میں بھگوان مدعی تھے مدعا علیہ ایک پروہت تھا جس نے بھگوان کے مندر پر قبضہ کرلیا۔ بھگوان کی طرف سے جو وکیل پیش ہوا۔ اس نے عدالت سے درخواست کی کہ وہ اس پروہت کو مندر سے نکال دے اور اسٹیو کو اس کی جگہ دلا دے۔ جج نے یہ مقدمہ خارج کردیا۔ اس نے فیصلے میں لکھا کہ بھگوان کسی رحم کے محتاج نہیں۔ وہ سب سے طاقت ور ہستی ہیں۔ ہر جگہ حاضر ناظر ہیں۔ دنیا ان کے حکم کی تابع ہے۔ ان پر رحم کھانا ان کی توہین ہے۔

معلوماتِ عامہ میں اضافہ کیجئے

ہندوستان نے جو مصنوعی سیارہ فضا میں چھوڑا تھا۔ اس کا نام چرن سنگھ تھا۔ تاج محل تاج الدین بابا نے بنوایا تھا۔ ناگ پور مدھیہ پردیش کی راج دھانی ہے۔ یہ ہیں کچھ جوابات جو پولیس کانسٹبل کے امتحان میں کچھ امیدواروں نے دیئے۔

گائے کی دُم سے مقدمہ جیت لیا

ایک کسان نے دس ہزار روپیہ قرض لیا۔ جب وہ یہ روپیہ ادا نہ کرسکا تو قرض دینے والے نے اس پر مقدمہ دائر کردیا۔ کسان نے گائے کی دُم ہاتھ میں لے کر قسم کھائی کہ اس نے یہ روپیہ قرض نہیں لیا۔ عدالت نے اس کا بیان تسلیم کرلیا اور مقدمہ خارج کردیا۔

دیوالی یا دیوالہ

ہندوستان میں ہر سال آتش بازی پر ۵۰ کروڑ روپیہ خرچ ہوتا ہے یہ روپیہ

۱۲۵ گرام
چھلجھڑیو ۲ چائے کے چمچے
دھنوال ایک چائے کا چمچہ
کے اعدا
پاؤ چائے کا چمچہ
دیوالی پہ ایک چائے کا چمچہ
صاف تیل کر دھولیں۔ پھر کدوکش
آتش با ایک چھلنی میں چھان لیں۔
تب ... پوڈر ملاکر دوبارہ چھان لیں۔
لندن ... علاحدہ کر زردی سفیدی علیحدہ
میں چینی ملاکر اچھی طرح
راس میں انڈوں کی زردی
رونیسٹس اور دودھ ملالیں۔
کار کنوا ... کر دیں۔ انڈوں کی سفیدی
کھا ... پھینٹیں۔ جھاگ بن جائیں
تا ہو ... آٹا اور بیکنگ پاؤڈر
... شامل کرلیں۔ پھر ایک دیگچی میں
... گرم کر اس میں یہ تمام ملی ہوئی
شروع ... دیگچی کو درمیانی آنچ پر رکھ
گجرات ... پانچ سات منٹ بعد
... تیرس کے ڈھکنے پر بھی دو چار
... رکھ دیں۔ دس پندرہ منٹ
دل ... پانی خشک ہوگیا ہو تو
... گرم گرم کھائیں۔

... قیمہ

دل: ایک عدد
دھنیا ۲ چائے کے چمچے
... ۵ عدد
جگ نفل) آدھا چائے کا چمچہ
ڈاکٹوا) ایک چائے کا چمچہ
استعمال ایک چائے کا چمچہ
اُس آدھا انچ کا ٹکڑا
۲ عدد

کے بائیں جانب لگایا تو اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب بائیں طرف سے کوئی آواز نہیں آئی بلکہ دائیں طرف سے آئی۔ بعد میں معائنے سے معلوم ہوا کہ نہ صرف دل دائیں طرف ہے بلکہ جگر مثانہ اور پتہ بھی دائیں طرف ہے۔ ڈاکٹروں نے اس بات کی تصدیق کر دی ہے۔ لیکن اُن کا کہنا ہے کہ اُس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔

گھونسلے میں طوفان

اونٹاریو کینیڈا کے ایک پارک میں بطخوں کا جھنڈ رہتا تھا۔ زندگی آرام سے گزر رہی تھی کہ یکایک ایک مادہ بطخ اس جھنڈ میں شامل ہو گئی۔ یہ بطخ ایک ذہنی مریض ثابت ہوئی اس کو وہم ہو گیا کہ وہ مادہ نہیں بلکہ نر ہے۔ اُس نے تمام نر بطخوں کو ٹھونگیں مار مار کر جھنڈ سے باہر نکال دیا۔ اُس نے تمام مادہ بطخوں کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ پارک کے مالی نے جب یہ ماجرا دیکھا تو اُس نے اس بطخ کو پکڑ لیا۔ سزا کے طور پر اُسے قیدِ تنہائی میں رکھا گیا۔ میدان خالی دیکھ کر نر بطخ جھنڈ میں واپس آ گئے اور حالات پھر نارمل ہو گئے۔

ڈاکو عورت نے خودکشی کر لی

انگرو شوبرٹ نے جرمنی کے ایک جیل خانے میں خودکشی کر لی۔ اُس نے اپنے پلنگ کی چادر کا پھندا بنا کر گلے میں ڈال لیا۔ جیل کے محافظین نے اُسے جیل کی سلاخوں سے لٹکا ہوا پایا۔ انگرو جرمنی کے مشہور شہری گوریلا ڈاکوؤں کے گروہ سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ گروہ باڈر مائینوف گروپ کہلاتا تھا۔ اُس کی لیڈر ایک عورت مس سائینوف تھی۔ اُس کے ساتھی کا نام اینڈریاس باڈر تھا۔ اس گروہ نے پچھلے چند سالوں سے جرمنی میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ انہوں نے کئی بینک لوٹے۔ کئی مشہور آدمیوں کو قتل کیا۔ یہ جب گرفتار ہو جاتے تو گروہ کے دوسرے ممبر کسی بڑے لیڈر یا امیر آدمی کو اغوا کر لیتے اور یہ اعلان کرتے کہ جب تک اُن کے ساتھیوں کو رہا نہیں کیا جائے گا وہ اپنا قیدی رہا نہیں کریں گے۔ حکومت کے لیے اُن کو رہا کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہتا۔ اس طرح یہ گروہ من مانی کرتا رہا گذشتہ سال اس گروہ کے سرغنہ باڈر اور مس مائینوف کو گرفتار کر لیا گیا۔ گروہ کے دوسرے ممبروں نے جرمنی کے ایک بڑے صنعت کار کو اغوا کر لیا۔ اور دھمکی دی کہ اگر اُن کے ساتھیوں کو فوراً رہا نہ کیا گیا تو وہ اس صنعت کار کو گولی مار دیں گے۔ حکومت نے اُن کے آگے گھٹنے ٹیکنے سے انکار کر دیا۔ اس گروہ کے ممبروں نے واقعی اپنے قیدی کو گولی مار دی۔ اُس کے بعد انہوں نے ایک طیارہ ہائی جیک کیا۔ وہ اُسے مختلف ملکوں سے اُڑاتے ہوئے افریقہ کے ملک سومالی لینڈ لے گئے۔ یہ طیارہ جرمن کمپنی کا تھا اُس میں تقریباً ۸۰ سیاح سوار تھے۔ ڈاکوؤں نے جہاز کے ایک پائلٹ کو بھی کسی بات پر گولی مار دی۔ جرمن حکومت نے خاص تربیت یافتہ لڑنے والے افریقہ بھیجے اور انہوں نے چند منٹوں کی مزاحمت کے بعد قیدیوں کو رہا کرا لیا چار ڈاکوؤں میں تین مارے گئے۔ ایک سخت زخمی ہوا۔ اُن میں دو عورتیں بھی تھیں۔ اس رہائی کے چند گھنٹے بعد جرمنی میں قید اس گروپ کے لیڈروں نے خودکشی کر لی۔ وہ اپنی رہائی سے نا اُمید ہو گئے تھے۔ جیل کی یہ چھٹی خودکشی ہے۔ جو انگرو شوبرٹ نے کی۔

دن بھر کی محنت کا نتیجہ ایک روپیہ

آندھرا پردیش کے نرساپور کی ’لیس‘ مشہور ہے۔ یہ کروشیا کے ڈیزائن پر بنائی جاتی ہے۔ یہاں کی عورتیں کروشیا سے لیس کی بنائی کرنے میں مشہور ہیں۔ ان ہنرمند عورتوں کی ۶-۷ گھنٹوں کی محنت کا پھل ہے صرف ایک روپیہ۔ نرساپور کی لیس نہ صرف ہندوستان میں مقبول ہے بلکہ امریکہ کینیڈا اور آسٹریلیا بھی ایکسپورٹ کی جاتی ہے۔ اس سے تقریباً ۶ لاکھ روپے سالانہ کا زرِ مبادلہ کمایا جاتا ہے۔ لیس تیار کرنے والی عورتوں کی آمدنی اس سالانہ آمدنی کا عشر عشیر بھی نہیں۔ یہ صنعت پبلک سیکٹر نہیں ہے اس لیے اس پر منافع خور اور بے رحم تاجروں اور دلالوں کا قبضہ ہے۔

خالہ بلّی کا وارنٹ گرفتاری

سری لنکا کے سپریم کورٹ کے جج نے ایک بلّی کا وارنٹ گرفتاری جاری کیا۔ یہ جج دو ججوں کے ساتھ ایک مقدمہ میں وکیل کی جرح سُن رہا تھا کہ ایک بدقسمت بلّی کہیں سے کمرہ عدالت میں آن دھمکی۔ اور اُس نے میاؤں میاؤں کرنا شروع کر دیا۔ بلّی کی مسلسل آواز سے جج بیزار ہو گیا۔ وہ مقدمہ کی کارروائی ٹھیک سے نہیں سُن سکتا تھا۔ اُس نے جھنجھلا کر عدالت کے رجسٹرار کو ایک نوٹس بھیجا۔ برائے مہربانی بلّی کو فوراً گرفتار کیا جائے۔ جب عدالت کا ایک کارکن رسّی اور بوری لے کر بلّی کو گرفتار کرنے پہنچا تو بلّی وہاں سے غائب ہو گئی۔ ایک پولیس کانسٹیبل نے اُسے وہاں سے بھگا دیا تھا۔

●●

باورچی خانہ

مزے دار اور آزمودہ پکوان
آزمائش اور ترتیب: رشیدہ خاتون ...

انڈوں کا اچار

انڈے	۸ عدد
سرکہ	آدھا لیٹر
ال مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
نگ	۴ عدد
لی مرچ	پاؤ چائے کا چمچہ
بائفل (پسی ہوئی)	پاؤ چائے کا چمچہ
ارچینی	ایک انچ کا ٹکڑا
ائی	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
ک	حسب ذائقہ

انڈوں کو سخت اُبال لیں۔ ٹھنڈے ہو جائیں تو چھیل لیں۔ رائی، لونگ اور چینی کو سل پر سوکھا پیس لیں۔

سرکہ کو ایک اسٹیل کی دیگچی میں ال کر آنچ پر رکھ دیں۔ سرکہ گرم ہو جائے انڈوں کو توڑ کر باقی تمام چیزیں سرکہ میں ل کر دیں اور جوش دے لیں پھر انڈے ڈال دیں۔ دو چار منٹ بعد دیگچی کو آنچ سے اُتار لیں۔ تھوڑا ٹھنڈا ہو جائے تو کسی ف اور خشک جار میں ڈال کر ڈھکنا کر بند کر دیں۔ دوسرے دن کھائیں۔

ش کی دال دودھ میں پکی ہوئی

ماش (دھلی ہوئی)	۲۵۰ گرام
دھ	آدھا لیٹر
مرچ	۱۰ عدد
ـ	۶ عدد
چھوٹی الائچی	۲ عدد
سفید زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
ادرک	۲ انچ کا ٹکڑا
ہری مرچ	۳ عدد
ہرے دھنیے کی پتیاں	ایک ٹیبل اسپون
گھی	ایک پیالی
نمک	حسب ذائقہ

دال کو صاف کرکے اچھی طرح دھولیں۔ پھر چار گھنٹے کے لئے بھگو دیں۔ ادرک چھیل کر لچھے کاٹ لیں۔ ہری مرچوں کے باریک باریک ٹکڑے کرلیں۔

ایک دیگچی میں دال، دودھ اور ایک پیالی پانی ڈال کر دیگچی کو آنچ پر رکھ دیں۔ دال ادھ گلی ہو جائے تو اس میں نمک، سفید زیرہ اور آدھے ادرک کے لچھے ڈال دیں۔ دال گل جائے اور دودھ خشک ہو جائے تو آنچ سے اُتار لیں۔

کڑھائی میں گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ گھی گرم ہو جائے تو اس میں لال مرچ، لونگ اور چھوٹی الائچی ڈال دیں۔ پھر فوراً ہی گھی کو تمام چیزوں سمیت دال میں اُنڈیل دیں اور دیگچی کو پانچ منٹ کے لئے ڈھانپ دیں پھر کھائیں۔

گاجر کی پڈنگ

گاجر	۲۵۰ گرام
انڈے	۲ عدد
چینی (پسی ہوئی)	ایک پیالی
مکھن	۱۰۰ گرام
دودھ	پاؤ لیٹر
آٹا	۱۲۵ گرام
بیکنگ پاؤڈر	۲ چائے کے چمچے
لیموں کا عرق	ایک چائے کا چمچہ
نمک	پاؤ چائے کا چمچہ
ونیلا ایسنس	ایک چائے کا چمچہ

گاجروں کو چھیل کر دھو لیں۔ پھر کدوکش میں کس لیں۔ آٹے کو باریک چھلنی میں چھان لیں۔ پھر اس میں بیکنگ پاؤڈر ملا کر دوبارہ چھان لیں۔

انڈوں کو توڑ کر زردی سفیدی علیحدہ علیحدہ کرلیں۔ مکھن میں چینی ملا کر اچھی طرح یک جان کرلیں۔ پھر اس میں انڈوں کی زردی، لیموں کا عرق، ونیلا ایسنس اور دودھ ملالیں۔ اب گاجریں بھی شامل کردیں۔ انڈوں کی سفیدی میں نمک ملا کر خوب پھینٹیں۔ جھاگ بن جائیں تو وہ بھی ملالیں۔ اب آٹا اور بیکنگ پاؤڈر بھی اس میں شامل کرلیں۔ پھر ایک دیگچی میں تھوڑا سا مکھن مل کر اس میں یہ تمام ملی ہوئی چیزیں ڈال دیں اور دیگچی کو درمیانی آنچ پر رکھ دیں، چمچہ نہ چلائیں۔ پانچ سات منٹ بعد دیگچی کو ڈھانپ کر اس کے ڈھکنے پر بھی دو چار جلتے ہوئے کوئلے رکھ دیں۔ دس پندرہ منٹ بعد کھول کر دیکھیں، پانی خشک ہو گیا ہو تو آنچ سے اُتار لیں۔ گرم گرم کھائیں۔

مُرغ کا قورمہ

مُرغ	ایک عدد
لال مرچ	۲ چائے کے چمچے
کالی مرچ	۵ عدد
سیاہ زیرہ (پسا ہوا)	آدھا چائے کا چمچہ
سفید زیرہ (پسا ہوا)	ایک چائے کا چمچہ
دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
دار چینی	آدھ انچ کا ٹکڑا
بڑی الائچی	۲ عدد

چھوٹی الائچی ۴ عدد
پیاز (درمیانہ سائز) ۳ ڈلی
ادرک ۲ چائے کے چمچے
لہسن ایک چائے کا چمچہ
دہی ایک پیالی
گھی ایک پیالی
نمک حسبِ ذائقہ

مُرغ کو صاف کرکے درمیانہ سائز کے ٹکڑے کرلیں پھر خوب اچھی طرح دھولیں۔

پیاز چھیل کر لچھے کاٹ لیں پھر گھی میں بادامی کرکے سل پر پیس لیں۔ اسی گھی میں مُرغ کے ٹکڑے اور دار چینی ڈال کر خوب بھونیں۔

مُرغ پر سُرخی آجائے تو دہی ڈال دیں۔ دو چار منٹ بعد تمام مسالے اور پیاز بھی ڈال دیں۔

دہی کا پانی خشک ہوجائے تو گلنے کے انداز کا پانی ڈال کر دیگچی کو ڈھانپ دیں۔ مُرغ گل جائے اور تھوڑا شوربہ باقی ہو تو آنچ سے اُتار لیں۔

مچھلی کے تکّے

مچھلی (سنگھاڑا) ۵۰۰ گرام
دہی آدھی پیالی
بالائی پاؤ پیالی
لال مرچ ۲ چائے کے چمچے
بُھنے ہوئے چنوں کا آٹا آدھی پیالی
لہسن ۲ چائے کے چمچے
پیاز (درمیانہ سائز) ۲ ڈلی
گرم مسالہ آدھا چائے کا چمچہ
لیموں کا عرق پاؤ پیالی
گھی حسبِ ضرورت
نمک حسبِ ذائقہ

مچھلی کے دو، دو انچ کے چوکور ٹکڑے کرالیں۔ پھر خوب اچھی طرح دھو کر ان پر لیموں کا لہسن مَل کر آدھے گھنٹے کے لئے رکھ دیں پھر دوبارہ خوب اچھی طرح دھولیں۔

پیاز چھیل کر لچھے کاٹ لیں پھر گھی میں بادامی کرکے سل پر پیس لیں۔ اب چنے کے آٹے میں مچھلی کو چھوڑ کر تمام چیزیں اور تھوڑا سا پانی ملا کر گاڑھا گاڑھا گھول لیں پھر مچھلی پر مَل کر آدھے گھنٹے کے لئے رکھ دیں۔

اب مچھلی کے ٹکڑوں کو سیخوں میں آدھے آدھے انچ کی دوری پر پرو دیں اور کوئلوں کی دھیمی آنچ پر سینک دیں۔ بیچ بیچ میں ان پر تھوڑا تھوڑا گھی ٹپکاتی رہیں۔ سلاد کے ساتھ پیش کریں۔

قیمہ گوبھی

قیمہ (درمیانہ موٹا) ۵۰۰ گرام
پھول گوبھی (درمیانہ سائز) ایک عدد
ٹماٹر ۲۰۰ گرام
لال مرچ ایک چائے کا چمچہ
دھنیا آدھا چائے کا چمچہ
سوکھی میتھی پاؤ چائے کا چمچہ
ادرک ۲ چائے کے چمچے
لہسن ایک چائے کا چمچہ
پیاز (درمیانہ سائز) ۲ ڈلی
ہرے دھنیے کی پتیاں ایک ٹیبل اسپون
گھی حسبِ ضرورت
نمک حسبِ ذائقہ

ایک دیگچی میں چار پیالی پانی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ پانی اُبلنے لگے تو اس میں ٹماٹر ڈال دیں۔ پانچ منٹ بعد دیگچی کو آنچ سے اُتار لیں۔ پانی ٹھنڈا ہوجائے تو ٹماٹروں کو آنچ سے نکال کر چھیل لیں اور چمچے سے خوب اچھی طرح کچل لیں۔

پیاز چھیل کر اس کے لچھے کاٹ لیں۔

اب ایک دیگچی میں پیاز کے لچھے اور گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں۔ پیاز بادامی ہو تو اس میں لال مرچ، دھنیا، لہسن، میتھی، نمک اور پاؤ پیالی پانی ڈال کر بھون لیں۔ پھر اس میں ٹماٹروں کا گودا ڈال دیں۔ ٹماٹروں کا پانی خشک ہوجائے تو قیمہ اس میں ڈال دیں۔ قیمے کا بسانذہ باقی ہو تو گلنے کے انداز کا پانی ڈال کر دیگچی کو ڈھانپ دیں۔

گوبھی کے پتے توڑ دیں ڈنڈی رہنے دیں پھر گوبھی کو خوب اچھی طرح دھولیں۔ ایک دیگچی میں گوبھی کا پھول اس طرح رکھیں پھول دیگچی کے پیندے کی طرف ہو اور ڈنڈی اوپر کی طرف رہے۔ پھر اس میں اتنا پانی ڈالیں کہ گوبھی کا پھول اس میں ڈوب جائے۔ دیگچی کو ڈھانپ کر آنچ پر رکھ دیں۔ جب پھول گل جائے تو آنچ سے اُتار لیں اور ڈنڈی سے پکڑ کر چھلنی میں رکھ دیں۔ پانی نچڑنے دیں۔ پانچ سات منٹ بعد ایک کڑھائی میں اتنا گھی ڈال کر آنچ پر رکھ دیں جس میں گوبھی کا پھول ڈوب جائے۔ گھی گرم ہوجائے تو گوبھی کو اس میں اس طرح ڈالیں کہ ڈنڈی اوپر کی طرف رہے۔ گوبھی بادامی ہوجائے تو گھی سے نکال لیں۔

جب قیمہ گل جائے اور آدھی پیالی پانی رہ جائے تو دیگچی میں قیمے کے اندر گوبھی کا پھول ڈنڈی اوپر کی طرف کرکے رکھ دیں۔ قیمے کا پانی خشک ہوجائے تو آنچ سے اُتار لیں۔ ڈش میں نکالتے وقت پہلے گوبھی کی ڈنڈی کاٹ کر پھینک دیں اور پھول ڈش میں سیدھا کرکے رکھ دیں۔ پھر پھول کے چاروں طرف گولائی میں قیمہ رکھ دیں۔ اور ہرے دھنیے کی پتیاں گوبھی کے پھول پر ڈال دیں۔

لیموں کی افادیت

لیموں وٹامن سی کا خزانہ ہے۔ سو گرام [illegible] وٹامن سی [illegible] کی بیماری [illegible] لیکن یہ اجزا [illegible] جو چیز [illegible] مصنوعی طور پر تیار [illegible] تاہم اس کی تاثیر اصل سے کم [illegible] ۵۰ ملی گرام [illegible] وٹامن سی ہوتا [illegible] نہیں [illegible] لیکن [illegible] مضر ہونے



شہناز حسین
ایم-۹۲ گریٹر کیلاش نئی دہلی ۱۱۰۰۴۸ فون ۶۴۰۸۹۴

بیوٹی کالج

کی بجائے فائدہ ہوتا ہے۔ مغربی ممالک میں زکام کا ایک ہی گھریلو علاج ہے۔ وہ لوگ ایک لیموں کا عرق گرم پانی میں یا بغیر دودھ کی چائے میں ڈال کر پیتے ہیں۔ یہ وہاں ایک عام علاج ہے۔ لیموں سے نہ صرف زکام کو فائدہ پہنچتا ہے بلکہ اس کے استعمال سے اعصابی تھکن بھی دور ہو جاتی ہے۔ اگر آپ کام کی زیادتی سے تھک گئی ہیں تو ایک لیموں کا عرق ایک گلاس پانی میں ملا کر پی لیں۔ آپ کی تھکن دور ہو جائے گی۔ لیموں کے استعمال میں ایک احتیاط لازمی ہے۔ لیموں کا عرق بغیر پانی ملائے نہیں پینا چاہئے۔ اگر یہ عرق بغیر کسی آمیزش کے استعمال کیا گیا تو اس کی تیزابیت معدے کی اندرونی جھلی کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ یہ عرق اتنا تیز ہوتا ہے کہ معدے کے راستے کو زخمی کر سکتا ہے، اس لئے لیموں کے عرق میں کچھ نہ کچھ ملا کر پینا بہتر ہے۔ سادہ پانی یا بغیر دودھ کی چائے سب سے اچھا محلول ہے۔ وزن گھٹانے کے لئے بھی لیموں سے اچھی دوا نہیں ہے صبح سویرے اٹھ کر نیم گرم پانی میں ایک لیموں کا عرق ملا کر پینے سے بدن کی فالتو چربی کم ہونا شروع ہو جاتی ہے۔

قدرت نے کچھ چیزیں اتنی کثیر تعداد میں پیدا کی ہیں کہ ان کی قدر و منزلت کم ہو گئی ہے۔ لیموں بھی ان ہی چیزوں میں شامل ہے۔ اگر یہ مشکل سے دستیاب ہوتا یا بہت مہنگا ہوتا تو اس کی ناقدری نہ ہوتی۔ لیموں میں گلوکوز موجود ہوتا ہے، نمکیات پائے جاتے ہیں، خون کے لئے فولاد کے اجزا بھی ہوتے ہیں اور تانبے کے بھی۔ یہ تپ دق میں بھی فائدہ پہنچاتا ہے اور خون کی کمی کو بھی دور کرتا ہے۔ چہرے پر چھائیاں ہوں یا جلد پر دھبے ہوں تو بھی لیموں کے استعمال سے دور ہو جاتے ہیں۔

ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ سادہ عرق لیموں استعمال کرنا مضر ہے۔ اس میں پانی یا پھلوں کا عرق ملا کر پینا چاہئے۔ اس بارے میں ایک اور بات قابل ذکر ہے اگر آپ اپنا جسم گھٹانے کے لئے ڈائٹنگ کر رہی ہیں تو لیموں کا زیادہ استعمال نہ کریں۔ ڈائٹنگ کے دوران معدہ اکثر خالی رہتا ہے۔ لیموں میں سائٹرک ایسڈ اور سیلک ایسڈ معدے کی جھلی کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ قدرتی علاج میں فاقہ بہت اہم ہے۔

یہ جسم کو فاسد مادے سے پاک کرتا ہے۔ فاقہ بہت سی بیماریوں کا قدرتی علاج ہے۔ فاقے کے دوران صفرا کی زیادتی کو روکنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، لیکن لیموں کی مقدار کم ہوتی ہے۔ نصف لیموں کا عرق ایک گلاس پانی میں ملا کر ہر چار گھنٹے کے بعد پیا جاتا ہے۔ اس سے صفرا کٹ جاتا ہے اور اعصابی تھکن دور ہو جاتی ہے۔ صفرا کی زیادتی کے اثر سے سر میں درد ہونے لگے تو لیموں کے استعمال سے یہ درد کم ہو جاتا ہے

وزن گھٹانے اور خون کی کمی کو دور کرنے کے علاوہ لیموں جگر کے لئے بھی مفید ہے۔ جگر کا کام یہ ہے کہ ہر روز تین پائو صفرا پیدا کر کے انتڑیوں میں پہنچائے۔ اگر جگر ٹھیک طرح کام نہ کرے تو یہ صفرا صحیح مقدار میں نہیں بنتا۔ لیموں کے استعمال سے جگر اپنا کام صحیح طور پر انجام دیتا ہے۔ اس سے جسم کے خلئے مضبوط رہتے ہیں۔ اسکول جانے والے بچوں کو روزانہ ایک لیموں پانی میں ملا کر پینے سے ان کی صحت اور تن درستی قائم رہتی ہے۔ اسکول میں کھیل کے دوران ان کی طاقت خرچ ہوتی ہے۔ گھر پہنچنے پر ان کو لیموں کا رس، پانی اور شکر ملا کر دیا جائے تو ان کی طاقت بحال ہو جاتی ہے۔ امتحان کے دوران خاص طور پر بچوں کو لیموں کا استعمال کرانا چاہئے۔ کھانے کے دوران تھوڑی سی سلاد بنا لیں سلاد آلو، گاجر، چقندر، سلاد کے پتوں اور ٹماٹر سے تیار کریں پھر ایک لیموں کا عرق نچوڑ دیں۔ ہاضمے کے لئے کھانے کے بعد ایک لیموں پانی میں ملا کر پینے سے کھانے کی تیزابیت ختم ہو جاتی ہے۔

لیموں میں ایک خاص افادیت ہے۔ یہ تیزابیت اور الکلی دونوں کے اثرات اپنے اندر رکھتا ہے۔ ایسیڈیٹی یا تیزابیت ہے تو یہ اس کو دور کرنے کے لئے الکلی یا کھار کا کام کرتا ہے۔ اگر آپ کو تیزابیت کی وجہ سے قبض کی شکایت رہتی ہے تو ایک لیموں کا عرق گرم پانی میں ملا کر پینے سے قبض ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر معدے میں کھار زیادہ ہے تو یہ اس کو دور کرنے کے لئے تیزاب یا ایسڈ کا کام کرتا ہے۔ مثلاً اگر آپ کو دست آرہے ہیں جو معدے میں کھار کی زیادتی کی نشانی ہے تو یہ بیماری بھی لیموں اور پانی سے دور ہو جاتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دست بند کرنے کے لئے لیموں خوب ٹھنڈے پانی میں ملا کر پینا چاہئے۔ اس طرح لیموں تیزابی معدے میں الکلی کا کام کرتا ہے۔ اور الکلی معدے میں تیزابیت کا کام کرتا ہے۔ یہ خاصیت کسی اور پھل میں نہیں پائی جاتی۔

لیموں اور سرکہ دونوں ایک ہی برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ دونوں میں تیزابیت ہے۔ لیکن سرکہ کے استعمال سے دانتوں کا انامل اتر جاتا ہے۔ اس کے علاوہ سرکے کا تیزاب معدے کی جھلی کے لئے بھی نقصان دہ ہو سکتا ہے۔

امریکہ میں ڈاکٹروں نے تحقیقات کے بعد انکشاف کیا ہے کہ لیموں کا استعمال دل کے مریضوں کے لئے بھی مفید ہے۔ اس کے استعمال سے خون کا دوران تیز ہو جاتا ہے اور دل پر رگوں کا دباؤ کم ہو جاتا ہے اس کے علاوہ آہستہ آہستہ وزن بھی گھٹ جاتا ہے اور صفرا باقاعدگی سے بننے لگتا ہے۔

کاسمیٹکس کی تیاری میں بھی لیموں کا استعمال عام ہے۔ کلینسنگ کریم میں لیموں کی آمیزش ہوتی ہے۔ لیموں سے جلد کی بلیچنگ بھی ہوتی ہے۔ بازار میں جو بلیچنگ لوشن ملتے ہیں، ان میں لیموں شامل ہوتا ہے۔ جلد پر بھورے رنگ کے دھبے ہوں تو لیموں کے استعمال سے کم ہو جاتے ہیں۔ دھوپ میں جلد جھلس جاتی ہے۔ لیموں کے استعمال سے دھوپ کی پیدا کی ہوئی سیاہی اتر جاتی ہے۔ اگر سر میں درد ہو تو ایک لیموں کو کاٹ کر پیشانی پر رگڑنے سے آرام ملتا ہے۔ گٹھیا اور نقرس کے لئے بھی لیموں مفید ہے۔ یہ زہر باد کی روک تھام بھی کرتا ہے۔ اگر دوپہر اور رات کے کھانے سے پہلے ایک لیموں کا عرق ایک گلاس پانی میں ملا کر پیا جائے تو کھانے کی چکنائی اور بوجھل پن دور ہو جاتے ہیں۔ لیموں کے استعمال سے آنکھوں میں چمک اور جلد میں تازگی پیدا ہوتی ہے۔ مسوڑھے اور دانت مضبوط ہوتے ہیں۔

جاڑوں میں سنگترہ کثرت سے ہوتا ہے یہ بھی لیموں کی برادری سے تعلق رکھتا ہے لیکن اتنا تیز نہیں ہوتا۔ اگر آپ صبح کو ایک سنگترے کا رس، نصف لیموں، شہد اور گرم پانی میں ملا کر نہار منہ پئیں تو اس سے نہ صرف قبض دور ہو جائے گا بلکہ آپ صبح کی چائے کے مضر اثرات سے محفوظ رہیں گی۔ لیموں سے آنتیں درست رہتی ہیں۔ کہنیاں سیاہ ہو جائیں تو نصف لیموں کو کہنی پر رگڑنے سے کہنی صاف ہو جاتی ہے۔ پاؤں کی انگلیوں کے پور بھی سیاہی مائل ہو جائیں تو لیموں سے صاف اور سفید ہو جاتے ہیں۔ لیموں کو عرق گلاب اور گلیسرین ایک ساتھ ملا کر ایک شیشی میں محفوظ کر لیں۔ یہ ایک قدرتی ہینڈ کریم ہے۔ صابن سے کپڑے دھونے کی وجہ سے ہاتھوں میں کھردرا پن آجاتا ہے اس کے علاوہ بھی انسان کے ہاتھ دنیا بھر

چیزیں چپکتے ہیں۔ ہاتھوں کو چکنا اور سفید بنانے
کے لئے لیموں اور چینی ہتھیلی میں رکھ کر دوسری
ہتھیلی سے رگڑیں۔ ایک مہینے تک یہ نسخہ آزمانے
سے ہاتھ خوب صورت اور تروتازہ ہوجائیں گے۔
بالوں کو دھونے یا شیمپو کرنے کے بعد چائے کی
پتّیوں والے پانی میں چند قطرے عرقِ لیموں ملالیں
اور اس سے بالوں کو دھوئیں۔ اس سے بال
گھنے، چکنے اور ملائم ہوجائیں گے۔

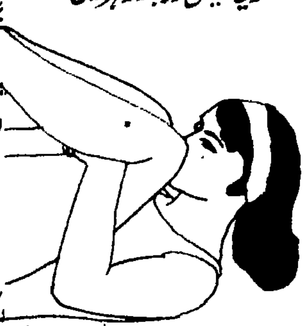
ایک برتن میں دو بڑے چمچے عرقِ لیموں
ڈال دیں۔ اس میں تھوڑا سا گرم پانی ملائیں۔
اس محلول میں ۲ عدد انجیر اور چند دانے کشمش
کے ملادیں۔ رات بھر اُسے پڑا رہنے دیں۔ صبح
کو انجیر اور کشمش کھالیں اور بچا ہوا پانی پی لیں۔
اس سے قبض کی شکایت رفع ہوجاتی ہے۔

آج کل ڈاکٹر اینٹی بایوٹک دواؤں کا
استعمال بہت کرتے ہیں۔ کلورومائسٹین،
ٹٹراسائیکلین وغیرہ تیر بہدف دوائیں ہیں۔
ٹائیفائیڈ، انفکشن اور بڑی بڑی بیماریوں کو یہ
دوائیں بہت جلد ختم کردیتی ہیں، لیکن ان دواؤں
کے بعد کے اثرات اچھے نہیں ہوتے۔ کبھی مونہہ
میں دانے نکل آتے ہیں کبھی زبان پر چھالے پڑ
جاتے ہیں اور کبھی بخار رہنے لگتا ہے۔
ان دواؤں کے مضر اثرات سے جسم کو محفوظ رکھنے
کے لئے لیموں یا وٹامن سی کی ٹکیاں بہت
فائدہ پہنچاتی ہیں۔ لیموں میں وٹامن سی کے
علاوہ وٹامن اے اور وٹامن بی ۱ اور ۲ بھی
ہوتا ہے۔ اگر آپ نے یہ دوائیں کثیر مقدار
میں استعمال کی ہیں تو ان کے مضر اثرات سے
بچنے کے لئے وٹامن سی کے ٹیبلیٹ استعمال کریں۔
اس سے دماغ کی خشکی دور ہوجاتی ہے۔ دماغ
کے ساتھ آنتوں کی خشکی بھی کم ہوجاتی ہے۔

یوگا ورزشیں

...از ملا" "پرایا بوجھ" اور "ملازمت بہت
...ہے۔ پریم وار برٹنی کا "گھر آنگن کے گلاب"
...پسند آیا۔ ان لوگوں کو میری طرف سے

ورزش نمبر ۱ : اس ورزش سے بادی پیش کریں۔
کی چربی گھل جاتی ہے۔ معدے کے عض میری دعا ہے کہ خدا آپ کی کاوشوں کی
چست ہوجاتے ہیں۔ جسم میں لچک پیدا اعلا فرمائے آمین۔
فرش پر چت لیٹ جائیں۔ آہستہ آہ احسان المظفر، ارول
ٹانگیں اوپر اٹھائیں۔ گھٹنوں کو چہر سوئیٹ بھابی:
طرف لے جائیں۔ دونوں ہاتھوں کو یوں تو "بانو" کا ہر کالم لاجواب ہوتا ہے
گھٹنوں کے نیچے رکھ لیں۔ انگلیاں ایک خاص کر بانو کا افتتاحیہ کافی پر مغز ہوتا ہے
میں پھنسا لیں۔ ہاتھوں کی مدد سے گھر ماہ افتتاحیہ کے تحت بڑے کام کی بات
مونہہ کی طرف لائیں۔ سر کو فرش پر رہے ہیں۔ افتتاحیہ کا ہر ایک جملہ معنی خیز اور
کمر فرش سے لگی رہے۔ گھٹنوں کو اتنت آمیز ہوتا ہے بانو جیسے ادبی رسالے
کہ وہ ہونٹوں سے لگ جائیں۔ ۱۵ سی محسوس ہوتی ہے تو بس چند غزلوں کی
کریں۔ یہ عمل دوبارہ دہرائیں۔ بانو، واقعی ایک معیاری، دل چسپ اور



...گی آموز جریدہ ہے، جس کا مطالعہ
...گھرانے کی لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ
...ل کے لئے بھی حد درجہ مفید ثابت ہوسکتا
شمیم آرا، لکھنؤ

پیاری بھابی:
ویسے تو میں ہر قسم کے رسالے پڑھتی ہوں
...د کا جولائی سے نیا نیا مطالعہ کر رہی ہوں۔

ورزش نمبر ۲ : اس ورزش سے کا بانو نظر نواز ہوا۔ اس بار تو بانو بڑی
رہتی ہے۔ رانوں کا گوشت کم ہوجاتا ار کے بعد ماہ کے آخر میں ملا۔ للّٰہ بھابی
اندر ہوجاتا ہے۔ آپ ایجنسیوں کے ہاں پرچہ جلد از جلد پہنچایا
فرش پر بیٹھ جائیں۔ دونوں ی تاکہ ہمیں وقت پر مل سکے۔
فرش پر رکھیں۔ ہاتھوں کی انگلیاں یہ اردو کا واحد رسالہ ہے جس میں
دائیں ٹانگ کو سامنے کی طرف لے جائیں کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ افتتاحیہ
آگے کی طرف جھکائیں۔ بائیں ٹانگ کہ کالج، آپ کی ذہنی الجھن اور اس کا حل
پیٹ کی طرف لے جائیں۔ بائیں پیر کچی خانہ یہ سب مفید کالم ہیں۔ افسانوں
کے نیچے دبالیں۔ پیٹ کو اندر کی طرف پیاسا ساون بے حد پسند آیا مصنف کو
۳۰ سیکنڈ انتظار کریں۔ یہ عمل ۳ بار...

مبارک باد اور ہاں بھابی جان آپ سے ایک التجا ہے۔ بانو میں پسندیدہ اشعار کو جگہ دیجئے گا یقیناً بانو اور بھی نکھر جائے گا۔

سکینہ خانم مومن، بلگام

ڈیر بھابی:

نومبر کا بانو ملا۔ خیال انصاری کی سچی لیکن کڑوی تخلیق "پیاسا ساون" کاش سماج کے ہر اُس فرد تک پہنچ جاتا، جو عورت کو کوکھ جلی اور بانجھ جیسے اہانت لفظوں سے نوازا کرتا ہے۔ تصویر کا دوسرا رُخ دیکھے بغیر جانے بغیر۔ جہاں مجھے شگفتہ جیسی بدنصیب ہندوستانی لڑکی سے ہمدردی ہے، وہیں میرے دل میں بے پناہ نفرت ہے ایسے بُزدل لوگوں سے جو اپنے آپ کو سماج میں مرد کہلانے کی غرض سے، نہ جانے کتنی معصوم لڑکیوں کو شوہر کی موجودگی میں بھی برہا کی آگ میں جلنے کے لئے مجبور کر کے نہ صرف اپنی شریکِ حیات کی بلکہ خود اپنی زندگی کو بھی خراب بنا لیتے ہیں۔ کاش ایسے لوگ شادی سے پہلے ہی اپنے آپ کو سمجھنے کی کوشش کریں اور شادی تجربہ کے لئے نہ کیا کریں تو بہت سی زندگیاں برباد ہونے سے بچائی جا سکتی ہیں۔

نیم احمد، بوکارو

عزیزہ بھابی:

ماہ اکتوبر کا بانو موصول ہوا۔ افتتاحیہ کے ساتھ ساتھ "پرایا بوجھ" اور "فیصلہ" کہانی پسند آئی۔ لیکن مضمون "کیا گاندھی جی ظالم شوہر تھے؟" کے بارے میں میں کچھ کہنا چاہوں گا باپو اور کستوربا کی ازدواجی زندگی کا بیان ادھورا ہی کیا گیا ہے۔ ن سلطانہ صاحبہ نے باپو اور کستوربا کی ازدواجی زندگی کے صرف اُس حصّے پر روشنی ڈالی ہے جب دونوں کے خیالات مختلف تھے اور دونوں کے مختلف خیالات کی بنا پر مصنف نے گاندھی جی کو ایک ظالم شوہر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ن سلطانہ صاحبہ نے باپو اور کستوربا کی صرف شروع زندگی کی سوانح حیات کیوں بیان کی جب گاندھی جی ہندوستان میں باپو نہیں مانے گئے تھے۔ لیکن جب باپو نے اپنی زندگی کی خاص مشن کا ہندوستان میں آغاز کیا اُس کے بعد باپو اور کستوربا کے تعلقات کیسے رہے؟ دونوں کے خیالات میں کیا تبدیلی آئی اس کے بارے میں ن سلطانہ صاحبہ نے کچھ نہیں کہا۔

ہندوستان میں ستیہ گرہ چھڑنے کے بعد باپو اور کستوربا کے تعلقات ویسے تو نہ رہے جیسے شادی کے بعد کچھ دنوں تک ہندوستان اور افریقہ میں رہے۔ افریقہ سے لوٹنے کے بعد گاندھی جی نے اپنے کوٹ اور پتلون کی ہولی جلا ڈالی تھی۔ وہ کستوربا گاندھی سے ہر کام کرنے سے پہلے رائے لیا کرتے تھے اور اُن کے رائے پر جہاں تک ممکن ہوتا عمل بھی کرتے۔

پہلے وہ کستوربا جو گھر سے باہر نہیں نکلتی تھیں۔ انہوں نے ہی آزادی کی جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ وہی کستوربا جو تعلیم سے گھبراتی تھیں گاندھی جی کے ساتھ جیل جانے پر انہوں نے جیل میں گاندھی جی سے پڑھنا شروع کیا۔ اب ذرا خیال کیجئے کتنا فرق آگیا تھا اُن دونوں میں اور باپو کستوربا کو کتنا پیار کرنے لگے تھے۔

وزین الدین، سہسرام

محترمہ بھابی جان:

"بانو" خواتین کا رسالہ ہے لیکن جب گھر میں ہوتا ہے تو ہم لوگ بھی کبھی کبھی اُس کو دیکھ لیتے ہیں۔ اس کے لئے میں آپ سے معافی چاہوں گا اس بار یعنی اکتوبر کے شمارے کو میں ایسے ہی دیکھ رہا تھا کہ اس مضمون پر نظر پڑی۔ و تھا "بچوں سے کیسے باتیں کریں" فوراً پڑھیں لہٰذا اُس کو پورا پڑھا۔ اور اسی اُس کا یقین ہو گیا کہ یہ ضرور انگریزی ترجمہ ہوگا اور آخر میں یہ خیال تھا: میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ انگریزی کے شائع نہیں ہونے چاہئیں۔ مجھے خوشی ہوئی کہ ہمارے اردو کے رسالے طرح کے مضامین چھاپ سکتے ہیں۔ بلاشبہ بہت ہی عمدہ تھا۔ اور آپ نے اس جگہ پہنچا دیا ہے کہ آپ ایسے چھاپ کر نہ صرف اردو کی خدمت بلکہ ہماری پوری قوم کے لئے مشعل ہو سکتی ہیں۔

میری رائے یہ ہے کہ بچوں کی کے اوپر بہت ہی کم ITERATURE میں ہے اور آپ اسی طرح کے ایک نہیں بلکہ پوری پوری SERIES کی چھاپئے۔

خدا کرے آپ کا رسالہ معیار کی تیز رفتاری کے ساتھ طے کرے۔ آمین میں ذاکر حسین کالج میں بوٹنی کا میری مدد اس سلسلے میں ہر وقت حاضر ہے

عارف علی

سویٹ بھابی:

ماہ نومبر کا بانو نظر نواز ہوا۔ افسانے پسند آئے مگر منصور احمد کا افسانہ قاصد بہت اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بیسیوں بہترین افسانے بانو میں شائع کئے جاتے آئندہ بھی ہوتے رہیں گے۔ سلیم ا

بچّوں
کے
لئے
اونی
کمبلوں کے
دو ڈیزائن



کشیدہ کاری

کے لئے

دل کش ڈیزائن



بچّوں
کے لئے
اُونی ٹوپیوں
کے نئے
ڈیزائن

دس ہزار روپے کے نقد انعامات کی شاندار تقسیم

[illegible]

[illegible] بالکل درست حل [illegible] پہنچ گئے۔ ان میں درست حلوں پر پہلا انعام مبلغ چھ ہزار روپے [illegible] گیا۔ [illegible] کی تیز رفتاری بے مثال ہے۔ درست حل ظاہر کرنے کے چند ہی گھنٹوں میں چیکنگ ختم کر کے تقسیم انعامات کی تفصیل کا [illegible] گیا۔ جن پر حالات نے صحیح حل [illegible] کی تفصیلات بھی لکھ دی گئیں۔ دوبارہ جانچ کے لئے [illegible] انتظار کئے بغیر [illegible] اور دوسرے انعامات کے منی آرڈر بھیج دئے گئے۔

بالکل درست حل ۲۰ موصول ہوئے جن پر پہلا انعام مبلغ چھ ہزار روپے بحساب تین سو روپے فی کس تقسیم کیا گیا

- شبیر ستار صاحب، ناگوری، لوہار پورہ ناگور ۳۴۱۰۰۱
- رگھن ناتھ صاحب معرفت دشی ناتھ پریس، ریذیڈنسی روڈ، سری نگر
- کے۔ پی۔ بھاٹیہ صاحب A - 24/1، تلک نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۸
- احمد علی بیگ صاحب، معرفت جے۔ اے۔ قریشی، قریشی کتاب گھر، بہادر گنج، شاہجہاں پور
- عبید اللہ صاحب، معرفت عبد الوہاب صاحب، ڈرائنگ ماسٹر (خلیفہ باب) مکان نمبر 39 - 3 - 4 محلہ اسلام پورہ کامارپیٹ ۵۰۳۱۱۱
- محمد عباد اللہ صاحب، 43، رائل اسٹریٹ، کلکتہ ۷۰۰۰۱۶
- امتیاز علی خاں صاحب، معرفت احمد رضا خاں صاحب، ریٹائرڈ سب انسپکٹر (پولیس) چاہ خانساماں، رام پور (یوپی)
- شفیق احمد صاحب، محلہ کسرول، رحیم اللہ والی مسجد، مراد آباد (یوپی)
- ایم۔ حفیظ الرحمٰن صاحب، تمباکو مرچنٹ، مقام و ڈاک خانہ پنڈول ضلع مدھوبنی (بہار)
- عابد میاں صاحب، مکان نمبر 2184، گلی مستری والی، محلہ پہاڑی، دہلی ۱۱۰۰۰۶
- ۱۱۔ انجم جوڑیا صاحب، فیملی کارنر، جموڑیا بازار، اسٹیشن روڈ، بردوان
- ۱۲۔ سنت لال صاحب، پروپرائٹر سنت لال اشوک کمار کلاتھ مرچنٹ، 29 پنجابی مارکیٹ، بدایوں
- ۱۳۔ عشرت جہاں بیگم صاحبہ، 95-9-3 [illegible] دواخانہ، بیرون [illegible] ۵۰۳۱۰۱
- ۱۴۔ دانش [illegible] صاحب، [illegible] چکی قصبہ [illegible]
- ۱۵۔ بہار میاں صاحب، محلہ ناتھو رام، منوٹہ، کاس گنج اسٹیشن
- محمد ابراہیم صاحب، معرفت الشفاء جنرل اسٹور، کارخانہ بازار، الموڑہ
- راحیلہ بیگم صاحبہ، مکان نمبر 656، چھتری والان، چاوڑی بازار، دہلی ۱۱۰۰۰۶
- [illegible] بیگم صاحبہ، معرفت سید حسن صاحب، [illegible] سعید منزل، شاہجہاں پور ۲۴۲۰۰۱
- ایم۔ انیس صاحب امروہوی، دکان نمبر 41، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳
- موہن لال شرما صاحب، سپھری روڈ، [illegible]

[illegible]

ایک غلطی والے ۲۶۹ حل موصول ہوئے جن پر دوسرا انعام مبلغ چار ہزار روپے بحساب [illegible] روپے فی کس تقسیم کیا گیا

[illegible]

صحیح حل شمع معمہ نمبر ۲۶

	ی	ب	ر	غ	م
د		ل	ی	ل	د
ے	ک		ش	ر	ط
کھ	ا	ر		ی	بھ
ل	ف	ت	س		
ا	ی	ی	ے		

[illegible]

۱۰,۰۰۰

شمع منی معمہ نمبر ۲۷

دس ہزار روپے کے نقد انعام

پہلا انعام بالکل درست حل پر چھ ہزار روپے۔ دوسرا انعام ایک غلطی والے حل پر چار ہزار روپے

فیس داخلہ فی حل : ایک روپیہ۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ فیس داخلہ پوسٹل آرڈر، منی آرڈر یا شمع ادبی معموں کے نقد ناموں کے ذریعہ ادا کی جا سکتی ہے۔ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی ڈاک سے ملنے والی رسید اپنے حلوں کے ساتھ بھیجیے۔ آپ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ ان کی فیس ایک ساتھ بھیج سکتے ہیں اور حل پر علیحدہ انعام کے حق دار ہو سکتے ہیں۔ کوئی ٹوکن بھیجنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بھیجنے کی شرط کے علاوہ شمع ادبی معموں کی دوسری تمام شرائط شمع منی معموں پر بھی عاید ہیں —— ان پابندی ضروری ہے۔

دفاتر شمع (نئی دہلی) میں ڈاک سے اور دستی حل وصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۴، دسمبر ۱۹۷۸ء ۸ بجے رات تک

اشارے

شمع منی معمہ نمبر ۲۷

ا	۲ ب	۳ م	۱	■	■
—			ٹ	■	■
	ت	ت	■	ل	۵
	ہ	■	ل		۶
ڈ	■	ل		ل	۷ د
■	ے	ن	ا	ل	۸

اوپر سے نیچے

۱ - جلوس "انقلاب زندہ باد" کے نعرے لگاتا ہوا بڑھتا آ رہا تھا۔ گولی چلتے ہی مجمع —— گیا۔ کچھ

۲ - نہ میری صحتیابی پر کوئی خوش ہونے والا ہے نہ میری —— پر رونے والا کوئی ہوگا

۳ - کسی کو کسی سے کمتر یا —— نہ سمجھو۔ ہر ایک کی اپنی الگ حیثیت ہوتی ہے

۴ - اگر امریکہ اور روس —— جنگ میں زور آزما ہو گئے تو دونوں بلکہ گھنٹوں ...... ہی مچ جائیگی

—— رہا ہے

اس کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے

۶ - یہ لاوا جو صدیوں سے —— رہا -

ہے نہ جانے کب پھٹ پڑے

۷ - ایسے موقعوں پر —— کوئی نہیں سنتا۔ سب جذبات کی رو میں بہ جاتے ہیں

۸ - صرف زبان —— سے کوئی کام نہیں بنتا۔ ہاتھ پیر چلانے پڑتے ہیں

شمع ادبی معمے (شمع منی معمہ نمبر ۲۷) ماہنامہ شمع، آصف علی روڈ، نئی دہلی

شمع منی معمہ نمبر ۲۷ کا صحیح حل ۲۷ دسمبر ۱۹۷۸ء کو صبح ساڑھے نو بجے ظاہر کر دیا جائے گا۔ صحیح حل اور انعام پانے والوں کے نام جنوری ۱۹۷۹ء کے "بانو" میں شائع کیے جائیں گے۔ انعام پانے والوں کی تفصیلات شمع فروری ۱۹۷۹ء میں بھی شائع کی جا سکیں گی

★ اب آپ ایک شمع ادبی معمہ اور دوسرے شمع ادبی معمہ کے حل بھیجنے کے درمیان اپنے ادبی ذوق کی تسکین کر سکتے ہیں ... منی معمہ کے ذریعے!

★ کوئی ٹوکن بھیجنے کی قید نہیں!

★ جتنے حل جی چاہے بھیجیے اپنے تمام حلوں کی فیس ایک یا ایک سے زیادہ منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا نقد ناموں سے بھیج سکتے ہیں

★ آپ ہر حل پر انعام کے حق دار بن سکتے ہیں فیس داخلہ، فی حل صرف ایک روپیہ

★ صرف آٹھ اشارے انعام پانا کس قدر آسان!

★ فیس داخلہ بھیجنے کے لیے شمع ادبی معموں کے نقد نامے استعمال کیے جا سکتے ہیں "اشاعت"، منی آرڈر بھیجیے۔ اپنے

والی رسید ضرور بھیجیے۔

صحیح حل: جوابی لفافہ بھیج کر منگوا لیجیے یا پھر اگلے ماہ نامہ "بانو" یا ماہنامہ "شمع" میں دیکھیے۔

★ شمع منی معمہ نمبر ۲۷ کا نتیجہ جنوری ۱۹۷۹ء کے "بانو" میں اور فروری ۱۹۷۹ء کے "شمع" میں شائع کیا جائے گا

—3-...

Date 27-12-79

MP



نزہت گل

اِن سے ملئے

ایک مشہور ماہرِ نفسیات کا قول ہے کہ خوب صورت لڑکیاں عموماً ذہنی اعتبار سے مایوس کُن ہوتی ہیں۔ انہیں قدرت کی طرف سے حُسن کا عطیہ ضرور ملتا ہے، لیکن ذہانت اور قابلیت نہیں ملتی۔ کلیہ میں مستثنیات ہوتے ہیں، نزہت گل بھی ایک ایسی ہی شخصیت ہیں جو اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔ قدرت نے ان کو نہ صرف حُسن سے نوازا ہے، بلکہ ان میں قابلیت اور ذہانت بھی کُوٹ کُوٹ کر بھر دی ہے۔

نزہت گل کسی بڑے شہر میں نہیں رہتیں۔ وہ اُتر پردیش کے شہر مظفر نگر کی رہنے والی ہیں۔ مظفر نگر ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ یہ شہر صنعت و حرفت کا مرکز ہے، تجارت کی منڈی ہے، لیکن یہاں علم و فضل کا بازار ٹھنڈا ہے۔ اس حوصلہ شکن ماحول میں نزہت گل نے اپنی ذہنی کاوشوں سے ایک ممتاز مقام حاصل کیا ہے۔ وہ مصور ہیں، موسیقار ہیں، فنونِ لطیفہ میں گہری دل چسپی رکھتی ہیں۔

نزہت گل کی بے شمار صلاحیتوں میں مصوری ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔ انہیں بچپن سے ہی مصوری کا شوق ہے۔ مصوری میں ان کا میلان ماڈرن آرٹ کی جانب ہے۔ ماڈرن آرٹ عموماً لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا — وہ کینوس پر بنی ہوئی ٹیڑھی سیدھی لکیروں کا مطلب نہیں سمجھتے۔ ماڈرن آرٹ کو سمجھنے کے لئے ایک آرٹسٹ کی نظر کا ہونا ضروری ہے۔ ماڈرن آرٹ در اصل آرٹ کی معراج ہے۔ اس کو سمجھنا ہر شخص کے بس کا روگ نہیں۔ ماڈرن آرٹ کی نمائش میں ایک عورت کی تصویر دیکھ کر ایک مجہول شاعر نے کہا تھا:

میں یہ سمجھا کہ تپائی پہ گھڑا رکھا ہے

پیکاسو اس فن کا امام تھا۔ یہ مشہور مصور اسپین میں پیدا ہوا، لیکن اس نے اپنی تمام زندگی پیرس میں گزاری۔ ابتدا میں وہ دوسرے مصوروں کی طرح عام تصویریں بناتا تھا، لیکن جلد ہی ان تصویروں سے اس کا دل اُوب گیا۔ اُس کا کہنا تھا: "میں مصور ہوں، فوٹوگرافر نہیں۔" کسی منظر کو فوٹو کینوس پر اُتارنا فوٹوگرافر کا کام ہے۔ نقاشی فوٹوگرافی نہیں ہے۔ کسی منظر کو دیکھ کر آرٹسٹ کے دل میں جو کیفیت پیدا ہوتی ہے، تصویر اس کی عکاسی کرتی ہے۔ ابتدا میں پیکاسو کی تصویروں میں انسانوں کی شکلیں اصل سے ملتی جلتی تھیں، لیکن اس کی فن کی ترقی کے ساتھ یہ تصویریں معدوم ہوتی گئیں۔

آخر میں تصویروں کی جگہ علامت نے لے لی۔ مثلاً اگر اسے صبح کو دفتر جاتے ہوئے لوگوں کی منظر کشی کرنا ہے تو وہ صرف ایک گھڑی دکھاتا ہے جس سے خون ٹپک رہا ہے، اس طرح وقت کی بے رحمی کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ ایسی تصویروں کو اہلِ نظر اور صاحبِ ذوق ہی سمجھ سکتا ہے۔ ان تصویروں کے ذریعے آرٹسٹ کی رُوح کی گہرائیوں تک پہنچا جا سکتا ہے —

نزہت ایک نوجوان لڑکی ہیں، لیکن اس کم عمری میں بھی ان کے فن میں پختگی کے آثار ملتے ہیں۔ وہ اب تک کئی انعامات حاصل کر چکی ہیں۔ انہوں نے مصوری کے کئی مقابلوں میں حصہ لیا اور پہلا انعام حاصل کیا۔ وہ اپنی تصویروں کی نمائشیں بھی کر چکی ہیں۔ ان کی تصویروں میں بہتے ہوئے موسیقی، بسنت اور رادھا کرشن کو خاص طور پر سراہا گیا ہے۔

'ادب برائے ادب' اور 'ادب برائے زندگی' ایک بڑی پرانی بحث ہے۔ جدید شاعر اور آرٹسٹ پرانی قدروں کی تقلید نہیں کرنا چاہتے ہیں۔ آرٹ اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ زندگی جتنی پیچیدہ ہوتی ہے آرٹ بھی اتنا ہی پیچیدہ ہوتا ہے۔ جدید آرٹ کو سمجھنے کے لئے آج کے انسان کی نفسیاتی واردات کو سمجھنا ضروری ہے۔

ماڈرن آرٹ میں ہر مصور آزاد ہے وہ اپنے احساسات کی ترجمانی میں کام کرتا ہے۔ نزہت کی دل چسپی کی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ آرٹ میں فرد کی آزادی کی قائل ہیں۔ وہ ایکسپریشن اِزم یا اظہاریت میں یقین رکھتی ہیں۔ وہ آرٹ میں انفرادیت برقرار رکھنا چاہتی ہیں۔ انہوں نے دنیا کے عظیم مصوروں اور اُن کے شاہکاروں کا مطالعہ کیا ہے، لیکن وہ کسی کی نقالی کرنا نہیں چاہتیں۔ وہ ایک اولوالعزم مصورہ ہیں۔ وہ ایک منفرد اسٹائل قائم